DUE DATE

Cl. No.________________ Acc. No.________________

Late Fine Ordinary Books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night Book Re. 1/- per day.

اس قبر کے نزدیک بیٹھ گیا اور اس بیکس ملکہ کی پُر انقلاب اور آفت رسیدہ زندگی کی حکایت سوچنے لگا۔

اب پاؤن کی آہٹ تک ایسے کے قریب سُننے مین آتی تھی۔ مین گاہے گاہے کسی پادری کی آواز جو شام کی نماز ادا کرتا تھا اور گانیوالون کی صدا جو درمیان مین گا اُٹھتے تھے سنتا تھا۔ یہ بھی تھوڑی دیر کے لئے بند ہوگئی اور اب چارون طرف سناٹا چھا گیا۔ خاموشی۔ تنہائی اور تاریکی جو ہر لحظہ بڑھتی جاتی تھی اس مقام کی کیفیت کو اور بھی خوفناک اور سنجیدہ بناتی تھی۔

"کیونکہ خاموش قبرون سے نہ کوئی آواز آتی ہے۔ نہ دوستون کی پُر مسرت آمد و رفت معلوم ہوتی ہے۔ نہ وہان عاشقون کے شکوہ شکایت۔ نہ والدین کی نصیحت الغرض کوئی بات سُنائی نہیں دیتی۔ وہان فراموشی سناٹا اور تاریکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

یکایک سرگرمی کے ساتھ۔ بجتے ہوئے ارگن کی صدائین [illegible] نزدیک سے کانون مین پہنچ [illegible] اور [illegible] بڑی بڑی موجون کی طرح لوٹتی ہوئی [illegible] اُنکا اُتار [illegible] اُنکا حظ [illegible] اس عالیشان عمارت [illegible] کیسی زیبا ہے۔ کس [illegible] دبدبہ کے ساتھ وہ اس [illegible] منزل [illegible] محرابون تک پہنچتی ہین اور ان [illegible] سے حجرون مین [illegible] اپنے [illegible] محل سے ہول پیدا کرتی ہین اور اس [illegible] کو گویا بنادیتی ہین [illegible] کبھی تحسین و آفرین کے الفاظ مین [illegible] ہو [illegible] اور اپنی سُریلی آوازون کو پے درپے اونچا اُٹھانے لگین۔ کبھی وہ تھم گئین اور گانیوالون کی دھیمی دھیمی آواز نہایت خوشگوار سُر مین نکلنے لگی اور بلند ہو کر چھت کے قریب نغمہ سرائی کرنے لگی۔ اسوقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آسمان سے اُتری ہوئی متبرک آوازین ہین جو اس عمارت کی اونچی اونچی محرابون مین [illegible] ہین۔ پھر ارگن نے اپنی صدا بلند کی اور ہوا مین سُریلا [illegible] اُسے روح انسانی پر اثر ڈالنے کے لئے بھیجدیا۔ [illegible] انسانی

[illegible] سے ہے اور کیسے عمدہ ملے ہوئے ہین۔ آواز ہر دم گہری [illegible] ہوتی جاتی ہے اور تمام خالی عمارت کو بھرنے کے بعد دیوارون سے ٹکرا کر جھنجھناتی ہے۔ سُنتے سُنتے کان سُن پڑگئے اور ہوش و حواس مختل ہوگئے۔ اب آواز بھرپور شادمانی کے ساتھ اُٹھی اور زمین سے آسمان تک پھیل گئی۔ روح سکتے کے عالم مین ہے اور ان میٹھی اور خوش آہنگ آوازون کے ساتھ آسمان کی طرف پرواز کررہی ہے۔

تھوڑی دیر تک مین حیران بیٹھا رہا اور مجھ پر وہ وجدانی کیفیت طاری ہوگئی جو اکثر خوش آیند نغمہ سننے کے بعد ہوجاتی ہے۔ شام کا اندھیرا بڑھتا آتا تھا اور قبرین زیادہ ہیبت ناک معلوم ہونے لگین تھین۔ نیز گھنٹے کی آواز بھی بتارہی تھی کہ اب دن رخصت ہوا چاہیے مین اُٹھا اور ایبے سے چلنے کو تیار ہوا۔ جب مین سیڑھیون سے اُترا جنسے عمارت مین داخل ہوتے ہین۔ میری آنکھ ایڈورڈ دی کنفیسر (Edward the Confessor) کی درگاہ پر جا پڑی [illegible] [illegible] زینے سے جو وہان لیجاتا تھا اوپر چڑھ گیا تاکہ [illegible] کے اس [illegible] سے چھوٹے آثار کو بھی ایک نظر دیکھ لون۔ یہ متبرک [illegible] [illegible] کی گئی ہے اور اسکے ارد گرد بادشاہون [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] راست مین سے ہوکر نیچے کے حجرون اور [illegible] [illegible] بے شمار قبرین موجود ہین اور جہان بہادر لوگ۔ پادری ارکین سلطنت۔ اور مدبر قبر کی خاک مین ملے پڑے ہین۔ [illegible] تاجپوشی کے کام کے لئے شاہ بلوط کا بنا ہوا بڑا تخت [illegible] پُرانے گاتھک مذاق [illegible] کے موافق بد نما نقش و نگار [illegible] نظا[illegible] سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکو تجہیز [illegible] پر بنایا گیا ہے [illegible] [illegible] [illegible] پیدا ہو [illegible] سہارے انسانی [illegible] [illegible]

موجود تھے اور اسی جگہ تخت اور تربت میں فی الواقع ایک قدم کا فاصلہ نظر آتا تھا۔ کیا کوئی شخص یہ خیال نہ کرے گا کہ یہ بے تکی یادگارین یہان اسلئے صحیح ہین کہ موجودہ صاحب عظمت اور اہل دول کے لئے ایک سبق ہون اور قابل فخر نعمت کے ساتھ ساتھ یہ بتائی جائین کہ آخرکار زمانہ انکو بھی بے اعتنائی اور تحقیر تک بہت جلد پہونچا دیگا۔ کتنی جلدی ایک تاج جو آج کسی کے لئے زینت فرق تھا کل قعر نیستی مین پڑ جائیگا اور قبر کی خاک اور ذلت گوارا کریگا اور کسی فرومایہ اور کمینے تماشائی کے قدمون سے روندا جائیگا۔ یہ بات دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ یہان اب قبر بھی کوئی متبرک جگہ شمار نہین کیجاتی۔ بعض طبائع مین ایک قسم کی بیہودگی ہوتی ہے جو انھین مقدس اور قابل تعظیم باتون کی تحقیر کے لئے اجازت دیدیتی ہے اور بعض بدطینت آدمی ایسے بھی ہوتے ہین جو کسی عالی مرتبت شخص کی اُس حقیر متابعت اور ذلت آمیز خوشامد [illegible] لینے سے خوش ہوتے ہین۔ ایڈورڈ دی کنفیسر کا تابوت کھلا پڑا ہے اور اُسکی لاش سے تجہیز و تکفین کی چیزین سب لُٹ چکی ہین۔ متبرک ملکہ الزبتھ کے ہاتھ سے شاہانہ عصا چھڑا لیا گیا ہے۔ ہنری پنجم کا بُت بلا سر موجود ہے۔ کوئی شاہی قبر ایسی نہین ہے جو اس بات کا ثبوت نہ دے کہ محکوم انسان کی اطاعت جھوٹی اور بدعہدی سے پُر ہے۔ بعض اُجاڑ پڑی ہین۔ بعض کی حالت خراب و خستہ ہے اور تمام قبرون کو بگاڑ دیا گیا ہے اور اُنکی تحقیر کی گئی ہے۔

شفق شام کی کرنین اب اونچی اونچی محرابون کے رنگین شیشون پر پڑنے لگی تھین اور ایبے کے نیچے کے حصے اب دونون وقت ملنے کی وجہ سے تاریک ہو چلے تھے۔ تمام حجرون اور اندر کے راستون پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ بادشاہون کی صورتین اور بُت دن چھپنے سے دُھندلے ہو گئے تھے اور قبرون کی سنگ مرمر کی مورتوانے

اسوقت مدھم روشنی مین عجیب و غریب صورتین اختیار کی تھین سرد ہوا چلنے سے قبر کے اندر ٹھنڈی سانس بھرنے کا گمان ہوتا تھا۔ کچھ فاصلے پر گوشہ شعرا مین پھرتے ہوئے کسی ملازم کے پاؤن کی آہٹ بھی بُری اور خوفناک معلوم ہوتی تھی۔ مین اب اُن راستون سے لوٹنے لگا جنسے صبح کو آیا تھا اور جب بڑے پھاٹک سے نکلا اور اُسکے کواڑ بند ہوئے تو تمام عمارت اس شور سے گونج اُٹھی۔

مین نے اس امر کی کوشش کی کہ جو چیزین مین آج دیکھ آیا ہون اور جنکے تصور مین مین اسوقت تک مستغرق تھا اُنھین اپنے دل مین ترتیب دے لون۔ مگر وہ سب اس سے پیشتر ہی منتشر اور ناقابل امتیاز ہو چکی تھین۔ پھاٹک سے باہر نکلنے کی دیر تھی کہ وہ نام۔ وہ کتبے اور فتوحات کی یادگارین سب خیالات کے ساتھ منتشر ہو گئین۔

مین نے سوچا کہ قبرون کے اس بڑے اجتماع کو سوائے اسکے کیا [illegible] کے تکبر اور فراموشی کے تیقن پر مکرر سہ کرر دُہرائے ہوئے وعظ اور تلقین کا بڑا مجموعہ ہے۔ فی الحقیقت یہ مقام ملک الموت کی بادشاہت ہے یا اُسکا سایہ دار رفیع الشان شاہی قصر ہے جہان وہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ رونق افروز ہوکر دنیا کے طمطراق اور شان و شوکت پر ہنستا ہے۔ اور بڑے بڑے بادشاہون کی آخری یادگارون کو فنا کا جامہ پہناکر خاک کے برابر کردیتا ہے۔ کوئی غور کرے کہ نام آوری او تشہیر کو امٹ کہنا کس نادانی سے شیخی مارنا ہے۔ وقت اپنے صفحے اُلٹتا جاتا ہے۔ ہم حال کی کہانیون مین اسقدر منہمک ہین کہ اُن او اور اُنکی روایتون کے ذکر تک کی مہلت نہین ملتی جو زمانہ ماضی کے باعث دلچسپی تھین۔ ہر زمانہ بذات خود ایک کتاب ہے جسے جلد بھلا کے لئے ایک طرف پھینکدیا جاتا ہے۔ آج کا بت گذشتہ کل کی یاد کو (Hero) ہمارے دل و دماغ سے نکالکر پھینکدیتا ہے

وغیرہ اپنے کل آنے والے جانشینوں کے داخل ہوتے ہی الگ ہو جائیگا۔ سرٹامس براؤن صاحب لکھتے ہین "جتنی جلدی ہم اپنے بزرگان کو بھول جاتے ہین اُتنی ہی جلدی ہمارے پس ماندگان ہمین بھلا دینگے"۔ تاریخین پڑھتے پڑھتے روایتین ہو جاتی ہین واقعات شکوک اور بحث و مباحثہ کی وجہ سے بالکل دھندلے معلوم ہوتے ہین۔ کتبے لوح تربت سے محو ہونے لگتے ہین اور بت اپنی کرسی سے گر جاتے ہین۔ بڑے بڑے کالم شاندار محرابین اور اونچے اونچے پرامڈ (Pyramid) یہ سب ریت کے سوا اور کیا ہین اور انکی تحریرات سطح خاک پر لکھے ہوئے حروف کی نسبت کیا زیادہ وقعت رکھتی ہین۔ اس حالت مین کسی مقبرہ کی حفاظت سے کیا حاصل اور اجسام مُردہ معطر مسالون سے کب قائم رہ سکتے ہین۔ سکندر اعظم کے جسم کا ذرہ ذرہ ہوا مین پریشان ہے اور اسکا خالی تابوت عجائب گھر کی حیرت افزا اشیاء مین شمار ہوتا ہے مصری مومیات جو کیمبی سس Cambyses اور روزگار کے ہاتھون سے بچ رہی تھین اب انسانی حرص و ہوس کے تصرف مین ہین اور جا بجا زخمون کو اچھا کرتی ہین۔ فرعون کی ممی مرہم کا کام دینے کی غرض سے بازار مین فروخت ہونے آگئی ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس عمارت مین جو اسوقت میرے سر پر اپنی پوری رفعت کے ساتھ استادہ ہے وہ کونسی خوبی ہے جو اسے دیگر عظیم الشان مقبرون کے انجام و آخرت سے بچا لیگی۔ کبھی نہ کبھی وہ دن ضرور آئیگا جب اسکی جلوہ فگن محرابین جو اسوقت اونچی اونچی کھڑی ہین زیر پا خاک مین ملی پڑی ہونگی۔ اور جب بجائے سُریلی صداؤن اور کلمات تحسین کے یہان ٹوٹی پھوٹی محرابون سے ہوا سیٹی بجاتی ہوئی سن سے نکل جائیگی اور اُلو شکستہ برجون سے اپنی نحس آواز لگائیگا۔ جب آفتاب کی روشن کرنین ملک الموت کے ان تاریک محلات پر پڑینگی اور جب منہدم ستونون پر عشق پیچان کی بیل چڑھنے لگیگی اور فوکس گلو (Fox Glove) کسی لاپتہ تربت پر پھول چڑھائیگا اور اپنی بہار دکھا کر مُردہ کو چڑائیگا۔ اسطرح ہر ایک بشر دار فانی سے گذر جاتا ہے اور ایک نہ ایک دن تذکرون اور انسان کی یادداشت سے اُسکا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ اُسکی تاریخ ایک کہانی رہ جاتی ہے جسے سُن چکے ہین اور اُسکی قبر بربادی کا منظر دکھائی دیتی ہے۔

(ترجمہ واشنگٹن ارونگ)

جید پال سکسینہ

معیار صداقت ۔ مہاتما ستیہ دھاری جی نے صداقت کی جانچ کے لئے ایک نہایت مبسوط کتاب لکھی ہے جو مندرجہ بالا نام سے موسوم ہے۔ اسکی ضخامت ۲۵۵ صفحات ہے اور ایکسو چیپٹر سے زائد مختلف مضامین درج ہین۔ قابل مصنف نے فلسفہ زندگی اور اخلاق کا کوئی پہلو فروگذاشت نہین کیا ہے۔ کتاب کو بالاستیعاب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کیسی طوفانی اور بحر ناپیدا کنار ہے۔ بہت سی خوبیون کے ساتھ اس کتاب مین ایک قابل افسوس نقص بھی ہے اور وہ غیر آریہ مذاہب پر حملے ہین جو ایسی اخلاقی کتاب کے لئے موزون نہین۔ قیمت فی جلد عہ۔ منیجر جیون سُدھار سیتکالا لاہور سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

اڈیٹر وطن مینار۔

اجنٹا کے غار

بودھ مذہب والون کے دلچسپ اور مشہور غار جنھین جنٹا کے غار" کہتے ہین اندھیادری کے ٹیلون مین شہر اجنٹا کے شمال و مغرب مین چار میل کے فاصلے پر واقع ہین - ان غارون کو جانے کے راستہ مین علی الخصوص برسات مین اور نیز اُسکے قبل ملک دکن کا ایک نہایت خوشنما اور قابل دید منظر پیش نظر ہوتا ہے لیکن گرمی کے موسم مین وہ سب چیزین خشک ہو جاتی ہین۔

اہل یورپ کو ان غارون کا حال کچھ کم سو برس سے معلوم ہوا ہے سپہلے پہل جو انگریز لوگ انھین دیکھنے گئے وہ مدراس کے فوجی افسر تھے سنہ ۱۸۱۹ء مین انکا وہان جانا ہوا تھا۔ انکے بعد سر جان مالکم نے ڈاکٹر جے برڈ کو روانہ کیا تھا کہ وہ اُن غارون کو غور سے دیکھین اور انکا حال دریافت کرین۔ اسکے بیشتر صدیون سے خوفناک جنگل نے اُن تک پہونچنے کے راستے بند کر رکھے تھے اور ملک نے انکو فراموش کر دیا تھا۔ اور انکی لاانتہائی صناعیان جھاڑی جنگل کے پتون سے منہ چھپائے پڑی تھین۔ اُن کے اطراف مین شیر تیندوے ڈھونڈا کرتے اور بھیل لوگ رہا کرتے تھے۔ انکی دیوارون پر جو قابل قدر نقش و نگار اور سنگ تراشی کے نمونے ہین انکو امتداد زمانہ سے نقصان پہونچا ہے لیکن وہ اتنا جتنا ایلورا کے غارون کو انکے نقش و نگار مین سے بعض عمدہ مورتین بیرحم تماشائی اُڑا لے گئے ہین۔ لیکن آخر کو سرکار آصفیہ نے ممانعت کر دی ہے کہ کوئی وہان دست اندازی نہ کرے اور اب ان غارون پر ایک پہرا بھی مقرر رہتا ہے جو تماشائیون کے ساتھ اندر جاتا ہے تاکہ کوئی شخص دست درازی نہ کرنے پائے۔

دولت انگلشیہ نے ان غارون کے عمدہ نقشے بنوانے مین بہت کوششین کین ہین چنانچہ دو مرتبہ کپتان جل نے جو ہندوستان مین ایک نامور مصوّر تھے سنہ ۱۸۴۴ء اور سنہ ۱۸۴۹ء مین انکے عمدہ نقشے تیار کئے تھے اور یہ نقشے لندن کے شیش محل مین نمائش کے لئے رکھے گئے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ سنہ ۱۸۶۶ء مین اُس محل مین آگ لگی اور یہ تمام نقشے برباد ہو گئے - ان نقش و نگار کی نسبت اختلاف ہے کیونکہ مسٹر جے برجس جنکے نوٹون سے یہ بیان لیا گیا ہے کہتے ہین کہ اسکی تاریخ کا پورا پورا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن بعض قدیم نقوش جو نمبر ۹ اور نمبر ۱۰ کے غارون مین ہین انکے نزدیک سن عیسوی کی دوسری صدی کے ہین اور باقی اکثر چھٹی صدی کے۔ لیکن بعضے ساتوین صدی کے بھی ہین اور مسٹر گریفتھس کی راے ہے کہ اطالیہ مین چودھوین صدی کے درمیان جس قسم کے نقش و نگار تیار ہوئے تھے اُسی قسم کے یہ بھی معلوم ہوتے ہین جس سے پایا جاتا ہے کہ ان کے اور اُن کے خیالات مین بہت مشابہت تھی - ان کے بنانے والے خواہ کوئی ہون لیکن انکی نسبت اتنا تو خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بمزور دنیاداروں سے میل جول رکھتے تھے اور اُنکے حالات سے بخوبی واقف تھے کیونکہ وہان کے نقش و نگار مین روزانہ زندگی کی شکلین نہایت عمدگی سے دکھلائی گئی ہین اور غالباً یہ انھین لوگون کا کام ہے جو رات دن اسکو دیکھتے ہون گے۔ اُن کے نہایت باریک بین اور صاحب ذہن وقاد ہونے مین کوئی کلام نہین ذیل مین ہر ایک غار کی نسبت کیفیت درج کی جاتی ہے۔

غار نمبر ۱

یہ ایک خانقاہ ہے جو بہ نسبت دوسری خانقاہون کے نہایت خوبصورت ہے اسکی نہایت عمدہ کھدی ہوئی دیوارین بھی ہین جو برآمدے کے سامنے ہے گزشتہ شان و شوکت کے کسیقدر نشان نظر آتے ہین۔ برآمدے کے باہر دونون طرف دو کمرے ہین بلے دروازون کے سامنے دو دو ستون ہین اور اُسکے مغربی جانب کا کمرہ دوسرے کمرے سے ملا ہوا ہے جو ½ ۱۳ فیٹ مربع اور بہت تاریک ہے اسکے داہنے طرف کے کمرے سے دوسرے دو کمرے ملحق ہین جو کسیقدر چھوٹے ہین۔ اسکا برآمدہ ۶۴ فیٹ لمبا ½ ۹ فیٹ چوڑا اور ½ ۱۲ فیٹ بلند ہے اسکے کنارے نقش و نگار اور سنگ تراشی کا ایک عجیب نمونہ ہین۔ سامنے کے دروازے کے چوکھٹے مین بھی نقش و نگار ہین اور اوپر کی کانس کے حصے مین جدا جدا خانے ہین جنمین انسانی مورتین اور راج ہنس کے خوبصورت جوڑے ہین۔ جنکے پر نقش و نگار کے اوپر سایہ کئے ہوئے ہین تاکہ وہ جگہ عمدہ نمایش سے خالی نہ رہے۔ یہ صنعت سنگالیون سے زیادہ خصوصیت رکھتی ہے۔

برآمدہ کے بیچ مین ایک وسیع دروازہ ہے جو ایک لمبے دالان سے جو تقریباً چونسٹھ مربع فیٹ ہے ملا ہوا ہے اسکے اطراف مین بیس ستون ہین اور ستونون کے درمیان ... فیٹ کا راستہ ہے اور اسمین ویسی ہی سنگ تراشی ہے جیسی سنگلیون بر ہما چین کے بودھ لوگ کیا کرتے ہین۔ اُن کے بیچ مین ایک ستون ہے جسکے نقش و نگار قابل تعریف ہین۔ اسپر چار ہرن کندہ ہوئے ہین اور اُن کے سر اس حساب اور خوبی سے تراشے گئے ہین کہ ایک سے دوسرے مین ذرہ برابر فرق نہین۔ اگر اُنمین سے ایک سر دوسرے کی گردن سے چسپان کر دیا جاے تو اوسی کا سر معلوم ہوگا۔

اس غار مین جوگیون کے لئے کمرے بنے ہوئے ہین اور بودھ کی ایک تصویر ہے جو بیس فیٹ کی وسعت مین ہے۔ اس غار مین بہت سے نقش و نگار ہین جو علم آثار قدیم کے نہایت دلچسپ نمونے ہین اور اُنمین جو تصویرین شیرین اور خسرو کی خیال کیجاتی ہین وہ بھی قابل دید ہین۔

غار نمبر ۲

یہ بھی ایک خانقاہ ہے لیکن پہلی خانقاہ سے چھوٹی اور صناعی مین بھی اُس سے دوسرے درجے پر ہے۔ اس غار مین جو عبادت کی جگہ ہے وہ تقریباً بارہ فیٹ لمبی اور گیارہ فیٹ چوڑی اور گیارہ فیٹ پانچ انچ اونچی اور تاریک۔ چونکہ ایک مدت تک چمگادڑ اسمین رہا کرتے تھے اسلئے اُسکی چھت کی نقاشی بالکل خراب ہوگئی ہے۔ لیکن اسکے برآمدے مین ابھی بہت سے نقش و نگار ایسے ہین جنکا فوٹو برابر لیا جا سکتا ہے۔ برآمدہ۔ دالان اور پوجا کی جگہ کے نقش و نگار بہت سے اُن راجاون اور رانیون کے واقعات کو ظاہر کر رہے ہین جو اُن مین کندہ ہین۔ پوجا کی جگہ کی دیوارون پر بودھ اور اسکے پرستارون کی تصویرین ہین اور اسکے مقابل مین چھت کے ایک حصہ پر لٹکتی ہوئی مورتین بنی ہوئی ہین جو بودھ کو پھول نذر دے رہی ہین۔ اس غار مین اٹھائیس قسم کے نقش و نگار ہین جو علٰحدہ علٰحدہ پہچانے جاتے اور بخوبی سمجھ مین آتے ہین۔

غار نمبر ۳

یہ ایک چھوٹی سی خانقاہ ہے جو ٹیلے کے اوپر سامنے کھدی ہوئی ہے۔ لیکن تمام نہین ہوئی۔ اسکا برآمدہ ۲۹ فیٹ لمبا اور سات فیٹ چوڑا ہے اور اسکی چھت کے نیچے ...

چار گول اور دو مربع لیکن ان پر کچھ نقش و نگار نہین ہین دالان مین جانے کا ایک دروازہ ہے لیکن وہ برابر کھدا ہوا نہین اور اسی مین ہو کر ایک دوسرے درجے مین جاتے ہین۔

غار نمبر ۴

یہ بھی ایک خانقاہ ہے۔ اور سبھون سے بڑی ہے۔ اسکا برآمدہ ستاسی فیٹ لمبا اور بارہ فیٹ چوڑا اور سولہ فیٹ اونچا ہے اور اسمین آٹھ ستون ہشت پہل ہین جو بالکل سادے ہین۔ اس برآمدہ کے دونون طرف دو کمرے ۱۰ فیٹ لمبے اور ۸½ فیٹ چوڑے ہین۔ انکے چھوٹے چھوٹے دروازون پر تین تین زینے لگے ہوئے ہین۔ اس غار کے دالان کے تین دروازے ہین۔ بیچ کا دروازہ اجنٹا کے تمام غارون کے دروازون سے نہایت مکمل اور خوبصورت ہے۔ یہان علاوہ بہت سی عمدہ مورتون کے بودھ کی ایک مورت ہے جسمین وہ دعا مانگ رہے ہین۔ اس مورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی اسی زمانے کے قریب قریب بنی ہے جسمین ایلورا۔ ڈھیڈ ناٹا اور اورنگ آباد کا ساتوان غار بنایا گیا ہے۔ برآمدے کی چھت جسمین ایک جگہ نہایت آبدار رنگ کی ہے۔ اس غار مین کوئی نقش و نگار نہین۔ اسکا دالان ستاسی مربع فیٹ ہے اور اسمین سادے اٹھائیس ستون ہین۔ انپر ویسے نقش و نگار نہین جیسے پہلے اور دوسرے غار کے کھمبون پر ہین۔ لیکن اسکی کانس بہت خوبصورت ہے۔

غار نمبر ۶

اس غار مین دو درجے ہین لیکن نیچے کے درجے کا تمام برآمدہ گرا ہوا ہے اسکا دالان جو پینتالیس مربع فیٹ کا ہے اسمین تقریباً سولہ ستون تھے لیکن اب فقط سات باقی رہ گئے ہین۔ چونکہ اسمین لوگ رہتے اور ہمیشہ آگ جلایا کرتے تھے اسلئے وہ خراب ہو گیا ہے۔ اور اسکی شکل ویرانہ کیسی معلوم ہوتی ہے، اسکے اوپر کے درجے پر چڑھنے کے زینے جو دروازے کے پاس ہین بالکل شکستہ ہو گئے ہین اسلئے اوپر کے برآمدے مین جانا دشوار ہے۔ اس برآمدے مین چار گول اور دو مربع ستون ہین لیکن مربع ستونون مین سے صرف ایک ہی باقی رہ گیا ہے اور واقعی یہ ایک نہایت عمدہ ستون ہے۔ اس غار مین بہ نسبت اجنٹا کے اور غارون کے بودھ کی بہت سی مورتین ہین جن مین اکثر کھڑی ہوئی ہین۔ غالباً ان غارون مین یہ غار حال ہی کے زمانے کا معلوم ہوتا ہے اگرچہ اسکے نقش و نگار دھوئین کی وجہ سے بالکل مٹ گئے ہین لیکن شاہی محل کے نقش صاف پہچانے جاتے ہین اور اندرا کی تصویر پرستش گاہ کے دروازے کے دونو طرف نظر آتی ہے۔

غار نمبر ۷

یہ بھی ایک خانقاہ ہے لیکن اب تک جتنی خانقاہون کا بیان ہوا اُن مین اور اسمین بعض باتون کا اختلاف ہے چنانچہ اسکے برآمدے مین دو ڈیوڑھیان ہین اور ہر ایک ڈیوڑھی مین دو دو ہشت پہل ستون ہین جنکی کانس ایلیفنٹا (گھارا پوری) کے دوسرے غار کے کھمبون سے کسیقدر مشابہت رکھتی ہے۔ اسمین علاوہ بودھ کے بودھی ساترا اور نیز دوسری مورتین ہین جنمین سے بعض بیٹھی ہوئی اور بعض کھڑی ہوئی ہین۔ پرستش گاہ کے دروازے کے اوپر مورتین بنی ہوئی ہین اور نیچے شیر ببر کا سر اور پنجے ہین۔ برآمدے مین سے ہو کر چھوٹے چھوٹے کمرون اور پرستش گاہ کو راستہ جاتا ہے جہان کی چھت اور کالی دیوارون پر کسی قدر نقش و نگار کے آثار باقی رہ گئے ہین۔

غار نمبر ۸

یہ بھی ایک خانقاہ ہے لیکن اسکے سامنے کا حصہ بالکل منہدم ہوگیا ہے۔ دالان مین جو کچھ باقی ہے اُسکی لمبائی ۳۲ فیٹ چوڑائی ۱۷ فیٹ اور اُنچائی دس فیٹ ہے۔ یہ غار ٹیلے کے نشیب مین ہے جو مٹی سے پٹ گیا ہے۔ پرستش گاہ کے دالان اور پیش دالان کے دونو طرف کوٹھریان ہین۔ پیش دالان کا دروازہ بہت نیچا ہے اور اُسکے پیچھے ایک پتھر کی چوکی ہے لیکن اُسمین کوئی نقش و نگار نہین۔

غار نمبر ۹

یہ غار ایک چھوٹا سا مندر ہے اور نہایت قدیم زمانے کا ہے۔ غالباً سنہ عیسوی سے ایک صدی پہلے بنا ہو۔ یہ ۴۵ فیٹ لمبا ۳/۴ ۲۲ فیٹ چوڑا اور ۲۳ فیٹ دو انچ اونچا ہے۔ اسکے وسط مین ستونون کی قطار ہے جسکے دونو طرف دو راستے ہین ان ستونون کے پیچھے ایک نصف دائرہ ہے جسکے بیچ مین ایک پرستش گاہ ہے اور اسکا قطر سات فیٹ ہے اسکی بنیاد ایک سادے بیلن کی سی پانچ فیٹ اونچی ہے اور اُسکے اوپر ایک گنبد ہے جسکا قطر تقریباً ۶ فیٹ اور ۴ انچ ہے اور اونچائی ۴ فیٹ۔ اس گنبد سے اوپر ایک مربع کالس ۱/۴ ۱ فیٹ بلند ہے اور اسکے اطراف مین کٹہرا ہے۔ اسکی صورت زمانۂ قدیم کے صندوقون کی سی ہے جسکے اوپر ایک ڈھکن ہے۔ یہ گویا ایک قسم کی میز ہے جسمین چھ خانون کی شکل ہے جنمین کا ہر ایک خانہ اپنے نیچے کے خانے سے کسیقدر باہر نکلا ہوا ہے۔ اسکے اوپر مثل کالی کے غارون کے ایک لکڑی کا چھاتا ہے۔ اس غار کے درمیان مین ۲۱ ستون ہشت پہل ہین لیکن اُنپر کوئی نقش و نگار نہین اسمین جو کچھ نقش و نگار باقی رہ گئے ہین وہ دو یا دو سے زیادہ زمانون کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہین اُسکی دیوارون کے بعض حصون پر دو تہین جمی ہوئی ہین۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دوسری صدی عیسوی کے اخیر نصف حصے کی ہین۔

غار نمبر ۱۰

اجنٹا مین یہ سب سے زیادہ قدیم مندر ہے اور اسکے پہلو لکڑی کے ہین۔ یہ مندر بالکل سادہ ہے اور اسمین کسی طرح کے نقش و نگار نہین اسکی بنیاد کا قطر ۱/۲ ۵ فیٹ ہے اور اسکا گنبد نصف کرے سے کچھ زیادہ ہے۔ اسمین ایک بڑی محراب ہے جسکے داہنی طرف یہ عبارت کندہ ہے ۵ ترجمہ

"گریہا مکاکی نذر + واسسٹ تھیوترا کی طرف"

چونکہ یہ ایک نامربوط عبارت ہے اسلئے یہ کہنا ممکن نہین کہ یہ غار واسسٹ تھیوترا نے کھودا تھا یا صرف دروازہ بنایا تھا اور وہ کون تھا۔ لیکن اسکی تعمیر یا تو دوسری صدی عیسوی کے قبل ہوئی ہے یا دوسری صدی کے نصف اول مین اس غار مین عمدہ نقش و نگار تھے اور بعض حصے ایک کے بعد دوسرے وقتون مین منقش ہوئے ہین لیکن اب کچھ کچھ ان کے آثار باقی رہ گئے ہین۔ مسٹر برجس کی رائے ہے کہ دوسری صدی عیسوی ہی اسکی تعمیر کا صحیح زمانہ ہے۔

غار نمبر ۱۱

یہ خانقاہ ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے۔ اور اُسکی شکل معمولی خانقاہ کی سی ہے۔ چونکہ اسکے دالان مین بے ڈول اور اصلی وضع کے ہشت پہل ستون ہین اسلئے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اُن کھمبون کا اسوقت کا نمونہ ہے جب پہلے پہل خانقاہون مین کھمبون کا تراشنا ایجاد کیا گیا۔ اس غار مین چند کمرے بلند کرسی پر واقع ہین اسلئے سامنے سے بمشکل دکھائی دیتے ہین اسکے بائین طرف ایک تنگ گلی ہے جو ایک مخفی کمرے کو گئی ہوئی ہے

اور اسکی سیدھی طرف ایک قسم کی پتھر کی نشست گاہ ہے اور پرستش گاہ مین بودھ کی مورت اور اس مورت کے مقابلہ مین انسان کی ایک نہایت خوبصورت تصویر ہے جو مراقبہ مین نظر آتی ہے معلوم ہوتا ہے اُسکے مُنہ اور ہاتھ کو عمداً نقصان پہونچایا گیا ہے۔ سوا برآمدے کے اس غار کے تمام نقش و نگار خراب ہو گئے ہین برآمدے کی چھت اور غار کے اوپر اور راستون کے باہر جو نقش و نگار ہین وہ ابتک اصلی حالت مین موجود اور علم ساحت کا ایک عمدہ نمونہ ہین۔ اندر کے نقش و نگار صاف نظر نہین آتے لیکن اُن سے پایا جاتا ہے کہ اُنپر بودھ اور بودھی ساتزا کی مورتین تھین۔

غار نمبر ۱۲ و ۱۳

یہ دونون قدیم خانقاہین ہین لیکن ان کے دروازے منہدم ہو گئے ہین۔ ان دونون کے اندر ستون نہین اور کوٹھریون مین پتھر کے پلنگ نما چبوترے بنے ہوئے ہین جو دوسرے صدی عیسوی کے غارون سے مشابہت رکھتے ہین۔ نمبر ۱۲ کا دالان ½ ۳۶ مربع فیٹ کا ہے اور اسکے اندر تین طرف چار چار کوٹھریان ہین۔ ان مین سے ۱۱ مین پتھر کے پایون پر دو دو پلنگ نما چبوترے بنے ہین اور دیوارون مین کمرون کے دروازون پر سائبان کھدے ہوئے ہین جو مندر کے دریچے کی شباہت رکھتے ہین۔ اور دوسری جگہ بھی دریچہ نما نقش ہین۔ پیچھے کی دیوار مین ایک کمرے کے دروازے کے بائین طرف دو سطرون مین ایک مختصر عبارت کندہ ہے۔

غار نمبر ۱۴

یہ غار ٹیلے مین غار نمبر ۱۳ کے برابر اوپر کو کھدا ہوا ہے اور اسمین جانے کے لئے غار نمبر ۱۲ مین ایک ناہموار سیڑھی بنی ہوئی ہے یہ غار نامکمل ہے اور غالباً بہت بعد کو تیار کیا گیا ہے۔

غار نمبر ۱۵

اسکا برآمدہ بھی مثل ایک خانقاہ کے ہے جسکا دروازہ منہدم ہو گیا ہے اسکے دونو طرف دو کمرے ہین اسکے اندر کا دالان تقریباً مربع اور ہر طرف ۴۳ فیٹ ہے اور اسکی بلندی ۱۰ فیٹ دو انچ کی ہے۔ اسمین ستون نہین ہین لیکن چارون طرف چار چار کوٹھریان ہین۔ اسکی پرستش گاہ مین ایک پہیہ دار چوکی پر بودھ کی مورت چارزانو بٹھائی گئی ہے اور اسمین شیر ببر جتے ہوئے ہین۔ دالان مین دو تراش ثابت ہین اور پیش دالانون کی چھت پر نقش و نگار کے مٹے ہوئے آثار باقی ہین۔

غار نمبر ۱۶

یہ ایک نہایت عمدہ خانقاہ اور بڑی عالیشان تعمیر ہے۔ تمام غارون مین اسکے نقش و نگار قابل دید ہین۔ اسکے تین دروازے ہین ایک بیچ مین اور دو بازؤن پر مع دریچون کے۔ اسکے بڑے دروازے کے دونو طرف دو مربع ستون ہین جنپر عورتون کی مورتین کھڑی ہوئی ہین۔ اسکا دالان ½ ۶۶ فیٹ لمبا ½ ۶۵ فیٹ چوڑا اور ½ ۱۵ فیٹ اونچا ہے اور اسکی چھت مین بیس ہشت پہل کڑیان لگائی گئی ہین۔ اسکے مندر مین سیدھا دالان مین ہو کر راستہ جاتا ہے۔ وہان دونو طرف دو کمرے ہین۔ مندر اور دالان کے درمیان ایک سنگین دیوار ہے مثل چلمن کے جسمین دو کھم ہین۔ مندر مین بودھ کی ایک بہت بڑی مورت ہے جو تعلیم دینے کی وضع مین تراشی گئی ہے۔ اس غار کی تاریخ ۵۰۰ء ہے اسمین چارون طرف بہت سی عبارتین کھدی ہوئی ہین۔ اور اگرچہ بہت سی مورتین یا تو بالکل مٹ گئی ہین یا ٹوٹ گئی ہین لیکن اسپر بھی جو کچھ باقی ہین وہ مشرقی صنعت کا نہایت عمدہ

نمونہ ہین - یہ نمونہ رنگ آمیزی اور نقش و نگار کی خوبصورتی کا نہین بلکہ مورتون کے چہرون پر اصلی حالتون کے نمایان کرنے کا ہے -

غار نمبر ۱۷

یہ خانقاہ نما غار مذکورۂ بالا غار سے بالکل مشابہ ہے اور تقریباً اسی وقت کا کھدا ہوا ہے - ہندوستان کے آثار قدیمہ کے ایک مشہور عالم مسٹر فرگوسن ان دونون غارونکو بہ نسبت دیگر تمام غارون کے زیادہ دلچسپ خیال کرتے ہین - اس غار کے دروازے سے ایک زینہ لگا ہوا ہے جو غالباً کسی ندی تک نیچے گیا ہے - اسمین بودھ کی بہت سی تصویرین اور اٹھارہ کمرے ہین - اسمین بہ نسبت اور غارون کے عبارت تھوڑی ہے اور نقش و نگار بہت ہین خوشی کی بات ہے کہ اسمین بہت سے نقوش ایسے ہین جنکی نقل آسانی سے لیجا سکتی ہے - اس غار کا نام غار منطقہ ہے کیونکہ اسکے برآمدے کے بائین طرف ایک تعجب انگیز دنیا کا گول نقشہ ہے - غار درمیان سے آٹھ حصون مین تقسیم کیا گیا ہے اور ہر ایک حصے مین انسانون کی مختلف وضع کی شکلین کندہ ہین - ۱۸۲۹ء مین اسکے ایک حصے مین ۳۰ شکلین گنی گئی تھین اور ہر ایک شکل پانچ سے سات انچ تک لمبی ہے لیکن اسوقت انمین سے بہت سی مٹ گئی ہین - اس غار مین نہایت عمدہ اور اعلی درجے کی سنگ تراشی ہے - مسٹر برجس نے ایک فہرست لکھی ہے جس مین ۱۹۱ شکلین اور نقوش کی تعداد مندرج ہے - ان مین بہت کم ایسے ہین جو دوسرے غارون کے نقوش سے اختلاف رکھتے ہون -

غار نمبر ۱۸

یہہ غار صرف ایک پیش دالان ہے ۱۹ فیٹ ۴ انچ لمبا اور ۸ فیٹ ۱۰ انچ چوڑا اور اسمین دو ستون ہین - یہ اسلئے بنایا گیا ہے کہ ایک پانی کے حوض کو ڈھانکے اور اسمین سے ہو کر اسکے بازو کے غار مین راستہ جائے -

غار نمبر ۱۹

مندر کے غارون مین یہ تیسرا غار ہے اسکی اندرونی ساخت غار نمبر ۹ و ۱۰ سے مختلف ہے کیونکہ وہ دونو بالکل سادے ہین اور یہ تمام منقش ہے - اسکی لمبائی ۴۶ فیٹ اور چوڑائی ۲۴ فیٹ اور اونچائی ۲۴ فیٹ چھ انچ کی ہے - اسکے بیچ مین صدر کے رخ پر دو علم ہین اور پیچھے پندرہ ستون ہر ایک کھم گیارہ فیٹ اونچا اور اچھا ترا شا ہوا ہے اسکے کونے کے پہلوون مین تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شیر کے سر بنے ہوئے ہین اور مندر کے درمیان بودھ کی مورتین ہین - جنکے اوپر تین پتھر کی چھتریان ایک کے اوپر ایک ہین - اسکی چھت بھی منقش ہے جسمین خوبصورت پھول اور بدھ کی مورتین اور مندر مین اور اسکی دیوارون پر بھی بودھ کی تصویرین ہین اور دروازے اور پیش دالان پر ایسی عمدہ اور مکمل سنگتراشی ہے کہ جسکا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہین - اس مین بودھ لوگون نے اپنی عمدہ سے عمدہ صنعت صرف کی ہے -

غار نمبر ۲۰

یہ ایک چھوٹی سی خانقاہ ہے جسکے برآمدے مین چار ستون ہین اس برآمدے سے چھت مین کڑیان اور شہتیر نکالے گئے ہین - اسمین ایک مورت ہے جسکو بھیل لوگ میت سیندرا ناتھ کہتے ہین اور علاوہ اسکے اس غار مین بودھ کی بہت سی مورتین ہین - دیوارون کی تراش بگڑ گئی ہے اگرچہ اسکی چھت اور عام نقاشی مین سے کچھ کچھ سمجھ مین آجاتا ہے -

غار نمبر ۲۱

یہ غار نمبر ۲۰ سے بہت دور ہے اسکا برآمدہ تمام منہدم ہوگیا ہے لیکن اسکے عمدہ تراشے ہوئے کھم جو برآمدے کے دونو طرف ہین ویسے ہی ہین جیسے غار نمبر ۱ مین ہین ان سے ظا

کہ غالباً یہ بھی ویسے ہی عمدہ نقش و نگار کے ساتھ تیار ہوا تھا جیسا کہ وہ غار ہے۔ دالان کی چھت جو ۱۵ مربع فیٹ کی ہے ۱۲ عمدہ تراش کے ستونون پر ٹھہری ہوئی ہے اور یہ ستون ویسے ہی ہین جیسے نمبر ۲ کے غار مین ہین چھت اور نیز آگے اور پیچھے کے راستون کا نقش اب تک صاف دکھلائی دیتا ہے اسکی نیلاہٹ ویسی ہی تازہ ہے جیسے ایک ہزار برس پہلے تھی اور باقی جو کچھ نقش و نگار تھے وہ سب مٹ گئے ہین۔

غار نمبر ۲۲

یہ چھوٹی سی خانقاہ ۱۶½ فیٹ مربع اور ۹ فیٹ اونچی ہے۔ اسمین چار نامکمل کوٹھریان ہین۔ دریچے وغیرہ کچھ نہین لیکن اسکا دروازہ بہت خوبصورت ہے اور ایک چھوٹا سا دو سیڑھیون کا برآمدہ ہے جسکے دونون کھمب شکستہ ہوگئے ہین۔ اسمین بھی بودھ کی مورت ہے جسکے پیر ایک کنول کے پھول پر رکھے ہوئے ہین اور مندر کی داہنی طرف بودھ کی سات تصویرین کندہ ہین جنکے نیچے اُسکا نام لکھا ہوا ہے اور ہر ایک سطر مین یہ عبارت کندہ ہے۔ ترجمہ

سکھیا بکشو کی فیاضانہ ملاقات کا اقرار .... اسکا معاوضہ .... ماں باپ اور تمام مخلوقات کو ہووے .... جنھین خوبصورتی اور خوش نصیبی بخشی گئی ہے اچھے اوصاف اور آلات .... درخشان .... محافظ روشنی کا .... اسطرح سے خوشنما ہے۔

غار نمبر ۲۳

یہ بارہ ستون کی خانقاہ پچاس فیٹ مربع اور بارہ فیٹ اونچی ہے۔ برآمدے مین چار مکمل ستون ہین اور نیز اُسکے دونون کونون پر پرستش گاہین بنی ہوئی ہین۔ اس غار مین نقش و نگار کا کہین نام نہین۔

غار نمبر ۲۴

یہ ناتمام خانقاہ ۷۵ مربع فیٹ کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسکو وسیع کرنے کا ارادہ تھا لیکن وہ ایسی ہی رہ گئی اگر یہ تیار ہو گئی ہوتی تو یہان کے تمام غارون مین غالباً نہایت خوبصورت ہوتی اس غار سے اسکے کھودنے کا طریقہ ظاہر ہو رہا ہے۔ پہلے اسمین گذاریون سے پتھر کو کھود کے سیدھی گلیان نکالی گئی ہین اور اُسکے بعد ان مقامون کو چھوڑ کر جہان جہان ستون بنانا منظور تھا درمیانی دیوارون کو توڑ دیا گیا ہے۔

غار نمبر ۲۵

یہ تین دروازے کی ایک چھوٹی سی خانقاہ ہے۔ اسکے دالان مین نہ کوئی کمرہ ہے اور نہ کوئی پرستش گاہ لیکن برآمدے کے کنارے پر ایک کمرہ ہے جسکے داہنے اور پیچھے حجرے بنے ہوئے ہین اُسکے سامنے محوطہ ہے جسمین دو محرابین اور ایک دروازہ ہے جو اُسکے بازو کے غار کے کوٹھے پر لیجاتا ہے۔

غار نمبر ۲۶

یہ غار اس سلسلے مین چوتھا مندر اور نمبر ۱۹ اسے بہت مشابہ ہے اسکی ابتدا چھٹی صدی کے وسط سے خیال کیجاتی ہے اسکے نقوش بہ نسبت اجنٹا کے تمام غارون کے بہت زیادہ اور بالکل مکمل ہین اگرچہ وہ ایک ہی قسم کے ہین لیکن تراش کی خوبی مین اُن سے کسیقدر کم ہین اسمین کچھ عبارت بھی کندہ ہے لیکن بالکل مٹ گئی ہے۔ یہان ایک نہایت دلچسپ نقش ہے جو تحقیق کرنے والون کو محو حیرت بناتا ہے۔ اس نقش مین اکثر صورتین بہت خوبصورت بنی ہوئی ہین۔

غار نمبر ۲۷

یہ ایک اخیر خانقاہ ہے جسکا برآمدہ بالکل شکستہ ہوگیا ہے۔ غار کے سامنے ایک بہت بڑا ٹکڑا پڑا ہوا ہے جو مکمل نہین کیا گیا۔ فقط پرستش گاہ کا پیش دالان کھلا ہوا ہے۔ اسکے بائین طرف تین کمرے ہین اور پیچھے دو اور نیز بائین طرف کی باقی جگہ مین ایک کمرا بنا ہوا ہے۔

غار نمبر ۲۸ و ۲۹

پہلے غار سے ایک مندر کی ابتدا ہوتی ہے اسمین ایک بڑی محراب کے بالائی حصے کے سوا جو دریچہ ہے اور وہ بالکل مکمل ہے۔ دوسری کوئی چیز تکمیل کو نہین پہونچی اور دوسرا غار صرف ایک خانقاہ کا برآمدہ ہے پہلے غار مین جانا سخت مشکل اور دوسرے غار مین ناممکن ہے۔

غار نمبر ۱-۲-۶-۹-۱۰-۱۶-۱۷-۱۹-۲۰

ان غارون مین مشہور استرکاری کے نقوش ہین جو چودہ سو برس پیشتر کے خیال کئے جاتے ہین اور جن سے ہندوستان کے اُسوقت کے لوگون کا مذہب اور اُنکی اخلاقی زندگی کے حالات دریافت ہوتے ہین جب یہان بودھ مذہب پھیلا ہوا تھا۔

استھری

کلیات اسمٰعیل ۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی اُردو زبان کے قدیم محسنون مین ہین جنکا مشہور اُردو کورس ان اضلاع کے مدارس مین مدتون جاری رہا اور اب بھی مقبول عام ہے۔ طلبا اُردو کی دماغی نشو و نما مین مولانا ممدوح کی درسی تصانیف سب سے بڑی معین ثابت ہوئی ہین اور شائقہ حال کے بہت سے اُردو خوان اصحاب آپ کے فیضان تعلیم کے ممنون ہین۔ ادبی دنیا مین آپ کی شہرت ایک لاجواب نظم سے ہوئی تھی جو "آثار سلف" کے نام سے موسوم ہے اور جسمین قلعۂ آگرہ کے تاریخی اور عبرت انگیز حالات نہایت مؤثر اور زوردار الفاظ مین نظم کئے گئے ہین۔ بہر نوع ایک اعلیٰ ادیب و شاعر کی حیثیت سے آپکی شہرت بہت قدیم ہے۔ حال مین آپ کا کلیات ایک نفیس اڈیشن مین شائع ہوا ہے جسکی ضخامت ۳۰۷ صفحات ہے۔ اسمین اُردو کی اُن درسی نظمون کے علاوہ جو آپ کے اُردو کورس مین شامل ہین بہت سی لٹریری نظمین بھی درج ہین اور مختلف اصناف سخن پر مبنی ہین۔ طرز بیان نہایت سادہ اور روزمرہ کے رنگ مین ڈوبا ہوا ہے جو آپ کی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی کا پتہ دیتا ہے۔ خصوصاً عورتون اور بچون کے لئے ان نظمون کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ کلیات کے ایک حصے مین آپ کا فارسی کلام بھی درج ہے اور اُسمین بھی سادگی بیان کا التزام موجود ہے۔ کتاب کے آغاز سے پیشتر مصنف کی عکسی تصویر بھی دی گئی ہے جو ادیب مین شائع کی جاتی ہے اور چھپائی مین بھی نفاست کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ قیمت فی جلد غیر مجلد دو روپیہ۔ مجلد عہ جسمین سُنہری حروف مین کتاب کا نام نمایان کیا گیا ہے۔ مذاق حال کے مطابق اس اڈیشن مین انٹروڈکشن (دیباچہ) اور نامور مصنف کے سوانحی حالات کی کسر رہ گئی جو غالباً دوسرے اڈیشن مین رفع کر دی جائیگی۔

مین کون ہون

مرنا بھلا ہے اُسکا جو اپنے لئے جئے
جیتا ہے وہ جو مرچکا انسان کے لئے

جس شخص نے کبھی کوئی پرویکار نہ کیا ہو اور جسنے خود اپنے ہی لئے یا اپنی اولاد ہی کے لئے زندگی بسر کی ہو اُسکا شمار بمصداق شعر مندرجہ عنوان زندون مین کرنا گویا سچے زندون کی توہین کرنا ہے۔ ایسے شخص کی زندگی کے حالات ہی کیا ہوسکتے ہین جو پبلک کے سامنے پیش کئے جائین۔ ایسے لکھو کہا اشخاص دنیا مین پیدا ہوتے ہین اور مرجاتے ہین اور اُنکا کوئی نقش صفحۂ روزگار پر باقی نہین رہتا۔ چنانچہ میرا بھی شمار ایسے ہی لوگون مین ہے اور اسلئے مجھے از حد خجالت ہے کہ باوجود اسکے کہ مین جانتا ہون کہ مین کیا ہون پھر بھی مین اپنے حالات کو خود اپنے قلم سے لکھنے کی جرأت کرتا ہون۔ مجھے امید ہے کہ ناظرین میری اس جسارت کو اپنی دریادلی سے معاف فرمائینگے۔

میرا جنم ۱۸۵۷ء کے غدر کے سال مین ایک متوسط حیثیت کے کایستھ خاندان مین بمقام آگرہ ہوا۔ تعجب نہین کہ ایسے شورش کے زمانہ مین میرا پیدا ہونا ہی میری شوریدگی و کج بختی کا باعث ہوا ہو کیونکہ میری زندگی زیادہ تر انواع واقسام کے مصائب وآلام ہی مین بسر ہوئی ہے۔ میرے دادا ایک بہت ہی سادہ روش اور نیک نفس آدمی تھے۔ اُنکی نسبت مین نے اپنے بچپن مین چند ایسی روایتین سُنی تھین کہ جنپر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک بہت بڑے مذہبی اور برگزیدہ آدمی تھے۔ ایک عجیب وغریب روایت اُنکی نسبت یہ سُنی گئی تھی کہ کسی بنگالی نے جو کلکتے کیطرف کا رہنے والا تھا اور جو کسی سخت عارضہ مین مبتلا تھا یہ خواب دیکھا کہ کوئی شخص اُس سے کہتا ہے کہ ”اگر تو متھرا جاکر فلان شخص کا جھوٹا کھائیگا تو تیرا یہ مرض جاتا رہیگا“۔ چنانچہ وہ پیادہ پا بنگالہ سے متھرا آیا اور میرے دادا کا کسیطرح پتہ لگاکر اس فکر مین ہوا کہ اُنکا جھوٹا کھانا حاصل کرے میرے دادا اُسکو اپنا جھوٹا کھانا دینے پر راضی نہ ہوتے تھے مگر اُسنے کسیطرح دو کرکے ذریعے سے حاصل ہی کرلیا۔ یہ تو معلوم نہین کہ اُسکو مرض لاحقہ سے شفا حاصل ہوئی یا نہین مگر یہ روایت مین نے اپنے چچا کے زبانی سُنی تھی۔ میرے والد بھی ایک بہت ہی مذہبی آدمی تھے۔ برہمنون کے ساتھ اُنکو بہت بڑی عقیدتمندی تھی۔ جیسا کہ علی العموم کایستھ دیوی کے اُپاسک ہوتے ہین میرے خاندان والے بھی قریب قریب سب ہی شاکت مت تھے لیکن میرے والد باوجود اسکے کہ اُنکا اِشٹ دیوی کا تھا اور خاندان بھی سخت شاکت مت تھا سب دیوتاؤن سے یکسان عقیدت رکھتے تھے۔ اُنمین تعصب کی بُو مطلق نہ تھی مہادیوجی کی بھی وہ ویسے ہی پرستش اور ستائش کرتے تھے۔ جیسے وشنو بھگوان کی۔ وہ نہایت ہی نیک صفت نرم مزاج اور اعلیٰ درجہ کے مخیر آدمی تھے۔ گو زیادہ تر حصہ اُنکی خیرات کا برہمنون کے نذر ہوتا تھا۔ بسلسلۂ ملازمت سرکاری جب وہ شاہجہان پور مین تھے میرے مکتب کی رسم اُسی شہر مین

ادا ہوئی۔ اس زمانے مین کایستھون مین مکتب کی رسم ادا ہونیکا یہ طریقہ تھا کہ مولوی صاحب بُلائے جاتے تھے اور تختی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم اور الف با تا لکھکر لڑکے کو پڑھاتے تھے۔ پنڈت وغیرہ نہین بلائے جاتے تھے اور اپنے مذہب کے مطابق سنسکرت یا ہندی وغیرہ کے پڑھانے کا دستور اُس زمانے مین نہ تھا۔ اُس زمانے مین کایستھون مین زیادہ تر فارسی کی تدریس جاری تھی اور گھر کے خطوط وغیرہ سب فارسی ہی مین لکھے جاتے تھے۔ مین نے خود اپنے گھر کے لکھے ہوئے اُنھین خطوط کو جو ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے ایک لمبے کھرے کی شکل مین ہوتے تھے اور جنھین مکتوب کہتے تھے پڑھا تھا۔ شاہجہان پور سے میرے والد کا تبادلہ ہوجانے پر میرا آنا آگرہ کو ہوا اور یہان آنے کے بعد خاص اپنے گھر کے مکتب مین بٹھا دیا گیا۔ اس مکتب مین زیادہ تر اپنے ہی خاندان کے لڑکے پڑھتے تھے اور مولوی فضل الدین ایک معمر آدمی ہمارے پڑھانے پر مقرر تھے۔ مولوی فضل الدین ایک نہایت متقی اور باخدا آدمی تھے۔ روزہ نماز کے سخت پابند تھے اور آخر عمر مین تو قریب قریب دائم الصوم ہوگئے تھے۔ وہ ایک نہایت ہی پاکیزہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے گو دنیوی حیثیت سے وہ ہمیشہ مفلوک الحال رہے۔ مین نے اُنسے فارسی کی ابتدائی کتب کا درس حاصل کیا لیکن چونکہ میرا جانا اپنے والد کے پاس بمقام راے بریلی جہان وہ ملازم تھے ہوا۔ اسلئے جو سلسلہ درس کا شروع ہوا تھا وہ کچھ عرصہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ لیکن پھر مین ایک خاص مولوی صاحب کے سپرد کیا گیا جو گھر پر آکر پڑھایا کرتے تھے اور اسطرح فارسی کی تدریس ایک عرصہ تک جاری رہی۔ جب میری عمر قریب گیارہ یا بارہ سال کے تھی مجھے انگریزی شروع کرائی گئی اور مدرسہ مین داخل کیا گیا۔ مدرسہ مین میری زندگی نہایت خاموشی کے ساتھ بسر ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ مین مدرسہ مین سب لڑکون سے علحدہ رہتا تھا نہ کسی سے دوستی کرتا تھا اور نہ کسی کے ساتھ کھیلتا تھا۔ مجھے یہ بھی خوب یاد ہے کہ ایک زمانے مین ایک بنگالی بابو مدرسہ کی ہیڈ ماسٹری پر مقرر ہوکر آئے تھے۔ اُنسے لڑکے مطلق نہین دبتے تھے اور کوئی دن نہ ہوتا تھا جب لڑکے ہیڈ ماسٹر صاحب سے بغاوت نہ کرتے ہون بلکہ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ کھلونے کے تپنچے لڑکے اُنپر چھوڑتے تھے۔ مگر مین کبھی ان لوگون کے شریک نہ ہوا اور گو کل لڑکے کلاس چھوڑکر دھوم کرتے ہوئے کمپونڈ مین چلے جاتے تھے لیکن مین ہمیشہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا تھا۔ میری ایک عجب خاموشی کی زندگی تھی۔ صرف اپنی تحصیل علم سے کام تھا اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مین ہمیشہ امتحان مین اپنی کلاس مین اول نمبر رہا۔ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد مین میور سنٹرل کالج الٰہ آباد مین شریک ہوا جہان میرے چچا جو مجھپر بہت مہربان تھے ملازمت کے سلسلہ سے مقیم تھے۔ الٰہ آباد مین کالج کی زندگی ویسے ہی خاموشی کے ساتھ بسر ہوئی جیسی کہ اسکول کی زندگی بسر ہوئی تھی۔ میرے چچا کے دوست اکثر میری نسبت یہ کہا کرتے تھے کہ یہ عجیب لڑکا ہے جو نہ کسی سے ملتا ہے اور نہ اپنے ہی ہمعمر لڑکون کے ساتھ صحبت رکھتا ہے۔ غرضکہ بی۔ اے۔ تک میری تدریس کالج مین ہوئی اور اسی زمانے مین مجھے ہندی سیکھنے کا شوق ہوا۔ مین نے بہت جلد ہندی حروف سیکھ لئے اور جو کچھ ہندی کی تحصیل کی وہ خود ہی کی کسی پنڈت کے پاس پڑھنے کے لئے نہین گیا۔ پڑھتے پڑھتے کچھ ایسا محاورہ ہوگیا کہ بہت جلد معمولی ہندی کی کتابون کو پڑھنے اور سمجھنے لگا۔ مگر ابھی تک مذہبی کتابون کے دیکھنے کا موقع نہین

حاصل ہوا تھا۔

مذہب کا رنگ مجھپر ابتدا سے عمر سے چڑھا ہوا تھا۔ جب مین تیسرے دوسرے اور پہلے درجے مین تھا جو اُس زمانے مین اسکول کے اونچے درجے تھے تو مین جنم اشٹمی کا برت نہایت عقیدت کے ساتھ رکھا کرتا تھا کہ مجھے امتحان مین کامیابی حاصل ہو۔ چنانچہ میری یہ عقیدت ہمیشہ بارآور ہوئی کیونکہ مین امتحان مین اول ہی رہتا تھا۔ اُس ابتدائی زمانے مین بھی مین خوشتر کی منظومہ رامائن اور بھاگوت کو نہایت عقیدت کے ساتھ پڑھا کرتا تھا اور یہ کتابین ہمیشہ میرے سرھانے رہا کرتی تھین۔ چونکہ میرے خاندان کے لوگ زیادہ تر شاکت مت تھے اسلئے یہ میرا ویشنوی طریقہ اُنکو خصوصاً میرے چچا کو پسند نہ آتا تھا اور اسلئے وہ اسکے ساعی رہتے تھے کہ مین طریقہ ویشنوی کو چھوڑ کر طریقہ شاکت اختیار کرون۔ کالج مین داخل ہونے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے مجھ مین بدعقیدگی ضرور پیدا ہوگئی تھی اور اسکی وجہ کچھ تحصیل سائنس یا درس فلسفہ انگریزی نہ تھی بلکہ میرے ایک معزز اور محترم بھائی کے لکچرون کا اثر تھا۔ میرے یہ بھائی انگریزی کے بہت بڑے فلاسفر ہین اور نہایت ہی حمیدہ صفات آدمی ہین۔ مگر اُس زمانے مین اُنکے خیالات دہریت سے بھرے ہوئے تھے۔ اُن لکچرون کا اثر مجھپر اسقدر ہوا کہ مین بدعقیدہ ہوگیا اور مذہب کیطرف میری تجسس باقی نہ رہی۔ لیکن جب بہ سلسلہ روزگار میرا آنا حیدرآباد ہوا اور کچھ عرصے کے بعد مجھے چند مذہبی کتب کے دیکھنے کا اتفاق ہوا جنمین سب سے بڑا حصہ مہابھارت کا تھا تو پھر خیالات مین تبدیلی واقع ہوئی۔ مین نے خوب غور کے ساتھ مہابھارت کا مطالعہ کیا اور اُسمین جو فلاسفی بھری ہوئی ہے اور جو اخلاقی باتین اُسمین موجود ہین اُنسے میرے دل مین بہت بڑی تحریک پیدا ہوئی اور ہندو مذہب اور ہندو فلاسفی کی عظمت کا نقش میرے دل پر ہوا۔ اُسکے کچھ عرصہ بعد سوامی وویکانند کے لکچرون کے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان لکچرون کو مین نے نہایت ہی غور کے ساتھ پڑھا جسنے سونے پر سوہاگہ کا کام کیا اور میرا مضبوط عقیدہ سری شنکر اچارج کی تفسیر کے مطابق ویدانت پر قائم ہوگیا۔ اگرچہ میرا عقیدہ پورا ادویت یعنی وحدت الوجود کا ہے اور ایک ہی آتما یعنی ذات مطلق کی ہستی کو مانتا ہون جو نرگن اور نراکار ہے یعنی شخصیت اور صفات کے خیالات سے بالکل مبرا ہے لیکن چونکہ میری طبیعت کچھ جوشیلی واقع ہوئی ہے لہذا مین نے عملاً طریقہ بھکتی یعنی عشق الہی کو اختیار کیا ہے اور اسلئے مین سگن سروپ مین محو رہنا پسند کرتا ہون گو وہ محویت ابھی تک مطلق حاصل نہین ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی اندر سے پریم کی لہرین اُٹھتی ہین اور کچھ دیر کے لئے جوش پیدا ہوتا ہے مگر یہ جوش مثل سوڈا واٹر کے جوش کے اوپر ہی اوپر نکل جاتا ہے۔

چونکہ حقیقت میرا مضبوط عقیدہ ادویت مت سے ہے اسلئے میرے [illegible] دیو شیو शिव ہین۔ لیکن چونکہ مین نے عملاً طر[illegible]تی کو اختیار کیا ہے اور اسی راستہ کو جو سہل ہے اور جو میری طبیعت کے لئے موزون ہے پسند کیا ہے اسلئے مین بھگوان سری کرشن کا عاشق ہون اور جو انتہاء پریم مجھے اُنکے ساتھ ہے وہ الفاظ مین بیان نہین ہوسکتا چونکہ ادویت مت مین شیو گیان کے اور وشنو یا سری کرشن بھکتی کے مرکز ہین اور دونون ایک ہی ایشور کے دو روپ یا ایک ہی ذات مطلق ہین گو روپ اور نام سے علیحدہ علیحدہ ہون اسلئے ان دونون خیالات کا اجتماع کوئی عجیب بات نہین۔

اگرچہ مین نے طریقۂ بھکتی کو پسند کیا ہے تاہم مین کوئی پجاری نہین۔ نہ مین کوئی مورت رکھکر پوجتا ہون اور نہ کبھی مندرون مین جاکر درشن کرتا ہون اور یہ کچھ اسوجہ سے نہین ہے کہ مین پرستش یا مورتی پوجا کا مخالف ہون اور نہ اسوجہ سے کہ مجھے معرفت حق یا دیدار حقیقی حاصل ہوگیا ہے بقول شخصے ـ

نہ دیکھا وہ کہین جلوہ جو دیکھا خانۂ دل مین
بہت مسجد مین سر مارا بہت ساڈھونڈا بتخانہ

مین کہان اور یہ دیدار حق کہان۔ بلکہ اسوجہ سے کہ مین اسکو بھکتی کا ادنیٰ درجہ سمجھتا ہون۔ گو یہ ہو کہ خود مین ہنوز اعلیٰ ترمنزل کو نہین پہونچا ہون۔ اسیطرح میرا پاکھنڈ مت بھی نہین ہے کہ مین اسکو چھوؤن اور اسکو نہ چھوؤن۔ اگرچہ جسمانی طہارت بڑی چیز ہے اور ہونی چاہئے۔ لیکن جب تک روحانی طہارت حاصل نہین محض اسی کو پکڑلینا ٹھیک نہین۔ جو لوگ نفس سے بالکل پاک ہین اور پاک زندگی بسر کرتے ہین مگر ہنوز درجۂ گیان یعنی عرفان کو نہین پہونچے ہین۔ وہ اگر چھونے چھانے یا غذا وغیرہ کا پرہیز کرین تو انکو یہ سب مباح ہے۔ لیکن جب خود اپنا ہی نفس سیاہ ہے تو پھر یہ دیکھنا کہ فلان شخص کیسا ہے فلان غذا کیسی ہے اور کسنے پکائی ہے تمسخر کی بات نہین تو کیا ہے۔ دوہا

برا برا سب کوئی کہے برا نہ جگ مین کوے
جو من ڈھونڈھا آپنا مجھ سا برا نہ کوے

اس سے کہین یہ نہ سمجھ لیا جاے کہ مین ورن آشرم کے قواعد کا پابند نہین۔ یہ پابندی جب تک کہ نور عرفان نہ چمکے یا جب تک ہمین سب کے ساتھ رہنا ہے ضرور ہے اور اسلئے جہانتک ممکن ہے مین بھی پابند ہون۔ مخفی نہ رہے کہ گیان مارگ بھکتی مارگ اور کرم کانڈ ان تینون مین سب سے آسان طریقہ بھکتی ہی کا ہے۔ جنھون نے گیان کے طریقہ کو اختیار کیا ہے انکو بذریعہ انواع واقسام کے سادھنون یعنی ریاضتون کے پہلے نفس پر قابو حاصل کرنا پڑتا ہے اور پھر سوکلپ اور نرو کلپ سمادھی یعنی مراقبہ کے ذریعہ سے یا یوگ کے دیگر طریقون سے برہم ساکشات کار یعنی اپنے مین اور ذات مطلق مین ابھید تا یا توحید کو پیدا کرنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے اور جو لوگ کرم کانڈی ہین انکو سخت سے سخت جاڑے مین بھی ندی یا تالاب یا باؤلی مین غسل کرکے طہارت جسمانی کے بعد سندھیا اور پنچ یگ وغیرہ کے فرائض کو ادا کرنے کی سخت ہدایت ہے جس سے عبادت معبود و کفارۂ گناہ دونون مقصود ہین۔ یہ دونون طریقے سخت کٹھن ہین اور آسان ہے تو بھکتی ہی کا طریقہ ہے جسمین صرف نام کا ورد یا روپ کا دھیان ہی کافی ہے اور اسکے لئے اگر تھوڑی سی بھی جسمانی اور روحانی طہارت ہو تو کافی ہے۔ لیکن اگر بھکتی کو کرم کانڈ مین داخل کردیا جاے تو وہ پھر بھکتی نہ رہی بلکہ کرم کانڈی ہوا۔ بھکتی مین اگر کوئی مشکل بات ہے تو یہی ہے کہ بیوی مین اولاد مین دولت مین جو محبت ہے اسکو ان چیزونسے آہستہ آہستہ ہٹا کر ایشور مین جسکے لئے ہماری سچی محبت ہونی چاہئے لگانا چاہئے یا انکی محبت کو ایشور ہی کی محبت سمجھنی چاہئے۔ لیکن سچ پوچھو تو یہ ویراگ یعنی ترک یا کم سے کم ترک روحانی تینون طریقون مین چاہیئے جسکے بغیر روحانی زندگی ممکن نہین ہے۔

گیان اور بھکتی پر میرے جو متعدد مضامین مختلف رسالون مین شائع ہوئے ہین انکو پڑھکر لوگون کو شاید یہ خیال پیدا ہوا ہو گا کہ مین نے ان سب باتون کو علم الیقین سے لکھا ہے۔ مگر مجھے نہایت شرمندگی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ابھی تک یہ سب زبانی جمع خرچ ہے جسکو

انگریزی مین (Intellectual Conviction) یعنی عقلی تیقن کہتے ہین وہ ضرور حاصل ہے مگر سکہ (Realization) یعنی دھارنا یا عملی علم الیقین کہتے ہین اس سے مین ابھی ہزارون کوس دور ہون لیکن جب علم الیقین ہی نہین تو پھر ایسے عقلی تیقن یا زبانی گیان سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

اگرچہ جانتک اپنی ذات سے تعلق ہے خواہشات کو بالفعل کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر بالقوی اُنکا زور ابھی ویسا ہی موجود ہے۔ یعنی من کے اوپر اُنکا تسلط ہنوز قائم ہے۔ ایسے اشخاص کی نسبت گیتا جی مین یہ ارشاد ہوا ہے۔

कर्मेन्द्रियाणि संयम्य य आस्ते मनसा स्मरन् ॥
इन्द्रियार्थान्विमूढात्मा मिथ्याचारः स उच्यते ॥

یعنی "جسنے اپنے افعال پر تو قابو حاصل کیا ہے مگر جسکے دل پر خواہشات برابر مسلط ہین ایسے ناپاک خواہشات نفسانی کے چاہنے والے کو متھیا چاری یعنی ریاکار کہین گے"۔ پس بھگوان کے ارشاد کے مطابق میرا بھی شمار انھین متھیا چارون یعنی ریاکارون مین ہے اور اُنھین کی کرپا یعنی فضل چاہئے کہ مین اس الزام سے بری ہون۔ لہذا اُنسے میری ہمیشہ یہ التجا ہے کہ :۔

کرو کر پارسائی وو بچن اپنے ہی چرنون مین
بھلا ہے یا بُرا ہے جیسا ہے آخر تمہارا ہے

لیکن جب تک یہ موہ کا جال نہ ٹوٹے یعنی نفس پر قابو حاصل نہ ہو یہ رسائی ممکن نہین۔ مگر یہان تو اسکی امید ہی نہین کہ یہ موہ کا جال کم سے کم اس جنم مین کبھی بھی ٹوٹے گا۔ کیونکہ جیسا کہ مین اپنے ایک مضمون مین لکھ چکا ہون کمزور طبیعت کے آدمی موہ یعنی نفس پر غالب نہین آسکتے اور یہ کمزوری ہی سب سے بڑا پاپ ہے جو دُنیا مین ہے اور اسلئے ایسے لوگ باوجود اسکے کہ اُنکا عقیدہ ادویت ہے اور عمل سے نہین تو عقل سے تو ضرور یہ جانتے ہین کہ وہی خود عین ذات مطلق ہین اور اسلئے وہ تمام پاپون سے مبرا ہین پھر بھی وہ آتم گیان کے نہونے کے کارن اپنے سے الگ ایک ایشور کی ہستی کو مان کر اُسکے چرنون مین اسلئے شرناگت ہونا چاہتے ہین یا اُسکے پریم مین اسلئے ڈوبنا چاہتے ہین کہ وہ گناہون سے صاف و پاک ہون۔

چنانچہ میرا بھی شمار ایسے ہی لوگون مین ہے۔ لیکن دوسرے لوگ کچھ تو اسکی تیاری بھی کرتے ہین یہان یہ بھی نہین۔ گوسائین تلسی داس جی فرماتے ہین۔

ڈاست ہی گئی بیت نشا سب کبھون ن ناتھ نیند بھر سویو۔

डासत ही गई बीत निशा सब कबहुं न नाथ नींद भरि सोयो ।

یعنی بچھونا ہی بچھاتے بچھاتے ساری رات گذر گئی ہے ناتھ مین کبھی نیند بھر نہین سویا۔ جس سے یہ مراد ہے کہ ساری عمر تیاریون مین صرف ہوئی مقصد کبھی حاصل نہ ہوا۔ گوسائین جی نے تیاریون کا تو اقبال کیا یہان وہ بھی نہین ہے پس میرا خدا ہی حافظ ہے۔

اسکو پڑھکر شاید یہ اعتراض کیا جاسے کہ جب یہی حال ہے تو پھر آپ کا یہ وعظ کرنا کیسا یہ آپ کی مضمون نگاری کیا معنی رکھتی ہے بمصداق اسکے کہ خود را فضیحت و دیگران را نصیحت۔ مین صدق دل سے اسکا مقر ہون کہ مین کون اور میری بساط کیا کہ مین کسی کو نصیحت کرون اور جو کچھ مین نے لکھا ہے وہ صرف اُسی کی کرپا یعنی فضل ہے ورنہ میری کیا طاقت کہ مین کچھ لکھون۔

شعر

جو کچھ کہتا ہون مین یہ بھی ترا پرکاش ہے ورنہ۔

کے وقت ہونٹ کھولے یہان ہر شخص ہارا ہے

لیکن [illegible] کہ مجھ پر ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ خصوص فلسفہ ویدانت کی [illegible] کیا اثر ہوا ہے کہ اُس سے میرے دل مین بیساختہ اہل فلسفہ پر مضامین لکھنے کی بہت بڑی تحریک پیدا ہوئی ہے اور ان مضامین کے لکھنے سے [illegible] اسکے کہ اس فلسفہ کی اشاعت ہو اور لوگون کو اُسکے مطالعہ کی ترغیب پیدا ہو خود مجھ ہی کو یہ سب سے بڑا فائدہ ہوا ہے کہ اُنکے لکھنے مین مین نے جو عمیق غور کیا ہے اُسکے ذریعہ سے مین اُن باریک نکتون کو سمجھ سکتا ہون جو پہلے کبھی میرے سمجھ مین نہ آتے تھے۔

اور اسلئے ایک معنی مین ان مضامین کے لکھنے مین مین نے خود اپنے ہی لئے اصلاح کیا ہے۔

میری تصانیف کچھ نہین ہین البتہ چند تالیفات ہین جنمین یہی مضامین شامل ہین جو متعدد رسالون مین شائع ہوئے ہین اور زبان ہندی مین دو ناٹک لکھے ہین۔ ایک دروپدی وستر ہرن اور دوسرا دروپدی کیش بندھن۔ ان دونون ناٹکون مین سبھا پرب سے استری پرب تک کے مہابھارت کے واقعات ڈراما کے طور پر درج کئے گئے ہین اور یہ دونون ناٹک چھپ بھی گئے ہین۔

پربھولال

82335

نہر سوئز کا نظارہ

ہمارے تمام بحری سفر مین ۱۹ ستمبر ایک غیر معمولی تاریخ تھی اُس روز کی دلچسپیان عمر بھر نہ بھولین گی۔ دیکھنے والون کی نگاہین تھک گئین مگر نظارے ختم نہ ہوے۔ تڑکے ہی اُٹھکر مین ڈیک (جہاز مین سب سے اوپر کا تختہ) پر چلا گیا۔ دامن مشرق سے آفتاب کا چہرہ آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔ سمندر کا پانی اور آسمان قریب قریب ہمرنگ تھے۔ نسیم صبح کے انداز بتا رہے تھے کہ ہم کسی ایسے مقام کے قریب آ پہونچے ہین جو قدرت کی دلفریبی کے لحاظ سے اپنا پایہ نہین رکھتا۔ داہنے ہاتھ عرب تھا اور بائین ہاتھ افریقہ۔ دونون طرف اونچے پہاڑ پاسبانی کر رہے تھے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ پاسبانی کے بہانے عیب پوشی کر رہے تھے کیونکہ اُنکی وجہ سے جہاز کے مسافرون کو عرب اور افریقہ کے وہ بدنما ریگستان نظر نہین آتے تھے جہان نہ کچھ سبزی ہے نہ آبادی۔ دن رات خاک اُڑا کرتی ہے۔ سمندر کا پانی بھی کچھ سہولت پر آگیا تھا ورنہ دو روز سے سر پر وہ طوفان اُٹھا رکھا تھا کہ خدا کی پناہ! شاید اس سہولت کی یہ وجہ ہو کہ پہاڑون سے متواتر ٹکرین کھاتے کھاتے اُسکا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ بیچارے ریڈ سی (Red Sea) کو کیا معلوم تھا کہ ابھی سو میل اور کھینچنا پڑے گا۔ ہزارہا سال تک پہاڑون کی گود مین بے فکری کی نیند سویا کیا مگر آجکل غریب کے سینے پر چوبیس گھنٹے یار لوگون کے جہاز چلتے ہین۔ ایشیائی ادا کا تقاضہ تھا کہ ریڈ سی (Red Sea) ایک گوشہ مین تنہا پڑا رہے مگر یورپین تہذیب چاہتی تھی کہ باہمی ربط ضبط بڑھے خوب آمنا سامنا ہو اور دونون اپنے اپنے جوہر دکھائین چنانچہ مغربی ترقی کے سیلاب نے اُس رہے سہے تکلف کا پردہ بھی اُٹھا دیا جو یورپ کو ایشیا سے جدا رکھتا تھا۔ خدا جانے اُس حجاب مین کیا مصلحت تھی اور تھی بھی کہ نہین۔

اسمین شک نہین جب آپسمین کچھ تکلف ہوتا ہے تو

تعلقات مین قدرتی طور پر کچھ خشکی بھی آجاتی ہے۔ مگر جب ملاپ کم ہوتا ہے خشکی جاتی رہتی ہے۔ ناظرین خود غور فرما سکتے ہین کہ جب بیسوین صدی بطرح ملانے پر تلی ہو تو پھر ایشیا اور یورپ کے درمیان خشکی کیونکر قایم رہ سکتی تھی چنانچہ مڈیٹرینین (Mediterranean) نے ہاتھ بڑھایا اور بحر احمر سے ملاقات کرکے سرخروئی حاصل کی۔ اسی ملاپ کا نتیجہ یا یادگار نہر سویز ہے۔

ٹھیک دس بجے دن کو ہمارا جہاز سویز کینل مین داخل ہوا اور بارہ بجے تک وہین قیام کیا۔ جہاز کے ٹھہرتے ہی بیسیون مصری سوداگر کنارے سے چھوٹی چھوٹی کشتیون مین سوار ہوکر جہاز پر آگئے اور اوپر ڈیک پر چڑھ آئے۔ ہر ایک نے اپنا اپنا سامان کھول کر چیزین قرینہ سے سجا دین اور مسافرون کے ہاتھ سودا بیچنے لگے۔ چارون طرف نگاہ ڈالنے سے جہاز کا ڈیک ایک چھوٹا سا مینا بازار نظر آتا تھا۔ دو چار میوہ فروشون کے علاوہ باقی سب بساطی تھے۔ دوکاندار مین بڑے ہوشیار تھے اور چیزین بڑی گران دیتے تھے۔ عام طور پر لوگ تصویر دار خطوط (Picture Post Cards) زیادہ خریدتے تھے مین نے بھی آٹھ آنے کی تصویرین لین اور چھ آنے کے انگور۔ کچھ عرصہ بعد یہ سب سوداگر اپنی اپنی کشتیون مین سوار ہوکر پھر کنارے پر پہونچ گئے۔ اور ساڑھے بارہ بجے کے قریب جہاز بندرگاہ سویز سے روانہ ہوگیا۔

سویز کینل فی زمانہ انجینیری کے کمال کی سب سے شاندار مثال ہے اس موقع پر انسانی دل اور دماغ نے (Nature) کو بڑی کامیابی کے ساتھ چیلنج (Challenge) کیا ہے۔ پچاس سال پیشتر کسکو معلوم تھا کہ افریقہ اور عرب کے لق و دق ریگستان بھی ادب سے ادھر اُدھر ہٹکر جہازون کو راستہ دینگے۔ اس قابل یادگار صنعت کی ایجاد کا سہرا فرانس کے ایک مشہور انجینیر مسٹر لسپ کے سر ہے تہذیب اور تجارت پر اُسنے وہ احسان کیا ہے کہ جسکا کچھ بدلا نہین ہوسکتا۔ فرانسیسی اپنے ہموطن پر جتنا بھی ناز کرین بجا ہے۔ کیا تعجب ہے اگر آج سویز اور سعید کی بندرگاہون پر جا بجا لسپ کے بُت نصب ہین۔

اس نہر کی لمبائی قریب سوا سو میل کے ہے۔ ایک سرے پر بندرگاہ سویز ہے۔ دوسرے سرے پر بندرگاہ سعید۔ چوڑائی سو گز کے قریب معلوم ہوتی ہے۔ دو جہاز برابر برابر نہین چلتے ہین جسوقت جہاز نہر مین داخل ہوتا ہے رفتار بھی بہت کم کردیجاتی ہے یعنی قریب ۵ میل فی گھنٹہ جہاز مین بیٹھکر دونون طرف کے کنارے بہت قریب دکھائی دیتے ہین۔

عرب کے میدان کچھ خوشنما نہین ہین اور ہوتے بھی کیونکر۔ نہ درخت نہ گھاس نہ بستی نہ پانی۔ ریت ہی ریت نظر آتی تھی یا غبار آلود ہوائین۔

البتہ دوسری طرف مصر کے میدانون کا نظارہ سیاحون کی بھٹکتی ہوئی نگاہون کے لئے کچھ دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ بات تو کہان تھی جو ہندوستان کی سرزمین مین چپہ چپہ پر پائی جاتی ہے مگر پھر بھی جو کچھ تھا غنیمت تھا۔ زیادہ تر ایک ہی قسم کے درخت دیکھنے مین آتے تھے جنکو جنگلی سرو کہنا چاہیئے۔ ان درختون کی دوہری قطارین نہر کے کنارے کنارے دور تک چلی گئی ہین اور اپنے طرز پر اچھی معلوم ہوتی تھین باقی زمین پر نہ گھاس ہے اور نہ کھیت البتہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر جھُنڈ کھڑے تھے اور سب سے خوشنما وہ لمبی لمبی گھاس تھی جو نہر کے ڈھلوان کنارون پر اُگی ہوئی تھی اور پانی مین اُسکا بہت خوبصورت عکس پڑتا تھا۔ راستے مین کچھ گانون بھی آئے جو نہر کے کنارے پر آباد تھے۔ مگر ہندوستانی گانون سے بالکل مختلف تھے۔ ہمارے یہان



روضۂ خسرو

التقی پریس الہ آباد

گاؤن کے چارون طرف کھیت ہوتے ہین - ایک آدھ تالاب ہوتا ہے اور گاے بھینس وغیرہ تو کثرت سے نظر آتی ہین مگر یہان سواے لکڑی اور چھپر کے جھوپڑون کے اور کچھ نہین تھا - پالو جانورون مین صرف اونٹ اور گتا دکھائی دئے - نہر کے ریتیلے کنارون پر دیہاتیون کے بال بچے کھیلتے ہوئے بھلے معلوم ہوتے تھے - نہر مین کچھ جہاز ایسے ملے جنمین مٹی کھودنے کی مشینین لگی ہوئی تھین -

راستے مین دو بڑی بڑی جھیلین آتی ہین جنمین سے ہوکر سویز کینل نکلی ہے - جھیلون کا پانی اسقدر شفاف اور ساکت تھا کہ باوجود جہاز کے گزرنے کے بھی اُسکی پیشانی پر بل نہین پڑتے تھے - جہاز مین بیٹھکر سویز کینل سے گزرنا اسقدر سہانا معلوم ہوتا تھا کہ مین دوپہر کے دو بجے سے رات کے دس بجے تک لگاتار بیٹھا ہوا اُس نظارے کا لطف اُٹھاتا رہا - اُٹھنے کو تو طبیعت تب بھی نہین چاہتی تھی لیکن نیند کا وقت تھا اور کچھ سردی معلوم ہونے لگی - اسلئے بستر پر آکر سو رہا -

جس روز سے سویز کینل کی تعریف سُنی تھی اُسی دن سے اُسکے دیکھنے کی تمنا تھی اور جسقدر اشتیاق سے اُسے دیکھا اُسیقدر خوشنما اور دلفریب پایا - اُسکے جمال کی پوری پوری تصویر کھینچنے کے لئے ملٹن کا قلم اور خسرو کی زبان چاہئے - لسپ نے نہر نہین نکالی بلکہ دل نکالکر رکھدیا ہے - اگر حضرت داغ اور غالب اسے دیکھ لیتے تو ضرور اپنے کلام مین اسے تسنیم کی جگہ دیتے اور اسمین شک بھی کیا ہے کہ صنعت مین - دلفریبی مین - حُسن مین اور بانکپن مین سویز کینال فی الحقیقت بے نظیر اور لاثانی ہے - لوگ اسے نہر کہتے ہین مگر مین اسے سحر کہتا ہون اور ایک مین کیا جن آنکھون نے اسے دیکھا ہے نثار ہو ہوگئین ہین - تاہم مصور بے سود اُسکا فوٹو لیتے ہین - دل کے کیمرے پر اُسکا عکس آجاے تو آجائے ورنہ ایسے نقشے کہین کاغذ پر اترتے ہین - ع

ایک تو تصویر اُنکی غیر کی محفل مین ہے
اک ہمارے پاس بھی ہے جو ہمارے دل مین ہے

ا - پ - لندن

روضۂ خسرو - الہ آباد مین خسرو باغ ایک نہایت قدیم اور تاریخی عمارت ہے - سنہ ۱۶۰۰ء مین شہزادہ سلیم (عرف جہانگیر) الہ آباد مین قیام پذیر ہوا اور بعد کو اس صوبہ کا گورنر مقرر کیا گیا - جہانگیر کو اپنے بیٹے خسرو سے سخت کاوش تھی جو ایک راجپوت رانی کے بطن سے تھا - رفتہ رفتہ یہ کاوش اسقدر ترقی کر گئی کہ خسرو کی بدنصیب ماں کو اپنی زندگی وبال ہوگئی اور اُس نے خودکشی کر لی - سنہ ۱۶۲۲ء مین شہزادہ خسرو بھی اپنے سوتیلے بھائی خرم (عرف شاہجہان) کے ہاتھ سے بمقام الہ آباد قتل ہوا تھا - راجپوت رانی نے بھی یہین خودکشی کی تھی اور خسرو کی ہمشیرہ کا بھی یہین انتقال ہوا تھا اور یہ سب کے سب خسرو باغ مین دفن ہین جسکی ایک عمارت کی تصویر اس مقام پر دیجاتی ہے - غالباً یہی وہ مقبرہ ہے جسمین یہ خاندان دفن ہے - لیکن تصویر مقبرہ کا فوٹو نہین ہے بلکہ ایک پرانے مصور دانیال کی صناعی کا نتیجہ ہے -

شمس العلما مولوی ذکاء اللہ مرحوم

رہنے کیا آئے تھے دُنیا مین امیر
سیر کر لی اور اپنے گھر چلے

دُنیا فانی ہے اور اُسکی ہر ایک چیز قانون فنا کے تابع ہے۔ یہ ہستی جو انسان کو اپنے حیرت انگیز کرشمے دکھا کر اپنا فریفتہ بنا لیتی ہے تنکے موہوم سے زیادہ وقعت نہین رکھتی۔ زندگی جسکے لئے آدمی تمام عمر مصائب و تکالیف کا شکار بنا رہتا ہے اسکی حقیقت مٹی کے کھلونے کیطرح ہے۔ انسان حرص و ہوا کا بندہ لاکھ سر مارے۔ کوشش کر کے دولت اکٹھا کرے۔ جاہ و منصب حاصل کرے۔ نام و نمود پیدا کرے لیکن ایک دن اُسے تمام دُنیاوی تعلقات سے منقطع ہوکر دو گز زمین کے سپرد ہونا ہے۔ موت کا زبردست ہاتھ کسی ذی روح کو پناہ نہین دے سکتا اور کوئی اسکے جابر شکنجہ سے نجات نہین پاسکتا۔ یہ وہ قانون ہے جسکا اثر امیر و غریب۔ نیک و بد جوان و پیر سب پر یکسان ہوتا ہے شخصی امتیاز۔ مصلحت وقت اسکے سامنے کوئی چیز نہین اور ہر شخص مجبور ہے کہ پیام اجل کے آتے ہی وہ اس جہان سے رخصت ہو۔ فلسفیانہ نظر سے دیکھا جائے تو موت اور زندگی پر رنج یا خوشی کا اظہار کرنا فضل عبث معلوم ہوتا ہے لیکن کسی فرد اکمل کی موت جسکی ذات بنی نوع آدم کے لئے سرچشمہ فیض ثابت ہو چکی ہو قیامت سے کم نہین ہوتی۔ دُنیا مین روز ہزارون نفوس انسانی کا اتلاف ہوتا رہتا ہے لیکن قابل افسوس صرف اُس شخص کی موت ہوسکتی ہے جسکی وجہ سے ملکی و قومی منافع منصور تھے مرنا برحق ہے لیکن ایسے وجود کا فنا ہونا حد درجہ کی مصیبت شمار کیا جاسکتی ہے جسکی آنکھ بند ہونے سے اسکے قابل قدر کارنامون کا خاتمہ ہوتا ہو۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی کا حسرتناک انتقال اسی قبیل سے ہے۔ آپ کے انتقال کی غیر متوقع خبر سنکر ہندوستان مین ایک سرے سے دوسرے سرے تک ماتم برپا ہو رہا ہے اور حامیانِ اُردو سب کے سب خواہ وہ ہندو ہون یا مسلمان سیاہ پوش نظر آرہے ہین۔ اُردو لٹریچر کی خدمت جس مستعدی اور جانکاہی سے شمس العلماء مرحوم کے معجز نگار قلم سے ابتک ہو رہی تھی آج اُنکا خاتمہ ہوگیا اور اُردو زبان کے اولین محسنون اور سرپرستون کی فہرست سے ایک قابل پرستش نام خارج ہوگیا۔

اُردو زبان کی موجودہ حالت پر جن بزرگون کو عبور حاصل ہے اور جو اُسکے خطرناک پوزیشن سے واقف ہین وہ اس بات کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہین کہ اسوقت شمس العلما مولوی ذکاء اللہ ایسے بالغ نظر اور صائب الرائے کی امداد و مشورت کی کسقدر ضرورت تھی تاکہ عوام پر ظاہر ہوجاتا کہ فروعی اختلافات جو آجکل ملک مین شدومد کے ساتھ پھیلائے جارہے ہین اُنکو مصلحت اندیشی سے رفع کرکے اصولاً زبان اُردو کی بہتری کے وسائل کس خوبی سے مہیا کئے جاسکتے ہین۔ امیر و داغ اور سرشار ایسے خادمان اُردو کی موت پر اشک ماتم بہانے کے بعد ہمین باقی ماندہ اہل قلم بزرگون سے ڈھارس باندھنے کا موقع ملا تھا اور مجروح دل کے لئے یہی خیال مرہم کا کام دے رہا تھا لیکن ایک سال کے قلیل مدت کے

[illegible] مولانا آزاد کے بعد ہی مولوی ذکاء اللہ ایسے ذی علم اور تجربہ کار انشا پرداز کا اپنی جگہ خالی کر دینا پورے طور پر ہمت شکن ہے اور اب غیر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص ذاتی لیاقت و تجربہ کے ذریعے آپ کی جانشینی کا حق ادا کر سکے۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم کے حالات زندگی پر سرسری غور کرنے سے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں جبکا ایک معتدبہ حصہ سرکاری ملازمت کی ذمہ داریون کا بار سنبھالنے کے نذر ہوا کسطرح اسقدر گرانبہا علمی ذخیرہ اہل ملک کے فائدہ کے لئے مہیا کر دیا۔ اسمین شک نہین کہ آپ اُردو زبان کے سب سے بڑے مصنّف اور مؤلف تھے اور آپ کی کُل کتابین مفید مطلب ہونیکے علاوہ آپ کی وسعت نظر اور واقفیت کی ضامن ہین۔ ہم اس مضمون مین معمولی طور پر آپ کی ابتدائی زندگی کا تذکرہ کرکے آپ کے علمی مشاغل پر کسی حد تک تفصیلی نگاہ ڈالنا چاہتے ہین۔ تاکہ ناظرین ادیب کو معلوم ہو کہ اُردو کے اس سب سے بڑے ادیب نے چمنستان اُردو کی آبیاری کس کسطرح کی ہے۔ آجکل جو لوگ ذاتی افکار و قلت وقت کی آڑ مین اپنی زبان کی خدمت سے کوسون دُور بھاگنا چاہتے ہین وہ مولوی صاحب مغفور کے حالات سے سبق لیکر اپنے وجود کو ملکی زبان و ملکی ادب کے لئے سودمند ثابت کر سکتے ہین۔

مولوی صاحب مرحوم دہلی کالج کے اُن متعلمین مین سے ہین جنکے کارنامون سے کالج کا نام ابتک روشن ہے۔ کالج عرصہ ہوا فنا ہو گیا لیکن اُسکے سپوت شاگردون کے ذکر کے ساتھ بے اختیار کالج کا نام زبان پر آجاتا ہے۔ مولوی نذیر احمد۔ شمس العلما آزاد اور مولوی ذکاء اللہ صاحبان تینون دہلی کی خاک سے پیدا ہوئے۔ تینون ایک ساتھ ایک ہی کالج اور ایک ہی کلاس مین داخل ہوئے اور غالباً تینون ایک ہی ساتھ فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ دُنیاوی جھگڑون مین پھنسنے کے بعد بھی ان صاحبون نے ایک حد تک حق رفاقت ادا کیا کہ تینون نے اُردو کی سرپرستی قبول کی اور اپنی بہترین خدمات کے عوض ہر سہ حضرات گورنمنٹ عالیہ کے جانب سے "شمس العلما" کے امتیازی خطاب سے مفتخر کئے گئے۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی جب وہ آپ کالج مین داخل ہوئے۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد آپ اسی کالج مین معلّم ریاضی مقرر ہوئے۔ میرے خیال مین ہر شخص کے لئے یہ امر باعث فخر ہو سکتا ہے کہ جس کالج مین ایک دن وہ طالب علم بنکر آئے اُسمین اپنی ذاتی لیاقت کے وسیلہ سے اُستادی کا درجہ حاصل کرے۔ یہان سے علیحدہ ہونے پر آپ کی ماموری آگرہ کالج مین اُردو لٹریچر کی تعلیم پر ہوئی غرضکہ اِسطرح آپ نے سات سال تک معلّمی کا کام کیا اور اُسکے بعد ۱۸۵۵ء مین ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو کر اضلاع بلند شہر و مرادآباد مین رہے اور گیارہ سال تک اس جگہ پر عمدگی سے کام کرتے رہے۔ ۱۸۶۶ء مین "دہلی نارمل اسکول" کی صدر مدرسی کا عہدہ حاصل کیا۔ تین سال کے بعد آپ کو "اورینٹل کالج" مین لکچراری کی خدمت پیش کی گئی لیکن اسکا چارج لینے سے پیشتر آپ "میور کالج" الہ آباد مین اُردو لٹریچر کے پروفیسر مقرر کر دئے گئے۔ ۱۵ سال تک آپ اس کالج مین انٹرنس سے۔ ایم۔ اے تک کی کلاسون کو عربی و فارسی کا درس دیتے رہے۔ جس خوش سلیقگی و قابلیت سے آپ نے اپنی مختلف خدمات پوری کین اُس سے آپ کی علمیت کا سکہ ملک مین بیٹھ گیا اور آپ کے افسران بالا آپ کے کام سے ہمیشہ مسرور رہے۔

میور کالج کی پروفیسری کی خدمات ایک عرصہ تک قابل اطمینان صورت مین انجام دینے کے بعد آپ نے پنشن لیکر خانہ نشینی اختیار کر لی۔ ۴۲ سال ملازمت سرکاری مین صرف ہوئے اور ۲۴ سال تک وظیفہ سے مستفید ہو کر اہل ملک کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے۔ بزم اُردو مین آپ کی جگہ خالی پڑی ہے اور آپ ہم سے جُدا ہو گئے ہین لیکن آپ کے علمی کارنامے آپ کو حیات جاوید بخشنے کے لئے کافی ہین اور آپ کی اولاد معنوی سے نا معلوم مدت تک آپ کا نام زندہ رہیگا۔

آپ کی تصانیف کا تفصیلی ذکر ایک مبسوط مضمون کا محتاج ہے اور اگر مضمون نگار اُنپر تنقیدی نظر ڈالکر ذاتی راے کا اظہار بھی ضروری سمجھے تو گویا اُسے بجاے خود ایک شرح ومطول تصنیف کے لئے آمادہ ہونا پڑے گا۔ اس جگہ ہم صرف شمار واعداد سے مختصراً آپ کے علمی کارنامون کو نذر ناظرین کرنا چاہتے ہین اُنپر قدردانی کرنے اور التعریض والتقریظ لکھنے کا یہ موقع ہے نہ اُنکی چندان ضرورت ہے کیونکہ ملک کے سربرآوردہ رسایل مین ایک عرصہ تک آپ کی کتابون پر نقادانہ ریویو شائع ہوتے رہے ہین جو مقبولیت عام کا درجہ حاصل کر چکے ہین۔ ان سطور مین انہین خیال کا اعادہ تحصیل حاصل سے زیادہ نہین ہوسکتا۔

کچھ عرصہ ہوا ایک اخبار مین آپ کی تصنیفات وتالیفات کی ایک جامع فہرست مین نے دیکھی تھی وہ اس جگہ نقل کیجاتی ہے۔

سبجکٹ	مطبوعہ	غیر مطبوعہ	جملہ
ریاضیات	۸۱	۶	۸۷
تاریخ وجغرافیہ	۱۷	۱	۱۸
علم ادب	۱۶	×	۱۶
علم اخلاق	۶	×	۶
طبیعات وہیئت	۷	۲	۹
سیاست مدن	۲	۵	۷
	۱۲۹	۱۴	۱۴۳

اس فہرست سے کل کتابون کی تعداد ۱۴۳ پائی جاتی ہے جو کچھ کم حیرت انگیز نہین ہے۔ ۱۸۵۴ء سے لیکر ۱۹۱۰ء کی یہ علمی کمائی ہے۔ گویا بالاوسط فی سال قریب تین جلدون کے ہوتی ہین۔ اب اسمین سے اگر ۳۶ برس ملازمت کے وضع کر دیجئے تو اوسط بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ مولانا شبلی نے حضرت امام غزالیؒ کے حالات مین کسی جگہ آپ کی تصانیف کا روزانہ اوسط نکالا ہے جو شاید چار صفحے ہوتے ہین۔ قریب قریب یہی اوسط مولوی ذکاء اللہ صاحب کی دماغی کوششون کا ہے۔ جو ہندوستان ایسے ملک مین جہان علمی مشاغل کی گرم بازاری ایک عرصہ سے مفقود ہے اور لوگون کی طبیعتین اکتساب علوم کیطرف سے متنفر ہین بیشک ایک عجیب بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُردو مین اسوقت تک کوئی شخص مولوی ذکاء اللہ مرحوم کیطرح کثیر التصانیف نہین گذرا کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کی کتابون مین سے ہر ایک کی ایک ایک جلد کا یکجائی وزن کیا جاتا تو خود آپ کے وزن سے وہ زیادہ ہوتا۔

اس فہرست پر معمولی طور سے غور کرنیکے بعد مصنف کی ہمہ گیر قابلیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ریاضی تاریخ جغرافیہ۔ اخلاق۔ ہیئت۔ پالٹیکس کوئی مضمون آپ کی حد نظر سے باہر نہ تھا۔ اسمین شک نہین کہ آپ کو تاریخ واخلاق سے خاص شغف تھا لیکن انصاف یہ ہے کہ بقیہ اصناف علوم مین سے آپ نے جسپر قلم اٹھایا ہے اُسی میدان کے سوار نظر آتے ہین۔ مین اُن خوش قسمت لوگون مین ہون جنھین مولوی ذکاء اللہ کی بیش بہا کتابون کے مطالعہ کا بیشتر موقع ملا ہے۔ اُردو کی پہلی اور دوسری کتاب سے لیکر جو آپ کے

نظر انتخاب کا بہترین ثبوت ہین۔ تاریخ ہندوستان وغیرہ تک کوئی ایسی نہین جو اپنے نامور مصنف کی ہمہ دانی کے لئے کافی شہادت نہو۔ اختلاف رائے اور چیز ہے اور کسی شخص کو اختیار نہین ہے کہ دوسرے کے خیال کو محض اس سبب سے کم وقعت سمجھ لے کہ اُسکی ذاتی رائے اُس سے جداگانہ ہے لیکن اگر انصاف سے دیکھئے تو جو محنت و کوشش مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم نے اُردو کیلئے کی ہے اُسکے مفید و کار آمد ہونے مین شک نہین۔ اگر کسی جگہ بالفرض کوئی لغزش بھی ہوگئی ہو تو وہ معقول پسند طبقہ مین قابل گرفت نہین قرار پا سکتی۔

آپ کی کتابون مین سب سے زیادہ قابل ذکر تاریخ ہندوستان تاریخ برٹش گورنمنٹ۔ سوانح عمری ملکہ معظمہ وغیرہ ہین۔ اول الذکر ۱۴ ضخیم جلدون مین اور دوسری تین جلدون مین ختم ہوئی ہے۔ مولوی سمیع اللہ صاحب مرحوم۔ سی۔ ایم۔ جی۔ جنکے قومی کامون کا زندہ نمونہ الہ آباد مین محمڈن ہوسٹل موجود ہے اور جو ایک عرصہ تک سرسید مرحوم و مغفور کے مشن کے زبردست حامی رہ چکے ہین اُنکے دوست اور احبا کو شمس العلما ذکاء اللہ صاحب کا خاص طور پر ممنون ہونا چاہئے کہ آپ نے آخری وقت اُنکی سوانح عمری تیار کر دی۔ مولوی سمیع اللہ صاحب بلا شک قومی لیڈر تھے لیکن سرسید سے نقیض ہو جانے کے بعد آپ نے گویا گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور عام طور پر نوٹس مین نہ آتے تھے۔ اسمین کلام نہین کہ اس گوشہ گزینی سے جہان قوم اور ملک آپ کی نفع بخش خدمات سے محروم ہو گیا وہان آپ کے مفید کامون اور سود بخش خیالون کے نتائج بھی مفقود ہو گئے اور خوف تھا کہ کہین آنیوالی نسلین اپنے ایک ذی ہمت محسن کے نام سے بھی ناآشنا نہ رہجائین لیکن مولوی ذکاء اللہ صاحب نے آپ کی لائف لکھکر نہ صرف حق ہوطنی ادا کر دیا بلکہ نوجوانان قوم کے لئے ایک مشعل روشن کر دی ہے جسکے اُجالے مین وہ صراط مستقیم سے ہٹ نہین سکتے۔

سُنا گیا ہے کہ شمس العلماے مرحوم آجکل "تاریخ اسلام" ایسے وسیع مبحث پر طبع آزمائی کر رہے تھے جسکا سلسلہ افسوس ہے کہ آپ کے دم کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کاش آپ کی یہ سعی تکمیل کو پہونچتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس چمن مین آپ کیا کیا گُل نہ کھلاتے اور اُردو کے خزانۂ ادب کو کن کن جواہرات بے بہا سے نہ بھرتے اُمید ہے کہ آپ کے نامور فرزند اُس مسودہ کو خواہ وہ جس حالت مین ہو چھپوا دینگے اور اہل مُلک اُسے اپنی زبان کے ایک سرپرست کی آخری یادگار سمجھکر سر آنکھون پر لینگے۔

مستقل تصنیفات سے اگر قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو آپ کے اُن مضامین کا مجموعہ کئی ضخیم کتابون کے برابر نکلیگا جو آپ نے وقتاً فوقتاً ملکی رسائل و اخبارات کے لئے تحریر فرمائے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ آپ ہندوستان کے تمام سر برآوردہ ماہواری و ہفتہ وار پرچون مین مضامین بھیجتے تھے۔ مین کئی ایڈیٹرون سے ملا ہون اُنمین سے اکثر شمس العلما ذکاء اللہ کے خلق و مروّت کے مدّاح پائے گئے۔ انکا بیان تھا کہ مولوی صاحب کو مضمون بھیجنے کے لئے جب لکھا گیا تو زیادہ تر بواپسی ڈاک آپ نے بھیجا ہے۔ گویا انکار کرنا آپ کو معلوم ہی نہ تھا۔ رسالہ حسن حیدرآباد دکن تہذیب الاخلاق سائنٹفک گزٹ علیگڈھ۔ ادیب فیروزآباد۔ معارف وغیرہ رسالے آپ کے رشحات قلم معجز رقم سے ہمیشہ فیضیاب ہوتے رہے ہین۔ اب یہ پرچے تو موجود نہین لیکن جو نئے نئے رسالے اُنکی جگہ نکلتے رہے ہین اُنکی طرف بھی دست امداد بڑھانے مین آپ نے کبھی کوتاہی نہین کی۔ مخزن۔ زمانہ۔ خاتون۔ علیگڈھ منتھلی مین عرصہ تک آپ کے مسلسل مضامین نکل چکے ہین۔ ادیب مین البتہ کوئی

مضمون آپ کا نہین دیکھا گیا لیکن مجھے امید ہے کہ اگر آپ سے درخواست[ع] کیجاتی تو ممکن نہ تھا کہ آپ مضمون نہ بھیجتے۔

پُرانے اور نئے رسالوں اور اخبارون کی سالانہ جلدون مین اگر کوئی آپ کے مضامین دیکھے تو اُسے آپ کی وسعت معلومات اور واقفانہ انداز کا پتہ چل سکتا ہے۔ تاریخ۔ فلسفہ۔ سائنس کیمیا۔ طرز معاشرت۔ پالیٹکس مشکل سے کوئی سبجکٹ بچا ہو جس پر آپ نے کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔ شمس العلما، حالی مدظلہ کا قول بالکل راست ہے کہ آپ کا دماغ گویا کسی پنساری کی دوکان تھی جسکو جس چیز کی خواہش ہوئی وہان سے مل گئی۔

مضمون نویسی کا شوق آپ کو بالکل ابتدا سے عمر سے تھا۔ دہلی کالج مین لڑکون کی حوصلہ افزائی کے لئے وظائف ملتے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ مرحوم ان وظائف کے زیادہ تر حقدار ٹھہرتے تھے۔ وہ تمغے "ہائی پروفشنسی" کے بھی آپ کو وہان سے ملے۔ کالج سے جو علمی شوق آپ لیکر باہر نکلے تھے وہ ہمیشہ قائم رہا۔ جسوقت آپ سررشتہ تعلیم مین ڈپٹی انسپکٹر تھے اُسوقت آپ کو بصلہ خدمات تعلیم نسوان منجانب گورنمنٹ خلعت مرحمت ہوا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو ۱۹ سال کی عمر سے علمی شوق تھا اُس زمانے مین آپ جو مضامین لکھکر اخبارون اور رسالون مین بھیجتے تھے اُنمین کسر نفسی سے اپنا نام درج نہ فرماتے۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ حقیقت پسند لوگ نمایش سے کسقدر گریز کرتے ہین۔ ایک ہم ہین کہ اگر ایڈیٹر صاحب کسی غلطی سے ہمارا نام مضمون کے تحت مین لکھنا بھول جائین تو گویا اُنسے ناقابل عفو خطا سرزد ہوئی ہے۔

اکثر اہل قلم اس بات کے شاکی پائے گئے ہین اور اُنکا تذکرہ تاریخون مین موجود ہے کہ اُنکی زندگی مین اُنکی تصانیف کی قدر نہین کی گئی۔ مولوی ذکاء اللہ ہندوستان کے اُن خوش قسمت بزرگون مین ہین جنکی کتابین اُنھین کے سامنے ملک سے مقبولیت کی سند پا گئی ہین اور نہ صرف پبلک نے اُنھین ہاتھون ہاتھ لیا ہے بلکہ سرکار نے بھی عزت افزائی سے دریغ نہین فرمایا۔ آپ کی کُتب ریاضی و طبیعات الہ آباد و پنجاب کی یونیورسٹیون مین بہت عرصہ تک شامل کورس رہ چکی ہین۔ اُردو کتابون کا ایک سلسلہ جو حلقہ بندی مدارس کے لئے آپ نے ترتیب دیا تھا ایک مدت دراز تک رائج رہکر دو چار سال پیشتر موقوف ہوا ہے۔ سلسلہ ریاضیات کے لئے برٹش گورنمنٹ سے آپ کو پندرہ سو کا بیش قرار انعام عطا ہوا اور "خان بہادر" و "شمس العلما" کے معزز خطابات سے مخاطب کئے گئے۔

آپ کے اخلاق و عادات کی نسبت صرف اسقدر عرض کردینا کافی ہے کہ روشن خیال اور تعلیم جدید کے حامی ہونے کے ساتھ ہی آپ پُرانی وضع کے پابند تھے۔ خلق و ہمدردی آپ کا خاص شیوہ تھا۔ سرسید کے آپ قدیمی رفیق تھے۔ ایک مرتبہ سرسید کے انتقال پر آپ سرسید میموریل فنڈ ڈیپوٹیشن کے ہمراہ لاہور تشریف لے گئے اور ۱۹۰۵ء مین اسلامیہ مدارس کے معلمین کی جو کانفرنس علیگڈھ مین منعقد ہوئی تھی اُسکے آپ پریسیڈنٹ تھے۔

افسوس ہے کہ فضل و کمال کی یہ زندہ تصویر اب ہماری نگاہون سے پوشیدہ ہے۔ اس قحط الرجال کیوقت ایسے کامل الفن۔ مشاق اور تجربہ کار ہمدرد قوم کا اُٹھ جانا بدنصیبی کی علامت ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ اُنکی روح کو اُس دُنیا مین جہان ایک دن سب کو جانا ہے اور جہان سے کوئی پلٹکر نہین آتا راحت اور اُردو کی سوگوار دُنیا کو صبر حاصل ہو۔

سید محمد فاروق

ع‍ه درخواست مین تامل نہین کیا گیا لیکن آپ کے اس جواب سے کہ "اب مین موت کیطرف جا رہا ہون" زیادہ اصرار کی جرأت نہین ہوئی۔ ایڈیٹر

ادیب



سیر دریا

انڈین پریس الہ آباد

سالِ نَو

مرحبا ہے آمدِ فصلِ بہارِ سالِ نو — شکر ہے آخر ہوا اب انتظارِ سالِ نو
سال بھر میں کلبۂ احزاں میں آتا ہے فقط — روزِ اول سے یہ دائم ہے شعارِ سالِ نو
قرن اپنی وضع میں آسنے نہیں دیکھی — ہے اسی باعث سے قائم اعتبارِ سالِ نو
دیکھئے کس شان سے ہوتا ہے جلوہ نما — دل میں گھر کرتی ہے طرزِ گفتگوئے سالِ نو
اسمیں ہے شامِ اودھ صبحِ بنارس کا مزا — کسقدر دلچسپ ہیں لیل و نہارِ سالِ نو
نیلگوں اسکی قبا ہے اور یہ ہے سبز پوش — ہیں زمین و چرخ دونوں کامگارِ سالِ نو
ہو مبارک اہلِ عالم عید نوروزی تمھین — مژدہ آسایش کا ہے صوتِ ہزارِ سالِ نو
ہے نوید عیش ہر محزون غمگین کے لئے — پھونکدیگا خرمنِ کلفت شرارِ سالِ نو
بٹ رہا ہے جام صہبائے مسرت کا سرور — بیخود و بدمست ہے ہر ہوشیارِ سالِ نو
اللہ اللہ آج رنگِ گلستان کچھ اور ہے — نور سے معمور ہے یکسر دیارِ سالِ نو
شاہدِ گل کی یہ رعنائی غضب ہے قہر ہے — منو فگن ہے اسمیں در پردہ نگارِ سالِ نو
کون کہتا ہے کہ شبنم کے ہیں قطرے گھاس پر — ہان مگر بکھرے ہیں دُرِّ شاہوارِ سالِ نو
دیکھکر پانی کی لہرین لبین آجاتی ہے موج — یہ لبالب حوض ہیں آئینہ دارِ سالِ نو
کس ادا کے ساتھ بلبلین لپٹی ہین اشجار سے — کیا یہ جوشِ شوق مین ہین ہمکنارِ سالِ نو
کھلتے پھرتے ہین ہوا کی زد سے پھولونکے ورق — یا زرِ گل کوئی کرتا ہے نثارِ سالِ نو
تو ہی کر انصاف ساقی آج پیکر کیا کرون — بے پیئے ہون مین تو سرمستِ خمارِ سالِ نو
بادۂ انگور سے مدت ہوئی توبہ کئے — پیتے ہین جامِ محبت میگسارِ سالِ نو
دوستون پر امن و راحت کی فراوانی رہے — پھول انکے واسطے بن جائے خارِ سالِ نو
گلشنِ ہندوستان سرسبز ہو شاداب ہو — اسکی خوش حالی پہ ہے یعنی مدارِ سالِ نو
یہ دعا ہے جارج پنجم ہمپہ ہون سایہ فگن — ہے انھین کی ذات سے نقش و نگارِ سالِ نو
سالِ نو کا جیسا آغاز ہے تسکین بخش — یا الٰہی ہو یونہین انجام کارِ سالِ نو

ہو گل مقصود کا گردون میں دار ابکے برس
شادمانی سے گزر جائے بہار ابکے برس

سید محمد فاروق رشتہ عمر چہرہ

سیرِ دریا

سیرِ دریا۔ لطفِ کشتی۔ اور گھٹا چھائی ہوئی
بڑھ چلی حد سے جوانی جوش پر آئی ہوئی

دستہائے گل سے کشتی کو بنا کر مہدِ گل
لیچلا تفریح کو عہدِ شباب اور عہدِ گل

عاشق و معشوق باہم سیر کرنے کو چلے
آشنایانِ محبت ڈوب مرنے کو چلے

\+ + + + +

کیا سرور افزا نشاط انگیز چھائی ہے گھٹا
بوندیان پڑتی ہین یا کیوڑا چھڑکتی ہے گھٹا

بوئے گل کے مختلف کپڑے بدلتی ہے نسیم
پنکھیان پھولونکی گویا منہ پہ جھلتی ہے نسیم

لیتی ہے نظارہ ہر برگ مین لذتِ نگاہ
چاٹتی ہے سبزۂ شاداب پر امرت نگاہ

جسطرح دریا مین موجون سے کوئی کشتی نشین
کھیلتا ہو ڈالکر پانی مین دستِ نازنین

کشتی چشمِ طراوت آشنا سے کو بکر
تیرتی ہے سبزۂ مواجِ ساحل پر نظر

دور۔ کوسون دور جاتی ہے فضائے آب مین
ڈبکیان کھاتی ہوئی امواج اور گرداب مین

\+ + + + +

تیرتی ہین وہ بطین گرتی ہین وہ مرغابیان
اور وہ کشتی مین بیٹھا جا رہا ہے اک جوان

نوبہار آئی ہے پارۂ لو خیز بھی پہلو میں ہے
آدمی کے ایک دریائی پری پہلو میں ہے

ہائے وہ مستانہ انداز اور وہ رغبت کی نگاہ
وہ گلابی آنکھ وہ نشہ میں متوالی نگاہ

بیخودی میں بڑھ کے تو اس عاشق دلدار کے پیار سے
اور وہ سینہ پہ اُسکے سر جھکائے پیار سے

عالم خلوت ہے اور معشوق در آغوش ہے
لطف سیر و لطف وصل و لطف نا و نوش ہے

\+ + + + + + +

اے ہوس آلودہ! اے لذت کش آغوش یار
چین ہی چین اب تو لکھتا ہے ترا نامہ نگار

چین ہے کیا۔ درحقیقت چین اسکا نام ہے؟
کیا شباب چند روزہ کا یہی اک کام ہے؟

عیش کہتا ہے!۔ اے !! نہ سمجھا تو مفہوم عیش
تیرتی ہے بحر غم پر کشتی موہوم عیش

تیری کشتی گرچہ او کشتی نشین جاتی ہے تیز
کشتی عمر رواں اس سے کہیں جاتی ہے تیز

بس ہوا و حرص کی موجوں کو اپنے ساتھ روک
ٹھہر۔ کشتی پھیر۔ ہٹ چھوڑ اپنے ہاتھ روک

زور طوفاں ہے کہیں گرداب میں تو آ نہ جائے
دیکھ ساحل سے کہیں کشتی تری ٹکرا نہ جائے

ہے حباب بحر کے مانند انجام حیات
ایک غوطہ کھاتے ہی لبریز ہے جام حیات

اے حباب بحر۔ اے پروردۂ آغوش موج
تیری ہستی اک جنازہ ہے رواں بر دوش موج

لذت گہوارہ ہے جس کی تجھے ہر لہر میں
ایک تختہ بھی نہ اُبھرا ڈوب کر اس بحر میں

دیکھ ہوتی جا رہی ہے اب گھٹا تاریک تر
اور جھونکے آمد طوفان کی دیتے ہیں خبر

روک ہٹ پھیر رخ کشتی کا ناداں لوٹ آ
جان دینے کو نہ جا اے دشمن جاں لوٹ آ

دیکھ تیرے ساتھ خطرے میں ہے تیرا ہمنشین
آہ تو اس نازنین کو بھی نہ لے ڈوبے کہیں

تو نہیں سنتا کسی کی۔ خیر۔ جاتا ہے تو جا
اپنی بربادی کی کرنے سیر جاتا ہے تو جا

جا پر اس آغاز اُلفت کا بخیر انجام ہو
تیرا بیڑا پار ہو۔ ساحل پہ تجھکو شام ہو

نادر علیخان نادر (کاکوروی)

کلامِ اکبر

اظہار اس معنیِ نازک کا الفاظ کی حد سے باہر ہے
ہر چیز کے سمجھ ہے گرد اُسکے جو حد خرد سے باہر ہے

جنھیں نہیں فکر آخرت کی یہ بن سنور کر اُدھر گئی ہے
اسی سبب سے عروس دنیا مری نظر سے اتر گئی ہے

اظہار مصیبت میں اکبر تجھے کیوں اتنی کد ہے
اب بہر خدا چپ ہو رونے کی بھی اک حد ہے

جانتا ہوں ہو رہا ہے جو نہ ہونا چاہئے ... بحث یہ ہے کب تلک اس غم میں رونا چاہئے

بے زور نمود کا اثر کیا ہے ... جب مغز نہیں تو لفظ سر کیا

آمادگی تو میری رہی ہر گناہ پر ... فضل خدا سے بت ہی نہیں آئے راہ پر

وضعِ مغرب سے مجھے کچھ بھی تسلی نہ ہوئی — ناز تو بڑھ گئے دولت کی ترقی نہ ہوئی
یورپ مین گو ہے جنگ کی قوت بڑھی ہوئی — لیکن فزون ہے اُس سے تجارت بڑھی ہوئی
ملک بنین لگا سکین وہ توپ ہر جگہ — دیکھو مگر پیرس کا ہے سوپ ہر جگہ
دو الفوان ہے سوا بیدارکن انجمن کی سیٹی ہے — اسی پہ شیخ بیچارہ نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

کہان باقی رہے ہم مین وہ اورادِ سحر گاہی
وظیفے کی جگہ یا پائنیر[عہ] یا آئی ۔ ڈی ۔ ٹی ہے

کلام چکبست

پہنچے تہذیب کو کشتیِ نو ایجاد سے — خدمتِ آبِ روان لیتا ہے انسان باد سے
جو بلبلِ ہمزبان کچھ قوتِ تقریر پیدا کر — بیان مین تازگی الفاظ مین تاثیر پیدا کر
قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بیکار ہے — طرزِ ہندو دیکھکر ۔ رنگِ مسلمان دیکھکر
دیدنی ہے بیخودی دارفتگانِ شوق کی — ہنس رہے ہین خود بخود چاکِ گریبان دیکھکر
انتشارِ قوم سے جاتی رہی تسکینِ قلب — نیند رخصت ہو گئی خوابِ پریشان دیکھکر
یادگارِ عالمِ وحشت ہے تہذیبِ جنون — آبلے پیدا کئے خارِ بیابان دیکھکر
اب وہ اندیشہ قفس کے کچھ ہمین الفت نہین — بے پروبالی سے اپنی عاشقِ صیاد ہین

غزل

دل ہی بجھا ہوا ہو تو لطفِ بہار کیا — ساقی ہے کیا شراب ہے کیا سبزہ زار کیا
یہ دل کی تازگی ہے وہ دل کی فسردگی — اس گلشنِ جہان کی خزان کیا بہار کیا
کس کے فسونِ حسن کا دنیا طلسم ہے — ہین لوحِ آسمان پہ یہ نقش و نگار کیا
اپنا نفس ہوا ہے گلو گیر وقتِ نزع — غیرون کا زندگی مین ہو پھر اعتبار کیا
دیکھا سرورِ بادۂ ہستی کا خاتمہ — اب دیکھین رنگ لائے اجل کا خمار کیا
ابھی تو شامِ غم کی سیاہی کچھ اور ہے — منظور ہے تجھے مرے پروردگار کیا
دنیا سے لے چلا ہے جو تو حسرتون کا بوجھ — کافی نہین ہے سر پہ گناہون کا بار کیا
جسکی قفس مین آنکھ کھلی ہو مری طرح — اُسکے لئے چمن کی خزان کیا بہار کیا
کیسا ہوائے حرص مین برباد ہے بشر — سمجھا ہے زندگی کو یہ مشتِ غبار کیا
خلعت کفن کا ہم تو زمانے سے لے چلے — اب ہے عروسِ مرگ تجھے انتظار کیا
بعدِ فنا فضول ہے نام و نشان کی فکر — جب ہم نہین رہے تو رہے گا مزار کیا
اعمال کا طلسم ہے نیرنگِ زندگی — تقدیر کیا ہے گردشِ لیل و نہار کیا
چلتی ہے اس چمن مین ہوا انقلاب کی — شبنم کو آسرا دامنِ گل مین قرار کیا
تفسیرِ حالِ زار ہے بس اک نگاہِ یاس — ہو داستانِ درد کا اور اختصار کیا
دونون کو ایک خاک سے نشو و نما ملی — لیکن ہوا و برسے گل کیا ہے خار کیا
چھٹکی ہوئی ہے گو غریبان پہ چاندنی — ہے بیکسون کو فکرِ چراغِ مزار کیا
کچھ گل نہان ہین پردۂ خاکِ چمن مین بھی — تازہ کریگی ان کو ہوائے بہار کیا
راحت طلب کو درد کی لذت نہین نصیب — تلوون مین آبلے جو نہین لطفِ خار کیا
خاکِ وطن مین دامنِ مادر کا چین ہے — تنگی کنار کی ہے لحد کا فشار کیا
انسان کے بغض و جہل سے دنیا تباہ ہے — طوفان اُٹھا رہا ہے یہ مشتِ غبار کیا

برج نراین چکبست

بیان آرزو

یاالٰہی کیا ہوئی وہ میری شانِ آرزو — اب کہان باقی رہی وہ این و آنِ آرزو
وہ مری شامِ تمنا ۔ وہ مری صبحِ اُمید — وہ مرے اوقاتِ فرصت وہ زمانِ آرزو
اشتیاقِ منزلِ مقصود جوشِ اضطراب — وسعتِ وحشت خیال و کاروانِ آرزو
وہ تبسم خیز موجین بحرِ حسنِ فکر کی! — کشتیِ دل اور اُسپر بادبانِ آرزو
کامیابی کی وفورِ شوق مین خوش منظری — جو مدارِ زندگی تھی اور جانِ آرزو
سازگاریِ مقدر کا وہ لطفِ انتظار — یعنی اک کیفیتِ رازِ نہانِ آرزو
ہان مگر محرومیِ قسمت کا تھا اک انتخاب — اک متاعِ داغ ہے سود و زیانِ آرزو

عہ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف

آہ اِس ناکامیِ جاوید نے کیا کر دیا

ہو کے سب برباد رہ گیا اک ناتوانِ آرزو

آگئی بزمِ تمنا پر قیامت آگئی　　گر پڑا ہے ٹوٹ کر اک آسمانِ آرزو

انتہائے یاس نے سکتہ کا عالم کردیا　　خوش بستانِ تحیّر ہے جہانِ آرزو

کیسی کیسی حسرتون کا خون ہوا ہے کیا کہون　　شرحِ درد و غم ہے میری داستانِ آرزو

وہ اُمیدین۔ وہ اُمنگین۔ وہ تمنائین وہ شوق　　دل سے کیونکر مٹ گیا اک اک نشانِ آرزو

نامرادی نے کیا ہے اسقدر پستی نصیب　　وہم سے بھی ہو گیا بالا گمانِ آرزو

دائمی افسردگی چھائی ہوئی ہے ہر طرف　　بنگیا جوشِ طرب بھی ہم عنانِ آرزو

خارزارِ حسرت و حرمان دلِ پژمردہ ہے　　ہوگیا صرفِ خزان یہ بوستانِ آرزو

اس ہجومِ یاس مین بھی اسے دلِ خیابہ کش

اور باقی ہے ابھی کچھ امتحانِ آرزو

آہ عالم ناامیدی کا بھی کیا تاریک ہے　　اب کہان وہ پرتوِ حسنِ عیانِ آرزو!

اب کہان وہ دلفریبی اور وہ دلبستگی　　اب کہان وہ دلکشیِ جادوانِ آرزو

خانۂ خالی مین ویرانی ہے کیا چھائی ہوئی　　ہاے میرا دل کبھی تھا میزبانِ آرزو

نارسائیِ مقدر سے مٹا جاتا ہے یہہ　　آہ۔ شوق جبہ سائے آستانِ آرزو

کردیا تصویرِ حیرت فرطِ حسرت نے مجھے　　اب کہان وہ گرمیِ حسنِ بیانِ آرزو

سوزشِ پنہان کا لب تک آنہین سکتا گلہ　　شمع کے مانند جلتی ہے زبانِ آرزو

پھر بھی اس لطف خلش کو کیا کہون کیا کچھ ہے　　دلمین چبھ کر رہ گئی نوکِ سنانِ آرزو

مرتے مرتے بھی نہین جاتی ہین یہ دلچسپیان

ایسے لذت گیر ہین دلدادگانِ آرزو

ناامیدی مین بھی ہون امیدوارِ آرزو　　آہ۔ کچھ پوچھو نہ ذوقِ انتظارِ آرزو

دیدے یارب پھر وہی لیل و نہارِ آرزو　　گردشِ ایام لادے روزگارِ آرزو

پھر کہین سے مجھکو ملجائے مرا عہدِ عتیق　　جسنے دے رکھا تھا مجھکو اقتدارِ آرزو

اخترِ قسمت چمک جائے پھر آئین میرے دن　　نور افگن ہو وہی شمس النہارِ آرزو

پھر ہری ہوکر پھلے پھولے مری کشتِ اُمید　　گلشنِ دل مین پھر آجائے بہارِ آرزو

پھر مرے دل مین تمناؤن کی ہو بزمِ نشاط　　پھر وہی جوشِ طرب جو ہے شعارِ آرزو

پھر وہی سرمستیِ وجدانِ بزمِ بیخودی　　پھر وہی جامِ شرابِ خوشگوارِ آرزو

یاد ہین وہ ابتدائے شوق کی کیفیتین

چاہتا ہون پھر وہی ارشدؔ خمارِ آرزو

ارشد تھانوی

جلوۂ روح

اے شریکِ رنج و راحت۔ اے نشاطِ زندگی　　تجھسے وابستہ ہے میری انبساطِ زندگی

باغِ ہستی مین تجھی سے ہے بہارِ زندگی　　تیرے دم سے ہے شگفتہ لالہ زارِ زندگی

حکمِ خلاقِ ازل سے تو ہوئی ہے جلوہ گر　　راز مخفی ہے نہین واقف کوئی جن و بشر

حسنِ قدرت کا تماشا بھی ہویدا تجھسے ہے　　ہستیِ عمرِ دوروزہ کا بھی جلوا تجھسے ہے

تو کہین ہے شمع کی صورت کہین پروانہ ہے　　واہ کیا دلکش ترا اندازِ معشوقانہ ہے

زندگانی کا تجھی پر ہے فقط دار و مدار　　گلشنِ ہستی مین تیرے دم سے آئی ہے بہار

پیکرِ ہستیِ انسان نقطۂ موہوم ہے　　تو نہین تو یہ وجودِ بے بقا معدوم ہے

— + —

ہے وہ خلاقِ جہان وہ واقفِ رازِ نہان　　جسکی قدرت کے کرشمون نے کیا تجھکو عیان

پھیلی ہے چارون طرف حسنِ ازل کی روشنی　　ہے اُسی کے ایک پرتو سے یہ تیری روشنی

حسنِ قدرت کا عجب نقشہ نظر آیا مجھے　　قالبِ خاکی مین کیا جلوہ نظر آیا مجھے

— + —

نخل پیرائے ریاضِ جسمِ انسانی ہے تو　　یا نسیمِ جان فزائے باغِ رحمانی ہے تو

دم کے دم مین برق کی صورت چمک جاتی ہے تو　　قالبِ خاکی سے اک پل مین نکل آتی ہے تو

تو قفس مین حکمِ باری سے مقید ہوگئی　　ورنہ تو اس جسمِ خاکی مین نہین رہتی کبھی

ہے ترے انوار سے روشن مری شمعِ حیات　　ہے معطر تیری نکہت سے ریاضِ کائنات

جلوۂ قدرت نمایان شانِ یکتائی سے ہے　　پیکرِ ہستیِ انسان تیری رعنائی سے ہے

— + —

اے بہشتی حور اے گلزارِ جنت کی مکین   اے مری روحِ رواں - اے طائرِ خلد آشیاں
اے گلستانِ جہاں کی عندلیبِ خوشنوا   ہے فلک تیرا نشیمن - آشیاں عرشِ علا
عالمِ فانی میں لیکر عیش و راحت کے مزے   لوٹتی ہے تو بہارِ باغِ جنت کے مزے

اوج سمجھا تھا تجھے شمعِ شبستانی ہے تو
اب کھلا برقِ جہاں سے بڑھ کے سیلانی ہے تو

حافظ محمد یعقوب اوج

ساقی بریز بادہ و ساغر بگردش آر   دن رات کا یہ ورد تھا عہدِ شباب میں
آتی کبھی نہ نیند فسانہ سُنے بغیر   پلتی تھی روح نغمۂ چنگ و رباب میں
قبلہ تھا یار کعبہ ما جت تھا میکدہ   تھی بہتی پھرتی کشتیِ ایمان شراب میں
تہ کر کے رکھ دیا تھا مصلے کو طاق پر   ہنستے تھے سُن کے فرق عذاب و ثواب میں
ناصح کے وعظ و پند پہ کرتے تھے مضحکہ   دیکھا کبھی نہ کیا ہے خدا کی کتاب میں
افسوس آج ہم ہیں اکیلے تہِ مزار   سب چھُٹ گئے جو یار تھے دیرِ خراب میں
اب یہ اندھیری قبر ہے اور ہم اسیرِ غم   کیا پوچھتے ہو روح ہے کیسے عذاب میں

ممتاز جونپوری

گورِ غریبان کا پرنس

کل سو گیا میں فکرِ عذاب و ثواب میں   ویرانہ ایک مجھکو نظر آیا خواب میں
گو دیکھنے میں تھا وہ بیابان ہولناک   تھیں بستیاں زمین کے نیچے حجاب میں
تھے سے کے پتلے خاک کی بالین پہ سر دھرے   لیٹے تھے مُنہ چھپائے ردائے تراب میں
یوں سنگ ریزے خاک پہ تھے منتشر تمام   جیسے ہوں داغِ غم دلِ خانہ خراب میں
سر دُھن رہے تھے آکے بگولے مزار پر   اُٹھ اُٹھ کے گرد بیٹھتی تھی اضطراب میں
طائر بھی اس جگہ پہ بسیرا نہ لیتے تھے   وحشت مکین تھی خانۂ بوم و غراب میں
حسرت برس رہی تھی غریبوں کی قبر پر   چلاتی تھی زمین کہ میں ہوں عذاب میں
تھے کچھ مزار جنسے نکلتی تھی یہ صدا   ہر چیز بے ثبات ہے دیرِ خراب میں
ملتا نہ تھا کوئی کہ جسے پوچھیں یہاں کا حال   حیران میں کھڑا تھا عجب پیچ و تاب میں
ناگاہ اک جوان مجھے آگیا نظر   دنیا سے اُٹھ گیا تھا جو عہدِ شباب میں
صورت عدو اس خاک میں بالغیر اٹی ہوئی   چہرہ نہفتہ گرد کی ہلکی نقاب میں
پوچھا یہ میں نے کچھ تو بتا اپنی سرگزشت   کیوں دیکھتا ہوں تجھکو میں اس انقلاب میں
عزبال تیرا مصحفِ رُخ ہو گیا تمام   کیڑے یہ کیسے لگ گئے ساری کتاب میں
تھی بتیس مل کے دانت ترے ہوگئے خراب   افسوس فرق آگیا موتی کی آب میں
کچھ آبدیدہ ہوکے جو میں نے کیا سوال   مغموم دل سے اُسنے کہا یہ جواب میں
اک دن وہ تھا کہ زینتِ بزمِ طرب تھے ہم   رندوں کے جھگڑے تھے ہماری جناب میں

نوحۂ حیات

مار ڈالا حسرتوں کے غم نے آخر ہمیں   چند دن میں ختم ہے اپنا بھی دورانِ حیات
گھٹ گیا زورِ جوانی ہو گئے اعضا ضعیف   کون اب سر پہ اٹھائے بارِ احسانِ حیات
خیریت سے جیتے جیتے ہو گئے چالیس سال   اب کہاں وہ روز و شب کہئے جنھیں جانِ حیات
کان میں آخر صدائے الرحیل آنے لگی   کچھ نہ ہم سے ہو سکا تھا جو کہ شایانِ حیات
اُف رے مستی شباب اللہ رے طغیانیِ شوق   خوب کی جی کھول کر سیرِ گلستانِ حیات
ذرہ ذرہ دفترِ مقصد تھا لیکن کیا ملا   چھان ڈالی ساری توسیعِ بیابانِ حیات
ہائے اُس دلکو سپردِ نفسِ امّارہ کیا   بدو فطرت سے تھا مضمر جسمیں عرفانِ حیات
ہائے وہ دل نذرِ خواہشہائے بیجا کر دیا   صدر میں پیکر کے جو تھا مرتبہ دانِ حیات
فکرِ تسخیرِ بتاں اُس جذب سے ہوتی رہی   جو کہ تھا شیرازہ بندِ جزو ایمانِ حیات
یہ حواسِ ظاہری اور یہ حواسِ باطنی   شکر کے سجدے کرو جبتک ہیں مہمانِ حیات
ہو رہا ہے چشمۂ آرام مانندِ سراب   تم سمجھتے ہو ترقی پر ہے طوفانِ حیات
ڈوبتا ہے نور آنکھوں کا برنگِ نجمِ صبح   ابتو آئینہ اُٹھا کر دیکھ لو شانِ حیات
ہو رہی ہے یوسفِ بے کارواں منہ میں زباں   گر رہے ہیں دانت جو تھے رکنِ ایوانِ حیات
ہاتھوں کا رعشہ خبر دیتا ہے بڑھکر متصل   چھوٹنے ہی کو ہے کوئی دم میں دامانِ حیات

ضعف سے تھرا کے دونون پاؤن نیچے ہین بہ   آگیا نزدیک آخر وقت پایان حیات
ایک دن وہ تھا کہ اپنی خوشی ہوتے تھے دوست   آج وہ دن ہے کہ ہم ہین مرثیہ خوان حیات

عقل کہتی ہے تو قبل از مرگ مرنا خوب ہے
محشر اس دنیا مین اب تک [illegible] پایان حیات

محشر

نمائش الہ آباد

بن گیا ہے آسمان مراد   اختر قسمت الہ آباد
باغ جنت ہے اسکے دامن مین   نقد عشرت ہے اسکے دامن مین
دل ہے شیدا ہین سو جان اسکے   غیرت حور نونہال اسکے
سیرگاہ خواص و عام ہے یہ   فرح زا دلکشا مقام ہے یہ
طلعت تفریح و سیر توام ہے   گنگا جمنا کا یان پہ سنگم ہے
ہر سحر ہے سحر بنارس کی   شکل پیش نظر بنارس کی
آنکھ کیا پڑتی روے روشن پر   لوٹ ہے حسن اسکے جوبن پر
غیرت کہکشان ہے راہگزر   ذرہ ذرہ ہے آفتاب اثر
پتے پتے مین حسن کی تنویر   بوٹی بوٹی ہے کیمیا تاثیر
ایگزبیشن سے ہے عجب زینت   ہے کھلا ایک تختۂ جنت
پتا پتا نئے سنگار پہ ہے   گل کا جوبن عجب بہار پہ ہے
شہر سارا بنا ہوا گلزار   اور دو طرفہ دوکانونکی ہے قطار
کارخانے کہین ہین صنعت کے   پیش خیمے کہین تجارت کے
کہین ملتان[ع۵] کی میناکاری ہے   کہین چھتی گوالیاری ہے
قابل قدر کام مٹی کے   دیدنی زیورات دہلی کے
ہر طرف ہین خوشی سے محو کار   اپنی صنعت لئے ہوئے تجار
اپنا اپنا ہنر دکھاتے ہین   سب کو کاریگری سکھاتے ہین
کھل رہا ہے ہر ایک کا جوہر   حسرتین لوٹ دستکاری پر
سحر پوشیدہ ہو رہے ہین عیان   ہر طرف ہین عجائبات جہان
صبح بانکی ہے صبح روز عید   شان ویلکم کلب ہے قابل دید
گھر ہے آغوش رود جمنا مین   یا ہے کشتی نور دریا مین
کمرے آراستہ دلہن کیطرح   طرفہ گلکاریان چمن کیطرح
ہر طرف بھیڑ میہمانون کی   چہلین آپس مین نوجوانونکی

دیدنی ہے مکان پردہ کلب   واہ رے حسن شان پردہ کلب
جلوہ افگن زنان مہ پارہ   نظرین دریا پہ محو نظارہ
موجین سرگرم جانفشانی مین   بجلیان لوٹتی ہین پانی مین
کبھی بڑھ بڑھ کے پاؤن چومتی ہین   کبھی ہو ہو کے مست جھومتی ہین
ہین فلک پر دماغ بجلی کے   جل رہے ہین چراغ بجلی کے
کہین باب طلسم حیرت باز   کہین اڑتے ہوئے ہوا پہ جہاز
کہین کرتب کوئی دکھاتا ہے   نقش حیرت ہمین بناتا ہے
کہین شہزورونکی لڑائی ہے   کہین تقدیر آزمائی ہے
کہین فٹ بال ہے کہین پولو   کہین ہاکی کہین ٹینس دیکھو
کہین تعلیم ہے زراعت کی   کہین تحریص شوق صنعت کی
کہین سرگرم کار کاٹن ملز   کہین جوہر نما ہین اولن ملز
کہین ہے نقشۂ نگار چین   کرم ریشم کی پرورش ہے کہین
کہین ہے کار شیشہ و آلات   کہین تعلیم فن تعمیرات
کارخانے کہین شکر کے ہین   کہین سامان سیم و زر کے ہین
از پے تمغۂ سرافرازی   طبع ہے مائل شکر سازی
اسکی مدحت مین کام جان عاجز ہین   اسکی توصیف مین زبان قاصر ہین
کہین شعبے ہین آبپاشی کے   کہین چرچے ہین بت تراشی کے
ہے کہین جنگلات کا صیغہ   فن تعمیر کا کہین شعبہ
میز بانون کا اہتمام کہین   ڈاک خانون کا انتظام کہین

ع۵ اس مصرعے مین اخفاء نون اور اسقاط الف عمداً جائز رکھا گیا ہے۔

فروری ۱۹۱۱ء

ادیب

جلد ۲ —— نمبر ۲

تقریر مسٹر روزولٹ

(سابق پریسیڈنٹ امریکہ)

۲۳ اپریل گذشتہ کو، مسٹر روزولٹ، سابق پریسیڈنٹ امریکہ نے پیرس مین ایک زبردست پُرمغز تقریر کی، جسنے سارے یورپ وامریکہ مین غلغلہ ڈالدیا۔ تقریر مذکور کا اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے۔

مدتون ہمارے اجداد کو جنگلیون اور وحشیون سے سابقہ ...کیونکہ امریکہ کے اصلی باشندے تین سو برس قبل بالکل جاہل ...ے)۔ قدیم علوم وفنون کے خزانے جو ہمارے بزرگون کے ساتھ ... (اور جو اسوقت ہمارے یورپی بھائیون کے پاس ہین) ہمکو ...و قائم نہ رکھ سکے، اور نہ رکھ سکنا ممکن تھا۔ کیونکہ ہم اُسوقت ...کی جنگ وجدل مین مصروف رہے جسطرح قرنہاے ماضی ...ن انسان کو جنگلیون کے ساتھ مصروف رہنا پڑا تھا۔ اُسوقت ...مین ان خزانون کے قائم رکھنے کی صلاحیت نہ تھی، تو اضافہ ...تو اور بھی محال تھا۔

بہر حال، اُن پیش رووں کا زمانہ گذر گیا۔ صحرا و جنگل زرخیز کھیت ہوگئے آدر جھونپڑے اور خیمے شہر بن گئے۔ حتی کہ اُسوقت کی قوم آنے والے تمدن کی راہ بنا کر خود بھی فنا ہوگئی۔ اُسوقت سے اُنکی اولاد غیر معمولی سُرعت کے ساتھ ترقی کرنے لگی۔ اُنکی ترقی کے ساتھ اُنکے عیوب اور اوصاف کی بھی پرورش ہوتی گئی۔ جانداری کے ساتھ بے رحمی، دلیری کے ساتھ خود غرضی اور حفاظت حقوق مین زیادتیوں سے بے پروائی، اُنکے رگ وپے مین سرایت کرگئی۔ یہ اُنھین اوصاف قدیمہ کے نمونے ہین جنکو تم اُنکی جدید کاروباری مصروفیت مین دیکھ رہے ہو۔ مگر اب یہ حالت بھی کاروباری تمدن کے دوسرے دَور مین غروب ہو رہی ہے۔

ملک کی ترقی کے ساتھ قومی دماغ بھی ترقی کر گیا، اور

اتنی مختلف شاخون مین ترقی کرنے کے بعد وہ دماغی و روحانی غذاؤن کیطرف مصروف ہوا ہے، جبکہ اسکے اجداد اپنی جنگی مصروفیت کے سبب تصرف مین نہ لا سکے اور اب رہبران خیال و افعال ایک نئی زندگی کا احساس اپنے لگے ہین جسکے آگے دنیاوی منافع کی محض اسلئے قدر ہے کہ وہ ایک سیڑھی ہے جسکے ذریعہ سے ہم مقاصد اعلیٰ کی طرف راہ پا سکتے ہین - اس نئی زندگی کی پرورش کسیقدر تو فضاے امریکہ مین ہوسکتی ہے، مگر اسکی پوری تکمیل کیلئے ہمکو پرانی دنیا کے خزانہ حکمت سے مدد لینی ہوگی - محض نقل کرنا کسی قوم کے لئے بھی سخت غلطی ہے - مگر بالکل نقل ہی نہ کرنا اس سے زیادہ گمراہی ہے اور یہ سخت کمزوری ہے کہ ہم پرانی باتون سے کچھ نہ سیکھ سکین اور نہ ان قدیم حکمتون کو زمانہ حال کی ضرورت کے مطابق زندہ رکھکر کام مین لا سکین - ہم اہل امریکہ کو چاہئے کہ پرانی دنیا کے آگے مودب بیٹھکر سیکھین اور اگر ہم مین جوہر اصلی ہے تو ہم دکھلا سکین گے کہ امریکہ بھی اپنی باری مین عالم و معلم بن سکتا ہے -

آج مین اہل شہر کے ذاتی فرائض پر گفتگو کرونگا - یہ مضمون ہم دونون قومون کے لئے (اہل امریکہ و اہل پیرس) نہایت ہی اہم ہے، کیونکہ ہر دو قوم ایک زبردست جمہوری سلطنت کی سرپرست ہین - سلطنت جمہوری - یعنی انتظام از افراد قوم و برائے افراد قوم - ایک نہایت ہی عظیم الشان کام ہے - جسکی کامیابی تمام روے زمین کے اقوام کے لئے فخر اور جسکی ناکامی تمام اقوام عالم کی ناامیدی و ذلت کا سبب ہوگی - اسلئے ہملوگون کے واسطے افراد قوم کے ذاتی اوصاف کا مسئلہ نہایت ہی اہم ہے - دوسری طرح کی سلطنت مین جہان صرف ایک شخص، یا چند اشخاص برسر حکومت ہین وہاں صرف حکمرانون کے اوصاف قابل لحاظ ہین - ایسی سلطنت مین اگرچہ افراد قوم کے اخلاق اچھے نہ بھی ہون، مگر جو برسر حکومت ہین انکے اوصاف اچھے ہین، تو سلطنت کئی پشتون تک کامیاب رہ سکتی ہے اور فتوحات مین بھی اضافہ ہوسکتا ہے - کیونکہ وہان افراد قوم سے سروکار نہین اور نہ وہ قومی عظمت و جلال کے بڑھانے مین کبھی معاون ہین - مگر ہم لوگون کی حالت بالکل جداگانہ ہے - ہماری اور آپ کی (اہل پیرس کی) کامیابی اسپر موقوف ہے کہ عام مرد و عورت اپنے فرائض عمدہ طور سے انجام دین - روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتون سے لیکر ان بڑے بڑے قومی مواقع پر، جبکہ ملک کو پامردی و جانبازی کی ضرورت ہوتی ہے اپنے کو قابل اعتبار ثابت کرسکین - غرضکہ ہماری جمہوریت کو اسیوقت ترقی ہوسکتی ہے جبکہ عام اہل شہر عمدہ ہون - اسلئے یہ ہم لوگون کا فرض ہے کہ عوام کے اخلاق کو درست کرین اور عوام کے اخلاق اسوقت تک نہین درست ہوسکتے جبتک کہ رہبران خیال و افعال کے اخلاق بہت ہی اعلیٰ و ارفع نہون -

بہتر ہوتا کہ انتظام جمہوریت مین زیادہ عنصر ایسے لیڈرون کا ہوتا جیسے لوگ آج کے جلسے مین شریک ہین - بشرطیکہ ایسے اشخاص کے دلون مین عوام کے ساتھ ہمدردی ہو اور انکے خیالات اعلیٰ ہون - حضرات! آپ کو اپنے دماغون کے پرورش کا موقع ملا ہے، آپ مین بہت سے لوگون کو فراغت نصیب ہے، آپ مین بیشتر لوگون کو دنیاوی نعمتین اور ساز و سامان زندگی میسر ہین جو بہتیرے بندگان خدا کو نصیب نہین - آپ کو اور آپ کی طرح کے دوسرے لوگون کو جب بہت سی نعمتین عطا کی گئی ہین تو آپ سے اور انسے بہت زیادہ توقع بھی کیجائیگی - مگر تعلیم یافتہ اور دولت مند اشخاص مین بہت سی کمزوریان بھی ہوتی ہین جنکو مٹانے کی از حد ضرورت ہے، کیونکہ اگر یہ کمزوریان قائم رہ گئین تو حضرات!

آپ سے حسن عمل کی توقع کا خاتمہ ہوگیا۔

علما و فارغ البال فاضلون کو نفس کی اس مکاری سے آگاہ رہنا چاہیے جو انکو صرف نکتہ چینی، ترش مزاجی اور عیب گیری بتاتی ہے جسنے انکی آرزو و تمنا کو بہت بڑھا دیا ہے اور جسکے آگے نیکی و بدی مین کوئی فرق نہین۔ دُنیاوی معاملات کا حقارت و اہانت سے مقابلہ کرنا سخت بزدلی ہے۔ بہت سے آدمی ہین جنکو اپنی اس حقارت و اہانت پر ناز ہے اور بہت سے حضرات ہین جو دوسرون کے اُن افعال پر نکتہ چینی کرتے ہین جنکو خود اُنکے کرنے کی ہمت تک نہین۔ اُس سے زیادہ کوئی ناکارہ و بے مصرف شخص نہین جو حقارت کرتا ہے، یا حقارت آمیز نظر سے اُن چیزون کو دیکھتا ہے جو حقیقت مین قابل قدر ہین۔ اگرچہ یہ قابل قدر شے کسیکی کامیابی مین ہو یا کسی کی ناکامی مین۔ کیونکہ ناکامی بھی کامیابی کے برابر ہے اگر وہ کسی اعلیٰ مقصد مین ہو۔ خشک مزاجی، ترش کلامی، نکتہ چینی و بے رُخی، یہ سب علامات عالی دماغی کے ضمن ہین، جیسا کہ نکتہ چین خیال کرتے ہین۔ بلکہ سخت کمزوری ہے جو شخص دُنیاوی کشمکش سے بھاگتا ہے اور دوسرون کے عمل کو حقارت سے دیکھتا ہے وہ حقیقت مین اپنی نکتہ چینیون کے پردے مین اپنی کمزوریون و بے عملیون کو چھپاتا ہے۔

تعریف اُنکی نہین ہے جو نکتہ چینی کرتے ہین اور نہ تعریف اُنکی ہے جو بتایا کرتے ہین کہ کام کرنے والے نے کہان لغزش کی اور کیونکر وہ بہتر طور پر کام انجام دیتا، بلکہ تعریف اُس جانباز کی ہے جو میدان کارزار مین گھسا ہوا ہے، سارا بدن پسینہ مین غرق ہے، ہاتھ گرد آلود ہو رہے ہین، پیشانی زخمی ہوگئی ہے اور مُنہ سے خون ٹپک رہا ہے، بار بار گرتا ہے پھر اُٹھتا ہے، کوشش کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے، غرض جو واقعی کسی کار خیر کے پیچھے جان دیئے ہوئے ہے، ایسا آدمی گو ناکام بھی رہے تو وہ کسی مقصد اعلیٰ مین ناکام رہا۔ اُسکی جگہہ ہرگز اُس سرد مہر و مردہ دل کے ساتھ نہین ہوسکتی جسنے نہ کبھی فتح کا مزہ چکھا نہ شکست کا۔

تُف ہے اُن علما پر جنکی نازک دماغی اور موشگافیون نے اُنھین کاروبار دُنیا کے لئے بالکل ناکارہ کردیا ہے۔ آزاد اقوام جو اپنے آپ حاکم ہین اُنمین جو لوگ زاویہ نشینی و گوشہ گیری کی زندگی بسر کرتے ہین وہ بہت ہی کم فائدہ رسان ہین اور وہ تو اُنسے بھی زیادہ بے مصرف ہین، جنکا کام صرف کام کرنیوالون پر ہنسنا اور اُنکی حقارت کرنا ہے اور نہ وہ لوگ کسی مرض کی دوا ہین جو ہمیشہ اس آرزو مین رہتے ہین کہ اُسوقت کام مین ہاتھ لگائینگے جبکہ زمانہ اُنکی خواہش کے مطابق ہوجائیگا۔ صفحات تاریخ مین بے عمل آدمی کی زندگی ہمیشہ کے لئے بد نمارہ جائیگی، گو وہ زاہد خشک ہو یا رند بے پروا وہ کسی مرض کی دوا نہین جسکا دل مردہ نہ جذبات اعلیٰ سے واقف ہے نہ اعتقاد و غیر تمندی سے آگاہ، نہ دلیرون کے اُس جوش و پامردی کو جانتا ہے جس سے وہ بجلیون پر چڑھ بیٹھتے اور طوفان کو دبا ڈالتے ہین، اگر ایسا آدمی کامیاب ہوا تو فہو المراد، اور اگر ناکام رہا جب بھی افسوس نہین۔

فرانس نے اقوام عالم کو بہت سے سبق سکھلائے ہین۔ نہایت ہی نادر بات جو اُسکی تاریخ ہمکو سکھاتی ہے وہ یہ ہے کہ انتہاے علوم و فنون کے ساتھ بھی اہل سیف و اہل قلم کا اجماع ہوسکتا ہے۔ صدیون تک فرانسیسی سپاہیوں کی دلیری ضرب المثل رہی ہے اور اسی کے ساتھ مدتون تک زبان فرانسیسی تمام یورپ کی زبان رہی اور بڑے بڑے صناع و قادر الکلام اُسکی نثر کا دم بھرتے رہے۔

جنھون نے بڑی بڑی عالمانہ فضیلتین حاصل کیں [illegible]

اور اُنکے ساتھ اُنکو بھی بہ جہ احسن حاصل کرسکے، ایک طرف کرو، کیونکہ یاد رکھو کہ یہ فضیلتین بھی چند دوسری چیزون کے آگے کم قدر ہین۔ مین مانتا ہون کہ ہمکو مضبوط بدن کی ضرورت ہے اور اُس سے بھی مضبوط تر دماغ کی ضرورت ہے، مگر صاحبو بدن و دماغ سے بھی بالاتر ایک چیز ہے اور وہ ہمارے اخلاق ہین۔ یعنی تمام اوصاف انسانی کا وہ نچوڑ جسے ہم جوہر انسانیت، دلیری، پختگی اعتقاد اور غیرتمندی سے تعبیر کرتے ہین۔ مین ورزش جسمانی کا پکا معتقد ہون، بشرطیکہ یہ ہمیشہ مد نظر رہے کہ صرف بدن کی پرورش ہی انتہائے مقصد نہین۔ مین اسکا بھی ویسا ہی حامی ہون کہ لوگون کو پوری پوری تعلیم دیجائے، مگر اُس تعلیم کو مفید بنانے کے لئے بہت سی باتین فاضل از کتاب بھی بتانی ہونگی، ہمکو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کیسی ہی زبردست ذہانت و فراست ہو کیسے ہی اعلیٰ و ارفع خیالات ہون اور ذہن مین کیسی ہی تیزی و برّاقی ہو، اُن وزنی اور ٹھوس اخلاقی اوصاف کی کمی کو پورا نہین کرسکتے۔ نفس کشی، ضبط و تحمل، دانائی، ذمہ داری کو تنہا اُٹھا لینے کی طاقت کے ساتھ ملکر کام کرنے کی صلاحیت، دلیری، اولوالعزمی - یہ اوصاف ہین جو کسی قوم کو زبردست و برگزیدہ بناتے ہین۔ بغیر اسکے کوئی قوم اپنے اوپر آپ حکومت نہین کرسکتی۔

حضرات، مین اسوقت ایک بہت ہی شاندار جماعت کے آگے گفتگو کر رہا ہون۔ مین ایک بڑی تعلیم گاہ مین تقریر کر رہا ہون جسمین فرانسیسی ذہانت کے چیدہ پھول ہین۔ مین ذہانت و طبّاعی کی پوری تعظیم کرتا ہون، مین تحصیل علوم کے اصول مروجہ کی پوری عزت کرتا ہون، پھر بھی حضرات مجھکو یقین ہے کہ آپ میری تائید کرینگے جب مین کہونگا کہ ان سب سے زیادہ ضروری اور بالاتر وہ اخلاقی اوصاف اور نیکیان ہین جنکی ہر دم ضرورت ہوتی ہے۔ روزانہ کے عام اوصاف مین یہ بھی داخل ہے کہ ہر شخص مین فرداً فرداً کام کرنے کی صلاحیت ہو، بوقت ضرورت اپنے ملک کیلئے سینہ سپر ہو سکے اور بہت سے تندرست لڑکے کھیلتا ہو کام کرنے کی ناگزیر ضرورت تو اس سے ظاہر ہے کہ بہت کم لوگ ملک مین ایسے ہوتے ہین جنکو بالکل بے فکری و فراغت نصیب ہو سکے۔ مگر ایسے خوش حال لوگ بھی بیکار نہین۔ بشرطیکہ وہ اپنی فراغت کے معنی کاہلی و بیکاری نہ سمجھین۔ کیونکہ ملک مین بہت سے ایسے کام ہین جنکو ایسے ہی لوگ انجام دے سکتے ہین جو فکر معاش سے آزاد اور اُجرت و مزدوری سے مستغنی ہون۔ مگر عوام الناس کو اپنی روٹی کے لئے محنت کرنی ہوگی، اسلئے قوم کو روح پیدا کرنے کی پوری تعلیم دینی چاہئے اور اُسے آگاہ کردینا چاہئے کہ اگر وہ کوئی روزگار نہین کرتا ہے تو نہایت ہی بے حیا و بے غیرت آدمی ہے، وہ اس غلط خیال مین نہ پڑے کہ لوگ اُسکی کاہلی کو آزادی و بے فکری سمجھکر رشک کرتے ہین، سمجھدارون کے نزدیک وہ نہایت ہی ذلیل و مجہول الخلقت آدمی ہے۔

اُسکے بعد حضرات! دوسری خوبی یہ ہونا چاہئے کہ ہر شخص دلیر و طاقتور ہو کہ بوقت ضرورت حفاظت وطن کے لئے میدان مین کود پڑے۔

بہت سے حکماے نیک نیت ہین جو خون ریزیون اور جنگ و جدل کے سخت مخالف ہین۔ مگر اُنکی مخالفت اُسیوقت تک صحیح ہے جبکہ جنگ ناحق و ناروا ہو۔ جنگ بیشک نہایت ہی نفرت انگیز و ہولناک شے ہے اور جنگ ناحق بندگان خدا پر صریح ظلم اور گناہ عظیم ہے، مگر گناہ اُسیوقت ہے جبکہ ناحق ہو، گناہ اسلئے نہین ہے کہ وہ گشت و خون ہے۔ ہمیشہ حق کی حمایت کرنی چاہئے، اسمین لڑائی ہو یا صلح، صرف یہ خیال نہین ہونا چاہئے

کسی عیب سے پاک ہو، بلکہ ہمیشہ یہ خیال مدنظر رہے کہ حق کو فتح ہو۔ اگر یہ سوال ہو کہ کیا قوانین عدل و انصاف پھر جاری کئے جائینگے تو صاحبو ایک دلیر و مضبوط قوم کیطرف سے یہی جواب ملے گا کہ "ہان" ! جو کچھ ہو جاسے "ہان" !! بیشک ہمیشہ اسکی کوشش کرنی چاہئے کہ قتل و خون کا موقع نہ آئے جسطرح ہم ہمیشہ اسکی کوشش کرتے ہین کہ آپسمین نزاعین نہون۔ مگر کوئی غیرت مند شخص، یا کوئی غیرت مند قوم اسکو ہرگز گوارا نہین کرسکتی کہ اُسپر ناحق و ناروا ظلم ہو اور وہ چپ رہے۔

آخر مین حضرات، کام کرنیکی لیاقت اور بوقت ضرورت سینہ سپر کردینے کی صلاحیت سے بھی بڑھکر ایک ضروری امر ہے۔ کسی قوم کی سب سے بڑی دولت و نعمت یہ ہے کہ وہ اپنے پیچھے نسلین چھوڑ جاسے۔ قرنہاے ماضی مین اولاد بہت بڑی دولت سمجھی جاتی تھی، حضرات، اُسیطرح وہ بہت بڑی نعمت آج بھی ہے۔ بے ثمری و لاولدی سے بڑھکر کوئی نحوست نہین اور جو لوگ عمداً انقطاع نسل کے درپے ہین اُنکو سخت ذلیل و رسوا کرنا چاہئے۔ تمدن کا پہلا فرض یہ ہے کہ عورت و مرد بہت سے تندرست لڑکون کے والدین ہون تاکہ افراد قوم مین اضافہ ہو اور وہ کم نہونے پائین۔ اگر کسی اور سبب سے نسلین گھٹ رہی ہین تو حضرات آپ یقین جانین کہ یہ ایک سخت بدنصیبی ہے اور اگر نسلین عمداً گھٹائی جا رہی ہین کہ بچون کے بکھیڑے عیش و عشرت مین مخل انداز نہون تو قوانین الٰہی کی بے خطا و دردناک سزاؤن سے وہ بچ نہین سکتے۔ ہملوگ بڑی بڑی جمہوری سلطنت کے افراد ہین، اگر عمداً اپنے گھرون مین بے ثمری کی نحوست کو لے آئینگے تو ہماری ساری فخر و خودستائی ایک نہایت ہی لغو حرکت ہوگی۔ تمام تہذیب و شایستگی، تمام تراش و خراش، ہمارے مذاق سلیم، ہمارے علوم و فنون کی ترقی، تمام مال و دولت کا غلبۂ انبار اخلاقی بنیادون کی کمی کو کبھی پورا نہین کرسکتے، اور انھین اخلاقی بنیادون مین حضرات ! ایک زبردست بنیاد توسیع نسل کی قوت ہے۔

اخلاقی خوبیون کا رنگ ہمارے تمام افعال مین ہونا چاہئے ہمارے فرائض ذاتی مین بھی اور ہماری فرائض ملکی مین بھی انسان کا سب سے بڑا فرض اُسکی ذات خود اور اُسکے اہل و عیال کے متعلق ہے اور اپنے اور اپنے اہل و عیال کے فرائض اُسیوقت انجام دے سکتا ہے جبکہ وہ اُنکی کفالت کے لئے روپیہ پیدا کرے۔ جب اُسکو اس سے فراغت ہوگی تو البتہ وہ کوئی قومی کام بھی کرسکتا ہے۔ پہلے جب وہ اپنا بار اُٹھالیگا تو پھر وہ قوم کا بھی بار اُٹھا سکے گا۔ وہ شخص جو قومی و ملکی خدمات مین ایسا مصروف ہے کہ اپنے اہل و عیال کی ضرورتون سے بے پروا اور اُنکو تکلیف مین رکھے ہوے ہے، ہرگز قابل ستائش نہین، اُسپر لوگ خندہ زنی کرنے سے کبھی باز نہین آسکتے۔

مگر باین ہمہ اگرچہ، روپیئے کو مین قوم و افراد کے لئے نہایت ضروری سمجھتا اور اُسپر اتنا زور دے گیا ہون، مگر اُسکو بنیاد کے سوا اور کچھ نہین سمجھتا اور گو بنیاد، عمارت سے نہ جُدا ہونے والی چیز ہے، مگر وہ بنیاد ایک بالکل بے مصرف چیز ہے اگر اُسپر مقاصد اعلیٰ کی عمارت نہ بنائی جاسے۔ یہی وجہ ہے کہ مین محض دولتمندون اور کروڑپتیون کی وقعت نہین کرتا اور اُنکو کسی ملک و ملت کے لئے مفید نہین جانتا اور خاصکر وہ میرے ملک کے لئے تو بالکل بے مصرف ہین۔ اگر کسی نے روپیہ کو اسطرح حاصل کیا ہے، یا اسطرح استعمال کرتا ہے کہ اُسکی ذات سے دوسرون کو فائدہ پہونچے تو کیا کہنا ہے، وہ ملک کی دولت ہے۔ مگر اُسکی تعریف صرف اسی وجہ سے کرینگے کہ اُسنے اسطرح

پیدا کیا، یا اس خوبی سے خرچ کرتا ہے، ہرگز اسلئے نہین کہ وہ ایسا دولتمند ہے۔ جسطرح بہت سے انسانی مشاغل مین ہادی او رہنماؤن کی ضرورت ہے اُسیطرح کاروباری دُنیا مین بھی بڑے بڑے رہنماؤن کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھنا کہ اُنکی جگہہ عام لوگ پُر کرسکتے ہین۔

کسی قوم کے لئے یہ نہایت ہی خراب بات ہے کہ وہ کامیابی کا ایک غلط معیار قائم کرکے اُسکی تعریف و تحسین کرے اور اس سے بڑھکر لغو و غلط معیار کوئی نہین ہوسکتا کہ ہم صرف مادّی ترقیون کی اتنی ناواجب عظمت کرین۔ کوئی شخص اگر کیسو جہ سے، جسکے لئے وہ خود ہی ذمہ دار ہوگا، اگر اپنے اہل و عیال کی کفالت نہ کرسکا تو بیشک اُسکو سمجھنا چاہئے کہ اُسنے ایک بہت بڑے فرض کو ادا نہین کیا، لیکن وہ شخص جو اپنے اور اپنے اہل و عیال کی ضرورتون سے مستغنی ہوگیا ہو اور اب حرص و بخل سے دولت کا انبار لگا رہا ہے، جسکے روپیہ سے قوم کو کوئی فائدہ نہین ہو رہا ہے اُسکو جان لینا چاہئے کہ وہ ایک ناکارہ و بے مصرف وجود ہے، سمجھدار اور دانشمند لوگ نہ اُسکی عزت کرتے ہین نہ اُسپر رشک۔ اُسکی تعریف و توصیف وہی لوگ کرینگے جنکے دل و دماغ اُس سے بھی پست ہین۔

مسئلہ مال کی نسبت میری راے یہ ہے کہ تمام شایستہ اقوام مین لوگون کے مال کی پوری حفاظت ہونی چاہئے اور عام طور سے حقوق انسانی و حقوق مالی ایک شے ہے لیکن جب کسی وجہ سے ان دونون حقوق مین نزاع پیدا ہو جاے تو اُسوقت یقینی دولت سے زیادہ انسانی حقوق کا پاس کیا جائیگا۔

اہل شہر کے دیگر فرائض مین ایک امر یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ وہ جن امور کو پسند کرین، یا کسی شے کی تعریف و توصیف کرین تو اُس تعریف و توصیف کو بلحاظ اُس شے کے افادہ و نقصان کے ہونا چاہئے نہ کہ محض اُس شے کی ذاتی خوبی اور بُرائی کے سبب۔

آجکل دو امور بہت ہی قدردانی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہین، ایک تو کسب زر کی قابلیت، دوسرے زبان آوری۔ اسمین شک نہین کہ کسب زر کی معتدل لیاقت نہایت ہی ضروری ہے اور بہت بڑی لیاقت بھی مفید ہے، بشرطیکہ یہ روپیہ پیدا کرنے کی قابلیت دوسرے اوصاف حمیدہ کی ماتحت ہو ورنہ بغیر اسکے یہ دولت اُس شخص کو زمانۂ حال کی کاروباری دُنیا کا ایک نہایت ہی بدنما نمونہ بناوے گی۔

یہی حال زبان آور مقررون کا ہے۔ بیشک یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ سلطنت جمہوری مین رہبران خیال اظہار مطالب پر پورے قادر ہون۔ مگر فصاحت و زبان آوری صرف یہ بتا دینے کی مختار ہے کہ اظہار مدعا کیونکر کرتے ہین۔ اگر اُس سے یہ کام لیا جانے لگا کہ سامعین کو اپنی رنگین بیانی سے دھوکا دیکر اپنا ہم خیال بنا لیا تو حضرات وہ شخص ایک فتنہ و فساد کا آلہ ہے۔ بہت سے لائق لوگون مین زبان آوری کی صلاحیت ہوتی ہی نہین، اسلئے آپ کو اپنی زبانِ اعمال کی فصاحت پر بھروسہ کرنا چاہئے اور اگر فصاحت مین صداقت نہین ہے، یا مقرر صادق اللہجہ نہین ہے، یا تقریر معقول قابل عمل نہین ہے، تو صاحبو! ایسی سب صورتون مین یاد رکھئے کہ جتنی زبردست زبان آوری ہوگی ویسی ہی زبردست خرابیان بھی پیدا ہونگی۔ یہ نہایت ہی شدید سیاسی کمزوری ہے کہ کوئی قوم صرف لسانی و زباندانی کے ذریعہ سے محسور کرلیجاے۔ الفاظ کی قدر صرف اسوجہ سے نہین ہے کہ وہ الفاظ ہین، بلکہ اسلئے ہے کہ وہ قائم مقام اعمال ہین۔ لسانی، گویائی، حاضر جوابی، سے اگر بلند حوصلگی

اصابت ہدا سے اور پرہیزگاری کو تقویت نہین پہونچی، تو وہ نہایت ہی خطرناک شئے ہے۔ اُس گویائی کی تعریف کرنی جسمین اخلاقی آمیزش مطلق نہین، پبلک پر ظلم کرتا ہے۔

جو باتین مین نے مقرر کی نسبت کہی ہین، وہ اخبار نویسون کے لئے بھی اسیقدر صحیح ہین۔ اخبار نویسوں کی طاقت نہایت ہی وسیع ہے، لیکن اگر وہ اپنی طاقت کو بُری طرح استعمال کرتے ہین، تو مطلق تعریف کے مستحق نہین۔ وہ پبلک کو بے انتہا نفع پہونچا سکتے ہین اور اکثر پہونچاتے ہین مگر ساتھ ہی پبلک کو بے انتہا نقصان پہونچا سکتے ہین اور پہونچاتے بھی ہین جو وہ باتین جو سراسر مذاق سلیم اور تہذیب و اخلاق کے منافی ہین، اگر اُنکو اخبار نویس و دیگر ارباب قلم پھیلائین تو وہ سخت لعنت و ملامت کے مستحق ہین۔ کذب و افترا، بدگوئی، بے حیائی اور عامیانہ پن، یہ سب نہایت ہی زبردست عنصر ہین جنسے پبلک کے دل و دماغ کو نقصان پہونچتا ہے۔ ناجائز تحریرون کے لئے یہ عذر کہ چونکہ پبلک کو اُسکی طلب ہے اسلئے اُسکی فراہمی کیجاتی ہے اُسیطرح کی ناقابل سماعت بات ہے جسطرح کوئی رسد رسان اپنی زہر آمیز رسد کی بابت کہے۔

بہرحال اہل شہر مین دو قسم کی خوبیان ہونی چاہئین اور یہ دونون خوبیان ایک دوسرے کی تابع ہین۔ ہر شخص مین پہلے لیاقت ہونی چاہئے کہ وہ اُسے ایک مستعد کارگذار بنائے، بعد اسکے اُسمین یہ خوبی ہونی چاہئے کہ وہ اپنی اُس مستعد کارگذاری سے پبلک کو بھی نفع پہونچا سکے اگر کوئی شخص بے لیاقت ہے نکما ہے۔

اگر کوئی شخص صرف غریب و معصوم ہے، تو ناکارہ ہے سُست اور بودی نیکی سے کچھ نہین ہوسکتا اور دُنیا سے جد و جہد مین ڈرپوک نیکی کی کہین جگہ نہین۔ جو شخص اپنی غربت و مسکینی کے سبب بڑی بڑی بُرائیون سے بچتا ہے وہ اپنی سادہ لوحی کے سبب بڑی بڑی نیکیون سے بھی بے نصیب رہتا ہے۔ غرض اہل شہر کو اپنا درجہ اور وقار قائم رکھنے کے ساتھ جفاکش و دلیر بھی ہونا چاہئے۔

مگر حضرات! مین پھر کہونگا کہ اگر لیاقت و دلیری کی باگ اخلاق حمیدہ کے ہاتھ مین نہین ہے تو وہ شخص جتنا زیادہ بالیاقت ہوگا اُسیقدر زیادہ خطرناک بھی ہوگا، ذہانت، فراست، جفاکشی اور اولوالعزمی اگر اغراض خود غرضی اور بندگان خدا کے حقوق سے بے اعتنائی مین صرف ہون تو اُنسے بڑھکر کوئی شئے بُری نہین اور اگر ایسے شخص کی لوگ قدر کرین تو یہ پبلک کی کم ظرفی و تہی مغزی کی دلیل ہے۔ مگر صاحبو! ایسے لوگ بدنصیبی سے ہر فرقے مین ہین۔ مدبران سلطنت، اہل سیف، مقرران تام اور اخبار نویس، تجار، ہادیان ملت، قریب قریب ہر فرقے کے لوگ کم و بیش ان عیوب کے شکار ہو رہے ہین۔ دانشمندون اور دُور بینون کو چاہئے کہ ایسے آدمی جتنے زیادہ مشہور و کامیاب ہون اُسیقدر زیادہ اُنکی توہین کرنی چاہئے۔ محض کامیابی کو انسان کے جانچنے کا ذریعہ بنانا نہایت ہی فاش غلطی ہے۔ اگر عام طور سے لوگ کسیکی تعریف محض اس خیال سے کرین کہ اُسکو بڑی کامیابی ہوئی ہے، تو حضرات! اُنکی عقلون مین فتور ہے اور وہ نہین جانتے کہ سلطنت جمہوری کا شیرازہ صالح لوگون کے ہاتھ مین ہے اور یہ کہ اسطرحکی ناواجب عظمت و تعریف سے وہ ثابت کرتے ہین کہ وہ نعمت آزادی کے اہل نہین۔

نیکیان جو عورتون کو عمدہ مائین اور سلیقہ مند بیبیان بناتی ہین اور مردون کو جفاکش و دلیر، یہ سب شاخین ہین عمدہ

اخلاق کی - لیکن اگر سلطنت کو بہتر کے ساتھ بڑا بھی بنانا ہے، تو حضرات اُن اوصاف کے ساتھ دوسرے اوصاف کو بھی شامل کرنا ہوگا - عمدہ شخص عزت وہی نہیں ہے جسکے اوصاف صرف گھر کی چہار دیواری مین محدود ہون، بلکہ اس شخص پر سلطنت کے بھی حقوق ہین اور خاصکر ایسی جگہہ کی سلطنت مین جہان کی آبادی مین کاروباری افراد کا پیچیدہ عنصر غالب ہے -

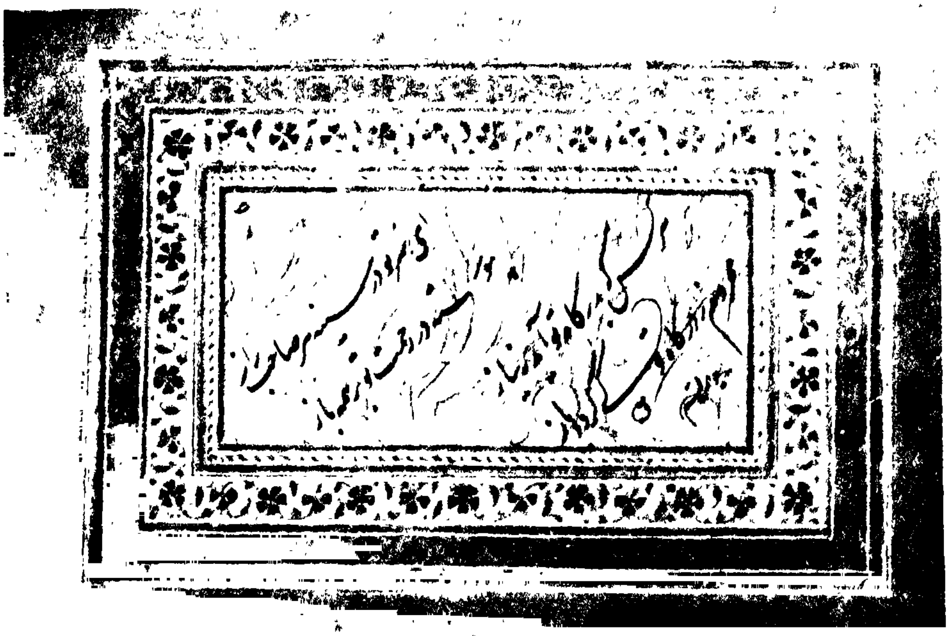
امور سیاسی مین اہل شہر کو اور خصوصاً لیڈرون کو اس بات کا بہت لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ اپنی گرمجوشی مین اپنے ذہنی منصوبے نہ باندھا کرین جنکا رتبہ خیالی پلاؤ سے زیادہ نہو - دقیقہ رس فیلسوفت و فضیلت مآب حضرات اپنے کتب خانون سے بیٹھے ہوئے اپنے منقولون کے مطابق کیا کرتے ہین کہ کار جہانبانی کو یون ہونا چاہیے اور یون ہونا چاہیے، حقیقت مین عملی دنیا کے لیے بالکل بیکار ہین جو شیخے بزرگوار اور منافقان بے بصر جو صرف اپنے اغراض مین کامیاب ہونے کے لئے، لوگون کو ان ہونی باتون کی توقع دلایا کرتے ہین، صرف بیکار ہی نہین ہین بلکہ فسادی ہین -

ہر اہل شہر کو چاہیے کہ اُنکے خیالات بہت ہی اعلیٰ و ارفع ہون، مگر وہ اتنے اونچے نہ ہون کہ عمل مین نہ آسکین - ایسے تمام منصوبے جو عمل مین نہ آسکین نہایت معزو قابل نفرت ہین - ایسے خیالات رکھنے والے حقیقت مین دیوانے اور بادیان حقیقی کے دشمن ہوتے ہین - جو بیچارے گر گر کر اور ٹھوکرین کھا کھا کر بُری بھلی طرح اپنے منصوبون کو عملی شکل مین لے آتے ہین وہ اپنے ہم خیالون کی آرزو و اُمید کو تو تھوڑی بہت پوری کر دیتے ہین - خیالی پلاؤ پکانے والے لفاظ پر افسوس ہے، جو عملی آدمیون کے لئے رستہ صاف کرنے کے عوض بوقت عمل اُنکا مخالف، اور اُنکی راہ مین روڑے اٹکانے والا ہو جاتا ہے - علاوہ اسکے ایسے خیالی منصوبے باندھنے والے حضرات کو یاد رکھنا چاہیے کہ جن باتون کے کرنے کی وہ دوسرون کو ہدایت کیا کرتے ہین، اگر وہ خود اُنکے حصول کی کوشش نہین کرتے، تو وہ کسطرح کا بدنما و مضحکہ انگیز نمونہ پبلک کے آگے پیش کرینگے - اُنکو بھولنا نہین چاہیے کہ تمام مقاصد اعلیٰ کی قدر اس سے جانچی جاتی ہے کہ وہ قابل عمل کسقدر ہین - اور ہمکو ایسے عملی آدمیون سے سخت نفرت کرنی چاہیے جنکے کامون مین کمینہ پن کا رنگ آجاتا ہے اور جو حصول مقاصد کے وقت اخلاق و شائستگی کی مطلق پروا نہین کرتے - ایسا شخص ملک کا دشمن ہے -

انتہا شخصیت کے اصول متفرقہ کو جسطرح مین نہین مانتا، اُسیطرح مساوات کی انتہائی تجویزون کی بھی مین تائید نہین کرسکتا - جداگانہ اشخاص کی کوششون کی تردید کے عوض اُنکی تائید کرنی چاہیے، مگر ساتھ ہی یاد رکھنا چاہیے کہ جسطرح تمدن بڑھتا جاتا اور پیچیدہ ہوتا جاتا ہے، اُسیکے ساتھ حالات بھی بدلتے جاتے ہین - اس تبدیل شدہ حالت مین جو کام پہلے افراد متفرق پر چھوڑ دیا جاسکتا تھا، اب وہی کام ملکر زیادہ خوبی کے ساتھ انجام پاسکتا ہے - یہ سخت غلطی ہے اور ناممکن بھی ہے، کہ ہم ایسے سخت اصول قائم کرین جو دونون حالتون کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردین - ان باتون کی اصل حقیقت عام شاہدات سے ظاہر ہو جاتی ہے بشرطیکہ دیکھنے والون کی آنکھون کو نشہ غرور نے اندھا نہ کر دیا ہو - مثلاً جب افراد انسانی چھوٹے چھوٹے اور گاؤن مین رہتے ہین تو فراہمی آب اور صفائی کا مسلہ فرداً فرداً اشخاص پر چھوڑ دیا جاتا ہے، مگر جب وہی لوگ آبادی مین زیادہ اور پیچیدہ ہو جاتے ہین، تو نئی صورتین پیدا ہو جاتی ہین -



مشہور خوشنویس عبدالرشید دیلمی عرف آغا رشید کی تحریر



سید علی خاں جواہر رقم استاد شہنشاہ اورنگ زیب کی تحریر

صرف ... وسائل ... کہ ... تعداد میں بڑہ گئے ہیں اسلئے اُنکی ضرورتون کی مقدار بھی بڑھ گئی ہے، بلکہ اُسکی شکل بدل جاتی ہے ... صفائی اور فراہمی آب کا ایک جداگانہ مستقل مسئلہ ہوجاتا ہے۔ یہ بات صرف تحکمانہ رائیون کے تابع نہین ہے کہ وہ ضرورت کب پیش آتی ہے بلکہ اسکا فیصلہ تجربہ ومشاہدہ کے ہاتھ ہے۔ بہت سی نزاعین مساویانہ ومتفرقانہ برتاؤ کی نسبت نہایت لغو ہین، یہ معمولی سمجھ کی بات ہے کہ بہت سا کام الگ الگ کرنے کے عوض ملکر بہت خوبی کے ساتھ انجام پاسکتا ہے۔

جسطرح ہمکو جھوٹ بولنا نہین چاہئے اُسیطرح ہمکو اُن افعال سے بھی پرہیز کرنا چاہئے جنمین صداقت نہین۔ ہرجگہ ہمکو یہ نہین کہنا چاہئے کہ تمام افراد مساوی الحقوق ہین مگر ہان ایک حد خاص تک مساوات کی کوشش نازیبا نہین۔ آزادی کے یہ معنی سمجھنا بالکل غلط ہے کہ فرقِ مراتب کا لحاظ رکھنا چاہئے، بلکہ اصل معنی یہ ہین کہ کسی کی جان ومال وآزادیِ افعال معرضِ خطر مین نہو اور وہ زندگی کا پورا پورا لطف اُٹھا سکے۔ ہم اُن لوگون کی باتین بالکل نہین سن سکتے جو مساوات کے اس درجہ درپے ہین کہ سارے عالم کو ایک سطح پر لے آنا چاہتے ہین بلکہ ہم اسکی کوشش کرینگے کہ روز بروز وہ زمانہ قریب ہوتا جاے کہ ہر آدمی کو آسانی کے ساتھ اپنا جوہر دکھلانے کا موقع ملے، اور اُسکے بعد جیسے وہ عمل کرے گا انھین کے مطابق اُسکے درجے ہونگے، اور جب عمل مین فرق ہوگا تو صلہ مین بھی فرق ہونا لازمی ہے۔ کوئی سپہ سالار یا مصوّر، کوئی صنّاع یا پیشہ ور اگر اپنی خلقی کمزوریوں کے سبب کوئی کام اچھی طرح نہ انجام دے سکے تو ہم اُسکی کمزوریون پر افسوس کرینگے۔ مگر بہرحال صلہ وانعام اُسی شخص کا حق ہوگا جو اچھا کام کرے گا۔ اسکے علاوہ کوئی دوسری صورت عطاے اُجرت کی صرف غلط ہی نہوگی بلکہ صریح ناانصافی ہوگی یہ کہنا کبھی صحیح نہین ہوسکتا کہ فضول خرچون، کاہلون اور نالائیقون کو بھی ایسی ہی اُجرت ملنی چاہئے جیسی اُجرت کہ ہم کفایت شعار، محنتی اور قابل اشخاص کو دیتے ہین۔ اگر کوئی شخص اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے تو بیشک اُسکی تھوڑی مدد کرنی بہت خوب ہے۔ ہم مین سے ہر شخص کبھی نہ کبھی تھوڑی اعانت کا محتاج ہے، لیکن اگر کوئی کاہل اور ناعاقبت اندیش اپنے کو بے پروائی سے ڈالدے تو اُسکی مدد کرنی تضیع اوقات ہے اور یہ سخت مضر ہے کہ ہم کاہلون کے دل مین یہ گمان پیدا کردین کہ اُنکو بھی کارناکردہ پر ویسی ہی اُجرت ملے گی جیسی کہ جفاکش ومحنتی کو۔

مگر مساویانہ برتاؤ کے حامی اگر کوئی تجویز پیش کرین تو ہمکو ہرگز اُسے اس خیال سے کہ یہ ایک وہمی وخیالی شخص کی تجویز ہے، رد نہین کرنا چاہئے۔ اگر کام کی تجویز ہے تو قبول کرو اور اگر ناقابل عمل ہے تو انکار۔ بہت سے نئی تجویزین پیش کرنے والے اشخاص ہین جنکے ساتھ ملکر ایک حدِ خاص تک کام کرنا ممکن ہے، اگرچہ اُنکی دوسری تجویزون سے ہمکو اختلاف ہو، لیکن اگر ترقی کے دوسرے قدم مین ہم اور وہ متفق ہین تو اُنکا ساتھ نہین چھوڑنا چاہئے۔ حامیانِ اصلاح وترقی کے تمام مطالبات کو رد کرنا اس بنا پر کہ وہ آگے بڑھکر حدِ جائز سے تجاوز کرجاتے ہین۔ فاش غلطی ہے۔

\+ + + + + + + + + + + + +

علی محمود

عبدالرشید دیلمی کی بہترین وصلی عجائب خانہ دہلی میں موجود ہے۔ آغا رشید ... [illegible]
[illegible]

مشرقی و مغربی تہذیب

الٰہ آباد کے مشرق جانب گنگا میں کوئی ندی ملتی ہے جسکا نام اب کیا ہے معلوم نہیں مگر جسکا نام زمانۂ قدیم میں تمسا ندی تھا۔ہم ایسے زمانہ کا ایک سین کھینچتے ہیں جسکی کوئی تاریخ۔سنہ عیسوی کے حساب سے نہیں بتائی جاسکتی۔مگر جسکی تاریخ ہندؤن کے حساب کے بموجب لاکھون سال پرانی مانی گئی ہے۔غرضکہ تمسا ندی کا کنارہ ہے اور اس کنارے پر ایک بہت بڑے رشی کا آشرم ہے۔یہ وہی مشہور و معروف بالمیک رشی ہین جو مصنف رامائن ہین۔ اسی آشرم مین درختون کا ایک کنج ہے جس مین بہت سے رشی جمع ہین اور دو بالک جنکا رنگ گورا ہے سر پر جٹا بندھی ہوئی ہے۔ اور جنمین سارے راج چہتر یعنی شاہی علامتین موجود ہین۔بین کو بجاتے ہوئے نہایت خوش الحانی کے ساتھ ایک مثنوی کو گا رہے ہین۔اور وہ رشی نہایت ذوق کے ساتھ اور بے خودی کی سی حالت مین اُن لڑکون کے گانے کو سن رہے ہین۔یہ مثنوی رامائن ہے۔ جسکو حال ہی مین مہرشی جی نے تصنیف کیا ہے۔اور جسکو انھون نے اُن دونون بالکون کو حفظ یاد کرا دیا ہے۔یہ دو بالک کون ہین؟ یہہ مہاراجہ سری رامچندر جی کے پیارے فرزند جگر بند ہین۔جنھون نے اپنی پیدایش کے وقت سے اسی آشرم مین مہرشی جی کے زیر سایۂ عاطفت پرورش پائی ہے۔ان دونون لڑکون کے گانے کو سنکر یکایک اُن بوڑھے رشیون کو وجد ہوتا ہے۔اور عالم وجد مین وہ ایک بہت بڑی فیاضی پر مستعد ہو جاتے ہین۔یعنے یہ کہ وہ اُن بچون کے گانے سے اسقدر خوش ہوتے ہین کہ اپنی خوشنودی کے اظہار مین جو کچھ اُنکے پاس ہے وہ سب بطور انعام اُن لڑکون کو دیڈالنا چاہتے ہین۔کوئی اُٹھکر پانی بھرنے کا کلسہ دیدیتا ہے۔کوئی ہوم کی لکڑیانکو باندھنے کی رسی بخش دیدیتا ہے۔کوئی مرگ چھالا عطا کرتا ہے۔ کوئی جنیو دیتا ہے۔اور کوئی جسکے پاس کچھ بھی دینے کو نہین ہے صرف دعا ہی دیتا ہے۔واہ کیا خوب داد و دہش ہے ایکطرف تو انعام کے دینے والے وہ رشی ہین جنکے پاس ساری دنیوی دولت جو کچھ ہے وہ ایک رسی ہے یا ایک مرگ چھالا ہے۔مگر جنکے پاس اصلی دولت ریاضت سے حاصل کی ہوئی خداشناسی یا معرفت الٰہی ہے۔ اور دوسری طرف انعام کے لینے والے دو بالک ہین جو ایک ایسے راجہ یا مہاراجہ کے فرزند ہین جو اپنی ظاہری حالت مین بہ حیثیت ایک عظیم الشان مہاراجہ کے کسی دُنیوی شے کے محتاج نہین۔اور جو اپنی اصلی حالت کے لحاظ سے قطعاً بے نیاز ہین۔

اب ہم اس سین کو بدلکر ایک اور ہی سین کا نقشہ کھینچتے ہین سنہ عیسوی کی بیسوین صدی ہے ایک عظیم الشان شہر دریائے ٹمس کے کنارے آباد ہے۔اس شہر مین ریلین دوڑتی ہین۔برقی روشنی ہو رہی ہے۔تارون پر منٹون بلکہ سکنڈون مین خبرین جا رہی ہین۔ایکطرف مجلسون مین اسپیچون کا زور شور ہے۔اور چیرز کی صدائین بلند ہو رہی ہین۔اور دوسری طرف تھیٹرون مین شاہزادے اور امرائے عظام اپنی اپنی لیڈیون کے ساتھ لباس فاخرہ پہنے ہوئے تماشا دیکھ رہے ہین۔یہ لوگ کسی پری وش۔مہ جمال ایکٹرس کی صورت اور گلے پر دل کھوئے ہوئے عالم مستی مین صرف تعریفون کی بوچھار ہی نہین کر رہے ہین بلکہ بیش قیمت اشیا مثل طلائی پن و بروچ وغیرہ کے پھینکے جا رہے ہین۔اور وہ ایکٹرس اس داد و دہش سے مالا مال ہو جاتی ہے۔اگر حساب کیا جائے تو ہزارون بلکہ لاکھون روپیون کا مال

اسکو ایک آن مین مِلجاتا ہے۔

ناظرین! غور کا مقام ہے کہ ایک تو زمانۂ قدیم کا وہ سین ہے جو اوپر کھینچا گیا اور ایک یہ سین ہے جو ہر روز آپ بھی مشاہدہ مین آتا ہے۔ وہ بھی ایک داد و دہش تھی۔ یہ بھی ایک داد و دہش ہے۔ دونون مین کسقدر تفاوت ہے؟ اُنکی دولت کچھ اور تھی اِن کی دولت کچھ اور ہے۔ اُنکی ظاہری دولت لکڑیون کے باندھنے کی رسّی یا ایسی ہی کوئی اور چیز تھی۔ اِنکی دولت دنیا کے عیش و نشاط کے تمام سامان۔ اُنکی اصلی دولت ریاضت تھی۔ اور اصلی حظ وہ تھا جو وجدان سے حاصل ہوتا ہے۔ اور جسکی کوئی انتہا نہین۔ انکا اصلی سکھ حظ نفسانی ہے جسکی انتہا فوراً ہو جاتی ہے۔ بلکہ جو اکثر فوراً ہی مبدّل بہ رنج ہو جاتا ہے۔ اگر وہ لوگ انلوگونکی نگاہ مین محض جنگلی اور نامہذب سمجھے جائین گے لیکن یہی لوگ ہین جنکی طرف پروفیسر میکس مُلر کا اشارہ ہے اور وہ کہتے ہین "اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ کس آسمان کے نیچے انسانی طبیعت نے بڑا اثر کیا ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ مسائل پر عمیق غور ہوا ہے اور اُنہین سے بعض مسائل کو حل بھی کر لیا ہے تو مین کہونگا کہ وہ ہندوستان کا آسمان ہے"

غرض کہ ایک طرف وہ روحانی مسرت ہے جو وجدان سے حاصل ہوتی ہے اور یہ ایک خاصہ ہے زمانہ قدیم کی مشرقی تہذیب کا۔ اور دوسری طرف وہ حظ ہے جو سامانِ عیش و نشاط سے حاصل ہوتا ہے اور یہ ایک خاصہ ہے زمانۂ حال کے مغربی تہذیب کا جسپر ہم* فریفتہ ہو رہے ہین۔ مشرقی تہذیب والے دنیا کو* چند روزہ یا سرے سے فانی کہہ کر اسکی طرف سے دل کو ہٹانے کی کوشش مین رہتے ہین اور یادِ خدا یا اُسکی محبت کو اپنا سچا فریضہ سمجھتے ہین۔

اشعار

اک دن ہوگا کوچ صفر در　　چلنا ہوسی صاحب حضور ادھورا
کیون سویا ہے جاگ پیارے　　بین گئی بیتے سب تارے
منزل بھاری چلنا دور
کنکر چن چن محل اُسارے　　جھوٹے ہین یہ سب لبتارے
اک دن ہوسی چلنا چور
مات پتا گھر کی ناری　　کوئی نہین دُکھ بانٹن ہاری
سکھ کے ساتھی نہ ہو مسرور
یہ دنیا سپنے کی نائی　　جو آیا سو بھی چل جائی
اک رہے گا پربھو کا نور

ولہ

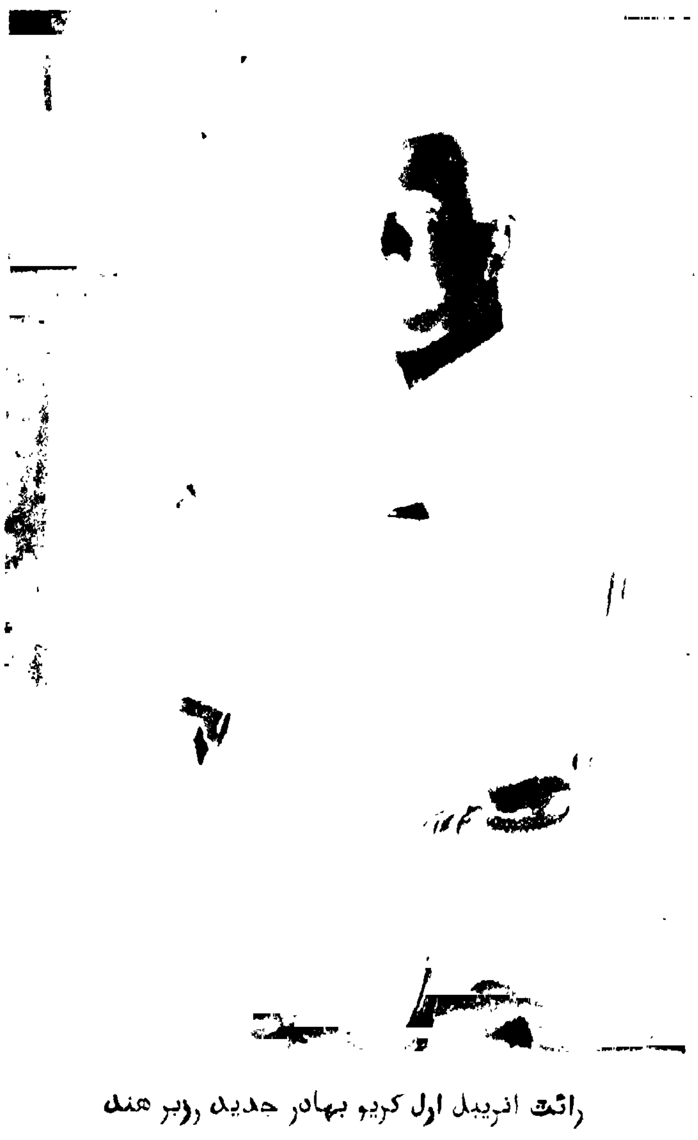
چھوڑ بستر اُٹھ رے غافل امرت بیلا بیتا یار رے
سگری رین نیند مین کاٹی برتھا سمے بتایا رے
یہ دُنیا ہے پلک بسیرا جسپر ٹھاٹھ جمایا رے
کیا بھروسہ ہے سانسون کا دم آیا نا آیا رے
مائی ہوگی پل چھن مین تب جب جم تجھے بلایا رے
سبھی ٹھاٹھ یہان پڑا رہیگا جس سے من بھٹکایا رے

برخلاف اسکے مغربی تہذیب والونکا یہ قول ہے کہ یہ دنیا ہی سچّی ہے اسلئے دنیا کی نارنگی کو ایسا نچوڑنا چاہیئے کہ اُسمین جتنا رس ہے وہ سب ہم نچوڑ لین اور ایک قطرہ بھی اُسمین باقی نہ رہے کیونکہ ہماری اس زندگی کے بعد ہماری کوئی ہستی باقی نہین رہتی کہ ہم پھر اس نارنگی کو نچوڑنے کے لئے آئینگے۔ سوامی وویکانند نے انگرسول مشہور دہریہ فلاسفر کو جب اسطرح کی گفتگو کرتے ہوئے سنا

* اگرچہ ہندؤن کے نزدیک دنیا کو اسلئے چند روزہ نہین کہا جا سکتا کہ حالت اگیان یعنی عدم عرفان مین اگیانی کے لئے دنیا بار بار ہے تاہم اُس سرور دائمی کے مقابلہ مین جسکے حاصل کرنے کی ہماری اصلی کوشش ہونی چاہیئے اسکو ہم چند روزہ یا فانی ہی کہینگے۔

تو اُنھوں نے یہ جواب دیا کہ مَین اس نارنگی کے رس کو چوُسنے کا بہتر طریقہ جانتا ہون اور مجھے رس بھی زیادہ ملتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مین کبھی مر نہین سکتا اور اسلئے مجھے کوئی عجلت نہین ہے کہ سب رس یکبارگی چوس لون۔ چونکہ مجھے اسکا خوف نہین ہے کہ مین ایک مرتبہ رس چوسنے کے بعد پھر رس چوسنے کے لئے نہین ہونگا اسلئے مین برابر رس کو چوستے رہنا پسند کرتا ہون اور اسمین مجھے بے انتہا رس ملتا ہے۔"

اس کو کیا مشرقی اور کیا مغربی تہذیب والے دونون قبول کرتے ہین کہ اس دنیا مین مصیبت ہی زیادہ ہے اور ہم سب اسی کوشش مین رہتے ہین کہ یہ مصیبت دور ہو۔ جب کسی کے پاؤن مین ذرا سا کانٹا لگ جاتا ہے تو وہ درد سے چلا اُٹھتا ہے اور فوراً اُس کانٹے کو نکالنے کی فکر کرتا ہے۔ تکلیف کسی کو پسند نہین۔ راحت سب کو پسند ہے یہ ایک قدرت کا خاصہ ہے۔ مگر مشرقی تہذیب والونکا یہ قول ہے کہ مصیبت کلیتہً کبھی نہین مٹ سکتی۔ چاہے ہم اسکے دفعیہ کی ہزار کوششین کیون نہ کرین۔ اگر کوئی ایک مصیبت ہماری کوششون سے اُسوقت کے لئے رفع ہو جائیگی تو پھر کوئی دوسری مصیبت اُسی کے سلسلہ مین یا کچھ وقفہ کے بعد ضرور پیدا ہو جائیگی۔ مثلاً ہم نے چند ادویات ایجاد کرکے بعض امراض کی تکلیف کو مٹا دیا ہے لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کسی مرض سے انسان کو نجات حاصل ہوئی ہے تو دوسرے امراض نے شدت کے ساتھ اُبھر لیا ہے۔ اگر مقطر پانی کے استعمال سے ہم نے ہیضہ کے زور کو کم کر دیا ہے تو نل کے پانی کے مکانون مین برابر بہتے رہنے سے تپ ولرزہ وغیرہ نے اپنا زور کیا ہے یا طاعون ہی کا مرض ایک ایسا شدید مرض پیدا ہو گیا ہے کہ جسکے دفعیہ کی کوئی تدبیر ابتک کارگر ثابت نہین ہوئی ہے۔ اسی طرح لنگر خانے خیرات خانے یتیم خانے سدابرت وغیرہ قائم کرکے افلاس کے زور کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ایک عالمگیر قحط کے پڑ جانے سے یہ سب تدبیرین بالکل بیکار ہو جاتی ہین۔ اور مخلوق خدا کو فاقہ کشی کی وہ مصیبت اُٹھانی پڑتی ہے کہ سوائے الامان الامان پکارنے کے اور کچھ بن نہین پڑتا۔ بہرحال دنیا سے مصیبت کو ہمیشہ کے لئے مٹا دینا غیر ممکن ہے اور اسلئے مشرقی تہذیب والون کا یہ خیال ہے کہ مصیبت کو جھیلنے ہی سے ہمیشہ کے لئے دور کیا جا سکتا ہے۔ ہم کو مصیبت جھیلنے کا ایسا عادی ہو جانا چاہئے کہ پھر وہ مصیبت ہم کو مصیبت معلوم نہو بلکہ عین راحت۔ ایسا خیال اُسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب خدا کی محبت کا سچا جوش ہمارے دلون مین پیدا ہو اور ہم سمجھین کہ وہ سراپا رحیم و کریم ہے اُسکو اپنے بندون کے ساتھ کمال محبت ہے اور اسلئے اگر کوئی مصیبت ہم پر نازل ہوتی ہے تو یہ بھی اُسکی عین شفقت ہے۔ یہ بھی کچھ نہ کچھ ہمارے ہی فائدہ کے لئے ہے۔ اور نہ ہو تو اسی لئے ہی کہ ہم مین اگر کوئی گند کی موجود ہے تو وہ اس مصیبت سے دُھل جائے۔ ایک سچے بھگت یعنی عاشق خدا کے دل مین تو ایسا ہی خیال پیدا ہوتا ہے جس سے وہ مصیبت کو مصیبت نہین سمجھتا ہے گو یہ صحیح ہے کہ ہمارے کل مصائب بنتیجہ ہمارے اعمال کے ہین اور اسلئے قہر یا رحمت خدا کو اسمین کوئی دخل نہین ہے۔ کیونکہ وہ منصف اور عادل ہے" بہرحال مصیبت تو



رائٹ انریبل ارل کریو بہادر جدید روبر ہند

انڈین پریس الہ آباد

ہمیشہ کے لئے صرف اسی ایک طریقے سے دور ہو سکتی ہے۔ یا اس طریقے سے کہ ہمکو سچا عرفان حاصل ہو جائے کہ ہم خود ہی ذات مطلق ہیں، ہم میں مصیبت اور راحت دونوں کیسی۔ اگر مصیبت کو دور کرکے سرور دائمی کے حاصل کرنے کا کوئی طریقہ ہے تو یہی ہے۔*

برخلاف اسکے مغربی تہذیب والون کا یہ بیان ہے کہ خدا نے انسان کو ذی عقل پیدا کیا ہے اور پھر وہ ذی حس بھی ہے۔ ممکن نہین کہ اُسکو تکلیف تکلیف معلوم نہ ہو اور جب عقل دی ہے تو وہ تکلیف کو محسوس کرتے ہی اسکو رفع کرنیکی فوراً فکر کرتا ہے یہ ایک فطرتی بات ہے۔ اور اسلئے ہمکو تکالیف کے دور کرنے کے تدابیر ضرور کرنا چاہئین۔ مضائقہ نہین اگر بعد ازان سلسلے ہی ہین یا وقفہ کے ساتھ کوئی دوسری تکلیف کیون نہ پیدا ہو جائے اور نہ صرف ہمکو تکالیف کو رفع کرنیکی کوشش کرنا چاہئے بلکہ راحت کے نئے نئے سامان پیدا کرنا چاہئین۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جتنے سامان آسائش اور راحت کے پیدا کئے جاتے ہین اُنکا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مصیبت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور تکلیف بھی زیادہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ مثلاً جب ہم پہلے پیدل چلتے تھے تو ہمکو بہت بڑی تکلیف معلوم ہوتی تھی اور جب ہم نے بیل گاڑی ایجاد کرکے اُسمین بیٹھکر سفر کرنا شروع کیا تو ہمکو ایک طرح کی راحت محسوس ہوئی اور پھر کمانی دار گاڑی ایجاد کرکے اور اُسمین گھوڑا لگا کر جب ہم اُسکے ذریعہ سے سفر کرنے لگے تو اور بھی زیادہ راحت محسوس ہوئی اور آخر مین جب ریل ایجاد ہو گئی تو اُسکے ذریعے سے سفر کرنے مین سفر کی تکلیفین گویا بالکل مفقود ہو گئین یہ سب کچھ صحیح ہے اور اب ہمکو جیسی کچھ راحت سفر مین حاصل ہوتی ہے اُس سے بڑھ کر راحت کا ملنا شاید اسوقت ہمارے خیال مین نہ آئے۔ لیکن جب بیلون یا ہوائی جہازون مین سفر کرنا ممکن العمل ہو جائیگا تو اُسوقت یہ ریل کا سفر بھی جسمین ہمکو بہت بڑی راحت معلوم ہوتی ہے بہت شاق اور تکلیف دہ معلوم ہونے لگے گا۔ غرضکہ جتنے زیادہ راحت بخش ذرایع سفر کے ایجاد ہوتے جائینگے اتنی ہی زیادہ تکلیف بڑھتی جائیگی۔ مثلاً اب جبکہ ہم بذریعہ ریل سفر کرتے ہین اگر اتفاقاً کوئی ایسا موقع پیش آجائے کہ ہمکو بیل گاڑی پر سفر کرنا پڑے تو ایسی صورت مین بیل گاڑی مین بیٹھکر چلنے سے جو مصیبت ہمکو محسوس ہوگی اُسکی تصریح فضول ہے۔

---

* آتما کو پرمانند سروپ یعنی سرور مطلق کہا گیا ہے اور اس لئے حقیقی ہستی صرف اُسی پرمانند یعنی سرور مطلق کی ہے اور جسکو تکلیف مطلق کہین گے اُسکا کوئی حقیقی وجود نہین ہے۔ چونکہ ہم اس سرور مطلق کو اگیان یعنی جہل سے بھولے ہوئے ہین اور ہم نے اپنے کو اُس سے الگ کچھ اور سمجھ لیا ہے۔ اس لئے یہ تکالیف صرف ریلیٹو Relative یعنی مجازی معنی مین ہم کو محسوس ہوتے ہین ورنہ ان تکالیف کا کوئی اصلی وجود نہین ہے۔ اصلی وجود ہے تو اُسی پرمانند یعنی سرور مطلق کا۔ جس وقت یہہ تکالیف ہماری تدبیرون سے یا کسی اور طرح کم ہو جاتے ہین تو صرف اُس وقت کے لئے اُس سرور مطلق کا گویا عکس پڑ جاتا ہے اور ہم کو وہ مجازی سکھ محسوس ہوتے ہین جنکی نسبت یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ اُسی پرمانند یعنی سرور مطلق کے ظہور یا پرتو ہین۔ اور اگر وہ آنند ہوتا تو یہ مجازی سکھ بھی نہ ہوسکتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ہم ان تکالیف کو ہمیشہ کے لئے دور کر سکین جو صرف تکالیف کو تکالیف سمجھنے یا اس گیان سے ہو سکتا ہے کہ ہم پرمانند سروپ ہین تو پھر ہم کو اُس سرور واقعی کی حالت جو ہم کو فی الحقیقت ہمیشہ حاصل ہے اور جسکو ہم بھولے ہوئے ہین پھر حاصل ہو سکتی ہے۔

ریل کی ایجاد سے پہلے بیل گاڑی مین بیٹھ کر چلنے سے ہمکو وہ راحت محسوس ہوتی تھی کہ ہم گویا یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے بڑھ کر کوئی صاحب نصیب نہ ہوگا۔ لیکن اب اُسی بیل گاڑی مین بیٹھکر چلنے سے ہمکو وہ مصیبت معلوم ہوتی ہے کہ ہم یہ خیال کرنے لگتے ہین کہ ہم سے بڑھ کر کوئی بدنصیب نہ ہوگا۔ غرضکہ یہ تکلیف اور آرام کُلّ اعتباری ہین اور انکا انحصار آدمی کی عادت اور استطاعت پر ہے۔ جتنی استطاعت بڑھتی جائیگی تکلیف بھی زیادہ محسوس ہوگی۔ تکلیف اور راحت مین جو فرق ہے وہ صرف درجہ کا ہے نہ کہ نوعیت کا۔ اور جسقدر کم فرق درجہ کا ہوتا جائیگا اُتنا ہی تکلیف اور آرام کا خیال کم ہوتا جائیگا۔ پس تکلیف تو قطعاً تب ہی رفع ہو سکتی ہے جب ہم مشرقی تہذیب والون کے ہم خیال ہوکر تکلیف کو تکلیف اور آرام کو آرام نہ سمجھین یا ان دونون مین جو فرق درجہ کا ہے اُسکو گھٹا کر اس درجے پر لائین کہ پھر یہ فرق ہمکو زیادہ محسوس نہ ہو[1]۔ غرضکہ مشرقی تہذیب کا آئیڈیل تیاگ یعنی ترک لذات ہے۔ برخلاف اسکے مغربی تہذیب کا آئیڈیل بھوگ یعنے طلب لذات ہے اور ظاہر ہے کہ اس دنیا مین کوئی ایسے لذات نہین جنکے انجام مین بعد حظ کے خود کو تکلیف نہ محسوس ہو۔ یا قبل اُسکے دوسرونکو تکلیف نہ پہونچی ہو۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ تیاگ یعنی ترک کیٔین وصف سمجھا جائیگا جو ذی استطاعت ہے۔ اور جو بھکاری ہے اُسمین تیاگ کوئی معنی نہین رکھتا مثلاً بھگوان بُدھ جی کا ایک اعلیٰ تیاگ تھا۔

مولوی سید علی صاحب بلگرامی نے تمدّن ہند جو ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ کیا ہے اور جسکا ایک حصّہ ادیب کے جون نمبر مین شائع ہوا ہے اُسکا ایک اقتباس ذیل مین درج کیا جاتا ہے۔

"پس گویا انسان کی عقبیٰ کا دار و مدار مذہب عیسوی کی طرح کسی خاص فعل پر نہین اور نہ انسان کی اخیر حالت اور توبہ پر بلکہ اسکے کُلّ افعال کے مجموعہ پر ہے اور اس مجموعہ مین خفیف سا خفیف فعل بھی اپنی قیمت اور حیثیت رکھتا ہے۔ منو لکھتے ہین۔

" وہ افعال جو خیال اور زبان اور جسم سے پیدا ہوتے ہین اُنکے نتائج یا تو اچھے ہوتے ہین یا بُرے اُنھین افعال سے انسان کی مختلف حالتین پیدا ہوتی ہین یعنی اعلیٰ متوسط اور ادنیٰ" (منوشاستر بارھوان باب ۳) یہی اعتقادات ہین جو ہندو کو

[1] یہان یہ مراد ہرگز نہین ہے کہ اگر ہمارے جسم مین کانٹا لگ جاے تو اُس کانٹے کو نہ نکالین اور کانٹے کی تکلیف برداشت کرتے رہین یا اگر ہمین کوئی بیماری ہو جاے تو اُس بیماری کے دفعیہ کی کوئی تدبیر نہ کرین۔ یہ کُل تدابیر فطرتی طور پر اُنکو کرنا ہی پڑتے ہین جو ہنوز محو عشق الٰہی نہین ہوئے ہین یا جن مین استغراق کی حالت پیدا نہین ہوئی ہے۔ پرم ہنس رام کرشن جی جب انت کال کے سمے مین مُبتلاے مرض سرطان ہو گئے تھے تو اُنکو اس خوفناک مرض کی تکلیف بوجہ اسکے کہ وہ اکثر سمادھی مین رہتے تھے مطلق محسوس نہ ہوتی تھی لیکن ایسی حالت سب کی نہین ہو سکتی اس لئے جب تک ایسی حالت پیدا نہ ہو رفع تکلیف امراض کے لئے تدابیر کا عمل ضروری اور فطرتی بات ہے۔ لیکن دیگر امور مین ہمین اپنے آپ کو آرام کا ایسا خوگر نہ کر لینا چاہئے کہ ہم کو تبدیلی حالت مین تکلیف محسوس ہو۔ مثلاً ہمین اپنی کچھ ایسی عادت کر لینی چاہئے کہ ریل اور بیل گاڑی دونون کے ذریعے سے سفر یکسان معلوم ہو یا سخت زمین پر ویسے ہی بآرام سو سکین جیسے کہ ایک نرم گدّے پر۔

سخت سے سخت کا پابند کر دیتے ہین اور خفیف سے خفیف کام کے کرنے اور چھوٹی سی چھوٹی حاجت نکالنے کو بھی اسکی مرضی پہ چھوڑتے ادنیٰ سی ادنیٰ بے احتیاطی یا غلطی بھی شدید نتائج پیدا کرتی ہے اور اُن نتائج سے بچنے کے لئے غلطی کے بعد ہی سخت اعمال اور عبادات کے ذریعے سے اُسکو رفع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

ان غلطیون یا ان گناہ وغیرہ کی نسبت انسان کی رائے کچھ کام نہین آتی نہ اس سے کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے کہ گناہ کرتے وقت کسی نے دیکھا یا نہین دیکھا۔ گناہ گار خود اپنے فعل کے نتائج کو سمجھتا ہے اور اسکو مٹانے کے لئے بعض صورتون مین نہایت سخت کفارہ دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ منوشاستر کے اُس باب کو جسمین پرایشچت یعنی کفارہ کا بیان ہے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ مین جسکا ہم ذکر کر رہے ہین ہندو کن سخت زنجیرون مین جکڑے ہوئے تھے اور ویدی زمانہ کی آریا آزادی اور اُس زمانہ کی جکڑبندی مین کسقدر فرق عظیم تھا۔ وہ قدیم آزاد اور خوشحال مخلوق مرمٹی تھی اور اُسکی جگہ ایک ایسی مخلوق نے لی تھی جو آنکھ بند کئے ہوئے حیوانات کی طرح بلا آرام اور چین بلا آسی و قفہ کے شدید معیبت کی بادیہ نوردی مین مبتلا تھی۔

دیکھنا چاہئے کہ ہمارے عالم مصنف صاحب کی یہ رائے کہان تک صحیح ہے۔ وہ لکھتے ہین کہ انسان کی عقبیٰ کا دارومدار مذہب عیسوی کی طرح کسی خاص فعل پر نہین اور نہ انسان کی اخیر حالت اور توبہ پر بلکہ اُسکے کل افعال کے مجموعہ پر ہے اور اس مجموعہ مین خفیف سا خفیف فعل بھی اپنی قیمت اور حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندؤن کے مذہب مین انسان کی عقبیٰ کا دارومدار مذہب عیسوی کیطرح صرف حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے خصوص اس بات پر ایمان لانے پر نہین ہے کہ حضرت عیسیٰ نے انسان کے ازلی گناہ کا کفارہ اپنے خون سے دیا مگر جناب مصنف صاحب کا یہ کہنا صحیح نہین ہے کہ ہندؤن مین انسان کی اخیر حالت و توبہ پر اُسکی عقبیٰ کا دارومدار نہین ہے۔ شاستر کا برابر یہ مقولہ ہے کہ انسان کی اخیر حالت جیسی ہوتی ہے اُس سے اُسکی آئندہ کی زندگی ترشتی ہے۔ مثلاً اگر کسی کا نفس مرتے وقت خواہشات نفسانی مین پھنسا ہوا ہے اور انھین خیالات مین اُسکی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو وہ دوسرے جنم مین ضرور ایسے قالب مین پیدا ہوگا جہان اُسکو ان خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کا کافی موقع ملے گا۔ گو وہ اسطرح اوولیوشن Evolution کے میدان مین اپنے آپ کو پیچھے گرا دیگا لیکن جو ایک بار سچی عقیدت کے ساتھ اپنے گناہون سے توبہ کر کے خدا کی پناہ مین گیا ہے اُسکے لئے نجات کا دروازہ برابر کھلا ہوا ہے۔ یا کم سے کم اُسکا نفس اسقدر صاف و پاک ہو جاتا ہے کہ پھر گیان کے ذریعے سے نجات کا حاصل کرنا کوئی مشکل امر نہین رہتا ہے۔ بلاشک خفیف سا خفیف فعل بھی اپنی قیمت اور حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی فاسد خیال ہمارے دل مین پیدا ہو جائے تو اُسکا اثر بد ضرور ہوگا۔ گو وہ اثر تھوڑی دیر کے لئے کیون نہ ہو۔ یعنے یہ کہ ہم کو اُسکی پاداش مین کوئی تکلیف ضرور اُٹھانی پڑے گی۔ جسقدر زور کے ساتھ کوئی برا خیال پیدا ہوتا ہے یا کسی فعل بد کا ارتکاب ہوتا ہے اُسیقدر جلد اُسکی سزا بھی ملتی ہے۔ جب ہم ایک گیند کو زور سے دیوار پر مارتے ہین تو وہ گیند فوراً ہی زور کے ساتھ پلٹتا ہے۔ یہی حال ہمارے خیالات یا ہمارے افعال کے نتائج کا ہے۔ جب مادّی دنیا مین ہم دیکھتے ہین کہ ہر علت کا معلول ہے اور کوئی معلول بغیر علت کے نہین ہے تو کیا سبب ہے کہ ہم اخلاقی دنیا مین بھی اس قانون کو عمل پذیر نہ سمجھین۔ آپکے نزدیک کوئی فعل بہت ہی خفیف معلوم ہوتا ہوگا اور اس قابل نہوگا کہ اُسپر کوئی لحاظ کیا جائے۔ لیکن فاعل جو اپنے نفس کو خوب سمجھتا ہے اگر اپنے فعل سے شرمندہ ہوا ہے تو وہ ضرور اُسکو بڑی وقعت

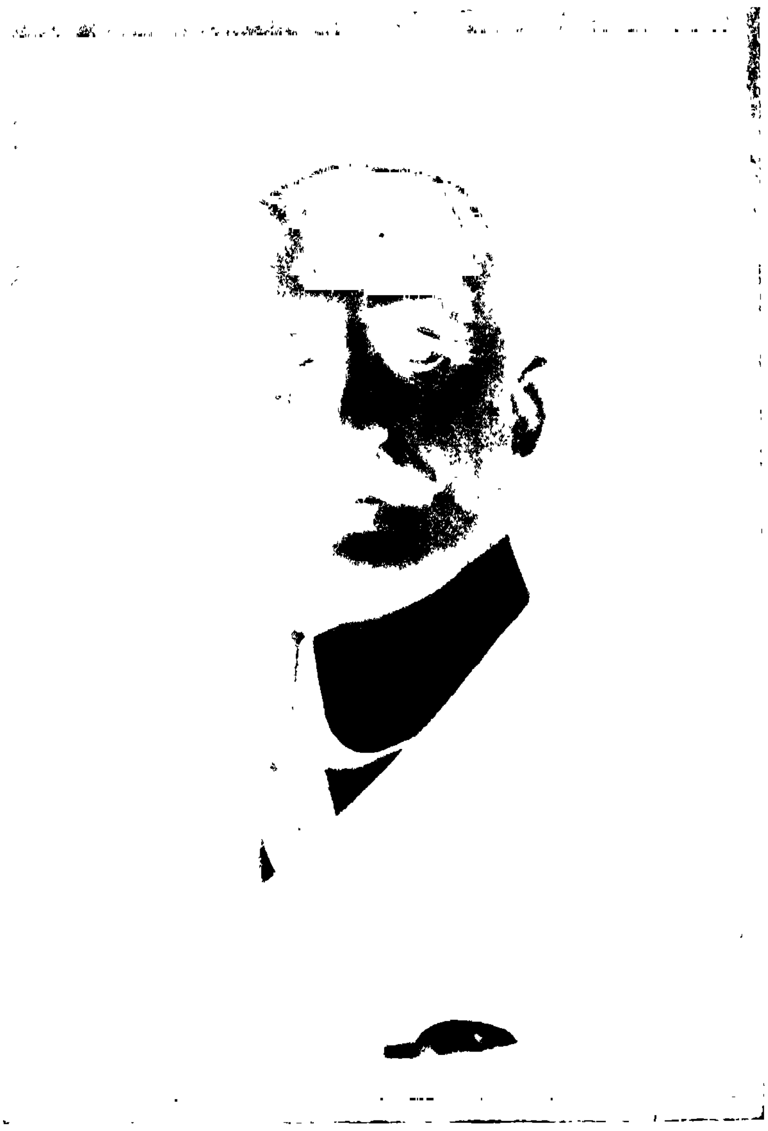
دیگا اور سخت ریاضتون اور طہارت کے ذریعے سے اُسکا کفارہ دینے کو تیار ہوگا۔* فاضل مصنف نے ایک عجیب بات لکھی ہے کہ ان غلطیون اور گناہ صغیرہ کی نسبت انسان کی راے کچھ کام نہین آتی نہ اس سے کچھ فائدہ حاصل ہوسکتا ہے کہ گناہ کرتے وقت کسی نے دیکھا یا نہین دیکھا۔ اگر بالفرض گناہ کرتے وقت کسی آدمی نے نہین بھی دیکھا تو کیا خدا اُسکا دیکھنے والا نہین ہے؟ اور اگر اسکو بھی نہ مانو کہ خدا سب کے افعال کا دیکھنے والا ہے تو کیا گناہگار کے کانشنس Conscience پر اُس کے افعال کا اثر نہین پڑتا۔ کانشنس پر گناہ کا بار رہنا ہی اسکے لئے کافی ہے کہ وہ اپنے کانشنس کو اس بار سے ہلکا کرے۔ ہندؤن مین جو کرم کانڈی ہین وہ اسیطرح دانستہ یا نادانستہ اپنے گناہون کا کفارہ دیتے ہین اور اُنھون نے اپنے کو ان قواعد کا پابند کرلیا ہے جنکی نسبت ہمارے فاضل مصنف کا یہ بیان ہے کہ ہندو قوم آنکھ بند کئے ہوے حیوانات کی طرح بلا آرام اور چین بلا ربلا کسی وقفہ کے شدید مصیبت کی بادیہ نوردی مین مبتلا ہے۱؎ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ گناہ تو کیا جائے مگر گناہ کے نتائج کا کوئی اثر نہ ہو۔ گناہ کے اثر سے بچنے کے لئے اگر قبل از قبل کوئی ڈنڈ جسمانی یا مالی دیدیا جائے تو کیا اسمین گناہگار کی بہبود متصور نہین ہے۔

ہمارے عالم مصنف نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ ویدی زمانہ کی آریا آزادی اور برہمنی زمانے کی جکڑبندی مین کسقدر فرق عظیم تھا بالکل صحیح ہے۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ویدی زمانہ ایک ابتدائی زمانہ تھا جب انسان ایک نہایت ہی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ گناہ نے اپنا کوئی بڑا تصرف اُسکے نفس پر نہین کیا تھا۔ وہ صرف سنا جاتون کے ذریعے سے اپنے خواہشات کے حاصل کرنے کی تمنا رکھتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے مادی تہذیب نے ترقی کی انسان کے نفس پر خیالات بد نے اپنا تصرف کرنا شروع کیا اور جب خیالات بد پیدا ہونے لگے تو نفس کو ان سے پاک کرنیکی بھی ضرورت ہوئی۔ پس طہارت اور عبادت کے ذریعے سے ان گندہ اور ناپاک خیالات کو دور کرنا عین فرض سمجھا گیا۔ زمانے کی حالت کے لحاظ سے قانون ہوا کرتا ہے جب زمانے نے اسکی ضرورت پیدا کی کہ نفس مین جو گندگی خیالات فاسد کی وجہ سے پیدا ہوجاتی ہے اُس سے اُسکو پاک کیا جائے تو طہارت اور عبادت کے متعلق اُس قسم کے قواعد جاری کرنے کی ضرورت داعی ہوئی جو ہماری اسمرتیون مین درج ہین۔ اب مین ہندو تہذیب پر اپنے ہی ایک مضمون سے جو ایک زمانہ مین دکن ریویو مین شائع ہوا تھا عبارت ذیل مقتبس کرتا ہون۔

"قدیم ہندوستان کے دو مختلف سین بلحاظ اُس زمانے کی سوشیل حالت کے یہان دکھائے جاسکتے ہین ایک سین جنگلون کا اور ایک شہرون اور بستیون کا۔ پہلا سین نہایت دلچسپ و دلفریب ہے۔ عین جنگل مین گنگا یا جمنا یا کسی اور ندی کے کنارے رشیون کا تپوبن یعنی ریاضت کا مقام ہے جہان ادھر اُدھر اُن کے رہنے کی کٹیان بنی ہوئی ہین۔ اُن کٹیون مین ایک طرف سمدھی یعنی حوم کرنے کی لکڑیون کے ڈھیر ہین جو خود اُنھین رشیون نے اپنے ہاتھون سے

۱؎ ممکن ہے آپ کے نزدیک کوئی فعل گناہ صغیرہ مین داخل ہو یا بالکل ہی گناہ نہو۔ مگر ہندوان مین وہ ایک گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہو۔ مثلاً چچازاد بہن کے ساتھ شادی ہندوان مین اُتنا ہی ایک فعل قبیح ہے جتنا کہ ایک حقیقی ہمشیرہ کے ساتھ ایسے تعلق کا ہوجانا مگر دوسرے مذاہب یا اقوام مین یہ فعل گناہ نہین۔ گناہ کیا ہے اسکا اندازہ ہر سوسائٹی اپنے مقرر کئے ہوئے قواعد یا رواجون سے کیا کرتی ہے۔

* اور جو طریقۂ بھکتی پر چلتے ہین وہ شخصی خدا کی پناہ مین جاکر توبہ کے ذریعے سے اپنے نفس کو پاک کرتے ہین۔



ہز اکسلنسی وائیکونٹ لارڈ ہارڈنگ بہادر آف پنسہرسٹ
جدید وایسرائے و گورنر جنرل کشور ہند

انڈین پریس الہ آباد

...کر یہان جمع کی ہین۔ ایکطرف پانی بھرنے کا کلسہ رکھا ہے اور ھوم کیلئے جو
...امان چاہئے وہ سب یہی ہے بیچ مین ھوم کرنیکی چوکھٹی یعنی مستطیل بیدی بنی ہوئی
ہے اور ایکطرف آگی ہوتر کا کنڈ ہے جسمین صبح وشام آگنی ہوتری ویدمنترونکو پڑھ پڑھکر
...لکڑیونکو آگ مین ڈالتے رہتے ہین کسی جگہ منی ان یعنی اُس غلہ کا انبار ہے جو اُن رشیونے
اپنے کھانیکے لئے جنگل کی خودرو گھاس سے گراہوا اکٹھا کرکے یہان جمع کیا ہے اور کہین جنگلی پھل
...اور زمین قند رکھے ہوئے ہین جو اُن رشیون نے اپنے کھانیکے لئے اکٹھا کئے ہین باہر تپوبن
یعنی جنگل کو دیکھئے تو جنگلی جانور مثل ہرن وغیرہ کے آدمیون سے
ایسے ہلے ہوئے ہین کہ آدمی کی آہٹ پاکر ذرا بھی نہین چونکتے۔ جن جگہون
مین دوب کٹ گئی ہے وہان ان ہرنون کے بچے بالکل ہی بیدھڑک
ہوکر چرتے پھرتے ہین۔ جا بجا ہنگوٹ پینے کی چکنی سلین رکھی ہوئی
ہین اور درختون کی نئی نکلی ہوئی کونپلون مین ھوم کا دھوان لگ لگ
کر مائلے بتے میلے ہوگئے ہین۔ ان کٹیون مین دو طرح کے لوگ رہتے
ہین ایک وہ جو بان پرستھ آسرم یعنی تیسرا آسرم اختیار کرکے یہان
تارک الدنیا ہوگئے ہین اور دوسرے وہ جنھون نے ابھی برہمچرج
آسرم اختیار کرکے علمی وروحانی دولت کے خزانون کو جمع کرنے کیلئے
ان رشیون کے پاس پناہ لی ہے۔ واضح رہے کہ ہندؤن نے اپنے
فرائض کے لحاظ سے اپنی عمر کو چار زمانون پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا زمانہ
طالبعلمی کا ہے جسکو برہمچرج آسرم کہتے ہین دوسرا زمانہ خانہ داری کا
ہے جسکو گرہست آسرم کہتے ہین تیسرا وہ آسرم ہے جب گھر بار کو چھوڑکر
وانپرستھ کے لئے جنگل کی سکونت اختیار کی جاتی ہے اسکو بانپرستھ آسرم
کہتے ہین اور چوتھا وہ آسرم ہے جب آدمی صرف تارک الدنیا ہی نہین
ہوجاتا ہے بلکہ کل مذہبی ودنیوی فرائض کی پابندی سے رہا ہوجاتا
ہے اور اسکو سنیاس آسرم کہتے ہین۔ پہلے اور تیسرے آسرم کا زمانہ
جنگل مین بسر ہوتا ہے اور دوسرا بستیون مین اور چوتھے کے لئے
کوئی جگہ مقرر نہین ہے جہان چاہے رہے مگر ایک جگہ مقیم ہوکر

نہ رہے۔ جس تپوبن یا ریاضت گاہ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہان
پہلے اور تیسرے آسرم کے لوگ جمع ہین۔ ایک طرف تو وہ لوگ
ہین جو بانپرستھ آسرم مین بسے ہوئے ہین مگر ابھی تک انھین
فرائض مذہبی ادا کرنے پڑتے ہین۔ دوسری طرف کم وبیش سن کے
برہمنون اور چھتریون کے وہ لڑکے ہین جو بغرض تحصیل علم ان
بوڑھے رشیون کے پاس جمع ہوئے ہین یہ ابھی برہمچرج آسرم مین
داخل ہوئے ہین اور انکا جنیو ہوگیا ہے۔ یہ وہ رسم ہے جسکے بعد انکو
ویدون کے پڑھنے کا استحقاق حاصل ہوجاتا ہے۔ جس عمر مین یہ رسم
زمانہ قدیم مین ادا ہوتی تھی وہ برہمنون کے لڑکون کے لئے ۸ سال
سے ۱۶ سال تک تھی اور چھتریون کے لڑکون کے لئے ۱۱ سال سے
۲۲ سال تک اور ویشون کے لڑکون کے لئے ۱۲ سال سے ۲۴ سال
تک تھی۔ اب تو دس بارہ سال کی عمر مین ہی شادی کردی جاتی ہے
اور برہمچرج یعنی طالب علمی کا زمانہ بہت ہی تھوڑا رہتا ہے اور وہ
بچپنے مین گزر جاتا ہے غرض کہ جو فوائد برہمچرج کے رکھے گئے ہین
وہ اب بالکل مفقود ہین۔ اس زمانہ برہمچرج یعنی طالب علمی مین
لڑکے کے لئے لازم تھا کہ وہ تمام لذیذ کھانون اور خوشبودار
روغنون یعنی کل اقسام کے سامان عیش سے پرہیز کرے۔ لڑکا
بالون کو ایک گچھے مین باندھ کر اور ایک لکڑی کو اپنے ہاتھ مین لیکر
ہر صبح بعد فراغت حوائج ضروری وعبادت مقررہ آس پاس کے
گاؤن مین بھیک مانگنے جاتا تھا۔ اُس کا فرض تھا کہ جو بھیک
اُسکو اسطرح ملے وہ اپنے گرو کے سامنے رکھدے اور جب
گرو کھانے سے فارغ ہوجائے تو اُسکی اجازت سے آپ کھائے
جنگل سے ھوم وغیرہ کی لکڑی لانا بھی اسی کا کام تھا۔ اُسکو
کھیل کود دل لگی مین شامل ہونے کی قطعاً ممانعت تھی اور
نفس پر قادر رہنے کی سخت ہدایت تھی۔ . . . .

. . . . تعلیم بالکل زبانی دی جاتی تھی۔ گرو چیلون کو پڑھ کر سُناتا جاتا تھا اور لڑکا سُنکر یاد کرتا تھا۔ کوئی کتاب وغیرہ ہرگز استعمال نہین کی جاتی تھی۔ پروفیسر مکس ملر لکھتے ہین کہ یہ حیرت کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ چارون وید اور اُسکے کُل انگ ویاکرن وغیرہ اسی طرح ہر ایک کے زبان پر تھے اور کچھ علم جو روحانی قسم سے ہوتا تھا صرف سینہ بسینہ دیا جاتا تھا۔ یہ تپوبن اُس زمانہ کی درسگاہین تھین۔ وہ بڑے بڑے کالج اور مدرسے تھے جو کسی بلند و عالیشان عمارت کے لئے نہین بلکہ اس تعلیم کے لئے مشہور تھے جو وہان دی جاتی تھی۔ عالیشان عمارتون کی جگہ صرف پتون یا گھاس کی کٹیان تھین اور بیٹھنے کے لئے بجائے کرسیون یا بنچون کے مرگ چھالا یا اور کوئی آسن استعمال کیا جاتا تھا۔ یہان جو تعلیم دی جاتی تھی وہ محض ویدون کی تدریس نہ تھی بلکہ عمیق مسائل فلسفہ بھی یہان حل ہوتے تھے۔ وہ بوڑھے رشی جنھون نے دنیا سے اپنا تعلق اُٹھا لیا تھا ان جنگلون مین اسی فکر و غور مین رہا کرتے تھے کہ اسرار روحانی کو کس طرح حل کرین چنانچہ اسی فکر و غور سے اُنھون نے عقدۂ دنیا کے متعلق بڑے بڑے مسائل اور باریک نکتون کو حل کیا تھا جو فی زمانناً اُن کے جاننے والون کو حیرت مین ڈال رہے ہین جیسا کہ پروفیسر مکس ملر نے فرمایا ہے۔ ”اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ کس آسمان کے نیچے انسانی طبیعت نے بڑا زور کیا ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ مسائل پر عمیق غور ہوا ہے اور اُن مین سے بعض مسائل کو حل بھی کر لیا ہے تو مین کہونگا کہ وہ ہندوستان کا آسمان ہے۔“

جب لڑکا اسطرح تحصیل علم سے فراغت حاصل کر لیتا تھا تو وہ بستیون مین اپنے باپ کے گھر واپس جاتا تھا اور شادی کر کے گرہست آسرم یعنی خانہ داری کو قبول کر لیتا تھا۔ خانہ داری کے فرائض کو ادا کرنے کے بعد وہ پھر تپوبن یعنی جنگل مین آکر ریاضت کیلئے بانپرستھ آسرم مین داخل ہوتا تھا۔ بڑے بڑے راجے مہاراجے اسیطرح تپوبن مین آکر بستے تھے اور مثل برہمنون کے وہ بھی خاکساری کے ساتھ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے معرفت حاصل ہو جانیکے بعد چوتھا آسرم شروع ہوتا تھا جسکو سنیاس آسرم کہتے ہین۔ یہان تمام قیود کٹ جاتے تھے۔ نہ اب مذہبی رسوم کی اور نہ کسی اور رسم کی پابندی لازم تھی۔ اس آسرم کے لوگ جنکو سنیاسی کہتے ہین حالت استغراق مین ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتے پھرتے تھے اور لوگون کو نیک ہدایت اور تعلیم عرفان دیا کرتے تھے۔ وہ لوگ سچے سنیاسی اُس زمانہ کے سچے عرفان کے نور سے چمکتے تھے اور جہان اُنکا گزر ہو جاتا وہان کے لوگون کی قسمت کھل جاتی تھی۔ آج کل کے سنیاسیون کی سی حالت نہ تھی کہ اُن کو اپنے آنے کا نوٹس دینے کی ضرورت ہوتی ہے مثل مشک کے جسکی مہک تمام اطراف مین خود بخود پھیل جاتی ہے اُن سنیاسیون کے آنے کا علم سب کو ہو جایا کرتا تھا اور لوگ خود بخود جمع ہو جاتے تھے۔ یہ سنیاسی کبھی اپنی طرف سے کھانیکا سوال نہین کرتے تھے جو کھانا چاہے کسی طرح کا وہ کیون نہ ہو اُن کو مل جاتا تھا وہ کھا لیا کرتے تھے اور ایک مقام پر تین روز سے زیادہ رہنے کی اُنکو اجازت نہ تھی۔

اب کچھ ذکر دوسرے آسرم یعنی خانہ داری کا کیا جاتا ہے جسکو گرہست آسرم کہتے ہین۔ یہ سب سے بڑا آسرم ہے کیونکہ اسی کے سہارے پر باقی دیگر آسرمون کی زندگی ہے۔ وشسٹ جی فرماتے ہین ”جسطرح چھوٹے اور بڑے دریا سمندر مین جا ملتے ہین اُسیطرح کل طبقون کے لوگون کو خانہ دارون کے یہان پناہ ملتی ہے۔“ خانہ داری کے ساتھ بہت بڑے بڑے اور سخت فرائض متعلق

کئے گئے ہین۔ ہندوؤن کی ساری زندگی مذہبی زندگی ہے مگر خانہ داری کے ساتھ یہ مذہبی پابندیان بہت سخت کر دی گئی ہین۔ سب سے بڑی ہدایت خانہ داری کے لئے یہ تھی کہ وہ اگنی ہوتر کرے اور مہمان نوازی تو اُسکا ایک نہایت ہی اعلیٰ فرض سمجھا جاتا ہے ۔

برخلاف حال کے ہندوستان کے قدیم ہندوستان مین اپنا ہی پیٹ بھر لینا نہایت ہی مذموم سمجھا جاتا تھا۔ منو کا قول ہے کہ کوئی گرہست یعنی عیالدار کھانا نہ کھائے جب تک کہ وہ کسی مہمان کو نہ کھلائے۔ مہمان سے یہان مراد دوست آشنا وغیرہ سے نہین ہے بلکہ مہمان سے مراد وہ اشخاص ہین جو یکایک وارد ہو جائین اور جن سے پہلے کی کوئی شناسائی نہ ہو اور جو اُسی بستی کے نہ ہون جہان خانہ دار رہتا ہے اور یہ مہمان کسی فرقہ کے کیون نہ ہون مگر فضیلت برہمنو کو دیجاتی تھی اُنکے بعد چھتریون ویشیون اور شودرون کو سلسلہ بسلسلہ یہ حکم تھا کہ مہمانون کو کھلا چکنے کے بعد اور جو کوئی مستحق ہو اُسکو کھلائے اور اگر کوئی عزیز اقارب یا دوست اُسکی دستگیری کے مستحق ہون تو اُنکو کھلائے۔ نوکرون وغیرہ کو بھی پہلے کھلا کر اور کتون وغیرہ کو حصہ دیکر آخر مین میان بیوی کو کھانے کی ہدایت تھی۔

غرض کہ گرہست کو بھی ایک طرح کہ ترک کے زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہے۔ وہ پیسہ بھی اگر پیدا کرتے تو اسلئے کہ دھرم کے کامون مین صرف کیا جائے اور نہ اسلئے کہ ذاتی عیش وعشرت پر خرچ ہو۔ . . . .

. . . .

. . . .

منو نے طہارت کے متعلق جو ہدایتین کی ہین وہ اسقدر سخت ہین کہ اب شاید ہی کوئی اُن پر پورا پورا عمل کرتا ہے۔ قضائے حاجت کے بعد بول و براز دونون صورتون مین مٹی اور پانی سے کئی بار طہارت کرنے کی ہدایت اسمرتیون مین درج ہے۔ . . . . ندی یا تالاب یا باولی مین غسل کرنے کی ہدایت ہے ۔ نہ یہ کہ پانی کے چند لوٹون سے غسل کر لیا جائے۔

خانہ دار کے لئے عبادت کی بھی بہت سخت تاکید ہے۔ ہندوؤن کا ایک زمانہ تھا جب سورج نکلنے سے پہلے حوائج ضروری سے فارغ ہو کر اور غسل کرنے کے بعد سندھیا یعنی عبادت کے لئے لوگ ندیون کے کنارے بیٹھ جایا کرتے تھے اور گنگا جمنا و سرسوتی کے کنارون کے اُس وقت کے سین کا اگر کوئی فوٹو کھینچا جائے تو ایک عجیب سُہانا منظر نظر آئے گا۔ نہ انکو سخت سے سخت جاڑے کی پرواہ تھی اور نہ اس بات کی کہ ہماری نیند حرام ہوئی۔ خدا کی عبادت کو وہ عین فرض سمجھتے تھے اور جو عبادت کی جاتی تھی وہ کسی دنیوی غرض کے ساتھ وابستہ نہ ہوتی تھی۔ مثل حال کے یہ دعا نہین کیجاتی تھی کہ یا خدا تو بڑا رزاق ہے ہمارا رزق ہمکو عطا کر۔ ان لوگون کو جسم کی پرورش کی تمنا نہ تھی۔ وہ تو محض روحانی روشنی کے خواستگار تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہندوؤن کا سب سے بڑا منتر جو گایتری ہے اُسمین یہی مانگا جاتا ہے کہ یا خدا تو ہمکو روشن ضمیر کر یعنی ہمارے فہم وادراک کو روشن کر۔ اس گایتری مین اگرچہ آفتاب کی طرف خطاب ہے مگر آفتاب ہی وہ سب سے بڑا نور ہے جو اصلی نور حقیقی سے منور ہے "

مندرجہ صدر اقتباس کو پڑھکر ہمارے ناظرین انصاف سے کہین کہ جسطرز معاشرت کے اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اُس سے کیا روحانی اور کیا جسمانی لحاظات سے بنی نوع انسان کے لئے کسقدر فوائد متصور ہین اور جسکے نہ ہونے سے آجکل کے زمانہ مین ہماری سوسائٹی کی کیسی کچھ خراب و خستہ حالت ہو رہی ہے

آگے چلکر فاضل مصنف صاحب نے یہ لکھا ہے کہ انسانی زندگی کا ہر فعل اس طرح باندھ دیا گیا تھا اور اُسکے نتائج ایسے شدید

باندھے گئے تھے کہ تخیلہ مایوسیون سے بھر گیا تھا اور زندگانی وبال ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے کہ مصنف صاحب کا اشارہ کچھ تو اُن باتون کی طرف ہے جنکا ذکر اقتباس مندرجہ صدر مین آیا ہے اور جنکے متعلق صحیح رائے کا قائم کرنا ہم نے ناظرین کے خیال انصاف پر چھوڑا ہے اور کچھ جیمنی کے کرم میمانسا کی طرف ہے جسکو پورومیمانسا بھی کہتے ہین۔ اس زمانہ مین البتہ یہ خیال تھا جسکی تائید ویدون سے بھی ہوتی ہے کہ جگ اور اگنی ہوتر وغیرہ کے کرمون کو کرکے آدمی سورگ یعنی بہشت کو حاصل کرسکتا ہے اور اسکے لئے طرح طرح کی مذہبی پابندیان جائز رکھی گئین تھین جنکو ہمارے مصنف صاحب نے وبال زندگی کہا ہے۔ جنکو یہ طریقہ پسند تھا البتہ اُن کے لئے یہہ طریقہ کھلا ہوا تھا۔ مگر ہر طرح کے خیالات کے لوگون کے لئے یہ طریقہ کچھ لازم ملزوم نہین کردیا گیا تھا۔ جو ادوتیہ میمانسا یعنی ویدانت کے طریقہ پر چلتے تھے وہ ان افعال کو بھی باعث پابندی سمجھتے تھے۔ جب آدمی ان افعال کے اندر جکڑ بند ہوگیا تو پھر اُسکو آزادی کہان رہی اور ویدانت کی یہ تلقین ہے کہ ہم بالذات قطعاً آزاد ہین۔ ہم نے جہل سے اپنے کو مقید سمجھ لیا ہے۔ ہم کو وہ کام کرنا چاہئے جس سے ہم اپنی اُس آزادی کو جو ہمیشہ حاصل ہے اور جسکو ہم اپنے جہل سے بھول گئے ہین پھر حاصل کرین۔ بہرحال ادوتیہ میمانسا یعنی ویدانت کی یہ تلقین ہے کہ ہم آزاد ہین مقید نہین ہین۔ ہمکو کوئی مذہبی رسم ورواج یا پابندیان مقید نہین کئے ہوئے ہین۔ اور اگر ہم مین اتنا گیان پیدا ہوجائے کہ ہم جسم نہین روح یعنی ذات مطلق ہین تو پھر یہ پابندیان قائم نہین رہتی ہین۔ لیکن جب تک ہم یہ سمجھتے رہینگے کہ ہم جسم ہین تب تک تمام عذاب و ثواب اپنا اثر ضرور ڈالینگے اور اُنکی جزا اور سزا ہم کو بھگتنی پڑیگی ایسی حالت مین شریعت کی پابندی ہم پر لازمی ہے اور افعال کے نتائج سے ہمکو رہائی نہین۔

اب دیکھنا چاہئے کہ مغربی تہذیب سے دنیا کو کیا فوائد حاصل ہوئے ہین۔ اس تہذیب کا ائیڈیل بھوگ یعنی طلب لذات ہے جسکے انجام مین ضرور تکلیف ہے۔ ان لذات کے سامان بہم پہونچانے اور اُنکے لازمی نتیجۂ تکلیف کو رفع کرنے کی کوششین ایسے ایجادات کے ذریعے سے کی گئی ہین جنپر زمانۂ حال کی تہذیب کو بہت بڑا ناز ہے۔ اگرچہ جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہوچکا ہے یہہ تکالیف باوجود ہماری کوششون کے قطعاً نہین مٹ سکتین۔ تاہم جو کوششین رفع تکلیف اور ازدیاد آسائش کے لئے کی گئین ہین اُنکے لئے دنیا کو اُن لوگون کا ہمیشہ کے واسطے مشکور ہونا چاہئے جنھون نے اپنی عمرین ان ایجادات کے سوچنے اور اُن کو عملی شکل دینے مین صرف کی ہین اور وہ اُنکے بار احسان سے کبھی سبکدوش نہین ہوسکتی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان لوگون نے قطعاً رفع تکلیف وآسائش بنی آدم کے خیال سے ہزارون مصائب وتکالیف جھیل کر اور خودغرضی کے خیالات سے بالکل پاک رہ کر اُن ایجادون کو وضع کیا ہے جنکی بدولت دنیا آجکل ایسی سرسبز نظر آرہی ہے۔ اُنکی بےغرضی مین بالکل شبہہ نہین کیا جاسکتا کیونکہ اُنھون نے انسان کو ایک کل سمجھکر اپنے کو اُسمین فنا کردینا چاہا ہے جیسطرح صوفیہ کے نزدیک فنافی الشیخ فنافی الرسول فنافی اللہ کا مسئلہ ہے اُسیطرح ان لوگون کی نسبت انصافاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ فنافی القوم فنافی الانسان تھے۔ جو لوگ تعینات کے اندر ہین اور سلسلۂ حیات کو قائم رکھنا چاہتے ہین اُنکو البتہ ان ایجادون کا ضرور ممنون ومشکور ہونا چاہئے۔ کیونکہ زندگی کے ساتھ جو تکلیف اور مصیبت لگی ہوئی ہے وہ ان ایجادون کی بدولت کچھ کم ہوئی ہے۔ گو وہ پورے طور سے رفع نہ ہوئی ہو لیکن ان سب مجازی لذات کی آخر انتہا ہے اور تکلیف بھی اُنکے ساتھ وابستہ ہے۔ کیونکہ جب کسی راحت یا حظ کے

حاصل کرنیکی کوشش کیجاتی ہے تو انجام مین اُسکا ضرور کسی نہ کسی قسم کی تکلیف کی شکل مین نکلتا ہے۔ ہر فعل کا جسکے ذریعے سے کوئی حظ حاصل کیا جاتا ہے عکس فعل لازمی نتیجہ ہے۔ بعض صورتون مین اس عکسِ فعل کا نتیجہ خود ہی پر پڑتا ہے اور بعض صورتون مین اپنے دوسرے ابنائے جنس پر۔

مغربی فلاسفی نے تو اپنا یہ مقصد قرار دیا ہے کہ خواہ دوسرونکو ضرر پہونچے لیکن ہم کو اپنی حیات و آسایش کی فکر کرنا چاہئے۔ بقائے حیات و ترقی سامان آسائش کے لئے جو جنگ ہوتی ہے اُسمین جو باقی رہ جائے وہی زندہ رہنے اور حظ اُٹھانیکے قابل ہے۔ برخلاف اسکے مشرقی فلاسفی کا نصب العین یہ اصول ہے کہ دوسرون کے لئے اپنے کو قربان کر دینا چاہئے اور جو کمزور ہین اُنکو زوردار بنانا چاہئے۔ نہ یہ کہ وہ نیست و نابود کردئے جائین۔ بنگاہ اخلاق سے تو ایسا فعل ہرگز جائز نہین ہوسکتا اور خاصکر اُس فلاسفی مین تو بالکل جائز نہین ہے جہان یہ مانا گیا ہے کہ مین ہی سب جاندارون مین ہون اور سب جاندار مجھ مین ہین اور کوئی جاندار مجھ سے جدا نہین۔ یا جسکا یہ اصول ہے کہ ایک ہی حقیقی ہستی کے کل جاندار کیا انسان اور کیا جانور مظہر ہین۔ پروفیسر ہکسلے بھی اگرچہ اُنکا شمار حال کے فلاسفۂ مادئین مین ہے۔ مشرقی فلاسفی کے اسی خیال سے ہم آہنگ ہین۔ چنانچہ اپنی کتاب موسومہ "اودلیوشن واتھکس" مین ایک جگہ وہ یہ لکھتے ہین "جیسا کہ مین کہہ چکا ہون جسکو اخلاقاً سب سے عمدہ طریقہ عمل کہتے ہین یعنی جسکو نیکی یا حُسن اخلاق کہتے ہین اُسکے لئے ایسا طرز عمل ضرور ہے جو جمیع حیثیات سے اس طرز عمل سے مخالف ہے جس سے بقائے حیات کے لئے کائناتی جنگ مین کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ ایسے طرز عمل کے لئے بجائے اسکے کہ بیرحمی کے ساتھ صرف اپنے اغراض کی محافظت کی جاوے کامل نفس کشی کی ضرورت ہے تمام رقیبون کو ایک طرف ہٹا دینے یا اُنکا قلع و قمع کردینے کی جگہہ یہان اسکی ضرورت ہے کہ ہر فرد نہ صرف اپنے ہم جنس کا پاس کرے بلکہ اُن کی مدد کرے۔ اُسکا اثر نہ صرف یہ ہونا چاہئے کہ جو سب سے زیادہ زندہ رہنے کے قابل ہے وہی زندہ رہے۔ بلکہ جہانتک ہوسکے جتنے اشخاص زندہ رہنے کے قابل ہون وہ سب زندہ رکھے جائین"

شاید ہمارے معترضین یہ کہہ اُٹھین گے کہ کیا آپ کے اصول پر عمل کرنے کے لئے ہم تمدن کی ابتدائی حالت یعنی وحشیون کی حالت پر پھر عود کرین جنہین تکلیف و آرام کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ اور جنکی خواہشات بھی محدود ہوتی ہین۔ بلاشک اگر اعلیٰ روحانیت کے ساتھ ہم اس حالت کو عود بھی کرین تو فبہا۔ ہمارا مقصود حاصل ہے۔ چاہے ہم وحشی ہی کیون نہ کہلائین اور یہ حالت اس سے تو ہزار درجہ بہتر ہے کہ ہمکو اعلیٰ درجے کی مادی تہذیب تو حاصل ہو۔ مگر روحانیت ہم سے مطلقاً رخصت ہو جائے۔ مگر یہان ہمارا ایسا کوئی مقصود نہین ہے کہ ہم اپنے مدعا کے حصول کے لئے ایک وحشیانہ حالت کو پھر عود کرین۔ نہین نہین مغربی تہذیب نے جتنے سامان آسائش و راحت کے اکٹھا کئے ہین اُن سب کو جمع کرنا چاہئے۔ لیکن اس عیش عشرت مین ہمکو اپنے تئین اسطرح منہمک نہ کر دینا چاہئے کہ ہم روحانیت کے اعلیٰ معیار سے کوسون دور ہو جائین۔ گیتا کا یہ بزور فرمانا ہے کہ تمام جائز بھوگون یعنی عیشونکو بھوگو مگر نفس کو اُنسے ہٹا رکھو۔ اپنے نفس پر اُنکا کوئی ناپاک اثر نہونے دو۔ دل سے ترک کے اعلیٰ آئیڈیل کو برابر قائم رکھو اور راحت کی تلاش مین اپنے کو اُسکا ایسا عادی نہ بناؤ کہ تکلیف کے نازل ہونے پر تم بیچین اور بیقرار ہو جاؤ۔

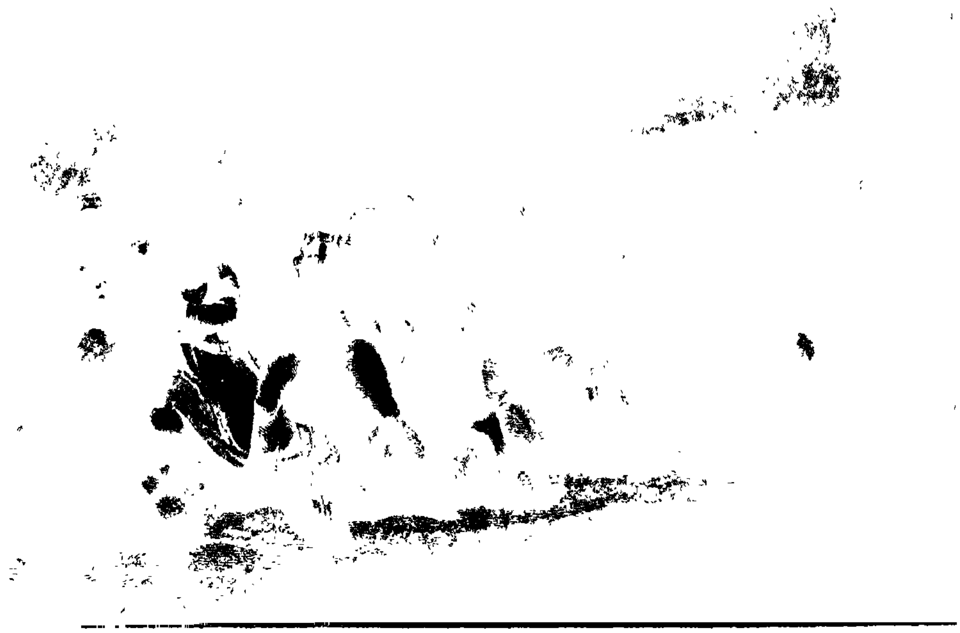
پربھولال

ٹیپو سلطان

جنوبی ہندوستان کی ریاست میسور مین حیدر علی ایک بڑا مشہور اور بہادر سردار تھا جسکے حُسنِ لیاقت کے باعث اس ریاست کو بڑی قوت اور وقعت حاصل ہوگئی تھی۔ ابتدا مین حیدر علی اس ریاست مین فوج کا کپتان تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اُسکا رسوخ یہانتک بڑھ گیا کہ ۱۷۶۱ء مین وہ وہان کے راجہ اور اُسکے وزیر کو ریاست سے خارج کرکے خود سلطان بن بیٹھا اور ایک کثیر التعداد فوج اور خزانہ بہم پہونچاکر قلعہ بدنور پر قبضہ کرلیا۔ اس قلعہ مین بافراط خزانہ تھا اور یہی خزانہ آیندہ اقبال مین اُسکے کام آیا۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد مادھوراو پیشواے چہارم نے حیدر علی کے علاقہ پر یورش کی اور اسکو شکست فاش دی۔ بدین وجہ حیدر علی نے وہ سارا علاقہ جو شمالی سرحد پر فتح کیا تھا مرہٹون کو واپس دیدیا اور علاوہ برین ۳۲ لاکھ روپیہ نقد بطور تاوان ادا کیا۔ مگر اگلے سال حیدر علی نے اسکی کسر نکال لی۔ یعنی اسطرح کہ وہ ملیبار پر جو ایک زرخیز ملک تھا اور اُسکی ریاست کے مغرب مین واقع تھا فوج لیکر چڑھ گیا اور اُسکا کچھ حصہ فتح کرلیا۔ اس موقع پر حیدر علی نے ایک نہایت قبیح بداخلاقی کا ثبوت دیا۔ یعنی اُسنے جب راجہ کالی کٹ پر یورش کی تو اُس بیچارے نے قلعہ سے نکلکر اُسکی اطاعت منظور کرلی مگر اسپر بھی حیدر علی نے اُسکے شہر پر یکایک قبضہ کرکے اُسکو لوٹ لیا۔ اس پر زمورن (راجہ کالی کٹ) نے اس اندیشہ سے کہ کہین حیدر علی کوئی اور زیادہ بدسلوکی نہ کرے اپنے محل مین آگ لگادی اور خود بھی وہین بھسم ہوگیا۔

چار پانچ برس تک جب حیدر علی ادھر اُدھر مار دھاڑ کرچکا اور اُن ریاستون کو تنگ کرنے لگا جو انگریزون کے زیر سایہ آچکی تھین، تو ۱۷۶۶ء مین گورنمنٹ مدراس نے حیدر علی پر حملہ کردیا۔ تاریخ مین یہ میسور کی اول لڑائی شمار ہوتی ہے۔ اس جنگ مین شروع مین تو مادھوراو پیشوا اور نظام دکن دونون انگریزون کے ساتھ تھے، مگر حیدر علی نے اپنی حکمت عملی سے دونون کو توڑلیا۔ یہانتک کہ آخر مین نظام حیدر علی کی طرف ہوکر انگریزون سے لڑنے لگا۔ اُسوقت انگریزی فوج کا سپہ سالار کرنیل سمس تھا۔ اُسکے پاس صرف سات ہزار کی جمعیت تھی۔ برخلاف اسکے حیدر علی اور نظام کی فوج کا شمار ستر ہزار تھا۔ بدین وجہ کرنیل سمس کو بڑی بھاری دقت پیش آئی۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ حوصلہ چھوڑ بیٹھا نہین۔ بلکہ اُسنے انجام کار مخالف کی فوج کو مقام چانگم پر پسپا کردیا اور اُسکے چندروز بعد ترنو ملی کے میدان مین اپنے دشمنون کو شکست فاش دی۔ یہ دونون مقام جنوبی ارکاٹ مین ہین۔ اس جنگ کا سلسلہ دو برس تک اور بھی جاری رہا اور اس عرصہ مین کبھی ایک کا پانسہ زبردست ہوتا تھا اور کبھی دوسرے کا۔ آخر حیدر علی ایکبار ایسا تنگ ہوا کہ اُسکو صلح کے لئے درخواست کرنی پڑی۔ مگر یہان بھی وہ اپنی چال سے باز نہ آیا۔ وہ سوارون کی ایک جمعیت کثیر ساتھ لیکر کرنیل سمس کی فوج سے بالا بالا جھٹ پٹ کوچ کرکے مدراس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔



ٹیپو سلطانؒ کا آخری معرکہ

انڈین پریس الہ آباد

اس سے مدراس کی کونسل پر اسقدر ہیبت چھا گئی کہ اُنھون نے فوراً حیدر علی سے صلح کر لی اور یہ شرط قرار پائی کہ لڑائی سے پیشتر جو صورت تھی وہی بحال رہے گی۔ اسطرح میسور کی اوّل لڑائی کا خاتمہ اس عہدنامے سے ہوا۔

۱۷۷۱ء مین مادھوراؤ پیشوا نے پھر حیدر علی پر چڑھائی کی اور متواتر شکستون سے قریب تھا کہ حیدر علی کا کام تمام ہو جائے، مگر اُسنے اسوقت مرہٹون کو اپنا سارا شمالی علاقہ اور بہت سا زر نقد دیکر اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ لیکن چونکہ اسکے بعد مادھوراؤ کا انتقال ہو گیا اور مرہٹون مین پھوٹ پڑ گئی، اسوجہ سے حیدر علی نے جسقدر ملک و مال مرہٹون کے نذر کیا تھا اس سے بھی زیادہ آئندہ چھ سال کے عرصہ مین پھر حاصل کر لیا۔

۱۷۸۰ء مین انگریزون اور حیدر علی مین پھر لڑائی چھڑ گئی۔ یہ میسور کی دوسری لڑائی کہلاتی ہے۔ اسکی کیفیت یہ ہے کہ انگریز اسوقت مرہٹون کی اوّل لڑائی کے مخمصون مین پھنسے ہوئے تھے۔ حیدر علی نے اس موقع کو غنیمت جانا اور نظام دکن اور مرہٹون کو ہموار کیا کہ میرے ساتھ ملکر انگریزون کو کرناٹک سے نکال دو۔ اسطرح دم دیکر اور ایک بڑا لشکر ساتھ لیکر حیدر علی کرناٹک پر چڑھ گیا اور اوّل اوّل کئی معرکون مین ظفرمند ہوا۔ چنانچہ اُسنے بہت سے انگریزی قلعہ فتح کر لئے اور انگریزی فوج کو جو کرنیل بیلی کے ساتھ تھی شکست دیکر کرنیل بیلی کو مع تقریباً دو ہزار جوانون کے قید کر لیا۔ مجبوراً انگریزی فوج کے سپہ سالار منرو صاحب کو بھی مدراس کی طرف ہٹ آنا پڑا۔ یہان سے اُسنے سر وارن ہیسٹنگز کو کمک کے لئے کلکتے خبر بھیجی، جسکے جواب مین اُنھون نے آیرکوٹ کے ہمراہ سمندر کے راستے سے فوج روانہ کر دی۔ اس فوج کے پہونچتے ہی لڑائی کا رنگ بدل گیا۔

چنانچہ سر آیرکوٹ نے پورٹو نووو۔ پالی لور اور سولن گڈھ مین بڑے میدان مارے اور حیدر علی کو شکست پر شکست دی۔ اگلے سال یہ جوانمرد جرنیل بیمار ہو کر چلا گیا مگر جنگ بدستور جاری رہی۔ اسمین کبھی انگریز فتحمند ہو جاتے تھے اور کبھی حیدر علی غالب آ جاتا تھا۔ آخر ۱۷۸۲ء مین حیدر علی کا یکایک انتقال ہو گیا۔

حیدر علی نے جو کچھ نام و نمود پہلے پہل حاصل کی وہ دیوان ہالی مین حاصل کیا تھا۔ اسی مقام پر ۱۷۵۳ء مین ٹیپو سلطان پیدا ہوا تھا۔ اس جگہ ایک مسلمان فقیر رہا کرتا تھا جس سے حیدر علی کو بہت عقیدت تھی، اُسی فقیر کے نام پر اُسنے اپنے بیٹے کا نام ٹیپو سلطان رکھا تھا۔ ٹیپو سلطان کی والدہ کا نام فخر النساء تھا جو میر معین الدین کی دختر نیک اختر تھین۔ میر معین الدین چند سال تک کڈپّہ کے صوبہ دار رہے تھے۔

حیدر علی کے دو بڑے معتمد شیر پرآمنیا اور کرشنا راؤ تھے۔ جب ان لوگون کو یقین کامل ہو گیا کہ حیدر علی کا آخری وقت قریب ہے تو اُنھون نے اُسکی نازک حالت اور جلد آنے والی موت کو فوج پر آشکارا کرنا نہ چاہا بلکہ ہر طرح اُسکے چھپانے کی کوشش کی۔ جب حیدر علی کا انتقال ہوا تو اس غمناک واقعہ کی خبر ٹیپو سلطان کو روانہ کی جو ایک مہم پر گیا ہوا تھا اور اُسے بعجلت واپس بُلایا گیا۔ حیدر علی کی لاش کو اُنھون نے خوشبوئیات لگا کر ایک صندوق مین بند کر دیا اور عام لوگون پر یہ ظاہر کیا کہ اس صندوق مین مال غنیمت ہے اور صندوق کو کولار بھیجدیا۔

دونون وزیرون نے حیدر علی کی وفات کو ایک راز کی مانند پوشیدہ رکھا اور کئی دن تک اس واقعہ کی خبر انگریزون کو نہونے دی۔ صرف چند معتمد افسر اس واقعہ سے واقف تھے

فوجین برابر کوچ و مقام کرتی ہوئین مغرب کیطرف بڑھتی چلی گئین
اور حیدر علی کی پالکی (جسپر پردے پڑے ہوئے تھے) برابر فوج
کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ تمام لوگ اس دھوکے مین رہے
کہ حیدر علی تندرست و توانا بیٹھا ہوا ہے۔ اگرچہ لوگون کو اسکے پاس
نہ آنے پر کچھ شبہ ہوا بھی مگر وہ کھلم کھلا کچھ کہہ نہ سکے۔

ٹیپو سلطان کو اپنے دلیر باپ کی بے وقت موت
کی خبر چار دن کے بعد ملی۔ وہ اسوقت پینیار کے میدان
مین لشکر ڈالے ہوئے تھا۔ مگر یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی
اُسنے وہان سے لشکر اُٹھا دیا اور کوچ کا حکم دیکر بعجلت تمام
اپنے باپ کے لشکر سے جا ملا جو اُسکے اور فرانسیسی سپاہ کے
انتظار مین وہان پڑا ہوا تھا۔ ٹیپو سلطان جب لشکر مین
پہونچا تو اُسے لوگون نے ہاتھون ہاتھ لیا۔ چارون طرف سے
لوگ اُسکے استقبال کے لئے جھک پڑے۔ وہان پہونچتے
ہی اُسنے معاملات کی باگ اپنے ہاتھ مین لے لی۔ نوّے ہزار
سپاہ کے علاوہ سرنگاپٹم مین اُسے ایک بڑا خزانہ ملا جو
مال غنیمت سے پُر تھا۔

اب ٹیپو سلطان اپنے باپ حیدر علی کی جگہہ ریاست
میسور کا فرمانروا ہوچکا تھا۔ انگریزون سے اُسکو نہایت سخت
عداوت تھی اور اپنے باپ کی طرح وہ بڑا بیرحم و تندمزاج تھا
معرکہ آرائی اور نبرد آزمائی مین بھی وہ حیدر علی سے کم نہ تھا۔ جب
وہ تخت میسور پر بیٹھکر ایک سال سے زیادہ عرصہ تک انگریزون
سے لڑتا رہا۔ بالآخر جب انگریزی فوج اُسکے پایہ تخت سرنگاپٹم
کی طرف بڑھنے لگی تو اُسنے فوراً گورنر مدراس سے صلح کرلی۔ گورنر جنرل
صاحب اس صلح پر راضی نہ تھے مگر گورنر مدراس نے عہدنامہ
منظور کرلیا۔ اس راضی نامہ مین یہ قرار پایا تھا کہ طرفین اپنے
اپنے مفتوحات سے ہاتھ اُٹھائین۔ اسمین مدراس گورنمنٹ
کا بہت نقصان ہوا۔ کیونکہ ٹیپو سلطان کی بہ نسبت انگریزون
نے بہت سا ملک فتح کرلیا تھا۔ یہ عہدنامہ جس سے میسور
کی دوسری لڑائی کا خاتمہ ہوا عہدنامہ منگلور کے نام سے موسوم
ہے جو ۱۷۸۴ء مین مرتب ہوا۔

میسور کی دوسری لڑائی کے اختتام کے بعد ٹیپو سلطان
کی حکومت اور دولت آناً فاناً بڑھتی گئی اور چھ برس کے اندر
(۱۷۸۴ء لغایت ۱۷۹۰ء) اُسنے ایک تو یہ کام کیا کہ جب مرہٹون
اور نظام حیدر آباد نے متفق ہوکر بڑی جرار فوج سے اُسکے
ملک پر یورش کی تو اُسنے خوب مقابلہ کیا اور اُنکا کوئی داؤن
نہ چلنے دیا۔ دوسرے یہ کہ کانڑا کورگ اور ملیبار کے اضلاع
فتح کرلئے۔ مگر وہان بڑے بڑے ظلم اور بیرحمیان کین۔ انجام
مین اُسنے ریاست ٹراونکور جو ہندوستان کے انتہائے
جنوب مین واقع ہے حملہ کیا۔ یہان اُسنے بڑی زک کھائی۔
ٹیپو سلطان جب ٹراونکور کی سرحدی دیوار پر حملہ آور ہوا جبکہ
راجہ نے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے کھینچ لیا تھا تو راجہ
کی فوج نے اُسکو شکست دیکر ہٹا دیا۔ اس مرحلے مین ٹیپو سلطان
کا بڑا نقصان ہوا۔ یہانتک کہ وہ خود بھی بمشکل اپنی جان بچاکر
وہان سے بھاگ سکا۔ اس زک سے ٹیپو سلطان اسقدر
پشیمان ہوا کہ اُسنے بدلہ لینے کا تہیہ کرلیا اور ریاست ٹراونکور
کو مغلوب کرنے کے لئے بڑی بڑی تیاریان شروع کین۔
ٹراونکور بہت چھوٹی ریاست تھی اور نہین معلوم کسطرح اُسنے
ایسی ہمت کی تھی کہ ٹیپو سلطان کے مقابلہ پر کھڑی ہوگئی تھی
اور اسکو بھی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے کہ اُسنے ٹیپو سلطان کو نیچا
دکھا دیا۔ راجہ ٹراونکور انگریزون کا دوست تھا۔ اسلئے جب

[illegible] کی ریاست پر دانت لگایا تو گورنر جنرل نے
[illegible] سلطان کے ہاتھ سے محفوظ رکھنے کا مصمم ارادہ کیا۔
نظام حیدر آباد نے ۱۷۸۸ء مین ایک سابقہ وعدے
کے بموجب ضلع گنتور جو دریاے کرشنا کے جنوب مین واقع ہے
انگریزون کے حوالہ کر دیا اور اقرار کیا کہ مین ٹیپو سلطان کے مقابلہ
مین سرکار انگریزی کو امداد دونگا۔ انگریزون کی طرف سے بھی
یہ وعدہ ہوا کہ ہم جو علاقہ ٹیپو سلطان کا فتح کرینگے، اُسمین سے تمکو
بھی حصہ دینگے۔ اسطرح جب نظام انگریزون کا ساتھ دینے کو تیار
ہوگیا تو گورنر جنرل نے سرکار پونہ کو بھی لکھکر اسی اقرار پر اپنے ساتھ
کر لیا اور جب نانا فرنویس کی سفنت پیپرگنت و یز ہو چکی تو لارڈ کارنوالس
۱۷۹۰ء مین فوج کی سپہ سالاری کے لئے کلکتے سے مدراس
پہونچا اور ۱۷۹۱ء مین بنگلور کو جو ٹیپو سلطان کی مملکت مین دوسرے
درجے کا مضبوط اور بڑا شہر شمار ہوتا تھا فتح کر لیا اور اسکے دو ماہ
بعد ٹیپو سلطان اور اُسکی تمام فوج کو مقام اری کیرا پر کامل شکست
دی۔ جب یہ سب کچھ ہوگیا تو میسور کے پایۂ تخت سرنگاپٹم کا فتح
ہونا کچھ دشوار نہ تھا مگر مرہٹے اپنے قول کے موافق امداد دینے
کو نہین آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنکا سردار ہری پنت جنگ
مین حصہ لینا نہین چاہتا تھا بلکہ صرف لوٹنا چاہتا تھا اور یہی
وجہ ہے کہ اُسنے اسقدر دیر لگائی کہ وقت پر نہ پہونچ سکا۔ آخر
جب لارڈ کارنوالس کے پاس سامان رسد ہو چکا تو اُسکو

مدراس کی جانب پلٹنا پڑا۔ یہان آکر اُسنے سال کے آخر تک
آیندہ لڑائی کے لئے خوب تیاریان کین اور کئی قلعے بھی فتح کر لیے۔
نیا سال شروع ہوتے ہی لارڈ کارنوالس پھر سرنگاپٹم پر چڑھ گیا
اور قریب تھا کہ اُسکو فتح کرے کیونکہ وہ اُسکی بیرونی فصیل پر قبضہ
کر چکا تھا۔ مگر ٹیپو سلطان نے اُسکے شرائط منظور کرکے صلح کر لی۔
وہ شرطین یہ تھین کہ ٹیپو سلطان اپنا آدھا ملک اور تین کرور روپیہ نقد
انگریزون کو دے اور تیس لاکھ روپیہ مرہٹون کے حوالہ کرے اور
اپنے دو بیٹے بطور یرغمال انگریزون کے سپرد کرے۔ اگرچہ نظام
اور مرہٹون کی سپاہ نے اس لڑائی مین کچھ کام نہین دیا تھا۔
بلکہ دغابازی کرکے ٹیپو سلطان سے خط و کتابت جاری رکھی تھی،
اسپر بھی لارڈ کارنوالس نے اپنے عہد کا ایفا کیا اور ملک مفتوحہ مین
سے اُنکو حصہ دیا۔ اس لڑائی مین اضلاع ڈنڈیگل، بڑا محال اور
ملیبار انگریزون کے ہاتھ آئے اور علاقۂ کورگ اُنھون نے اُسکے راجہ کو
دیدیا۔ اسطرح ۱۷۹۲ء مین میسور کی تیسری لڑائی کا خاتمہ ہوا۔
جب انگریز اس جنگ مین اول سے آخر تک کامیاب رہے تو اس سے
لارڈ کارنوالس کی بڑی نیکنامی ہوئی یہانتک کہ اُسکو مارکوئیس کا خطاب عطا کیا گیا۔
جب لارڈ ولزلی ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوکر آیا تو اُس وقت
کئی ہندوستانی ریاستون نے سرکار کی مخالفت پر ایکا کر رکھا تھا مگر
لارڈ ولزلی دشمنون پر غالب آیا اور سارے خوف و خطر مٹ گئے۔ لارڈ ولزلی
نے اول تو نظام حیدر آباد کو گانٹھکر سب سڈی ایری سسٹم قاعدے

حاشیہ: سرکار انگریزی اور ہندوستانی ریاستون کے باہم جو ایک رابطہ قائم ہے وہ سب سڈی ایری سسٹم (امدادی انتظام) کہلاتا ہے۔ اس قاعدے کو جب کوئی ریاست عہدنامے کے رو سے منظور کرتی تھی، تو وہ سرکار انگریزی کی حکومت کو ہندوستان کی ساری حکومتون پر غالب مانتی تھی اور سرکار اُسکی حفاظت اور سلامتی کی ذمہ دار ہو جاتی تھی۔ اُس ریاست کیطرف سے یہی اقرار ہوا کرتا تھا کہ ہم سرکار انگریزی کی منظوری کے بغیر نہ کسی سے جنگ کرینگے نہ صلح اور اپنے یہان کنٹنجنٹ فوج رکھینگے اور اُس سے ضرورت کے وقت سرکار کی مدد کرینگے۔ یہی اس انتظام کی بڑی شرائط تھین مگر حسب موقع و محل اسمین تغیر و تبدل بھی ہو جاتا تھا۔ اول اول یہ قاعدہ سر والرن ہیسٹنگز نے نواب اودھ کے ساتھ برتا تھا۔ بعد ازان لارڈ ولزلی نے تمام ہندوستانی ریاستون کے ساتھ اسی قاعدہ پر رابطہ قائم کیا۔ اس سے پیشتر جو طریق جاری تھا، اُسکی علت غائی یہ تھی کہ ہندوستانی ریاستون کی قوت ایسی برابر رہے کہ ایک دوسرے سے زیادہ یا کم ہونے پائے۔ مگر یہ نیا قاعدہ اس سے عمدہ تھا اور اب جا بجا اسی کے مطابق عمل درآمد ہوا۔

کے مطابق اُس سے وعدہ نہ کرلیا۔ چنانچہ نظام نے ٹیپو سلطان کے مقابلے پر انگریزون کی امداد کے لئے ایک بڑی فوج بھیجی جسکا سپہ سالار کرنیل ولزلی[۵۱] مقرر ہوا۔ اسکے بعد گورنر جنرل بذات خود مدراس چلا آیا۔ اس لڑائی مین گورنر جنرل کے اسقدر ہمہ تن معروف ہونے کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ فرانس کا نامی گرامی فاتح نپولین بوناپارٹ اسوقت مصر مین جنگ کررہا تھا اور ٹیپو سلطان نے انگریزون کو ہندوستان سے نکال دینے کے لئے برملا اُس سے مدد مانگی تھی۔ ان وجوہ کے باعث لارڈ ولزلی کمال سرگرمی کے ساتھ اس لڑائی کی تیاری مین معروف تھا۔ پس اُسنے حکم دیا کہ دو فوجین دو طرف سے میسور پر حملہ کرین۔ غرض ان دونون فوجون نے ٹیپو سلطان کی خوب خبر لی اور اسکو پے در پے شکست دی اور بڑھتے بڑھتے دونون فوجین میسور کے پایۂ تخت سرنگاپٹم پر جا پہنچین اور اُسکا محاصرہ کرلیا۔

اب ٹیپو سلطان کے اوسان خطا ہوگئے اور اُسکے دل پر خوف وہراس نے اپنا تسلط جمالیا۔ کبھی تو وہ فال کُھلواتا اور نجومیون سے دریافت کرتا تھا اور کبھی مسجدون مین دعائین منگواتا اور مندرون مین پوجا کرواتا تھا۔ جب کچھ پیش نہ گئی تو پھر صلح کا پیغام بھیجا۔ اس موقع پر جنرل ہیرس نے جو شرطین پیش کین وہ بہت سخت تھین اور اُنکو منظور کرنے مین ٹیپو سلطان لیت ولعل کرنے لگا۔ اسوقت وہ سارے فنون سپاہگری اور عہدوپیمان کے ڈھنگ بھول گیا تھا۔ اُسکے ہوش وحواس بجا نہ تھے۔ انگریزی فوج برابر اپنا کام کئے جاتی تھی اور شدت کے ساتھ سرنگاپٹم کی لوہالاٹ فصیلون اور گنبدون پر برابر گولہ برسا رہی تھی۔ آخر ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو فصیل مین رخنہ ہوگیا اور جنرل بیرڈ (جو وہان چار سال تک قید رہ چکا تھا) انگلستانی سپاہ فوج لیکر فصیل پر چڑھ گیا اور بات کی بات مین انگریزی جھنڈا فصیل کے اوپر مین جاکر گاڑ دیا۔ فوج کے دو حصون نے دو طرف سے دھاوا کیا اور راستے مین جو کچھ سد راہ ہوا اُسپر فتح پاکر اور میسور کی فوج کے ایک بہادر دستے کو قتل کرکے دونون فوجین شہر کے مشرقی دروازے پر آملین اور شہر سر ہوگیا۔

جسوقت انگریزی جھنڈا قلعہ کی فصیل پر نصب ہوگیا اُسوقت ٹیپو سلطان کی عجیب کیفیت تھی وہ ایک نرغہ مین پھنس گیا اور اُسکے ہوش وحواس بجا نہ رہے۔ وہ کوشش کرکے آگے بڑھتا گیا کہ کسیطرح قلعہ کے اندر داخل ہوجاے۔ مگر پیچھے سے اُسکی فوج نے پھاٹک پر باڑھین مارنا شروع کین اور ایک گولی اُسکے سینے مین لگی جس سے وہ سخت زخمی ہوگیا۔ ٹیپو سلطان زخمی ہوکر بھی آگے ہی بڑھتا گیا۔ مگر ایک گولی پھر اُسکے سینے مین سیدھی طرف سے آکر لگی اور ساتھ ہی اُسکا گھوڑا بھی زخمی ہوکر گر پڑا۔ اُسکے چند وفادار اور نمک حلال رفقا نے اُسے اُٹھاکر پالکی مین ڈال دیا اور درخواست کی کہ وہ اپنی حالت سے انگریزی فوج کو آگاہ کردے تاکہ وہ کوئی مزید کارروائی نہ کرے بلکہ اُس سے بہ حُسن سلوک پیش آئے لیکن اُسنے اُنکی اس بات کو منظور نہ کیا لہذا اُسکی پالکی وہین پھاٹک کے اندر رکھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہان چند انگریزی سپاہی آگئے۔ اُنمین سے ایک نے اسکا زرین پٹکا چھیننا چاہا۔ اسپر ٹیپو سلطان نے ایک ہاتھ تلوار کا مارا جس سے اُسکے گھٹنے مین ایک زخم آگیا۔ اس زخمی سپاہی نے غضبناک ہوکر ٹیپو سلطان پر بندوق سر کردی اور فی الفور اسکا مرغ روح قفس تن سے پرواز کرگیا۔

[۵۱] کرنیل ولزلی (برادر لارڈ ولزلی) ایک نامی سپہ سالار تھا۔ اُسنے آیندہ اپنی شمشیر کے زور سے کمال ناموری حاصل کی۔ یہانتک کہ ڈیوک آف ولنگٹن کے خطاب سے ممتاز ہوا۔

[illegible] ہلاک ہو گیا۔ محاصرین اور محصورین آپس میں [illegible] رہے۔ مگر اُسکے مرنے کی خبر بہت دیر تک مشہور [illegible] اس [illegible] میں انگریزی فوج نے تمام مورچوں اور فصیلوں کے [illegible] پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ٹیپو سلطان کی سپاہ نے [illegible] مقابلہ کیا۔ اسپر جنرل بیرڈ کو کچھ شبہ ہوا اور اُسنے پتہ لگانا [illegible] کیا کہ کیا وجہ ہے کہ ٹیپو سلطان کی فوج مقابلہ نہیں کرتی۔ جنرل [illegible] نے میجر ایلین (کوارٹر ماسٹر جنرل) کو ٹیپو سلطان کے محل [illegible] صلح کا جھنڈا لیکر بھیجا تاکہ وہ مقابلہ نہ کئے جانے کا سبب [illegible] دریافت کرے۔ اُسنے بہت دیر بعد لوٹ کر جواب دیا کہ لوگوں میں چرچا ہو رہا ہے کہ پھاٹک پر ٹیپو سلطان کے ایک زخم کاری لگا تھا۔

یہ خبر سُنتے ہی جنرل بیرڈ نے مقتولین میں اُسے تلاش کرایا تو اسکی لاش ملگئی۔ اگرچہ اُسکی تلوار زرّین پٹکا اور دیگر چیزیں تو دستیاب نہیں ہوئیں تاہم اُسکے راست بازو پر ایک تعویذ بندھا ہوا تھا جسمیں آیات قرآنی لکھی ہوئیں تھیں، اُسی سے اُسکو شناخت کر لیا گیا۔ اسوقت تک اُسکا جسم گرم تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور صورت میں کوئی تبدیلی واقع نہوتی تھی۔ اُسکے جسم پر تین زخم آئے تھے اور کنپٹی میں ایک گولی سما گئی تھی۔ جنرل بیرڈ نے اُسکی لاش کو پالکی میں رکھوا کر اُسکے محل میں بھجوا دیا۔

دوسرے دن ٹیپو سلطان کا جنازہ قلعہ سے لال باغ میں پہونچایا گیا جہاں وہ اپنے شیر دل باپ حیدر علی کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اُسکے جنازہ کے ساتھ انگریزی فوج کی چار کمپنیاں تھیں اور جنازہ اُسکے خادموں کے کندھے پر تھا۔ اُسکا بیٹا شہزادہ عبد الخالق جنازہ کے ہمراہ گیا تھا اور اسکی ہمراہی میں اُسکے اراکین سلطنت اور افسر بھی تھے۔ جسطرف سے جنازہ گزرا تھا مسلمانوں کا ایک ہجوم تھا اور سب کے چہروں سے غم کے آثار نمایاں تھے۔ جب جنازہ لال باغ کے پھاٹک پر پہونچا تو فوج نے سلامی اُتاری۔ قاضی نے نماز جنازہ پڑھی اور جب لاش دفن ہو چکی تو بارہ ہزار روپیہ مُلّاؤں اور غریبوں کو جو جنازہ کے ہمراہ گئے تھے تقسیم کیا گیا۔

اسکے بعد ٹیپو سلطان کے بیٹوں کو قید کر لیا گیا اور اُنمیں سے جو بالغ ہو گئے تھے، اُنکو مع اُنکے خاندان کے ویلور بھیجدیا گیا۔ بعد میں اُنمیں سے بعض اس سازش کے بانی قرار دئے گئے جسکے باعث انگریزی فوج مقیم ویلور نے سنہ ۱۸۰۶ء میں غدر کر دیا تھا اور اس جرم میں اُنکو کلکتہ بھیجدیا گیا۔

اس خاندان میں سے ایک شہزادہ جسکا نام شہزادہ غلام محمد تھا بہت سخی فیاض اور مہمان نواز تھا۔ اُسکی یہ باتیں اور منکسر مزاجی اور ہمدردیاں ابتک لوگوں کو یاد ہیں۔ وہ کلکتہ میں جسٹس آف دی پیس کے منصب پر مامور تھا۔ اُسنے میسور کے غریبوں اور مفلسوں کی امداد کے لئے ایک فنڈ بھی جاری کیا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا کہ اُسکا انتقال ہو گیا ہے۔

ٹیپو سلطان کی وفات کے بعد جنرل بیرڈ نے خاص خاص امرا کے مکانات پر حفاظتی پہرے مقرر کر دئے جنھوں نے اپنی جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں اطاعت قبول کر لی۔ شاہی محل پر بھی ایک حفاظتی پہرہ بٹھا دیا۔ ٹیپو سلطان کے محل میں انگریزوں نے بہت چیزیں پائیں، جنکی مالیت ۱۶ لاکھ روپیہ بتائی جاتی ہے۔ مزید برآں نو لاکھ جواہرات بھی انگریزوں کے ہاتھ لگے۔ مال و زر کے علاوہ ۹۲۹ توپیں بھی دستیاب ہوئیں۔ کتب خانہ میں جو قلمی کتابیں ملیں اُنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

قرآن ۴۴ جلدین - تفاسیر ۴۱ - نماز کی کتابین ۳۵ - حدیث کی کتابین ۴۶ - علم الٰہی کی کتابین ۱۶ - صوفی مذہب کی کتابین ۱۱۵ - علم اخلاق کی کتابین ۲۴ - علوم وفنون کی کتابین ۱۹ - فلسفہ کی کتابین ۵۴ - علم ہیئت کی کتابین ۲۴ - علم ریاضی کی کتابین ۷ - علم طب کی کتابین ۶۲ - تاریخ کی کتابین ۱۱۸ - خطوط نویسی کی کتابین ۵۳ - علم عروض کے رسالے ۱۹۰ - ہندی اور دکھنی زبان کے دیوان ۲۳ - دکھنی زبان کی نثر کی کتابین ۴ - ترکی زبان مین نثر کی کتابین ۲ - قصے کہانیان ۱۸ - علم فقہ کی کتابین ۹۵ - صرف ونحو کے رسالے ۴۵ - لغات ۲۹ - انمین سے کچھ کتابین تو آرکاٹ بیجاپور اور گولکنڈہ کی تھین - مگر زیادہ تر یہ چتوڑ - آرنو اور کڈپا کی لوٹ مین ہاتھ لگی تھین - انمین سے قرآن تو قلعہ ونڈسر (انگلستان) کے کتب خانہ مین بھیجدیے گئے اور باقی کتابین کتب خانہ فورٹ ولیم کلکتہ مین داخل کردی گئین -

اس محاصرہ مین جو میسور کی چوتھی اور آخری لڑائی کے نام سے مشہور ہے، میسور کی تقریباً آٹھ ہزار سپاہ ہلاک ہوئی تھی - انگریزون کی طرف سے ۲۹۰ یورپین مارے گئے اور زخمی ہوئے - مزید برآن ۵۶ افسر اور ۶۳۹ دیسی سپاہی کام آئے - انگریزی مقتولین کی تعداد کی زیادتی کی یہ وجہ ہے کہ حملہ کرنے والی فوج مین آگے یورپین ہی ہوتے تھے -

لارڈ مارننگٹن نے فتح کے بعد بڑی عقلمندی کے ساتھ ٹیپو سلطان کے ملک کی تقسیم کی، نصف ملک تو نظام اور مرہٹون کو دیدیا اور نصف انگریزی علاقہ مین شامل کرلیا اس نصف علاقہ کی آمدنی ۵ لاکھ ۳۷ ہزار سکہ میسور تھی اور میسور کا ایک روپیہ ہندوستان کے تین سرکاری روپیون کے برابر ہوتا تھا - رہا وہ ملک یعنی میسور خاص جسکا اصلی فرمانروا ایک ہندو راجہ تھا جسے حیدر علی نے ۱۷۶۱ء مین معزول کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ مین لے لی تھی، وہ اُس راجہ کو بخش دیا گیا -

اُس راجہ کو میسور خاص کی حکرانی اس شرط پر عطا کی گئی تھی کہ وہ انگریزون کو سات لاکھ سکۂ میسور سالانہ بطور خراج دیا کرے اور اُسکے دربار مین انگریزون کا ایک رزیڈنٹ رہے اور نیز معاملات ملکی کی نگرانی انگریزون کے ہاتھ مین رہے اور جزیرہ سرنگاپٹم انگریزون کے حوالہ کردیا جاوے - یہ شرائط راجہ "جیکا کرشنا راج" اور راجہ چام راج کی بیواؤن نے منظور کین جسکا ثبوت اُس خط سے ہوسکتا ہے جو ان دونون کی طرف سے بھیجا گیا تھا :-

> "ہمین بہت خوشی ہوئی کہ سرکار انگلشیہ نے ہمارے نابالغ لڑکے کو میسور ناگر اور اُسکے ماتحت سردارون کے ملک کی حکرانی عطا کی ہے اور پرنیایا کو اُسکا دیوان مقرر کیا ہے - ہمارے ہاتھ مین اس ملک کی حکرانی دوبارہ ۴۰ سال کے بعد آئی ہے - جبتک آفتاب وماہتاب قائم ہین، ہم سرکار کے خلاف کوئی کام نہین کرینگے، بلکہ اپنے تئین ہمیشہ تمہارا فرمانبردار سمجھینگے اور تمہین اپنا محافظ خیال کرینگے - تمہاری یہ عنایت ہم اور ہماری اولاد نسلاً بعد نسل یاد رکھیگی - ہماری اولاد انگریزی حکومت پر امداد کا بھروسہ رکھے گی اور اُس سے ہمیشہ محبت کرے گی -
>
> - دستخط - رانی لچھمی امانی - رانی دیواجی امانی

اسکے بعد نابالغ راجہ کو میسور کے تخت پر بٹھا دیا گیا - وہ مدت العمر اس ریاست پر حکران رہا - ٹیپو سلطان کے افرون کے لیے سرکار انگریزی کی طرف سے معقول وظیفے مقرر کوئے گئے - ٹیپو سلطان اور حیدر علی کے مقبرون کا خرچ اب تک سرکار انگلشیہ کی طرف سے دیا جاتا ہے -

ٹیپو سلطان کے عادات وخصائل اُسکے باپ کے عادات وخصائل کے بالکل برعکس تھے وہ بہادر دل شہسوار اور بڑا اچھا نشانہ باز تھا۔ مگر اسمین اُسکے باپ کی سی جنگی قابلیت نہ تھی۔ فن حرب سے بھی وہ ایسا واقف کار نہ تھا جیسا کہ اُسکا باپ تھا۔ گو وہ خود ایک بے اعتبار شخص تھا۔ مگر اپنے سپہ سالار کی ذات پر بھروسہ نہین کرتا تھا۔ البتہ اپنے سرداروں کو خطابات بہت دیا کرتا تھا۔ وہ مغرور بھی بہت تھا اور اُسکا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ نماز جمعہ مین شاہان مغلیہ کے نام کی جگہ وہ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا کرتا تھا اور لوگون سے کمتر درجے کے لوگون کے شایان شان الفاظ مین گفتگو کرتا تھا۔

سنہ ۱۷۸۶ء مین اُسنے بادشاہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ لیکن اپنے باپ کو ہمیشہ شاہزادہ ہی کہا کرتا تھا۔ وہ اپنی مملکت کو "مملکتِ خداداد" کے نام سے یاد کرتا تھا اور اپنے لشکر کو "لشکر مقدس" کہا کرتا تھا۔ وہ گاہے گاہے اپنی ذات کو "شیر مملکتِ خداداد" کہا کرتا تھا۔

ٹیپو سلطان کو نئی نئی ایجادون کا بڑا شوق تھا۔ وہ اکثر صوبون کے نام بدل بدلکر رکھا کرتا تھا اور پُرانے رسوم کی جگہ نئے رسوم قائم کرتا تھا۔ اُسکے یہ عادات لوگون کو پسند نہ تھے۔ کیونکہ ہندوستان کے باشندے عموماً "لکیر کے فقیر" اور رسوم قدیمہ کے دلدادہ ہوتے ہین۔ انکے مقابلے مین وہ بہتر سے بہتر نئے رسوم کو قبول نہین کرتے۔

ٹیپو سلطان نے امور مملکت اور دیگر بہت سی باتون مین اصلاحین کین۔ آج کل انگریزی قاعدہ کے مطابق دو میل کا ایک کوس سمجھا جاتا ہے لیکن ٹیپو سلطان نے ۲ ۱/۲ میل کا ایک کوس مقرر کیا کہ محمدی کلمہ مین چوبیس حروف ہین اسلئے کوس بھی ۲۴ ہی کے عدد کا تابع ہو۔ اُسنے ڈاک کے ہرکارون کو حکم دے رکھا تھا کہ اگر وہ ۲۲ ۱/۲ منٹ مین ایک کوس فاصلہ طے نہ کریگا تو اُسکے بید لگوائے جائین گے۔ ٹیپو سلطان نے اوزان مین بھی تبدیلی کر دی تھی اور وقت کے شمار کرنے کا ایک عجیب وغریب قاعدہ جاری کیا تھا۔ اہل ہند ساٹھ برس کا ایک دَور قرار دیتے ہین اور ہر سال کو ایک نیا نام دیتے ہین۔ اُسنے بھی اسی قاعدہ کے مطابق ہر سال کا ایک علحدہ نام رکھا۔ اُسنے سال مین ۳۵۴ ہی دن رکھے اور ہر مہینے کا نام ابجد کے قاعدے سے رکھا گیا۔ اُسنے یہ قاعدہ سنہ ۱۷۸۴ء مین جاری کیا اور اُسوقت سے لیکر آخر تک اُسکے خطوط اور کاغذات سرکاری مین اس نئے قاعدے کا عملدرآمد پایا جاتا ہے۔ ٹیپو سلطان ہر فن مولا تھا اور تمام علوم وفنون مین اعلیٰ دستگاہ رکھنے کا دعویٰ رکھتا تھا لیکن جانتا بہت کم تھا۔ سائنس، علم ادب، تجارت، مذہب، انجنیری، فن حرب وغیرہ سب مین کچھ نہ کچھ دخل رکھتا تھا۔ فارسی زبان مین اُسے خوب مہارت تھی اور آسانی کے ساتھ اُسے لکھ پڑھ سکتا تھا۔ سلطنت کا سارا کام وہ اپنی نگرانی مین کراتا تھا اور خود بھی منشیون کی طرح تحریر کا کام کرتا تھا۔

اُسنے ایک عجیب قسم کا سکہ جاری کیا تھا جسکے ایک طرف کلمہ محمدی لکھا جاتا تھا اور دوسری طرف صیغہ واحد غائب مین لفظ "سلطان" ہوتا تھا جس سے خواہ ٹیپو سلطان مراد لے لو اور خواہ خدا۔ اس سکہ کے اجرا سے اُسکی غرض دین محمدی کی اشاعت تھی تاکہ لوگون کے پیش نظر کلمہ محمدی رہنے سے اُنکے دلون مین اسکو قبول کرنے کی رغبت پیدا ہو سکے۔ یہی سکہ اُسنے شاہ عالم فرمانروائے دہلی کی خدمت مین بطور نذر روانہ کیا۔ اسپر شاہ عالم اُس سے ناخوش ہو گیا۔ ٹیپو سلطان نے اُس سے

معافی مانگی اور کہلا بھیجا کہ وہ روپیہ محض آپ کی منظوری کے لئے روانہ کیا گیا تھا۔

ٹیپو سلطان نے ایک جنگی قانون مرتب کیا تھا جسمین اُسنے جنگی فنون، قواعد، مشق جنگ، محاصرہ، سلامی، رخصت اور تنخواہ وغیرہ امور کے متعلق قواعد منضبط کئے تھے۔

ٹیپو سلطان کے فرمان مجریہ ۱۷۸۳ء کے موافق فوج کی ترتیب یون قرار دی گئی تھی:۔

پیادہ و لشکر۔ اسکے پانچ ڈویژن کئے گئے تھے اور ہر ڈویژن مین ۷، رجمنٹ ہوتی تھین اور ہر رجمنٹ مین ۳۹۲ آدمی ہوتے تھے۔ ہر رجمنٹ کے ساتھ آتشی ہوائیان چھوڑنے والی ایک کمپنی رہتی تھی۔

سوارون کا لشکر۔ اس لشکر مین تین قسم کے سوار تھے (۱) قواعد دان سوار (۲) اسلحہ دار سوار (۳) قزاق سوار۔ انمین سے قواعد دان سوارون کے تین ڈویژن تھے اور ہر ڈویژن مین چھ رجمنٹ تھین اور ہر رجمنٹ مین ۳۷۶ لڑنے والے سوار رکھے گئے تھے۔ قواعد دان سوارون کو چھوڑکر اسلحہ دار سوارون کی تعداد ۹ ہزار تھی اور قزاق سوار شمار مین ایک ہزار تھے۔

ٹیپو سلطان نے ۱۷۹۶ء مین گیارہ اشخاص کی ایک مجلس مقرر کرکے اُسکے سپرد بحری فوج کے قائم کرنے کا انتظام کردیا تھا اور ان ہی لوگون کی ماتحتی اور انکی منظوری سے ۲۳ امیر البحر مقرر کئے تھے۔ اُسنے ۲۰ جنگی اور ۲۰ بڑے جہاز تیار کئے جانے کا حکم جاری کیا اور جنگی جہازون کے دو درجے قائم کئے یعنی دوسرے قسم کے جہازون مین ہر ایک جہاز مین اوّل قسم کی ۶۲ توپین اور بڑے جہازون مین ہر جہاز مین ۴۶ توپین۔ امیر البحر کی تنخواہون کے علاوہ گھوڑے کا خرچ بھی منظور کیا گیا اور امیر البحر اعظم کی دعوت کا خرچ بھی مقرر کیا گیا۔ جہاز بننا شروع ہوگئے لیکن اُنسے کام لینے کی نوبت نہ آئی اور ٹیپو سلطان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

ٹیپو سلطان کی سب سے معقول اصلاح انسداد مُسکرات تھی۔ اُسنے اپنی قلمرو مین مُسکرات فروخت نہ کرنے کا حکم جاری کردیا تھا اور مُسکرات فروخت کرنے والون کو حکم دیا تھا کہ وہ کوئی اور پیشہ اختیار کرین۔

اُسنے ایک عجیب وغریب فرمان کل مسلمانان ہند کے نام جاری کیا تھا جسمین اُنسے یہ درخواست کی گئی تھی کہ مومنون پر واجب ہے کہ مرتدون کی حکومت سے نکلکر اس ملک مین آبسین تاکہ سب مشترکہ کوشش کرکے ہندوستان مین اسلام کا جھنڈا نصب کرسکین۔ جو لوگ ایسا کرینگے اُنکی جان ومال اور عزت کا لحاظ کیا جائے گا اور ہر طرح پر اُنکو امداد دی جائیگی۔

ٹیپو سلطان کی مملکت مین محکمہ مالگزاری بھی تھا لیکن جوڈیشل محکمہ نہ تھا۔ محکمہ مالگزاری کے افسر (جو ہر ضلع مین مقرر تھے) اپنی مرضی کے مختار تھے اور جو جی مین آتا تھا کرتے تھے۔ لوگ بھی ڈر کے مارے اُنکی شکایت ٹیپو سلطان سے نہ کرتے تھے۔ خود ٹیپو سلطان بھی جنگ وجدل کے باعث تمام محکمون کی نگرانی اچھی طرح نہین کرسکتا تھا۔

ٹیپو سلطان ایک محکمہ سے خاص دلچسپی رکھتا تھا یہ جاسوسون کا محکمہ تھا۔ ہر سرکاری دفتر، ہر امیر اور ہر بازار مین جاسوسون کا پہرا رہتا تھا جنکے ذریعے اُسکو تمام باتین معلوم ہوجاتی تھین۔ ایک امیر کو دوسرے امیر کے گھر جانیکی سخت ممانعت تھی۔ ٹیپو سلطان کے جور وظلم حد سے بڑھے ہوئے تھے۔ یہان تک کہ وہ خطوط مین بھی اپنے افسرون کو اسکا

[illegible] کرتا تھا۔ ثبوت کے طور پر چند خطوں کا انتخاب [illegible] ہے جو اُسنے مختلف موقعوں پر اپنے افسروں کو لکھے تھے [illegible] ٹیپو سلطان نے محاصرہ مارکنڈہ کے وقت اپنے [illegible] سالار کے نام لکھا تھا۔

[illegible] تمہیں مجبوراً قلعہ پر حملہ کرنا پڑے تو جوذی روح تمہارے سامنے آئے اُسے فوراً تہ تیغ کردو۔ عورت، مرد، لڑکا۔ لڑکی، کُتا، بلّی، خواہ کوئی ہو ہرگز جیتا نہ چھوڑنا۔ لیکن قلعہ کے سپہسالار کا [illegible] کو قتل نہ کرنا۔"

وہ خط جو ٹیپو سلطان نے افسر کورگ کے نام لکھا۔

"تم کورگ پر خوب جوش و خروش کے ساتھ حملہ کرو۔ اور تمام لوگوں کو یا تو قتل کردو اور یا قید کرلو اور مستورات اور بچوں کو مسلمان بنالو۔"

جب ضلع کنار کے مقام سُدیا میں بغاوت ہوئی تو ٹیپو سلطان نے اپنے سپہ سالار بدر الزمان کے نام یہ خط لکھا تھا۔

"کوئی دس سال ہوئے کہ اس شہر کے ہر ایک درخت میں دس دس پندرہ پندرہ آدمیوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ مگر اُسوقت سے اب تک یہ درخت منتظر کھڑے ہیں اور لوگوں کو انہیں پھانسی نہیں دیجاتی۔ اسلئے تمکو چاہیئے کہ جو لوگ سرغنۂ بغاوت ہیں اُنکو ان درختوں میں پھانسی دیدو۔"

خط جو اُسنے کالی کٹ کے حاکم ارشد علیخان کو ملاکوڈن کی سرکوبی کے متعلق لکھا تھا۔

"جسطرح پہلے رہزنوں اور لٹیروں کو قتل کیا گیا تھا، اُسیطرح یہ اب بھی قتل کئے جائیں۔ لیکن صرف سرغنہ قتل کئے جائیں، باقیوں کو قید کرلیا جائے۔ مگر سرکشوں کی سب سے بہتر سزا یہ ہے کہ خواہ وہ کالے کٹتے ہوں خواہ گورے، انہیں قید کرکے سرنگاپٹم کو روانہ کیا جائے۔"

ٹیپو سلطان اپنے باپ حیدر علی کے مانند فیاض نہ تھا بلکہ بخیل تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ فوج کو وردی تک بھی دینے سے کُڑکُڑاتا تھا۔ اگرچہ حیدر علی بھی قیدیوں کے ساتھ سختی برتا کرتا تھا مگر اُنہیں پیٹ بھر کے کھانے کو دیتا تھا۔ لیکن ٹیپو سلطان قصداً اُنکی جان لیتا تھا۔ حیدر علی نے کھانڈے راؤ کو ایک قفس میں قید رکھا تھا، ٹیپو سلطان نے بھی اس سزا کو برقرار رکھا بلکہ اسقدر اضافہ کردیا کہ ایسے قیدیوں کو پاؤ بھر چاول اور نمک کھانے کو ملتا تھا، جسکے باعث وہ سوکھ سوکھ کر مرجاتے تھے۔

مجرموں کو ایک اور قسم کی بھی سزا دیجاتی تھی۔ ایک چوبی گھوڑا تھا جسکے اوپر زین کسا ہوتا تھا۔ مجرم کو اُسپر بٹھاکر باندھ دیا جاتا تھا اور پھر وہ کل گھمائی جاتی تھی جو گھوڑے میں لگی ہوتی تھی جسکے باعث مجرم ایک شکنجہ میں پھنسکر ہلاک ہوجاتا تھا۔ ایک اور سزا بھی دیجاتی تھی۔ وہ اسطرح کہ ٹیپو سلطان مجرموں کے ہاتھ پاؤں زور سے ایک رسّی سے بندھوا دیتا اور پھر اُسے ہاتھی کے پاؤں سے بندھواکر ناہموار زمین پر ہاتھی کو دوڑایا جاتا اور اسطرح خدا کے بندوں کی جان لیجاتی تھی۔ کبھی کبھی مجرموں کے ناک اور کان کٹواکر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ بعض دفعہ مجرموں کو شیروں کے آگے بھی ڈلوا دیا جاتا تھا۔

ٹیپو سلطان کا حُلیہ یہ تھا، خوبصورت ہاتھ پاؤں، سوتواں ناک، بڑی بڑی اور روشن آنکھیں، گردن چھوٹی اور موٹی، جسم فربہ۔ اُسکے ڈاڑھی نہ تھی۔ وہ بڑا حیادار تھا۔ کبھی کسی نے سوائے اُسکے پیروں، کلائیوں اور ٹخنوں کے اُسکے جسم کا کوئی حصّہ نہیں دیکھا۔ غسل کرتے وقت وہ اپنے جسم کو سرتاپا ڈھانپے رہتا تھا۔

ٹیپو سلطان اپنے باپ کے خلاف سادہ لباس زیب بدن کرتا تھا اور اس قسم کا لباس اپنے سردارون کے لئے بھی روا رکھا تھا۔ لیکن سیر و سیاحت کے وقت زرق برق پوشاک استعمال کرتا تھا۔

ٹیپو سلطان کا نام ٹیپو اسلئے رکھا گیا تھا کہ اسکے باپ کا نام حیدر تھا اور حیدر شیر کو کہتے ہین اسلئے کناری زبان کا لفظ ٹیپو اسکے نام کے لئے استعمال کیا گیا جسکے معنی بھی شیر کے ہین۔ اُسے شیر کا شوق بھی تھا۔ اُسکے محل کے آگے چند شیر بانکوں کٹہرون مین بند رہتے تھے اور یا زنجیرون سے جکڑے ہوئے ہوتے تھے۔ اُسنے فوج کی وردی پر بھی شیر کی تصویر بنوائی تھی تخت مین بھی شیر کا طلائی سر لگایا گیا تھا اور شیر کے سر کے اوپر ہما کی صورت بنائی گئی تھی جسکے بازوؤن مین بیش قیمت جواہرات جڑے گئے تھے اور چتر شاہی کی جگہ ہما کے بازو کام دیتے تھے اُسنے اپنے ہتھیارون پر یہ جملہ کندہ کرایا تھا "اسد اللہ الغالب"

ٹیپو سلطان اگرچہ بڑا باتونی تھا، مگر اپنے باپ حیدر علی کے مانند لغو باتین نہین کرتا تھا بلکہ کسی مفید مضمون پر اپنے درباریون کے ساتھ گفتگو کیا کرتا تھا۔ چونکہ اُسے اپنے افسرون پر اعتبار و اعتماد نہین تھا، اسلئے فوج کے لوگون کے سوا سب لوگ اُس سے ناخوش رہتے تھے۔ اپنے مظالم کے لحاظ سے ٹیپو سلطان، نادر شاہ، اور علاء الدین شاہ دہلی کا "مثل" بتایا جاتا ہے۔

ٹیپو سلطان کی قبر پر اُسکی تاریخ وفات لکھی ہوئی ہے جسکے کئی مصرعون سے تاریخ وفات نکلتی ہے جسکا سنہ ہجری ۱۲۱۳ ہے اس تاریخ کا مصنف میر حسین علی تھا اور کندہ کرنے والے کا نام عبد القادر۔

شاکر (میرٹھی)

(ماخوذ)

بعض اُردو رسالے۔ سال گذشتہ کے آخری حصے مین اُردو کے کئی نئے رسالے شائع ہوئے ہین جنمین سفیر جنگلات لکھنؤ اور الصنعت لاہور ملک کی تمدنی ترقی کے لئے خاص طور پر مفید ہین۔ اول الذکر رسالہ مسٹر پی۔ این۔ وکشنی دہ کی ایڈیٹری مین شائع ہوتا ہے جو کشمیر فارسٹ سے تعلق رکھتے ہین اور صیغہ جنگلات کے ایک زبردست ماہر ہین۔ اس رسالے مین محکمہ جنگلات کے متعلق کافی معلومات کے علاوہ علم نباتات اور ہندوستان کے عام درختون کی کاشت اور حفاظت وغیرہ پر عمدہ مضامین ہوتے ہین۔ خصوصاً "درختان ہند" کے عنوان سے ایک نہایت مفید اور معلومات سے لبریز مضمون کا سلسلہ کئی نمبرون سے شائع ہو رہا ہے۔ ملک مین اس قسم کے رسالے کی خاص ضرورت ہے اور ترقی تعلیم کے ساتھ صنعت و حرفت کے رجحان کیلئے خاص طور پر مفید ہے۔ مضامین نگار سب ایسے ہین جو صیغہ جنگلات مین خاص بصیرت اور تجربہ رکھتے ہین۔ اسکے منیجر اور پبلشر پنڈت برج ناتھ صاحب شرغہ۔ ایم۔ اے ہین جنکی اعلیٰ قابلیت اس رسالہ کی اہمیت کی کافی ضمانت ہے۔ قیمت صرف دو روپیہ سالانہ ہے اور رانی کٹرہ لکھنؤ سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ الصنعت لاہور کے مقاصد زیادہ وسیع ہین اور صنعت و حرفت کے عام مضامین کے علاوہ قومی ترقی اور تجارت کے مسئلون پر بھی بحث کرتا ہے اور محنت و قابلیت سے مرتب کیا جاتا ہے۔ اسکی قیمت عوام سے دو روپیہ اور رؤسا سے چار روپیہ ہے۔ والیان ملک سے دس روپیہ قیمت رکھی گئی ہے۔ لیکن طلبہ کے ساتھ خاص رعایت ہے اور انسے صرف عہ مقرر ہے۔ انجمن مؤید الصنعت لاہور کے پتہ سے طلب کیا جاوے۔



فتح حیدر (پسر اکبر ٹیپو سلطان)

انڈین پریس الٰہ آباد

دیباچہ جامِ سُرور

شعر و سخن سے لذت آشنا طبائع کے لئے کسی خوشگو شاعر کا کلام خوان نعمت سے کم نہین۔ جن مختلف ذائقون کے دلکش طعام اس خوان پر چُنے ہوئے ملین گے کسی شاہی دسترخوان پر بھی نظر نہ آئینگے۔ کیونکہ لطیف سی لطیف غذائین بھی صرف زبان کے چٹخارے تک محدود ہین۔ برخلاف اسکے شاعری غذائے روحانی ہے جو انسان کے باطنی احساسات کو بیدار کرتی ہے اور روح کو وہ لذت و سرور بخشتی ہے جسکی تعریف الفاظ کے احاطے سے باہر ہے۔ لارڈ مکالے کا قول ہے کہ "انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلمرو ہے" اس چھوٹے سے جملے مین شاعری کا بہت بڑا فلسفہ مستور ہے۔

انسان کا بطون کوئی چھوٹی سی چیز نہین ہے بلکہ وہ ایک وسیع دنیا سے بھی بڑا ہے اور بعض حالتون مین دنیا و ما فیہا کی وسعت بھی انسانی بطون کی وسعت و کشادگی کو نہین پہونچتی۔ اسی مناسبت سے شاعری بھی ایک بحر ناپیداکنار ہے جسمین کائنات کی تمام محسوس و غیر محسوس کیفیات و جذبات کے چشمے موجزن رہتے ہین۔ دُنیا کے عام مناظر، حُسن و عشق کے کارنامے، رزم و بزم کی داستانین، دولت و ثروت کے افسانے جود و سخا، بذل و ایثار اور خلق و مروت کے اذکار، رنج و مصیبت کے جذبات، خوشی و مسرت کے ولولے، عیش و عشرت کی کہانیان، جنگ و جدل کے واقعات، سلطنتون کے انقلابات، قومون کا عروج و زوال، ارضی و سماوی حادثات قدرت کی نیرنگیان، روحانی جذبات، پند و نصائح، اخلاق و آداب، حکمت و فلسفہ، تہذیب و تمدن، طرز معاشرت اور خصائل انسانی وغیرہ کی جیسی سچی تصویرین شاعری مین ملتی ہین کسی دوسرے فن مین نہین مل سکتین۔ خلاصہ یہ کہ شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جسمین تمام اشیاء خارجی و ذہنی کا عکس نمایان طور پر موجود ہے۔

شعر کی ماہیت کی نسبت دنیا مین اسقدر مختلف و متضاد رائے قائم ہوئی ہین کہ اُن سے کسی صحیح نتیجے پر پہونچنا تقریباً محال ہے۔ لیکن خصوصیات شعر کے متعلق اسپر عام اتفاق ہے کہ تاثیر اسکی جزو اعظم ہے۔ حالانکہ ارکان شعر کا دائرہ بہت وسیع ہے اور حال کے نقادان فن نے اسکے لئے چار چیزین ضروری اور لازمی قرار دی ہین۔ جدت، سادگی، اختصار اور مضمون آفرینی۔ غالباً ان چارون خصوصیات کے اجماع سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اُسکا نام تاثیر ہے۔ لیکن شعر کی علت غائی کیا ہے؟ یہ سوال اسقدر مشکل نہین جسقدر خیال کیا جاتا ہے۔ شعر کا وجود ابتداءً خواہ کسی ضرورت سے کیون نہوا ہو لیکن اسمین اظہار مدعا کی غرض ہمیشہ مضمر رہی ہے۔ جب انسان کے دلمین جذبات پیدا ہوتے ہین اور اُنکا ہجوم حد سے زیادہ ہو جاتا ہے تو طبیعت مین ایک خاص روانی محسوس ہوتی ہے اور قوت متخیلہ جو ہر انسان مین موجود ہے موجزن ہو جاتی ہے۔ اس وقت جو خیالات معرض بیان مین آتے ہین یا گویائی کے ذریعے سے صورت پذیر ہوتے ہین وہی شاعری ہے۔ لیکن قوت متخیلہ ہر انسان مین مساوی نہین ہے۔ لہذا جس شخص مین یہ قوت نسبتہً زائد ہوتی ہے وہ اپنے خیالات کو ایسے اسلوب سے بیان کرتا ہے جو معمولی گفتگو سے فائق ہوتا ہے اور درحقیقت معمولی گفتگو سے فائق تر اسلوب بیان کا نام شاعری ہے۔

اسمین جدت، اختصار، سادگی اور مضمون آفرینی ایک ندرت پیدا کر دیتی ہے اور الفاظ کی طلسم بندی سے وہ موزونیت اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے کہ سامع وجد مین آجاتا ہے۔

اسطرح شاعری ادراکات دلی پر اثر کرتی ہے اور اقلیم دل پر اسکی حکمرانی اسقدر تام ہے کہ اسے اگر دنیا کی ملکہ کہنا مبالغے مین داخل نہین۔ تاثیر اور جذبات کی ترجمانی موجود ہے اور سچے جذبات کو جس رنگ اور جس لباس مین جلوہ گر کیا جائے اسمین یہ صفت موجود ہوگی خصوصاً مصوری، موسیقی، بت تراشی اور ڈراما مین یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ لیکن شاعری کو ان فنون پر اسلئے تفوق حاصل ہے کہ انکی منفرد خوبیان اسمین مجموعی طور پر موجود ہین بلکہ بعض اعتبار سے اسکا مرتبہ ان سب سے زیادہ بلند ہے۔ مثلاً مصوری اور بت تراشی کی صنعتین قوت باصرہ کے بغیر فضول و بیکار ہین۔ اسیطرح موسیقی قوت سامعہ کی محتاج ہے۔ البتہ ڈراما جو محض نقالی ہے شاعری سے کسیقدر مشابہت رکھتا ہے اور وہ شاعری کیطرح قوت باصرہ اور سامعہ دونون پر حاوی ہے اور شاید اسی اعتبار سے لارڈ مکالے نے شاعری کو بھی ایک قسم کی نقالی سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن شاعری مین جو الہامی قوت ہے وہ اُسے اس الزام سے بری کرتی ہے۔ نیز شاعری کی دنیا مین جو وسعت وکشادگی ہے وہ مندرجہ بالا فنون مین نہین پائی جاتی۔ حتی کہ خود لارڈ مکالے نے اسکا اعتراف کیا ہے:۔

"لیکن[ع] شاعری کا میدان اسقدر وسیع ہے کہ بت تراشی، مصوری، ڈراما، یہ تینون فن اسکی وسعت کو نہین پہونچ سکتے۔ بت تراش فقط صورت کی نقل اُتار سکتا ہے۔ مصور صورت کے ساتھ رنگ کو بھی نمایان کرسکتا ہے اور ایکٹر (بشرطیکہ شاعر نے اُسکے لئے الفاظ مہیا کر دئے ہون) صورت اور رنگ کے ساتھ حرکت بھی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن شاعری باوجودیکہ اشیاء خارجی کی نقل مین ان تینون فنون کا کام دے سکتی ہے، اُسکو ان تینون سے اس بات مین فوقیت حاصل ہے کہ انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلمرو ہے۔ نہ وہان مصوری کی رسائی ہے نہ بت تراشی کی اور نہ ڈراما کی۔ مصوری اور ڈراما وغیرہ انسان کے خصائل یا جذبات اُسیقدر ظاہر کرسکتے ہین جسقدر چہرہ یا رنگ اور حرکت سے ظاہر ہوسکتے ہین۔ اور یہ بھی ہمیشہ ادھورے اور نظر فریب نمونے اُن کیفیات کے ہوتے ہین جو فی الواقع انسان کے بطون مین موجود ہین۔ مگر نفس انسانی کی باریک گہری اور گوناگون کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعے سے ظاہر ہوسکتی ہین۔ شاعری کائنات کی تمام اشیاء خارجی اور ذہنی کا نقشہ اُتار سکتی ہے۔ عالم محسوسات، دولت کے انقلابات، سیرت انسانی، معاشرت نوع انسانی تمام چیزین جو فی الحقیقۃ موجود ہین اور تمام وہ چیزین جنکا تصور مقامات اشیاء کے اجزا کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہے سب شاعری کی سلطنت مین محصور ہین۔ شاعری ایک سلطنت ہے جسکی قلمرو اسیقدر وسیع ہے جسقدر خیال کی قلمرو۔"

یہ بھی شاعری کی جامع اور مانع تعریف نہین ہے لیکن اس سے اُسکی وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ شاعری کی قوت متخیلہ کی کوئی حد مقرر نہین۔ اُسکا توسن خیال ہمیشہ نئے اور غیر محسوس میدانون مین طرارے بھرا کرتا ہے۔ وہ انسانی دلون کے اُن عام جذبات کے علاوہ جو دوسرے ذریعون سے بھی واضح ہوسکتے ہین۔ اُن غیر محسوس جذبات کو بھی نمایان کرتا ہے جنکے اظہار کے لئے شاعری کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہین۔ اور اکثر اُن الہامی باتون کو بھی بیان کرتا ہے جو انسانی نظر سے پوشیدہ ہوتی ہین۔ اسطرح شاعر کی طبیعت قدرت کے پوشیدہ رازون کی مظہر اور اُسکی زبان

ع۔ ماخوذ از مقدمہ شاعری شمس العلما مولانا حالی۔

ز مخفی کی ترجمان ہے۔ دنیا و ما فیہا مین جو کچھ موجود ہے وہ شاعری کے احاطے سے باہر نہین اور قدرت جن جدید رموز کا انکشاف چاہتی ہے وہ بھی اکثر شاعر ہی کی طبیعت کے ذریعے سے ظاہر کرتی ہے۔ اسلیئے شعرا تلامیذ الرحمٰن کہے جاتے ہین اور انکی شاعری اکثر حالتون مین ملہم غیبی کی آواز ہوتی ہے۔

شاعر، مصوّر، بُت تراش، موسیقار، اور ایکٹر سب ایک دوسرے کے حریف ہین۔ لیکن شاعر کے پاس اپنے حریفون کے مقابلے مین ایک ہتھیار نہایت زبردست ہے اور وہ تشبیہ و استعارہ ہے جسے شاعر کے سوا کوئی نہین استعمال کر سکتا۔ مصوّر، بُت تراش، موسیقار، اور ایکٹر سب کے سب اپنے کمالات کو کسی دوسری چیز سے تشبیہ نہین دے سکتے۔ اور اسی وجہ سے شاعر کے مقابلے مین انکا رنگ پھیکا رہتا ہے۔ اسمین شک نہین کہ مضمون آفرینی کے میدان مین سب یکسان ہین۔ جدت بھی ایک حد تک مشترک ہے۔ سادگی و اختصار سے بھی سب یکسان فائدہ اُٹھا سکتے ہین۔ اور یہ تو مسلّم ہے کہ اسمین ہر شخص اپنے کمال کے اظہار کے لئے کوئی دلکش مضمون انتخاب کرتا ہے جو بجائے خود دلچسپ و اثر انداز ہو۔ لیکن کمزور مضمون کو زوردار بنانے کے لئے غالباً شاعر کے سوا کسیکے پاس کوئی آلہ نہین ہے۔ شاعر کمزور سے کمزور مضمون مین تشبیہ و استعارہ کا رنگ بھر کے اُسے دلفریب بنا دیتا ہے اور اسطرح اپنے حریفون سے بازی لیجاتا ہے۔

انسان کے قوائے دماغی کی نشو و نما کے لئے شاعری سے بہتر کوئی میدان نہین جسکی وسعت نامحدود ہے۔ اگر انسان مین شاعری کا مادہ نہوتا تو اُسکی قوت متخیلہ ایک تنگ دائرے مین محدود ہو جاتی۔ اُسکے دلی جذبات، ولولے اور اُمنگین سرد پڑ جاتین اور وہ ایک حیوان ناطق سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا۔ اُسکے تمدن کی رفتار بہت دھیمی ہوتی اور کیا عجب ہے کہ اُسکی فطری مدنیت کا مادہ ہی زائل ہو جاتا۔ کیونکہ جب قوت خیال ہی کمزور یا محدود ہوتی تو قوت ارادی مین زور پیدا ہونا معلوم۔

یہ شاعری کے چند نامکمل خصوصیات ہین جنکے بعد اُسکے تاثیرات کی باری آتی ہے۔ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ شاعری براہ راست دلپر اثر ڈالتی ہے اور اقلیم دل پر اس کی حکمرانی عام ہے۔ ایک دل سے دوسرے دلپر روشنی ڈالنے کے لئے اس سے بہتر کوئی آلہ نہین ایجاد ہوا۔ یون تو انسان رنج مین روکر اور خوشی مین ہنسکر اپنے جذبات کا اظہار کر سکتا ہے۔ لیکن جب انھین جذبات کو شاعری کا جامہ پہنایا جاتا ہے تو کچھ اور ہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور سننے والے خود بھی رونے یا ہنسنے لگتے ہین۔ بلکہ شاعری ہی کی بدولت یہ جذبات قابل اعتنا ہو گئے ورنہ ہنسنا یا آنسو بہانا انسان کے معمولی حرکات سے زیادہ وقعت نہین رکھتے جسطرح سونا، جاگنا، انگڑائی، ڈکار اور چھینک لینا انسان کے معمولی حرکات خیال کئے جاتے ہین اُسیطرح رونا اور ہنسنا بھی۔ لیکن جب رونے کو "آنسوؤن کا دریا بہا دینا" اور ہنسنے کو پھول جھڑنے یا بجلی چمکنے سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اُسکی تاثیر بے پایان ہو جاتی ہے اور ممکن نہین کہ سننے والے کے دلپر اثر نہ کرے۔ اسیطرح شاعری کی بیشمار تاثیرین ہین اور سب براہ راست دلپر اثر کرتی ہین۔ خلاصہ یہ کہ شاعری کا نشتر رگ دلپر کھٹکتا ہے اور اپنی کھٹک عرصے تک باقی رکھتا ہے۔ اُسکا اثر دوسری چیزون کی طرح جلد زائل نہین ہوتا بلکہ بعض حالتون مین مستقل ہوتا ہے اور کبھی نہین بدلتا۔

عام مذہب نے شاعری ہی کی مدد سے کامیابی حاصل کی۔ بلکہ اُسیکے لباس مین جلوہ افگن ہو کے اسقدر اثر انداز ہوئے کہ لوگ اُنکے لئے اپنی جانین دینے کو طیار ہو گئے۔ میدان جنگ مین بھی شاعری ہی نے بہادر اور سورما سپاہیون کو تلوار روکنے

مشتعل نہ کر ڈالدیا ہے جو جوش و محبت کی وہ آگ بھڑکاتی ہے جو بغیر خون کی چھینٹون کے فرو نہین ہو سکتی۔ اسیطرح عشق و محبت کے جذبات، ہجر و فرقت کی مصیبتین، رنج و راحت کے قصے سب اپنی اثر اندازی کیلئے شاعری کے محتاج ہین اور حقیقت یہ ہے کہ بے تاثیر شاعری ایک بیکار شے ہے۔ شعر کی عام تعریف یہ ہے کہ وہ زبان سے نکلتے ہی سننے والے کی لوح دل پر مرتسم ہو جائے اور اگر اتنی دیرپا تاثیر نہ ہو تو کم از کم اپنے لیے آہ یا واہ کا نعرہ فوراً نکلوا لے۔

دنیا کے نامور شعرا کے کلام مین شاعری کے بہت سے خصوصیات اور تاثیر شعری کا مادہ بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ لیکن کسی ایک شاعر کے کلام مین شاعری کے تمام خصوصیات مجتمع نہین ہوئے اس سے ظاہر ہے کہ شاعر کی طبیعت خواہ کتنی ہی ہمہ گیر ہو اور اسکا طائر خیال خواہ کتنا ہی بلند پرواز کیون نہ ہو اقلیم سخن اتنی وسیع ہے کہ وہ اسپر احاطہ نہین کر سکتا۔ فردوسی ایسے یکتائے آفاق شاعر نے اپنی تیغ زبان کے جو جوہر میدان رزم مین دکھائے ہین وہ بیمثال ہین۔ لیکن بزم کی نشستگین پر اسکا چراغ نہین جلتا۔ اسیطرح ہر شاعر ایک خاص مذاق کا پابند ہے اور سوسائٹی کا اثر اسے اس پابندی کے لیے خاص طور پہ مجبور کرتا ہے۔ آخر الذکر شق نے بہت سے خوش فکر شعرا کے فطری رجحان کو بھی خاک مین ملایا ہے اور اکثر انہین ایسی اخلاق سوز شاعری پر مجبور کیا ہے جو تہذیب و شائستگی کے صاف دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔

اسکی مثالین گزشتہ دور کی اردو شاعری سے واضح طور پر مل سکتی ہین جسکی اصلاح کے لئے نصف صدی کی مسلسل کوشش بھی کافی نہین ہوئی اور ابتک ملک مین ایک ایسا گروہ موجود ہے جو محض حسن و عشق کے جذبات اور نفس پرستیون کی تفصیل کو عین شاعری کہتا ہے۔ اسکے نزدیک دنیا و مافیہا مین عامیانہ عشق اور ہوس پرستی کے سوا کوئی دوسری چیز ہی نہین۔ لیکن مصلحان شاعری کی آوازین بھی بیکار نہین گئین اور شمس العلما آزاد و حالی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کو بہت سے ہونہار اور خوش فکر شاعر موجود ہو گئے۔

انھین شعرا مین **جام سرور** کا مصنف بھی تھا جسکی بے وقت موت کا رنج ابھی بالکل تازہ ہے۔ سرور جہان آبادی نے اپنی تھوڑی سی زندگی مین شہرت و ناموری کے بہت سے مدارج طے کئے اور اپنی شیوا بیانیون سے ہر طبقے مین ہر دلعزیزی حاصل کی۔ سخن سنجون مین انکا نام ہر زبان پر تھا اور جدید شاعری کے دلدادہ عام طور پر انکے مداح تھے۔ انکے کلام کے خصوصیات مین سوز و گداز کو زیادہ دخل ہے۔ حسن فطرت کی تصویر کشی بھی انکا خاص حصہ تھی اور اسمین سوز و گداز کی حرارت سے جو انکی طبیعت کا جزو اعظم تھی درحقیقت جان پڑ جاتی تھی۔ لیکن انکی شاعری کی سرحد یہین نہین ختم ہوتی بلکہ خیالات کی بلندی۔ طرز بیان کی جدت۔ مضمون آفرینی اور بہت سے خصوصیات شعری انکے کلام مین التزاماً پائے جاتے ہین۔ انکے کلام پر بالاستیعاب نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھون نے صحیفۂ فطرت کا ایک ایک صفحہ غور سے پڑھا تھا اور اسکے معانی و مطالب کو شاعری کا لباس دینے مین خاص قدرت رکھتے تھے۔ بطون انسانی کے باریک اور گہرے جذبات کی وضاحت مین بھی انھین خاص ملکہ تھا۔ کارگاہ ہستی کی بہت چیزون پر انکی توجہ مائل ہوئی ہے اور عام جذبات و احساسات کے علاوہ مناظر قدرت۔ مخلوق خدا۔ نیرنگی عالم۔ اور واقعات وغیرہ پر انکی خاص نظر تھی۔

اُن تمام شاعرانہ لوازم کے ساتھ جو ایک اعلیٰ شاعر کی طبیعت کے لئے مخصوص ہیں سرور میں دو بڑی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اول قادر الکلامی دوم خیالات کی کثرت۔ قادر الکلامی کا یہ حال ہے کہ ایک ایک موضوع پر متعدد نظمیں کہی ہیں اور سب کا رنگ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے۔ اور اسکا تو ذکر ہی فضول ہے کہ بیشمار مختلف اور متضاد خیالات کو شاعری کا نہایت لطیف لباس پہنا دیا ہے اور کہیں تکلف نظم نہیں پایا جاتا۔ خیالات کی کثرت کا بھی یہی عالم ہے۔ کوئی مضمون ہو وہ اپنے مسلسل خیالات نظم کرتے چلے جاتے ہیں اور کبھی کبھی اُنکا سلسلہ بہت طولانی ہو جاتا ہے۔

قریب قریب اُردو کے تمام اصناف سخن میں اُنکا کلام موجود ہے۔ مثلاً مسدس۔ مخمس۔ مربع۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ تضمین۔ قصیدہ۔ قطعہ۔ مثنوی۔ رباعی اور غزل وغیرہ لیکن طرز بیان میں وہ جدت ہے کہ نہ قصیدہ، قصیدہ معلوم ہوتا ہے نہ غزل، غزل۔

اگرچہ سرور غزلگوئی کے مرد میدان نہ تھے لیکن اُنکے کلام میں رنگ تغزل اسقدر عام ہے کہ اس کمی کی پوری تلافی ہو گئی ہے۔ حالانکہ وہ زلف یار کی پرپیچ گلیوں میں نہیں بھٹکتے، دہان یار کی تنگی اور کمر کی معدومیت میں اُنھوں نے مضامین کے خرمن نہیں لگائے ہیں، لیکن اس قسم کے نازک تشبیہات و استعارات سے اُنکا کلام لبریز ہے۔

وہ جدید قسم کی شاعری کے دلدادہ تھے اور قدرت نے اُنھیں جذبات کی تصویر کشی کے لئے پیدا کیا تھا۔ قدیم اصناف سخن میں جدید مذاق کا رنگ بھر کے اور اُسمیں اپنے دلگداز طرز بیان کی روح پھونک کے وہ ہر نظم کو ایک دلکش مرقع بنا دیتے تھے جسمیں جذبات کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ گویا مشرقی شیشوں میں مغربی شراب جھلک رہی ہے۔ اس جدت کے ساتھ بعض نظموں میں مغربی اصناف سخن سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار میں جو ایک مربع کے پہلے بند سے تعلق رکھتے ہیں اول اور آخر کے مصرعے ہم قافیہ ہیں:-

یہ آخری گلاب کا ہے یادگار پھول — اور شاخ پر کھلا ہوا تنہا چمن میں ہے
بیکس، غریب، فرقت احباب میں ملول — دھندلا سا اک چراغ سحر انجمن میں ہے

ہر نظم کے ساتھ اُنکی وسعت معلومات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ جس مضمون کو اُٹھایا ہے اُسے کافی معلومات کے ساتھ ختم کیا ہے۔ اگرچہ یہ میدان ایسا نہیں ہے کہ انسانی طبیعت اُسپر احاطہ کر سکے اور خیالات کا سلسلہ کبھی ختم ہو سکے۔ تاہم ضروری معلومات کے بغیر اس قسم کی نظموں کا کوئی لطف نہیں۔ مثلاً پھول پر نظم کہنا ہے تو اگرچہ فن باغبانی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے تاہم پھول کا تھوڑا بہت فلسفہ جانے بغیر صرف اُسکے رنگ اور نزاکت کی تعریف کر دینا جدید اصول فن کی رو سے گناہ ہے۔ سرور کی طبیعت فلسفانہ نہیں واقع ہوئی ہے لیکن جذبات پر اُنکی اسقدر گہری نگاہ ہے کہ ایک حد تک اسکی تلافی ہو جاتی ہے۔

اس مجموعہ میں زیادہ تر مصنف کی طبعزاد نظمیں ہیں۔ لیکن ایسی نظمیں بھی کثرت سے موجود ہیں جو کسی غیر زبان کی نظم کا ترجمہ ہیں یا کسی نثر مضمون کے خیالات و مطالب کو نظم کا لباس دیا گیا ہے۔ اسی قسم کی نظموں میں کسی نظم یا نثر کا لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ تھوڑے بہت تصرف کے ساتھ اُن مطالب کو اپنی زبان میں لے لیا ہے۔ مثلاً "کارزار ہستی" مسز ہیمانس کی ایک مشہور انگریزی نظم کا ترجمہ ہے لیکن نقل مطابق اصل نہیں ہے۔ "رویائے اکبر" بھی ایسی ہی نظم ہے جسمیں لارڈ ٹنی سن کی ایک بسیط اور پرزور نظم (Akber's Dream) کے بعض بندوں کا مفہوم لیا ہے۔

اسپیلج" "کوئل" "مرغابی" "تمنا" "ترانۂ خواب" "حسرت دیدار" "سال گزشتہ" وغیرہ سب انگریزی نظموں سے ماخوذ ہیں۔ نظمِ ہذا "دیوار کہن" "ملک الحضری" "مطالعۂ کتب" "نابینا پھول والی" وغیرہ نئے مضامین سے ماخوذ ہیں۔

اگرچہ سرور نے مختلف موضوع پر نظمیں کہی ہیں اور ہر قسم کے جذبات نظم کئے ہیں مگر حب الوطنی پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ ہر شاعر خواہ کیسی ہی ہمہ گیر طبیعت کیوں نہ رکھتا ہو، ایک خاص رجحان ضرور رکھتا ہے۔ نظر برین سرور کا خاص رجحان حب الوطنی ہی کی طرف پایا جاتا ہے۔ اگرچہ سوز و گداز اور حسرت بھی انکے کلام کی خاص خصوصیات ہیں لیکن جس نشے میں وہ سرشار تھے وہ غالباً حب الوطنی ہے۔ اس سبجکٹ پر انکی چھ نظمیں موجود ہیں جنمیں بعض طبعزاد ہیں اور بعض ترجمہ یا ماخوذ۔ "خاک وطن" میں ہندوستان کی گزشتہ عظمت کی عبرت انگیز تصویر کھینچی ہے۔ "عروس حب وطن" کا انداز بالکل جداگانہ ہے جسمیں اردو کے پرانے مذاق کو نیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسری نظم "مادر ہند" کے عنوان سے ہے چوتھی "اندوہ غربت" پانچویں "یاد وطن" اور چھٹی نظم "حسرت وطن" لیکن باوصف ایک ہی موضوع ہونے کے سب کا انداز و طرز بیان جداگانہ ہے۔

حب الوطنی کے دوسرے نمبر پر عہد طفلی کے جذبات اور اسکی حسرت خیز یاد ہے۔ "دیوار کہن" اسی قبیل کی نظم ہے جو اگرچہ سرور کی طبعزاد نہیں لیکن اظہار جذبات میں شاعر نے کلیجہ نکالکر رکھدیا ہے۔ "یاد طفلی" "بچہ اور ہلال" "امید اور طفلی" "بچپن کی یاد" سب معصومانہ جذبات سے معمور ہیں اور سب کا طرز بیان مختلف، موثر، اور دلگداز ہے۔

کوئل کی کوک۔ شفق شام کی دلآویزی۔ نسیم سحر کے جھونکے۔ مرغان قفس کی فریاد۔ گل و بلبل کے افسانے۔ شمع و پروانہ کے راز و نیاز۔ داغ جگر کی سوزش۔ بے ثباتی دنیا۔ عرفان و تصوف۔ حسرت شباب۔ ماتم آرزو۔ بیقراری دل۔ سودائے عشق وغیرہ ایسے مضامین ہیں جنپر شعرائے اردو نے تلے توڑ دیے ہیں اور انھیں اتنے مختلف طریقوں سے باندھا ہے کہ اب انمیں بظاہر کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ لیکن شاعری ایسا فن ہے جو کبھی محدود نہیں ہوسکتا اور مبدء فیاض سے اسکے لئے نئے نئے خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ سرور نے ان مضامین پر متعدد نظمیں لکھی ہیں جنکا رنگ نہایت دلکش ہے۔ ہر نظم میں قدرتی جذبات موجزن ہیں اور خیالات کی کثرت۔ طبیعت کی روانی۔ اور طرز بیان کی جدت سے ایک بالکل نیا طلسم پیش نظر ہو جاتا ہے۔ مناظر قدرت پر بھی انھوں نے بہت کچھ طبع آزمائی کی ہے اور مشکل سے کوئی دلفریب منظر انکی نظر سے بچ رہا ہے۔ عورتوں کے جذبات اور انکے فطری اوصاف پر سرور نے نہایت غائر نگاہ ڈالی ہے اور اس صنعت خاص میں انھیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ "پدمنی" "دمن اور ہنس" "سیتا کی گریہ وزاری" "زن خوشخو" "ادائے شرم" وغیرہ سب اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ اصلاح معاشرت کے متعلق اگرچہ انھوں نے بہت کم کہا ہے تاہم بیوگی کی رسم سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں اور "سوز بیوگی" کے عنوان سے ایک دردبھری نظم اس مجموعے میں موجود ہے۔ ایسے خشک مضامین میں شاعرانہ ندرت اور دلکشی پیدا کرنا آسان بات نہیں ہے۔ مشاہیر ملک کی موت پر خصوصیت کے ساتھ انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور یہ رنگ انکی دلگداز طبیعت سے خاص مناسبت رکھتا ہے۔ نظر برین اس صنعت میں انکا قلم خاص طور پر زوردار ہوگیا ہے

اور بعض مشاہیر کی وفات پر اُنھون نے بڑے بڑے اور دردار مرثیے لکھے ہین جنمین نہایت عمیق جذبات منظوم ہین۔

عام شاعرانہ اوصاف کے علاوہ سُرور مین ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ ہر قسم کے خیالات پر قادر تھے اور جس میدان مین قدم رکھتے تھے اُسکی انتہائی منزل تک پہونچ جاتے تھے۔ چنانچہ جو نظمین اُنھون نے مذہبی مذاق پر لکھی ہین اُنکا طرزِ بیان اگرچہ نہایت سادہ ہے لیکن مقدسانہ جذبات کے دریا بہادئے ہین۔ "لکشمی جی" اور "وید مقدس کی روشنی" وغیرہ ایسی نظمین ہین جو مقدسانہ جذبات کے ساتھ خاص جدّت رکھتی ہین۔ اس صنف مین اُنھون نے بہت کچھ کہا تھا لیکن اس مجموعے مین اُن تمام نظمون کو داخل نہین کیا۔

اس مجموعے مین اُنکی جتنی نظمین داخل ہین وہ نئی صدی کے آغاز سے پیشتر کی نہین ہین۔ صرف تین نظمین "نوجہان کا مرثیہ" "نیچرل شاعری" اور "بے ثباتی دنیا" جو آخر مین درج ہین ۱۸۹۹ء کی تصنیف ہین اور رسالہ ادیب فیروزآباد مین شائع ہوئی تھین جو مولوی عبدالواجد صاحب رئیس فتح گنج غربی کی عنایت سے دستیاب ہوئی ہین۔ ان نظمون مین اگرچہ ابتدائی مشق کی اکثر خامیان موجود ہین تاہم شاعر کی قادرالکلامی کا عمدہ نمونہ ہین۔ سرور مرحوم ایک زمانے مین مولوی صاحب موصوف کی معلمی پر مامور تھے اور مبارکباد عید کے عنوان سے اپنے شاگرد کے لیے ایک قطعہ کہا تھا جو درج ضمیمہ ہے۔ چونکہ اس قسم کی شاعری اُنکے رنگ سے بالکل جدا گانہ ہے، لیکن اُنکی ہمہ گیر طبیعت پر روشنی ڈالتی ہے اسلئے وہ قطعہ خصوصیت کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔

اُن فطری شعرا مین جو اپنی شاعری کا مادّہ بدوِ فطرت سے ساتھ لاتے ہین سرور خاص طور پر قابل الذکر ہین۔ وہ ایسے مقام پر پیدا ہوئے جہان شاعری و زباندانی کے لئے کوئی آسانی نہ تھی۔ شعر و سخن کی وہ صحبتین جو اہل دہلی و لکھنؤ کو بالعموم حاصل رہتی ہین اُنھون نے خواب مین نہین دیکھی تھین۔ اُنکا وطن جہان آباد ضلع پیلی بھیت کا ایک قصبہ ہے جسے اُنھین کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ یہان کی زبان لکھنؤ اور دہلی کے دیہات کی زبان سے بھی ہمسری نہین کر سکتی۔ باایں ہمہ اُنکا کلام کسی اہل زبان کا کلام معلوم ہوتا ہے اور زبان پر اُنکی قدرت اسقدر زیادہ ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ خیالات کو بھی آسانی سے نظم کر دیتے ہین۔ یہ قدرت صرف اساتذۂ قدیم و حال کی تصنیفات کے مطالعہ سے پیدا ہوئی ہے اور اُنکی ذہانت و طباعی نے اُسے اپنا حصّہ کر لیا ہے۔ طرزِ بیان کے اعتبار سے وہ **غالب و مومن** کے مقلد معلوم ہوتے ہین اور ان اساتذہ کی فارسی ترکیبون کو اس بے تکلفی سے استعمال کرتے ہین جو اُنکی استعدادِ علمی کے اعتبار سے بالکل معجزہ معلوم ہوتی ہے۔ اُنکے کلام مین کہین کہین **میرانیس** کی صفائی اور حسنِ بندش کی جھلک بھی موجود ہے اور **مرزا دبیر** کی شوکت الفاظ کا شائبہ بھی۔ اور میر کا دلگداز رنگ اس عمومیت سے موجود ہے کہ مشکل سے کوئی نظم اس سے معرا ہوگی۔

ان خصوصیات کو فطری جذبات کی صورت کشی نے ایک رنگ خاص دیدیا ہے اور طرزِ جدید مین ایسی شان پیدا کر دی ہے جسکی دلکشی غیر معمولی ہے۔ زورِ طبیعت کے لحاظ سے بھی سرور ایک زبردست شاعر تھے اور اُنکی **آورد** مین **آمد** کا لطف موجود ہے۔ خصوصاً سوز و گداز کے بیان مین اُن کے قلم سے چنگاریان اُڑتی ہین اور آگ کے شعلے آسمان تک پہونچتے ہین۔ اسی مناسبت سے اُنھون نے اپنے طرزِ بیان مین اساتذۂ قدیم کی تقلید کی ہے جنکا رنگِ سخن سوز و گداز اور حسرت کشی کے

جذبات سے مملو ہے۔ انکے کلام مین "آہ" کا لفظ اس کثرت سے آیا ہے کہ گویا یہ انکا تخلص معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ انکی دلگداز طبیعت کا مقتضی تھا اور انکی شاعری کے لئے ناگزیر سمجھنا چاہیے۔ تشبیہ و استعارہ سے بھی انکا کلام ایک حد تک مالا مال ہے اور انتہا درجہ فن کے کمال کے مطابق یہ شاعری کی آخری منزل ہے۔ اس آسمان پر پہونچکر شاعر کو معراج حاصل ہوجاتی ہے۔ دنیا کے جتنے بڑے بڑے شاعر گزرے ہین سب کے کلام مین یہی مابہ الامتیاز ہے۔ سرور کی اس قسم کی نظمون مین "بیر بہوٹی" والی نظم خاص طور پر قابل لحاظ ہے جو انکی آخری نظمون مین لاجواب ہے۔ حالانکہ انکی سب سے آخری نظم "ترانۂ وحدت" ہے جسے مرحوم نے اپنی وفات سے چند ہی یوم پیشتر کہا تھا اور دسمبر ۱۹۱۰ء کے ادیب مین شائع ہو چکی ہے۔

سرور کی شاعری کی تشریح کرتے ہوئے مجھے اپنی ہیچدانی کا اعتراف ہے۔ مین نے ایسی جرأت صرف مرحوم کے اُس اصرار پر کی ہے، جو اُنھون نے اپنا مجموعۂ کلام مرتب کرنے پر مجھسے کیا تھا۔ چونکہ اب وہ اس دنیا مین نہین ہین اور معذرت کا کوئی موقع نہین باقی رہا ہے لہذا امتثال امر کے طور پر اپنے کمزور دماغ اور معذور قلم سے جو کچھ ہو سکا ہے نذر کیا گیا ہے۔ غالباً مرحوم کی روح ناخوش نہ ہوگی اور احباب مجھے اس ہرزہ سرائی کے لئے معاف فرمائینگے جسکا خیال مجھے مرحوم کی وفات پر ایک دوستانہ فرمایش کی تعمیل کے طور پر پیدا ہوا ہے اور نہایت عجلت مین انجام پذیر ہوا ہے۔

نوبت رائے نظر (لکھنوی)

اولڈ بوائے۔ علی گڑھ کالج کے طلبا رقدیم کی دلچسپیون کے لیے "اولڈ بوائے" ایک نہایت ہی دلکش رسالہ ہے۔ اسکے ایڈیٹر ابو حامد عترت حسین صاحب بی اے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر سید منظر علی صاحب علی گڑھ کالج کے پرانے طلبا اور اعلی قابلیت کے اہل قلم ہین۔ کالج موصوف کے پرانے طلبا کی ایک برادری قائم کرنا اور انھین کالج کے حالات اور مزدورون سے مطلع کرتے رہنا اس رسالہ کا خاص مقصد ہے۔ مضامین مین دلچسپی اور شوخی تحریر کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے اور تمام مضامین نگار اپنے ناظرین کے مذاق سے پوری واقفیت رکھتے ہین۔ خصوصاً مسٹر شوکت علی صاحب اور "یلدرم" کی جادو بیانیان خاص لطف رکھتی ہین ٹائٹل پیج پر علی گڑھ کالج کی ایک نفیس عکسی تصویر اور "اولڈ بوائے" کا نام اپنی سادگی اور بیباکی مین نہایت دلکش ہے۔ مینجر اولڈ بوائے بنارس سے خط و کتابت کی جائے۔

رسالۂ زبان دہلی۔ اردو رسالون مین "زبان" بھی اپنی طرز کا ایک ہی رسالہ ہے جو شروع ہی سے اعلی پیمانے پر نکالا گیا تھا۔ اس مین ادبی۔ اخلاقی۔ شاعرانہ ہر قسم کے مضامین کے علاوہ تصاویر کا سلسلہ بھی عرصے سے جاری ہے۔ لیکن دسمبر گزشتہ سے اسمین خاص طور پر اضافہ کیا گیا ہے۔ اسکے ایڈیٹر حضرت نازک رقم اکبرآبادی ہین جو ایک خوش فکر شاعر کے علاوہ اعلی درجے کے خوشنویس بھی ہین۔ قیمت سالانہ ۱؎ ہے۔ زبان پریس دہلی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔



میگھناد اور پرمیلا
(از بابو آبندرو کمار متر)

انڈین پریس الہ آباد

بنگالیون کی اُردو شاعری

قصۂ یاران رفتہ ہی بلا سے چھیڑیے
نیند آنکھون سے اُڑے ایسا کوئی افسانہ ہو

بنگال کی اُردو زبان دانی کا خاکہ ہمیشہ اُڑایا گیا ہے اور گو کہ خاص الخاص بنگالہ کی زمین پاک سے عبدالغفور خان نساخ اور سید محمود آزاد ایسے کامل الفن حضرات اُٹھے ہین اور اب بھی اچھی سی اچھی اُردو نظم و نثر لکھنے والے موجود ہین مگر کیا غضب ہے کہ پھر بھی یہ دھبہ بنگالے کے دامن سے دور ہوتا ہوا نظر نہین آتا۔

عجب پرلطف اصطلاح ہے کہ بنگالے کے مسلمان اپنے ہندو برادران وطن کو "بنگالی" کہتے ہین اور اپنے آپکو "مسلمان" گویا بنگالی ہندو کا مترادف ہے اور اب یہ انوکھی اصطلاح حدود بنگال سے نکلکر سارے ہندوستان مین مشتہر ہوگئی ہے۔ اس اصطلاح کے بنا پر ہمنے بھی اپنے اس مضمون کا یہی عنوان پسند کیا ہے۔

ایسی کوئی وجہ وجیہ نہ تھی جس سے ہمارے بنگالی بھائی اُردو کی جانب متوجہ ہوتے۔ بیشک جب آج سے ستر برس پہلے بنگال کی عدالتون کی زبان فارسی تھی اُسوقت اکثر بنگالیون مین لایق سے لایق فارسی دان موجود تھے اور اُسوقت بھی یہی لوگ بوجہ اپنی صحیح فطرت اور مادہ کے برسر کار تھے۔ چنانچہ خالص بنگال کے مشہور بانی مذہب راجہ رام موہن رائے کی تحفۃ موحدین فارسی زبان کی مشہور تصنیف ہے۔ اور اسی طرح ڈھاکہ کے زبردست خوشنویس منشی مدن موہن کی مشق اور وصلیان ابتک اچھی قیمت پاتی ہین۔ مگر یہان کی عدالتون مین فارسی کا استعمال بنگلہ کے ساتھ یکایک ہوگیا۔ ایسی حالت مین ننگی اُردو کی جانب کون متوجہ ہوتا۔ لیکن ہندو مسلمانون کے قدیم محبتانہ برتاؤ اور تعلقات معاشرت کا اثر (جسکے فقدان کا تمام محبان وطن کو افسوس اور سخت افسوس ہونا چاہیئے) خالص بنگالی خاندانون مین اُردو زباندانی اور اُردو شاعری کی صورت مین ظاہر ہوا۔ مجھے بڑی تلاش کے بعد کچھ ایسے اصحاب کا پتہ لگا ہے جو اُردو کے اچھے شاعر تھے اور چونکہ یہ گنتی کے چند لوگ ہین اسلئے ہم ناظرین ادیب کیلئے معرف بننے کی جسارت کرتے ہین۔

ارمان۔ جب کلکتہ نیا نیا آباد ہونا شروع ہوا ہے اُسوقت راجہ نبکرشن متر وہان کے رئیس شمار ہوتے تھے اور سوتڑی جو کلکتے سے قریب ہی ہے وہان رہتے تھے۔ ارمان تخلص ہے راجہ موصوف کے نبیرہ راجہ جنمیجے متر۔ اپنے وقت مین اُردو کے بڑے حامی اور شاعرون کے زبردست معاون شمار ہوتے تھے۔ اُنھون نے شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ بہار دلکشا نام بھی لکھا تھا۔ حضرت نساخ کے دوست اور ہم اُستاد تھے۔ ۱۸۷۴ء تک بقید حیات تھے اُنکے دو شعر حاضر ہین۔ ؎

کام اپنا نہ کبھو، مجھسے مری جان نکلا ۔۔۔ تن سے جان نکلی مگر دل کا نہ ارمان نکلا
رات بھر نالے کیا کرتا ہون گریہ دن کو ۔۔۔ پوچھتے کیا ہین مرے اوقات کو آپ

---

۱ مضمون ہذا سخن شعرا نساخ جہانگیر نگری۔ تذکرۂ شعرائے ہنود اور گلدستۂ خیال از عطش جہانگیر نگری۔ تذکرہ شعرائے ڈھاکہ وغیرہ سے ماخوذ ہے۔

وزیر۔ تخلص ہے منشی بنواری لال باشندۂ کلکتہ کا نسّاخ نے انھین اپنا ملاقاتی لکھا ہے ۱۲۸۲ھ تک زندہ تھے ایک شعر انسے یادگار ہے۔ ؎

دلدار کی خاطر سے دل آزار بھی چھوڑا | الفت میں سمن رویوں کے گلزار بھی چھوڑا

راقب۔ مرزا جان طپش مرحوم جو درحقیقت بنگالہ کی اُردو شاعری کے آدم تھے اور جنکے شمس البیان پر میرا ریویو نومبر کے ادیب مین شائع ہو چکا ہے راقب انکے تلمیذ رشید تھے۔ راجہ راج کشن نام تھا اور راجہ نبکشن بہادر رئیس اعظم کلکتہ کے صاحبزادے تھے۔ ایک ضخیم دیوان انھون نے اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ تذکرین گذرین کہ میری نظر اس دیوان کے مطالعہ سے فیض اُٹھا چکی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اب بالکل نایاب ہے۔ صرف ایک ہی شعر ہدیۂ ناظرین ہے۔ ؎

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤ گے صاحب | تو مجھکو سحر تک نہ یہان پاؤ گے صاحب

کشن۔ تخلص بابو کشن چندر گھوس باشندۂ کلکتہ۔ اس سے زیادہ کچھ نہ معلوم ہوا۔ ولہ ؎

صدف اپنے گوہر کو بے آب سمجھے | یہ دندان تمہارے دہن مین جو دیکھے

کنور۔ الولد سرٌ لابیہ کے اصول پر راجہ راج کشن بہادر کے صاحبزادے نے بھی شغل شاعری کو برجا رکھا۔ کنور صاحب کا نام راجہ اپورب کشن بہادر تھا۔ اپنے فاضل والد کے شاگرد تھے۔ انسے بھی ایک ضخیم دیوان یادگار ہے۔ مین نے اُسے بہت دن ہوئے دیکھا ہے مگر اب کمیاب ہے۔ معقول کلام ہے۔ ؎

شیدا ہے عشق مین ترے دل شیخ و شاب کا | قالب تہی ہے یاد مین تیرے حباب کا

نہ پوچھو گذری ہے جو مجھ بیقرار کی رات | مثال شمع کٹی روتے روتے ساری رات

مشفق۔ تخلص ہے راجہ جادوب کشن بہادر کا اور یہ بھی اُسی خاندان کے نونہال اور صاحب دیوان گذرے ہین۔ مولوی ظہور النبی مخزون جو سرہندی پیرزادے تھے اور ایک زمانہ مین کلکتے مین انکی شاعری کی بڑی دھوم تھی راجہ صاحب انھین کے شاگرد تھے۔ ولہ ؎

خفتگان خاک ہین قربان اُس رفتار پر | ہے قیامت کا گمان سب کو قدِ دلدار پر

نیند تو آتی نہین جو خواب مین دیکھون اُسے | حیف آتا ہے مجھے اس دیدۂ بیدار پر

ملک۔ ملک خاندان اب بھی کلکتے مین نہایت مشہور اور صاحب اثر خاندان ہے۔ بابو جگناتھ پرشاد اسی خاندان کے ایک رکن تھے۔ میر باسط علی محوی الہ آبادی کے اثر صحبت سے یہ شاعری کے جانب بھی متوجہ ہوئے۔ حضرت نسّاخ نے انھین اپنا ملاقاتی بتایا ہے۔ ولہ ؎

دل پہ اک سانپ سا لہراتا ہے اسوقت فلک | زلف جانان کی صبا جبکے جو بو آتی ہے

موہن۔ بابو ہری موہن داس پروفیسر فارسی و اُردو جگناتھ کالج ڈھاکا کا تخلص ہے۔ حضرت موہن ڈھاکہ کے قدیم باشندے تھے اور پُرانے بزرگون کی ادائین اُنمین اتنی تھین کہ انکے بعد کوئی اُنکا مثل ہی باقی نہ رہا۔ ابھی کئی سال ہوئے انتقال کیا۔ اسوقت سوائے تاریخ ذیل کے دیگر کلام سے میرا ذخیرہ خالی ہے اسلئے اسی پر اکتفا کی گئی۔ ؎

میرے شفیق منشی عالی خیال طپش | شعر و سخن مین ہے انھین سب طرح کمال

تقریر جو لکھی ہے یہ نو طرز دلفریب | ہے شاہدان باغ سخن کا نیا جمال

ظاہر ہے خوبی اسکی نہین حاجت بیان | تعریف اسکی مین جو کرون میری کیا مجال

تاریخ اسکی لکھتا ہون موہن بشوق دل

ہے یہ نیا کھلا ہوا گلدستۂ خیال ۱۳۱۷ھ

ناظرین ادیب! کیا آپ اس خبر کو نہایت رنج سے نہ سنین گے کہ یہ تمام فہرست مردہ شاعرون کی ہے اور اب بنگال بھر مین ایک فرد بھی ایسا نہین ہے جو اُردو شاعری کا نام لیوا ہو اور پھر وہ بنگالی ہو۔ مین نے صرف یہ انتخاب اُن حدود کے اندر کیا ہے جہان بنگلہ زبان رائج ہے ورنہ سرکاری بنگال مین بہار و اُڑیسہ بھی شامل ہے۔ یادش بخیر بہار مین اب بھی ہندو شعرا موجود ہین اور اگر تلاش کیجائے تو صرف زندہ شاعرون کی ایک بڑی تعداد نکل آسکتی ہے۔

حبیب الرحمٰن



اعلیحضرت حضور جارج پنجم شاہ و شہنشاہ سلطنت برطانیہ دام ملکہ



علیا حضرت حضور ملکہ معظمہ میری دام اقبالہا

نوید مقدم شاہی

(از افکار تازہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سابق مدرس فارسی گورنمنٹ نارمل اسکول آگرہ)

بہار بوستان آنے کو ہے — خسروِ گل ہم عنان آنے کو ہے
بہر استقبال رایاتِ بہار — لشکرِ سروِ روان آنے کو ہے
شاخِ گلبن پر باندازِ خطیب — عندلیبِ خوش بیان آنے کو ہے
صحنِ گلشن مین بطورِ ترجمان — طوطیِ شیرین زبان آنے کو ہے
پیشِ گل ہر طائرِ رنگین نوا — تہنیت گو، مدح خوان آنے کو ہے
ہدہدِ فرخندہ مژدگانی کے لئے — بال افشان پرزنان آنے کو ہے
بہرِ گوہر بارِ بحرِ مغربی — سوئے مشرق دُرفشان آنے کو ہے
راہِ دریا سے سفینون کی قطار — صورتِ سیارگان آنے کو ہے
نوجوان بنکر نگاہِ خلق مین — داستانِ باستان آنے کو ہے
جامِ صحت سے بنکے بزمِ عیش مین — گردشِ رطلِ گران آنے کو ہے
خانۂ باغون کے سئے کشمیر سے — کشتِ زارِ زعفران آنے کو ہے
بلدۂ کاشی سے زربفتِ نفیس — از برائے سائبان آنے کو ہے
زینتِ درہائے ایوان کے لئے — ٹوکیو سے پرنیان آنے کو ہے
عاقہ طاقہ مخملِ روم و فرنگ — فرشِ راہِ دوستان آنے کو ہے
طبلہ طبلہ مُشکِ تاتار و ختن — حسبِ حکمِ میزبان آنے کو ہے
میوہ کابل سے تو مسقط سے رطب — بہرِ نقلِ میہمان آنے کو ہے
وہ مہوبہ سے تو یہ قنوج سے — عطرِ گل اور برگِ پان آنے کو ہے
لیکے جنسِ نادراتِ روزگار — مجمعِ بازارگان آنے کو ہے
خاص کجلی بن سے پیلِ دیوزاد — ساتھ لیکر پیلبان آنے کو ہے
گلۂ گلگون و شبدیز و سمند — ہمرہ سوداگران آنے کو ہے
اشترانِ تند جیلمیر سے — لیکے خیلِ ساربان آنے کو ہے
بے شمار اسٹاک موٹر کار کا — ملک یورپ سے یہان آنے کو ہے
صنعتِ پرواز کا موجب گروہ — لیکے اپنی کشتیان آنے کو ہے
مردمِ آفاق کا جمِّ غفیر — کاروان در کاروان آنے کو ہے
شہری و دہقان کا انبوہ کثیر — مرزبان سے تاشبان آنے کو ہے
جذبۂ شوقِ تماشا دیکھئے — تا بہ پیرِ ناتوان آنے کو ہے
خیمہ و خرگاہ کا شہرِ جدید — زیرِ سقفِ آسمان آنے کو ہے
ہر طرف سے لشکرِ آراستہ — مثلِ دریائے روان آنے کو ہے
نیزہ برداروں کے پیہم کوچ سے — راستون مین نیستان آنے کو ہے
رائفل بر دوش پیدل کا فشون — ہمدمِ برقِ دمان آنے کو ہے
توپخانون کا گرجنا گھورنا — گویا بھادون کا سمان آنے کو ہے
وقتِ ہر شلّک دہانِ توپ سے — بانگِ دیوِ ہفتخوان آنے کو ہے
عرضِ لشکر کے لئے میدان مین — تا دہ بابِ چترِ نشان آنے کو ہے
موجِ برقِ نامہ برلائی خبر — اک نیا دورِ زمان آنے کو ہے
دیدہ و دل منتظر ہین ہم بتا — کون آتا ہے؟ کہان آنے کو ہے
جارج پنجم خسروِ گیتی ستان — جانبِ ہندوستان آنے کو ہے
وارثِ تاج و نگینِ قیصری — داورِ دارانشان آنے کو ہے
آفتابِ گلشنِ ہندوستان — سمتِ راسِ عزوشان آنے کو ہے
از پئے تسلیمِ شاہِ جم شکوہ — ہر امیرِ ملک ران آنے کو ہے
دیرجات و سندھ و پنجاب و دکن — باسرو با چشم و جان آنے کو ہے
تبت و برما و بنگال و اودھ — بلکہ تا بامِ جہان آنے کو ہے
عتبۂ علیا کی جانب باخلوص — طبقۂ نواب و خان آنے کو ہے
گرد بر گردِ سوادِ تہاے شاہ — جیش رائے و راجگان آنے کو ہے
راجپوتانہ سے باخیل و حشم — ماہ[عہ] و خور کا خاندان آنے کو ہے
ربعِ مسکون سے برسمِ تہنیت — نائبِ ہر قہرمان آنے کو ہے
تازہ کرنے ملک پیمانِ وفا — پادشاہِ مہربان آنے کو ہے
مژدہ اے دہلی کہ تیرے ارک مین — مرکزِ امن و امان آنے کو ہے

عہ چندر بنسی و سورج بنسی۔

مستقرِ ملک میں قرنوں کے بعد   موکبِ صاحبقراں آنے کو ہے
چار سوے ملک سے بہرِ نثار   حاصلِ دریا و کاں آنے کو ہے
عہدِ والفت کی گراں مایہ متاع   برسبیلِ ارمغاں آنے کو ہے
مقدمِ شہ میں زبانِ خلق پر   شاد باش و مرحباں آنے کو ہے
گرمیِ ہنگامۂ جشن و جلوس   آخرِ سالِ رواں آنے کو ہے

وادیِ چوڑل

آندو کھنڈ والا ئن پر وادیِ چوڑل کا نظارہ ریل کے مسافروں کے حق میں فطرت کا نہایت گراں قدر عطیہ ہے۔ بلند پہاڑ پر بائیں جانب ریل رواں دواں ہے اور داہنے طرف اُس سے بھی زیادہ مرتفع کوہی سلسلہ قائم ہے۔ درمیان میں چوڑل اپنی میانہ رفتار سے موجزن ہے۔ آبشارِ چوڑل کا منظر نہایت دلفریب ہے بارش میں یہ پہاڑ سبزہ و گل کی کثرت سے زمرد پوش معلوم ہوتے ہیں اور اس جگہ کی سیر سے مسافروں کے طویل و صعوبت آمیز سفر کی تکان کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ ریلوے لائن پر ہندوستان میں اس قسم کے فرحت بخش مناظر بہت کم ہونگے۔

حال میں اندور سے الہ آباد جاتے ہوئے اس مقام کی زیارت کا موقع ہمیں بھی ملا۔ اس مختصر نظم کو اسی سیر کا خوشگوار نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔

مرحبا اے وادیِ چوڑل تری دلکش فضا   ہلکی ہلکی چاندنی یہ ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا
سر سے پا تک آہ یہ تیرا لباسِ مخملیں   تختۂ فردوس تو گویا ہے بالائے زمیں
تیرے گرد و پیش اک تنویر ہے چھائی ہوئی   چھپ گئی ہے روشنیِ مہر شرمائی ہوئی
ہے پہاڑوں کا ترے منظر سہانا کسقدر   اور ندی کا شورش آگیں ہے ترانہ کسقدر
خضر سرگشتہ ہیں ناحق آبِ حیواں کیلئے   چشمۂ حیواں ہے تو دنیا میں انساں کیلئے
صاف موتی کیطرح پانی ہے یہ اخاہ کیا   دلربا پُر لطف ہے منظر تر اک آہ کیا
سنگریزہ تیری تہ میں گوہرِ شہوار ہے   مہرِ روشن دن کو تیرا آئینہ بردار ہے
ہے سکوتِ شب میں دلکش صدائے آبشار   یا مسافر سے ہے شرحِ ماجرائے آبشار
چادرِ آب مصفا اک ردائے نور ہے   ایک اک قطرہ یہاں جلوہ نمائے طور ہے
دونوں جانب تیرے پہلو میں ہیں استادہ پہاڑ   اک پری کے یہ محافظ دیو ہیں گویا پہاڑ
وہ تر و شاداب وہ سرسبز اونچی چوٹیاں   کر رہی ہیں چرخ سے باتیں یہ ہوتا ہے گماں
سبکہ ہیں گلہائے رنگا رنگ سے زیبا درخت   جلوۂ عنبر ہیں بیشک انھیں کہنا درست
بیل بوٹے سے ہے کیا کیا گود پتھر کی بھری   دیدنی ہے دلبرِ نیچر کی یہ افسونگری
صنعتِ فطرت سے چشمِ شوق لذت یاب ہے   سبزہ و گل پر گماں بسترِ سنجاب ہے
ہوگئی ہیں تیری خوبی دل پہ نقشِ کالحجر   ڈھونڈھتی ہے آہ اب بھی تجھکو آنکھوں میں نظر

سید محمد فاروق

نالۂ نے

کسی کے دل کی طرح گرچہ داغ داغ ہوں میں   مگر جو گل نئے دیتا ہے وہ چراغ ہوں میں
مری صدا لبِ اظہارِ دردِ بیتابی   طریقِ الفتِ گم کردہ کا سراغ ہوں میں
اگاہ مایۂ صد بحر بادۂ سرجوش   خجل ہیں جس سے خرابات وہ ایاغ ہوں میں
ادا ادا سے ہے نیرنگیِ جہاں پیدا   بہارِ لالۂ کوہ و جبال و راغ ہوں میں
ہمیشہ آتشِ الفت ہے مشتعل مجھ سے   جو روز جلتا ہے بے آگ وہ چراغ ہوں میں
صلائے مے بہ حریفانِ بزمِ ہستی ہے   مے سرور سے جو پُر ہے وہ ایاغ ہوں میں
مری صدا سے نمایاں ہے دل کی بیتابی   فسانہ گوئے حسیناں بد دماغ ہوں میں
ہزاروں برق نہاں میرے اک شرار میں ہیں   جو پھونکدیتا ہے محفل کو وہ چراغ ہوں میں
نمودِ گلشنِ الفت ہے میرے داغوں سے   گرچہ خشک ہوں لیکن بہار باغ ہوں میں
بھرے ہیں جیب میں گلہائے نغمۂ رنگیں   شمیمِ جنت و تازہ گن و ماغ ہر ن میں
مری صداؤں میں پوشیدہ ہے صدائے الست   ہے اُسکے حسن کی لو جس میں وہ چراغ ہوں میں
مری بجوئے ہے وہ گویا ہے برقِ بیتابی   پکارتا ہے ہر اک دل کو داغ داغ ہوں میں
بہار داغ ہوئی ہے خلش جدائی کی   کسی کے ہجر میں والعقد باغ باغ ہوں میں

سلام ... اندیشۂ حوادث کیا   ہوا میں جو نہیں بجھتا ہے وہ چراغ ہوں میں

سید خواجہ معین الدین سلام

تتلی

... جا پیاری تتلی، شاخ گل پر کوئی دم   تیرے ان رنگین پروں کے ہیں بہت مشتاق ہم
... تیرے رنگ پہ پرواز پر   لوٹی جاتی ہیں ادائیں تیرے ہر انداز پر
... ہوا پر ساغر زرّین کوئی   سیر کو نکلی ہے یا محبوبۂ رنگین کوئی
... یوسف حسن خود آیا ہے بیابازار میں   پڑ گئی ہے جان تازہ یا گل گلزار میں
... ہیں سیر یا خود رنگ وہ قص باد پر   ٹکڑے یا قوس قزح کے اڑتے آتے ہیں نظر
جسم ہلکا سا ترا ۔ بازو سبک اور پر سبک   آتش گلشن کے ہیں شعلے سبک اخگر سبک
ہلکی پھلکی گرچہ ہے تو اک ذرا سی جاندار   دیکھتے ہیں تجھ میں ہم نیرنگ قدرت کی بہار
باعث حیرت ہے رنگینی تری ہم کیا کہیں   پھول اک اڑتا ہوا ۔ یا باغ چھوٹا سا کہیں

ننھی تتلی تیری ہستی کا اگر ظاہر ہو راز
منکشف ہو رشتۂ خلق و خدائے بے نیاز

اڑتے پھرتے دیکھ کر تجھ کو ہوا میں شاد شاد   اک عجب حسرت سے بچپن کی ہمیں آتی ہے یاد
سخت کوشش پر ہمارے بھی نہ ہاتھ آتی تھی تو   تجھ تلک چٹکی پہونچی تھی کہ اڑ جاتی تھی تو
معترف ہوتے تھے چالاکی کے تیرے دمبدم   اور ہوا پر تجھ کو پہروں تاکتے رہتے تھے ہم
آہ! وہ دن کیا ہوئے جب رنج سے ہم دور تھے   تتلیوں سے بھی سوا معصوم تھے مسرور تھے
اب نہ وہ اگلی سی آزادی نہ وہ اگلا سا دل   ہاں فقط ہے گردش ایام و طبع مضمحل
اب کہاں ننھا سا دل اور آرزو بے رنگ دلو   صحن گلشن میں کہاں وہ تتلیوں کی جستجو

ہاں وہ محفل اور تھی ، سامان محفل اور تھا
سچ تو یہ ہے اے رواں ہم اور تھے دل اور تھا

جگت موہن لال رواں

کلام ابر

"غزل"

جور استاد سے خالی یہ دبستان نہوا   کون سا طفل یہاں آیا ، جو گریان نہوا
مجھ کو دشمن سے بھی خوف و خطر جان نہوا   ہوں وہ شعلہ جو ہوا سے کبھی لرزان نہوا
صدمۂ ہجر نے آخر میں دیا لطف وصال   میری قسمت سے ہوا آپ کا احسان نہوا
عافیت سوزی کا وہ مست مزہ کیا جانے   جس کو مے پینے سے کیف مے عرفان نہوا
کی مدد میرے احبا نے مصیبت میں مری   شکر ہے غیر کا شرمندۂ احسان نہوا
میں تو کچھ سوچ کے گلشن کو گیا تھا لیکن   غنچے نے بات نہ کی سرو خرامان نہوا
عاشق حسن بتان مجھ کو بنانا تھا اگر   یا الٰہی! تو ہی کیوں صورت انسان نہوا
کیسی راحت نہ جراحت بھی ہوئے مجھ کو نصیب   میں تو کیا ہوں دہن زخم بھی خندان نہوا
کیسے کیسے ہوئے اس شہر میں استاد لے ابر   میر و آتش سا مگر کوئی سخندان نہوا

"متفرقات"

جو کسی سے نہ محبت نہ وفا کرتے ہیں   وہی ہم سے بھی یاران کا گلا کرتے ہیں
بہت تدبیر کی ، تقدیر کو بھی آزمائیے   دوا تو کر چکے ، اب کچھ خدا سے بھی دعا کیجئے
خدا کا شکر ہے بندے کا کچھ نہیں احسان   ہم آبشار کا چلو سے پانی پیتے ہیں
اگرچہ فعل عبث ہے ۔ یہ زخم سوزن میں   وہ لذتیں ہیں کہ چاک جگر کو سیتے ہیں
عدم کے صفحہ پہ کھینچا جو نقش کن فکان تو نے   صریر کلک قدرت سے صدائے آفرین نکلی
ورق کے دونوں صفحوں پر ہیں تصویریں ہی تصویریں   جو بالائے زمیں صورت چھپی زیر زمیں نکلی
اے مصور نقل کیا ہوگی برابر اصل کے   لاکھ صنعت ہو مگر تصویر پھر تصویر ہے
آنکھ کی راہ سے آنکھ جو ہے تو دل میں   الٹے ہی پاؤں پھرے جاتے ہیں آنسو دل تک

بشن نرائن در

غزل

(از افکار تازہ مولانا سید علی حیدر صاحب طباطبائی نظم لکھنوی)

بھرا ساقی کس آب آتشین سے ، کہ حیدر کا خون رنگ ساتگین سے
یہ کاوش خار صحرا - او زمین سے ، چھٹا دامن تو الجھا آستین سے
ترشح ماگیا اسکی جبین سے ، بنائے چاہ زلفِ عنبرین سے
کبھی دیکھو ادھر بھی آنکھ اٹھا کر ، اجازت تو نگاہ شرمگین سے
فلک بیتاب رہا سرمایہ دہر ، وہ اپنا ہاتھ نکلا آستین سے
کشیدہ و رو نہ یون اسے دامن یار ، نکلنا سیکھ زلف عنبرین سے
مبارک قیم بسمل ہو کے مرنا ، چھری پھرتی ہے دست نازنین سے
سفر کا یہ سنے قصہ مختصر ہے ، کہین جاتا ہے آیا ہون کہین سے
بہت نازک ہے اسے ناصح مراد ل ، کہین ٹوٹے نہ حرف دلنشین سے
پلٹ جاتے ہین کیا بات کہکر ، اسیرون نے یہ سیکھا ہے نگین سے
بتا کس خون گرفتہ پر غضب تھا ، لہو ٹپکا نگاہ خشمگین سے
سبب گردون کے خم ہونیکا یہ ہے ، کہ جھککر توڑلے تارے زمین سے
شرار عشق دامن جہل کے بھڑکا ، چراغ عقل گل کر آستین سے
خوشی مین بھی نکالے غم کے پہلو ، خدا سمجھے دل اندوہگین سے
اٹھائی آنکھ اُس نے - اور نہ دیکھا ، نہ سنبھلا جام دستِ نازنین سے
عطائے دہر سے یون ہاتھ کھینچا ، شکن نکلی نہ اپنی آستین سے
عجب آزاد ہے دیوانۂ عشق ، نہ دنیا سے غرض اُسکو نہ دین سے
بیان کسکو خبر دورِ فلک کی ، کسے فرصت ہے دور ساتگین سے

جلا اسے نظم آئینہ پیراہنے
ہوئی گرد نگاہ عیب بین سے

ایڈیٹوریل

نمائش الہ آباد کے تماشائیون کی تعداد ۸ لاکھ کے قریب پہونچ چکی ہے تاریخ افتتاح سے اتبک اسکا وہی زور شور قائم ہے اور وقتاً فوقتاً نئے تماشے بھی ہوتے رہتے ہین جنمین "قدیم نظارے" خاص طور پر دلچسپ تھے - ہوائی جہازون کی اڑان اور مغربی تماشا ئیان بھی خاص لطف رکھتی تھین - تقریباً ملک کے ہر گوشے سے لوگ نمائش کی سیر کو آئے اور صوبہ جات متحدہ کے زراعت پیشہ اشخاص خصوصیت سے اسکو دیکھنے آرہے ہین - لیکن اس سبق آموز منظر کو کتنے لوگون نے بنظر استفادہ دیکھا اور مفید خیالات اپنے ساتھ لیگئے اسکا اندازہ محال ہے - حال مین خبر اڑی تھی کہ نمائش کی میعاد بڑھا دیجائیگی لیکن اب یہ طے ہوگیا ہے کہ ۲۸ فروری سنہ حال کو قطعاً بند ہوجائیگی -

---

اُردو ہندی کے جھگڑے نے اب یہانتک طول کھینچا ہے کہ معزز ہمعصر آریہ گزٹ کو زمانہ اور ادیب کا ذکر کرتے ہوئے یہ فقرہ لکھنا پڑا ہے "ہندوؤن نے ہندی اور دیوناگری اکشرون (حروف) کے برخلاف مسلمانون کے ساتھ ملکر اون سلمانون سے بڑھکر کام کرنا شروع کردیا ہے" - دُنیا کے کسی دور مین ایسا تاریک زمانہ کبھی نہ آیا ہوگا جب ذاتیات سے گزر کر زبانون اور علمون کی تحقیر کی گئی ہو - بلکہ مہذب اور شایستہ اقوام مین ہمیشہ ایک سے زیادہ زبانین حاصل کرنے کو معیار تمدن سمجھا گیا ہے - بہرنوع کسی زبان کے ساتھ خاص تعصب کا اظہار نہ ترقی تمدن کے منافی ہے بلکہ ایک بدترین اخلاقی جرم ہے - ضرورت ہے کہ دونون فرقے ایک دوسرے کی زبان کو نہ صرف حاصل کرین بلکہ اُسکی ترقی و اشاعت مین ساعی ہوکر اپنے اخلاقی فرائض سے سبکدوش ہون -

---

اخبار نیر اعظم مراد آباد کے فاضل اور نامور ایڈیٹر منشی - ایس - ابن صفا نے ادیب کی سالانہ زندگی پر ریویو کرکے ہمین مشکور فرمایا ہے - ایسی

حوصلہ افزائیان ہمین ادیب کی آیندہ خدمات پر معمول سے زیادہ آمادہ کرتی ہین- زبان اُردو کی ترقی مین جو سرگرم کوششین آپ عرصہ دراز سے کر رہے ہین وہ اہل ملک پر روشن ہین- حال مین آپ نے زبان کی ترقی کے لئے اپنے اخبار مین انعامی مضامین کا خاص سلسلہ قائم کرکے اُردو کی سرپرستی مین فیاضی اور ایثار نفسی کا بھی ثبوت دیا ہے- اُردو اہل قلم کو اسطرف خاص توجہ کی ضرورت ہے-

---

ایڈیٹر صاحب "اردوے معلی علیگڈھ" نے بھی جنکے زور قلم کی تمام شہرت ہے ادیب کی سالانہ زندگی پر حوصلہ افزا ریویو کرکے ہماری کوششون کی داد دی ہے جنکے ہم خاص طور پر شکر گزار ہین- اُردوے معلی کی نئی زندگی اگرچہ اُسکی پرانی آب وتاب کے مقابلے مین بہت ہی کم ہے لیکن اُردو علم ادب کی درستی اور اساتذۂ قدیم کے تذکرون کی اشاعت کے لحاظ سے اب بھی وہ ایک بےنظیر رسالہ ہے- ہماری دعا ہے کہ ہم اُسے پھر اُسی اگلی شان سے دیکھین جب وہ اس صوبے مین بہترین رسالہ تھا-

---

ہمارے دیرینہ کرمفرما منشی دیانرائن صاحب نگم- بی- اے- ایڈیٹر زمانہ کانپور نے اگرچہ ادیب پر بہت عرصے کے بعد توجہ فرمائی لیکن اپنے ریویو مین حق محبت ادا کر دیا ہے- اُنکے نہایت ہی محبت آمیز الفاظ جو ہماری ناچیز ذات سے تعلق رکھتے ہین ہمارے شکریہ کی حد سے باہر ہین- ملک کے بلند حوصلہ نوجوانون مین اُنکے کارنامے عدیم النظیر ہین جنھون نے کالج سے نکلتے ہی اپنی اعلیٰ قابلیت اخباری دُنیا کے لئے وقف کر دی ہے- زمانہ اُنکی قابلیت کا ایک عمدہ نمونہ ہے جسمین سال گذشتہ کے آغاز سے حجم وتصاویر مین مستقل طور پر اضافہ ہوا ہے اور سال حال سے اسکا سائز بھی کسیقدر بڑھا دیا گیا ہے جس سے بڑے پیمانے کی تصاویر شائع کرنے کی گنجائش نکل آئی ہے- ہمین اپنے گزشتہ تعلقات کی بنا پر زمانہ سے خاص محبت ہے اور اُسکی ترقی کو اپنے لئے فخر ومباہات کا باعث سمجھتے ہین-

---

زمانہ کے جنوری نمبر مین ایک "علم دوست" صاحب نے علمی خبرون کے تحت مین ہمپر بھی توجہ فرمائی ہے- انھین ہمارے وہ الفاظ جو دسمبر کے ایڈیٹوریل مین محض اظہار واقعات کے طور پر لکھے گئے تھے خاص طور سے ناگوار گزرے ہین- وہ تحریر فرماتے ہین کہ "بعض رسالون پر ادیب کا ثنی بننے کا فقرہ "غالباً" زمانہ پر چسپت ہوا ہے جبکا سائز اس سال سے بڑھانے کا اعلان ادیب کے اس نمبر کی اشاعت سے پہلے کیا گیا تھا" اسی قیاسی بنا پر اُنکے غصے اور طعن وتشنیع کا طوفان حد سے گزر گیا ہے جسکے جوش مین وہ یہان تک لکھ گئے ہین کہ ادیب کے سائز پر بعض اُردو رسالے پیشتر سے نکل رہے ہین جنمین صلاے عام دہلی اور مشورہ ناگپور کا نام خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے- اگرچہ ہمارے لئے ادیب کا سائز باعث فخر نہین لیکن اپنے غائبانہ کرمفرما کی واقفیت کی داد دینا مناسب خیال کرتے ہین- صلاے عام ہمیشہ ہی سے زمانہ کی دوچند تقطیع پر شائع ہوتا ہے جسے ادیب کے سائز سے کوئی تعلق نہین اور ہمارے کرمفرما پیمائش کی تھوڑی سی تکلیف گوارا کرکے اب بھی اپنا اطمینان کر سکتے ہین- اسیطرح اُنھون نے مشورہ کے ابتدائی نمبر دیکھنے کی تکلیف بھی گوارا نہین فرمائی جو شروع مین چھوٹی تقطیع کے چند ورق پر شائع ہوا تھا اور جسکی موجودہ حالت کیلئے انڈین پریس نے اکثر سامان مہیا کیا ہے- ہمین زمانہ کے متعلق بھی اُنکی واقفیت مین شک ہے جو ابتداً ایسی ہی تقطیع پر شائع ہوا تھا اور جسے موجودہ ایڈیٹر صاحب نے گھٹا کر مخزن وغیرہ کے سائز پر کر دیا تھا- معلومات کے اس فقدان پر ایسے لمبے چوڑے دعوے حیرت انگیز ہین- اسی سلسلے مین اُنھون نے آنریبل پنڈت مدن موہن صاحب مالوی کی اسپیچ کانگرس کے متعلق ہمارے اور مسٹر محمد علی صاحب کے بیانات مین تباین دکھاتے ہوئے ہمپر ہندی زبان

ا حقارت کا الزام لگایا گیا ہے۔ ایک منٹ پہ دونین مقامات سے مین مالا کلاہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض اظہار واقعہ کی غرض سے اور اُسے کسی پالیسی اور پارٹی فیلنگ سے ادنی تعلق بھی نہیں۔ ہم ایک عام تقریر سے جو ہمارے خیال مین اپنے دعوے کے مطابق نہ تھی عام زبان کی حقارت کا نتیجہ اخذ کرنا اور ہندی پریس کو ہمارے خلاف اُکسانا اُنکی علمدوستی کی نہایت بدنمیش دلیل ہے۔ ہمارے نزدیک اُردو ہندی دونون ملک کے لئے ضروری ہین اور ہم دونون کی ترقی کے یکسان خواہشمند ہین۔

تشریح تصاویر

اس نمبر کی رنگین تصویر جو انڈین پریس کے ایک ممتاز مصور کے زود قلم کا نتیجہ ہے رامائن کے ایک افسانے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جب راون کا بیٹا میگھناد جو اُسکی فوج کا سپہ سالار تھا سری لچھمن جی کے ہاتھ سے مارا گیا تو اُسکی بی بی پرمیلا اُسکی لاش پر ستی ہوئی۔ اِس تصویر مین پرمیلا ہاتھ جوڑے مردانہ استقلال سے چتا پر بیٹھی ہوئی ہے اور اُسکے شوہر کی لاش اُسکے پاس پڑی ہوئی ہے۔ راون اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھے ہوئے رنج و قلق کا اظہار کر رہا ہے اور اُسکے تمام سردار اُسکے اردگرد کھڑے ہوئے ہین۔ دوسری طرف میگھناد کی ماں اور خاندان کی تمام عورتین جمع ہین اور بعض بعض اپنے ہاتھ بلند کئے ہوئے اُس جوش اور تفاخر کا اظہار کر رہی ہین جو پرمیلا کے ستی ہونے سے اُنھین محسوس ہوا ہے۔

معرکۂ ٹیپو سلطان کی تصویر اُس موقع سے تعلق رکھتی ہے جب وہ زخمی ہو چکا ہے اور غنیم کے ایک سپاہی نے اُسکا زرین پٹکا چھیننا چاہا ہے۔ ہمارے کرمفرما مسٹر شاکر میرٹھی نے اپنے تاریخی اور محققانہ مضمون کے ساتھ یہ تصویر بھی عنایت کی ہے۔

فتح حیدر کی تصویر مشہور علم دوست مولوی سید خورشید علی صاحب کا عطیہ ہے۔ یہ ٹیپو سلطان کا بڑا بیٹا اور اپنے باپ کے بالکل ہمشکل تھا۔

سمندر کی دیوی کی تصویر بھی ستی کی رنگین تصویر کے مصور کی صناعی کا نمونہ ہے۔ ہندوؤن مین ورن سمندر کے دیوتا ہین اور انکا مرتبہ بعینہ وہی ہے جو مسلمانون مین حضرت الیاس کا۔ سمندر کی دیوی جو حسن و جمال مین لاثانی ہے اُنکی بی بی ہے جو اپنے سنگار مین معروف ہے۔ ایک سہیلی اُسکی چوٹی گوندھ رہی ہے اور سمندر کی موجین اور عام سناٹا چارون طرف چھایا ہوا ہے۔

میگھناد اور پرمیلا کی تصویر بھی مصور موصوف ہی کے قلم سے نکلی ہے۔ اسمین میگھناد اپنی پیاری بی بی سے رخصت ہو کر آخری جنگ کے لئے جا رہا ہے جسمین وہ مارا گیا۔

ادیب



گوبردھن لیلا

مارچ سنہ ۱۹۱۱ء

ادیب

جلد ۳ — نمبر ۳

مصوّرانِ لکھنؤ

مصوّری ہندوستان کا نہایت قدیم فن ہے اور اگرچہ زمانۂ قدیم کے بہت سے فنون کے ساتھ اسکو بھی عرصۂ دراز سے زوال و نکبت کی تاریکی نے دُھندلا کر دیا ہے تاہم اس سے ہمارے گزشتہ تمدّن پر ایک صاف روشنی پڑتی ہے۔ وہ قوم جسنے فلسفہ و حکمت، ہیئت و ہندسہ اور دیگر علوم و فنون کی بنیادیں ڈالیں، آج اگر اپنی بدبختی سے معرضِ زوال میں ہے تو اسکے گزشتہ کارنامے فراموش کر دینے کے قابل نہیں ہیں اور اسے متمدّن اقوام میں ہمیشہ اس اعتبار سے صفِ اوّلین میں جگہ ملنا چاہیئے کہ اُسکے پیشروؤں کی ریاضت اور محنت شاقہ نے دُنیا کو تمدّن کی شاہراہ بتائی ہے۔

فنِ مصوّری میں ہندوؤں کیطرح اہلِ چین بھی اپنی قدامت کا دعویٰ کر سکتے ہیں، لیکن یہ سوال ہنوز حل طلب ہے کہ دونوں میں تقدّم کا فخر کسکو حاصل ہے۔ بہر نوع ان دونوں قوموں سے پہلے تمدّن کی اس لطیف شاخ کیطرف کسیکی توجہ نہیں مائل ہوئی۔ مصری، رومی اور یونانی تمدّن کی نسبت اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اُنکی تاریخیں ہمارے تمدن سے بہت بعد کے واقعات ہیں لیکن ہندوستان و چین کے بعد رومتہ الکبریٰ بھی مصوّری کا بہت پُرانا اسکول ہے اور یورپ میں مصوّری کی ساری روشنی اٹلی (اطالیہ) ہی سے پھیلی ہے۔

تاریخی اعتبار سے ہندوستان کی مصوّری کے تین بڑے دَور ہیں۔ اوّل وہ دَور جو ویدک زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا بودھوں کا عہد اور تیسرا وہ دَور جو شاہانِ مغلیہ کی علم دوستی اور ہنرپروری کی یادگار ہے۔ ویدک زمانے کی مصوّری کے نمونے اب نایاب ہیں۔ البتہ بودھوں کے عہد کی صناعیوں کے اکثر نمونے ابتک موجود ہیں جنمیں بعض حال کی نمائش گاہ الٰہ آباد میں نمایاں کئے گئے تھے۔ عہدِ مغلیہ کی مصوّری چونکہ سب سے

ہندو مصوری ہے اور اسے منسوخ ہوئے بہت زمانہ نہیں ہوا لہذا اسکے نمونے جا بجا موجود ہین اور نمائش گاہ مذکور مین انکی نمائش کثرت تھی۔ یورپ اور مغلیہ عہد کی مصوری کا موازنہ کرتے ہوئے یہ امر بآسانی ذہن نشین ہوتا ہے کہ آخر الذکر صنعت مین اوّل الذکر صنعت کے خلاف نمائشی تکلفات کو زیادہ دخل ہوگیا تھا۔ کیونکہ ایک طرف صورتگری کے ساتھ رنگ کی پائداری اور سادگی کو زیادہ دخل ہے اور دوسری طرف تصویر کی دلکشی کے لئے نگینوں کی شوخی اور دیگر تکلفات کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے جنکی تفصیل آگے آئیگی۔

یہ سوال کہ مصوری کب اور کس ضرورت سے ایجاد ہوئی ہماری قوت فیصلہ سے باہر ہے۔ البتہ فنون لطیفہ مین شاعری کے بعد مصوری ہی ایسی چیز ہے جسکے ذریعے سے انسان اپنی اعلیٰ ذہانت اور ہنرمندی کا ثبوت دے سکتا ہے۔ مصوری کو اگر اسکے عام معنون مین لیا جائے تو سنگتراشی اور فن تعمیر بھی اسکے تحت مین آسکتے ہین۔ بالخصوص بت تراشی کی نسبت تو یہ خیال یقین کے درجے تک پہونچتا ہے کہ وہ مصوری ہی کی ضرورت سے ایجاد ہوئی۔ خصوصاً جب دونون کا مقصد ایک ہی ہے یعنی صورتگری۔ تو عام اس سے کہ صناعی مین فرق و امتیاز ہی کیون نہو، دونون ایک دوسرے سے علحدہ نہین ہوسکتے۔ اگلے زمانے مین جب کپڑا اور کاغذ نہین ایجاد ہوا تھا تو عام تحریرون کی طرح مصوری بھی بھوج پتر اور چمڑے یا تانبے کے ٹکڑون اور مکانات کے ستون اور دیوارون پر ہوتی تھی اور اسے زیادہ پائدار بنانے کیلئے پتھر بھی کام مین لایا جانا قریب القیاس ہے۔ اس دور کی مصوری کے متعلق یہ بھی قرین قیاس ہے کہ ابتداءً وہ صرف چند لکیرون تک محدود ہوگی جنکے ذریعے سے تصویر کے حدود نمایاں ہوجاتے ہونگے۔ رنگ و پرداز بہت بعد کی باتین ہین اور اندھیرا اُجالا اور دیگر اصول مصوری اس سے بھی بعد کے خصوصیات ہین۔ بلکہ یہ زمانہ حال ہی مین اوج کمال تک پہونچے ہین۔ اس صورت مین مصوری کے لئے بت تراشی کا طریقہ زیادہ موزون تھا جس سے تصویر کے حدود نسبتہً زیادہ نمایاں ہوجاتے تھے۔

بہرکیف اگرچہ اسلامی حملون سے پہلے بودھون کی تہذیب کا چراغ گل ہوچکا تھا لیکن مصوری کی شاخ مین اسی اسکول کی تعلیم عام تھی اور بجز مذہب یا معتقدات کے تمدن کے کسی صیغے مین نمایاں تبدیلی نہین ہوئی تھی۔ اسلامی حملے زیادہ تر مذہبی رنگ لئے ہوئے تھے اور فاتحانِ ہند اُن ممنوعات کو جاری رکھنے سے معذور تھے جنکی انکے مذہب مین ممانعت تھی۔ مصوری بھی انھین ممنوعات مین داخل تھی اور اگرچہ ہمارے پاس اسکا کوئی ثبوت نہین ہے کہ اگلے بادشاہون نے مصوری کے لئے کوئی امتناعی حکم جاری کیا تھا لیکن ہندوستانی مصوری کے اس عام زوال سے جو شاہانِ مغلیہ کے ابتدائی عہد تک قائم رہا یہ پتہ بآسانی لگ سکتا ہے کہ اسوقت یہان کی مصوری معدومیت کے قریب پہونچ گئی تھی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے حصون مین صرف راجپوتانہ ایسا مقام تھا جہان مصوری کا کچھ چرچا باقی تھا اور اسی اعتبار سے جے پور کو مصوری کا ایک پرانا اسکول کہا جاسکتا ہے لیکن اسکی قدامت ایک ہزار سال سے زائد نہین ہے

شاہانِ مغلیہ مین شہنشاہ اکبر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُس ہندوستان کے بہت سے قدیم علوم و فنون کے ساتھ مصوری کو بھی ایک حد تک زندہ کیا۔ مغل فرمانروا ہندوستان مین براہ راست ایران سے آئے تھے اور ایران بھی مصوری کا ایک پرانا اسکول ہے۔ پس ایرانی اور ہندوستانی مصوری کے میل جول

ایک نئے آرٹ (صنعت) کی بنیاد پڑی - مسلمانوں مین مذہبی ممانعت کی وجہ سے صورت کشی کا عام رواج نہ تھا اور انھون نے اُسکا نعم البدل ایک اور ہنر ایجاد کیا تھا جسکا نام خوشنویسی ہے جسطرح تصویر مین رنگ بھر کے اور جا بجا سونا چڑھا کے اُسے نظر فریب بنایا جاتا ہے اُسیطرح مسلمان خوشنویسوں نے اپنے قطعات کو دلفریب بنانیکی کوشش کی اور دُنیا کے لئے ایک نئے ہنر کی بنیاد ڈالی جو افسوس کہ اب بالکل معدوم ہوگیا - وصلیوں پر ابری کام یعنے سونے کی افشان ہندوستان کے اگلے عہد کی یادگار ہے لیکن مسلمانوں نے اسمین بھی ایک نفاست پیدا کی تھی اور خوشنویس اپنے قطعات عموماً ابری ہی وصلیوں پر لکھتے تھے - ہاتھی دانت کے ٹکڑوں، شیشوں اور کاغذ پر آبی رنگ کی تصویرین بھی اسلامی مصوّری کی خصوصیات مین داخل ہین - کتابوں مین رنگین اور سُنہری جلدوں، نقاشی اور تصویرین اگرچہ اُس عہد کی ایجاد نہین تاہم عہد اکبری کی تمام کتابوں مین یہ خصوصیات موجود ہین - اکبر کے عہد مین بہت سے مصوّر (جنمین ہندو و مسلمان دونون داخل ہین) اس فن مین خاص کمال رکھتے تھے - انھین تاریخی، واقعاتی اور خیالی تصویرین بنانے مین خاص امتیاز حاصل تھا۔

شہنشاہ جہانگیر کو بھی اس فن سے خاص دلچسپی تھی اور اُسکے عہد مین باکمال مصوّروں کی کافی تعداد موجود تھی چنانچہ جب سر ٹامس رو نے شہنشاہ کو ایک تصویر اس دعوے کے ساتھ نذر کی کہ کوئی ملک اس قسم کی صناعی نہین پیش کرسکتا، تو اُسکے دوسرے ہی روز اُنکی لاف زنی خاک مین مل گئی اور وہ یہ دیکھکر دریائے حیرت مین غرق ہوگئے کہ اُس تصویر کی چار نقلین تیار کردی گئین جو ہوبہو اصل کے مطابق تھین - شاہجہان کا عہد بھی مصوّری کے لئے خوش نصیبی کا زمانہ تھا جسکے دربار مین

بہت سے عدیم النظیر مصوّر موجود تھے - لیکن خاندان مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی مصوّری پر بھی زوال آنے لگا اور دہلی کے اچھے اچھے مصور دربار اودھ مین داخل ہوگئے - چنانچہ نواب شجاع الدولہ کے دربار مین دہلی کے مصوّروں کی کثیر تعداد موجود تھی - ان مصوّروں کی صناعی کے بہت سے نادر نمونے اگلے نوابوں کے محلوں مین موجود تھے لیکن اب اُنکا پتہ لگانا محال ہے - تصاویر مین سفیدہ اور سونا چڑھانا دہلی اسکول کی مصوّری کے خصوصیات مین داخل ہے - اودھ کے قدیم مصوّر اسی اسکول کے شاگرد تھے - لیکن اُنمین بہت جلد تبدیلی واقع ہوئی اور اُنکی صناعی مین یورپین مصوّری کے خصوصیات اس کثرت سے داخل ہوگئے کہ لکھنؤ ایک جداگانہ اسکول ہوگیا۔

یورپ کے بعض مصوّروں کو دربار اودھ سے خاص تعلق رہا ہے جنمین زوفینی سب سے پہلا مصوّر تھا جو نواب آصف الدولہ کا ملازم تھا - اُسکی تصویروں مین "مرغ کی پالی" اور "مرزا امید بیگ کا لارڈ کارنوالس کے پاس برسم سفارت جانا" یورپ تک مشہور ہین - زوفینی نے نواب آصف الدولہ بہادر، کلاوڈ مارٹین اور دوسرے اُمراکی شبیہین بھی بنائی تھین - چنانچہ مارٹین صاحب کی ایک اصلی تصویر کلکتہ مارٹینیر مین ابتک موجود ہے - مرغ کی پالی اور دوسری تصویروں کی اصلین اب مفقود ہین لیکن اُنکی بعض کی نقلین یورپ مین ابتک موجود ہین - اوّل الذکر تصویر ۱۷۸۵ء کے قریب بنائی گئی تھی جسمین اس منظر کو نہایت خوبی سے دکھایا تھا - یہ تصویر بہت عرصے تک نواب آصف الدولہ کے محل موسوم بہ دولتخانہ کی رونق رہی - مسز پارکس نے ۲۴ر جنوری ۱۸۳۱ء کو اُسے شاہی محل مین بچشم خود دیکھا تھا - غالباً ہنگامۂ غدر مین دوسرے قیمتی ذخائر کے ساتھ یہ تصویرین بھی

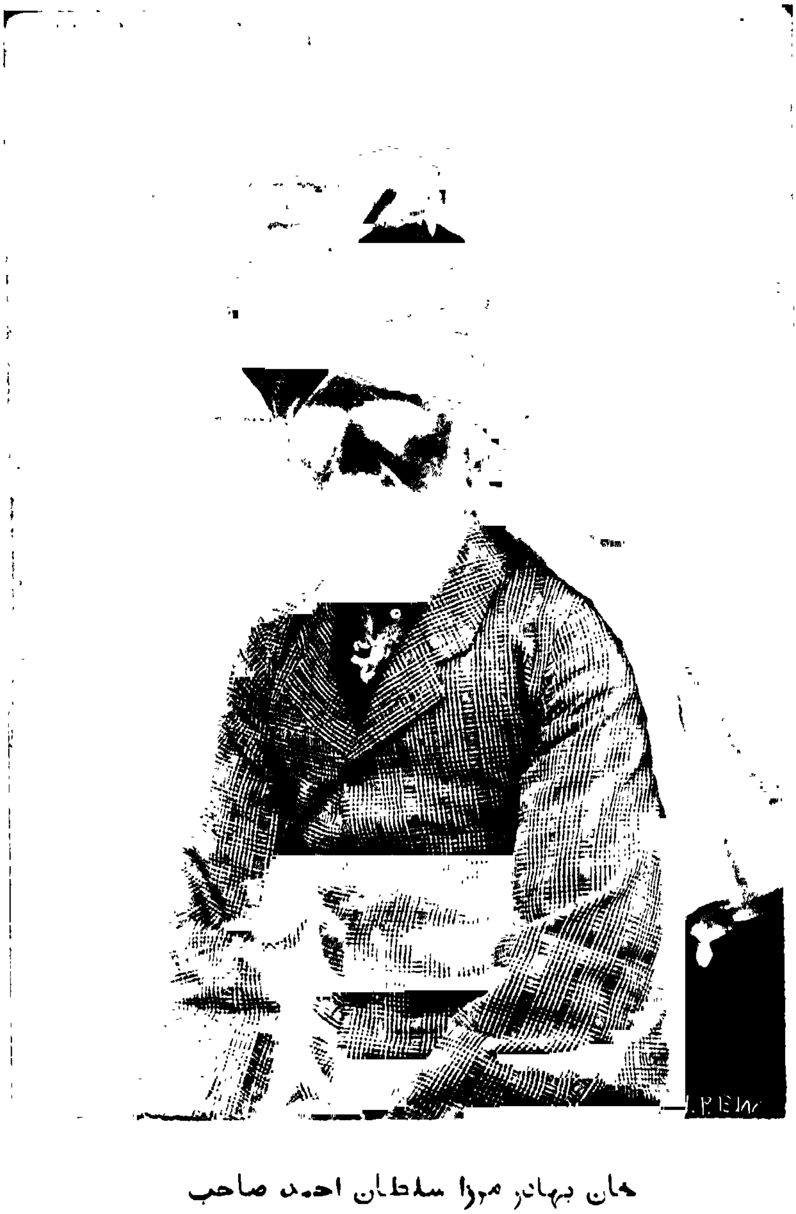
فنا ہوگئیں۔ مرغون کی لڑائی والی تصویر کی ایک نقل ۱۸۰۹ء میں مع اُسکی تشریح کے چھاپی گئی تھی اور اُسکی ایک رنگین نقل تاشے کی پلیٹ پر بھی بنائی گئی تھی جو آخری شاہ اودھ کے جواہر خانہ مین موجود تھی۔ اسے نواب علی نقی خان (وزیر اودھ) اپنے عمل واقع گوگھاٹ مین اٹھا لے گئے تھے اور اب اُسکا بھی پتہ نہین۔

مرزا حیدر بیگ کی سفارت کلکتہ والی تصویر مین چند طویل القامت ہاتھیون کی قطار تھی جسکے وسط مین سب سے بڑا ہاتھی اپنی سونڈ مین ایک زندہ آدمی کو لپیٹے ہوئے تھا۔ ہاتھیون کے آگے آگے چند پیدل آدمی بیقاعدگی سے جارہے تھے اور چند لوگ اطراف مین بیٹھے ہوئے تھے جنمین ایک نیم برہنہ عورت بھی نظر آتی تھی۔ تصویر کا منظر ٹلینہ کے قرب وجوار مین کسی مقام پر قائم کیا گیا تھا جو کلکتہ کے راستے مین واقع ہے۔ لیکن تصویر کو کسی تاریخی واقعہ سے چندان تعلق نہین معلوم ہوتا۔

زوفنی کے بعد مسٹر ہوم اور اُنکا بیٹا (اسکا نام بھی ہوم تھا) وارد ہند ہوئے۔ مسٹر ہوم ایک مشہور مصوّر تھے۔ انکی شہرت دربار اودھ تک بہت جلد پہونچگئی اور نواب سعادت علی خان نے اُنھین مدراس سے طلب کرکے ایک ہزار روپیہ ماہانہ پر ملازم رکھا۔ مسٹر ہوم کو شبیہ نگاری مین خاص کمال حاصل تھا اور اُنھون نے بہت سی نادر تصویرون کے علاوہ نواب سعادت علیخان کے پورے قد کی بھی ایک تصویر کھینچی تھی۔ شاذو نادر طور پر کسی منظر کی تصویر بھی بناتے تھے۔ اس قسم کی تصاویر مین ایک کا ذکر سلیمن صاحب (رزیڈنٹ لکھنؤ) نے اپنی یادداشت مین کیا ہے جو اُنکی نظر سے گذری تھی۔ اس تصویر مین ایک شکار گاہ کا سین کھینچا گیا تھا جسمین راجہ بختاور سنگھ نواب سعادت علی خان کے پیچھے شکار کرنیکے انداز سے کھڑے ہوئے تھے۔

مسٹر ہوم کے بیٹے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج مین کپتان تھے لیکن اپنے نامور باپ کیطرح مصوّری مین کبھی کمال رکھتے تھے۔ شاہ غازی الدین حیدر نے اپنے عہد سلطنت مین نہ صرف مسٹر ہوم ہی کی قدر افزائی کی بلکہ اُنکے بیٹے کو بھی اپنے زمرۂ مصاحبین مین داخل کر لیا۔ یہ بھی شبیہ نگاری کے اُستاد تھے۔ شاہ زمن غازی الدین حیدر اور اُس عہد کے اُمرائے شاہی کی بہت سی تصویرین اُنکے زورِ قلم کا نتیجہ تھین۔ رسالہ "بشپ ہیبر" بابت ۱۸۲۴ء اور مسز پارکس کی تصنیف "سین اینڈ کیرکٹر آف ہندوستان" مطبوعہ ۱۸۳۷ء مین ان باپ بیٹون کی مصوّری پر زوردار ریمارک درج ہین۔ مسٹر ہوم اپنی ضعیف العمری مین پنشن یاب ہوکر کانپور چلے گئے جہان آخر وقت تک نہایت عیش وآرام سے بسر کرتے رہے اور وہین وفات بھی پائی۔

ان دونون کے بعد "چارلس مانٹر" آئے جنکا ذکر "ایک مشرقی بادشاہ کی پرائیویٹ زندگی" نامے کتاب مین ایک جرمنی مصوّر کی حیثیت سے آیا ہے۔ یہ شاہ نصیر الدین حیدر کے خاص مصاحب تھے اور ایک معقول تنخواہ پر طلب کئے گئے تھے۔ اُنھون نے بادشاہ کی کئی نادر تصویرین انگریزی اور ہندوستانی لباس مین بنائی تھین۔ نیز بیگمات شاہی مین کسی فرضی بیگم کی ایک خیالی تصویر بھی بنائی تھی جسکی یورپین حلقون مین مشرقی حُسن کے ایک دلکش نمونے کی حیثیت سے بیحد شہرت ہوئی تھی۔ ان سب کے بعد ایک اور قابل الذکر یورپین مصوّر داخل دربار ہوا جسکا نام "بیچی" تھا۔ یہ آخری شاہ اودھ محمد واجد علی شاہ کا خاص مصوّر تھا۔ اسنے بھی ایک بادشاہ بیگم کی خیالی تصویر بنائی تھی جو ۱۸۵۱ء کی نمائش گاہ لندن مین نمایان کی گئی تھی اور جسکی بیحد شہرت ہوئی۔



خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب

انڈین پریس الہ آباد

ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ دربار اودھ مین اوّل سے آخر تک ایک نہ ایک یورپین مصوّر داخل رہا اور اسطرح دیسی مصوّری پر مغربی صنّاعی کا اثر پڑتا رہا۔ لیکن مصوّرانِ لکھنؤ اُس فنی صنعت سے زیادہ بہرہ اندوز نہین ہوئے۔ ایک انگریزی مورخ کا بیان ہے کہ اوّل اوّل جو مغربی مصوّر یہان آئے اُنھون نے دیسی مصوّرون کو اپنا ہنر سکھانے مین فیاضی سے کام نہین لیا۔ اوّل تو اُن تک پہونچنا اور اُنکی شاگردی اختیار کرنا ہی سخت دقت طلب تھا اور جو نہایت مشکل اور صرف کثیر سے اُنکے شاگرد ہوئے اُنکو تعلیم نہین دی گئی۔ دوئم اُنکی تصاویر بھی عام طور پر دیکھنے مین نہ آتی تھین کہ اُنکی باریکیون اور طرز صنعت کی تقلید کیجا سکتی۔ تاہم لکھنؤ مین مصوّرون کا ایک کافی گروہ موجود تھا جسمین مختلف طبقون کی مصوّری کے خصوصیات کے باہم میل جول سے ایک نئی صنعت کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ ان لوگون نے تصویرون مین رنگ چڑھانا اور سفیدہ کی زمین تیار کرنا دہلی اسکول سے حاصل کیا تھا اور رنگ بھرنے کا طریقہ جے پور اسکول سے۔ روغنی تصاویر اور پرداز کے خصوصیات مغربی اسکول سے اُڑائے تھے اور اسطرح ایک نیا اسکول قائم کر لیا تھا جسمین ذاتی ذہانت اور زورِ قلم سے ایک خاص امتیاز پیدا ہو گیا تھا۔

شاہ زمن غازی الدین حیدر کے دربار مین ایک دیسی مصوّر کی بجد شہرت تھی جسکا نام "ٹھاکر داس" تھا اسے روغنی اور آبی دونون قسم کے رنگون کی تصاویر بنانے مین کمال حاصل تھا۔ اسکی صنّاعیون مین راگ اور راگنیون کا ایک سلسلہ جسمین قاعدۂ انگریزی کے مطابق دیسی مذاق کی تمثیلی تصویرین بنائی گئی تھین نہایت اعلیٰ ہنرمندی پر مبنی تھا جسکی تعریف مین یورپین نقادانِ فن بھی رطب اللسان ہین۔ اس حیرت انگیز مصوّر کی نسبت ایک روایت نہایت دلچسپ ہے۔ ایک مرتبہ کسی رزیڈنٹ نے بادشاہ سے اثنار گفتگو مین دیسی مصوّری کی نسبت نہایت حقارت آمیز کلمات کہے۔ اسپر بادشاہ نے ٹھاکر داس کو ایک سرکاری نوٹ کی ہو بہو نقل بنانے کا حکم دیا۔ حالانکہ ٹھاکر داس انگریزی کا ایک حرف بھی نہین جانتا تھا تاہم اُسنے نوٹ کی ایسی پوری نقل اُتار دی کہ جب دوسرے روز بادشاہ نے رزیڈنٹ صاحب کو بلا کر اصلی و نقلی نوٹون کے پہچاننے کی فرمائش کی تو اُنھون نے حیرت و استعجاب کے ساتھ دونوان کو بہت دیر تک ملاتے رہنے، اُلٹنے پلٹنے اور توڑنے مروڑنے کے بعد نقل کو بجائے اصل کے منتخب کیا۔ اسپر جناب عالی مُسکرائے اور اصل نوٹ کو رزیڈنٹ صاحب کیطرف بڑھا کے نقل کو اپنے پیچوان کی چلم پر رکھ دیا۔ حتیٰ کہ وہ جل کر خاک ہو گیا اور اُس عدیم النظیر صنّاعی کی یادگار مٹ گئی جسکا ذکر تاریخون مین درج کرنیکے قابل سمجھا گیا۔

محمدؐ علی شاہ کے عہد مین جس مصوّر نے شہرت و ناموری کی معراج حاصل کی اُسکا نام محمدؐ علی تھا جسے "مانی رقم" کا خطاب دیا گیا تھا۔ اسکی مصوّری مین پرداز کے گھٹاؤ بڑھاؤ اور اندھیر اُجالے کے خصوصیات نہایت قابل تعریف تھے محمدؐ علی شاہ کے دربار تخت نشینی کی تصویر جو شاہی محل کی زینت سمجھی جاتی تھی اسی مصوّر کی صنّاعی کا نمونہ تھی۔ اسکا بیٹا فضل علی جسکا لقب "بہزاد رقم" تھا، واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ کا خاص مصوّر تھا۔ شاہی تصویر خانہ کی ساری زینت اسی ایک مصوّر کے قلم سے وابستہ تھی جسنے بہت سے محلات شاہی کی شبیہین اور زمانہ مناظر کی تصویرین بھی بنائی تھین۔ اسکا دادا بھی ایک پرانا مصوّر تھا جسکی روغنی تصویرین نہایت نفیس اور قابل ستائش تھین۔ اسیطرح بیشمار مصوّر تھے جنمین صاحب رائے اور بیچو بیگ

بہت مشہور تھے۔

ان مصورون ... صناعیان شبیہ نگاری کے علاوہ ... متعلقات مذاق پر مبنی تھین۔ شاہی مصورون کا ... زیادہ تر بادشاہون کی شبیہین۔ دربار کے منظر۔ گوڑ ... اور ... ہاتھیون کی ... اور انکی سواریون کے جلوس ... عوام کے ... مین صرف ہوتا تھا۔ اکثر اوقات ... شاہی ... کے مناظر بھی بنائے جاتے تھے ... شاہی کے ... دکھائے جاتے تھے جس طرح اس زمانے ... کی زندگی پر واقعات اور زندہ دلی کی روح سے ... اس عہد کی مصوری بھی اپنی بوقلمونی مین ... کہین گینڈون اور ہاتھیون کی لڑائی ہو رہی ہے کہین ... کار رہے ہین۔ کہین چیتون، باڑھون اور بارہ سنگون ... کسی تصویر مین کوئی نوجوان نواب مع بیگم صاحبہ ... بیٹھے ہوئے ہین۔ سونے چاندی کے پاندان ... خاصدان، چنگیرین، شمعدان اور پیچوان قرینے سے رکھے ہوئے ہین اور سامنے ڈومنیون کا ناچ ہو رہا ہے کہین عیش باغ کی برسات کا منظر پیش نظر ہے۔ جدا بکھوا ... رہا ہے اور آم کے اونچے اونچے درختون مین جھولے پڑے ہوئے ہین۔ گھٹائین اٹھ رہی ہین، ہوا سنا رہی ہے اور جھولنے والی حور جمال بیگمون کے پینگ درختون کی چوٹیون تک پہونچ جاتے ہین۔

لیلی و مجنون کی محبت کے افسانون کو بھی تصاویر کا لباس دیا گیا تھا اور بعض ہندو مصورون نے مذہبی روایات کو بھی تصاویر کے ذریعے سے ایسے دلکش پیرایہ مین جلوہ گر کیا تھا کہ عقیدت مندانہ نگاہین انکی زیارت سے سیر نہین ہوتی تھین۔ کرشن جی کی مرلی بجانے کی ادا اور گوپیون کی محویت کے جیسے نادر نمونے ان مصورون کی صناعی مین ملتے ہین اب نظر نہین آتے۔ قدیم و جدید مصوری کی مذہبی شاخ مین اب بہت کچھ تغیر ہو گیا ہے۔ اصول فن کے اعتبار سے جدید مصوری خواہ کتنی ہی قابل ستائش کیون نہو لیکن موجودہ مصورون کے دل اس عقیدتمندی سے لبریز نہین ہین جو اگلے مصورون کی صناعی کو دلکش بنا دیتی تھی۔ راجہ راوی ورما کی تصاویر جو بیشتر مذہبی رنگ لئے ہوئے ہین ان تقدسانہ جذبات کے اظہار سے قاصر ہین جو ہادیان مذہب کے لئے ضروری ہے اور اسی وجہ سے ان تصاویر کو نمائش گاہ الہ آباد مین نمایان نہین کیا گیا۔ لیکن مجھے لکھنؤ کی مصوری سے مطلب ہے۔ یہان کی اس سوسائٹی مین جو عیش پرستی کے طوفان مین غرق تھی اگر چند عقیدت مند مصورون نے روحانی جذبات کو نمایان کرنے کی کوشش کی تو اگرچہ انکی صناعی ناقص ہو سہی تاہم ہزار تحسین و آفرین کے قابل ہے۔

عشق و محبت کی داستانین عام تھین۔ مثلاً کوئی عورت اپنے گھر مین بال کھولے بیٹھی ہے۔ مکان کی دیوار اسقدر پست ہین کہ کوئی شہزادہ گھوڑے پر سوار ادھر سے گزرتا ہے اور عورت کو دیکھکر اسپر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ عورت غیر مرد کو دیکھکر شرم و حیا سے گڑ جاتی ہے اور تلوار ... سے زخمی ہو کر کلیجہ تھام لیتا ہے۔ مصور اس ساری واردات کو ایک تصویر مین اس خوبی سے دکھاتا تھا کہ بادی النظر مین سارا قصہ ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ بعض تصویرون مین شہزادہ کسی شاہزادی کے محل کے نیچے ہاتھی پر سوار کھڑا اور شہزادی اپنی سہیلیون سمیت محل کے کوٹھے پر کھڑی

اس انداز سے نیچے کو جھکی ہوئی ہے گویا شہزادے کو اپنی طرف بلا رہی ہے، یا اُس سے کوئی پھول یا دوسرا تحفہ لے رہی ہے۔ کہیں اندھیری رات میں کوئی حسینہ اپنے محل کے چور دروازے میں اس انداز سے خوف زدہ کھڑی ہوئی کہ اُسکے عاشق کو جو اُس سے ملنے آیا ہے کوئی دیکھ نہ لے اور اُسپر روشنی کی شعاع نہ پڑ جائے۔ تصویر میں روشنی کا اظہار طلائی تحریر سے اور اندھیرے کا امتیاز سیاہ رنگ سے کیا جاتا تھا۔ بلکہ تصاویر میں سونے کا استعمال اس کثرت سے ہوتا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اور ستارے وغیرہ بھی طلائی ہی بنائے جاتے تھے۔

ہر تصویر کا عقبی حصہ (Background) دکھانیکے لئے عموماً تصویر کے عرض میں ایک پُر چوبین دار دیوار یا کٹہرہ بنایا جاتا تھا جسکے اوپر پھول پتیوں کے گچھے یا سرو یا اور کوئی جھاڑی وغیرہ بنائی جاتی تھی۔ جھاڑیوں سے تھوڑے فاصلے پر بالائی جانب آسمان دکھایا جاتا تھا جسپر ہلکی ہلکی بدلیاں چھائی ہوتی تھیں اور درمیان میں کوئی پرند اُڑتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ خصوصیات لکھنؤ کی مصوری کے اصول میں داخل تھے۔ صورتیں عموماً حسین بنائی جاتی تھیں۔ بوڑھے اور بدشکل چہروں کا کوئی شائق نہ تھا لہذا مصوروں کو اپنی تصویروں کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے سوسائٹی کے مذاق کی متابعت کرنا پڑتی تھی۔ لیکن توسیع فن کے اعتبار سے حُسنِ قدرت (Natural beauty) کے اکثر نمونے دکھائے جاتے تھے۔ مثلاً مائیں اپنے بچوں کی حرکات دیکھکر خوش ہو رہی ہیں۔ رامچندر جی بن باس کے لئے جا رہے ہیں یا گوپیاں جمنا میں نہا رہی ہیں اور کرشن جی اُنکی ساریاں لیکر کدم کے درخت پر جا بیٹھے ہیں۔ یا شیو جی جنگل میں بیٹھے ہوئے ہیں اور پاربتی جی اُنکے پہلو میں جلوہ افروز ہیں۔ بعض تصاویر میں جنگل کے سین نہایت کامیابی سے دکھائے جاتے تھے اور ہندوؤں کی مُرتاضانہ زندگی اور ریاضت کے واقعات کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا جاتا تھا۔ ان تصاویر میں لمبی لمبی جٹاؤں والے جوگی اور جوگنیں تقدسانہ انداز کے ساتھ عبادت میں مصروف ہیں اور دریا کے کنارے کنارے کٹیاں بنی ہوئی ہیں جنمیں بعض اسقدر قریب ہیں کہ دریا اُنکے پاس ہی لہریں مار رہا ہے۔ میدانِ جنگ کے سین اگرچہ لکھنؤ کی آزادی سوسائٹی سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے لیکن یہاں کے مصوروں نے اس صیغے میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ یہ منظر اسطرح دکھائے جاتے تھے کہ دونوں جانب صفیں آراستہ ہیں اور ڈھال تلوار سے معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔ آخری مصوروں نے توپوں اور بندوقوں کی لڑائی بھی دکھائی تھی لیکن یہ صناعی اُنکے طبعی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ البتہ ڈھال تلوار کی گھمسان لڑائی دکھانے میں اُنکے قلم کو لغزش نہیں ہوئی۔

بادشاہ کی سواری مع جمعیت فوج اور اراکین کا جلوس کے عیدگاہ یا کسی دوسرے مذہبی مقام پر جاتی ہوئی عموماً دکھائی گئی ہے۔ شاہی شکار کے منظر بھی عام طور پر بنائے جاتے تھے جنمیں شیر کا غضبناک حالت میں ہاتھی کی سونڈ یا جھول پر چڑھ جانا اور مہاوت کا اُسپر بھالے سے وار کرنا بہت کچھ قدرتی بیساختگی کا پہلو لئے ہوتا تھا۔ اس منظر کو یہانتک مقبولیت ہوئی کہ مٹی کے کھلونوں میں بھی دکھایا جانے لگا اور ابتک مقبول ہے۔ بعض ایسی تصویریں بھی بنائی گئی تھیں جنمیں بادشاہ یا اُمرا اپنے محلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ انمیں عمارتی نقشے زیادہ وضاحت کے ساتھ دکھائے جاتے تھے جنمیں در و دیوار ستون اور برج اور سائبان سب کی کیفیت نظر آتی تھی۔ اس قسم کی ایک تصویر

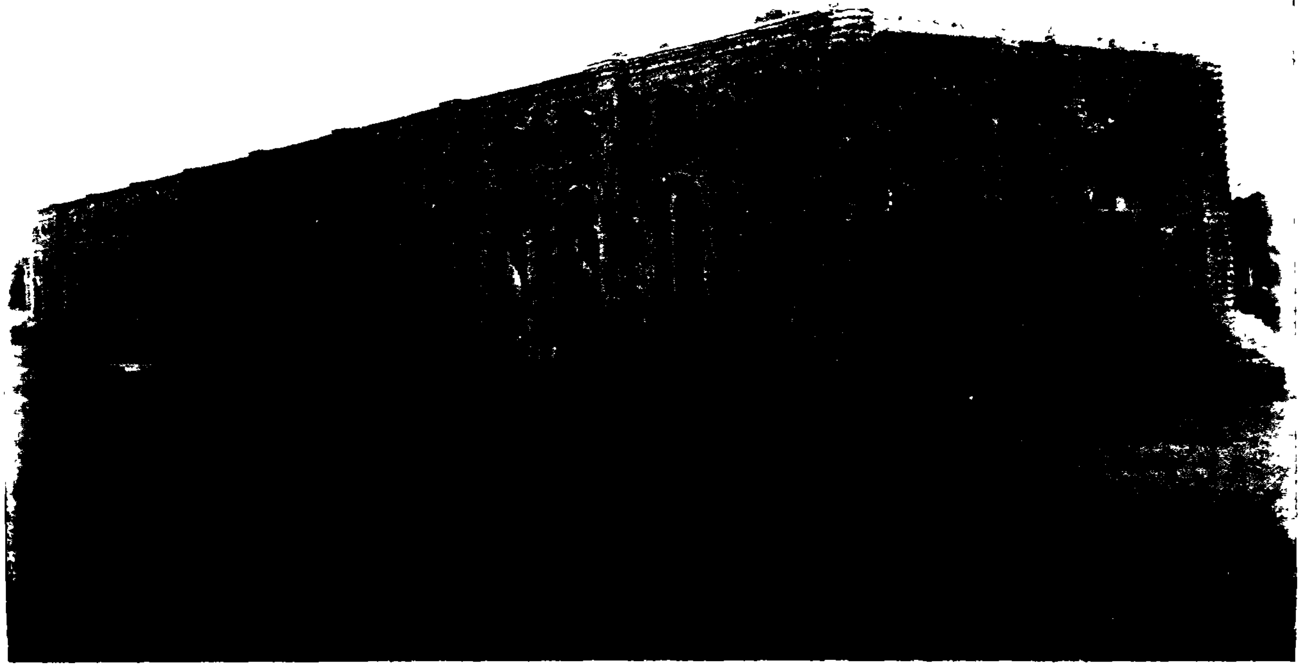
رقم کی نظر سے گزری تھی جس میں نواب ... بالاکشش اپنے محل کے سائبان میں رونق افروز تھے۔ مہاراج گوالیار و چڑیوان سے جیسے ... تھا اور انکو اپنے ہاتھ سے پان ... پیش کرتے تھے۔ مصور نے اپنی تصویر میں مہاراج کے ان جذبہ کو نمایان کیا تھا۔ مہاراج گدی پر بیٹھے تھے۔ ... بیشمار ... اور سپاہیان رکھی ہوئی تھیں اور ... جو ... انکی طرف آ رہے تھے۔

مصوران صناعی کے اشرف پیشہ لکھنو مین روغنی تصاویر بنانے کا رواج نہ تھا۔ صرف آبی رنگ کی تصویرین ہاتھی دانت، شیشہ، ابرک، اور کاغذ پر بنائی جاتی تھین۔ تانبے اور پیتل کے ظروف پر بھی رنگین تصویرین اور گلکاری بنائی جاتی تھی۔ ایک پر بعض نہایت نفیس اور نادر کام اہلِ لکھنو کے اکثر تعزیون مین دیکھے جا سکتے ہین جو ساری دنیا مین عدیم النظیر ہین۔ لیکن کتنے ایسے لوگ ہین جنھون نے اس سب صناعی کو اس نظر سے دیکھا ہے اور ان متبرک اعمال کاریگرون کی محنت کا اندازہ کیا ہے جو سال بھر اسی کام مین مصروف رہتے ہین۔ انکے تن پر کپڑا نہین اور شاید انکے بچون کو ایک وقت سے زیادہ کھانا نہین ملتا۔

تصویر کے گرد بیل اور مداخل بنانا اور اسکی پشت پر قطعہ لکھنا بھی لکھنو کے خصوصیات فن مین داخل تھا۔ قطعہ کے گرد بھی رنگین یا سنہری بیل اور مداخل کا التزام ہوتا تھا اور وصلی کی زمین عموماً افشانی ہوتی تھی۔ سونا حل کرنے اور رنگ بنانے مین جو کمال اگلے مصورون کو حاصل تھا اسکی مصورانِ حال کو آرزو ہے۔ اگلے مصور موقلم بھی خود ہی بنا لیتے تھے لیکن اب ولایتی برش کی محتاجی ہے۔ اب رنگ بھی ولایتی ہی استعمال ہوتے ہین اور لاجورد، سفیدہ وزنگار وغیرہ کا استعمال خواب و خیال ہو گیا ہے۔ لیکن ان معمولی رنگون کی شوخی اور پائداری ابتک حیرت خیز نگاہون سے دیکھی جاتی ہے۔

فوٹوگرافی کے ایجاد سے پیشتر تناسب اعضا اور رگ و ریشہ کا صحیح اظہار عام طور پر نا ممکن تھا۔ لیکن جو مصور علم تشریح سے واقف تھے اور کمال فن کے ساتھ دقت نظری سے بھی بہرہ ور تھے انکی صناعی مین یہ وصف بدرجہ اتم موجود تھا۔ لکھنو کے بہزاد رقم اور صاحب راے اس صنف مین خاص کمال رکھتے تھے۔ اندھیر اجالے کے اصول بھی عام طور پر رائج تھے اور پرداز کی گھلاوٹ مین تمام مسبوق الذکر مصورون کو کمال حاصل تھا۔ اسیطرح قلم کی نزاکت اور رنگون کی موزونیت مین بھی وہ کسی اسکول کے مصورون سے دوسرے درجے پر نہین رہے۔ لکھنو میوزیم اور شاہ نجف وغیرہ مین ان مصورون کی صناعی کے اکثر نمونے ابتک موجود ہین جو دستبرد زمانہ سے بچ رہے ہین اور انسے نہ صرف انکا کمال ظاہر ہوتا ہے بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص اسکول کی مصوری ہے۔

آخر آخر بھی قابل قدر مصور اور پیدا ہوئے۔ لیکن اب زمانہ کی ہوا انکے موافق نہ تھی اور عام افلاس، ناقدری اور کس مپرسی کی بدولت انھین ابھرنا نصیب نہین ہوا۔ درحقیقت غدر کے بعد اہل شہر کے دل مردہ ہو گئے تھے اور انھین تمدنی زندگی کا احساس تک باقی نہین رہا تھا۔ اس حالت مین مصورون کی قدردانی درکنار انھین پیٹ بھر روٹی ملنا محال تھا۔ شاہی عہد کا بہزاد رقم غدر کے بعد عرصے تک زندہ رہا۔ اسے اپنے کمال پر آخر وقت تک غرہ تھا اور با وصف ضعف بصارت اور فاقہ کشی کی وجہ سے قبل از وقت بڑھاپا آجانے کے جس سے ہاتھون مین رعشہ پیدا ہو گیا تھا، اسکی صناعی اصول فن ا



سکھیہ کنبان مہاراجہ پٹیالہ قیصر پور پنجاب

حدود مصوری کے اعتبار سے بے نظیر ہوتی تھی بُلاقی داس بھی ایک ایسا ہی مصور تھا جو با وصف فاقہ کشی اور در بدر مارے مارے پھرنے کے اپنے وقت کا ایک لاجواب مصور تھا اسے شبیہ نگاری مین اتقدر مہارت تھی کہ ادنیٰ فرمائش پر بھی فوراً تصویر بنا دیتا تھا۔ تصویر کا ہیکو فوٹو کہنا چاہیئے کہ اصل و نقل مین مطلق فرق نہین۔ اسکی ساری ضرورتین مصور ہی سے پوری ہوتی تھین۔ بنئے سے آٹا لیا اور اُسکی تصویر بنا دی۔ حجام سے خط بنوایا اور عوض مین تصویر پیش کر دی۔ لوگ روزمرہ تصویرین لیتے لیتے تھک جاتے تھے اور اُسکا قلم کبھی نہین تھکتا تھا۔ اگر کسی نے کچھ فیاضی دکھائی اور دو چار آنے نقد دینے کہے تو اُسکی رنگین تصویر مع نقش و پرداز بنا دی گئی اور وہ بھی ایسی لاجواب کہ اب قلم کی یہ نزاکتین مفقود ہین۔

شیخ قائم علی بھی ایک خاندانی اور مشہور مصور تھے۔ اُنکی صناعی کے اکثر نمونے ابتک اُنکے خاندان مین موجود ہین اور بعض اہل شہر کے پاس بھی نظر آتے ہین۔ نولکشور پریس کی بدولت اُنھین زمانہ کی سختیان نہین برداشت کرنا پڑین اور اُسکے تعلق سے خوش و خرم زندگی بسر کرتے رہے۔ "گلستان با تصویر" کی خیالی تصویرین اُنھین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہین حسین بخش بھی ایک حیرت انگیز مصور تھا جسنے فکر معاش سے تنگ آکر جعلی اسٹامپ بنانا شروع کئے تھے جنکی مدتون شناخت نہو سکی۔ آخر وہ اپنے کیفر کردار کو پہونچگیا۔ لیکن اگر اُسکی صناعی کے قدردان موجود ہوتے تو اُسے اپنی اعلیٰ ذہانت کو ایسے مجرمانہ فعل کی نذر نہ کرنا پڑتا اور دُنیا اُسکے کمال سے محروم نہ ہو جاتی۔

فوٹوگرافی بھی مصوری کی ایک شاخ ہے اور اسمین بھی اہل لکھنؤ کو قدیم الایام سے کمال حاصل رہا ہے۔ اوّل اوّل تقریباً ۱۸۵۵ء مین ایک فوجی انگریز کے ذریعے سے یہ فن لکھنؤ مین داخل ہوا تھا اور اہل شہر مین سب سے پہلے "چھوٹے میاں" نے اس فن کو حاصل کیا تھا جو حسین آباد اور قیصر باغ ایسی عمارتون کے نقشے بنانے کیوجہ سے تاریخی شہرت رکھتے ہین۔ انکے بعد مشکور الدولہ نے بھی اس فن مین خاص کمال حاصل کیا۔ اُنکے فوٹوؤن کی ابتک خاص شہرت ہے اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہین خصوصاً ٹون کے کام مین بنظیر اُستاد تھے۔ آخری شاہ اودھ نے اُنکے کمال کی قدردانی مین مندرجہ بالا خطاب دیا تھا۔ داروغہ عباس علی بھی ایک پُرانے اور نہایت مشہور فوٹوگرافر تھے۔ اُنھون نے بعض کتابین مع فوٹو شائع کی تھین مثلاً "لکھنؤ البم" جسمین عمارات لکھنؤ کے پچاس فوٹو اور اُنکی تشریح تھی۔ "حسینان لکھنؤ" دوسری کتاب تھی جسمین پچیس رقاصہ یا حسینان بازاری کے فوٹو شائع کئے گئے تھے۔ "مرقع تعلقداران" آخری کتاب تھی جسمین چارسو تعلقداران اودھ کے فوٹو شامل تھے۔ آخر آخر "اصغر جان" برادر مشکور الدولہ نے بھی اس فن مین خاص شہرت حاصل کی اور اسکے بعد یہ فن اسقدر عام ہو گیا کہ گلی گلی فوٹوگرافر نظر آنے لگے۔

ایڈیٹر

مسئلہ سالمات

نمبر ۲

ہندوؤن کے خیالات | راقم مضمون سنسکرت سے نابلد ہے اسواسطے انگریزی کتابون کے ذریعہ ہندو فلسفہ اور اُسکے مسائل کی نسبت تمام معلومات حاصل کرنے پڑے ہیں۔ ہوا۔ اُپنشدون مین سالمات کے نظریہ کا کوئی پتہ نہین ملتا ہے۔ مگر ہان ویدانت سوترون مین اسکی کیفیت موجود ہے۔ بلکہ اس مسئلہ کی ماہیت پر اچھی طرح بحث کی گئی ہے اور ویدانت سوتر اُپنشدون کی تفسیر تصور کئے جاتے ہین۔ سانکھیہ اور یوگ مین بھی سالمات کا ذکر نہین پایا جاتا۔ گو یہ دونون بہت پُرانے ہین اور ہندو نظام فلسفہ کی ایک زبردست پرانی شاخ قائم کرتے ہین۔ ذرّون پر وساسے شک شاستر مین تفصیلی بحث پائی جاتی ہے۔ بلکہ یہ مسئلہ اس فلسفہ کا جزو اعظم ہے۔ نیاسے بھی اسکے وجود کا قائل ہے۔ اور جابجا اسکا ذکر کرتا ہے۔ برہمنی فلسفہ مین یہ دواجزا ایسے ہین جنکے بانی پنڈت لوگ سمجھے جاتے ہین۔ اُنھون نے اس مسئلہ کی بہت چھان بین کی تھی۔ مگر رشی منی اس سے احتراز کرتے تھے۔ اور اسے غیر ضروری علم خیال کرکے اسکی طرف سے بالکل بے پروا رہے۔ جن فرقون کو قدیم ہندو مت سے اختلاف ہوا اور اس سے انحراف اختیار کیا اُنمین فرقہ جین بھی ہے جسنے اس فلسفہ کو اخذ کیا اور اسے اپنے عقلی اعتقاد کا جزو گردانننے لگا۔ بودھ مت والے ابتدا مین اس درشن سے ناآشنا تھے۔ پالی زبان اور ادبیات کے مشہور عالم پروفیسر فرینک (Franke) کہتے ہین کہ پالی کتب شرعی مین اسکا کوئی بیان نہین پایا جاتا مگر شمالی ممالک کے بودھ یعنی وے بھاشک اور سوتر انتک مسئلہ سالمات کے قائل تھے۔ مادھیمک اور یوگ چارہ اسکے مخالف تھے۔ اسکی غالباً یہ وجہ تھی کہ یہ دونون گروہ خارجی دنیا کو ایک قسم کا خوفناک سراب سمجھتے تھے اور اُسکے وجود کو محض خواب اور دھوکہ تصور کرتے تھے۔

تمام فرقے اور علما جو سالمات کے ماننے والے تھے تین بڑے گروہون مین تقسیم ہوسکتے ہین۔ اوّل فرقۂ جین ہے۔ دوم وساسے شک اور نیاسے سوتر کے درشن مع اُس بھاشیہ یعنی شرح کے جو واتسائن نے نیاءپر لکھی تھی اور جیسے شمالی ملکون کے بودھون نے اپنے طور پر مرتب کی تھی۔ سوم پرشس ست پاد بھاشیہ جو وسیشک کی سب سے پُرانی تفسیر ہے جسے وساسے شک اور نیار کے مقلدون نے متفق اللفظ ہوکر سند مان لیا ہے۔ سب سے پہلے جین فرقہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اُسنے اپنا فلسفہ مادہ کے نہایت ابتدائی خیالات مین تصحیح اور ترمیم کرکے قائم کیا ہے۔ مثلاً وہ یہ خیالات ہین۔ مادّہ ازلی ہے۔ اسکی مقدار اور ماہیت غیر معیّن ہے۔ یعنی ذرّون کے اجتماع و ازدیاد یا تفریق و تخفیف کے بغیر اُنکے حجم مین ترقی اور تنزل ہوسکتا ہے۔ مادّہ جو صورت چاہے اختیار کرسکتا ہے اور جو خواص چاہے اپنے اندر پیدا کرسکتا ہے۔ ہر قسم کا مادّہ ملکر ایک مادّۂ خاص کی صورت قبول کرسکتا ہے اور اگر پسند کرے تو ایک ہی مادّہ طرح طرح کی شکلین اختیار کرسکتا ہے۔

جین مت کے پیرو کہتے ہین کہ ارواح اور ظرفت کے سوا باقی تمام اشیا "پدگل" یعنی مادہ سے ترکیب پکڑتی ہین اور یہ کہ مادّہ ذرّون یعنی پرمانوؤن سے مرکب ہے۔ ایک ذرہ خاص

ایک خاص کونے مین رہتا ہے - اُنکے خیال کے مطابق مادّہ کی دو صورتین ہوتی ہین ایک "ستھول" یعنی کثیف اور دوسری "سُوکھشم" یعنی لطیف - حالت لطیف مین اسکے بیشمار ذرّے کثیف کے ایک ذرّہ کے برابر ہوتے ہین - ہیولی کیوجہ سے ذرّے ازلی ہین - ہر ذرہ مین خاص خاص قسم کا ذائقہ - رنگ اور بو پائی جاتی ہے اور دو قسم کا لمس ہوتا ہے - مگر یہ خواص ذرّے کے دائمی نہین ہوتے بلکہ عارضی ہوتے ہین - ذرّے ترکیب پکڑکر مختلف صورتون مین نمایان ہوتے ہین - ہر شے ایک خاص طبقہ کے ذرّون کے اجتماع سے پیدا ہوتی ہے - ذرّہ مین ایک خاص حرکت پیدا ہوتی ہے جسکے ذریعے سے وہ نہایت خوفناک سرعت کے ساتھ ایک لمحے مین عالم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچ جاتا ہے -

اس بیان سے ظاہر ہوگیا ہوگا کہ اہل جین ایسے مختلف ذرّے نہین مانتے جو عناصر اربعہ یعنی خاک پانی - ہوا - آگ سے مقابلہ کرین - تاہم یہ تصادق تسلیم ہوسکتا ہے کہ ذرّون مین بعض خواص پیدا ہوجاتے ہین جس سے وہ عناصر کے مشابہ ہوسکتے ہین اور وہ عناصر اربع بناسکتے ہین - کیونکہ وہ عنصری ارواح کے قائل ہین اسوجہ سے یہ نتیجہ اخذ ہوسکتا ہے کہ وہ چارون عنصرون کے معتقد ہین - مثلاً وہ ارواح خاکی - ارواح آبی - ارواح بادی اور ارواح آتشی مانتے ہین - اُنکے خیال کے مطابق یہ ارواح استحالہ کے مختلف مرحلون مین ہین اور خاک کے ذرّون کی صورت مین ہین - عناصر ایک قسم کے اجسام سمجھے جاتے ہین - انکی ابتدا اور انتہا مانی جاتی ہے - اہل جین کے عقیدہ کے مطابق مسئلہ سالمات کا کرم سے کیا لگاؤ ہے؟ اسکا ذکر خالی از لطف نہ ہوگا - کرم کی ماہیت مادّی ہے - روح دُنیا سے راہ ورسم رکھنے کیوجہ سے نہایت لطیف قسم کے ذرّون سے متاثر ہوجاتی ہے جو کرم کی صورت اختیار کرکے ایک خاص جسم اختیار کرتے ہین - جبتک روح انسے آزادی حاصل نہ کرے وہ اسکے ساتھ برابر لگے رہتے ہین - اس خیال کے مخالف یہ کہا کرتے تھے کہ کرم ذرّون کا نتیجہ ہے جو انکے اندر حرکت پیدا کردیتا ہے اور وہ متحد ہوکر جسم کو ترکیب دیتے ہین - پھر یہ مانا جاتا ہے کہ چار قسم کے ذرّے ہین جو عناصر اربع آب وخاک - بادو آتش سے لگا کھاتے ہین - بعض ذرّے ایسے بھی ہین جنکے خواص ہوا مین پائے جاتے ہین - بالاشتراک یا بالانفراد جملہ موجودات چارون عنصرون سے مرکب ہین - یہ خیال اس ملک مین قدیم الایام سے غالب اور رائج چلا آتا ہے - اُسوقت نظام فلسفہ عالم وجود مین نہین آیا تھا - "چھاندوگیہ اپنشد" (۲:۴) مین لکھا ہے - ابتدائی عنصر یعنی ہیولی سے آگ - آگ سے پانی - پانی سے خاک پیدا ہوئی - ان تینون کے اجتماع اور ترکیب سے باقی اشیا وجود پذیر ہوتی ہین بعض اور مقامات مین وایو یعنی ہوا کو بھی ایک عنصر خاص قرار دیا گیا ہے اور آکاش پانچوان عنصر مانا گیا ہے اور یہ عناصر خمسہ حواس خمسہ کے مقابل مین مانے جاتے ہین ڈاکٹر سکھ تھنکار نے "رامانج کی ویدانتی تعلیم" مین اسپر خوب بحث کی ہے - عناصر خمسہ کا خیال سانکھیہ کے فلسفہ مین بھی پایا جاتا ہے - اسمین اس مسئلہ کو زیادہ صراحت سے بیان کیا گیا ہے - سانکھیہ کے موجد نے عناصر کے دو حصے کئے ہین - ایک تن ماتر یعنی لطیف و پاک اور دوسرا کثیف وغلیظ یعنی مہابھوت ہے - مصنف کو عناصر کی قدامت سے بھی انکار ہے اور اُنکے وجود کو ذرّون سے منسوب نہین سمجھتا ہے - اسکے خیال مین جملہ عناصر ایک ابتدائی مادّہ یعنی

پرکرتی سے بنتے ہین - پانچوین عنصر یعنی آکاش کی نوعیت بالکل عجیب و غریب ہے - یہ اور عنصرون کے ساتھ شامل ہوکر موجودات کی ترکیب مین حصہ دار نہین بنتا ہے - بلکہ یہ مفرد و مسلسل اور بے پایان ہے - بودھ لوگ بھی اسے اپنے مذاہب تون جیسی اعناصر مین شمار نہین کرتے وسیشک والے بہ خلا اور آکاش کے درمیان امتیاز کرتے ہین اسے مفردات قدیم (دوتھو) مین شمار کرتے ہین اور اروات مکان وغیرہ ان نیطرح اسے دائمی اور لاانتہا سمجھتے ہین - چنانچہ برہمنی اور بودھ عقیدہ کے لوگ چار مادے مانتے ہین جنکا وجود سالمات سے ہے اور یہ مادے یا عناصر خاک - پانی - ہوا اور آگ ہین - مگر باقی امور مین انکے خیالات ایک دوسرے سے بہت اختلاف رکھتے ہین -

دوم وسیشک مین زیادہ تر طبعیات سے بحث ہے اور نیائے نے مابعد الطبعیات (Metaphysics) اور منطق (Dialectics) کے اصولون کا ذکر کیا ہے اول الذکر مین مسئلہ سالمات کے طبعی پہلو پر اور موخر الذکر مین اسکی مابعد الطبعی صورت پر خامہ فرسائی کی گئی ہے - ان[۵۱] دونون مین مادہ ازلی مانا گیا ہے - پس یہ نتیجہ نکال لینا خلاف واقعہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جاسے کہ وسیشک مین مسئلہ سالمات کا ذکر مفصل پایا جاتا ہے اور اُسکا مصنف اسکا بڑا قائل اور معتقد تھا - بادرآئینہ تو یہانتک کہتا ہے کہ مسئلہ سالمات اہل وسیشک کے اعتقاد کا جزو[۵۲] اصلی ہے - سالمات اور اُنکے خواص کے متعلق آرا اور دلائل وسیشک شاستر کی چوتھی اور ساتوین فصلون مین مقولون اور کماوتون کی صورتون مین ملتے ہین - انہین اس طریقہ سے استدلال کیا گیا ہے :- موجودات کی کوئی علت نہین ہے وہ ازلی ہین - ہم محسوسات کو حادث خیال کرتے ہین - کیونکہ کسی شے کو غیر ازلی سمجھنے مین ازلیت کا خیال لازم آتا ہے - ہم آخری علت یعنی علت العلل کو نہین معلوم کرسکتے جو ہماری نادانی اور جہالت پر دال ہے - اسکی وجہ سے ہم یہ قیاس کرلیتے ہین کہ علل آخری ازلی ہین -

ایچ جیکبی (Jacobi) صاحب کہتے ہین - ان سوترون کی تشریح و توضیح کے لئے ہم زمانۂ حال کے مفسرون کے محتاج نہین ہین شنکر آچاریہ نے انکی تردید بخوبی کی ہے - واضح رہے کہ ابدیات مین جو حادث کے اسباب ہین ذرّے ہین - مگر وہ غیر دیدنی ہین - سوتر مین مذکور ہے کہ بہت سی چیزین مرئی ہوسکتی ہین - اگر انہین رنگ ہو اور انکے بہت سے اجزاء ترکیبی ہون - نیائے وارتِک (صفحہ ۲۳۳) مین ایک سوتر نقل ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ذرّہ غیر مرئی ہے - کیونکہ وہ مادی اجزا سے مرکب نہین ہے - اگر اجزاے ترکیبی شمار مین زیادہ ہون یا وہ بالذات بڑے بڑے ہون تو چیز کا حجم[۵۳] بڑا ہوجاتا ہے - برعکس اسکے یہ خیال ہے کہ آنو یا ذرہ چھوٹا ہوتا ہے - اسکے اجزاے ترکیبی نہین ہوتے ہین - اس سے آگے آٹھ دس سوترون مین یہ بحث برابر چلی گئی ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ "بڑا - چھوٹا - لمبا" وغیرہ جو بول چال مین مستعمل ہوتے ہین نسبتی الفاظ ہین ہم ایک شے کو بڑی اور دوسری کو چھوٹی کہکر پکارتے ہین - کیونکہ ظاہری صورت مین وہ ایسی دکھائی دیتی ہین اسوجہ سے انکا مفہوم ثانی ہوتا ہے - مگر دراصل "بڑا اور چھوٹا" ایک دوسرے سے منسوب نہین ہین - وہ خاص خاص چیزون کے حجم کی بڑائی یا چھوٹائی ظاہر کرتے ہین ورنہ اسکے یہ معنی -

[۵۱] "دین حق کی تحقیق" صفحہ ۱۳ - انگریزی ترجمہ ملاحظہ ہو - [۵۲] "ویدانت سوتر" اور اسکی نسبت شنکر کے خیالات - [۵۳] "ویدانت سوتر" شنکر اچاریہ دوسرا حصہ دوسری فصل کا ماحاصل شمرک

ہونگے کہ ہم صفت سے صفت منسوب کرتے ہین جو اس اصول سے منافی ہے کہ صفت کی صفت نہین ہوتی ہے۔ بڑائی اور چھوٹائی حادثات مین غیر ازلی ہے مگر قدیم اشیا مین وہ قدیم اور ازلی یعنی مطلق اور بے پایان ہے۔ بالکل چھوٹی شے پری منڈل کہلاتی ہے۔

ذرّون کے اور خواص حسب ذیل ہین۔ خاکی اور دیگر اشیا کے خواص مثلاً رنگ۔ ذائقہ۔ خوشبو اور لمس اُس شے کی بربادی کے وقت نابود ہو جاتے ہین۔ اسواسطے غیر حادث چیزون یعنی ذرّون مین وہ ازلی ہونے چاہئین۔ پانی۔ ہوا اور آگ کے ذرّون مین یہ خواص قدیم ہین۔ خاک اور اُسکے ذرّون مین بعض اوصاف "پاکج" یعنی حرارت کے اثر سے بدل جاتے ہین۔ مختلف قسم کے ذرّے آپسمین ایک دوسرے سے اتحاد پکڑکر نئی صورت مین نمودار ہو جاتے ہین۔ ابتداے عالم مین آدرشٹ کے ذریعے سے ذرّے حرکت پذیر ہوتے ہین۔ یعنی تکوین کے پیشتر کے زمانے مین مخلوقات کے اعمال نیک و بد کے مطابق سالمات مین حرکت پیدا ہوتی ہے۔

نیائے سوتر مین ذرّہ کے واسطے لفظ "انو" آیا ہے۔ نیائے وارتک مین جو سوتر نقل کئے گئے ہین انمین لفظ "پرمانو" ملتا ہے اور مابعد کے مصنفون نے بھی یہی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ذرّون کے وجود کے لئے جو استدلال کام مین لایا گیا ہے اُسکی بنیاد اس امر پر ہے کہ کسی شے کی لامحدود تفریق و تقسیم ناممکن العمل ہے یعنی کسی شے کے اتنے ٹکڑے نہین ہو سکتے جتنے ہم کرنے کے خواہشمند ہون۔ ویشیشک سوتر کے مصنف نے اس طریق استدلال سے کام نہین لیا تھا۔ گو یہ بحث بہت مختصر ہے۔ مگر یہ امر ظاہر کرنے کو کافی ہے کہ کناد کے زمانے مین مسئلہ سالمات کی اصل حالت کیا تھی اور اس نظریہ کے قائم و رائج کرنے مین اُسنے کن دلائل سے کام لیا تھا۔

گوتم کا مسئلہ سالمات نیائے شاستر کے مصنف مہرشی گوتم ہین۔ اس مشہور زمانہ کتاب کے سوترون مین اور نیز اسکے بھاشیہ یعنی شرح مین جو غالباً پانچوین صدی مسیحی مین واتسیاین نے لکھی تھی۔ سالمات کے بعض پہلوؤن پر بحث کی گئی ہے اور معترضون کے اعتراضات کو بھی رد کیا گیا ہے۔ ذرّون کے خواص طبعی کی بابت گوتم اور کناد کے خیالات مین بڑا اتفاق پایا جاتا ہے مثلاً وہ کہتے ہین (۴ باب پہلی فصل ۶۷ اشلوک) خاکی ذرّون کا سیاہ رنگ ازلی نہین ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ آگ۔ پانی اور ہوا کے خواص کو قدیم سمجھتے تھے۔ مگر گوتم نے سب سے زیادہ سالمات کے متعلق جملہ سوالات مابعد الطبیعات پر مفصل بحث کی ہے اور اسکے بعد اُسکے بڑے مقلد واتسیاین نے بھی ان مسائل کی خوب توضیح و تصریح کی ہے۔ دو مقامات مین "کل و جزو" کی صورت مین سالمات پر مناظرہ پیدا کیا گیا ہے۔ نیائے کے ماننے والے کہتے ہین کل اپنے اجزا کے ماسوا کچھ اور بھی ہے۔ کل ایک جداگانہ شے (ار تھانتر) ہے مگر وہ اپنے اجزا سے علحدہ نہین ہے۔ بلکہ یہ انکے ماسوا ہے۔ ہم ایک مکمل شے کو دیکھتے ہین مثلاً درخت، ہمین اسکے سامنے کا حصہ اچھی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اسکے درمیانی اور پچھلے حصے ہماری نگاہ سے اوجھل ہین پس ظاہر ہے کہ ہم ایک شے کو دیکھتے ہین مگر جن ذرّون سے وہ مرکب ہے ہم انھین نہین دیکھ سکتے۔ ذرّون کے مسئلہ پر اسطرح بحث کی گئی ہے :۔ ایک شے جو حصون سے

---

۵ "ویدانت سوتر" ۲ باب ۱ فصل ۱۰-۱۷ شلوک۔ ۵ باب ۱ فصل ۱۳-۱۷ اشلوک

مرکب ہے کُل کہلاتی ہے۔ اُسکا ایک ایک حصہ بجائے خود ایک مکمل تصویر ہونا چاہئے۔ اسیطرح ایک حصے کے بہت سے حصے ہین اور پھر اُنکے اور حصے ہین جو انتہا تک پیدا ہوتے چلے جاتے ہین۔ اگر ہم کُل کے آخری اور انتہائی حصون تک نہین پہونچ سکتے تو اُسکا تصور ہمارے دماغ میں صحیح نہ ہو سکتا ہے اور اسطرح کُل لاشے مین منتقل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ تقیم در تقیم ذرہ پر ختم ہوتی ہے جسکی تفریق مزید ناممکن ہوجاتی ہے۔ کیونکہ وہ بالکل ہی چھوٹا ہے اور اسے کاٹنا۔ اسکے اجزا نکالنا اور اسنے اور حصون مین تقسیم کرنا امر محال ہے۔

اگر کُل کے اجزا کی کوئی حد نہو تو ذرہ اور بلند ترین پہاڑ مین کوئی فرق نہ ہوگا۔ کیونکہ دونون کے اجزا کی تعداد یکسان ہوگی۔ اعتراضون کا جواب دیتے ہوئے آگے چلکر بیان کیا ہے۔ آکاش ایک مفرد۔ غیر محدود اور محیط کُل جوہر ہے۔ اسپر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ سالمات کے اندر بھی داخل ہوتا ہے یا نہین۔ اگر یہ جوہر اُنکے اندر دخل حاصل کرسکتا ہے تو ذرّون کے اجزا ثابت ہونگے۔ اگر وہ انکے اندر اثر نہین کرسکتا تو وہ محیط کُل کیسے ٹھہر سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ذرّے کا اندر اور باہر یکسان ہے۔ اسکے اندر خلا نہین ہے۔ یہ مفرد جوہر ہے مرکب نہین۔ دوسرا اعتراض یون رد کیا گیا ہے۔ چونکہ ذرّہ کروی ہونے کی وجہ سے باصورت ہے اور اسکی صورت اجزا پر موقوف ہے اسلئے ذرّہ کے اجزا لازم ٹھہرتے ہین۔ علاوہ ازین ذرّے چونکہ ایک دوسرے کے محاذی ہوتے ہین لہذا جو ذرّہ دو ذرّون کے وسط مین ہے وہ اپنے آگے پیچھے داہنے بائین کے ذرّون سے گھرا ہوا اور ملا ہوتا ہے جس سے اسکے چھ پہلو پیدا ہو جاتے ہین۔ پس ذرہ کے اجزا ثابت ہوتے ہین۔ اسکا جواب یہی دیا گیا ہے کہ ذرّہ کے اجزا کی تفریق در تفریق محض قیاسی ہے حقیقی نہین ہے اور نہ یہ تقسیم بے انتہا ممکن العمل ہے۔

وسیشک وارتک (چھٹی صدی مسیحی) نے سالمات کے متعلق اُس زمانہ کے مصنفین کے آرا نقل کئے ہین جنکا خلاصہ دینا خالی از لطف نہ ہوگا۔ کھڑکی یا جھروکے سے سورج کی کرن جو مکان کے اندر داخل ہوتی ہے۔ اُسمین بیشمار بہت ہی ننھے ننھے ریزے اُڑتے دکھائی دیتے ہین۔ بعض انھین ذرے سمجھتے ہین۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ ذرّے صرف مجتمع صورت مین پائے جاتے ہین (صفحہ ۲۳۴) بودھ لوگ اور اکثر آدمی کہتے ہین کہ ذرّے قدیم نہین ہین کیونکہ انکے اندر حرکت موجود ہے۔ نیائے والے اس امر مین وسیشک والون کے ساتھ متفق ہین کہ آدرشٹ سے ذرّون مین حرکت پیدا ہوتی ہے۔ آخرالذکر گروہ کے لوگ یہ بھی کہتے ہین کہ ذرّون[۵۱] کی نقل و حرکت سے ایشور کی اِکّیا انوسار ہوتی ہے۔ سوم۔ جیسا شروع مین بیان ہو چکا ہے۔ نیائے کے مخالف وے بھاشک اور سوترانتک فرقہ کے بودھ لوگ تھے۔ اوّل الذکر فرقہ کے عالم کہتے تھے کہ اشیائے خارجہ کا بلاواسطہ احساس ہو سکتا ہے اور موخرالذکر فرقہ کہتا تھا کہ اُنکا احساس نہین ہو سکتا بلکہ بالواسطہ اُنکے وجود کا علم حاصل ہوتا ہے۔ شنکر آچاریہ ویدانت سوتر مین ان دونون گروہون کے خیالات دربارۂ سالمات کو اسطرح بیان کرتے ہین:-

"بودھ لوگ عناصر اربع یعنی ہوا۔ پانی۔ آگ اور خاک اور انکے مرکبات اور اعضائے حسّی کو مانتے ہین۔ ان چارون عناصر کی ابتدا اور صدور ذرّون سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ذرّات خاکی مین سختی اور کرختگی۔ ذرّات آبی مین سلساہٹ۔ ذرّات آتشی مین

[۵۱] "نیاوارتک" صفحہ ۱۰۴

حرارت اور ذرّات بادی مین حرکت کا خاصہ پایا جاتا ہے - ان ذرّون کی ترکیب اور اجتماع سے موجودات وجود پذیر ہوتے ہین"[۵]

اہل وسے یشا شک یہ بھی مانتے تھے کہ ذرّہ کے چھ پہلو ہوتے ہین - ذرّہ کے اندر جو خلا یا ظرف ہوتا ہے وہ تقسیم کے قاعدہ کا ہرگز تابع نہین ہے - اُنکا یہ بھی خیال ہے کہ حواس کے ذریعے سے ذرّون کا علم اور احساس ہو سکتا ہے - مگر وہ نظر نہین آسکتے - نیائے اسکے برخلاف کہتا ہے - ذرّہ مافوق الحس (اتندریہ) ہے یعنی حواس سے اسکے وجود کا علم حاصل نہین ہو سکتا -

سوترانتک فرقہ کا یہ خیال ہے کہ سات ذرّون کا چھوٹے سے چھوٹا مجموعہ ہو سکتا ہے - ذرّات کروی ایک دوسرے کو بالکل نہین چھوتے بلکہ انکے درمیان کچھ جگہہ خالی رہتی ہے - اس فرقہ کے بعض لوگ اس خیال کے مخالف ہین - مگر ان سب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ذرّہ ناقابل تفریق ہے - یہ دونون گروہ یہ بھی مانتے ہین کہ ذرّے اندر سے خالی نہین ہوتے ہین اور نہ وہ ایک دوسرے کے اندر گھس سکتے ہین - بودھ لوگون کے بہت سے فلسفیانہ خیالات کا جنکا مجملاً ذکر اوپر ہوا نیائے کے سوتر اسکے بھاشیہ اور وارتک مین بہت چرچا ملتا ہے - یہ تمام قیاسات سنہ عیسوی کے ابتدا سے لیکر چھٹی صدی تک برابر غالب و رائج رہے - مابعد کی صدیون مین کئی ایسے بلند فکر اور نازک خیال بزرگ ہوئے - جنھون نے مسئلہ سالمات کی بہت تحقیق و تفتیش کی - نیائے اور ویشیشک کے قیاسات کی توضیح کرکے اُنکی اشاعت کی اور اپنی عقلی کوشش سے بہت کچھ اسمین اضافہ کر دیا - پرشستپاد اور ادیوت کار اسکے بڑے نامور حامی تھے -

سب سے آخر مین ادیائن تھا جسنے بارھوین صدی مین اس مسئلہ سے خدا کی ہستی ثابت کرنے کا کام لیا تھا - چھٹی اور بارھوین صدی کے درمیان کے مصنفون اور محققون نے دوے نک کا مسئلہ اختراع کیا تھا جسکے لغوی معنی "دو کا تیسرا حصہ" ہین - اسکی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ بڑی بڑی چیزین دو قسم کی ہین ایک قدیم مثلاً ظرف جو بے پایان ہے اور دوسری حادث - اور یہ دونون خواص چھوٹی چھوٹی چیزون کے اندر موجود ہین - ازلی چھوٹی چھوٹی چیزون مین سالمات ہین اور غیر ازلی مین مرکبات و مجموعہ جات ذرّات ہین اور وہ "دوے نک" کہلاتی ہین - تعدد کا خیال اس امر سے پیدا ہوتا ہے کہ بہت سی اکائیان یعنی ایک شاید ہی موجود ہین اور اس قسم کا خیال قائم کرنے کیواسطے عقل ہونا لازمی ہے - دُنیا و مافیہا مین ایک ایسی عقل درکار ہے جو تمام ذرّات اور "دوے نک" کا تصور ایک ساتھ قائم کر سکے اور یہ عالم الغیب اور ہمہ دان کا کام ہے جو خود خدا ہے اسکے بغیر "دوے نک" یا "ترے نک" ممکن نہین ہے اسوجہ سے خدا کے بغیر موجوداتِ عالم - سالمات - اُنکے مرکبات اور مجموعہ جات نہین ہو سکتے -

مسئلہ سالمات کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ مسئلہ سالمات کی جملہ صورتین جنکا علم حاصل ہو سکتا ہے اوپر مذکور ہو گئی ہین - اب اس امر کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی اس ملک کے فلاسفرون کے یہان کسطرح ابتدا ہوئی تھی - سب سے پہلے ذرّہ کو لینا چاہیے - اسکا نام "انو" یعنی "کہتر" اور "پرمانو" یعنی "کہترین" ہے دوسرا امر یہ ہے کہ "چھوٹا" صرف نوعیت مین "بڑے" سے مختلف سمجھا جاتا ہے - اس خیال کے رو سے جسکے قائل مسئلہ سالمات کے مخالفین بھی تھے خرد یا "کہتر" یا چھوٹا قائم اور موجود مانا گیا تھا اور اسکے ثبوت کی کوئی ضرورت نہین ہے - یہ خیال اپنشدون کے زمانہ مین مروّج تھا - وہان یہ پایا جاتا ہے "برہمن" چھوٹے سے بھی

[۵] "ویدانت سوترہ اوشنکر آچاریہ ۲ باب ۲ فصل ۱۰ اشلوک -

چھوٹا ہے اور "آتمن" کہتے (انو) ہے۔ ذرہ کا تصور باندھنے کیلئے ضرورت خردیت اور سکتری کا خیال مادہ پر عائد کرنا پڑا بلکہ معاً اُسکے عدم فنا پذیر کا اطلاق الہ پر ہوا۔ پھر اجتہادات سے کام لیا گیا یعنی استدلال قیاسی پر عمل ہوا۔ چونکہ "اکبر مطلق" یعنی خدا قدیم ہے۔ اسوجہ سے "اصغر مطلق" یعنی ذرہ بھی ازلی ہے۔ الغرض سکتری او خردیت سے تصورت ذرہ کا خیال پیدا ہو گیا۔ اسی زمانے مین جین مت والون نے اس خیال کو قبول کر لیا اور اپنے قیاسات مابعد الطبیعات مین اس سے کام لینا شروع کر دیا۔ مسئلہ کے اصل مخترع فراموش ہو گئے اور شہرت کا سہرا اُن لوگون کے سر بندھا جو اسکی حمایت واقامت مین کامیاب ہوئے تھے۔ یہ کام ویشیشک والون نے پایۂ کمال تک پہونچا کر غیر فانی ناموری حاصل کی۔ مسئلۂ سالمات انکے فلسفہ کا جزو اصلی ہے۔ سوترون مین اسکے متعلق بڑی بڑی دلائل پیش کی گئی ہین۔ ویدانت سوتر مین شنکر آچاریہ بحث کرتے ہوئے اسکی ابتدا ویشیشک سے منسوب کرتے ہین۔

جب یہ مسئلہ مستحکم دلائل کی بنا پر قائم ہو گیا تو اور فلاسفرون کی توجہ اسکی طرف منعطف ہوئی ہو گی۔ کیونکہ اس مسئلہ نے مادہ کے ابتدائی خیالات کو جنکی رو سے اسے ناقابل فہم جوہر سمجھا جاتا تھا۔ سایہ مین ڈالدیا اور "العالم متغیر" کی معقول توجیہ کی۔ اسکے ساتھ ہی مادہ کی قدامت وازلیت بھی قائم رہی۔ شمالی ملکون کے بودھون نے اس مسئلہ کو قبول کیا اور صرف اتنا تغیر پیدا کر لیا کہ ذرات ازلی نہین ہین۔ کیونکہ اس مت کے اصول متعارفہ کے رو سے عالم اور ما فی العالم حادث ہین۔ یوگ والون نے بھی بعد مین پرمانوؤن کو مان لیا اور انھین نہایت ننھے ننھے اجزا قرار دیا۔ جنکے اندر تینون گُن پائے جاتے ہین۔ میمانسا والون نے بھی بقول پرجناک آرمتی ذرون کو قدیم تسلیم کیا تھا اور یہی امراجی وک والون پر عائد ہوتا ہے۔

جرمنی کے ایک مشہور محقق ڈاکٹر ڈبلیو بانڈٹ نے اپنی[۱] ایک کتاب مین جو سنہ ۱۹۰۱ء مین شائع ہوئی تھی۔ لکھا ہے کہ مسئلہ سالمات کی ابتدا بودھ لوگون سے ہوئی تھی اور اسکے متعلق زبردست دلائل پیش کئے ہین۔ "بودھ لوگون کا ابتدائی خیال یہ ہے کہ سنسار مسلسل بنتی اور بگڑتی ہے۔ تمام دنیا حادث ذرون کا عظیم الشان مرکب ہے۔ جیسے عالم روحانی پانچ اسکندھون کا مجموعہ ہے" لیکن اگر ذرہ کو قدیم نہ مانا جائے تو اس خیال کی بنیاد بالکل سست ہو جاتی ہے۔ سوترانتک فرقہ کے بودھ لوگون نے ایک اور ہی نظریہ پیش کیا تھا جسکی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ چیزین ایک لمحہ مین وجود مین آتی ہین اور دوسرے لمحہ مین ناپید ہو جاتی ہین۔ اُنکا صرف سایہ باقی رہ جاتا ہے۔ اسکی رو سے دائمی تبدلات عالم کی بھی تعبیر کیجاتی ہے۔ وہ اسکی رو سے زمانہ کو ذرون سے مرکب سمجھتے ہین۔ بودھ لوگون نے یہ مسئلہ اپنے عقیدے کی حمایت مین نہین وضع کیا تھا بلکہ اس زمانے کے علوم کا ایک مسئلہ تھا۔

مسلمانون کے خیالات | ٹی۔ جے۔ دے۔ بوئر صاحب لکھتے ہین۔ مسلمانون کے درمیان مسئلہ سالمات کی ابتدا کسطرح۔ کہان سے اور کس زمانے مین ہوئی بالتحقیق معلوم نہین ہے۔ گمان غالب ہے کہ ارسطاطالیسی طبیعیات کے ذریعہ سے یہ خیال اُنکے درمیان پھیلا تھا۔ افلاطون کے شاگردان اسکندریہ نے جب اپنے اُستاد کے فلسفہ اور اُسکے فلسفی مسائل کی تفسیرین لکھین تھین تو اُنکے ذریعے سے شام اور عرب مین علمی خیالات

[۱] ڈاکٹر ایچ جیکبی کے خیال کے مطابق۔



کو رواج حاصل ہوا تھا۔ جہانتک پتہ چلتا ہے عربی کتابون مین[۵۱] اسلامی اور نو افلاطونی تصورات کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ نوین صدی ہجری مین وہان مسئلہ سالمات کے متعلق خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ النظام (۸۴۵ء) نے اس مسئلہ کی مخالفت کی تھی۔ القندی (۸۶۰ء) نے اس مسئلہ کے پیروؤن کے خلاف ایک کتاب لکھی تھی۔

ابو ہاشم باشندۂ بصرہ کے زمانے مین اس مسئلہ نے ایک خاص صورت اختیار کی۔ یہ شخص ۹۳۳ء مین پیدا ہوا تھا۔ اسکے نظریہ کا ذکر "کتاب المسائل" مصنفہ ابو رشید سعید بن محمد بن سعید نیشاپوری مین ملتا ہے۔ یہ شخص ۹۳۲ء اور ۱۰۱۶ء کے درمیان [گزرا] ہے اسکا خیال حسب ذیل ہے "ذرہ یا الجوہر جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بالطبع "جوہر فرد" ہے جو خلا یا تحیز مین گھیرتا ہے۔ جوہر مسدس ہوتے ہین اور وہ سب ایک ہی قسم کے ہوتے ہین صرف اتنا فرق ہے کہ وہ چیز کے ایک حصۂ خاص کو پر کرتے ہین۔ ہر ایک جوہر ایک مقام خاص مین رہتا ہے۔ وجود اور فاعلیت اسکے ماسوا بطور خواص موجود ہے جسکی وجہ سے ہر ذرہ دوسرے کی جگہ غصب کرنے اور اپنے تصرف ناجائز سے باز رہتا ہے۔ ان جوہرون مین یہ بھی خوبی ہے کہ جب چاہتے ہین خواص عارضی اختیار کر لیتے ہین۔

یہ ذرے یا جوہر خلا مین ادھر ادھر گھومتے رہتے ہین تصادم اور دباؤ سے ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہین۔ اسکا ثبوت نہ صرف طریقہ استخراج سے بہم پہونچایا جاتا ہے۔ بلکہ مسلسل تجربات سے اسے ثابت کر سکتے ہین۔ ومقراطوس کا یہ مقولہ تھا کہ "لاشے چیز سے کم قابل قدر امر واقعی نہین ہے" یہان "لاشے" سے مراد خلا ہے۔ مگر جب اور خیالات کا غلبہ ہوا تو عرب کے عالمون نے ومقراطوس کے نظریہ کو بالکل رد کر دیا۔ جوہر یا ہیولی کے اندر ہی وجود اور عدم وجود کی حالتین موجود پائی جاتی ہین۔ ذرہ کا جوہر یا مادۂ طبعی اسکے وجود سے آزاد ہے۔ اس سے غالباً یہ مراد ہے کہ یہ جوہر اصلی علم انسانی یا فکر یزدانی کا موضوع بحث بن سکتا ہے۔ جوہرون کو خدا پیدا نہین کرتا ہے بلکہ وہ صرف انھین وجود مین لاتا ہے یعنی انھین وجود پذیر ہونے دیتا ہے۔ جب وہ حقیقی ہستی کے مرحلے پر پہونچ جاتے ہین تو دوسرے اکوان کی خاص خاص صورتین اختیار کر لیتے ہین۔ مثلاً حرکت و سکون۔ اتحاد و انتشار اور عارضی خواص بھی پیدا ہو جاتے ہین۔ ایک جوہر خاص طرح طرح کے بیشمار اوصاف اختیار کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ایک دوسرے سے تناقض اور متضاد نہ ہون۔

اجسام اور جوہر جو انکی ترکیب سے بنتے ہین انھین انکے قیام کا تعین پایا جاتا ہے۔ انکی فنا ممکن ہے جو اس حالت مین کامل ہوتی ہے جبکہ تمام دنیا نیست و نابود ہو جائے۔

بغداد کے عالم بعض امر مین مذکورۂ بالا خیالات سے متفق نہ تھے۔ اس گروہ کے علماء کے مسائل کو سب سے پہلے ابو بکر الباقلانی (۱۰۱۲ء) نے صورت دی تھی اور انھین کلام قدیم مین منقل کیا تھا۔ مشہور یہودی فاضل اور فلاسفر ابو عمران موسی بن میمون عبید اللہ القرطبی نے جو انگریزی مین مائے مانی ڈیز[۵۲] (Maimonides) کے نام سے مشہور ہے اس مسئلہ کا تفصیلی حال ایک اپنی مشہور کتاب مین لکھا ہے۔ یہ شخص ۱۱۳۵ء اور ۱۲۰۴ء کے مابین گزرا ہے۔ ذیل کا بیان اسکی تحریر پر مبنی ہے۔ تمام دنیا جسکا خدا خالق واحد ہے۔ ناقابل تقسیم ذرون اور انکی خوبیون پر مشتمل ہے۔ بالانفراد یہ ذرے صفر ہین جو طول و عرض اور وسعت سے مبرا ہونیکی وجہ سے ناقابل تحسیس ہین۔ انکا تحیز

[۵۱] منقول از "انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد دوم صفحہ ۲۰۲ مطبوعہ دسمبر ۱۹۰۹ء

[۵۲] "دی نیو انٹرنیشنل انسائیکلو پیڈیا" جلد ۱۲ مطبوعہ نیو یارک ۱۹۰۹ء

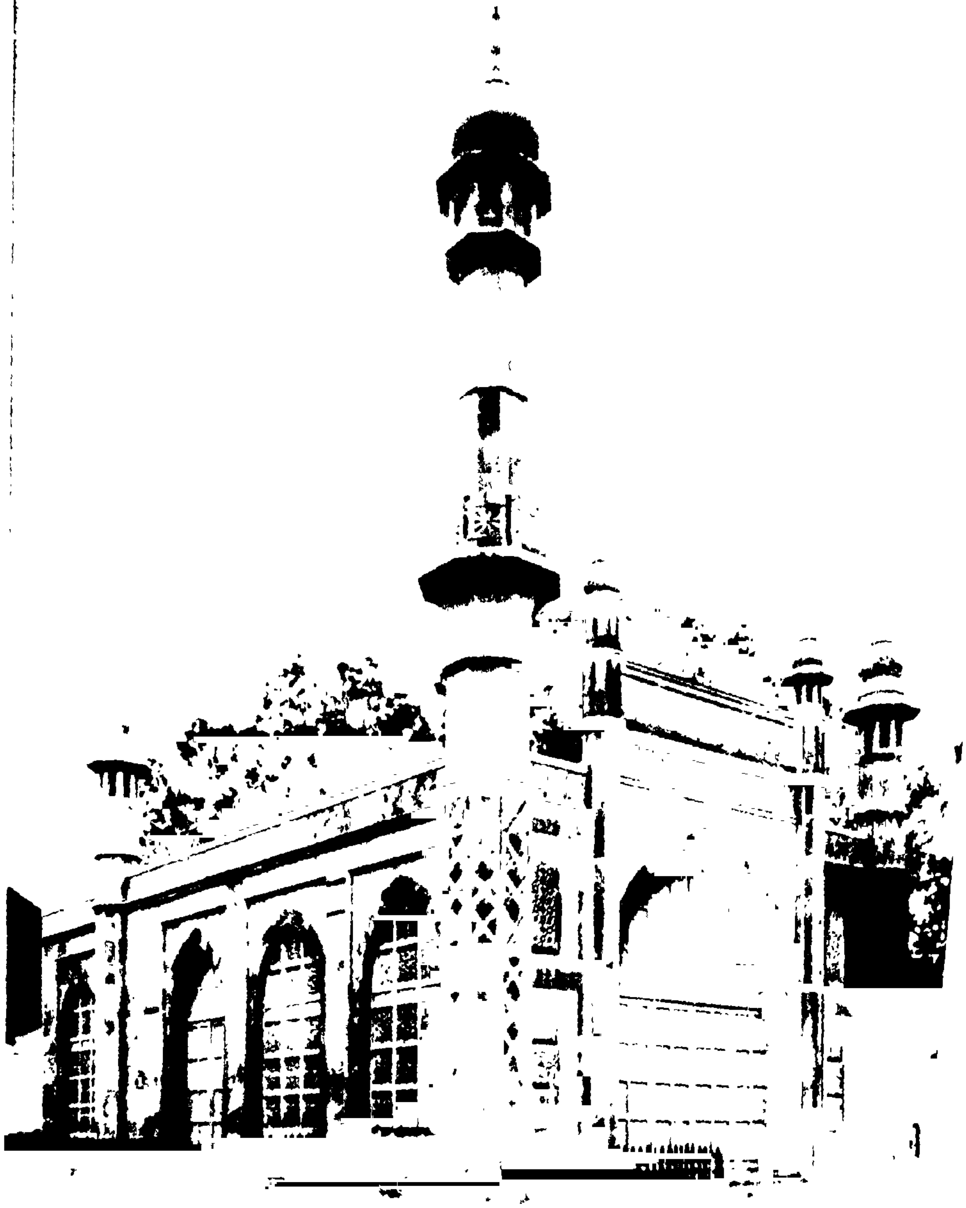
یا قدرتی جگہ نہین ہے۔ ... ذرون کے اتصال سے وہ وسعت اور جسامت اختیار کرتے ہین اور مکان پیدا کرتے ہین۔ ذرون کے اتحاد سے اجسام وجود مین آتے ہین اور جب انتشار واقع ہوتا ہے تو نابود ہو جاتے ہین۔ جو امر مکان پر عائد ہوتا ہے وہ زمان پر بھی صادق آتا ہے۔ وقت کے لمحون یا آنون کے اجتماع سے زمان پیدا ہوتا ہے۔ حرکت بھی مکان و زمان کی طرح غیر مسلسل ہے۔

ہر ذرہ مین ایک کثیر تعداد خواص کی ہمیشہ موجود پائی جاتی ہے۔ بعض محققین یہ بھی کہتے ہین کہ اسکے اندر تمام قطعی اوصاف پائے جاتے ہین۔ حالات سالبہ بھی ویسے ہی خواص عارضی ہین جیسے حالت موجبہ ہوتی ہے۔ مثلاً موت اور زندگی۔ جہالت اور علم وغیرہ ہر دو خواص کی مثالین ہین۔ زندگی احساس تخیل عارضی خواص مین سے ہین۔ بعض یہ مانتے ہین کہ روح لطیف ذرون سے مرکب ہے۔ پھر بعض کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ روح ونفس جسم کے ایک ذرہ خاص سے تعلق رکھتے ہین۔ کوئی خاصہ ایک لمحہ سے زائد نہین رہ سکتا اور چونکہ جوہر اپنے اوصاف سے علیحدہ نہین ہوسکتا اسواسطے اسکی کشاکش صرف ایک لحظہ تک رہتی ہے۔ اس خیال کے رو سے یہ لازم ٹھہرتا ہے کہ دنیا جو ذرون اور انکی صفتون سے مرکب ہے ایک منٹ رہتی ہے اور دوسرے منٹ مین خدا نئی تیار کر دیتا ہے۔ سلسلۂ اسباب ونتائج کوئی نہین ہے۔ قانونِ قدرت بھی معدوم ہے۔ خدائے قادر مطلق کے فعل اختیاری کے ماسوا اور کوئی شے دنیا مین نہین ہے۔ اسکے نزدیک وجود اور عدم وجود برابر ہے۔ خدا یکے بعد دیگرے اپنی مرضی کے مطابق دنیائین پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی عالم بنانا منظور نہو تو وہ لاشے اور عدم وجود بناتا ہے۔

مسٹر ڈی بوئر کہتے ہین۔ اس امر کے اعتراف کے ساتھ مسئلہ عالمات کا مذہبی مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ تمام اسباب طبعی حکم الٰہی کے تابع بتائے جاتے ہین۔ سب کچھ ممکن ہے۔ کسی شے کا خیال یا تصور ذہن مین قائم ہوسکتا ہے۔ وہ وقوع اور وجود مین آسکتی ہے۔ جو کچھ واقع ہوتا ہے اسکے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ اللہ کی ایسی مرضی ہو۔ اس تعلیم مین زمانہ حال کی سببیت (Occasionalism) کی جھلک نظر آتی ہے جو نہ صرف اسباب قدرت پر عائد کی جاتی ہے بلکہ افعال انسانی پر بھی اسکا اطلاق ہوسکتا ہے۔ ایک عام نظیر سے اسے واضح کیا جاتا ہے۔ ایک آدمی بیٹھا لکھ رہا ہے۔ اللہ پہلے اسکے اندر ارادہ پیدا کرتا ہے پھر لکھنے کی قوت دیتا ہے۔ پھر ہاتھ کو حرکت پہونچتی ہے اور سب کے آخر مین قلم حرکت کرتا ہے جو مذکورہ صدر تمام امور کے عین مطابق ہے۔ اس لکھنے کے عمل مین جتنے اسباب واقع ہوتے ہین وہ سب ایک دوسرے سے آزاد اور علیحدہ ہین۔ ہر ایک حرکت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ فعل کا تواتر صرف ظاہری اور آنکھ کا دھوکہ ہے۔ مکان و زمان مین جو دنیا قائم اور تباین سے معرا دکھائی دیتی ہے وہ صرف نمائشی ہے۔ انسانی زندگی اور دنیا کی حرکات مین جو ارتباط اور مطابقت نظر آتی ہے اسکی وجہ خاص یہ ہے کہ خدا واقعات کے تسلسل مین خرق عادات سے رخنہ نہین پیدا کرتا ہے۔ جب چاہے وہ اسمین مداخلت کرسکتا ہے اور اسکی ظاہری زندگی کے تواتر مین تناقض اور تضاد پیدا کرنے پر قادر ہے۔

جرمنی عالمون نے عربی کی کئی مشہور علمی کتابون کے ترجمے شائع کئے ہین اور تحقیق و تدقیق کے بعد انکے علمی مسائل کو اپنی

۵ ماخوذ از "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد دوم صفحہ ۲۰۳۔



الور کا سرکاری امام باڑہ

زبان مین مقفل کیا ہے - ایم - شر آئنر برم اسٹائن شنائڈر - دی لرنڈ ڈولاس وٹنر کی کوششین قابل قدر ہین اور اُنکی تصانیف کا مطالعہ ہونا چاہیئے -

باقی آئندہ -

جے - آر - راے

اندور کا محرّم

مسلمانون کے مذہبی تہوارون مین جو بالعموم خوشی کے مواقع شمار کئے جاتے ہین - صرف محرّم ہی ایک ایسا تہوار ہے جس سے ایک دردناک تاریخی واقعہ وابستہ ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس تہوار کے مراسم مین مختلف ملکون اور طبقون کے لحاظ سے جو تفرقہ پیدا ہوگیا ہے اُسکی نظیر بمشکل کسی دور مین مل سکتی ہے - یورپ - ایشیا - ہندوستان - غرضکہ اُن تمام مقامات مین جہان مسلمان آباد ہین رمضان کے روزے اور عید و بقرعید وغیرہ کی تقاریب یکسان طور سے منائی جاتی ہین لیکن محرم کا حال بالکل جداگانہ ہے - اس عشرہ مین جو کیفیت قسطنطینہ مین ہوتی ہے وہ ایران مین نہین ہوتی اور جس طریقہ سے کلکتہ مین ماتم کیا جاتا ہے وہ بمبئی مین ناپید ہے - غرض مذہبی تہوار ہونے کے باوجود اختلاف آب وہوا کیطرح مراسم عشرۂ محرم مین فرق پیدا ہوگیا ہے اور خود ہندوستان کے باشندون کو یہ نہ معلوم ہوگا کہ اُنکے ملک کے مختلف اقطاع مین ایک ہی تہوار ایک ہی مذہب کے راسخ الاعتقاد پیروؤن مین کس کسطرح منایا جاتا ہے - اسی خیال سے ہمین امید ہے کہ ذیل کے سطور کا مطالعہ جو اندور کے محرم کے صحیح حالات پر مشتمل ہین ناظرین کے لئے دلچسپ ثابت ہوگا جس سے اُنھین اس ملک کے باشندون کی طرز معاشرت اور خیالات و عقائد کے متعلق بھی راے قائم کرنے کا سہل ترین ذریعہ ہاتھ آجائیگا -

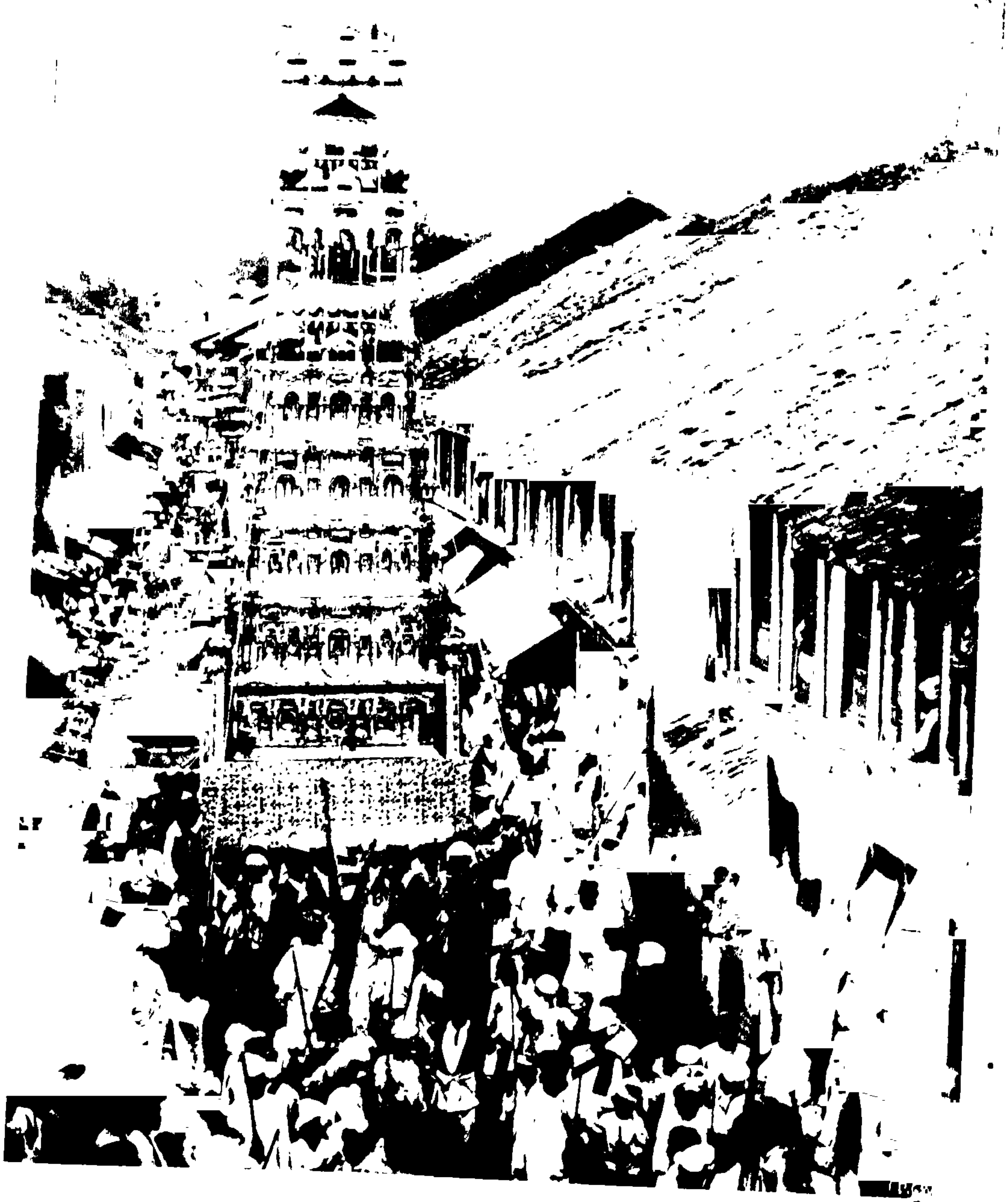
محرم کی چاندرات اندور مین خاص دلچسپی کی چیز ہے - شام سے خلقت کڑھاؤ گھاٹ پر جمع ہونا شروع ہوتی ہے - ندی جو ایک پیچدار راستے سے تقریباً شہر کے وسط مین ہوتی ہوئی نکل گئی ہے اُسکے کنارے آٹھ بجے رات تک خاصہ مجمع ہوجاتا ہے - ہندو مسلمان - امیر غریب ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگ اکٹھا ہوتے ہین اور چوکیان ڈھلنے کا تماشا دیکھتے ہین - کڑھاؤ گھاٹ مچھلی بازار کے محاذی شہر کے جنوبی سمت مین واقع ہے - اس جگہ ایک بند ندی پر بندھا ہوا ہے جسمین موسم برشگال مین آبشار کی سی دلآویزی پیدا ہوجاتی ہے اور بلندی پر سے پانی گرنے کا نظارہ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے - لیکن باوجود اسکے مجموعی حیثیت سے یہ مقام کچھ موزون نہین - نہ زمین ہموار نہ میدان صاف - ندی کا پانی اس جگہ اکثر غلیظ رہتا ہے اور دُور تک تعفن جاتی ہے - سمجھ مین نہین آتا کہ یہ جگہہ کن خصوصیات کی وجہ سے پسند کی گئی ہے - شاید اسوجہ سے ہو کہ زمانۂ قدیم سے اسی جگہہ ایسا ہوتا چلا آیا ہے - خیر

اب کچھ چوکیان دھونے کی کیفیت سُنئے - شہر مین جہان جہان تعزئے رکھے جاتے ہین وہان سے یہ چوکیان آتی ہین جو عموماً چوبی ہوتی ہین - انھین پر تعزیہ کے سامنے لوبان وغیرہ

سناگایا جاتا ہے لیکن تعزیہ رکھنے سے پیشتر انکی نشست و شواس عالیہ ندی کے کنارے ہونا ضروری ہے۔ شام سے ۱۱-۱۲ بجے رات تک چوکیون کے آنے کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ چوکیون پر تعزیہ دار کی ذاتی استطاعت کے مطابق کار چوبی یا ٹین یا کسی اور قسم کا عمدہ کپڑا پڑا رہتا ہے اور اُسکے اندر آتشدانون مین عود و لوبان سلگا کرتا ہے۔ بعض مین عود کی بتیان بھی ہوتی ہین۔ ایک آدمی چوکی کو جسکا عرض و طول تین چار فیٹ سے بشکل زیادہ ہوگا سر پر اُٹھائے رہتا ہے اور اُسکے آگے آگے خصوصیت سے وہ لوگ جنکے گھر کی یہ چوکی ہوتی ہے اور انکے اور عزیز و اقارب اور احباب ہوتے ہین۔ مرثیہ ہوتا جاتا ہے۔ بعض چوکیون کے ساتھ کرتب باز پہلوان یا پھری گدکا والے اکھاڑے ہوتے ہین۔ کڑھاؤ گھاٹ پہونچنے کے بعد ندی کے کنارے رکھکر چوکی دھوئی جاتی ہے۔ دھونا کیا ہوتا ہے گویا شگون کیا جاتا ہے۔ ندی کا پانی جو عموماً صاف نہین ہوتا چلو مین لیکر چوکی پر چھڑک دیا جاتا ہے۔ فاتحہ کے بعد تھوڑی دیر تک مرثیہ کا سلسلہ رہتا ہے اُسکے بعد یہ لوگ جسطرح سے آتے ہین اُسی صورت سے واپس جاتے ہین۔ مختصر یہ ہے کہ سر شام سے نصف شب تک انکا تانتا لگا رہتا ہے۔ سرکاری اور قلعہ کے تعزیون کی چوکیان کسیقدر شان سے آتی ہین اور افواج ریاست اُنکے جلو مین ہوتی ہے میرے خیال مین یہی دو دیکھنے کی چیزین ہین جنکا نظارہ متین و سنجیدہ اشخاص کے لئے بھی غیر موزون نہین کہا جاسکتا۔ لیکن افسوس ہے کہ جمہور میرے خیال کی تائید بشکل کرینگے کیونکہ اُنکے لئے جو غیرت سوز مسرت ارباب نشاط کی چوکیون کے دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے اوّل الذکر مین اُسکا شائبہ تک نہین رہتا۔ طوائفون کی چوکیان عموماً ۸-۹ بجے رات سے آنے لگتی ہین اور اُنکے ساتھ ساتھ وہ خود بھی ہوتی ہین۔ آگے آگے وہ مرثیہ و سلام کا ورد کرتی ہوئی چلتی ہین اور اُنکے اردگرد اُنکے مداح حضرات کا مجمع ہوتا ہے۔ ان لوگون کی حالت خاص طور سے قابل رحم ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت انکے دل و دماغ بالکل مسخ ہوتے ہین اور بھلے بُرے کی تمیز اُنکے لئے غیر ممکن امر ہے۔

چاندرات کو چوکیان دھونے کے بعد تعزیے رکھدئے جاتے ہین۔ چوتھی پانچوین تاریخ تک کچھ زیادہ چہل پہل نہین ہوتی البتہ شہر اور چھاونی کے مختلف مقامات مین مجالس عزا دن رات مین ہوا کرتی ہین۔ کاغذی پورہ کی آبادی مراسم محرم کے حسن عقیدت انجام دینے کے لئے خاص طور سے ممتاز ہے۔ چنانچہ پہلی تاریخ سے آخر تک یہان مجلسین برپا ہوتی رہتی ہین اور راتون کو شب عاشورہ تک تعزیے اور روشنی دیکھنے کے لئے وہان آدمیون کا ہجوم رہا کرتا ہے۔ کاغذی پورہ کے علاوہ شہر کے اور کئی محلّون مین بھی تعزیے اور بُراق رکھے جاتے ہین۔ چکلے مین جسکی نوعیت اُسکے نام ہی سے ظاہر ہوتی ہے کئی ایک تعزیے بُراق اور بیلین ہوتی ہین جنمین سے اکثر خاص اُسی مبتذل فرقہ کے جانب سے ہوتی ہین جسکا وجود اخلاقی حیثیت سے تمام ہندوستان کے لئے قہر خدا سے کم نہین طوائف اپنے تعزیون کے پاس موجود رہتی ہین اُنکے دو ایک احباب پہلو دبائے بیٹھے ہوتے ہین اور سڑک پر شائق نظارگیون کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوتے ہین۔

اندور کے تعزیے باستثنار سرکاری و فوجی تعزیون کے قد و قامت مین بہت مختصر ہوتے ہین بلکہ سچ یہ ہے کہ مین نے اسقدر چھوٹے تعزیے کہین نہین دیکھے۔ صوبجات متحدہ وغیرہ مین اکثر منّت کے جو چھوٹے تعزیے چڑھائے جاتے ہین۔



اندور کا سرکاری تعزیہ

انڈین پریس الہ آباد

اندور مین اُسنے کہین مختصر تعزیئے ہوتے ہین- لیکن اسمین شک نہین کہ انمین ایک حد تک دستکاری نفیس کیجاتی ہے اور اپنی ننھی سی جسامت کے ساتھ دلچسپ نظر آتے ہین- کاغذی پورہ کے تعزیے بہ لحاظ نفاست کے اول درجہ پر ہوتے ہین- بُراق بھی ایک حد تک قابل تعریف ہوتے ہین اور اکثر خوش عقیدہ لوگ اُنھین قیمتی زیورات سے آراستہ کرتے ہین-

چھتری باغ کے دروازہ کے مقابل دو عظیم الشان کاغذی گھوڑون کا نظارہ پُر لطف ہے- بظاہر کام مین کچھ ایسی زیادہ صفائی نہین ہوتی لیکن بازیچہ پسند طبیعتون کے لئے انکا کم از کم ایک دفعہ دیکھ لینا ضروری ہے- یہ قدآور (ہاتھی سے بھی زیادہ لحیم) گھوڑے اُسوقت اور زیادہ پُرلطف تماشا بن سکین گے- اگر اضافۂ جسامت کے ساتھ بنانے والے تناسبِ اعضا کا اصول نظر انداز نہ کرین- ہندوستانی اور یورپین صناعون مین یہی فرق ہے کہ موخرالذکر کی نقل پر بھی سرسری نظر سے اصل کا دھوکا ہوجاتا ہے اور ہمارے یہان اسکا خیال نہین کیا جاتا- مثال کے طور پر انگریزی اور ہندوستانی کھلونون کو دیکھ لیجئے- اگر ہندوستانی دستکار اس راز کو سمجھ لین تو یہان کی دستکاری کو فروغ ہونے کے علاوہ خود اُنکی مالی حالت بہت کچھ درست ہوسکتی ہے-

سرکاری اور فوجی تعزیون کا ذکر ابھی باقی ہے- سرکاری تعزیہ ریاست کے اخراجات سے تیار کیا جاتا ہے اور اسکے لئے محل قدیم کے عقب مین گوپال مندر کے محاذی ایک امام باڑہ بنا ہوا ہے جسکی تعمیر سنگی چوگوشہ عمارت دورِ جدید کی یادگار ہے- مکانیت کچھ ایسی زیادہ نہین تاہم ضرورت کے مطابق گنجائش بہت ہے- ہر سیاح کے دل مین امام باڑہ دیکھکر اس بات کی تفتیش کا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اسکے چارون گوشون پر جو مینار ہین اُنمین شمالی و مشرقی کونے والا باقی تینون منارون سے غیر موزونیت کے ساتھ کیون زیادہ بلند رکھا گیا ہے- مین نے اکثر احباب سے اسکی بابت دریافت کیا مگر کسی سے یہ معما حل نہین ہوا-

سرکاری تعزیہ مخصوص اشخاص کی نگرانی مین تیار ہوتا ہے- اس امام باڑہ کے اخراجات کی کفالت ریاست کے خزانہ سے ہوتی ہے اور یہان کے انتظام وغیرہ کے لئے معقول بندوبست کیا جاتا ہے- تعزیہ چونکہ بہت بلند اور ارتفاع کی مناسبت سے طویل و عریض ہوتا ہے اسوجہ سے اُسکی تیاری مین وقت کے ساتھ محنت و کوشش بھی پوری پوری صرف ہوتی ہے- پہلی تاریخ سے امام باڑہ کھلتا ہے اور بیسیون اشخاص کی شبانہ روز محنت و سعی سے تعزیہ وقت مقررہ پر تیار ہوتا ہے- تعزیہ مین علاوہ گنبد کے آٹھ یا نو کھنڈ ہوتے ہین- ہر کھنڈ کو بجائے خود ایک بڑا تعزیہ سمجھنا چاہئے- جب اسکے کل ٹکڑے ملا دئے جاتے ہین تو تعزیہ نہایت اونچا ہوجاتا ہے- امام باڑہ اسقدر بلند نہین کہ پورا تعزیہ اُسمین آسکے- اُسکے اندر جُدا جُدا ٹکڑے بنائے جاتے ہین- نوین کی رات اور دسوین کے دن کو وہ باہر مکمل حیثیت مین رکھا جاتا ہے- فرمانروایان ہلکر کا محل قدیم جسکو "جونا باڑہ" کہتے ہین بہت بلند واقع ہوا ہے- لوگ کہتے ہین کہ پیشتر تعزیہ اسکے برابر بنایا جاتا تھا- اب اسقدر اونچا تو نہین ہوتا تاہم بحالت موجودہ بھی دیکھنے والون کے لئے وہ عجیب چیز ہے- اندور کے اور تعزیئے جسقدر چھوتے ہوتے ہین اُتنا ہی یہ بڑا ہوتا ہے- گویا اُنکی تمام کمی یہ پوری کرتا ہے-

قلعہ کا تعزیہ جو فوج کی جانب سے تیار ہوتا ہے-

سرکاری تعزیہ سے کسیقدر پست ہوتا ہے لیکن بالکل اسی کے نمونے پر بنایا جاتا ہے۔ اسمین [illegible] گھنٹے ہوتے ہین - ان دونون تعزیون کے بندون مین کوئی نہ کوئی خاص صنعت بھی رکھی جاتی ہے۔ مثلاً اب کی دفعہ یہ تھا کہ چلتے چلتے گنبد غنچہ کیطرح کھل کر پھول کی صورت کشادہ ہوجاتا اور اسمین سے ایک خوبصورت مور نمودار ہوتا تھا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد پھر بند ہوجاتا تھا۔

نوین تاریخ تک محرم کی چہل پہل چندان زیادہ نہین ہوتی۔ ہان دسوین مین تماشائیون کا ہجوم سرکاری تعزیے کے پاس چبکلے اور کاغذی پورہ مین ہوتا ہے۔ سرکاری امام باڑہ پر روزانہ گلاس کنول کی خوشنما روشنی کیجاتی ہے۔ اسکی سیر کے لئے بھی خلقت کثرت سے جمع ہوتی ہے۔ امام باڑہ کے دروازے پر فوج اور پولیس کا پہرہ رہتا ہے۔ لیکن فاتحہ درود کی غرض سے اندر جانیکی اجازت ہے۔ وہان مین شیرون کی چیخ پکار سے محرم معلوم ہوتا ہے۔ شیر اصلی نہین بلکہ مصنوعی۔ ممالک متوسط۔ مالوہ اور دکن مین منت کے شیر بننے کا بہت رواج ہے۔ نوعمر لڑکون سے لیکر معمّر اشخاص تک محرم مین "جنگل کے بادشاہ" کا قالب اختیار کرنے کے عادی ہین۔ مختلف رنگون سے جسم کی آرائش کیجاتی ہے۔ ستر پوشی کے لیے صرف ایک عرقی رہتی ہے باقی برہنہ۔ بدن پر دھاریان بناکر شیر کے پوستین کی نقل اُتاری جاتی ہے۔ ہاتھون اور گردنون مین لوہے کی زنجیر پڑی ہوتی ہے۔ بازوؤن پر مور کے پر بندھے ہوتے ہین اور یہ محرمی شیر سڑکون پر اُچھلا کودا کرتے ہین۔ انکے پیچھے دف بجا کرتا ہے اور لوگ انکا تماشا دیکھنے کی غرض سے اردگرد جمع رہتے ہین۔ ممالک متوسط مین بعض شیرون کے متعلق سنا گیا ہے کہ اکثر چھوٹے چھوٹے بکرے مُنہ یا پنجے مین دبائے رہتے ہین۔ ایک دوست نے اسکی بابت عینی شہادت دی ہے کہ شیرون کے ہاتھ مین آہنی خاردار پنجے ہوتے ہین جس سے وہ غریب بیکس بکرے کی گرفت بہ آسانی کرسکتے ہین۔ تعجب ہے کہ اس زمانے مین بھی ان قبیح وظالمانہ رسوم کا وجود پایا جاتا ہے۔

محرم مین فقیر بننے کی رسم ہندوستان مین عام ہے لیکن اندور مین اسکی بیحد کثرت ہے۔ شاید دوسرے مقامات مین فقیری کا طریقہ صرف یہی ہے کہ آدمی کسی درگاہ یا تعزیے کے پاس جاکر شیرینی وغیرہ چڑھاکر بازو پر دھاگا یا سبز کپڑا بندھوا لیتا ہے اور بھیک مانگنے کے لئے اپنے قریبی عزیزون کے گھر جاتا ہے - اندور مین محرم کے فقیر اُلجھے ہوئے کلابتون کے لچھے سر پر لپیٹے اور مختلف رنگ کے کپڑے زیب تن کئے ہاتھون مین ڈنڈا یا اسی قسم کی چیزین لئے عام شاہراہون اور گذرگاہون پر پھرا کرتے ہین۔ اکثر ان لوگون کے پاس خالی کدو ہوتا ہے جسمین کنکر پڑے رہتے ہین - یہ لوگ جب کسی ناواقف اجنبی شخص کو دیکھتے ہین کہ بے خبر ہے تو اُسکے کانون کے پاس اسے لیجاکر زور سے حرکت دیتے ہین کہ وہ چونک اُٹھتا ہے۔ بعض کے پاس ایک بڑی سی لکڑی جسے مختصر سا شہتیر کہنا چاہیے ہوتی ہے۔ لیکن نہایت ہلکی - یہ لوگ اسکو اجنبی آدمی کے اوپر اسطرح اُٹھاکر پھینکنے کا قصد کرتے ہین کہ وہ چوٹ لگ جانے کے خیال سے کبھی بھاگتا ہے اور کبھی خوفزدہ ہوکر چیخنے لگتا ہے۔ لیکن لکڑی نہ اُس تک پہونچتی ہے نہ اُسے کوئی صدمہ پہونچتا ہے - اسی قسم کی اور خفیف الحرکاتیون سے مجمع مین دلچسپی پیدا کیجاتی ہے اور دیکھنے والون کے قہقہے اُس غریب کی پشیمانی وخفت کو اور بڑھا دیتے ہین۔

ہندوستان کے دوسرے حصص کے برخلاف یہان صرف نوین کی شب کو تعزیے اُٹھائے جاتے ہین۔ کاغذی پورہ کے سوا تمام شہر کے تعزیے جو آباڑہ کے سامنے والے پُرفضا چوک مین جمع کئے جاتے ہین۔ سرکاری اور قلعہ کے تعزیے دونون اس شب کو دھوم دھام سے اُٹھتے ہین اور باڑہ کے گرد سات چکر لگاکر اپنے مقررہ مقامات پر چلے جاتے ہین۔ تعزیون کے ساتھ افواج ریاست جلو مین ہوتی ہے۔ نشان کا ہاتھی سب سے آگے اور اُسکے پیچھے پیدل اور سوارون کا ایک دستہ ہوتا ہے اور اُسکے بعد تعزیہ جسکی محافظت کے لئے پولیس کے تنومند و طویل القامت کانسٹیبل اُسکے اطراف مین موجود رہتے ہین۔ سو پچاس مزدور بانسون کی مدد سے تعزیے کو اپنے کندھون پر لئے رہتے ہین اور تا وقتیکہ ساتون چکر ختم نہ ہوجائین زمین پر نہین رکھتے۔ تعزیے کی مضبوطی کا اندازہ کسیقدر اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اُسکے ابتدائی دو تین کھنڈون پر دونون جانب آدمی کھڑے مورچھل جھلا کرتے ہین۔ سرکاری تعزیے کے پیچھے قلعہ کا تعزیہ ہوتا ہے۔ باڑہ کے طواف کے بعد اوّل الذکر امام باڑہ کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور دوسرا قلعے مین چلا جاتا ہے۔ باقی رات بھر اُسی چوک مین رکھے رہتے ہین۔

غرضکہ شبِ عاشورہ کو محل قدیم کے سامنے خلقت کا بڑا ہجوم رہتا ہے۔ اکثر یورپین حکّام بھی بسواری فیل سیر کی غرض سے تشریف لاتے ہین۔ شام سے لیکر تین بجے رات تک مجمع قائم رہتا ہے۔

اسی شب کو کاغذی پورہ مین بھی نہایت دھوم ہوتی ہے اور تماشائیون کی یہ کثرت ہوتی ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔ لب سڑک کشادہ برآمدون مین تعزیے رکھے رہتے ہین۔ روشنی کا اہتمام معمولی طور پر اچھا ہوتا ہے۔ ایک مختصر سے میدان مین کھلونون۔ مٹھائی پان اور سگرٹ کی چھوٹی چھوٹی دوکانین رکھی جاتی ہین۔ چار پانچ جھولے کرایے ہوتے ہین جنپر ایک پیسہ دیکر چھوٹے بڑے سب جھول سکتے ہین۔

آجکی رات آپ کو سڑکون پر بہت سے ایسے گروہ ملین گے جنکے آگے ایک تنومند شخص ڈنڈا ہاتھ مین لئے پینترے بدلتا اُچکتا ہوا اور زبان سے کوئی فقرہ کہتا چلا جارہا ہے۔ اُسکے پیچھے ہمراہی بھی اُسی چال سے رواں دواں ہین اور اپنے مقتدی اسکے آخری الفاظ کی ہم آہنگی کررہے ہین۔ ان لوگون کا زور شور حیدرآباد مین بہت ہے۔ وہان تو جب اس قسم کے دو گروہ آمنے سامنے آجاتے ہین تو بعض وقت گتھم گتھا کی نوبت پہونچ جاتی ہے اور پولیس کو حفظ امن کے لئے بہت کوشش کرنا پڑتی ہے۔

نوین کی شب کا ہنگامہ ختم نہین ہونے پاتا کہ دسوین کی صبح نمودار ہوتی ہے۔ غور کرنے کی جگہ ہے کہ یہ صبح کن دردانگیز واقعات کی یادگار ہے۔ کوئی مسلمان ایسا ہوگا جو جگر گوشہ رسول برحق صلعم کے مصائب کو یاد کرکے خون کے آنسو نہ بہائے۔ لیکن آہ ہماری عقلین اندھی ہوگئی ہین اور ہم مین اس بات کی تمیز کرنے والا اب کوئی نہین رہا کہ محرم کے زمانے مین ہم جن مراسم کی پابندی کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہین وہ کہانتک اسلامی شان کے منافی ہین۔ آج کا دن سوگ اور ماتم کا ہے لیکن غائر نگاہ سے دیکھئے تو اب مسلمان محرم کو عید سے کم نہین سمجھتے۔ تمام ہندوستان کا ایک حال ہے۔ جب تعلیم یافتہ

اور مہذب صوبجات اسی مزمن مرض مین گرفتار ہین تو اندور کے مسلمانون سے کیا شکایت ہو سکتی ہے جہان تعلیم و تہذیب کا ابتدائی زمانہ ہے -

لکھنؤ[له] - دہلی - آگرہ - حیدر آباد کیطرح اندور مین بھی دسوین کو سویرے ہی سے غیر معمولی جوش و خروش ہوتا ہے - چھوٹے لڑکے - عورتین اور مرد سب حسب استطاعت نئے نئے کپڑون اور زیورات سے آراستہ پیراستہ ہوکر تعزیون کے جلوس اور کربلا کے آخری سین کا نظارہ کرنے کی غرض سے تیار ہوجاتے ہین - دس گیارہ بجے تک جونا باڑہ کے اردگرد اور امام باڑہ کے سامنے کثیر مجمع ہوجاتا ہے - ۱۲ بجے کے قریب سرکاری تعزیہ امام باڑہ سے اٹھتا ہے - فوجی تعزیہ اس سے پہلے یہان پہونچکر اسکے ساتھ ہوجاتا ہے - دوسرے محلون اور مان منت کے وہ تمام تعزیے جو رات کو باڑہ کے سامنے جمع ہوئے تھے اسکے پیچھے ہوتے ہین اور جو شان و اہتمام رات مین تھا وہی دن مین بھی رہتا ہے - جونا باڑہ سے آڑے بازار ہوتے ہوئے ہر سدّی کی رپٹ کے ذریعہ سے ندی طے کرکے قریب شام یہ جلوس کربلا کے میدان مین پہونچتا ہے -

میدان کربلا شہر کے جنوبی آبادی کے بالکل آخری حصے پر واقع ہے - یہ ایک مسطح و پُرفضا مقام ہے - بائین سمت ایک باغیچہ ہے - جنوب مین ندی ہے جسمین تعزیے دفن ہوتے ہین - نالے کے اسطرف ایک بلند ٹیلہ ہے جسکی سبز و شاداب گھاس اور جھاڑی آنکھون مین خنکی پیدا کرتی ہے -

تعزیون کا جلوس پہونچنے سے پہلے ہی لوگ یہان جمع ہوجاتے ہین - کاغذی پورہ کے تعزیے براہ راست ۱۲ بجے سے آنے لگتے ہین - میدان مین دو طرفہ ہر طرحکی دوکانین لگی رہتی ہین - یکے - بگھی - تانگے - بائیسکلین ان سب کا شمار ہزارون تک پہونچتا ہے - داہنے طرف کا میدان بیل گاڑیون سے بھرا رہتا ہے جنمین عورتین سوار ہوکر آتی ہین - باغیچہ مین جسکا ذکر اوپر ہوا شرفاء کی مستورات تشریف فرما ہوتی ہین - لیکن افسوس ہے کہ یہان اجنبیون کا داخلہ ممنوع نہین - ہمارے خیال مین عورتون سے زیادہ وہ مرد قابل ملامت ہین جو پردہ نشین مخدرات کو تماشا کی غرض سے لاتے ہین اور تماشا بنا دیتے ہین -

تعزیون کا جلوس جب اپنے معمولی تزک و احتشام سے میدان مین پہونچتا ہے تو یہان کی چہل پہل اور زیادہ ہوجاتی ہے اور ۹ - ۱۰ بجے رات تک یہی حال رہتا ہے - چھوٹے چھوٹے تعزیے تو آج ہی دفن کردئے جاتے ہین لیکن بڑے تیجے کے دن تک اس جگہ رکھے رہتے ہین -

تیجے کے دن کوئی خاص بات قابل تذکرہ نہین ہوتی - دسوین تاریخ کیطرح آج بھی کربلا مین کثیر مجمع ہوتا ہے اور معمولی رسوم ادا کیجاتی ہین - پھر دوپہر رات تک آدمیون سے جگہ گلزار رہتی ہے اسکے بعد دیکھتے دیکھتے ہو کا عالم ہوجاتا ہے -

سیّد محمد فاروق

له لکھنؤ مین کئی سال سے عشرہ کی دھوم دھام موقوف ہوگئی ہے اور اس بارے مین اصلاح کا سلسلہ مین سے شروع ہوا ہے - ایڈیٹر

نمائش ممالک متحدہ

ماہ دسمبر ۱۹۱۰ء کے **ادیب** مین ایک مضمون نمائش ممالک متحدہ کے باب مین شائع ہو چکا ہے۔ وہ مضمون اُسوقت لکھا گیا تھا جبکہ نمائش کی کل اشیا۔ تقریباً بے ترتیب تھین جب کرسمس کے ہفتے مین ہمنے پھر نمائش کی سیر کی تو بہت سی نئی چیزین دیکھنے مین آئین۔ اُسکے بعد بھی کئی بار نمائش کی سیر کی۔ اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن قابل الذکر اشیا کا بھی ذکر کیا جائے جو اول مضمون مین مذکور نہین ہوئین۔

(۱) منجملہ دیگر قابل دید اشیا کے نمائش مین وائرلیس ٹیلیگرافی (بے تار کا سلسلۂ پیغام رسانی) کے آلات بھی نمایان کئے گئے ہین۔ اسکا طریق یہ ہے کہ جب تار دیتے ہین تو بجلی کی ایک تیز آواز نکلتی ہے۔ عمارت کے باہر ایک بڑا ستون کھڑا کیا گیا ہے۔ بجلی کی رو تارون کے ذریعے سے اُس ستون مین آتی ہے، اس ستون سے اُس ایتھر مین جنبش ہوتی ہے جو آواز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتا ہے۔ جسطرح پانی کے اندر کوئی چیز پھینکنے سے لہرین چارون طرف نکلتی اور پھیل جاتی ہین اسیطرح ایتھر کے سمندر مین جو ہمارے ہر چہار طرف پھیلا ہوا ہے، برقی رو کی جنبش سے لہرین پیدا ہوتی اور پھیل جاتی ہین۔ جتنا بلند یہ کھمبا ہوگا، اُسی نسبت سے اِن لہرون کے دور چلے جانے کی اُمید ہے۔ اگر ستون بلند ہو تو خبر دنیا کے تمام حصّون مین پہونچ سکتی ہے۔

جب یہ لہرین پیدا ہو جاتی ہین تو بے تار برقی کا کام انکو ایک خاص مرکز پر جمع کرنا ہے۔ یہ کام ایک آلہ کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ جب یہ باریک اور غیر محسوس لہرین اُس آلہ پر لگتی ہین تو اُسکو جنبش ہوتی ہے۔ باہر ویساہی یک ستون کھڑا ہوتا ہے، اُسپر یہ لہرین جاکر ٹکراتی ہین، اور پھر وہان سے ہوکر خاص اُس آلہ تک پہونچتی ہین جسمین جنبش ہوتی اور آواز نکلتی ہے۔ اسی طریقہ سے خبر بلا کسی تار یا سلسلہ کے ہزارون میل دور چلی جاتی ہے امریکہ و یورپ کے درمیان اسوقت یہ سلسلہ قائم ہے اور ہندوستان مین بھی عنقریب اسکو رائج کیا جائیگا۔

(۲) حال مین محکمہ تار مین ایک ایسی ایجاد ہوئی ہے جسکی بدولت وہ خبرین جو ایک مقام سے دوسرے مقام کو بھیجی جاتی ہین، تار بابو ہاتھ سے نہین لکھتے بلکہ ایک ایسا آلہ لگا ہوا ہے جسکے ذریعہ وہ خبرین خود بخود کاغذ پر لکھی جاتی ہین۔ یہ اسطرح ہے کہ آلہ تار مین ایک فیتہ لگا ہوا ہے جو خود بخود کھنچا چلا آتا ہے اور اسپر جو خبر دی جاے وہ چھپتی جاتی ہے۔ گویا ایک ایک حرف کی آواز کو جو تار بابو سمجھکر کاغذ پر اُتارتا تھا، اسکی بجاے یہ فیتہ خود بخود لیتا آتا ہے۔ تار بابو کا کام صرف اس فیتہ کو ایک کاغذ پر جماکر مکتوب الیہ کے پاس بھیجدینا ہے۔ تار دینے کے لئے حرف کے نشان مقرر ہین جنکے مختلف تال میل سے کل حروف بنجاتے ہین، اسی طرح آلہ تار مین بھی لکھے جاتے ہین۔ فرق صرف یہ ہے کہ ٹائپ رایٹر مین حروف اسی جگہہ لکھے جاتے ہین اور آلہ تار مین یہ بہت دور دراز فاصلہ پر لکھے جاتے ہین۔ اصول ایک ہی ہے۔

(۳) ڈاک خانہ کی ایک نئی ایجاد۔ اُس عمارت مین

بو ڈاک خانہ کی پیدائش کی نمائش کے لئے مخصوص ہے۔ ایک نوایجاد قفل پیش کیا گیا ہے جس کی موجودگی میں اُن خطوط کی چوری کا احتمال نہ ہوگا جو لیٹر بکس سے ڈاک کے چپراسی نکال لیا کرتے تھے۔ ایسی چوریاں صرف ٹکٹ اُکھاڑ لینے کی غرض سے کیجاتی تھیں۔ اب ایسا نہیں ہوسکیگا۔ یہ قفل ایک تھیلے کے منہ پر لگتا ہے۔ دوسری طرف پوسٹ ماسٹر تھیلے کے منہ کو بند کرکے اُسپر مہر لگا دیتا ہے۔ اور بعد قفل کے اسکو اپنے پاس کی کنجی سے کھول دیتا ہے۔ چپراسی جاکر اسکو لیٹر بکس کے منہ کے اندر پہنا دیگا۔ اب جو خطوط لوگ ڈالین گے وہ سب تھیلے مین گرینگے۔ جب چپراسی جاکر اسکو وہان سے کھینچیگا تو اسکے ساتھ ہی وہ قفل بھی بند ہوجائیگا جسکو صرف پوسٹ ماسٹر ہی اپنے پاس کی کنجی سے کھول سکیگا۔ ایک اور خوبی اسمین یہ بھی رکھی گئی ہے کہ جونہی وہ تھیلے کو کھینچیگا نہ صرف تھیلے کا منہ بند ہوجائیگا بلکہ لیٹر بکس کا منہ بھی بند ہوجائیگا تاکہ اسمین کوئی چٹھی نہ ڈالی جاسکے۔ جب دوسرا تھیلا اُسی انداز سے وہان لگایا جائیگا تو لیٹر بکس کا منہ پھر کھل جائیگا۔

(۴) بجلی کے دلچسپ تماشے۔ اوپر مذکور ہوچکا ہے کہ بلا تار برقی سلسلہ کسطرح کام کرتا ہے۔ ایک برقی کل رکھی ہوئی ہے جسکے وسط مین ایک طاقچہ ہے جسپر ایک آئینہ لگا ہوا ہے۔ یہان بے تار کی تار برقی کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے اور یہہ دکھایا جاتا ہے کہ کسطرح بجلی بغیر کسی درمیانی سلسلہ کے ایک جسم سے دوسرے جسم مین داخل ہوجاتی ہے اور کسطرح ایک جگہہ سے دوسری جگہہ تک برقی لہر بھیجی جاسکتی ہے۔ انجنیر نے سب سے پہلے شیشے کی نلی لیکر کچھ فاصلہ سے اس طاقچہ کے سامنے کی تو اس طاقچہ کے اندر اس زور سے بجلی کی چمک اور کڑک ہوئی گویا بجلی ابھی طاقچہ کے شیشے کو توڑ کر نکلی آتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی اُس شیشے کی نلی مین بھی ایک چمک پیدا ہوگئی اور اُسکے اندر بھی بجلی اُسی طرح مضطرب نظر آتی تھی جیسے طاقچہ کے اندر۔ اُسکے بعد ایک چھوٹا سا لیمپ طاقچہ کے روبرو لایا گیا تو وہ خودبخود روشن ہوگیا اور جبتک طاقچہ کے سامنے رکھا رہا روشن رہا۔ جب اسکے سامنے سے ہٹایا گیا تو گل ہوگیا۔ ایک اور تجربہ دکھایا گیا یعنی یہ کہ لوہے کی دو سلاخون کو بجلی کی قوت سے نصف منٹ مین اسطرح جوڑ دیا گیا گویا وہ ایک ہی تھین۔ کمرے کے باہر ایک بلند ستون استادہ کیا گیا ہے جسپر برقی قمقمے اسطرح لگائے گئے ہین کہ اُنسے لفظ TELEGRAPH بن گیا ہے یہ حروف کبھی سُرخ ہوجاتے ہین، کبھی سبز اور کبھی سفید، مگر ایک ساتھ نہیں بلکہ یکے بعد دیگرے رنگ بدلتے ہین۔ کئی انگریزی کارخانون نے بھی ان برقی قمقمون سے ایسا ہی کام لیا ہے۔

اُس ستون کے قریب ہی ایک فوارہ ہے جو برقی قوت سے پانی اُچھالتا ہے۔ یہ اسطرح بنایا گیا ہے کہ ایک بڑا دائرہ ہے جسکا قطر تقریباً چار گز ہے۔ اسکے اندر اور بھی چھوٹے چھوٹے دائرے ہین اور ان سب دائرون مین مختلف رنگ کے فوارے چھوٹتے ہین جو کم از کم بیس پچیس ۲۵ گز کی بلندی تک جاتے ہین۔ خوبی یہ ہے کہ جو فوارہ ابھی سُرخ ہے وہ ایک لمحہ مین سبز ہوجاتا ہے، اسیطرح یکے بعد دیگرے کئی رنگ بدلتا ہے۔

(۵) جس جگہہ سنگر کمپنی نے اپنی مشینین رکھی ہین، وہان ایک نقلی بوڑھی عورت بجلی کی قوت سے سلائی کر رہی ہے۔

کوئی نہین کہہ سکتا کہ وہ عورت اصلی نہین ہے، اس کے چہرے پر جھرّیان پڑگئی ہین، آنکھون پر چشمہ لگا ہوا ہے، اور بجلی کی قوت سے کچھ کچھ گردن بھی ہلتی ہے، جو پیری کی علامت ہے۔ ہاتھ مشین چلانے مین مشغول ہے اور انکھین کپڑے پر جمی ہوئی ہین جسمین بخیہ ہوتا جاتا ہے۔

(۶) موسمی بخار اور مچھر۔ اس امر سے سب لوگ واقف ہین کہ نئی تحقیقات سے، بوجب ملیریا بخار ایک قسم کے کیڑون کے ذریعہ سے پھیلتا ہے جو خون کے اندر نشو و نما پاتے ہین۔ یہ کیڑے مختلف رنگ اور قد کے ہوتے ہین۔ مگر ملیریا بخار کی اصل وہ مچھر ہین جو ان کیڑون کو ایک انسان سے دوسرے انسان تک پہونچاتے ہین۔ محققین نے مچھرون کے سیکڑون اقسام دریافت کئے ہین۔ اس نمائش مین بھی بہت سی قسمین پیش کی گئی تھین۔ انسان کے ساتھ ہی وہ مچھلیان بھی دکھائی تھین جو ان مچھرون کے بچّون کو کھا جاتی ہین جبکہ مادہ انھین پانی پر چھوڑ دیتی ہین۔

(۷) تپ دق کے متعلق بھی بہت سی معلومات اس نمائش مین موجود تھے۔ پھیپھڑون کی مختلف حالتون کو تصویرون اور نقشون کے ذریعہ دکھایا گیا ہے۔ یہ بات بھی ظاہر کیگئی ہے کہ کسطرح ہندوستان تپ دق سے تباہ ہورہا ہے۔ مثلاً مردون کی بہ نسبت عورتون کو یہ مرض زیادہ ہوتا ہے۔ اور ہندو مستورات کے مقابلہ مین مسلمان عورتین زیادہ اسکا شکار ہوتی ہین۔ مثلاً کلکتہ مین تین فیصدی ہندو عورتین تپ دق سے مرتی ہین اور مسلمان عورتین ۳۰ فیصدی۔ اسکی وجہ اسکے سوا کچھ اور نہین ہوسکتی کہ مسلمان عورتون کو عموماً کھلی ہوا سے محروم رکھا جاتا ہے۔

(۸) تپ دق کے معلومات کے ساتھ ہی ایسی مکھیان بھی رکھی ہوئی ہین جو ایک شخص کے سر سے نکلی تھین۔ یہہ عام مکھیون کے برابر ہین۔ اسکی کیفیت اسطرح ہے کہ جب ناک کو ئی زخم ہو، یا غلاظت ہو تو مکھیان آکر بیٹھتی ہین اور کبھی کبھی انڈے دے دیتی ہین۔ اور جب صفائی نہین ہوتی تو انڈون سے بچے نکلکر آہستہ آہستہ دماغ مین پہونچ جاتے ہین۔ ذرا سی بے احتیاطی سے ہزارون جانین آئے دن اسی قسم کی بیمارون سے ہلاک ہوتی ہین۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اہل ہند حفظان صحت کے اعلیٰ اصول سے واقف ہون اور انکو عمل مین لائین۔ نیند کی بیماری (Sleeping Sickness) پلیگ اور چیچک کے متعلق بھی مفید معلومات نمائش مین موجود تھین۔

(۹) ایکسریز (X—rays) زمانۂ حال کی یہ ایک نہایت دلچسپ اور کارآمد ایجاد ہے۔ یہ ایک قسم کی شعاعین ہین۔ اس روشنی کے سامنے اگر کسی شخص کی تصویر لی جائے تو کُل اندرونی کیفیت ظاہر ہوجاتی ہے یعنی ہڈیان وغیرہ تصویر مین نظر آتی ہین۔ بجلی کی تیز شعاعین ہر چیز کے اندرونی حصے کو ظاہر کردیتی ہین۔ ایکسریز کی مدد سے بہت سے جلدی امراض کا علاج بھی ہونے لگا ہے۔ دہرہ دون کی ایکسریز انسٹی ٹیوشن نے جو اوزار وغیرہ نمائش مین بھیجے ہین انکو باسانی ہر جگہ لڑائی مین لے جاسکتے ہین۔ اگر جسم مین گولی گھس جائے تو فوراً معلوم ہوسکتا ہے کہ گولی جسم کے کس حصہ مین ہے۔

(۱۰) ہندوستان مین جلانے کی لکڑی روز بروز گران ہوتی جاتی ہے۔ اسلئے محبان وطن کا مدت سے یہ خیال تھا کہ اگر کوئی ایسا چولھا بن سکے جسمین کوئلہ بھی کم خرچ ہو تو اس سے دو فائدے ہونگے۔ اول تو یہ کہ ایندھن کی گرانی محسوس نہوگی

دوم یہ کہ ہزارہا ہندوستانی برسرروزگار لگ جائین گے اور کوئلہ کی کالون پر تنگی بڑھ جائیگی۔ اس نمائش مین چولھون کا مقابلہ بھی کیا گیا۔ کلکتہ کے انگریزی سوداگران مسرز اینڈریو یول اینڈ کمپنی کے ایک حصہ دار مسٹر ڈیوڈ یول نے ایک ایسا بہترین چولھا بنانے والے کو جسمین کوئلہ استعمال کیا جاسکے ایک ہزار روپیہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ بہت سے لوگون نے اپنی دماغی قوت کے زور سے چولھے بنائے اور ۲۸ جنوری کو ان سب کا مقابلہ ہوا۔ ۲۲ چولھے مقابلہ کیلئے پیش ہوئے جو ہندوستان کے تمام حصص سے آئے تھے۔ مگر سب سے بہترین چولھا الہ آباد کے ایک میکنیکل انجنیر مسٹر سی ڈی ہالی کا ثابت ہوا اور انکو ایک ہزار روپے کا انعام مسٹر یول نے اسی وقت دیدیا۔ اس چولھے مین چار پونڈ ۱۲ اونس (دو سیر) کوئلہ ڈھائی گھنٹے تک جلتے رہے اور ان پر چھ قسم کا کھانا پکایا گیا جسمین کئی قسمین کی چپاتیان بھی تھین۔ اس قسم کے بڑے متوسط اور چھوٹے چولھے کی قیمت علی الترتیب ۱۲/۵ ، ۸ اور ۵ روپیے ہے۔ اسکے علاوہ دوسرے درجہ پر کانپور کی امپائر انجنیرنگ کمپنی کا چولھا تھا جسکو غازیپور کے لالہ بیجناتھ داس نے برنجی تمغہ کا خاص انعام دیا۔ دو اور چولھون کی بھی تعریف کی گئی۔

(۱۱) طبقہ فنون لطیفہ اور تعلیمی کورٹ مین چند نایاب قلمی کتب رکھی ہوئی ہین۔ انمین ایک مہابھارت ہے جو سنسکرت زبان مین ہے۔ اسکو ۱۶۹۲ء مین ایک کشمیری نے لکھا تھا۔ اسکی قیمت پچاس ہزار روپیہ ہے۔ مہابھارت کی ایک اور جلد ہے جسکی قیمت دس ہزار روپیہ ہے۔ قرآن کی بھی ایک قیمتی جلد رکھی ہے جسکی قیمت کئی ہزار روپیہ ہے۔ شاہنامہ کی متعدد جلدین نمائش مین رکھی گئی ہین۔ انکی قیمت بھی کئی کئی ہزار روپیہ ہے۔ ایک لطیفون کی کتاب بھی قلمی رکھی گئی ہے، اسکو کسی مسلمان نے لکھا تھا۔ اسکی قیمت بیس ہزار روپیہ مقرر کی گئی ہے۔ قلمی کتب مین خاص چیز تصویرین ہین، اور انھین کے لحاظ سے اُن کی قیمتین مقرر کی گئی ہین۔

(۱۲) طبقہ صنعت و حرفت مین واس کمپنی نے اپنے تیار کردہ قفل بھیجے ہین جو بہت عجیب وغریب ہین۔ ان مین سے ایک قفل کی قیمت ۲۵ روپیہ ہے۔ اسمین یہ خوبی ہے کہ دوسری کنجی سے کھولنے والے کے ہاتھ آپ سے آپ پھنس جاتے ہین۔ اس کمپنی کے ٹرنک بھی ایسے مضبوط ہین کہ پچاس من بوجھ رکھدینے سے بھی نہین ٹوٹ سکتے۔

(۱۳) اعضائے انسانی مین بڑی ضروری شئے آنکھ ہے۔ اسمین جو نقص قدرتی طور پر یا بعض بیماریون کی وجہ سے ہوجاتے ہین، وہ مناسب عینک کے استعمال سے رفع ہو سکتے ہین۔ مسرز لارنس اینڈ میو نے اپنی عینکون کے ساتھ ۲۰ اکسوٹلیس قسم کی مصنوعی آنکھین نمائش مین رکھی ہین۔ مین نے کامل تین گھنٹے تک ان آنکھون کو دیکھا اور آنکھ کے متعلق بہت سے مفید معلومات حاصل کئے۔ سخت ناانصافی ہوگی اگر اس موقع پر لارنس اینڈ میو کمپنی کے اُس انگریز منیجر کا شکریہ ادا نہ کیا جائے، جس نے اسقدر وقت میرے سوالات کے جواب دینے اور ہر قسم کی معلومات بہم پہونچانے مین صرف کیا، حالانکہ مین نے پیشتر ہی کہہ دیا تھا کہ ہنوز مجھے عینک کی ضرورت نہین ہے۔

(۱۴) ٹیکسٹائل کورٹ مین یون تو سب چیزین ایک سے ایک اعلی ہین اور ہم اپنے اول مضمون مین سب چیزون کا ذکر کرچکے ہین۔ مگر کانپور کی کاٹن ملز نے نمائش ہی مین ایک

دھوتی تیار کرائی تھی جسکے حاشیہ پر "نمائش الہ آباد[1] مین تیار کیا گیا" بنا گیا ہے۔ یہ دھوتیان یہین نمائش مین تیار ہوتی تھین اور مشین کی حرکت مین کچھ کمی نہین ہوتی تھی بلکہ یہ الفاظ خود بخود بنتے چلے جاتے تھے۔ ان دھوتیون کے لئے طلائی تمغہ انعام ملا ہے۔

(۱۵) برٹش اینڈ فارن بئبل سوسائٹی کی شاخ الہ آباد نے ڈیڑھ سو زبانون مین مکمل بئبل یا اُسکی بعض کتابین نمائش مین رکھی تھین۔ ان مین ساٹھ زبانین وہ ہین جو ہندوستان کے مختلف حصص مین بولی جاتی ہین۔ ۱۹۱۰ء کے آخر تک بئبل کا ترجمہ دنیا کی ۴۲۴ مختلف زبانون مین ہو چکا ہے[2]۔

(۱۶) نمائش کے ہر ایک میدان مین ایک ایک ایسی مشین رکھی ہوئی تھی۔ جو انسان کا وزن کر کے بلند آواز سے بتا دیتی تھی کہ اتنا وزن ہے۔ جو شخص اپنا وزن کرانا چاہے وہ اسپر کھڑا ہو جائے اور ایک آنہ اُسمین ڈالدے۔ مشین کے اندر سے فوراً آواز آئیگی کہ آپ کا وزن اتنا ہے۔ طبقۂ زراعت مین بھی ایک مشین ہے جسمین ایک پیسہ یا دو پیسہ اور ار آنہ ڈالنے سے اُسی قیمت کا ایک سگرٹ کا بکس باہر آجاتا تھا۔ وزن کرنے والے مشین مین ایک عیب ہے کہ وہ انگریزی مین بات کرتی ہے۔ میرے سامنے ایک دیہاتی نے جی کڑا کر کے ایک آنہ نکالا۔ مگر جب مشین نے انگریزی زبان مین وزن بتایا تو سخت غصہ ہوا اور اسکے موجد کو بھلا بُرا کہتا ہوا اپنی راہ لی۔ نمائش مین دوسرے ممالک کی اشیاء دکھانے کی غرض یہی ہوتی ہے کہ اُس ملک کے باشندے بھی ویسی ہی اشیاء تیار کرین۔ دیکھین، اب کون ہندوستانی کاریگر اُردو بولنے والی مشین تیار کرتا ہے۔

(۱۷) ایشیا مین اول مرتبہ ہوائی جہاز کی پرواز۔ ۱۰ دسمبر کو پہلی مرتبہ نمائش کے پولو گراونڈ مین ہوائی جہاز اُڑائے گئے۔ پہلے مانو پلین یعنی ایک سطح والا جہاز اُڑا اور نہایت خوبصورتی کے ساتھ تھوڑی دور تک پہیون پر دوڑ کر پہلے دُم کی طرف سے بلند ہوا اور پھر اگلے پہیون کی طرف سے اُٹھا اور ایک پرند کی طرح پھیلائے ہوئے ہوا مین چلا گیا۔ مگر اسکے انجن مین کچھ خرابی ہو گئی جسکی وجہ سے قلعہ کے پرے زمین پر اتر آیا اور پھر وہان سے اُڑ کر پولو کے میدان مین اُتر پڑا۔ اسکا اُڑانیوالا ایک انگریز تھا جسکا نام مسٹر ڈلوس تھا۔

اس کے بعد دوسرا ہوائی جہاز اُڑا جو بائی پلین یعنی دو سطح والا ہے۔ اسکا اُڑانے والا ایک فرانسیسی تھا جسکا نام مسٹر پکویٹ ہے۔ جسطرح اُڑنے سے پہلے چیل کوّے اور دوسرے بڑے پرند تھوڑی دور دوڑ لیتے ہین، اُسی طرح ہوائی جہاز بھی کرتے ہین۔ بائی پلین بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ ہوا مین بلند ہو گیا اور قلعہ الہ آباد کے اوپر سے دریائے جمنا کو عبور کر کے بہت دور چلا گیا، یہانتک کہ بہت چھوٹا نظر آنے لگا۔ اس پرواز کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اڑانے والے کو اپنی مشین پر کسقدر قابو حاصل ہے کہ جدھر چاہتا ہے اُدھر ہی اُسے موڑ سکتا ہے۔ اور جہان چاہتا ہے بلندی سے نیچے اُتار سکتا ہے۔

بائی پلین کی ساخت اسطرح ہے کہ دو باریک مگر لمبی لکڑیون کا فریم ہوتا ہے جو گویا ایک کبوتر کی گردن سے لیکر دونون پہلوؤن مین سے ہوتی ہوئی دُم پر ختم ہوتی ہین۔ اب یہان سے بازو شروع ہوتے ہین اور پر نکلتے ہین وہان اوپر نیچے دو مستطیل لمبے چوڑے ریشم کے کپڑے منڈھے ہوئے فریم

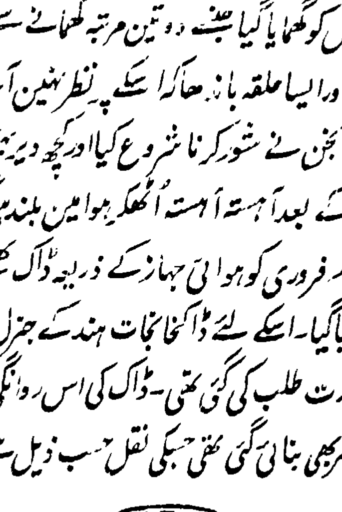
---

[1] الفاظ ٹھیک یاد نہین رہے مگر مفہوم یہی تھا۔ [2] بئبل سوسائٹی کو نمائش ممالک متحدہ کیطرف سے اعلا درجہ کا انعام ملا ہے یعنی گرانڈ پرکس۔

نیچے اوپر لگائے گئے ہیں۔ بائی پلین کی یہی دو سطح ہیں اور یہی دونوں اُڑتے وقت ہوا پر سہارا دیتی ہیں۔ ان سے چھوٹی ایک اور مربع سطح اسی طرح ریشم سے منڈھی ہوئی دُم کے سرے پر لگی ہوتی ہے۔ ایک اور زیادہ لمبی مستطیل سی سطح جانور کے سر کی جگہہ لگی ہوئی ہے۔ ان سطحوں کو ان لوہے کی نلیوں سے جوڑا گیا ہے جو بائسکلوں میں عموماً ہوتی ہیں یہ نلیں فریم کی ہوتی ہیں اور اندر سے خالی۔ تاکہ وزن کم ہو اور باریک تار ان تمام نلیوں اور سطحوں کو جا بجا جوڑے اور تانے رکھتے ہیں۔ یہ دونوں جہاز انگلستان کے کارخانہ سنگر کے بنائے ہوئے ہیں)۔

جب جہاز اُڑنے کو تیار ہوتا تھا تو جسطرح اور انجنوں کے فلائی وھیل کو گھمایا جاتا ہے اُسی طرح اُسکے دو پروں والے فلائی وھیل کو گھمایا گیا جسنے دو تین مرتبہ گھمانے سے چکر کھانا شروع کیا اور ایسا حلقہ باندھا کہ اسکے پر نظر نہیں آتے تھے۔ اسکے بعد انجن نے شور کرنا شروع کیا اور کچھ دیر پہیوں پر دوڑنے کے بعد آہستہ آہستہ اُٹھکر ہوا میں بلند ہوگیا۔

۱۸ فروری کو ہوائی جہاز کے ذریعہ ڈاک بھیجنے کا پہلا تجربہ بھی کیا گیا۔ اسکے لئے ڈاکخانجات ہند کے جنرل ڈائرکٹر سے خاص اجازت طلب کی گئی تھی۔ ڈاک کی اس روانگی کے لئے ایک خاص مہر بھی بنائی گئی تھی جسکی نقل حسب ذیل ہے۔



تاریخ مقررہ پر شام کو پانچ بجے مسٹر پکویٹ ڈاک لیکر اُڑے اور ایک بار نہیں بلکہ تین بار اُڑے اور نینی تک پرواز کی اور وہاں کے ڈاکخانہ میں ڈاک حوالہ کی جہاں سے تمام دنیا میں روانہ کی گئی۔

اُس روز خلقت کا ہجوم بہت زیادہ تھا جسمیں یورپینوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس ڈاک کے لئے فی خط ۶ر لفافہ یا ۸ر کے ڈاک کے ٹکٹ مقرر تھے۔ ہندوستان کے ہر حصہ سے خطوط آئے تھے۔ اس سے جو کچھ منافع[1] ہوا وہ آکسفورڈ کیمبرج ہوسٹل کو دیا گیا ہے کیونکہ اسکے سپرنٹنڈنٹ کی درخواست پر مسٹر پکویٹ سے یہ انتظام کیا گیا تھا[2]۔ جو لوگ ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتے ہیں انہیں ان ٹکٹوں کی کچھ دن بعد بہت قدر ہوگی جنپر ہوائی جہاز کی مہر لگی ہے۔

جو تصویر ہوائی جہاز کی اس مضمون کے ساتھ دی جاتی ہے وہ اسی جہاز کی ہے جسپر مسٹر پکویٹ ڈاک لیکر اُڑے تھے اور جسکا نام بائی پلین ہے۔ نمائش کے دنوں میں تقریباً ہفتہ وار اسکی پرواز ہوتی رہی تھی۔ کئی بار اس نے شہر کا چکر بھی لگایا تھا۔

یہ زمانہ گوناگون ایجاد اور ترقیوں کا زمانہ ہے۔ آئے دن نئی چیزیں دریافت ہوتی رہتی ہیں۔ ہوائی جہاز رانی بھی اسی قسم کی ایک پوری جدت ہے۔ جسطرح اسٹیمر پر سوار ہوکر دنیا کے مختلف حصوں میں جاسکتے ہیں اُسی طرح ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ایک مقام سے دوسرے مقام کا سفر ہو سکتا ہے۔ ان مشینوں کے مختلف نام ہیں مثلاً ایروپلین (Aeroplane) فلائینگ مشین (Flying Machine) یعنی اڑنے والی کل" ایرشپ (Air ship) یعنی ہوائی جہاز وغیرہ۔ اگرچہ یہ یورپ کی جدید ایجاد ہے لیکن سنسکرت کی کتابوں میں پتہ ملتا ہے کہ ہمارے ملک کے قدیم زمانے کے باشندے ہوائی جہاز رانی سے ناواقف نہ تھے۔ سنسکرت زبان میں ایک لفظ

[1] آمدنی کی کل تعداد بعد منہائی اخراجات ۲۱۰۰ روپیہ ہے۔ [2] نمائش میں جو ہوائی جہاز آئے تھے انکے انچارج کپتان ونڈہم صاحب تھے اور انہیں کے ذریعہ سے اس ڈاک کی روانگی کا انتظام ہوا تھا۔



ہوائی جہاز

انڈین پریس الہ آباد

وہان ملتا ہے جو "اُڑنے والی کل" کا ہم معنی ہے۔ سنسکرت زبان کی کتابون مین "اُڑن کھٹولے" کا بھی ذکر ہے۔ اسمین شک نہین کہ سنسکرت کی پرانی کتابون مین اس قسم کے جو الفاظ ملتے ہین وہ زیادہ تر افسانون کے سلسلہ مین آئے ہین جنکو مبالغہ کی حد سے نکالکر واقعیت کے نزدیک لانا ایک مشکل کام ہے، لیکن ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اُس زمانہ کا لٹریچر ہوائی جہازرانی کے نام٭ سے آشنا نہین تھا۔

یونانی قصون مین بھی اسکا پتہ لگتا ہے۔ ڈیڈلس نے پر جمع کرکے موم سے اُنھین جوڑا اور اپنے اور اپنے بیٹے اِکرس کے لئے بازو بنائے تھے تاکہ شاہ مائی نس کی قید سے نکلکر بھاگ جائین چنانچہ وہ دونون اس ترکیب سے قید خانہ سے اُڑ گئے۔ ایک اور روایت بھی مشہور ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالم ریاضیات آرخی طاس نے لکڑی کی ایک فاختہ بنائی تھی جسکے اندر ایک عجیب طریقے سے ہوا بند کی گئی تھی جسکی وجہ سے وہ دیر تک ہوا مین اُڑ سکتی تھی۔ ارشمیدس (جو ۲۱۲ ق م مین ۷۵ برس کی عمر مین فوت ہوا) زمانۂ قدیم کے علما ریاضیات مین سب سے بڑا اُستاد گزرا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کارتھیج کے محاصرہ کے وقت جب کوئی امید غنیم کے پنجہ سے رہا ہونے کی نہ رہی تب اُسنے کئی اُڑنے والی کلین تیار کرائین اور اہل شہر کو انمین بٹھاکر آسمان پر چڑھ گیا۔ اسپر دشمن محاصرہ سے رُک گیا۔ چند برس پیشتر ایسی باتون کو افسانہ سے زیادہ وقعت نہ دیجاتی تھی۔ مگر اب کون ہے جو انکی حقیقت پر شک لاسکتا ہے۔

سامانِ تفریح

(۱) نمائشون کی اصل غرض تو تعلیم ہے۔ لیکن اُس وقت تک نمائش کا انعقاد نا ممکن سمجھا جاتا ہے تاوقتیکہ عوام کے لئے کچھ تفریح کا سامان مہیا نہ کیا جائے۔ عام لوگ واقفیت کے خیال سے بہت کم نمائش مین شریک ہوتے ہین۔ اسی خیال سے ممالک متحدہ کی نمائش مین تفریح کا سامان بھی کافی سے زیادہ مہیا کیا گیا تھا۔ سامان تفریح مین اہل ہند کی دلچسپی کی چیز خصوصیت کے ساتھ دنگل ہے۔ ہندوستان مین دنگل کا چرچا ہزارہا سال سے چلا آتا ہے۔ نمائش کے موقعہ پر ہندوستان کے تمام نامی پہلوان الہ آباد مین جمع ہوئے اور برابر دنگل ہوتے رہے۔

(۲) اورینٹل پیجنٹ یعنی مشرقی جلوسی تماشے۔ انگلستان مین ایسے تماشون کا بہت چرچا ہے اور وہان تقریباً ہر شہر مین ایسے تماشے ہوا کرتے ہین۔ مگر ایسے تماشون کے لئے ہندوستان بہت موزون مقام ہے۔ اس سے پیشتر یہان ایسے تماشے کبھی نہین ہوئے تھے۔ اس سلسلہ مین بہت سے تواریخی واقعات دکھائے گئے مثلاً رام چندر جی کا اپنے پدر مبارک کے حکم سے جلاوطنی قبول کرنا اور پریاگ مین وارد ہوکر بھاردواج جی سے مُلاقات کرنا، دربار اشوک کے واقعات، بدھ مذہب کی تاثیر، ایلزبتھ ملکۂ انگلستان کا دربار جسمین ملکہ نے دربار اکبری مین تین انگریزون کو روانہ کیا، دربار اکبری مین تینون انگریزون کا پیش ہونا، اکبر کا آخری وقت، دربار اورنگ زیب، لارڈ کلائیو کا شاہ عالم کی طرف سے دیوان مقرر ہونا، لارڈ کیننگ کا

٭ نام بغیر اصل چیز کے تخیل کی حد سے باہر ہے۔ یعنی جب تک کوئی چیز موجود نہ ہو اُسکا نام وضع نہین ہوسکتا۔ ایڈیٹر

دربار جسمین ملکہ وکٹوریا کا اعلان پڑھا گیا' وغیرہ وغیرہ) یہ تاریخی واقعات نہایت ہی پُرمذاق اور دلفریب تھے۔ اسمین دوسین بہت ہی بہتر ایک تھا جسمین شہنشاہ اکبر کا وہ آخری وقت دکھایا گیا تھا جبکہ اسکی روح اپنے جسمانی قالب کو چھوڑکر عالم بالا کی سیر کی مشتاق تھی اور شہنشاہ اکبر اپنے گزشتہ اعمال کی معافی پروردگار عالم سے طلب کرتا ہے جن لوگون نے ان تماشون کو دیکھا ہے وہ عرصہ تک انکو نہ بھولینگے۔ یہ تماشے ۱۷ر جنوری سے شروع ہوئے تھے۔

(۳) آتشبازی - ایام نمائش مین ہر سنیچر کو آتشبازی چھوڑی گئی - براکس کمپنی کی آتشبازی تمام دُنیا مین مشہور ہے' یہی کمپنی اس نمائش مین بھی اپنا سامان لائی ہے - آتشبازی کی خوب رونق رہی اور عوام نے اسکو پسند کیا - یورپین صنّاعون کی کاریگری اس مد مین بھی بڑھ گئی حتیٰکہ شہنشاہ و ملکۂ انگلستان کی تصویرین بھی آتشبازی کے ذریعہ دکھائی گئین - آتشبازی کے آخری روز یعنی ۲۵ر فروری کو آتشبازی ہی مین پہلوانون کی بھی کشتی ہوئی - ہندوستانی آتشبازون کو اس فن کی ترقی کا بہت کچھ مسالہ ہاتھ آئیگا - ہمارے ملک مین بھی بڑے بڑے ماہر آتشباز ہین جو اپنے آبائی کرتبون کی نمائش مین دیکھنے والونکو محوِ حیرت کرتے ہین' لیکن یورپین آتشباز سائنس اور کیمسٹری کے زور سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہین - ہندوستانی آتشبازی مین دھوان بہت ہوتا ہے' جو اگرچہ ہوا کو صاف کرنے کے حق مین مفید ہے مگر آنکھون اور گلے کو نقصان پہونچاتا ہے - ولایتی آتشبازی مین روشنی بہت تیز ہوتی ہے - ۱۶ر جنوری کو حضور والئسرائے بھی الہ آباد تشریف لائے تھے' وہ بھی آتشبازی سے محظوظ ہوئے -

(۴) سنیک ریلوے - سامان تفریح مین یہ بھی ایک عمدہ چیز ہے - یہ ایک گاڑی ہے جسمین بیٹھکر انسان ہائڈ پارک (لندن) سے لیکر ہمالیہ تک کی سیر کرتا ہے - انگلستان کے ایک دریا سے گذر کر پہلے تو پورٹ سعید دکھائی دیتا ہے' پھر بمبئی مین اُتر کر روضہ تاج محل ملتا ہے اسی طرح رفتہ رفتہ ہمالیہ کی برفانی چوٹیون تک پہونچ جاتا ہے - اصل مین دونون جانب بلند پردے لگائے گئے ہین جنپر مختلف کیفیتون کے نقشے کھینچے ہوئے ہین - مگر ان نقشون اور تصویرون مین نہایت صنّاعی سے کام لیا گیا ہے' یہانتک کہ کسی کسی مقام پر پہونچکر انسان خوف زدہ سا ہو جاتا تھا -

(۵) جاسے وھیل - ہندوستان مین یہ بھی ایک نئی چیز تھی - یہ ایک بڑا گول تختہ تھا جو گھڑی کے شیشے کی طرح چارون طرف ڈھالو ہوتا گیا تھا - ایک میخ کے اوپر یہ تختہ قائم کیا گیا تھا اور برقی قوت کے زور سے جب میخ گھومتی تھی' تو یہ تختہ بھی خوب زور سے چکر کھاتا تھا - چونکہ اسکی سطح بہت چکنی تھی لوگ لڑھک کر نیچے آ رہتے تھے جس سے چارون طرف قہقہہ لگتا تھا -

(۶) میری گوراؤنڈ - اگرچہ یہ ایک عام چیز ہے مگر اس نمائش مین جو میری گوراؤنڈ آیا ہے' وہ ترقی یافتہ ہے یعنی یہ بھی برقی قوت سے چلتا ہے - اور چونکہ اسکا دائرہ بہت وسیع ہے اسلئے چکر بھی نہین آتا - اسکے ساتھ باجہ بھی بجتا رہتا تھا -

(۷) احاطۂ نمائش کے باہر پروفیسر رام مورتی نے اپنی جسمانی طاقت کے کرشمے دکھاکے حاضرین کو خوب محظوظ کیا - جسوقت وہ اپنے کرتب دکھاتے تھے' آنکا منڈوا بالکل اَٹ جاتا تھا - واقعی پروفیسر رام مورتی نے شہزوری مین کمال

حاصل کیا ہے۔ ڈاکٹر عصمت اللہ نے بھی اپنی طاقت کے کرتب دکھائے اور داد حاصل کی۔

(۸) بوس کمپنی کا سرکس ہندوستان میں بہت مشہور ہے۔ پروفیسر رام مورتی کے منڈوے کے ساتھ اسکا بھی منڈوا تھا۔ جنگلی اور خونخوار جانوروں کو جس طریقہ پر سدھایا گیا ہے اسکی داد دینی پڑتی ہے۔ اس سرکس میں گیناپنی کے کرتب بہت عجیب و غریب تھے۔

(۹) احاطۂ نمائش گاہ میں ایک بائسکوپ کمپنی بھی تھی جس میں چلتی پھرتی تصویریں دکھائی جاتی تھیں۔ یوں تو ہر روز نئی نئی چیزیں دکھائی گئیں، مگر دو چیزیں بہت دلچسپ ثابت ہوئیں۔ ایک ہز مجسٹی شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تجہیز و تکفین جس میں چلتی پھرتی تصویروں کے ذریعہ سے وہ کل کیفیت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تھی جو لندن میں وقوع میں آئی۔ دوسری چیز وہ کشتی تھی جو گاما نے لندن میں جیتی تھی۔

سامان تفریح میں اور بھی بہت سی چیزیں شامل ہیں مثلاً میجک لنٹرن، لافنگ گیلری (مکان قہقہہ)، واٹر شوٹ، وغیرہ۔ علاوہ ازیں امسال ایام نمائش میں آل انڈیا پولو ٹورنمنٹ بھی ہوا، نیز باکسنگ (مکا بازی)، کا جو سالانہ دنگل لکھنؤ میں ہوا کرتا ہے، امسال وہ بھی الہ آباد ہی میں منعقد ہوا۔ کشتی سے دوسرے درجہ پر اہل ہند کی نظر میں باکسنگ بھی ایک پر لطف دنگل ہے۔ سالانہ اسالٹ ایٹ آرمس (فوجی کرتب)، جو لکھنؤ میں ہوا کرتے ہیں، وہ بھی الہ آباد ہی میں ہوئے۔ کئی ہندوستانی تھیٹریکل کمپنیاں بھی آئیں اور اپنے اپنے کھیل دکھائے۔ غرضکہ تفریح کا کافی سامان مہیا کیا گیا تھا۔

کانفرنسیں

نمائش ممالک متحدہ کی زیادہ رونق و کامیابی کا ذریعہ وہ کانفرنسیں تھیں جو دسمبر کے آخری ہفتہ میں الہ آباد میں منعقد ہوئیں۔ دسمبر کا آخری ہفتہ ہندوستان میں کانفرنسوں کیلئے مشہور ہے۔ اور اب کے نمائش کی وجہ سے ان کا مرکز بھی الہ آباد ہی تھا۔ اپنے اپنے خیال کے مطابق مختلف لوگ ان کانفرنسوں کی قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اسلئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ بعض کانفرنسوں کا کچھ ذکر اس جگہ کیا جائے۔

(۱) نیشنل کانگرس۔ ۲۶ دسمبر کی صبح کو نیشنل کانگرس کا اول اجلاس شروع ہوا۔ کانگرس کا پنڈال خوب آراستہ تھا مسٹر ولیم ویڈربرن پریسیڈنٹ کانگرس کے تشریف لانے پر سارا پنڈال نعرہ ہائے خوشی سے گونج اٹھا۔ مدراس، بنگال، صوبجات متحدہ، پنجاب اور بمبئی سے ڈیلیگیٹ آئے تھے۔ دوپہر تک ساڑھے پانچسو تک ان کی تعداد پہونچ چکی تھی۔ کل حاضرین کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ پریسیڈنٹ کی تقریر، جو نہایت پر معانی تھی، بہت غور و توجہ سے سنی گئی۔

(۲) انڈسٹریل کانفرنس۔ آل انڈیا انڈسٹریل کانفرنس کا چھٹا سالانہ جلسہ کانگرس کے پنڈال میں ۳۰ دسمبر کو منعقد ہوا۔ اسکے پریسیڈنٹ مسٹر آر۔ این مکرجی سی آئی ای تھے۔ آپ نے ابتدائی کلمات کے بعد فرمایا کہ۔

"علمی کام کے لئے تو گزشتہ سالوں کی کارروائیوں کے ریکارڈ اور متعدد صنعتی رسالے کافی مدد دے سکتے ہیں مگر واجب ہے کہ ہم کچھ عملی کارروائی پر بھی غور کریں۔ چند گزشتہ سالوں میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں متعدد چھوٹے چھوٹے کارخانے جاری کئے گئے ہیں جنکو زیادہ تر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے، اسلئے ہمیں انکی ناکامی کے اسباب پر غور کرنا چاہئے۔ ملک کی موجودہ حالت کے مطابق کام شروع کرنے سے پہلے ہمیں

ماہرین کی ضرورت ہے جو اس کام کے لائق ہوں۔ بنگال سے کئی طالب علم امریکہ اور یورپ میں سائینٹفک تعلیم حاصل کرنے کے لئے پبلک خرچ سے گئے جنمین سے بعض واپس آگئے ہین، اور جن جن مضمونوں میں وہ تعلیم پانے کی غرض سے گئے تھے ان مین قابلیت پیدا کر کے آئے ہین۔ مگر عملی تجربہ اور انتظامی قابلیت کی اُنمین کمی ہے۔ یہی ناکامی کا اصلی سبب ہے اگر ولایت بھیجنے سے پہلے اُنھین یہین صنعتی تعلیم کا موقعہ ملتا تو زیادہ دقت نہ ہوتی۔ واپس آکر اُنھون نے جس کام کو سیکھا تھا اُسکے علاوہ دوسرے شعبون مین کام کرنے لگے اور اسطرح اُنکی تعلیم پر جو پبلک کا روپیہ خرچ ہوا تھا، برباد ہوا۔"

آگے چلکر آپ نے فرمایا کہ۔

"اگر ہم فی الحقیقت خواہاں ہین کہ ہندوستان مین صنعتی ترقی ہو تو اسکے لئے ایک صنعتی کالج قایم کرنا چاہیئے۔ یہ کالج اسی پیمانہ پر ہونا چاہئے جیساکہ برمنگھم، مانچسٹر اور لیڈز کے کالج ہین . . . مگر قابل غور سوال یہ ہے کہ سرمایہ کہان سے مہیا کیا جائے۔ یہ ایک اہم سوال ہے۔ ہمارے ملک مین معمولی کاروبار ہی ابتر حالت مین ہین، اور چونکہ کمپنیون کے قیام مین اکثر ناکامیون کا مُنہ دیکھنا پڑا ہے اسلئے سرمایہ دار جھجکتے ہین۔ عام طور پر ہندوستان ایک مفلس ملک ہے۔ مگر متمول حضرات کی بھی یہان کمی نہین ہے۔ اگر وہ اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ اس کام مین لگائین تو اس سے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہین، اور یون ہندوستان پھر دنیا مین تجارتی حیثیت سے نامی ہو سکتا ہے . . . . مگر اسکے ساتھ ہی ہمین گورنمنٹ سے بھی امداد مانگنی چاہیئے۔ جب تک وہ ہماری مدد نہ کرے گی، اسوقت تک ہم کچھ نہین کر سکتے۔"

(۳) انڈین سوشل کانفرنس۔ انڈین سوشل کانفرنس کا چوبیسوان سالانہ جلسہ ۲۹ر دسمبر کو کانگرس کے پنڈال مین فراہم ہوا۔ حاضرین کی تعداد معقول تھی اور بہت سے ممتاز اصحاب تشریف لائے تھے۔ آنریبل پنڈت موتی لال نہرو نے بحیثیت میر مجلس استقبالیہ کمیٹی کارروائی شروع کی۔ آپ نے اپنی مختصر تقریر کے ضمن مین ڈیلی گیٹ صاحبان کا شکریہ ادا فرمایا۔ بعد ازان آنریبل راجہ رام پال سنگھ صاحب صدر نشین جلسہ منتخب ہوئے۔ اور ایک پُر مغز تقریر فرمائی۔

تقریر ختم ہونے پر مندرجہ ذیل امور کے متعلق رزولیوشن پاس ہوئے (۱) ترقی تعلیم نسوان (۲) سن استرضا (۳) پردہ (۴) ادنیٰ ذاتون کو ہندوؤن سے الگ نہین سمجھنا چاہئے (۵) بیوگان کی حالت زار (۶) شکمی ذاتون مین باہمی خورد و نوش (۷) سوشل کانفرنسون کے لئے سرمایہ (۸) ہندو جماعت مین ازسرِ نو ایسے اشخاص کو شامل کرنا جو تبدیل مذہب کے باعث الگ ہو گئے تھے (۹) بحری سفر کی عام اجازت (قومی) (۱۰) مذہبی اوقاف وغیرہ۔

(۴) انڈین لیڈیز کانفرنس۔ انڈین لیڈیز کانفرنس کا ساتوان سالانہ جلسہ بھی ۲۹ر دسمبر کو میور سنٹرل کالج کے وزیانگرم ہال مین فراہم ہوا۔ وزیانگرم کی رانی صاحبہ اس کانفرنس کی پریسیڈنٹ تھین۔ اُنھون نے اپنی تقریر مین ہندو اور مسلمان مستورات مین تعلیم کی کمی پر بہت افسوس ظاہر کیا۔ آپ نے فرمایا۔

"جب تک اس ملک کی لڑکیان زیور علم سے آراستہ نہ ہونگی، ملک ترقی نہ کر سکیگا۔ ہر ایک ملک کی مستورات کی حالت سے اُس ملک کی تہذیب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مختلف ممالک مین مستورات کے حالات جداگانہ ہین۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ممالک مین



جسٹس کرشنا سوامی آئر

انڈین پریس الہ آباد

عورت اپنے خاوند کی وفادار، سچی، اور عزیز مددگار بھی
جاتی ہے سنسکرت کے ایک شلوک مین ہندوستانی مستورات کے بھی
یہی اوصاف بیان لئے گئے ہین یعنی

कार्येषु मंत्री करणेषु दासी भोज्येषु
माता शयनेषु रम्भा ॥

تعلیم سے مستفید ہوکر ہی ہمارے ملک کی مستورات اپنے بچون کی
اخلاقی اور مذہبی تعلیم کا انتظام کر سکتی ہین، اور نہ صرف یہ بلکہ شریفانہ
زندگی بسر کرنے مین اُنکی رہنمائی کر سکتی ہین۔ "

(۵) آل انڈیا ٹمپرنس کانفرنس۔ آل انڈیا ٹمپرنس کانفرنس کا ساتوان سالانہ جلسہ ۲۸ و ۲۹ / دسمبر کو کانگرس کے پنڈال مین فراہم ہوا حاضرین کی تعداد معقول تھی۔ الہ آباد کرسچن کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایوینگ صاحب نے بحیثیت میر مجلس استقبالیہ کمیٹی ڈیلیگیٹون کا خیر مقدم کیا۔ بعد ازان پادری ای۔ ڈبلیو۔ فرجلی صاحب (ایف آر۔ بی اے۔ ایف آر بی ایس) کانفرنس کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ آپ نے ایک طویل تقریر فرمائی جو پُر از معلومات تھی۔

(۶) کانفرنس صلح۔ تعلیم کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان خود غرضی کے تنگ اور منحوس دائرہ سے نکلکر فائدہ عام کے وسیع اور کشادہ میدان مین قدم مارنے لگتا ہے اور کھلی تازہ ہوا کا لطف اُٹھاتا ہے۔ چنانچہ ہندو محمڈن کانفرنس اسی گلزار کا ایک شگوفہ ہے کہ سرکردگان اہل ہنود و اہل اسلام ایک کانفرنس مین جمع ہوکر باہمی اتحاد کے وسائل پر غور کرین اور اس اتحاد مین جو امور حارج اور مخل ہون اُنکو دور کرین۔ اس کانفرنس کا اجلاس یکم جنوری سنہ ۱۹۱۱ء کی صبح کو راجہ ہوٹل مین فراہم ہوا۔ جو شخص اس کانفرنس کے انعقاد کو اچھا خیال نہین کر سکتا وہ کسی اچھی بات کو بھی سمجھنے کے لائق نہین۔ الہ آباد مین گنگا اور جمنا ملتی ہین اور یکجان ہوکر بہتی ہین یہین اب قوم کے دو بچھڑے ہوئے بھائی ملتے ہین یہ ایک قابل یادگار اور تاریخی واقعہ تھا۔ اگر مشرق اور مغرب آپسمین نہین مل سکتے تو کوئی وجہ نہین کہ مشرق مشرق بھی نہ مل سکین۔ بہرحال سر ولیم ویڈر برن کی تحریک پر اس کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ دونون گروہون کے قائم مقامون کی کافی تعداد موجود تھی۔ سر ولیم ویڈر برن نے افتتاحی تقریر فرمائی۔ جسکا ایک ایک لفظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

مین آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہون کہ آپ لوگ میری درخواست پر یہان تشریف لائے۔ وجہ یہ ہے کہ مین ہندوؤن اور مسلمانون دونون کا خیر اندیش ہون اور میرا یہ خیال ہے کہ دونون کی بڑھتی ہوئی شکر رنجی ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے سخت مضر ہے۔ اگر ہندو اور مسلمان دونون ملکر کام کرین تو ہندوستان کو ایک شاندار مستقبل حاصل ہو سکتا ہے۔ جب تک ہندوؤن اور مسلمانون کے باہمی تعلقات اچھے نہ ہونگے اُسوقت تک ہندوستان کی بہبودی کی امید کرنا ایک امید موہوم ہے + + + +

(۷) ایک رسم الخط کی کانفرنس۔ الہ آباد مین جہان اور کانفرنسین فراہم ہوئین وہان ایک رسم الخط بنانے والی کانفرنس بھی ۲۹ / دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو کانگرس کے پنڈال مین ہوئی۔ اسکے پریسیڈنٹ آنریبل جسٹس کرشنا سوامی آئر تھے۔ آپ نے اپنی تقریر مین فرمایا۔

ہندوستان مین ایک رسم الخط بنانے والی کانفرنس ایک بالکل نئی کانفرنس ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ پہلے کی نسبت اب اتحاد کی زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اگر یہ تازہ تحریک کامیاب ہوگئی تو ملک کو ایک نعمت بے بہا حاصل ہو جائیگی۔ اس کانفرنس کی یہ غرض نہین ہے کہ ہندوستان کی زبان ایک

ہو جائے۔ اگر یہ ایک رسم الخط کی موجودہ ۔ ہندوستان میں ۱۴۷ زبانیں بولی جاتی ہیں اور تقریباً تین ہزار مختلف حروف رائج ہیں۔ باوجود کہ پورے بھارت باسی نئی زبانیں بولتے ہیں جو آریں زبان کہلاتی ہیں اور کوئی ساڑھے پانچ کروڑ باشندے ایسی زبانیں بولتے ہیں جو ان زبانوں سے اختلاف رکھتی ہیں۔ ... آپ ذرا اس نقصان کو دیکھیں جو مختلف زبانوں کے بولنے سے ہو رہا ہے۔ اگر زبانیں جدا ہونے پر رسم الخط ایک ہو تو اتنا نقصان نہ ہوتا۔ کیونکہ ہندوستان کی تمام زبانیں ایک ہی منبع سے نکلی ہیں اور بہت کچھ آپس میں ملتی جلتی ہیں .... یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ کوئی زبان کسی خاص مذہب سے تعلق رکھتی ہے .... ملک کی بہتری کے لئے ایک رسم الخط کا رائج ہونا بہت ضروری ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس تحریک سے کسی زبان کو مٹا دیا جائے ... دیوناگری اور رومن رسم الخط ایسے ہیں جن میں کسی قدر تبدیلیوں کے بعد ملک کی سب زبانیں لکھی جا سکتی ہیں۔

(۸) مذاہب ہند کی کانفرنس۔ یہ کانفرنس ۹ سے ۱۱ جنوری تک میو ہال میں منعقد ہوئی۔ مہاراجہ صاحب دربھنگہ اس کے پریسیڈنٹ تھے۔ اس کانفرنس کا یہ دوسرا سالانہ اجلاس تھا۔ مندرجہ ذیل مضامین پڑھے گئے۔

(۱) شیوی مت از مسٹر پلائی مدراس (۲) مذہب ویدانت از مسٹر ... کلکتہ (۳) بودھ مذہب از بابو نگیندر ناتھ باسو کلکتہ (۴) وشنو مت از مسٹر ... چارج (۵) حضرت عیسیٰ کا پیام از پادری برنارڈ لوکس صاحب (۶) شاکت مت از مسٹر کاشی ناتھ سہائے بہار (۷) اسلام از خواجہ کمال الدین لاہور۔

(۸) ... ائیلیوں کا مذہب از مسٹر ڈیوڈ (۹) اسلام از مسٹر محمد علی ایم اے۔ (۱۰) زردشت کی عام فہم تعلیم از مسٹر کلیسر والا (۱۱) زردشتی مذہب از مسٹر دینا دلال ایم اے (۱۲) بودھ مت از مسٹر دھرم پال (۱۳) آریہ سماج از پروفیسر رام دیو۔ (۱۴) جین مت از وجے دھرم سوری (۱۵) مذہب عیسوی از پادری انڈریوز صاحب دہلی (۱۶) بہائی مذہب از سید مصطفیٰ صاحب (۱۷) عملی ویدانت از سوامی چدانند۔ (۱۸) برہمو سماج از پروفیسر بی رام سہانی رائے صاحب ایم۔ اے۔

مندرجہ بالا کانفرنسوں کے علاوہ مندرجہ ذیل کانفرنسیں بھی منعقد ہوئیں۔

(۱) ناگری پرچارنی سبھا پریاگ۔ ۱۲ جنوری ۱۹۱۱ء۔ پریسیڈنٹ شریمان راجہ پرتھی پال سنگھ صاحب۔

(۲) تھیسٹک کانفرنس (برہمو سماج) ۲۵ جنوری ۱۹۱۱ء پریسیڈنٹ پنڈت شیو ناتھ صاحب شاستری ایم۔ اے۔

(۳) بھارت شدی سبھا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۰ء پریسیڈنٹ پنڈت رام بھجدت صاحب چودھری بی اے۔

(۴) زراعتی کانفرنس (ممالک متحدہ) ۱۳ جنوری ۱۹۱۱ء افتتاحی تقریر از نواب لفٹننٹ گورنر بہادر۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی کانفرنسیں مثلاً کائستھ کانفرنس انڈین کرسچین کنونشن وغیرہ منعقد ہوئیں۔ جگہ نہیں کہ ہم سب کا حال ہدیہ ناظرین کریں۔ الغرض الہ آباد میں کرسمس کے ایام میں خوب چہل پہل رہی اور اس سے نمائش کی رونق بھی دوبالا ہو گئی۔ جن لوگوں نے اس موقعہ پر الہ آباد کی سیر کی ہے وہ مدتہائے دراز تک اس رونق کو نہ بھول سکیں گے۔

شاکر (میرٹھی)

عبدالرزاق خان لاری

زمانۂ قدیم سے سرزمین ہند مین حب الوطنی کی مثال النادر کالمعدوم ہے اور نہ صرف ہمارے ہی ملک کا یہ خاصہ ہے بلکہ سوا ے جاپان کے دیگر ممالک ایشیا کے باشندون مین بھی اپنے ملک کی محبت کا نام و نشان نہین پایا جاتا - آجکل شاید بعہ مشرق کی تقلید کی وجہ سے جسکی حب الوطنی اظہر من الشمس ہے یا مغربی تعلیم کی بدولت ہندوستان اور دیگر ممالک مثلاً ایران و ٹرکی مین کچھ کچھ قومی حمیت کے آثار نمودار ہو چلے ہین لیکن ابھی وہ زمانہ دُور ہے جبکہ یہ قومین اپنی اتحادی قوت سے اپنے خیالی منصوبون کو عملی لباس پہنا سکین گی اور اُس نقطۂ خیال پر پہونچ سکین گی جو اُنکے پیش نظر ہے -

جب ہم متذکرۂ بالا کمی کا سبب دریافت کرتے ہین تو ہمارا دل قدرتاً اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ گزشتہ زمانے مین شخصی حکومت کے اثر نے ملک کی محبت کو دل مین جاگزین نہین ہونے دیا - باشندگانِ ملک کی تمام امیدین حکمران کے دامنِ دولت سے وابستہ رہتی تھین اگر وہ نیک، عادل اور مہربان ہوتا تھا تو غریب سے لیکر امیر تک سب اُس سے محبت رکھتے تھے اور اپنی خوش نصیبی کا باعث سمجھتے تھے کہ اُنھون نے ایسے مبارک زمانے مین نشو و نما پائی - برخلاف اسکے اگر وہ ظالم عیاش اور ملک کی حالت سے بیخبر ہوتا تھا تو اپنی بدقسمتی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتے تھے لیکن اُسکے ظلم کی بیخلتی اور اُسکی بدانتظامی کے تدارک کیلئے کوئی تدبیر نہین کرسکتے تھے - البتہ کبھی کبھی کسی صوبہ کا گورنر رعایا کی بددلی کو مدنظر رکھکر اپنے ظالم اور عیاش بادشاہ کو تخت سے اتارنے کے لئے معرکہ آرا ہوتا تھا اگر ظفر و نصرت اُسکا ساتھ دیتی تھی تو وہ خود تخت سلطنت پر متمکن ہو جاتا تھا ورنہ دوسرے ملک کے بادشاہ کی خدمت مین عرضداشت بھیجتا تھا کہ حضور آئیے اور ہمکو ظالم کے پنجے سے نجات دیجئے - اگر اس صورت مین بھی کامیابی ہوتی تھی تو ظالم حکمران کی حکومت جبتک کہ موت کا زبردست ہاتھ اُسکی رگ گردن پر نہین پڑتا تھا برابر جاری رہتی تھی اور رعایا برابر پریشان رہتی تھی -

یہ اسباب تھے جنکی وجہ سے بادشاہ تمام خیالات کا مرکز سمجھا جاتا تھا اور ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک اُسکی پرستش کرتے تھے - ملک کی ضروریات کا پورا کرنا بادشاہ کی طبیعت پر منحصر تھا - رعایا کو اُس سے سروکار نہ تھا جو اُسکا جی چاہتا تھا وہ کرتا تھا - رعایا کو چون و چرا کرنیکی مجال نہ تھی - آجکل زمانہ اور ہے یورپ کے ممالک مین بادشاہ برائے نام بادشاہ ہے اور تمام ملکی معاملات پبلک کے قبضہ مین ہین اُسوقت پبلک یا پبلک اوپینین (عوام یا عوام کی رائے) کوئی چیز نہ تھی - اُس زمانے مین قومیت اور حب الوطنی کا کوئی نام نہین جانتا تھا صرف بادشاہ کی نمک حلالی اور وفاداری مایۂ ناز سمجھی جاتی تھی -

اسی قسم کی ایک عدیم النظیر مثال تاریخ دکن مین عبدالرزاق خان لاری کی پائی جاتی ہے جو ابوالحسن تاناشاہ فرمانرواے گولکنڈا کے زمرۂ ملازمین مین شامل تھا - جسوقت شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب ملقب بہ عالمگیر لشکر جرار کے ساتھ ریاست بیجاپور کو تاخت و تاراج کرکے گولکنڈا کیطرف روانہ ہوا تو شاہزادہ محمد معظم مخاطب بہ شاہ عالم اور خان جہان کوکلتاش جو پہلے سے گولکنڈا کی سرحد کے اندر داخل ہو چکے تھے شہنشاہ کی خدمت

مین ابوالحسن تاناشاہ کی جانب سے صلح کا پیغام لیکر پہونچے اور بارگاہ شاہی مین عرض کیا کہ ابوالحسن دس کروڑ روپیہ شاہی افواج کے خرچ کے لئے اور بیس لاکھ روپیہ سالانہ جو خراج سے کہین زیادہ تھا ادا کرنے کیلئے تیار ہے اور نہ صرف یہ بلکہ وہ اضلاع جنکے حاصل کرنیکے لئے ظاہراً جنگ کی تیاریان کی گئی تعین دینے کے لئے آمادہ ہے اور اپنے دونون برہمن مشیرون کو بھی علٰحدہ کرنے کیلئے راضی ہے اگر شہنشاہ فتح گولکنڈا سے باز رہے لیکن عالمگیر جو دکن کی صوبہ داری کے زمانے سے بیجاپور اور گولکنڈا پر دانت لگائے ہوئے تھا ایسے پیغام صلح کو کب خاطر مین لاتا تھا۔ خان جہان کوکلتاش، شاہ عالم، اُمراے جلیل القدر اور لشکر جرار اس جبر و تشدد سے بددل ہون مگر آخری عظیم الشان تاجدار مغلیہ کے عزم بالجزم مین سر مو فرق نہین آسکتا تھا۔ کوچ کا حکم دیا گیا اور پیغام صلح مسترد کر دیا گیا۔

جب ابوالحسن نے دیکھا کہ عاجزی اور فرمانبرداری بیکار ثابت ہوئی تو اُسنے اپنے قوی اور زبردست دشمن کے مقابلے کے لئے جان توڑ کوشش کی۔ چنانچہ اپنے خاص امرا، شیخ منہاج، شرزہ خان اور مصطفےٰ خان لاری کو جو تاریخ مین عبدالرزاق خان لاری کے نام سے مشہور ہے رخصت کیا اور مغلون کی فوج کے روکنے کا حکم دیا۔ شاہی لشکر گولکنڈا سے دو منزل کے فاصلہ پر تھا جبکہ دکنی اُمرا اُسکے مقابلے کے لئے پہونچے۔ دکنی فوج قلیل تھی اور اسلئے چھوٹی چھوٹی لڑائیان لڑتی تھی۔ قشون شاہی آگے بڑھتا رہا اور شہنشاہ ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ہجری مطابق ۱۶۸۷ء گولکنڈا کے بہت قریب جا پہونچا اور محاصرہ کی تیاریان شروع کر دی گئین۔

مغلون کو صرف محصورین ہی سے مقابلہ نہ کرنا پڑتا تھا بلکہ دکنی فوج عقب سے مغلون کو تنگ کرتی تھی اور سنبھاجی اپنے مرہٹہ سپاہیون کو لیکر سامانِ رسد بند کرنے مین اُسکا ساتھ دیتا تھا۔ اُس سال بارش کی کمی کی وجہ سے دکن مین قحط تھا اور شاہی فوج سامانِ رسد کی تنگی کیوجہ سے پریشان تھی لیکن محصورین کیلئے قلعہ مین ہر چیز بافراط مہیا تھی۔ کئی بار قلعہ پر حملہ کیا گیا مگر شاہی فوج کو زک اُٹھا کر واپس ہونا پڑا۔ اکثر جانباز اور وفادار امرا کام آئے۔ بہت سے راجپوت نذر اجل ہوئے۔ مغلون کی فوج مین ہیضہ پھیل گیا جس سے ہزارہا سپاہی مر گئے۔

الغرض رجب کے مہینے مین جبکہ محاصرہ کا تیسرا مہینہ قریب الاختتام تھا۔ فیروز جنگ نے سیڑھیون کے ذریعے سے قلعہ کی دیوارون پر چڑھنے کا انتظام کیا۔ جسوقت سپاہی قلعہ کی دیوارون کے اوپر پہونچنے ہی کو تھے۔ ایک کتے نے جو لاشون کی کھوپریان تلاش کرتا ہوا پھر رہا تھا آہٹ پاکر بھونکنا شروع کیا اور قلعہ کے سپاہی مشعلین ہاتھ مین لیکر دیوارون کیطرف دوڑے۔ فوراً اُن رسیون کو جنسے سیڑھیان بندھی ہوئی تھین کاٹ ڈالا جس سے بہت سی جانین تلف ہوئین اور پھر گولہ بارود سے حملہ کیا جس سے شاہی فوج کو سخت نقصان پہونچا۔

اگر اورنگ زیب جیسا مستقل مزاج محاصرہ کرنے والا نہوتا تو اس سخت ناکامیابی کے بعد محاصرہ کا نام نہ لیتا، لیکن اُسکی پیشانی پر ذرا بل نہ آیا اور قلعہ کو فتح کرنے کے لئے دیگر ذرائع بہم پہونچانیکی تدبیر کی گئی۔ چنانچہ تین سُرنگ قلعہ کی دیوار تک کھودی گئین جو بالکل تیار تھین اور صرف فلیتہ لگانے کی دیر تھی کہ بارش کا طوفان شروع ہو گیا۔ شاہی فوج کے لئے کوئی جاے پناہ نہ تھی۔ بعض افسران شاہی نے سخت بزدلی دکھائی۔ سلیم خان افریقی کچھ دیر تک دکنیون کا مقابلہ کرتا رہا بعد ازان فرار ہو گیا اور ایک غار مین جا چھپا۔ صف شکن خان جسکی بہادری مسلمہ تھی اور جسنے محاصرہ مین کارہاے نمایان کئے تھے۔ اُس دستہ فوج پر حکمرانی کر رہا تھا

جسپر جری اور بہادر عبدالرزاق خان لاری حملہ آور تھا۔ وہ کیچڑ مین گر پڑا اور زخمی ہونیکا بہانہ کیا۔ جمشید اور گجرات خان جو شاہی توپخانہ کے افسر تھے نہایت ذلت اور شرم کے ساتھ فرار ہوگئے۔ سربراہ خان اور دیگر بارہ منصبدار قید ہوئے۔

جب یہ قیدی ابوالحسن کے سامنے پیش ہوئے تو اُسنے حکم دیا کہ اُنکو غلہ کے انبار اور بارود دکھاؤ۔ یہ شاہی منصبدار اسقدر سامان دیکھکر بہت حیران ہوئے۔ اس سے ابوالحسن کا یہ منشا تھا کہ عالمگیر صرف اپنے استقلال سے قلعہ فتح نہین کرسکتا۔ قیدی رہا کردئے گئے اور اُنھون نے شاہی فوج مین ابوالحسن کے غلہ کے انبار اور سامان جنگ کی افراط کا حال ظاہر کیا جس سے شاہی فوج بددل ہوگئی۔

ادھر ابوالحسن نے پھر پیغام صلح بھیجا اور کہا کہ مین تو شہنشاہ کا غلام ہون۔ ہر حملہ جو شاہی فوج نے کیا ہے اور ہر مقام جو شاہی فوج میرے ملک کی سرحد کے اندر کریگی اُتنے ہی کرور روپیہ مین دینے کیلئے تیار ہون اور ۵۰۰ یا ۶۰۰ من غلہ بھی شاہی فوج کے لئے دونگا۔ اسپر عالمگیر نے کہا کہ اگر ابوالحسن میرا غلام ہے جیسا کہ وہ ظاہر کرتا ہے تو پابجولان میرے روبرو آئے صرف اُسوقت مین اُسکی شرائطِ صلح سُن سکتا ہون۔

اسکے بعد صلح کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا اور سُرنگ پھر لگانی شروع کیگئین جو ۱۵ شعبان کو تیار ہوگئین اور یہ منصوبہ باندھا گیا کہ شاہی سپاہیون کی ایک جماعت قلعہ کی دیوار کے قریب پہونچکر غُل وشور مچائے جس سے محاصرین قلعہ کی دیوار پر آجائینگے پھر سرنگون مین آگ لگادی جائے۔ جب شاہی سپاہیون نے غل مچایا تو محاصرین قلعہ کی دیوار پر پہونچ گئے۔ لیکن عبدالرزاق خان لاری شاہی فوج کے مطلب کو تاڑ گیا اور اُسنے فوراً حکم دیا کہ سرنگون مین پانی بھر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

شاہی فوج اس حال سے بیخبر تھی۔ جب پہلی سُرنگ مین فتیلہ لگایا گیا تو بارود قلعہ کیطرف تر ہونیکی وجہ سے نہ جلی اور دوسری طرف بھڑک اُٹھی جس سے شاہی فوج کے ہزار سے زیادہ سپاہی مرگئے جنمین اکثر بڑے بڑے افسر بھی تھے۔ دوسری سُرنگ مین بھی فتیلہ لگایا گیا جسکا نتیجہ پہلے سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوا۔ دو ہزار سے زیادہ شاہی فوج کے آدمی تباہ ہوئے۔ تیسری سُرنگ مین جسکی بارود محاصرین نے علیحدہ کردی تھی فتیلہ نہ لگا۔

اورنگ زیب اپنی بار بار ناکامیابی سے سخت پریشان تھا۔ شاہی فوج بھی بددل تھی لیکن محاصرہ نہین چھوڑتا تھا۔ اگلے دن عالمگیر نے اعلان کردیا کہ ریاست گولکنڈا شاہی مقبوضات مین شامل کرینگے۔ اگرچہ یہ اعلان کسیقدر قبل از وقت تھا اور ابھی دارالخلافت فتح نہین ہوا تھا لیکن اسکا اثر شہنشاہ کے حق مین بہت مفید ثابت ہوا۔ ابوالحسن کے تمام سردار سوائے عبداللہ خان پنی اور عبدالرزاق خان لاری کے ہمت ہار بیٹھے اور دشمنون سے جاملے۔ ایسے نازک وقت مین ابوالحسن نے یہ غضب کیا کہ شیخ منہاج کو جسکی نسبت سُنا گیا تھا کہ وہ بھی ڈھلمل یقین ہے قید کرلیا اور اُسکے مال واسباب کو ضبط کرلیا۔ اس سے ابوالحسن کے سپاہیون مین اور بھی بددلی پھیل گئی۔

چنانچہ عبداللہ خان پنی نے بھی در پردہ شاہی فوج سے سازباز کرلیا اور شہنشاہ نے اُس سے نہایت اعزاز واکرام کے وعدے کئے۔ عبدالرزاق کو بھی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی گئی مگر تمام وعدے اُس جری مرد کے لئے بیکار ثابت ہوئے۔ وہ اپنے آقا کی وفاداری کو مقدم سمجھتا رہا۔ رات کے وقت عبداللہ خان پنی نے قلعہ کے عقب دروازہ کو کھولدیا اور مغل قلعہ مین داخل ہونے شروع ہوگئے۔

جسوقت عبدالرزاق خان لاری کو جو بستر راحت پر آرام سے سو رہا تھا یہ خبر پہونچی کہ مغل قلعہ مین داخل ہونا شروع ہوگئے

ہیں تو بغیر اسلحہ لگائے (کیونکہ اتنا وقت نہ تھا) اور بغیر اپنے آدمیوں کو جمع کئے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہوکر ایک ہاتھ میں ننگی تلوار اور دوسرے میں ڈھال لئے ہوئے یہ اتنا ہوا کہ چونکہ طلال ہے یہ سے پیچھے چلا آئے۔ مغلوں کی فوج پر جا ٹوٹا۔ اسکے ہمراہی بارہ سے زیادہ نہ تھے جو ایک دوسرے سے ذرا علیحدہ ہوگئے تھے۔ عبدالرزاق خان مغلوں کی بیچ فوج تک جا پہونچا اور برابر لڑتا رہا یہانتک کہ سر سے پیر تک زخم خوردہ ہوکر گر پڑا۔

نعمت خان نے جو اسوقت عالمگیر کی فوج میں ملازم تھا حسب ذیل الفاظ میں اسکی بہادری کا حال لکھا ہے :-

"اندرین ایک قطرہ آب کے مانند بہتا ہوا یا ایک شعاع کی مانند سورج پر حملہ کرتا ہوا وہ فوج پر حملہ آور ہوا اور اس مردانگی اور جرأت کے ساتھ جو انسانی تصور سے باہر ہے یہ نعرہ لگاتا ہوا لڑتا رہا میں جبتک زندہ ہوں اپنے آقا ابوالحسن پر نثار ہونے کے لئے تیار ہوں، ہر لحظہ اسکا قدم آگے بڑھتا رہا اور ہزاروں کا مقابلہ کرتا رہا اور زخم کھاتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکا ہر قطرہ خون لڑ رہا ہے۔ کھوپری سے لیکر تلوے تک بیشمار زخم تھے اور ہر زخم کاری معلوم ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ اسکا وقت ابھی تک نہ آیا تھا وہ برابر لڑتا رہا یہانتک کہ قلعہ کے دروازہ تک پہونچ گیا اور وہاں جاکر آہستہ آہستہ بے حس و بے خبر ہوگیا۔ اسکے چہرے پر بارہ زخم لگے تھے جس سے اسکی پیشانی کی کھال اسکی آنکھوں اور ناک پر نقاب کیطرح جا پڑی تھی اور جب یہ کھال اٹھائی گئی تو معلوم ہوا کہ اسکی ایک آنکھ تلوار کے زخم سے بیکار ہوگئی ہے اور اسکے بدن پر اسقدر زخم تھے جسقدر کہ آسمان پر تارے ہیں۔ اسکا گھوڑا جو اپنے آقا کیطرح زخموں سے چور چور تھا آخر کار کانپتا ہوا کھڑا ہوگیا اسوقت عبدالرزاق خان کی بھی سب طاقت سلب ہوچکی تھی لہذا اسنے گھوڑے کی باگ چھوڑ دی کہ جدھر اسکا جی چاہے لیجائے۔ چنانچہ وہ اسکو قلعہ کے پاس ایک باغ میں جسکو نگینہ باغ کہتے تھے لے گیا اور وہاں جاکر ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوگیا جس جگہ عبدالرزاق گھوڑے سے گر پڑا"

اگلے روز حسینی بیگم کے ملازم ادھر سے گزرے اور اسکو روح اللہ خان کے پاس لے گئے۔ صف شکن خان نے کہا کہ ملعون لاری کا سر کاٹ ڈالا جائے لیکن روح اللہ خان نے اسے بہت ڈانٹا اور بادشاہ کو لاری کے حال کی اطلاع دی۔ عالمگیر نے فوراً شاہی جراح اور طبیب بھیجے اور اسکا نہایت عمدہ علاج کرایا۔ جب اسے آرام ہوگیا تو بادشاہ نے اسکو ملازمت دینی چاہی لیکن اسنے انکار کیا۔ آخر کار جب بادشاہ نے قید کی دھمکی دی تو شاہی ملازموں میں داخل ہوگیا آٹھ مہینے کے بعد محاصرہ گولکنڈا ختم ہوا اور ابوالحسن قید کرلیا گیا۔

محمد یحییٰ تنہا

انشائے ہادی النسا۔ منشی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ اردو زبان کے زبردست محسنوں میں ہیں جنکی مفید تصانیف نے خاص شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ کتاب بھی آپ ہی کے فیضان قلم کا نتیجہ ہے جسمیں مستورات کو خط و کتابت سکھانے کی کوشش کیگئی ہے۔ اسکے دو حصے ہیں حصہ اول میں مستورات اور لڑکیوں کی خط و کتابت ہے جو دہلی کی خاص زنانی زبان میں لکھی گئی ہے اور نہایت پرلطف ہے حصہ دوم میں عورتوں کی طرف سے انکے رشتہ داروں اور شوہروں کے نام خط ہیں اور انکے جواب بھی جا بجا نظم کی چاشنی بھی موجود ہے جو عورتوں کی لوٹی پھوٹی شاعری کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ معمولی لکھائی چھپائی کے ۵۲ صفحات پر قیمت ۱۲ / دفتر فرہنگ آصفیہ دہلی سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

رخصت سرما

جو نہی فصل بہاری کا لیکے علم آیا　　ریاض دہر کا سوتا نصیب جاگ اٹھا
گئی وہ موسم سرما کی گرم بازاری　　گئی وہ لرزے کی ہر ایک دل سے بیماری
مزاج اہل جہان اعتدال پر آیا　　کہین ہے موج نسیم اور کہین ہے باد صبا
گئے وہ لباس کہ جو تھے بار دوش　　نہ لانگ کوٹ کی اب قدر ہے نہ ہے سویٹر
سہریون پہ نہ تو شک نہ بھاری بھاری لحاف　　بچھے ہوئے ہین بچھونے سفید اور شفاف
انگیٹھیون مین رہی آگ کی ضرورت کیا　　جو رہ گئی ہے ستائیگی وہ برودت کیا
بچھی ہوئی تھی چمن پر جو اوس مدت سے　　اڑی وہ پرتو خورشید کی حرارت سے
دیا ہے جوانان باغ کو ملبوس　　کہ جسکا حسن ہے ہمصورت پر طاؤس
ہر ایک شاخ مین کوپل یہ پھوٹی ہے کوپل　　ہر ایک پتی ہے تصویر صنع عز و جل
چمن مین سبزے کی آکے جلوہ افروزی　　چلی جہان مین ہر سمت باد نوروزی
اثر کی جان ہوئی نغمہ سنجی بلبل　　چمن کی زیب ہوا زور شور خندۂ گل
چمن مین کی ید قدرت نے ایسی گلکاری　　ہے جسکی دید سے حیران سپہر زنگاری
برائے سیر حسین بھی قریب جو آئے　　کہ اپنے ساتھ لئے شیشہ و سبو آئے
نشیلی انکھڑیان اسپر شباب کا عالم　　ادائے شوخ مین پنہان حجاب کا عالم
نظر فریب ہے آنکھون مین خواب کی مستی　　نگاہ ناز سے پیدا شباب کی مستی
قدم قدم روش ناز اے معاذ اللہ　　اور اسپہ حسن خدا ساز اے معاذ اللہ

غرضکہ روپ پہ رنگ جہان ہے اے محشر
بہار دورہ سے کا سمان ہے اے محشر

محشر

کلام سرور

(منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام)

ایک انگریزی نظم کا ترجمہ

وہ روشنی عطا کر عمر رواں کو یارب!　　جگنون مین شمع بنکر اس تیرہ انجمن مین
میری شمیم سے ہو مشکین جہان کو یارب　　مہکون مین پھول بنکر اس وادی کہن مین
یارب! بنا دے میری ہستی بے بقا کو　　اک گیت پیارا پیارا اک نغمہ دل آرا
اور وہ فسون ہو کہ بخش دے لحن جانفزا کو　　ہون اہل انجمن کے جینے کا مین سہارا
ہان! میری زندگی کو ایسا عصا بنا دے　　ہو جس سے دستگیری ایک ایک ناتوان کی
اور لازوال دولت وہ مجھکو کر عطا دے　　حاجت برآئے جس سے ہزار خستہ جان کی
اس زیست کو بنا دے یارب وہ جام زرین　　ہو جلوہ ریز جسمین تیری شراب وحدت
دنیائی کاہشون سے ہرگز نہین ہو غمگین　　لب پر ہو جوش ہستی مین نغمۂ مسرت

رباعیات

بت خانے جدا ہین خانقاہین ہین جدا　　ارباب پرستش کی نگاہین ہین جدا
جویا ترے شیخ و برہمن ہین دونون　　منزل تری ایک ہے پہ راہین ہین جدا

آغاز ہے کچھ ترا نہ انجام ترا　　بندون پہ ہمیشہ لطف ہے عام ترا
مندر مین ہے تو خدا ہے تو مسجد مین　　جپتے ہین شیخ و برہمن نام ترا

گلچین جو گلون کو لیچلا چن چن کر　　کلیون نے کہا یہ منہ سے سر کو دھن کر
"کل آہ! یہی ہمارا ہوگا انجام"　　رویا کیا مین بہت صدا یہ سنکر

یارب! ہے یہ دفن کسکی میت دلمین　　سر پیٹ کے رو رہی ہے حسرت دلمین
پامال ہوئی آہ! ہے یہ نازون کی مری　　ہر پاس ہو بیکسی کی تربت دلمین

غزل

شب وصال مزہ دے رہی ہے لو تیری　　لبون سے گھولتی ہے قند گفتگو تیری

مشکل ہے چھپانا دل درد آشنا کو ہے
کرتی ہمیں رسوا ہے بیدردی آرزو تیری

ترے زبان کو ہے پاس ادب بخوف
کہ بات بات پہ گالی تو کٹتی زبان تیری

اٹھا رہا ہے جفائیں تری بانتظار میں
ترا ہی ہے مجھے خون آرزو تیری

ترے سکوت میں بھی اس ادا خلق ہے
کہ شوخی بھی ہوتی ہے دست میں انگریزی

نہ جان کر اس بتا پہ کہ دست تلا!!
نہ جانے ہم کہیں رسوا نہ آرزو تیری

کبھی ہے قصد ہم کا کبھی ہے جستجو
کہ ان نشان لئے پھرتی ہے جستجو تیری

جوانی

تب گرم تھا ہنگامۂ بازار جوانی
جب ذوق نہ تھا کوئی خریدار جوانی

تھیلے ہوئے ہنگامۂ عشق و نازانہ
آتا ہے کوئی لیکر بازار جوانی

اک وقت میں صحبت یہ رہتے دیکھا یاران
اے بنجرِ لذتِ آزار جوانی

ہر نقطہ میں پوشیدہ ہیں سو مطلب رنگین
ہے شرح طلب دفتر طومار جوانی

انبار سے پھولوں کے ہر اک گوشہ ہے معمور
شاداب ہے کیا گلشن پر بہار جوانی

صد حیف کہ سب بھولگئے کچھ نہ رہا یاد
فطرت نے سکھائے تھے جو اسرار جوانی

ہے دور ادھر ختم ادھر رخصت ساقی
ہشیار ہو ہشیار ہو سر شار جوانی

تھا نقش مرے دل پہ ترا عشق جنون خیز
ہر داغ تھا اک تمغۂ سرکار جوانی

اک وہ ہیں جنھیں راس ہے یہ فصل طرب خیز
اک ہم ہیں کہ مشہور ہیں بیزار جوانی

اُس شخص سے پوچھو تو ذرا لطف اسیری
عالم میں جو ہوتا نہ گرفتار جوانی

کھوئی ہوئی دولت نہیں ہوتی ہے میسر
اب کوشش بیجا ہے طلبگار جوانی

افسوس کہ پیری میں کوئی کام نہ آئے
وہ عضو بدن تھے جو مددگار جوانی

کمزوری ہمت ہو کہ ہو جوش مسرت
یہ مشغلہ شیب ہے وہ کار جوانی

ڈوبی ہوئی تاثیر میں ہر بات تھی میری
اللہ رے وہ لذت گفتار جوانی

کس طرح کرے صبر گرفتار محبت
ہے تاب شکن طرۂ طرار جوانی

اسوقت کی کچھ قدر کرو میرے جوانو!
پھر ہوگی تمھیں حسرت دیدار جوانی

ہر گام پہ ہے نوزش مستانہ کا عالم
ہے ہوش ربا فتنۂ رفتار جوانی

ہے مرکز جذبات سویداے دل تنگ
اور جادۂ عشرت خط پرکار جوانی

اے حسن تری بزم طرب خیز میں جاکر
طاقت ہے کسے جو کرے اظہار جوانی

ہے ذوق تماشا تو اُٹھا آئینہ قدرت
رخسار ہوں جب مطلع الانوار جوانی

وہ فلسفۂ حسن کا اصلی ہے مرقع
چہرے پہ نظر آئیں جب آثار جوانی

افسوس کہ گم کردہ نشان ہے یہ زمانہ
وہ جوش جو تھا قافلہ سالار جوانی

یہ یاد رکھو پھر کبھی آنسو نہ تھمینگے
دیکھو گے اگر چہرۂ بیمار جوانی

پیران در میکدہ روتے ہیں عزیز اب
تا چند سناؤ گے یہ اشعار جوانی

عزیز

کلام اکبر

گردش گردون سے ہر دم وہم رنج افزا میں ہیں
یہ بھی اک سودا ہے ورنہ کیا ہمیں دنیا میں ہیں

مفتون ہوگئے ہم اس بے بقا چمن کے
آنکھوں میں خاک ڈالی مٹی نے پھول بنکے

ہستی کو اپنی سمجھیں بنیاد اپنی دیکھیں
اُٹھتے ہیں جو بگولے برباد ہونگے تنکے

گو نجی بہت ہے اسمیں فریاد بیکسونکی
ٹکڑے اُڑینگے اکدن اس گنبد کہن کے

مغرب کا وعظ ادھر بھی اے پیر ملت لو
اس شہر میں بھی مردے محتاج ہیں کفن کے

تجھے اُن سے ہے سرد مہری - تری آرزو بھی عجیب ہے
وہ ہیں تخت پر تو ہے خاک پر - وہ امیر ہیں تو غریب ہے

ترا جلوہ زیب خیال ہے - وہی وجد ہے وہی حال ہے
تری انجمن سے ہوں دور اگر - مرا دل تو مجھ سے قریب ہے

جو خدا کا حکم ہے خوب ہے - مجھے توبہ کرنے میں عذر کیا
مگر ایک بات ہے واعظا - کہ بہار اب تو قریب ہے

پئے حفظ جان ہین جو کوششین نہ اجل کے ساتھ ہین سازشین
اور اسی روش پہ ہین خوا ہشین - یہ معاملہ بھی عجیب ہے
اُسے انکھون کا خیال کیا - جو ہو محو تارونکی چال کا
وہ نظر زمین پہ کیون جھکے کہ جو آسمان سے قریب ہے
جو حرم مین شیخ ہے کدہے کیا - کہ ضرور تین ہین جدا جدا
مین ہون دیر مین تو عجب ہے کیا - کہ یہ اپنا اپنا نصیب ہے

—✻—

دل رات کی بیچینی ہے - یہ آٹھ پہر کا رونا ہے
آثار بُرے ہین فرقت مین - معلوم نہین کیا ہونا ہے
دنیا کے نئے ہنگامے تھے - خلق ایک طرف آپا یکطرف
اب شہر خموشان عالم ہُو - مٹی ہے لحد کا کونا ہے
کیون پست ہوئی ہے ہمت دل - کیون روک رہی ہے مایوسی
کوشش تو ہم اپنی سی کرلین ہوگا تو وہی جو ہونا ہے
ترتیب و تکلف لاکھ کرو - فطرت نہین چھپتی اے اکبر
جو مٹی ہے وہ مٹی ہے جو سونا ہے وہ سونا ہے

کشمیر

اے کاشمیر تو چمنِ بے نظیر ہے
شیدا ترا جوان کی صورت سے پیر ہے
تجھپر ازل سے فضل خدائے کبیر ہے
جسکو لگی ہے لو تری روشن ضمیر ہے
ہے آرزوے دل کہ تری آرزو کرین
جب تک زبان تر ہے تری گفتگو کرین
جو ہے ہزار جان سے تجھپر نثار ہے
گُل سے عزیز ہمکو ترا خار خار ہے
سرتاج دہر ہند کا تو افتخار ہے
رنگین تجھ سے یہ چمن روزگار ہے
مدت سے اشتیاق ہے اکبار دیکھ لین
بلبل ہین چشم شوق سے گلزار دیکھ لین

سب کرتے آئے ہین تری توصیف او ثنا
تیری زمین ہے زیر فلک شانِ کبریا
دیکھا نہین ہے آنکھ سے کانون سے ہے سنا
ہے شنید دید سے بھی معتبر ہوا
اب کچھ ہو پہلے تو چمنِ بے مثال تھا
کیا حال سے غرض ہے یہ ماضی کا حال تھا

فرشِ زمین کا عرش سے پایا بلند تھا
ہر قصر شکلِ بام مسیحا بلند تھا
شہ تا و باغ شاہد بالا بلند تھا
ذرون کا مہر سے بھی ستارا بلند تھا
آب و ہوا کو حکم جو تھا زمہریر کا
بازار سرد رہتا تھا مہر منیر کا

ہر نخل شکل نخل تمنا ہرا بھرا
ہر گُل گُل مراد سے بھی بڑھ کے جانفزا
ہر غنچہ غنچۂ دل احباب با وفا
ہر خار خار دیدۂ بد بین پُر دغا
ہر کوہ کاشمیر کا کوہ وقار تھا
ہر چشمہ چشمۂ کرم کردگار تھا

چشمِ وفا کا نرگس بیمار پر گمان
سادہ رخی کی پھولونمین رنگین مزاجیان
بحرِ عطا کی طرح ہر اک نہر تھی رواں
آزادیِ وطن تھی ہراک سرو سے عیان
کس جوش سے پہاڑ کے چشمے اُبلتے تھے
اہل وطن کے ولولے دل سے نکلتے تھے

ہر سرو مین بلندیِ ہمت انھین کی تھی
ہر نہر مین صفاے طبیعت اُنھین کی تھی
ہر گُل مین رنگ و بوئے محبت اُنھین کی تھی
ہر غنچہ کی زبان پہ حکایت اُنھین کی تھی
موج صبا مسیح نفس انکے دم سے تھی
کشتِ اُمید سبز انھین کے کرم سے تھی

ہے سیر برف کی وہی بالائے کوہسار
جاری ہین ہر طرف سے وہی اب بھی آبشار
کوسون تلک وہی ہین شجرہاے میوہ دار
گلزار مین وہی گل و نسرین کی ہے بہار
بلبل وہی ہین گل وہی ہین بوستان وہی
نہرین وہی ہین سرو وہی قمریان وہی

دنیا وہی ہے وہی دشت وہی ہیں جبل وہی سبزہ کنار جو ہے وہی سبزہ زار وہی

دون پہ مہر و ماہ و ثریا و زحل وہی رستہ وہی زمین پہ شہر و مکان و محل وہی

آب و ہوا وہی ہے مرے کاشمیر کی

سرسبزی وہی ہے خطۂ جنت نظیر کی

سب کچھ وہی ہے حیف مگر وہ بشر نہیں وہ اہل دل نہیں ہیں وہ اہل نظر نہیں

کان و صدف وہی ہیں پہ لعل و گہر نہیں باغ و چمن وہی ہیں پہ گلہائے تر نہیں

قالب ہے دیکھنے کو پہ قالب مین جان نہیں

نام وطن ہے حب وطن کا نشان نہیں

یا آجکل وطن کی جو حالت نہ پوچھئے کیا کیا پڑے ہیں رنج و مصیبت نہ پوچھئے

ل و نفاق و کبر کی حالت نہ پوچھئے کشمیریون کی گردش قسمت نہ پوچھئے

جنت مین بھی عذاب جہنم اُٹھاتے ہین

عمال بد کی ہین سزا اُسکی پاتے ہین

زار مین بھی دشت کی وحشت کا رنگ ہے صبح وطن مین شام غریبی کا ڈھنگ ہے

ہے وہ جور دست زمانہ سے تنگ ہے کشت اُمید مورد باران سنگ ہے

آوارہ آرزوئین ہین مانند گرد راہ

کشتی قوم موج تلاطم مین ہے تباہ

بشن نراین در

ترانۂ مسرت

بیقراری تھی - بسکہ شام تنہائی جانِ اسیر حرمان تھی - دل تھا ناشکیبائی

کہا طبیعت نے کشمکش مین بنائی زندگی کہین تیری - ہو نہ بار پیمائی

ت ہے مجھے غافل - ہو نہ کچھ تجھے حاصل موت آکے دے پیغام - اُٹھ تری اجل آئی

گفتگو اُسکی - مین نے یہ کہا نہ یون کہا کر او ظالم - خوب راہ بتلائی

ت و عبادت سے - کام کچھ نہین مجھکو حدِ شرع سے باہر - ہے غریب سودائی

بہت ہی بیگانہ صنعت اور حرفت سے دو ستون کی یہ دولت - مین نے کچھ نہین پائی

تمام سے فلاحت سے کاشتکاری نہین ہوتی مجھ مین وہ قناعت مین - کیسے ہو شناسائی

اُنس طبع کو گر ہے - ہے فنون لطیفہ سے ق دل پہ حکمران جنکی - ہے کمال رعنائی

اکتساب پر انکا - ہو تو کس طرح سے ہو جب غم زمانہ سے - ہون اسیر تنہائی

الغرض نہین ہون مین - کار دہر کے قابل مجھسے ہو نہین سکتی - اسکی بزم آرائی

دل فریب خوردہ ہے - بسکہ اہل دنیا کا ہے یہ آرزو میری - ہو رہون مین صحرائی

سایۂ درختان ہی کاشانہ ہو خانہ جاندنی کے گل سے ہو - جسکی رونق افزائی

خوش گلومنی کی - نغمہ ریز یان پیہم مار ڈالین لہ مجھکو - کہ کرین مسیحائی

بیخودی کے عالم مین - زندگی کٹے میری خلوت بھی بہتر ہو - ایسا کنج تنہائی

پر مجھے کہان حاصل - یہ مزے قناعت کے اُف رے میری محرومی - وائے ناتوانائی

سُنکے داستانِ دل - یون کہا طبیعت نے تو مگر نظر آیا - مجھکو خام سودائی

بخت کار الفت کو - آرزو و حسرت کیون چاہئے ہو جلوت مین لطف خلوت آرائی

جلوہ گاہ عالم ہے - آئینہ حقیقت کا دیکھ جلوۂ جانان - تجھکو گر ہے بینائی

ہم مین اور بہائم مین - امتیاز کرتا ہے ذوق دید جانانہ - شوق محفل آرائی

چل کر منعقد اسدم - جا رہا جلسا ہے کی ہے دوست نے تیرے - تیری یاد فرمائی

آکے دیکھتا کیا ہون - جمع ہین سبھی احباب دیکھنے سے آنکھون مین نکلے - آئی بینائی

گفتگو ظریفانہ - چھیڑ چھاڑ رندانہ موجب سکون ہے اور باعث شکیبائی

مست بنکے بیٹھے ہین چشم دلربا کے دیکھا رام ہو گئے کیونکہ آہوانِ صحرائی

فتنۂ ساز مطرب نے مستِ ناز مطرب نے دل ہر اک ہوا بیخود - جبکہ یہ غزل گائی

غزل

کس گل محبت کی بو صبا لگا لائی ہو گیا مین دیوانہ - ہو گیا مین سودائی

دل مین بیٹھے کہتا ہے - یون خیالِ جانانہ مین نہین ہون ہرجائی - مین نہین ہون ہرجائی

کاش مجھکو مل جائے - وہ بت پری پیکر سنگِ در پہ ہے جسکے - خواہشِ جبین سائی

مانع نظارہ ہے - کہتے ہین حجابِ عقل تو ہی اسے جنون کر دے - میری کار فرمائی

بھول جاؤن مین کیونکر اے شباب اس گل کو

لوٹ لی مرے دل کی جسنے سب شکیبائی

محمد سیف الدین شباب

پردۂ زنگاری

مین نے پوچھا فلکِ پیر سے اکدن بسمل	کیون ہے تو موردِ الزام ذرا یہ تو بتا
ایک عالم ہے ترے ظلم وستم سے نالان	ہے زمانے مین ترے جور و جفا کا چرچا
لوگ ہر روز کیا کرتے ہین تجھپر نفرین	خلق دن رات کیا کرتی ہے تیرا شکوا
ظلم سے تیرے زمانے مین بپا ہے ظلم	ہر طرف نالہ و فریاد و فغان واویلا
سارے عالم مین ہے مشہور تری نیرنگی	ایک حالت پہ کسیکو نہین دیکھا اصلا
رنج دیتا ہے کسیکو۔ تو کسیکو راحت	عیش دیتا ہے کسیکو تو کسیکو ایذا
گلشن دہر مین پھولا جو کوئی تازہ نہال	خار بنکر تری آنکھون مین کھٹکنے وہ لگا
کردیا چشم زدن مین اُسے برباد وتباہ	فارغ البال جسے تونے ذرا دیکھ لیا
نظر آیا جو کوئی پہنے ہوئے صاف لباس	گرد آلود تفکر کیا دامن اُس کا
اے فلک! تونے اُڑالے ہین کیسکے انداز	کیا حسینون نے سکھایا ہے تجھے طرزِ جفا
جسپہ ہوتی ہے ترے ظلم وستم کی بوچھار	اُسکو دم بھر بھی کبھی دم نہین لینے دیتا

ختم ہونے بھی نہ پائی تھین ابھی یہ باتین	ناگہان دی مرے کانون مین کسی نے یہ صدا
سربسر ہے ترا بسمل یہ خیالِ باطل	کر رہا ہے فلکِ پیر کا ناحق شکوا
عقل سے کام لے کسِ دھیان مین ہے ہوش سنبھال	دیکھ تو کرکے ذرا چشمِ حقیقت کو وا
شیوۂ جور وجفا اور فلک ہ کیا مقدور	بال بھی کر نہین سکتا یہ کسی کا بیکا
ہو نہ ہو اسمین نہان ہے کوئی سرِ مخفی	اسکے پردے مین مقرر ہے کوئی راز خفا

کب سلیقہ ہے فلک کو یہ ستمگاری مین
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری مین

محمد عبدالرحمٰن بسمل

گرفتاریِ دل

ہائے اس عشق مین کیا کیا ہوئی خواریِ دل	کام کچھ آئی نہ دانائی وہشیاریِ دل
ہوش گم ہوتے ہین ملتی نہین عیاریِ دل	کیا کہون کس سے کہون گریہ دل زاریِ دل

دوستان چند کنم نالہ زبیماریِ دل
کس گرفتار مبادا زگرفتاریِ دل

خفقان گھر سے ہے الفت مجھے ویرانے سے	کچھ سروکار نہ اپنے سے نہ بیگانے سے
موت[1] بہتر ہے طبیعت کہین آجانے سے	دم گھٹا جاتا ہے ہر روز کے غم کھانے سے

دوستان چند کنم نالہ زبیماریِ دل
کس گرفتار مبادا زگرفتاریِ دل

نازِ معشوق کے انداز نے مارا مجھکو	التفاتِ نگہِ ناز نے مارا مجھکو
جلوۂ حسن خداساز نے مارا مجھکو	فتنہ پرداز دغاباز نے مارا مجھکو

دوستان چند کنم نالہ زبیماریِ دل
کس گرفتار مبادا زگرفتاریِ دل

ایک دن وہ تھا کہ واقف ہی نہ تھے عشق سے ہم	بزمِ عشاق مین سب روتے تھے ہم تھے خرم
وہ خوشی کل کی ہوئی آج بلا سے مبرم	اپنے احباب سے اب عرض یہی ہے پیہم

دوستان چند کنم نالہ زبیماریِ دل
کس گرفتار مبادا زگرفتاریِ دل

عشق کی شان زمانے سے نرالی دیکھی	ہے کہین رنج کی صورت کہین تصویر خوشی
یون تو اس عشق کے ہاتھون سے ہین بیزار سبھی	میری اے صبر زمانے سے ہے اُفتادگی

دوستان چند کنم نالہ زبیماریِ دل
کس گرفتار مبادا زگرفتاریِ دل

صبر (دہلوی)

---

[1] یہ مطلع خواجہ میر درد کا ہے۔

چوپاٹی

بمبئی مین چوپاٹی ایک بہت سوا تفریح گاہ ہے جو سمندر کے کنارے واقع ہے۔ والکیشور پہاڑ کے دامن مین سمندر کا نظارہ ہی ایک دلفریب منظر اور قدرت کا بہترین عطیہ تھا۔ اُسپر انسانی صنعت اور سلیقہ مندی نے وہ اضافہ کیا ہے کہ "اگر شہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست" رات کو چوپاٹی ایک بقعۂ نور معلوم ہوتی اور سمندر کی گرجتی ہوئی موجین کنارے سے ٹکرا کے تماشائیوں کو اپنی طرف مخاطب کرتی ہین۔ دلکو پہاڑ پر سبزہ گاہ کا نظارہ، فرحت بخش ہوا اور گزرنے والے جہازون کی سیر جو لطف رکھتی ہے وہ بیان نہین ہو سکتا۔ — ایڈیٹر

نہ سر سے جائیگا تیرا خیال چوپاٹی — کہ اُنس مجھکو ہے تجھسے کمال چوپاٹی
فدا ہے تجھپہ ہر اک مہ جمال چوپاٹی — ترا ہی بھرتے ہین دم نونہال چوپاٹی

عدیل تیرا ہے بیشک محال چوپاٹی
جہان مین تو ہے عدیم المثال چوپاٹی

وہ تو ہے بڑھ کے آغوش مین لیا تجھکو — وہ تو ہے آنکھون مین رکھتے ہین اٹھا تجھکو
وہ تو ہے دیتے ہین دلمین حسین جا تجھکو — گلے سے موجین لگا لیتی ہین سدا تجھکو

عدیل تیرا ہے بیشک محال چوپاٹی
جہان مین تو ہے عدیم المثال چوپاٹی

ترا کنار محبت ہے حور کا آغوش — نگاہ دست سے تیری ہین سیکڑون مدہوش
زبانِ موج پہ ہر دم ہے شور نوشا نوش — وہ تو ہے قلزم خوبی ہے بحر حلقہ بگوش

عدیل تیرا ہے بیشک محال چوپاٹی
جہان مین تو ہے عدیم المثال چوپاٹی

جو ایک بار تجھے دیکھنے کوئی آیا — ہزار جان سے بس ہو گیا ترا شیدا
اُڑا لے لیتی ہے دلکو تری ہر ایک ادا — بجا ہے گر کہون تجھکو کہ ہے تو بت یکتا

عدیل تیرا ہے بیشک محال چوپاٹی
جہان مین تو ہے عدیم المثال چوپاٹی

نکلتی ہے مرے دل سے یہ تیرے حق مین دعا — ہرا بھرا رہے ہر دم چمن مرادون کا
رہے یہ چہرۂ تابان نگاہ بد سے بچا — نہ اُلجھے دامنِ دل سے ترے کوئی کانٹا

عدیل تیرا ہے بیشک محال چوپاٹی
جہان مین تو ہے عدیم المثال چوپاٹی

علی احمد قریشی

نوحۂ سُرور

آہ اے ماتم سرائے کشورِ ہندوستان — تو بنا رہتا ہے اکثر رنج اور غم کا مکان
لوگ دنیا کے تجھے کہتے ہین گو جنت نشان — پھول تیرے بوستان کے رہتے ہین وقفِ خزان

غم لکھا ہے تیری قسمت مین نہین شادی لکھی
ہے سراپا خامۂ قدرت نے بربادی لکھی

شیشۂ دل ہو گیا ہے سنگ غم سے چور چور — شادمانی رہتی ہے تیرے مکان سے دور دور
آسمان کرتا ہے نازل نت نئین تجھپر فتور — اک اضافہ ہو گیا اُسپر غمِ مرگِ سُرور

چاک کرتی ہے کلیجہ میرا یہ حالت تری
اشک بھر لاتی ہین آنکھین دیکھکر صورت تری

جسکے ھونٹون پر رہا کرتی تھی آہ جانگزا — ہند مین تھا شور محشر جسکے نالون سے بپا
اب نہ آئیگی کبھی کانون مین پھر اُسکی صدا — پیکرِ تصویر کے مانند ہے لاشہ پڑا

دونو جانب ہو رہی ہے دیر سے نوحہ گری
اک طرف اُردو زبان ہے اک طرف ہے شاعری

جو کہ خود ہو آتشِ سوزِ نہان سے جل گیا — اُسکو اے آتش اگر تو نے جلایا بھی تو کیا
پر سنبھل کر پاس دل کے تو قدم رکھنا ذرا — ہائے "دل" کہتے ہوئے خود کا نپتا ہے دل مرا

"دل بہت شاعر کا نازک ہے" کچھ اسپر دھیان ہو
آہ او ظالم نہ اتنی بات سے انجان ہو

موت تجھکو آ گئی گو اے سُرورِ نکتہ دان — خون کے آنسو بہا کر رو چکا ہندوستان

ملک میں جب تک مگر قائم ہے یہ اُردو زبان — تیرے پھولوں پر سکن کبھی آئے خزاں

پرورش جس کو کیا ہو خونِ دل سینہ کا
ایسے گلشن میں خزاں کا ہو نہیں سکتا گزر

بنت حفیظ اللہ

غزل

(نتیجہ افکار جناب حسرت موہانی ایڈیٹر اُردوئے معلی علیگڈھ)

محبوبی و رنگینی ہیں جزو بدن تیری — سرشار محبت ہے خوشبوئے دہن تیری
مجبورِ وفا کر کے محروم کرم کرنا — بھولینگی نہ یہ باتیں اے عہد شکن تیری
باطن میں وہ بیمہری ظاہر میں یہ دلجوئی — ہم خوب سمجھتے ہیں ترکیب سخن تیری
غارتگرِ تمکین ہے۔ آشوبِ دل و دین ہے — یہ طرزِ نگہ تیرا یہ وضعِ حسن تیری
جو تمنے چھپائی تھیں ہمکو نہ بتائی تھیں — روشن ہیں وہ سب ہمپر باتیں من و عن تیری
اب رونے سے کیا ہوگا پروانہ بے پروا — برباد ہے سب محنت اے شمع لگن تیری
اس خاطرِ رعنا کے اکرام اقامت سے — تقدیر چمک اُٹھی اے ملک دکن تیری

تنہائیِ غربت سے مغموم نہو حسرت
کب تک نہ خبر لینگے یارانِ وطن تیری

غزل

داغ بھی کیا راز پنہاں ہوگئے — جب بہار آئی نمایاں ہوگئے
مجھکو بسمل کرکے خود پشیماں ہیں — آج سارے ظلم احسان ہوگئے
بلبلوں کے دل سے اُٹھے جو طوفاں — ہائے آشوبِ گلستان ہوگئے
روکھی باتوں سے خدا یاد آگیا — تیرے گلے جزو ایمان ہوگئے
اب کہوں کیا اُنسے کیوں آیا تھا میں — سارے شکوے صرف دربان ہوگئے

جب سے ساقی ہوگیا خلوت نشین
سنتے ہیں بسمل مسلمان ہوگئے

سید امین الحسن رضوی

ایڈیٹوریل

۲۸ فروری گذشتہ کو نمائش الہ آباد کا اختتام ہوا۔ شام سے پہلے مینہ نے باد و باران کے ساتھ اسے الوداعی ایڈریس پیش کیا۔ افتتاح کے روز بھی قدرت نے اسی جوش و خروش سے اسکا خیر مقدم کیا تھا۔ ان علامات سے امید ہوتی ہے کہ ہندوستان میں سرسبزی و خوشحالی کی بارش عنقریب ہونیوالی ہے۔ نمائش کے متعلق مسٹر شاکر نے اپنے مضمون کا ٹکڑا ادبی نمبر میں دیدیا ہے۔

منشی درگا سہائے صاحب سرور مرحوم کے مجموعہ کلام پر ہمارا ایک بسیط دیباچہ گذشتہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ انڈین پریس نے اسکی اشاعت میں اولوالعزمی سے کام لیا ہے اور نہایت نفیس اور دلکش چھاپا ہے جو اس سال کے بہترین مطبوعات میں شمار کیا جائیگا ہمارے کرمفرما مسٹر شاکر نے سرور مرحوم کا کچھ غیر مطبوعہ کلام نہایت کوشش سے دستیاب کیا ہے اور اسکی اشاعت کیلئے ادیب کو خاص طور پر ممنون فرمایا ہے جسکے ہم شکرگزار ہیں۔ یہ کلام ادیب میں بدفعات شائع ہوتا رہیگا۔

ذکرِ سرور کم نہیں وصلِ سرور سے

ہمنے یہ خبر نہایت رنج و قلق کے ساتھ سنی کہ ہمارے دیرینہ دوست حکیم سید محمد مہدی صاحب کمال خلف علامہ جلال مرحوم نے ۲ فروری گذشتہ کو بمقام رامپور بعارضہ طاعون انتقال فرمایا۔ مرحوم حضرت جلال کے فرزند اصغر اور نہایت ہونہار جوان تھے۔ شاعری اور حکمت دونوں میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ رسالہ دستور الفصحا اور ایک دیوان آپکی یادگار ہے۔ باقی کلام اور کئی رسالے جو فن عروض وغیرہ پر لکھے تھے غیر مطبوعہ رہ گئے جنکے چھپنے کی اب امید نہیں۔ بلکہ خاندان جلالی کا خاتمہ ہوگیا جسمیں اب کوئی شاعر اور ادبی شوق رکھنے والا باقی نہیں رہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

کتاب "معیار صداقت" کے متعلق (جسپر جنوری گذشتہ کے ادیب میں ریویو کیا گیا تھا) مینجر صاحب جیوان سُدھار پتکا لاہور تحریر فرماتے ہیں کہ "معیار صداقت میں حملے موجود ہیں۔ مگر وہ غیر آریہ ہی مذاہب پر نہیں بلکہ آریہ مذہب پر بھی ہیں۔ ہر مذہب کو ایک ہی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ یہ حملے مصنف کیطرف سے نہیں ہیں بلکہ جو جو حملے آپسمیں ایک مذہب نے دوسرے مذہب پر کئے ہیں انکا نمونہ بطور دکھایا گیا ہے۔" ہندو مسلمان ہر فرقے نے اسکی بالاتفاق تعریف کی ہے۔

ادیب کی سالانہ زندگی پر ہمارے معاصرین نے نہایت حوصلہ افزا ریویو کئے ہیں خصوصاً ایڈیٹر صاحب "ہندوستان لاہور" ایڈیٹر صاحب "ذو القرنین بدایون" اور ایڈیٹر صاحب "الحجاب بھوپال" کے ہم

تہ دل سے شکر گزار ہیں۔ خصوصاً ایڈیٹر صاحب ذوالقرنین نے اپنے ریمارکوں میں وسیع نظری سے کام لیا ہے۔ غالباً دوسرے معاصرین بھی جلد توجہ فرمائینگے۔

تشریح تصاویر

(۱) ماہ عالم کی رنگین تصویر ہندؤں کی ایک مشہور مذہبی روایت سے تعلق رکھتی ہے جسکا مفصل ذکر بھاگوت اور برج بلاس میں موجود ہے۔ سری کرشن جی کے متعدد معجزوں میں ایک معجزہ یہ بھی مذکور ہے کہ جب اندر دیوتا نے برج کو بارش کے دیوتا کی پرستش کیلئے منع کیا تو اندر نے برج پر اپنی موسلادھار بارش سے چڑھائی کی اور برق و باران کا ایسا طوفان برپا کیا کہ لوگوں کی زندگی معرض خطر میں آگئی۔ اسوقت سری کرشن جی نے گوبردھن پہاڑ کو اپنی چھنگلیا پر اٹھا لیا اور سب لوگ اسکے نیچے اندر کے حملوں سے محفوظ ہو گئے۔ تصویر میں کرشن جی کے پاس جو معمر بزرگ نظر آتے ہیں اور پہاڑ میں اپنا ہاتھ لگائے ہوئے ہیں یہ نند جی ہیں اور انکی پشت پر جسودھا مائی جنھوں نے کرشن جی کو پالا تھا۔ اردگرد گوالے اور گوپیاں گائے اور بچھڑے۔ دس ہزار برس پہلے کی سوسائٹی کا ایک عمدہ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ تصویر کے بالائی حصے میں ابر و باران اور بجلی چمکنے کی کیفیت نہایت عمدگی سے دکھائی گئی ہے جو مصور کی اعلیٰ صناعی پر دال ہے۔

(۲) خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب پنجاب کے نہایت نامور اہل قلم اور عالی مرتبت حضرات میں ہیں۔ نثر اردو میں فلسفیانہ استدلال کی بنیاد آپ ہی کے قلم نے ڈالی ہے جسکا رنگ آپکی ہر تحریر میں موجود ہوتا ہے۔ علاوہ اُن بے انتہا مضامین کے جو آپ نے اردو کے تمام لٹریری پرچوں کے لئے لکھے ہیں۔ آپکی مستقل تصانیف بھی موجود ہیں جنمیں "فلسفۂ شاعری" نہایت ہی عمدہ کتاب ہے۔ سرکاری حلقے میں بھی آپکا پایہ بہت بلند رہا ہے اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے معزز عہدے پر عرصے تک ممتاز رہنے کے بعد گزشتہ سال ریاست بہاولپور کے وزیر مال مقرر کیے گئے ہیں۔ گورنمنٹ نے آپکی اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں آپکو "خان بہادر" کا معزز خطاب عطا فرمایا ہے جسکی مبارکباد میں ہم آپکا بالکل تازہ فوٹو شائع کرتے ہیں جو حال ہی میں ادیب کیلئے لیا گیا۔

(۳) سکھ کنیا مہا ودیالہ کی کئی تصویریں اور اسکے حالات بھائی ہیرا سنگھ صاحب ایڈیٹر پنجابی بہن نے ارسال فرمائے ہیں جنمیں صرف عمارت کی تصویر اس مرتبہ شائع کیجاتی ہے۔ یہ عظیم الشان زنانہ تعلیم گاہ جو فیروزپور (پنجاب) میں واقع ہے اپنی نوعیت ومقاصد کے اعتبار سے تمام قوم کی اُمیدوں کا مرکز ہے۔ اسکے بانی مبانی بھائی تخت سنگھ جی اور انکی اہلیہ محترمہ سرکھتی ہرنام کنور صاحبہ ہیں جنھوں نے ۲۴ر نومبر ۱۸۹۲ء کو اسکی بنیاد ڈالی تھی اور اپنی سرگرم کوششوں، ایثار نفسی اور محنت شاقہ سے اس قومی انسٹی ٹیوشن کو کمال کے درجے پر پہونچا دیا ہے۔ بھائی تخت سنگھ جی نے اسکے انعقاد سے سب بڑی قومی خدمت انجام دی ہے۔ جو لوگ تعلیم نسوان کی کوشش میں مصروف رہے ہیں وہ ملک کی اصلی ترقی کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہی لڑکیاں جو آج درسگاہوں میں زیر تعلیم ہیں ایک دن جوان ہوکر اپنے بچوں کو بھی باقاعدہ تعلیم و تربیت سے بہرہ ور کرینگی۔ اس کالج کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس اور تمام ضروری سامان موجود ہے اور اپنی خوش انتظامی کی بدولت کافی شہرت رکھتا ہے۔ ۸ار جنوری سنہ حال کو ہز آنر لفٹنٹ گورنر پنجاب نے اسکا معائنہ فرماکے اپنی خوشنودی ظاہر کی ہے۔ ہز ہائینس مہاراجہ صاحب نابھہ اسکے قدیم سرپرست ہیں۔

(۴) سجادن دیو الہ آباد سے آٹھ میل کے فاصلے پر دریائے جمنا میں ایک چھوٹا سا ٹاپو ہے۔ یہ عجیب و غریب پہاڑی ٹیلہ ایک نہایت قدیم اور بہت بڑے شہر کی یادگار ہے جسے دریائے جمنا کی بیرحم موجوں نے تباہ کر دیا تھا۔ اس شہر کی بہت سی علامتیں موضع دیوہٹ میں ابتک موجود ہیں جو سجادن دیو سے صرف دو سو گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ سجادن دیو اپنی پُر عظمت تنہائی اور خاموشی کے ساتھ جمنا کی چوڑی دھار میں ایک نامعلوم مدت سے کھڑا ہے۔ اسکی بلندی ساٹھ فیٹ ہے جسکی چوٹی پر ایک برج بنا ہوا ہے۔ یہ برج شاہجہان کے عہد میں نواب شایستہ خان نے ایک قدیم ہندو مندر کو مسمار کرکے بنایا تھا جسکا قطر ۱۲ فیٹ ہے۔ نواح الہ آباد میں یہ ٹاپو نہایت دلچسپ اور فرحت بخش مقام ہے۔

(۵ و ۶ و ۷ و ۸) ان تصاویر کے متعلق مفصل مضامین درج ہیں۔

(۹) عروس بہار کی تصویر مغربی تخیل کا نمونہ ہے جو نمائش الہ آباد میں خاص دلچسپی سے دیکھی گئی تھی۔ اس تصویر میں مصور نے ایک دوشیزہ ماہ پیکر کو پھولوں کے خرمن میں اس مستانہ انداز سے دکھایا ہے جو موسم بہار کے لئے مخصوص ہے۔ اتفاق سے آجکل یہی موسم ہے، اسلئے موسمی مناسبت کے اعتبار سے یہ تصویر خاص دلچسپی کا باعث ہوگی۔

اپریل ۱۹۱۱ء

ادیب

جلد ۳ — نمبر ۴

توحید

ایک اکھنڈت برہم وراجت نام جُدو کر وشو کہاوے
ایک ہی گرنتھ پُران بکھانت ایک ہی دتّ وششٹ سناوے
ایک ہی ارجن اودھو سون کہہ کرشن کرپا کرکے سمجھاوے
سندر دویت کچھو مت جانو ایک ہی ویاپک وید بتاوے

एक अखंडित ब्रह्म विराजत, नाम जुदो करि विश्व कहावै।
एकहि ग्रंथ पुराण बखानत, एकहि दत्त वसिष्ठ सुनावै।
एकहिं अर्जुन उद्धव सूं कहि, कृष्ण कृपा करिकै समुझावै।
सुंदर द्वैत कछू मत जानहु, एकहि व्यापक वेद बतावै।

ترجمہ- خدا ایک ہے اور کامل ہے اُسکا دوسرا نام یہ سب عالم ہوا گرنتھ اور پُران وغیرہ بھی ایک کہتے ہیں گرو دتاترے اور مہرشی وششٹ جی بھی ایک کہتے ہیں اور سری کرشن نے کرپا کر کے ارجن اور اودھو کو ایک ہی کہکر سمجھایا ہے۔ اسے سندر دوئی یعنی شرک کو مطلق مت جانو وید بھی ایک ہی کو کہتا ہے جو سارے عالم میں سائر و دائر ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک خاصۂ انسانی ہے کہ مصیبت یا حاجت کو دور یا حاجت کو رفع کر سکے گا۔ اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ
کہ وقت جب اپنی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو پھر کسی ایسے شخص اندفاع مصیبت یا حاجت روائی اُس شخص کی قدرت سے باہر ہے جسکا سہارا لیا
کا سہارا لیا جاتا ہے جسکی نسبت یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اُس مصیبت گیا تھا تو پھر عالم بالا پر کسی ایسے وجود کی ہستی کو مان کر جسکی نسبت

---

* دتّ گرو دتا ترے سے مراد ہے दत्तात्रय جنکی اودھوت گیتا अवधूत ایک بہت مشہور کتاب معرفت ہے۔ وششٹ مشہور رشی ہیں جنکی یوگ وششٹ کتاب کو سب جانتے ہیں اور ارجن سے کہی ہوئی بھگوت گیتا کو کون نہیں جانتا ہے ۔۳

یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ سب کچھ اور سب باتون پر قادر ہے
دفع تکالیف و حاجات کے لئے التجا کیجاتی ہے۔ اور اسطرح کسی
دنیوی خداوند کی خوشامد وغیرہ کرکے اور نذر و تحائف وغیرہ
پیش کرکے اُس سے طلب امداد کی جاتی ہے۔ ویسی ہی اُس
علوی معبود یا معبودون کی ستائش وغیرہ کرکے یا اُنکی مورتون
پر پھول پان۔ روپیہ زیور وغیرہ چڑھاکر اُنسے اپنی مرادون کو مانگا
جاتا ہے۔ انسان کا تقاضائے ہی خاصہ رہا ہے کہ اپنی حاجات
کو رفع کرنے اور تکالیف کو دور کرنے کے لئے اپنے سے زیادہ
مقتدر شخص کے پاس پناہ لیتا ہے۔ چاہے وہ کوئی ذی اقتدار
انسان ہو یا ہے کوئی ایسا وجود ہو جو انسانات سے بڑھکر مقتدر
یا قادر مطلق مانا گیا ہو اور جسکی نسبت یہ خیال ہو کہ وہ ہماری قسمتون
کا فیصلہ کرنے والا ہے اور اگر ہم اُس سے کچھ مانگین گے تو وہ
ہماری مناجات کو سُنکر ہماری حاجات کو رفع کردیگا اور جب
یہ دیکھا جاتا ہے کہ اُس دُنیا مین بغیر خوشامد یا نذر و نیاز کے
کام نہین چلتا تو پھر اُس معبود یا معبودون کی خوشامد یا پرستش
اور نذر و نیاز وغیرہ تو اور بھی ضروری خیال کی جانے لگی۔ غرضکہ
اس طرح سے طریقۂ پرستش و مناجات کی ابتدا ہوئی۔ تمدن کی
حالت کے لحاظ سے اس پرستش و مناجات کے طریقے علیحدہ
علیحدہ ہین۔ جو ہنوز نہایت ہی وحشت کی حالت مین ہین وہ
صرف شئے پرستی پر اکتفا کرتے ہین یعنی جو چیز اُنکے ہاتھ لگ
گئی اُسی کو وہ پوجنے لگتے ہین۔ گو یہ صاف طور پر نہین کہا جاسکتا
کہ وہ ایسی شئے پرستی سے اپنی کسی مراد براری کی تمنا رکھتے ہین
یا نہین۔ اسکے بعد تمدن کی ایک ایسی حالت ہے جسمین کچھ ایسی
روحون کے وجود رکھنے کا عقیدہ پایا جاتا ہے جنکی نسبت یہ
خیال ہوتا ہے کہ وہ نفع یا ضرر پہونچانے پر قادر ہین اور نفع
حاصل کرنے یا ضرر سے بچنے کے لئے اُن روحون کو خوش رکھنے
کی کوشش کیجاتی ہے۔ اور اسطرح اُنکی مورتین بنا بناکر اُنکی پوجا کرنا
ایک فرض سمجھا جانے لگا۔ غرض کہ اسطرح بت پرستی کا آغاز ہوا۔
اگرچہ اہل یونان و اہل روما کی تہذیب اعلیٰ درجہ کو پہونچی ہوئی
تھی مگر وہ خدا کے خیال کے متعلق بہت پیچھے تھے کیونکہ وہ
کثرت معبودی کے عقیدہ تک پہونچے تھے۔ البتہ کسی ایک معبود
کو باقی معبودون پر حکمران ہونے کی حیثیت سے معبود اعلیٰ اُنھون
نے بھی سمجھا تھا* اور وحدانیت معبود کا خیال صرف سیمٹک
Semetic اقوام ہی کے دائرے کے اندر رہا جو اسلام مین
آخر انتہائی عروج کو پہونچ گیا۔
اب اس مضمون مین ہمین یہ دیکھنا ہے کہ کیا وحدانیت خدا
یعنی توحید کا خیال صرف اقوام سیمٹک Semetic ہی تک
محدود رہا یا یہ کہ ہندوستان کے آریون مین بھی یہ خیال تھا اور
ہے۔ اس مضمون مین یہ ثابت کیا جائیگا کہ اگرچہ یہ صحیح ہو کہ بلحاظ
امتیاز عبدیت و معبودیت، وحدت معبود کا خیال صرف سیمٹک
ہی اقوام مین پایا جاتا ہے لیکن خوف کے بجائے محبت سے
اور مطلقاً بے غرضی کے ساتھ پرستش یا عبادت معبود و نیز کثرت
مین وحدت کے خیال یعنی وحدت الوجود کے خیال کو پہونچنے کا
ثبوت ہندوؤن مین قدیم الایام سے موجود ہے۔ لفظ توحید مشتق
ہوا ہے احد سے جسکے معنی ایک کے ہین لیکن اصطلاح مین اسکے
یہ معنی لئے جاتے ہین کہ خدا کو ایک جاننا۔ خدا کو تو سب ہی ایک
جانتے ہین۔ دو کوئی نہین کہتا لیکن دیکھا جاتا ہے کہ وحدانیت
کے متعلق ہر مذہب مین جُدا جُدا خیالات ہین مثلاً۔
(۱) کوئی یہ سمجھتا ہے کہ خدا ہی ایک ہے جو ازل سے
ابد تک ہے باقی کوئی شئے ایسی نہین جو ازلی و ابدی ہو جس سے

* بعض فلاسفہ کا خیال اہل یونان مین بھی unknown God یعنی نامعلوم خدا کی طرف رجوع ہوا تھا۔

یہ مراد ہے کہ ازل مین وہ شئے نہ تھی اور ابد تک نہ رہیگی بلکہ اسکی ہستی خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ جب چاہے وہ اسکو مٹا سکتا ہے۔ یعنی معدوم کرسکتا ہے۔ وہ شئے ازل مین موجود نہ تھی خدا ہی اسکو عدم سے وجود مین لایا اور آخر ایک دن وہ اسکو معدوم بھی کردیگا۔ یہ صحیح ہے کہ اُس شئے کی بھی فی الوقت حقیقی ہستی ہے لیکن یہ ایک ایسی ہستی ہے جو ہستی مطلق یعنی خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگرچہ دونون کی علیحدہ علیحدہ حقیقی ہستی مانی جاتی ہے مگر فرق یہ ہے کہ ہستی مطلق (خدا) کو زوال نہین۔ یعنی وہ انقلابات کے تابع نہین جس حالت مین کہ باقی اشیا حادث اور انقلاب پذیر ہین۔

(۲) کسی کا یہ خیال ہے کہ صرف ذات مطلق یا خدا ہی کی حقیقی ہستی ہے جو ایک ہی ہے اور جسکو ماضی۔ حال و مستقبل تینون زمانون مین کوئی انقلاب نہین اور باقی دوسرے اشیا کا وجود اگر ہے تو وہ ظاہری ہے نہ کہ اصلی اور اُسی ایک حقیقی ہستی مین ان اشیا کے وجود کا دھوکا ہوجاتا ہے۔ اسیطرح جسطرح کہ ایک رسّی پر جو فی الحقیقت موجود ہے سانپ کا دھوکا ہوجاتا ہے جو فی الحقیقت موجود نہین ہے۔

(۳) خدا روح اور مادّہ تینون کی حقیقی ہستی ہے اور تینون ازلی و ابدی ہین۔ خدا ایک ہے اور تمام انقلابات سے پاک ہے لیکن روحین جو بیشمار ہین اور مادّہ دونون تابع انقلابات ہین۔ لیکن اُنکو کبھی فنا نہین اور نہ وہ معدوم ہوسکتے ہین۔ خدا کے ساتھ ساتھ اُنکی ہستی بھی ازل سے ابد تک ہے۔ خدا مالک اور یہ اُسکی مِلک ہین۔ خدا حاکم اور یہ اُسکے محکوم ہین۔ مگر یہ نہین ہے کہ خدا خالق اور وہ مخلوق ہین۔ یہان لفظ تخلیق سے مراد کسی شئے کو عدم سے وجود مین لانا ہے۔

پہلا خیال ہندوؤن مین کسی فرقۂ مذہبی کا نہین ہے۔ البتہ دوسرے اور تیسرے خیال پر اُنکے مذہب کی کل عمارت قائم ہے۔ سچی توحید تو پہلے اور دوسرے خیال ہی مین پائی جاتی ہے کیونکہ ان دونون مین ایک ہی ذات کی حقیقی ہستی مانی گئی ہے۔ خیال اوّل مین جب دوسری اشیا تابع مرضی خدا ہین اور وہ جب چاہے اُنکو مٹا سکتا ہے اُنکا وجود ازل سے نہین ہے اور ابد تک بھی نہ رہیگا تو پھر اُنکی ہستی ماضی۔ حال و مستقبل تینون زمانون مین نہین رہتی ہے۔ لیکن اس خیال کی نسبت یہ اعتراض ضرور وارد ہوتا ہے کہ ایک شئے جو معدوم تھی وہ وجود مین آئی۔ ہندو فلسفہ اور سائنس حال اس خیال کے بالکل مخالف ہین کیونکہ جبکی حقیقی طور پر کوئی ہستی نہ تھی وہ حقیقی طور پر ہست نہین ہوسکتا اور جو حقیقی طور پر ہست ہے وہ نیست نہین ہوسکتا یعنی غیر موجود سے موجود اور موجود سے غیر موجود نہین ہوسکتا۔ تیسرے خیال مین خدا روح اور مادہ تینون کی علیحدہ علیحدہ حقیقی ہستی مانی گئی ہے اور تینون کا وجود ازل سے ابد تک مانا گیا ہے۔ اگرچہ زمان و مکان کا خیال خدا کی نسبت نہین ہوسکتا لیکن اگر ہم ایک دفعہ اُسکو کیا بلحاظ زمان اور کیا بلحاظ مکان غیر محدود مان لین اور پھر روح اور مادّہ کو مکان و زمان دونون مین اُس سے علیحدہ مانین تو کیا بلحاظ زمان اور کیا بلحاظ مکان۔ خدا کی غیر محدودیت مین فرق آئیگا۔ بلحاظ زمان یا بلحاظ مکان صرف ایک ہی شئے غیر محدود ہوسکتی ہے۔ دو نہین۔ لہذا اس سے صرف ایک ہی وجود کی حقیقی ہستی ثابت ہوتی ہے جو غیر حادث اور علت و معلول کے خیال سے پاک ہے۔ البتہ اس تیسرے خیال مین بھی توحید اس معنی مین مانی جاسکتی ہے کہ حاکم ایک ہے دو نہین مگر وہ ایسا مقتدر حاکم نہین کہ جب چاہے اپنے بندون کو یا اپنی مِلک کو معدوم کردے

اور اسلئے ایسی صورت مین وہ ذات مطلق نہ رہا البتہ دُنیا کے وہم
بالکل الگ ہے وہ ہر ... ہوتے ہیں کیونکہ وہ ... جب تک ذات
... خیال ہی تو توحید ہمیشہ ہی ہے
... لیا گیا ہے ... توحید کو دور
نہین ... کر دیا ہے ... یہ دھوکا مٹ گیا تو ... حاصل
ہے۔ اس ... کی کوئی ... ہستی نہین ہے کیونکہ اصلیت
کا علم ہونے پر آخر وہ مٹ جاتا ہے۔ مگر جب تک وہ قائم رہتا
ہے اُسی ہستی کو ماننا پڑتا ہے۔ مثلاً جب تک ہم رسّی کو سانپ
سمجھتے رہین گے ہم ضرور اس سے خوف کھاتے رہین گے۔
ممکن ہے کہ یہ دھوکا منٹون بلکہ گھنٹون تک رہے لیکن جب
ایک مرتبہ وہ دھوکا جاتا رہا تو پھر وہ رسّی ہی ہے جسکی حقیقی ہستی
ہے اور نہ کہ سانپ ہے جسکی فی الواقع کوئی ہستی نہ تھی گو دھوکے
سے کچھ دیر کے لئے قائم ہوگئی تھی۔ اسیطرح ذات مطلق مین جو
اس عالم کے وجود کا دھوکا ہو رہا ہے اُسکی ابتدا کی نسبت اسیطرح
کچھ نہین کہا جا سکتا جسطرح کہ یہ نہین کہا جا سکتا کہ سانپ کے خیال
سے پہلے رسّی کا خیال تھا۔ کیونکہ اگر رسّی کا خیال پہلے ہوتا تو پھر
سانپ کا دھوکا رسّی پر کبھی نہ ہوتا۔ رسّی کا خیال نہ ہونے ہی
سے سانپ کا دھوکا رسّی پر ہوا۔ یہان یہ کہدینا چاہئے کہ ایک
وقت مین ایک ہی خیال رہ سکتا ہے۔ جب رسّی کا خیال ہے تو
سانپ کا خیال نہین۔ اور جب سانپ کا خیال ہے تو رسّی کا خیال
نہین۔ اسیطرح جب ذات مطلق کا خیال ہے تو سوائے ذات
مطلق کے اور کسی کی حقیقی ہستی نہین۔ یعنی عالم کثرت نہین ہے
اور جب اس عالم کثرت کا خیال ہے تو پھر ذات مطلق کا خیال
نہین۔ لیکن عالم کثرت فی الاصل ذات مطلق سے علیحدہ نہین
کیونکہ اس نمود کی بود تو فی الحقیقت وہی ذات مطلق ہے اور
اور چونکہ نمود عالم بے بود نہین اسلئے ہم اُسکو معدوم محض نہین کہہ سکتے۔
اور چونکہ اس نمود کا وجود ایک دوسرے وجود پر ہے اسلئے ہم
اسکو موجود محض بھی نہین کہہ سکتے۔

روح اور ذات مطلق کے ایک ہونے کو توحید کہتے
ہین مگر جبتک انانیت ہے جو نتیجہ ہے ہماری عدم معرفت کا یعنی
جب تک یہ خیال ہے کہ میری کوئی علیحدہ ہستی ہے یہ توحید حاصل
نہین ہوتی۔ اس حالت مین اُسی ایک حقیقت کو جیو یعنی روح
اور ایشور یعنی خدا دو علیحدہ علیحدہ نامون سے موسوم کرتے
ہین۔ ایسی حالت مین روح تو محکوم ہے اور خدا اُسکا حاکم
ہے۔ جبتک مین اپنی علیحدہ ہستی مانونگا مجھے یہ ضرور ماننا پڑیگا
کہ میرا مالک و حاکم خدا ہے۔ مگر انانیت کے مٹ جانے کے بعد
وہی ایک حقیقت روح اور خدا کی بلا کسی تفریق کے قائم
ہو جاتی ہے۔

اس مضمون کو پڑھکر بعض حضرات یہ کہہ اُٹھینگے کہ ہندوون
نے عقیدے مین تو بجائے ایک خدا کے تینتیس ۳۳ کرور خدا مانے
جاتے ہین جب یہ حال ہے تو پھر توحید کہان رہی۔ دیکھنا چاہئے
کہ کیا یہ اعتراض صحیح ہے۔ ہم دیکھتے ہین کہ ہندوؤن کی آبادی
تو چھبیس ۲۶ کرور سے زیادہ نہین مگر اُنکے معبودون کی تعداد تینتیس ۳۳
کرور بتائی جاتی ہے۔ پس فی ہندو ایک سے زیادہ معبود کا اوسط
پڑتا ہے۔ اس سے کہین یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس تعداد کے
لحاظ سے ہر ہندو کا جُدا جُدا معبود ہے۔ نہین بلکہ یہ کہا جاتا ہے
کہ ہر ہندو کے لئے تینتیس ۳۳ کرور معبودون کی اطاعت و عبادت لازم گردانی
گئی ہے۔ مشہور ہے کہ دو قانون کی اطاعت مشکل سے ہوتی
ہے یہان تینتیس ۳۳ کرور کی اطاعت ہر ہندو پر لازمی کہی جاتی ہے۔
✓ ہندوون کی مذہبی کتابون مین مقدم وید ہے۔ اُسکے بعد پران وغیرہ

ہین- ویدون مین لفظ دیوتا جو مستعمل ہوا ہے اُسکی نسبت پروفیسر میکس مُلر کی راے کا خلاصہ ذیل مین دیا جاتا ہے:-

"رشیون کے مذہبی خیالات کو بہ تدریج ترقی ہوئی ہے- ابتدا مین وہ آندھی مینہ بجلی- گرج- رات اور دن وغیرہ کے قدرتی مظاہر کو دیکھکر مبتلاے حیرت ہوئے اور اُنکی شوکت وعظمت اُنکے دلون مین جانشین ہوگئی- اسلئے اُنھون نے اُنکو دیوتا کہہ کہکر اندر اگنی ورن سورج متر وغیرہ کے نامون سے اُنکی ستائشین کرنی شروع کین- مگر یہ واضح رہے کہ کسی قسم کی پرستش اُس زمانہ قدیم مین نہ تھی محض ستائشین گائی جاتی تھین- پرستش کا قاعدہ اُس زمانہ قدیم مین اب تک جاری نہ ہوا تھا کیونکہ رشیون کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ جن دیوتاؤن کی وہ ستائش کرتے ہین وہ بذات خود اُنکے روبرو موجود ہین اور اُنکی ستائشون کو سن رہے ہین- جب کبھی اُن رشیون کو یہ خیال ہوتا تھا کہ قدرت کی ان قوتون مین سے کسی خاص قوت کو زیادہ زور ہے اور اُسکا کوئی بڑا اثر پڑ رہا ہے تو اُسی دیوتا کو اُنھون نے صرف اُسوقت کے لئے سب سے بڑا دیوتا خیال کیا اور اُسی کو اُنھون نے اپنا سب سے بڑا معبود سمجھا"

صرف اتنا ہی نہین ہے جتنا کہ مکس ملر نے لکھا ہے بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ وحدت معبود کا خیال صاف صاف الفاظ مین سنگھتاؤن مین موجود ہے- چنانچہ رگ وید کی کئی رچائین اسکی شاہد ہین جنمین سے سب سے مشہور یہ ہے-

"وہ اُسکو اندر- متر- ورن اور اگنی کے نامون سے پکارتے ہین لیکن ایک ہی سچ ہے یا جو فی الحقیقت موجود ہے وہ ایک ہی ہے رشی لوگ اُسکو مختلف نامون سے یاد کرتے ہین مثلاً اگنی یم- متر وغیرہ"

اسیطرح اسی رگ وید کی ایک رچا یہ ہے-

"وجود صرف ایک ہی کا ہے مگر رشیون نے اُسکو اپنے اپنے خیال کے لحاظ سے الگ الگ نامون سے پکارا ہے"

غرض کہ وحدانیت کا پورا پورا خیال ویدون مین موجود ہے اور کثرت مین وحدت یا روح اور ذات مطلق کی توحید کے خیال کی تلقین آگے چلکر اپنشدون مین بڑے زور شور سے کی گئی ہے جسکا ذکر تفصیل سے سابق کے مضامین مین آچکا ہے-

پرانون مین لفظ دیوتا کہین جسمانی اور مادّی معنی مین مستعمل ہوا ہے یہ مثل انسان کے ہاتھ پاؤن آنکھ ناک وغیرہ رکھنے والے اشخاص سمجھے گئے ہین- البتہ انکو بمقابلہ انسان کے صرف اسی معنی مین غیر فانی کہا گیا ہے کہ وہ کلپ یعنی دور عالم کی انتہا تک موجود رہینگے- لیکن کلپ کے آخر مین مثل اورون کے یہ بھی فنا ہوجائینگے- یہ بھی بخوبی واضح رہے کہ مکتی یعنی نجات حاصل کرنے کے لئے ان دیوتاؤن کو بھی انسان کے قالب مین پیدا ہونا پڑتا ہے- کیونکہ مکتی صرف انسان ہی کے قالب مین مل سکتی ہے- غرض کہ اس معنی مین انسان کے قالب کو دیوتا کے قالب پر فضیلت حاصل ہے- انمین سے چند دیوتاؤن کو بہ نتیجہ ریاضت عالم کی کچھ حکومت بھی حاصل ہے اور اسی لئے وہ ایک طرح انسان کے معبود سمجھے جاتے ہین- کیونکہ اُنکو قدرت عطا حاصل ہے- البتہ اس معنی مین شرک کا الزام ہندوؤن کے مذہب پر عائد ہوتا ہے- لیکن جب ادویت یعنی وحدت الوجود مین وہی ایک ذات مطلق کل ظاہری وجودون (کیا دیوتا کیا انسان اور کیا جانورون) مین ظاہر ہوتی ہے تو یہ کوئی ایسا الزام نہین جو تسلیم کیا جاسے- کیونکہ دیوتا بھی آخر اُسی ایک ذات کے مظہر ہین- البتہ فرقہ دویت کی نسبت جنکے عقیدہ مین صرف ایک شخصی خدا اس تمام عالم کا حاکم ہے اور جنکے یہان خداوندی اور بندگی کا بھی امتیاز ہے البتہ یہ الزام ایک حد تک صادق آتا ہے- ایک حد تک صرف اسلئے کہ دیوتا

مین اقتدارات کو عمل مین لاتے ہین وہ بھی تو مفوضہ خدا یتعالی ہین۔ کچھ اُنکے ذاتی اقتدارات نہین ہین۔ مگر یہ دراصل شرک ہے یا نہین اسکا فیصلہ بھگوت گیتا مین بھگوان سری کرشن نے نہایت خوبی کے ساتھ فرمایا ہے جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ

"جنکو اسکا علم نہین ہے کہ حقیقت کیا ہے اور جو اپنے اگلے افعال کے اثر سے طرح طرح کے طریقون کو اختیار کرکے دوسرے معبودون کی پرستش کرتے ہین اور جو دنیاوی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے سچی عقیدت کے ساتھ اُن معبودون کی پرستش کرنے مین مصروف ہوتے ہین اُنکی اس عقیدت کو اُن معبودون مین مین جو ہر ایک مین موجود ہون مضبوط اور راسخ کردیتا ہون۔ وہ سب اپنے اپنے حُسن عقیدت کے ساتھ اُن معبودون کی پوجا کرتے ہین پھر مین ہی اُنکے حسب مراد اُنکی خواہشات کو پورا کردیتا ہون۔ کم عقل لوگون کو اس پوجا کا جو پھل اسطرح حاصل ہوتا ہے وہ جلد ضائع ہو جاتا ہے مگر جو لوگ اپنی تمام خواہشات کو چھوڑ کر مجھ مین دل لگاتے ہین وہ اُس دائمی مسرت کو حاصل کرتے ہین جسکی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا"

اسکی تشریح یہ ہے کہ جنکو حقیقت کیا ہے اسکا علم نہین یعنی جنھون نے یہ نہین جانا ہے کہ جو عین حقیقت ہے وہ تو وہ خود ہی ہین وہ اُس سے علیحدہ نہین۔ یا یون کہو کہ جنھون نے خداوند حقیقی کو نہین پہچانا ہے اور جو جہل سے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے دوسرے خداوندون سے جو خواہ دُنیاوی ہون یا علوی یعنی از قسم دیوتا و پیر و اولیا ہون طالب امداد ہوتے ہین اور اُنکی خدمت گزاری۔ پرستش یا عبادت کرنے مین سچی عقیدت کے ساتھ مصروف ہوتے ہین۔ جو لوگ ایسے ہین اُنکے حُسن عقیدت کو اُن خداوندون یا معبودون ہی مین (خداوند حقیقی سے جو حاضر ناظر یعنی ہر جا حاضر و ناظر ہے یا جسکا جلوہ ہر ایک کے خانۂ دل مین ہے یا جسکا ظہور اُن معبودون اور عابدون دونون مین بلحاظ مرتبت ہوا ہے) اور مضبوط اور راسخ کردیتا ہون اور وہ سب اپنے اپنے حُسن عقیدت کے ساتھ اُن خداوندون یا معبودونکی پوجا کرتے ہین اور پھر مین ہی جو پوجا کا پھل دینے والا اور مرادون کو پورا کرنے والا ایک ہی ہون اُنکے حسب مراد اُنکی خواہشات کو پورا کردیتا ہون۔ یعنی پھل تو دینے والا مین ہی ہون پوجا چاہے کوئی میرے کسی نام یا میری کسی شکل کی کرے۔

ہم یہ جانتے ہین کہ مطلق کا خیال ہمارے دل مین کبھی نہین آسکتا جب تک ہم مادی اشیا کو اپنے خیال مین نہ لائین جو اُس مطلق کو ظاہر کرتی ہین۔ مثلاً خوبصورتی کا خیال ہمکو ہرگز نہین ہوسکتا تا وقتیکہ ہم اُن خوبصورت چیزون کو نہ دیکھین جنکو ہم نے خوبصورت سمجھ رکھا ہے۔ ہماری زبان سے جو حروف نکلتے ہین اُنکی جب تک آواز نہ ہو یا اُنکو کوئی شکل نہ دیجائے ہم کسیطرح اُنکا اظہار نہین کرسکتے۔ ہم جانتے ہین کہ یہ حروف کسیطرح نہ نام کے محتاج ہین اور نہ شکل کے اور وہ اپنی مطلق حیثیت سے ہمیشہ موجود ہین۔ مگر جب ہم اُنکا اظہار کرنا چاہین گے تو ہمکو پہلے نام دینا ہوگا اور پھر شکل بھی بغیر نام و شکل کے ہمارا کام کسیطرح نہین چل سکتا۔ اسیطرح خدا کو جو ذات مطلق ہے ہم نہین پہچان سکتے جب تک کہ ہم اسکا خیال کسی صفات یا نام یا شکل کے ذریعے سے نہ کرین۔ سنسکرت مین دو لفظ ہین۔ ایک گیان یعنی معرفت اور دوسرا دھیان یعنی تصور۔ سادھی کے ذریعہ سے ہمکو نرگن یعنی ذات مطلق کا گیان ہوسکتا ہے۔ مگر جب ہم اُسکا دھیان کرینگے تو ہمکو لازم ہوگا کہ ہم اُسکو کوئی صفت دیکر اُس صفت کے لحاظ سے کوئی نام اور شکل دین۔

یعنی تصور کے لئے تصویر چاہیئے اور چونکہ ہم انسان ہین اسلئے ہمارے ذہن مین خدا کی شکل انسان ہی کی شکل کی سی آئے گی۔ لوگون نے انسانی صفات والے خدا کا خیال دور کرنے کی بہت کوشش کی ہے کیونکہ اپنی طرح خدا کو ایک انسان سمجھ لینا اُنکے نزدیک ایک گناہ عظیم ہے۔ مگر جبتک ہم ایک شخصی خدا کے خیال مین مبتلا رہین گے ہمین لامحالا اُسکو انسانی صفات دینا پڑینگے۔ اس سے گریز نہین ہوسکتا۔ مگر جہان یہ خیال ہے کہ وہ صرف ذات مطلق ہے اور سوا اُسکے کوئی دوسرا وجود نہین یا کوئی دوسری حقیقی ہستی نہین ہے وہان البتہ خدا انسانی صفات سے کیا بلکہ تمام صفات سے مُبرّا ہے۔ وہ نہ دیکھتا ہے۔ کیونکہ دیکھنے کے لئے کوئی شئے نہین اور نہ سُنتا ہے کیونکہ سُننے کے لئے کوئی آواز نہین اور نہ وہ قادر ہے کیونکہ کوئی ایسی چیز نہین ہے جسپر وہ اپنے اقتدار کو کام مین لائے۔ ہم چونکہ خود مقید ہین یا یہ کہ ہمنے اپنے کو مقیّد سمجھ رکھا ہے اسلئے ہم اُسکو بھی مقیّد کرنا چاہتے ہین۔ سب سے پہلے ہم اُسکو بالتخصیص صفات مایا یعنی تعیّنات کے اندر ایک ایشور مین مقیّد کرتے ہین پھر صفات کے لحاظ سے اُسی ایک ایشور کو تین روپ یعنی برہما۔ وشنو اور مہیش مین مقیّد کرتے ہین اور پھر اُسکے بعد انسانی شکل مین رام اور کرشن کے جسم مین مقیّد کرتے ہین اور سب سے آخر مورتون مین۔ غرض کہ جیسی جسکی جسمین عقیدت ہے ویسے ہی وہ ذات مطلق کو مختلف اشکال مین مقیّد کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اُسکی ستائش یا پرستش کی خواہش کو پورا کرکے اُس سے اپنے کسی مطلب کو حاصل کرے یا اُسکے عشق اور محبت مین غرق ہو۔

اگرچہ ذات مطلق فی الحقیقت کبھی مقیّد نہین ہوتی تاہم پرستش کی خواہش رکھنے والا شخص اُسکو اپنی پرستش کے اغراض کیلئے مقیّد کرنا چاہتا ہے۔ یعنی وہ جو غیر شخصی خدا ہے بطور شخصی خدا کے ظاہر ہوتا ہے۔ جب پرستش مقصود ہوتی ہے اور اُسی کو ویدانت کی اصطلاح مین ایشور کہتے ہین۔ اس درجہ تک ذات مطلق کو مقیّد کرنے ہین جسم کا کوئی خیال نہین ہے اور اگر اُسکا کوئی جسم ہے تو وہ مایا ہے۔ جب اُسی ایک ایشور کے اُسکے تین مشہور صفات کے لحاظ سے تین روپ مانے گئے مثلاً برہما۔ وشنو اور شیو اور پھر اُسکے اوتارون کے روپ بھی علیحدہ علیحدہ لیے گئے مثلاً رام و کرشن وغیرہ تو خدا کی نسبت جسمانیت کے خیال کو اور ترقی ہوئی اور اس جسمانیت کا آخری درجہ وہ ہے جب وہ خدا مورتون کی شکل مین پوجا جاتا ہے۔ وہ مورتین چاہے شیو اور وشنو کی ہون چاہے رام و کرشن اوتارون کی۔ یہ بخوبی واضح ہے کہ مذہب ویدانت کے بموجب ذات مطلق ہمیشہ غیر مقیّد اور لاتعیّن ہے چاہے ہم اسکو ایشور کرکے یا برہما و وشنو و شیو کی شکلون مین اور چاہے رام و کرشن وغیرہ اوتارون کے روپ مین اور بالآخر چاہے مورتون کی شکل مین پوجین ان سب شکلون مین وہ غیر مقیّد اور لاتعیّن ہی ہے۔ اگرچہ ہمکو وہ مقیّد ہی معلوم ہو۔ ویدانت کی اصطلاح مین "ہونا" اور "ظاہر ہونا" یا "معلوم ہونا" دو علیحدہ علیحدہ چیزین ہین۔ یہ کہنا کہ مطلق مقیّد ہوجاتا ہے بالکل لغویات ہے کیونکہ یہ دونون متضاد الفاظ ہین۔ مگر مطلق بطور مقیّد کے ظاہر ہوتا ہے یہ مانا جاسکتا ہے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر بالفرض ہندو تینتیس ۳۳ کروڑ خداؤن کے قائل نہین ہین تو تین خدا کے تو وہ ضرور قائل ہین اور اُنمین سے کم سے دو کی پرستش ہندوؤن مین برابر دیکھی جاتی ہے۔

غرض کہ ہندوون مین توحید کا خیال نہین ہے بلکہ مثل عیسائیون کے وہ تثلیث کے قائل ہین - اسکا جواب یہ ہے کہ اس کائنات کی کل اشیا تمام صورت و شکل رکھنے والی ہین اور سب سے وہ خارج نہین ہین - اسی طرح سب تعینات کے اندر آ جانے سے ذات مطلق کا نام ایشور ہوا اور ذات موصوف بہ تعینات ہوا تو مختلف صفات کے لحاظ سے اسکو علیحدہ علیحدہ نام بھی دیے گئے مثلاً خالق - رب - قہار - رحیم - کریم - غفار - جبار وغیرہ وغیرہ اور عالم کے پیدا کرنے اور پالنے اور فنا کرنے کے تین خاص صفات کے لحاظ سے اسی ایک ذات مطلق یا ایشور کو تین نام دیے گئے ہین اور جب نام علیحدہ علیحدہ ہوے تو اسکے روپ یعنی اشکال بھی علیحدہ علیحدہ ماننا پڑینگے - جب کوئی شخص غصہ ہوتا ہے تو اسکی شکل و صورت اس سے علیحدہ ہی ہوگی جب وہ مجسم غضب ہے - اس امر کے ثبوت کے لئے کہ یہ تینون اشکال ایک ہی ذات واحد کے مظہر ہین اور یہ کہ ہندو توحید کے قایل ہین سنسکرت کی بعض مشہور استوترون یعنی مناجات سے چند اقتباسات بیان درج کئے جاتے ہین -

مناجات بھگوان شیو

کیسے ہین بھگوان شیو جگت کے بیج یعنی عالم کے تخم ہین مراد یہ کہ تمام عالم انھین سے پیدا ہے وہ سارے عالم کی ابتدا ہین انکو کوئی خواہش نہین - انکی کوئی شکل نہین - جس سے یہ عالم پیدا ہوتا ہے اور جو اسکو پالتا ہے اور جسمین یہ فنا ہو جاتا ہے - ایسی ایشور کی مین ستائش کرتا ہون نہ وہ خاک ہے نہ آب نہ آتش اور نہ باد اور نہ آکاش اور گو اسکی کوئی صورت یا شکل نہین ہے لیکن تین شکلون مین ظاہر ہونے والے ایسے ایشور کو مین سجدہ کرتا ہون - انکی پیدائش نہین - ہمیشہ قائم رہنے والے ہین - علت العلل ہین ہمیشہ بھلائی کرنے والے ہین - ذات واحد ہین - لاشریک ہین وغیرہ وغیرہ -

(۲)

تو ہی برہما سرشٹی کا پیدا کرنے والا ہے اور تو ہی وشنو جگت کا پالنے والا ہے اور تو ہی شیو تمام عالم کو اپنے مین فنا کرنے والا ہے بھکتون یعنی عابدون کے دھیان کے لئے تو طرح طرح کی شکلون کو اختیار کرتا ہے اور جو شکل جسکو پیاری ہے اسی شکل مین تو اسکے لئے ظاہر ہوتا ہے -

مناجات بھگوان وشنو

مین سجدہ کرتا ہون تجھکو جو برہما ہوکر عالم کو پیدا کرتا ہے وشنو ہوکر اسکو قائم رکھتا ہے اور شیو ہوکر اسکو اپنے مین فنا کر لیتا ہے - سب تعریفین سزاوار ہین تجھکو جو تمام ملائک و جنات و انسان و حیوانات و طیور و نباتات و جمادات اور پانی - آگ - ہوا اور آکاش وغیرہ وغیرہ کا اصلی جوہر ہے - یوگی تیرا ہی دھیان کرتے ہین - تو وہ ہے جسکا نہ کوئی نام ہے نہ شکل اور پھر تیرے ہزارون نام ہین اور ہزارون شکلین ہین - تیری کوئی صفت نہین ہے - بجز اسکے کہ تو ہی ایک حقیقت ہے جو ہے -

یہ تو فرقہ ادویت کا ذکر ہوا جو وحدت الوجود کے قائل ہین - اب رہے وہ ہندو جو دویت یعنی دوئی کے قائل ہین اور جنکے یہان جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے خدا روح اور مادہ تینون کی علیحدہ علیحدہ ہستی مانی گئی ہے - انکے یہان صرف بھگوان وشنو ہی ایک ہین جو خداوند حقیقی ہین اور ساری کائنات کے مالک ہین - چونکہ انکے عقیدے مین نہ صرف صفات سے بلکہ ذات سے بھی روح اور خدا دونون ایک دوسرے سے جدا جدا

ہین اسلئے بھگوان وشنو جو خداوند حقیقی ہین تمام روحون سے جنمین برہما و شیو وغیرہ دیوتا بھی شامل ہین۔ بالذات و نیز بالصفات دونو حالات سے جدا ہین اور جسطرح کہ تمام جیو یعنی روحین اُنکی محکوم ہین اسیطرح یہ دیوتا بھی اُنکے محکوم ہین اور جو اقتدارات انہین سے ان کو حکومت عالم کے حاصل ہین وہ اُنکو بھگوان وشنو ہی کیطرف سے بہ نتیجۂ ریاضت و عبادت عطا ہوئے ہین۔ لیکن کوئی ذاتی اقتدار اُنکو حاصل نہین اور کلپ یعنی دور عالم کے آخر مین صرف ایک ذات وشنو ہی کی باقی رہیگی باقی سب اُنمین فنا[۱] ہوجائینگے۔ لہذا اس عقیدے مین بھی وحدت خدا کا خیال موجود ہے۔

پربھولال

مالک الدولہ حسین جعفر خان بہادر صولت

خاندانی شاعر[۲] بادشاہ کے اُستاد فتح الدولہ برق کے بھتیجے تھے۔ انکے خاندان کے سب لوگ فصحاے لکھنؤ و میرزایان شہر مین سے تھے۔ اس گھر کے سب لوگون پر بادشاہ کی نہایت نظر عنایت تھی۔ یہ میرے سامنے کا ذکر ہے کہ انکے والد مرحوم کیدان مہتم الدولہ بہادر مرزا جعفر صاحب ایک دفعہ مبتلاے سنگ مثانہ ہوکر صاحب فراش ہوگئے تھے کہ بادشاہ عیادت کے لئے خود چلے آئے اور جب تک علیل رہے دونون وقت خیر و عافیت پوچھنے کو میر دہہ بادشاہ کے پاس سے آیا کیا۔ یایانِ بزم شاہی مین ایسا امتیاز کسی کو کم حاصل تھا۔ ڈاکٹرون نے بیہوش کرکے عمل بالید کے ذریعہ سے آخر اُس پتھری کو نکالا اور بیمار کو افاقہ ہوگیا۔ مالک الدولہ نے تاریخ کہی۔ سنگ آمد و سخت آمد۔ اسپر جو مصرعے لگائے ہین اُنمین بادشاہ کے عیادت فرمانے کا اور دعا پڑھنے کا ذکر بھی نظم کردیا ہے۔

یہ لوگ بڑے بہادر، صاحب جوہر، بنکیت اور پھکیت اور مشہور قدر اندازون مین تھے۔ شرفاے لکھنؤ مین ان فنون کا بھی حد سے زیادہ چرچا تھا۔ اس فن کی مشاقی کے جیسے جیسے تذکرے متواتر سُننے مین آئے ہین حیرت انگیز ہین۔ ایک بزرگ سفر حجاز مین تھے۔ قافلہ کسی منزل پر ٹھہرا یہ بھی استنجا کرنے کو کسی جھاڑی مین چلے گئے۔ وہان کوئی عرب نیزہ گھات مین لگا ہوا تھا۔ سر پر آکے اس زور سے ڈانڈ لگائی کہ تیورا گئے۔ وہ ظالم لوٹا لے کر ہوا ہوگیا۔ انھین ہوش آیا تو اُس جھاڑی کو اچھی طرح سے پہچان لیا اور منزل کا نام بھی لکھ رکھا۔ زیارت سے مشرف ہوکر جب اسی منزل پر پہونچے ہین تو انتقام لینے کا خیال آیا۔ ایک ڈنڈا بغل مین دبالیا اور ایک لوٹا ہاتھ مین

---

۱ لفظ فنا سے یہان مراد کسی شے کا معدوم ہوجانا نہین ہے بلکہ ایک شے کا دوسری شے مین غائب ہوجانا۔ ہندوؤن مین کلپون یعنی عالم کے دورون کا عقیدہ ہے جنکے سلسلے کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ ہر دور کے آخر مین پرلے [illegible] یعنی قیامت ہوتی ہے۔ جس زمانہ مین حالت سکون رہتی ہے۔ پرلے مین تمام کائنات ایشور مین لے [illegible] یعنی فنا رہتی ہے یعنی بالفعل سے بالقوی ہوجاتی ہے اور جب پھر سرشٹی یعنی پیدائش عالم ہوتی ہے تو جو کائنات ایشور مین سابق کے دور مین فنا ہوئی تھی وہ پھر ظاہر ہوتی ہے یعنی بالقوی سے پھر بالفعل ہوجاتی ہے لیکن جن روحون کی مُکتی یعنی نجات کسی ایک دور مین ہوچکی ہے وہ پھر نہین پیدا ہوتی ہین۔

اُٹھا لیا اور اُسی بندوق میں جا کر استنجا کرنے کے طرز پر بیٹھ گئے۔ مگر ہوشیار بیٹھے۔ بندوق بھرا تھا کہ وہ آ ہی پہونچا۔ انہوں نے بندوق کو سر سے اونچا ہی کیا تھا کہ اور شیر نے کمنی کا ہاتھ پورا پڑ گیا۔ ڈنڈا انگلی پر جا کر بیٹھا۔ وہ او مردم سے گرا اور ادھر پڑا اوٹا اور تڑتڑاتے ہوے قافلہ سے آملے۔ بڑے میان سے کہتے تھے کہ اس دن مجھے اس نظارے نے مار ہی ڈالا تھا اور اب تک نہیں معلوم کتنے دن تک کرتا کیا ہو گا۔ آج میں نے ایک ہاتھ مارا یا اگر بچ گیا تو عمر بھر یاد کرے گا اور اگر مر گیا تو میں بری الذمہ ہوں۔ ایک اور صاحب غلیل کے نشانہ میں قدر انداز تھے۔ قافلہ پر بدوی آ گرے۔ گٹھریاں بغل میں دبا لیں۔ بڑے بڑے گٹھر پیٹھ پر لادے۔ برچھے بیبیوں کی تھیلیاں دانتوں پر اٹھا لیں اور اب سارے قافلہ کو لوٹ کر جایا چاہتے تھے کہ ان بزرگ نے ایک غلیل اٹھا کر تڑاتڑ چند گولیاں ماردیں۔ ایسے کٹتے پڑتی کہ نیزہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ اُسکی کہنی پر پڑی کہ بقچہ بغل سے نکل پڑا۔ سب کے سب ڈھیلے ہو گئے۔ جب گولی پڑی جوڑ پر پڑی۔ ہاتھ چھوٹے ہو گئے پاؤں نکمے ہو گئے۔ جسنے برچھا اٹھایا اُسکے گٹے اور کہنی اور مونڈھے کے جوڑوں کو توڑ کے رکھدیا اور پھر لطف یہ کہ کسی کو جان سے نہیں مارا۔ کسی کی آنکھ کو نہیں پھوڑا۔ ورنہ قلب پر اور کنپٹی پر گولی کا پڑنا موت کا پیغام تھا۔ انسان کا مارنا تو کجا کبھی چڑیا کو بھی ان بزرگ نے نہیں مارا۔ فاختہ درخت پر بیٹھی بول رہی ہے اور احباب نے مجبور کیا کہ مرزا صاحب نشانہ لگائیے۔ بہت اصرار کرنے سے نشانہ لگایا مگر ایسا اوچھا کہ فاختہ درخت سے تو گر پڑی لیکن زمین پر لوٹ کر پھر اُڑ گئی۔ پچیس چھبیس برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ میرے دوستوں میں حکیم مرزا باقر صاحب مرحوم گردش زمانہ و بے وفائی روزگار سے تنگ آ کر لکھنؤ سے حیدرآباد تک پیدل چلے آئے اور غلیل کے سوا کچھ زادراہ ساتھ نہ تھی۔ یہاں کچھ سہارا ہو گیا تھا مگر وقت رحلت بھی قریب ہی آ چکا تھا۔ اُردو میں فن محاضرہ کسی نے نہیں لکھا ورنہ ان بزرگوں کے حالات سے دفتر بھر جاتے۔

ملک الدولہ مرحوم کی طبیعت میں بھی وہی خاندانی آن بان موجود تھی۔ وضع کے بڑے پابند، انتہا کے کم سخن، فکر شعر نے انہیں چپ کر دیا تھا۔ بات بہت کم کرتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ سوچ رہے ہیں۔ میں نے عموماً اس بات کو خیال کیا ہے کہ شعرا کے چہرہ سے بشاشت و شگفتہ روئی جاتی رہتی ہے۔ کچھ یہ ضرور نہیں کہ ہر وقت وہ سوچ میں رہتے ہوں اور فکر شعر سے کسی وقت خالی نہ ہوتے ہوں۔ نہیں بلکہ فکر کرتے کرتے بشرہ پر آثار فکر مرتسم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس مسئلہ میں یورپ کے فلاسفہ کا یہ قول کسقدر مطابق واقع کے ہے کہ خیال موثر ہے اور مادہ منفعل یعنی اسباب جسمانی وجود اخلاقی کی علت نہیں ہیں بلکہ اخلاق علت ہیں اور وضع و احوال جو اجسام پر طاری ہوتے ہیں وہ معلول ہیں۔ شعرا جیسی فکر شعر میں کرتے ہیں اگر اور فنون میں اسطرح مستغرق ہوں تو بہت کچھ انکشافات ہوں۔ زہیر بن ابی سلمہ چار مہینے میں قصیدہ کہتا تھا۔ پھر چار مہینے تک اُسمیں اصلاح کیا کرتا تھا۔ پھر چار مہینے اہل ذوق کے سامنے پڑھا کرتا تھا۔ برس دن میں وہ قصیدہ اس ہوتا تھا کہ سوق عکاظ کے مشاعرہ میں پڑھا جائے۔ انگلینڈ کے شعراے متاخرین میں ٹینیسن کا یہ حال تھا کہ کہتے ہیں اُسکی تکمیل قریب بانکشاف پہونچ گئی تھی۔

بادشاہ اپنا غم بہلانے کے لئے جاڑوں بھر تو کبوتروں میں مشغول رہتے تھے تین تین سو اور چار چار سو کبوتروں کا ساتھ ایک رنگ کا اور ہر ایک کوٹھی میں کئی ایک کبوتر خانے۔ ایک لاکھ

کبوتر تھا اور ۲ اٹھ تو سو کبوتر باز جنمین اکثر شرفا و سادات لکھنؤ کے خانمان ویران و آوارہ وطن ملازم تھے۔ جسنے کسی ساتھ کو دو چار بھڑیان دیکر اُڑا دیا دوشالہ اور رومال اور انعام سے مالا مال ہوگیا اور کبوترون کو روغنی روٹیان کھلانے کے لئے ہزار روپے اسکے علاوہ ملجاتے تھے۔ گرمیان آئین اور جہان پناہ نے کبوترون کا شغل موقوف کیا۔ اب خس خانہ مین سارا سارا دن گزر جاتا ہے۔ مراقیت و خفقان کا زور رہتا ہے۔ دھوپ کی طرف دیکھنا ناگوار ہوتا ہے۔ اس زاویۂ عزلت مین غم غلط کرنے کی راہ کچھ دنون یہ رہی کہ بلبلون کے پنجرے خس خانہ کے قریب آویزان ہین اُنکے زمزمون سے وحشت دل کا علاج کر لیتے تھے۔ مگر یہ چڑیا ہر فصل مین نہین بولتی۔ کچھ دنون بے زبانون سے دل بہلاتے رہے۔ خس خانون کے اندر سنگ مرمر کے حوض بنے ہوئے ہین اُنمین لال مچھلیان چھوٹی ہوتی ہین۔ فوارے چل رہے ہین۔ حوضون مین سوار ڈالی جاتی ہے۔ جب مچھلیان اُسمین انڈے دے لیتی ہین تو سوار مٹی کے ناندون مین ڈالدیجاتی ہے اور کچھ دنون مین بچے نکل آتے ہین۔ ماہی گیرون کو انعام ملتا ہے۔ برسات کی فصل بادشاہ کے مزاج سے بہت موافق تھی۔ اکثر سوار ہوتے تھے اور باغون کی آرائش مین مشغول رہتے تھے۔ اس زمانے مین تعمیر کا شغل بہت رہتا تھا۔ قصر مرصع منزل سہ منزلہ ایوان تھا۔ حکم ہوا کہ اُسکے دونون پہلوؤن مین دو منارے اتنے ہی بلند تعمیر کئے جائین۔ اُس بلندی پر دو پنجرے آہنین کٹہرون کے تیار ہون۔ اُنمین ریچھ چھوڑے جائین۔ خیال یہ ہوا کہ ریچھ کو گرمی زیادہ لگتی ہے۔ رمنہ مین زرافہ کے لئے مچان بنوائی کہ اُسکو دانہ مچان پر کھلایا جائے۔ سانپون کا شیشون مین بند رہنا گوارا نہوا اور اُنکا کھلا رہنا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا۔ ایک عجیب تدبیر کی جو بادشاہ کی جودت طبع و جدت فکر کی طرفہ دلیل ہے۔ شہنشاہ منزل ایک کوٹھی ملکہ باغ مین تعمیر ہو رہی تھی۔ اسی کوٹھی کے طرۂ ایوان کے سامنے ایک پہاڑ بنوا کر سیکڑون سانپ اُسمین چھڑوا دئے کہ پہاڑ پر پھرنے کے سوا اور کہین جا ہی نہ سکتے تھے۔ شاہزادہ مرزا کام بخش بہادر ملکہ باغ مین رہتے تھے اُنکی تعلیم کی خدمت میرے حوالہ تھی۔ مالک الدولہ صولت مرحوم کو مجھسے بہت اُنس تھا۔ جب بادشاہ کے سلام کو حاضر آتے تھے مجھسے ضرور ملتے تھے۔ جب کوٹھی تیار ہوگئی اور سج جاچکی تو بادشاہ دیکھنے کے لئے رونق افروز ہوئے۔ سبعہ سیارہ شعراے دربار شاہی تاریخین پڑھ پڑھکر سنانے لگے، اور مورد تحسین و آفرین ہوئے۔ مالک الدولہ اپنی تاریخ مذہب کرکے ایک فریم مین لگا کر لائے تھے۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ شہنشاہ منزل کے ایک فراش نے آکر خبر دی کہ جہان پناہ نے یاد کیا ہے۔ گئے تاریخ ملاحظہ مین گزرانی اور کوٹھی کے خاص کمرہ مین لگا دی گئی ؎

کیا خوب ہے یہ بناے عالی — ہر نقش و نگار مین ہے صنعت
اس اوج کو ہو کر دیکھتا ہے — کہتا ہے کہ ہے خدا کی قدرت
جس شخص نے آنکھ اُٹھا کے دیکھا — آئینہ ہوا۔ ہوئی یہ حیرت
صولت نے لکھا یہ مصرع سال
یہ قصر ہے یا ہے قصر جنت
۱۲۰۹ھ

کوٹھی کے سامنے پہاڑ ہونے سے یہ بات نہ تھی کہ ملکہ باغ کا منظر بالکل چھپ گیا ہو۔ پہاڑ کے شکم مین ایک مستطیل درۂ کوہ تھا۔ اُسمین اتنی بڑی ایک چیت تھی جسے بکرا نگلتے ہوئے مین دیکھا ہے۔ اس درۂ مصنوعی کے دونون طرف آہنین سیخچے لگے ہوئے تھے کہ چیت بھی نکل نہ سکتی تھی اور

باغ کا سامنا بھی صاف تھا۔ اسپر سیکڑوں خالی مٹکے تلے اوپر رکھے ہوئے تھے جن پر سیاہ روغن کیا ہوا تھا۔ مٹکوں کے موکھڑوں کے درمیان جو غیبہ چھپی ہوئی تھی اُسمین سفالی نل لگے ہوئے تھے جو سانپ کی بانبیوں کی طرح ہوا دو وضاً لگائے گئے تھے۔ اس مصنوعی پہاڑ کی چوٹی شہنشاہ منزل کے لب بام سے باتین کرتی تھی۔ پہاڑ کی چوٹی سے آبشار چھوٹتے تھے جسکا خزانہ کوٹھی کی چھت پر تھا اور پانی کے بہنے بھی جابجا بنائے گئے تھے جنکے سبب سے پہاڑ پر کی ہری ہری دوب ہمیشہ لہلہایا کرتی تھی کوٹھی کے سامنے پہاڑ ایک گلدستہ معلوم ہوتا۔ پہاڑ کے چارون طرف دو دو گز گہری اور چوڑی ایک خندق کھدی ہوئی تھی اگر سانپ جست کرکے نکلنا چاہتا تھا تو خندق مین گر پڑتا تھا۔ گرکے لہراتا ہوا دیوار تک پہنچا اور چڑھنا شروع کیا۔ خندق کی دیوار مین لداؤ کا کام ہے ساری دیوار ہلالی ہے اُسپر چونے کی گھٹائی مین ایسا اہتمام کیا گیا ہے کہ آئینہ کی طرح عکس پڑتا ہے سانپ جون جون چڑھتا ہے اُلٹتا جاتا ہے۔ جب تک دُم زمین پر ٹکی ہوئی ہے لپٹا ہوا ہے۔ ذرا اور اونچا ہوا اور اپنا بوجھ سنبھالنا اوسے مشکل ہوگیا۔ اب ذرا بھی جنبش کی تو زمین پر آرہا عاجز آکر پھر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ یہان سیکڑون دھامن اور کالے ناگ اور کوڑیالے سبزہ پر لہرا رہے ہین۔ اُنکے کھانے کے لئے مینڈک اور چوہے بہت سے کیڑے مکوڑے اُسی خندق مین چھوڑ دیے جاتے تھے اور سانپ کے شکار کا لطف دیکھنے مین آتا تھا۔ مجھے اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ چڑی مارنے تھیلے مین سے چڑیا نکالی اور سانپ کو دُور سے دکھائی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ چڑیا مجھے دیتا ہے اور جلدی سے اُسنے سر اُٹھایا۔ ادھر اسنے چڑیا پھینکی اُدھر اُسکے منہ ہی مین تھی۔ جھرنون سے خندق مین جو پانی گرتا تھا وہ پائین کوہ ایک تپلی سی نہر مین جمع رہتا تھا۔ مینڈک اُسمین ڈبکیان لگاتے تھے اور سانپ سے چھپتے پھرتے تھے۔ یہ مضمون طبعزاد بادشاہ کا تھا۔ یورپ کے بھی کسی جانورخانہ مین زہریلے سانپ اس آزادی سے نہین رکھے گئے تھے اب سنتا ہون کہ اور لوگ بھی لے اُڑے۔

بادشاہ نے ایک رسالہ جوہر عروض تصنیف کیا اور ایک نسخہ اُسکا مالک الدولہ کو بھیجا۔ اُنھون نے اسکے شکریہ مین کچھ اشعار حضرت کے سامنے پڑھے۔ آخر مین دعائیہ اشعار کا ایک قطعہ تھا جسے سُنکر جہان پناہ آبدیدہ ہوگئے ؎

سنتے تو ہین زمانہ نے بدلا ہے اپنا رنگ پھر انقلاب کرنے کو ہے دور آسمان
سامان اور کچھ نظر آتے ہین آج کل یعنی جلوس شاہ کے آثار ہین عیان
ہر طرف یہ دھوم ہے چلتے ہین لکھنؤ پھر بیٹھتے ہین تخت پہ سلطان بعز و شان
اس سے یقین ہے نہ ہو پھر سلطنت بحال نقارۂ خدا ہے خلائق کی بھی زبان

یہ لوگ تو بادشاہ کے خوش کرنے کے لئے اعادۂ ملک وسلطنت کی دعا دیتے تھے مگر مین نے خیال کیا کہ اُنکا دل دُکھ جاتا تھا اور غم تازہ ہو جاتا تھا۔ ہاے افسوس۔

فصیح الملک مرزا داغ مرحوم کلکتہ مین جب آئے ہین تو مالک الدولہ اُنسے ملنے کو گئے۔ جب وہان سے آئے تو مین نے پوچھا کہ کوئی مزے کا شعر بھی یاد کرکے آئے۔ کہنے لگے ایک مزے کا فقرہ سُنیئے۔ مین اُنکا مشتاق ہوکے گیا تھا۔ اپنے ساتھ کوئی غزل نہین لے گیا تھا۔ مگر اُنھون نے اصرار کیا تو ایک غزل کے چند شعر مجھے یاد آگئے وہ مین نے پڑھ دیے ؎

نہ دیکھا جلوۂ رخسار تیرا قیامت پر رہا دیدار تیرا
کہان مےکش کہان یہ جوش رحمت کرم اے ابر دریا بار تیرا
ترے کوٹھے پہ چڑھ آؤن لپٹ کر جو اُترے سایۂ دیوار تیرا

ادھر تو آنکھ دکھلاتا ہے ظالم ادھر ہر روز دان دیوار تیرا
دہانِ زخم بوسے لے رہا ہے لبِ معشوق ہے سوفار تیرا
غضب ہے اُڑگئین راتون کی نیندین بُرا ہو خواہشِ دیدار تیرا
اُتر آتے فلک سے ماہ و خورشید جو پاتے سایۂ دیوار تیرا

محبت مین نہ اسے صولت کمی ہو
بڑھے اغماض اُتنا پیار تیرا

کہتے تھے مقطع پڑھکر مین خاموش ہو رہا تو مرزا داغ نے کہا کچھ تو اور پڑھئے مین نے پانچ چار شعر اور پڑھے ؎

روشنے بیداد کی ہے ہم پر یہان تو چپ ہین ستم اُٹھا کر
مزور نیکون بروزِ محشر کرینگے شکوہ خدا سے جا کر

یہان تو لینے دو چین مجھکو لحد مین آئے ہو کیون فرشتو
نہ تم مجھے نیند مین ستاؤ عبث نہ چھیڑو جگا جگا کر

عجب یہ قدرت کے ہین تماشے ہین دستِ صنعت پر اُسکے صدقے
کہ نقشِ پا کی طرح سے نقشے بگاڑتا ہے بنا بنا کر

ہم اب نہ چونکین گے تا قیامت ملی ہے خوابِ اجل سے راحت
عبث جگاتے ہو بعد رحلت ہمارا شانہ ہلا ہلا کر

ہوئی یہ ہجرِ بتان سے حالت ہے ایک عالم کو جس سے حیرت
بیان مشکل ہے اسکا صولت اُٹھائے صدمے جو دل لگا کر

کہنے لگے مرزا داغ سے میری عروض دانی کا کسی نے تذکرہ کر دیا تھا یہ فقرہ اُنھون نے کہا "بحرِ خفیف مین بھی آپ نے خوب غزل پڑھی اور شکستہ بحر بھی خوب کہی" مرزا داغ سے اور اُنسے کچھ ایسا ارتباط بڑھ گیا تھا کہ ہمیشہ خط و کتابت باہم دگر ہوا کی۔

مرض الموت مین مالک الدولہ کا غزل پڑھنا مجھے نہین بھولتا۔ عجب انداز کا پڑھنا تھا اور عجب طرز کے شعر تھے - یہ ذوق فن دیکھئے کہ مرتے دم تک اُسے نباہا - ایک عرصہ سے مدقوق تھے مشاعرون مین جانا اور ملاقات احباب کو آنا یک قلم موقوف تھا - میرے پاس رقعہ آیا کہ آج شب کو مشاعرہ ہے ضرور آئیگا - مین خوش ہوا کہ شاید کچھ افاقہ مرض سے ہوا - مگر جاکے یہ حال دیکھا کہ اُنھین بیٹھنے کی بھی طاقت نہین ہے - پلنگ پر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھے ہین اور اُسی کے متصل تختون کا چوکا ہے - چند کنول روشن ہین - پانچ چار حقے بھرے ہوئے دم کھا رہے ہین دس پندرہ آدمی جنسے زیادہ تر ارتباط تھا - وہی پڑھنے والے اور وہی داد دینے والے ہین - کہنے لگے طول مرض سے دم اُکتا گیا اور صحبت احباب کے لئے دل ترس گیا - تو مین نے ایک طرح کر دی کہ مین سب کو تکلیف دونگا یہ کہکر خاصدان میری طرف بڑھا دیا - طرح کی غزلین لوگ پڑھنے لگے آخر مین اُنھون نے غزل پڑھی - معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص بیمار نہین ہے - نجانے شعر پڑھنے کی طاقت کہان سے آ گئی تھی اور چہرہ پر بشاشت کیونکر پیدا ہو گئی تھی ؎

جھونکے ہوئے بلند جو باد بہار کے دامن گلون نے پھونک دئے کوہسار کے
آتا ہے یار واسطے دل کے شکار کے ہاتھ اُسکے چوم لون کہ قدم راہوار کے
آتش بھی گل ہے فیض سے ابر بہار کے نکلے ہین لالہ بن کے شرر کوہسار کے
جادو نگاہ ناز کا نرگس پہ ہے ستم بیمار کو نہ قتل کرو آنکھ مار کے
آنکھین منور آپ کے دیدار سے ہوئین روشن ہوئے چراغ شبِ انتظار کے
خلعت بٹے گلون کو جو فصل بہار مین ہمنے جنون کو دیدئے کپڑے اُتار کے
آ آکے میکدہ پہ الٰہی برس پڑین بادل نہ جائین اور طرف کوہسار کے
جلدی قیامت آئے حساب اپنا پاک ہو دھڑکے تو حشر ڈھاتے ہین روز شمار کے
میری سیکروی کا دیا ہے ذرا بھی ساتھ دم بھی نہین ہے دم مین نسیم بہار کے
مٹھی سے دل کے گرتے ہی کہنے لگا وہ شوخ ہم شرط جیت لیتے ہین یون ہاتھ مار کے

واقف ہیں کون [illegible] مسئلہ طلسم تو ہے ہین لوح مزار کے
[illegible] کی خرابیون کا جو آتا [illegible] خیال ہیں حضور ہم قول [illegible]
[illegible] شعبدے سمجھا ہے لیل ونہار کے
دولت [illegible] تاقل [illegible]
کیا [illegible] جان دی [illegible] دل [illegible] کے

واسطے ترکیب کرکے اور حرف آسمان کے اس قسم کے تصرفات ہین جو عربی و فارسی پڑھنے والون کی زبان مین پائے جاتے ہین اور لطف یہ ہے کہ اُنکو مانوس معلوم ہوتے ہین۔

مشاعرہ کے آٹھ دن بعد مین عیادت کو گیا تو خیر حال تھا خدا مغفرت کرے۔ مجھے سال وفات یاد نہین رہا۔ غالباً سنہ ۱۳۲۰ ہجری مین انتقال کیا۔

(باقی آیندہ)

سید علی حیدر طباطبائی

مسئلہ سالمات

نمبر ۳

علامہ [illegible] مضمون بالا کا یہ حصہ زیادہ وقت اور جگہ کا محتاج نہین ہے۔ کیونکہ قرون وسطیٰ کے فلاسفر اور محقق بہت تھوڑے تھے اور انکی تحقیق و تجسس کے نتائج کا تناسب قدیم زمانہ کے عالمون کے مقابلہ مین بہت محدود ہے۔ اگر انھین قدما اور متاخرین کی علمی دریافتون اور ترقیون کی حد فاصل قرار دیا جاوے تو بہت مناسب ہوگا۔ قابل الذکر فاضلون کے اسما اور اُنکے مساعی جمیلہ کے نتائج کے اجمالی ذکر کے بعد ہم زمانہ حال کے شہرہ آفاق محققون کی کوششون اور دریافتون کے تذکرہ کی طرف رجوع ہونگے۔

اگر انتشار۔ انقباض۔ تحلیل اور اخراج کی اصل وجہ دریافت کرنے کی کوشش کیجاوے تو اس خیال کو تسلیم کرنے کے سوا ہمارے لئے کوئی چارہ نہین ہے کہ مادہ ننھے ننھے ریزون سے بنا ہوا ہے اگر مادہ قدیم ہے اور اُسکا وجود بلا تناقض قائم چلا آتا ہے۔ تو چیزون کے پھیلنے۔ سکڑنے۔ حل ہونے اور تہ مین بیٹھنے کے مظاہر و اقعات آخری ہین۔ جنکی توجیہ کسی اور نظریہ اور اصول سے ممکن نہین ہے۔ یہ تو ذہن مین آسکتا ہے کہ قدیم شئے پھیلتی اور سکڑتی ہے۔ مگر ہم اسکی وجہ بتانے سے قاصر رہتے ہین۔ اگر یہ مانا جاوے کہ مادّہ علیحدہ علیحدہ ذرون سے مرکب ہے تو ریزون کا اجتماع عوام کے جم غفیر کے مشابہ ٹھہرتا ہے۔ پھیلاؤ یا وسعت سے مراد یہ ہے کہ ذرّون کا جھرمٹ باہر کیطرف پھیلتا اور بڑھتا ہے اور انقباض کا مطلب یہ ہے کہ ذرّے اندر کو کھنچے اور دبائے جاتے ہین۔ اختلاط سے یہ مراد ہے کہ دونون قسم کے ذرّے ملکر ایک ہوجاتے ہین اور اخراج کا مطلب یہ ہے کہ اس طبقہ کے خاص خاص ذرّے خارج ہوجاتے ہین۔ دیگر مظاہر مادی کی بھی توجیہ ہوسکتی ہے۔ مثلاً تبخیر کی یہ غایت ہے کہ ذرّے اپنی حد مقررہ سے باہر چلے جاتے ہین۔ اس نظریہ کے ساتھ یہ ماننا لازم نہین ہے کہ ذرّون کی درمیانی جگہہ خلا ہے۔ یہی جانتے ہین کہ جب چند آدمی ایک جگہہ اکھٹا ہوتے ہین تو اُنکے درمیان ہوا موجود رہتی ہے۔ پس اس امر کے اعتراف مین کوئی بڑی رکاوٹ حائل نہین ہوسکتی کہ ذرّون کے درمیان کوئی شئے ہے جسے ہٹا کر وہ آپسمین مخلوط ہوجاتے ہین۔

قرون وسطی کے محققون اور عالمون کا یہ خیال تھا کہ مادّہ باریک باریک ریزون سے مرکب ہے جنھین وہ اسلاف کیطرح عناصر اربع تصور کرتے تھے یعنی آگ - پانی - ہوا - خاک تمام اجسام انہی چارون عنصرون کی ترکیب اور اجتماع سے بنتے ہین - مگر ان کا تناسب سب جسمون مین مختلف ہوتا ہے لیکن عناصر کا جو مفہوم آجکل ہے - وہ اُس زمانے سے بہت مختلف ہے - اُس زمانے کے کئی فلاسفرون کا یہ خیال تھا کہ عنصر ایک دوسرے مین منتقل ہو سکتے ہین - راجر بیکن (Roger Bacon) جو ۱۲۱۴ء اور ۱۲۹۴ء کے درمیان گزرا ہے انگلستان کا ایک مجاور فیلسوف اور زبردست محقق تھا - اُسکی رائے مین عناصر اربع ہائیلے (Hyle) کے بنے ہوئے ہین (یونانی مین" ہائیلے" کے لغوی معنی لکڑی کے ہین) ایک عنصر دوسرے کی ماہیت مین تبدیل ہو سکتا ہے اور ایک چیز کو دوسری شئے مین بدلا جا سکتا ہے - اس عالم کے خیال کی روسے گندم سے انسان بن سکتا ہے اور انسان گیہون مین بدل سکتا ہے جسوقت زمانۂ حال کے سائنس کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا - اُس زمانے مین بھی یہ نظریہ غالب اور رائج تھا اور اٹھارہوین صدی تک اُس پیر فرتوت کیطرح عالم وجود مین رہا جسکے حواس خمسہ سلب ہو چکے ہون اور ہروقت چارپائی پر پڑا رہتا ہو جب سائنس جدید کے اصول اولیہ کی چھان بین ہو رہی تھی اور اُسکی شاندار عمارت کا نقشہ کھینچ رہا تھا تو کئی بلند فکر اور بالغ نظر محقق یہ مانتے تھے کہ مادہ ریزون سے مرکب تو ہے مگر یہ ریزے ذرون کی قسم سے نہین ہین - لارڈ بیکن جو علوم حال کے اصول اولیہ کے موجد اور طریق تحقیق و تفتیش کے بانی اول اور اس زمانے کے سائنس والون کے باوا آدم کہلانے کے مستحق ہین - اپنی معرکۃ الآرا کتاب[۵۱] مین یونانی حکما[۵۲] اور محققین کے قیاسات سالمات پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہین " اس طریقہ سے ہم سالمات کی اصلیت تک نہین پہونچ سکتے - کیونکہ اسکی روسے خلا بلاچون وچرا مانا جاتا ہے اور مادہ غیر متغیر قرار دیا جاتا ہے اور یہ دونون تصور غلط ہین - البتہ اس طریقۂ تحقیقات کی عمل پیرائی سے اُن حقیقی ریزون کی حقیقت ہمپر عیان ہوتی ہے جس سے ہم پہلے ہی سے واقف ہین[۵۳]" - لارڈ بیکن نے اپنی تحقیق و تجسس سے مسئلہ مادہ مین بیش قیمت اور قابل قدر اضافہ کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ حرارت ذرون کی حرکت ہے - چنانچہ آپ رقمطراز ہین " حرارت حرکت ہے جو جسم کے ادنیٰ ذرون کے درمیان سے گزر جاتی ہے - اُسکی روک تھام ہو سکتی ہے اور وہ منعکس ہو سکتی ہے اور اُس سے مخالف سمت مین حرکت پیدا ہو جاتی ہے - آگ اور حرارت کی تیزی کی یہی وجہ ہے[۵۴]" - اس سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ذرون کے جھرمٹ ہوتے ہین جو حرارت پاکر متحرک ہو جاتے ہین اور ایک دوسرے سے ٹکراتے ہین اور جس سے حرارت کے زور مین بیشی ہوتی ہے - بیکن کے خیال مین ذرون کے مابین ایک غیر محسوس - بے وزن

---

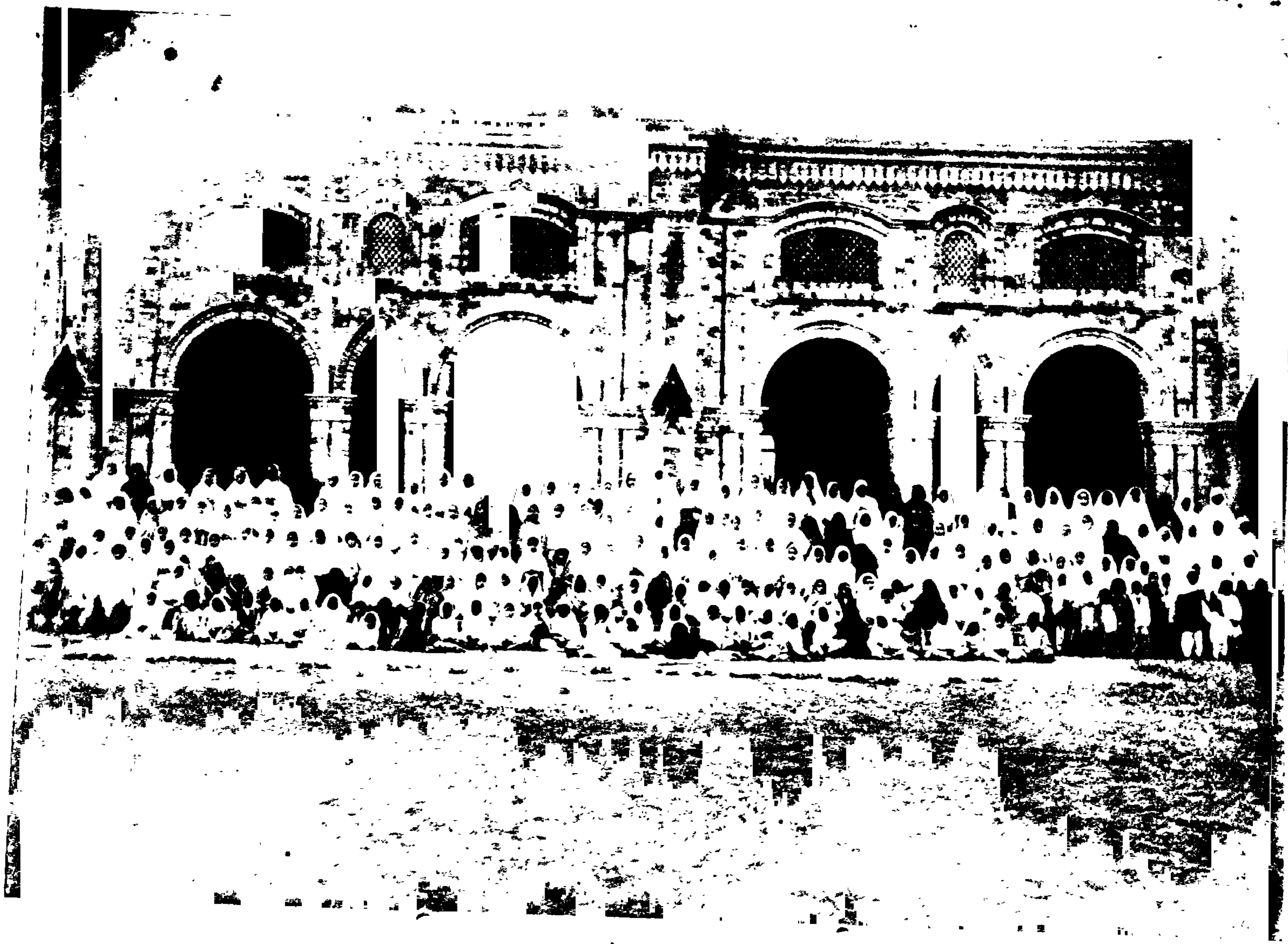
۵۱ "طریق جدید" (Novum Organum") جو پہلے پہل ۱۶۲۰ء مین طبع ہوئی تھی - ۵۲ اپی کیورس (Epicurus) اور اُسکے پیرو اور اُسکے ہمسر کہتے تھے - ذرے غیر مرئی - لاتغیر ہین - مگر انکے اندر ایسے خواص ہین جو اجسام مفردہ کے اندر پائے جاتے ہین - انکے اجتماع سے اجسام صورت پکڑتے ہین - انمین امتیاز بھی ہوتا ہے جس سے خلا کا وجود لازم ہوتا ہے - ۵۳ "نودم آرگنم" صفحہ ۳۵۵ دوسرا پیرنمبر ۸ مطبوعہ ۱۸۷۹ء - ۵۴ ایضاً صفحہ ۴۰۰

اور مقداری شے ہے [illegible] "روح" (Spirit) کہہ کر پکارتے ہیں۔ اگر [illegible] رہتے تو تفتیش تجسس [illegible] نام سے موسوم کرتے۔ وہ ایک [illegible] کہتے ہیں [illegible] کے اندر ایک جوہر ثانی حرکت [illegible] کا عمل ظاہر ہوتا ہے [illegible] جسم کے اندر ایک چیز ہوتی اور غیر [illegible] اصلی ہے [illegible] اسکے اندر چھپا رہتا ہے۔ اگر وہ نکال دیا جائے [illegible] اور [illegible] ہو جاتے ہیں۔ [illegible] تو [illegible] ہے [illegible] واضح رہے [illegible] مادہ کی [illegible] تھے۔

دے کارٹ (Descartes) فرانس کا نہایت مشہور فلاسفر تھا۔ ۱۵۹۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۵۰ء میں انتقال کیا۔ بعض لوگ اسے فلسفہ جدید کا "مورث اعلیٰ" سمجھتے ہیں۔ اسنے ۱۶۴۴ء میں اپنی شہرہ آفاق کتاب "پرنسیپیا فلاسوفیہ" (Principia Philosophia) یعنی "اصول فلسفہ" شائع کی تھی۔ جسمین اُسنے مسئلہ سالمات پر شرح وبسط کے ساتھ بحث کی اور اسے ایک نہایت اہم اور زبردست مسئلہ قرار دیا۔ اُسنے اس بحث مین دکھایا کہ جو کچھ ہم صاف صاف محسوس کرتے ہین یہ صحیح اور حقیقی ہے اسمین کسی قسم کا دھوکا نہین ہے۔ عقل جس شے کیطرف متوجہ ہو اور وہ اسپر عیان و آشکار ہوتی ہو۔ اُسکی تخمیس صریح ہوتی ہے اُسنے اس اصول کو اجزاے مادہ پر عائد کیا اور یہ ظاہر کر دیا کہ سالمات ناقابل تفریق نہین ٹھہر سکتے۔ چاہے وہ اجزا کیسے ہی چھوٹے اور ادنی کیون نہون مگر قیاساً ہم اُنھین چھوٹے سے چھوٹے حصون مین تقسیم کر سکتے ہین اور جہانتک چاہین انھین تقسیم در تقسیم کے قاعدہ کے تابع کر سکتے ہین۔ اُسنے اس نظریہ مین انکی تفریق لاانتہا کو تسلیم کر لیا۔ دے کارٹ یہ بھی کہتا ہے کہ خلا محال ہے بعینہ ذرے نہون اور عقل اسے تسلیم کرنیکی طرف مائل نہین ہوتی۔ تو بعد مکانی گویا توسیع مادّہ ہے۔ یعنی خلا مین کسی شے کا پھیلاؤ ہے۔ وہ مادّہ ہے۔ پس خلا مادّہ سے معمور تھا۔ اجسام کثیف ایسے ذرّون سے مرکب ہین جنکے وجود کا علم حواس کی وساطت سے حاصل نہین ہو سکتا اور یہ ذرے تین قسم کے ہوتے ہین۔ گو وہ ایک ہی جوہر یا ابتدائی عنصر سے بنتے ہین۔ عنصر اول نہایت باریک باریک ریزون کا مرکب ہے۔ اسکی شکل بے قاعدہ ہوتی ہے۔ اسمین نہایت تیز حرکت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سے جو ننھے ننھے ریزے الگ ہوتے ہین اُنسے عنصر ثانی بنتا ہے اور ان دونون کے درمیان جو خلا پایا جاتا ہے یہ اسے پُر کرتا ہے۔ دوسری صورت کے ذرے رگڑ اور تصادم باہمی سے کروی شکل اختیار کر لیتے ہین۔ وہ اسقدر چھوٹے ہوتے ہین کہ نظر ہرگز انھین نہین دیکھ سکتی۔ تیسری قسم کے جو ذرے ہین۔ وہ بڑے بڑے ہوتے ہین اور انکی حرکت بھی دھیمی ہوتی ہے۔ سورج اور ستارے اول قسم کے عنصر سے۔ آسمان قسم ثانی اور کرۂ ارض مع سیارگان فلکی عنصر ثالث سے بنے ہین۔ دوسری اور تیسری قسم کے عنصرون کے گرداگرد عنصر اول کے گرداب ہوتے ہین جنکے سبب سے ذرے ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہین۔ یہ چکر اسی قسم کے ہین جس قسم کے آفتاب اور سیارون کے چارون طرف ہین جنکی وجہ سے انکی حرکت محوری پیدا ہوتی ہے۔

دے کارٹ کا یہ مسئلہ بہت عجیب تھا۔ گو بعد ازان

۱؎ "نوزم آرگنم" صفحہ ۵۱۸۔



سکھہ کنیان مہاودیالہ فیروزپور

محققون کو اس سے تحقیق و تجسس کا میلان اور اشتیاق پیدا ہوا مگر یہ تاریخی اہمیت لئے ہوئے ہے۔ یعنی یہ پہلی کوشش تھی جو مادّہ کی ماہیت اور اُسکے مظاہر مختلفہ کی توجیہ و تعبیر کیواسطے عمل مین آئی تھی۔ اسکی رو سے یہ بھی مانا گیا تھا کہ موجودات عناصر اولی کی حرکت سے صورت پذیر ہوتے ہین۔ دے کارت کا یہ بھی خیال تھا کہ مادّہ کی حرکت کیوجہ سے ہر قسم کے تحسّسات پیدا ہوتے ہین۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔ "ہماری عقل اسی نوعیت کی ہے کہ جسم کی حرکت اُسکے اندر ہر قسم کے خیالات متحرک کر دیتی ہے۔ سوائے رنگ۔ روشنی۔ خوشبو۔ ذائقہ۔ آواز اور قابل لمس خواص کے ہم اپنی ذات سے باہر کسی قسم کی چیزون کا ادراک حاصل نہین کرتے اور یہ محض اشیا کی خصوصیات مثلاً حجم۔ شکل اور حرکت[۵۱] ہے۔" جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جوہر۔ روشنی۔ خوشبو۔ آواز وغیرہ بالطبع کوئی شے نہین ہین۔ بلکہ ہمارے نفس کے اندر موجود پائی جاتی ہین اور ان ننھے ننھے ذرّون کی حرکت۔ شکل اور حجم سے ہر قسم کے تحسّسات (Sensations) پیدا ہوتے ہین جنکی ترکیب اور اجتماع سے مادّہ بنا ہوا ہے۔ حرارت کی ماہیت کی نسبت وہ بیکن کے بالکل ہم خیال تھا اور اسے سالمات کی حرکت قرار دیتا تھا۔

دے کارت کے اصول اوّلیہ پر اسپی نوزہ (Spinoza) نے اپنا نظام فلسفہ قائم کیا تھا۔

دے کارت کا ہمعصر رابرٹ بائل (Boyle) نامے انگلستان کے ایک رئیس کا بیٹا تھا۔ جس نے اُس زمانہ مین علوم طبیعیات اور کیمیا کی تحقیقات اور تجسس کے لئے خاص نام پیدا کیا تھا۔ ۱۶۲۶ء مین تولد ہوا اور ۱۶۹۱ء مین انتقال کیا۔ اُسنے ایک کتاب الموسوم بہ "خواص و اشکال کی ابتدا" ۱۶۶۶ء مین اور "متذبذب کیمیا دان" ۱۶۶۱ء مین شائع کی تھی۔ اور چند کتب بھی تصنیف کی تھین۔ جنمین اُسنے مادّہ کی ماہیت پر خوب بحث کی۔ اور اسکا کیمیائی نظریہ قائم کیا۔ وہ مسئلہ سالمات کا بھی بڑا حامی تھا۔ وہ لکھتا ہے:۔ واضح رہے کہ دُنیا مین ذرّون کا ایک عظیم الشان مخزن ہے۔ ہر ایک ذرہ اسقدر چھوٹا ہے کہ اُسے محسوس کرنا محال ہے۔ یہ غیر منقسم ہے۔ اسلئے اسکی شکل ہوتی ہے اور ٹھوس بھی ہے۔ گو اپنے ذہن مین ہم اسے تقسیم کر لین اور قادر علی الاطلاق کی قدرت سے وہ قابل تقسیم ہے۔ مگر فطرت شاذونادر اُسکے حصّے کرتی ہے۔ اس اعتبار سے ہم ذرّون کو قدیم اور جوہر اولی تسلیم کر سکتے ہین[۵۲]۔

اس کتاب کے مقدمہ مین وہ لکھتا ہے کہ مین اُسی استدلال سے کام لینے پر مجبور ہون جس سے سالمات ناقابل تقسیم سمجھے جاتے ہین۔ دے کارت کی تقلید کرتے ہوئے وہ اجسام فطری کے خواص کو حرکت۔ حجم اور شکل سے منسوب کرتا ہے اور مادّہ کے کے نہایت باریک ریزون کو بھی خواص کا موجب قرار دیتا ہے۔ حرارت کی بابت اُسکا یہ خیال تھا کہ جب جسم کے اجزا جوش پذیر ہو کر چارون طرف پھیلنے کی کوشش کرتے ہین تو انمین تصادم واقع ہوتا ہے جسکا انجام گرمی ہے۔ مادۂ لطیف کے ذرّون مین جب زور کی جنبش ہوتی ہے تو آگ نکلتی ہے۔ مگر بائل جس درجہ سے اپنے کو سائنس کے دائمی شکریہ کا مستحق ٹھہراتا ہے وہ یہ ہے کہ اُسنے پانی۔ ہوا اور مٹی کو مرکب ثابت کیا اور پرانے خیال کی لغویت ظاہر کی۔ بائل کہتا ہے کہ ذرّون کی ترکیب سے بیشمار مرکبات پیدا ہو سکتے ہین اور ان مین صرف تناسب

۵۱ "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد دوم صفحہ ۲۰۴۔

۵۲ "اشکال و خواص" صفحہ ۱۱۔

حرکت شکل اور حجم سے قوت پیدا ہوتی ہے۔

۲ عالم گیر مادہ کی مختلف ترکیب اور میل سے آبی اور خاکی اجسام بن سکتے ہین اور اسی سبب سے اُڑ جانیوالی اشیا بھی تیار ہو سکتی ہین اسلئے کہ تمام مفردات اس امر مین متفق ہے کہ مادہ کی اصلیت ایک ہے۔ تمام اسکے اجزا کی شکل حرکت اور حجم سے تفاوت واقع ہوتی ہے۔

سر آئزک نیوٹن (۱۶۴۲ع – ۱۷۲۷ع) انگلستان کے نہایت زبردست عالم و فلسفی گذرے ہین۔ مسئلہ کشش انھین کے مسائل کا ممنون ہے۔ آپ نے مادہ کی حقیقت معلوم کرنے کیطرف توجہ نہین کی۔ وہ اور ہی قسم کے فلاسفر تھے۔ تجربات اور مشاہدات سے قاعدے دریافت کیا کرتے تھے۔ قیاس سے بہت تھوڑا کام لیتے تھے۔ تجربے سے جو نتیجہ نکلتا اسکی تصدیق مشاہدہ۔ قاعدہ ریاضی اور تجزیہ مزید سے کرتے تھے۔ اپنی مشہور زمانہ کتاب "اصول اولیہ" مین آپ نے مادہ کی بابت مطلق بحث نہین کی۔ اپنی ایک نامور کتاب[۵۱] کے خاتمہ پر لکھتے ہین:۔ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ابتدا مین مادہ کو ٹھوس۔ سخت۔ وزندار ممتنع الدخل۔ ناقابل نفوذ اور متحرک ذرون سے بنایا تھا" بعد ازان اُنکے پیروون نے اس مسئلہ کیطرف بالکل توجہ نہین کی۔ بلکہ اپنے ہادی کے طریقہ تحقیق سے اور مسائل کی چھان بین مین لگے رہے۔

براعظم یورپ کے بعض محققین اس مشہور مسئلہ کیطرف کم و بیش متوجہ رہے۔ انمین قابل الذکر ڈانیل برنوئلی (Bernouilli) ہے۔ جو ۱۷۰۰ع اور ۱۷۸۲ع کے درمیان گزرا ہے۔ یہ شخص گروننگن ملک ہالینڈ مین پیدا ہوا تھا اور ریاضیات و طبعیات کا ایک بہت مشہور استاد تھا۔ اُسنے مسئلہ سالمات کے علم مین قابل قدر اضافہ اپنی ایک زبردست تصنیف کے ذریعہ سے کیا تھا جو ۱۷۳۸ع مین شائع ہوئی تھی۔ اُسنے بالواسطہ یہ ظاہر کیا تھا کہ گیس نہایت باریک ذرون سے مرکب ہے۔ جو بڑی تیزی کے ساتھ ادھر اُدھر ناچتے پھرتے ہین۔ بھرے ہوئے برتن کے کنارون پر گیس کا جو دباؤ پڑتا ہے۔ وہ انھین ذرون کے تصادم اور ٹکرون کیوجہ سے ہوتا ہے۔ اگر کسی برتن کا حجم بدل جائے تو دباؤ اُلٹ ہوگا۔ یہ بائل کا نظریہ تھا۔ برنوئلی کا استدلال بہت کمزور اور غیر منطقیانہ ہے جسکی وجہ سے اُسکا تصور ایک صدی تک کس مپرسی کی حالت مین پڑا رہا۔ اسکے بعد اُسکی طرف بعض محققون کا خیال رجوع ہوا اور اُنھون نے اپنے مساعی حسنہ سے اسمین ترمیم کی اور اسے اچھی بنیادون پر قائم کیا۔

جیاسپی باسکووچ (Boscovich) اٹلی کا ایک نامور اُستاد ریاضیات اور محقق عالم تھا۔ ۱۷۱۱ع اور ۱۷۸۷ع کے درمیان گزرا ہے اُسنے اپنی تحقیق و تفتیش سے مسئلہ سالمات کے سلجھاؤ کی بہت کوشش کی اور نئی باتین اُسکے متعلق دریافت کین۔ اُسنے ۱۷۵۸ع مین ایک کتاب "قیاسات فلسفہ طبعی" کے عنوان سے لکھکر شائع کی۔ اسمین اُسنے سالمات کی نوعیت کے مسئلہ پر تفصیلی اور عالمانہ بحث کی اور یہ دکھانا چاہا کہ جیسا وہ مادہ کو سمجھتا ہے۔ اُسکی بنا پر جملہ مظاہر طبعی مثلاً تصادم۔ اتصال۔ مائعات کا دباؤ۔ لسساہٹ اور لچک کی توجیہ ہوسکتی ہے۔ اسکے خیال کی رو سے ذرہ ایک وسطی نقطہ ہے جسکی طرف مقدار یا سکون منسوب کیا جاتا ہے۔ اسے نقطہ مقدار یعنی ((Mass point)) کہنا بجا ہوگا اور یہ قوت کا مرجع بنجاتا ہے۔ اسکی وجہ سے ایک اور

---

۵۱ (Optics) طبع سوم صفحہ ۳۷۰ منقول از انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس۔

نقطے مقدار پیدا ہو جاتا ہے اور وہ پہلے کی طرف ایسی سرعت سے مائل ہوتا ہے جو ضمنی بُعد مربع کے تناسب کشش پر موقوف رہتی ہے۔ جب فاصلہ تھوڑا ہوتا ہے تو اُس قوت میں گریز اور کشش کی کئی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ جب دونوں نقطے ایک دوسرے کے بہت ہی قریب آ جاتے ہیں تو گریز بھی انتہا درجہ کی ہوتی ہے۔ اسوجہ سے وسطی نقاط مقدار کبھی ایک دوسرے سے اتحاد نہیں پکڑ سکتے۔ باسکوچ نے قوت (Force) کی بابت کوئی خاص خیال ظاہر نہیں کیا۔

انیسویں صدی کی تحقیقات | اس سے قبل جو عالم اس مسئلہ کی تحقیق و تفتیش کے سبب سے مشہور ہوئے تھے۔ وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ ذرہ کے مرکز کے گرداگرد ایک ننھا سخت قلب ہوتا ہے۔ باسکوچ نے اسے غیر ضروری ٹھہرایا اور یہ خیال قائم کیا کہ جب دوسرے طبقہ کا ذرہ ایک کے پاس پہونچتا ہے۔ تو اُنمیں انتشار اور گریز پید ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے اتحاد پکڑنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اس نظریہ نے اپنے انوکھے پن سے محققوں کی توجہ کو اپنی طرف مائل کیا۔ مثلاً انگلستان کے عالم و محقق پادری جوزف پریسٹلے نے جسکا ۱۸۰۴ء میں انتقال ہوا تھا اسے قبول کر لیا پھر کچھ عرصہ کے بعد انگلستان کے نامی گرامی ماہر برقیات مائکل فاراڈے نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ وہ کہتا تھا کہ مادہ کے قوا یعنی جو طاقتیں اس سے وجود پذیر ہوتی ہیں وہ صرف ایسی ہیں جنکی بابت ہمیں علم ہے۔ یہ قوتیں مادہ ہیں اور جہاں یہ وسعت پکڑتی ہیں۔ وہاں مادہ بھی پایا جاتا ہے۔ اسیوجہ سے ہر ایک ذرہ تمام خلا میں پایا جاتا ہے۔ اُسنے یہ بھی بتا دیا کہ ذرہ کے مرکز سے قوتیں نکلکر خطوط مستقیم میں ہر طرف جاتی ہیں اور روشنی کے نورانی ذرے انھیں خطوط پر سے گزرتے ہیں۔ اس نظریہ کی سر جے۔ جے۔ ٹامسن نے تجدید کی اور اسے درست ٹھہرایا۔

لارڈ کیلون جو کئی برس ہوئے۔ سر ولیم ٹامسن اور اس سے پیشتر پروفیسر ٹامسن کے نام سے مشہور تھے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے علما و محققین یورپ و امریکہ میں نہایت ممتاز نام آور اور اُستاد و یکتا سمجھے جاتے تھے۔ آپ کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے ۱۸۲۴ء میں شہر بلفاسٹ (آئرلینڈ) میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے باسکوچ کے مسئلہ کی تحقیقات شروع کی اور یہ دکھانا چاہا کہ ذرے جمع ہو کر کسطرح بلوریں شکل اختیار کر سکتے ہیں اور انکے ذریعے سے مظاہر روشنی کیونکر ظہور میں آتے ہیں۔

حساب اور تخمینہ کیواسطے لابدی ہے کہ باسکوچ کا نظریۂ ذرات قبول کیا جائے۔ چاہے وہ کسی صورت میں کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اُن قوتوں کا اندازہ کرنا محال ہے۔ جو فاصلہ پر موقوف ہیں۔ ریاضی اصول سے یہ مسئلہ بآسانی عقل میں آ جاتا ہے۔ مگر طبعی طور پر اسکے ماننے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ مادہ اور سالمات کو نری قوت تسلیم کرنا بہت دشوار ہے۔ اگر قوت کو فعل جسمانی قرار دیا جائے اور اسے عصبی سعی سمجھا جائے تو یہ بات عقل میں آ جاتی ہے۔ مگر یہ فہم و ادراک سے بعید معلوم ہوتا ہے کہ فعل جسمانی کا فعل جسمانی پر اثر ہوتا ہے اور خالص قوت کے سوا دوسری اور کوئی شے نہیں ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہم کم از کم عقلاً دوئیت (Duality) کو مانیں۔ جب ہم ذہن میں قوت کا خیال کرتے ہیں تو اسکے ساتھ ایک اور شئے کا تصور بھی پیدا ہوتا ہے۔ جو قوت کی مزاحم ہوتی ہے اور اُسے ہم مادہ کہکر پکارتے ہیں۔ اگر ہم باسکوچ اور فراڈے کے

خیال کی تقلید میں تحرک ہوتی ہے ... وابستہ کریں اور یہ
کہیں کہ مادہ قوت ہے ... قوت کا ... خیال پیدا ہوتا ہے۔ایک حالت
میں اسکے ذریعے سے عمل ... ہوتی ہے اور دوسری حالت میں
خود عمل قبول کرتی ہے۔ ... قوت کا ... دوسرا ...
کا نشان ہے ... مسائل طبیعیات ... مادیت کے مسئلہ کا
ذکر میں چاہتے کچھ ہی حشر ہو مگر ... سے انکار محال ہے کہ
مادہ اور قوت کے اتحاد اور اتصال ... قوت کے تصور
سے عہد ... خیالات میں مستقل اور ... اور قابل قدر اضافہ ہوگیا۔
اب یہاں اس امر کا خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے
کہ کیمیائی دریافتوں سے مسئلہ سالمات پر کیا اثر پڑا۔ اٹھارھوین
صدی کے آخری نصف حصہ تک تو اس علم کی یہ کیفیت رہی
کہ محققین اسے ایک ہنر کر خیال کرتے رہے۔ گو کیمسٹری میں
ترقی ہوتی رہی۔ خام دھاتون کو نکالا۔ صاف کیا اور پگھلایا جاتا
تھا اور کئی قسم کے مرکبات تیار ہوتے تھے۔ جو زیادہ تر صنعتی اور
عملی قدر و قیمت رکھتے تھے۔ مگر جب تک عناصر اربع ہوا۔ پانی۔ نمک
اور آگ کا سن رسیدہ مسئلہ غالب و رائج رہا۔ کیمیا کے علم میں خاطرخواہ
ترقی ہونا محالات سے تھا۔ سنہ ۱۷۰۰ء میں جرمنی کے ایک مشہور
ماہر کیمیا جارج اسٹال (Stahl) نے جو سنہ ۱۶۶۰ء اور سنہ ۱۷۳۴ء کے
درمیان گزرا ہے۔ اپنا مسئلہ فلوجسٹن[۵] پیش کیا جس سے پرانے
خیالات درہم و برہم ہوگئے۔ اسکا خیال یہ تھا کہ معدنیات کے اندر
ایک شے ہوتی ہے جو "فلوجسٹن" کہلاتی ہے۔ ذرے سے ہوا
میں ملکر اس شے کو خارج کردیتے ہیں۔ آکسیجن بھی ہوا ہے
مگر وہ فلوجسٹن سے معرا ہے۔ نائٹروجن ہوا ہے جسمیں فلوجسٹن
موجود ہے۔ بعض ارباب کیمیا نے ہائڈروجن ہی کو فلوجسٹن
قرار دیا۔ جس مسئلہ کو بلیک کاونڈش اور پریسٹلے ایسے عالمون نے
قبول کرلیا وہ ضرور معقول ہوگا۔ اٹھارھوین صدی کے اواخر
میں کیمیائی مسئلہ واضح ہونے لگا۔ مسئلہ سالمات میں بھی ترقی ہوتی
ہی۔ بعض لوگون نے بائل کا مسئلہ قبول کرلیا۔ عناصر اربع کی
حقیقت معلوم ہوتی گئی اور وہ مفردات کی فہرست سے خارج
کئے گئے۔ بعض گیسوں کی بابت معلوم ہوا کہ انکے خاص خاص
خواص ہیں اور ہوائی مرکبات نہیں ہیں۔ یہ بھی دریافت ہوا کہ ہوا
دو عناصر نائٹروجن اور آکسیجن سے مرکب ہے۔ اسوجہ سے
ہوا مفردات میں شمار ہونا موقوف ہوگئی۔ بعد ہی میں کیمیا کی
تحقیقات سے یہ ظاہر ہوا کہ پانی ہائڈروجن اور آکسیجن کے
اختلاط اور ارتباط سے بنا ہے۔ خاک کئی اور قسم کی مٹیون اور
کھادون کا مرکب ثابت ہوئی۔ فرانس کے ایک مشہور محقق کیمیا
لاوآسیئے (Lavoisier) نے یہ ثابت کردیا کہ ہر قسم کی چیزون کے
جلنے میں آکسیجن سب سے زیادہ خرچ ہوتی ہے۔ اس سے مسئلہ
فلوجسٹن مسترد ہوگیا۔ حرارت جو سترھوین صدی میں ایک
قسم کی حرکت سمجھی جاتی تھی۔ ایک جوہر لطیف شمار ہونے لگی۔
انگلستان کے ایک سربرآوردہ محقق کی تحقیقاتی کوششون
سے جسکا نام ولیم ہگنس تھا ڈالٹن کے مسئلہ سالمات کیواسطے
راستہ تیار ہوگیا۔ اسنے سنہ ۱۷۸۹ء میں ایک کتاب شائع کی جسمیں
اسنے پانی کے دو عنصر ایک سوختنی (آکسیجن) اور دوسرا آتش گیر
(ہائڈروجن) مانا۔ اور یہ بھی کہا کہ انکے ساتھ تیسرا عنصر ترکیب
نہیں پکڑ سکتا۔

ڈالٹن کا مسئلہ سنہ ۱۸۰۸ء میں زمانہ حال کے مشہور مسئلہ ارتباط کیمیائی نے مشہور محقق ڈالٹن (Dalton) کی تحقیق و تجسس سے

۵ فلوجسٹن (Phlogiston) یونانی لفظ فلوجسطاس سے ہے جسکے لغوی معنی سوختہ کے ہیں۔ اسکا ماخذ "فلیگو" ہے جسکے معنی جلنے کے ہیں ۱۲

خاص صورت اختیار کی اسکا خیال ذرّون کی بابت یہ تھا کہ تمام سادہ اجسام مین تمام سالمات یکسان ہوتے ہین اور ظرف معین مین انکی تعداد بیشمار ہوتی ہے۔" نشر کیمیائی سے ذرّون کو ایک دوسرے سے الگ کیا جاتا ہے اور ترکیب کیمیائی مین اجزا ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہین۔ نیا مادّہ بنانا اور بگاڑنا علم کیمیا کی قدرت سے بالکل باہر ہے۔ ہائڈروجن کے ایک ادنیٰ ذرّہ کو پیدا کرنا یا بگاڑنا گویا نظام شمسی مین ایک سیارہ کو بنانا اور دوسرے کو برباد کرنا ہے۔ ہم جو انقلابات اجسام کے اندر پیدا کر سکتے ہین۔ وہ صرف ذرات اور اجزا کے ایک دوسرے کو علیحدہ کرنے سے عمل مین آسکتے ہین یا منتشر و متفرق اجزا کو ایک دوسرے سے ملا سکتے ہین۔ مرکبات خاص خاص ذرّون کے خاص مجموعہ جات ہین[۵]۔ ذرّہ کی بابت ڈالٹن کا یہ خیال ہے کہ وہ جسم کا ادنیٰ ترین ریزہ ہے جسمین اُس جسم کے جملہ خواص موجود رہتے ہین۔ اگر اسے تقسیم کیا جائے تو جوہر کئی حصون مین منتقل ہو جاتا ہے۔ دو عناصر کا وزن اضافی اسی نسبت سے ہوتا ہے جس نسبت سے وہ دو عنصر مرکب مین موجود ہون۔ ڈالٹن نے عناصر کے ذراتی اوزان کی ایک عمدہ جدول تیار کی تھی اور ہائڈروجن کے ذرّہ کو سب سے ہلکا ٹھہرایا تھا۔

ڈالٹن مین یہ ایک بڑی خوبی تھی کہ وہ اپنے مسائل کو مبہم نہین رہنے دیتا تھا۔ بلکہ ہر پہلو سے انھین واضح اور معقول بناکر پبلک مین پیش کرتا تھا اُسنے عنصر کی بابت یہ خیال قائم کیا کہ وہ سراسر ریزون سے مرکب ہوتا ہے جو معمولی کیمیائی طریقہ سے منقسم نہین ہو سکتے اور دوسرا خیال یہ تھا کہ بالعموم مرکبات اسی قسم کے ابتدائی ریزون سے جو ذرّے کہلاتے ہین بنتے ہین۔ ان مسائل اور اصول تفتیش کی بنا پر محققین کیمسٹری نے عناصر اربع سے کلّی طور پر قطع نظر کی اور ایسے اجسام کے کھوج مین مصروف ہو گئے جنکی کیمیائی طریقون سے تفرید اور تفریق نہین ہو سکتی۔ اُنھون نے ان اجسام کا نام "عناصر" رکھا اور اس امر کی تحقیقات ہونے لگی کہ مرکبات مین عناصر کس تناسب سے داخل ہوتے ہین۔

جب ڈالٹن کے نظریہ کی اشاعت ہوئی تو اٹلی کے ایک عالم طبیعیات آووگاڈرو (Avogadro) نے جو ۱۷۷۶ء مین پیدا ہوا اور ۱۸۵۶ء مین انتقال کیا۔ یہ مسئلہ پیش کیا کہ جن گیسون کا درجہ حرارت و برودت مساوی ہو اور اُنپر دباؤ یکسان ہو اور انکا حجم بھی ایک ہو۔ اُنمین سالمات کی تعداد برابر ہوتی ہے اور تجربات کے ذریعہ سے اس مسئلہ کو ثابت کیا کہ گیسین مرکب ہوتی ہین۔ مفرد نہین۔ ڈالٹن کا یہ خیال تھا کہ ذرّے ناقابل تفریق نہین ہین مگر غیر منقسم اور سالم ہین اور آجکل کوئی عالم یہ نہین مانتا کہ ذرّون کو پھاڑکر علیحدہ کرنا محالات سے ہے۔

انیسوین صدی کے وسط مین جول (Joule) اور دیگر محققون کی تحقیق و تجسس کا یہ نتیجہ ہوا کہ حرارت جو پہلے ایک جوہر تصور ہوتی تھی وہ حرکت کی قوت سمجھی جانے لگی۔ عالمون نے اس مسئلہ کی چھان بین مین زیادہ وقت اور دماغ صرف کرنا شروع کر دیا۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ برنولے نے کوشش بے سود یہ امر دکھانے کی غرض سے کی کہ گیس کا دباؤ ذرّون کی حرکت سے پیدا ہوتا ہے۔ ہیریاتھ نے ۱۸۲۱ء مین واٹرسٹن نے ۱۸۴۶ء مین اور بعد ہی جُول نے اپنے کو اس نظریہ کی جانچ پڑتال

۵؎ منقول از "نیو سسٹم آف کیمیکل فلاسفی"

کے لئے وقف کر دیا۔

جول نے ۱۸۴۸ء مین پہلے پہل سالمات کی حرکت کی رفتار کا تخمینہ شائع کیا۔ اس کے بعد کینے ٹک تھیوری (Kinetic Theory) کا رواج ہوا۔ کرونگ۔ کلاسیوس اور کلیوپل نے ۱۸۵۸ء مین اسکے متعلق اپنے اپنے تجربات اور غور و خوض کے نتائج شائع کئے اور اس نظریہ کو خاص صورت دی۔ بولٹس مین (Boltsman) ایک جرمن محقق نے بھی اسکی تائید مین بڑا اہم حصہ لیا۔

کینے ٹک تھیوری ط اس مسئلہ کا تعلق زیادہ تر گیسون سے ہے۔ اسکی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ گیس بیشمار ذرّون سے مرکب ہے۔ جو بڑی سرعت کے ساتھ چارون طرف اڑتے پھرتے ہین اور ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہین مگر تصادم ایسے ہوتے ہین کہ قوت حرکی مین فرق نہین آتا تا وقتیکہ سرعت مین فرق نہ آئے۔ یہ ذرّے دور ہونے کے سبب سے ایک دوسرے کو متاثر نہین کرتے صرف تصادم کے وقت کچھ اثر ہوتا ہے۔ اسکے بعد وہ خط مستقیم مین آگے پیچھے چلے جاتے ہین۔ جب اس مسئلہ کو رواج ہوا تو مادّہ کی ماہیت کی طرف بھی محققون کا خیال رجوع ہوا۔ ایک اسکاچ عالم طبیعیات اور انجینیر رانکین نامے نے یہ مسئلہ قائم کیا تھا کہ ہر ذرّہ ایک چھوٹا سا قلب ہے اور اُسکے گرداگرد ایک قسم کا کرّہ ہوا ہے جو اُسکے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ گویا رانکین نے ڈے کارت کے خیال کی تائید کی اور اُسے رواج دینا چاہا۔ مگر بہت تھوڑے عالمون کے نزدیک اسکی معقولیت تسلیم ہوئی۔

لارڈ کیلون آنجہانی کا مسئلہ گرداب بہت مشہور سمجھا جاتا ہے اسکی بنیاد جرمنی کے سب سے بڑے محقق طبیعات ہیلم ہولٹس کے خیال پر قائم ہوئی تھی۔ اسکی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ خلا ایک سیال جوہر سے معمور ہے جسمین نہ توڑ گڑ پیدا ہوتی ہے اور نہ اُسے دبایا جا سکتا ہے۔ اُسکی کثافت آسمانون مین ہر جگہہ مساوی ہے۔ اسمین ذرّہ ایک قسم کا چکر ہے اور وہ برابر گھومتا رہتا ہے۔ حرکت سے رگڑ پیدا ہوتی ہے۔ اسوجہ سے وہ ہمیشہ گھومتا رہتا ہے۔ اس مثال سے یہ خیال اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جب تمباکو کا دھوان منہ سے نکلتا ہے تو چکر کھاتا ہوا گول حلقون مین پھیلتا چلا جاتا ہے۔ جس سے ایک قسم کے گرداب پیدا ہو جاتے ہین۔ جب تالاب مین پتھر پھینکا جاتا ہے تو پہلے ایک چھوٹا سا گرداب پیدا ہوتا ہے۔ بعد مین وہ پھیلتے پھیلتے کنارون تک پہونچ جاتا ہے۔ لارڈ کیلون وغیرہ کے خیال کے مطابق خلا مین ذرّون کی بعینہ یہی کیفیت ہوتی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذرّون کی گردابی حرکت کی کیا وجہ ہے؟ اگر یہ مانا جاسے کہ وہ شروع سے چلی آتی ہے تو وہ حال اور استقبال مین یکسان رہیگی۔ اگر یہ صورت ہے تو سالمات قدیم اور ناقابل تفریق ٹھہرتے ہین چاہے یہ کیسا ہی نامعقول مسئلہ ہو۔ مگر ایک امر بالکل واضح ہے کہ قوت یکسان ہے اور اُسکی نوعیت مختلف نہین۔ مگر گزشتہ چند سال سے یہ مسئلہ کس مپرسی کی حالت مین پڑا ہوا ہے۔ لارمر نے یہہ نظریہ قائم کیا تھا کہ خلا مین لعاب کی قسم کا مادّہ بھرا ہوا ہے جسمین حرکت پیدا ہو سکتی ہے اور اُسکے ذریعے سے لہرین پیدا ہوکر ادھر اُدھر پھیل سکتی ہین۔ اس مادّہ مین ذرّہ مرکز ہے۔ وہ ایک جگہہ سے دوسری جگہہ پہونچ سکتا ہے اور آگے بڑھتے وقت اپنے ساتھ اور اجزا شامل کر لیتا ہے۔ لارمر نے کئی مضامین مین

ط "کینے ٹک تھیوری" اسے شاید نظریۂ تحرک گیس کہنا مناسب ہوگا۔ یونانی لفظ "کائنیو" کے لفظی معنی حرکت کرنے کے ہین جو اسی کا ماخذ ہے۔

سپر بحث کی اور برق و روشنی کے جملہ مظاہر کی اسکے ذریعے سے ترجیہ و تعبیر کرنے کی کوشش کی تھی۔

حال کا مسئلۂ سالمات پہلے مسائل سے بہت مختلف ہے۔ کیونکہ اسکی رو سے ذرّہ کی برقی ماہیت مانی جاتی ہے۔ سر جے۔ جے۔ ٹامسن نے دو کتابون مین اس مسئلہ پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے اور اسے ہر طرح سے پایۂ تکمیل تک پہونچانا چاہا۔ برمنگم یونیورسٹی (انگلستان) کے مشہور و معروف پرنسپل اور زندہ عالمون کے سرتاج سر آلیور لاج نے بھی اپنی کتاب "الکٹرون" مین بہت تفصیل کے ساتھ اسکے مختلف پہلوؤن پر بحث کی ہے۔

سر ہمفری ڈیوی مشہور ماہر کیمیا کے زمانے سے یہ مانا جاتا ہے کہ جو قوا ذرّون کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھتے ہین۔ وہ اپنی فطرت مین برقی ہین۔ جب کسی رقیق شئے مین برقی رو چھوڑی جاتی ہے تو اُسکے اجزا ترکیبی علیحدہ علیحدہ ہوجاتے ہین۔ اگر کوئی چیز دو قسم کے ذرّون سے مرکب ہو تو اُسکے ایک حصہ پر منفی اور دوسرے پر مثبت اثر پیدا ہوتا ہے اور یہ مثبت اور منفی رَوین ہر وقت ایک دوسرے سے ٹکرانے کو تیار رہتی ہین۔ انکے درمیان جبلی کشش ہے جس سے ذرّے ایک دوسرے سے مربوط رہتے ہین۔

فراڈے نے دریافت کیا کہ جب کسی رقیق شئے کو برقی رو سے پھاڑا جاتا ہے تو مرکب سے اجزا کو علیحدہ کرنے کے واسطے مختلف قسم کی برقی قوت درکار ہوتی ہے۔ اگر مسئلہ سالمات کو تسلیم کر لیا جائے تو اسکی قوت علیحدہ شدہ ذرّون کی تعداد کے متناسب درکار ہوگی۔ ہائڈروجن کے ذرّہ کے لئے ایک ہی قسم کی برقی قوت کی ضرورت ہے اور قسم کے ذرّون مین کم و بیش صرف ہوتی ہے۔ ہنوز یہ معلوم نہین ہوتا ہے کہ جتنی قوت ہائڈروجن کے ذرّے کے لیے ضروری ہے اُس سے کم مقدار مین کسی اور قسم کے ذرّے مین بھی صرف ہوتی ہے۔ پس اسطرح برق بھی عنصر ہی ٹھہرتی ہے اور اسکا خاص لگاؤ ذرّون سے ہے۔ فراڈے کی اس دریافت سے مسئلہ سالمات نے ایک نئی صورت اختیار کی اور برقی ذرّہ کا نظریہ قائم ہوا۔

الکٹرون | سر ولیم کروکس نے فراڈے کے مسئلہ کی تحقیقات شروع کی۔ پہلے آپ نے لطیف گیسون کو لیا اور اُنکی تفتیش و تجسس کے دوران مین ایک نیا امر دریافت کیا جس سے فراڈے کے نظریہ کو بڑی تقویت پہونچی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اگر ایسے ظرف مین دھات کی دو طشتریان رکھی جائین جنکی ہوا نلی کے ذریعہ سے نکالکر بہت لطیف کی گئی ہو اور اُسمین پھر برقی رو چھوڑی جائے تو اُس طشتری سے جسمین منفی برقی پہونچتی ہے بلا واسطہ منفی برق یافتہ مادّہ نکلتا ہے جسے مقناطیس کے ذریعے سے جدھر چاہو موڑ لو اور اُسکا رُخ پلٹ دو۔ سر جے۔ جے۔ ٹامسن نے دریافت کیا کہ برقی قوت سے بھی اسکی رَو مین انحراف اور تجاوز پیدا ہو سکتا ہے۔ انحرافات (Deflections) پر مسلسل تجربے ہوئے جنمین مقناطیسی اور برقی قوتون سے کام لیا گیا اور چند اہم امور روشنی مین آئے از انجملہ ایک یہ تھا کہ جس مقدار سے برقی رَو گزرتی ہے وہ ہر حالت مین یکسان رہتی ہے۔ چاہے کوئی گیس کام مین لائی جائے اور یہ ہائڈروجن کی مقدار کا ۱/۱۸۰۰ حصہ ہوتی ہے اور وہ اس رَو کو پہونچا سکتی ہے۔ تجربون سے اُسنے یہ بھی بتایا کہ اس رَو کا ہر ذرّہ برقی رَو کو اُسیطرح پہونچا سکتا ہے جیسے ہائڈروجن کا

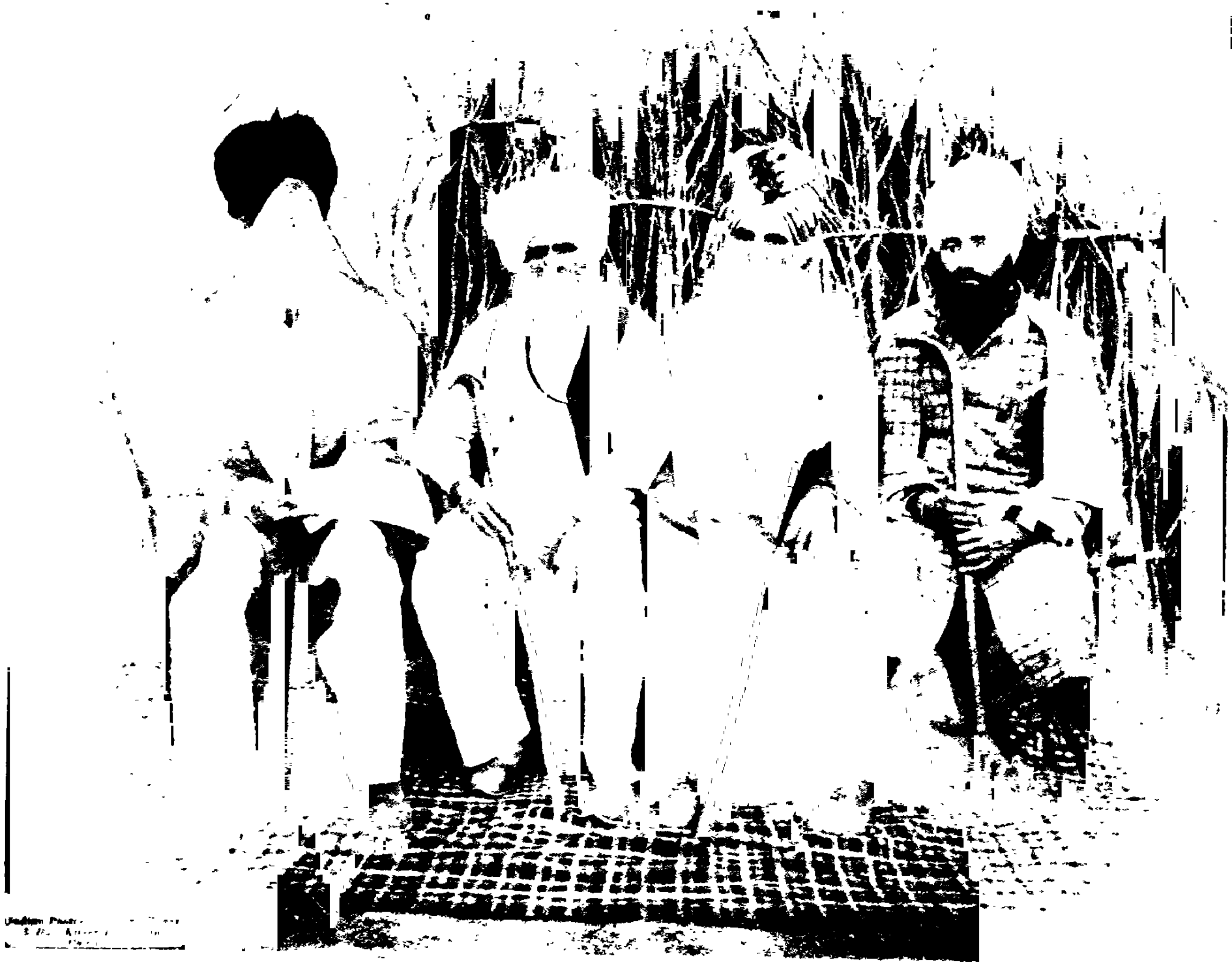
ذرہ۔ پس ظاہر ہوا کہ اس ذرہ کی مقدار ذرہ ہائڈروجن کی مقدار کے ۱/۱۶۰۰ حصہ کے برابر ہے۔ ان نہایت ننھے ننھے ذروں کا جنکے ذریعے سے منفی برق گزرتی ہے کارپسلز (Corpuscles) نام رکھا۔ مگر آجکل انھیں "الکٹرون" (Electron) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جسکے لفظی معنی یہ ہیں "مفرد ذرۂ برق"۔ اس امر کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ برقی قوت سے منفی طشتریوں کے ذروں کے منفی برق یافتہ حصے علیحدہ ہو جاتے ہین اور سب ذروں کی یہی کیفیت ہے اور انکی مقدار ذرۂ ہائڈروجن کی مقدار کا ۱/۱۶۰۰ حصہ ہے۔ اگر ریزہ کے اخراج سے پیشتر کوئی ذرہ بے تعلق ہو تو برقی قوت کے اثر کے بعد بھی مثبت قوت اسکے باقیماندہ حصہ مین رہ جاتی ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ مثبت اور منفی قوتوں کی مقدار مساوی ہوتی ہے۔ جب ایک قسم کی قوت نکلتی ہے تو دوسری متضاد قوت خارج ہوتی ہے چاہے وہ اسکے ساتھ ہی ساتھ ہو یا کم و بیش علیحدہ ہو۔ مگر دوسری قسم کی قوتوں کی وجہ سے اسکے ساتھ وابستہ رہتی ہے۔ پس ظاہر ہوا کہ ذرہ مین ایک تو مثبت برق ہوتی ہے اور دوسرے کئی الکٹرون جنکی تعداد ذرہ کے وزن جبلی پر موقوف ہے۔ مثلاً آکسیجن کے ذرہ مین ہائڈروجن کے ریزہ سے سولہ گنے الکٹرون زیادہ ہوتے ہین۔ مثبت قوت الکٹرون کی مجموعی منفی قوت کے برابر ہوتی ہے اور یہ مثبت قوت کروی صورت مین پائی جاتی ہے اور وہ اپنے کرہ کے اندر ہر جگہ مساوی ہوتی ہے۔ الکٹرون اسکے اندر گردش کرتے رہتے ہین اور بلا مزاحمت مثبت کے کرہ مین بھی گھومتے ہین۔ اگر ایک ذرہ مثبت کے کرہ مین حرکت کرے تو وہ ایک خاص مدت تک اسکے مرکز کے گرد چکر لگاتا رہیگا۔ چاہے اسکا فاصلہ کتنا ہی ہو۔ جب کئی الکٹرون اپنے اپنے محوروں پر کرہ کے مرکز کے گرد گردش کرتے ہین تو وہ ایک دوسرے کی گردش کے زمانے پر بہت اثر ڈالتے ہین۔ جب یہ اپنی دھریوں پر گھومتے ہین تو انسے قوت لہر کی شکل مین خارج ہوتی ہے اور ایک گردش مین ایک رو نکلتی ہے۔ عالمون نے اسی نظریہ کی بنا پر یہ تصور قائم کیا ہے کہ روشنی بھی اسیطرح خارج ہوکر اشاعت پذیر ہوتی ہے۔ جب دو ذرے ایک دوسرے کے نزدیک پہونچتے ہین اور ان مین سے اگر ایک غیر مستقل ہو تو اسکا الکٹرون خارج ہوکر دوسرے مین جا ملتا ہے اور اس طرح اسکا تسلسل قائم رہتا ہے وہ ایک دوسرے کو کشش کرتے ہین اور ذرے قائم رہتے ہین۔

منفی الکٹرون کی حرکت کی صورت مین ذرہ کے اندر بہت قوت موجود رہتی ہے۔ باہمی اثر کے سبب سے کبھی کبھی یہ علیحدہ ہو جاتی ہے اور ایک نیا ذرہ بنانے کی موجب ہوتی ہے ریڈیم (Radium) اور ان اجسام مین جنھین اسکی بدولت تحریک عملی پہونچتی ہے ذرے بگڑتے دیکھے گئے ہین۔ انکی وجہ مذکورۂ بالا عمل اخراج قوت ذری ہے۔

موجودہ حالت۔ اب یہ خیال عام ہے کہ مادہ ذروں سے مرکب ہے اور یہ کہ وہ ذرے نہایت ہی ننھے ننھے ہوتے ہین۔ جو حقائق اور واقعات مشاہدہ مین آتے ہین انکی توجیہ صرف اسی نظریہ سے ممکن ہے اور کسیطرح انکی تعبیر نہین ہوسکتی۔ اسلیے اس نظریہ کے اعتراف کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہین ہے۔ حقائق کیمیا کی ماہیت ہی اس خیال کے بغیر سمجھ مین نہین آسکتی کہ مرکبات کے اجزاے ترکیبی ہوتے ہین اور ہر ایک جز ننھے

اراکین سکھہ کمیان مہاودیالہ



[illegible] سنگھ جی — سردار [illegible] سنگھ جی مرحوم — نوجوان بھائی لقمان سنگھ جی — ماسٹر بیر سنگھ جی مفسر انصاف

ایک ریزون کا ہوتا ہے - جو ذرّے کہلاتے ہین - کیمیادان ذرّات کو پھاڑ سکتا ہے اور علیحدہ علیحدہ کر سکتا ہے مگر جب کوئی چیز قابل تقسیم و تفریق کے ناقابل ثابت ہوتا ہے اور کیمیائی طریق قاصر رہ جاتا ہے تو وہ اسے "عنصر مفرد" کے نام سے یاد کرتا ہے - عنصر ایسے ذرّون کا مرکب ہوتا ہے جو اپنی نوعیت مین ایک دوسرے سے بالکل جُدا نہین ہوتے - جملہ مظاہر کیمیائی کو اسی سے منسوب کیا جاتا ہے اور یہ ایسا معقول نظریہ ہے کہ اسپر قبول عام کی مہر ہو گئی - اسکے سوا اور کوئی خیال ایسا نہین ہے - جسکے ذریعے سے ان تمام اسباب و نتائج کیمیائی کی توجیہ کی جاسکے -

قیاسات اور مفروضات سائینس ہر دس بیس برس کے بعد بدلتے رہتے ہین جیسا مضمون ہذا سے بخوبی واضح ہوتا ہے - سالمات کے مسئلہ کی نسبت قدیم زمانہ کے یونانیون مین جو خیالات رائج تھے - وہ فی زمانہ مقبول و مروج نہین ہین - یہ تو دُور افتادہ زمانہ کا ذکر ہے - حال ہی پر غور کرو انیسوین صدی مین اس نظریہ کی بابت کتنے مختلف خیالات پیدا ہو ہو کر مسترد ہوتے رہتے ہین - مگر علم چونکہ ترقی کی طرف مائل ہے - اسواسطے اسمین مختلف خیالات کا اضافہ ہر زمانہ کے لوگون کی عقلی تربیت اور علمی تجسس سے ہوتا رہتا ہے - حتیٰ کہ کچھ عرصہ بعد ہر ایک مسئلہ کی ایک ضخیم تاریخ اور داستان تیار ہوجاتی ہے - تھوڑے عرصہ سے ریڈیم دریافت ہوئی ہے - عالم اسکی ماہیت اور خواص کی تفتیش مین سرگردان پھرتے ہین اور اسکے ذریعے سے مظاہر ارضی و سماوی اور نیز سلسلۂ اسباب و نتائج اور ظہوران طبعی کی توجیہ کیجاتی ہے - الکٹرون کا نظریہ بھی موجود ہے ممکن ہے تھوڑے عرصہ کے بعد انہین سے ایک علمی دنیا پر قابض ہو جاے فقط

جے - آر - راے

سل و دق کا علاج و انسداد - یہ مفید کتاب جسے منشی ہرگوند پرشاد صاحب تگم - ایم - اے دہلوی نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر تصنیف فرمایا ہے - اس مصنف کی پہلی کتاب ہے جو اُردو مین شائع ہوئی ہے - کتاب کے شروع مین ایک مختصر دیباچہ اور ضروری مضامین ہین - بعدہٗ اصل کتاب سات ابواب پر ختم ہوئی ہے جنمین اس مہلک مرض کی ماہیت و اسباب اور اسکے علاج و انسداد کے متعلق نہایت کامیابی سے بحث کی گئی ہے - تگم صاحب ایک مشہور اُردو اہل قلم ہین اور اکثر اُردو خوان اصحاب آپ کی عالمانہ قابلیت سے آگاہی رکھتے ہین - چونکہ آپ نے اس مہلک مرض سے کامیابی کے ساتھ نجات پائی ہے لہذا اپنے تجربات سے عوام کو فائدہ پہونچانے کے لئے اس بیش بہا تصنیف کی تکلیف گوارا فرمائی ہے - چھوٹی تقطیع کی معقول ضخامت پر قیمت ۸ رہے اور لالہ جگیشر ناتھ تگم کوچہ نواب شہر دہلی سے دستیاب ہو سکتی ہے -

---

کلام فیروز - مولانا حکیم فیروز الدین احمد صاحب فیروز طغرائی امرتسری کی چند منتخب نظمون کا ایک مختصر مجموعہ پیرزادہ مولوی عبدالعزیز صاحب مخدومی کی کوشش سے شائع ہوا ہے جسکی ہر نظم بلندیِ خیال اور زورِ طبیعت کا عمدہ نمونہ ہے - فاضل مصنف کے شاعرانہ خیالات کی پاکیزگی سے قطع نظر کرکے ہمین اس مجموعہ مین اکثر سبق آموز نظمین بھی ملتی ہین جنمین "گنگ و زمزم" والی نظم ہندو مسلمان کے اتفاق مٹانے کی غرض سے کہی گئی ہے جو مصنف موصوف کی روشن خیالی پر دال ہے - ۸۰ صفحات پر قیمت ۴ر پیرزادہ موصوف سے بہ نشان کوچہ قاصدان امرتسر مل سکتا ہے -

ویدانت

(سکھ و دکھ)

دنیا کی موجودہ حالت پر دو مختلف قدر کی رائین ہین۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ ہم روز بروز ترقی کر رہے ہین اور جو معلومات و تہذیب تگ و دو سے ہمارے متقدمین نے کی ہے اُس سے فائدہ اُٹھا کر ہم ترقی کا قدم آگے بڑھا رہے ہین۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہین تمہاری خواہشین بڑھتی جاتی ہین۔ اندرونی طاقتین جو دماغ اور خیال مین جذب ہونے کی وجہ سے زیادہ پائدار اور قوی تھین۔ مادہ پرستی اور آرام طلبی کی گوناگون شکلون مین تبدیل ہو کر بحکم رجعت باعث نقصان ہو رہی ہین ہمارے خیال مین اسکو طے کرنے کے لئے یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ انسان کی قدرتی خواہش کیا ہے۔ ہندو فلاسفہ کے ایک درشن کا یہ جزو اعظم ہے۔

"جیو آتما قدرتی طور پر دکھ سے آزادی اور سکھ کا حصول چاہتا ہے"

یہان یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سکھ اور دکھ فی الواقع کیا شے ہین؟ اور اُنکے ہونے نہ ہونے یا بڑھنے گھٹنے کا دار و مدار کس چیز پر ہے سکھ جسکی اعلیٰ حالت کو پرم آنند (انتہائی سُرور) کہتے ہین۔ دلی خواہش کا پورا ہو جانا اور پھر اُسی حالت کا قائم رہنا ہے۔ اُسکی مخالف حالت کی بے چینی اور جگر سوزی کا نام دُکھ ہے مسلسل حرکت یا قیود کی پابندی دوسرے لفظون مین دُکھ کا باعث ہوتی ہے۔ یہان یہ خیال رکھنا چاہئے کہ حرکت یا افعال دو قسم کے ہو سکتے ہین۔ ایک وہ جو ایسی حالت پیدا کرتے ہین جیسے ٹوٹی ہوئی کشتی کی حالت ہوا کے طوفان مین سمندر کی لہرون سے ہوتی ہے۔ یعنی خواہشات کا طوفان من کے لاانتہا سمندر مین تموج پیدا کر کے جسم کی کشتی کو طمانچے لگاتا ہے۔ اور جذبات اور نفس پرستی کے غیر متعین افعال سرزد کراتا ہے۔ اسکا نتیجہ سراسر تکلیف ہے۔ اگرچہ اس مقام پر کہا جا سکتا ہے کہ طبیعت اپنے وہم مین اُن خواہشات کی فوری تکمیل مین چشم زدن کے لئے آرام محسوس کرنے لگتی ہے لیکن وہ آرام غیر مستقل اور قیام پذیر نہ ہونے کی وجہ سے اپنی غیر موجودگی کی حالت مین زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازین قانون صداقت کی ایک ایسی مثال موجود ہے جسکو سامنے رکھکر ایسی ہی ناپائیدار حالت پر آرام کا اطلاق کرنا غلطی ہے۔ آواز یا شبد کی دو صورتین ہین۔ ایسی آواز جو باقاعدہ طور پر مسلسل جاری رہتی ہے۔ وہ راگ یا گانے کے نام سے نامزد کیجاتی ہے اور قلب پر اُسکا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ جیسے سُریلا گلا۔ ستار یا بین وغیرہ۔ برخلاف اسکے جو آواز غیر متعین طور پر کم و بیش حرکت کے ساتھ کان کے پردے پر ضرب دیتی ہے وہ دھمک یا شور کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ جب یہی دھمک یا شور وزن مین متعین اور باقاعدہ ہو جاتا ہے تو قلب مین سُرور پیدا کرنے لگتا ہے۔ مثلاً زرکوب کے ہتوڑے کی کھٹ کھٹ یا چاندماری کی توپون کا سلسلۂ آواز۔ اسلئے نتیجہ نکلتا ہے کہ آنند (سُرور) کی وہ حالت جو قیام پذیر اور باقاعدہ قوانین قدرت کے مطابق ہوتی ہے وہی اصل مین آرام یا آنند کے نام سے نامزد کی جاتی ہے۔

دوسری صورت افعال کی ایسی ہے۔ جسطرح ایک باقاعدہ بیڑا عاقل اور تجربہ کار ناخدا کی رہبری مین منزل مقصود کو نگاہ مین رکھکر مناسب اور سلیم راستہ طے کرتا جاتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ سلسلۂ افعال کا جیسا کہ شری مد بھگوت گیتا مین بھی شری کرشن نے

فرمایا ہے اسطرح ہے :۔

(۱) خیال

(۲) بھاؤنا (بھاؤنا خواہش سے ایک درجہ اعلیٰ ہے اُردو مین ہم اسکو نیّت کہہ سکتے ہین۔

(۳) خواہش

(۴) کرم

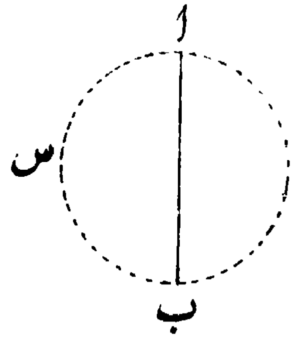
(۵) اسکا نتیجہ پدارتھ کا سنجوگ بیوگ (یعنی سامان دنیوی کا ملنا یا چھوٹ جانا۔حصول یا بربادی جس کی وجہ سے عوام رنج وراحت کو محسوس کرتے ہین)

یہ دَور خیال سے شروع ہوکر کرم پر ختم ہوتا ہے اور کرم کا نتیجہ پھر خیال ہے۔گویا حرکت دائرے مین ہے جو کبھی ختم نہین ہوسکتی۔ بجز ایک صورت کے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ کسی خواہش کے پورے ہوجانے کا نام آرام ہے اور خواہش من مین حرکت پیدا ہونے کا اظہار ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ من کی حرکت کے اشانت ہونے مین آرام محسوس ہوتا ہے۔یعنی سُکھ کو قیام ہے اور یہ ابھی بیان کیا جا چکا ہے کہ حرکت دائرے مین ہے۔اسلئے قانون حرکت کی بنا پر جسکو انگریزون مین نیوٹن صاحب نے (Laws of Motion) کی شکل مین محسوس کیا تھا۔یہ حرکت ختم نہین ہوسکتی جب تک کوئی دوسری قوت اسی وزن کی اسکے مقابلے مین روکنے والی نہو۔یا منتشر حرکتین جمع ہوکر کسی خاص نقطے کو اپنا مقصود یا مطلوب قائم کرکے اس سمت جاری ہوجائین۔اور جب وہ مقام حاصل ہو جائے تو حرکت کو قیام ہو۔ بشرطیکہ اس حرکت کا شروع ایسی مناسب قوت کے ساتھ کیا گیا ہو جس سے تمام دور کا اختتام خاص اُس نقطے پر پہونچکر ہو۔اس حالت کا نام موکھش (نجات یا آزادی) ہے۔یا دوسرے لفظون مین یون کہہ سکتے ہین کہ تمام خواہش سمٹ کر ایک خواہش کی شکل اختیار کرلین اور جب وہ بھی پوری ہوجائے تو قدرتی طور پر حرکت کو سکون حاصل ہوگیا۔

یہی مدعا اور نتیجہ موکھش (نجات) اور آزادی ہے۔

دائرہ نقطے کی مسلسل حرکت کا نتیجہ ہے اسلئے ہر ایک نقطہ دوسرے نقطے کے برابر ہے۔اسکی تین صورتین ہوسکتی ہین۔



فرض کرو کہ ایک ○ دائرہ ا ب س ہے اس مین جو قیمت ابتدائی نقطہ الف کی ہے وہی اُسکے قُطری مقابل نقطہ ب کی ہے۔اسلئے جو حالت الف پر طاری ہوتی ہے وہی ب پر سمجھنی چاہئے۔اگر کوئی چیز الف سے روانہ ہوکر براہ قطر ب تک پہونچے تو گویا اُسکو منزل مقصود حاصل ہوگئی۔دوسری صورت یہ ہے کہ ا سے چلکر ا ہی پر لَوٹے۔وہ اس حالت مین ہوگا کہ جب تمام محیط کو طے کیا جائے۔تیسری صورت یہ ہے کہ نقطۂ ا سے حرکت ہی شروع نہو۔

قُطری سفر شاسترون مین بھگتی یوگ کے نام سے نامزد ہے۔ محیط کا سفر کرم یوگ ہے اور تیسری حالت گیان یوگ ہے۔یہ امر قابل غور ہے کہ چونکہ قطر محیط کے دو ٹکڑون کے درمیان ہے اسلئے اسمین کرم اور گیان دونو شامل ہین اور اسی وجہ سے کرم یوگ کا راستہ بھگتی یوگ سے زیادہ لمبا اور شاید کچھ کم پُر خطر ہے۔یعنی متقدمین کے سدھانت (اصول مسلمہ) کے موافق کرم سے بھگتی پیدا ہوگی اور

وہی درجہ انتہا کو پہونچ گیا ہے جب پرم آنند مین مستغرق کردیتا
اوپر کہا جا چکا ہے کہ حرکت کا شروع ہونا ایسی مناسب قوت کے ساتھ
کیا گیا ہو جس سے تمام حرکات کا خاتمہ اس نقطے پر پہونچکر ہو جاتا ہے
ایسے افعال تینون گن یعنی زیادہ قوت ہے جس سے وہ نقطہ دور ہوتا
ہے۔ وہ کشش نہین ویسکتے یا ایسے افعال بھی جنسے وہ نقطہ اپنی منزل
منزل سے دور ہی رکھ سکتے ہین۔ یہ دونون حالتین افعال نیک یا بد مین
ہوتی ہین۔ یعنی وہ فعل جو طبیعت کی کسی خاص نیک یا بد خواہش
سے سرزد ہوں۔ اسی مدعا کو مدنظر رکھکر بھگوان نے گیتا کے دوسرے
ادھیاے مین اسکا مفصل بیان فرمایا ہے۔

پس انتہائی صورت سکھ (راحت) کی وہی ہے جسمین
فعل بغیر کسی ذاتی خواہش کے سرزد ہو۔ یعنی سمجھا ذسے اپنا فرض سمجھکر
یا دوسرون کے سے مثال قائم کرنے کے لئے۔ اولذکر پر کوئی اعتبار
نہین۔ نمبر ۲ بھی خواہش سے مبرا ہونا چاہئے کیونکہ وہ اپنا دھرم یا فرض ہے
جس کے نہ کرنے مین وجود کے فنا ہونے کا اندیشہ ہے۔ یعنی دھرم
وہی قوت ہے جو کسی شے کو دھارن کئے رہے۔ تیسری حالت بھی
ذاتی خواہشات سے بالکل پاک ہونی چاہئے ورنہ وہ عوام کے لئے
بطور مثال پیش نہین کی جاسکتی۔ متذکرۂ بالا دلائل کا اختصار ہم
یون کرسکتے ہین۔

(۱) کسی فعل کا سرزد ہونا من کی حرکت پر منحصر ہے جسکے لئے
قوت محرکہ۔ خواہش۔ بھاونا۔ اور انتہائی صورت مین خیال ہے۔
(۲) سکھ حرکت کے ساکت ہونے مین ہے۔ لیکن دل کی
حرکت کا ساکت ہونا فعل کا ساکت ہونا نہین ہے۔
(۳) وہی افعال اعلیٰ درجہ کے کہلاسکتے ہین یعنی وہی کرم
پرم آنند (ابدی راحت) کو پہونچا سکتے ہین جو بغیر کسی خواہش کے کئے جائین۔
راحت کس مین ہے۔
(۱) راحت عامۂ خواہشات کی کمی مادی ترقی کے محدود دائرے
اور مایا کے اختصار مین ہے
(۲) جو شائستگی یا تعلیم یا لٹریچر (ساہیتہ) مادی خواہشات
اور مایا کے گھٹا ٹوپ بادل پھیلائے۔ اُس سے گریز واجب ہے۔ کیونکہ
وہ اصول اور عمل دونون مین سم قاتل ہے۔
(۳) وہ انسانی جماعت یا جتھا جسمین مادہ پرستی کا زہر نہین پھیلا
بیرونی دنیا اور مایا کی ڈراونی خواہشات سے بے اثر ہے۔ فی الواقع وہ جسمانی
دماغی اور روحانی طور پر آزاد ہے اور جب تک نفسانی خواہشات سے زیر نہ ہوگا
اور جذبات کی ظلمت کے تلاطم سے بچا رہیگا اُسکی ہر حالت مین کوشش ہے۔
وہ ایشور کے درشن کا مستحق ہے۔ ہان وہ خود .... اوم!

رام چندر

تین قابل قدر کتابین۔ پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب کی مہتم بالشان تصنیف "بوستان آصفیہ" پر ہم گذشتہ سال ریویو کرچکے ہین۔ حال مین آپنے
تین اخلاقی اور نہایت مفید تصانیف عنایت کرکے ہمین شکرگذار فرمایا ہے۔ اول "تعزیۃ الحیات" جسمین اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین سے اُس طرز پر بحث کی گئی ہے جسطرح پر سر جان لبک
نے "پلیژرس آف لائف" مین بحث کی ہے۔ زندگی کو دلچسپ اور خوشگوار بنانے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ دوم ہندوستان کے عظیم الشان راجہ اشوک
کی سوانح عمری ہے جسمین قدیم زمانے کی تاریخ کا بہت بڑا اور دلچسپ حصہ آگیا ہے اور جس سے فاضل مصنف کی وسیع النظری کا اندازہ ہونے کے ساتھ ہی بہت سے اخلاقی اور عبرت خیز
سبق حاصل ہوسکتے ہین۔ تیسری کتاب "دُر نیتی" ہے جسمین وہ اخلاقی اور حکیمانہ نصائح جمع کئے گئے ہین جو رودرگرو نے راجہ دھرتراشٹر کو کئے تھے اور جو ہر انسان کا دستور العمل
بننے کے قابل ہین۔ تینون کتابین انسانی زندگی کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہین اور اس قابل ہین کہ انکا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ مصنف موصوف سے بمقام حیدرآباد محلہ حسینی علم خط و کتابت کیجائے۔

قدیم عربون کا علم الاصنام

عرب مین اسلام سے پہلے کا زمانہ ایام جاہلیت کہلاتا ہے اس زمانہ مین قوم عرب کوئی تاریخی حیثیت نہین رکھتی تھی جسکی وجہ سے دنیا مین اسکی کوئی مستقل تاریخ موجود نہین ہے - اسلئے انکے مذہب کا قابل اطمینان بیان زیادہ مشکل امر ہے -

زمانہ جاہلیت کے مذہب کی نسبت مغربی علما کی دو رائین ہین بعض کا بیان ہے کہ اہل عرب اسلام سے پہلے لا مذہب تھے - بعض کہتے ہین کہ اسلام سے پہلے جو مذہب عرب مین رائج تھا وہ ظہور اسلام کے وقت بالکل ضعیف بلکہ بمنزلہ نیست و نابود کے ہوگیا تھا - عربی تاریخون مین قدیم مذہب کے جستہ جستہ حالات ملتے ہین جنسے معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام سے پیشتر عرب مین مختلف مذاہب مروج تھے - مثلاً دہریت - یہودیت - مسیحیت - مجوسیت - صنم پرستی وغیرہ - لیکن ان مین سے یہودیت و مجوسیت وغیرہ ایسے مذاہب تھے جنکی ابتدا غیر ممالک سے ہوئی تھی اسلئے انکو یہان بہت کم عروج حاصل ہوا - صنم پرستی انمین عام طور پر رائج تھی اور یہی ایک ایسا مذہب تھا جسکو عربون کا ملکی اور قومی مذہب کہہ سکتے ہین -

عرب چونکہ سامی النسل ہین اسلئے انکی بت پرستی کا طریقہ قریب قریب وہی تھا جو تمام سامی اقوام مین پایا جاتا تھا - یہ لوگ سمجھتے تھے کہ خدانے کواکب کو مدبرنی الکائنات بنایا ہے اور ان مین روحانیت بھی مانتے تھے - اسلئے انکی پرستش کرتے تھے کہ وہ مہربان ہون اور ہم انکی مضرت سے محفوظ رہین - اور اپنے خیالات کے موافق ان کے بت بناتے تھے اور صالح و خدارسیدہ آدمیون کے بھی بت بنا کر انکی پرستش کرتے اور انکی ارواح سے حاجات طلب کرتے تھے -

انکے یہان ہر قبیلہ کا ایک خاص بت یا معبود ہوتا تھا - اور قبیلہ کے تمام لوگ اسکی پرستش کیا کرتے تھے - عربی اقوام چونکہ صدہا قبائل مین منقسم تھے جسکی وجہ سے انکے بتون کا شمار سیکڑون بلکہ ہزارون سے تجاوز کرگیا تھا - چنانچہ ایک شاعر زید بن عمرو کہتا ہے -

اربا واحدا ام الف رب　　ادین اذا تقسمت الامور[1]

(آیا مین ایک خدا مانون یا ہزارون کو - جبکہ امور دین اسطرح متفرق ہورہے ہین)

عربون نے اپنے بتون کے لئے بہت سے بت خانے بنا رکھے تھے - جن مین سب سے بڑا بت خانہ کعبہ تھا - کعبہ مین مختلف قبائل کے تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے - عرب چونکہ خانہ بدوش تھے اور انکے بت مقامی تھے - اسلئے ان مین زیارت کا عام دستور ہوگیا تھا اور وہ لوگ مقررہ اوقات پر اپنے معبودون کی زیارت کے لئے اپنے بت خانون کو آیا کرتے تھے - کعبہ مین چونکہ سیکڑون قبائل کے بت تھے اسلئے وہ سب سے بڑی زیارت گاہ بن گیا تھا[2]

عرب اپنے بتون کو مختلف اشیا مثلاً پتھر - لکڑی - گوند - ہاتھی دانت وغیرہ سے بناتے تھے اور ان پر مختلف قسم کے نقش و نگار کرتے اور قسم قسم کے رنگون سے رنگتے تھے - ایسے بتون کو جو پتھر کے ہون انصاب کہتے تھے اور جو لکڑی کے ہون تمثال کہلاتے تھے ہاتھی دانت کا نقش و نگار والا بت دمیہ کہلاتا تھا[3] یہ بت نہایت خوبصورت بنایا جاتا تھا - یہان تک کہ اسکی خوبصورتی ضرب المثل ہوگئی تھی - اہل عرب جب کسی عورت کے حسن کی تعریف کرتے تو کہتے تھے -

---

[1] سیرۃ ابن ہشام طبع یورپ　[2] التمدن الاسلام جلد ۱　[3] لسان العرب

فلانہ احسن من دمیۃ[۵۱] یعنی فلانی عورت دمیہ سے بھی زیادہ حسین ہے۔ وہ الفاظ جو مطلق بت کے لئے استعمال کئے جاتے تھے یہ ہین۔ صنم۔ تماثیل۔ وثن۔ نُصُب۔ صنم۔ پہلے کے چار وان لفظ عربی الاصل ہین صنم عجمی لفظ ہے اور فارسی زبان کے لفظ شمن کا معرب ہے[۵۲]

بت جسطرح مختلف اشیا سے بنائے جاتے تھے اسیطرح انکی اشکال بھی مختلف ہوتی تھین۔ بعض انسانی شکل کے ہوتے تھے بعضون کی شکل حیوانی ہوتی تھی اور بعض نباتات کے بھی ہوتے تھے[۵۳]

عرب اپنے بتون کے لئے قربانی بھی کرتے تھے۔ ذبیحہ کا خون معبود سے لگا دیا جاتا تھا اور گوشت کھا لیا کرتے تھے۔ عرب اپنی سب سے زیادہ عزیز چیز کو اپنے بتون کے لئے قربان کرنا اپنی نجات و بہبود اور بتون کی خوشنودی تصور کرتے تھے۔ اسلئے ان مین انسانی قربانی کا بھی رواج ہو گیا تھا۔

عربون مین بت پرستی اور متعدد معبودون کی پرستش قدیم الایام سے مروج ہے۔ لیکن یہ بتانا کہ یہ طریقہ اُن مین کب سے اور کیونکر رواج پایا نہایت مشکل امر ہے۔ قدیم مورخ ہیرودطس (Herodotus) بیان کرتا ہے کہ اُن ایام مین قبائل عرب عموماً دو معبود مانتے تھے جنکے نام اُرتال اور اللات تھے[۵۴] اسریا اور خالدیا کے کھنڈرون سے حضرت مسیح سے آٹھ نو صدی پہلے کے جو کتبے برآمد ہوئے ہین اُنسے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب نہایت قدیم زمانہ سے متعدد معبودون کے قائل تھے۔ اور اُنکے نام سے بت بنا کر پرستش کیا کرتے تھے۔

فرانس کے مشہور عالم ڈاکٹر گستاولی بان G. Le Bon نے جو کتاب عربون کے تمدن پر لکھی ہے۔ اُسمین اسی قسم کا ایک قدیم کتبہ درج ہے اور اُس سے ان حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ وہ کتبہ یہ ہے۔

"شاہ عرب بہت سے تحفہ و تحائف لیکر میرے مستقر نینوا مین آیا اور قدمبوس ہو کر عرض کیا کہ مین اُسکے بتون کو اُسکے حوالہ کر دون مجھے اُسکی حالت پر افسوس ہوا اور بتون کی مرمت کرا کر اور اُن پر اپنے خدا آشور اور اپنے دستخط ثبت کرنے کے بعد واپس دیدیا اور تابوعہ کو جو عرب کی شہزادی تھی اور میرے یہان پرورش پائی تھی مین نے ملکہ بنا کر اُسے بھی اُسکے ملک کو روانہ کر دیا[۵۵]"

علامہ عبدالکریم شہرستانی بیان کرتا ہے کہ پہلے جس نے مکہ مین بت بنائے اور اہل مکہ کو اُن کی پرستش کے لئے متوجہ کیا وہ عمرو بن لحی ہے۔ عمرو کے بت پرست ہونے کا سبب یہ ہے کہ جب وہ ملک شام کے شہر بلقا مین گیا ہوا تھا تو وہان ایک قوم کو بتون کی پرستش کرتے دیکھا اور اُن سے سبب دریافت کیا۔ جسکے جواب مین اُنھون نے کہا کہ یہ ہمارے پروردگار ہین اور ہم نے اُنکی اشکال علویہ کو اجسام بشریہ مین بنا لیا ہے۔ جب ہم اُن سے مدد مانگتے ہین تو وہ ہماری مدد کرتے ہین جب پانی مانگتے ہین تو پانی دیتے ہین۔ یہ گفتگو سنکر عمرو کو تعجب ہوا اور اُسنے اُنکے بتون سے ایک بت جس کا نام ہبل تھا مانگ لیا اور اُسے لیکر مکہ مین آیا اور کعبہ کی چھت رکھدیا اور عوام الناس کو اُسکی تعظیم پر توجہ دلائی اور کہا کہ یہ تقرب باری تعالی کے لئے توسل ہے۔ یہ واقعہ شاپور ذوالاکتاف کے عہد حکومت مین ہوا ہے[۵۶]۔

عربون کے اگرچہ صدہا بت تھے لیکن کتابون مین تلاش کرنے سے صرف بیس بتون کے حالات ملتے ہین۔ ان بتون مین ہبل اور اساف و نائلہ ایسے بت تھے جنکی پرستش تمام عربون مین

---

[۵۱] مجمع الامثال میدانی۔ [۵۲] شفاء العلیل فیما فی کلام العرب والدخیل للخفاجی۔ [۵۳] التمدن الاسلامی جلد ا۔

[۵۴] La Civilisation des Arabes 1884 pp [۵۵] ملل و نحل مطبوعہ ... صفحہ ۲۳۰ [۵۶] شاپور ذوالاکتاف ایران کی دولت ساسانیہ کا آٹھوان تاجدار تھا۔ حضرت رسول کریم سے ۲۹۰ سال قبل گزرا ہے ملخص از تاریخ التواریخ۔

مروّج تھی۔ باقی بت مختلف قبائل سے مخصوص تھے۔ یعنی کوئی قبیلہ کسی بت کی پرستش کرتا تھا اور کوئی کسی کی۔

ود ۔ قبیلۂ کلب کا بت تھا اور دومۃ الجندل مین رکھا ہوا تھا[1]

سواع ۔ قبائل بنو ہذیل وکنانہ و ہمدان کا بت تھا اور ... مین رکھا ہوا تھا[2]

یغوث ۔ قبیلۂ مذحج اور بعض قبائل یمن کا بُت تھا۔[3]

یعوق ۔ قبائل بنو ہمدان و بنو مراد کا بت تھا[4]

نسر ۔ قبیلۂ ذوالکلاع کا معبود تھا اور صنعان مین رکھا ہوا تھا۔[5]

لات ۔ قبیلۂ بنو ثقیف کا معبود تھا اور طائف مین رکھا ہوا تھا۔[6]

منات ۔ قبائل اوس و خزرج اور بنو خزاعہ اسکی پرستش کرتے تھے۔ اور وادی منا مین رکھا ہوا تھا۔[7]

عزیٰ ۔ قبائل قریش وکنانہ وغطفان اسکی پرستش کرتے تھے اور مکہ مین رکھا ہوا تھا۔[8]

فلس ۔ قبیلہ بنو طے کا بُت تھا اور حبس مین رکھا ہوا تھا[9]

کثریٰ ۔ قبائل طسم وجدیس کا بت تھا[10]

تیم ۔ قبیلہ تیم کا بت تھا۔ 〃

ذوالشریٰ ۔ قبیلۂ اوس وخزرج کا بت تھا۔ 〃

باجر ۔ قبیلۂ ازد کا بت تھا۔ 〃

جہاذ ۔ قبیلہ ہوزان کا بت تھا۔ 〃

اوائل ۔ قبیلہ بکر بن وائل کا بت تھا۔ 〃

محرق ۔ قبیلۂ ملکان بن سعد کا بُت تھا[11]

سعیر ۔ قبیلۂ عنزہ کا بُت تھا۔ 〃

عمیانس ۔ قبیلۂ بنی خولان کا بت تھا۔ 〃

رضا ۔ قبیلۂ بنی طے کا بُت تھا۔ 〃

ذوالکفین ۔ قبیلۂ اوس کا بُت تھا۔ 〃

ہبل سب بتون سے بڑا اور کعبہ کی چھت پر رکھا ہوا تھا۔[12] یہ بُت عقیق احمر کا بنا ہوا تھا اور اُسکی صورت انسان کی سی تھی[13] یمن کے بادشاہ اصحاب الفیل (ابرہۃ الاشرم) کی فوج کشی مین اسکا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا تھا۔ جسکو قریش نے دوبارہ سونے کا بنوایا[14] ہبل سب سے پہلا بُت ہے جو مکہ مین رکھا گیا۔ اسکے بعد اساف ونائلہ بنے۔

اساف ونائلہ کے بُت صفا و مروہ کی پہاڑیون پر رکھے ہوئے تھے اور اُنکی شکل مرد وعورت کی تھی۔ ان کی نسبت بعض گمان کرتے ہین کہ یہ دونون آدمی تھے۔ اساف عمرو بن لحی کا بیٹا اور نائلہ سہیل کی بیٹی دونون کعبہ مین .... مرتکب ہوئے جسکی وجہ سے اللہ نے انکو پتھرون کی صورت مین بدل دیا۔

ود ۔ سواع ۔ یغوث ۔ یعوق ۔ نسر ۔ ان پانچ بتون کا ذکر قرآن مجید مین آیا ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بُت نہایت قدیم ہین اور طوفان نوح سے پہلے بھی ان کی پرستش کی جاتی تھی۔

"نوح نے کہا کہ اے میرے پروردگار انھون نے میرا کہا نہ مانا" "(اور) پیروی کی اُنکی جسکے مال واولاد نے نقصان

---

۱ ملل ونحل شہرستانی۔ ۲ ملل ونحل وتاریخ یعقوبی و فتح الباری جلد ہشتم۔ ۳ ملل ونحل۔ ۴ ملل ونحل و فتح الباری ۵ ملل ونحل۔ ۶ تاریخ یعقوبی جلد ۱۔ ۷ ملل ونحل۔ ۸ ملل ونحل ومعجم البلدان ذکر مکہ۔ ۹ تاریخ یعقوبی جلد ۱۔ ۱۰ صناجۃ الطرب۔ ۱۱ ملل ونحل۔ ۱۲ سبائک الذہب فی قبائل العرب۔ ۱۳ تاریخ یعقوبی جلد اول۔ ۱۴ سیرۃ ابن ہشام و ملل ونحل۔

سو انکو ... فائدہ نہ پہنچایا ... بڑا مکر کیا اور انہوں نے کہا کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑو اور ود کو اور سواع کو اور یغوث و یعوق و نسر کو اور بے شک انہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا[۱]

ان بتوں کی نسبت بہت سے قصص اور روایات پائے جاتے ہیں منجملہ انکے ایک قصہ جسکو امام بغوی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے یہ ہے۔

"ود - سواع - یغوث - یعوق - نسر - چند آدمیوں کے نام ہیں جو آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان گذرے ہیں لوگوں نے انکے مرنے کے بعد انکی مورتیں بطور یادگار بنائیں جنکی مدت دراز بعد پرستش ہونے لگی عربوں نے بھی دیگر اقوام کی دیکھا دیکھی انکو اپنا معبود قرار دیا۔"[۲]

ود مرد کی صورت پر تھا۔ سواع کی شکل عورت کی تھی یغوث کی صورت شیر کی تھی۔ یعوق گھوڑے کی شکل پر اور نسر عقاب کی صورت پر تھا[۳]

توریت میں اگرچہ قوم نوح کی شرارت و گمراہی کا ذکر آیا ہے مگر اُس میں انکی بت پرستی کا تذکرہ نہیں ہے اور نہ یہ حالات کسی اور قدیم کتاب میں ملتے ہیں۔ زمانہ حال کی تحقیقات سے اس بارے میں تھوڑا سا انکشاف ہوا ہے۔ ان پانچ بتوں میں صرف نسر کا پتہ چلا ہے۔ عبرانی میں اسکا نام نسروک [נסרך] ہے۔ قدیم زمانے میں اسریا میں جو قوم نوح کا مسکن تھا اسکی پرستش ہوتی تھی اور نینوہ Neneveh میں اسکا معبد بنا ہوا تھا۔ اسی مندر میں اسریا کے بادشاہ سنجریب کو جبکہ وہ اس بت کی عبادت میں مصروف تھا اُسکے لڑکوں نے قتل کر ڈالا تھا۔ چنانچہ حضرت اشعیاہ پیغمبر نے اس واقعہ کا ذکر اسطرح کیا ہے۔

"سنجریب بادشاہ اشور کوچیدہ روانہ شد و برگردیدہ در نینوہ ساکن شد و واقع شد ہنگامی کہ در خانہ خدائے خود نسروک می نمود کہ پسرانش ادرملک و شراصر اورا بشمشیر زدند و ایشان بولایت اراراط فرار کردند و پسرش اسر حدون در جائش سلطنت نمود"[۴]

بابل Babylon اور نینوہ Neneveh کے کھنڈروں سے نسر کے بہت سے بت برآمد ہوئے ہیں جنکا سر عقاب کا ہے اور باقی حصہ انسان کا۔ شانوں پر بازو بھی لگے ہوئے ہیں۔ ہاتھ میں اُس مقدس درخت کی تصویر ہے جسے بہشت میں کھانے سے حضرت آدم کو منع کیا گیا تھا[۵] لیکن یہ بتانا مشکل امر ہے کہ عربوں میں اسکی کیا شکل مروج تھی۔ صاحب مناجۃ الطرب نے بیان کیا ہے کہ اسکا چہرہ عقاب کا سا بنایا جاتا تھا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب فتح الباری میں جو روایت واقدی سے نقل کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی تمام ہیئت پرندے کی سی ہوتی تھی۔

لات - منات - عزیٰ - بھی عرب کے مشہور معبود ہیں۔ انکا ذکر سورۃ النجم میں وارد ہے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ تینوں نام عربوں نے خدا کے ناموں سے اشتقاق کئے ہیں۔ عزیز سے عزیٰ۔ اللہ سے اللات - منان سے منات۔

لات عرب کا بہت قدیم معبود ہے۔ مورخ ہیرودوٹس (Herodotus) نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مورخین عرب بیان کرتے ہیں کہ لات اصل میں شعیب علیہ السلام کی قوم کا معبود تھا۔ عربوں نے اسکی پرستش اُسی قوم سے سیکھی ہے۔ اسکا بت ستارۂ زہرہ

---

[۱] قرآن مجید سورہ نوح آیۃ ۲۱ سے ۲۳۔ [۲] الوار التنزیل مطبوعہ یورپ جلد دوم صفحہ ۳۶۰۔ [۳] مناجۃ الطرب۔ [۴] صحیفہ اشعیاہ پیغمبر۔
[۵] تطلع الذہور فی تاریخ الدہور۔

شابہ بنایا جاتا تھا اور حجر اسود کی طرح اسکی عبادت کی جاتی تھی[1]

ابن اسحاق الکندی جو خلافت عباسیہ کا مشہور مترجم ہے۔ ...ی کی نسبت بیان کرتا ہے کہ عاران مین اسکا بہت بڑا معبد بنا ہوا تھا جہان ابراہیم خلیل اللہ سے پہلے بھی اسکی پرستش ہوتی تھی۔ ...ہین لوگون سے اہل عرب نے اس بت کو حاصل کیا تھا۔[2]

ابن ہشام نے ایک ایسے بت کا بھی ذکر کیا ہے جو عرب کے ہر ایک گھر مین ہوتا تھا۔ مگر اسکے نام وحالات وغیرہ کا پتہ نہین ملتا۔ وہ لکھتا ہے کہ عرب کے ہر گھر مین ایک بت ہوتا تھا جسکی عبادت گھر کے تمام آدمی کرتے تھے۔ جب کوئی کہین باہر جانے لگتا تو سوار ہوتے وقت اپنا جسم اُس سے مس کرتا۔ اور جب سفر سے واپس آتا تو اپنے ...ل وعیال سے ملاقات کرنے سے پہلے اُس بت کے پاس جاتا اور ...سمِ تعظیم ادا کرتا تھا۔[3]

امام طبری اور ابن اثیر وغیرہ مورخین نے تصریح کی ہے کہ حضرت رسولکریم کے حکم سے حضرت مغیرہ بن شعبہ نے ۸ھ مین لات کو توڑا۔ ۸ھ مین حضرت سیف اللہ خالد بن ولید کے ہاتھ سے عزیٰ اور حضرت سعد کے ہاتھ سے منات توڑے گئے۔ اسی سنہ مین جب مکہ فتح ہوا تو جناب رسالت مآب نے اپنے ہاتھ سے ہبل کو توڑا۔

کعبہ عربون کا سب سے بڑا بت خانہ تھا۔ اسمین تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ اور ان کی نسبت گمان کیا جاتا تھا کہ یہ اُن تین سو ساٹھ ہستیون کی تصویرین ہین جو سال بھر کے خادم اور کارکن ہین[4] اور یہ مختلف صورتون پر بنائے گئے تھے۔ کوئی آدمی کی ہیئت پر تھا۔ اور کسی کی حیوانی اور نباتاتی شکل تھی[5]

اِن بتون کے علاوہ بہت سی تصویرین بھی تھین۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر اسطرح بنی ہوئی تھی کہ ہاتھ مین ازلام لیکر فال دیکھ رہے ہین۔ اور بی بی مریمؑ حضرت عیسیٰ کو گود مین لئے ہوئے بیٹھی ہین[6]

حکیم سید شمس اللہ قادری

امتحانِ محبت

(قصہ)

آج پالی پور مین خوشیان منائی جارہی ہین سب لوگون نے اپنے اپنے گھرون کے دروازون پر پھولون کے ہار لگائے ہین کیون؟ ...ون کے سردار بھیم سین کے یہان بچہ پیدا ہوا ہے۔ لڑکا ہے کہ لڑکی؟ ...ہن دیوتا تو لڑکا چاہتے ہین، جو انکی وفات کے بعد انکا سراد... ...ے اور انکی جائداد کا وارث ہو۔ مگر خیر لڑکی ہی سہی۔ خدا نے اولاد تو ...۔ شکر ہے اُسکی درگاہ مین!

اب ضیافتین اُڑنے لگین۔ آج برہمنون کا بھوجن ہے۔ تو کل گاؤن بھر کی دعوت ہے۔ رات کو ایسی ایسی آتشبازیان چھوٹتی ہین کہ گاؤن والون نے اس سے پیشتر کبھی نہین دیکھی تھین۔ دس دن تک بچے کی خبرگیری نہایت عمدہ انتظام کے ساتھ ہوتی رہی۔ گیارھوین دن چُن باہن کی رسم ادا کی گئی، اور بارھوین دن نام کرن ہوا بھیم سین کی یہ خواہش تھی کہ اس لڑکی کا کوئی انوکھا نام رکھا جائے۔ آخر ملکا मल्लिका (چمبیلی کا پھول) نام رکھا گیا۔

ملکا جون جون بڑھنے لگی، چمبیلی کے پھول کی طرح خوبصورت

---

[1] ...خ قرون الوسطی۔ [2] نامہ الکندی مطبوعہ لندن۔ [3] سیرۃ ابن ہشام طبع یورپ [4] مناجۃ الطرب۔ [5] التمدن الاسلامی جلد ا [6] تاریخ یعقوبی جلد اول

اور خوش نظر آنے لگی۔ بھیم سین چاہتا تھا کہ بیٹی کی شادی جوانی
کی عمر میں کردے۔ مگر [illegible] اُسکی [illegible] کچھ اور ہی لکھا تھا۔ دس
سال کی عمر [illegible] وہ اپنے [illegible] کے ساتھ کھیلا کی۔ اس اثنا مین
پروہت [illegible] کئی دفعہ بھیم سین سے شادی کے لئے کہہ چکے تھے
مگر اب وہ آخری مرتبہ پہونچے اور بھیم سین سے مخاطب ہوکر کہا کہ "ایک
لڑکی کی شادی نہ کرنے سے کیا مطلب ہے؟ اب یہ کئی برس کی
کی ہوگئی۔ مناسب تھا کہ ابتک اسکی شادی ہوجاتی۔ اگر تم فوراً اسکی
شادی کا انتظام نہ کروگے تو یاد رکھو اسکا نتیجہ بہت برا ہوگا!"
بھیم سین نے [illegible] کچھ جواب دیا۔ بات یہ تھی کہ اُسے
صغر سنی کی شادی منظور نہ تھی۔ لیکن پروہت جی کے سامنے
اُسکی ایک نہ چلی۔

اب پروہت نے صاف صاف کہدیا کہ "اگر تم لڑکی کی
شادی فوراً نہ کروگے تو تمکو برادری سے خارج ہونا پڑیگا۔ خوب
سوچ سمجھ لو۔ قریب کے گاؤن مین رام راؤ کا لڑکا ہے اُس کو مین
ٹھہرا دونگا۔ کہو کیا صلاح ہے؟"

بیچارے بھیم سین نے بہت کچھ سوچا۔ اسکی عقل پریشان تھی۔ کچھ کام
نہ دیتی تھی۔ چاہتا تھا کہ ننھی کلی کے پھول کو کچھ اور عرصہ تک
پاس رکھے۔ مگر یہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔ برادری سے قطع تعلقات
وہ کسطرح گوارہ کرسکتا تھا۔ اُنکی بیوی نے جب یہ حال دیکھا، تو شوہر
کے قدمون پر گر پڑی، اور روکر کہنے لگی کہ "آپ شادی کر دیجیے۔"
اب بھیم سین مجبور تھا۔ ناچار پروہت جی سے کہا گیا کہ "اچھا! آپ
شادی کا انتظام کیجیے۔"

رام راؤ بہت دولتمند تھا۔ مگر جسطرح اُسکی دولت بیشمار تھی
اسی طرح اسکی کنجوسی کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ خیر کچھ مضائقہ نہیں۔
وہ ضعیف العمر ہے کبتک زندہ رہیگا۔ اُسکی جائداد کا مالک تو اُسکا
لڑکا رام چندر ہی ہوگا۔ لڑکا بہت ہونہار، خوش طبع اور خوبصورت
ہے۔ بی۔ اے کی تعلیم پاتا ہے۔ ملکہ کے لئے بر تو اچھا ہے اور
بہت اچھا ہے۔

پروہت جی نے ساعت ٹھہرائی۔ سب بھائی بند بلائے گئے
طرح طرح کے زیورات تیار ہوئے۔ الغرض نہایت دھوم دھام سے
شادی کے سامان ہونے لگے۔ شادی کے پانچوین دن بارات
رخصت ہوئی۔ پالکی مین دولھا اور دولھن بیٹھے تھے۔ آتشبازی چھوٹ رہی
تھی اور مشعلین روشن تھین۔ پالکی پر پھولون کی بارش ہورہی تھی۔
لڑکا اور لڑکی دونون پھولون کے ہارون اور زیورات سے
لدے ہوئے تھے۔ ملکہ شرم کے مارے دُہری ہوئی جاتی تھی۔
بارات مین لوگون کا کچھ شمار نہ تھا۔

لڑکی سسرال مین پہونچی۔ پانچ برس بڑی خوشی سے گزرے۔
ملکہ شوہر پر فدا تھی اور شوہر ملکہ پر قربان، دونون ایک دوسرے کے
قدردان تھے۔ تیلگو زبان تو وہ جانتی ہی تھی، مگر اب رام چندر سے وہ
انگریزی بھی پڑھنے لگی۔ اُسکی ہر طرح یہی کوشش تھی کہ جہانتک
ہوسکے اپنے گھر کو بہشت کا نمونہ بنادے۔ ساس سسر بھی اُس پر جان دیتے
تھے۔ افسوس! اُس بیچاری کو کیا معلوم تھا کہ "چار دن کی چاندنی
اور پھر اندھیری رات" کا معاملہ ہونے والا ہے۔

ایکدن ملکہ کو اپنے باپ کی چٹھی ملی، اُسکو پڑھتے ہی وہ سن ہوگئی۔
اُسمین لکھا تھا کہ اُسکے باپ کو کسی بیوپار مین اسقدر خسارہ ہوا ہے کہ اُسکی
ساری جائداد ہاتھ سے نکل گئی۔ ملکہ کو اپنا تو کچھ اندیشہ نہ تھا مگر والدین
کی حالت کا خیال کرکے پھوٹ پھوٹ کے رودی۔ آخر وہ اپنی ساس
کے پاس گئی اور خط پڑھکر سنایا۔ ساس یہ خبر سنکر بہت گھبرائی اور کہنے لگی
"بیٹی تو بڑی بدقسمت ہے۔ تیرا سسر یہ حال سنیگا تو تجھپر بہت خفا ہوگا۔"

ملکہ :۔ "ماتا! اسمین میرا تو کوئی قصور نہین جو سسر جی ناراض ہوجائینگے۔ وہ تو، جب سے مین آئی ہون ہمیشہ مجھ پر مہربان رہتے ہین"

ساس :۔ "نہین بیٹی! تمکو اندر (باطن) کا حال معلوم نہین"

ملکہ :۔ "اچھا تو پھر مجھکو کچھ دن کے لئے میکے جانے کی اجازت دے دو"

ساس :۔ "ٹھہرو! اتنی جلدی مت کرو، پہلے دیکھنے دو وہ کیا کہتے ہین!"

رام راؤ نے جب ساری کیفیت سُنی تو آگ بگولہ ہوگیا۔ ملکہ حیران تھی کہ "ہین! یہ وہی سسر جی ہین جو مجھ پر بیحد مہربان تھے!" اب وہ اپنی بہو کی طرف مخاطب ہوا اور چلاّ کر بولا۔ "اری لڑکی! تو بغیر روپے کے میرے کس کام کی ہے؟ مین نے تو روپے کے لئے اپنے لڑکے کی شادی کرائی تھی، نہ کہ تیرے گوشت کے لوتھڑے (جسم) کے لئے۔ جا اور جائداد کا حصہ لے آ، ورنہ تیرا بُرا حال ہوگا سُنتی ہے کہ نہیں؟"

ملکہ کی آنکھون سے آنسوؤن کا دریا اُمڈ آیا، اُسکے مُنہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ باپ کے چیخنے چلانے کی آواز سُن کر رام چندر بھی وہان آگیا اور پوچھا "باپ! کیا معاملہ ہے؟"

رام راؤ :۔ "معاملہ کیا ہے، ملکہ کے باپ کا سب روپیہ برباد ہوگیا، اور تم اچھے خاصے بیوقوف بنے۔ اب کیا ملکہ کو لیکر چاٹوگے؟"

رام چندر :۔ "مگر مین نے روپے کے لئے شادی نہین کی تھی"

رام راؤ :۔ "ہین کیا بکتا ہے؟ روپے کے لئے شادی نہین کی تھی تو اور کسکے لئے کی تھی؟ شادی کرنے یا نہ کرنیوالا تو کون ہے؟ شادی تو ٹھیک تو مین نے کیا تھا۔ اب مین تمسے کہتا ہون کہ اسکو چھوڑ دو اور دوسری شادی کرو۔"

رام چندر نے اشارے سے ملکہ سے کہا کہ تم یہان سے ہٹ جاؤ اور باپ سے کہا کہ "مین تو ہرگز ملکہ کو نہ چھوڑونگا"

رام راؤ اتنا سُنکر بہت حیران ہوا، کیونکہ لڑکے نے کبھی ایسا جواب نہ دیا تھا۔ اُسکے آنسو نکل آئے اور کہا "اگر تم دوسری شادی نہین کرتے تو مین کیا کرونگا؟ مین تو برباد ہو جاؤنگا" رام چندر حیرانی سے باپ کے مُنہ کو تکنے لگا۔ اسپر باپ بول اُٹھا۔ "گھورتے کیا ہو؟ بہت عرصہ ہوا کہ میری ایک اسامی کے کنبے کے لوگ ہیضہ کا شکار ہوگئے تھے، اس سے وہ ایسا گھبرایا کہ اپنا سب مال میرے پاس رکھکر تیرتھ یاترا کو چل دیا۔ جب مدت تک اُسکا کچھ پتہ نہ چلا، تو مین نے وہ ساری دولت اپنے قبضہ مین کر لی اور اُس سے مین دولتمند ہوگیا۔ اب سُنتا ہون کہ وہ آرہا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو مین پھر غریب . . . . کا . . . غر . . . . یب!"

رام چند :۔ "باپ! ایسے روپے کو رکھنے کا ہملوگون کو ہرگز خیال نکرنا چاہیئے۔ جسطرح ممکن ہو اسامی کا مال اُسکو واپس کر دینا چاہیئے"

ملکہ کو مجبوراً اپنے باپ کے گھر جانا پڑا۔ مگر تعجب اس بات کا ہے کہ اُسکے شوہر نے بھی اُسکو نہین روکا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ بیچارے رام چندر کی عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ آخر اُس نے یہ سوچا کہ ملکہ کا اپنے باپ کے گھر جانا ہی اچھا ہے، مین دفتر مین ملازمت کرتا ہون، پہلے باپ کی پرورش کرونگا، اور جو کچھ اُسکی ضروریات ہونگی، اُن کو رفع کرونگا۔ اسکے بعد آرام سے ملکہ کو اپنے گھر لے آؤنگا۔ یقین ہے کہ میری بیوی میری غریبی کا چندان خیال نہ کریگی"

ملکہ جب روانہ ہونے لگی تو اُسکو اُمید تھی کہ اب میرا شوہر مجھکو روکتا ہے، اب کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ۔ مگر افسوس اسی اُمید مین

وہ چلی گئی۔ جب باپ سے گھر پہونچی، تو اُسکے سامنے ساری دنیا تاریک تھی۔

—— + ——

تین برس اسی طرح گذر گئے۔ ملکہ ہر وقت اپنے شوہر کے انتظار مین رہا کرتی تھی۔ ظاہر مین تو اُسکا سہ دنا قد اور کھلے ہوئے گلاب کا سا خوشنما چہرہ یہ بتاتا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔ مگر اُسکے دل کی کیا کیفیت تھی، اُسکو وہ ہی جانتی تھی۔ جب اُسکو یہ معلوم ہوا کہ اُسکے سسر کو وہ سب مال و متاع اسامی کو واپس کر دینا پڑا ہے، اور اب وہ خود بھی بہت غریب ہو گیا ہے، اُسوقت سے وہ دلمین غمگین اور فکرمند رہنے لگی مگر کیا کر سکتی تھی وہ مجبور تھی۔ بیٹھے بیٹھے دل مین آتا تھا کہ چلون اور غربت مین اپنے شوہر اور سسر کی خدمت کرون۔ مگر اسکے ساتھ ہی یہ خیال دل مین چٹکیان لیتا تھا کہ شاید رام چندر نے دوسری شادی کر لی ہو کیونکہ اُسکا باپ کسی دولتمند گھر مین اُسکی شادی کیا چاہتا تھا۔ آخر وہ یہ کہکر خاموش ہو رہی کہ ”جو ہو سو ہو بغیر بلائے تو ہرگز نہ جاؤنگی“۔

رام چندر کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو۔ لکھنا پڑھنا اُسنے ترک کر دیا اور اب کسی دفتر مین ملازمت کر لی ہے، اور کوشش کرکے بہت جلد اپنے باپ کا لین دین صاف کر دیا۔ اگرچہ اب بھی اُسکی حالت غریبی کی تھی، مگر وہ دل سے چاہتا کہ ملکہ کو گھر پر لے آئے۔ مگر اسکے ساتھ ہی یہ خیال بھی گزرتا تھا کہ ”شائد اب وہ مجھ غریب کے یہان رہنے مین ناخوش ہو، ممکن ہے کہ وہ میرے باپ کے چلانے اور مجھے دوسری شادی کے لئے مجبور کرنے سے ناراض ہو گئی ہو۔ اچھا کچھ دن اور صبر کرون“۔

ایک دن ملکہ کو ایک گمنام خط ملا اُسمین لکھا تھا۔

”تمھارے سسر نے بیجا طور پر دولت جمع کی تھی۔ اب وہ سب جاتی رہی ہے۔ وہ جھوٹ موٹ دولتمند بنا تھا۔ تمھارے شوہر کی حالت بہت شرمناک ہے۔ اب وہ تمھارے لائق نہین، تم ہرگز اُسکے پاس نہ جانا۔ اِن باتون کو بالکل سچ سمجھنا۔“

اُف! اِس خط کے پڑھنے سے ملکہ کے دل کی کیا حالت ہوئی ہو گی، اُسکو بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ بار بار اُسکے دل مین یہ خیال آتا تھا کہ مین چلون اور ایسی حالت مین جاکر اپنے شوہر کی خدمت کرون!“

—— + ——

اتفاق سے بھیم سین کے گھر ایک قابل جوتشی پہونچے۔ یہ بہت ضعیف اور لائق آدمی تھے۔ بھیم سین نے انکی خوب آؤ بھگت کی اور گھر بھر کے جنم پترے اُنکے سامنے لاکر رکھدئے۔ دیکھتے دیکھتے ملکہ کا جنم پترا ہاتھ مین آگیا۔ اسکو دیکھکر اُنھون نے بھیم سین سے کہا کہ اگر آپ اجازت دین تو مین ذرا الگ ہوکر آپ کی لڑکی کو دیکھون اور پھر اسکا سارا حال آپ سے بیان کرون۔ پنڈت جی مہاراج چونکہ ضعیف العمر تھے لہذا بھیم سین نے کہا ”بہت اچھا“۔

جوتشی:۔ (ملکہ سے) تم شادی مین خوش نہین رہی ہو۔ تم وہ ہیرا ہو، جو ایک خراب اور بھدی انگوٹھی مین جڑ دیا گیا ہے۔ اپنے شوہر کے پاس اب بھولکر نہ جانا۔ جوتش ودیا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدمعاش، خراب اور تباہ ہو گیا ہے۔“

ملکہ:۔ (آہستہ سے) اگر یہی کیفیت ہے تو مجھے ضرور جانا چاہئے۔

جوتشی:۔ ”تمھارے ہاتھ کی ریکھاؤن سے ایسا جان پڑتا ہے کہ اگر تم اپنے خاوند کے پاس جاؤگی، تو تمکو دُکھ ہی دُکھ ہوگا“۔

ملکہ:۔ ”مجھے اپنے آرام کی کوئی فکر نہین۔ مین صرف یہ چاہتی ہون کہ مصیبت مین اپنے سوامی کا ساتھ دون!“

جوتشی:۔ بالفرض اگر تم وہان گئین، اور اُسنے تم سے بات بھی نہ کی اور نہ تمھاری طرف آنکھ اُٹھاکر دیکھا تو، شائد وہ



[illegible] کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں

دوسری شادی کرنا چاہتا ہو۔ تب تم کیا کروگی؟"

ملکہ:۔ "ایسی حالت مین مجبوراً گھونٹ آنا پڑے گا"

جوتشی:۔ "وہ تمہاری بے عزتی کا موجب ہے"

ملکہ:۔ "بھلا وہ میری بے عزتی کا موجب کیون ہونے لگا وہ تو بہت شریف اور معزز شخص ہین!"

جوتشی:۔ "یاد رکھو اگر تم وہان جاؤگی تو بڑی مصیبت مین مبتلا ہوگی۔ اگرچہ تمہارا باپ غریب ہے پھر بھی وہ تمکو اچھی طرح رکھے گا"

ملکہ:۔ "مین کہہ چکی ہون کہ مجھے اپنے تکلیف و آرام کا کوئی خیال نہین ہے"

جوتشی:۔ "تو گویا تم اپنے بیکار اور نکمے شوہر کو چاہتی ہو؟ اگر وہ مرجاتا تو اچھا ہوتا! تمہارے ہاتھ کی ریکھاؤن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تم بدھوا ہوجاؤ تو تم خوش رہوگی۔ اُسنے تمہارے ساتھ کیسے خراب سلوک کئے ہین!"

ملکہ:۔ "شنو! شنو! ایسے ناز یبا کلمات مین سننا نہین چاہتی۔ بھگوان کشل کرین۔ نارائین! میرے سوامی کا بال تک بیکا نہ ہونے دیجیو"

جوتشی بہت حیران ہوا اور اُسکے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ تب اُسنے جیب سے کوئی چیز نکالی۔ ملکہ کو تعجب ہوا کہ اُسنے کیا نکالا ہے۔ دیکھا تو اُسکے شوہر کی انگوٹھی ہے۔ "کیا کوئی اُسکی طرف سے پیغام ہے؟" ملکہ کا دل اُچھلنے لگا۔ تب جوتشی نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور ہاتھ ہٹاتے ہی ملکہ نے بے اختیار خوشی کی ایک چیخ ماری۔ یہ رام چندر تھا جو جوتشی بنا ہوا تھا۔ ملکہ اُسے دیکھکر شرما گئی اور آنچل سے مُنہ کو ڈھانپ کر ایک طرف کو ہٹ گئی۔ رام چندر نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور کہا کہ "مین تمکو لینے آیا ہون!"

(از ہندی) شاکر (میرٹھی)

لکھنؤ کا قدیم تمدن

جس زمانے مین لکھنؤ اودھ کا دار السلطنت تھا عام خلقت کی سخاوت اور شاہی فیاضیون اور امراء و ساکی اولعزمیون نے اسکے تمدن مین عیش پرستی اور وضع داری اور پابندیِ عہد کا خمیر آمیز کردیا تھا اور چھوٹے سے بڑا تک اسی رنگ مین رنگا ہوا تھا۔

اسکی فیاضی اور زر بخشی کے شہرے سُنکر اطراف عالم کے ماہر فن اپنے وطن کو خیرباد کہکر اس غربت کی زندگی کو ہزار درجہ شرف دیتے تھے۔

بات کے دھنی لوگ جان جانے کی پروا نہ کرتے تھے اور عزت سے مرجانا بے عزتی کی زندگی سے بہتر سمجھتے تھے۔

مذہب کی پابندی سے لوگون کا پُن پاپ گناہ ثواب خیرات اور سخاوت۔ عبادت۔ روزہ۔ نماز۔ پوجا پاٹ کی طرف زیادہ خیال تھا۔

شاہی زمانے کے لوگون کے طرز معاشرت پر نظر ڈالنے سے لکھنؤ کے قدیم تمدن کے حالات واضح ہوجاتے ہین۔

ہر ملت و مذہب کے افراد کے حرکات و سکنات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان پُرانی ہڈیون کی ذات سے لکھنؤ کو شرف حاصل تھا۔

تمدن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اب ہم مختصر طور سے ہر پہلو پر تحقیق آغاز کرتے ہیں

سوسائٹی کی رو سے ان میں سب سے بڑا خیال شرافت کا تھا۔ شریفوں کے خاص خاص پیشے اور عہدے تھے شاہی دربار میں انھیں لوگوں کی عزت ہوتی تھی جو نجیب الطرفین اور شریف ہوتے۔

ہر پیشہ اور قوم میں ایک بزرگ کو مکھیا مانا جاتا تھا جسکی اطاعت تمام گروہ پر فرض ہوتی تھی۔

چھوٹے چھوٹے گروہ بھی اپنے اپنے چودھری کے ماتحت ہوتے تھے اور اسکے فرمان کو سرکاری احکام کے برابر سمجھتے تھے۔

فوج اپنے کپتان کو اپنا حاکم اور سردار سمجھتی تھی

ہر گھر میں اسی حیثیت لوگ ایک بزرگ کو اپنا پیشوا اور مربی سمجھتے تھے اور اُسکی اطاعت کو سب سے زیادہ مقدم سمجھتے تھے

شریفوں کے لئے خاص عہدے - وزارت، رفاقت، مصاحبت اور خاص پیشے شاعری، معلمی، اتالیقی، طبابت وغیرہ وغیرہ مخصوص تھے۔

یہ لازم ہوتا تھا کہ شرافت کے زمرے میں آنے والا بچہ اپنے باپ کی طرح شرفا کی سوسائٹی کے اصول کا پابند ہو۔

باپ چاہتا تھا کہ میرا فرزند میری طرح بھولا ہو تو اسکو اپنی اولاد کو عام لوگوں کی صحبت سے بچانا پڑتا تھا اور اُسکو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت بیس برس کے سن تک نہیں دیجاتی تھی۔ اُسکو بسم اللہ اور طوق پڑھانے کی منت کھیر چٹائی وغیرہ کی تقریبوں سے دالعزامی کا سبق پڑھایا جاتا تھا۔

ادب سکھانے کے لئے بچپن میں کھلائی، اتالیق، ادیب اور معلم رکھے جاتے تھے صحبت کے لوگ رفاقت میں اسی مرتبے اور حالات کے ہوتے جو بادشاہی دربار کے اوضاع اور طریق سے واقف ہوتے تھے۔ اس جانفشانی کے بعد ایک بچہ اس لائق ہوتا تھا کہ وہ سوسائٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے باپ کے عہدے پر کام کر سکے۔

حق خدمت اور حق نمک کو لوگ فراموش نہ کرتے تھے اور نمک خوار سے احسان کا بہت معاوضہ کرتے تھے۔

معین الدولہ نواب سعادت علی خان بہادر کے مختلف مشاغل پر نظر ڈالنے سے اودھ کے تمدن زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔

قبل طلوع آفتاب خاصہ سے برآمد ہوئے۔ شب کی پوشاک خانساماں نے اتار کر صبح کی پوشاک زیب جسم کی۔ ولایتی زیب کمر کی گئی اور سیاہ مخمل کی مغلی ٹوپی پہنائی گئی۔

شہزادوں نے باادب سلام کیا۔ پھر امرائے خاص کے سلام کی باری آئی۔ پھر حضور گھوڑے پر سوار ہو کر دلکشا تک ہواخوری کو تشریف لے گئے۔ اور دو گھڑی کے بعد واپس آئے۔

مرصع ہاتھی مع عماری زرنگار در دولت پر کھڑے تھے آپ سوار ہوئے۔ جلوس سواری اور ڈنکا آگے آگے چلا شہزادے اور امرائے خاص اپنے اپنے ہاتھیوں پر سوار ہوئے اور خاص بردار یا دو چوبدار سواری ہے بادشاہ عالم کی نگاہ روبرو ادب قاعدے سے پکارتے ہوئے داہنے بائیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہمرکاب تھے۔

مرزا کریم بیگ، محمد غلامی انگریزی سواروں کی پوشاکیں پہنے ہوئے آگے آگے جوڑیوں پر سوار اور شکاری کتے اور باز وغیرہ کچھ فاصلے سے پیشرو۔

بیس سوار اور بیس پیرا سی جلوس کے انتظام میں ہٹو بچو کرتے ہوئے ساتھ ساتھ۔ انکے افسر انتظام الدولہ مظفر علی خان اور شرف الدولہ رمضان علی خان گھوڑوں پر سوار۔ پہلو میں رفقا اور مصاحبین خاص۔ اس تفریح کا نام تھا "دربار سواری"

واپسی پر دربدولت سے سب اُمرا رخصت ہوگئے۔

نو بجے چائے[عہ] پانی ہوتا تھا۔ کرسی نشین اُمرا و مقربان خاص صمصام الدولہ مرزا جگو اور مرزا محمد تقی خان ہوس شاعر۔ پہلو مین یار و بر و صاحبان مقربان خاص مگلوڈ صاحب انجنیر و ڈاکٹر صاحب۔ پس کرسی میر انشاء اللہ خان انشا اور میر ابوالقاسم سپہ سالار فوج۔

مجرئی معززین، خواجہ سرا وغیرہ کو دفعہ دفعہ سے عرض بیگی بلاتا تھا اور ادب قاعدے سے سلام کراتا تھا۔ یا ہر برآمدے مین بیٹھتا تھا۔ دس بجے دربار برخاست ہوتا تھا۔

تیسرا دربار ایک بجے حضور کے خاصہ نوش فرمانے کے وقت ہوتا تھا جسمین مقربان خاص اور خاص اردلی نواب جلال الدولہ مہدی علی خان رکن الدولہ نواب محمد محسن خان نہایت صغیر السن شہزادے شریک ہوتے تھے

دوپہر کو ملاحظہ کاغذات کا دربار ہوتا تھا۔ نواب نصیر الدولہ کاغذات پیش کرتے تھے۔ نواب منتظم الدولہ مہدی علیخان۔ راجہ دیاکرشن۔ رائے رتن چند صاحب اخبار۔ صاحب رام اخبار نویس خفیہ منشی رونق علی خان۔ منشی دانش علی خان اور معزز منشی کاغذات کچہری مع مسل مقدمہ وغیرہ پیش کرتے تھے۔ بعد ملاحظہ حکم احکام صادر ہوتے تھے۔ جس کاغذ پر مہر خاص کی ضرورت ہوتی ظفر الدولہ کپتان فتح علیخان صندوقچے سے مہر نکالکر حضور کے سامنے مہر کرکے صندوقچے لے جاتے تھے۔ اسی ملاحظے مین اکثر رات کے دس بج جاتے تھے۔ فرصت ملی تو شام کے وقت بسواری گاڑی و داسیہ ہمراہی راجہ بختاور سنگھ اردلی خاص۔ مع جلوس سواری و رسالہ کسی گنج مین جاکر نرخ غلہ دریافت کرتے تھے۔

یہ ایک بادشاہ کے اوقات معینہ تھے جس سے اودھ کے طرز معاشرت معلوم ہوتے ہین۔ حق نمک کا خیال یہان ہر شخص کو رہتا تھا۔ عہد آصف الدولہ مین امیر الدولہ حیدر بیگ خان کابلی وزیر مقرر ہوئے۔ مہاراجہ ٹکیت رائے دیوان۔ سرفراز الدولہ نائب تھے۔

ایک روز مہاراجہ ٹکیت رائے نے پچھتر لاکھ روپیہ قرضہ سرکاری کا بیباق وزیر کے سامنے پیش کیا۔

امیر الدولہ وزیر مہاراجہ جھاؤلال نمک خوار قدیم سے کہا تم اسکی جانچ کرو۔ اُنھون نے کچھ بلاحظہ راجہ ٹکیت رائے تامل کیا۔

اسپر خفا ہوکر کہا تمھین ہمارے نمک کا پاس نہین ہے اور سلطنت کے حق نمک کو بھول گئے۔

حق نمک کا نام سنتے ہی مہاراجہ جھاؤلال نے سر جھکا کر فرد حساب لیکر اپنے زیر دست منشی بالکرام اور راجہ بچھراج کو دی۔ جنھون نے اونسٹھ لاکھ کا غبن نکالکر ثابت کردیا کہ حق نمک کا ادا کرنا واجبات سے ہے۔

شرافت کے پیشون مین خوشنویسی بھی شامل تھی۔ شاہی دربارون مین انکی قدر کیجاتی تھی اور ایک ایک قطعہ کے کئی کئی ہزار روپے صلے مین دئے جاتے تھے۔ خوشنویسون مین حافظ ابراہیم اور حافظ مرزا احسن رضا عطارد رقم۔ حافظ نور اللہ۔ مرزا علی رضا جواہر رقم۔ مشہور زمانہ تھے۔ حافظ نور اللہ کا لکھا ہوا ایک حرف ایک اشرفی کو بکتا تھا۔ جس رئیس کو دیدیجئے ایک اشرفی حرف کے حساب سے پورا قطعہ لے لیتا تھا۔ مشہور ہے کہ آپ اہل حاجت کو کوئی تقطیع یا قطعہ لکھکر دیدیا کرتے تھے وہ شہر مین فروخت کرلیتا تھا۔

نسخ نویسون مین میر بندہ علی یک چشم کا طوطی بولتا تھا۔

عہ چار یاری ایک اصطلاح ہے جو رزیڈنٹ کی تقریب ملاقات کیلئے وضع ہوئی تھی۔ یہ ملاقات روزمرہ ہوتی تھی۔ ایڈیٹر۔

طبابت کے پیشے کو بہت عزت تھی اکثر شرفا اسی پیشے کو اختیار کرتے تھے حکمائے حاذق مین حکیم مرزا صادق بہت کامل و ذکی تھے نسخہ تیر بہدف ہوتا تھا۔ میر بندہ علی مین اور ... حکیم کا خاصہ تھا کہ مریض کو جس چیز پر رغبت ہوتی تھی کھانے کی اجازت دیدیتے تھے اور طاقت کا لحاظ رکھتے تھے۔

حکیم الملوک اخلاق اور ... مین ضرب المثل تھے حکیم مرزا محمد علی صاحب ... مریض سے منہ پر صاف صاف کہدیتے تھے کہ تمہارا علاج نہین ہو سکتا لیکن اُسکے ساتھ تشخیص بہت عمدہ تھی۔ مہلک مرض انکے ہاتھ سے دفع ہوگئے۔

حکیم سید محمد درگاہ والے عجب لطیف مزاج آدمی تھے ایک غریب سید کی پرورش فرماتے تھے۔ چار آنے روز اپنی جیب خاص سے دیتے اور جب کوئی مریض بلاتا تو اپنی فیس کے ساتھ سید صاحب کا حق بھی آٹھ آنے روز کا ٹھہرا لیتے اور کہتے تھے کہ دوا اور دعا دونون کی ضرورت ہے۔ یہ سید دعا کرینگے۔ سید صاحب روزانہ چار آنے ٹھونک بجا کر لے لیتے۔ جس روز حکیم صاحب کا کچھ سُننے کو جی چاہتا منہ بنا کر کہتے میر صاحب اسوقت تو جیب خالی ہے سید صاحب ہزارون صلواتین سُناتے۔ دوست احباب کہتے حکیم صاحب آپ ایسے شخص سے سلوک کرتے ہین۔ جو آپ سے گستاخی کرتا ہے۔ فرماتے تھے کیا ہوا دوستی مین ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

شاعری اس زمانے مین شریف پیشون مین گنی جاتی تھی کوئی رئیس ایسا نہ تھا جسکی رفاقت مین ایک آدہ شاعر نہ ہو بعض شعرا کی گھر بیٹھے تنخواہین مقرر تھین۔ شاعر عموماً نازک مزاج اور نازک دماغ ہوتے تھے۔ اُمرا اور رؤسا انکی ناز برداری کرتے تھے۔ مقبول الدولہ قبول نے مرزا اصغر علی خان نسیم کو قیصر باغ مین ملاقات کے لئے بلا بھیجا آپ اپنے شاگرد اشرف اور تسلیم کو ہمراہ لیتے گئے۔ قبول کا شمار اسوقت امرا مین تھا۔ چاہا کچھ نسیم سے سلوک کرین مگر تنک مزاجی کے خوف سے روبرو کچھ نہ کہہ سکے۔ چلتے وقت تسلیم کو علیحدہ بلا کر پانچسو روپے دئے کہ اپنے اُستاد کی نذر کر دینا۔ نسیم نے کہا یہ نہین ہو سکتا وہ بھی شاعر مین بھی شاعر دونون ہم پیشہ ہین اپنے برابر والے کا احسان نہ لونگا۔

بانکے اپنی وضع اور بات کے پابند ہوتے تھے۔ بات پر جان دیتے تھے۔ جاڑون مین ململ کے کرتے پہن کر اکڑتے تھے۔

مرزا قربان بیگ نے اسی نوّے برس کے سن تک ململ کے کرتے اور ایک دوپٹے کے سوا جاڑون مین ایک چادر تک کندھے پر نہ ڈالی۔ نواب سعادت علی خان کی سواری کے ساتھ اندھیرے منہ اسی وضع سے جایا کئے اور ہمیشہ بغلون کا پسینہ دکھاتے رہے۔

ایسی وزنی سپر جو تین آدمیون سے نہ اُٹھ سکے بغیر علی بند کے ہمیشہ پھول کیطرح اُٹھاتے تھے۔

قوم پروری کا خیال حد سے زیادہ تھا۔ راجہ امرت لال کالیستھ سکسینہ کے مکان مین ایک کیتھے کا درخت تھا ہر شادی بیاہ مین اسے زربفت سے منڈھوا دیتے تھے اور کہتے تھے یہ بھی کالیستھ ہے مجھسے قوم کی برہنگی نہین دیکھی جاتی۔

ادب کا عالمگیر لحاظ تھا۔ نواب مصطفےٰ علی خان (آخری شاہ اودھ کے بھائی) کے صاحبزادے کے لئے کان میلیا بلایا گیا۔ کان میلئے نے جیسا دستور ہوتا ہے شہزادے کا۔ کان پکڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ نواب صاحب نے ملاحظہ فرمایا فوراً غصہ آگیا۔ کان میلئے کو کان پکڑ کر نکلوا دیا اور کہا ایسے بے ادب کا ہمارے یہان کچھ کام نہین۔ اسی خاص کان میلئے کو بلا لاؤ جو ہمارا کان دیکھتا ہے۔

غازی الدین حیدر کے زمانہ ولیعہدی مین لکھنؤ مین ایک

مرد آدمی نہایت خاندانی شریف آل رسول سید فاطمی وارد ہوئے جو معاش کیطرف سے بہت بے اطمینان تھے۔ لکھنؤ کی شرفا نوازی مشہور عام تھی لیکن ان غریب کا کیا وسیلہ تھا جو اپنی نسبتی شرافت سے فائدہ اُٹھاتے۔ بہت تکلیف اور عسرت کی حالت مین آپ نے مجبور ہوکر استخارہ دیکھا کہ نواب غازی الدین حیدر کے خواصون کے جمعدار سے ملون حسن اتفاق سے استخارہ آگیا۔ دوبارہ استخارہ دیکھا اور واجب بھی آیا۔

آپ نواب صاحب کی ڈیوڑھی پر گئے اور اُس جمعدار کو بہت ادب سے جُھک کر سلام کیا اُسنے شریف آدمی سمجھکر بہت خاطر کی۔ آپ نے یہ اپنا معمول کر لیا کہ روز جمعدار کو سلام کرنے جاتے تھے۔

ایک روز اُس نے مجحوب ہوکر کہا کہ مین ایک ادنیٰ آدمی ہون آپ کیون مجھے کانٹون مین گھسیٹتے ہین جو خدمت میرے لائق ہو اُسے بسروچشم بجالاؤن آپ میرا اختیار بھی جانتے ہین۔ ایک خواص کا اسم خالی ہے۔ آپ کی شان کے خلاف سمجھکر عرض نہین کرسکتا۔ میر صاحب نے کہا کہ کیا مضائقہ ہے بیکاری سے ملازمت اچھی ہے جمعدار کی رعایت سے خالی نام لکھوا دیا گیا اور کسی خدمت کا تعلق اُنسے نہ تھا حضور کا اُلُش تمام خواصون کو تقسیم ہوتا تھا۔ انکو بھی ملا تو آپ نے انکار کردیا۔ خواصون نے خیال کیا کہ شاید نواب کا جھوٹا کھانا سمجھکر انکار کردیا۔ دوسرے روز مسلّم پلیٹ دی جب بھی نہ لی یہ بات غازی الدین حیدر تک پہونچی۔ ایک روز ایسے وقت پر کہ جسوقت بکاول خاصہ لیکر حاضر ہوا اور خواص نے زیر بند بچھا کر لگن کا چمچی تسلا اور لوٹا لاکر ہاتھ دُھلائے۔ بکاول نے خوانپوش کھولکر خاصہ چُنا اور ایک ایک چمچہ ہر قسم کے کھانے سے نواب کے سامنے لگانا چاہا۔ میر صاحب سامنے کھڑے تھے۔ نواب نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔ بولے ناچیز کو سید محمد عرف آغا میر کہتے ہین۔ نواب سید کا نام سُنکر کانپ اُٹھے اور اپنے پہلو مین نہایت تعظیم سے بٹھایا اور ہاتھ دُھلوا کر کھانے مین شریک کیا۔ بہت معذرت کے بعد رُفقا مین انکا نام لکھوا لیا آخر اسی شرافت خاندانی سے وزارت کے مرتبے تک اُنکو پہونچا دیا اور معتمد الدولہ بہادر کے خطاب سے مشہور ہوے۔

آخری شاہ اودھ کا اخلاق بہت مشہور تھا خواجہ بشیر الدولہ نواب ناظر جنکا امام باڑہ جلوخانۂ شاہی کے قریب سر راہ واقع تھا شیشہ آلات جھاڑ کنول عمدہ عمدہ زردوزی پٹکے بھاری بھاری چاندی اور سونے کے علم استادہ ہوتے تھے۔ ذاکرین امام باڑہ عشرۂ محرم مین مرزا عباس روضہ خوان اور میر انیس تھے۔

بشیر الدولہ نے بادشاہ سے عرض کیا فدوی کی تمنا ہے کہ حضور کی تصنیف سے کوئی نیا مرثیہ میرے امام باڑہ مین پڑھا جائے تو عین ذرّہ نوازی ہوگی۔

فرمایا اچھا کیا مضائقہ ہے۔ ساتوین تاریخ محرم کو تمہارے یہان مجلس مین نیا مرثیہ پڑھینگے۔ روز موعودہ مجلس آراستہ تھی کہ حضور مع ارکین جنکی پوشاکین ماتمی تھین بوچہ پر سوار تشریف لائے۔ تمام اہل مجلس نے تعظیم کی۔ بادشاہ اپنی جگہہ پر بیٹھے۔ پہلے میر انیس نے چند بند پڑھے۔ اسکے بعد میر عباس روضہ خوان نے فارسی مین مصائب امام پڑھے۔ پھر بادشاہ ممبر پر تشریف لائے۔ آفتاب الدولہ قلق اور فتح الدولہ برق زیر ممبر کھڑے ہوتے۔ بادشاہ نے مرثیہ پڑھا بہت رقّت ہوئی۔

کسی موقع سے رفقا نے عرض کیا حضور بشیر الدولہ کے یہان تشریف لیجانا آپکے خلاف شان تھا۔ فرمایا کیا ہو مجھکو خیال تھا اسکا دل تھوڑا ہوتا۔

محمد عبد الرؤف عشرت

زمانہ اور ادیب

اس عنوان سے منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی نے حال ہی مین ایک دلچسپ مولزنہ لکھا ہے۔ اُردو رسالون کی تاریخ مین یہ پہلا موقع ہے کہ اس قسم کا موازنہ شائع ہوا ہے جسمین پرچون سے علاوہ ایڈیٹرون کی قابلیت کا بھی مقابلہ کیا گیا ہے۔ تعجب نہین کہ آیندہ اُردو اخبارات اور اُنکے ایڈیٹرون کا بھی مقابلہ کیا جائے اور اسطرح اُردو اُس معراج ترقی پر پہونچ جائے جسپر ابھی تک کوئی زبان نہین پہونچی۔

ہندوستان مین فن تنقید براہ راست انگلستان سے آیا ہے اور انگلستان کے نامور نقادان فن لارڈ مکالے اور کارلائل کو بھی یہ جدت نہین سوجھی۔ ہم اس قسم کے موازنہ کے خلاف نہین ہین بشرطیکہ اُسمین واقفیت اور نیک نیتی کو دخل ہو اور راے دہندہ اپنے ذاتی نقطہ خیال سے علیحدہ ہوکر سچی تنقید کرسکے۔ سچی تنقید کی تعریف یہ ہے کہ دو بالمقابل چیزون کے عیب و صواب بلاکم و کاست دکھا دئے جائین۔ لیکن ہندوستان مین ابھی اسکا رواج عام نہین ہے اور عموماً ایسے موقعون پر پہلے ہی سے ایک چیز کی نسبت عمدہ اور دوسری کے متعلق بُری راے قائم کرلیجاتی ہے۔ بلکہ یہ ضرورت ہی اسلئے پیش آتی ہے کہ ایک کی مدح اور دوسری کی ہجو کیجائے۔

اس اعتبار سے شوق صاحب کا موازنہ زیادہ دلچسپ ہے۔ آپ نے جنوری حال کے زمانہ اور ادیب کو اپنے موازنہ کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ موقت الشیوع رسالون کے موازنہ کے لئے ضرورت ہے کہ اُنکی سالانہ جلدون کا مقابلہ کیا جائے نہ کسی خاص مہینے کے پرچون کا خصوصاً ادیب کا موازنہ اسی اعتبار سے ہوسکتا ہے جسمین کسی خاص مہینے کیلئے کوئی خاص دھوم دھام نہین کیجاتی جنوری کا زمانہ خاص دھوم دھام سے شائع ہوا ہے اور ادیب اپنی معمولی رفتار سے۔ کاش اُسکی یہ دھوم دھام یکسان قائم رہتی۔ لیکن ابھی تک واقعات اسکے خلاف ہین۔

بہرنوع نیک نیتی کو جہانتک دخل ہے وہ ایسے موازنہ سے واضح ہے۔ تاہم مجھے موازنہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ شوق صاحب نے اپنے موازنہ کو دونون پرچون کی رنگین تصویرون سے شروع کیا ہے۔ ادیب کی رنگین تصویر (ولادت سکندر) کے متعلق آپ رقمطراز ہین۔

”مین اس قسم کی فرضی تصویرون کو کچھ قدر کی نگاہون سے نہین دیکھتا۔ انکے خیالی ہونیکا خیال ہی آنکو بے اثر بنا دینے کو کافی ہے۔ کپڑون کے تھانون پر ہزارہا رنگین تصویرین بہت اچھی اچھی نظر آتی ہین جنھین دیکھکر لڑکے ضرور خوش ہوتے ہین۔ سمجھنے والے (حضرت شوق) تو صرف اُن تصویرون (زمانہ کی رنگین تصویر لیلی المجنون) کو دلچسپی کے ساتھ دیکھتے اور پسند کرتے ہین جنکے نظارے سے واقفیت کے ساتھ تاریخی۔ علمی۔ معاشرتی یا اور ایسی ہی کوئی بات پیدا ہوتی ہو“

کوئی شک نہین کہ شاعرانہ خیالات کے لوگ لیلی مجنون کی حد سے آگے نہین بڑھ سکتے اور وہ مصور کے اُس اچھوتے

خیال کی قدر کرنے سے معذور ہین جو ولادت سکندر کے مرقع سے ظاہر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ولادتِ سکندر کیطرح لیلیٰ مجنون کی تصویر خیالی نہین ہے اور اُنکے اصلی فوٹو لئے گئے تھے؟

اگر ایسا نہین ہے تو یہہ موازنہ کیا وقعت رکھتا ہے۔

لیلیٰ مجنون کی تصویرین اسقدر عام ہین کہ اُنپر کپڑے کے تھانون کی تصویرون کا صحیح اطلاق ہو سکتا ہے۔ خصوصاً زمانہ مین جو تصویر شائع ہوئی ہے۔ وہ فن مصوّری کا نہایت ادنیٰ نمونہ ہے جسمین مصوّر نے جنگل کے تمام درندون کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا ہے اور وہ بھی اس انداز سے گویا تمام وحشی جانور ایک دوسرے سے ہلے ملے ہوئے ہین۔ لطف یہ کہ ان درندون کے ساتھ ایک گھڑیال بھی دکھایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ صحراے نجد مین جہان مجنون رہتا تھا کوئی دریا نہین ہے۔

رنگین تصویرون سے گزر کر آپ نے سادی تصویرون سے بحث کی ہے جو اس نقطۂ خیال سے بال بھر اِدھر اُدھر نہین ہے۔ حتیٰ کہ طرفداری کے جوش مین آپ نے غلط بیانی مین بھی تامل نہین فرمایا ہے اور واقعات پر خاک ڈالنے کی انتہا کر دی ہے۔ زمانہ کے جنوری نمبر مین نمائش گاہ الہ آباد کی آٹھ تصویرین دو ورق پر چھاپی گئی ہین جنکی نسبت جناب شوق نے ذیل کا شاندار دعویٰ پیش کیا ہے:۔

"تعجب تو یہ ہے کہ "زمانے" نے کانپور سے الہ آباد کے نمائش گاہ کے نقشے دکھا دیئے اور ادیب الہ آباد ہی مین ہے مگر کچھ نہ دکھا سکا۔ اس سے دونون رسالون کے اڈیٹرون کی قابلیت اور اُنکے دماغون کی علمی مناسبت کا اندازہ کر لیا جاے۔ آئندہ اگر ادیب نمائش گاہ کے نقشے چھاپے بھی تو کیا۔ زمانہ بالا جیت چکا۔"

ایسی بے لاگ اور واقفیت سے بھری تنقید کی داد ہمارے امکان سے باہر ہے۔ شاید ناظرین ادیب کچھ داد دے سکین جنھون نے زمانہ سے ایک ماہ پیشتر ہی دسمبر کے ادیب مین عمارات نمائش کے ۱۶ دلکش فوٹو، مکمل نقشۂ نمائش مع تشریح۔ نمائش کی ابتدا، نمائشات عالم کی مبسوط تاریخ۔ نمائش علاقہ جات کے مفصل حالات۔ نمائش کا پروگرام اور کانگرس وغیرہ کی کیفیت سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ لطف یہ کہ زمانہ کی جن تصویرون کے متعلق ایسا شاندار دعویٰ کیا گیا ہے وہ ادیب ہی کی نقل ہین جنکے قد و قامت مین بھی بال بھر کا فرق نہین۔ ہم حضرت شوق کو یقین دلاتے ہین کہ ادیب اس میدان مین کبھی زمانہ سے پیچھے رہنے والا نہین۔ وہ اپنی تاریخ اشاعت سے آجتک زمانہ سے کہتا رہا ہے کہ "آؤ آؤ! ہمارے پیچھے پیچھے چلے آؤ" اُسنے نمائش گاہ لاہور کے موقع پر بھی اپنے پہلے ہی نمبر مین نمائش مذکور کے مکمل حالات مع تصویر شائع کر دیئے تھے جنھین دیکھکر زمانہ کو بھی اپنا "خاص رپورٹر" لاہور بھیجنا پڑا تھا۔ لیکن اُسوقت تک نمائش برخاست ہو چکی تھی۔ تاہم آیندہ ماہ کے زمانہ مین ادیب کا مُنہ چڑانے مین تامل نہین کیا گیا۔

اسیطرح زمانہ کی جن دوسری تصویرون کے متعلق لمبے چوڑے دعوے کئے گئے ہین وہ سب کی سب "انڈین ورلڈ" "چترمے جگت" "ماڈرن ریویو" اور "پرباسی" وغیرہ رسالون مین نکل چکی ہین جنکے انتخاب اور فراہمی مین ان پرچون کے قابل ایڈیٹرون کے دماغ صرف ہوئے ہین نہ کہ ایڈیٹر زمانہ کی قابلیت۔

زمانہ مین ابھی تک کوئی ایسی تصویر نہین نکلی ہے جو خاص

زمانہ کے لئے تیار کرائی گئی ہو و انگلے سنے تھے جس ہو۔ بلکہ انہیں آرٹ پیپر پر شمالہ پریس پر چھپوا ۔ آرٹ پریس کلکتہ سے حاصل کر سکتا ہے۔ اگر موازنہ نگار کی ذاتی وسعت میں ہے تو موازنہ نگاری کا شوق فضول ہے۔

تصاویر کی بحث میں شوق صاحب نے ایک اور مقام پر اور داد خوش بیانی دی ہے۔ ادیب میں "سیر دریا" کے عنوان سے ایک نظم اور ایک تصویر جنوری کے پرچے میں شائع ہوئی تھی اور زمانہ میں بھی "لب آب ایک کشتی" کے عنوان سے ایک نظم اور تصویر "لب آب" کی مہمل ترکیب سے قطع نظر کرکے اس تصویر کو تصویر کہنا اس فن کی حقارت کرنا ہے۔ ایسے چربے جو دیسی چھاپے خانوں کے مصور کھینچا کرتے ہیں اگر فن مصوری کی کوئی شاخ قرار دئے جائیں تو دنیا میں اس مصوری کی ضرورت ہی نہیں باقی رہتی جسمیں دل و دماغ اور زر و قلم صرف ہوتا ہے۔ شوق صاحب نے اپنے مذاق کی مناسبت سے اس تصویر کی تعریف میں قلم توڑ دیا ہے اور ادیب کی بافن تو تصویر کی جو اس منظر کا ایک بے نظیر نمونہ پیش کرتی ہے ہجو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک عورت ایک لڑکی کو گود میں لئے ہوئے بیٹھی ہے۔ دقت نظری اسیکا نام ہے۔ کاش آپ فن تصویر سے واقف ہوتے اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ اگلے یونانیوں کی کیا وضع اور معاشرت تھی تو اسقدر غلط فہمی نہ واقع ہوتی۔ سیر دریا والی نظم جو منشی نادر علی خانصاحب نادر کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور جس سے ایک بے نظیر اخلاقی سبق ملتا ہے۔ آپ کے خیال میں نہ صرف عاشقانہ بلکہ شرمناک ہے۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

تصاویر کے بعد مضامین کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے لیکن مقصود اصلی صرف ادیب و ایڈیٹر ادیب کی ہجو اور حقارت ہے اور اسیطرح تصاویر کے متعلق غلط بیانی تک سے احتراز نہیں کیا گیا اسیطرح مضامین کے متعلق بھی سمجھ لینا چاہئے۔ ادیب کے تمام مضامین میں صرف "مسئلہ سالمات" قابل ذکر سمجھا گیا ہے نہ کہ قابل تعریف اور اسکی نسبت جو کچھ گل فشانی کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہے:-

"سالمات یعنی اجزائے لاتیجزے کا سبجکٹ ضرور اچھا ہے لیکن ابھی تک جتنا مضمون چھپا ہے اسمیں صرف حکمائے قدیم و جدید کے اقوال ہیں۔ "باقی آئندہ" میں جرح اور تعدیل سے کچھ نتیجہ نکالا جائے تو مضمون کی خوبی اور نقص پر کچھ رائے قائم ہوسکے۔ لائق مضمون نگار جو کچھ نتیجہ نکالیں اُس سے ادیب کے ایڈیٹر کو خود ایسا نتیجہ نکالنا بہت مشکل مسئلہ ہے۔"

گویا مضمون مذکور میں ہر دور کے حکما کی تحقیقات جرح و تعدیل سے خالی ہے اور کوئی نتیجہ ایسا ہے جو ساتھ ساتھ نکلتا نہیں جاتا اور شاید موازنہ نگار اس کمی کو پورا کرسکیں گے۔ شوق صاحب نے زمانہ کے علمی ضمیمہ کی مدح سرائی میں نسبتہً زیادہ زور قلم صرف کیا ہے۔ یہ علمی ضمیمہ کیا ہے؟ اسمیں علم و ہنر کی کونسی منزلیں طے کی گئی ہیں اور علم ادب میں کتنا اضافہ ہوسکتا ہے۔ صرف اس سے ظاہر ہے کہ بعض نامور علما (جنمیں شوق صاحب بھی شریک کرلئے گئے ہیں اور جسکی شکرگزاری میں آپ نے زمانہ و ادیب کا موازنہ تحریر فرمایا ہے) سے ایڈیٹر زمانہ نے دریافت کیا تھا کہ آپ اردو فارسی کی کون کون کتابوں کو بہترین خیال فرماتے ہیں۔ آپ کس کتاب کو پڑھکر تصنیف و تالیف کیطرف متوجہ ہوئے ہیں۔ آپ کی سب سے پہلی تصنیف کا کیا نام ہے اور آپ اپنی تصانیف میں

"سب سے بہترین" [۱] کس کو سمجھتے ہین وغیرہ یہ سوالات زبان حال سے پکار رہے ہین کہ پوچھنے والا خود کسی نتیجے پر نہین پہونچ سکتا۔ یہ بعینہ ایسی بات ہے کہ کسی کمہار کی دوکان پر جاکر یہ سوال کیا جاے کہ تمہارے بنائے ہوے کھلونوں مین سب سے اچھا کون ہے۔ اسکا نام علمی ضمیمہ رکھنا در اصل علم کی توہین کرنا ہے۔ ایسی خط و کتابت اُسوقت مفید ہوسکتی ہے جب مصنفین اُردو غالب کی طرح اپنے تجربات اپنے خطوط مین زیادہ وضاحت و صراحت کے ساتھ قلمبند کرین۔ لیکن اُنھین اپنے مشاغل علمی سے اتنی فرصت کہان۔ چنانچہ فخر الہند علامہ شبلی نے صرف دو چار سطرین لکھکر ٹال دیا ہے۔ البتہ حضرت شوق نے ان سوالات کے جواب مین اپنے سوانح عمری تک لکھدئے ہین۔

جناب شوق بجاے خود کیسے ہی اُستاد یگانہ ہون لیکن ابھی تک اُنکی کوئی مہتم بالشان تصنیف اہل ملک کی نظر سے نہین گزری۔ ساری عمر مین ایک مثنوی "ترانہ شوق" نظم فرمائی ہے جسمین گلزار نسیم کے مُنہ چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے نہ اُسکے قصّے مین کوئی جدّت ہے نہ طرز بیان مین۔ نہ حکیمانہ و فلسفیانہ مسائل کی کوئی جھلک اُسمین موجود ہے۔ تاہم شمس العلما مولانا شبلی نعمانی۔ مولانا شرر لکھنوی اور مرزا محمد ہادی صاحب بی۔اے۔ ایسے مشہور علما اور کثیر التصانیف مصنفین کے زمرے مین آپکا شمار محض ایڈیٹر صاحب زمانہ کی عنایت یا تجارتی ضرورت پر مبنی ہے اور اس عنایت کی شکرگزاری مین اگر آپ نے ادیب پر ہاتھ صاف کیا تو کوئی تعجب کی بات نہین۔

موازنہ مین الفاظ تو بڑے بڑے نظر آتے ہین جو ہر شخص ادنیٰ کوشش مین بھی لکھ سکتا ہے لیکن وقت نظری کی جو حقیقت ہے وہ مندرجہ بالا اقتباسات سے واضح ہو چکی ہے۔ طرفداری کے جوش مین آپ نے فقرے فقرے فقرے کے بعد لکھدیا ہے کہ ادیب زمانہ سے پوری شکست کھا رہا ہے۔ زمانہ کے سامنے ادیب کی وہی حقیقت ہے جو ایک شگفتہ پھول کے سامنے خشک پتّی کی۔ ایڈیٹر زمانہ کی علمی لیاقت کا ایڈیٹر ادیب مقابلہ نہین کرسکتا۔ یہ الفاظ خود ہی اپنی تردید کررہے ہین ایسے موازنہ کی تردید مین مجھے قلم اُٹھانے کی ضرورت نہ تھی جسکا ہر لفظ ذاتی رنجش اور دلی عناد کا آئینہ ہے اور جسکا دُھرا دُنیا ہی اُسکی کافی ترقی تردید ہے لیکن اس خیال سے کہ ناواقف اور سادہ مزاج لوگ غلط فہمی مین مبتلا نہ ہون اس سمع خراشی کی ضرورت محسوس ہوئی۔

مہیش پرشاد بی۔اے

زمانہ اور ادیب۔ ہمارے محترم دوست منشی شیخ احمد علی صاحب قدوائی نے ادیب و زمانہ کا موازنہ فرمایا ہے۔ مگر یہ موازنہ انیس و دبیر سے کم مرتبے کا نہین ہے افسوس ہے کہ ملک کے نامور انشا پرداز نے ادیب کی خوبیون کو خاک مین ملانے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ آج کل کا زمانہ ادیب کے ادب کا ممنون ہورہا ہے۔ (اخبار مشرق گورکھپور)

[۱] "بہترین" خود ہی صیغۂ افعل التفضیل ہے اسکے ساتھ "سب سے" کا اضافہ بالکل مہمل ہے ۱۲۔

بیگمات دہلی کی سیر دریا

اللہ اللہ یہ شب مہتاب یہ دلکش بہار
نور کی سنہری فلک سے زمین پر چھائیاں

بقعۂ تنویر ہے گویا فضائے آسمان
موج ہا کیا صاف ستھری ہے قبائے آسمان

ہو رہا ہے عرش سے تا فرش عالم نور کا
چاند جلوہ ہے گویا شاہد مستور کا

دید نی ہے واہ کیا حسن کا منظر دلفریب
یہ شب ماہ اور یہ پانی کی بہار دلفریب

اس مکمل شب میں دریا کی روانی دیکھیے
صاف موتی کی طرح ہے واہ پانی دیکھیے

چاندنی میں نیلگوں امواج ہیں یوں خوشنما
یا کسی کے لب ہیں جن پر تبسم جانفزا

کیا ہوا سے ہو کیا کیفیت نشاط انگیز ہے
ایک اک جھونکا شمیم گل سے عنبر بیز ہے

ہیں لطافت خیز یہ شفاف لہریں کس طرح
دودھ کی زرد و سبز میں جاری ہوں نہریں جس طرح

سبزہ و گل سے لب ساحل ہے تصویر نشاط
جدول امواج پر ہے ثبت تحریر نشاط

ہے رواں خورشید و مہ بھرا ایک سطح آب پر
کشتیٔ مہ شرم میں ڈوبی ہے جسکو دیکھکر

آہ یہ کشتی نشین یہ انکی دلکش فن حسن
گہر عصمت سے مالامال ہے دامان حسن

آشنائے بحر ذوق خود نمائی ہے ہر ایک
سربسر یعنی فسون دلربائی ہے ہر ایک

ہے فروغ روئے رنگیں سے اجالا چار سو
عکس عارض کا ہوا ہے بول بالا چار سو

جلوہ روئے نکو ہے عکس افگن آب میں
یا کہ ہے محو تماشا کوئی پریرو آب میں

شان برنائی شریک ناز معشوقانہ ہے
طرز خود داری سے پیدا سطوت شاہانہ ہے

نازنین نازک بدن ہے کوئی مہ پارہ کوئی
ہے یہ بجرا یا تمناؤں کا گہوارہ کوئی

نقش حیرانی ہے یا کوئی طلسم دلنشین
چل رہا ہے بزم آبی میں کوئی یا سانگین

یا کنول کا پھول یہ کوئی کھلا پانی میں ہے
یا شباب فتنہ جو جلوہ نما پانی میں ہے

یا بہار حسن کا ہے مختصر گلشن کوئی
یا گل باغ جوانی سے ہے پر دامن کوئی

بیخودانہ ہو رہی ہے سیر دریا دیکھیے
کس نزاکت سے چلا جاتا ہے بجرا دیکھیے

کیا سہانی ہے یہ کیا پر لطف ساعت دیکھیے
جنبش باد صبا کی یہ لطافت دیکھیے

دل کی کلیاں کھل رہی ہیں راہ رس آئے ہوا
ہے امنگوں و ولولوں میں فطرتی نشو و نما

تارزم بخش مشام جان ہے موج بوئے گل
از زمین تا آسمان پھیلی ہے فوج بوئے گل

دل ادھر نظارۂ ساحل سے لذت یاب ہے
آنکھ ادھر وقف تماشائے فضائے آب ہے

کوزہ و خود کوزہ گر کی ہے مثل صادق یہاں
واہ یہ جلوت ہے کچھ خلوت سے بھی فائق یہاں

غیر کیا کو سوں یہاں سایہ نہیں ہے غیر کا
صحبت ہم جنس میں دونا مزا ہے سیر کا

سید محمد فاروق (شاہ پوری)

آفتاب

اے فروغ روز روشن مشعل افروز جہان
جلوۂ صبح تمنا اے چراغ آسمان

رونق دنیا ہے تیری گرمی بازار سے
نور اک پھیلا ہے تیرے آتشیں رخسار سے

جانب مشرق نظر آتا وہ تیرا صبحدم
سورۂ والشمس لوح چرخ پر گویا رقم

ہے شراب ارغوانی سے بھرا ساغر ترا
دور چشم مست ہے دن بھر کا یہ چکر ترا

کس حسین کے گوش کا تو گوہر نایاب ہے
کونسے عاشق کا تو داغ دل بیتاب ہے

ہے کتاب حکمت خالق کا اک اجلا ورق
نور دانش سے ترے روشن ہیں یہ چودہ طبق

تار زریں میں شعاعوں کی جو یہ چھوڑ رہا
حسن کا اے مہوش تیرے ہی سر سہرا رہا

تخت ہے چرخ چہارم اے شہ خاور ترا
ہے دم عیسیٰ سے بیشک معجزہ بڑھکر ترا

ہے حرارت تیری آب زندگی سب کے لئے
تو ہے دن کیواسطے اور چاند ہے شب کے لئے

تیری ہی گرمی سے پھل آتے ہیں کل اشجار میں
لعل ہو جاتے ہیں پتھر دامن کہسار میں

تیرے ہی پرتو سے روشن ہیں یہ ذرات زمین
تیری ہی گرمی سے اٹھتے ہیں بخارات زمین

ابر بنکر پھر برستے ہیں یہ رحمت کی طرح
زر لٹاتے پھرتے ہیں اہل سخاوت کی طرح

باغ دنیا سے خزان جاتی ہے آتی ہے بہار — صحن گلشن مین ہزارون گل کھلاتی ہے بہار
جلوہ قدرت کی نیرنگی تجھی سے ہے عیان — تیرے ہی باعث اُگلتی ہے زمین گنج نہان
صحن گلشن مین جو ہر گل شاہد طناز ہے — پردہ ہی پردہ مین تیرے سوز کا یہ ساز ہے
ظلمت شب ہو جاتا ہے کافور آتے ہی ترے — اور بجاتی ہے ظلمت نور آتے ہی ترے
ماند ہے آگے ترے مہتاب و انجم کی چمک — نور ہے تیرا ہی بیشک چشم مردم کی چمک
نور ہوتا تو یہ جلوے ہم کہان سے دیکھتے — رنگ یہ اے نیر اعظم کہان سے دیکھتے
شام کو ہے زرد چہرہ اور سحر کو لال ہے — کھولکر اُڑتا ہے پر تو مرغ زرین بال ہے
گو ہمارے پاس سے تو ہے کرورون میل دور — پر ہے نزدیک اسقدر آنکھون مین سما جاتا ہے نور
موسم سرما مین ہے تو مفلسون کا آسرا — دھوپ سے تیری اُنھین سردی مین آتا ہے مزا
مہر ہے تو اک وہان روزہ داران کے لئے — اک وسیلہ آمد ابر بہاران کے لئے
جان مرغ و مور و ماہی روح جملہ کائنات — چشمہ خورشید سے پاتے ہین سب آب حیات
تیرا جلوہ دیکھنے کی تاب لا سکتا نہین — رعب ایسا ہے کوئی آنکھین ملا سکتا نہین
کیسا جلوہ تجھ مین دیکھا اکبر ذیجاہ نے — سر جھکایا سامنے تیرے جو ایسے شاہ نے
پوجنے والے ترے کرتے ہین تیری بندگی — کچھ تو ہے تجھ مین جو ہے یون شوق سرافگندگی
رازداروان سے ترے یہ راز پوچھا چاہئے — ہے یہ کس کے حسن کا انداز پوچھا چاہئے
ہو یہان مہمان اگر یہ نصیب اپنے کہان — ہین بروج آسمان بس تیرے رہنے کے مکان
ہے کشش سے تیری قائم ایک مرکز پر زمین — ورنہ گر پڑتی خدا جانے کہان جا کر زمین
ہے یہ آویزان فقط تیری کشش کے تار پر — لیگئی گردش مین سبقت کوکب سیار پر
مثل مرکز بیچ مین تو دائرے مین خادم حکام — نام ہے دار الحکومت کا تری شمسی نظام
کیون مریضون کو نہو تسکین سحر کی دید سے — دل ٹھہر جاتا ہے تیرے کاستہ تبرید سے
سر پہ سورج آگیا اے مست کچھ ہشیار ہو — خواب غفلت کب تلک اے دل اب تو بیدار ہو

ہے بہت کم جسقدر تعریف اسکی ہو رقم
دیکھ اے واصف اُسے جسکا ہے یہ نقش قدم

واصف (اکبرآبادی)

مرے دوستانے والے

تری دلفریب صورت مری طبع عاشقانہ — تری دلربا ادائین مرا ذوق شاعرانہ
یہی بانی محبت یہی عشق کا سبب ہین
یہی رنج دینے والے

نہ کبھی ستم سے تھے نہ کبھی یہ دکھ اُٹھایا — لیکایک آہ مجھکو جو خیال یار آیا
تو تڑپ علقہ جگر کی دل زار مضطرب ہے
مری جان کے ہین لالے

مین کرون تو کیا کرون اب مرا اختیار کیا ہے — مرا دل ہے خود ستم کش یہ اسی کی سب خطا ہے
اسے عشق کا ہے سودا - یہ بلاکشی کا خوگر
اسے کیا کوئی سنبھالے

جو دکھاسے سرخروئی یہ وفا شعار بنکر — تو مفارقت کے صدمے بھی اُٹھائے قلب مضطر
یہ کسے غرض پڑی ہے کہ فضول و اہی کی
کوئی اپنے سر بلا لے

نہ کسی نے دیکھا ہوگا یہ وفور سوزش غم — نہ یہ جوش وحشت دل نہ یہ بیکسی کا عالم
مرے دل پہ ہے گرانی - مری جان پہ ہے مصیبت
مرے لب پہ آہ و نالے

ترے عشق کا ہے سودا مرے سر مین بت جانان — کہ خیال منتشر ہے تو حواس ہین پریشان
دل دردمند کو پھر - ترے کا کلون کے بل سے
کوئی کس طرح نکالے

مرے دل سے سوز غم کی یہ کہین اُمس بھی جائے — جو گھٹا ہے دل پہ چھائی یہ کہین برس بھی جائے
مین اسی مین خوش ہون ہمدم - کہ کوئی ستا ستا کر
مجھے خوب سا رولالے

یہ زمانہ ساز ناصح نہ ہوا تبع محبت — مجھے حُسن کی طرف سے نہ دلائے اب یہ نفرت

نہ جلائے دل ناتوان کو ۔۔۔ اس مین نیا ہکی

کہ نہ ہ ر ا ر د ھا ۔۔۔

یہ ۔۔ و حسن والے یہ رشتہ ساز الفت کہ لباب وخو ۔ دنیا یہ ہے جنکو نازونخوت

جو ۔ ۔ ۔ تہذیب ۔ ۔ ۔ باو ۔ ۔ ۔ دلربا ۔ ۔

ایں ۔ ب ا ۔ ۔ لیجیے بجا ۔

مجھے ذرا تم ہی محوی کہ بری بلا ہے الفت ۔ ۔ ۔ ذلت ۔ ۔ ۔ موجب حقارت

مگر آہ اب مین سمجھا کہ دل اور دلربا ہین

"مرے دوست ستانے والے"

محمد حسین (محوی)

کلام ابر

کیا روشنیِ حسنِ صبیح انجمن مین ہے — فانوس مین ہے شمع کہ تن پیرہن مین ہے

بھڑکا تی ہے جنون کو گل و لالہ کی بہار — اک آگ سی لگی ہوئی سارے چمن مین ہے

پُرزے ۔ ۔ سمجھ کے جامۂ تن کے اُڑا جنون — وہ جامہ زیب بھی تو اسی پیرہن مین ہے

سوکھے شجر ہرے جو ہوئے پھر تو کیا ہوا — ناسور تو ہمارے بھی زخمِ کہن مین ہے

بزم خیال یار مین غیرون کا کیا گزر — خلوت جو چاہئے وہ اسی انجمن مین ہے

تقدیر رنگ شیشۂ ساعت ملی مجھے — کلفت سفر کی رات دن اپنے وطن مین ہے

بلبل کی خوشنوائی کا باعث ہے عشق گل — دل مین جو درد ہے تو مزہ بھی سخن مین ہے

رنگ خزان بھی جسکا ہے رشکِ بہار ابر — وہ کشت زعفران کی ہمارے وطن مین ہے

رباعیات

عمر رفتہ کی جستجو کیا کیجے — ناممکن شے کی آرزو کیا کیجے

زخم غم احباب کا مرہم کیا ہے — چاک دل صد پارہ رفو کیا کیجے

دل سے غم دل کی خارجنگی نہ گئی — ایام فراغ مین بھی تنگی نہ گئی

لپٹی ہی رہی فصل بہار سے خزان — افسوس زمانے کی دورنگی نہ گئی

قطعہ تاریخ وفات جناب منشی جوالا پرشاد صاحب برق جج خفیفہ لکھنؤ

(مصنفہ مولانا صفی لکھنوی)

جج خفیفہ کے خوش اخلاق جوالا پرشاد — برق ہر کام مین تھے برق نہ ہے ذہن سا

بات سنتے ہی معاملہ کو پہونچ جاتے تھے — لطف بہتے ہوئے دریا مین نہ ہنہ خواہی کا

دل کے حالات قیافہ سے بتا دیتے تھے — مشغلہ روز عدالت مین یہی رہتا تھا

طبع سنجیدہ تھی ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح — رنگ تہذیب و متانت کا نہایت گہرا

ایک سویا ہوا برتاؤ سبھون سے یکسان — کار سرکار مین نرمی نہ درشتی بیجا

رنگ انصاف مین ڈوبا ہوا انداز نگاہ — شوخیِ جنبش مژگان سے ذہانت پیدا

ذکر جیتے تھے کسی پر نہ برستے تھے کبھی — برق کا کام اشارون پہ فقط چلتا تھا

آنے جانے مین عدالت کے یہ پابندیِ وقت — کام کتنا ہی زیادہ ہو مگر کیا پروا

ختم کر دیتا انھین چاہیے تھا سب کام — کہ نہ سائل ہون پریشان نہ جج ہون کلا

"کار امروز بفردا مگذار" اسپہ عمل — کام مین طول نہ کوتہ قلمی حد سے سوا

تجربہ کار نگاہین ہمہ دان و ہمہ گیر — نکتہ نکتہ پہ نظر سامنے عرضی دعوی

صاف سلجھی ہوئی تقریر بھی تحریر بھی سب — نہ کہین جھول عبارت مین نہ الجھاؤ پڑا

نکتہ چینون سے نہ ٹوٹے یہ طلسم تجویز — فیصلہ مین وہ سلیقہ کہ نہ دیکھا نہ سنا

کرسیِ عدل پہ جج جج کی ملاقات مین دوست — صحبتِ شعر و سخن ہو تو ادیب یکتا

بذلہ سنجی مین سخن ساز طبیعت حاضر — فقرہ فقرہ مین ظرافت کا نمک تھوڑا تھوڑا

جائیے گھر پہ جو ملنے تو ملنسار بڑے — آئے جب سر اجلاس تو انداز جدا

ڈٹ گئے کرسی پہ جہان بیٹھ گئے شیر کی طرح — رعب چہرہ پہ خدا داد نظر ہوش ربا

مذہبی رنگ تعصب کا کہین نام نہین — دل کے آئینہ پہ آزاد خیالی کی جلا

جج مین جتنی صفتین چاہئین وہ سب موجود — اب وہ ان آئے تھے کہ عہدہ کوئی ملتا اعلی

یون تو مرنا ہے سبھی کو مگر افسوس ہے برق — اجل آئی تمھین بیوقت قلق ہے اسکا

لکھنؤ یہ تری قسمت کہ ترے ہاتھ سے لو — ہو گیا گم وہ نگینہ کہ جو تھا بیش بہا

بار گرتے رہے ہیں یہ شاہانہ گیسے
سو رہی ہے کیسے اُردو کی کشمکش دنیا

افسوس میں ہیں شکسپیر کی جلدیں
کون اُردو میں کریگا وہ خیالات ادا

تیرے لئے چھوڑ گیا دیکھ اُردو
تیرے سرمایۂ نازش کا بڑھانے والا

اس سے کوئی اور نہ ہوگی بہتر
کر اشاعت سے تصانیف کو دیجا بقا

باقی تھا بہت کچھ مگر افسوس افسوس
ساتھ تو نے نہ دیا زندگیٔ سست وفا

تب میں ہوئے مارچ کی اکیسویں کو
اور چھبیسویں کو آگیا پیغام قضا

چھیالیس برس تین مہینہ کا ابھی
ساخت اعضا کی نہ کمزور نہ کمزور قویٰ

یا کیجئے دن گو کہ دیکھتے مرنیکے
لیگئی چھین کے احباب سے بخت برا

اولاد کو اور اُنکے عزیزوں کو تمام
تعزیت دیجئے اللہ کرے صبر عطا

اے برق جہاں رہئے وہاں خوش رہئے
خوش رہے آپ سے دنیا میں سب اعلیٰ و ادنیٰ

برق میں گویا کشش برقی تھی
سبق آموز محبت تھی ہر اک طرز ادا

شعلوں نے لیا برق کو آغوش میں
او غم انگیز جگر سوز شررخیز چتا

حباب میں اک آگ لگا دی غم نے
حشر تک جو نہ بجھیگی نہ بجھیگی اصلا

لکھنے بیٹھا ہے مصفی برق کی تاریخ وفات
دل رنجیدہ پہ چھائی ہے غم انگیز گھٹا
سنہ ۱۹۱۱ء

کلام اکبر

ابر بھی جھونکے بھی ہیں بادِ بہاری کے
مبارک ساقیا پھر آگئے دن بادہ خواری کے

یہ فصلِ بہار و بادۂ گلگون
عناصر ہیں یہ میرے عالم بے اختیاری کے

برستی ہے مری انکی نگاہوں سے
حواس و ہوش گم ہیں ذوقِ سعیِ رازداری کے

کا اکرام اب کریگا کون اے اکبر
خراب و مست خود ہیں قدردان پرہیزگاری کے

اے دل کی امید اس گلستان میں
نہ رنگِ روح پرور ہے نہ بوئے ہمت افزا ہے

رنگون کے گئے دن اب تو اے اکبر
نہ بادِ دوش سر ہے اور نہ ہمت کا تقاضا ہے

کلام چکبست

ملک میں دولت نہیں باقی دوا کے واسطے
ہاتھ خالی رہ گئے ہیں اب دعا کے واسطے

خود پرستوں سے حبیبانِ وطن کا قول ہے
ہم وفا کے واسطے ہیں تم جفا کے واسطے

آبرو آتش کی غلامی پر بشر قانع نہیں
[illegible] فکر تسخیر ہوا کے واسطے

مردہ دل زندہ جفائے زندگی سہنے کو ہیں
مرنے والے مر گئے پاسِ وفا کے واسطے

یہاں تسبیح کا حلقہ وہاں زنار کا پھندا
اسیری لازمی ہے مذہب شیخ و برہمن میں

نشان ملتا نہیں کیفیتِ شام جوانی کا
طلوع صبح پیری دیکھتے ہیں ہم لڑکپن میں

جنہیں سینچا تھا خونِ دل سے اگلے باغبانوں نے
ترستے اب ہیں پانی کو وہ پودے میرے گلشن میں

اُڑا کر لے گئی بادِ خزاں اس سال اسکو بھی
رہا تھا ایک برگِ زرد باقی میرے گلشن میں

نہ بتلائی کسی نے بھی حقیقت رازِ ہستی کی
~~بتوں سے جا کے پوچھا [illegible] میں~~

حیا معدوم ہے ترکِ ادب پہ ظلم ہوتا ہے
جوانی میں نظر آیا جو سنتے تھے لڑکپن میں

سلام

(از افکار تازہ حضرت رشید لکھنوی نبیرۂ میر انیس صاحب مغفور)

خوشی سے زخم کھانے یوں شہ دلگیر آتے ہیں
کہ بڑھ جاتا ہے دل جب سامنے سے تیر آتے ہیں

نکل آئی ہیں حوریں کوثر و تسنیم سے باہر
خبر پہونچی ہے پیاسے حضرت شبیر آتے ہیں

گئے ہیں شاہ دین لیکر کھڑی ہیں منتظر بانو
بیان ہے دیکھئے کب اصغر بے شیر آتے ہیں

نہ نکلے اس سے بھی نالہ یہ ہے مطلوب عابد کو
فقط اسواسطے تھامے ہوئے زنجیر آتے ہیں

فرشتے ڈر رہے ہیں قبر میں میں اُٹھ کے بیٹھا ہوں
زمین کو زلزلہ ہے شاہ خیبر گیر آتے ہیں

پسر کے بعد جب کرکے کمین کمانیں شہ نے فرمایا
علی اصغر گئے دنیا سے اب کیوں تیر آتے ہیں

پھرے ہیں سوئے خیمہ ہاتھ پر ہے لاش بچے کی
شہ دین دفن کی کرتے ہوئے تدبیر آتے ہیں

غم اکبر میں گویا ام لیلیٰ ذبح ہوتی ہے
کمین سے کان میں جب نعرۂ تکبیر آتے ہیں

گرے ہیں رن میں اکبر دوڑتے ہیں ہر طرف اعدا
مٹانے کو رسول اللہ کی تصویر آتے ہیں

نہ گھبرا اے کرونگا میں مدد صبح قیامت کی
مجھے بھی شہ کے غم میں نالۂ شبگیر آتے ہیں

رشید اچھے ہیں سب مداح سب شاعر برا میں ہوں
زبان پر لفظ یہ اکثر دم تقریر آتے ہیں

جشن سالگرہ مبارک

چمن سے لائی ہے پھولوں کا ہار سالگرہ　　بنی ہے آج عروس بہار سالگرہ

ہو شوق دید میں بیتاب کیوں نہ گلزارش　　وہ آئی جلوہ فشاں مستانہ وار سالگرہ

رہیگا آج نہ خالی کسی کا دامن و جیب　　لٹا رہی ہے زر و زر نثار سالگرہ

بڑی عقیدت سے سب اس سے کہتے ہیں　　ہمیں ہے نذر عقیدت پہ دوگا سالگرہ

ہے تیرہ دیدہ و دل کو خدا نصیب کرے　　یہ خوشگوار ہو یا رب ہزار بار سالگرہ

چھلک رہا ہے جو پیمانہ سرور کا آج　　تو دعا یہی ہے دلوں سے غبار سالگرہ

ادا سے ناز سے خوبی سے دلربائی سے　　بنی ہے ایک بت گلعذار سالگرہ

الہی آصف جاہ دکن جو عمر دراز　　یہ دیکھے رہیں دعا بار بار سالگرہ

بڑی خوشی کا یہ دن ہے جبکہ فرخندہ　　نہ تم نے دیکھی ہے ایسی روزگار سالگرہ

حضور بھی آج یہ دیتے ہیں تہنیت شہ کو　　خدا کرے ہو تمہیں سازگار سالگرہ

جہاں جہاں گل تصویر تھے مہک اٹھے　　عجیب رنگ سے ہے عطر بار سالگرہ

سنا رہی ہے ترانے نشاط کے بلبل　　منا رہی ہے نسیم بہار سالگرہ

یہ روشنی کا ہے عالم تو کیوں نہ کہلائے　　چراغ انجمن روزگار سالگرہ

بنا چکی ہے زخود رفتہ جمال اپنا　　تمام شہر کو اے شہریار سالگرہ

گہر مراد کے لائی ہے بھر کے دامن میں　　کریگی شاہ دکن پر نثار سالگرہ

خوشی کا دور مسلسل ہے دام سے بڑھکر　　دلوں کا کھیل رہی ہے شکار سالگرہ

جہاں بھر میں ہوا اس جشن کا کیوں شہرہ　　کہ نامدار کی ہے نامدار سالگرہ

وہ آج شکر خدا بار بار کرتے ہیں　　جو کر رہے تھے ترا انتظار سالگرہ

گرہ کشا رہیں سرکار جان نثاروں کے　　دل عدو سے نہ نکلے ہزار سال گرہ

جلیل لاکھ تمنا کی اک تمنا ہے　　مرے حضور کی ہو لاکھ بار سالگرہ

براے نذر لکھو تم یہ بے بہا تاریخ　　مبارک آصف گردوں وقار سالگرہ
۱۳۲۹ھ

جلیل

غزل

شراب عیش میں مدہوش یا محو الم رہنا　　مگر اے دل وفا کی راہ میں ثابت قدم رہنا

حقیقت کیا کھلے گی تجھ پہ آرام و مسرت کی　　اگر ہے بار خاطر بتا اسے درد و غم رہنا

یہ آرائش مجازی سلسلہ بند حقیقت ہے　　ہمارا حلقہ جنبان در بیت الصنم رہنا

شہادت رقت قلب اور دلیل آئینہ ہے　　کسی بسمل کی حالت دیکھنے میں آنکھ کا نم رہنا

یہ ہیبت ناک منظر و ہم طول زندگانی ہے　　نگہ کے سامنے ہر وقت تصویر عدم رہنا

دو روزہ ہو زیست باعث گر منظور ہو تجھکو　　مثال شمع ہر اک بزم میں ثابت قدم رہنا

بتا دو ان اتحاد باطنی کا فلسفہ کیا ہے　　دلی جذبات کا شادی و ماتم میں بہم رہنا

تلاش مدعا میں فکر بھی ہمراہ لازم ہے　　کبھی دو گام چلنا اور کبھی دم بھر کو تھم رہنا

کوئی پوچھے کہ آخر زاہد کیوں بزم رنداں میں　　بہت دشوار ہے اعزاز شیخ محترم رہنا

بڑھیگی معرفت اہل دل کے فلسفہ سے دل　　اگر جویاے حق ہے سالک دیر و حرم رہنا

ہوئی جس وقت فکر رزق شکوہ نیند آنے میں　　مقدر بول اٹھا بیدار غافل صبحدم رہنا

تواضع کی ادا دلکش ہے دیکھی گو کسی میں ہو　　نہایت حسن ہے محبوب کی زلفوں میں خم رہنا

جہاں صبر میں ہو شوق سبکو کامیابی کا　　وہ پہلے اہل دل سے سیکھ جاے محو غم رہنا

یہ منظر بھی جہاں میں قابل عبرت ہے اے گردوں　　مرا خاموش رہنا تیرا مشغول ستم رہنا

ہم ایسی زندگی کو زندگی کیونکر کہیں محشر　　سحر سے شام تک منت کش اہل کرم رہنا

محشر

ایڈیٹوریل

صوبجات ہذا کی انتظامی رپورٹ بابت سال گزشتہ حسب معمول حال ہی میں شائع ہوئی ہے جسکے ایک حصے میں لٹریچر اور اخبارات کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب و اخبارات کی تعداد میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے اور ان صوبجات میں علمی شوق برابر ترقی کر رہا ہے ۔ تعداد کتب میں بمقابلہ سال گزشتہ ۵۵۵ کا اضافہ ہوا ہے ۔ لیکن یہ اضافہ انگریزی اور ہندی تصانیف سے تعلق رکھتا ہے اردو کتب میں بمقابلہ سال ماسبق افسوسناک کمی واقع ہوئی ہے ۔ یہ کمی اس خیال کے ساتھ اور بھی حیرت انگیز ہے کہ سال گزشتہ میں اردو زبان کی ترقی کیلئے خاص کوششیں کی گئیں اور صوبہ ہذا میں اردو کانفرنس کمیٹی بھی قائم ہوئی ۔ نیز علیگڈھ پارٹی اور مسلم لیگ نے بھی اردو کی سرپرستی کا بیڑہ اٹھایا ۔ لیکن عملی کوشش یعنی تصنیف و تالیف کی کارروائی نسبتہً سست رہی ۔ سارے صوبے میں صرف دو کتابیں قابل تعریف سمجھی گئی ہیں ۔ ایک علامۂ عصر مولانا شبلی مدظلہ کا سلسلۂ "شعر العجم" (جو ہنوز نامکمل ہے اور جسکی تکمیل میں ابھی برسوں کی دیر ہے) اور دوسری مسٹر گردھاری لال سکسینہ کی تصنیف "بہارستان انجینیرنگ" جو اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کتاب خیال کیگئی ۔ علامہ شبلی مدظلہ العالی کی پیرانہ سالی، کثرت کار، اور ندوۃ العلما کی اہم ذمہ داریوں کا خیال کرتے ہوئے اردو زبان کے متعلق انکی عملی کوشش حد تعریف سے باہر ہے ۔ ہزارہا حامیان اردو میں صرف ممدوح ہی کی ذات بابرکات اس صوبے کے لئے مایۂ ناز ہے ۔

منشی جوالا پرشاد صاحب برق بی ۔ اے ۔ بی ۔ ایل ۔ جج خفیفہ لکھنؤ کی افسوسناک وفات اردو زبان کے لئے ایک سخت ماتم ہے ۔ جن لوگوں نے آپکی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو نظم و نثر میں آپکی فصاحت اور شیوا بیانی کیا درجہ رکھتی تھی ۔ بنکم چندر اور شیکسپیر کی تصنیفات کو فصیح اردو کا لباس دینا مرحوم پر ختم تھا ۔ ان یگانۂ آفاق مصنفوں کی اصلی فصاحت منشی صاحب کے اردو ترجموں میں اسطرح جلوہ گر ہے جسطرح آئینے میں عکس ۔ آخر میں شیکسپیر کی تمام تصنیفات کا ترجمہ کر رہے تھے کہ پیام اجل آگیا ۔ ظرافت میں بھی آپ کو خاص دستگاہ حاصل تھی اور اودھ پنچ کے صفحات آپکے فیضان قلم سے ہمیشہ سیراب ہوتے رہے ۔ قانون کیلئے بھی آپ نے خاص دماغ پایا تھا اور آپکی بینظیر جوڈیشل خدمات کا سرکاری طور پر اعتراف کیا گیا ہے ۔ مرحوم کی وفات سے نہ صرف اردو کا ایک فصیح البیان مصنف، ایک زندہ دل اور ظریف الطبع شاعر، ایک بینظیر جج اور لکھنؤ کی سوسائٹی کا ایک اعلیٰ ممبر اٹھ گیا ہے بلکہ قوم کایستھ کا ایک رکن رکین اور مایۂ ناز فرو کم ہوگیا جو ہمارے لئے ایک صبر آزما قومی سانحہ ہے ۔

آپکے اوصاف کی تفصیل مولانا صفی لکھنوی کے قطعۂ تاریخ میں درج ہے جو ۴ر اپریل سنہ حال کو قیصر باغ لکھنؤ کی تعزیتی مجلس میں پڑھا گیا تھا اور جسکی بیحد تعریف ہوئی ۔ حضرت صفی لکھنؤ کے نامور اساتذہ میں ہیں اور مرحوم کے سررشتہ دار تھے ۔ آپکے مختصر حالات جو آپکے برادر معظم منشی جانکی پرشاد صاحب گورنمنٹ پلیڈر رائے بریلی نے مع فوٹو ارسال فرمائے ہیں حسب ذیل ہیں :-

منشی جوالا پرشاد صاحب بتاریخ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۳ء یوم دسہرہ ماہ کنوار بمقام قصبہ محمدی ضلع کھیری پیدا ہوئے تھے ۔ بزرگان منشی صاحب مرحوم قصبہ شاہ آباد ضلع ہردوئی کے باشندے تھے ۔ جد ماجد منشی نین سکھ عہدۂ جلیلہ پر بعہد شاہی ممتاز تھے اور اسی سلسلہ سے قیام محمدی ہوگیا ۔ والد ماجد منشی شیو دیال صاحب بھی عہد شاہی میں ممتاز رہے ۔ منشی صاحب مرحوم بچپن سے خاموش ۔ محنتی اور شائق تحصیل علم رہے ۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں مڈل پاس کر کے انٹرنس ۔ ایف اے ۔ اور بی ۔ اے میں برابر اول درجہ میں پاس ہوتے گئے ۔ بی ۔ اے ۔ پاس کر کے آپ اسسٹنٹ انگلش پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ میں مقرر ہوئے اور اسی زمانہ میں قانون بمشورہ منشی کالی پرشاد صاحب مرحوم کل بھاسکر بانی کایستھ پاٹھ شالا الہ آباد کے حاصل کیا

بی-اے کے امتحان سے ایک سال پہلے ہائیکورٹ کے امتحان میں کامیاب ہو گئے تھے پانچ سال وکالت عدالت العالیہ صاحب جوڈیشل کمشنر بہار میں آپکے منصف ۱۸۸۰ء میں مقرر ہوئے منصفی سے ترقی کرکے سب جج اور کئی دفعہ قائم مقام سیشن جج مقرر ہوئے۔ بالآخر ۲۶ مارچ ۱۹۱۱ء کو بوقت ۳ بجے سہ پہر اس دار فانی سے کوچ کیا۔

تشریح تصاویر

(۱) بیگمات دہلی کی سیر دریا حکیم محمد خان صاحب لکھنوی کی مصوری ہے جو اپنے اچھوتے خیالات سے ہندوستانی فن تصویر میں تاریخی روح پھونک رہے ہیں تصویر میں دریا کا منظر اور شاہی بجرا جو دلکشی رکھتا ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔ دہلی کے زمانہ عروج میں شاہی بیگمات اکثر چاندنی رات میں جمنا کی سیر کرتی تھیں جسکی دلکش کیفیت کو جناب سید محمد فاروق صاحب نے شاعرانہ تخیل میں جلوہ گر کیا ہے۔

(۲) رام نومی ہندوؤں کا ایک عظیم الشان قومی تہوار ہے جس روز سری رامچندر جی نے اوتار لیا ہے۔ چونکہ یہ تہوار اسی ماہ میں واقع ہوا ہے۔ لہذا سری رامچندر جی کا مرقع جسمیں سیتا جی اور لکشمن اور ہنومان بھی موجود ہیں۔ مناسبت وقت کے لحاظ سے عام دلچسپی کا باعث ہوگا۔ تصویر عام اور معمولی نہیں ہے بلکہ ایک پرانے مصور کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔

(۳) منشی جوالا پرشاد صاحب کی وفات ایک سخت ملکی و قومی نقصان ہے۔ آپکا فوٹو ادبی دنیا میں اول اول شائع ہوتا ہے۔ اپنی حیات میں آپ نے اپنی تصویر چھپوانا پسند نہیں کیا حالانکہ اسکے لئے ہر طرف سے مانگ آتی رہی

(۴ و ۵) سکھ کنیان مہا ودیالہ کی ایک تصویر ادیب کے گزشتہ نمبر میں نکل چکی ہے اس مبارک زنانہ تعلیم گاہ سے سکھوں میں جو قومی اور روحانی زندگی پیدا ہوئی ہے وہ بے پایان ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنی آیندہ نسلوں کی بہتری کیلئے تعلیم نسوان کی ترقی میں اپنے تن من دھن کو نثار کر رہے ہیں۔ عمر یان سنت الیشر سنگھ جی اور عمر یان بھائی تخت سنگھ جی وہ نام ہیں جن پر سکھ قوم ابد الآباد تک ناز کریگی۔ اس مرتبہ اس ودیالہ کے اندرونی حصے کی ایک اور تصویر دیجاتی ہے اور ساتھ ہی ان کین ودیالہ کو بھی ملک سے روشناس کرایا جاتا ہے۔

(۶) شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب مرحوم کے حالات زندگی پر ایک جامع و مانع مضمون جنوری سنہ حال کے ادیب میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مرتبہ آپکا فوٹو بھی ہدیہ ناظرین ہے۔

(۷) ۸ مارچ کو سر جان اسٹینلی نائٹ کے سی۔ چیف جسٹس الہ آباد ہائیکورٹ نے ایک عظیم الشان جلسے میں ہائیکورٹ کی جدید عمارت کا سنگ بنیاد رکھا تھا جو ایک یادگار واقعہ ہے اور جسکی تصویر ہدیہ ناظرین ہے۔

(۸) سکنتلا اپنے چمن میں درختوں کو پانی دے رہی تھی۔ اسکی سہیلیاں پریمبدا اور انسویا بھی اسکے ساتھ کام میں مشغول تھیں جیسے ہی راجہ کی نگاہ سکنتلا پر پڑی تیر محبت سینے کے پار ہو گیا اور غیرت عشق نے زمین میں پاؤں گاڑ دیئے۔ سکنتلا کی نظر بھی راجہ پر پڑی اور دونوں کے دلوں پر کیا گزری۔ اسے جیسا زندہ جاوید کالیداس نے بیان کیا ہے وہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔ جب راجہ اپنے گھر واپس آیا تو اسنے اپنے دوستوں سے سکنتلا کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا۔

"وہ دو تین قدم آگے چلی اور دفعتاً کھڑی ہو گئی۔ اسلئے کہ اسکے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا تھا۔ کیا یہ بات سچ تھی۔ ابھی نہیں۔ یہ صرف میرے دیکھنے کا بہانہ تھا۔"

کالیداس کی اسی جادو بیانی کو مصور نے تصویر کا رنگ دیا ہے اور وہ دلکش منظر دکھایا ہے جسکی تشریح کے لئے سارا سکنتلا ناٹک دوہرانے کی ضرورت ہے۔

---

(۹) مرزا کاظم حسین صاحب محشر کی شیوا بیانیاں عام شہرت رکھتی ہیں اور ناظرین ادیب آپکے دلکش کلام سے شروع ہی سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ اس مرتبہ آپکا فوٹو بھی شائع کیا جاتا ہے جو عام طور پر دلچسپی سے دیکھا جائیگا۔

مئی ۱۹۱۱ء

ادیب

جلد ۳ — نمبر ۴

ادبِ اُردو کی طوائف الملوکی

تمام دُنیا کے ملکون مین جو زبان ہین وہ اسقدر بیقاعدگی کے ساتھ اختلافات نہین رکھتی اور نہ ایسے جذر و مد پیدا کرتی ہین جیسی ہندوستان مین زبانِ اُردو اور ہر ایک ملک کی زبان نے کوئی نہ کوئی پہلو اختیار کیا ہے مگر اُردو کا اُونٹ کسی کل بیٹھتا ہوا نہین معلوم ہوتا اسکے اسباب متعدد ہین اور تقریباً سب کے سب افسوسناک ہونے مین اسقدر اہم ہین کہ آخرکار دلچسپ ہوگئے ہین۔

ہر ایک زبان پر چار قوتین متصرف ہوتی ہین ملکی۔ مذہبی۔ علمی۔ حکومتی۔ کوئی زبان ان چارون کے اثر سے خالی نہین ہوسکتی جب تک کہ خود انکا وجود معدوم نہ ہو۔ ملکی اثر اسوجہ سے لازمی ہے کہ جب کوئی ملک آباد ہوا اہل ملک نے جو سب کے سب آپسمین ہموطن تھے خود بخود الفاظ وضع کئے اور سب یکزبان ہوگئے۔ یہ ملکی اثر ہر زبان کا قدیمی ہے اسیوجہ سے ہر ملک کی زبان علیحدہ ہے۔ اگر کوئی نیا ملک بچون سے آباد کردیا جاے تو جب اُس ملک پر تمدنی حیثیت سے ملک کا اطلاق ہوسکے گا اُسوقت وہان کوئی نہ کوئی زبان ضرور ہوگی اور اگر وہ اس قابل نہ ہو کہ اُسے ملک کہا جاے تو بیشک زبان قائم ہونے سے پہلے وہ برباد ہوچکے گا۔

یہ ملکی زبان گویا انسان کی فطری زبان ہے۔ اُسکے بعد بقیہ ہر سہ امور کا اثر اُسپر شروع ہوگا اور وہی ترتیب ہوگی جس ترتیب سے ملک مین جسکی مداخلت ہو مثلاً کسی ملک مین دوسرے ملک کا مذہب پھیلا تو اول مذہبی کتاب اور اُسکے شروح ا

پھر مذہبی علما کی تصانیف، و خیالات سے ملکی زبان مین مذہبی
مضامین کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس زبان غیر کے الفاظ داخل
ہوتے جائین گے۔

تیسرا اثر علمی ہے یعنی یہ کہ ہمسایہ ملک کے علوم کی جو
زبان ہوگی وہ علوم کے ساتھ اس ملک مین ضرور داخل ہوگی۔

چوتھا اثر حکومتی ہے یعنی قوم فاتح کی زبان کے الفاظ
چارناچار لینا پڑینگے اور وہ بسیط و دخل در معقولات کرسکتے ہین
جسطرح قوم فاتح نے اپنا عمل و دخل کرلیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ
چار اثر ہر زبان پر ہو سکتے ہین اور اگر خوش قسمتی سے
کسی ملک کو مذہبی یا حکومتی زبان کے اختلافات سے انقلابات عالم
نے بچالیا تو صرف دو ہی حاکمون کی حکومت کے قلیل اثر سے
زبان پختہ اور بے جذر [illegible] ہوگی مثلاً عربی زبان کہ وہ ملکی زبان
ہونے کے بعد ۱۳ سو برس سے اسوقت تک متلون نہین
ہوئی کیونکہ اُسکی مذہبی زبان بھی غیر نہین ہے یعنی وہی عربی۔
اور حکومتی اثر بھی اُسپر کسی غیر کا نہین یعنی عرب ہی فاتح ہین بجائے
اسکے کہ اُسمین کوئی غیر زبان دخیل ہو وہ خود تمام دُنیا کی اعلیٰ
زبانون مین متصرف اور بعض پر مسلط ہے۔ فارسی مین تو وہ
شریک غالب ہے مگر یورپ مین بھی اُسکا اتنا اثر ہے کہ پانسو
سے زیادہ الفاظ رسا ہو گئے اور وہان وہ علمی حیثیت سے گئی
کیونکہ جسقدر علوم اہل یورپ نے لئے ہین تقریباً سب کے سب
عربی ہی سے حتیٰ کہ لاطینی مین بھی عربی الفاظ موجود ہین (جنکا
ذکر اگر مثالاً بھی کرون تو بھی نفس مطلب خبط ہو جائیگا لہذا اس
مضمون کے بعد عربی زبان کا اثر دوسرے نمبر مین دکھانا
مناسب ہوگا)۔

عربی کیطرح اور زبانین سب قریب قریب اس معاملہ مین
خوش نصیب ہین مگر ہمارے ہندوستان اور اُسکی زبان کا
انداز ساری دُنیا سے نرالا ہے۔

ہندوستان کی آبادی جتنی قسم کی اور جس شدت سے
اختلافات رکھتی ہے اُنکی کوئی انتہا نہین اور ہر قسم کی نااتفاقی
اور اختلافات مین ہندوستان کو عجیب و غریب خصوصیت حاصل
ہے اگر مبالغہ نہ سمجھا جاسے تو مین سچ سمجھکر کہون کہ یہ جو مشہور ہے
کہ "جتنے آدمی ہین اُتنے طبائع" یہ ہندوستانی آبادی کے لئے
زیادہ موزون ہے بلکہ گویا اسی کے لئے موضوع ہے اور
یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ جس انسان کے جتنے رنگ ہو سکتے ہین
وہ سب ہندوستان مین پائے جاتے ہین حالانکہ اور ملکون مین
دو تین رنگ کا بھی جمع کرنے والا کوئی ملک نہین نظر آتا یا سب
کالے ہو گئے یا سب گورے یا زیادہ سے زیادہ سانولے یہان سُرخ۔
سُرخ و سپید۔ زرد۔ گندمی۔ صندلی۔ چمپئی۔ کتھئی۔ سبزہ رنگ
بھورے۔ سانولے۔ کالے۔ غرض ہر وہ رنگ جو کہ انسان
کا ممکن ہو سکے ہندوستان کی آبادی مین پایا جاتا ہے
حالانکہ کثرت الوان کیوجہ سے اُنکا نام تک وضع نہین کیا گیا
اور یہانتک کہ وہ رنگ جس رنگ کا آدمی دُنیا کے پردے پر
نادر الوجود ہے یعنی اُودا۔ یعنی ایسا چہرہ بھی دیکھا ہے اور اُسکو
طاؤسی کہہ سکتے ہین۔ غرض یہ کہ اختلافات ہند کی کوئی انتہا
نہین اُنھین اقسام مین سے ایک قسم زبان کے اختلافات
کی بھی ہے جو کہ خود اپنی جگہہ پہ ایک اعلیٰ درجہ کا اختلافی محکمہ ہوگئی ہے

ہندوستان کی قدیم کہین یا فطری زبان سنسکرت ہے
جو کہ اُسکی ملکی زبان ہے۔ عموماً ہر ملک مین ملکی زبان متعدد نہین
مگر ہندوستان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اس ملک مین صرف
ملکی زبانین اسقدر نہین جسقدر اُسکے چھوٹے چھوٹے سے حصے۔

صرف حضور نظام کی مملکت مین جسکی آبادی کچھ کم و بیش ایک کروڑ ہے - بہت سی زبانین موجود ہین - ظاہر ہے کہ ہندوستان کا گویا وہ ایک صوبہ ہے مگر اس صوبہ کے بھی جسقدر حصص انتظامی حیثیت و ضرورت سے کیے گئے اُنکی زبانون مین محاورات کا فرق نہین بلکہ ہر صوبہ کی زبان بالکل علیحدہ ہے سب ملا کر جتنی قسمین کہ ان مین السنہ کی ہین وہ حسب ذیل ہین - اُردو (یہ دو اُردو ہے) جو اختلاف مختلف کیوجہ سے دوسری ہو رہے فارسی (پہلے دفاتر کی زبان تھی) مرہٹی - تلنگی کنڑی - اور علمی و مذہبی کتابین جو سنسکرت مین موجود ہین وہ علاوہ اسکے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کے ہر چھوٹے سے چھوٹے حصہ مین مختلف و متعدد زبانین ہین اور صرف زمینی ہی تقسیم تک یہ اقسام السنہ محدود نہین ہین بلکہ طبقات آبادی کے لحاظ سے اور پیشون کے اعتبار سے بھی کثرت اصطلاحات نے ہر ایک کی زبان ایک علیحدہ زبان بنا دی ہے جوہریوں کی بولی دوسرا پیشہ ور نہین سمجھ سکتا اسیطرح دلالون اور بزازون - کٹھیرون - کنجڑون وغیرہ کی علیحدہ علیحدہ زبان ہے بلکہ ارباب نشاط مین بھی ایک علیحدہ لغت ہے اور یہ سب الفاظ و لغات محکمہ راز کی حیثیت سے اسقدر پوشیدہ ہین کہ دوسرا فرقہ یا پیشہ ور اُسکی تعلیم سے محروم رکھا جاتا ہے - مگر خیر اسمین تو اصطلاحات کیوجہ سے یہ گنجائش ہے کہ خاص الفاظ ہر پیشہ کے دوسرے ممالک مین بھی اسیطرح مختلف ہین مگر ملک کے حصون کے لحاظ سے ایسا لسانی اختلاف کہین نہین ہے - تیرہ سو برس بلکہ بعثت نبوی سے سو برس پہلے عرب مین جو زبان تھی وہی اب تک ہے اور مشرق سے مغرب تک محاورات مین اتنا فرق نہین کہ سمجھنے مین دقت ہو یہانتک کہ سمجھ مین نہ آنے والا فرق ہندؤن کی زبان مین بھی نہین پایا جاتا -

بہرصورت یہ تو ملکی زبان کا حال ہے کہ سنسکرت کو بھی ملکی زبان نہین کہہ سکتے جبکہ ہر صوبہ کی ملکی زبان علیحدہ ہے کشمیری - پنجابی - گجراتی بنگالی - وغیرہ وغیرہ -

دوسرا نمبر مذہبی ہے - اسکا فیصلہ بھی نہایت آسان ہے قدیم مذاہب کو جانے دیجیے اُسوقت تو مذہبی زبان وہی سنسکرت تھی مگر اب تو اُتنی ہی زبانین ہین جسقدر مذاہب و اقوام ہند مین پائے جاتے ہین -

تیسرا اثر علمی ہوتا ہے - ہندوستان مین علمی اثر کی یہ حالت ہے کہ جو علم جس ملک سے آیا اُسی ملک کی زبان کا اثر پیدا ہوتا گیا -

اب رہی حکومتی زبان وہ بھی ایک نہین - خاندان مغلیہ فارسی لائے اور فارسی مین شریک غالب عربی تھی اسوجہ سے عربی تو علمی مذہبی اور حکومتی - غرض ہر طرح کی حیثیت سے ہندوستان مین داخل ہونے کی حقدار ہو گئی مگر سو برس سے انگریزی کا دور دورہ ہے -

انگریزی سے پہلے یا اسکی ابتدا ہی کے زمانہ مین انہی اختلافات کے مجموعہ نے ایک جدید ذخیرہ الفاظ پیدا کر کے اُردو کے نام سے مرتب و شائع کیا - اب انگریزی بھی اُسمین جانزو دخیل ہو گئی کیونکہ اوّل تو اُردو کی بنا ہی اس اصول پر پڑی کہ تمام عالم کی زبانین اُسمین بے روک ٹوک آ سکتی تھین اور کیکی مداخلت مداخلت بیجا نہ تھی کیونکہ صرف ہندوستان ہی کی زبانین خیر سے کیا کم تھین جو غیر زبانین اسمین آتی ہوئی بری معلوم ہوتین تو انگریزی زبان کو قوم فاتح کی زبان ہونے سے وہی استحقاق تھا جو اس قوم کو ہے -

اب وہ لوگ کہان ہین جو اُردو کی اصلاح چاہتے ہین۔ وہ کن اصول پر اسکی اصلاح کا بیڑہ اُٹھاتے ہین۔ میرے نزدیک اسکے مربی او منی اس وقت دو ہین ایک درجہ مین ہین خواہ ناکام ہون یا کامیاب۔ خود اُردو کے اختلافات کی تشریح صورتین اسوقت میرے ذہن مین ہین کہ اُنکے خیال سے میرا دم گھبراتا ہے۔ ہر شہر ہر قصبہ تو بالاے طاق ہر محلہ کی ایک خاص دو ہے بلکہ ہر گروہ اور ہر خاندان یہانتک کہ اگر مجھے اجازت دیجائے تو مین کہونگا کہ ہر شخص کی ایک خاص زبان ہے۔ دو بھائی ایک ہی آغوش مین پرورش ہوئے اور ایک ہی اُستاد سے پڑھے اور جوان ہوئے مگر ایک لفظ کو ایک بھائی بجالت تانیث استعمال کرتا ہے اور دوسرا بحالت تذکیر۔ دُنیا مین کون شخص اسکے مسلہ قواعد بنا سکتا ہے اور کس مین یہ اعجاز ہے کہ ایک مستند لغت اگر جامع بھی ہو مدوّن کر دیگا ہان وہی شخص اس کام کو کر سکتا ہے جو تمام عالم کے السنہ اور سارے ہندوستان کی سب زبانون کے مروجہ اور متروکہ الفاظ و لغات و محاورات وغیرہ کو ایک کتاب مین جمع کر دے۔ جو کتاب ایسی ہو وہی اُردو کا مکمل لغت ہے مگر مستند وہ بھی نہوگا کیونکہ کسی ایک لفظ پر بھی سب کا متفق ہو جانا مشکل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُردو کا نہ تو کوئی معیار قائم ہو سکتا ہے نہ کوئی مقیاس اور نہ کوئی اُسکی ترقی کی حد معین ہو سکتی ہے نہ تنزلی کی جو اسباب و علامات اُسکی وسعت و ترقی کے کہے جا سکتے ہین وہی اُسکی خرابی اور تعویت کے۔ ہر شخص اپنے آپ کو حق پر سمجھ سکتا ہے اسی لئے کوئی نہین کہتا کہ ہم اہل زبان نہین ہین۔ فصاحت ایک رواجی کیفیت ہے اور رواج کا کوئی ٹھل ٹھرا نہین اسلئے ہر شخص اپنے کو فصیح کہہ سکتا ہے اور کوئی کسی کو معقول نہین کر سکتا۔ یہی وجہ سے میرا یہ خیال ہے کہ ہر شخص مین ایک خاص قسم کی فصاحت ہے لہذا ہندوستان کا ہر فرد بشر زبانِ اُردو مین وہ خصوصیت رکھتا ہے جو دوسرے کو نہین میسر سلیم الطبع نوجوان یا صلح پسند سادہ مزاج لوگ جو بعض اساتذہ کو مانتے ہین یہ اُنکا محض عقیدہ ہے اور اس عقیدہ کے اسباب اساتذہ کی علمیت مشق سخن اور کثرت معتقدین سے متعلق ہین۔ پھر طرہ یہ کہ اُردو مین ہر روز نئے انقلابات ہوتے ہین۔ آج جو لفظ مذکر ہے وہ کل مونث ہو جائیگا خواہ اس ایک لفظ کیلئے پوری ایک کتاب شائع کر دین اور دنیا بھر کی سندین اُسمین جمع کر دین آیا اس حیرت انگیز اختلافی کیفیت اور نااتفاقی کی ہمیت کا کوئی علاج ہے یا نہین۔ غور کرنا چاہئے اور غور کر کے ایک خاص معیار قائم کرنے کے بعد آزادِ اُردو کے اصول مقرر کرنا چاہئے ورنہ اس تدبیر سے پہلے جو شخص اُردو کا مربی بنتا ہے وہ بے عمل اور ناکامیاب ہے۔

ناطق لکھنوی

اساس الاخلاق ۔ یہ علم اخلاق کی ایک حکیمانہ تالیف ہے جس کے مولف ہمارے دیرینہ کرمفرما خان بہادر مرزا سلطان احمد خان صاحب ای - اے - سی ممبر مال ریاست بھاولپور ہین۔ اسمین واقعات کی بنا پر زوردار فلسفی دلائل سے انسانی زندگی کے تہذیب و شائستگی کے ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ قوم کی زندگی کے لئے کس قسم کے آداب و اخلاق ضروری و مفید ہو سکتے ہین اور ان کا اصول فلسفہ کیا ہے۔ مشرقی زبانون مین اس موضوع کی یہ پہلی کتاب ہے جو اس صدی مین علم اخلاق کی حقیقت پر تالیف ہوئی ہے۔ ادیب کی کسی آیندہ اشاعت مین ہم اسپر مفصل ریویو درج کرینگے۔

"اساس الاخلاق" کا حجم قریباً ساڑھے سات سو صفحات ہے۔ قیمت عہ ر۔ شائقین وکیل ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ امرتسر (پنجاب) سے طلب فرمائین۔

قاعدہ

جب انسان مشاہدہ اور مشاہدات مین ترقی کرتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ اس بات کا معترف ہوتا جاتا ہے کہ دُنیا مین کوئی کام اور کوئی حرکت بے قاعدہ نہین ہو رہی ہے - جو کام ہو رہا ہے اور جو حرکت ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی قاعدہ کے ماتحت ہے اگرچہ کبھی کبھی ظاہر مین اسکے برعکس لمحہ بھر کے لئے خیال کیا جا سکتا ہے - لیکن جب امعان نظر سے دیکھا جاتا ہے تو اپنی غلطی کا اقرار کر کے یہ ماننا پڑتا ہے کہ کون کام اور کون حرکت بے قاعدہ نہین ہوتی - یہ جدا بات ہے کہ ہمین بعض قواعد کی سمجھ نہ آئے یا ہم بعض قواعد کی تہ تک نہ پہونچ سکین لیکن یہ نہین کہا جا سکتا کہ دُنیا کا کارخانہ بے قاعدہ چل رہا ہے -

دُنیا کی حالت انفرادی اور مجموعی رنگ مین قواعد کی پابند ہے - جون ہی قاعدہ مین فرق آتا ہے یا کوئی عمل بے قاعدہ ہونے لگتا ہے معاً غرض خلقت مین بھی فتور شروع ہو جاتا ہے -

اگر ہم یہ مان لین کہ دُنیا اور دُنیا کا کام بے قاعدہ اور بے ترتیب چل رہے ہین یا وہ بے قاعدہ اور بے ترتیب چل سکتے ہین تو اُسکے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ گویا دُنیا یا دُنیا کا کارخانہ ہی موجود نہین ہے یا دُنیا کی ہستی معرض زوال مین آ گئی ہے -

دُنیا اور دُنیا کے تمام کارخانے بجائے خود ایک متمدن آبادی ہے جسکے ہر رنگ مین اقتصادی آمیزش پائی جاتی ہے اور ہر حالت مین ایک ترتیب اور وضعیت موجود ہوتی ہے ایک تنکے سے لیکر عظیم الشان پہاڑ تک اور زمین سے لے کر آسمان تک تمام مخلوق چند قاعدون کی زنجیرون سے اس خوبصورتی سے جکڑی ہوئی ہے کہ ایک کڑی کا بھی ادھر اُدھر ہو جانا ایک عظیم فساد کا موجب ہے - قدرت یا قانون قدرت نے اپنی ذات کو ان بندشون اور پابندیون مین کیون جکڑ رکھا ہے ؟ کیا اسواسطے کہ وہ ان پابندیون کے بغیر کام نہین چلا سکتی ؟ یا اسواسطے کہ وہ اپنی ہی ذات مین یہ قوت یا یہ عمل رکھتی ہے ؟ میری راے مین قدرت ہی کی ذات مین یہ عمل اور یہ قوت موجود ہے -

قدرت یا قانون قدرت تمام ہی چند قواعد یا چند ضابطہ کا ہے - قانون قدرت کیا ہے ؟ چند قواعد اور چند ضوابط یا قانون قدرت کیا سکھاتا ہے ؟ اُن قواعد کی پابندی اور اُن ضوابط کا تقید - اگر صحیفۂ قدرت کھولکر دیکھا جاے تو اُسکے اوراق اُسکے صفحات اُسکی سطرین اُسکے الفاظ - اُسکے حروف قواعد و ضوابط بھی ثابت ہونگے -

زنجیر مین قانون قدرت کی ایک ایک کڑی ایک ایک قاعدہ اور ایک ایک ضابطہ ثابت ہوگی - ہر کڑی زبان حال سے کہیگی کہ مین ایک قاعدہ اور ایک ضابطہ ہون اور مین اُس بڑے مجموعہ کی ایک مسلمہ دفعہ ہون جسکو دوسرے الفاظ مین قانون قدرت کہا جاتا ہے -

انسان کا جسم بھی بجاے خود ایک چھوٹی سی دُنیا یا چھوٹی سی آبادی ہے - کیا انسان غور اور خوض کرنے کے بعد یہ کہہ سکتا ہے کہ اُسکی اس آبادی اور بستی کا کام بغیر کسی قاعدہ کی پابندی کے بخوش اسلوبی چل سکتا ہے - کیا وہ یہ نہین دیکھتا کہ

جب کبھی وہ قاعدہ سے باہر ہوتا ہے تو اُسکی اس بستی یا آبادی پر فوراً ایک آفت آجاتی ہے اور اُسکی زندگی کا سارا سلسلہ بگڑنے لگتا ہے۔

خاندان - کنبہ - قوم اور شخصیت بھی ایک آبادی یا بستی ہے اور مجموعی رنگ مین ان سب کا ایک جسم یا ہستی تسلیم کرنا پڑتی ہے - یہ بھی اسی صورت مین بخوش اسلوبی چل سکتی ہین جب انھیں قاعدہ کی حمایت مین رکھا جائے۔

جن قومون اور جن ملکون مین قواعد کی پابندی کا سوال بے غرضی سے سنا جاتا ہے اور اسپر کوئی توجہ نہین کیجاتی وہ قوم اور وہ ملک تمدن اور اقتصاد کی ان ضرورتون سے تقریباً ناآشنا اور نابلد ہوتا ہے جنسے واقف ہونا لابدی خیال کیا گیا ہے۔

انسان کا کوئی کام اور کوئی مہم اُسوقت تک بخوش اسلوبی انصرام نہین پاتی جب تک کسی قاعدہ کے ماتحت اُسے نہ رکھا جائے۔ صرف دُنیاوی تعلیمات ہی یہ سبق نہین دیتی ہین بلکہ مذہبی اشارات بھی یہ راہ دکھاتے ہین - عبادتون اور عبادتون کے اوقات کا تعین، ریاضتون اور ریاضتون کی کمی بیشی کے اصول وغیرہ وغیرہ اسی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہین - فصلین ایک وقت پر بوئی جاتی ہین اور دوسرے وقت پر کاٹی جاتی ہین - ایک قاعدہ سے دانہ اور غلہ صاف کیا اور نکالا جاتا ہے اور ایک قاعدہ سے اُسکا استعمال کرتے ہین صبح سے لیکر شام تک جسقدر کام ہم کرتے اور جسقدر حرکات ہم سے سرزد ہوتی ہین اُن سب کا میلان کسی نہ کسی قاعدہ اور ضابطہ کی جانب ہوتا ہے۔

قانون قدرت ہمین بزور سکھاتا اور تعلیم دیتا ہے کہ جو قاعدہ مقرر کیا گیا ہے اُسکے مطابق عمل کیا جانا لازمی ہے - قواعد کی پابندی اور ضوابط کی تقید دوسرے الفاظ مین کیا ہے "وقت کی پابندی اور وقت کی قدر و منزلت" بدقسمتی سے ہمارے ملکون اور ہماری قومون کی حالت کیون بگڑی اور اُنکی تہذیب اور خوشحالی اور احترام مین فرق کیون آیا -

قواعد کی تحقیر سے -

ضوابط کی توہین سے -

وقت کی بے قدری سے -

قانون کی بے وقری سے -

عمل کی کمزوری سے -

ہمارا کھانا - پینا - لباس - سونا - جاگنا - اُٹھنا - بیٹھنا - ہنسنا کھیلنا - بات چیت - حکومت - سیاست وغیرہ وغیرہ کسی قاعدہ اور کسی ضابطہ کی پابند نہین رہی ہے - اگرچہ ہم مین قواعد اور ضوابط ہوتے ہین اور ہم اُنکی تدوین اور تکوین مین بھی بہت کچھ حصہ لیتے ہین - لیکن جب اُنپر عمل کرنے کی نوبت آتی ہے تو ہم انواع واقسام کے حیلے حوالون سے صاف نکل جاتے ہین - قاعدہ بنانے کے وقت اگرچہ ہماری طبیعتون اور ہمارے قلمون مین بلا کا زور اور جوش ہوتا ہے - لیکن عمل کرنیکے وقت ہم بالکل نرم اور مدھم پڑجاتے ہین -

سوسائیٹیون - مجلسون - خاندانون - کنبون اور حکومتون مین ایسا طریقہ ہمیشہ اختیار کیا جاتا ہے جس سے قواعد و ضوابط مجریہ کی سخت تحقیر ہوتی ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے یہان قانون اور ضوابط کی کوئی قدر و منزلت ہی نہین -

ہم جو کام کاج شروع کرتے ہین اور جو بنیاد رکھتے ہین اگرچہ اُنکے چلانے اور قائم رکھنے کے واسطے صدہا قواعد

بناتے اور پابندیان لگاتے ہین۔ لیکن عمل کے وقت اخیر تک بچاتے ہین۔ ہمارا حکمران اور راجہ یا نواب ایک قاعدۂ انصاف مرتب دیتا ہے لیکن خود ہی اُسکے خلاف کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ایک سوسائٹی خود ہی ایک قاعدہ ترتیب دیتی ہے اور خود ہی وقت پر اُسکے خلاف کرتی ہے۔ ہمارے قواعد اور ہمارے ضوابط میزون کے کونون ہی مین بن ٹھنکر رہ جاتے ہین۔ ہم بڑے زور سے ایک قاعدہ کا اعلان کرتے ہین اور بڑی بزدلی سے عمل کیوقت اُس سے انحراف کر جاتے ہین۔

اگر دیسی امارتون کے تنزل کے اسباب فیصدی پچھتر کچھ اور ہون گے تو اُنمین سے پچیس ضرور قواعد کی تحقیر ہونگے۔ ہمارے ملک مین جو جج اور جو مجسٹریٹ پوری ایمانداری سے یہ پابندی قواعد اور قانون کام کرنے کا عادی ہو وہ بجائے تحسین و آفرین کے ہمیشہ مورد الزامات ہی رہتا ہے۔

جو شخص سوسائٹی مین قواعد کے اقتدار سے کام کرے وہ نکو بنایا جاتا ہے اور اُسکی بات بات پر نکتہ چینی اور گرفت ہوتی ہے اور پھبتیون سے اُسکا دم بند کر دیا جاتا ہے قانون ایک کھیل سمجھا جاتا ہے اور ضابطہ ایک شغل۔ چنانچہ بڑے بھی بڑے کامون مین اسوجہ سے ابتری نہین پیدا ہوتی بلکہ چھوٹے چھوٹے امور مین بھی اسکا اثر ظاہر ہو رہا ہے۔

ہم دیسی وقت کی پابندی نہ کرنیکے واسطے مشہور ہین ہم اب خود ہی کہنے لگے ہین کہ جو وقت مجلس یا دعوت اور ضیافت کا مقرر کیا گیا ہے یہ دیسی وقت ہے یا انگریزی وقت؟ گویا ہم خود بھی احساس کرتے ہین کہ انگریزی وقت وہ ہے جسمین تکلف نہین ہونا چاہیے یا نہین ہو سکتا اور دیسی وقت وہ ہے جسمین تکلف ہو جانا کوئی بات نہین اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ اعتراف کیا ہمین قومون مین کھڑا ہونے کے قابل رکھتا ہے اور کیا ہم یہ کہہ سکتے ہین کہ ہماری قوم مین وقت کی پابندی قانون یا ضابطہ اور وعدہ کی پابندی کا کوئی خیال ہے۔

قومون کی ترقی اور عروج کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ لوگ قاعدہ کی پابندی لازمی سمجھین۔ محنت کے وقت محنت کرین اور کھیل کے وقت کھیل کھانے کے وقت کھانا کھائین اور سونے کے وقت سوئین۔ بولنے کے وقت بولین اور خاموشی کے وقت خاموش رہین۔ کام کرنیکے وقت کام کرین اور آرام کیوقت آرام۔ جو قانون بنائین اور جو قواعد وضع کرین سب سے اول خود اُسکی پابندی کرین۔ جو لوگ ایسی پابندی کے عادی ہون اُنکی حوصلہ فزائی کرین اور اُنکی ہمت بڑھائین۔ جو قومین ہمارے مقابلہ مین ایسا کر رہی ہین اُنسے عملی سبق لین۔

اگرچہ دنیا کی عمر صدہا سال کی ہوگی لیکن ابتک سورج اور چاند نے اپنی چال نہ بدلی ایک ہی طرح پھر رہے ہین اور ایک ہی قاعدہ کے پابند ہین۔ قاعدہ کی پابندی سے یہ مراد نہین کہ اگر اُسمین کوئی نقص ہو تو اُس حالت مین بھی اُس سے کام لیا جائے مطلب یہ ہے کہ جو قاعدہ بصورت افادت وافاضت تسلیم کر لیا گیا ہو اُسکی پابندی لازمی قرار دیجائے۔

یاد رکھو کہ کوئی قوم اُسوقت تک تمدن اور تہذیب و خوشحالی مین ترقی نہین کر سکتی جبتک وہ اپنے ضوابط کی خوبصورتی سے پابند نہو گی عملی ٹرین قاعدہ سے چلتی ہے اور قاعدہ ہی اُسکی زندگی ہے۔

سلطان احمد

پھولون کی زندگی

شہد کی مکھیاں پھولون کا رس چوس کر اپنی زندگی بسر کرتی ہین لیکن اسطرح کے ہزارون ننھے ننھے کیڑے ہین جو دن رات اسی دُھن مین لگے رہتے ہین۔ خیال ہوگا ان چھوٹے چھوٹے کیڑون کی غذا کو قدرت نے پھولون مین کسی غرض سے پیدا کیا ہے اسی سوال کے حل کرنے مین ننھے کیڑون کی ناچیز ہستی معنی خیز معلوم ہوتی ہے - ہماری نظرون کے سامنے ایک نیا عالم دکھائی دیتا ہے اور اسرار فطرت کے سربستہ راز کے کھلنے کا تماشہ نظر آتا ہے - عالم اسباب مین کوئی شئے ایسی نہین ہے جسکو کسی دوسری شئے سے تعلق نہو - ہر چیز کو ایک نہ ایک چیز سے لگاؤ ہے - لیکن قدرت نے اس لگاؤ کو کچھ ایسا گہرا رکھا ہے کہ ہر موقع پر وہ ہماری سمجھ مین نہین آتا ہے شہد کی مکھیون کو پھولون سے کیا تعلق ہے اسکو سب آسانی سے سمجھ سکتے ہین لیکن قبل اسکے پھولون کی زندگی اور اُنکے وجود مین آنیکی غرض کو سمجھ لینا ضروری ہے -

قدرت نے درختون مین پھول اس غرض سے لگائے ہین کہ اُن مین پھل آئین اور پھل مین تخم پیدا ہون جس سے اس درخت کی نسل کا سلسلہ قائم رہے - لیکن بقاے نسل کے لئے خدا نے ہر چیز کا جوڑا خلق کیا ہے - اُن مین ایک مادہ اور دوسرا نر ہوتا ہے - یہ سُنکر حیرت ہوگی کہ عالم نباتات مین بھی قدرت نے نر اور مادہ بنائے ہین اور اُنکی مختلف انواع ہین - کوئی نوع ایسی ہے جسمین زنانہ اور مردانہ درخت جُدا جُدا ہوتے ہین جب تک دونون قسم کے درخت ایک جگہہ نہون اُنمین پھول آ کر مرجھا جاتے ہین اور پھل نہین لگتا ہے چنانچہ یہ مشہور نقل ہے کہ جب اسٹرابیری (Strawberry) کا پودا ولایت مین دوسرے ملک سے لاکر لگایا گیا تو اُسمین پھول تو خوب آئے لیکن پھل نہین آیا - جب تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ درخت مادہ تھا جسکا جوڑا (نر) ولایت مین موجود نہین تھا - آخر جب دوسرا پودا لاکر لگایا گیا تو زنانہ درخت جسمین پھول آ کر مرجھا جاتے تھے پھلنے لگا اور ایک نہایت خوش ذائقہ ثمر پیدا ہوا - دوسری قسم درختون کی وہ ہے جسمین پیڑ تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن اُسکے پھول دو طرح کے ہوتے ہین - کسی شاخ مین زنانہ اور کسی شاخ مین مردانہ پھول کھلتا ہے اور جب تک ان دونون قسم کے پھولون مین وصل نہین ہوتا درخت بارور نہین ہوسکتا ہے - کچھ پودے ایسے ہوتے ہین کہ اُنکے ہر ایک پھول مین دونون باتین موجود ہوتی ہین - ایک حصہ مردانہ اور دوسرا زنانہ ہوتا ہے - لمبے لمبے ڈنٹھل جو پھولون کے اندر ہوتے ہین وہ تو نرینہ ہین اور اندرونی حصہ جو کٹوری ایسا ہوتا ہے وہ اُنکا رحم ہے - ڈنٹھل مین زرگل پیدا ہوتا ہے جسکو پھولون کا زیرہ کہتے ہین - جب یہ زیرہ پک کر تیار ہو جاتا ہے تو جھڑ کر پھولون کے رحم مین گرتا ہے جس سے وہ حاملہ ہوتے ہین اور اُنمین تخم پیدا ہوتا ہے - غرض اسطرح کے درخت جنکے پھول خود بخود بلا کسی واسطہ یا لگاؤ کے حاملہ ہو سکتے ہین وہ اپنی زندگی کے فرض کو آسانی سے انجام دے جاتے ہین لیکن ان درختون کے لئے جنکے زنانے اور مردانے پھول الگ الگ ہوتے ہین

کسی نہ کسی لاگ کی ضرورت ہوتی ہے اسلئے کہ زرگل جو مردانے پھولون مین پیدا ہوتا ہے زنانے پھولون کے رحم مین بلا کسی توسل کے نہین پہونچ سکتا ہے۔ ایک حد تک تو اس ضرورت کو ہوا کے جھونکے انجام دیتے ہین یعنی مردانے پھولون سے اُسکے باریک ریزون کو اڑا کر زنانے پھولون کے رحم مین پہونچاتے ہین جس سے پھول حاملہ ہوتا ہے لیکن سچ پوچھو تو یہ خدمت قدرت نے ننھے ننھے کیڑون کے سپرد کی ہے جو رس چوسنے کے لالچ مین دن رات پھولون پر جھکے رہتے ہین۔ یہ کیڑے ایک پھول سے اُڑکر دوسرے پھول پر جاتے ہین اور اسطرح زرگل کو جو اُنکے پرون مین چمٹ جاتا ہے مردانے پھول سے زنانے پھول مین پہونچاتے ہین جس سے درخت بارور ہوتا ہے اور اُنکی زندگی کی ایک بڑی ضرورت انجام پاتی ہے۔ تمہاری شہد کی مکھی جو انھین چھوٹے کیڑون مین شمار کی جاتی ہے حسینانِ چمن کی ایک چالاک قاصد ہے جو اُنکے پیغام وصل کو پہونچایا کرتی ہے اور آخر عاشق اور معشوق پھولون کے وصل کی باعث ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدائی اس ننھی مخلوق کی محنت کا جو پھولون کے فرض زندگی کے انجام دینے مین اسطرح سرگرم رہتی ہے آخر معاوضہ کیا ہے۔ اس سوال کے جواب مین تمکو سنکر حیرت ہوگی کہ ننھے کیڑو نکو ترغیب دیکر بلانے کے لئے عالم نباتات مین طرح طرح کے سامان موجود ہین جو جادو کا اثر رکھتے ہین پھولون کی دلفریب رنگ آمیزیان اُنکا بناؤ سنگار، اُنکی مست خوشبو یہ کل سامان زیبایشی چھوٹے کیڑون کو لبھانے کے لئے ہین۔ جسوقت کیڑے پھولون کی شوخ رنگت کو دُور سے دیکھتے ہین تو اُنکا دل بے چین ہو جاتا ہے اور عالم بے خودی مین پھولون پر آآکر گر پڑتے ہین۔ کہین یہ انتظام ہے کہ پھولون کی خوشبو کی لپٹ دُور دُور جاتی ہے اور کیڑون کو ایسا مست کردیتی ہے کہ وہ بے ساختہ اُڑے چلے آتے ہین۔ غرض جب اسطرح کیڑے پھولون مین پہونچ جاتے ہین تو اُنکو اپنی دعوت کا عجیب وغریب سامان نظر آتا ہے۔ کھانے کو زرگل اور نوش کرنے کو شیرین اور خوشگوار عرق ملتا ہے جو پھولون مین افراط سے بھرا رہتا ہے۔ ننھے مہمان طرح طرح کی لذیذ غذاؤن کے فطری خوان کو دیکھکر پھولون مین اٹک جاتے ہین۔ پھول اپنے تازہ وارد وحشی مہمانون کو مانوس کرتا ہے اور شدہ شدہ رازدار بنا لیتا ہے۔ کیڑے رس چوسنے کی لالچ مین پھولون کی کٹوری کے اندر گھس جاتے ہین جس سے اُنکا تمام بدن پھولون کی دھول مین اَٹ جاتا ہے اور وہ اسطرح پھول کے زیرہ کو لیکر باہر اُڑتے ہین اور اُسکو زنانے پھولون تک پہونچاتے ہین جس سے وہ حاملہ ہوتا ہے۔ جب پھولون کی زندگی کا فرض اسطرح انجام پا جاتا ہے تو وہ مرجاتے ہین۔ سامانِ دعوت ختم ہو جاتا ہے اور ننھے مہمان افسردہ دل اپنے گھرون کی راہ لیتے ہین۔

سید راحت حسین، بی۔ اے

سری کرشن جی

گرچہ بعض نیلگون این چرخ بسیار آورد
کم بزاید مادرے با این صفا دُرّ یتیم

پیارے ہندوستان کی نسبت تنقیدی اصلی اور حقیقی معیار سے اغماض ایکے خواہ کچھ ہی نتیجہ کیون نہ اخذ کیا جاے۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ پوتر استھان اور رشیون منیون کی سرزمین خداے تعالیٰ کے بے شمار فضلون اور رحمتون کی حقیقی اور جائز وارث رہی ہے اور اب بھی اسمین اُنکے جذب کرنے کے جوہر موجود ہین۔ بشرطیکہ اُسکے لائق اور ہونہار فرزندون کی مفید اور بابرکت زندگیون کے قابل قدر نمونون کو خضر راہ تسلیم کرکے نقل وحرکت کیجاے۔ اسلئے ضرورت ہے کہ یہان کے نیکون اور قابلِ قدر انسانون کے حالات کی تصویر کھینچی جاے اور برادرانِ وطن کو اُنکی پاک سیرت اور زرین لائف سے مستفید ہونے کے لئے خوشنما پیرایہ مین اُنکے قصص پیش کئے جائین۔ یہی وہ وجہ ہے کہ ہمنے اس مقصد کے لئے ہندوستان جنت نشان کے بعض ایسے بزرگون کے حالات کو تنقیدی نظر سے مع مفید اور نتیجہ خیز امور کے برادران وطن کے آگے پیش کرنا ضروری سمجھا کہ جنکی عظمت ہزارون برس سے کرورون انسانون کے دلون مین جاگزین ہے اور جسکے ذیل مین ہم سب سے پہلے سری کرشن جی کے مبارک حالات کو پیش کرنیکا دل مین بے حد جوش پاتے ہین

پیارے کرشن کی زرین لائف مین اگرچہ خودغرضی سے بڑے بڑے سیاہ داغ ڈالے گئے ہین اور خصوصاً ایسے خطرناک طور پر جس سے آپکی مقدس شکل وصورت کو کوئی بے عیب اور نورانی یقین نہ کر سکے۔ لیکن حق یہ ہے کہ پاک اور مطہر انسانون کی شکلون اور صورتون کو خواہ کسیقدر کیون نہ بگاڑا جاے اور سیاہ سے سیاہ پردے کیون نہ حائل کئے جائین حقیقت شناس اور غائر نظرون سے وہ چھپ ہی نہین سکتے اور ایک وقت آجاتا ہے کہ تنقیدی معیار سے اُنکی زرین لائف بالکل پاک وصاف قرار دیجاتی ہے اور اُنکا اصلی اور حقیقی چہرہ ویسا ہی چمکتا اور دمکتا ہوا نظر آنے لگتا ہے۔ جیسا کہ فی الحقیقت وہ ہوتا ہے۔ اسی خیال سے ہم ذیل مین سری کرشن جی کی مطہر لائف کے چند نمونے مشتے از خروارے پیش کرتے ہین۔ ممکن ہے کہ کسیکو اسنے فائدہ پہونچ جاے اور ہماری محنت ٹھکانے لگے۔

پہلا واقعہ

ہر ایک واقف اس امر سے متفق ہے کہ آپ کی ولادت سے پہلے آپ کے نانا مہاراج اگرسین سخت تر بے رحمی اور ظلم وستم کا تختۂ مشق بنائے گئے تھے اور بلا قصور تاج وتخت سے بے دخل کئے گئے تھے اور یہ سب ظلم وستم ڈھانے والا کرشن جی کا ماموں تھا جسکا نام کنس تھا۔ ظالم کنس نے نہ صرف اپنے بے گناہ والد ہی کی پگڑی اُتاری تھی بلکہ اپنے بہنوئی اور بہن (والدین کرشن جی) پر ظلم وستم کے پہاڑ اس بے رحمی اور سنگدلی سے توڑنے شروع کئے تھے اور اُنکی اولاد کے ناحق ونا روا قتل پر اس بے رحمی سے کمر باندھی تھی کہ اسکو

خیال مین لانے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہین اور دل مین ایک خاص قسم کا درد پیدا ہوتا ہے۔ خواہ بالغ اور عاقل انسان ظلم و ستم کے تختۂ مشق بنکر ایک حد تک صبر کرین اور قدرت انکو صبر تحمل اور برداشت کا عادی بنادے مگر معصوم بچّون پر ناحق ظلم و ستم انسان کو واقعی دوزخ کا سزاوار بناتے ہین اور یہی وجہ ہے کہ کنس کی کوئی تدبیر پیش نہ گئی اور خدائے کریم کو اپنے فضل و کرم سے محفوظ رکھکر جس سے کام لینا تھا اُنکا وہ بال بیکا بھی نہ کرسکا۔

کنس نے اگرچہ کرشن جی کے والدین کو اُنکی کوئی اولاد زندہ نہ رکھنے کی غرض سے نظر بند کیا تھا مگر مشیت ایزدی نے چونکہ اُنھین کو دنیا کی فلاح و بہبودی کے لئے چنا تھا اسلئے کنس کی تمام کوششین بیکار کرکے مہاراج بلرام اور کرشن جی کو صحیح و سلامت اور جیتا جاگتا رکھا اور سب سے پہلے آپ سے وہ کام لیا جو عین حکمت، عین مصلحت، اور عین انصاف تھا یعنے مہاراج اُگرسین کا دوبارہ تخت شاہی پر بیٹھکر عدل و انصاف سے رعیت کو سرفراز کرنا اور کنس کے خطرناک پنجۂ فولادی سے خلق خدا کا عموماً اور کرشن جی کے والدین کا خصوصاً رہائی پاکر زندگی کے دن امن چین سے پرماتما کی یاد مین گذارنا۔

دوسرا واقعہ

راجہ جراسندھ والی مگدھ نے کچھ عرصہ سے ایسا سر اُٹھایا تھا اور تقریباً ایک سو کشتری خاندان کے راجون مہاراجون کی آئے دن کی وقت بے وقت کی چڑھائی سے طاقتون اور قوتون کو اسطرح پامال کیا تھا کہ خدا کی پناہ۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ آئے دن کی چڑھائی اور وقت بے وقت کے حملے انسان کو پنپنے نہین دیا کرتے۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ مذکور نے تقریباً ایکسو راجون کو شکست دیکر قید کرلیا اور اسکے باعث غرور تکبر اور گھمنڈ اور خودسری مین یہانتک ترقی کرگیا کہ جو جواہرات راجون مہاراجون کے تاجون کی زینت کا موجب تھے اُنھین نذر مین لیکر بھی خوش نہین ہوتے تھے۔

متھرا پوری (مہاراج کرشن کی جائے پیدائش) پر جہان کنس کے بعد کرشن جی کے نانا اور اصلی حقدار مہاراج اُگرسین کا عادلانہ راج تھا اُسپر اُسنے متعدد دفعہ چڑھائی کی مگر تقدس مآب کرشن کے حسن تدابیر سے ہر بار شکست فاش کھاکر حسرت اور یاس سے اُسکو واپس ہونا پڑا۔ لیکن جراسندھ اس قسم کی فطرت ہی نہین رکھتا تھا کہ شکست کھاکر امن سے زندگی کے دن گذارے بلکہ وہ شکست کھانے کے بعد پھر جمعیت کو از سر نو مضبوط کرکے سینہ سپر ہوکر شکست کا قرار واقعی بدلا نکالنے کے لئے سخت کوشش کیا کرتا تھا۔ چنانچہ جب اُسکی آخری شکست کے بعد دوبارہ آمد اور چڑھائی کا حال سری کرشن کو معلوم ہوا تو آپ نے آئے دن کے جھگڑون کو مٹانے کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ متھرا پوری سے ہجرت کرکے کسی اور جگہ سکونت اختیار کرنا بندگان خدا کے کُشت و خون سے بہت بہتر ہے اسلئے آپ نے صرف امن پسندی کا قابل قدر نمونہ دکھانے کے لئے اور لوگون کو آئے دن کے قتل سے بچانے کے لئے متھرا کو خیرباد کہا اور اپنی قوم کو ایک اور مقام مین لا بسایا جسکا نام آپ نے دوارکا تجویز فرمایا اور یون آئے دن کے جھگڑون کو سرد کیا اور اپنی قوم کو امن و امان کا وارث بنایا جس سے آپ کی سچی امن پسندی، اور جبلی شرارت کے تپلون سے اعراض کرنے کا حال اظہر من الشمس ہوتا ہے۔ گویا آپ نے اپنے عملی نمونے سے یہ سبق دیا کہ جو خوا مخواہ خلق خدا کو کسی خاص جگہ کیوجہ سے

آنے اور قتل کرنے پر کمر باندھے ہوئے اور ایک مدت تک مقابلہ میں شکست فاش کھانے کے باوجود دوبارہ آنے تو انسانیت یہی ہے کہ اس جگہہ کو ہی چھوڑ دیا جائے اور یوں خلق خدا کو آئے دن کی ہلاکت سے محفوظ رہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کا وجود جیسا کہ ظالموں کی سرکوبی کے لئے تھا ویسا ہی امن و امان کا سبق دینے اور سچی راحت اور سرور کا وارث کرنے والا بھی۔

بہرکیف جراسندھ کے ذمہ یہ بڑا بھاری قصور ہے کہ اسنے ایک ایسی قوم کو جو اس سے پہلے ایک خطرناک ظالم سے بہت سا دکھ برداشت کرچکی تھی ناحق ذرا ذرا سی بات پہ ہلاک کرنے پر کمر باندھی مگر قدرت نے اسکو ایک سچے رہنما اور سچے ہادی کی بدولت اپنے منصوبے میں ناکام و نامراد رکھا۔ بلکہ اسکے علاوہ اپنی دوسری حرکتوں کا بھی اسکو خمیازہ بھگتنا پڑا۔ یعنی جن راجوں کو اسنے قید کیا تھا انکو رہائی دلانے کے لئے سری کرشن کے دل میں جوش پیدا ہوا۔ چنانچہ آپ مع ارجن اور بھیم کے صرف اسی اہم کام کے لئے اسکے پاس تشریف لے گئے اور جراسندھ کے سامنے جاکر اپنے آنے کی اصل غرض کو بڑی بہادری اور دلیری سے یوں بیان فرمایا کہ "ہم لوگ دھارمک ہیں۔ دھرم ہمارا جیون (زندگی) ہے۔ دھرم کی رکھشا کرنا ہمارا فرض ہے۔ پرمیشور نے ہمیں یہ سامرتھ (طاقت) دی ہے کہ دھرم کی رکھشا کرسکیں۔ پس یہ سامرتھ رکھتے ہوئے آپ کو آپ کے اعمال کی سزا نہ دینا دراصل اپنے آپ کو گناہ کے سمندر میں غرق کرنا ہے۔ ظالموں کا سر کچلنا اور مظلوموں کی مدد کرنا ہر ایک کشتری کا پرم دھرم ہے۔ اور اسی نیت سے ہم آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ کو سمجھائیں کہ آپ کشتریوں پر ظلم نہ کریں اور قیدیوں کو رہا کردیں ورنہ یاد رکھیں کہ ہمکو حق سے اسقدر پیار ہے کہ ہم حق کے لئے مرنے سے ہرگز نہیں ڈرتے کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ مظلوموں کی مدد کے لئے لڑنا دراصل دھرم کی لڑائی ہے اور دھرم کی لڑائی میں جو مرتا ہے وہ سیدھا سورگ (بہشت) کو جاتا ہے پھر فرمایا کہ اگر آپ اپنے آپ کو دنیا میں مہابلی سمجھتے ہیں تو بڑی غلطی کرتے ہیں کیونکہ اس سنسار میں ابھمان (غرور) کرنے والا انسان ضرور خسران میں کا وارث بنتا ہے۔ ایسے ہی اس دنیا میں بڑے بڑے مہابلی موجود ہیں۔ پس اے راجن بدی کے طریقے کو چھوڑ دے اور خدا کا خوف کر اور ان قیدیوں کو رہا کردے ورنہ ہم سے کشتی کرکے اپنی طاقت وقوت کو آزمالے تاکہ حق کا بول بالا اور باطل کا منہ کالا ہو۔ باوجود اس شائستگی سے سمجھانے کے جراسندھ باز نہ آیا اور ایک حقیقی خیرخواہ کی نصیحت سے منہ موڑکر کرشن جی اور ارجن کو تو کسی شمار و قطار میں نہ سمجھا اسلئے انسے کشتی کرنے کو اپنی ذلت کا موجب قرار دیکر بھیم کو اپنا مدمقابل سمجھکر لڑنے مرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ بھیم کے ہاتھوں اپنے بے جا غرور کے باعث ہلاک ہوا اور مہاراج کرشن نے سب سے پہلے قلعہ کا دروازہ کھولکر اور رحمت کے فرشتہ کی صورت میں قدم رنجہ فرماکر ان سب راجوں مہاراجوں کو قید سے رہائی دی جو جراسندھ کے ظلم وستم کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے اور اسکے بعد جراسندھ کے بیٹے کو راج تلک دیکر ثابت کردیا کہ دراصل آپ کا جراسندھ سے بیر محض بنی نوع انسان کی خیرخواہی کے لئے تھا اور وہ جراسندھ کے خاندان کے بھی دل سے خیرخواہ تھے

تیسرا واقعہ

آپکی زندگی کے واقعات میں سے ایک قابل قدر واقعہ پراگ جیوتش دارالخلافت کامروپ (آسام) کا ہے جسکی مختصر

کیفیت یہ ہے کہ وہان کے راجہ سمی نرک نے اسقدر سر اُٹھایا تھا اور ایسی شرارت اور ظلم وستم پر کمر باندھی تھی کہ جسکی عورت کے حسن وجمال کا چرچا سُنتا یا دیکھتا اور ایسے ہی جو کسی کی اچھی چیز اُسکے ملاحظہ مین آتی زبردستی اُس سے چھین لیتا۔ ایک عرصہ تک اس قسم کے ظلم وستم برداشت کرنے کے بعد اُس علاقہ کے لوگ مہاراج کرشن کی جناب مین فریادی ہوئے۔ آپ نے نرک پر چڑھائی کی اور پہلے اُسکو ان حرکات ناشایستہ سے منع فرمایا۔ جب وہ باز نہ آیا بلکہ ناصح مشفق کی نصیحتون سے مُنہ موڑا اور اپنے بل بوتے کا گھمنڈ ظاہر کیا تو آخر لڑائی تک نوبت پہونچی اور اپنے کیفر کردار کو پہونچا۔ نرک پوری کو سدھارا اور مہاراج نے سیدھا اُسکے محل کیطرف رخ کیا اور جبر وتعدی وظلم وستم سے جسقدر عورتین وہان محصور تھین اُن سب کو رہائی بخشی۔ چنانچہ اُن عورتون کی تعداد سولہ ہزار کے قریب وشنو پران کے ادھیاے ۲۹ مین بیان کی گئی ہے۔

اس سے آپ کی اعلیٰ ہمدردی کا ثبوت ملتا ہے اور صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لڑائی محض دوسرون کی فلاح اور بہبودی کی خاطر کی گئی تھی۔ اپنا کوئی ذاتی فائدہ آپ کے مدنظر ہرگز نہ تھا۔

چوتھا واقعہ

آپ کی مبارک زندگی کا ایک واقعہ راجہ پونڈر وائی بنارس سے لڑائی کا بھی ہے جسنے کرشن جی سے خواہ مخواہ اس درجہ کا حسد وکینہ شروع کیا تھا کہ اوّل تو آپ کی جائز عزت و عظمت کو پامال کرنے اور لوگون مین آپ کا وقار کم کرنے کے لئے آپ کا جو لقب تھا (یعنے واسدیو) وہ اختیار کیا تھا۔ دوسرے حسد اور بغض سے بعض گستاخانہ پیغام بھی اکثر بھیجتا رہا تھا۔ تیسرے آپ کو مکار عیار وغیرہ بھی بیان کرتا رہا۔ مگر آپ نے اپنے نفس کے خاطر چڑھائی کرنے کا کبھی ارادہ نہین کیا اور ایسے معاملات مین قابل قدر حلم اور صبر کا نمونہ دکھایا۔ لیکن حسد بُری بلا ہوتی ہے۔ پونڈر نے آپ کے اخلاق فاضلہ سے سبق حاصل نہ کیا۔ بلکہ بجائے سبق حاصل کرنے کے آپ کے کیلاش یاترا پر جانے کے بعد چورون کی طرح دوارکا پر چڑھائی کرکے شبخون مارا۔ آخر صبر کی حد ہوتی ہے اسلئے مجبوراً آپ کو اسکی سرکوبی کیلئے نقل وحرکت کرنی پڑی اور راجہ پونڈر نے ناحق حسد وغرور تکبر اور نخوت مین گرفتار ہونے کا خمیازہ بھگتا اور یون ثابت ہوا کہ دراصل نیکون اور پارساؤن سے ناحق حسد وبغض کرنا اور اُنکے ستانے اور تباہ کرنے پر کمر باندھنا انسان کو قعر مذلت اور رسوائی وخواری کا وارث بناتا ہے۔

پانچوان واقعہ

آپکی مقدس زندگی کا سب سے بڑا واقعہ مہابھارت مین کا واقعہ ہے جسکے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ اس خونخوار اور بھارت ورش تباہی اور بربادی کی باد سموم پھیلانے والی لڑائی کے بانی مبانی سری کرشن ہی تھے۔ یعنی آپ ہی نے ارجن وغیرہ کو لڑنے کے لئے اُکسایا تھا۔ اگر آپ کی طرف سے لڑنے کی تحریک نہ ہوتی تو یہ خونخوار جنگ ہرگز وقوع مین نہ آتی۔ لیکن حق یہ ہے کہ آپ نے اس لڑائی سے باز رکھنے کے لئے طرفین کو جسقدر سمجھایا اور جسقدر کوشش بذات خود کی وہ اسقدر وزن دار ہے کہ آپ پر اسکا الزام لگانا خطرناک غلطی ہے۔

واقف حضرات اس امر سے کافی آگاہی رکھتے ہین کہ

پانڈوؤن کے ساتھ کوروؤن نے جو طریقہ اور رویہ اختیار کیا تھا وہ واقعی خطرناک ظلم کی حد تک پہونچ گیا تھا سب سے پہلے جو حرکت کوروؤن نے کی یعنے لاکھ کے محل مین آگ لگا کر پانڈوؤن کو زندہ جلا دینا۔ وہ ایسی ناقابل برداشت ہے کہ اُسپر جسقدر بھی افسوس کیا جاسے وہ تھوڑا ہے۔ ایسے ہی اُسکے بعد کے واقعات اور پانڈوؤن کی ترقی جاہ و مال متاع اور شان و شوکت کو دیکھکر کوروؤن کا آتش حسد مین جلکر مہاراج یدھشٹر کو چال بازی سے جُوا کھیلنے پر آمادہ کرنا اُنکی دوسری نازیبا حرکت تھی۔ پھر شریمتی دروپدی جی کو سر کے بالون سے پکڑ کر سبھا مین لانا تیسری سراسر شرارت تھی۔ ایسے ہی بارہ برس کے لئے بن باس کا فتویٰ پاس کرنا اور اُسمین خطرناک اور ناقابل برداشت شرائط مقرر کرنا یہ چوتھی شرارت تھی۔ بالآخر پانڈوون کے ہر ایک شرط کے ماننے اور بجا لانے کے باوجود اُنکو اُنکا حصہ نہ دینا نہایت ہی ظالمانہ حرکت تھی جو کوروؤن سے ظہور مین آئی۔

مقدس کرشن نے طرفین کی خیر خواہی مین ہرگز فرق نہین کیا۔ ہر طرح سے دونون کو سمجھایا۔ چنانچہ آپکی مبارک تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ پانڈو صرف پانچ گانون لیکر اپنا گذارہ کرنے پر راضی ہو گئے۔ لیکن کورو اپنی چال سے نہ چوکے۔ دریودھن کے سر پر کچھ ایسا حسد۔ کینہ اور خود پسندی کا بھوت سوار تھا کہ وہ راضی نہ ہوا۔ کرشن جی نے اُسکو سمجھانے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہین کیا۔ خود سفیر بنکر گئے۔ دھرت راشٹر مہاراج اور گندھاری جی (والدین دریودھن) کو سمجھایا۔ دوسر بزرگون کے ذریعہ دریودھن کو مآل پر نگاہ رکھنے کیطرف توجہ دلائی۔ مگر وہ نہ ماننا تھا نہ مانا۔ بلکہ خود کرشن جی کے خلاف ایسے خیالات ظاہر کرنے لگا جو ہر صورت مین قابل نفرت اور لائق ملامت تھے۔ جسپر بزرگون کو اُسکی پست خیالی پر بہت ہی افسوس ہوا اور بعض نے اُسکی خبر بھی لی۔

واقعات پر جہان تک نظر غائر ڈالکر انصافاً دیکھا جائے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سری کرشن کو سخت ترمجبور ہو کے بحالت مین بے انصافون اور ظالمون سے مقابلہ کرنے کے لئے ہدایت کرنی پڑی اور یون مہابھارت کی خونخوار جنگ نے جہان کورؤن کا تخم صفحۂ دہر سے حرف غلط کیطرح مٹا دیا وہان پانڈوؤن کو بھی خون کے آنسو رلانے سے مستثنیٰ نہ رکھا۔ جبکا اصل پوچھو تو سارا گناہ انصاف کے سیاہ دشمن دریودھن کی گردن پر ہے۔ جسنے حق اور راستی سے انکار کیا اور حقیقی ناصحون اور سچے خیرخواہون کی نصیحت پر کان نہ دھرے۔

کرشن مہاراج کی پوتر لائف کی داستان اگرچہ بہت لمبی ہے جسمین پہلا نمبر ظالم کنس کے مارنے کا ہے تو آخری مہابھارت کی گھور سنگرام (خونخوار لڑائی) کا۔ لیکن اس جنگ سے پہلے اور بعد کے واقعات اور خصوصاً دھرم راج مہاراج یدھشٹر کے آگے پند ونصائح کے انمول رتنون اور بے بہا خزانون کے جو دریا مہاراج نے بہائے تھے اور اُسکو عسر و یسر (تنگی اور فراغبالی) مین ایک خاص الخاص اسٹیج پر قائم رہنے کے لئے جسقدر قابل قدر کوشش کی ہے وہ واقعی اس لائق ہے کہ ہم مین سے ہر ایک اسکو اپنی زندگی کے لئے مفید اور بابرکت یقین کرکے اور خواب غفلت سے بیدار ہوکر عمل درآمد کرنے پر مستعد ہو جاسے۔

تقدس مآب کرشن کے پوتر ارشادات اور منوہر بچنون ہی سے در اصل مہاراج یدھشٹر دھرم راج بنگئے

تھے۔ اگر کرشن جی کا مبارک اور فائدہ بخش وجود پانڈوؤن کا پشتی بان نہ ہوتا تو پہلے مرحلے مین نہ سہی تو دوسرے مین تو ضرور ہے کہ پانڈو عدم کے راہرو بنجاتے۔ نہ تو اُنکی طاقت ہی کام آتی اور نہ کوئی تدبیر ہی اُنکو فائدہ پہونچاتی یہ توسچ ہے کہ دُنیا مین طاقت۔ قوت اور حُسن تدبیر انسان کے لئے بہترین مددگار ہین۔ لیکن حق یہ ہے کہ بغیر قابل قدر اور غیور خیرخواہون کے فلاح اور سلامتی کا راستہ بسا اوقات مسدود ہی رہتا ہے

مہابھارت کی جنگ سے جسقدر خطرناک خون ریزی واقع ہوئی اور اپنے بیگانے کٹ کر ڈھیر ہو گئے۔ اُسنے یدھشٹر جیسے نرم دل کا دل پھاڑ دیا۔ دُنیا اُسکی نظرون مین سیاہ اندھیری ہوگئی۔ وہ دنیا اور کار دُنیا سے دل برداشتہ اور سخت بیزار ہوکر اُسکو لات مارنے اور جنگل مین منگل منانے پر تیار ہوگیا۔ لیکن پیارے کرشن ہان دل و جان سے زیادہ عزیز مقدس کرشن نے جہان اُسکو اُسکا حق دلانے کے لئے سعی بلیغ کی تھی وہان اُسکو اُسکے اصلی فرض سے بھی اس آڑے وقت مین آگاہی بخشی اور سمجھایا کہ دراصل آپکا وجود اس دنیا مین محض جنگل مین منگل منانے کے لئے پیدا نہین کیا گیا۔ بلکہ آپ اسلئے پیدا ہوئے ہین کہ ہر ایک کے حقوق کی نگہداشت کرین اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے تن من۔ دھن سے جتن (کوشش) کرین۔ چنانچہ آپ کی مبارک نصیحتون کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراج یدھشٹر کے دل مین سنسارک جیو کی سچی خیرخواہی اور حقیقی فلاح کی روح داخل ہوگئی۔ اُنھون نے راج پاٹ سنبھالا اور خلق خدا کے لئے جو کچھ عادل اور نیک نہاد بادشاہون سے ممکن ہوتا ہے سب کچھ کیا اور کرتے رہے اور مہاراج کرشن اُنکو نیک ہدایات کرتے رہے۔

لیکن مہاراج کرشن کی بے وقت وفات نے پھر رنگ بدل دیا۔ دلون مین جو شانتی کی روح پھونکی گئی تھی۔ دفعۃً پرواز کرگئی۔ پانڈوؤن کے لئے نئی مصیبت اور نیا ماتم بپا ہوگیا۔ دنیا کی عیش و عشرت ایک حقیقی خیرخواہ کے بغیر سخت ترمصیبت کا سامان معلوم ہونے لگی۔

آپ کی ناگوار جدائی نے اسقدر بھی تاب و طاقت نہین رکھی کہ دُنیا کی دلفریبیون پر موہت (فریفتہ) رہین۔ اسلئے دل مین یہ جوش اُٹھا کہ دنیا اور عیش دنیا کو لات مار کر اور برف مین گل کر ایسی تلخ زندگی سے ہمیشہ کے لئے رہائی حاصل کی جائے۔ چنانچہ پانچون بھائی مع دروپدی کے صرف پیارے کرشن کی ناگوار جُدائی سے بیقرار ہوکر رشیون اور منیون کی پیاری سرزمین کیطرف روتے اور آہین بھرتے ہوئے نکل پڑے اور برف مین گل کر کہان سے کہان کو پہونچے۔

آہ! دنیا کی بے ثباتی۔ آہ!! پیارون اور حقیقی نیکون، ہان سچے خیراہون کی جُدائی کا ناگوار پیالہ بڑا ہی تلخ ہوتا ہے۔

اے پیارے کرشن! اے میرے محبوب کرشن!! اے سچے ہادی اور راستباز کرشن! اے میرے مولا کے محبوب کرشن!! اگر تم اپنے پربھو (مولا کریم) سے ملنے کے لئے جلدی نہ کرتے اور سنسار کو اپنے پوتر وجود سے خالی کرنیکا خیال آپ کے دل مین پیدا نہ ہوتا تو پانڈوؤن کی جان یون مفت مین ضائع نہ ہوتی۔ تمہاری بے وقت کی جدائی نے اُنکو خون کے آنسوؤن سے رلایا اور ایسا صدمہ پہونچایا کہ اُنکو اپنی زندگی کی گھڑیان تلخ اور تاریک اور بے لطف نظر

آسنے لگین۔

مہاراج کرشن کی مبارک زندگی سے ہمکو کیا کیا سبق ملسکتے ہین؟ غور فرمایئے۔

اوّل یہ کہ دنیا مین رہکر انسان کا فرض ہے کہ جہان وہ خویش و اقربا کی فلاح و بہبودی کے لئے کوشان ہو وہان اگر اپنے ظلم و ستم اور اپنے جابرو تشدد پیشہ بزرگ ہون اور بنی نوع انسان کو آئے دن ستانے، دُکھ اور ایذا دینے سے دریغ نہ کرین تو اُنکی مطلق پاسداری نہ کیجاے بلکہ علی الاعلان انکے خلاف ہونے کا ثبوت دینا فرض ہے۔

دویم یہ کہ بنی نوع انسان کے دُکھ اور درد کو ایسا ہی محسوس کیا جاے جسطرح اپنی جان پر سختی اور مصیبت آتی ہے اور اُنکو دکھ اور تکالیف سے رہائی دینے کے جائز وسائل سے کام لینا اپنے فرائض مین سے سمجھنا دراصل انسانیت کا راز سمجھنا ہے

سویم یہ کہ اپنے نفس اور ہوا و ہوس کے بالکل اَدھین (تابعدار) نہ ہو اور نہ اپنے نفس سرکش کی اسقدر رسّی دراز کیجاے کہ وہ جائز او ناجائز راہون کیطرف چلاکر خسران مبین کا وارث بنائے۔ پھر دشمنون کی ایذا رسانیون پر جہان ایک حد تک صبر کرنا ضروری ہے وہان اُسکو شوخ اور حد سے زیادہ بے باک ہونے کا موقع بھی نہ دینا فرائض مین سے ہے۔ وجہ یہ کہ اسکو نظرانداز کرنے سے خودداری کے قابل قدر اصول سے محرومی گلے کا ہار بن جاتی ہے۔

چہارم یہ کہ ہر ایک امر مین سختی سے پہلے نرمی کا پہلو اختیار کرنا فرض انسانی ہے۔ اگر نرمی او نصیحت سے کام نکل آئے تو سختی کرنا لاحاصل ہے۔ پھر انسان کے فرائض مین یہ بھی ہے کہ جہان وہ ہر ایک کام کے لئے خداداد طاقتون سے کام لیکر کوشش کرے وہان ہر ایک کام کے مآل کو سوچ کر کام کرے اور ایسے طریقے پر کہ جس سے اصل مقصد ہاتھ سے فوت نہ ہو۔ چنانچہ کرشن جی کا ارشاد پاک ہے کہ "انسان کا فرض ہے کہ جہان ہر ایک کام کے لئے اپنی طاقت اور قوت بھر کوشش کرے وہان اُسکا یہ بھی فرض ہے کہ وہ کیول ایک پرکھو کے ادھین اور ایشور پر آدھین ہوکر کام کرے"

غرضکہ یہ وہ چار سبق ہین جو ہم کرشن جی کی زرین لائف پر غور کرکے اخذ کرسکتے ہین گو یہ سچ ہے کہ آپکی مبارک زندگی سے بہت سے قابل قدر نمونے اخذ کئے جاسکتے ہین جنسے کسی نہ کسی رنگ مین بنی نوع انسان کو فوائد پہونچ سکتے ہین لیکن اس صورت مین مضمون کا بڑھ جانا ممکن ہے اسلئے سردست اسی پر اکتفا کرتے ہین۔

محمد حسین

ہندی ساہتیہ سمّیلن۔ گزشتہ سال جو ہندی کانفرنس بنارس مین منعقد ہوئی تھی، یہ اسکی کارروائی کی دوسری جلد ہے جو قریباً ڈیڑھ سو صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ اسمین وہ جملہ مضامین درج ہین، جو کانفرنس مین پڑھے گئے تھے۔ مضامین کی تعداد ۲۲ ہے اور سب اپنے اپنے موضوع پر لاجواب ہین "برتمان ناگری اکشرون کی اُتپتی" اور "ناٹک اور اُپنیاس" بہت عمدہ مضمون ہین۔ "دادو دیال اور سندر داس" کے بارے مین جو مضمون لکھا گیا ہے، وہ بہت سے نئے معلومات سے پُر ہے۔ سب سے زیادہ ہم نے جس مضمون کو پسند کیا، وہ "دیوناگری لپی" (با تصویر) ہے، جسکو پنڈت کیشوداس صاحب شاستری نے تحریر فرمایا ہے۔ ہم خوش ہین کہ ہندی زبان کے خیرخواہ اسکو ترقی دینے مین ہرطرح کی کوشش کرتے ہین، کاش اُردو والے بھی بیدار ہون۔ ہندی ساہتیہ سمّیلن کی قیمت صرف ۱۲ آنہ ہے۔ ملنے کا پتہ ہے۔ ناگری پرچارنی سبھا بنارس۔

میلہ دیوگر اڑیا

ہندوستان ایسے وسیع ملک مین بمشکل کوئی خطہ ایسا ہوگا جہان سال کے خاص خاص مواقع پر کوئی میلہ نہوتا ہو۔ یورپ مین بھی اس قسم کے سوشل مجمعون کا رواج پورے طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہان کے میلون اور تماشون سے ہزارون اور لاکھون تمدنی۔ اقتصادی اور تجارتی فوائد حاصل ہوتے ہین اور ہمارے یہان یہ سودمند باتین مفقود ہین تاہم اس سے کوئی انکار نہین کرسکتا کہ اس ملک مین جو مجمعے مختلف نامون سے مختلف اوقات کے اندر ہوا کرتے ہین انکی شان نزول بالکل وہی ہے جو آج یورپ و امریکہ مین خیال کی جاتی ہے۔ مثال کے لئے ملکن پور وغیرہ کے سالانہ جمگھٹے ظاہر کرسکتے ہین کہ کسی زمانہ مین ان سے کیا کیا تجارتی فائدے مترتب نہ ہوتے ہونگے۔ چھتر وغیرہ کے میلون مین اب بھی یورپ کی تجارتی منڈیون کا لطف آجاتا ہے۔ بحالت موجودہ اسمین کلام نہین کہ ان میلون سے کوئی مستقل اثر ہماری طرز معاشرت۔ تمدن اور تجارت پر نہین پڑتا۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ تعلیم اور تربیت کی کمی اور احساس ضروریات کے فقدان نے ہمین اس قابل ہی نہین رکھا کہ ان موقعون سے فائدہ اٹھانے کے وسایل اختیار کرسکین۔ اب یہ میلے جنکے نیک نیت بانیون نے انکے ذریعہ ملک کو گرانقدر نفع پہونچانا چاہا ہوگا معمولی تفریح گاہون اور بچون کے کھیل کود کی جگہ سے زیادہ وقعت نہین رکھتے اور اسلئے ان سے کوئی پایدار فائدہ اٹھانے کی توقع فضول ہے۔ تاہم اس گئی گزری حالت مین بھی وہ ہندوستان کی پرائیویٹ زندگی اور تمدنی کیفیت کا مرقع ہین۔ ممکن ہے کہ ہم آپ ان تماشون مین کوئی دلچسپی کی بات نہ پائین لیکن باہر والون کیلئے یہ گویا ایک آئینہ ہے جسمین ہندوستانی معاشرت کے خط و خال خود بخود نظر آتے ہین اور اُسے یہان کے باشندون کی ضروریات اور وضع و لباس کے متعلق بیرونی طور پر دریافت و تفحص کرنے مین سرگردان نہین ہونا پڑتا۔ کاش ہندوستان مین میلون کے انعقاد کے لئے یورپ و امریکہ کے اقتصادی اصول اختیار کئے جائین اور اُنکے ترتیب مین فائدہ مند طریقے اختیار کئے جائین تو ملک کی عام حالت پر عمدہ اثر پیدا ہوسکتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے تمہیدی سطور مین لکھا ہے ہندوستان کے ہر حصہ مین کم و بیش سال بھر کے اندر بیسیون میلے ہوتے ہین۔ اور ان سے اگرچہ کوئی معتدبہ نفع نہین پہونچ سکتا لیکن اُس حصہ ملک کی جہان یہ جمگھٹے ہوا کرتے ہین۔ معاشرتی و تمدنی زندگی کا صحیح و سچا عکس نظر آجاتا ہے۔ ہندوستان مین مالوہ اور مالوہ مین اندور قدامت کی حیثیت سے دلچسپ جگہین ہین ان مقامات پر ہندو حکومت اور اسلامی سلطنت کا دیرپا اثر اسوقت تک نمایان ہے اور اس اثر کی جھلک آج بھی بعض مواقع پر نظر آجاتی ہے۔ مثلاً مراسم محرم کے علاوہ عید و بقرعید کے میلون مین ہندؤن کی شرکت سے جہان اسلامی اقتدار کا اظہار ہوتا ہے۔ وہان یہ بات کہ ہولی مین بہت سے مسلمان گیہون کی بالیان جلا کر آغاز سال کا شگون ادا کرتے ہین، ہندو حکومت کا لازمی اثر سمجھنا چاہئے۔ یہ اثرات کسی

جبر و تشدد کا نتیجہ نہیں کہے جا سکتے بلکہ ان کا ہونا قانون قدرت کے عاقلانہ اصول و ضوابط پر مبنی ہوتا ہے۔

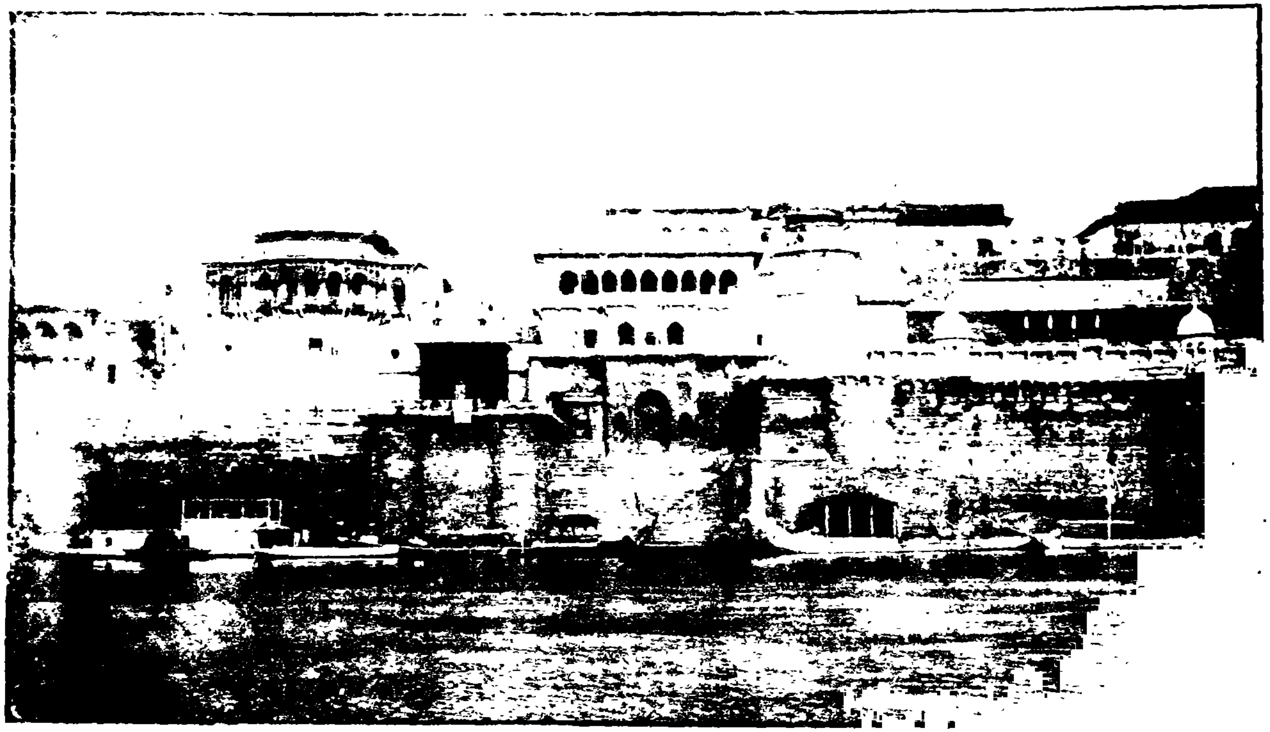
شہر اندور جسکو مہاراجگان ہلکر کے تخت حکومت ہونے کی امتیازی عزت حاصل ہے اسکے جنوب مشرق کے گوشہ میں ایک مختصر سا گاؤن دیوگڑا اڑیا آباد ہے۔ اندور کی آبادی سے کوئی چھ سات میل کا فاصلہ ہوگا۔ گو اس گاؤن کی حیثیت و وسعت چندان قابل وقعت نہیں لیکن اندور اور اسکے اطراف و اکناف میں اس چھوٹی سی آبادی کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ یہان ہر سال اواخر ماہ [illegible] مین ایک میلہ ہوتا ہے جسکی وجہ دیوگڑا اڑیا ایسے غیر معروف مقام مین بھی دو چار دن تک غیر معمولی چہل پہل ہو جاتی ہے۔

اس میلہ کے ایام مین دیوگڑا اڑیا کی رونق قابل دید ہوتی ہے۔ چارون طرف کے لوگ اردگرد سے آکر جمع ہوتے ہین اور تین دن تک یہ سنسان اور کم آباد جگہ اچھے خاصے شہر کی طرح آباد رہتی ہے۔ یہان کے میلون مین عموماً آپ وہ دلآویزی نہین پا سکتے جو شمالی ہند کے لئے ایک طرح کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن دیوگڑا اڑیا مین آنے سے جہان قدرتی مناظر کے سیر کا خاطر خواہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہان اس ملک کی دیہاتی زندگی کا صحیح اور سچا فوٹو بھی پیش نظر ہو جاتا ہے۔

اندور سے میلہ کے مقام تک پختہ سڑک گئی ہے چھاونی کے حصہ سے نکلنے کے بعد پُر فضا میدان ہین جنکی سینری سڑک پر چلنے والون کے قلوب پر خاص اثر ڈالتی ہے۔ موضع دیوگڑا اڑیا جسے چند خس پوش جھونپڑون اور دو چار سنگی مکانات کا مجموعہ کہنا زیادہ موزون ہوگا ایک پہاڑ کے دامن مین واقع ہے۔ ایک طرف مرتفع کوہی دیوار سے معمار قدرت کی اعلیٰ صناعی اور چابکدستی آشکار ہوتی ہے اور اسکے بالمقابل لق و دق میدان ہے۔ جہان موسم برشگال مین فطرت کی نیرنگیان قابل دید ہوتی ہین۔ اسی پہاڑ کی جڑ مین جسے دیوگڑا اڑیا کا پہاڑ کہتے ہین ایک مندر بنا ہوا ہے۔ اس مین مہادیوجی کی مورت رکھی ہوئی ہے۔ جسکے درشن کے لئے سال بھر مین ایک دفعہ یہان خلق اللہ کا کثیر ہجوم ہو جاتا ہے اور تین شبانہ روز جنگل مین منگل ہوا کرتا ہے۔

کوہستانی جگہ ہونے سے اگرچہ یہان کی زمین پست و بلند ہے لیکن ایک حد تک دوکانون وغیرہ کا سلسلہ منضبط ہوتا ہے۔ شہر والون کے نقطہ خیال سے گو اس میلے کی چیزین پسندیدہ نہین ہو سکتین لیکن باشندگان دیہات کی ضروریات کے مطابق ہوتی ہین۔ مین نے یہان ایک دوکان پر مٹی کے کھلونے دیکھے جو مجھے بہت پسند آئے۔ انسان اور جانورون کی مورتون مین صفائی کا کافی خیال رکھا گیا تھا اور اگر انمین رنگ کاری بھدے پن سے نہ ہوتی تو انگریزی کھلونون سے وہ کسی طرح کم نہ ہوتے۔

میلہ کے ہجوم مین اور ہجوم بھی کیسا مخلوط اور غیر منضبط، تجارتی پہلو سے کسی خاص چیز پر غور کرنا مشکل تھا۔ لیکن یہان کیلے کی پھلیان بکثرت دیکھنے مین آئین۔ دوکانون پر ڈھیر کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ اندور کے اکثر حصون مین ان کی افراط ہے اور اس لئے بہت ارزان بکتی ہین۔ میرا خیال ہے کہ ریاست اسکی کاشت سے خاطر خواہ نفع اُٹھا سکتی ہے۔ آجکل کیلے کے ریشون سے پارچہ بافی کا کام کامیابی سے لیا جا رہا ہے اور اس دستکاری کے رواج سے ریاست کو فائدہ پہونچنا ایک یقینی امر ہے۔



قلعۂ رام نگر (بنارس)

میلہ مین دیہاتی لوگون کا مجمع کثیر ہوتا ہے۔ ان کے زنانہ و مردانہ دونون لباس بہت محتاج اصلاح ہین۔ خصوصاً عورتون کی وضع سخت ناپسندیدہ ہے۔ عورتون کے زیورات مین جو ایک سر سے بھدّے اور وزنی ہوتے ہین۔ ایک چیز مجھے عجیب نظر آئی۔ اسے وہ لوگ اپنی زبان مین ریکھڑی کہتے ہین۔ اسکی شکل کم و بیش یون  ہوتی ہے۔ یہ سر پر لگایا جاتا ہے۔ حصہ (ب) سر کے اوپر آکر جمتا ہے اور (الف) اُٹھا ہوا رہتا ہے جسپر ساری کا دوسرا پلہ آکر پڑتا ہے اور اُسکے اندر سے یہ مخروطی مینار جھلکتا رہتا ہے۔ اس زیور کی اونچائی زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی انچ ہوتی ہے۔ لیکن بنجارہ قوم کی عورتون مین اس سے بھی زیادہ عجیب رسم ہے کہ وہ ایک بالشت کے برابر لکڑی لیکر اپنے سرون پر کھڑی کرتی ہین اور اُسپر دوپٹہ پڑا رہتا ہے۔ یہ منظر نہایت ہی مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ لیکن "ہر ملکے و ہر رسمے"

تیسرے دن میلے مین خاص طور سے رونق رہتی ہے۔ یہ آخری دن ہوتا ہے اور شہر و دیہات کی خلقت بکثرت آتی ہے۔ دفاتر ریاست مین آج کا دن تعطیل کا ہوتا ہے۔ مہاراجہ ہلکر بھی سرِ شام اپنے قدوم سے میلہ کو فیضیاب فرماتے ہین اور پوجا کرکے واپس تشریف لیجاتے ہین۔ ہم نے ابھی تک مندر وغیرہ کے متعلق کچھ نہین لکھا۔ حالانکہ اس میلہ کی جان وہی ہے۔ مذہبی حیثیت سے قطع نظر کرکے دیکھئے تو یہ عجیب دلچسپ مقام ہے۔ پائین کوہ مین مندر بنا ہوا ہے اور اُسمین مورت رکھی ہے۔ اسجگہ پہاڑ سے ہمیشہ پانی گرتا رہتا ہے۔ مندر کے سامنے ایک حوض بنا ہے جسمین یہ پانی جمع ہوتا ہے۔ اسکے بعد ایک عالیشان دروازہ کمان کی وضع کا ہے جسکے بالمقابل صحن مین چار حوض اور ہین اور انکے بیچ مین ایک اور مندر بنا ہوا ہے۔ ان حوضون مین بھی پہاڑ کا پانی آکر بھرا رہتا ہے۔ حوضون کے وسط مین پختہ سنگی روشین بنی ہوئی ہین جن سے گزر کر عقیدت مند لوگ مندر مین جاکر پوجا پاٹھ کرتے ہین۔

اندر باہر کے یہ سارے حوض ہمیشہ لبالب رہتے ہین۔ کبھی خشک نہین ہوتے۔ چارون طرف تناور درختون کا سایہ رہتا ہے۔ سرد و خنک ہوا اور شفاف پانی تماشائیون اور زایرون کے کسل سفر کی تلافی بآسانی کردیتے ہین۔

پہاڑ کے اوپر جاکر نیچے نگاہ دوڑائیے تو اور ہی لطف ہے۔ سامنے جہانتک نگاہ جاتی ہے پُر فضا میدان ہے۔ برسات مین یہ جگہ نمونۂ بہشت برین ہوتی ہے۔ سبزہ و گل کی کثرت سے قلعہ کوہ اور میدان تختۂ گلزار معلوم ہوتا ہے اور ذوق آشنا طبیعتین یہان کے پتّے پتّے مین معرفت حق کی داستان لکھی ہوئی دیکھتے ہین۔

سید محمد فاروق

قلعہ رام نگر (محل مہاراجہ صاحب بنارس) ایک نہایت خوشنما عمارت ہے جو بنارس چھاونی سے چار میل کے فاصلہ پر لب دریائے گنگا واقع ہے۔ راجہ بلونت سنگہ نے ۱۷۵۰ء مین گنگاپور کی رہایش کو ترک کرکے اپنے محل کے واسطے اس جگہ کو پسند کیا اور یہ قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ اندرون قلعہ مین بھی بعض عمدہ عمدہ قابل دید عمارتین ہین۔

کرنل الگزنڈر ہملٹن پیری

صوبہ اودھ میں کوئی انگریزی تعلیم یافتہ ایسا نہ ہوگا جو کرنل پیری کے نام سے واقف نہ ہو جب سے تہذیب کے آفتاب نے انسانی دنیا کے آسمان پر چمکنا شروع کیا ہے - اُسیوقت سے علم کو درجہ اولی حاصل ہوا ہے اور تعلیم سے بڑھکر کوئی بھی ثواب نہین خیال کیا گیا ورنہ بچے معلم کے برعکس کون محب وطن تصور کیا گیا ہے مبارک ہین وہ لوگ جنھون نے تعلیم و تعلم کو اپنی زندگی کا اعلی مقصد ٹھہرایا ہے - ایسے ہی اصحاب کے واسطے بہشت کے دروازہ پر رضوان خیر مقدم کے لئے مودب کھڑا رہتا ہے - لیکن وہ بنی نوع انسان کی خدمت چھوڑکر اندر داخل ہونے کی مطلق پروا نہین کرتے - یہی وہ لوگ ہین جنکو زمین کا نمک کہا گیا ہے -

کرنل پیری کا شمار بھی اسی زمرہ مین ہے - آپ ملک اسکاٹلینڈ کے باشندے ہین اور سنہ ۱۸۴۳ء آپکا سن پیدائش ہے - سینٹ انڈروز یونیورسٹی کے گریجویٹ ہین - چونکہ تعلیم سے بہت شوق تھا لہذا آپنے اڈنبرا کے ٹریننگ کالج کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیا - زمانہ طالب علمی مین آپکو گالف (Golf) سے بہت شوق تھا - اور اس کھیل مین ہمیشہ اچھے رہا کرتے تھے - باوجودیکہ حوادث زمانہ کی باد مخالف نے آپ کو یہہ اجازت نہ دی کہ آپ خود اس کھیل مین شریک ہون - مگر آپکا شوق اسقدر زبردست تھا کہ آپ لکھنؤ آنے پر یہان کے پہلے گالف کلب کے سکرٹری ہوئے اور لکھنؤ مین پہلا گالف لنکس بنانے کا فخر حاصل کیا

اگر آپ اسکاٹلینڈ مین رہ جاتے تو اپنی وسیع معلومات سے کیا کچھ عزت نہ حاصل کر لیتے - لیکن خدا نے آپکو ہندوستان کی خدمت پر مامور کیا تھا - پس اواخر سنہ ۱۸۶۶ء مین آپنے ہند کی پاک سرزمین پر قدم رکھا اور ڈوٹن کالج کلکتہ کے ریاضی و علم طبیعات کے پروفیسر مقرر ہوئے اور سات سال تک یہان کام کیا - اس زمانے مین ہمارے مشہور پولیٹیکل پیشوا بابو سُریندر ناتھ بنرجی بھی آپکے شاگرد تھے - اگر آپکا تعلق ہندوستان سے اُسیوقت منقطع ہو جاتا تو آپ نے یہ کیا کم عزت حاصل کر لی تھی کہ دنیا کے اُن معدودے چند اشخاص مین سے جنکو اقلیم جادو بیانی کی سلطنت ملی ہے ایک صاحب آپکے تلامذہ مین سے ہین لیکن خدا نے آپکے واسطے عزت کے اور بھی ذخیرے جمع کر رکھے تھے - اور سنہ ۱۸۸۱ء مین آپ لا مارٹینیر کالج کے ہیڈ ماسٹر ہوکر لکھنؤ آئے اور ڈیڑھ ہی سال کے اندر (سنہ ۱۸۸۳ء مین) کیننگ کالج مین منتقل ہوآئے جہان آپنے ۲۸ برس بحیثیت پروفیسر کے کام کیا - جس زمانہ مین مولوی سید حسین صاحب بلگرامی یہان پروفیسر تھے وہ آپکے بڑے دوست تھے - ڈاکٹر میکل جے ہوائٹ صاحب کی وفات کے بعد یعنی سنہ ۱۹۱۰ء مین آپ کالج کمیٹی کے پرنسپل و سکرٹری مقرر ہوئے - اور حق یہ ہے کہ آپ نے اس ممتاز عہدہ کے اہم فرائض اس قابلیت سے ادا کئے جو موجودہ زمانہ کے بہت کم پرنسپلون مین پائی جاتی ہے -

آپ نے اپنے ہمدردانہ برتاؤ سے اپنے شاگردون کے دل سخر کر لئے ہین جسکا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ نہ صرف موجودہ طلبا بلکہ اودھ کے رؤسا، وکلا و دیگر پیشہ ور حضرات جو قریب قریب کل آپکے شاگرد رہ چکے ہین پبلک جلسون مین و دیگر مقامات پر بڑے جوش و خروش سے آپکا خیر مقدم کرتے ہین۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جب شہنشاہ عالم پناہ اعلیحضرت جارج پنجم قیصر ہند بحیثیت ولیعہد لکھنؤ رونق افروز ہونے والے تھے تو مثل دیگر درسگاہون کے کیننگ کالج کو بھی ایک آراضی اس غرض سے ملی تھی کہ وہان سے طلبا جلوس دیکھ سکین۔ قبل اسکے کہ حضور ولیعہد کی ریل داخل شہر ہو سڑک کے دونون طرف آدمیون کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ اور کیننگ کالج کی آراضی بھی طلبا سے بھری ہوئی تھی۔ اتنے مین پرنسپل پیری کی گاڑی وہان پہونچی۔ طلبا نے گاڑی کو آتے دیکھکر اسقدر پُرجوش استقبال کیا اور اس زور سے تالیان بجائین اور نعرہاے خوشی بلند کئے کہ اور لوگ بھی تالیان بجانے لگے اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے کہ شاید پرنس آف ویلز آگئے ہین جو اسقدر پرجوش استقبال ہو رہا ہے۔

آجکل جبکہ تھوڑے عرصے کے قائم شدہ کالجون مین سٹرائک (Strike) اس زور شور سے ہوتی ہے کہ مہینون کالج بند رہتے ہین اور طلبا پرنسپل کی جان لینے کی تدابیر کرتے ہین، پرنسپل پیری کی اس سے زیادہ کوئی تعریف نہین ہوسکتی ہے کہ آپ کے کالج مین پروفیسرون اور لڑکون کے تعلقات بہت ہی محبتانہ رہے ہین۔ اسکا سبب کیا ہے۔ کیا یہان کے طلبا کسی خاص قسم کے ہین یا یہان کی آب و ہوا مین اثر وفاداری ہے؟ سبب صرف یہ ہے کہ یہان پرنسپل کے برتاؤ سے لڑکے یہ نہین محسوس کرتے کہ ہم محکوم ہین۔ یہان قومی تفوق کا خیال ہی نہین آنے پاتا۔ انکا پرنسپل ایک ملنسار وہمدرد آدمی ہے جو ہمیشہ پدرانہ مشورہ دینے کو تیار رہے اور شفقت پدرانہ سے اپنے طلبا کو اپنے بال بچون کی طرح بڑھتے دیکھکر خوش ہوتا ہے۔ انکی غلطیون سے درگذر کرتا ہے اور انکی خوبیون کی تعریف کرتا ہے۔ مسٹر پیری کا یہ طرز عمل بعض حکومت پسند پرنسپلوں کے واسطے ایک ایسی روشن مثال ہے جو انکو ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہیے۔ لاٹ صاحب نے اپنی تقریر مین ۷ فروری ۱۹۱۱ء کو بہت سچ کہا تھا۔

"مسٹر پیری! آپکا نام پشتہا پشت تک تعلقداران
اودھ کے خاندانون مین بڑی عزت و محبت سے لیا جائیگا
اور آنکے ورد زبان رہیگا۔ نہ صرف تعلقداران اودھ کے
خاندانون مین بلکہ کل تعلیم یافتہ اودھ مین کیونکہ اودھ مین
کون ہے جسنے اپنے علم کا چراغ آپکی مشعل سے روشن
نہین کیا۔"

جو لوگ واقف ہین وہ جانتے ہین کہ پرنسپل کے فرائض اسقدر اہم اور پیچیدہ ہوتے ہین کہ پرنسپل عموماً اپنی نئی دنیا مین رہا کرتے ہین اور معمولی انسانی دنیا سے بالکل علحدہ رہتے ہین۔ لیکن مسٹر پیری مستثنیات مین سے ہین۔ آپنے اودھ کی محض تعلیمی خدمت ہی کرنے پر اکتفا نہین کی بلکہ عرصہ دراز تک یونائٹیڈ سروس کلب و اسٹیشن لائبریری کے سکرٹری بھی رہے۔ اور یہ عزت ہر انگریز کو حاصل نہین ہوتی۔ سوسائٹی کے لیڈر عموماً اسی اول الذکر عہدہ کے واسطے منتخب کئے جاتے ہین لیکن ایک بڑی اور اعلیٰ قابل قدر خدمت آپنے یہ کی کہ آپ جوبلی ہائی اسکول کے پہلے سکرٹری رہے۔ یہی نہین بلکہ آپ پراونشل عجائبخانہ کے بانیون مین سے ہین اور اسکے قائم ہونے پر آٹھ برس تک

اُسکے بھی سکرٹری رہے - آپ ہی اُسکے پہلے سکریٹری تھے اور اُسکی بہت کچھ کامیابی آپ ہی کی کوششون کا نتیجہ ہے -

تعلیمی امور سے باہر بھی مسٹر پیری نے بہت کچھ ملک کی خدمت کی ہے - چنانچہ لکھنؤ مین لوکل سلف گورنمنٹ کی ترقی ایک حدتک آپکی کوششون کا نتیجہ ہے - جب یہان میونسپل بورڈ قائم ہوا تو اس کے پہلے ممبرون مین آپ ہی تھے اور وہ قواعد وضوابط جنکے مطابق پہلا الیکشن ہوا تھا وہ بھی آپکی اور آپکے دوستون کی دماغ سوزی سے مرتب ہوے تھے -

آپ ایک مدت تک اودھ والنٹیر فورس کو کمانڈ کرتے رہے اور اب اُنکے آنریری کرنل ہین - آپکی علی خدمات کے صلے مین آپکو ایک والنٹیر ڈکوریشن ملا ہے اور سنہ ۱۹۰۵ء مین لارڈ لینسڈون کی سرکار سے بھی آپکو پروانہ خوشنودی عطا ہوا تھا جسمین آپکی اعلی فوجی خدمات کا بخوبی اعتراف کیا گیا ہے -

آپکو فن باغبانی خصوصاً کاشت گلاب کا از حد شوق ہے اور پھولون کی نمایش مین کوئی کلاس انعامون کا ایسا نہین ہے جسمین آپکو اول درجہ کا انعام نہ ملا ہو - ایک مرتبہ سرکاری باغ کے گلاب کی باڑی کی فہرست مرتب کرنا آپکے سپرد ہوا تھا - اور سنا گیا ہے کہ آیندہ دربار قیصری کے موقع کے لئے باغ لگانا آپکی دختر نیک اختر کے سپرد ہوا ہے -

غرض کہ کرنل پیری نہ صرف درسی علوم مین کامل دستگاہ رکھتے ہین بلکہ دیگر علوم مین بھی یکتا مانے جاتے ہین -

زبان انگریزی کے علاوہ آپ تقریباً ہر یوروپین زبان و بعض دیسی زبانون مین بھی خاص مہارت رکھتے ہین - علم تمدن - علم ہندسہ - علم فلسفہ - منطق - طبیعات وغیرہ علوم مین بھی اچھی دستگاہ ہے - اور اُنکی معلومات کا دائرہ اسقدر وسیع ہے کہ ہر شخص کی طبع رسا اسکی حدتک نہین پہونچ سکتی اور آپکی بذلہ سنجی و حاضر جوابی نے آپکے تمام اوصاف پر سونے مین سہاگہ کا کام دیا ہے - یہ ہے وہ شخص جسکی تصویر ہدیۂ ناظرین ہے اور جس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ ہندوستان کی خدمت مین صرف کیا اور اب عنقریب کالج سے قطع تعلق کرکے آرام کرنا چاہتے ہین - اُن کے تمام طلبا اُن کے واسطے دست بدعا ہین کہ وہ ایام پیری لطف کے ساتھ گزارین اور عمر طبعی تک بآرام پہونچین

آمین ثم آمین

برجستہ ثمرغہ

ہے سحر حلال خوش بیانی تیری — سرمایۂ ناز نکتہ دانی تیری
ہین گوہر شہوار سخن کی لڑیان — اے ابر کرم گہرفشانی تیری

کیون حرف تعلی کا زبان سے نکلے — خود بینی کی شان کیون بیان سے نکلے
فیض کوثر سے کیون کھلتے اے اوج — مرجھاے وہ گل جو بوستان سے نکلے

حال دل زار کس طرح دکھلاؤن — بیمار و نزار ہون نہ کیون گھبراؤن
فیض کوثر سے گو غزل ہے تیار — کمزور بہت ہون اوج کیونکر آؤن

اوج گیاوی

آرزوے شہرت

جس طرح جناب باری نے انسان کی ذات مین عقل، فکر، اور تمیز کی اعلیٰ ترین قوتین ودیعت کی ہین، اُسیطرح ایک اور صفت اسکی ذات مین پائی جاتی ہے جسے "آرزوے شہرت" کے نام سے تعبیر کرتے ہین اور جو ہرایک انسان کی ذات مین ازل ہی سے موضوع و مخلوق ہے۔ اس عجیب اور پاکیزہ صفت کی تعریف یہ ہے کہ:۔

"یہ ہر ایک آدمی کو نیکنامی حاصل کرنے کی طرف مائل کرتی ہے" اور

"توجہ دلاتی ہے کہ انسان اپنے ابناے جنس کی نظرون مین عزت اور بزرگی حاصل کرے"

دنیا مین جن لوگون نے خاص عزت و فضیلت حاصل کی ہے، یا جو لوگ اس دار ناپایدار مین بہ نسبت اورون کے ممتاز اور محترم خیال کیے گئے ہین، اُن سب نے اسی صفت کی پیروی کی ہے۔ افلاطون کے علم و فضل، ارسطو کی دانش و بینش، بیکن کی عقل و فراست، سکندر اعظم کی فتوحات، اور نپولین بوناپارٹ کی جوانمردی اور ہمت و استقلال کا باعث یہی اعلیٰ صفت تھی۔ اگر اُن کے دل مین شہرت کا شوق اور جوش نہوتا، تو یہ کمالات کیونکر حاصل ہوتے۔ ہماری دانست مین آدمی کو اچھی باتون کے حاصل کرنے کا جوش اور شوق اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ دل مین "آرزوے شہرت" کا پاک جذبہ موجود ہو۔ اور اگر یہ نہ ہو تو بہتری اور بدتری مین امتیاز ہی محال ہے۔ ہر ایک آدمی کے دل مین پہلے شہرت کا خیال پیدا ہوتا ہے، اسکے بعد عزت و احترام حاصل کرنے کا ولولہ اور جوش آتا ہے۔

بعض لوگ خیال کرتے ہین کہ شہرت کا طالب ہونا خلاف تہذیب و عقل ہے، لیکن ہم اس دعوی کو ہرگز ماننے کے لئے تیار نہین ہین۔ عابد، زاہد، اور دنیادار بھی، اُسی وقت دین و دنیا کی بزرگی حاصل کرسکتے ہین، جبکہ دل مین پختگی کے ساتھ شہرت کا خیال جاگزین ہو۔ کوئی بھی ایسا کام نہین ہے، جسمین شہرت کا خیال مدنظر نہ ہو۔ جب لڑکے اسکول مین تعلیم پاتے ہین، تو اُن مین سے ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے طلبا سے بڑھکر اپنے ہم جنسون اور اُستاد کی نظر مین شہرت حاصل کرین، اور مدرسہ مین اُنکی ذہانت اور تیز طبعی کا چرچا ہو۔ جو لڑکے اسکی پروا نہین کرتے، وہ کبھی اپنی تعلیم مین کامیاب نہین ہوتے۔ اسی طرح میدان جنگ مین ایک سپاہی جو بڑھ بڑھکر تلوار مارتا ہے، محض اسی خیال سے کہ بہادری کے ساتھ ملک اور قوم مین شہرت اور ناموری حاصل کرے۔

عموماً لوگ کہا کرتے ہین "خدا کرے، کوئی ایسا کام ہو، جس سے ہمارا نام زندہ رہے!" یہ بقاے نام کی خواہش ہی "آرزوے شہرت" ہے۔ جس شخص کے دل مین اسکا خیال نہین اسکو برتری اور عزت کبھی حاصل نہین ہوسکتی۔

سوال ہوسکتا ہے کہ "آرزوے شہرت" صرف ذاتی اور خلقی طور پر ہی پیدا ہوتی ہے، یا اُسے کسی محرک کی بھی ضرورت ہوتی ہے؟ اور انسان کی یہ خواہش کہانتک جائز ہے اور

کہانتک لے جانا جائز؟

ہمارا خیال ہے کہ یہ دونون باتین برابر سے یکسان ظہور مین آسکتی ہین - بعض اوقات نیکنامی کی آرزو ہم مین خلقی طور پر پیدا ہوتی ہے، یہانتک کہ جاہل بھی اس جوش سے متاثر ہوجاتے ہین - لیکن بسا اوقات اس قابلیت کو جوش مین لانے کے لئے کسی خارجی تحریک کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خصوصاً اُسی حالت مین جبکہ انسان اپنی کم دلی کمزوری سے اپنے آپکو شہرت حاصل کرنیکے ناقابل سمجھتا ہے - ایسی صورت مین البتہ اُسے کسی محرک کی ضرورت ہوتی ہے جسکی تحریک سے فوراً ہی دل مین شہرت کی آرزو پیدا ہوجاتی ہے - ہمارا یہ کہنا کہ "افسوس اگر ہم کو فلان کام کی خبر ہوتی تو ہم ضرور ہی کرتے۔ افسوس کسی نے توجہ نہین دلائی" اس بات کی دلیل ہوسکتی ہے کہ اکثر دوسرون کی تحریک سے بھی شہرت کا خیال پیدا ہوجاتا ہے اور دوسرون کی معمولی باتین شہرت کی آگ کو بھڑکا دیتی ہین -

اس امر مین بھی کلام ہے کہ آیا شہرت کا خیال اچھے کامون کی نسبت ہی پیدا ہوتا ہے یا بُرے کامون کے لئے بھی پیدا ہوجاتا ہے؟ عام طور پر لوگ جانتے اور مانتے ہین کہ جاہل سے جاہل، اور نادان سے نادان انسان بُرے کامون کی شہرت نہین چاہتا - بلکہ وہ بالطبع بُرے کامون کو معیوب اور بُرا خیال کرتا ہے - کسی بُرے کام کے کرنے سے یہ ثابت نہین ہوتا کہ اسکا کرنے والا اسکو نیک یا اچھا سمجھتا ہے چور اگرچہ چوری کرتا ہے مگر ہرگز اسکو اچھا نہین سمجھتا - جب دریافت کرو، یہی جواب دیگا کہ "مجبور ہوکر کرتا ہون" اس قسم کے بدیہی اقرار یقین دلاتے ہین کہ بُرے کام کرنے والا بھی بُرے کامون کو اچھا نہین سمجھتا - پس صاف ظاہر ہے کہ ایسے کامون کی بابت اُسکے دل مین شہرت کا خیال بھی نہ پیدا ہوتا ہوگا - کیونکہ اگر بُرے کام کرنے سے شہرت کا خیال پیدا ہوسکتا، تو ان کا کرنیوالا اُنکے چھپانے کی سعی نہ کرتا - جب آدمی اچھے اور نیک کام کرتا ہے، تو اُس کے دل مین خود بخود ہی ناموری اور شہرت کا نقش جم جاتا ہے - اگرچہ کوئی ظاہر نہ کرے، مگر عقل شہادت دیتی ہے کہ ضرور ہر ایک شخص ناموری اور شہرت کا طالب ہے، عام اس سے کہ حاصل ہو یا نہ ہو!

شاکر (میرٹھی)

دربار جہانگیر - اس تصویر مین اُسوقت کا منظر دکھایا گیا ہے جبکہ ۱۶۱۵ء مین سر طامس رو صاحب شاہ انگلستان جیمس اول کی طرف سے بحیثیت سفیر جہانگیر کے دربار مین حاضر ہوئے تھے - جہانگیر اُسوقت اجمیر مین تھا، وہین اُسنے سر طامس رو کو شرف ملاقات بخشا اور بڑی خاطر و تواضع سے پیش آیا بلکہ اُسکو دربار مین سب سے ممتاز جگہ عنایت کی۔ اس سفیر کی سعی و کوشش سے انگریزون کی تجارت ہندوستان مین جمی تھی - تصویر کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سر طامس رو کی پوشاک اسلامی وضع کی تھی، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر ملکی لباس مین کوئی شخص دربار مین حاضر نہین ہوسکتا تھا + یہ تصویر مہاراجہ صاحب جے پور کے مجموعہ مین ہے جسکی نقل حال مین "جرنل آف انڈین آرٹ" نے شائع کی ہے، اُسی سے یہ ادیب مین نقل کی جاتی ہے۔



دربار جہانگیر

نیشن

نیشن ایک جماعت ہے ان لوگون کی جنکے عادات و اطوار - زبان و مذہب ایک ہون - حکومت رکھتے ہون اور دنیا کے کسی خطہ مین قیام گزین ہون - موجودہ اقوام مین سب سے عمدہ نمونہ نیشن کا انگلستان ہے - مذہب اس کل قوم کا یکسان ہے - اگرچہ مذہب مین زمانہ قدیم سے دوئی ہوگئی ہے مگر آجکل کے خیالات اور عدم تعصب نے اس فرق کو کالعدم کر دیا ہے - اب چاہے ایک انگریز رومن کیتھولک ہو یا پروٹسٹنٹ وہ ہر سرکاری خدمت پر مامور ہوسکتا ہے - فقط دو تین خدمتین مستثنیٰ ہین - اسمین سے ایک یہ بھی ہے کہ بادشاہ مذہب پروٹسٹنٹ کے سوا کوئی دوسرا مذہب نہین رکھ سکتا - اس تعصب کی غیر موجودگی اور غیر مذاہب کی دلشکنی سے احتراز کا اندازہ اس بحث سے کیا جاسکتا ہے جو ایک مدت ہوگئی کہ پارلیمنٹ مین بادشاہ کی تخت نشینی کی قسم پر کیگئی تھی - اب اسی طرح اور ممالک کے لوگ ہین - مثلاً فرانس اور جرمنی اور چند اور ممالک یورپ - ان سب قومون کے عادات و اطوار رسم و رواج ایک ہین - یہ باہمی مشابہت ہمیشہ باعث ترقی رہی ہے اور اب بھی ہے - موجودہ سلطنتون مین دیکھا جائے تو جو نیشن کے نام سے موسوم نہین کئے جاسکتے اُنکی ایک مثال ٹرکی ہے کہ تمام ملک مین ایک قسم کے لوگ موجود نہین - فقط کچھ تھوڑا ہی علاقہ ہے جسمین صرف ترک ہین ورنہ اور قومین بھی موجود ہین جنکے رسم و رواج مذہب اور زبان جداگانہ ہے - ان سب اقوام کا گو ر ایک جگہ ہونا اور ایک حکومت کے ماتحت رہنا مشکل امر ہے - اسیوجہ سے یہ دیکھا گیا ہے کہ قدیم زمانہ مین جب تک ترکونکی قوت بھی رہی - اُسنے چھوٹی باج گزار ریاستین مثلاً سرویا - رومینیا - بلغاریہ دبی رہین - جب ترکون کی قوت مین انحطاط شروع ہوا - اُنھون نے سر اُٹھانا شروع کیا اور بتدریج خود مختاری تک پہونچگئین - چنانچہ حال مین مانٹینگرو کو بادشاہت کا رتبہ دیا گیا - یہی حال ریاست آسٹریا کا ہے - اسمین بھی مختلف قومین موجود ہین - آسٹریا اور ہنگری کو یون ہی کہنا چاہیئے کہ برائے نام ملے ہوئے ہین - اگر کچھ فساد اُٹھ کھڑا ہو تو الگ ہونے کو دست بہ شمشیر موجود ہین - یہ بات اور ملکون مین مثلاً اٹلی جرمنی اور فرانس یا روس مین نہین - سب ایک ہی قوم ہے ایک ہی مذہب ایک ہی وضع اور شکل و شمائل - جہان کہین ایک روسی جائیگا اگر دوسرا اُسے نظر آئے اسیوقت پہچان لیگا - اور اسیطرح فرانس اور جرمنی وغیرہ کے باشندے -

اسلامی ریاستون مین فی زمانتا ایران ہے جسکو ہم نیشن کہہ سکتے ہین - اسی خطے مین جہان جاؤ سوا ایرانی کے اور کوئی نظر نہین آسکتا - اسکی ترقی اگر ہو تو بے شبہہ ٹرکی سے نہین ہوگی - جیسا کہ اوپر کہا گیا لفظ نیشن کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ اس قوم مین حکومت بھی ہو - اگر ایک قوم ہو مگر دوسرے کے ماتحت ہو تو اُسکو نیشن کہنا بیجا ہے - مثلاً یہودیون کو نیشن نہین کہا جاسکتا - یہ ایک ایسی قوم ہے کہ دنیا کے ہر تہذیب یافتہ حصے مین موجود ہے اور مختلف سلطنتون کے تابع ہے -

اسیطرح ہندوستان بھی کوئی نیشن نہین -

آجکل لفظ نیشن اسقدر عزیز اور محترم ہوگیا ہے کہ جولوگ یورپ کی قومیت مین شامل نہین کیے جاتے ایشیا مین موجودہ زمانہ مین جاپان ہے جو اس رتبہ تک پہنچ گیا ہے۔ چین کا بہت زمانہ تنزل کا رہا اور اسکو بہت سی شکستین بھی ہوئین - مگر اس مین قومیت کے صفات موجود ہین - فقط علم اور سائنس کی کمی ہے - ایک اور سبب انکے تنزل کا یہ تھا کہ وہ اپنے کو ماورا دوسرون کو ارذل سمجھتے تھے - اس گھمنڈ پر اجنبیون سے تعلقات رکھنا کسرشان سمجھتے تھے - مگر اب وہ خیال جاتا رہا اور یورپی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کی کوشش کی جارہی ہے -

آجکل دنیا مین جو ایولیوشن ہورہے ہین - اس مین قدیم زمانہ کے خیال کو الٹا جارہا ہے - اب اگر قدیم زمانہ کے خیال کو حکومت کے متعلق غور سے دیکھا جائے تو یہ بات عیان ہے کہ ایک کا عکس ہے قدیم لوگون کا خیال اور اب بھی غیر ترقی یافتہ اقوام کا خیال یہ ہے کہ "رعایا سرکار پر سے صدقے" مگر جدید خیال اسکے بالکل برعکس ہے وہ یہ کہ "سرکار رعایا پر سے صدقے" اور سرکار فقط رعایا کی بہتری اور بہبودی کی غرض سے ہے -

چنانچہ اس خیال نے سلطان عبدالحمید خان اور مرزا محمد علی شاہ کو معزول کروایا -

جب علم سیکھ کر لوگ عمل کرنا شروع کرتے ہین تو اُسوقت اُس قوم مین سے اشخاص نکلنے لگتے ہین - وہ اپنے جوہر اور کارنمایان سے اپنا نام روشن کرجاتے ہین اور یادگارین چھوڑ جاتے ہین - انکے ملک کے لوگ انکی نقل کرتے ہین اور بتدریج نیشنون کے جداگانہ خصوصیات - اوصاف اور اخلاق قائم ہونے اور بننے لگتے ہین - اُسیطرح جسطرح کہ ایک مشہور شاعر یا مصنف ایک طرز خاص کا موجد ہوتا ہے اور اپنے شاگردون اور پس ماندگان کو اس طرز پہ لے آتا ہے - اور کچھ زمانہ تک اسکو فروغ ہوتا ہے -

پہنچنے والی قومین جو آگے نیشن کے رتبہ کو حاصل کرنیوالی ہین - انمین کئی چیزین بتدریج آتی جاتی ہین - انمین سے ایک یہ ہے کہ آدمی کا تصرف کارخانۂ قدرت پر زیادہ ہوتا جاتا ہے - اُسکا علم اجسام کے خصوصیات کو کھولتا جاتا ہے - اُسکی کوئی حد نہین معلوم ہوتی - اور بے گنتی ایجادات اور اختراعین آنکھونکے سامنے نظر آتی ہین جو خواب وخیال مین بھی نہ تھین - اسپر طرہ یہ کہ جون جون معلومات وسیع ہوتی ہین - یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قدرت وترقی ابھی آغوش دایہ مین ہے -
دوسری چیز جو قوم کا روبترقی ہونا ثابت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جان ومال کے بچاؤ کا جدید انتظام ہونے لگتا ہے - یورپ کے لوگون کی ہر نسبت کے بعد چاہے وہ کتنے ہی تہذیب سے بیگانہ ہون باہمی مظالم وظلم وجفا سے بچنے کا اور حفاظت جان ومال کا بہتر سے بہتر سامان ہوتا رہا - قانون اور ضوابط کا عمدہ نظم ونسق ہوگیا - پولیس کی ہوشیاری اور زیرکی خصوصاً ان رسم ورواج کا منسوخ ہونا جو ایک سرگروہ کو دوسرے سرگروہ خواہ الناس پر حاوی کردیتے ہین ، نمایان ہوگئے - اسکے ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ محصول کم ہوجاتے ہین - تیسری بات جو نیشن مین پیدا ہوجاتی ہے وہ باہمی اعتماد وبھروسہ ہے - لوگون کی حمایت ایسے کام کرسکتی ہے جو ایک سے ممکن نہین - جب تک اتنا مال جمع نہو تو اسکا اتمام محالات سے ہے - اسمین یہ ضرور ہے کہ مالدار لوگ بھروسہ کرین اور اپنے مال کو کسی کام مین شریک کرین - ابتر حالت اس قوم کی ہے اور رہیگی جسمین ایک کو دوسرے پر اعتبار نہین - اور جس قوم مین ساکھ نہین -

میر عالم علی

شیخ امیر اللہ صاحب تسلیم

گلستانِ دہلی کی وہ روح افزا فضائیں اور پہلوانانِ سخن کی وہ رزم گاہیں جنمیں شاہ حاتم۔ سودا۔ درد۔ نصیر۔ مومن و نسیم اپنی تیغ زبان کے جوہر دکھلاتے تھے اور جن کے گلہائے کلام کی خوشبو سارے ہندوستان کو معطر کئے ہوئے تھی، آنکھوں سے پنہاں ہوگئیں۔ اے انقلابات عالم کی کالی کالی گھٹاؤ۔ شاید انکو تم نے اپنے دامن مین چھپالیا۔ خدارا میری مشتاق آنکھوں کو وہ جلوۂ تابان دیکھ لینے دو۔

اے شمع شبستان بزم حاتم! دیکھ صبح ہونے آئی۔ للہ اب تو اپنے آنسو دامن نسیم سے پونچھ۔ تیرا رہ رہ کر جھلملانا، رو رو کر اپنے آپ کو گھلانا، اب زیادہ دیکھا نہین جاتا۔ ذرا اپنی گردن جھکا کر دیکھ کہ تیرے دلسوز رفیق پروانے، تیرے نثار زار رونے پہ کسطرح مرمٹے ہین۔ اب تو یہ بیچارے منزل عدم کو سدھارے، چین سے ان کو کنج فنا مین سونے دے۔ آہ

اب کہان تسلیم اگلی شاعری
مرمٹے وہ لوگ کہتی جنکے لئے

جناب استادی شیخ امیر اللہ صاحب تسلیم اُن چند بزرگوارون مین سے ہین جنکے دم سے قدیم اُردو شاعری کا نام زندہ ہے، اور آپ اُن کہن مشاق استادون مین سے ہین جنپر مٹے ہوئے لکھنؤ کو ناز اور بجا ناز ہے۔ آپ کی وضع سے ظاہر ہے کہ یہ ہماری پرانی شاعری کے آخری دور کے نشانیوں مین مغتنمات سے ہین۔ آپکے آبا و اجداد کی سکونت مضافات دریاآباد مین تھی، مگر وہ ترک وطن کرکے مدت تک فیض آباد مین مقیم رہے۔ آپ کا آبائی پیشہ زمینداری اور مالگذاری تھا، مگر بوجوہ چند در چند آپنے اپنے وطن قدیم کو خیرباد کہکر لکھنؤ کی سکونت اختیار کی اور محلہ محمود نگر مین قیام پذیر ہوئے۔ اسی محلہ مین آتش بیان خواجہ آتش بھی مقیم تھے اور اُنکو اور اُنکے فرزند جوش کو آپنے بخوبی دیکھا، بلکہ اُنکے خاصان صحبت آپکے رفیق و دمساز تھے۔

آپ نے فارسی اپنے والد مولوی عبدالصمد صاحب سے اور بعد مین مولوی شہاب الدین سے پڑھی اور عربی کی تعلیم اپنے بڑے بھائی سے پائی۔ جب ان ہر دو علوم مین آپ خوب ماہر ہوگئے تو آپکو خوشنویسی کا شوق دامنگیر ہوا اور آپ منشی عبدالحی سندیلوی کے شاگرد ہوئے۔ آپکا اول کلیات آپ کی کتابت کا نمونہ ہے، جسکا ثبوت جناب عیش مرحوم کی تقریظ سے بھی ملتا ہے۔ فن شاعری کی تحصیل آپنے نواب اصغر علی خانصاحب نسیم دہلوی سے کی، جنکا نسب نامہ شاہ حاتم، سودا، اور درد علیہ الرحمۃ سے ملتا ہے اور اس لحاظ سے اُردو شاعری گویا آپکے گھر کی لونڈی ہے۔ اسی آسمان کے آفتاب فیض نے شرق سے غرب تک اُردو شاعری کے نام کو چمکا دیا۔ اور یہی باعث ہے کہ باوجود لکھنوی ہونے کے آپ کو دہلی کا طرز پسند رہا۔ فرماتے ہین۔

مین ہون اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی
مجھکو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

آپ کی اولاد مین صرف منشی تجمل حسین صاحب پہلی بیوی کی یادگار موجود ہین۔ مگر شاعری سے اُنھین کچھ سروکار نہین

صاحبزادہ موصوف کی والدہ کے انتقال کے بعد آپ نے لکھنؤ میں دوسری شادی کی۔ گر ۱۳۰۱ھ میں رامپور آکر وہ بھی انتقال کر گئیں۔ آپ کے شاگردوں میں شید الکھنوی اور شوق نیموی کا درجہ بہت بلند تھا۔ آجکل بدر لکھنوی و حسرت موہانی کا نام مشہور ہے۔ جناب حسرت کی ذاتی تحریک اور کوششوں نے استاد تسلیم اور مرزا محمود علی بیخود اس فن کو علیگڈھ میں اکٹھا کیا تھا۔ جو گویا بزم آخر تھی۔ رامپور والوں میں منشی محمد اسمٰعیل خان صاحب تہر جو صاحب دیوان ہونے کے علاوہ اور بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں ممتاز ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ آپ کے شاگردوں کا دائرہ ہندوستان میں بہت وسیع ہے۔

استاد تسلیم کی عمر اللہم زد فزد اسّی برس کی ہے۔ مگر اس پر بھی آپ کا دل و دماغ صحیح ہے۔ یہ عنایت ایزدی ہندوستان کے تمام اساتذۂ اولین و آخرین میں صرف آپ کے ساتھ ہی البتہ ہے۔ آپکی ذات الیشیائی شاعری کے آسمان میں آفتاب لب بام ہے۔ ناسخ مرحوم کی صحبتوں کا دیکھنے والا اب بجز آپ کے لکھنؤ میں اور کوئی نہیں ہے۔ محمد علی شاہ بادشاہ لکھنؤ کے عہد حکومت میں آپ پانچسو سپاہیوں کے افسر تھے۔ مگر واجد علی شاہ کے زمانہ میں برطرفی ہوگئی۔ آپ نے بوساطت اپنے دوست کپتان مقبول الدولہ مہدی علی خان بہادر مقبول شاگرد ناسخ پھر درخواست کی تو نواب واجد علی شاہ نے دست خاص سے عرضی پر یہ حکم صادر فرمایا ؎ اختر

بشنواے خوشنویس واے خوشگو — ہر دو فن میکنی و ہر دو نکو
اسم تو مندرج بہ دفتر شد — بست و دہ روپیہ مقرر شد

تا انتزاع سلطنت آپ کو یہ تنخواہ ملتی رہی، مگر جب ۱۸۵۷ء کے غدر نے مُنہ دکھلایا اور خزانِ انقلاب نے گلشن لکھنؤ کو ویران کر دیا تو ماہرانِ فن سخت تکلیفوں میں مبتلا ہوگئے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ کلب علیخان بہادر بے اختیار تھے۔ مگر بوجہ قدر دانی استاد تسلیم رامپور تشریف لے گئے۔ وہاں آپکا کچھ وظیفہ مقرر نہیں ہوا اور سخت تکلیف سے یہ ایام مصیبت بسر کئے۔ جب ہنگامہ غدر کم ہوا تو لکھنؤ کا راستہ بھی صاف ہوگیا۔ اور آپنے لکھنؤ کی واپسی کا عندیہ ظاہر کیا۔ نواب صاحب نے یکصد روپیہ زادراہ دیکر رخصت کیا۔ جب لکھنؤ پہونچے تو منشی نولکشور صاحب مرحوم نے نیا نیا مطبع قائم کیا تھا۔ آپ نے مطبع کی ملازمت اختیار کرلی۔ اور مشاہرہ چونکہ کم تھا۔ اسلیئے آپ کے استاد بھائی اور شاگرد محمد تقی خان بہادر جو سات سو ساٹھ (۷۶۰) روپے کے وثیقہ دار تھے، آپ کے کفیل رہے۔ مگر ان کی وفات کے بعد آپ عرصہ تک پریشان رہے۔ ہوتے ہوتے وہ وقت آن پہونچا کہ نواب کلب علی خان بہادر مسند نشین ہوئے اور تلق امیر، بحر، منیر، جلال اور داغ کے ہمراہ آپ بھی طلب کئے گئے۔ اسی یکجائی نے زمانہ پر روشن کردیا کہ آپ امیر، داغ اور جلال کے ہمعصر ہیں، حالانکہ قریب قریب لضعفالضعف کا فرق تھا۔

جب ایوان رامپور کا چراغ ہوائے اجل نے گل کر دیا تو پروانے بھی راہی ہوگئے۔ آپ کو نواب صاحب منگرول کاٹھیاواڑ نے اپنے دربار میں رکھنا چاہا۔ اُدھر داغ مرحوم نے بھی حیدرآباد سے طلبی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا، مگر آپ نے یہ کہکر ٹال دیا۔

میرے دل میں تمنائے دکن کچھ اور کہتی ہے
مگر یادِ امیرِ بے وطن کچھ اور کہتی ہے

(رحلت و ناکامیِ امیر مرحوم کی طرف اشارہ ہے) غرض آپ بخیال نمک خواری ریاست رامپور عیش و آرام پر لات مار آئے۔

کریم النفسی، قناعت، توکل آپکا حصہ ہے - نخوت سخن آپ مین نام کو بھی نہین - اگرچہ اب اس زمانہ مین کر سماعت و بصارت بالکل جواب دیگئی ہین، آپ کو دعویٰ سخن نہین مگر عالم شباب مین بھی آپ نے اپنے آپکو مرد عامی ہی سمجھا - اور اسی پاک نفسی کا یہ حاصل ہے کہ تمام ہندوستان آپ کو اُستاد تسلیم کے نام سے یاد کرتا ہے -

مشق سخن کے لحاظ سے آپ منیر، قلق، گویا، خلیل، عیش، رند، شاد، قبول، سرور، اور طپش وغیرہ کے ہمعصر ہین - آپ نے داغ مرحوم کو محض صغر سنی کے عالم مین دیکھا تھا جبکہ وہ مولوی غیاث الدین سے گلستان و بوستان کا سبق پڑھتے تھے زمانہ کا ورق آپ کے سامنے اُلٹا ہے - رشحات صفیر بلگرامی مین آپ کے اشعار بطور سند درج ہین -

زمانۂ غدر مین آپکا وہ کلیات تو لُٹ گیا جو نسیم کی زندگی مین مرتب کیا تھا اور جسکا ذکر کلیات اول مین کیا گیا ہے - مابعد ایک دیوان ضخیم شائع کیا اور آجکل ایک اور کلیات رامپور مین زیر طبع ہے - علاوہ ازین آپ نے سات مثنویان لکھین اور تین ضخیم جلدون مین ریاست رامپور کی تاریخ لکھکر فرمانروایان قدیم کے مزارون پر آبحیات کا چھڑکاؤ کیا -

آپکا کلام جمیع عیوب صوری و معنوی سے پاک اور درد ناک ہے - اور زمانہ نے اسکو مان لیا ہے کہ نسیم دہلوی و مومن خان کا نام آپ ہی نے روشن کیا ہے ؎ تسلیم

قدرت نمائیون مین نہین کچھ سبب کو دخل　　بے تیل جل رہا ہے چراغ آفتاب کا

آخر مین مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کلام کا تھوڑا سا نمونہ بھی نذر احباب کیا جائے - وہو ہذا -

خزانے سے کبھی کم ظرف اعلیٰ ہو نہین سکتا　　اُٹھائے لاکھ سر فوارہ دریا ہو نہین سکتا
[illegible]

کسی کا پردہ دار راز ہوان چھیڑو نہ اے ہمدم　　لب تصویر کی صورت مین گویا ہو نہین سکتا
کبھی وہ دل مین بستے ہین کبھی آنکھون مین پھرتے ہین　　مرے اُنکے کسی صورت سے پردا ہو نہین سکتا
عبث تسلیم ہے تجھکو بھروسا اہل دنیا کا　　تو سب کا ہو رہا ہے کوئی تیرا ہو نہین سکتا

ہر چند ہے خیال اپنا یہ نقش ہستی　　پھر بھی گران جہان مین ہم سب کی جان پر ہین
خورشید و ماہ و اختر کرسی و عرش اعظم　　جلوے جو نور کے ہین سب آسمان پر ہین
نقش قدم تھی ہستی وہ بھی نہین ہے باقی　　ایسے مٹے ہوئے ہم کس بے نشان پر ہین
کس نے مٹا دیا ہے کہہ کہہ کے لن ترانی　　بے نام بے نشان ہم کس بے نشان پر ہین

جاؤن ہزار بار مین اُس کوچہ مین مگر　　مانند عمر رفتہ پھر آیا نہ جائے گا
کہتا ہے مجھ سے ضعف اگر تو گرا کہین　　نقش قدم کی طرح اُٹھایا نہ جائیگا
مرنے کے بعد گور مین حرص طلب محال　　پھیلا کے پاؤن ہاتھ بڑھایا نہ جائیگا

موت آئی جی گئے چھٹ کر غم و اندوہ سے　　یہ نیا مرنا ہے جسکا نام جینا ہو گیا
یاس و حسرت - درد و غم - ناکامی و رنج و قلق　　ایک دل پر ہائے کس کس کا اجارا ہو گیا
خاک مین مل جا برومندی کی حسرت ہے اگر　　ہو کے پیوند زمین سر سبز دانا ہو گیا

آنسو ہین اسطرح سر مژگان رکے ہوئے　　گویا چڑھے ہین حضرت منصور دار پر
حاجت نہین ہے نامۂ قاصد کی ہجر مین　　دل کی خبر منگاتے ہین اشکون کے تار پر
ماتم ہے اپنے مرنے کا گھر گھر مگر چراغ　　خوش ہو کے ہنس رہا ہے ہمارے مزار پر
تسلیم گو ہین پیر مگر دل جوان ہے　　مرتے ہین جامہ زیب جوانون پر اب بھی نکھار پر

جب ہوئے بے آب و دانہ ذکر حق جاتا رہا　　دین سے بھی ہاتھ دھویا ہم نے دنیا چھوڑ کر

ایسے نظرون سے گرے اشک کہ جی ٹوٹ گیا　　اپنے رونے پہ مجھے آپ ہنسی آئی ہے
زندگی جاگتے گزری ہے گھڑی بھر دم لے　　مرگ اے شور قیامت مجھے نیند آئی ہے
چھٹ گئے مر کے ہر اک درد و الم سے تسلیم　　موت بھی ہمدم اعجاز مسیحائی ہے

چھوڑ دنیا کو سوئے ملک عدم چل تسلیم　　راستہ دیکھتی ہے گور غریبان تیرا

آخری شعر کا مضمون آپ اپنے مقطعات و اشعار مین بہت باندھتے ہین اور نئے نئے انداز سے باندھتے ہین - مگر ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تا دیر آپ کو زندہ و سلامت رکھے -

عرش (گیاوی)

امپیریل لائبریری

لارڈ کرزن نے سابق وائسرائے ہند کو السنۂ مشرقیہ کے فاضل نہ کہلاتے ہون لیکن معاملات مشرقی کے بہت اچھے واقف کار سمجھے جاتے ہین اور انکے دل کو مشرقی مذاق سے ایک خاص اُنس بھی ہے۔ اسی شفقت کا نتیجہ ہے کہ لارڈ ممدوح نے ایک شاندار اور فلک نما عمارت مین بمقام کلکتہ امپیریل لائبریری قائم کی ہے۔ یہ کتب خانہ بہت سی خصوصیات سے ہندوستان کے کل سرکاری کتب خانون سے ممتاز ہے۔ مین گذشتہ گرمی کے روح فرسا اور جگر سوز موسم مین ایک خاص ضرورت سے کلکتہ گیا تھا۔ بڑی دقتون سے کچھ وقت نکال کر مین نے اس عظیم الشان اور بے نظیر کتب خانہ کی سیر کی۔

امپیریل لائبریری کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اسمین بُہار لائبریری کے نام سے علوم مشرقیہ کا ایک الگ کتب خانہ موجود ہے۔ بُہار بردوان کے ضلع مین ایک قصبہ ہے۔ جہان مولوی سید خلیل الدین نام ایک فاضل گزرے ہین۔ جنکے علمی شغف کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت مولانا ابوالعیاش عبدالعلی محمد بحر العلوم اُنکے مدرسہ کے مدرس اعلیٰ بنکر لکھنو سے تشریف لائے تھے۔ مولانا بحر العلوم مدتون اس مدرسہ مین طالبان علوم کو مستفید کرتے رہے۔ اُس زمانہ مین اس مدرسہ کی گورنمنٹ مین بھی بڑی وقعت تھی۔ اور یہین کے فارغ التحصیل علما صدر الصدور اور صدر اعلیٰ بنائے جاتے تھے۔ اُسی زمانے مین یہ بے نظیر کتب خانہ بھی مدرسہ کے ساتھ قائم کیا گیا تھا اور اسوقت سے کچھ مدت قبل تک مولانا جلال الدین کے وارثون کے قبضہ مین تھا۔

لارڈ کرزن نے جب امپیریل لائبریری قائم کی اور اُسمین بہت سی کتابین السنۂ مشرقیہ کی رکھی گئین تو انکے اصرار سے اس کتب خانہ کے مالک مولوی سید صدر الدین صاحب نے اسے بھی امپیریل لائبریری مین شامل کر دیا۔

میری بڑی دلچسپی بُہار لائبریری سے تھی۔ اس لئے باوجودیکہ مین وقت کی کمی اور موسم کی سختی سے اچھی طرح دیکھ نہ سکا تاہم دو چار سطرین صرف اسی کتب خانہ کے لئے نذر ناظرین کرتا ہون۔

اس کتب خانہ مین قریب قریب اکثر کتابین قلمی ہین۔ اور جو مطبوعہ ہین وہ بھی اندنون نایاب اور کمیاب ہین جیسی کہ مولانا بحر العلوم کے قیام کے اثر سے مجھے امید تھی اس کتب خانہ مین معقولات کی کتابین بہ نسبت دیگر فنون کے بہت زیادہ ہین۔ اور مولانا کی بھی اکثر تصانیف موجود ہین اور شاید ان مین کئی ایک اب تک غیر مطبوعہ ہین۔ بعض نسخے یہان تاریخی دلچسپی بھی رکھتے ہین جیسے شہزادہ دارا شکوہ کا لکھا ہوا پنجسورہ جو وکٹوریہ میموریل ہال کے لئے الگ کر لیا گیا ہے۔ یا شمس البیان جو اردو قواعد و مصطلحات مین جو اہل زبان کی تصنیفات مین سے سب سے پہلی کتاب ہے یا تاریخ شہنشاہی جو مشہور سادات بارہ کے متعلق صرف ایک ہی تاریخ ہے۔ بہت سی کتابین ہین جنپر شاہی مہرین لگی ہوئی ہین۔ چند کتابین جو سرسری نگاہ مین مجھے ممتاز معلوم ہوئین صرف

انکے نام پر اکتفا کی جاتی ہے۔

تفسیر امام حسن عسکری۔

تفسیر امام جعفر صادق۔

تفسیر سورۂ اخلاص از شیخ ابوعلی سینا۔

تفسیر شاہی از ابوالفتح۔

اعلام الہدیٰ از شیخ شہاب الدین سہروردی۔

زیج از ابوعلی سینا۔

میر باقر اور علامہ محقق طوسی کے تصنیفات بہت کثرت سے موجود ہین۔ علاوہ ازین چند نام اور ملاحظہ فرمائے

شرح ہدایت الکلمتہ از میر کبیر جنگی۔

شرح ہدایت اللحکمیہ از نصراللہ۔

حاشیہ صدرا از بحرالعلوم۔

حاشیہ صدرا از ملا نظام الدین۔

حاشیہ صدرا از ملاحسن۔

حاشیہ شمس البازغہ از ملاحسن۔

شرح مسلم الثبوت از ملاحسن۔

شرح مسلم الثبوت از ملا نظام الدین سہالوی۔

شرح مسلم الثبوت از ملا عبدالشکور۔

اخیر کے سطور مین وہ کتابین ہین جنکے نام لینے والے صرف ربع صدی تک اور پائے جائینگے - ورنہ آیندہ کے لیے زمانہ انکو پیدا کرنے کا خیال ترک کر چکا ہے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی اپنی لاجواب کتاب سبحۃ المرجان مین میر قمرالدین اور انکی نادرالوجود تصنیف "مظہرالنور" کی بیحد تعریف کرتے ہین۔ مظہرالنور کا کامل نسخہ مصنف کے وقت کا لکھا ہوا یہان محفوظ ہے۔

چنگیز خانی دور دورے مین بغداد کا علمی سرمایہ جسطرح ضائع کیا گیا وہ داستان درحقیقت نہایت دردناک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکمائے قدیم کی تصانیف مین سے اگر کوئی نسخہ مل جاتا ہے تو اسکی سخت زندگی پر غرور تعجب ہوتا ہے - اس کتب خانہ مین علم دوست حضرات کو کتب ذیل ضرور جاکر دیکھنی چاہیے۔

یازدہ رسائل حکمائے سلف- اس نام سے معلم ثانی ابونصر فارابی کی ایک بے مثل تصنیف موجود ہے جسمین اسنے ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ پر محاکمہ کیا ہے۔ اسی مجموعہ مین ارسطو کی کتاب الربانی پر موجود ہے۔

اثولوجیہ- عبدالمسیح بن عبداللہ بن ناعمتہ الحمصی نے ابویوسف بن اسحاق کندی کی اصلاح سے احمد معتصم کیلئے ارسطاطالیس کی فن الٰہیات کا ترجمہ کیا تھا۔

اقوال افلاطون- اس نام سے ایک کتاب موجود ہے جسمین افلاطون نے طریق تحصیل حکمت پر بحث کی ہے - مترجم کا نام معلوم نہین۔

ثمرۂ بطلیموس- بطلیموس نے احکام تنجیم مین اپنے شاگرد سیوریس کے لئے چار کتابین لکھی تھین - یہ ایک کا ترجمہ ہے۔

میارطیس ارسطو- دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے ابوبکر بن طاہر العملی الغزاری کوئی بزرگ ہین جو متعدد اسناد و روایات کی بنا پر اس کتاب کو ارسطو کی تصنیف بتلاتے ہین۔ یہ ایک بالتصویر کتاب ہے اور مختلف طلسمات و نیرنجات پر بحث کیگئی ہے - اسی جلد مین جسپر الاسرین کی غلطی سے الگ نمبر نہین ہے ایک دوسری تصنیف ہرمس کی ہے جسے عطارد بن الحاسب نے ترجمہ کیا ہے - یہ کتاب تاثیر الاحجار کے بیان مین ہے۔ سارا کتب خانہ ایک علمی سمندر ہے جسکی تصریح کیلئے یہ مختصر مضمون کافی نہین تاہم بعض علم دوست حضرات کیلئے یہ چند سطور بھی دلچسپی سے خالی نہونگی۔

حبیب الرحمن

ریویو

مستقبل اسلام

(مترجمہ مولوی ظفر عمر صاحب بی اے - ٹوپی شاپ علی گڑھ - قیمت ۸)

پروفیسر ویمبری ہنگری کے بڑے مشہور عالم اور سیاح ہین - آجکل کے مستشرقین مین انکا رتبہ بہت ممتاز ہے - مختلف مشرقی زبانون مین دستگاہ رکھنے کے علاوہ آپ اکثر بلاد مشرقی کی سیر بھی کر چکے ہین - ایران اور ترکستان مین آپنے درویشانہ حیثیت سے سفر کیا تھا اور ایسی کامیابی کے ساتھ کہ دوران سفر مین آپکا راز کسی پر افشا نہ ہوا - اس سفر کے حالات کو آپنے اپنی کتاب موسومہ "اسٹوری آف مائی اسٹرگلس" (میری جد و جہد کا افسانہ) مین نہایت دلچسپ پیرایہ مین بیان کیا ہے - آپ کی تصانیف انگلستان مین بہت مقبول ہوئی ہین کیونکہ پروفیسر ویمبری انگلستان کے حامی اور روس کے مخالف ہین - منجملہ اور کتابون کے آپ نے ایک کتاب "ویسٹرن کلچر ان ایسٹرن لینڈس" (مشرقی ممالک مین مغربی تمدن) کے نام سے لکھی ہے - کتاب کے لکھنے کی بظاہر دو اغراض ہین ' اول پروفیسر ویمبری یہ ثابت کرنا چاہتے ہین کہ بہ نسبت روس کے انگلستان مین ایشیائی اقوام کی راہبری کرنے کی زیادہ قابلیت ہے - دوم یہ کہ اسلامی اقوام سے ترقی کرنے کی قابلیت ناپید نہین ہوگئی بلکہ چند اسباب اسکے سد راہ ہین ' اگر وہ اسباب دور ہو جائین تو ترقی کی شاہراہ پر اسلامی اقوام بھی قدم مار سکتی ہین ' اس کتاب کے تین حصے ہین - پہلے حصے مین روس کی ہجو ' اور دوسرے مین انگلستان کی مدح ہے - اور یہ دونون حصے غرض اول کے پورا کرنے کے واسطے لکھے گئے ہین - تیسرا حصہ جسکا نام "فیوچر آف اسلام" (مستقبل اسلام) ہے دوسری غرض سے متعلق ہے اور ایشیائی ناظرین کے لئے زیادہ دلچسپ ہے - اس حصہ کا ترجمہ مولوی ظفر عمر صاحب بی - اے - نے حال مین کیا ہے "مستقبل اسلام" کا حجم ۱۹۵ صفحات کا ہے اور لکھائی چھپائی قابل تعریف ہے - ترجمے کی اصلی خوبی یہ ہے کہ اسپر تصنیف کا دھوکا ہوتا ہے - اس ترجمے مین یہ وصف بدرجہ اتم موجود ہے اور اگر کتاب کے اصلی مصنف کا نام حذف کر دیا جائے تو وہ مترجم کی تصنیف معلوم ہوتی ہے - مولوی ظفر عمر صاحب نے جا بجا فٹ نوٹ اور حواشی ایزاد کر کے کتاب کی خوبی کو بڑھا دیا ہے -

اس ترجمے کے علاوہ پروفیسر ویمبری کی اصل کتاب بھی ہمارے پیش نظر ہے - اسمین کلام نہین کہ روسیون نے وسط ایشیا مین اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے اکثر جابرانہ کارروائیان کین اور اگر روس اور انگریزی پالیسی کا مقابلہ کیا جائے تو کیا بلحاظ وسائل اور کیا بلحاظ نتائج انگریزون ہی کا پلہ بھاری رہیگا - ساتھ ہی اسکے انصاف ہمکو یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ ویمبری صاحب نے کہین کہین جنبہ داری کے جوش مین اُسی حکومت کو اصل سے زیادہ خراب اور انگریزی

حکومت کو اصل سے زیادہ اچھا دکھلایا ہے مثلاً پروفیسر صاحب نے اُسی جبر و ظلم کے تذکرہ مین ایک یورپین عالم کے قلم سے ذیل کا اقتباس درج کیا ہے۔

"پادریوں" کا جلوس بڑے تزک و احتشام کے ساتھ میدان مین پہونچا جسکے وسط مین نائب سلطنت کے لئے اونچا چبوترہ بنایا گیا تھا۔ چارون طرف تماشائیون کا ہجوم تھا۔ مین بھی ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو کر تماشہ دیکھنے لگا۔ باجون کی آواز اور قومی راگ دور سے سنائی دیتے تھے۔ یکایک روسی ایشیائی باشندون پر ٹوٹ پڑے مقدس اور معمر آدمیون کے سر سے عمامہ اُتار اُتار کر بتر مین پھینکنے لگے اور پھر آدمیون کو بھی ڈھکیل دیا۔ بیچارے مسلمان کیچڑ پانی اور شرم سے آلودہ ہو کر عیسائیون کے شہر سے باہر بھاگے مگر دور تک لات گھونسے کی مار پڑتی گئی۔ یہ دیکھکر مجھسے نہ رہا گیا اور بے اختیاری نے سوال کیا کہ "کیا تم عیسائی ہو اور صلیب مقدس کے سایہ تلے ایسی حرکتین جائز رکھتے ہو" مگر اس نقار خانے مین طوطی کی آواز کون سنتا۔ البتہ ایک افسر نے جو بہ نسبت دوسرون کے زیادہ تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا کہا "کیا تم خدائی فوجدار ہو" اور ہنسکر اپنی راہ چلا گیا۔ دوسرے روز اس جشن کے متعلق جو سرکاری رپورٹ اخبارات مین شائع ہوئی اُسکا مضمون یہ تھا کہ تمام شہر مین چہل پہل رہی۔ روسی اور ترکستانیون کے غول کے غول شادمانی کے نعرے بلند کرتے ہر چار طرف نظر آتے تھے۔ شہنشاہ روس کی جشن سالگرہ کی بدولت اس اتحاد اور یگانگت کے اظہار کا بخوبی موقع ملگیا جو روسیون اور رعایا کے درمیان پائی جاتی ہے۔"

کون ایشیائی ہے جو اس بیان کو پڑھے اور اُسکو حرارت نہ آتے۔ لیکن انصاف ہمین یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا تحکم پسندی ہندوستان مین مفقود ہے۔ کیا ریل کے سفر مین اس قسم کا برتاؤ آئے دن ہمارے ملک مین نہین ہوا کرتا۔ پھر کیون پروفیسر ویمبری نے حصہ اول مین یہ حالات تو لکھے مگر دوسرے حصہ مین اُن واقعات کو نظرانداز کر دیا؟ شاید اسکا سبب یہ ہو کہ پروفیسر صاحب موصوف اہل انگلستان کو ناراض نہین کرنا چاہتے۔ ایک موقع پر پروفیسر ویمبری صاحب لکھتے ہین۔

"سلطنت انگلشیہ کو ہندوستان مین بھی جہان ۷ کرور مسلمان آباد ہین کسی فوری خطرہ کا اندیشہ نہین ہے جبتک کہ عدل و انصاف و انسانیت کے اصول پر گورنمنٹ کاربند ہے اور مسلمان اور وشنو پرست ہندوؤن مین رقابت باقی ہے جو غیر ملک کی حکومت کے لئے سپر کا کام دیتی ہے۔"

گویا انگریزی گورنمنٹ کی پالیسی اپنے استحکام کے واسطے یہ ہونی چاہئے کہ ہندوؤن اور مسلمانون کی مخالفت کی آگ کو بھڑکائے۔ کیا کوئی ہندوستان کا بہی خواہ کہہ سکتا ہے کہ یہ پالیسی انصاف اور ایمانداری پر مبنی ہے؟ علاوہ برین وسط ایشیا کے حالات سے تو آپ کو ذاتی واقفیت ہے اور اسیوجہ سے آپ کی راے مین واقعات کے متعلق شک و شبہ کی گنجائش نہین لیکن کتاب کے دوسرے حصہ مین جہان ہندوستان کی انگریزی حکومت کا بیان کیا گیا ہے وہان معلوم ہوتا ہے کہ کسی ناواقف کار نے گھبراہٹ مین ادنیٰ درجہ کی انگلو انڈین تصانیف کا خلاصہ کر دیا ہے اور اس حصہ کے اکثر واقعات مین ایسی غلطیان ہین جنکو پڑھکر ہندوستان کے طفل مکتب کو بھی ہنسی آئے گی۔ ہمارے

پروفیسر صاحب کا لیکٹ اور کلکتہ۔ پشیوا ور پشاور مین امتیاز کرنے سے قاصر ہین۔ سرسالار جنگ اور نواب عبدالطیف کا شمار آپ ہندوؤن مین کرتے ہین اور پنجاب اور سندھ کا الحاق ۱۸۵۸ء مین قرار دیتے ہین۔ اگر آپ نے ہند کی سیاحت کی تکلیف بھی گوارا فرمائی ہوتی تو یقیناً آپ کی تصنیف ان لغزشون سے پاک ہوتی۔

پروفیسر ویمبری کی کتاب کا سب سے زیادہ کارآمد اور قابل قدر حصہ اسکا تیسرا باب ہے جسکا ترجمہ کا ہم اسوقت ریویو کر رہے ہین اور جسکا نام "مستقبل اسلام" ہے پروفیسر ویمبری کی یہ رائے ہے کہ اسلام بذات خود ترقی مین بارج نہین لیکن اسلامی ممالک مین چند اور وجوہ ایسے پیدا ہوگئے ہین جنھون نے اسلامی اقوام کو چاہ ذلالت مین گرادیا ہے۔ انمین سب سے زیادہ قوی سبب اسلامی ممالک مین شخصی سلطنت کا رواج ہے۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہین۔

"حقیقت یہ ہے کہ اسلام یا اسکے معتقدین کیوجہ سے ایشیا کا مغربی حصہ برباد نہین ہوا اور نہ دین اسلام مسلمانون کے موجودہ تنزل اور انحطاط کا ذمہ دار ہے بلکہ اصل مین اسلامی بادشاہون کا ظلم و تشدد اس خرابی کا باعث ہے۔ انھون نے دیدہ و دانستہ پیغمبر عربی کی تعلیم کو اپنے فائدہ کی غرض سے دیگر شکل مین ظاہر کیا اور اپنی مطلق العنانی اور خودمختاری کی حمایت مین قرآن پاک کی آیات کا بیجا استعمال کیا۔ انھون نے مذہبی باتون مین نکتہ چینی کرنے اور آزادانہ خیالات کی اشاعت کو سختی کے ساتھ روکا اور اسطرح انھون نے اسلامی ترقی کی صبح صادق کو روشنی پھیلانے سے باز رکھا۔"

دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک مین قومیت کا احساس ابتک نہین پیدا ہوا بقول پروفیسر ویمبری پولٹیکل آزادی کی تمنا پیدا کرنے کے لئے قومیت کا احساس ہونا لازمی امر ہے۔ اسلام مین قومیت کا خیال کبھی نہین پیدا ہوا کیونکہ قرآن مین "کل مومن اخوۃ" کی تاکید کی گئی۔

تیسری وجہ ایشیا کی کمزوری کی مذہب کا عالمگیر تسلط ہے جسکو پروفیسر ویمبری صاحب ذیل کے الفاظ مین بیان فرماتے ہین

"اور اگر باوجود اسکے اور نیز باوجود اپنے مذہبی اقتناع کے عیسائی دنیا نے ازمنہ متوسط کی تاریکی سے نکلکر عقل اور فہم کی روشنی مین قدم رکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تو پیروان دین اسلام کے لئے ایسی ترقی و تبدیلی کسقدر زیادہ آسان تھی بشرطیکہ اہل ایشیا مین اپنے پیشواؤن اور بادشاہون کے جبر و ظلم کی دوہری بیڑیون سے آزادی پانے کی قوت ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ یہی باعث ہے کہ یورپ نے جوش جوانی اور اپنی پوری قوت کے ساتھ کوشش کرکے تہذیب و تمدن کی عمارت کو بہ نسبت کہن سال سست اور کاہل وجود ایشیا کے بہت زیادہ بلند کرلیا۔ مسلمانون کی کاہلی کے ذمہ دار اصول اسلام نہین بلکہ مذہب کی مجموعی حیثیت جو تمام ایشیا مین اب بھی وہی قوت رکھتی ہے جو اُسے ازمنہ متوسط مین یورپ مین حاصل تھی۔ اُسکا زور ہر چیز مین محسوس ہوتا ہے ، تمام انسانی خیالات اور خدمات مین اسکا تسلط ہے اور روزانہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے کامون مین بھی اس کا اثر ہے آدمیون کی نشست و برخاست۔ کھانے پینے سونے حتی کہ عشق و محبت مین بھی مذہب کو دخل ہے گویا طلسما کا حصار انسان کے گرد کھچا ہوا ہے جسکے باہر قدم نکالنا محال ہے اور انسان مثل

شیرخوار بچے کے ہے، اور جسطرف مذہبی یا دنیوی پیشوا چاہتے ہین اُنگلی پکڑکر چلاتے ہین"

یہ اسباب جو پروفیسر ویمبری نے اسلامی ممالک کی کمزوری کے قائم کئے ہین۔ ہماری راے مین بھی صحیح ہین اور انکا اطلاق اسلامی ممالک کیا معنی ساری ایشیا پر ہوتا ہے لیکن انھون نے جو نتیجہ اس سے اخذ کیا ہے وہ ایشیا والون کے واسطے نہایت دل شکن ہے۔ وہ فرماتے ہین۔

"چونکہ صورت معاملہ یہ ہے اسلئے اسلامی ممالک کو جو اب تک خود مختار ہین مروجہ تمدن کے ساتھ اخلاقی اور مادی اتحاد حاصل کرنے کے لئے اپنی پولٹیکل آزادی اور خود مختاری کو کسی نہ کسی دن قربان کرنا پڑے گا اور ایک تمدن کو دوسرے تمدن اور معاشرت سے تبدیل کرنے کے لئے غیر ممالک کی حکومت مین لازمی طور سے آنا پڑے گا"

پروفیسر ویمبری کی راے ہے کہ:۔

"اسمین شبہ کرنے کے لئے کئی وجوہ ہین کہ ٹرکی مین زمانہ حال کے مطابق سیاست اور رواداری کے اصول پر متمدن حکومت قائم ہوسکے گی کیونکہ اس سے اسلامی سوسائٹی کی تبدیلی اور نیز جملہ غیر ترک اقوام کا ترکون کے زیر حکومت ہونا لازم آتا ہے"

آگے چلکر آپ فرماتے ہین کہ:۔

"اسوقت ایران کی قسمت انگلستان اور روس کے ہاتھ مین ہے .... انکی قسمت مین یہی لکھا ہے کہ انکا ملک ان دو سلطنتون مین باہم جسطرح وہ اپنے لئے مفید سمجھین تقسیم ہو جاے"

یہی حال پروفیسر ویمبری کی راے مین افغانستان کا ہونا ہے:۔

"پس افغانستان کی قسمت مین بھی وہی بدا ہے جو مشرق کی دیگر اسلامی خود مختار سلطنتون کو پیش آیا یا آئیگا اور اگر افریقہ مین جہان اشاعت اسلام کو بڑی ترقی ہے، کوئی جدید اسلامی سلطنت قائم نہ ہوئی تو اسلام کی پولٹیکل آزادی تباہ و برباد ہو کر رہیگی"

یہ ہے پیشین گوئی اس فرنگی درویش کی آیا یہ صحیح ثابت ہوگی یا وہ بیداری کے آثار جو اسوقت ٹرکی، مصر، اور ایران مین نمایان ہو رہے ہین اسکا ابطال کرینگے زمانہ خود بتلا دیگا

علی خانوف

سینے کی کل۔ ہندوستان مین سلائی کی مشینون کا عام رواج ہے، یہانتک کہ دیہات مین بھی انکا چلن ہو چلا ہے۔ جب مشین مین کوئی نقص ہو جاتا ہے، تو ہر جگہ اسکی مرمت و درستی کا انتظام نہین ہو سکتا اور اسو جہ سے اچھی اچھی قیمتی مشینین بھی بیکار پڑی رہتی ہین۔ دفتر "کاریگر دیوبندی" بنارس نے حال مین ایک چھوٹی سی کتاب شائع کی ہے جسکا نام "سینے کی کل" ہے۔ اسمین تصویرون کے ذریعے مشین کے اصول اور پرزون کا عمل سمجھایا گیا ہے، اور ہر شخص اسکے مطالعہ سے مشین کے بہت سے نقائص کو خود رفع کر سکتا ہے۔ آٹھ آنہ قیمت بھی کچھ زیادہ نہین ہے۔

جناب رشید لکھنوی

سید محمد مصطفیٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشید مرثیہ گو سید احمد مرزا صاحب صابر مرحوم کے صاحبزادے ہین بچپن سے لوگ آپ کو پیارے صاحب پیارے صاحب کہتے تھے آخر یہی نام ہو گیا۔

صابر مرحوم کی شاعری نے تو بقدر شہرت نہین حاصل کی لیکن رشید کے عم بزرگ سید حسین مرزا صاحب عشق نامی مرثیہ گو تھے۔ وقعت فن کے خاندان سے ابتدائی تعلیم کے بعد رشید صاحب نے انھین کی شاگردی اختیار کی۔ آپ کے دوسرے چچا سید مرزا صاحب تعشق بھی اچھے شاعر تھے اور تغزل کا رنگ انکے کلام مین اچھا تھا۔ رشید صاحب نے دو استادوان کی نگرانی مین فن شاعری حاصل کیا۔

انکے والد سید احمد مرزا صاحب صابر میر ببر علی صاحب انیس مرحوم کے خویش تھے اس لحاظ سے جناب رشید کو اپنے نانا کے رنگ شاعری پر ناز تھا مگر تعلیم کا اثر زیادہ ہوتا ہے اسلئے کہہ سکتے کہ جناب رشید کی مرثیہ گوئی نے آخر عشق کی شاعری کا رنگ اختیار کیا عشق اور انیس کی شاعری مین وہی فرق ہے جو انیس اور دبیر کی شاعری مین ہے۔ عشق مرحوم کی شاعری مین تحقیق الفاظ اور صحت روایات کا بہت خیال ہے۔ لیکن کلام کسیقدر روکھا پھیکا ہے اسی وجہ سے انکے کلام نے اتنی شہرت نہین حاصل کی۔ جناب رشید تعلیم فارسی سے فارغ ہوتے ہی شاعری کے زمرے مین داخل ہو گئے انکا رنگ تغزل بہت اچھا تھا اکثر روسا اور امرا کے مشاعرون مین بھی آپ شریک ہوا کئے ہین۔

عشق و تعشق کے بعد رشید کی شاعری نے شہرت حاصل کی۔ غزل کی مشق بہت چڑھی ہوئی تھی اسی لئے جب آپ نے مرثیہ گوئی مین قدم رکھا تو اسمین بھی غزل کا رنگ غالب رہا رفتہ رفتہ آپ مرثئے مین بہاریہ مضمون لکھنے لگے اور یہ روش آپ کی سب کو پسند آئی۔

جناب رشید کے مرثیہ مین ساقی نامے کا رنگ بہت جو کھا رہتا ہے جسمین آپ نے ظہوری کا رنگ اختیار کیا ہے۔ ابتدا مین آپ مرثیے بہت مشقت سے کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ حیدرآباد مین نواب بہرام الدولہ بہادر کے کانون تک آپکی مرثیہ گوئی کی خبر پہونچی تو اُنھون نے اپنی مجلس کے سلئے انھین کو تجویز کیا۔ نواب بہرام الدولہ کے یہان اکیس محرم سے تیس محرم تک مجلسین بہت عظیم الشان ہوتی ہین جنمین اکثر حضور نظام حیدرآباد بھی رونق افروز ہوتے ہین۔ نواب بہرام الدولہ جناب رشید کی بہت عزت کرتے ہین اور بعد اختتام مجلس ایک ہزار یا پانچسو روپیہ بھی نذر کرتے ہین۔

پہلی ربیع الاول سے آٹھوین ربیع الاول تک آپ کلکتے مین سفیر ایران کے یہان مجلسین پڑھتے ہین۔

لکھنؤ مین آتوجی کی مسجد مین ایک مرثیہ پڑھتے ہین جسمین کثرت سے لوگ شریک ہوتے ہین اور لطف شاعری آتا ہے۔ تخمیناً دس بارہ برس سے آپ مجلس خوانی کرتے ہین۔

مرثیے کی بعض ٹیپین اور بعض بند آپ نے ایسے لکھے ہین جو لوگون کی زبانون پر رہ گئے ہین - سلام کے بعض شعر رباعیان پیری کی حالت مین ایسی لکھی ہین جنکی اساتذہ حال نے داد دی ہے -

ایک سلام کا شعر ہے جسمین پیری کی حالت کو نئے عنوان سے دکھایا ہے ؎

غرور اب کیا ٹہے گا خم ہوے اس درجہ پر آگے　　ہم اپنے سر کو اپنے پاؤن سے ٹھوکر لگاتے ہین

ایک غزل پر سلام لکھا ہے - ؎

کیا لیکے خاک تربت سرور بنائینگے　　دل اور ایک دل کے برابر بنائینگے
کرتے ہین جمع اشک ہمارے ملائکہ　　حورون کے کان کے لئے گوہر بنائینگے
حدا روتے جاتے ہین لوہا کیا ہے نرم　　قتل حسین کے لیے خنجر بنائینگے
تہ دامن رضاے خدا کو یہ دینگے طول　　اپنا کفن مزار کی چادر بنائینگے
ٹوٹے ہین دل غریبون کے باقی نہین ملا　　یہ جام بھکر لب کوثر بنائینگے
کر کے حسن کو خلق ہوا حکم کردگار　　اک فخر خاندان پیمبر بنائینگے
ہو جاے غرق کشتی امت مجال کیا　　شبیر اپنے صبر کو لنگر بنائینگے
کہتی تھی ذوالفقار نہ تھی مجھکو یہ خبر　　شبیر مجھسے تربت اصغر بنائینگے

مضمون نکال جاؤ ہزارون تم اے رشید
گلدستہ ان گلون کے سخنور بنائینگے

شاہی مین رشید کی عمر دس برس کی ہو گی اور اسوقت آپ کا سن پینسٹھ برس کا ہے - آپ بدن کے دُبلے اور نہایت ضعیف الجثہ ہین - فرماتے ہین " اسقدر ضعیف ہون اکثر چلنے مین گر گر پڑتا ہون "

تواضع اور انکساری مین آپ کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے مگر وہی شاعرانہ مبالغے کا پہلو لئے ہوئے - آپ کی بات بات سے شاعری ٹپکتی ہے -

---

یہ تو آپ اکثر کہا کرتے ہین کہ سب اچھے ہین مین بُرا ہون لیکن اسکو کوئی یقین نہین کرسکتا اسیطرح آپ کے انکسار کا ایک خاص رنگ ہے جسمین شاعری کا ایک جزو ملا ہوا ہے -

بہر حال لکھنؤ کا رنگ تصنع ابھی تک زندہ ہے اور مشرقی تہذیب کے لوگ اسکو برتنے پر مجبور ہین - لباس اور پوشاک مین بھی خاص امتیاز رہتا ہے - بات بات مین تکلف -

سچ بات تو یہ ہے کہ اس مٹنے پر بھی لکھنؤ کی خلقت غنیمت ہے -

عشرت لکھنوی

آداب مشاعرہ - حضرت رشید کی ہدایت ہے کہ ٹوپی سر سے اُتار کر نہ رکھی جائے - کسی کو اسقدر داو نہ دیجائے کہ وہ سمجھے مجھے بناتے ہین یا دوسرے شرکاء مشاعرہ کو ناگوار ہو مثلاً کسی کی غزل پر یہ کہنا کہ حضرت آپکی غزل پر مشاعرہ ختم ہے - اوروں کی دل شکنی ہے کہ ہماری غزل کچھ نہ ہوئی - لیکا یک یا اعتراضاً دوبارہ شعر کسی کا پھر مشاعرہ مین پڑھوانا نہ چاہئے - جس سے اعتراض ظاہر ہوتا ہے - غزل تمام اصناف سخن کی اصل ہے - غزل کے دو مصرعون مین ساٹھ چیزین دیکھنے کی ہوتی ہین - فصاحت کی بلاغت محتاج ہے اور فصاحت بلاغت کی محتاج نہین - فارسی یا عربی کے الفاظ بھر دینے کا نام بلاغت نہین ہے بلکہ اسکو غرابت کہتے ہین اور یہ غرابت عیوب شعر مین داخل ہے - بچے سے لیکر بوڑھا شاعر یعنی مبتدی اور منتہی سب ایک واہ کے لئے مشاعرہ مین آتے ہین ، کچھ اور نہین چاہتے لہذا داد کلام سب کو مساوی دینی چاہئے - غزل تمام اصناف سخن سے زیادہ دلچسپ چیز ہے - شاعری تمام علوم و فنون سے زیادہ مشکل ہے - بقول جلیل " جلیل شعر کا فن عمر بھر نہین آتا " حضرت رشید فرماتے ہین کہ صاحب پچاس برس کی مشق کے بعد مین نے یہ سمجھ کے غزل کہنا چھوڑ دیا [illegible]

موت اور اُسکی یاد

"موت اور اسکی یاد" اف! یہ کیسا ہیبت ناک خیال ہے یہ خود ہم جانتے ہین کہ ہر چیز کے لئے ایک دن فنا ضرور ہے' مگر اسپر بھی موت کا خیال جسوقت آجاتا ہے دل پر عجیب اثر پیدا کرتا ہے۔ جوان تو جوان' وہ بڈھا بھی جسکی پلکین تک سفید ہوگئی ہین اور اب سواے موت کے نہ اُسکو کسی چیز کا انتظار ہے نہ کسی شئے کی تمنا' اس نام کو جس خوف کے ساتھ سنتا ہے' کچھ اُسکے دل سے پوچھئے۔ موت انتہا سے زیادہ وقت کی پابند ہے۔ اسکا سلوک بچون' بوڑھون اور نوجوانون کے ساتھ یکسان ہے دُنیا کی ہر چیز اسکا شکار ہے۔ اسے نہ کوئی ٹال سکتا ہے نہ روک سکتا ہے۔ موت کیا ہے؟ اُس قوت کے نکل جانے کا نام ہے جو ہمارے جسم مین اسٹیم کا کام دیتی ہے اور جو قوت ہماری دینی کتابون مین روح کے نام سے تعبیر کی گئی ہے۔ مملکت جسم کی شاہنشاہ ہے۔ یہ ساری کرامتین جو حضرت انسان مین دکھائی دیتی ہین سب اسی کے دم سے ہین۔ ادھر یہ جسم سے رخصت ہوئی اور سارا کارخانہ درہم برہم ہوگیا۔ روح قفس تن مین ایک چہکتے ہوئے طائر کی طرح ہے جب یہ اس قفس سے اُڑ گیا تو جسم ایک خالی پنجرہ کیطرح رہگیا۔ پھر صرف ایک خالی پنجرہ سے کیا حاصل۔ وہ کس مصرف کا ہے؟ یون تو انسان کے لئے موت کا نام قہر ہے۔ مگر دو موتین حقیقتاً نہایت ہی سخت ہین ایک نوجوانی کی دوسری مسافرت کی۔

خیال کیجئے' ایک غریب مسافر بستر علالت پر اکیلا پڑا ہے اپنا بیگانہ کوئی خبر گیر نہین۔ وہ بیماری کی تکلیفون سے کراہتا ہے اور پھر خود ہی دل کو ڈھارس دیتا ہے۔ مگر اُسکا پژمردہ اور ضعیف دل قابو مین نہین۔ وہ اُس سے کہتا ہے۔ ہاے تو نے اپنے ساتھ مجھے بھی تباہ و برباد کر دیا۔ اب یہ تیری تسلی آمیز باتین تو میرے لئے اور بھی زہر ہین' مین تیری ایک نہ سنونگا یہ سب تیرا ہی کیا ہوا ہے۔ کاش تو مجھے دیار غربت مین نہ لاتا۔ للہ مجھے نہ چھیڑ' جی بھر کے تڑپنے دے۔ کیون' کیا تو مجھے تڑپنے نہ دیگا؟ آہ یہ کیسی بیرحمی ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ
باز میگوئی کہ دامن تر مشو ہشیار باش

وہ غریب مسافر درد دل کہے تو کس سے۔ وطن کی ہوا تک اُس تک نہین آتی کہ وہ کچھ اُسی سے اظہار حال کرے۔ غذا کیسی دوا تک میسر نہین اور ہو بھی تو وہ منتین اور خوشامدین کرکے پلانے والے کہان؟ ہر ساعت تڑپتے گذرتی ہے' ہر پل موت کی یاد دل کو پائمال کئے دیتی ہے۔ اب قریب ہے کہ اُسکی روح پرواز کر جاے۔ وہ گھبرا گھبرا کر اپنے پیارے عزیزون کو ڈھونڈ رہا ہے مگر کسی کو نہین پاتا۔ اُسکے لب ہل رہے ہین۔ کیا وہ کچھ کہہ رہا ہے؟ ہان وہ بہ منت باد صبا سے کہہ رہا ہے کہ "اے صبا میرے وطن کی طرف تیرا گذر ہو تو میرے دوستون کو میرا آخری سلام پہونچانا۔ اُنسے کہنا کہ تمہارا بہت انتظار کرتا رہا مگر آہ تم نہ آئے۔ گو تمہاری خیالی صورتون سے مین بغلگیر ہولیا مگر تسکین نہ ہوئی۔ دنیا اور اسکی

سرتین تمہین مبارک - مجھے دعاے خیر سے نہ بھولنا - اے صبا اگر تو میرے ننھے بچون سے ملے تو اُنکے نازک رُخسار کے بوسے لینا - اُنکی زلف مشکین سے لپٹکر کہنا کہ میرے پیارے بچو مرتے مرتے بھی تمہارا باپ تمہاری یاد نہ بھولا - خدا تمہاری خبر لیگا جو اپنی تمام مخلوقات کو پالتا ہے، جسکا رحم سارے عالم پر سایہ فگن ہے - میرا خیری سلام میرے پیارے بھائی بہنون اور کل عزیز و اقارب اور دوستون کو پہونچانا دیکھو بھول نہ جانا"!

یہ کہتے کہتے اُسکی آنکھین بند ہوگئین، موت کا پسینہ آگیا، روح جسم سے رخصت ہوگئی - آہ! وہ مرحوم دفن بھی کیا گیا تو ایسے مقام پر جہان اُسکی دلبستگی کے لئے دو چار قبرین بھی نہین صحرا کی خاک اُڑا اُڑ کر اُسکی قبر پر پڑ رہی ہے - امیدین قبر سے لپٹ کر زار و قطار رو رہی ہین - صحرا نے تو البتہ ہمدردی کی ہے کہ دو چار خشک پتے اور کچھ کمہلائے ہوئے پھول اُسکی قبر پر چڑھا دئے ہین، ورنہ کیسی شمع اور کیسی چادر ؎

بر مزارِ ما غریبان نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صداے بلبلے

اب ذرا میری خاطر سے اس باغ مین چلئے دیکھئے کیا بہار پر ہے - پھول کیسے کھلے ہوئے ہین - نہرین جاری ہین، فوارے چھوٹ رہے ہین، ہوا کیسی ٹھنڈی اور صحت بخش ہے - کہین گل و بلبل مین راز و نیاز کی باتین ہو رہی ہین کہین خوش الحان طائر چہچہا رہے ہین - کسی طرف گلاب کے تختون کی بہار ہے - کہین نسرین و یاسمن کے پھول دل چھینے لیتے ہین - گلچین کے دامن پر ہزارون باغ کی بہار نثار ہین - مگر ہاے یہ کیفیت بھی چند روزہ ہے - موت کے جد پسند ہاتھون سے یہ چیزین بھی نہین بچین - اسی باغ کو موسم خزان مین جاکر دیکھئے تو ایک عجب اُداس اور ابتر حالت مین پایئے گا - دیکھئے رخصت بہار کا زمانہ آگیا ہے - سارے درخت خشک ہوگئے ہین - موسم خزان کی پریشان ہوا نے خشک پتون اور مرجھائے ہوئے پھولون پر اتنا رحم بھی نہ کیا کہ انھین باغ مین رہنے دے - بلبلین بھی پھولون کے ساتھ کسیطرف کو اُڑ گئین ہین - سبزہ بالکل جل گیا ہے - ہوا نہایت ہی گرم اور پریشان چل رہی ہے - وہی باغ جسمین جانورون کی چہکار سے کان بھر جاتے تھے شہر خموشان کا نمونہ ہوگیا ہے - ہاے یہان کی یہی خزان رسیدہ چیزین جب بہار پر تھین تو انسے کیسا دل بہلتا تھا اب انھین کوئی نظر اُٹھا کر نہین دیکھتا - غمزدہ باغبان ایک گوشہ مین زانوے حسرت پر سر رکھے چپ بیٹھا ہے، باغ کی یہ حالت جسکی ہر ایک چیز سے دنیا کی بے ثباتی ظاہر ہو رہی ہے، دیکھی نہین جاتی - اس باغ کی بہار جب اسے یاد آجاتی ہے تو بیتحاشہ آنسو پھوٹ نکلتے ہین - وہ ٹھنڈی سانسین بھر بھر کر کہتا ہے کہ آہ! دنیا کی کسی شے کو ثبات نہین، انقلاب اسکی خاص صفت ہے -

اب ذرا اسطرف توجہ فرمایئے - دیکھئے! ماں باپ نے اپنے پیارے اکلوتے بیٹے کو محنت و مشقت سے پال پوس کر جوان کیا ہے - اُسکی شادی خانہ آبادی کی فکر مین ہین - راتین چین سے کٹتی ہین - دن عیش و عشرت مین بسر ہوتے ہین، تمنائین ہین کہ اُنکا کوئی حساب نہین - کل یہ کرنا ہے اور آج یہ کرینگے - اس قسم کے جوش بھرے خیالات اُسکے دل مین پیدا ہوتے رہتے ہین -

ایسا کوئی خیال اُسکے گرد نہین پھٹکتا جو اُسکے حوصلون

کو پست کر دے۔ اسکی عمر کی ہر ساعت ایک نئی تمنا پیش کرتی ہے جسے وہ چھپا چھپا کر خلۂ دل مین رکھتا جاتا ہے۔ گویا اُسنے ایک گلگشت باغ مین قدم رکھا ہے جسکے رنگ رنگ کے پھول وہ توڑنا چاہتا ہے۔ وہ گلشن تمارے واقعی زندگانی۔ آہ! ادھر موت نے اُسے اپنے آغوش مین لے لیا۔ اسکی ساری امیدین اور آرزوئین تباہ و برباد ہوگئین۔ اس مختصر زمانہ مین وہ کسی کام کو انجام نہ دے سکا۔ اسنے دنیا کی بہار کچھ نہ دیکھی۔ اُسکی بیوقت موت پر افسوس ہے۔ اُسکی روح عجب کشمکش مین ہے۔ آہ! وہ عجب حسرت بھری نگاہون سے لوگون کو دیکھ رہا ہے۔ گو وہ اپنی زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ مگر اسی خاموشی مین وہ سب کہہ گیا ؎

پھول تو کچھ دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچون پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

عابد حسین

انتخاب دیوان میر حسن (قلمی)

مرحوم لسان العصر کے جولائی نمبر مین میر حسن کے دیوان کا انتخاب شائع ہوا تھا۔ حال مین مجھے ایک کرمفرمانے قلمی دیوان میر حسن کا دکھلایا جو حیدر آباد کے ایک قدیم امیر کے کتب خانہ مین بہت احتیاط سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ چند اشعار اسمین سے انتخاب کرنیکا بھی موقع ملا جو مین ادیب مین لکھتا ہون۔ اس کلام مین اور اس انتخاب مین جو لسان العصر مین شائع ہوا ہے بہت فرق ہے۔ کیا عجب ہے کہ یہ انتخاب میر حسن کی آخری اور سلجھی ہوئی شاعری ہو۔ غرض جسقدر ہے دلآویز ہے تغزل بہت خوب ہے۔ ناظرین ملاحظہ فرمائین۔

غزل

ایک دل بس ہے جان کھونے کو ۔۔ کیا پڑی ہے خراب ہونے کو
غم کے کھانے کو بیٹھتا ہون اب ۔۔ پانی لا میرے ہاتھ دھونے کو
کچھ نہ سمجھا سیاہ اور سفید ۔۔ دل دیا سانولے سلونے کو
مجھپہ جھنجھلا کے یون لگا کہنے ۔۔ کیا کہون تیرے غصہ ہونے کو
منہ پہ آنسو ڈھرے ہی رہتے ہین ۔۔ آگ لگجائے ایسے رونے کو
بس حسن چونچلے نہ کر اُٹھ جا ۔۔ بیٹھ مت میرا گھر ڈبونے کو

پابند ہین گیسو کے زلفون کے حوالے ہین ۔۔ رسوائیون سے اپنے کیا پانون نکالے مین

کیا اب کے بھی جاؤ گے چلے چپکے ہی چپکے ۔۔ ایک بات تو سن جاؤ بھلا اور نہین تو

رہنے نہ دیگا اُس بن یہ دل کو ایک دم بھی ۔۔ کیون اُٹھکر ہم اپنا کھو دین عبث بھرم بھی
کھا لو قسم کہ پھر بھی آؤنگا گو نہ آ پھر ۔۔ بخشے ہے دلکو تسکین جھوٹی تری قسم بھی

مین کہا جی لیا مرا کس نے ۔۔ ہنس کے کہنے لگا کہ جی ہمنے

چشم بد دور تیری آنکھون مین ۔۔ نشہ ہے یا خمار ہے کیا ہے
غمزہ مین جوش مارا جو دریائے حسن نے ۔۔ جلوے ہزار کتون کے لپسینہ پہ آرہے

سید امین الحسن

کلامِ شوکت

غیر از بقا نشانِ فنا دل نشین نہ ہو　　جز لا مکان ہوائے مکان و مکین نہ ہو

کیون دل سے ہر نگاہ مین راز گزین ہو　　یعنی وہ جلوہ کیا کہ کہین ہو کہین نہ ہو

اُٹھتے ہین ہاتھ حرص کے مثلِ لبِ فسوس　　نخلِ طلسم دہر ہے تو میوہ چین نہ ہو

گر کچھ بھی تو رہ منزلِ عرفان کا پاس ہے　　غیر از نفس تو نفس سے ہرگز قرین نہ ہو

ہو محو سیرِ جنت نظارۂ جمال　　پُتلی وہ کیا ہے آنکھ کی جو حور عین نہ ہو

عرفانِ حق کا عقل سے ہے اور سد باب　　کنجی ہے مینخ قفل درِ آہنین نہ ہو

آلودہ کر نہ لب سخنِ زشت ترش سے　　اتبک جو انگبین ہے وہ سرکنگبین نہ ہو

تن پروران خاک ست ہے روح کو ثبوت　　آما جگاہ طعنۂ گردون زمین نہ ہو

اے عندلیب کیا سبق حرفِ فنا　　اوراقِ گل کی گردش کے غرین نہ ہو

عیش ابد نتیجۂ کردار نیک ہے　　کہتے ہین جسکو گلشن جنت جنین نہ ہو

چھیلا کے پاؤن سوتے ہین نیچ زندگی کے بعد　　تہ چرخ کی حریف لحد کی زمین نہ ہو

چین بر جبین سا کے کیون نقش بوریا　　ڈرتے خراب سجدۂ طاعت زمین نہ ہو

حاصل ہے اُسکو خلدِ حیاتِ ابد کی سیر　　پابندِ غم اسیر شہور و سنین نہ ہو

تھا نجد مین سوال یہ لیلیٰ سے قیس کا　　محمل نشین وہ کیون ہے جو محفل نشین نہ ہو

بادِ صبا حریف ہے مشتِ غبار کی　　نقشِ خرام ناز تو چین بر جبین نہ ہو

ہوتے ہین کامیاب بد ونکے طفیل نیک　　کب وصل حور عین ہو جو شیطان لعین نہ ہو

گھس جائے تار بین کے بلا سے ہون سو نقاب　　رونا نگاہ کا ہے اگر دوربین نہ ہو

کم ہین نگاہ ناز نہین کم رقیب سے　　اے لاغری خدا کے لئے نازنین نہ ہو

الیاس بھی ہو کوئی تو شوکتؔ ہو یار کیسے

جبتک کہ اتباع شہ یاد سین نہ ہو

یادگارِ سرور

(منشی درگا سہائے صاحب سرورؔ جہان آبادی مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام)

سر ٹپکتی ہے بیکسی دل کی　　تو نے ظالم خبر نہ لی دل کی

بیچ حضنا اندر کو ٹوٹنا، رونا　　ساری باتین ہین ایسی دل کی

وہ بھی سمجھاتے نہین افسوس　　کیا بُری شکل ہو گئی دل کی

اُنکے پہلو سے جلد یار اُٹھکر　　نہ گئی ہائے بیخودی دل کی

میرے خط کا جواب کیا لایا　　نامہ بر! کچھ خبر ملی دل کی

چٹکیون مین مسل کے پھینک دیا　　تمنے پوچھی نہ بات بھی دل کی

دیکھے چھینٹے نہ تم نے اشکون کے　　نہ بجھائی کبھی لگی دل کی

درد اُٹھ اُٹھکے کہہ رہا ہے سرورؔ

مجھسے اُٹھتی نہین کڑی دل کی

— + —

فقیرون پہ اپنے کرم اک ذرا کر　　ترے در پہ بیٹھے ہین صوفی بناکر

گناہین ہین ہم ہی کے رہنے والے　　ذرا اے شہ حسن دھو دیکھ آکر

بہت دیر سے در پہ سادھو کھڑا ہین　　فقیرون پہ آ تا ذرا کر دیا کر

پھرے تیری نگری مین ہم تیرے کارن　　جگایا الکھ ہمنے صوفی بناکر

نہین ہمکو خواہش کسی اور جگہ کی　　ہمین اپنے جوبن کا صدقہ عطا کر

سرورؔ انکی نگری مین سون بیٹھے ہم

فقیرانہ بھیس اپنا اکثر بنا کر

— + —

بخدا عشق کا آزار بُرا ہوتا ہے　　روگ چاہت کا بُرا پیار بُرا ہوتا ہے

جان پہ آ بنتی ہے جب کوئی حسین بھاتا ہے　　ہائے معشوق طرحدار بُرا ہوتا ہے

یہ وہ کانٹا ہے نکلتا نہین چبھ کر دل سے　　خلشِ عشق کا آزار برا ہوتا ہے

ٹوٹ پڑتا ہے فلک سر پہ شب فرقت میں — شکستہ ہوتی ہے تمنا کا برا ہوتا ہے
آہی جاتی ہے حسینوں پہ طبیعت ناصح — سچ تو یہ ہے کہ دل زار برا ہوتا ہے

تمام شب میں رہا انتظار میں بیدار — حضور خواب میں آئینگے یہ خیال نہ تھا
سوال وصل پہ آپ آ کے دیکھ بگڑ گئے — تمہارے سر کی قسم یہ مجھے خیال نہ تھا

خطا ہو گئی ہے گنہگار ہوں — جو چاہو سزا دو سزاوار ہوں
برا ہو ترا عشق خانہ خراب — کہ میں تیرے ہاتھوں سے بیزار ہوں
مری آرزوں کا خوں ہو گیا — یہ کس کا میں یارب دل زار ہوں
مداوا نہیں میرے دکھ کا سرور
میں اب اپنے جینے سے بیزار ہوں

پھول

کبھی یہ پھول ہے گلعذاروں کا زیور — کبھی یہ تختۂ تابوت پہ ہیں جلوہ گر
کسیکے پھولوں میں کام آکے بنگئے داغ جگر — کسی غریب کی تربت پہ گہہ بنے چادر
مشام جان ہے معطر کبھی تو نکہت سے — تو گاہ ہوتا ہے دوران گلو سے دردِ سر
کبھی بنے سرِ نوشاہ پہ گل حسرت — برآئی ان سے گہ امید مادر اور پدر
کبھی حسینوں کا بنتے ہیں یہ گلے کا ہار — کبھی ہیں پہلو نشیں سیج پہ تا بسحر
کبھی ہے باغ میں اور گہ ہیں پڑے بہار — کبھی سبد پہ ہیں سبزے کا گہہ بنے بستر
کبھی یہ ڈالیوں میں خوشنما دکھائی دئے — کبھی یہ دھوپ سے گر گر پڑے ہیں مرجھا کر
کبھی تو شوق سے گلچیں لئے ہے دامن میں — کبھی زمیں پہ کھاتے ہیں ہر طرف ٹھوکر
کسی نے شوق میں کپڑے بسائے ہیں ان سے — کسی نے انکا عرق کھینچا جوش دے دے کر
کبھی ہیں بلبلیں انپر نثار اور قمری — کبھی نثار یہ ہوتے ہیں خود حسینوں پر
کبھی تو کرتا ہے ہر وقت باغباں محنت — کبھی ہے بلبل نالاں خود انپہ چشم تر
کبھی ہیں ڈالیاں مست تصور عشاق — کبھی یہ پھول رسن سے بندھے ہوئے ہیں مگر
ہوائے باغ جہاں یک بیک بدل جو گئی — جو گل کھلے نہ تھے کلیوں کو ہو گئے دو بھر
یہی دو رنگی لیل و نہار دنیا ہے — کہ ایک حال سے ہوتی نہیں کسی کی بسر
صدائے خندۂ ہر گل یہ صاف آتی ہے — ہمیں تھا خوب جو پھولوں کے بنتے ہم پتھر
غرضکہ باغ جہاں میں ہر ایک فانی ہے — ہو اس میں غنچہ کہ گل ہو ثمر ہو یا کہ شجر

یہ جانتے اگر ہو جائیں چمن کے ہم تو ٹوٹینگے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

ماہ عظیم آبادی

غزل

(از پنڈت بشن نرائن صاحب در بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ)

فدا ہیں جان و دل اس مایۂ عصمت کے جوبن پر
پڑھیں حوران جنت بھی نمازیں جسکے دامن پر
ہمارا دل ہے پروانہ کسیکے روئے روشن پر
کہو برق تجلی سے گرے وادیِ ایمن پر
وہی ٹھنڈی ہوائیں ہیں وہی سبزہ کا عالم ہے
کرم ہے ابر باران کا وہی صحرا و گلشن پر
ابھی شیشے میں کچھ مے ہے ابھی اے ابر برسے جا
ابھی زہد و ورع کے داغ کچھ باقی ہیں دامن پر
دعا سے میرے باران بہاری کب برستا ہے
مگر ہاں اوس پڑ جاتی ہے اکثر میرے گلشن پر
کوئی طفل یتیم آغوش مادر سے جو چھٹتا ہے
ہماری آنکھ سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں دامن پر
حمائل دست رندان ہیں پڑے ہیں ہار پھولوں کے
گلوئے یار کا عالم ہے ہر شیشے کی گردن پر

جلا کرتی ہے جنکے انجمن مین شمع کافوری
جلاتے ہین چراغ اب آکے جگنو انکے مدفن پر

مٹے بن بن کے نقشے ہین یہان کن کن حسینونکے
عبث نازان ہین تصویرین دو دو زہ رنگ روغن پر

اُٹھاؤن منت بیگانہ تاب اتنی کہان مجھکو
بہت ہے آشنا کا بار احسان میری گردن پر

زبون بختی یہ ہے چھپر جو چھاؤن ابر باران سے
یقین ہے آسمان سے آگ برسے میرے خرمن پر

چمن والون کا آوردہ نہ آب جو کا پروردہ
مین ہون وہ سبزہ خودرو جو ہو دیوار گلشن پر

دم باران رحمت کیا سیہ مستون نے بدمستی کی
شراب اتنی اُڑا دی دھبّے پڑے بادل کے دامن پر

نہ رو اے ابر تم لیکن بقول حضرت آتش
ہمارے شعر کا انصاف ہے انصاف دشمن پر

مسدس

یون غرق بحر آب تو ہونا نہ چاہیے زندون کو خواب مرگ مین سونا نہ چاہیے
کشتی قوم سوتے ڈبونا نہ چاہیے وقت عزیز ہاتھ سے کھونا نہ چاہیے
جاگو کہ اب بھی وقت ہے باقی فلاح کا
جاتا رہے نہ یہ بھی زمانہ صلاح کا

سوچو تو غور کرکے ذرا احوال کا مآل انسان کو ضرور ہے انجام کا خیال
دیکھو تو آنکھ کھول کے اپنا شکستہ حال شرماؤ دیکھ کر بخدا حال پُر ملال
دن ڈھل گیا ہے آمد ظلمات شام ہے
اب بھی جو تم نہ جاگو عجب کا مقام ہے

چھوڑو بھی خانہ جنگی بے سود کو کہین آپس مین ایک دوسرے پہ ہو نہ نکتہ چین
اس جنگ باہمی سے تو کچھ فائدہ نہین حاصل نہ اسمین منفعت دہر نفع دین
یہ وہ مرض ہے جس سے کہ عاجز طبیب ہو
یہ وہ مرض ہے جس سے نہ صحت نصیب ہو

وہ شمع بزم اہل صفا مایۂ وقار وہ ماہ آسمان وفا جان افتخار
وہ مہر برج عزّ و شرف فخر روزگار اسلام جسکا نام جہان مین تھے جسکا
ہے معرض زوال مین جاگو خبر تو لو
جو کام کرنے آئے ہین وہ کام کر تو لو

رشک و نفاق و بغض و حسد کینہ و دغا کذب و غرور و فتنہ و مکاری و ریا
بخل و فساد غیبت و بے مہری و جفا غمازی و جہالت و خود بینی و ہوا
جبتک دلون سے دور نہ ہو یہ صفات زشت
سرسبز حشر تک بھی نہ ہوگی ہماری کشت

جب تک نہ اتحاد یہ باندھینگے ہم کمر جبتک نہ میل جول ہو باہم بیکدگر
جب تک نہ جانے عیب تو عیب اور ہنر ہنر جبتک نہ ہم برائیون سے ہون نہ باخبر
دیکھین گے حشر تک بھی نہ صورت کمال کی
ہرگز نہ ہم سے جائیگی نکبت زوال کی

نا امید ہون خدا کے کرم سے یہ بات کیا صادر ہوئی ہین گو کہ خطائین ہزار ہا
رحمان اسم پاک ہے شوکت رحیم کا وہ چاہے گر بھلا تو ہو یکدم مین سب بھلا
اُسکا جو حکم ہو تو اُسی دن نصیب ہو
نادم عدو ہو اور پشیمان رقیب ہو

شوکت

رباعی

اے بود کو نابود بنانے والے اے نیست کو ہست کر دکھانے والے
کچھ پا نہ سکے بھید تیری قدرت کا ڈھونڈا ہی کئے سارے زمانے والے

افسر (میرٹھی)

گفتگو

کرتی ہے عیب و ہنر کو آشکارا گفتگو
جوہرِ انسان کا ہے آئینہ گویا گفتگو

جس سے کھنچ جائے مخاطب کی طبیعت وہ ہے بیجا گفتگو
جو نہ کھینچے دل کو سامع کے تو وہ کیا گفتگو

آفتیں لاتی ہے سر پر بے سر و پا گفتگو
سر اٹھا دو تو دکھا دیتی ہے نیچا گفتگو

خامشی بہتر نہ ہو جائے نہ اصلا گفتگو
ہے یہی [illegible] جو کرو سنجیدہ بیجا گفتگو

غور پہلے کرتے ہیں اہلِ خرد دانا گفتگو
تا نہ آفت میں پھنسا دے بے محابا گفتگو

[illegible] آتی گفتگو
دوست کو کرتی ہے دشمن ناگوارا گفتگو

جاہلوں میں جنگ کا باعث ہوئی بیجا گفتگو
جہل سے لاتی ہے دیکھو رنگ کیا کیا گفتگو

جاہلِ عاجز کو عاجز دشمنی بناتی ہے عزیز
عالم متبحر کو کرتی ہے رسوا گفتگو

من سکت پر ہے عمل بنا کر عاقل ہو گیا
ختم کر دیتی ہے بے پایاں کا یا گفتگو

جب نکلتی ہے گلی تو صاف آتی ہے صدا
ہے گل احسن خموشی خار ایذا گفتگو

ہو نہ سامع کو تنفر ہو مخاطب سے نہ رنج
زجر سے جلا کے تم کرنا نہ اصلا گفتگو

غیر کو ہو گی غلط فہمی کہو گے تم غلط
بات بے سمجھے ہوئے ہرگز نہ کرنا گفتگو

جاتی ہے نخوت سے عزت آزمایا بارہا
کر نہ خود آرائی و شیخی سے خطا گفتگو

بات کرنا چاہیے سب سے علیٰ قدرِ عقول
کیجیے فہمِ مخاطب سے نہ بالا گفتگو

عرضِ مطلب میں رکھو ہر جا خیالِ مقتضا
بار خاطر بارہا ہوتی ہے بیجا گفتگو

ناک بھوں بیہم چڑھانا منہ بنانا غیظ میں
داخلِ تہذیب کب ہے یہ سراپا گفتگو

اے خوشا دل بدست آور کہ حج اکبر است
جس سے دل کو رنج پہونچے وہ ہے بیجا گفتگو

گفتگو سے پیشتر اپنا اجازت ہے ضرور
تا مخاطب سے کرے تو بے محابا گفتگو

چاہیے تمکو مخاطب کے مراتب کا لحاظ
سوچ لو پہلے ہی کرنا چاہیے کیا گفتگو

ہو جو دل برداشتہ محفل تو خاموشی ہے خوب
جب توجہ ہو نہ سامع کو ہے بیجا گفتگو

بات ہو اک تیر جستہ اور لبِ قائل کمان
اور دلِ سامع ہدف ہو جب ہے زیبا گفتگو

جھوٹ سچ کو مان لینگے آپ کی خاطر سے دوست
چاہیے تو یہ کریں تسلیم اعدا گفتگو

بات کہنا کان میں ہرگز نہیں زیبا تمھیں
مجمعِ اغیار میں کر دیگی رسوا گفتگو

صدمہ و ذلت میں دیکھو مبتلا ہو جاؤ گے
نامناسب ہے تمھیں چھپ چھپ کے سننا گفتگو

حرف شیریں بات سے زبان کو آشنا کرتے رہو
صبح گل کی لب پہ ہو جائیگی پیدا گفتگو

بات وہ تم بیان کرو جسکا ہو تمکو یقین
چاہیے ڈرتے رہو کر دے نہ رسوا گفتگو

باتیں دو شخصوں میں جو ہوتی ہوں تو خاموش رہو
دخل در معقول اسے جاہل ہے بیجا گفتگو

ہو ہو شیرینی و نرمی و فصاحت بات میں
سننے والے کو بنا دے کیوں نہ شیدا گفتگو

غیر پر راز اپنا افشا کرتے ہیں نادان ہی
یہی بے پردہ نہیں کرتے ہیں دانا گفتگو

[illegible]
دل میں لوگوں سے کرے نفرت نہ پیدا گفتگو

تم کو بھی پہونچے گا پہونچا دو ضرر جو غیر کو
چپ رہو تا کر نہ دے نقصان کسی کا گفتگو

کان دو ہیں اور زبان ہے ایک یہ کیوں اسلیے
سننا تم دو بار تو اک بار کرنا گفتگو

روک لینا چاہیے وقتِ غضب تمکو زبان
ورنہ نکلے گی دہن سے بے تحاشا گفتگو

افترا و تہمت و غیبت کا ہے انجام بد
یہ نصیحت ہے کچھ اسمیں تم نہ کرنا گفتگو

خامشی کے فائدے دیکھے بہت ہیں اے ذہین
کیجیے بیجا اگر دیتی ہے رسوا گفتگو

سید غلام مصطفیٰ ذہین

کلام عارف لکھنوی

نہیں ہے سنج دوپٹہ یہ فرق دلبر پر
چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا سر پر

وہ جلد آئینگے یا دیر میں خدا جانے
میں گل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر

نئی خوشی ہے کہ قاتل لقب ہو عالم میں
کہو تو ہاتھ بھی رکھا نہ جائے خنجر پر

جو دیکھتا ہے مجھے آہ بھر کے کہتا ہے
کہ اختیار کسی کا نہیں مقدر پر

جو ناشناس جفا تھے وہ سمجھے خندہ برق
ہنسی فلک کو جو آئی میرے مقدر پر

کب تسلی کو مری کافی ترا دیدار ہے
درد جب حد سے زیادہ ہو دوا بیکار ہے

ظلم صیاد تو ایسی کوئی بیداد نہیں
یہ ستم ہے کہ مجھے عادتِ فریاد نہیں

دمِ واپسین

آہ کیسا ہے وقت درد انگیز　　کیسا نظارہ ہے یہ رقت خیز
اُف ہے کیسا یہ دلخراش سمان　　عالمِ نزع مین ہے ایک جوان
اک طرف دوست و آشنا ہین کھڑے　　اک طرف غم مین اقربا ہین کھڑے
اک عجب خامشی کا عالم ہے　　جسکو دیکھو وہ چشم پُرنم ہے
کوئی فکرِ دوا مین ہے مصروف　　کوئی دل سے دعا مین ہے مصروف
دیکھو اک طرف طبیب کھڑے　　سب ہین بیمار کے قریب کھڑے
آہ اب اُس مریض کی حالت　　ہو گئی اور بھی ردی حالت
رخ کی رنگت بھی اب بدلنے لگی　　نبض بھی ابتو سُست چلنے لگی
اور حالت بگڑ گئی دیکھو　　سانس بھی اب اُکھڑ گئی دیکھو
کھلتی ہے اب زبان بھی دقت سے　　دیکھو آنکھین بھی لگ گئین چھت سے
ایک بچی بھی ہے قریب کھڑی　　متحیر وہ بدنصیب کھڑی
دیکھکر سب کے مُنہ پہ رنج و ملال　　کچھ نہ سمجھی کہ کیا ہے باپ کا حال
دیکھا جب سب کو چُپ کھڑے ہین اداس　　دوڑی اندر گئی وہ مان کے پاس
غمزدہ مان بھی سر جھکائے ہوئے　　اشک آنکھون مین ڈبڈبائے ہوئے
کیسی حالت بنائے بیٹھی ہے　　لو خدا سے لگائے بیٹھی ہے
آہ معصوم بچی نے جا کر　　کر دیا مان کا اور ٹکڑے جگر
گود مین جا کے پہلے بیٹھ گئی　　پھر چمٹ کر گلے سے یہہ بولی
آپ چُپ چاپ کیون ہین بیٹھی یہان　　کس لئے رو رہی ہین آج اماّن
ابّا کمرہ مین چپ پڑے ہین کیون　　لوگ گھیرے ہوئے کھڑے ہین کیون
اور بھی لوگ آتے جاتے ہین　　مرے ابّا کو کیون ستاتے ہین
چلکے کمرہ مین سب کو منع کرد　　نیند آتی ہے شاید ابّا کو
اسکی اس بھولی بھالی باتون نے　　دل ہلا دینے والی باتون نے
کیا کیا ہائے مان کے دل پہ اثر　　کر دیا اور ٹکڑے ٹکڑے جگر
دل مین سمجھی کہ اب ہے حالت غیر　　چیخ اُٹھی کہ ہو الٰہی خیر

حال اب کیا کرون رقم آگے
اب تو چلتا نہین قلم آگے

انجم

نوحہ وفات حضرت کمال لکھنوی

آہ اے چرخِ ستم پیشہ یہ کس تقصیر پر　　آفتین ڈھاتا ہے تو ہر دم میانِ لکھنؤ
خوب ہی صورت نکالی ہے یہ تو نے ظلم کی　　غم کے پتلے ہو رہے ہین ساکنانِ لکھنؤ
جائے شادی ہر محلے مین ہے اک ماتم بپا　　خانۂ رنج و الم ہے ہر مکانِ لکھنؤ
رشک سے تو ہو گیا ہے دشمنِ اہلِ کمال　　رل رہی ہے خاک مین سب آن بان لکھنؤ
بھولنے پایا نہ تھا رنج و غمِ مرگِ جلال　　محوِ افغان تھے ابھی پیر و جوانِ لکھنؤ
نام نامی جنکا دنیا بھر مین روشن ہو چکا　　تھے جو مشہور آفتابِ آسمانِ لکھنؤ
چین اسپہ بھی نہ آیا پھر دیا اک تازہ زخم　　پھر ہوئی سینے مین بسمل آہ جانِ لکھنؤ
بجھ گیا یعنی چراغِ زندگانیِ کمال　　ہو گئی بے نور بزمِ شاعرانِ لکھنؤ
شاعری پہ جسکی سحر سامری بھی تھا فدا　　جسپہ نازان تھے بہت جادو بیانِ لکھنؤ
روزمرہ کا مزہ تھا جسکے دم سے سر بسر　　جسکے حصے مین ازل سے تھی زبانِ لکھنؤ
جسکی رنگینیِ مضمون گل کھلاتی تھی نئے　　جسکے باعث سے ہرا تھا بوستانِ لکھنؤ
وہ رنگیلے شعر صورت دار وہ تصویر نظم　　وصف سُنکر جسکے قربان ہین بتانِ لکھنؤ
فکرِ دُنیا اُنکو لیجائے میانِ رامپور　　ہو گئے مجبور اتنا قدر دانِ لکھنؤ
یہ قیامت اسپہ غربت مین اجل بھی آ گئی　　پھر گیا ایسا نصیبِ ساکنانِ لکھنؤ
یہ وہ غم ہے یاد کر کے روئینگے اہلِ کمال　　جب تلک دنیا مین ہے نام و نشانِ لکھنؤ
خیر جو قسمت مین لکھا تھا ہوا وہ اے محب　　اب دعا کرتے ہین ہم حق سے میانِ لکھنؤ
یادگارِ زندگانی ہے جو تصنیفِ کمال　　دلکو بہلائین اسی سے نکتہ دانِ لکھنؤ
حشر کے دن سایۂ رحمت رہے مرحوم پر　　مانگتے ہین یہ دعا باشندگانِ لکھنؤ

محب (دریاآبادی)

غزل

(از سید محمد مصطفی صاحب زیبا بسم صاحب رشید لکھنوی)

شبہ ہے تمکو گمان تو شگوفے آئے رات کو
شبنم نہ آنسو ٹپکتے تھے ہمارے رات کو

آپنے پوچھا نہ جان و دل ہجر نے لی خبر
درد فرقت میں نہ کس کس کو پکارے رات کو

کہیں وہ بعد جمل باتیں ترجمہ گیا پھر شوق وصال
ہیں ابھی نکلے تھے جو ارمان سارے رات کو

دل جگر لینے پھر آسنے صبح کو کہتے ہوئے
رہ گئے بستر پہ دو موتی ہمارے رات کو

آپ آرایش بھی کرتے ہیں موافق وقت کے
دن کو منہ دھویا گیسو سنوارے رات کو

ڈھونڈتے پھرتے ہیں لوگ صبح سے آج اے رشید
ڈر رہا تھا ایک حجلہ میں ہمارے رات کو

کیا کرتے کیا نہ کرتے

تھوڑی سی زندگی میں آیا کئے کیا کرتے
اس دور سرسری میں کیا کرتے کیا نہ کرتے

ہستی میں آج آئے کل جائینگے عدم کو
ایسی رواروی میں کیا کرتے کیا نہ کرتے

جب موت زندگی کے جھگڑے میں ہم پھنسے
پھر ایسی بے بسی میں کیا کرتے کیا نہ کرتے

ہستی نے پہلے کھینچا پھر موت نے گھسیٹا
جب تھے کشاکشی میں کیا کرتے کیا نہ کرتے

فکر معاش کا گھن دلمیں لگا ہوا تھا
ہم کام زندگی میں کیا کرتے کیا نہ کرتے

ڈھائے ستم فلک نے آغاز ہی سے اے مہر
اس بیسوین صدی میں کیا کرتے کیا نہ کرتے

سکھدیو پرشاد مہر

رباعیات

زندہ ہیں تو اچھے بھی دن آئینگے کبھی
بگڑی ہوئی تقدیر بنائینگے کبھی
ہمت ہے تو دور نہیں منزل دوست
گرتے پڑتے پہونچ ہی جائینگے کبھی

پیدا ہوئی تھیں بہر تماشا آنکھیں
بس دیکھ چکیں تمام دنیا آنکھیں
بچپن دیکھا شباب دیکھا پیری دیکھی
دیکھوں مجھے دکھلاتی ہیں اب کیا آنکھیں

مقصود ہے راحت تو بہانہ کیسا
سننا بیکار کا فسانہ کیسا
پیری میں اجل نے بند کیں ہیں آنکھیں
یہ صبح کے وقت نیند آنا کیسا

محشر لکھنوی

تاریخ وفات

حضرت کمال لکھنوی

بلبل گلزار معنی تھا کمال
نوبہار شاعری دکھلا گیا
مہر موزوں ہے یہی سال وفات
اک گل باغ سخن کمھلا گیا

سنہ ۱۹۱۱ء

سکھدیو پرشاد مہر

ایڈیٹوریل

ملک مین یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ پڑھی گئی ہے کہ شمس العلما، ڈاکٹر **مولوی سید علی صاحب بلگرامی** بالقابہٗ ایم اے، ڈی لٹ، پی ایچ-ڈی، بیرسٹرایٹ لا، ۳ رمئی کو یکایک ہردوئی مین انتقال فرماگئے - شمس العلما، موصوف قوم کے ایک برگزیدہ ممبر اور اپنی بیش بہا علمی قابلیتون کے لحاظ سے فردِفرید تھے، ہندوستان وانگلستان اور دیگر بلاد یورپ بلکہ دنیا مین اُن کی علمی شہرت تھی، اور یقین ہے کہ اُنکی وفات کی خبر ہر جگہ نہایت رنج وافسوس کے ساتھ سُنی جائیگی - ہم مرحوم کے اہل خاندان کے ساتھ اُنکے رنج وغم مین شریک ہین، اور ان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہین ع

خدا بخشے بہت سی خوبیان تھین مرنے والے مین

آیندہ نمبر مین ہم مرحوم کے حالات وتصویر ہدیہ ناظرین کرینگے -

گزشتہ فروری مین گورنمنٹ کی تحریک پر ایک تعلیمی کانفرنس الٰہ آباد مین منعقد ہوئی تھی، جسکے صدر نشین مسٹر ٹیلر تھے جو گورنمنٹ ہند کے مشیر تعلیم ہین اس کانفرنس مین چار یوم تک تعلیمی معاملات پر بحث ہوتی رہی - حال مین اسکا نتیجہ شائع ہوا ہے -

کانفرنس مین یہ طے پایا ہے کہ دیہات مین بعد معائنہ جابجا مرکزی اسکول کھولے جائین، جنمین آس پاس کے گاؤن کے طلبا، آکر تعلیم حاصل کرینگے - تعلیم فی الحال ابتدائی تیسری جماعت تک ہوگی، اور بعد کو رفتہ رفتہ پانچوین جماعت تک کی جائیگی - دیہاتی اور شہری اسکولون کی تعلیم مین زیادہ فرق نہوگا - مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے باب مین بہت ردوقدح ہوئی پر چونکہ ممبران کسی ایک بات پر متفق الرائے نہین ہو سکے، لہذا اسکے متعلق کوئی فیصلہ نہین ہوا - استادون کی تنخواہ اور اسکولون کے عمارات کے متعلق جو فیصلہ ہوا ہے، وہ نہایت اطمینان بخش ہے - ہم امید کرتے ہین کہ گورنمنٹ ضرور تعلیمی کانفرنس کی تجاویز پر کاربند ہوگی -

---

حال مین آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی نے ہندو یونیورسٹی کی اسکیم شائع فرمائی ہے جسمین تعلیمی ضروریات کو نہایت وسیع پیمانہ پر پورا کرنے کی تجویز کی گئی ہے - یہ یونیورسٹی بنارس مین قائم ہوگی، اور اسکا نام "ہندو وشو ودیالہ" یا "ہندو یونیورسٹی آف بنارس" ہوگا - اس یونیورسٹی کے اغراض ومقاصد یہ بتائے گئے ہین -

ہندو شاستروں اور سنسکرت لٹریچر کے مطالعہ کی توسیع ؟

تمام شاخہائے علوم وفنون کی تعلیم وتحقیقات -

علمی، صنعتی وحرفتی تعلیم کی ترقی واشاعت

مذہب واخلاق کو تعلیم کا جزو لاینفک قرار دیکر نوجوانون مین اخلاقی قوت پیدا کرنا -

جو لوگ ہندو یونیورسٹی کے پہلے ٹرسٹی چنے گئے ہین، ان مین ہندوستان کے مختلف صوبہ جات کے قابل وذی عزت اصحاب شامل ہین جنکی تعداد ۲۱ ہے یقین ہے کہ گورنمنٹ کو چارٹر عنایت فرمانے مین کچھ عذر نہوگا -

---

ہندو یونیورسٹی کے ساتھ کس قسم کے کالج ملحق کئے جائینگے ؟ مذکورہ بالا اسکیم سے واضح ہوتا ہے کہ کالجون کی تعداد حسب گنجائش سرمایہ ہوگی، مثلاً (۱) سنسکرت کالج مع صیغہ دینیات (۲) کالج آف لٹریچر (۳) کالج برائے تعلیم صنعت وحرفت (۴) زراعتی کالج (۵) کالج برائے تعلیم تجارت وملک داری (۶) آیوردیدک کالج، جسمین طب جدید کی بھی تعلیم ہوگی (۷) کالج فنون نفیسہ -

---

حال مین جو مردم شماری ہوئی تھی، اُسکا یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تمام ہندوستان کی آبادی ۳۱ کرور ۵۰ لاکھ ایک ہزار ۹۹ آدمی ہین برٹش عملداری کے اندر ۲۴ کرور ۴۱ لاکھ ۶۷ ہزار تین سو ہے، اور دیسی ریاستون مین ۷ کرور ۰۸ لاکھ ۸۸ ہزار سات سو اٹھائیس آدمی ہین۔ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید اس مردم شماری مین ہندوستان کی آبادی کم نکلیگی لیکن خلاف اُمید تمام ملک کی آبادی مین بمقابلہ سنہ ۱۹۰۱ء ۷ فیصدی کی بیشی ہو گئی ہے یعنی دو کرور ۷ لاکھ ۴۴ ہزار ۳۴ نفر کی آبادی کا اضافہ ہوا ہے۔ اسمین برٹش عملداری مین ایک کرور ۲۵ لاکھ ۷۴ ہزار پانچسو ۴۷ اور دیسی ریاستون مین ۸۰ لاکھ ۹۲ ہزار چارسو ۹۷ کی تعداد بڑھی ہے۔ گو ممکن ہے کہ مکمل نقشون کی جانچ سے کچھ تفاوت نکلے مگر سر دست یہ تخمینہ بہت صحیح معلوم ہوا ہے۔

ہواخواہان اُردو یہ سُنکر خوش ہونگے کہ ریڈر کی ٹیچینگ کالج لکھنؤ مین اُردو مختصر نویسی کا جو طریقہ جاری کیا گیا تھا، اُس مین خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے۔ حال مین وہان ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جسمین اس طریقہ کی آزمایش کی گئی، اسکے طلبا فی منٹ ۲۰۰ لفظ بآسانی لکھ سکتے ہین۔ چنانچہ آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما نے جو تقریر اس جلسہ مین کی تھی اُسکی رپورٹ قابل اطمینان طریقہ مین لیگئی صدر جلسہ نے رائے دی کہ ہندی مختصر نویسی کا طریقہ بھی جاری کیا جائے۔

ناظرین ادیب کو اطلاع دیجاتی ہے کہ **منشی نوبت رای صاحب نظر** کا ادیب سے قطع تعلق ہوگیا ہے۔ لہذا آیندہ ادیب کے متعلق کسی قسم کی خط و کتابت اُنکے ذاتی نام پر نہ کی جائے۔ ادیب کے قلمی معاونون سے بھی درخواست ہے کہ وہ بھی اسکا لحاظ رکھین۔ آیندہ صرف اس پتہ پر خط و کتابت ہونی چاہیئے۔

ایڈیٹر ادیب، انڈین پریس الہ آباد

اس نمبر کی رنگین تصویر انڈین پریس کے ایک قابل مصوّر کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ اُس وقت کا سین ہے جبکہ کرکشیتر کی لڑائی ہونے پر تھی اور دریودھن اور ارجن سری کرشن جی کے پاس امداد کی غرض سے آئے ہین۔

سری کرشن مہاراج کے متعلق ہمارے مکرم جناب **منشی محمد حسین صاحب** نے ایک دلچسپ مضمون بھی ارسال فرمایا تھا جو اس پرچہ مین شائع کیا جاتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی رادھا کی رسوئی کی تصویر بھی شایع کی جاتی ہے۔ اسمین رادھا جی کھانا پکا رہی ہین اور سری کرشن دریچہ مین سے جھانک رہے ہین۔ لاہور کے عجائب خانہ مین اسکی اصل موجود ہے جو ہندوستانی مصوری کے اعلیٰ نمونون مین شمار کی جاتی ہے۔

خیرخواہان ادیب یہ سُنکر خوش ہونگے کہ منشی پیارے لال صاحب شاکر (میرٹھی) نے ادیب کی ایڈیٹری منظور کی ہے، چنانچہ آیندہ نمبر آپ کی ایڈیٹری مین شائع ہوگا۔ جناب شاکر صاحب کو لٹریری دنیا مین کافی شہرت حاصل ہے، آپکے مضامین نظم و نثر ہمیشہ مقبولیت کی نظر سے دیکھے گئے ہین۔ اُمید ہے کہ آپ کے زمانہ مین ادیب خاطر خواہ ترقی کرے گا (انشاء اللہ تعالےٰ العزیز)

منیجر ادیب، انڈین پریس الہ آباد

جون سنہ ۱۹۱۱ء

ادیب

جلد ۳ — نمبر ۶

تخت و تاج

در بار مین حضور کے چہرہ کی ہے ضیا
ملبوس زر فشان ہے تجلّا ہے نور کا

بعض لوگ کہتے ہین دُنیا مین جبتک درجوں اختیارات قدرت و جبروت کی مساوات نہ ہو تب تک مخلوق یا انسانی جماعتین خوشی اور آرام سے نہین رہ سکتین اور نہ ہر ایک خلقت اپنا حق پا سکتی ہے۔ مگر یہ ایسا خیال ہے جسکی زمانہ اور زمانہ کی رفتار تائید اور تصدیق نہین کرتی۔

بیشک ہر شخص آرزومند ہے او چاہتا ہے کہ اُسکی حیثیت اور حالت اوروں سے کسی صورت مین کم نہ ہو لیکن یہ بھی کوئی نہین چاہتا کہ کسی سے پیچھے رہے۔ ہر شخص دُنیا کی گھوڑ دوڑ مین آگے ہی نکلنا چاہتا ہے اور ہر شخص کی یہ خواہش ہے کہ دُنیا کی پُر رونق منڈی مین اُسکا نمبر سب سے اوپر ہو اور وہ کسی نہ کسی امتیاز سے خصوصیت دیا جاے۔

یہ کیون ہے؟ اسواسطے کہ انسانی فطرتون مین بھی قدرت نے یہ جذبہ ودیعت کر رکھا ہے اور ہر خلقت مین اسکا جوہر پایا جاتا ہے۔ سب انسان ایک ہی طریق سے پیدا ہوتے اور مرتے ہین اور ایک ہی طریق پر اُنکا شروع اور خاتمہ ہوتا ہے لیکن پھر بھی اُنکے امتیازی درجون مین کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ لوگ جُدا جُدا نام اسواسطے رکھتے ہین کہ ایک دوسرے سے تمیز کی جاسکے۔ اسیطرح پر درجون کے امتیازات کی بھی ضرورت ہے۔

انسان متمدن الطبع بنایا گیا ہے اور مدنیت اسکا خاصہ ہے۔ تمدنی ضرورتین چاہتی ہین کہ درجہ بندی ہو اور سواے درجہ بندی کے دُنیا کے کاروبار بسہولت نہین چل سکتے۔ اگر غور کیا جاے تو ثابت ہو سکے گا کہ خود انسان کا اپنا وجود ہی ان تمام ضروریات

و امتیازات کا بین ثبوت ہے۔ انسان کے وجود کی ترکیب ہی
ان تمام تفرقہ پسندیوں پر روشنی ڈالتی ہے ۔

انسان کے جسم مین جو قدرتاً اندرونی، بیرونی پُرزے
رکھے گئے ہین یہ ظاہر کرتے ہین کہ اُنمین کیا کچھ امتیازات اور
درجہ بندیان ہین - ایک ہی جسم مین سر اور پانون ہوتے ہین
لیکن دونون مین جو نسبت باعتبار ضرورت و حاجت اور
نزاکت کے ہے وہ پوشیدہ نہین ہے - ناک اور آنکھ قریب
قریب ہین لیکن دونون مین باعتبار کام ضرورت کے بہت
کچھ فرق ہے - اگرچہ سر اُس جسم مین سے ایک ہے جس مین
دو پانون ہوتے ہین لیکن سر کی جو عزت اور جو احترام ہے وہ دو
پانون کا نہین ہے، ناک کی وہ حالت نہین جو آنکھ کی ہے -
ہم اور پھیپھڑے مین فرق ہے اور یہ فرق قدرت نے خود ہی رکھا ہے -

آنکھ کے پھوٹنے سے روشنی اور بصارت جاتی رہتی ہے
لیکن ناک کے زخمی ہونے سے بصارت مین کوئی فرق نہین
آسکتا - سر کی چوٹ اور پانون کی چوٹ مین بہت کچھ فرق ہے
سر کے ماؤف ہونے سے دماغ اور دماغی طاقتون مین
ایک فتور فاش ہوجاتا ہے اور پانون کی چوٹ سے گو الم
اور درد کی سختی ہوگی مگر وہ صورت جو صدمہ سر سے عارض ہوتی
ہے پیدا نہین ہوسکتی - ان یا ایسے امتیازات کا قانون قدرت
قدم قدم پر نشان دیتا ہے اور پھر سمجھاتا ہے کہ اسکے بغیر گزارہ نہین -

جیسے انسان کا ایک بدن اور ڈھانچہ ہوتا ہے اور
اس بدن یا ڈھانچے مین مختلف کم وبیش چھوٹے بڑے
پرزے ہوتے ہین - ایسے ہی قومون اور انسانی جماعتون
کا بھی ایک بدن اور ایک ڈھانچہ ہوتا ہے اور اُسمین بھی مختلف
پرزے ہوتے ہین، کوئی کم، کوئی بیش، کوئی بڑا، کوئی چھوٹا
کوئی نرم، کوئی سخت، کوئی چُست، کوئی ڈھیلا -

دنیا کی ابتدائی تاریخین اگرچہ کیسی ہی دُھندلی اور نامکمل ہون
پھر بھی اُنسے بہیئت مجموعی یہ پتہ لگ سکتا ہے کہ اوپر کے اصول
کے مطابق شروع ہی سے ہر قوم، ہر جگہ اور ہر گروہ مین کوئی
میر قوم یا میر گروہ ہوتا چلا آیا ہے - وہ قومین جو اب تک وحشی
اور جنگلی ہین اُن مین بھی ابتک یہی رسم چلی آتی ہے - ہر وحشی
گروہ اور ہر وحشی فرقہ مین کوئی نہ کوئی میر قوم ہوتا ہے اور گروہ
یا فرقہ کے تمام پُرزے اور تمام اجزا اُسی میر قوم کے ہاتھ
کے نیچے رہتے اور بسر کرتے ہین - دُنیاوی امور مین نہین بلکہ
مادّی اور روحانی امور مین بھی یہی طریقہ مرعی ہے - مختلف
قومون مین اوتارون، رشیون، منیون وغیرہ کا آنا اور اُنکے
ہاتھ پر لوگون کا بیعت اور اقتدار کرنا صاف طور پر اس ضرورت
کا احساس کرا رہا ہے - کنبون اور گھرون مین بھی ایک صدر
مجلس ہوتی ہے اور اُسی کی تجویزات پر سب فیصلے ہوتے
ہین - اگرچہ دُنیا مین بادشاہتین اور حکومتین کیسے ہی مختلف
اسباب کے ماتحت نشو و نما پا چکی ہون اور اُنکا شروع کیسا ہی ہو
لیکن اُنکا اصول یہی تھا کہ ایک میر قوم ہو جسکے ماتحت سب افراد زندگی بسر کرین -

اگرچہ قومون اور گروہون مین سخت خونریزیان ہوتی
رہین اور چند در چند نسلین تلوار و نیزہ کی نذرین ہوئین مگر آخر مین
یہی فیصلہ ہوا کہ کوئی نہ کوئی میر قوم ہونا ضرور ہے - آریہ قومین
جب ہندوستان مین آئین اگرچہ اُنمین بھی گروہ در گروہ تھے
لیکن پھر بھی میر قوم کی اُنھین بھی ضرورت پڑی - آریہ قومون کے
دوسرے فرقے اور دوسری گروہ جو یورپ کی طرف نکلے اُنکا بھی
رجحان اسیطرف ہوا حالانکہ دونون کے مقاصد جداگانہ تھے
اور دونون کے واسطے میدان الگ الگ عربی اور شامی

ون سے بھی یہی روش اختیار کی۔ فارسی۔ چینی۔ جاپانی گروہ
بھی اسی خیال نے نشو و نما پایا اور اسی مین اعیبر پر کامیابی
ی۔ باوجودیکہ ہر شخص اسی بات کا خواہان رہا کہ وہی بادشاہ
یر قوم بنے مگر سہرا ایک ہی کے سر بندھا اور بالاتفاق ایک ہی میر قوم بنایا گیا۔
دنیاوی رنگ مین یہ کہا جائیگا کہ جس شخص کو اتفاقات
سنہ پیش آتے گئے وہی اپنے اپنے وقت پر ہر قوم بنتا گیا
ر اسی کی امارت تسلیم کی گئی۔

لیکن مادی رنگ مین اگر اس مسئلہ کا حل کیا جاے
اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی میر قوم سواے مرضی خداے کریم
قدرت کے نہین ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ ہر میر قوم اور ہر قوم
امارت کی ایک عمر ہے اُسکے مطابق قدرت انتظام کرتی
ہتی ہے۔ جب ہر مخلوق کی عمر اور زمانہ مقرر ہے تو کوئی وجہ
مین کہ میر اقوام یا بادشاہون کی کوئی زمانہ وار عمر نہ ہو۔

اگر ہم لگاتار تاریخین پڑھین اور بہ چشم غور دیکھین تو یقین
رنا پڑیگا کہ کسطرح کوئی قوم امارت کی وارث بنتی ہے اور کسطرح
سمین سے کوئی ایک شخص میر قوم بنا دیا جاتا ہے۔ ہندوستان
ین وارد ہونے کے بعد آریہ قومین جسطرح میر قوم اور صاحب الامارت
رار پائین اور اُسکے بعد مسلمان قومون نے جسطرح اُنکی کمزوریون
انہ جنگیون، نا اتفاقیون سے موقع پر فائدہ اُٹھا کر اپنا تسلط
و قمع و دخل کیا، اور مسلمانون کی کمزوریون، نا اتفاقیون،
انہ جنگیون سے جسطرح پرتگیزون، فرنچون، اور انگریزون نے
فائدہ اُٹھایا اور ایک دور دراز کے حصہ سے آکر جبروت و قدرت
حاصل کی یہ تمام سانحات اور تمام واقعات ایک چبھتے والی
طبیعت کے واسطے ایک ایسا سامان ہے جنسے وہ یہ نتیجہ
بآسانی نکال سکتا ہے کہ گو بظاہر قومون کی اپنی ہی لغزشون کے

یہ نتیجے ہین لیکن اگر اسکی تہ تک نظر کیجاے تو ماننا پڑے گا کہ
باوجود اسقدر جبروت و قدرت اور سامان کے ان قومون مین
دوئی کا آجانا نا اتفاقی کا پیدا ہو جانا سواے اسکے نہین
کہ کوئی مخفی طاقت وقت کے پورا ہونے کی وجہ سے خود
اس زنجیرون کی کڑیون کو حرکت دے رہی ہے اور سابق
کی کڑیون کے بجاے جدید کڑیان داخل کرنا چاہتی ہے۔

اگرچہ بعض لوگون کی نگاہون اور ضمائر مین یہ توجیہ
انوکھی معلوم ہوگی مگر یقین کرلو کہ معاملہ یون ہی ہے۔ قانون قدرت
اپنے منشاء کے مطابق حکومتون مین تداول اور تغیر و تبدل
کرتی ہے اور اسمین اُسکی جانب سے کوئی ناانصافی اور قبل از
وقت کوئی بات نہین ہوتی۔ ہر قوم کے تنزل کے موجبات
اور کوائف کو ساتھ رکھ کے دوسری حکومت کے آنے کے
اسباب پر جب غور کروگے تو بآسانی پتہ لگ جائے گا کہ دوسری
قومین پہلی حکمران قومون پر اُسوقت غلبہ پاتی یا غلبہ دیجاتی ہین کہ جب
(الف) پہلی قومونکی کمزوریان اور لغزشین حد سے باہر ہوجاتی ہین۔
(ب) جب اُنمین سے حکومت کے مواد کی عمدگی کم ہوجاتی ہے۔
(ج) جب ایک عام بے چینی پھیل جاتی ہے۔
(د) جب مخلوق عامہ آسائش سے کام نہین کرسکتی۔
(ہ) جب شخصی عیش و عشرت کی ضمانین بڑھ جاتی ہین۔

کوئی حکومت اور کوئی قوم پایۂ امارت سے سواے ان
امور کے یا اسی قسم کے اور امور کے گرائی نہین گئی ہے۔ کوئی
قوم یک لخت پس پا نہین کی گئی بلکہ رفتہ رفتہ اپنی کرتوتون کیوجہ
سے طعمۂ قدرت ہوئی ہے۔

کیا جب انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے تو اُسوقت
ہندوستان کی حکومتون اور طوائف الملوکی ایسی حالت نہ تھی؟

نیا مرہٹون اور بادشاہ محمد شاہ کے دور کی تباہیان اور لغزشین اس بات کا بیّن ثبوت ہین کہ کوئی دوسری قوم ہندوستان کی حکومت کیواسطے انتخاب ہو رہی تھی۔ اگر خود ہندوستان کے اہل کسی دوسری قوم کو چننا چاہتے تو انکا کیا نتیجہ ہوتا۔ خود قدرت نے انگریزون کو یورپین اقوام مین سے چن لیا اور انھین سات سمندر پار سے لا کر ہندوستان کا بادشاہ بنایا۔ انگریز صرف اپنی ہی قوت اور رعب کیوجہ سے اس ملک کے بادشاہ نہین ہوے ہین بلکہ اسمین خدا کا مقدس ہاتھ بھی ہے۔

اس خیال کی وجہ سے ایشیائی خیالات کے مطابق بادشاہ کو "حق تعالیٰ سے مقرب" اور "ظل اللہ" کہتے ہین مطلب یہ کہ اسکے ساتھ خدا کا مقدس ہاتھ ہوتا ہے جسکا کوئی دوسرا ہاتھ مقابلہ نہین کرسکتا۔ اسی قدر کہ جبتک خدائی ہاتھ ساتھ رہتا ہے۔

شاہجہان کے وقت سے انگریزون کی پیری سرزمین ہندوستان مین لگنی شروع ہوئی اور خدا کے فضل سے رفتہ رفتہ سرسبز ہوتی گئی۔ اگرچہ صدہا کیفیتین اور مقامی صعوبتین حائل ہوئین اور کبھی کبھی انگریزون کے قدم اُکھڑ بھی گئے اور بے وطنی نے دل اُکتا بھی دیا مگر چونکہ قدرت کو انکی حکومت اور انکا تسلط منظور خاطر تھا باوجود ان سب تکلیفون اور مصائب کے قدم جمتا ہی گیا۔ ایک مٹھی بھر دور دراز فاصلہ کی رہنے والی قوم سے ہندوستان جیسے براعظم مین کامیاب ہو جانا سوائے اسکے اور کیا کہا جاوے کہ خدا اُنکے ساتھ تھا اور ابتک ہے۔ انکا قومی کریکٹر، اُنکے قومی اخلاق، اُنکی بے تعصبی، اُنکے منصفانہ طریق حکومت، انکا علم، اُنکے اکثر امور مین شایستگی و اُنکی کامیابی کے علاوہ) کفیل اور ضامن تھے۔

ہندوستان نے ابتک چار حکومتین انگلستان کی دیکھین اور پائین۔

(۱) حکومت کمپنی۔

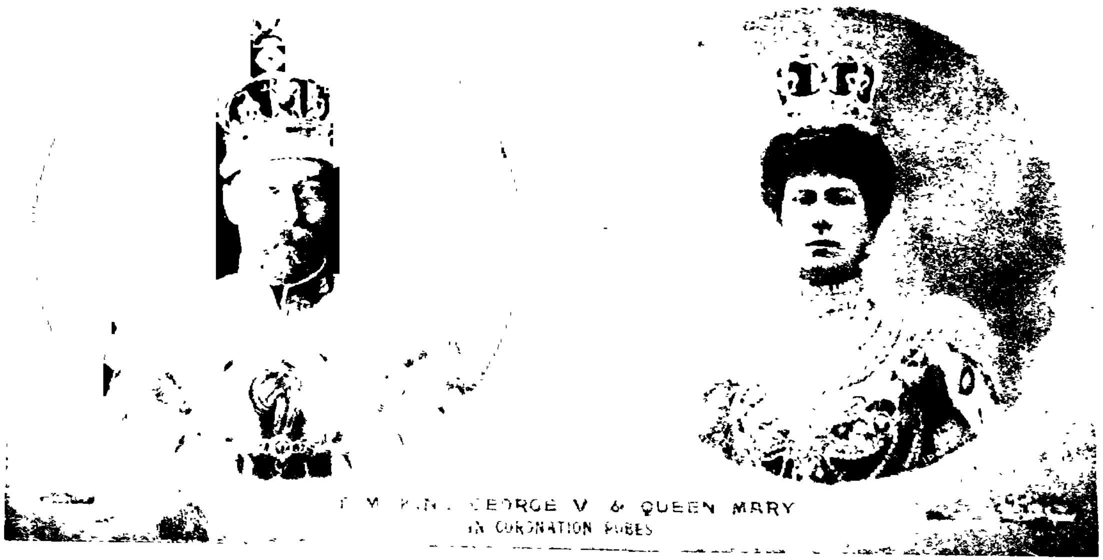
(۲) حکومت ملکہ معظمہ وکٹوریہ۔

(۳) حکومت شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم۔

(۴) حکومت جارج پنجم۔

تین حکومتین گزر چکین۔ دُنیا اور محکومون نے اُنکا طرز عمل انکا انصاف، اُنکا برتاو، اُنکا طریق حکومت اور اُنکا زمانہ دیکھ لیا۔ اب چوتھی نسل یا چوتھی حکومت کی باری آئی ہے۔ اس حکومت کیواسطے ہمین خوبی قسمت سے سورج کبھی غروب نہین ہوتا اور جسکی وسعت اقصائے مغرب اور اقصائے مشرق تک ہے۔ جارج پنجم بالقابہ کا انتخاب ہوا ہے۔ یہ انتخاب نفس اسوجہ سے نہین ہوا کہ جارج پنجم ایڈورڈ ہفتم کے صاحبزادے ہین بلکہ اسواسطے بھی کہ قدرت نے از خود انکی خوبیون کے خیال سے یہ انتخاب کیا ہے۔ یہ خیال ہمارا اُس اصول کے اقتدار کی وجہ سے ہے جسمین ہمنے یہ تسلیم کیا ہے کہ صرف خدائے کریم ہی اپنی مرضی سے ایسا انتخاب کرتا اور اُسمین برکت دیتا ہے۔

خیال کرو کون ایسا شخص ہے جو امیر اور بادشاہ ہونا نہین چاہتا۔ لاکھون نوجوان اور لاکھون سول اور فوجی افسران کا دل اور حوصلہ کون طاقت صرف ایک ہی شخص کی جانب موڑ دیتی ہے؟ وہی اعلیٰ طاقت جسے خدا کہا جاتا ہے۔ جارج پنجم کے ساتھ خدا ہے اور اُسکا فضل و کرم اور اُسکی عنایات اُسکے ممد و معاون۔ پہلی تین حکومتون مین ہندوستان جس صلح اور آشتی و آسائش کے زمانہ مین رہا ہے وہ دل سے شکریہ کے قابل ہے بخصوص جبکہ بعض گزشتہ کمزوریون کا اُس سے مقابلہ کیا جاے۔ ہر انسانی پرورش اور ہر انسانی حکومت باوجود اعلیٰ اور پاک



علیا حضرت ملکہ معظمہ میری دام اقبالہا

اعلیٰ حضرت شہنشاہ جارج پنجم دام ملکہ

صاف ہونیکے بھی کچھ نہ کچھ اپنے اندر کمزوریان رکھتی ہے۔ انسان کمزور ہے اور انسانی حکومتون کا جزو اعظم خود انسان ہی ہوتے ہین۔

یہ نہین کہ کمزوریان یا لغزشین کیون ہین بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اصولِ حکومت کیا ہے اور اُسمین اخلاق، تمدن، اور سیاست کے اصول کے مطابق اصلاح کہانتک ہے اور پہلوؤن سے اُسکی مجموعی نسبت کیسی ہے؟ انگریزی قوم نے ہندوستان مین جو طرز اختیار کیا ہے اور جو رفتہ رفتہ کر رہی ہے وہ اس بات کا ثبوت اور پیش خیمہ ہے کہ وہ ہندوستان کیواسطے موجودہ زمانہ مین ایک رحمت ہے اور اُسکا ہونا ضروری ہے۔

ہندوستان کی موجودہ حالت اس امر کی متقاضی نہین ہے کہ کوئی اندرونی حکومت اُسمین کام کرنے کے قابل ہوسکتی ہے یا انگریزون کے سواے کوئی اور بیرونی حکومت کام دیسکتی ہے۔ یہ واقعات موجودہ کا نچوڑ ہے اسمین نہ تو کوئی مبالغہ ہے اور نہ کوئی زائد حاشیہ۔

ہندوستان کے واسطے ان خیالات کی وجہ سے اعلیٰ حضرت جارج خامس کی تخت نشینی ایسی مسرت انگیز ہے جیسے خود انگریزون کے واسطے گو ہم انگریزون کے رنگ اور رعب لیاقت، اقبال، و دبدبہ مین اسقدر شریک نہین ہین جسقدر وہ خود ہین لیکن اس امن و امان کے خیال سے اُنکے شریک ہین کہ جو انگریزی دور کی وجہ سے ہمین حاصل ہو رہا ہے۔ انگریزون نے ہم سے اگرچہ ملک اور اقطاع موروثیہ حاصل کئے اُسوقت کہ جب ہم مین سے کوئی اس بار کے اُٹھانے کے قابل نہ رہا۔ لیکن ساتھ ہی اسکے جو آسائش، جو امن، جو ترقی انگریزون نے اسکے معاوضہ مین کشادہ دلی سے ہمین بخشی اُسکا معاوضہ ایک اور ملک بھی دیکر ادا نہین کر سکتے بیشک ہم مین سے بعض کچھ کشیدہ خاطر بھی ہونگے لیکن یہ بالکل درست اور صحیح ہے۔ ایسے لوگ بھی اصول حکومت، اور بادشاہ انگلینڈ یا انگریزی قوم سے کشیدہ نہین ہین بلکہ اُن بعض لغزشون سے جو کسی وقت اُنکے قائم مقامون سے سرزد ہوتی ہین اور جنکے صرف دو ہی سبب ہوسکتے ہین کہ یا تو اُنکی اپنی ذاتی غلطی ہے یا ہمارا ہی قصور فہم ہے۔

ارتقاء (Evolution) کا مسئلہ صرف انسانی نسل سے وابستہ نہین بلکہ حکومتون اور امارتون سے بھی ہے۔ دنیا مین شروع شروع مین حکومتون اور پھر اقوام کی کچھ اور حالت اور سمان ہوتا تھا۔ اب رفتہ رفتہ کچھ اور ہوتا جاتا ہے۔ اگر پچھلے بادشاہ آکر یہ سمان ملاحظہ کرین تو وہ حیران ہوکر یا گھبرا کر واپس جانے پر مجبور ہونگے۔

اب موجودہ زمانہ مین جسطرح ایک انسان بلحاظ کریکٹر کے تعریف کیا جاتا ہے۔ اسیطرح ایک حکومت کا بھی ایک کریکٹر ہوتا ہے جو پرائیویٹ کریکٹر سے ایک جداگانہ شئے یا جداگانہ حالت ہے۔ انگریزی حکومت کا کریکٹر فی الواقع ساری دُنیا مین بعض امور کے خیال سے بے نظیر اور لاثانی ہے اگرچہ اُسکے بعض حصون مین کچھ مدھم سے داغ بھی ہون جو اضطراری ہین لیکن اُسکی عام خوبی، علم عمدگی اور عام مضبوطی وغیرہ سے کسی صورت مین انکار نہین کیا جاسکتا اور وہ ہمارے اور خود انگلینڈ کیواسطے ایک الٰہی رحمت ہے۔ ہندوستان کا موجودہ زائچہ کہہ رہا ہے کہ اُسکی گنڈلیان نجات دہندہ ستارون سے لگا کھا رہی ہین اور خدا کی مرضی اور مہربانی سے ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے کہ ہندوستان انگلستان کا داہنا بازو شمار ہوگا اور اُسکی بہتری خود انگلستان کی بہتری ہوگی۔ صرف پار اور وار کا فرق رہ جائے گا باقی سلسلہ ایک ہی ہو جائیگا۔

ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم صحیح طور پر جارج پنجم بالقابہ کی حکومت کی برکات کا اعتراف کرین اور دل سے دعا کرین کہ ہمارا بادشاہ ہمارا حکمران اور اُسکا خاندان زمانہ کی دستبرد سے عمر بھر محفوظ

رہے - آمین ثم آمین -

وہ مسائل وہ آرام اور وہ حقوق تاقیامت جو انگریزی گورنمنٹ کی جانب سے ہمیں نصیب ہو رہی ہیں اس بات پر آمادہ کرتی ہیں (لفظی مذہبی ہی نہیں بلکہ اصلی روپ میں) کہ ہم صدق دل سے اس کارونیشن کی مبارکباد دیتے ہوئے جو اسی ماہ میں انگلینڈ میں وقوع پذیر ہے خوشی کے ساتھ اس عظیم الشان کارونیشن کا انتظار کریں جو بماہ دسمبر دلی میں ہونے والا ہے - انگلینڈ کا کارونیشن مقدمۃ زنجیر ہے اور ہندوستان کی مؤخرہ زنجیر، دونوں میں جو نسبت ہے وہ دونوں قوموں اور دونوں رعایا کے واسطے دونوں صورتوں میں مبارکباد کے قابل ہے - رفتہ رفتہ ہندوستان اور انگلستان کا ملاپ آپس میں ملتا جاتا ہے - یہ کسے خیال تھا کہ ایک زمانہ میں بادشاہ انگلینڈ ہند میں بھی رونق افروز ہونگے - یہ مقدمہ ہے ان فتوحات محکومانہ اور میابی ہائے معنوی جات کا جو آیندہ کے واسطے ہندوستان کے حصے میں آنے والی ہیں -

سلطان احمد

دھرم کا خیال

خیال اور اُسکی عجیب و غریب طاقت کی تحقیقات کے متعلق ابتک لوگون کی توجہ بہت کم رجوع ہوئی ہے - عام طور پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ خیال معمولی چیز ہے اور اُسکا اثر اسقدر نہین ہوتا جتنا ہندو شاسترون نے بالخصوص اور ہندو عُلما نے بالعموم زور دیا ہے کاش ہمارے اصلاح کرنے والے اگر ذرا بھی اس طرف متوجہ ہوتے تو نہ صرف اُنکا کام کامیاب نظر آتا بلکہ وہ زندگی کے تمام محکمون مین نمایان شخصیتین پیدا کرکے ملک مین سرگرمی و گرمجوشی کے زبردست سیلاب لانے مین کامیاب ہوتے -

اسوقت جو کامیابی کی غلط معراج ہم ہندؤن کے سامنے پیش کیجا رہی ہے وہ بالکل فضول اور بیمعنی ہے - ہم یہ نہین کہتے کہ جو لوگ کسی خاص مدعا کو نگاہ کے سامنے رکھکر کام کرنا اور کام کرانا چاہتے ہین وہ بالکل ہی بادہوائی ہے اور اُسکا کوئی نتیجہ نہ ہوگا - خیال چاہے کیسا ہی ہو اپنا اثر پیدا کرنے سے باز نہین رہتا - مگر اسقدر دیکھنا بھی لازمی ہے کہ آیا جنکو اس خاص خیال کی ظاہری دُھن لگی ہے اُسمین سچائی بھی ہے یا نہین اور آیا وہ خود اُسکے لئے موزون اوزار بھی ہیں یا نہین یہ دو ضروری شرطین ہین اور جبتک انپر غور نہ کر لیا جائے ساری کوششین بے سود و بے معنی ثابت ہونگی - کمزور آدمیون کے خیال کمزور ہوتے ہین اور اُنکا اثر بھی کمزور رہتا ہے - یہ اصلی سبب ہے کہ اُنکا کام شاندار اور وقیع نہین ہوتا -

دُنیا مین ہر قوم کا کوئی نہ کوئی مشن ہوتا ہے اور جبتک وہ مشن پورا نہین ہوتا قدرت کسی صورت مین اُس قوم اور اُسکے افراد کو زندہ نہین رکھتی، کیونکہ نیچر مین غیر ضروری اور غیر مفید زندگیون کے قائم رکھنے کا کہین بھی انتظام و اہتمام نہین ہے - یہ اسقدر دور اندیش منتظم ہے کہ جہان کام ہو چکا

پھر ایک دم کے لئے کسی کو اپنی وسیع و لامحدود سلطنت مین نہین رہنے دیتی۔ نگاہ کو وسیع کرو اور تم ذرہ ذرہ کی موجودگی مین اسی اصول کو محیط پاؤگے۔ ہندو قوم دُنیا مین کسی خاص مشن کے لئے موضوع و مقصود ہے اور اسکی ہستی اس بات کی صریح دلیل ہے کہ اتبک اس خاص مشن کی تکمیل کے لئے قدرت کو اُسکے انحفاظ کا خیال قدم قدم پر ملحوظ خاطر رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتبک وہ کب کی صفحۂ ہستی سے محو ہوگئی ہوتی۔ زمانہ کی سختیان اُسکو بُری طرح اپنا آماجگاہ بنا چکی ہین۔ ہزارون برس تک وہ کھیل کے میدان مین فٹ بال کیطرح ادھر اُدھر رہی ہے۔ مگر مری نہین۔ دُنیا اسکی سخت جانی دیکھکر سخت متعجب ہے۔ یونانی۔ پارسی۔ مصری سب آئے اور گئے۔ کچھ دنون کے لئے کوس لمن الملکی بجایا اور اب اسطح عدم مین مُنہ ڈھانپ کر سو رہے کہ سوائے تواریخ کے منتشر صفحات کے اُنکا کہین نام و نشان بھی نہین ہے۔ مگر ہندو اتبک زندہ ہین اور باوجود تمام تر پریشانیون کے گذشتہ زمانے کے حوادث اور بلیات کو اُنکا نام مٹانے مین کامیابی نہین ہوئی۔ آخر اسکا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہے اور وہ سبب صرف یہ ہے کہ ہندوؤن کو اتبک دُنیا مین کچھ کام کرنا باقی ہے اور جبتک اس مقصد کی تکمیل نہ ہولیگی، وہ برابر زندہ رہیگی۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندو قوم کی ہستی و زندگی کا مشن کیا ہے؟ اس سول کا جواب نہ سہل ہے نہ مشکل ہے اور نہ سہل و مشکل دونون۔ جنکو قدرت نے گہری نگاہ سے دیکھنے کی طاقت عطا کی ہے۔ اُنکے واسطے یہ معمّا لاینحل عقدہ نہین ہے۔ جو محض کوتاہ بین، کوتاہ اندیش اور کوتاہ عقل ہین، اُنکو اصلیت کا پتہ ملنا مشکل ہے۔ ہندو قوم کا اصلی مشن صرف یہ ہے کہ وہ دُنیا مین روحانیت کا تماشہ دکھایا کرے اور بس اسمین کلام نہین کہ بحیثیت مجموعی ہندو قوم نہایت پست حالت مین ہے۔ یورپ اور امریکہ کے اولوالعزم اقوام کے ساتھ کوئی نسبت نہین ہے۔ لیکن فردیت و شخصیت کی حیثیت سے وہ دنیا کی تمام اقوام مین ممتاز ہے اور جو افراد ہندوؤن مین کبھی کبھی پیدا ہوکر اسطح کے تماشے دکھلاتے ہین، اُنکی عجیب و غریب روحانی طاقت کے کاروبار کو دیکھکر دُنیا کو سخت حیران ہونا پڑتا ہے۔ افراد کی اب بھی ہندوؤن مین کمی نہین ہے اور وہ کسی نہ کسی صورت مین آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہین۔ اس قسم کے اولوالعزم انسان ہندوؤن مین سب سے زیادہ پیدا ہوتے ہین اور پیدا ہوتے رہینگے۔ اس سلسلے کو قدرت کبھی موقوف نہ ہونے دیگی۔ یورپ کی بلند خیال اقوام مین اب اونچی طبیعت کے انسان پیدا نہین ہوتے اور اگر پیدا ہوتے بھی ہین تو نہایت کمی کے ساتھ۔

کیا اسکے ثابت کرنے کی ضرورت ہے؟ دور کیون جایئے ابھی مہاتما رام کرشن پرم ہنس ایسے ناخواندہ شخص نے تمام دُنیا کو محو حیرت بنا دیا تھا۔ اُنکے شاگرد رشید سوامی وویکانند جی نے امریکہ اور یورپ مین جس دانائی کے ساتھ کام کیا وہ دُنیا کو یاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دانشمند مرتاض کے کاروبار نے خیالات کی دنیا مین وہ تہلکہ ڈالدیا کہ آج کا امریکہ وہ امریکہ نہین رہا جو بیس برس پہلے تھا۔ مذہبی مسائل کی تاویلات ہندو نقطۂ نگاہ سے کیجاتی ہین۔ ویدانت جو کسی وقت مین محض خیالی و وہمی چیز سمجھا جاتا تھا آج سب سے زیادہ زندہ مذہب و زندہ طریق سمجھا جاتا ہے۔ رائے سالگ رام صاحب بہادر کی تصوف کی بینظیر تعلیم اپنا کام اور بھی زیادہ خوبی اور مضبوطی کے ساتھ کر رہی ہے جو بے خبر ہین اُنسے کچھ کہنا سُننا لاحاصل ہے۔ جو باخبر ہین

وہ جانتے ہین کہ اُنکے شاگردون کے زمرہ مین اسوقت کتنے مسیحی، یہودی، مسلمان، پارسی وغیرہ شامل ہوکر روحانی تشفی حاصل کر رہے ہین۔ سوامی رام تیرتھ کے وصال کو ابھی بہت دن نہین گذرے۔ دُنیا کو ابتک یاد ہے کہ وہ کیسی زبردست روحانی خصوصیت تھی۔ علیٰ ہذالقیاس۔

ہندوون کا گورو راجہ پدیا یورتشٹر سے منسوب نہین ہے سورج بنسی و چندربنسی خاندانون کا گورو صرف رشیون کا گورو ہے کیا اس سے لوگ آسانی نتیجہ نہین نکال سکتے کہ ہندو قوم کے سامنے اگر کوئی آئیڈیل یا معراج ہے تو وہ صرف روحانی ہے اور اُسکا مشن دنیا مین صرف روحانیت پھیلانا ہے اور ہندو ہمیشہ سے صرف اسی کام کے لئے کرۂ ارض مین ممتاز رہے ہین۔ اسمین کلام نہین کہ دُنیا کی اور قومون مین بھی روحانیت ہے اور تھی کیونکہ روحانیت کے بغیر کبھی زندگی مکمل و شاندار نہین ہوسکتی ہے نہ اخلاقی حالت کی درستی کی امید ہوسکتی ہے۔ مگر اسمین خصوصیت کا رتبہ ہندوون کو حاصل ہے۔ پرماتما نے اسی قوم کو ویدون کی دولت سپرد کی اور ویدون کا محافظ بنایا۔ اسی قوم کے رشیون اور منیون نے اُپ نشدون کی حقانیت کا نغمہ گایا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے عدیم المثال ہین اور فلسفہ کی تمام شاخون کو بڑی خوبی کے ساتھ تکمیل کا درجہ بخشا۔ گوتم بدھ، مہابیر سوامی رشبھ دیو سب ہندو ہی تھے۔ ہندو ابتدا ہی سے دُنیا کے معلم کی حیثیت مین آئے ہین۔ یونان و مصر کے کون سے فلاسفر ہین جو اُنکے خرمن فیض کے خوشہ چین نہین ہین اور یہ استحقاق دُنیا کی کوئی قوم ہندوون سے کبھی نہین چھین سکتی۔

مگر اس زمانہ کے ہندو سخت ادبار مین گرفتار ہین اور نحوست کی گھنگھور گھٹائین ہر چہار طرف چھائی ہوئی ہین بعض بعض اہل الرائے کا تو یہ خیال ہے کہ اب ہندو چند دنون کے مہمان ہین۔ اب اُنکے برباد ہونے مین ذرا شک نہین۔ بعض ناعاقبت اندیش و کوتاہ بین آدمیون نے تو قطعی فیصلہ نافذ کر دیا کہ نصف صدی کے اندر اندر ہندو دُنیا سے غائب ہو جائینگے۔ میرا یہ خیال کبھی نہین تھا اور نہ ہے کیونکہ مین برسون سے ہندو قوم کے جذبات کا مطالعہ کر رہا ہون۔ یہ سچ ہے کہ ہندوون کی آبادی گھٹ رہی ہے۔ وہ تیئیس ۲۳ کرور سے اُنیس ۱۹ کرور رہ گئے اُنمین بہت سی خرابیان واقع ہین تاہم یہ مایوسی بخش باتین نہین ہین۔ سونیوالے کسی وقت بیدار ہونگے اور وہ اپنی حالت درست کر سکین گے۔

اسوقت جو بات ہندوون کو ذہن نشین کرانی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ دُنیا مین اپنی حیثیت کو سمجھین اور قومی آئیڈیل کو نگاہ کے سامنے رکھین اور اُس معراج تک پہونچنے کی کوشش کرین۔ اُنکے دل مین ہمت و استقلال کے خیالات پیدا کرا دیے جائین۔ خیالات ہی دراصل کسی قوم کے اُبھارنے کا بہترین سامان ہین۔ خیال کی طاقت سب سے زیادہ ہوتی ہے یہانتک کہ بجلی، گرمی اور آواز وغیرہ اُسکے پاسنگ کو بھی نہین پہونچ سکتین اور جہان یہ خیال اُنکے دل مین قائم ہوگیا، پھر وہ بآسانی ترقی کے راستہ مین قدم زن ہونگے۔

ہندوون کو صرف دھرم کی ضرورت ہے۔ کیونکہ دھرم ہی اُنکی سرشت ہے اور دھرم ہی انکا قومی خاصہ ہے۔ وہ زندگی کے چاہے جس طبقہ مین کام کرین، چاہے کیسا ہی پیشہ اختیار کرین مگر ضرورت ہے کہ وہ سچے دھرماتما ہون اور دھرم کی راہ پر قائم ہوجانے سے وہ پھر نہ صرف اپنی ہستی ہی کو معرض ہلاکت سے محفوظ کر لینگے بلکہ گوتم بدھ کے زرین عہد کی طرح وہ دھرم کے ہتیار سے ساری دُنیا کے کو مسخر کر لینگے۔

شیوبرت لال

عالم و مافی العالم

(سلسلہ کے لئے دیکھو ادیب بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۱۰ء)

مضمون ہذا کے اوّل حصے مین اس امر کا ذکر ہوا ہے کہ عالم کائنات دو چیزین مادہ (Matter)[1] اور حرکت (Motion) ہر حصہ عالم مین محیط ہین اور کوئی مقام انکے وجود سے خالی نہین ہے۔ آگے چلکر ہر دو عالمگیر وجودون کی تشریح و توضیح ہوئی۔ بڑے بڑے محققون کے آرا پیش کئے گئے۔ پھر مادہ کے خواص او کرشمے دکھائے گئے اور اس امر پر بحث اٹھائی گئی کہ "آسمانون مین مادہ کن کن صورتون مین موجود ہے"۔ اسکے ضمن مین بیان ہوا کہ آسمانون مین مادہ سیارون۔ دمدار تارون۔ ستارون۔ شہاب ثاقبون۔ ایتھر اور درخشان دخان وغیرہ کی صورتون مین پایا جاتا ہے اس کے تعلق مین خاک فلکی (Cosmic dust) کا بھی ذکر آیا جو قطبین کی برف اور سطح بحر پر گرکر پانی کی تہ مین جمع ہوتی رہتی ہے۔ پھر سیارون کا چرچا ہوا اور دکھایا گیا کہ آسمان ہمارے نظام شمسی ایسے کرورون نظام ہائے شمسی کا مسکن ہے۔ سب سے پہلے اپنے نظام شمسی کا ذکر ہوا جسکا مرکز آفتاب عالمتاب ہے اس روشن بالذات کرے کا ذکر قدرے تفصیل سے دیا گیا اسکی جغرافیائی حالت اور دیگر مظاہر شمسی کا ذکر کرکے اخیر مین سطح آفتاب پر انسانون کی بستی کے امکان و احتمال پر بحث ہوئی اور بڑے بڑے عالم فلکیات کے خیالات پیش کرکے اسے ثابت کیا کہ وہان انسان رہتے ہین جو ہم سے بہت باتون مین مختلف ہین۔ اب نظام شمسی کے دیگر اراکین کا ذکر کیا جاتا ہے۔

نظام شمسی کے مرکز اور مرجع یعنی سورج کے بیان کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کرۂ ارض کا ذکر کیا جاسے جو سورج سے اُتر کر تمام سیارون مین ایک سے زیادہ اعتبار سے سب سے مقدم ہے۔ گو اپنی جسامت کے لحاظ سے سوائے بدھ (عطارد) منگل (مریخ) اور شکر (زہرہ) کے سب سیارون مین چھوٹا ہے۔ سورج اسوجہ سے سب سیارون پر فائق ہے کہ وہ انکی ہستی کا موجب ہونے کے علاوہ انسے لاکھون گنا بڑا ہے اور ہماری زمین ذی عقل اور ذی روح ہستیون کا مسکن ہے۔ اسکا مفصل بیان سردست اٹھائے رکھتے ہین سلسلۂ کے اخیر مین اسکی طرف رجوع ہونگے۔ بالفعل بدھ (عطارد) منگل (مریخ) شکر (زہرہ) یورے نس (Uranus) نپچون (Neptune) سینچر (Saturn) جسے عربی والے زحل کہتے ہین اور برہسپت (مشتری) (Jupiter) کا ذکر کرینگے۔ اسکے ساتھ ہی چھوٹے سیارون کا ذکر جداگانہ ہوگا جو صرف انیسوین صدی مین دریافت ہوئے۔

نظام شمسی کی وسعت

سیارون کے ذکر بالانفراد سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نظام شمسی کی وسعت کا کچھ ذکر کیا جائے اور سیارون کے متعلق چند دلچسپ امور بیان کئے جائین۔ اس ضمن مین سب سے پہلے انکے حجم نسبتی کا چرچا کیا جاتا ہے اور یہ دکھایا جاتا ہے کہ ہر سیارہ سورج سے کتنے فاصلہ پر ہے۔

[1] مادہ دیکھو عنوان میٹر "انسائیکلوپیڈیا" جلد ۱۸ صفحہ ۳۲۷۔

نام سیارہ	قطر کا طول	آفتاب سے فاصلہ	سیارہ کے دورہ کا زمانہ
عطارد	۳۰۰۰ میل	تین کروڑ ساٹھ لاکھ میل	۸۸ یوم
زہرہ	۷۶۳۰ ″	چھ کروڑ ساڑھے بارہ لاکھ میل	۲۲۴ ″
[illegible]	۰۰ ″	پانچ کروڑ پچھتر لاکھ میل ″	۱۲۸ ″
کرۂ ارض	۷۹۱۰ ″	نو کروڑ اکیس لاکھ میل ″	۳۶۵ ″
یورےنس	۳۱۹۰۰ ″	ایک ارب اٹھتر کروڑ [illegible] لاکھ میل	۳۰۶۹۸ ″
نیپچون	۳۴۸۰۰ ″	دو ارب اکاسی کروڑ دس لاکھ سولہ ہزار میل	۶۰۱۸۱ ″
سینچر	۷۳۰۰۰ ″	اٹھاسی کروڑ ساٹھ لاکھ میل	۱۰۷۵۹ ″
برہسپت	۸۶۵۰۰ ″	اڑتالیس کروڑ تیس لاکھ تینتیس ہزار میل	۴۳۳۳ ″
[illegible]	۴۲۰۵ ″	تئیس کروڑ ستر لاکھ میل	۱۶۹۱ ″
[illegible]	۴۰ ″	ساڑھے تیرہ کروڑ میل	۶۴۳ ″

سورج کا قطر ساڑھے آٹھ لاکھ میل ہے گو حجامت مین ہمارے کرۂ ارض سے ساڑھے بارہ لاکھ گنا زیادہ ہے اور نظام شمسی کے تمام سیارون اور انکے متعلق چاندون سے چھ سو گنا بڑا ہے اور کرۂ ارض سے تین لاکھ دس[۵۱] ہزار گنا بھاری ہے۔

مساحت سیاری نظام شمسی مین برہسپت (مشتری) سب سے بڑا سیارہ ہے جسکا کل رقبہ چوبیس ارب اٹھاسی کروڑ چالیس لاکھ مربع میل ہے۔ اس سے اتر کر سینچر (زحل) ہے جسکا کل رقبہ اُنیس ارب ساٹھ کروڑ مربع میل ہے اور پھر تیسرے نمبر پر یورےنس ہے جسکا رقبہ تین ارب چوراسی کروڑ چوراسی لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل ہے۔ نظام شمسی کے اراکین اور اُن کے چاندون کی مجموعی مساحت کا تخمینہ ساٹھ[۵۲] ہزار ملین (Milt on) مربع میل ہے۔ ملین انگریزی حساب مین دس لاکھ کا ہوتا ہے اور اس حساب سے یہ ساٹھ ارب مربع میل ہوتا ہے مگر سورج کی مساحت ۲۴ بلین (B illion) یعنی چوبیس کھرب مربع میل ہے اور سیارون کے رقبہ مجموعی سے چالیس گنا زائد ہے۔ اب اس سے اندازہ کر لیجیے کہ نظام شمسی کتنا وسیع ہے جبکی سرحد سورج سے دو ارب اسی کروڑ میل ہے اور وہان پر یورےنس چوکیداری کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اسکی گردش سورج کے گرد ۱۶۴ برس مین صرف ایک دفعہ ہوتی ہے۔

گردش کے دائرون کی وسعت کا اندازہ اب ہم انکے دائرون کے خطوط کا حساب لگاتے ہین اور یہ بتاتے ہین کہ انکا ہمارے کرۂ ارض سے کیا تعلق ہے۔ اگر آپ کسی ایسی گاڑی پر سوار ہون جو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلے تو آپ کرۂ ارض کے دائرہ کو جو اپنی گردش مین بناتی ہے چار سو تیس برس مین طے کرینگے مگر یہ زمانہ دیگر نظام شمسی کے اراکین کے دائرون کے مقابلہ مین کوئی حقیقت نہین رکھتا۔ اگر کوئی گاڑی سنہ عیسوی کے آغاز سے اسی رفتار سے متواتر چلتی رہتی تو وہ آج کے دن تک سینچر کی گردش کے نصف دائرہ کو بھی طے نہ کرسکتی اگر وہی گاڑی اُسوقت روانہ ہوتی جب حضرت آدم بہشت مین سے تو وہ اسوقت یورےنس (Uranus) کے گردش کے دائرہ کے صرف دو تہائی حصہ کو طے کرسکتی۔ اس ہولناک وسعت کا تخمینہ کرنا محال ہے۔ جس آدمی نے ہزار دو ہزار، چار چھ یا دس ہزار میل سفر کیا ہو اور یورپ اور امریکہ دیکھ آیا ہو وہ دس بیس ہزار میل فاصلہ کا تصور کرسکتا ہے۔ مگر ایسے فاصلہ کا تصور نہایت دشوار ہے جسکے اظہار کے لئے ایسے اعداد درکار ہوتے ہین جنسے انسان اپنے روزمرہ کے کاروبار اور حساب کتاب مین کوئی کام نہین لیتا۔

مگر یہ تو ہمارے نظام شمسی کی کیفیت ہے۔ عالمانِ فلکیات کی رائے مین ایسے ایسے نظام ہائے شمسی

۵۱ ماخوذ از "گیلری آف نیچر" (نگارخانۂ قدرت) صفحہ ۵۳ — ۵۲ ماخوذ از "گیلری آف نیچر" (نگارخانۂ قدرت) صفحہ ۱۰۲ - ۱۰۳

سالوں[۱] مین کروڑون کے شمار مین ہین آپ قیاس کیجئے آسمانون کی وسعت کتنی بے قیاس اور بے اندازہ ہے۔ ہمارا آفتاب مع سیارگان اور دیگر ارکین نظام شمسی سولہ میل فی سکنڈ کی رفتار سے ویگا (Vega) نکشتر کی کشش سے کھنچا چلا جارہا ہے خیال تو کیجئے وہ کتنا عظیم الشان نکشتر (مجموعہ ستارگان) ہوگا جو تمام نظام شمسی کو اپنی طرف کشش کر رہا ہے اور پھر یہ بھی خیال فرمایئے کہ وہ کتنے ہولناک فاصلہ پر ہے جسکی طرف سورج نو سو ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بڑھ رہا ہے اور یہ حرکت اور رفتار شاید ہزارون سال سے جاری ہے۔ اب اندازہ کرنا چاہیئے کہ خلا کی حد کہان ہے اور یہ وسعت کہان جاکر ختم ہوتی ہے یہ خدائے ذوالجلال کی شان ہے۔ گو ظرف و زمان کا ہنوز عقل انسانی پتہ لگانے مین قاصر رہے۔ مگر وہ اس سے بھی پہلے موجود تھا اور اسکے حدود وقیود سے بالاتر ہے۔

دن رات اور سالون کی میعاد

ایک اور امر بھی قابل ذکر ہے اور وہ مختلف سیارون کے دنون۔ مہینون اور سالون کی میعاد اضافی ہے یعنی یہ کہ فلان فلان سیارہ مین دن رات کتنے گھنٹون منٹون کا ہوتا ہے اور سال کتنے مہینون اور دنون کا ہوتا ہے۔ گو جب ہم ہر ایک سیارہ کا جدا جدا ذکر کرینگے تو ان امور کا ذکر بھی کیا جایگا۔ مگر یہان مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً سب کا ذکر کیا جائے جسکی غرض یہ ہے کہ سرسری نظر مین ہر سیارہ کے دن رات اور سال کی میعاد معلوم ہوجاتی ہے۔

---

[۱] (فٹ نوٹ) ابتک اس خلائے سماوی کی حد کا پتہ نہین لگتا۔ عالمان فلکیات کی کوششون سے دن بدن نئے نئے ستارے اور سیارے دریافت ہوتے چلے آئے ہین۔ یہان پر بعض شمار و اعداد دیکر آسمان کی بے پایانی کا خفیف سا تصور پیش کیا جاتا ہے۔ کہکشان (MilkyWay) مین جو صاف رات کو لمبی پٹک سی دکھائی دیتی ہے دور دور سورج ہین۔ ہمارا سورج اس عظیم الشان ودرخشان گروہ مین بہت ہی ادنی اور کم بضاعت ہے۔ عالمون کا تخمینہ ہے کہ خلا مین ایسے ایک ارب کے قریب سورج ہین۔ لارڈ کیلون اور ہیلم ہولٹس اس خیال کے حامی تھے۔ ہمارے نظام شمسی کے قریب ترین نظام شمسی الفر سنٹاوری (Alpha Centauri) ہے جہان سے روشنی دو لاکھ میل فی سکنڈ کی رفتار سے چلتی ہوئی چار سال مین ہمارے یہان پہونچتی ہے اور اسکا فاصلہ بیس ہین ہے۔ کہکشان کے بعید ترین ستارہ سے روشنی آٹھ ہزار برس مین زمین پر آتی ہے اور نہایت ہی دور افتادہ نیوبلہ (سحاب) سے جو بڑی بڑی دوربینون ہی کے وسیلہ سے دکھائی دیتا ہے دو کرور برس مین روشنی کرۂ ارض مین پہونچتی ہے۔ نزدیک ترین ثابت یعنی ستارۂ قائم ہماری کرۂ ارض سے (۰۰۰۰۰۰۴۶۶۸۷۴۲) میل پر ہے۔ اگر ہم ایک بتیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی گاڑی پر سوار ہوکر اس ستارہ کیطرف چلین بشرطیکہ ایسا سفر ممکن العمل ہو تو ہم وہان نو کرور بیس لاکھ سال کے بعد پہونچینگے۔ کہکشان بحر خلا مین ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ وہ مجموعۂ ستارگان کتنا دور افتادہ اور کیسا ہولناک ہوگا جو سورج اور اسکے سیارون کو صدیون سے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ بعض اسے ہرکلیس اور بعض عالم اسے ویگہ کے نام سے پکارتے ہین۔ اب اس سے ارباب تجسس قیاس فرما سکتے ہین کہ آسمان کتنے وسیع ہین اور انکے اندر سورج سیارے وغیرہ وغیرہ کتنے اور کہان اور کیسے دور افتادہ ہین۔ جرمنی کا نامور نیچرل شاعر کیا خوب کہتا ہے:۔ اے میرے تخیل تو اپنا جہاز واپس لا تیرے آگے ازلیت اور بے پایانی ہے۔ تیرے پیچھے ابدیت ہے۔ اپنے بادبان اتار دے۔ اے تصور لنگر ڈالدے سفر ہوچکا۔ شوریدہ ملاح آفرینش کے سمندر کا کوئی کنارہ نہین ہے۔

جے۔آر۔آر

نام ستیارہ	دن رات کی میعاد		سال کی میعاد		
	گھنٹے	منٹ	سال	مہینے	دن
بدھ	۲۴	۰	۰	۲	۲۸
زہرہ	۲۳	۲۱	۰	۷	۱۵
کرۂ ارض	۲۳	۵۶	۱	۰	۰
منگل	۲۴	۳۷	۱	۱۰	۲۱
برہسپت	۹	۵۶	۱۱	۱۰	۱۷
سنیچر	۱	۳۰	۲۹	۰	۰
یورینس	نامعلوم		۸۴	۰	۰
نپچون	۰		۱۶۴	۰	۰

اس گوشوارہ سے عیان ہے کہ نپچون کا سال سب سے بڑا ہے۔ یعنی ہمارے حساب کے رو سے ایک سو چونسٹھ برس کے برابر ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ مین اسکے یہ معنی ہین کہ ستیارہ نپچون ایک سو چونسٹھ[۱۶۴] سال مین اپنی گردش کا دور سورج کے گرد ختم کرتا ہے۔ یورینس ۸۴ برس مین سنیچر ۲۹ سال مین وعلیٰ ہذا۔

ستیارون کی کثافت نسبتی وغیرہ

کرہ ارض باعتبار حجم پانی سے پانچ گنا بھاری ہے اور بدھ تین گنا۔ مگر سنیچر پانی سے صرف نصف کے قریب کثیف ہے۔ اگر کوئی ایسا عظیم الشان اور بے پایان اور بے تھاہ سمندر ہو اور اُسمین ستیارون کو پھینکا جائے تو بدھ سیسہ کے گولہ کیطرح پانی کی تہ مین جا بیٹھیگا۔ مگر سنیچر نہایت ہولناک جہاز کی طرح اسپر تیرتا رہیگا۔ اُنکی کثافت کی تناسب پر اجسام کا وزن موقوف ہے۔ گو سورج کی کثافت کرۂ ارض سے کئی درجہ کم ہے۔ مگر وسعت کے باعث دو سے دو من وزنی آدمی کا سطح آفتاب پر چوالیس من کے قریب اسکا وزن پایا جائیگا۔ گو برہسپت بھی کرۂ ارض کے مقابلہ مین بہت کم کثیف ہے۔ مگر جسامت کے سبب سے کشش ثقل ڈھائی گنا زیادہ ہے۔ بالفرض اگر کوئی انسان برہسپت مین جا پہنچے تو اسکا وزن آٹھ گنا زیادہ ہوگا۔ اگر چلیگا تو اسے آٹھ گنا زیادہ بوجھ معلوم ہوگا اور اگر گرے گا تو بھی آٹھ گنا زور کے ساتھ۔ مگر چھوٹے ستیارون کی کثافت اور کشش ثقل بہت کم ہے۔ اگر ہم وہان پر رہا کرتے مین تو بجاے ۴ ۵ گز کی چھلانگ کے سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو گز ایک ذقند مین پھاند جاتے اور دیوون پریون کے قصون کے تمام کارنامے صحیح معلوم ہونے لگینگے۔ سطح برہسپت پر شیر اور ہرن کبھی چھلانگ نہ مار سکینگے۔ مگر مریخ اور بدھ اور شکر کی سطح پر انکی ایک ایک ذقند تین اور چار سو گز کے درمیان ہوگی۔

ایک نیا سیّارہ

پُرانے اور معلوم ستیارون کا تذکرہ شروع کرنے سے پیشتر ایک اور ستیارہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جو پروفیسر پکرنگ متعلقہ رصدگاہ ہارورڈ کالج (امریکہ) نے ۱۹۰۹ء مین معلوم کیا تھا۔ اسکے بارے مین بہت سی باتین ابتک معلوم نہین ہوئی ہین۔ مگر جو کچھ دریافت ہوا ہے وہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ یہ نیا ستیارہ نپچون کے اُسطرف واقع ہے اور بہت بڑا ہے۔ دو سال پیشتر عالمون کا یہ گمان تھا کہ نظام شمسی کا سرحدی ستیارہ نپچون ہے۔ برسون سے ماہران فلکیات کا یہ خیال تھا کہ نپچون سے آگے بھی ایک اور بڑا ستیارہ ہے جو نظام شمسی کی گردش پر خاص اثر ڈالتا ہے۔ پروفیسر جارج فاربس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ ۱۸۴۳ء ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۲ء مین جو دمدار ستارے

ﷲ ماخوذ از "گیلری آن نیچر" صفحہ ۱۰۵

ظاہر ہوتے تھے۔ انکی حرکتون سے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ اثناے سفر مین کسی عظیم سیارہ سے موثر ہوتے تھے جو سورج سے قریب سوا تین ارب میل پر واقع ہے اور جسکا سال ہمارے یہان ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے اور اُسی نکشتر مین واقع ہے جہان ہرشل صاحب نے ۱۷۸۱ء مین سیارہ نپچون[۱] معلوم کیا تھا۔

بدھ (عطارد)

اب ہم یہان سے سیارون کا جداگانہ تذکرہ شروع کرتے ہین۔ ترتیب اُنکے حجم کے رو سے رکھی جاتی ہے۔ بدھ سب سے چھوٹا ہے اسواسطے پہلے اسی کا ذکر کیا جاتا ہے بدھ سورج کے قریب ہے۔ سال مین تین مرتبہ دکھائی دیتا ہے طلوع آفتاب سے ڈیڑھ دو گھنٹے پیشتر مشرق مین اور غروب آفتاب کے دو گھنٹے بعد مغرب مین تین تین بار نظر آیا کرتا ہے۔ سیارون مین سب سے تیز رو ہے۔ یعنی ایک لاکھ میل سے زائد فی گھنٹہ چلتا ہے اور کرۂ ارض کی رفتار صرف چھیاسٹھ ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اسکی کثافت پانی سے چودہ گنا زائد سمجھی جاتی ہے اور اس سے زائد کثیف کوئی سیارہ نہین ہے۔ باوجود اسکے بھی اگر سورج کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ لے تو چودہ روز مین اُسپر جا گریگا۔ دن رات ہمارے یہان کے دن اور رات کے برابر ہوتے ہین اور گردش کا دور سورج کے گرد اٹھاسی دن مین ختم کرتا ہے۔ گو اسکی بابت طرح طرح کے شکوک ظاہر کئے گئے تھے۔ مگر ۱۸۸۹ء[۲] مین اٹلی کے نامی فلکی شیاپریلی نے صحت کے ساتھ اسکا تعین کیا اور اب پروفیسر لوئل (امریکہ کے ایک عالم) نے اسکی تصدیق کردی ہے۔ ہمارے یہان بہار کا موسم سال بھر مین صرف ایک دفعہ آتا ہے مگر بدھ کی سطح پر اس عرصہ مین چار مرتبہ موسم بدل بدل کر آتے ہین۔ چونکہ سورج کے بہت نزدیک ہے۔ اسواسطے روشنی اور حرارت ہم سے سات گنا زیادہ آتی ہے[۳] اگر اسیقدر گرمی اور روشنی ہمارے یہان آنے لگے۔ تو ہم یکدن نہ جی سکینگے بعض عالمون کا گمان ہے کہ وہان پانی اُبلتا رہتا ہے مگر پروفیسر ٹنڈل مرحوم کا یہ قول ہے کہ کسی سیارہ کی قربت آفتاب کی بنا پر اسکی آب و ہوا کے باب مین کوئی خاص راے قائم نہین ہوسکتی۔

اسکی تیز روی کے سبب سے اسکی حرکتون کو بالتفصیل جانچنا دشوار ہے۔ کوپرنیکس (Copernicus) جرمن کا نامور فلکی اسکا مشاہدہ کرنے سے قاصر رہا۔ آجکل شام کو سات اور آٹھ بجے اُس مقام پر چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ جہان سورج افق کے پیچھے چھپتا ہے۔

بدھ دیوتا کی پوجا مصری لوگ اسے دیوتا سمجھکر پوجتے تھے۔ اور اسے سٹ ہورس (Set Horus) کہکر پکارتے تھے۔ پرانون مین بھی اسکا تذکرہ ملتا ہے۔ سوم اسکا باپ اور برہسپتی کی بیوی اسکی ماں بیان کی گئی ہے۔ بعض ہندو لوگ اسکی خاص طور پر پوجا کرتے ہین۔ جوتش اور نجوم مین بھی بدھ کا بڑا درجہ سمجھا جاتا ہے۔ انکے حساب سے کئی بڑے بڑے مہان پرش اسکے زیر اثر پیدا ہوئے تھے۔ خالدیہ۔ بابل۔ نینوہ اور فنیشیا کے لوگ بھی اسکی پرستش کرتے تھے اور اسے اپنی قسمتون کا قاضی مانتے تھے۔ یونان کے مشہور ترین فلکی طالمی (Ptolemy) نے مسیح سے ڈھائی سو برس پیشتر اسکا کئی بار مشاہدہ کیا۔ اسکی ایک کتاب مین اسکے

---

[۱] بحوالہ "ترقی" جولائی ۱۹۰۷ء راقم نے اس سال مین اس نئے سیارہ کے متعلق ایک مختصر مضمون شائع کیا تھا۔ [۲] "نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا" جلد ۱۳ صفحہ ۲۲۵

[۳] ماخوذ از "دی گیلری آف نیچر" صفحہ ۶۵۔

چودہ[1] مشاہدات کا آغاز موجود ہے۔

منگل (مریخ)

منگل کی حیثیت یونانیوں کی بابت پرانے خیالات

نجومیون اور جوتشیون کے نزدیک منگل خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ جو آدمی اسکے خاص زیر اثر پیدا ہوتا ہے۔ انکی قسمت میں کئی قسم کے ادل بدل رہتے ہین۔ یہ کسی کے مقسوم پر خوشگوار اور نفع اور اثر نہین ڈالتا۔ یونانیون مین اسکا بہت چرچا ہے اور ایک جابر زبردست دیوتا مانا جاتا ہے جو کسی سے موافقت نہین رکھتا سب سے برسرپرخاش رہتا ہے۔ رومی اور یونانی لوگ اسے جنگ کا دیوتا مانتے تھے اور اسکی خوشنودی کے لئے قربانیاں چڑھاتے تھے۔ قدیم زمانہ کی اور قومین بھی جو تہذیب کے پچھڑے پن مین الجھی ہوئی تھین اس ستارہ کی پرستش کرتی تھین۔ انکا رنگ سرخ انگارہ ایسا ہے۔ اسواسطے اسے جنگ کا دیوتا قرار دیا گیا تھا۔ جو اسکی حرارت اور شبیہ سے تصور ہوتی تھی لیکن زمانہ حال کی تہذیب اور علمی ترقیوں نے ظاہر کر دیا ہے کہ یہ بیچارہ اور اجرام فلکی ایسا ناکردہ گناہ اور بے ضرر ہے۔

مریخ کے متعلق جدید خیالات

عالمان فلکیات منگل (Mars) کو اعلیٰ درجہ کے سیارون مین شمار کرتے ہین۔ زمین سے اترکر یہی سیارہ فلکیات کی خاص دلچسپی اور تحقیق کا مرجع بنا ہوا ہے۔ عالمون نے تمثیل اور تشبیہ سے یہ خیال قائم کیا ہے کہ مریخ مین جاندار اور روئیدگی پائی جاتی ہے اور گمان کیا گیا ہے کہ وہان انسان رہتے ہین جو ہم سے زیادہ عقلمند ہین بعض عالم کہتے ہین کہ وہان کے باشندے برسون سے ہمسے سلسلہ نامہ و پیام جاری کرنے کی کوشش کر رہے ہین۔ اسی خیال کی بنا پر ہیرسٹ کالج (اضلاع متحدہ امریکہ) کی رصدگاہ کا سپرنٹنڈنٹ پلاٹیم کے بیابانون مین بیٹھکر دس بارہ میل اوپر ہوائی کرہ مین جانیکا خواہشمند ہوا تھا۔ جب ڈھائی سال پیشتر (۲۴ ستمبر ۱۹۰۹ء) منگل اٹھارہ بیس سال کے بعد کرۂ ارض کے قریب تر آیا تھا۔ اسکی بنا پر ۱۹۰۹ء سے یورپ کی ایک مخیر طبع اور نیک طینت لیڈی نے کئی لاکھ روپیہ اس غرض سے عطا کر دیا تھا کہ اہل مریخ سے بات چیت کرنے کا کوئی طریقہ ایجاد کیا جائے۔ اب اس فنڈ مین لاکھون روپیہ جمع ہوگیا ہے۔ مشہور ماہر برقیات مارکونی اور اسکا ایک نہایت مشہور ماہر برقیات اور چند اور اہل تحقیق اس کوشش مین ہین کہ منگل والون کے پاس کوئی پیام پہونچایا جائے اور انسے سلسلہ رسل و رسائل قائم کیا جائے۔ مارکونی وغیرہ کا خیال یہ ہے کہ بے تار کا برقی پیام منگل مین پہونچانا آسان اور ممکن العمل ہے۔ اسواسطے اس فکر مین ہین کہ آبشار نیاگرا (جو کنیڈا اور صوبجات متحدہ کی سرحد پر ہے) سے بہت سی برقی قوت راکی پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی پر جمع کی جائے اور جب ضرورت کے مطابق بہم پہونچ جائے۔ تو ایک پیام بھیجا جائے۔ ہوسکتا ہے آنے والے برسون مین کوئی صاحب دماغ ایسی ترکیب نکالے جس سے مریخ کو پیام پہونچانے مین کامیابی ہو۔

منگل آفتاب سے چودہ کرور ساڑھے بارہ لاکھ میل پر ہے اور اس لحاظ سے زمین سے پانچ کرور میل کے قریب زیادہ فاصلہ پر ہے۔ سورج کے گرد اسکی گردش کا چکر ۶۸۶٫۹۸ دن مین مکمل ہوتا ہے اور اسکا قطر ۴۲۳۰ میل ہے۔ اس سیارہ کی سطح پر موسمی تبدلات اسیطرح سے ہوتے ہین جیسے ہمارے یہان۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اسکا محور گردش کے دائرہ کی طرف (۲۴°) (۵۰') جھکا ہوا ہے۔ عالمون نے برسون کے مشاہدہ

[1] ماخوذ از "کاسمس" جلد چہارم صفحہ ۱۳۲ مصنفہ الگزنڈر ہمبولٹ مطبوعہ ۱۸۵۲ء نیویارک۔

کے بعد یہ قرار دیا ہے کہ اسکی حرکت روزانہ کا دور ۲۴ گھنٹے ۳۷ منٹ ۲۲۶۷ سکنڈ مین پورا ہوتا ہے - یہ سیارہ سورج کے گرد اور نیز اپنے محور پر چون ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے چلتا ہے - شکل مین گول سا ہے گو قطبون کے قریب ہماری زمین کی طرح قدرے باہر کو نکلا ہوا ہے - اسکے ساتھ دو چاند ہین جو پروفیسر ہال متعلقہ بحری رصدگاہ واشنگٹن نے ۱۸۷۷ء مین دریافت کئے تھے - یہ اتنے چھوٹے ہین کہ بڑی دوربین کے بغیر دکھائی نہین دیتے - اندرونی چاند فوباس (Phobas) پونے آٹھ گھنٹے مین گردش کرتا ہے اور بیرونی چاند ڈیماس (Deimas) ہے -

کرہ ارض اور مریخ مین مشابہت | پہلے پہل سر ولیم ہرشل نے مریخ اور زمین کی طبعی صورتون مین کچھ موافقت معلوم کی تھی - اٹلی کے نامور محقق فلکیات شیاپریلی نے ۱۸۷۷ء مین یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ سطح مریخ پر نہرون کا ایک جال پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے - اسکے بعد اور عالمون نے بڑی بڑی دوربینون سے مشاہدہ شروع کیا اور نئی باتین معلوم ہوئین - اب یہ امر یقینی ہے کہ مریخی کرۂ ہوا ہمارے یہان کے کرۂ ہوا سے بہت مشابہ ہے - پروفیسر لوئل متعلقہ فلیگ اسٹاف رصدگاہ اری زونہ (امریکہ) مدت سے لگاتار اسکی مختلف صورتون اور حالتون کا مشاہدہ کرتے چلے آتے ہین - انکی راے سند سمجھی جاتی ہے - وہ کہتے ہین کہ مریخ مین "نہرون کا سلسلہ" برابر ہے اور وہ انسانی ہستیون کے وجود کے بھی قائل ہین - کرۂ ہوا صاف معلوم ہوتا ہے - اسکے قطبون کے قریب مین دو سفید قطعات بہت شفاف دکھائی دیتے ہین اور وہ سورج کی روشنی مین ستارون کی سی چمک دمک دکھاتے ہین عالم انھین برف یا یخ کے تودے خیال کرتے ہین - موسم کی تبدیلی کے ساتھ وہ نمودار اور غائب ہوتے رہتے ہین -

طبعی شکل و صورت | وسطی حصہ مین نارنجی اور خاکستری سبز قطع نظر آتے ہین اور وہ خط استوا کے ساتھ ساتھ پھیلتے ہین - انھین زمین خیال کیا جاتا ہے - یہ قطع اور انکی خصوصیات مستقل نظر آتی ہین خاکستری سبز قطع پہلے بحیرے اور جھیلین تصور کی گئی تھین - مگر بعد کے مشاہدون سے یہ غلط ثابت ہوا سر ولیم ہگنس نے کرۂ ہوا مین پانی کا بخار دریافت کیا تھا ۱۸۹۴ء مین لوئل اور پکرنگ نے جنوبی قطب کے قریب ایک منقطع مشاہدہ کیا تھا، جسے اُنھون نے برف کے پانی کا ذخیرہ قرار دیا - شمالی قطب کے نزدیک بھی اسی قسم کا ذخیرہ پایا گیا تھا -

سب سے زیادہ دلچسپی "نہرون کے سلسلہ" پر مرکوز ہے مشاہدۂ عمیق سے مریخ لمبی لمبی نہرون کے جال سے ڈھکا ہوا معلوم ہوتا ہے - کئی نہرین ایک دوسرے کو قطع کرتی معلوم ہوتی ہین - وہان پر عظیم تالاب پیدا ہو گئے ہین بعض انھین زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے سمجھتے تھے اور بعض ندیان - مگر پروفیسر لوئل کا یہ خیال ہے کہ وہ نہرین ہین جو اہل مریخ نے قطبون سے پگھلی برف کا پانی میدانون اور شہرون اور کھیتون مین لیجانے کے لیے بنائی ہین - اسی کی بنا پر وہ بہت عقلمند سمجھے جاتے ہین - ۱۹۰۵ء مین لوئل نے انکے فوٹو لئے اور نہرون کا وجود پایہ ثبوت تک پہونچا دیا ایک کتاب "مارس اینڈ اِٹس کنالز" (Mars and its Canals) "مریخ اور اسکی نہرین" شائع کی ہے جسمین اس نظریہ کو ہر طرح سے ثابت کر دیا ہے -

مریخ کے سُرخ ہونیکا سبب | مریخ اور کرۂ ارض کے درمیان کئی طبعی امور مشترک ہین -

جو کسی اور سیارہ مین نہین پائے جاتے - مریخ کی خون گین صورت کو ہوا کی کثافت کی طرف منسوب کیا گیا تھی جیسے ہمارے یہان صبح او شام کے وقت افق پر سرخی نمایان ہوتی ہے مگر اسپکٹرواسکوپ (Spectroscope) سے جو مشاہدہ مرتیہ لوئس نے کیا - اس سے سر جان ہرشل کی رائے کی تائید ہوئی کہ یہ سرخی مٹیون کی رنگت کے سبب سے ہے جو سطح مریخ کی ترکیب مین پائی جاتی ہین اور کئی چیزین نمایان ہوتی ہین اور پھر جلدی سے ناپید ہوجاتی ہین - مگر کئی مستقل طور پر قائم رہتی ہین - بادل اور بخارات ادھر نکلے ادھر غائب ہوگئے - اول رات دن کا تغیر و تبدل تقریباً یکسان ہے - موسمی تبدلات بھی ایک ہی جیسے ہوتے ہین - دوم دونون مین کرۂ ہوا - بادل - برف - یخ - مینہ - سمندر اور بر اعظم ہین مگر اسکے چاند کی کشش کمزور ہونے کے سبب سے سمندرون مین مدوجزر نہین پیدا ہوتا -

تازہ ترین حالات تازہ ترین انکشافات مریخ کے باب مین ذیل مین دیئے جاتے ہین - اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ علوم تجربیہ مین نت نئی باتین معلوم ہوتی رہتی ہین - عالم اور ارباب تحقیق رات دن اپنی اپنی دھن اور اپنی اپنی تحقیق مین مشغول ہین اور نئی باتین دریافت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہین - ڈھائی سال پیشتر جب مریخ چکر کھاتا ہوا زمین کے بہت قریب آگیا تھا تو ماہران فلکیات نے بہت سی باتین مشاہدہ کی تھین منجملہ انکے ایک بات یہ ظاہر ہوئی کہ مریخ کی سطح دن بدن خشک ہوتی جاتی ہے اور پانی کی سخت قلت ہے - وہ وقت جلد آنیوالا ہے کہ جب وہان ایک بوند بھی پانی کی نہ رہیگی اور جاندار پیاس کے مارے تڑپ کر مرجائینگے - روئیدگی ابھی سے مرجھا رہی ہے سردی بڑھ رہی ہے - ایک روسی عالم نے پچھلے سال ایک میگزین[1] مین مریخ کی موجودہ حالت کے بارہ مین ایک مضمون لکھا تھا جسمین سے ذیل کے امور اخذ کئے جاتے ہین -

وہ کہتا ہے - اپنے کو عالم تخیل مین آج کے زمانہ سے کرور دو کرور برس آگے لیجاؤ - جب کرۂ ارض کے پہاڑ فرسودگی کے عمل سے زمین کے ہم سطح ہوجائینگے اسکے زرخیز خطے صحراؤن مین تبدیل ہوجائینگے اور اسکی ہوا کیمون کی تخفیف کثیر سے لطیف ہوجائیگی - بارش اور آندھیان بالکل بند اور بادل صرف ظہورات طبعی مین ہونگے - مطلع بارہ مہینے صاف اور نیلگون رہیگا - سمندر اور جھیلین خشک اور بڑے بڑے سمندرون کا پانی زمین کے غارون مین غائب ہوجائیگا اور قطعات آبی صرف قطبون کی برف کی صورت مین باقی رہینگے - بعینہ یہی کیفیت اسوقت مریخ کی ہے - مریخ اور کرۂ ارض ایک ہی سے مادہ سے بنے ہین - مگر وہ ہماری زمین سے کہین زیادہ معمر اور فرسودہ سال ہوگیا ہے - قطبون کی برف جب پگھلتی ہے تو اسکا پانی نہرون مین ڈالکر خط استوا کیطرف لایا جاتا ہے جس سے زمین سیراب ہوتی ہے اور فصلین اٹھائی جاتی ہین - ان نہرون کا شمار چارسو قرار دیا جاتا ہے - اور ہر ایک کا طول بالاوسط سترہ سو میل ہے - سیارون کا تمام رقبہ نہرون سے ڈھکا ہوا ہے -

وہان کے انسان کس قسم کے ہین؟ اسکے باب مین سیارہ مریخ کی طبعی صورت کی بنا پر یہ قیاس ہے کہ وہان کی آب و ہوا لطیف ہونے کے سبب سے وہ ہماری شکل و صورت

[1] راقم نے "امرت بازار پترکا" مطبوعہ ۱۰ مئی سنہ ء سے چند امور استنباط کئے ہین -

کے نہین ہین - مریخ زمین سے کرورون برس پہلے وجود مین آیا تھا - اگر وہی قانون قدرت وہان پر رائج رہا - گو وہ عقلی ترقیون مین ہزارون لاکھون برس پیشتر ہم پر سبقت لیگئے ہونگے اور انکا ڈھانچہ ہمارے ڈھچر سے بہت مختلف ہوگا۔

مریخ کی کشش ثقل بہت کمزور ہے - اسیوجہ سے وہان کا ہر ایک آدمی ہمارے یہان کے بڑے بڑے پہلوانون سے بڑھکر ہوگا - تین چار سکنڈ مین ایک آدمی سطح مریخ پر سو گز دوڑ سکتا ہے اور وہان کا پست الوجود ہمارے یہان کے ہوشیار ترین نٹ کو چند سکنڈ مین مات دیگا اور معمولی درخت پر سے ایک چھلانگ مین گزر سکتا ہے اور فٹ بال کو ایک لات سے پاؤ میل تک پہونچا سکتا ہے - وہ قدوقامت مین ہمارے یہان کے آدمی سے سہ چند اور کام کی قوت مین ستائیس آدمیون کی برابر ہوگا - کھدائی کے کام مین وہ پچاس ساٹھ قلیون کا مقابلہ بآسانی کرسکتا ہے اور ڈھائی ٹن (ستر من) بوجھ بڑی آسانی سے کندھے پر اُٹھاکر لیجاسکتا ہے -

منگل کی تباہی کے آثار "پانی کی قلت"

ہمین افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اہل مریخ تھوڑے عرصہ مین پانی کی کمی سے تڑپ تڑپ کر مر جائینگے اور یہ حشر شاید ہمارا بھی کسی زمانہ مین ہوگا مگر وہ زمانہ بہت دُور ہے - ہم مین سے کسی کے پوتون پر پوتون اور انکی آل اولاد کو بھی دیکھنا نصیب نہ ہوگا - آبادی کا ذکر آگے چلکر ہوگا اور کرۂ ارض کے بیان مین ہم دکھائینگے کہ زمین کن اسباب سے برباد ہوگی -

شکر (زہرہ)

یہ سیارہ بھی سیارون کی ذیل مین شمار ہوتا ہے - ہندوؤن کی طرح یونانیون - رومیون اور قدیم زمانہ کی دیوپرست قومون کی مائتھالوجی (علم الاصنام) مین اسے بڑا رتبہ حاصل رہا - مگر زمانہ حال کے ماہران فلکیات نے اسے خلا کے ساکنین مین ایک ادنی باشندہ قرار دیا ہے اور فلکی اصطلاح مین ادنی سیارون کے زمرہ مین شمار ہوتا ہے - سورج سے اسکا فاصلہ چھ کرور بہتر لاکھ میل ہے - ہمبولٹ کے زمانہ مین یہ صرف چھ کرور میلون پر شمار ہوتا تھا - مختلف عالمون نے اسکے بُعد شمسی کا اندازہ مختلف کیا ہے - مگر وہ سات کرور میل سے زائد اور چھ کرور میل سے کم نہین ہے - یہ ستیارہ کبھی کبھی کرۂ ارض کے بہت نزدیک آجایا کرتا ہے یعنی کل دو کرور ساٹھ لاکھ میل اور کبھی گردش کے دوران مین اس سے سولہ کرور میل پیچھے ہٹ جاتا ہے - چاند اور کسی بھولے بھٹکے دمدار ستارے کے سوا اور کوئی سیارہ کرۂ ارض کے اسقدر قریب نہین پہونچتا ہے - شکر درخشانی اور آب و تاب مین تمام اجرام فلکی سے بڑھکر ہے - کبھی کبھی دن کے وقت بھی دکھائی دیتا ہے - مگر کبھی شام کو مغرب کے وقت اور کبھی طلوع آفتاب سے تھوڑی دیر پیشتر مشرق مین دکھائی دیتا ہے - فیثاغورس نے پہلے پہل اسکی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرکے اسے ایک ستارہ قرار دیا تھا - گو اور عالم اسے دو مختلف تارے شمار کرتے تھے - یونانی شعرا اور مصنفین قدیم نے اسکی نسبت بہت خامہ فرسائی کی ہے اور اسے ملاحون اور مسافرون کا رہنما ٹھہرایا ہے کیونکہ وہ اسکی روشنی مین راستہ طے کرتے تھے -

شکر سورج کے گرد ۲۲۵ یوم مین اپنی سالانہ حرکت ختم کرتا ہے اور اسی ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے چلتا ہے -

۵۱ "کاس مس" جلد چہارم صفحہ ۱۳۰۸

اگر سورج کی کشش غالب آکر اسے اپنی طرف کھینچ لے۔ تو ساڑھے انتالیس دن میں یہ ستیارہ سطح آفتاب پر جا گرے اور جلکر خاک سیاہ ہو جاوے۔ اسکا قطر زمین سے کچھ چھوٹا یعنی ۷۸۱۴ میل ہے۔ ہمبولٹ جرمنی محقق نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "کاسموس" میں اسے ۷۸۰۰ میل لکھا ہے اور کیلیی انجینئر بک پر (صفحہ ۹۰) ۷۸۰۰ میل بیان ہوا ہے۔ ڈاکٹر ینگ نے اپنی کتاب مین بھی یہی فاصلہ دیا ہے۔ مگر تازہ ترین تحقیق کے مطابق اس سے زائد ہے۔ جیسا اوپر مذکور ہوا ہے۔ اسکی حرکت محوری ساڑھے تیئیس گھنٹے مین تمام ہوتی ہے۔ اسکی رفتار محوری ۲۲ میل فی سکنڈ ہے۔ اسکی ضخامت زمین کے حجم کا ۹/۱۰ حصہ ہے اور اسکی مساحت ۹/۱۰ ہے۔

اسکی بے حد درخشانی کے سبب سے زہرہ کے اجزائے ترکیبی کے باب مین ٹھیک ٹھیک معلوم نہین ہے کہ اسکے اندر کون کون معدنیات پائی جاتی ہین۔ سنہ ۱۸۷۴ء کے مشاہدون سے ظاہر ہوا تھا کہ اسکا کرۂ ہوا پچپن میل عمیق ہے۔ حالانکہ ہمارے کرہ ارض کا صرف چالیس میل ہے اور یہ اسوقت ہوئے تھے جب وہ سورج کے قرص پر سے گزرا تھا۔ ہوا کی کثافت ہماری ہوا کے نصف ہے۔ گاہے گاہے اسکے اوپر دھبے سے نمودار ہوتے ہین جنکے بارے مین عالمون کا یہ خیال ہے کہ کرۂ ہوا بخارات سے لدا رہتا ہے جس سے بادل بنتے ہین اور سطح زمین پر پانی۔ سمندر۔ دریا۔ جھیلین وغیرہ ہین۔ یہ بھی گمان ہے کہ بعض ایسے مظاہر دوربین کے ذریعہ سے دیکھنے مین آتے ہین جنسے پہاڑ اور وادیان موجود معلوم ہوتی ہین۔ جرمنی کے مشہور فلکی شراٹر کا یہی خیال ہے جو اسنے کچھ عرصہ تک زہرہ کے قرص کے مشاہدہ کے بعد قائم کیا تھا۔ اگر یہ قیاسات جو محض ظنیات سے ہین۔ بالکل درست ہون تو زہرہ اور کرۂ ارض کے درمیان مریخ کیطرح بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہوائی کرہ جس سے روشنی منعکس ہوتی ہے اور آواز ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچتی ہے۔ اسمین بخارات موجود ہونے سے بادل بننا ہوا دے اور مینہ برسنا وغیرہ۔ جھیلین۔ ندیان اور پہاڑ و وادیون کا ہونا وغیرہ امور دونون مین مشترک ہین۔ چونکہ سورج کے بہت نزدیک ہے اسواسطے وہان گرمی سخت پڑتی ہے قطبین بہت قریب ہین وہان کے موسم ہمارے یہان کے موسمون سے ڈبل ہین۔ یعنی دو جاڑے۔ دو بہار۔ دو گرما اور دو دفعہ سال مین خزان ہوتی ہے۔ وہان روئیدگی بھی یقیناً ہے اور اسکی بنا پر وہان جاندارون کا ہونا ناممکنات سے نہین ہے۔ مگر یہ قیاس صرف استدلال تمثیلی کی بنا پر قائم ہو سکتا ہے۔ کوئی تعجب نہین کہ جو آج ظنیات مین ہے وہ کل کو یقینی ثابت ہو اور پھر تازہ تحقیق کی روشنی مین سیارے جاندارون کا مسکن ثابت ہون۔ مگر اسپر ایک جداگانہ مضمون مین بحث ہوگی۔

(باقی آیندہ)

جے۔ آر۔ راے

نغمۂ روح۔ یہ ایک نعتیہ دیوان ہے جسکے مصنف جناب حاجی قاضی خلیل الدین حسن صاحب حافظ رئیس پیلی بھیت ہین۔ غزلیات، سلام، ترجیع بند، مخمس، رباعیات، مثنوی، غرض اس مجموعہ مین ہر ایک چیز شامل ہے۔ کلام نہایت پختہ اور عیوب شاعری سے پاک ہے۔ ضخامت ڈیڑھ سو صفحات۔ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ سید احمد علی صاحب محرر رجسٹری۔ پیلی بھیت۔

شمس العلما ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

افسوس! ۳ مئی ۱۹۱۱ء کی صبح کو علمی دُنیا کا ایک بڑا
نفس یکایک حرکت قلب بند ہو جانے سے ہمیشہ کے لئے
ال بلگرام کا پیوند ہوگیا - مولوی سید علی صاحب بلگرامی مرحوم
ن افراد عالیہ مین سے تھے جنپر نوع انسانی فخر کرسکتی ہے۔
پ کی ناگہانی وفات تمام ہند کے لئے عموماً اور دنیاء اسلام
کے لئے خصوصاً ایک سخت ناقابل تلافی ملکی و قومی صدمہ
ہے اور ملک و قوم انکے لئے جسقدر ماتم کرے بجا ہے - پایونیر
یسے اینگلو انڈین اور سخت محتاط اخبار نے بھی آپ کی وفات
پر افسوس کیا اور لکھا کہ "ہندوستان سے ایک علامہ و
سیع الخیال و با اخلاق ہر دلعزیز شخص جاتا رہا"۔ مرحوم نے
و علمی شہرت حاصل کی تھی وہ نہ صرف ہندوستان تک
محدود تھی بلکہ یورپ کے طبقہ علما مستشرقین مین بھی آپ
یک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ دو قدیم مختلف علمی زبانون یعنی
عربی و سنسکرت کا علامہ ہونے اور یورپ کی مختلف زبانون
مین مہارت رکھنے سے یورپ کا کوئی علمی مرکز ایسا نہ تھا جہان
آپ کا تعارف نہ ہو - حقیقت یہ ہے کہ مرحوم ان نادر و نایاب
افراد مین سے تھے جنکو فطرت نے غیر معمولی ذہانت و عجیب و
غریب قوت حافظہ عطا کیا تھا اور اُنکو اپنی ان خداداد قوتون
کا پورا احساس تھا - چنانچہ انھون نے بچپن سے تا دم واپسین
ان قوتون سے کام لینے اور اُنکو ترقی دینے مین کوئی کسر
اُٹھا نہ رکھی - آپ کی طالبعلمانہ خصوصیت آخر تک قائم رہی۔
جن لوگون کو مرحوم سے قریبی تعلق تھا اور اُنکی بیش بہا صحبت
کی عزت سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا تھا وہ اُن کی
وسیع و محققانہ معلوماتِ علمی سے متحیر رہجاتے تھے۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ گویا علم کا ایک بحر ذخار ہے جو اُنکے دماغ مین
موجزن ہے، یا ایک معدن و مخزن ہے جو بے بہا خزائن علمی
سے مالامال ہے۔ مہینون اور برسون کی صحبت سے بھی دل
سیر نہ ہوتا تھا اور مشاغل علمی سے دل نہ تھکتا تھا۔

مرحوم کی اس غیر معمولی علمی ترقی کا راز تین باتون مین
تھا - یعنی

اوّل اُنکی خداداد اعلیٰ ذہانت و قوت حافظہ

دوم علوم و فنون کی تحصیل کا بے حد شوق اور
مشاغل علمی مین لگاتار مصروف رہنا۔

سوم خوش نصیب و فارغ البال زندگی جسکے حاصل
کرنے کے بیش بہا مواقع مرحوم کو حیدرآباد دکن مین ملے۔

علمی دنیا مین ممتاز بننے اور شہرۂ آفاق ہونے
کے لئے تینون مذکورہ بالا باتون کا نہایت قریبی سمبندھ ہے۔
یہ اکثر کہا گیا ہے کہ کسی مین خداداد ذہانت کے ذرّے
مخفی ہین تو اُسکو تحصیل علم کا شوق نہین - یا اگر تحصیل علم کا
عشق ہے تو دماغی قوا مین اُسی تناسب سے قوت کی کمی ہے۔

اور اگر اتفاقاً داعی [illegible] علم کا شائق دونون بالقوہ والفعل موجود ہین تو ہم [illegible] پر یہان اتنی مہلت نہین دی کہ اس شوق کو پورا کیا جاسکے۔ بیشمار خداداد ذہنی قوی توفیق علم [illegible] افسوس کی کمی [illegible] بیماری [illegible] سے یون ہی ناشگفتہ ہو کر رہ جاتی ہین۔

حیدرآباد دکن علم دوستی و جوہر شناسی مین ہمیشہ ممتاز رہا ہے اور ہندوستان کے اس تخت و تاراج و کشمکش کے زمانہ مین جبکہ ہندوستان کی دیسی ریاستون کو توان اور مسلمانون کو کس مپرسی ہے اور انکو اپنے جوہر قابلیت دکھانے کے موقع حاصل نہین۔ یہ ریاست مغتنمات سے ہے۔ اب ہونہار و باکمال ہندوستانیون کے لئے حیدرآباد ہی ایک مقر باقی رہ گیا ہے جہان پہونچکر کچھ عزت افزائی ہوجاتی ہے اور اس قدردانی سے ہونہار اور اہل کمال کو اپنے جوہر قابلیت دکھانے کا موقع ملتا ہے اور کسی علم دوست کا یہ مقولہ پورا ہوجاتا ہے

اگر بدبخت باشد من چہ دانم * و لے یکبار بردولت رسانم

مہدی علیخان مرحوم ایسے مدبر و سید حسن صاحب بلگرامی ایسے لائق و مشتاق حسین ایسے متدین اور نواب محسن الملک و نواب عماد الملک و نواب وقار الملک کو ایسے اعلی مدارج پر پہونچنے کے موقعے حیدرآباد ہی مین ملے۔ مولوی چراغ علی مرحوم کے سے لائق۔ راے حکم چند ایسے مقنن۔ علامہ شبلی کے سے فاضل و فلسفی مصنف۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایسے ادیب۔ داغ مرحوم ایسے شاعر بے بدل۔ مولوی عزیز مرزا ایسے منتظم و علم دوست اشخاص کو اپنی قدر و قیمت کا کچھ صلہ حیدرآباد ہی مین حاصل ہوا۔ اور سید علی صاحب بلگرامی مرحوم بھی آخر دم تک حیدرآباد ہی کے رہین منت رہے۔ یہ وہین کی فارغ البالی کی بدولت تھا کہ آپ کی عالمانہ پیاس کی سیرابی کیلئے بیش بہا کتب کا ایک نایاب ذخیرہ برابر مہیا ہوتا رہا چنانچہ اسوقت جو جائداد اور میراث آپ نے چھوڑی ہے وہ ایک نہایت نایاب لائبریری ہے اور مرحوم اسکو نہایت عزیز رکھتے تھے۔ مرحوم نے اپنی خداداد لیاقت و حیدرآباد کے بے بہا مواقع سے متمتع ہونے و عالمگیر شہرت حاصل کرنے کا پورا فائدہ اٹھایا اور باوجود حیدرآباد کی امیرانہ و سازشانہ زندگی مین شب و روز گھرے رہنے کے بھی آپ کی زندگی ہمیشہ طالبعلمانہ رنگ لئے رہی۔ چنانچہ آپ اپنی مشہور تصنیف کتاب تمدن عرب کے دیباچے مین لکھتے ہین کہ:—

"جو اشخاص دیسی ریاستون کی ملازمت کی مشکلات سے واقف ہین اور جنھون نے اُن بدتعیب انقلابات کو دیکھا ہے جو ان ریاستون مین ہر روز ہوا کرتے ہین، خیال فرماسکتے ہین کہ کسی عہدہ دار کے لئے جو علاوہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے ہروقت دربارداریون اور سازشون کی مصیبتون مین مبتلا ہو ایسی بڑی تصنیف کا ارادہ کرنا اور پھر اسکو ایک سال کے اندر تمام کرنا کسقدر دشوار امر ہے۔"

مرحوم کی ۶۰ سالہ زندگی پر نظر ڈالنے سے بہت سے بیش بہا سبق حاصل کئے جاسکتے ہین۔ آپ کی زندگی تین حصون پر منقسم کیجاسکتی ہے۔ اول ابتدائی عمر و طالبعلمی۔ دوم حیدرآباد کی زندگی۔ سوم حیدرآباد سے وظیفہ لینے اور زندگی کے آخری ۱۰ سال۔ مرحوم کا مرز بوم صوبہ اودھ کا وہ مشہور مردم خیز قصبہ ہے جو بلگرام کے نام سے مشہور ہے۔ آپ وہان کے سادات عظام مین سے تھے۔ چونکہ آپ کے والد ماجد خان بہادر سید زین الدین بنگال پراونشل سروس

مین تھے اسلئے مرحوم سنہ ۱۸۵۱ء مین بمقام پٹنہ پیدا ہوے اور آپ اپنے پانچ بھائی اور ایک بہن مین سب سے چھوٹے تھے - سید حسن صاحب بلگرامی المعروف بہ نواب عماد الملک آپ کے برادر اکبر ہین جو علاوہ اپنی اعلیٰ لیاقت اور تاریخ دکن کے مصنف ہونے کے محض اپنی قابلیت اور اعلیٰ درجہ کے صائب الراے ہونے کے انڈیا کونسل کی ہندوستانی ممبری پر سرفراز ہوے - آپ کے دوسرے بھائی سید حسن ہیت جو انگلستان کی اعلیٰ سوسائٹی مین نہایت بارسوخ ہین - آپ کے ایک بھائی بنام سید محمدؐ صاحب حیدرآباد کے ایک بڑے ضلع کے سینیر کلکٹرون مین سے ہین اور آپ کی ایک ہمشیرہ مسز شجاعت علی صاحب فخر خاتونان اسلام ہین اور اعلیٰ درجہ کی انگریزی و فارسی لیاقت رکھتی ہین - اور آپ کے کل خاندان پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے کہ -

این خانہ تمام آفتاب است

سید علی صاحب بلگرامی مرحوم نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے عم بزرگوار خان بہادر سید اعظم الدین سی - آئی - ای کے گھر مین حاصل کی - لیکن یہ تعلیم وہی پرانی مکتبی طریقے کی تھی جسکو آجکل "اولڈ اسکول" کہا جاتا ہے - مرحوم کی عربی و فارسی تعلیم کی یہین بنیاد پڑی - پرانے مکتبی طریقۂ تعلیم کی خواہ کتنی ہی ملامت کیجاے مگر اسمین شک نہین کہ اسمین ذہنی و اخلاقی تربیت کی کچھ خوبیان ضرور تھین - کون نہین جانتا کہ سرسید علیہ الرحمۃ، نواب محسن الملک، وقار الملک، علامۂ شبلی و حالی، ڈاکٹر نذیر احمد، ذکاء اللہ مرحوم وغیرہ وغیرہ ایسے عالم فاضل مدبر و منتظم اشخاص سب اسی پرانے اسکول کے طالبعلم تھے اور انکی ابتدائی تعلیم کی بنیاد قدیم مکتبون مین پڑی تھی - یہ لوگ کیرکٹر یعنی عملی قوت کے لحاظ سے جدید اسکول کے فارغ التعلیم حضرات کے مقابلہ مین جو تفوق رکھتے ہین وہ ارباب بصیرت پر مخفی نہین ہے -

بلگرامی مرحوم نے اپنی مادری زبان اُردو اور عربی و فارسی مین پختگی حاصل کر لینے کے بعد پندرھوین سال مین انگریزی زبان کی تحصیل کی طرف توجہ کی - چونکہ بچپن ہی سے خداداد طور پر طباع اور ذہین تھے اور اسپر قوت حافظہ مستزاد تھی اور عربی فارسی کی تعلیم سے انکی دماغی تربیت خوب منجھ چکی تھی اسلئے اُنھون نے انگریزی اسکول مین بھی اس سرعت سے ترقی کی کہ داخلہ سے صرف آٹھ سال مین پٹنہ کالج کی طرف سے - بی - اے - مین شریک ہوئے اور اول درجے کے دُہرے اعزاز یعنی "ڈبل آنرز" کے ساتھ اس امتحان مین کامیابی حاصل کر لی - سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس امتحان مین مرحوم کی سکنڈ لینگوج یعنے دوسری زبان سنسکرت تھی! اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد آپ میکانکل سائنس یعنے علم آلات و انجینیری سیکھنے کی غرض سے رُڑکی کالج مین داخل ہوئے - سر سالار جنگ اوّل کو جو اس زمانہ مین حیدرآباد کے بہترین وزیر اعظم تھے اور جنکا نام ہندوستان کی تاریخ مین بڑے بڑے مدبّرون کی فہرست مین ہے، مرحوم کی عجیب و غریب ذہانت کی خبر لگی اور اُنھون نے فی الفور بلگرامی صاحب کو حیدرآباد طلب کر کے اپنے ذاتی اسٹاف مین رکھ لیا اور جب سر سالار جنگ ممدوح انگلستان تشریف لے گئے تو بلگرامی صاحب مرحوم کو بھی اپنے ساتھ لیا اور وہان پہونچکر اُن کو انگلستان کے معدنیات کے شاہی مدرسہ مین داخل کرا دیا یہان آپ کو پروفیسر ہکسلے اور پروفیسر ٹنڈل جیسے مشاہیر درجہ سائنس دانون کی شاگردی کی خوش نصیبی حاصل ہوئی - جب

بہت چاہتے تھے کہ حیدر آباد مین رہکر بقیہ زندگی بسر کرین لیکن حیدر آباد کی سازشون کی بدولت گذشتہ سال کے اپریل مین راقم سطور کی سفارش پر دوبارہ قنوج تشریف لے آئے تاکہ کتاب تمدن ہند کے ترجمہ کی تکمیل کر لین چنانچہ وہ مکمل ہو گیا اور اب زیر طبع ہے۔ اوائل گرما مین آپ مع اپنی بیگم صاحبہ و بچون کے اپنے وطن مالوف بلگرام تشریف لائے اور ہردوئی مین ایک بنگلہ خرید لیا۔ ارادہ تھا کہ بقیہ زندگی وطن کے قریب ہی اور ملک و قوم کی خدمت مین صرف ہو۔ چنانچہ تقریباً دو سال سے ”آپ علیگڈھ مومنٹ“ مین بہت کچھ عملی دلچسپی لینے لگے تھے۔ گذشتہ جنوری مین آپ ”آغاخانی مشن“ کے ساتھ الہ آباد مین شریک تھے اور آخر مارچ مین پنجاب ڈیپوٹیشن کے ساتھ بسر کردگی ہز ہائنس سر محمد علی محمد خان صاحب لاہور بھی تشریف لائے تھے۔ علیگڈھ یونیورسٹی کا کانسٹیٹیوشن مرتب کرنے کا اہم ترین کام آپ کے سپرد ہوا تھا۔ آپ اُسکے سکریٹری تھے اور اسمین ہمہ تن مصروف تھے۔ اس شوق و مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ ۱۲ اپریل کو آپنے نواب وقار الملک کو لکھا کہ کل مین نے مسلسل ۹ گھنٹہ کام کیا اور پھر شام کو ۲ گھنٹے۔ ایسٹر کی تعطیلون مین اسکا مسودہ آپ نے بمقام علیگڈھ منتخب کمیٹی کے سامنے پیش کیا تھا اور ۳ مئی کی صبح کو آپ پھر لکھنؤ جانے اور راجہ صاحب محمود آباد سے یونیورسٹی کا نسٹیٹیوشن کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے گھر سے روانہ ہوئے تھے کہ پیام اجل آپہونچا۔ ۳ منٹ کے اندر ہی اندر روح نے اس خاکی جسم سے مفارقت کی۔ آپ کی بیگم صاحبہ جنھین آپ بیحد عزیز رکھتے تھے کئی مہینے کے بعد حیدر آباد سے اُسی روز واپس تشریف لائی تھین اور یہ آخری صحبت صرف ۱۴ گھنٹہ کی تھی۔

حسب وصیت آپ بلگرام کے امام باڑہ مین دفن ہوئے افسوس آپکی رحلت سے نہ صرف قوم اور ملک کو ایک نقصان عظیم پہونچا بلکہ ایک ایسا فرد دنیا سے اُٹھ گیا جسکے مانند مادر گیتی روز بروز پیدا نہین کرتی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ نے جو ۶۰ سالہ زندگی مین علمی اعزاز حاصل کئے وہ حسب ذیل ہین۔ شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی بی۔ اے (کلکتہ) ایم۔ اے۔ (کیمبرج) بی۔ ایل (کلکتہ) گولڈ میڈلسٹ بارسٹرایٹ لا۔ ڈاکٹر آف لٹریچر۔ ایف۔ جی۔ ایس۔ ایسوسئیٹ رائل اسکول آف مائنس لندن۔ ممبر آف دی رائل ایشیاٹک سوسیٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ۔ ممبر آف دی نارتھ آف انگلینڈ انسٹی ٹیوشن آف مائننگ انجینیرس۔ ممبر ایشیاٹک سوسٹی بنگال و بمبئی۔ ممتحن سنسکرت مدراس یونیورسٹی۔ وغیرہ وغیرہ۔

باسوائے ان علمی اعزاز کے آپ قریباً چودہ یورپ و ایشیا کی زبانون مین مہارت رکھتے تھے۔ فلسفہ علم اللسان کے ایک زبردست ماہر تھے طبعی عملی طور پر آپ طالبعلم تھے۔ نہایت خلیق و متواضع و فیاض تھے۔ حیدر آباد مین صرف دو شخص ایسے گذرے ہین جنھون نے اپنے اوج و اقبال کے زمانہ مین رسد با بندگان خدا کو روزی سے لگا دیا اور ہزاری ماہوار تک پہونچایا۔ اول نواب محسن الملک مرحوم تھے اور دوسرے بلگرامی مرحوم۔

مذہباً آپ اثنا عشری شیعہ تھے مگر حضرت عمرؓ کے انصاف و اعلیٰ اوصاف کے ہمیشہ مداح تھے۔ آپ کا مذاق عالمانہ تھا اور آپ کے خیالات بیشتر فلسفیانہ تھے۔ اصلاح رسوم و تمدن مسلمانان ہند کے نہ صرف آپ حامی تھے بلکہ عملی طور پر آپ اسکے کوشان تھے۔ ہندی پردہ یا حبس دوام کے آپ سخت

...الف تھے اور تعلیم نسوان کے بڑے زبردست حامی- چنانچہ آپ کی صاحبزادی مس لولو رقیہ بلگرامی ہندوستان مین اسوقت بلحاظ انگریزی تلفظ، عربی قرأت، فرنچ دانی، فنون لطیفہ و باریک خیالی کے مین اپنے یکتا باپ کی اکلوتی بیٹی ہین-

ایک عجیب خصوصیت جو مرحوم مین حیدر آبادی زندگی کے باعث پیدا ہوگئی تھی وہ یہ ہے کہ باوجود عالمانہ مذاق و طالبعلمانہ زندگی کے آپ مین اعلیٰ درجہ کا اسٹیٹ کرافٹ یعنی ملک و دربارداری و جوڑ توڑ کا ملکہ بھی پیدا ہوگیا تھا اور مشرقی ریاستون کے راز بازسے آپ خوب ماہر تھے اور مشرقی و اسلامی ممالک کی ساری تباہ حالی ذلت و خواری کا ذمہ دار آپ بادشاہان وامراء مشرق کو قرار دیتے تھے- چنانچہ راقم سطور جن ایام مین ایران و استنبول و مصر کی سیاحت کر رہا تھا تو آپ نے مجھے یہ تحریر فرمایا تھا کہ:—

"میرا خیال ہے کہ اس سفر کے بعد آپ بھی اسلام اور مسلمانون کے طرف سے اس درجہ پر امید نہونگے جیسے پہلے تھے- اصل یہ ہے کہ جب تک ہمارے بادشاہ اور امراء نہ جاگین گے تب تک کوئی اُمید نہین ہوسکتی اور انکی یہ حالت کہ خود تو وہ کسیقدر غافل تھے ہی لیکن یورپ کی قومون نے اپنی خود غرضی سے انکو جام پر جام مسکرات اور مقویات کا دیکر سلار کھا ہے اور جاگنے ہی نہین دیتے"

گو مرحوم کو اسلامی اقوام کے پھر اُبھرنے سے بعض اوقات بہت کچھ مایوسی سی معلوم ہوتی تھی لیکن جب کبھی انکی ترقی کا کسی گوشہ سے کوئی حال سُنتے تھے تو ایک جوش مسرت اُنکے چہرے سے مترشح ہوتا تھا- راقم سطور کو گذشتہ ۱۰ سال سے نہایت قریبی تعلق مرحوم سے رہا- مہینون ایک جا بسر ہوئے اور صدہا پرائیویٹ خطوط راقم سطور کے پاس اسوقت مرحوم کے موجود ہین جنسے انکے مذہبی و ملکی و عالمانہ خیالات پر روشنی پڑتی ہے- راقم سطور کا ارادہ ہے کہ انکو وقتاً فوقتاً شائع کرے کہ اس جلیل القدر شخص کا اندازہ پبلک کسیقدر کرسکے- مرحوم کو اپنے عالمانہ مذاق و عدیم الفرصتی کے باعث طبقہ عوام سے میل جول کا بہت کم موقع ملا- انکے آخری ایام کے خطوط سے اپنے ذاتی معاملات کے متعلق کسیقدر مایوسی معلوم ہوتی ہے مثلاً مرحوم کے سب سے آخری خط کا جو اُنھون نے اپنی موت سے ایک ہفتہ قبل ۲۲- اپریل کو مجھے لکھا ایک جملہ یہ ہے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجابت کو دعا سے بیر ہوگیا ہے"

مرحوم علیگڈھ یونیورسٹی کو نہایت مفید خیال کرتے تھے اور انکو نہایت آرزو تھی کہ وہ اس یونیورسٹی کو دیکھین- یہانتک خیال تھا کہ خود جاکر علیگڈھ کو ہند کا کیمبرج بنائین اور ہند کے مسلمانون پر جو ایک بہتر دور جدید شروع ہوا ہے اُسکے کچھ آثار دیکھ لین- لیکن جسطرح حضرت موسیٰ کو زمین موعود کے اندر داخل ہونیکا موقع نہ ملا اور انھون نے دور سے ایک پہاڑ پر سے اُفق مین زمین موعودہ کی زیارت کرلی اسیطرح بلگرامی مرحوم بھی یہ داغ حسرت دل مین لے گئے-

کسی آیندہ نمبر مین بشرط فرصت ہم بلگرامی مرحوم کی زندگی سے جو خاص سبق حاصل کئے جاسکتے ہین اسکا بیان کرینگے اور انکے خیالات پبلک کے سامنے پیش کرینگے- یہان صرف اسقدر عرض کردینا ضروری سمجھتا ہون کہ پبلک انکی آخری تصنیف تمدن ہند کو ضرور پڑھے- یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے جو زیر طبع ہے اور راقم سطور نے سالگذشتہ قریباً پانچ ماہ حیدر آباد دکن مین انکا مہمان رہکر اس کتاب کی تکمیل مین انکی مدد کی تھی-

ایم-جان

قدیم ہندوستان کی بحری تجارت

(ماڈرن ریویو کے ایک مضمون کا خلاصہ)

برہمنی اور بدھ مذہب دونوں کے زمانے میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں انمیں جابجا ایسے تذکرات پائے جاتے ہیں جو قدیم ہندوستان کی بحری تجارت پر دلالت کرتے ہیں۔ اُنکے بیانات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جہازسازی کا ہنر معدوم نہ تھا بلکہ اسمین بہت کچھ ترقی ہوئی تھی۔ یہ باتین ہندوستان کے قدیم لٹریچر تاریخی کتبہ جات اور سکون سے پایہ ثبوت کو پہونچتی ہین اور بعض ممالک کے مورخون اور سیاحون کے بیانات سے بھی انکی تائید ہوتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تین ہزار سال تک ہندوستان تجارتی دُنیا کا مرجع و مرکز رہا ہے چینی، یہودی، اسوری، یونانی، مصری اور رومی اقوام کے ساتھ سلسلہ تجارت قائم تھا اور قرون وسطی مین ترکون، وینس والون، پرتگیزون، ڈچ اور انگریزون کے ساتھ تجارت ہوا کرتی تھی۔ زمین کی زرخیزی کاریگرون کی ہنرمندی وصنعتگری، خوشگوار آب وہوا، اور سادہ طرز زندگی کے باعث اہل ہندوستان ضروریات زندگی کیلئے غیرون کے محتاج نہ تھے۔ البتہ دوسری قسم کی چیزین (جو ضروریات زندگی مین شمار نہین ہوسکتی ہین) یورپ اور مغربی ایشیا سے آیا کرتی تھین مثلاً قلعی، سیسہ، کانچ کے برتن، عنبر، فولاد، اور ادویات وغیرہ اشیاے درآمد تھین۔ عرب سے لوبان آتا تھا جو معبدون مین جلایا جاتا ہے۔ برعکس اسکے ہندوستان سے یورپ کو لین بھیجی جاتی تھی جو سکندر کے زمانے سے مشہور چلی آتی تھی ہیرے، یاقوت، فیروزے، نیلم اور پکھراج وغیرہ کیلئے بھی مغرب اسی ملک کا دست نگر تھا کئی قسم کے گوند، پوستین، ہینگ، مشک نافہ، بیش بہا اور خوبصورت شالین دوشالے، قالین جنکی بابل اور روما مین وہی قدر وقیمت تھی جو اسوقت پیرس اور لندن مین ہے، اس ملک سے بکثرت تیار ہو کر باہر جایا کرتے تھے۔ اشیاے برآمد مین سب سے بیش قیمت ریشم تھا جو سلطنت ایران کے عروج کے زمانے مین سونے کے بھاؤ فروخت ہوتا تھا۔ یہ ریشم ہندوستان مین بھی تیار ہوتا تھا اور چین سے بھی لایا جاتا تھا۔ اس سے اُترکر ململ، چھینٹ، اور سوتی کپڑے تھے۔ مگر ململ سب سے اعلی قسم کی تیار ہوا کرتی تھی۔ مختلف قسم کے روغن، پیتل کے برتن، راب، نمک، نشہ آور ادویات، کئی قسم کے رنگ، خوشبودیات، مرچ، دارچینی اور قسم قسم کے مصالح جات جنکی یورپ مین بڑی مانگ تھی، ہندوستان سے بکثرت روانہ ہوا کرتے تھے۔

ممالک غیر کی آسائش کے سامان ہندوستان صدیون تک بہم پہونچایا کیا اور اس تجارت سے اہل ہند بہت متمول ہوگئے تھے۔ غیرون سے وہ صرف سونا چاندی خریدتے تھے، جس پر انکے منافع کا ایک بڑا حصہ اُٹھ جاتا تھا۔ جس طریقے سے یہ دھاتین لیجاتی تھین اُن کی بابت مسٹر ڈانیل صاحب (صرفتی مقابلہ ایشیا) " Industrial competition of Asia " کے صفحہ ۲۲۵ مین تحریر فرماتے ہین:-

"جو چیزین اہل ہند کے نزدیک غیر ضروری اور وافر بھی جاتی تھین انکا سونے چاندی سے تبادلہ کیا جاتا تھا۔ یہ چیزین دُنیا کے کسی اور

سے ہم نہ پہونچ سکتی تھین علاوہ ازین مغربی ایشیا، مصر اور یورپ کے اہالیان کے نزدیک اُنکی قدر و قیمت بہت اعلیٰ تھی۔

ہندوستان مین ہر سال سونے کی ایک معتدبہ مقدار آتے دیکھکر اوّل صدی قبل از مسیح مین پلائنی کو اندیشہ و تاسف ہوا تھا۔ اس مشہور مصنف کے اندازہ کے مطابق سلطنت روما خوشبویات اور سنگار کی اشیار کے لئے ساڑھے دس لاکھ روپے کا سونا دیا کرتی تھی[51]۔ پانچوین صدی قبل از مسیح مین دارا نے پنجاب وکشمیر کو اپنی سلطنت کا صوبہ بنایا تھا، جو سب سے زیادہ متمول اور زردار تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان مین غیر ممالک سے اشیار برآمد کے تبادلہ مین سونا اور چاندی آتی تھی۔ اس صوبہ مین افغانستان بھی شامل تھا" وہ ہر سال پندرہ ہنڈرڈ ویٹ خاک طلا جو ڈیڑھ کرور روپیہ کی ہوتی تھی بطور خراج لیا کرتا تھا یہ رقم اُسکی سلطنت کے ایشیائی حصے کی آمدنی کا تہائی حصہ تھی[52]"

اس عظیم الشان تجارت کی تاریخ بیان کرنا خالی از فائدہ نہوگا۔ اس تجارت کی قدامت کا اس امر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رگوید مین جو بنی آدم کی سب سے پرانی تحریر ہے، اسکا ذکر پایا جاتا ہے کہ کئی جگہ جہازوں اور تاجروں کا ذکر ہے جو دولت لانے کے لئے جہازوں پر سوار ہوکر سمندروں مین جاتے اور اپنی جان کو خطرہ مین ڈالتے ہین۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی بحری تجارت کی ابتدا تاریخی زمانہ کے ساتھ ہوئی تھی یا جب بنی آدم اس زمین پر آباد ہوئے تو اسکے بعد ہی یہ تجارت بھی شروع ہوئی۔ بائبل مین بھی اسکا ذکر ملتا ہے کہ تاجر اونٹوں پر بلسان، اگر، اور گرم مصالح لادکر مصر کو لے جایا کرتے تھے[53]۔ حضرت سلیمان کے زمانے مین ہندوستان سے ہاتھی دانت، نفیس و بیش قیمت کپڑے، بندر، اور مور جایا کرتے تھے جنکے خریدار اسوریہ مین بکثرت سے تھے۔ اوّل سلاطین کی کتاب مین مذکور ہے کہ حضرت سلیمان کے جہاز اوفیر سے سونا، جواہرات اور ایک قسم کی قیمتی لکڑی لے جایا کرتے تھے[54]۔ حزقی ایل نبی کی کتاب مین طائر کی تجارت کے ضمن مین ایسی اشیار کا تذکرہ ملتا ہے جو بلاشبہ ہندی ساخت کی تعیین[55] زمانہ قدیم کے نامور مصنفین مثلاً میگستھنز[56] (Megasthenes)

---

[51] ملاحظہ " Natural History " (تاریخ طبعی) مصنفہ پلائنی جلد دوازدہم صفحہ ۰، ورسین کی کتاب Provinces of Roman Empire جلد یازدہم۔

[52] تاریخ ہیرودطس جلد سوم۔ بند ۹۴۔ اے۔ اسمتھ صاحب کی کتاب Early History of India (قدیم ہندوستان کی تاریخ) صفحہ ۴۴۔

[53] "...اسماعیلیوں کا ایک قافلہ جلعاد سے گرم مصالح اور روغن بلسان اور مُر اونٹوں پر لادے ہوئے آتا ہے کہ انھیں مصر کو لیجائیں" (پیدائش ۳۷/۲۵)۔

[54] "پھر سلیمان بادشاہ نے عصیون جبر مین جو ایلوت کے نزدیک ہے، دریائے قلزم کے کنارے پر جو ادوم کی سرزمین مین ہے، جہازون کی بحری بنائی اور حیرام نے اُس بحری مین اپنے چاکر ملاح جو سمندر کے حال سے آگاہ تھے سلیمان کے چاکرون کے ساتھ کرکے بھیجا اور وہ اوفیر کو گئے اور وہان سے چار سو بیس قنطار* سونا لیکے سلیمان بادشاہ پاس آئے" (اوّل سلاطین ۹/۲۶، ۲۷، ۲۸) "اور حیرام کی بحری بھی جس پر لادکر اوفیر کا سونا لائے، اُسی پر اوفیر سے چندن کے بہت سے درخت اور جواہر دھرے ہوئے آئے" (اوّل سلاطین ۱۰/۱۱)۔

[55] "...یہی تیرے تجار تھے جو کمخواب اور چوغے اور ارغوانی اور منقش پوشاکین، اور سب طرح کے بوٹے دار نفیس کپڑے کے گٹھون کو ڈوری سے کسے ہوئے اور مضبوط کئے ہوئے تیری تجارت گاہ مین بیچنے کے لئے آتے تھے۔" (حزقی ایل ۲۷/۲۴)۔

[56] "وہان آبنوس پیدا ہوتا ہے" (استرابو ۱۵/۱)۔

---

* قنطار۔ ایک قنطار ۱۳۲۰۰۰ انگریزی گرین کے برابر ہوتا ہے یعنی ۲۲۹ ½ ٹرائے پونڈ۔

تاوفرسطس (Theophrastus)[51] اور ورجل (Virgil)[52] بھی ان اشیا کو ملک ہند کی پیداوار سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر کالڈ ویل صاحب اپنی مشہور کتاب "دراوڑی زبانوں کی نسبتی گرامر"[53] میں تحریر فرماتے ہین:

"کوئی تعجب نہیں اگر یہ جو کہا جاتا ہے صحیح ہو کہ اس زمانہ سے فنیکیون اور حضرت سلیمان کے ملاحون کے ساتھ ۔۔۔ مالابار تک آ کر لیجایا کرتے تھے۔ یا کم از کم اس تجارت مین حصہ لیا کرتے تھے۔ ویدون سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانہ سے آریہ لوگ جہازون مین سوار ہو کر غیر ملکی تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کے جہاز کہان دور کن حصون کو جایا کرتے تھے۔"

بشپ کالڈ ویل صاحب ممدوح کے خیالات کی ایک فاضل و محقق پادری صاحب (پادری ڈی فولکس) حسب ذیل بیان سے تائید کرتے ہین:-

"اب اس امر مین شاید ہی شبہ کیا جائیگا کہ حضرت سلیمان اور شاہ حیرام (والی طائر) کے زمانہ مین جو چیزین مشرق سے جاتی تھین وہ دکن کی بندرگاہون سے روانہ ہوا کرتی تھین اور گمان غالب ہے کہ مدیان کے تاجر جنکا ذکر کتاب مقدس (پیدائش ۲۵، ۳۷ ۔ ۲۵ و ۲۸) مین ملتا ہے اور حضرت یعقوب کے بیٹے مصر مین جو گرم مصالح پہونچایا کرتے تھے وہ دکن کے باغات مین پیدا ہوا کرتے تھے"[54]

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تجارت ابتدا مین مغربی ایشیا اور فلسطین کے ساتھ ہوا کرتی تھی جسکا تاریخ مین ذکر پایا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان نے اس تجارت کا ایک حصہ اپنی یہودی رعایا کے لئے مخصوص کرنا چاہا اور بدین غرض اُنہنے مشرقی تاجرون کے لئے بحر و بر مین سہولتین پیدا کین، چنانچہ بری راستون پر قافلون کے آرام کیواسطے تدمر یعنی (Palmyra) بعلبک یعنی (Heliopolis) (مدینۃ الشمس) اور حامت (Epiphania) بسائے۔ سلیمان کی پیش بینی جوان قافلون کی حفاظت مین ظاہر ہوئی تھی۔ آخر کار رنگ لائی یعنی مسوپٹامیہ مین تجارتی مرکز قائم ہو گئے جس سے بابل سلیشیا اور ایشیا مشرقی تجارت سے مالامال او فارغ البال ہو گئے۔ سلیمان مشرق کی بحری تجارت کی ترقی کا بھی یکسان خیال رکھتا تھا۔ اُسکے بیڑے بحیرہ قلزم اور خلیج فارس کے بندرگاہون سے وقتاً فوقتاً ممالک غیر کو روانہ ہوا کرتے تھے اور انکے وسیلے سے جو مال سمندر کے کنارے پر اترتا تھا اُسے قافلہ اندرون ملک مین پیٹرہ پہونچاتے تھے اور وہان سے کچھ مصر کو جاتا اور کچھ بحیرہ روم کی بندرگاہون مین پہونچکر یورپ کو بھیجا جاتا تھا۔ فنکی قوم نے اس تجارت مین سرگرم حصہ لیا تھا اور شہر طائر اسکا بڑا تجارتی مقام تھا۔ جب سکندر اعظم طائر کو فتح کرکے شہر سکندریہ کی بنیاد قائم کر چکا

[51] ملاحظہ ہو "پودون کی تاریخ" ۱۰۴ جہان میک کرنڈل صاحب نے تاوفرسطس کے الفاظ نقل کئے ہین۔

[52] گورگ ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱ "سیاہ آبنوس صرف ہندوستان ہی مین پیدا ہوتا ہے" نیز گورگ ۵، ۲ "ہاتھی دانت ہندوستان کی پیداوار ہے" پیری پلس (Periplus) بھی لکھتا ہے کہ آبنوس کے لٹھے بری گزا (یعنی بھروچ) سے بھیجے جاتے ہین۔

[53] "Grammar of the Dravidian Languages" صفحہ ۱۲۲۔

[54] ملاحظہ ہو Foulke's "Indian Intiquary" جلد ہشتم



تصویر بیکسی

اک مصیبت ہے تو مرمر کے ہوا تھا جینا * پڑگئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

مصر اس تجارت کی جانب رجوع ہوئے۔ جب رفتہ رفتہ یکے بعد
ے یہودیون، فنیکیون اور ایرانیون کے اقتدار کو مغربی ایشیا
زوال آیا اور انکی حکومت بھی زوال پذیر ہوگئی تو مصریون
ستارۂ اقبال عروج پر پہونچا اور نو سو برس تک اہل عرب کے
ے سے مشرقی تجارت سے آسودہ حال بنے رہے۔ انکے
ں کا زمانہ سکندر اعظم کی موت کے بعد شروع ہو کر ۶۴۰ء
ہا۔ جب مسلمانون نے مصر کو فتح کیا۔

اب یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یونانیون کے ان بیانات
الی جائے جو انھون نے قدیم ہندوستان کی داخلی تجارت
ب مین اپنی کتابون مین قلمبند کئے ہین۔ ان بیانات سے ہندوستان
ین الاقوام راہ و رسم پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ہیرادوٹس
تاریخ کا مبدا اور سب سے پرانا معتبر مورخ ہے۔ اسنے اپنی
ین ہندی سپاہ کے دستہ کا ذکر کیا ہے جو زرکسیس کے
ں شامل تھا۔ اسکے بیان کے مطابق ہندی سپاہیون کا
سوتی تھا اور وہ بید کی کمانون اور تیرون سے جنکے
ے پر لوہے کی تیز نوکین تھین، مسلح تھے۔ وہی مورخ یہ بھی
کرتا ہے کہ ہندوستان کا شمالی حصہ دارا کی سلطنت مین شامل
سکا بیسوان صوبہ قرار پایا تھا۔ علماء کا خیال ہے کہ ہندوستان
ت پر جو ایرانی اثر ہوا تھا اسکی یہی وجہ ہے۔ ہیرادوٹس کپاس
س ذکر کرتا ہے اور اسے بھیڑون کی اون سے بہتر اور
تر قرار دیتا ہے۔ استرابو اور ایرین صحرائے گوبی کے
ہ و دنے والون کا ذکر کرتے ہین جنسے پنجاب کے تاجر
خریدا کرتے تھے۔ مسیح سے چار سو برس قبل یونانی زبان مین
ایک کتاب لکھی گئی تھی جو سب سے پرانی سمجھی جاتی ہے۔ اسمین
یونانی مصنف نے ملک ہند کے حالات تحریر کئے ہین جو
اسے ایرانی حکام سے اثنائے گفتگو مین معلوم ہوئے تھے
یا دربار ایران کے ہندوستانیون سے سنے تھے۔

سکندر اعظم کے حملۂ ہند (۳۲۶ ق م) کے وقت کئی
نامور یونانی سیاح اور مورخ بھی اسکے ہمراہ آتے تھے۔ انھونے
ہندوستان کی اسوقت کی مالی اور حرفتی حالت کی کیفیت
حوالۂ قلم کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت
جہاز سازی کے ہنر کا بڑا غلبہ تھا اور اسکے طفیل بہتون کو روزی
ملتی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ دریائی اور بحری تجارت کے
سبب سے جہاز بنانے کی ضرورت لاحق ہوئی تھی۔ سکندر اعظم
نے دریائے سندھ کو کشتیون کے ذریعے سے عبور کیا تھا
نیارکس (Nearchos) کے لئے جو دریائے سندھ کے دہانہ
سے گزر کر خلیج فارس کو مع سپاہ گیا تھا، تمام کشتیان اور جہاز
بیگار مین پکڑے گئے تھے اور ایک ہولناک بیڑا بنایا گیا تھا جس کا
شمار ایرین مورخ کے بیان کے مطابق آٹھ سو اور کرٹیوس
(Curtius) اور دیوڈورس (Diodorus) کے بیان کے
مطابق ایک ہزار تھا۔ مگر "طالمی (Ptolemy) کے زیادہ قابل
اعتبار بیان" کے مطابق دو ہزار تھا۔ جنمین آٹھ ہزار سپاہ کئی
ہزار گھوڑے اور اشیاے خوردنی کا وسیع ذخیرہ لدا تھا۔ یہ بیڑا
ہندی کاریگرون نے ہندی مصالح سے تیار کیا تھا اور بڑا ہی
عظیم الشان تھا۔ ایرین یہ بھی بیان کرتا ہے کہ قبیلۂ خطرا
(Xathroi) کے اپنے ڈاک یارڈ (جہاز بنانے اور بحری جنس

۱ یہ مورخ مسیح سے چار سو برس پیشتر گزرا ہے۔

۲ ملاحظہ ہو اسمتھ صاحب کی کتاب "Early History of India" صفحہ ۵۵۔

[illegible] کھنے کی جگہیں ... جہازرانی تھے۔ انکے اپنے چھوٹے چھوٹے بادبانی کشتیاں ... وہ خود بنایا کرتے تھے ان اقتباسات اور حوالجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ موریہ خاندان کے زمانہ میں جہاز سازی ایک سرکاری فن اور صنعت تھی۔ مگر اسکا تمام انتظام گورنمنٹ کے ہاتھ میں تھا۔ میگستھنیز لکھتا ہے کہ اہل حرفہ کے ... جہاز بنانیوالے ... نگرانی ... تھے۔ مگر بہت سے سرکاری ملازم تھے اور انھیں پرائیویٹ (ذاتی) جہاز بنانے کی ممانعت[51] تھی۔ مگر بقول استرابو یہ جہاز تاجروں اور مسافروں کو کرایہ پر لیجاتے تھے[52]۔ پلائنی (Pliny) نے اپنی کتاب میں جزیرہ تپروبین (لنکا) کا ذکر کیا ہے جس میں ... باتیں جہازرانی اور جہاز سازی کے متعلق درج ہیں:-

"... ہندوستان کے درمیانی سمندر گہرا نہیں ہے ... پر ... لنگر تک نہیں پہونچ سکتا۔ ... اور پچھلا ... ایسا ہے کہ ... پانیوں میں بآسانی ادھر ادھر موڑا جا سکتا ہے۔ تپروبین کے ملاح ستاروں سے سمت معلوم نہیں کرتے اور ... اکثر انھیں نظر نہیں۔ مگر وہ اپنے ساتھ پرندے لیجاتے ہیں جنھیں سمندر میں چھوڑ دیا جاتا ہے جہاز انکے پیچھے پیچھے چلتے ہیں کیونکہ وہ خشکی کی طرف اڑا کرتے ہیں۔"

پلائنی یہ بھی بیان کرتا ہے کہ بڑے بڑے جہازوں پر تین ہزار امفورا[53] وزنی بوجھ لدا کرتا تھا اور بعض پر دس ہزار امفورا تک وزنی بوجھ بار ہوتا تھا[54] جو ڈھائی سو من کے برابر ہوتا ہے میکنڈل صاحب اسکی تائید کرتے ہیں۔

جہاز سازی اور جہازرانی کا رواج ہونے کے سبب سے صیغہ بحریات قائم کرنیکی ضرورت لاحق ہوئی۔ اسمتھ صاحب اپنی کتاب "قدیم ہندوستان کی تاریخ" میں تحریر کرتے ہیں:-

"حاکم شہر سے دوسرے درجہ پر تنظیمی کا ایک تیسرا فرقہ تھا جو فوجی معاملات کا انصرام کرتا تھا۔ اسکے چھ حصے تھے اور ہر حصے میں پانچ پانچ ممبر ہوا کرتے تھے۔ ایک حصہ خاص بحری معاملات کا منتظم تھا"[55]

شہنشاہ چندر گپت (۳۲۱ لغایت ۲۹۷ ق-م) کے چھ بورڈوں میں سے ایک صیغہ جنگ کا تھا میگستھنیز اور استرابو وغیرہ مصنفین اسکا ذکر اپنی کتابوں میں کرتے ہیں مگر اس زمانہ کی ایک سنسکرت زبان کی کتاب میں بھی اسکا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ کتاب اس زمانہ کی ادبیات کی بہترین یادگار اور قدیم تمدن کا ایک شاندار نشان ہے۔ اس کتاب کا نام کوٹلیا کا ارتھ ساشترہ ہے اسکا مصنف چانکیہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صیغہ بحریات کی ترکیب اور اسکا انتظام بہت عمدہ تھا۔ اسکا اعلیٰ ترین افسر جہازوں کا مہتمم کہلاتا تھا یعنی नावध्यक्ष وہ نہ صرف بحری جہازوں کا مہتمم تھا بلکہ دریاؤں اور جھیلوں کی جہازرانی کا بھی منتظم تھا[56]۔ جہازوں کا مہتمم زمانہ حال کے کمشنر بندرگاہ کی مانند

---

۵۱ استرابو ۱۵/۴۶ ملاحظہ ہو۔

۵۲ ملاحظہ ہو ibid ۱۵/۴۶ -

۵۳ امفورا ٹن کا چالیسواں حصہ ہوتا تھا اور ایک ٹن ۲۸ من کا ہوتا ہے۔

۵۴ ملاحظہ ہو ٹار صاحب کی کتاب "Ancient Ships" صفحہ ۲۵

۵۵ ملاحظہ ہو Smith's "Early History of India" صفحہ ۱۲۴ نیز استرابو ۱۵/۵۲ -

۵۶ नावध्यक्षस्समुद्रसंयान नदीमुखतर प्रचारान् देवसरोविसरोनदीतरांश्च स्थानीयादिष्ववेक्षेत

وتا تھا۔ اسکا ایک فرض یہبی تھا کہ سب جہازون سے واجبی محصول لے اور کسی قسم کا دھوکا نہ دے۔ صیغۂ بحریات اُس زمانہ مین کیا تھا اور لوگ بحری تجارت و صنعت مین کس قدر مصروف تھے اسکا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ جو لوگ سمندر دریا اور جھیلون کے کنارون پر آباد تھے اُنکو ہمیشہ ایک مقررہ رقم بطور ٹیکس ادا کرنی پڑتی تھی۔ ماہی گیر پروانۂ اجازت (لائسنس) لیکر ماہی گیری کرتے تھے اور اپنی آمدنی کا چھٹا حصّہ سرکار کو بطور ٹیکس دیا کرتے تھے۔ بندرگاہون اور سمندر کے کنارے کے شہرون مین رہنے والے تاجرون کو ایک خاص ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ جو لوگ سرکاری جہازون پر سوار ہوکر باہر جاتے تھے، اُنھین روانگی کی ایک خاص فیس دینی پڑتی تھی۔ موتی اور گھونگے نکالنے والے آدمیون کو سرکاری کشتیان کرایہ پر دی جاتی تھین۔ اسکے سوا وہ اپنی ذاتی کشتیون سے بھی کام لینے کے مجاز تھے۔ کشتی بندرگاہ کو جو ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا اسکے علاوہ دریائی گھاٹ کی فیس بھی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسوقت بحری تجارت رونق پر تھی اور تاجرانہ زیست معروفیت کا ایک تسلسل تھی۔ آدمیون، بیلون اور گھوڑون پر جو اسباب پار ہوکر جاتا تھا، اُسپر بھی ٹیکس مقرر تھا۔ اونٹ یا بھینسے کے دریا پار اُتارنے کا محصول چار ماشے تھا۔ پانچ ماشہ چھوٹے چھکڑے کا اور چھ ماشہ معمولی چھکڑے کا جسے بیل کھینچتے ہین اور بڑے بڑے چھکڑون کا محصول سات ماشہ تھا۔ بڑے دریاؤن کے گھاٹون پر مذکورۂ بالا شرح سے دوچند محصول لیا جاتا تھا۔ سب ٹیکسون کی تحصیل اور ہر قسم کی فیس لگانا اور وصول کرنا، یہ جہازون کے مہتمم کا کام تھا۔ علاوہ ازین بندرگاہون کے لئے جملہ قواعد وضع کرنا اور ان کی تعمیل کرانا بھی اسکا فرض تھا، مثلاً جب کوئی تباہ اور طوفان زدہ جہاز اسکے علاقہ کی بندرگاہ پر آتا، تو اسکا فرض تھا کہ اسکی ہر طرح دستگیری کرے۔ اگر کسی جہاز کا مال خراب ہوگیا ہو یا بھیگ گیا ہو تو مہتمم کو اسکا کل محصول معاف کرنے یا نصف محصول وصول کرنے کا اختیار تھا۔ اگر کوئی جہاز سمندر مین جاکر ٹوٹ جاتا،

तद्वेलाकुलग्रामाः क्लृप्तं दद्युः ।

मत्स्यबन्धकाः नौकाहाटकं षड्भागं दद्युः ।

पत्तनानुवृत्तं शुल्कभागं वणिजो दद्युः ।

यात्रावेतनं राजनौभिः सम्पतन्तः ।

शङ्खमुक्ताग्राहिणो नौकाहाटकान् दद्युः ।

स्वनौभिर्वा तरेयुः ।

क्षुद्रपशुर्मनुष्यश्च सभारो माषकं दद्यात् ।

शिरोभारः कायभारो गवाश्वं च द्वौ ।

उष्ट्रमहिषं चतुरः ।

पञ्च लघुयानम् । षड्गोलिङ्गम् । सप्त शाकटम् ।

द्विगुणो महानदीषु तरः ।

मूढवाताहतां तां पितेवानुगृह्णीयात् ।

उदकप्राप्तं पण्यमशुल्कमर्धशुल्कं वा कुर्यात् तथा निर्दिष्टाश्चैताः पण्यपत्तनयात्राकालेषु प्रेषयेत् ।

یا اسکے اندر پانی بھر جاتا جس سے مال و اسباب خراب اور برباد ہو جاتا تو اُسے تاجرون کو ہرجانہ دینا پڑتا تھا کیونکہ یہ اس کا فرض تھا کہ وہ جہازون کو مضبوط اور مستحکم بنوائے اور ٹوٹے پھوٹے کی مرمت کرائے اور انکو ہمیشہ اچھی حالت مین رکھے۔ ہرجانہ کا روپیہ سرکاری حساب سے دیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے دریاؤن کے جہازون کو ہمیشہ اچھی حالت مین رکھنا اور ملاح اور منتظم قسم پہونچانا بھی اسکا فرض تھا۔ ہر ایک جہاز کا ایک کپتان اور ایک ناخدا ہوتا تھا، چپو لگانے اور پانی نکالنے والے اور دیگر ضروری ملازم بھی ہوتے تھے۔ ندی اور نالون مین چھوٹی کشتیان ڈالی جاتی تھین۔ کوئی آدمی بلا اجازت دریا کو عبور نہین کر سکتا تھا۔ اس سے ملک کے دشمنون اور غدارون کو سلامت بچ نکلنے کا بہت تھوڑا موقع ملتا تھا اور نہ کسی کی جان تلف ہو سکتی تھی۔ دریا کے عبور کرنے کا وقت اور جگہ مقرر تھی جو شخص غیر مقررہ مقام و وقت پر دریا کو عبور کرنے کی کوشش کرتا وہ گرفتار ہو کر سزایاب ہوتا تھا۔ مگر اس قاعدہ مین مستثنیات بھی تھے یعنی فلاح عام اور تجارت کے فائدہ کے خیال سے خاص خاص قسم کے آدمیون کو ہر وقت دریا کو عبور کرنے کی اجازت تھی جنمین ماہی گیر سرکاری ملازم، ہر قسم کے پیغامبر، تاجر، جوگی، سنیاسی، برہمن وغیرہ شامل تھے۔ وہ اس قاعدہ کی پابندی پر مجبور نہ تھے۔

جہازون کے مہتمم کو مجاز تھا کہ جو آدمی بندرگاہ کے قواعد کی خلاف ورزی کرے اُسے قرار واقعی سزا دے۔ وہ بدمعاشون کو بھی سزا دینے پر قادر تھا جو رعایا کی بہتری اور بہبودی کے لئے خطرناک تھے۔ دریائی قزاقون کے جہاز برباد کر دئے جاتے تھے اور جو جہاز دشمن کے ملک کو جانے والے ہوتے تھے وہ بھی برباد کر دئے جاتے تھے۔ کسی کی بہو بیٹی کو ورغلانے اور بھگانے والا، چور اور مشتبہ آدمی وغیرہ فوراً گرفتار کر کے سزایاب ہوتا تھا جسکا مہتمم کو اختیار حاصل تھا۔ اسی قسم کے اور انتظامی قواعد بھی تھے اور چند دیگر فرائض بھی مہتمم کے عہدہ سے وابستہ تھے۔

اس سے عیاں ہو گیا ہوگا کہ اُس زمانہ کے بحریات کا کیا انتظام تھا اور کہ یہ صیغہ کن کن باتون کا ذمہ دار تھا۔ یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ موریہ خاندان کے وقت ہندوستان کی بحری تجارت، جہازرانی اور جہازسازی کی صنعت بڑے زور و ن پر تھی۔ تجارت پر بلاشبہ شہنشاہ چندر گپت کی وسیع سلطنت کا بھی بہت اثر پڑا تھا جسکے حدود موجودہ سلطنت ہند کے تمام رقبہ سے وسیع تر تھے۔ غیر ممالک کے سیاح،

---

۴۹ पुरुषोपकरणहीनायामसंस्कृतायां वा नावि विपन्नायां नावध्यक्षो नष्टं विनष्टं वाभ्यावहेत् ।

۵۰ शासकनियामकदात्ररश्मिग्राहकोत्सेचकाधिष्ठिताश्च महानावो हेमन्तग्रीष्मतार्यासु महानदीषु प्रयोजयेत् ।

۵۱ क्षुद्रिकासु वर्षास्राविणीषु क्षुद्रकाः ।

۵۲ बद्धतीर्थाश्चैताः कार्याः राजद्विष्टकारिणां तरणभयात् ।

۵۳ अकालेऽतीर्थे च तरतः पूर्वस्साहसदण्डः ।

۵۴ कैवर्तकाष्ठतृणभारपुष्पफलवाटषण्डगोपालकानामनत्ययः सम्भाव्य दूतानुपातिनाञ्च सेनाभाण्डप्रचारप्रयोगाणां च, स्वतरणैः तरतां ; बीजभक्तद्रव्योपकरणांश्चानूपग्रामाणां तारयताम् ।

۵۵ हिंस्रिका निर्घातयेत् । अमित्रविषयातिगाः पण्यपत्तनचारित्रोपघातिकाश्च ।

۵۶ परस्य भार्यां कन्यां वित्तं वापहरन्तं शङ्कितमाविग्नं भाण्डोत्कृतं महाभाण्डेन मूर्ध्नि भारेणावच्छादयन्तं सद्यो गृहीतलिङ्गिनं अलिङ्गिनं वा प्रव्रजितमलक्ष्यव्याधितं भयविकारिणं गूढसारसारशासनशस्त्राग्नियोगं विषहस्तं दीर्घपथिकममुद्रं चोपग्राहयेत् ।

سفیر اور تاجر ہندوستان مین آیا کرتے تھے اور بقول اسمتھ صاحب خارجی سلطنتون سے سلطنت موریہ کا بہت وسیع ربط و ضبط تھا۔ تجارت اتنی وسیع تھی کہ اشیاے درآمد پر جو محصول لگایا گیا تھا، اس سے ایک بڑی رقم وصول ہوا کرتی تھی۔ اشوک کے زمانہ مین سلطنت کی وسعت پہلے سے بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ اسوریہ، بابل، مصر اور یونان وغیرہ ممالک کے فرمانروا ؤن کے ساتھ عمدہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ تاجرون اور اپدیشکون (مشنریون) کی کوشش سے ہندوستان زمانۂ قدیم کی تمام دُنیا کا تجارتی اور روحانی مرکز بن گیا تھا۔ بدھ مت کے مشنری عالمگیر برادری کی تلقین کیا کرتے تھے جسے ہندوستان کے باہر بھی فروغ حاصل ہوا تھا۔

الغرض جو اقتباسات پیش کئے گئے ہین، یا جنکے حوالے دئے گئے ہین اُنسے یہ امر ظاہر ہو گیا ہے کہ اس ملک کے قدیم باشندے بڑے صاحب ہنر اور عالی حوصلہ لوگ تھے اور ان کی اولوالعزمی ان کی خارجی بحری تجارت سے ظاہر ہوتی ہے۔

حسب ونسب

ہر زمانے اور ہر ملک کے بڑے بڑے نامور مصنفین نے اس بات پر زور دیا ہے اور نہایت شرح وبسط کے ساتھ اس امر پر قلمطرازی کی ہے کہ انسان کا اپنے حسب ونسب پر فخر کرنا بالکل بیجا ہے اور ع پدرم سلطان بود کا مصداق ہے۔ مجھے اس بارے مین ان نامور مصنفین سے کسی حد تک اختلاف ہے اور میرا خیال ہے کہ ہماری نظرون مین ان لوگون کی عزت ہونی چاہیے جنکے بزرگون نے اپنے ملک و قوم کے لئے نام حاصل کیا اور جنکی وجہ سے انکے ابناے جنس دوسرون پر یا تو دانائی مین یا دولت مین سبقت لے گئے اور جنکی ان تھک کوششون کے طفیل سے ہم دوسری قومون کی نظرون مین زیادہ قابل قدر ہوگئے۔ علاوہ برین یہ بات زیادہ قرین قیاس اور مدلل معلوم ہوتی ہے کہ وہ شخص جو نجیب الطرفین اور صحیح النسب ہے شریفون کے گھر مین پیدا ہوا ہے - انکے زیر اثر پرورش پائی ہے اور جسکی رگون مین شریفون کا خون دورہ کرتا ہے وہ فرد ایک رذیل اور گمنام شخص کی اولاد سے کہین زیادہ اچھے خیالات اور اچھے اطوار کا ہوگا۔ کسبی لیاقت اور شرافت نسبی عزت اور وجاہت کے مقابلے مین کسی صورت پیش نہین کیجا سکتی ایک شخص جو ایک اعلیٰ خاندان کا رکن ہے اور مزید بران اسنے علمی لیاقت بھی پیدا کرلی ہے - ایک ادنیٰ درجے والے اور ذلیل آدمی سے گو اسنے اعلیٰ تعلیم کیون نہ حاصل کرلی ہو- بدرجہا افضل ہے۔ بلکہ میرا تو یہانتک خیال ہے کہ ایک آدمی جسکا مایۂ ناز سواے اپنے اباو اجداد کی حاصل کردہ عزت و نیکنامی کے کچھ بھی نہین، وہ بھی معمولی درجے والے اور کم حیثیت لوگوں کی نسبت زیادہ قابل قدر ہے۔

جدی اور خاندانی شرافت کو مایۂ ناز ثابت کردینے کے بعد مجھے ان لوگون کو بھی نظر انداز نہین کرنا چاہئے جو اس بات

پر نسبت زیادہ فخر کرتے ہیں۔ دولت کی ہوس دوست تجارت و زراعت ہیں۔ یہ لوگ اس امر کو محسوس نہیں کرتے کہ بدی اور جہالت قوموں کو گندا کر دیتی ہیں۔ بدقسمتی سے انہیں لوگوں کی نظروں میں آشنائی ذلیل و خوار بنا دیتے ہیں۔ جیسا کہ خاندانی عزت اسکی بے گناہی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اور ان لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ایک نیا مالدار اور نئی عزت کا شخص قابل قدر نہیں اور ایک بھوکا ننگا بزرگوں کی اولاد اسکے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اول الذکر شخص بجائے عزت کئے جانے کے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے کے قابل ہے۔ ان لوگوں کا یہ خیال بالکل غلط ہے وہ نہیں سوچتے کہ روزمرہ کے حالات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اس دنیا میں روپیہ ایک بڑی زبردست طاقت ہے جس شخص کے پاس روپیہ کثرت سے اکٹھا ہو جاتا ہے وہ شائستہ بھی بن جاتا ہے۔ اسکے آنسو بلکہ اخلاق بھی درست ہو جاتے ہیں۔ غرض ہر طرح سے اسکی واہ واہ ہونے لگتی ہے اور جس شخص میں سے روپیہ پیدا کرنے کی قابلیت جاتی رہتی ہے وہ ہر طرح سے مورد طعن و تشنیع بن جاتا ہے۔ مالدار کے عیب بھی خوبیاں نظر آتی ہیں اور غریب کی خوبیاں عیب شمار کئے جاتے ہیں۔

اگر اس امر کو بغور دیکھا جائے کہ شریف النسب آدمی کیوں ایک خاصہ پاکر اپنی نجابت کو کھو بیٹھتے ہیں اور انکے سامنے کے رذیل اور ہیچ انسان عزت اور ثروت حاصل کر لیتے ہیں تو قدرت کا یہ اٹل قانون کہ "زمانہ کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا" ہمیں اسکا تسلی بخش جواب دیتا ہے۔ زندگی کی اس جد و جہد میں وہی افراد اور قومیں اپنا وجود قائم رکھ سکتی ہیں جو خود کو حالات زمانہ کی روش کے مطابق چلا سکیں ورنہ زمانہ انہیں نیست و نابود کر دیتا ہے اور انکا نام و نشان صفحہ ہستی سے اسطرح گم کرتا ہے گویا وہ کبھی دنیا میں تھے ہی نہیں نتیجہ یہ ہے کہ شرافت نسبی پر انسان فی الواقع فخر کر سکتا ہے مگر اس صورت میں کہ وہ اپنے تئیں اسکا اہل ثابت کرے ورنہ اگر اپنی ذاتی لیاقت تو کچھ ہو نہیں بلکہ صرف باپ دادا کی پیدا کی ہوئی عزت پر ناز کیا جائے تو بالکل بیجا ہے اور لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہونیکے علاوہ بزرگوں کی عزت کو بٹہ لگانا اور خود کو سوسائٹی میں ملنے جلنے سے محروم کرنا ہے۔

مرزا محمد عبدالرحمن۔ بی۔ اے۔

غزل فارسی

(از افکار تازہ جناب شمس العلما مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی)

غمزه چون گفت که در نرگس پر فن باشم
فتنه برخاست که با قامت او من باشم

اے که پرسی که بود آن که به جرم جان داد
می تواند که من سوخته خرمن باشم

داغ عشقے که به دل داشته ام گفت به من
سیر دوم شمع ره وادی ایمن باشم

یا تو آمیزم و از شوق تسلی نه شوم
تا به حدے که تو جان باشی و من تن باشم

دامن افشان بگذر بر سر من اے مایه ناز
تا من از هر دو جهان برزده دامن باشم

دوش در قتلگهِ عام تو شبلی سنه گفت
اول آن کس که فداے تو شود من باشم

ہمارے قیصر کی تاجپوشی

ماہ رواں کے دوران مین سرزمین برطانیہ بالخصوص اس کا پایۂ تخت لندن ایک ایسے واقعۂ تاریخی سے دوچار ہوا چاہتا ہے جسکی نظیر نہ تو تاریخ مصر قدیم، نہ بابل و نینوہ بہم پہنچا سکتی ہے جسکا جواب یونان اور روم نے اپنے عروج و اقبال اور شان و شوکت کے زمانہ مین بھی نہ دیکھا، نہ سنا۔ تاریخ ہند بھی خاموش ہے۔ الغرض تاریخ عالم کے اوراق ہم بے فائدہ اُلٹے چلے جاتے ہین۔ مگر اس نہایت عجیب و غریب اور دلچسپ و پُر لطف تقریب کی مثال ہاتھ نہین لگ سکتی۔ یون کہنا بجا ہوگا کہ یہ اپنی نظیر آپ ہے اور تاریخ عالم اسپر جسقدر ناز کرے تھوڑا ہے۔ ہماری مراد ہمارے شہنشاہ عالم پناہ جارج پنجم کی رسم تاجپوشی کے جشن سے ہے۔ یہ بیسوین صدی ہے جو تاریخ مین نہایت ممتاز اور عجیب بھی جائیگی۔ اس صدی کی دنیا اوّل صدی مسیحی کی دُنیا سے نرالی ہے۔ اسکی وسعت مین حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ وسائل آمد و رفت کی آسانیون سے برسون کی مسافت ہفتون مین اور تار برقی کے ذریعہ سے چند منٹ کے اندر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خبر پہونچ جاتی ہے۔ قیصر جارج کو ورثہ مین وہ سلطنت ملی ہے جس سے آفتاب کبھی غائب نہین ہوتا۔ جسکی مساحت کو سکندر اعظم اور قیصر جولیس کی سلطنتین ملکر بھی نہین پہونچ سکتی ہین۔ دنیا کا کوئی جزیرہ اور کوئی ملک ایسا نہین جو جہان پناہ کے زیرنگین نہین اور جسپر علم انگریزی نہ لہراتا ہو۔ اس عظیم الشان سلطنت کا کل رقبہ ایک کرور پندرہ لاکھ میل کے لگ بھگ اور آبادی چالیس کرور ہے۔ گویا خشکی کا پانچوان اور بنی نوع انسان کا چوتھا حصہ قیصر جارج پنجم کی حکومت کو تسلیم کرتا ہے۔ شہنشاہ جارج کی سلطنت عظیم مین دُنیا کی سب قومون اور زبانون کے لوگ موجود ہین۔ سب قسم کی پیداوارین۔ ہر قسم کے چرند و پرند اسکے حدود کے اندر رہتے ہین۔ جہان پناہ کو شاہ ہفت اقلیم پکارا جاسے تو درست ہوگا۔

اس عظیم الشان جشن تاجپوشی مین سلطنت برطانیہ کی تمام آبادیون اور قومونکے لیڈرون اور نمایندون کے اسوا شاہان یورپ و ایشیا کے خاص سفیر اور قائم مقام، براعظم امریکہ کی جمہوری حکومتون کے خاص وکیل، اور افریقہ کے سردارون کے نائب وغیرہ مدعو ہوسے ہین۔ دُنیا کی کوئی سلطنت اور کوئی حصہ ایسا نہوگا جو ہمارے شہنشاہ عالی وقار کو تخت نشینی کی مبارکباد کہنے کو دربار مین نہ آئیگا۔ ہندوستان کے والیان ریاست اپنے قیمتی زر و جواہر اور شاندار درباری پوشاکون کی چمک دمک سے خاص شان پیدا کرینگے۔ یہ ایک دربار ہے جو دُنیا کا خلاصہ ہے اور بنی آدم کی عالمگیر کشش کا مرکز۔ اس دربار کے ساتھ سامان تفریح اور سلطنت کی مصنوعات کی خاص نمائش کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ جلوس بڑے تزک و احتشام سے نکلیگا۔ الغرض اس دربار کی نظیر تاریخ مین کہین نظر نہین آتی۔

سوانحی حالات

ولادت مبارک حسب و نسب اور تعلیم و تربیت

ہمارے قیصر ملک معظم ایڈورڈ ہفتم صلح جو اور نیک بخت ملکہ معظمہ الگزنڈرا کے دوسرے فرزند ارجمند ہین۔ ۳ جون ۱۸۶۵ء کو محل مارل برو واقع لندن مین

تولد ہوئے - ملکہ معظمہ وکٹوریہ مرحومہ کے پوتے اور "شاہ بحر" والی ڈنمارک مرحوم کے نواسے ہین - بعض عالمان کا یہ مقولہ ہے کہ انسان کی عقلی قابلیتون اور اخلاقی خوبیون کا اندازہ کرتے وقت اسکے حسب نسب اور تعلیم کے طریقہ کو فراموش نہین کرنا چاہئیے - ہمارے قیصر ہمارے ان فرمانرواؤن کے نام سے بھی مشہور ہین جنکی وجہ یہ ہے - حضرات شاہ کو بحری طریقۂ جنگ کے فنون مین معتدبہ دستگاہ حاصل ہے اور کئی جنگی جہازون کی کمان فرما چکے ہین اور جہازرانی کے کمال کے تمغے اور انعامات حاصل کرکے بڑا نام پیدا کر لیا ہے - حضور کا یہ شوق جدی ہے شہزادہ الفریڈ اور شہزادہ والڈیمار بحری فوجون کے اعلیٰ افسر رہ چکے ہین جو حضور کے قریبی رشتہ مین ہین شاہان برطانیہ مین ولیم چہارم اور ڈیوک آف یارک برادر جارج سوم مشہور بحری کمانڈر انچیف تھے اور دوسرے ڈیوک آف یارک برادر چارلس دوم نے سترھوین صدی مین ڈچ بیڑہ کو شکست فاش دیکر خاص نام حاصل کیا تھا۔

ہمارے شہنشاہ کا پورا نام جارج فریڈرک ارنسٹ البرٹ ہے - چار سال کی عمر مین اپنے بڑے بھائی وکٹر مرحوم سمیت پادری جان نیل ڈالٹن کی اتالیقی مین رکھے گئے۔

ملک معظم ایڈورڈ کا یہ منشا تھا کہ حضور بحریات مین کمال حاصل کرین - بڑے بھائی وکٹر کی موجودگی مین تاج و تخت کا حق حضور کو نہ پہونچ سکتا تھا - اسواسطے آپ کو بحری بیڑہ کی کمان کرنے کے لئے خصوصیت سے تیار کیا گیا - چنانچہ ۱۸۷۷ء مین سپاٹ ہیڈ کو بھیجے گئے تاکہ جہاز برطانیہ پر بحری فنون کی تعلیم حاصل کرین - خاص استاد مسٹر لاکس مقرر ہوئے جنکی زیر نگرانی تمام بحری علوم و فنون حاصل کرنے لگے - علاوہ ازین ریاضیات کا بھی مطالعہ کیا - فرانسیسی زبان سیکھی - پادری ڈالٹن اخلاقی اور دینی تعلیم و تربیت کے اتالیق تھے - صبح ساڑھے چھ بجے سے رات کے ساڑھے نو بجے تک علمی اور اصولی تعلیم مین مصروف رہا کرتے تھے - عام طالب علمون اور شہزادون مین کوئی امتیاز نہین کیا جاتا تھا جیسے اور لڑکون کو اُستادون اور بحری افسرون کی فرمانبرداری کرنی پڑتی تھی - اسیطرح ان دونون گرامی قدر شہزادون پر بھی فرض تھی - شہزادہ جارج نے کشتی رانی مین اول درجہ کا انعام حاصل کیا تھا اور اپنے ہمسبقون اور جہاز کے ملاحون اور افسرون کے دلون مین بڑی عزت اور الفت پیدا کی۔

مقبوضات وراے بحر کی اول سیاحت

والد مکرم کے حسب ارشاد ۱۸۷۹ء مین آپ جہاز "بکانٹ" پر انگریزی مقبوضات ماوراے بحر کی سیاحت کو روانہ ہوئے - تاکہ جہازرانی کے تمام نشیب و فراز سے آگاہ ہوجائین - اسوقت آپ کا سن صرف چودہ سال کا تھا - اس سیاحت کے دوران مین حضور کو یہ معلوم ہوگیا کہ سلطنت برطانیہ کا کُل دار و مدار بحری سپاہ پر ہے دو سال تک اسی سیاحت مین مصروف رہے - اس اثنا مین کئی سمندر اور کئی ملک دیکھے اُن مقامات کی خصوصیت سے سیر کی جہان انگریزی امراے بحر نے غنیم کے بیڑون کو شکست دیکر اپنے ملک و قوم کو ایک بڑے خطرہ سے بچایا بماہ مئی ۱۸۸۳ء جہاز کینیڈا کے مڈشپ مین مقرر ہوئے ۱۸۸۳-۸۴ء مین شمالی امریکہ اور غرب الہند کے چند مقامات مین رہے - اُنیس سال کی عمر مین سب لفٹننٹ کا امتحان دیکر اول درجہ کا سرٹیفکٹ حاصل کیا - وہان سے واپس جاکر گرینچ کے بحری کالج اور پورٹ اسمتھ مین تعلیم پائی - پانچ مضامین مین سے چار مین اول رہے - اکتوبر ۱۸۸۵ء مین لفٹننٹ کے

دہ پر تعینات ہوئے - جنوری ۱۸۸۶ء مین جہاز "ٹھنڈرر" پر
ر ہوکر بحیرہ روم کو گئے - پھر ۱۸۸۸ء مین جہاز "الگزنڈر" پر
ینات ہوئے اور تین سال تک وہان رہے - گنبوٹ تھرش
پ کے سپرد ہوئی اور آپ جزائر غرب الہند کے سمندرون
ین گشت کرتے رہے - حضور اس جہاز پر پادری صاحب کی
دم موجودگی مین دعا نماز بھی کراتے رہے - تیسری مرتبہ جمیکا گئے
ور وہان ایک نمائش کا افتتاح فرمایا - ۱۸۹۱ء مین جہاز ملمپس
کے کمان افسر مقرر ہوئے اور دو سال بعد کپتان مقرر کئے گئے -
جنوری ۱۸۹۲ء مین پرنس وکٹر کے انتقال کے سبب سے حضور
ولیعہد تاج برطانیہ قرار پائے - جولائی ۱۸۹۳ء مین شہزادی میری
وکٹوریہ مے، دختر بلند اختر شہزادہ الگزنڈر ڈیوک آف ٹک
سے آپ کی شادی ہوئی - جون ۱۸۹۶ء کو جہاز کریسنٹ
زرہ پوش کے کمان افسر درجہ اول مقرر ہوئے - اسکے بعد
حضور بحری معاملات سے دست کش ہوگئے -

جن لوگون کو حضور کے ساتھ یا ماتحت کام کرنے کا
اتفاق ہوا، وہ سب کے سب متفق الراے ہوکر کہتے
ہین کہ حضور فرض کی ادائگی مین پرلے درجہ کے مستعد تھے
اور کسی کام سے پہلوتہی نہ کرتے تھے -

سیاح حکمران - اولاً، تاج داران مین کوئی حکمران سیر و سیاحت
فرمانروائے مقبوضات ماورائے بحر - اور جہاندیدگی مین ہمارے شہنشاہ جہان پناہ
کا پہلو دبانے کی جرأت نہین کرسکتا اور شاہان
برطانیہ مین صرف جہان پناہ ہین جو "فرمانروائے مقبوضات
ماورائے بحر" کہلانے کے مستحق ہین - گویہ فقرہ پہلے پہل
حضور کے والد ماجد مرحوم کے اعلان تخت نشینی مین ایزاد
ہوا تھا - جہان پناہ بچشم خود اور بنفس نفیس تین مرتبہ جزائر غرب الہند

تین چار مرتبہ کنیڈا - دو دفعہ اسٹریلیا اور جنوبی افریقہ - دو بار
ایک مرتبہ ہندوستان اور نوآبادیہائے مشرق بعیدہ کی سیاحت
فرما چکے ہین - کوئی حکمران اس بات کا دعویٰ نہین کرسکتا کہ اسنے
اپنی سلطنت کے تمام حصون کو ملاحظہ کیا ہے - مگر ہمارے
قیصر نے اپنی سلطنت کے انتہائی گوشون کو دیکھنے کے علاوہ
اور کئی ملکون کی بھی سیر فرمائی ہے -

حکما کا مقولہ ہے کہ سیر و سیاحت سے انسان کا تجربہ
اور عقل بہت ترقی پکڑتی ہے - ہمارے شہنشاہ کو یہ امانت
حاصل ہے جسکی بنا پر یہ امید لگانا بے سود نہین کہ حضور کا
عہد فرمانروائی ملکہ معظمہ وکٹوریہ اور ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کے
عہد حکومت سے بڑھ چڑھکر رہیگا -

نوآبادیون کی سیاحت - ملکہ وکٹوریہ اور ملک معظم ایڈورڈ کا جو اس
وقت پرنس آف ویلز تھے - ۱۸۹۹ء مین یہ قصد ہوا کہ حضور
نوآبادیون کی سیر فرمائین - اس سال حضور نے مع شہزادی
میری آئرلینڈ کی سیاحت فرمائی تھی - اسکے قریباً دو سال
پیچھے حضور پرنور آسٹریلیا کو روانہ ہوئے - ماہ مئی ۱۹۰۱ء
مین شہر ملبورن مین داخل ہوکر وہان کی پہلی پارلیمنٹ کا
افتتاح فرمایا - وہان سے نیوزی لینڈ کو تشریف لیگئے - پھر
جنوبی افریقہ کی سیر فرمائی - بعد کو کنیڈا رونق افروز ہوئے
اور وہان سے اپنے وطن مالوفہ کو واپس ہوئے - ۱۹۰۱ء
مین ریئر ایڈمیرل اور ۱۹۰۳ء مین وائیس ایڈمیرل کے
عہدہ پر مقرر ہوئے - نومبر ۱۹۰۱ء مین دیرینہ شاہانہ رسوم
کے ساتھ "پرنس آف ویلس" ملقب ہوئے مگر اپنے بڑے
بھائی شہزادہ وکٹر کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد نومبر ۱۸۹۲ء
مین ڈیوک آف یارک - ارل آف ان ورنس اور بیرن کلارنی

ملقب ہوئے تھے۔

ہندوستان کی سیاحت | نومبر ۱۹۰۵ء مین حضور مع شہزادی صاحبہ ہندوستان کی سیاحت کو تشریف لائے۔ ملک کے مختلف حصے ملاحظہ فرمائے۔ کئی دیسی ریاستون کی راج دھانیون مین گئے۔ جنگلون مین شیر وغیرہ جانورون کا شکار کھیلا۔ والیان ریاست اور اہل ہند نے حضور کے خیر مقدم اور خاطر و مدارات مین اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اہل ہند کو شاہ وقت سے خاص انس ہے اور وہ اسے ذات خدا کا پرتو خیال کرتے ہین جبلی وجہ سے اسکی ذات مقدس سمجھی جاتی ہے۔ اسواسطے لوگون نے جہان موقع ملا اظہار وفاداری اور نیکوخواہی مین کوئی دقیقہ فروگذاشت نہین کیا۔ چونکہ یہ واقعہ صرف پانچ چھہ سال کا ہے اور اسکی یاد قریبا ہر کس و ناکس کے دل مین تازہ ہے، اسواسطے ہم اسکی تفصیلی کیفیت سے احتراز کرتے ہین۔ چند ماہ تک سیر فرمانیکے بعد مئی ۱۹۰۶ء کے شروع مین آپ انگلستان واپس پہونچے ۱۷ مئی کو لندن مین اہل وطن کی طرف سے خیر مقدم کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جسمین بڑے بڑے رؤسا۔ شرفا۔ وزرائے عالی قدر شریک ہوئے تھے۔ حضور کو اپنی سیاحت ہند سے جو خصوصیات نظر آئین، انکا اپنی تقریر مین اظہار فرمایا اور اس امر پر زور دیا کہ حکام کو اہل ہند کے ساتھ ہمدردی کا برتاو کرنا امر لازمی ہے جس سے انتظام ملک مین بہت آسانیان پیدا ہوسکتی ہین اور حاکم و محکوم کے تعلقات مخلصانہ اور خوشگوار ہو جاتے ہین۔ اس تاریخی تقریر کا بڑا نیک اثر ہوا۔

شہنشاہ جہان پناہ کا کیرکٹر | ہمارے قیصر کا کیرکٹر اعلی۔ خیالات بلند۔ اصول ارفع ہین اور حوصلے عالی ہین۔ پچھلے سال اسی مہینہ کے "فورٹ نائٹلی" رسالہ مین مشہور اخبار نویس سڈنی بروکس نے یہ لکھا تھا:—

"جہان پناہ کی نجی طرز زیست بے لوث اور بے عیب ہے طبیعت عمدہ اور پاک اور میانہ روی قابل تعریف ہے۔ سیر و شکار کے شائق پابند فرض۔ نیک نہاد اور دل کے فیاض ہین شخصیت باپ کی طرح زبردست مگر اور کینڈے کی ہے۔ ملکی معاملات کو بغور دیکھنے بھالنے والے۔ ہر مسئلہ اور معاملہ کو بغور خود سوچ کر اپنی رائے قائم کرنیوالے کاروبار مین قاعدہ اور اصول کی پابندی کرنے والے۔ وزرا کے سامنے اپنی رائے کا بڑی صفائی اور فراخ دلی سے اظہار فرماتے ہین"

"نیشنل ریویو" کے اسی مہینے کے پرچہ مین مندرجہ ذیل بیان شائع ہوا:—

"جہان پناہ بین الاقوام معاملات کا بڑی ہوشیاری سے مطالعہ فرماتے ہین۔ والد مرحوم کی خارجی پالیسی کے بڑے مداح ہین۔ نوآبادیون کی سیاحت کے بعد لندن مین ایک تقریر کے دوران مین فرانس کی پیش بینی کو جو نہر سویز کے متعلق ظاہر ہوتی تھی۔ بہت سراہا جس سے فرانس سے دوستی کی بنیاد پڑی اور روسی خطرہ کو بے بنیاد ٹھہرایا اور اسطرح اس سلطنت سے بھی دوستانہ سمجھوتہ ہوگیا"

آپ محکوم کے ساتھ ہمدردی اور انصاف کے برتاؤ کے حامی ہین۔

ملکہ معظمہ میری | ہمارے قیصر کی ملکہ میری اپنی ساس ملکہ الگزنڈرا کی طرح بڑی نیکبخت اور نیک نام عورت ہین۔ حضور ممدوحہ ۲۶ مئی ۱۸۶۷ء کو تولد ہوئی تھین۔ آپ پرنس فرانسس، ڈیوک آف ٹک کی دختر بلند اختر ہین۔ پہلے آپ کی نسبت شہزادہ وکٹر

۔قولسہائی تھی مگر وہ تھوڑے عرصے کے بعد انتقال کرگئے تو میر
ہزادہ جارج سے منسوب ہوئین اور جولائی ۱۸۹۳ء مین شاہانہ
روز کے ساتھ شادی خانہ آبادی کی رسم ادا ہوئی۔ ہمارے قیصر
ہند ملکہ کے چھ لڑکے لڑکیاں ہین سب سے بڑے صاحبزادے
شہزادہ ایڈورڈ البرٹ ۲۳ جون ۱۸۹۴ء کو "وائٹ لاج" رچمنڈ مین
پیدا ہوئے تھے۔ آپ حال ہی مین ولیعہد قرار دئے گئے ہین۔
شہزادہ فریڈرک جارج دسمبر ۱۸۹۵ء مین سینڈرنگھم مین شہزادی وکٹوریہ الگزنڈرا
اپریل ۱۸۹۷ء مین شہزادہ ہنری ولیم فریڈرک البرٹ مارچ ۱۹۰۰ء مین شہزادہ جارج
الگزنڈر ایڈمنڈ دسمبر ۱۹۰۲ء مین شہزادہ جارج چارلس فرانسس جولائی ۱۹۰۵ء
مین تولد ہوئے تھے۔ ملکہ میری نیک بخت بیوی اور پیار کرنیوالی
مان کی طرح اپنے بچون کی تربیت اور تعلیم کی خود نگرانی فرماتی
ہین اور اس قاعدہ کی بڑی سختی سے پابندی کرتی ہین۔ استاد
اور استانیان بڑی احتیاط سے مقرر کئے جاتے ہین گھر کے کاروبار کی بذات خود
نگہداشت فرماتی ہین جب اس سے فراغت پاتی ہین تو رفاہ عام
کے کامون مین مصروف ہوتی ہین۔ مصیبت زدہ عورتون لڑکون اور بچون
کی فلاح مین بڑی دلچسپی ظاہر فرماتی ہین۔ الغرض ملکہ میری سیرت و صورت
دونون کیلئے خاص شہرت رکھتی ہین اور پاکیزگی اور نیکوکاری کیلئے مشہور عام
ہے۔ آر۔ آر

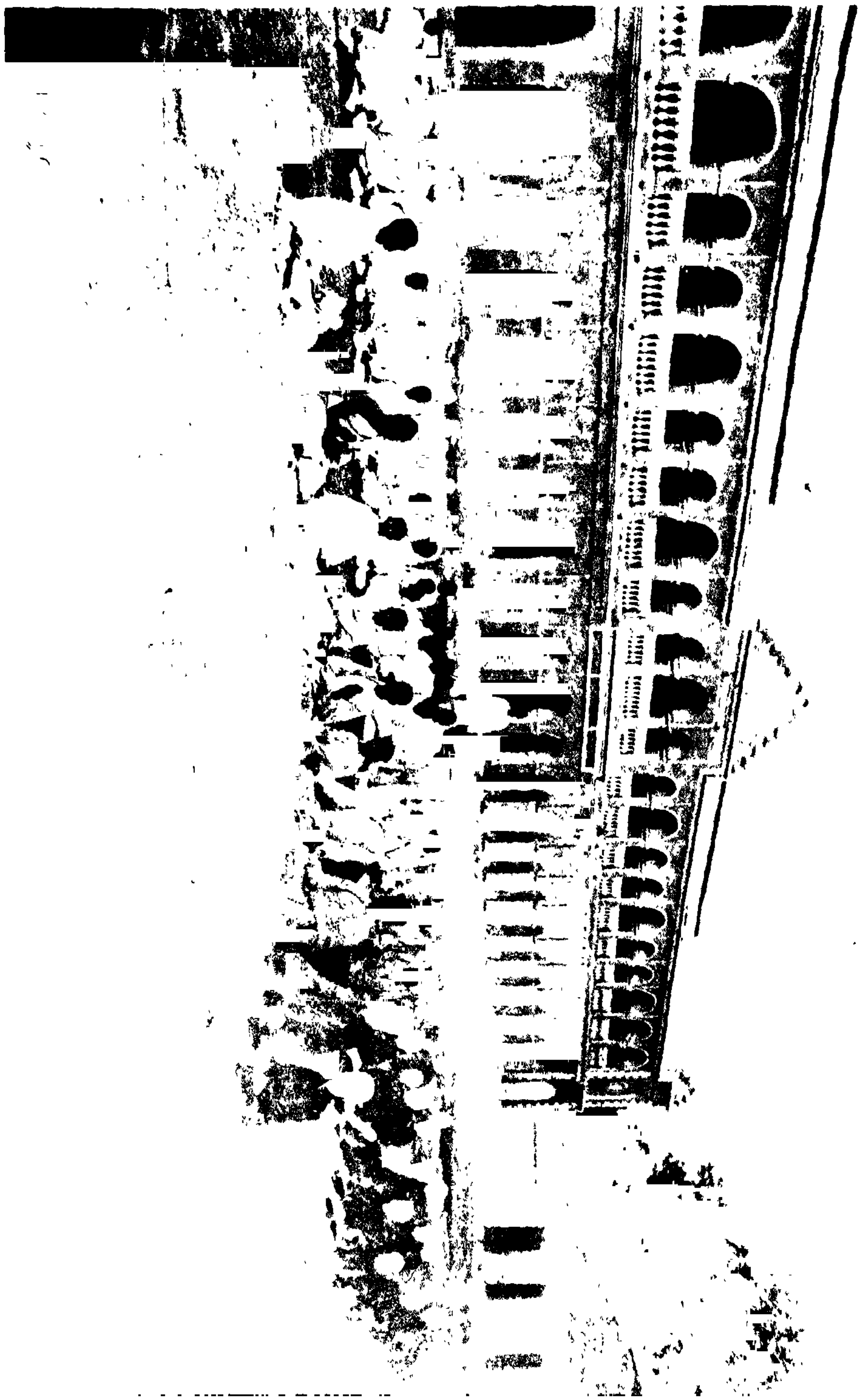
دیانند اینگلو ویدک اسکول دہرہ دون

شمال مین کوہ ہمالیہ کے سلسلون اور مغرب و جنوب
مین کوہ شوالک کی پہاڑیون سے گھری ہوئی ایک پرفضا
اور دلکش مقام پر چھوٹی سی بستی آباد ہے جو دہرہ دون کے
نام سے مشہور ہے۔ جن لوگون نے کوہستانی مقامات ہند
اور بالخصوص اتراکھنڈ کے ان مقامات کی سیر نہین کی انکو
زمانہ قدیم کے رشیون نے اپنی عبادتون اور ریاضتون سے
ایسا متبرک بنادیا ہے کہ اسقدر عرصہ دراز کے بعد بھی ہزارہا
جاتری ہر سال انکی سیر کو جاتے ہین، وہ انکی پاکیزگی اور
انکے قدرتی دلاویز نظارون کی خوبصورتی کو وہم و گمان مین
بھی نہین لاسکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ صانع قدرت نے ان
مقامات کو کچھ ایسے سانچون مین ڈھالا ہے کہ انسان انکو
دیکھکر محو ہوجاتا ہے اور اپنے دل کو جواب تک دنیاوی
خرافات مین پھنسا ہوا تھا۔ اُس ذات باری کی درگاہ مین
تصدق کردیتا ہے جسکے بے چون و چرا کرشمون کو سمجھنے مین
وہ اپنے تئین بالکل معذور و حقیر پاتا ہے۔ فی الواقع یہ ان
مقامات کی خوبی ہی تھی جس نے قدیم رشیون کو اپنا گرویدہ
بنالیا اور انھون نے تارک الدنیا ہوکر ان کوہستانی
کندراؤن اور گپھاؤن کو اپنا مسکن بنایا اور یاد الٰہی مین
مشغول ہوے۔ نہ صرف فقرا اور مجرد اشخاص ہی کی طبیعتون
کو یہ مقامات پسند آئے، بلکہ زمانہ قدیم کے اکثر راجہ بھی اپنے
تزک و احتشام کو خیرباد کہکے اپنی زندگی کے آخری ایام یہان
بسر کرتے رہے اور انھین وجوہ سے شمالی ہند کے اس
حصہ سرزمین کا نام تپوبن پڑگیا۔
انیسوین صدی کے مشہور ہندو ریفارمر سوامی دیانند سرسوتی

یادگارین انکی قائم کردہ آریہ سماج اور بیسوین صدی کی چیتنا جاگتی سوسائٹی سے منجملہ اپنی دیگر متعدد تحریکون کے اس تپوبن کی سرزمین میں بھی بمقام دہرہ دون ایک تعلیمی انسٹیٹیوشن قائم کی جسکا نام عنوان پر درج ہے۔ سوامی دیانند سرسوتی نے ۱۸۸۳ء مین وفات پائی۔ اسوقت ہندو سوسائٹی اور بالخصوص انکی قائم کردہ آریہ سماج ایسی منتشر اور کمزور حالت مین تھی کہ انکے یا دوسرے الفاظ مین انکی تلقین کردہ ویدون کے اصولون کی ترویج دینے کے لیے انکی یادگار مختلف مقامات مین قائم ہونا ایک امر محال تھا۔ پنجاب مین جہان انکی تعلیم و تلقین زیادہ شدومد کے ساتھ جاری رہی اور اجمیر مین جہان انھون نے وفات پائی انکی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یادگاری انسٹیٹیوشن قائم ہوگئے مگر دیگر مقامات مین جون جون انکے خیالات نے قوت پکڑی اور آریہ سماج کو زمانہ حال کی ضرورتون کے مطابق بیداری اور انتظامی معاملات مین قابلیت حاصل ہوئی آریہ سماج کو انکی یادگار قائم کرنے کا خیال پیدا ہوتا گیا۔ یہ شکر کا مقام ہے کہ اب تک جو یادگارین قائم ہوئی ہین انمین کوئی بھی ایسی نہین ہے جو افادۂ عام کے لئے مخصوص نہو۔ یادگار کے معنی بھی یہی ہین کہ زبان حال سے اس شخص کے اوصاف اور خیالات کا اظہار کرے جسکے نام سے وہ منسوب ہے۔ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی تمام عمر افادۂ عام کیلئے وقف کردی تھی۔ آریہ سماج اور اسکے بانی کے لئے وہ دن نہایت بدنصیب ہوگا جب انکی یادگار اس جادۂ راستی سے ہٹ کر کسی بت وغیرہ کی صورت اختیار کریگی۔

دیانند انگلو ویدک اسکول ۱۹۰۴ء مین قائم ہوا ہے اسکے قبل یہ یادگاری انسٹیٹیوشن اولاً ۱۸۹۶ء مین بمقام میرٹھ بہ سرپرستی دیانند ویدک کالج ٹرسٹ سوسائٹی قائم ہوا تھا مگر جب وہان کی آب و ہوا اس نوخیز پودے کیلئے بابرکت ثابت نہ ہوئی تو اسکو دہرہ دون مین منتقل کردیا جہان آتے ہی اسنے ترقی کرنا شروع کی۔ بیگی پورن سنگھ صاحب نے جو دہرہ دون کے ایک فیاض طبع رئیس ہین ایک وسیع قطعہ اراضی اس اسکول کے حوالہ کردیا۔ یہ قطعہ اراضی شہر سے باہر ایک ایسے پرفضا مقام پر واقع ہے جہان کی قدرتی سینری طالبعلمون کے دلون مین امنگ اور قدرتی خوبصورتی کا شوق پیدا کرنے والی ہے۔ نیز بیگی صاحب موصوف نے اسکے لئے عمارت بھی تعمیر کرائی۔

اس انسٹیٹیوشن کا اصل مدعا نوجوانون کو دینی اور اخلاقی تعلیم دینے کا تھا جس سے ایک ایسی تعلیمگاہ سے پورا ہوتا تھا جسمین مثل دیگر اسکولون کے دنیاوی تعلیم دیجاتی ہو اور دینی تعلیم محض ایک جزوی حیثیت رکھتی ہو۔ لہذا اسکے متعلق ایک ایسا آشرم یا ہوسٹل قائم کرنا ضروری ہوا جس مین بورڈرون کو داخل کرکے انکی تمام زندگی کو ایک نمونے کے سانچے مین ڈھالا جائے۔ وہ سب ایک مقررہ وقت پر بیدار ہون۔ انکے غسل، انکے طریق عبادت و خواندگی، انکی خورش، انکا کھیل کود، انکے خیالات اور طور و طریق ایک ڈھنگ کے اور ایک معینہ وقت کے پابند ہون۔ انکی زندگی مین ہر ایک کام کا ایک وقت ہو اور ہر ایک وقت کے لئے ایک جداگانہ کام ہو۔ انکے دل و دماغ اور قوائے جسمانی ایک ہموار اور مناسب پیمانہ پر نشو و نما پائین۔ انکے دل حب الوطنی سے پر ہون انکے دماغ زمانہ حال اور زمانہ مستقبل کی ضرورتون سے بیدار اور انکو قبول کرنے والے ہون جہان وہ اپنے والدین اور



اندان کے لاڈلے ہون، وہان اپنے ہمسایہ اور اپنے
ور سب سے بڑھکر اپنی سرکار کے بھی پیارے ہون۔ انکے
لح جو ہون اور اپنے دھرم کے اصولون پر بیا کا نہ قائم
ہوے دیگر مذاہب کے لئے اُنکے دلون مین جگہہ ہو انکی
اشرت کفایت شعارانہ اور سادگی پسند ہو۔ مگر اعلیٰ خیالات
ت ریسپکٹ انکی چال وچلن کا جزو عظیم ہون۔ غرضکہ ہر پہلو
یک ہونہار نسل تیار کرنے کا یہ آئڈیل بانیان اسکول
ن نظر تھا۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے نیگی صاحب
یک دو منزلہ پختہ عمارت آشرم کے لئے تعمیر کی جسکی تصویر
ن کے ساتھ شائع کیجاتی ہے۔ آپ نے صرف اسی پر
نہین کی بلکہ اس آشرم کو اُسکی دیگر ضروریات غسل خانہ و
ال وغیرہ سے بھی مکمل کر دیا۔ آپ کی اس اولوالعزمی و
ی کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوکل و بیرونجات کے دیگر روسا نے بھی
معاونت کی اور ایک خاتون نے اسکول کے ملحق ۷ بیگھہ
ی عطا کرکے اُسکے میدان اور کمپاؤنڈ کو اور وسیع کر دیا ہے۔
وسٹل مین فی الحال قریباً سو بورڈر ہین۔

نیگی صاحب نے اسکول کی عمارت مین اور بھی بہت
ہ کیا اور اسکے ملحق ایک سنسکرت پاٹھ شالہ کی عمارت تعمیر کی۔
ماسوا آپ نے اپنے چند دیگر بنگلون اور کوٹھیون کی آمدنی
اسکول کو وقف کر دی ہے اور ارادہ ہے کہ اپنی تمام
حنہ جائداد اسکول کے نذر کر دین۔

بدقسمتی سے گذشتہ ماہ اپریل مین خام حصہ بورڈنگ ہوس
اتفاقیہ آگ لگ گئی اور بورڈنگ ہوس اور بورڈرون کا
ن کثیر ہوا۔ شکر ہے کہ جان کا نقصان نہین ہوا نیگی صاحب
نگ ہوس کے قریب ہی رہتے ہین۔ وہ فوراً تشریف لائے
اور سب کی تسلی وتشفی فرمائی اور صبح کو ایک ہیرے کی انگشتری قیمتی
۳ ہزار روپیہ پریسیڈنٹ اسکول کے پاس روانہ فرمائی اور لکھا

"آپ کا غم نہ کیجئے۔ بالفعل ہوسٹل کی جدید پختہ عمارت کا کام اسی سے شروع کر دیا جائے"

چنانچہ دوسرے ہی روز ایک عمارت کا کام شروع کر دیا گیا۔

بیسوین صدی کا آغاز بہت بڑی بیداری اور پُر امید مستقبل سے مملو ہے۔ ہر ایک سینے مین ملکی بہبودی کی اُمنگ پائی جاتی ہے۔ ہر ایک جماعت اور ہر ایک فرقہ اپنے اپنے فرائض، اپنی اپنی ہستی اور اپنے حقوق کے لئے جد وجہد مین کوشان اور سرگردان ہے۔ اعلیٰ تعلیم، اپنی ہستی اور اپنے سلف ریسپکٹ کو قائم رکھنے کے لئے قومی طریقہ پر اخلاقی اور دینی تعلیم کی پیاس ہر ایک ہندوستانی متنفس کے حلق کو خشک کر رہی ہے۔ ایسی حالت مین کیا آریہ سماج کی جیتی جاگتی سوسائٹی سے یہ اُمید کرنا خلاف اُمید ہوگا کہ کم از کم اجمیر اور دہرہ دون کے اسکولون کو کالج کے درجہ تک پہونچا دیا جاے اور تمامی ہند کے دیانند اسکولون اور کالج کی ایک سنٹرل کمیٹی قائم کرکے اُنکو ایک ہی ضابطہ اور قواعد کے سلسلہ مین منسلک کر دیا جاے۔ اگر آریہ سماج کی ضرب المثل یکجہتی اور تعلیمی گرسنگی پر غور کیا جاے تو اس اسکیم کو درجہ تکمیل تک پہونچانا کچھ دشوار امر نہین ہے۔ لیکن تعلیم کی دیوی ہندو پران مالا کے مطابق ایک ایسی دیوی ہے جسکا سنگاسن سب سے بلند پایہ رکھتا ہے۔ اُسکا آئیڈیل انسانی قوت متخیلہ کی بالاترین حد ہے اس نقطہ خیال سے ہمکو بزرگان آریہ سماج سے یہ اپیل کرتے مین (کیا ہمکو زمانہ موجودہ کی یونیورسٹی کی دُھن کی پُرزور تحریک کے وقت) مطلق دریغ نہین ہے کہ اب وقت آگیا ہے جب اُنکو ہمت باندھکر یہ غور کرنا چاہئے کہ کیونکر دیانند اینگلو ویدک یونیورسٹی قائم کیجاے۔

چنڈی پرشاد

غزل

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں — یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں — جو تھے چھالوں میں کانٹے نوک سوزن سے نکالے ہیں
بیابانوں میں لے دل [illegible] — [illegible] ہیں
پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا — جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں
غضب [illegible] — [illegible] ہیں
رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی — نرالا عشق ہے میرا نرالے میرے نالے ہیں
بتاؤں تو [illegible] — [illegible] علوم [illegible] دل [illegible] کے [illegible] ہیں
پلا دو [illegible] — زبان برگ گل پر قطرۂ شبنم کے تالے ہیں
نہ دیکھو [illegible] — [illegible] ہوئے گلشن کے لالے ہیں
نہ پوچھو مجھ سے لذت خانمان برباد ہونے کی — نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں
نہیں بیگانگی اچھی رفیق راہ منزل سے — ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں
دعا دیتا ہوں روتا ہوں گلا کرتا ہوں قسمت کا — ہزاروں ڈھنگ اظہار تمنا کے نکالے ہیں
الٰہی کون مالی ہے اس دل کے گلستان کا — امیدوں کے شجر زخموں کے گل داغوں کے لالے ہیں
امید حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو — یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں
نشان ماہ کنعان لے زلیخا پوچھ لے مجھ سے — کہ میں نے چاہ دل سے سیکڑوں یوسف نکالے ہیں
نہیں کچھ امتیاز یار و اغیار شہر محبت میں — نرالا دیس ہے دستور بھی یہاں کے نرالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھکو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

اقبال

رباعی

کچھ عقل کی میزان میں تولا نہ گیا — جب ہو گئے اسطرح کہ بولا نہ گیا
عقدے سب حل ہوئے مگر آہ انیس — یہ عقدۂ اجل کسی سے کھولا نہ گیا

(انیس)

رباعیات

کچھ درد جگر سناؤں گا گلشن میں — ہر برگ کا دل ہلاؤں گا گلشن میں
کانٹا نہ ہو سو لکھ کر زبان بلبل — میں نغمۂ تر سناؤں گا گلشن میں

افسانۂ غم سناؤں گا محفل میں — احباب کو سن بناؤں گا محفل میں
میں دیکھ چکا ہوں خوب ہنسنا تیرا — اب شمع تجھے رلاؤں گا محفل میں

تجدید کے گل کھلاؤں گا محفل میں — میں سکۂ فن جماؤں گا محفل میں
ہے گریۂ خوان کباب سے سوختہ دل — یاروں کو مزا چکھاؤں گا محفل میں

پھل پھول دکھائیگا مرا باغ قلم — لالہ کو جلائیگا مرا داغ قلم
گلشن میں نہ اسکے پاؤں جمنے دیگا — بلبل کو اڑائے گا مرا زاغ قلم

ہے جوہر فن سے میرے گوہر پانی — ہے نطق سخن سے میرے پتھر پانی
گریہ سے مرے اوس پڑیگی گل پر — پڑ جائیگا بلبل کے پروں پر پانی

ناپاک کبھی نہ مصحف پاک پڑھیں — ہاں اسکو فقط عاشق لولاک پڑھیں
تجدید سے لیں سبق جوانان سخن — بڈھے طوطے ہیں جو وہ کیا خاک پڑھیں

نے لالہ و گل ہے نے غنچہ ہے باقی — اب باغ میں صرف ایک ہوا ہے باقی
جب جاکے عدم میں آنکھ غفلت سے کھلی — دیکھا تو فقط نام خدا ہے باقی

لاہوت کلام آشیان میرا ہے — اک روح قدس ہی ہمزبان میرا ہے

بن زم عدا ؛ ہو جا کر غریب   مغز غم دوست استخوان میں ہے

صحرائے جنون مین شوق کو پیر سمجھ   گزرے جو تو سر سے ، خود کو رہگیر سمجھ
س دشت سے بھاگ اگر تو عمر بلینت ہے   ہر خار کو تیر ، خس کو شمشیر سمجھ

ما عبث ہے کف جنون سے تدبیر مری   کیون گو سے گریبان ہے گلوگیر مری
پلتی نہین شوخیون سے کچھ وحشت کی   نقش قدم دست ہے زنجیر مری

جو سانس ہے بیکسی کی ، کس کی ہے صدا   خوابیدہ کو عبرت ہی عسس کی ہے صدا
بیدار دلون کے پاؤن کب سوتے ہین   ہر تار نفس مین اک جرس کی ہے صدا

وحشت مجھے چارہ گر سے روپوش کرے   بیخود ہون جو مین تو بیخودی کوشش کرے
ہے جوش جنون بپا اسکے سر پر   اب چاک گریبان کو سبکدوش کرے

بیتاب ہون گر گر کے اچھلتا ہون مین   مثل چہ سیماب ابلتا ہون مین
دار فتگیون سے شوکت آئے بہ ہوش   اپنے پہ برنگ موج چلتا ہون مین

احمد حسن شوکت (دہرہ گھاٹ)

تاریخ انتقال

(جناب شمس العلما مولوی سید علی صاحب بلگرامی طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ)

کیا ستم تو نے کیا اے آسمان   رو رہے ہین غم مین جو پیر و جوان
آج یہ کس کی ہے بزم تعزیت   ہو گیا ہے کون نظرون سے نہان
کہتی تھی خلق مجسم کس کو خلق   فخر کس پر کرتا تھا ہندوستان
اٹھ گیا وہ سید عالی صفات   خلق مین تھا جو کہ فخر خاندان
دیکھتے تھے اہل یورپ رشک سے   اسکے جوہر کے وہی تھے قدر دان
اسکی نظرون مین سمائے کیا کوئی   جانتا ہو جو کہ اٹھارہ زبان
خیر خواہ قوم وہ سید علی   خوبیان ہین جسکی عالم پر عیان
ساتھ لے کر آئے تھے سالار جنگ   جب دکن سے وہ گئے ہندوستان
بھیجکر لندن انھین تعلیم دی   فیض سلطان سے رہے یہ شادمان
کیون نہ ہو پھر خلق مین ان کا عروج   جبکہ ہو شاہ دکن سا قدردان
یا الٰہی دے اسے تو عمر خضر   ہے جہان مین خلق کا راحت رسان
میر محبوب علی سا بادشاہ   شکر ہے ہم پر کیا ہے حکمران
معتمد آکر عدالت کے ہوئے   عدل ان کا آج تک ہے بر زبان
مختلف کی ہین دکن مین خدمتین   حال کس کس کا کرون سب سے بیان
تھا خطاب شمس ، ورون کو بھی ، پر   سامنے اسکے تھے سارے ذرہ سان
کرتے تھے پیہم اسی سے کسب نور   شمس اسا تھا یہ سید ضو فشان
تھے ستارے جتنے اہل فضل تھے   آفتاب فضل تھا یہ بے گمان
ایک تھا نظرون مین محتاج و غنی   سب پہ رہتا تھا برابر مہربان
اس سے بیگانہ یگانہ شاد تھا   فیض کا دریا ہمیشہ تھا روان
کیا سخاوت تھی کہ اپنے ہاتھ سے   آب و نان لائے برائے میہمان
بعد اسکے فکر وہ ایسی کرے   فیض سے پائے ہمیشہ آب و نان
گھیرتے تھے جب اسے اہل غرض   کام کر دیتا تھا ہو کر شادمان
حلم ایسا تھا کہ گر کوئی سخت   سن کے چپ رہتا نہ ہوتا کچھ گران
رات دن رہتا تھا پیہم شغل علم   وقت کب ہوتا تھا اسکا رایگان
اہل ہمت ، صاحب جود و کرم   اہل علم و فضل کا تھا قدر دان
جسکا احسان ہوتا کوئی خلق مین   کام یہ اس کا نکالے بیگمان
خود بھی دے اور رون سے بھی دلوائے وہ   لیکے حاجت جائین جب پیر و جوان
اس مین دنیا کے محاسن جمع تھے   یاد اب آتی ہین اسکی خوبیان
بچ پہ رہ بچایا نہ بھولے سے کبھی   کی ہین دشمن سے بھی اسنے نیکیان

کوئی [illegible] تھا [illegible] ۔۔۔ [illegible] بنا تھا خیال دوستان
شان و شوکت [illegible] تھا [illegible] ۔۔۔ [illegible] نام و نشان
ملتے تھے ہر [illegible] ۔۔۔ [illegible] نثار [illegible]
بجھتا تھا جیسے [illegible] بزم مین ۔۔۔ [illegible] ان کی [illegible]
کوئی بتلاسے [illegible] ۔۔۔ [illegible] خورد و کلان
چند دن مرنے سے [illegible] ۔۔۔ [illegible] ہین پیر و جوان
[illegible] اس کو کیا تھا توم سے ۔۔۔ [illegible] لب [illegible]
ایک ہفتہ مین قواعد [illegible] ۔۔۔ [illegible] قانون دان
اسے [illegible] ۔۔۔ [illegible] انسان
جو مدد کار [illegible] کی [illegible] تھا [illegible] ۔۔۔ [illegible] نے جائین [illegible] کہان
چاہتا تھا [illegible] ۔۔۔ [illegible] عز و شان
روز [illegible] ۔۔۔ شام [illegible] جان
[illegible] کھانے [illegible] ۔۔۔ [illegible]
ہوگئی تھی بند بنبش [illegible] کی ۔۔۔ [illegible] کی نبض [illegible]
بیٹھے بیٹھے چل بسے ہوئی [illegible] وقت ۔۔۔ [illegible] کوئی نشان
پائی [illegible] دنیا کے [illegible] ۔۔۔ [illegible] عیش جاودان
خلد مین لیجائے گی [illegible] ۔۔۔ [illegible] انکے مکان
کہدو ماہر ان کی تاریخ وفات ۔۔۔ [illegible] باغ جنان
۱۳۲۹ھ

ماہر کنتوری

دیپ دان

چھپا ہے پردۂ مغرب مین مہر عالمتاب ۔۔۔ [illegible] ہی کو ہے لیلائے شب کے رُخ سے نقاب
سہانا شام کا ہے وقت دلربا نایاب ۔۔۔ ہوئی سحر نہ کبھی جسکی خوبیون کی جواب
کسی کی سانولی صورت کی آن ہے اسمین
کسی کے نازِ دل آرا کی شان ہے اسمین

دکھا رہا ہے سمان دلنواز کیفیت ۔۔۔ نظر فریب شفق کی وہ لالہ گون رنگت
[illegible] بزم مین پھولون کی جانفزا نکہت ۔۔۔ طیور زمزمہ سنج ترانۂ عشرت
عجیب روح فزا دلپذیر ساعت ہے
ہر ایک لمحہ طلسم سکون و راحت ہے

[illegible] نظارۂ [illegible] یہ [illegible] ۔۔۔ نگاہین لوٹ رہی ہین بہار رعنائی
[illegible] ہے بیخود کوئی تماشائی ۔۔۔ شفق کی دیکھئے پانی مین رنگ آرائی
ہوا ہے جلوہ نما چرخ پر ہلال ابھی
نمود اختر تابان ہے خال خال ابھی

[illegible] منا ظر کا یون ہے عکس پذیر ۔۔۔ کہ جیسے ہوتا آئینہ کا عکس تصویر
سرور خیز ہے نظارۂ فسون تاثیر ۔۔۔ بعد ادا تبسم ہے غنچۂ دلگیر
سیار شام بڑھائی تھی نجم تابان نے
فروغ اور دیا جلوۂ چراغان نے

عجیب ہوش ربا جلوہ ہے لب دریا ۔۔۔ کہ چند عورتین عفت مآب حور لقا
کمال [illegible] عقیدت سے آئی ہین گنگا ۔۔۔ دلون مین پریم ہے بھاگیرتی کی عظمت کا
بہا رہی ہین "دیئے" کوئی شعور پڑھکر
ستارے ٹانکے ہین آب روان کی چادر پر

کسی کے حق مین دل افروز ہے وہ طرز عمل ۔۔۔ بصدق دل کوئی بھرنے کو آئی گنگا جل
چڑھائے ہین کسی نازک ادا نے پھول اور پھل ۔۔۔ پرتر کامنا بھاگیرتی کرے گی سپھل
یہ لطف خاص ازل سے ملا ہے بھارت کو
کہان یہ منظر دلکش نصیب جنت کو

شرر سہارنپوری

رباعی

گزرے ہر دم مرا ارادت مین تری ۔۔۔ گردن یہ جھکی رہے عبادت مین تری
یارب اِ مجھے طول عمر دے تو لیکن ۔۔۔ وہ عمر جو کام آئے اطاعت مین تری
(انیس)

دولت و شہرت

دُنیا کی دولت! دنیا کی شہرت   کیا یہ ہین دونون بنیاد عشرت؟
دے سکتی ہین کیا تم کو یہ راحت؟   کیا ان سے پاؤ گے لطف محبت؟
کیا ان سے حاصل ہوگی مسرت؟   شاید جواب اسکا دو گے ہان مین

دنیا مین لیکن شہرت کا سہرا   کتنا ہی پیارا ہو اور اچھا
کیسی ہی خوشبو دے وہ زیادہ   جس سے مشام عالم ہو تازہ
آخر ہے اک دن مرجھانے والا   کیا وہ بچیگا فصل خزان مین

یہ مال اسباب یہ سیم یہ زر   یہ سچے موتی لعل و جواہر
یہ بیش قیمت دھات اور پتھر   عمدہ سے عمدہ بہتر سے بہتر
اچھے تو سمجھے جاتے ہین اکثر   داخل ہے یہ سود لیکن زیان مین

کرلین اگر فرض اک شخص ایسا   رکھتا بہت سا ہے وہ خزانا
شان امارت مین بھی ہے یکتا   دبتے ہین سارے ادنیٰ و اعلیٰ
آخر کسی دن وہ بھی مرے گا   ہوگی جدائی جسم اور جان مین

اک مطربہ کی یا شاعرہ کی   شہرت ہے ساری دنیا مین پھیلی
عزت ہے کرتی ہر قوم اُسکی   آنکھون مین دل مین سب نے جگہ دی
ہوگی فنا پر اُسکی بھی ہستی   تھی ہی نہین وہ گویا جہان مین

قابل مصنف ہے اک ایسا   زورِ قلم کا جسکے ہے چرچا
مانا گیا ہے بے مثل و یکتا   تحریر اُسکی ہے فخر انشا
بکھرے گا پھر بھی شیرازہ اُسکا   وقت پڑے گی نام و نشان مین

دُنیا کی دولت! دنیا کی شہرت   دُنیا کی عزت! دنیا کی حرمت
دُنیا کی ثروت! دُنیا کی حشمت   دُنیا کی رفعت! دُنیا کی شوکت
دُنیا کی عظمت! دُنیا کی وقعت   منظر ہین یہ سب خواب گران مین

ارشد (تھانوی)

"زنجیر لوہے کی"

جنون نے کی عطا مجنون کو یہ توقیر لوہے کی   گلے مین طوق آہن پاؤن مین زنجیر لوہے کی
کسی سے حلقۂ زلف معنبر کے اسیرون کو   نہین آنکھین دکھا سکتی کبھی زنجیر لوہے کی
زمین تنگ آگئی جب اسکے ہاتھون دست وحشت کی   لگی سر پر اُٹھانے آسمان زنجیر لوہے کی
اسیران بلا کو دو قدم چلنے نہین دیتی   بنی ہے ناتوانی پاؤن مین زنجیر لوہے کی
نہین کچھ سقف و در سے کام آزادان وحشت کو   کڑی ہے درمیان خانہ زنجیر لوہے کی
مین وہ ہون ناتوان وحشی کہ پیر ستقید کرنے کو   بنے گا سایۂ زنجیر بھی زنجیر لوہے کی
گرفتاران گیسوے بت خود کام کے حق مین   حصار عافیت ہو جائیگی زنجیر لوہے کی
غضب ہے اسطرح حلقہ بگوشون پر ستم کافر   کہ انکی بیکسی پر چیخ اُٹھی زنجیر لوہے کی
جنون تیرے ہی سر سہرا رہا فصل بہاری مین   کہ چھا نکھن پاے وحشت کا بنی زنجیر لوہے کی
سلیمان کے ترحم نے بنا دی خاکساری سے   قطار مور ہے میرے لئے زنجیر لوہے کی
نہ کیون پیر فلک کو باندھ لاؤن جوش وحشت مین   دھوان آہون کا لہری بنگیا زنجیر لوہے کی
لڑی آنکھین ادھر دل سے اُدھر کھنچے نے آگھیر   نگاہ سُرمگین کیا بنگئی زنجیر لوہے کی
ارادہ تیرے وحشی نے کیا سیر بیابان کا   گری پڑتی ہے ہر زنجیر پر زنجیر لوہے کی
سیہ بختی اسیر دام گیسو کی نہ کچھ پوچھو   رقم تحریر سطرین بنگئین زنجیر لوہے کی
وہ چونک اُٹھین گے اے صدا اپنے خواب نوشین سے   بنا نا بے صدا میرے لئے زنجیر لوہے کی
نہ لیجائے کہین وحشت مین وحشت مجھکو جنگل مین   لگی آپس سے رشتہ توڑنے زنجیر لوہے کی

یہ ادنیٰ معجزہ ہے گیسوے مسود کے سودا کا　　بنے گی ... کھا کے بل زنجیر لوہے کی
رہی زوروں پہ اپنی قوت دیوانگی یوں تو　　جھنجھنا ... ہر دفعہ زنجیر لوہے کی
جنوں نے رشتہ پیمان الفت سے بنا ڈالی　　... پاؤں میں زنجیر لوہے کی
اگر زندان میں دیکھا پاے وحشت نواز ...　　... صورت ... زنجیر لوہے کی
پہاڑوں پر گیا فرہاد بھاگا قیس جنگل کو　　... میرے لیے زنجیر لوہے کی
اگر دریا میں تیرے آشنا ہے جوش وحشت تو　　... زنجیر لوہے کی
گرفتار ہوتے ہی عاشق معشوق کو دیکھا　　کہیں زنجیر سونے کی کہیں زنجیر لوہے کی
پڑھا کے ہیں مگر طوق طلائی اسنے ...　　ہمارے پاؤں پر لکھی ہے ... زنجیر لوہے کی
گراں ہیں جھیلتے ... ان بیڑیاں نالے میں　　... گی ترے بیمار سے زنجیر لوہے کی
بلا آئی تھی میرے ... ساتھ ... زندان میں　　... پاؤں پڑ کر مجھے زنجیر لوہے کی

مثال طوق قمری پاؤں میں لے میر پڑ جاے
اگر کھینچے ... مجلس میں زنجیر لوہے کی

میر سلمہ القدیر

رباعیات

کیا پایا اگر کعبے صنم میں بیٹھے　　کیا ملگیا جاکر جو حرم میں بیٹھے
دل مطمئن اسوقت ہوا اے محشر　　جس وقت کہ آخرت کے غم میں بیٹھے

ہستی کو حباب سے بھی تم کم سمجھو　　دنیا کی خوشی کو اپنا ماتم سمجھو
اللہ سے پائی ہے اگر عقل سلیم　　ہر کام پہ مرنے کو مقدم سمجھو

مجنون ہوئے عشق میں دل کھونے پر　　بے صبر ہئے محو فغاں ہونے پر
افراط ہر اک شے کی بری ہے محشر　　اب اپنے بھی ہنستے ہیں مرے رونے پر

محشر (لکھنوی)

علم

بیکار ہے یاں شیوہ بیانی اپنی　　بے سود ہے لے طبع! روانی اپنی
محروم ہے خاموش۔ قلم ہے ساکت　　خود علم سناتا ہے کہانی اپنی

بزم فنا میں ... ابقا ہوں میں　　آزار روگ کیا ہے کہ خاک شفا ہوں میں
میرے ہی دم سے ہے گل ... کی آب و تاب　　ابر بہار ہوں میں نسیم صبا ہوں میں
رونق نگار خانہ امکان کی مجھ سے ہے　　ہوں وہ طلسم ہوش کہ حیرت فزا ہوں میں
وہ میری کہنگی ہے، فدا جس پہ تازگی　　دور قدیم سے ہوں مگر نت نیا ہوں میں
سب شوخیاں ہیں عالم ایجاد میں مری　　میرے ہیں سب کرشمے جدھر دیکھتا ہوں میں
سب جانتے ہیں تو جبین ازل مجھے　　رنگ ظہور خالق ارض و سما ہوں میں
عارف کے واسطے ہوں میں خورشید معرفت　　برہم زن طلسم شب ماسوا ہوں میں
گمراہ میری راہ پہ ہوتا نہیں کوئی　　پرتو وہ چراغ طریق صفا ہوں میں
مشکل نہیں ہیں راہ حقیقت کے مرحلے　　منزل نہیں ہے دور اگر رہنما ہوں میں
دیتا ہوں بے نشان کا نشان کچھ تو کچھ ضرور　　طالب رہا ہے جس کا ہے اس کا پتا ہوں میں
ہرچند وہ رسائی دانش سے دور ہے　　ہے یہ بھی جانتا کہ نہیں جانتا ہوں میں
میراث انبیا مرا مشہور نام ہے　　سیدھا سا اک وسیلہ قرب خدا ہوں میں
دیتا ہے گو یہ سارے زمانے کو روشنی　　رتبے میں آفتاب سے لیکن سوا ہوں میں
اس آفتاب میں تو ہے ظاہر کی روشنی　　در اصل آفتاب حقیقت نما ہوں میں

ظلمت فزاے دل ... خورشید ہوں ابھی
چشم جہان سے آج نہاں گو رہا ہوں میں

میرا وطن نہ پوچھئے مجھ سے کہ صبح و شام　　غربت میں مثل بادیہ گرد صبا ہوں میں
اس سرزمین میں کرتا ہوں چند سے قیام بھی　　جوہر کی اپنے قدر جہاں دیکھتا ہوں میں
نفرت غرور و کبر سے ہے، کاہلی سے ہے　　انکا جہاں عمل ہو، وہاں سے اٹھا ہوں میں
اس مملکت میں میں نے گزاری ہیں مدتیں　　سچ پوچھئے تو ہند میں پروان چڑھا ہوں میں
جنت نشان بھی ہے پرانا وطن مرا　　پیدا ہوا اسی میں اسی میں بڑھا ہوں میں

پالا اسی نے دامن شفقت مین ہے مجھے ۔ سائے مین اسکی مہر کے صدیون رہا ہون مین
یونان و مصر مین بھی پھرا مدتون مگر ۔ جب مٹ مین گیا ہرن یہین سے گیا ہون مین
گنگا کے یہ کنارے ۔ ہماآلا کی چوٹیان ۔ تھے میری سیر گاہ، انہین جانتا ہون مین
یہ ہیپ مین ہے جنگل ہین مرے قدردان مگر ۔ وان حیرت حرف مادّہ بے لقا ہون مین
بھارت دیش مین جب تھے مرے دن عروج کے ۔ اسوقت کیا تھا۔ آہ ! مگر آج کیا ہون مین

جس رنگ مین ہون، خیر وہی رنگ خوب ہے
ظاہر ہون جس ادا مین بہت دلربا ہون مین

کچھ ذوق دید ہے تو جوانان زندہ دل! ۔ دیکھو مجھے کہ شاہد رنگین ادا ہون مین
رکھتا ہون اپنے طالب صادق کو شادکام ۔ مائل کوئی مرا ہے تو اُسپر فدا ہون مین
ایسے مزے نصیب کہان ہین حواس کو ۔ مجھ مین وہ رس کہ لذت کامزا ہون مین
رہتا ہون مثل مردمک چشم آنکھ مین ۔ مٹتا نہین ہون دل سے وہ نقش وفا ہون مین
ہر ملک و ہر دیار مین عالم کی قدر ہے ۔ سارا زمانہ دوست ہے گو آشنا ہون مین
بوڑھون مین رکھتا ہون مین جوانون کی آن بان ۔ وہ ہاتھ نا توان نہین جسمین عصا ہون مین
مفلس نہین رہا مرا طالب کہین کوئی ۔ مین کوہ زر ہون، کان نگر کیمیا ہون مین
اقبال جسکو کہتے ہین پردہ ہے مرا ۔ کیا سایہ ہما ہے ہما کا ہما ہون مین
یورپ کو دیکھئے کہ ہے دولت سے مالامال ۔ وہ مجھ مین غوطہ زن ہے کہ بحر عطا ہون مین
محتاج ہر ہنر ہے مرا اور ہر ایک فن ۔ مین ابتدا کمال کی ہون انتہا ہون مین
خاک، آب و باد و آتش سرکش ہین باجلال ۔ سب میرے زیر حکم ہین۔ فرمانروا ہون مین
رستے بنائے مین نے پہاڑون کو چیر کر ۔ ہمدم ذرا جو انجینیر کا ہوا ہون مین
مثل زمین بنے ہین سمندر پہ شاہراہ ۔ بیڑے کو خوف کیا ہے اگر ناخدا ہون مین
ہونی سا یہ کرشمہ تعجب ہے اس مین کیا ۔ لے کر اگر بشر کو ہوا مین اُڑا ہون مین

لونڈی ہے میری برق بخارات ہین غلام
دونون سے تار ریل کو چلوا رہا ہون مین

ظاہر نظر فریب ہے باطن ہے دلپذیر ۔ ہر رنگ اور روپ مین جلوہ نما ہون مین
موجود ہر خیال مین ہون ، ہر الاپ مین ۔ ہون شاعری کہین تو کہین فلسفہ ہون مین
مین ہون کہین نقوش ریاضی مین جلوہ گر ۔ شکل کے سلسلون مین کہین بولتا ہون مین
پیدا کرون مین شکسپیر اور بالیک ۔ ہے لطف گر معاون طبع رسا ہون مین

اظہار امر واقعی محروم کردیا
ورنہ نہ خود فروش نہ کچھ خود نما ہون مین

محروم

غزل

وہ دل نہین۔ وہ جگر نہین ہے ۔ سامان ہے وہی وہ سر نہین ہے
افسردگیون کا ڈھیر ہون مین ۔ اس راکھ مین اب شرر نہین ہے
اب دل مین وہ کاوشین نہین ہین ۔ اب آہ مین وہ اثر نہین ہے
مجھ مین جو نہین وہ بے قراری ۔ تیری بھی تو وہ نظر نہین ہے
جو کچھ تھا خیال دوست سے تھا ۔ ہنگامۂ شور و شر نہین ہے
نالہ تو کرون ہزار ہمدم ۔ کیا کیجے کہ وہ جگر نہین ہے
غمزے تو ہنوز دلربا ہین ۔ دل در خور غمزہ گر نہین ہے
اُجڑے ہوئے دل کا تو ہے مہمان ۔ لائق ترے گو یہ گھر نہین ہے
ہان تیرے خریدنے کو کافی ۔ سرمایۂ جبر و زر نہین ہے
آغاز کسی طرح ہوا بھی ۔ انجام کی کچھ خبر نہین ہے
تجھ سے کوئی پیشتر نہین تھا ۔ تجھ سے کوئی بیشتر نہین ہے
تو سب کو چلا رہا ہے اور خود ۔ تیرا کوئی ہمسفر نہین ہے

الفت مین پھنسے اگر ولی تم
پھر جاؤ کہین مفر نہین ہے

ولی الحق

رباعی

راحت مین بسر ہوئی کہ ایذا گذری ۔ کیونکر تاریک گھر مین تنہا گذری
اے کنج لحد کے سونے والو افسوس! ۔ کس سے پوچھین کہ تم پہ کیا گذری

(ناظم)

قومی نظم

راتوں دن رونا ہمین دن رات غم کھانا ہمیں — تو ہی بولو دیکھی کہین لے چشم طوفان زا ہمین
چشم تر سرسبز کیون ہوتا نہیں نخل راہ — دیکھا ہے تجھ سے باقی خون برسانا ہمین
یاد آتا ہے زمانہ اپنا جب گذرا ہوا — کیا کہین کس درجہ ہوتا ہے غم کیا کیا ہمین
ہم خلف انکے ہین تھا جنکا زمانے مین عروج — مانتے تھے ہر طرح سے قیصر و کسریٰ ہمین
کون ہے خوبی سے دنیا کی کہ ہم مین تھی نہ تھی — جانتی تھی ہنر مین رہنما اپنا ہمین
منہ سے جو کہتے تھے وہ کرتے تھے ہم پہلے سے — سر رہے یا جائے کچھ پروا نہ تھی اصلا ہمین
محنتین کرتے تھے مزدوری مین تھا ہمکو نہ عار — ان ہی وصفوں سے ملا تھا رتبہ اعلیٰ ہمین
اس صدف کے ہم ہین گوہر جسنے دیکھا اک نظر — بالیقین وہ جانتا تھا گوہر یکتا ہمین
غیر قومون کے ہمیں سے تھے رہنما و پیشوا — ہین جو منصف جانتے ہین بوعلی سینا ہمین
ہم وہ ہین قیصر مین جنکے تھے زمانے کے علوم — مانتے تھے اہل دانش زیرک و دانا ہمین
آج وہ دن ہے کہ ہم ہین تنزل کر رہین — کر دیا بے غیرتی نے خوار اور رسوا ہمین
عیب تھے جتنے وہ حصے مین ہمارے آگئے — یاد ہین بغض و نفاق و مکر اور کینا ہمین
شوکت اسلام کو آخر گنوایا ہے ہائے — مل چکا ہے اپنے کرتوتوں کا پھل اچھا ہمین
وائے نادانی کہ ہم ہین خواب غفلت مین ابھی — جانتے ہین کر چکے جو کچھ کہ کرنا تھا ہمین
منزل مقصود پہ گویا کہ جا پہونچے ہین ہم — بے خبر ہین اب نہین مطلق کہین جانا ہمین
ہے ترقی کا زمانہ بڑھتے جاتے ہین سبھی — غور سے دیکھا یہ دنیا ہے نئی دنیا ہمین
ایشیا مین اک فقط جاپانیون کو دیکھکر — ہو جو غیرت تو مناسب ہے سبق لینا ہمین
عقل کا یہ مقتضا ہے عقل سے کچھ کام لین — شرم کے قابل ہے دیکھو اسطرح جینا ہمین
سب سے پہلے ہمکو خود غرضی سے نفرت چاہیئے — قوم ہی کے فائدہ مین چاہیئے جینا ہمین
سب چلین اک راہ پر اور ایک ہو سب کی غرض — مضطرب کرنے نہ پائے خواہش بیجا ہمین
ہر ترقی کو تنزل ہے تنزل کو عروج — مرحلہ دشوار ہے درپیش اب کیسا ہمین
قافلہ سب منزل مقصود پر پہونچا۔ مگر — راستہ طے کرنا ہے اک سخت جان فرسا ہمین
سہل ہو جاتی ہین محنت سے سبھی دشواریاں — ہان بھروسہ چاہیئے اللہ پر رکھنا ہمین
ختم کر جان اے رابعہ تو کیا تری تحریر کیا — کر دعا توفیق دے وہ خالق یکتا ہمین
اس نبی کا واسطہ دیتے ہین ہم اللہ کو — جسکے صدقے مین کیا اللہ نے پیدا ہمین
ہمکو دے توفیق راہ نیک کی اے ذوالجلال — تیری رحمت کی ضرورت ہے فقط مولا ہمین
عزت و دولت کا مالک ہے تو ہی اے بے نیاز — کیون سمجھتے ہین ذلیل اب گبر و ترسا ہمین
تو اگر چاہے تو بیڑا پار ہو اک آن مین — ہے اگر تو ہے تیری رحمت ہی کی پروا ہمین

رابعہ سلطان بیگم

غزل

(از نواب محمد عمر خان صاحب بہادر المتخلص بہ **وفا** دام اقبالہ)

جب یہان آتی ہین حورین باغ رضوان چھوڑ کر — پھر کہان جاتا ہے زاہد کوئے جانان چھوڑ کر
کیون نہ بلبل خوش ہو آنکھین دیکھکر اس شوخ کی — باغبان جنگل مین رہتا ہے گلستان چھوڑ کر
سوزش داغ جگر سے اک قیامت ہو گئی — مردے بھاگے جاتے ہین شہر خموشان چھوڑ کر
شوخ روئی کو رشک کیا جب جگر خون ہو گیا — لعل نے غربت مین کیا پایا بدخشان چھوڑ کر
کون کہتا ہے کہ یوسف کو زلیخا سے تھا عشق — وہ تو تمکو ڈھونڈتے پھرتے تھے کنعان چھوڑ کر
دیکھکر عارض کو تیرے پانی پانی ہو گئے — مثل شبنم گل اڑے جاتے ہین بستان چھوڑ کر
جو یہان سرسبز ہین حاصل ہے انکو وصل دوست — پھول جاتے ہین کہین گلشن کا دامان چھوڑ کر
ایک بھی باقی نہین ہے جبکہ پیراہن کا تار — جائینگے وحشی کہان صحرا کا دامان چھوڑ کر
زندگانی پر تو کیون بھولا ہوا ہے مردہ دل — یاد رکھ جائیگی اک دن جسم کو جان چھوڑ کر
جذبۂ دل دیکھکر ہنسنے لگے زخم جگر — صبحدم جب چل دیا وہ مجھکو گریان چھوڑ کر

آسمان خود حلقۂ زنجیر آفت ہے **وفا**
حضرت یوسف نے کیا پایا تھا زندان چھوڑ کر

ایڈیٹوریل

یہ دریافت کرنا بہت کچھ طمانیت بخش اور مسرت انگیز ہے کہ "ہندو یونیورسٹی" کے لیے چندہ فراہم کرنے کا کام عملی طور پر شروع ہوگیا ہے۔ اس مقصد کے لئے پہلا جلسہ ۱۲ مئی کو کچہری مین منعقد ہوا تھا، جس مین بڑے بڑے ہندو معززین شامل تھے۔ آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب رما اور پنڈت گوکرن ناتھ صاحب مشر لکھنؤ سے، اور پنڈت اقبال نارائن صاحب بنارس سے تشریف لائے تھے۔ راجہ راجندر بہادر سنگھ صاحب تعلقدار میر مجلس تھے۔ جلسہ کی کارروائی پنڈت اقبال نارائن صاحب کی تقریر سے شروع ہوئی، جسمین اُنھون نے "ہندو یونیورسٹی" کی اسکیم کو واضح کیا تھا۔ آپ نے فرمایا

> موجودہ یونیورسٹیان بیشک اچھا تعلیمی کام کر رہی ہین، لیکن "ہندو یونیورسٹی" کچھ اور ہی چیز ہوگی، اور اسکا تعلیمی کام ہندو نقطۂ خیال سے بدرجہا بہتر اور اعلیٰ ہوگا۔

بابو گنگا پرشاد صاحب ورما نے ایک ریزولیوشن پیش کیا، جسمین یہ چاہا گیا تھا کہ آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی، اور مسز اینی بیسنٹ کی یونیورسٹیون کی تجاویز کو ملا دیا جائے اور صرف ایک ہی یونیورسٹی قائم ہو + بابو سیتارام صاحب بی۔ اے۔ نے اس ریزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے دونون یونیورسٹیون کی تجاویز میں اصولی اختلاف ظاہر کیا، اور فرمایا کہ

> یہ اختلاف بھی دور ہو سکتا ہے، بلکہ اسکو دور کرنے کی سخت ضرورت ہے، تاکہ ہندوؤن کی طاقت اور دولت دو یونیورسٹیان قائم کرنے مین نہین، بلکہ ایک ہی یونیورسٹی قائم کرنے اور اسکو تقویت پہنچانے مین صرف کیجائے!

اجمیر مین چندہ کی اپیل ہوئی اور اسی جگہ ۵۲ ہزار روپیہ کے وعدے ہوئے۔ گویا ایک گھنٹہ سے کم عرصہ مین نصف لاکھ روپیہ سے زائد جمع ہوگیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ابتدا اچھی نہین ہے۔ امید ہے کہ ہندو قوم اس عظیم الشان تحریک کے متعلق اپنی اہم ذمہ داریون کو محسوس کریگی اور ثابت کر دکھائیگی کہ وہ ایک زندہ قوم ہے، اور اپنی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنیکا دل اور حوصلہ رکھتی ہے۔

صوبہ سرحدی کی تازہ ترین سالانہ رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ صوبۂ مذکور کے اہل اسلام پشاور مین ایک اسلامیہ کالج قائم کرنے کی تجویز کر رہے ہین۔ اسکی تکمیل کے لیے ایک نہایت متقدر کمیٹی قائم کی گئی ہے جسکے تمام ممبر سرآمد[illegible] مسلمان ہین۔ اس کمیٹی کا ارادہ اعلیٰ تعلیم کے لئے پشاور مین علیگڈھ کالج کے نمونہ پر نہ صرف ایک اسلامیہ کالج اور بورڈنگ ہوس تعمیر کرنے کا ہے، بلکہ صوبہ سرحدی کے تمام اضلاع مین اسکولون کی تعداد مین اضافہ کرنے، اور موجودہ اسکولون کو ترقی دینے کا ہو رہا ہے۔

ہمکو اس تجویز سے دلی ہمدردی ہے، کیونکہ اسکی تکمیل سے صوبہ سرحد[illegible] مین اعلیٰ تعلیم بیحد ترقی کر جائیگی۔ کالج کے قیام کے لئے پانچ لاکھ روپے کی [illegible] ضرورت بیان کی گئی ہے، جسکی فراہمی کا کام شروع ہوگیا ہے، اور بڑی خوشی [illegible] کی بات ہے کہ یہ تحریک اُمید سے بڑھکر کامیاب ہو رہی ہے۔ چنانچہ چندہ کی [illegible] مقدار دو لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ یہی نہین کہ کھاتے پیتے اور خوشحال لوگون [illegible] چندہ دیا ہو، بلکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگون نے اپنی حیثیت کے موافق [illegible] چندہ دینے سے دریغ نہین کیا۔ گورنمنٹ کی ملازمت مین جسقدر اہل اسلا[illegible] ہین، اُنھون نے ایک ایک ماہ کی سالم تنخواہ دیدی یا دینے کا وعدہ کیا [illegible] اور بعض تحصیلون مین مسلمان زمیندارون نے مالگذاری کے ساتھ ایک آ[illegible] فی روپیہ چندہ دینے کی تجویز منظور کرلی ہے ع یہی کہنے کی باتین ہین جو کرنیکی [illegible] یقین ہے کہ اس مبارک تحریک مین لوگ دل و جان سے چندہ دینگے [illegible] اگر عام چندہ سے رقم مطلوبہ فراہم ہوگئی، تو اُمید ہے کہ ہماری شفیق گورنمنٹ [illegible]

امداد فرمانے مین دریغ نہ کریگی کیونکہ عام تعلیم کا بہت بڑا بار [illegible]
گورنمنٹ سے آگاہے گا ۔ [illegible] گورنمنٹ
کا بہت سا روپیہ صرف ہو جاتا ہے ۔

ابتدائی تعلیم کا چرچا ملک مین روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے اور یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہر طرف اسکا خیر مقدم جوش سے ہو رہا ہے ۔ مگر تعجب کا مقام ہے کہ بعض بنگالی احباب اس مفید تحریک کے خلاف ہین ۔ وہ ڈرتے ہین کہ اگر یہ مسودہ پاس ہو گیا تو اخراجات تعلیم کے لئے مزید ٹیکس دینا پڑیگا ۔ حال مین ایک عام جلسہ مسٹر گوکھلے کے مسودۂ قانون کی حمایت مین بمقام کلکتہ منعقد ہوا تھا جسمین بنگال کے بہت سے سربرآوردہ اصحاب شریک تھے ۔ بعض اہل اسلام بھی اس جلسہ مین شامل تھے جنمین "کامریڈ" کے قابل ایڈیٹر مسٹر محمد علی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے ۔ آپ نے اپنی تقریر کے دوران مین فرمایا تھا کہ :-

جب اس مفلسی کی حالت مین اہل اسلام تعلیم کے لئے مزید ٹیکس دینے کو بخوشی تیار ہین تو ہندو بھائی جو اُن سے کہین زیادہ متمول ہین کیون اس تھوڑے سے بار سے ڈرتے ہین ۔

"بنگالی" مین اس جلسہ کو بھی غیر مناسب بتایا گیا ہے ، کیونکہ جب "بنگال مین اس مسئلہ کے متعلق اختلاف رائے ہے تو ایسا جلسہ نہونا چاہئے تھا ، کیونکہ اس سے اختلاف بڑھنے کا اندیشہ ہے اور جب ایک امر مین اختلاف ہوگا ، تو اور باتون مین بھی ناراضگی پیدا ہوگی" ۔ یہ منطق بالکل نرالی ہے ۔ اسکے یہ معنی ہونگے کہ ہمین کسی ایسی تحریک مین شامل ہونا نہین چاہئے جسکا کوئی فریق مخالف ہو ، خواہ وہ تحریک بذات خود کیسی ہی مفید کیون نہو ، افسوس !

لیکن امید کیجاتی ہے کہ یہ اختلاف جلد مٹ جائیگا ، چنانچہ لیگ بنگالہ متعلقہ ابتدائی تعلیم نے ایک سرکلر شائع کیا ہے جسمین بنگالی اہل الرائے صاحبان سے بالخصوص اور عوام سے بالعموم یہ درخواست کی گئی ہے کہ وہ مسٹر گوکھلے کے مسودۂ قانون کے مختلف پہلوؤن پر غور کرکے اپنی اپنی رائے ظاہر کرین ۔ لیگ کی رائے مین اشاعت تعلیم کے لئے اس کا لازمی ہونا نہایت ضروری ہے ، کیونکہ جب تک لوگ اس پر مجبور نہ کئے جائینگے ، اسوقت تک خاطر خواہ توسیع ہونی غیر ممکن ہے ۔ مزید ٹیکس کے بارے مین بھی مذکورہ سرکلر مین نہایت مناسب رائے ظاہر کی گئی ہے ۔ یعنی یہ کہ گورنمنٹ پر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ وہ خزانۂ عامرہ سے ابتدائی تعلیم کا خرچ ادا کرے اور رعایا پر اسکا بار نہ ڈالے ۔ لیکن اسکے ساتھ ہی اہل ملک سے بھی استدعا کی گئی ہے کہ اگر کسیقدر ایثار نفس کی ضرورت پڑے اور مزید ٹیکس لگایا جانا ضروری ثابت ہو تو ہمکو اسکے برداشت کرنے سے جھجکنا نہ چاہئے ۔

بعض اخبارات نے مسز اینی بیسنٹ کی مجوزہ "انڈین یونیورسٹی" اور آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی کی مجوزہ "ہندو یونیورسٹی" کے الحاق کی خبر مشتہر کی ہے ۔ ممکن ہے کہ اسکی محرک مسز اینی بیسنٹ کی وہ تحریر ہو جسکو انھون نے سنٹرل ہندو کالج میگزین مین شائع کیا تھا لیکن یہ خبر بالکل بے بنیاد ہے ۔ ابھی تک اسکے متعلق کوئی مستقل سمجھوتہ نہین ہوا ۔ چنانچہ خود آنریبل پنڈت صاحب اخبار لیڈر کے ذریعہ سے اس خبر کو قبل از وقت بتاتے اور اسکی تردید کرتے ہین ۔ آپ لکھتے ہین :-

الحاق کا سوال ہنوز زیر غور ہے ۔ جن لوگون کو اس تحریک سے دلچسپی ہے ، انھین یقین رکھنا چاہئے کہ ہندو جماعت کے لیڈرون اور مالی مددگارون کی آرا پر خوب غور کیا جائیگا ۔ لیکن سب سے ضروری سوال روپیہ کی فراہمی کا ہے ۔ جو لوگ جلد یونیورسٹی کو قائم دیکھنا چاہتے ہین اُن سے میری درخواست ہے کہ وہ اپنی توجہ اور اپنی طاقت کو اس کام مین صرف کرین ۔ جبتک ۲۵ لاکھ روپیہ فراہم نہ ہوجائے اسوقت تک چارٹر حاصل کرنے کی کوشش

نہیں کیجا سکتی۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جسقدر جلد ممکن ہو تو یہ رقم فراہم ہو جائے "۔

عجائب خانہ برطانیہ کے مشرقی صیغہ کے منتظمین کو حال ہی میں دیوان نظامی کا ایک نادر نسخہ ہاتھ لگا ہے۔ اس نسخے میں ۳۰۰ ورق اور آٹھ تصویریں ہیں۔ ان تصویروں میں سے ۷، عہد اکبری وضع کی اور ایک قدیم ایرانی طرز کی ہے۔ ان تصاویر سے اکثر اُن واقعات پر روشنی پڑتی ہے، جنکو شاعر نے کمال فصاحت کے ساتھ اپنے اشعار میں نظم کیا ہے، اور دلاویزی، سبکدستی اور خوشنمائی کی جتنی خوبیاں اعلیٰ درجہ کی تصاویر میں ہو سکتی ہیں، وہ سب ان میں موجود ہیں۔ اس دیوان کی کتابت کا زمانہ تحریر ۱۶۱۰ء ہے۔

کیلیفورنیہ (امریکہ) میں کوہ ولسن کی چوٹی پر ایک عظیم رصدگاہ واقع ہے، وہان سے ایک نئی دُنیا کی پیدائش کی خبر ملی ہے۔ علماے سائنس کا خیال ہے کہ یہ نئی دنیا اُس دُنیا سے جسکی وہ شاخ ہے .... ۱۵ میل پر واقع ہے اور آخر الذکر کا قطر .... ۵ میل ہے۔ ان اعداد کا خیال کرکے دماغِ انسانی چکر میں آتا ہے۔ آسمانون کے اُن رازون میں جو منجمون کو حیران کرنے والے ہیں، وہ ناگدم ستارون کے گچھے بھی ہیں، جو ہر جگہہ ایک حیرت انگیز تعداد میں موجود ہیں۔ انکی جسامت بہت بڑی ہوتی ہے اور جس طاقت کو وہ ظہور میں لاتے ہیں، وہ ڈر سکنے والی ہے۔ انکی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ زمانہ مستقبل کے نظام شمسی کی ابتدائی شاخیں ہیں، یا یون کہنا چاہیئے کہ اس عالم کے مادہ پر ولو یلازم کا اُڑتا ہوا حصہ، جسمین سے نئے سورج اور نئے عالم اسطرح پیدا ہو رہے ہیں، جیسے ایک گھومتے ہوئے چکر سے آگ کے شرارے اُڑا کرتے ہیں۔

امید ہے کہ ہم جلد ان اجرام فلکی کی نسبت زیادہ واقفیت حاصل کر سکین گے، کیونکہ ایک نئی دُوربین تیار ہو رہی ہے جس سے منجمون کو وہ امداد حاصل ہو سکیگی جسکی اُنھیں ضرورت ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس دُوربین سے ہمارے معلومات میں اس قسم کا اضافہ ہو کہ اس سے علم نجوم میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو جائے۔ آجتک جو بڑی بڑی دُوربینیں تیار ہوئی ہیں وہ اس عظیم الشان دُوربین کے مقابلہ میں ہیچ ہونگی، اس دُوربین کے شیشے کا قطر ۱۰۰ انچ ہے، یعنی موجودہ دُوربینون کی نسبت اسمین چوگنا انعکاسی قوت زیادہ ہوگی۔ مسٹر کارنیگی (جنکے خرچ سے یہ دُوربین تیار ہو رہی ہے) کا خیال ہے کہ اس دوربین کی مدد سے لاکھوں ایسے نئے عالم ہمارے دیکھنے میں آئینگے، جنھیں کسی آنکھ نے آجتک نہیں دیکھا۔

دہلی میں جو دربار شاہی ہونے والا ہے، اسمین دیسی اخبارات کو بھی مدعو کیا جائیگا۔ صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ نے ہندو اخبارات اور اسلامی اخبارات کو اطلاع دی ہے کہ انکی طرف سے ایک ایک قائمقام شریک دربار کیا جائے گا جسکا فیصلہ وہ کثرت راے سے کر سکتے ہیں۔ یہ تقسیم قسمت وار کی گئی ہے، مثلاً الہ آباد، بنارس، لکھنؤ، اور فیض آباد چار ڈویژنون سے ایک ہندو ایڈیٹر اور ایک مسلمان ایڈیٹر دربار میں شریک ہو سکیگا۔ لارڈ کرزن بالقابہ نے بھی گذشتہ دربار میں تمام صوبوان کے چیدہ ایڈیٹرون کو مدعو کیا تھا، اس لیے ہماری گورنمنٹ کا اخبار نویسون کو دربار میں مدعو کرنا نہایت مستحسن فعل ہے۔ مگر اندیشہ ہے کہ ہماری فیاض گورنمنٹ نے اصول مساوات کو مدنظر رکھکر طریقۂ انتخاب کا جو خوشنما پہلو نکالا ہے، اُسمین خاطر خواہ کامیابی نہو، کیونکہ ہر شخص اس اعزاز کے پانے کا بطور خود مشتاق ہے۔ ہمارے صوبہ کے اخبارات ہی نہین بلکہ پنجاب کے بھی بعض اخبارات اس طریقۂ انتخاب کے خلاف ہیں اور سب کی یہی راے ہے کہ اس طریقہ پر قائمقامی کا حق پورے طور پر ادا نہو سکیگا۔

ہمکو خبر [illegible] بہت [illegible] یادگار [illegible] تسلیم [illegible] سید [illegible] صاحب تسلیم لکھنوی نے [illegible] لکھنؤ مین [illegible] مولانا [illegible] ادیب [illegible] عمر کی [illegible] ہوگئی تھی لکھنؤ [illegible] ہندوستان [illegible] اور [illegible] ہم [illegible] تھے وہ [illegible] تھے [illegible] ہے۔

(گذشتہ نمبر مین ہم مرحوم تسلیم کے حالات اور تصویر ادیب مین شائع کر چکے ہیں)

تبصرۂ تصاویر

اس نمبر کی [illegible] تصویر [illegible] بنگالی مصور [illegible] کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ [illegible] الف لیلہ [illegible] مین دکھایا گیا ہے کہ [illegible] شہزادی [illegible] شہریار کی خدمت مین حاضر ہوتی ہے [illegible] سلسلہ [illegible] شروع ہوتا ہے۔ نمائش الہ آباد مین یہ تصویر خاص وقعت سے دیکھی گئی تھی اور ایک یورپین قدردان فن نے اپنی [illegible] اسکو خرید لیا تھا۔

اس ماہ مین لندن مین جشن تاجپوشی ہونے والا ہے۔ اس مبارک تقریب کی خوشی مین اعلیٰ حضرت جارج پنجم دام ملکہٗ و علیا حضرت ملکہ میری دام اقبالہا کی خاص تصویرون کے ساتھ خاندان شاہی کا بھی ایک گروپ شائع کیا جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ تصویرین نگاہ پسندیدگی سے دیکھی جائینگی جو اس نمبر کے لئے خاص کوشش سے مہیا کی گئی ہین۔

مسٹر جے۔ آر۔ رائے کی تصویر اُس شکر گذاری کے ساتھ شائع کیجاتی ہے جو آپ کی قلمی اعانت سے ادیب پر فرض ہے اور جسمین آپ نے ابتدا ہی سے غیر معمولی دلچسپی ظاہر فرمائی ہے۔ آپ ایک قابل اور مشتاق اخبار نویس ہین۔ اور آجکل اندور کے مدرسہ علم الٰہی مین الٰہیات کے پروفیسر ہین ہندوستانی مسیحیون [illegible] بہت کم ہے اور اس لحاظ سے مسٹر رائے کا وجود مغتنمات سے ہے۔

شمس العلما ڈاکٹر سید علی بلگرامی کے انتقال کی خبر ہم گذشتہ پرچے مین لکھ چکے ہین۔ [illegible] حسب وعدہ انکی تصویر و حالات درج کئے جاتے ہین ہم ریونڈ علم خان صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہین کہ اُنھون نے ہماری درخواست پر ادیب کے لئے حالات قلمبند فرمائے۔ آپ ہندوستانی مسیحی کلیسا کے ایک معزز رکن ہین اور ایشیائی لٹریچر سے آپ کو بڑی دلچسپی ہے۔ ناظرین ادیب یہ سنکر خوش ہونگے کہ جناب ممدوح نے ادیب کو مستقل قلمی اعانت کا وعدہ فرمایا ہے۔

تصویر [illegible] مین ایک مشرقی راجہ کے دو نابالغ لڑکے تھے۔ رانی راج کرتی تھی۔ وزیر سے اور رانی سے ملاقات ہوگئی اور وہ خود حکومت کرنے لگا۔ وزیر چاہتا تھا کہ اُن دونون لڑکون کو مار ڈالے جب رانی کو یہ حال معلوم ہوا تو اُسنے رانی اور شاہزادون کو جنگل مین بھگا دیا۔ جنگل مین ایک مست ہاتھی آیا اور دونون شاہزادون کو اٹھا لے گیا۔ وہ ہاتھی جس سلطنت کا تھا وہان کا بادشاہ مرگیا تھا۔ اب رانی تنہا رہ گئی اور گریہ وزاری کرنے لگی۔ وہ حاملہ تھی اور جنگل مین وضع حمل ہوا۔ اتنے مین ایک اور سلطنت کا وزیر اُدھر آگیا۔ اُسکے کوئی اولاد نہ تھی۔ خوبصورت بچے کو دیکھا اور اُسے دبے پاؤن اُٹھانے بڑھا اور آخر لے گیا۔" اس قصے کے آخری واقعات کو انڈین پریس کے ایک قابل مصور نے تصویر کا جامہ پہنایا ہے۔

دیپ داں کا نظارہ کسی انگریزی ماہر فن کی مصوری کا نمونہ ہے جسمین ہندوستورات کا گنگاجی مین چراغ بہانے کا منظر نہایت عمدگی کے ساتھ دکھلایا گیا ہے۔ ادیب مین یہ تصویر ہندوستان کی ایک قدیم تاریخ سے نقل کیجاتی ہے "دیپ داں" کے متعلق ہمارے مکرم جناب شرر سہارنپوری کی دلکش نظم قابل داد ہے۔

جلد نمبر

ادب اُردو کا باتصویر ماہوار رسالہ

جولائی سنہ ۱۹۱۱ء

ادیب

ایڈیٹر پیارے لال شاکر میرٹھی

فہرست تصاویر

فہرست مضامین

فی پرچہ

چندہ سالانہ چار روپیہ

پنچکوڑی مترا پرنٹر و پبلشر نے انڈین پریس الہ آباد میں چھاپ کر شائع کیا

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

ٹریبیون لاہور۔ ادیب، ایک ماہوار باتصویر اُردو رسالہ ہے جو الہ آباد سے شائع ہوتا ہے اور ملک کے اُردو رسالوں میں نہایت ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی اور تصویریں غرض ہر چیز عمدہ ہے۔ جون کے نمبر میں گیارہ تصاویر اور [illegible] مضامین ہیں۔ ان میں سے کئی مضامین ملک کے مشہور اہل قلم حضرات کے ہیں۔ ان تصاویر میں اعلیٰ حضرت ملک معظم جارج پنجم دام ملکہ اور علیا حضرت ملکہ معظمہ میری دام اقبالہا کی شاہی خاندان کی تصویریں بہت دلکش ہیں۔ ان کے علاوہ تصویر [illegible]، ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم اور شہریار، دو شہزادیاں وزیر (رنگین) کی تصویریں بھی قابل ذکر ہیں۔ مضمون نگاروں میں، جن کے مضامین اس نمبر میں شائع ہوئے ہیں، یادری [illegible] جان، شمس العلماء مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، [illegible] سلطان بیگم صاحبہ، نواب [illegible] خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب وغیرہ کے نام نامی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ مسٹر پیارے لال شاکر قابل مبارکباد ہیں کہ وہ رسالہ کو اس قدر مفید اور دلچسپ بنا رہے ہیں۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ ہمیں رسالہ ادیب کا ایک نمبر ملا ہے، جو الہ آباد سے زبان اُردو میں شائع ہوتا ہے اس میں مختلف عنوان و مباحث پر مضامین درج ہیں اور مضمون نگاروں میں وہ اصحاب شامل ہیں جو آج تمام ہندوستان میں متند مانے جاتے ہیں۔

مارواڑی کلکتہ۔ ادیب نام کا ایک باتصویر اُردو رسالہ انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا جون نمبر ہمارے سامنے ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے کل اکیس مضامین ہیں جملہ مضامین اعلیٰ درجہ کے ہیں اور سبجکٹ بھی بجائے خود عمدہ ہیں۔ عبارت نہایت فصیح و سلیس ہے۔ تصاویر کی تعداد بارہ ہے۔ پہلی تصویر رنگین ہے جس میں الف لیلہ کا ابتدائی منظر دکھایا گیا ہے۔ دوسری تصویر ہمارے شہنشاہ اور ملکہ معظمہ کی ہے۔ جملہ تصاویر دلکش اور قابل دید ہیں۔ آج کل اسکے ایڈیٹر منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی ہیں۔ شاکر صاحب زبانِ اُردو کے مشہور انشاپرداز اور اچھے شاعر ہیں۔ آپ کی نظمیں قابلِ تعریف ہوتی ہیں۔ الغرض۔ اُردو والوں کے لئے ادیب بڑے کام کی چیز ہے۔۔۔۔

نورافشاں، لودیانہ۔ ادیب۔ اس نام کا ایک [illegible] مسٹر پیارے لال صاحب شاکر کی زیر ایڈیٹری الہ آباد سے [illegible] ہے۔ یہ رسالہ قابل دید ہے۔ کیا بلحاظ خوش خطی اور خوبصورتی کے، اور کیا بلحاظ خوبی مضامین کے یہ رسالہ قابل تعریف ہے۔۔۔۔ اس میں نہایت خوبصورت سادہ اور رنگین تصاویر بھی شامل ہیں جن سے رسالہ کی رونق دوبالا ہو گئی ہے۔ رسالہ کی عبارت نہایت شستہ اور رنگین ہے، کیوں نہ ہو اس کے ایڈیٹر صاحب ایک اعلیٰ درجہ کے انشاپرداز اور صاحبِ تجربہ ہیں۔۔۔۔۔۔

توسیع اشاعت۔ ذیل کے علم دوست اصحاب کا دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے اس ماہ میں ادیب کی توسیع اشاعت میں دلچسپی لی ہے اور اپنے احباب کو اس کی خریداری پر [illegible] کیا ہے۔ آیندہ بھی ایسے علم دوست حضرات کا شکریہ ادا کیا جائے گا۔ (۱) محمد عبدالعزیز صاحب کورٹ انسپکٹر (۲) مولوی احمد عبدالعلیم صاحب ناظر (۳) ہیڈ ماسٹر صاحب [illegible] (۴) مولوی علی جواد صاحب (۵) منشی تلوک چند صاحب مرحوم (۶) مولوی محمد عبدالحکیم خانصاحب (۷) مولوی مہدی حسن صاحب سکریٹری (۸) منشی احمد حسن صاحب (۹) پادری جان [illegible] (۱۰) خواجہ غلام قادر غلام غوث صاحب (۱۱) مولوی لطیف الدین صاحب تعمیر (۱۲) سید معشوق حسن صاحب (۱۳) بابو نہال چند صاحب سیٹھی۔

فہرست مضامین

حصۂ نثر

صفحہ

حصۂ نظم

فہرست تصاویر



حبقوق نبی کا مزار

انڈین پریس الہ آباد



عرقت زدہ یکس

عرقت زدہ

انڈین پریس الہ آباد

جولائی سنہ ۱۹۱۱ء

ادیب

جلد ۴ — نمبر ۱

امومیت

تمدّن کے ابتدائی مدارج

اقتباس از کتاب تمدّنِ ہند (زیرِ طبع)۔ کتاب دوم فصل چہارم

سواحلِ ملابار کے باشندے نائر وغیرہ

تمدّن کے ابتدائی مدارج ہند کی مختلف اقوام میں اس وقت وہ نظامات اور تمدّنی مدارج موجود ہیں، جن کو متمدّن اقوام مدت سے قطع کر کے اپنی موجودہ حالت پر پہنچی ہیں۔ اس برّ اعظم کی اقوام پر نظر ڈالنے سے ہمیں وہ کُل مدارج ملتے ہیں، جو ہمارے آباؤ اجداد طے کر چکے ہیں۔

نائر ملابار کے نائروں میں بعض ایسی رسمیں موجود ہیں جو یورپ سے بالکل مفقود ہو گئیں، اور جن کا پتہ صرف ہماری کتابوں میں رہ گیا ہی۔ مثلاً اُن میں خاندان کا دار و مدار ماں پر ہی جو یورپ میں بھی ابتدائی زمانۂ تاریخی میں تھا۔

اُمیت تاریخی تحقیقات نے، جن کا ذکر ہم نے اپنی دوسری تصنیف میں کیا ہی، اس امر کو ثابت کر دیا ہی کہ جب انسان اپنی وحشی حالت سے نکل کر تمدّن کے میدان میں آیا، تو اس ابتدائی حالتِ معاشرت میں کسی ایک قوم کی کُل عورتیں، کُل مردوں کی مِلک ہوا کرتی تھیں، اور بچّے جو اِن سے پیدا ہوتے، وہ بھی کُل قوم کی مِلک تھے۔ اس کے بعد اُمیت یعنی مادری خاندان کی بنا پڑی۔ جس کے رو سے بچّے ماں کی مِلک ٹھہرائے گئے، اور ماں کی جائداد کے وارث قرار دئے گئے۔ یہ اُس عام ملکیت کے مقابل میں ایک بہت بڑی ترقی تھی، کیونکہ شخصی ملکیت عمومی ملکیت سے زیادہ قوی ہوتی ہی۔

نائروں کی حکومت ایک فرانسیسی فرانسوا پیرار سترھویں صدی عیسوی کا

ابتدا میں ملابار آیا تھا اور اس نے جو کچھ بیان نائروں کا لکھا ہی وہ کم و بیش اس وقت تک اُن کی حالت سے مطابقت رکھتا ہی۔ وہ لکھتا ہی کہ نائر ایک بہادر اور جنگ جُو قوم ہی، اور ان میں اُسی قسم کا مردانہ اخلاق ہی جیسا یورپ میں ازمنۂ متوسطہ میں تھا۔ یہ بالکل نڈر اور غیرت مند قوم ہی۔ انھیں اپنی عزت کا بے انتہا خیال ہی اور ان میں عورتوں کی عزت اعلیٰ درجہ کی ہی۔ سولھویں صدی عیسوی میں نائروں کی ایک بڑی حکومت تھی اور یہ متمول قوم تھی۔ پیرارڈ لکھتا ہی کہ کیا لیکٹ کا زاموزن ہندوستان کے بڑے حکمرانوں میں ہی اور اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ نائروں کی فوج ہی۔

نائروں کے اوصاف | جسمانی لحاظ سے نائر ایک حسین قوم ہیں۔ ان کا قد بلند، جسم سڈول، ہاتھ پیر خوبصورت، اور رنگ صاف ہی۔ نائر کے لفظ کے معنی مالک کے ہیں، اور یہ فی الواقع سائل ملابار کے امرا اور حاکم قوم ہیں۔ برہمنوں نے صرف تھوڑے دنوں ان پر حکومت کی، اور انھوں نے بہت جلد اپنے کو آزاد کر لیا۔ اس وقت برہمنوں کی مذہبی حکومت بھی نائروں پر بہت کم ہی۔ یہ ملابار کے برہمن آریہ نہیں ہیں، اور نہ شمال کے آریہ برہمنوں کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ خود نائر جو اپنے کو کھتری کہتے ہیں، ہندوؤں کے نزدیک شودر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی نائر اپنی ہمسایہ اقوام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمسایہ ٹیر کی قوم ہی، جو اصل میں نائروں سے زیادہ خالص ہیں، اور ان کا رنگ بھی زیادہ صاف ہی۔ علاوہ ان کے موپلوں (موپلا) کی قوم ہی، جو عرب ملاحوں کی اولاد اور مسلمان ہیں۔ یہ نہایت بہادر ہیں اور اکثر نائروں سے لڑتے رہتے ہیں۔

خاندان | خاندان کی بنیاد کا اُمیّت پر ہونا ایک ایسی رسم ہی، جو اعلیٰ متمدن اقوام سے بالکل مفقود ہو گئی ہی، اور اب بہت ہی کم اقوام میں باقی ہی۔ ہند میں یہ رسم آسام کے کھاسیا میں، جن کا ذکر ہو چکا اور ملابار کے نائروں میں پائی جاتی ہی۔ وحشی اقوام میں شادی کوئی چیز نہیں بلکہ قوم کی کل عورتیں کل مردوں کی ملک ہیں۔ اُمیّت کی رسم اس سے ایک درجہ اوپر ہی اور اس میں ایک عورت کے متعدد شوہر ہوتے ہیں، اور خاندان کی مالک عورت ہوتی ہی۔

شادی | نائروں میں شادی کثرت البعول کے قسم کی ہی، اور ایسا معلوم ہوتا ہی کہ شادی کی رسمیں اُس وقت قرار دی گئیں جب برہمن ان پر غالب ہو چکے تھے۔ شروع میں تو ایک عورت کا ایک ہی شوہر ہوتا ہی، لیکن شادی کی مدت محدود ہوتی ہی۔ ۲
شوہر اپنی بی بی کے گلے میں ایک ہار ڈال دیتا ہی، اور جب تک عورت اُس ہار کو پہنے رہے، شادی قائم رہتی ہی۔ تھوڑے دنوں کے بعد پہلا شوہر کچھ دیکر رخصت کر دیا جاتا ہی، اور دوسرے اشخاص اس کی جگہ لیتے ہیں۔ یعنی عورت تمام قوم کی ملک نہیں ہوتی، بلکہ صرف چند اشخاص کی؛ لیکن اس شرط سے کہ وہ خود اُن کو انتخاب کرے، اور اُن سے بچے لے، اور اُن کی تعداد دس بارہ اشخاص سے زیادہ نہ ہو۔ نائر عورت، جو اپنے بھائیوں کے ہمراہ رہتی ہی، پہلی شادی ہونے کے بعد ہی اپنے مختلف شوہروں کو یکے بعد دیگرے بُلا کر گھر میں رکھتی ہی، اور جو شوہر برسرِ کار ہوتا ہی، وہ اپنا چھرا بطور علامت کے دروازہ پر گاڑ دیتا ہی۔ ایسی شادی سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ اپنی ماں کے نام سے کہلاتے ہیں، کیونکہ باپ ان کا نا معلوم ہوتا ہی۔

[illegible] حکومت ناٹروں میں خاندان کی حکومت پوری طرح عورت کے ہاتھ میں ہے، اور وہ اس کام میں اپنی بڑی بیٹی سے مدد لیتی ہے۔ جو مرد ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتے ہیں، اُس کے بھائی اور بیٹے ہیں۔ بچّوں کو جو اپنی ماں اور اُس کے بھائیوں میں پلتے ہیں، ماموں کے ساتھ ویسی ہی محبت ہو جاتی ہے، جیسے دوسری اقوام میں اولاد کو باپ کے ساتھ ہوتی ہے۔ بھائی بہنوں میں بھی ہمیشہ ساتھ رہنے کی وجہ سے بڑی محبت ہو جاتی ہے، جو ہرگز زن و شو میں نہیں ہو سکتی، کیونکہ شوہر اپنی بی بی کے ساتھ کبھی زیادہ دنوں نہیں رہ سکتا۔ آسانی سے سمجھ میں آئے گا کہ اس انتظام کے رو سے خاندان میں اوّل درجہ عورت کا ہے، اور اُس کے بعد اُس کے بھائیوں کا۔ شوہر کا درجہ نہایت کم ہے، کیونکہ اُس کا تعلق عارضی اور چندروزہ ہوتا ہے۔ عورت ہمیشہ اُسی مرد کو انتخاب کرتی ہے جو مضبوط اور حسین ہو۔ اُس کو پورا حق اس بات کا ہے کہ جس کو چاہے اپنا شوہر بنائے، بشرطیکہ وہ شخص نیچی ذات کا نہ ہو، کیونکہ ایسی صورت میں اُس کی عزّت میں فرق آتا ہے۔ یہ ہنگامی شوہر زیادہ تر برہمن ہوتے ہیں، اس لئے کہ ان کی ذات اعلیٰ ہے۔ یہ گھر گھر پھرتے ہیں اور اپنی قیمتی نسل کو نذر کر کے قوم کا درجہ بلند کر دیتے ہیں۔

مردوں کی آزادی ناٹروں میں مردوں کو ویسی ہی آزادی ہے جیسی عورتوں کو، یعنی جس طرح عورتیں کثیرۃ البعول ہیں ویسے ہی مرد کثیر الازواج ہوتے ہیں۔ البتہ جو اشخاص مفلس ہیں، وہ زیادہ بی بیاں نہیں رکھ سکتے، بلکہ کئی بھائی یا کئی اشخاص ملکر ایک عورت کے شوہر بن جاتے ہیں۔

کثرت البعول کی رسم کثرت البعول کی رسم ہندوستان کے دوسرے خطوں میں پائی جاتی ہے۔ اقصائے شمال کی طرف تبت میں اور اقصائے جنوب کی طرف مدورا میں یہ رسم موجود ہے۔ کثرت البعول کی رسم جو ہمیں اس قدر نفرت انگیز معلوم ہوتی ہے، فی الواقع نہایت قدیم رسم ہے، اور مہابھارت میں پانچوں پانڈو جو آپس میں بھائی ہیں ایک ہی عورت سے، جس کا نام دروپدی ہے، اور جس کی آنکھیں کنول کی سی ہیں، شادی کرتے ہیں۔

ارث جب کوئی ناٹر مرتا ہے، تو اُس کی اولاد وارث نہیں ہوتی، بلکہ اُس کی بہن کی اولاد۔ مادری جائداد لڑکی اور اُس کی لڑکی کو پہنچتی ہے، جیسا کہ پہلے ٹراونکور کے راج میں ہوا کرتا تھا۔ بھائی اپنی ماں کی نگرانی میں جائداد کا انتظام کر سکتے ہیں، لیکن قانوناً انہیں اُس میں کوئی ملکیت کا حق نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُمیتی خاندان ناٹروں کی طبائع اور حالت سے خاص مناسبت رکھتا ہے کیونکہ اُس ملک میں قدیم سے جاری ہے۔ اگرچہ مسلمان اور عیسائی اس ساحل پر سالہائے دراز سے بسے ہوئے ہیں، ان کا کوئی اثر اس رسم پر نہیں پڑا ہے۔

سیّد علی بلگرامی

قدیم ہندوستان میں فنِ ہوابازی

آجکل جب کہ انگریزی اور اُردو رسالوں اور اخباروں میں سب سے زیادہ دلچسپی کے مضامین وہ سمجھے جاتے ہیں جو ہوابازی، ہوائی پرواز، آلات پرواز، یا ہوائی جہازوں کے متعلق ہوں، یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوؤں کی قدیم روایات میں جو بِوانوں اور اُڑان کھٹولوں کا ذکر آیا ہی وہ کہاں تک درست اور قرین قیاس ہوسکتا ہی۔ پُرانے قصّے کہانیاں سُننے اور بعض مذہبی کتب پڑھنے سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہی کہ گو اہل مغرب ہوائی پرواز کو ایک جدید انکشاف قرار دیکر اسے سائنس کی ایک عظیم الشان فتح ظاہر کررہے ہیں، تاہم اہل ہند کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی جہالت یا لاعلمی کے باعث ہم آجتک ہوائی پرواز کے ان قدیم قصّوں سے یا تو بالکل بے خبر تھے یا انھیں ناممکن سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرتے تھے، لیکن اب جب کہ ہم نمائش الہ آباد کے موقع پر اپنی آنکھوں سے آلات پرواز دیکھ چکے اور کلکتہ، حیدرآباد وغیرہ بعض مقامات میں مشہور ہوابازوں کے کارنامے سُن چکے ہیں، تو قدرتی طور پر ہمارے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہی کہ ہندوؤں کی عظیم الشان تہذیب سے یہ بات کچھ بعید نہ تھی کہ اس میں بِوان اور اُڑان کھٹولے تیار کرلئے گئے ہوں۔

فی الحقیقت یہ بات عام طور پر بیان کی جاتی ہی کہ ہندوؤں کے علم الاصنام (Mythology) میں جن دیوتاؤں کا ذکر آتا ہی وہ ضرور کسی نہ کسی قسم کے آلات پرواز (Aeroplanes) استعمال کیا کرتے تھے۔ ان میں زیادہ مشہور پشپک بِوان تھا جسے کُبیر جو دولت کا دیوتا ہی، استعمال کیا کرتا تھا۔ پُرانوں میں ایک خاص صنعت کے ذریعہ جسے انگریزی میں Metonomy کہا جاتا ہی جا بجا اس دیوتا کا ذکر بطور "پشپک" کے آیا ہی۔ بالمیک نے اپنی تصنیف میں اسکا جو ذکر کیا ہی اس کا حوالہ آگے چل کر دیا جائے گا۔ یہاں پر صرف اسیقدر بیان کردینا کافی معلوم ہوتا ہی کہ اس کا ایک خود بخود حرکت کرنے والی ہوائی گاڑی ہونا ایک یقینی امر ہی۔ اس بات کی کہیں توضیح نہیں کی گئی کہ اس کا نام "پشپک" کیوں تھا گو اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہی کہ یہ لفظ "پُشپ" पुष्प سے مشتق ہی جس کے معنی "پھول" کے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہی کہ کُبیر چونکہ تمام دیوتاؤں میں زیادہ دولت مند تھا، اس لئے اس کی ہوائی گاڑی پھول کی طرح ہلکی اور اس کی خوشبو کی طرح تیز رفتار ہوگی۔ اس عجیب و غریب گاڑی کی نسبت رامائن کے ایک پرب میں جن میں سنہ [illegible] قبل مسیح سے سنہ [illegible] قبل مسیح تک کے واقعات کا ذکر ہی، یہ بات مذکور ہی کہ اسے راون نے کسی طریق پر اپنے قبضہ میں کرلیا تھا اور جب کبھی وہ برہمنوں کو جپ تپ میں مصروف دیکھتا تو اس میں بیٹھ کر اُن کے کاموں میں حارج ہوا کرتا تھا۔ جب رامائن کی مشہور و معروف لڑائی میں راون رام چندر جی کے ہاتھوں قتل ہوا تو یہ ہوائی گاڑی حقوقِ فتح کے مطابق رام چندر جی کے ہاتھ آئی اور وہ اس میں مع سیتا جی اور لکشمن جی و بعض دیگر خدام

سوار ہو کر اجودھیا پہنچے۔

سنسکرت زبان کے مشہور و معروف ناٹک شکنتلا کا مصنف کالیداس اسی واقعہ کو اپنی نظم "رگھوبنس" میں دہراتا ہے۔ اس نظم کے ۱۹ کانڈوں میں رام چندر جی، ان کے آباو اجداد اور جانشینوں کا تذکرہ ہے۔ ایک اور سنسکرت شاعر بھاروی جو چھٹی صدی عیسوی میں ہو گذرا ہے، اسی قسم کی ہوائی گاڑی کا ذکر اپنی نظم "کراتا رجونیہ" میں کرتا ہے جس میں شو اور ارجن کی لڑائی کا ذکر ۱۸ کانڈوں میں کیا گیا ہے۔

انگریزی زبان میں ہوا میں اڑنے کی کل کے لئے ایک جامع لفظ ایروپلین (Aeroplane) موجود ہے لیکن اردو میں ابھی تک اس کا مرادف کوئی خاص لفظ قائم نہیں کیا گیا۔ اخبارات میں عام طور پر اس کے لئے آلۂ پرواز، ہوائی گاڑی، ہوا میں اڑنے کی کل، یا ہوائی جہاز وغیرہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے "ہوائی جہاز" غلط اور "ہوا میں اڑنے کی کل" غیر موزوں ہے۔ کوئی لفظ اگر موزوں کہلا سکتا ہے تو وہ "آلۂ پرواز" ہی ہے۔ لیکن سنسکرت زبان میں اس کے لئے ایک نہایت مناسب لفظ "ومان" विमान ہے جو ایک سنسکرت ماخذ سے نکلا ہے جس کے معنی "ناپنا" "پھیلنا" اور "مختلف طریقوں پر بنانا" کے ہیں۔

قدیم ترین روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک قسم کی خود بخود حرکت کرنے والی گاڑی ہوتی تھی جس میں بیٹھ کر لوگ ہوا میں سیر کر سکتے تھے۔ پرانوں میں اس قسم کی ایک گاڑی کا ذکر آتا ہے جس کی سات منزلیں تھیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں یہ لفظ عام طور پر ایوانِ شاہی کے لئے استعمال ہونے لگ گیا تھا۔ روایات سے پایا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں ومان مختلف شکلوں کے بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ بعض کی شکل محل کی سی ہوتی تھی، بعض کی مکان کی طرح اور بعض ان میں سے گاڑیوں کی وضع کے ہوا کرتے تھے۔ ایک پران میں وشیشور کا جو ہندوؤں کے چھوٹے درجے کے دیوتاؤں میں سے ہے، اس طرح پر ذکر آتا ہے کہ وہ اپنے ومان میں سوار ہو کر آسمان کی سیر کرتا پھر رہا ہے۔ چنانچہ ایک خاص باب میں جس کی سرخی "گاڑی میں بیٹھ کر سفر کرنا" ہے اس دیوتا کی سیر وسیاحت کا حال مذکور ہے۔ سنسکرت زبان میں ہوا بازی کے متعلق بہت سی اصطلاحات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہوائی پرواز کا فن اس زمانے کے بھارت ورش میں ایک اعلیٰ تکمیل کے درجہ تک پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ ان میں سے بعض اصطلاحات حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) ومان یاتو विमान यातु ہوائی گاڑی کو چلانا یا اس میں بیٹھ کر سفر کرنا۔

(۲) ومان چریا विमान चरया ہوائی گاڑی میں سیر کرنا۔

(۳) ومان پربھوت विमान प्रभूत ہوائی گاڑیوں کا جلوس۔

(۴) ومان ارج विमान चरज ہوائی گاڑی کو چلانے والا۔

وعلیٰ ہذا القیاس۔

لیکن ان اصطلاحات سے اس بات کا پتہ نہیں چل سکتا کہ ہوائی گاڑیوں کی پرواز کس قسم کی ہوا کرتی تھی۔ اس مطلب کے لئے ہمیں بالمیکی رامائن کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ نظم میں اس کا تذکرہ یدھ اور اتر کانڈ میں رام چندر جی کی حصے میں مذکور ہے کہ

ذکر آتا ہے۔ ان سب میں غالباً بہترین کیفیت "پشپک" ومان کی ہے جس میں رامچندر جی نے اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور ہمراہیوں کے سوار ہو کر اجودھیا پہنچے تھے۔ چنانچہ جب رامچندر جی بھبیشن سے جو راون کا بھائی اور جانشین تھا اس بات کا بندوبست کرنے کو کہتے ہیں کہ وہ اجودھیا میں جہاں کا راستہ نہایت کٹھن اور دشوار ہے جلد پہنچ جائیں تو بھبیشن انھیں "پشپک" ومان کی یاد دہانی کرواتا ہوا کہتا ہے:-

"مہاراج میں بہت جلد آپ کو اس شہر میں پہنچا دوں گا۔ پشپک نامی دوستی کی شکل کی گاڑی میرے بھائی کبیر سے راون نے چھین لی تھی۔ مہاراج وہ عمدہ گاڑی جو ہر جگہ لے جائی جا سکتی ہے راون کے مرنے کے بعد آپ کی ہو چکی ہے۔ وہ گاڑی لنکا کے آکاش میں بادلوں کے مانند ہے جس میں تمام تفکرات سے بری ہو کر آپ اجودھیا کو پدھار سکتے ہیں"۔

اس کے بعد بھبیشن نے رام چندر جی کی پوجا کی اور گاڑی ان کے سامنے لے آیا۔ بالمیکی نے اس موقع کا ذکر حسبِ ذیل الفاظ میں کیا ہے:-

"اس پر وہ گاڑی وہاں پہنچی۔ اس پر سنہرے نقش و نگار تھے اور جا بجا قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے بالائی کمروں پر سر بسر چاندی چڑھی ہوئی تھی اور اسے سفید جھنڈوں اور جھنڈیوں سے سجایا ہوا تھا۔ اس پر گلٹ کئے ہوئے کنول کے پھول لگے ہوئے تھے اور موتیوں اور جواہرات کی مالائیں لٹک رہی تھیں۔ اس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں جن میں سے نہایت سریلی آوازیں نکلتی تھیں۔

کے سم[illegible] سامان اٹھائے کرے تھے جنھیں چاندی اور موتیوں سے آتا ہے وہ ضرور کسی نہ کسی قسم کی مضبوط بنی ہوئی تھی کہ اس کے ٹوٹنے کا اندیشہ نہ تھا اور اسے مرضی کے مطابق چلایا جا سکتا تھا۔

اس قدر تفصیل کے بعد لکھا ہے:-

"اس پھول کی ایسی خوبصورت گاڑی کو دیکھ کر جو ایک بہت بڑے پربت سے مشابہ تھی، رام چندر جی حیرت میں آ گئے۔۔۔۔۔۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد وہ مع سیتا جی اور لچھمن کے اس خوشنما گاڑی پر سوار ہوئے اور ہنومان اور ان کی سپہ کے بعض جوان جو اجودھیا پہنچنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے وہ بھی اس میں سوار ہو گئے"۔

آگے چل کر بالمیک لکھتا ہے:-

"اس طرح پر جب سب سوار ہو چکے تو راگھو کا حکم پا کر کبیر کی وہ خوشنما گاڑی بہت بڑے شور کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھی نہایت خوشنما راج ہنس اس گاڑی کو اڑاتے تھے۔ رام چندر جی اس میں سوار ہو کر ایسے خوش ہوئے کہ وہ کبیر ہی کا سروپ معلوم ہوتے تھے"

راستے میں یہ گاڑی مقام کشکندہ پر رکی۔ معلوم ہوتا ہے یہ شہر زمانۂ حال کے موضع ہمپی کی جگہ جو بیجا نگر کے مشہور کھنڈرات کے قریب واقع ہے آباد ہوا کرتا تھا۔ یہاں پر سیتا جی کی درخواست پر ہنومان کی فوج کے بعض اور افسر اس گاڑی میں سوار کئے گئے۔ آخر کار یہ گاڑی رام چندر جی کے بھائی بھرت جی کے محل میں جا رکی جہاں رام چندر جی اور ان کے ہمراہی اس میں سے اترے۔ اس کے بعد رام چندر جی نے گاڑی سے مخاطب ہو کر کہا "اب تو کبیر کے پاس چلی جا میں تجھے جانے کی آگیا دیتا ہوں" اس پر وہ خوشنما گاڑی شمال کی طرف اڑ کر دولت کے دیوتا کے پاس پہنچی۔ اس گاڑی کو راون کبیر سے چھین کر لے گیا تھا مگر اب رام چندر جی کی بدولت وہ اسے واپس مل گئی۔

لیکن رامائن میں پشپک کا ذکر یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ آگے چل کر ایک موقع پر لکھا ہے:۔

"بعض اوقات دولت کا منکدل دیوتا (کبیر) غریبوں کا بھیس بدل کر اپنے والدین کے پاس جایا کرتا تھا۔ اس وقت دیوتا اور گندھرو موگاتے اور اپسرائیں اس کی گاڑی کے آگے آگے ناچتی جایا کرتی تھیں اور جس طرح سورج اپنی کرنوں پر تیرتا ہے اس طرح دولت کا دیوتا اس گاڑی میں بیٹھ کر اپنے والدین کے پاس جایا کرتا تھا۔"

معلوم ہوتا ہے یہاں پر اس وقت کا حوالہ دیا گیا ہے جبکہ پشپک گاڑی رام چند کی بدولت کبیر کو واپس مل گئی تھی۔

رام چندر جی کو اس کے واپس ملنے کی کسی قدر دلچسپ کیفیت رامائن میں دی ہوئی ہے جس میں سے ذیل کے فقرات کا اقتباس کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب رام چندر جی مع اپنے بھائیوں کے بڑے سکھ چین کے ساتھ اجودھیا میں رہتے تھے انہیں ہواسے ذیل کے شیریں الفاظ سنائی دیئے۔

"ہے عالی نسب رام آپ خوش ہو کر میری طرف دیکھئے۔ میں وہی پشپک ہوں جو اس وقت کبیر کی جائے رہائش سے آرہی ہوں۔ مہاراج آپ کے حکم کے بموجب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی مگر انہوں نے مجھے کہا کہ راون کو لڑائی میں قتل کر کے مہاراج رام چندر جی نے تجھ پر قبضہ پا لیا ہے میں اس بدخلق راون کی موت پر بہت خوش ہوں۔ ہے پشپک رام نے تجھے لنکا میت فتح کر لیا ہے۔ پس میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو واپس انہیں کے پاس چلی جا۔ تمام مقامات پر سیر کرنے کے لئے تو ہی مناسب گاڑی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ رگھو کل رام ہی تجھ پر سوار ہوں۔ پس تو بغیر افسوس کئے اُن کے پاس چلی جا، مہاراج کبیر کا یہ حکم پاکر میں اب تمہاری خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ آپ بلا خوف وخطر مجھے منظور کیجئے۔ میں تمام دُنیا کی فتوحات سے بالاتر ہوں کبیر کے حکم کے بموجب میں آپ کی خواہش کے مطابق تمام علاقوں پر سے سفر کر سکوں گی۔"

پشپک کے ان الفاظ کو سُن کر رام نے اسے ان الفاظ میں مخاطب کیا:۔

"اے پشپک تو جو سب گاڑیوں کی سردار ہو اگر صورت حال یہ ہے تو خیر تو آجا۔ چونکہ دولت کے دیوتا نے تجھے اس قسم کا حکم دیا ہے اس لئے میں اس سے انحراف نہ کروں گا۔"

یہ کہہ کر رام چندر جی نے خشک دھان، پھولوں اور عنبر سے پشپک کی آرتی اُتاری اور پھر یوں کہنے لگے:۔

"اب تو جا اور جس وقت میں تجھے یاد کروں یہاں آجانا۔ اس وقت ہے پشپک تو ہماری جُدائی سے افسردہ خاطر نہ ہونا اور نہ کہیں جاتے ہوئے راستے میں رُکنا۔"

اس حکم کو پاکر پشپک نے کہا "جو آگیا مہاراج" اور وہ واپس اپنے مقام پر چلی گئی۔

بالمیکی رامائن سے اخذ کر کے جو فقرات سطور بالا میں درج کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں اس قسم کی ہوائی گاڑیاں موجود تھیں جنہیں بنانے میں ابتک یورپ والے کامیاب نہیں ہو سکے۔ بالمیک نے جا بجا اس گاڑی کو "طلائی پشپک" کے نام سے یاد کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اتر کانڈ میں رام چندر جی کے گدھ اور اُلو کے جھگڑے کو فیصل کرنے کے جس واقعہ کا ذکر ہے اس موقع پر اُنھوں نے اسی گاڑی میں سفر کیا تھا۔ یہ آخری موقع ہے جہاں اس رزمیہ نظم میں اس گاڑی کا ذکر آتا ہے۔ رامائن کے ایک ابتدائی حصے میں مذکور ہے کہ

"اس گاڑی کو برہما کے من سے تیار کیا تھا" اور سطور بالا میں جو کیفیت قلم بند کی گئی ہے اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ "اسے بڑے خوشنما راج ہنس کھینچا کرتے تھے" مخفی نہ رہے کہ یہی فقرہ کم از کم ایک بار پھر اس گاڑی کے تذکرے کے متعلق رامائن میں آتا ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس گاڑی کو درحقیقت پرندے کھینچتے ہوں۔ البتہ اس کے یہ معنی لئے جا سکتے ہیں کہ گاڑی کی رفتار اور خوبصورتی راج ہنسوں کے برابر تھی۔ رامچندر جی کی اس گاڑی کے ساتھ گفتگو کا بھی جو ذکر کیا گیا ہے وہ شاعرانہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔

رام کے لنکا سے اجودھیا میں اڑ کر آنے کا ذکر کالیداس نے بھی اپنی نظم رگھوبنس کے تیرھویں کانڈ میں کیا ہے اور بھاؔبھوتی اپنے ناٹک "اترا رام چرتر" میں اس کا ایک موقع پر حوالتاً ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ ایکٹ نمبر ۱ میں ہم رام چندر جی کو یہ کہتے ہوئے پاتے ہیں "۔ ہے گاڑیبان اس جگہ گاڑی کو روکو" مہابھارت میں جابجا آسمانی گاڑیوں کا ذکر آتا ہے جن میں سے ایک وہ بھی تھی جو ورن نے ارجن کو بطور تحفہ کے پیش کی تھی۔ اس گاڑی کی کیفیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آسمانی ہتھیاروں سے مسلح تھی اور اسے دیوتا یا راکشش مغلوب نہ کر سکتے تھے۔ اس گاڑی کی چکا چوند کی کوئی شخص تاب نہ لا سکتا تھا اور اسی میں بیٹھ کر سوم نے دیوتاؤں کو مغلوب کیا تھا۔ اس گاڑی میں ایک نہایت خوشنما طلائی جھنڈا لگا ہوا تھا جس پر کئی قسم کے جانوروں کی تصاویر تھیں لیکن اس کے متعلق چونکہ لکھا ہے کہ کاندھرو دنیا میں سے اسے گھوڑے اڑا کر لے گئے تھے اس لئے یہ امر مشتبہ ہے آیا وہ پشپک کی طرح ہوائی گاڑی تھی یا نہیں۔ ایک اور ہوائی گاڑی اندر کے قبضہ میں تھی جس پر سوار ہو کر ارجن آکاش پر پہنچا تھا لیکن اس کے متعلق اس جگہ مفصل ذکر کرنے کی گنجائش نہیں۔

سطور بالا میں ہندوستان کی دو مشہور قدیم رزمیہ نظم کی کتابوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے کہ زمانہ قدیم کے ہندوستان میں فنِ ہوابازی ایک اعلیٰ تکمیل کے درجے تک پہنچ چکا تھا۔ یہ بات کہ جو حوالے اوپر دئے گئے ہیں وہ شاعرانہ مبالغہ سے کہاں تک ملوث ہیں، سوائے عالم الغیب کے اور کسی کو معلوم نہیں۔

تیرتھ رام

ایشیائی شعراء کا کمال

(۱)

روایت وقافیہ شعر کے دو رکن اعظم ہیں اور انھیں سے شعر کہلانے کا مستحق ہوا ہی اور شاعر کے لئے انھیں کا التزام اہم ہی۔ عرب۔ فارس۔ بھاشا۔ کے شعرا نے دونوں کے پورا پورا لحاظ رکھنے پر اتنا زور دیا ہی اور کیا طاقت ہی کہ اُن کا قلم ردیف وقافیہ کے مری رکھنے میں ڈگمگا جائے۔ مگر اردو شعراء اس کا لحاظ بہت کم رکھتے ہیں۔ کیا معنی کہ ردیف جس پر مضمون کا دار و مدار ہی اور جو مضمون کی حرکت کروی کی قطب یا کلی ہی وہی شعر میں اکثر بیکار نظر آتی ہی گویا مضمون کو اُس سے واسطہ ہی نہیں رہتا۔ یہ عیب نہ صرف نوآموز یا معمولی شعراء کے کلام میں ہی بلکہ بعض نامی گرامی شعراء بھی اس سے بری نہیں۔ اساتذہ کے ایسے اشعار کسی وقت ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے اور بات یہ ہی کہ جو لوگ حشو کو معیوب نہیں سمجھتے وہ ردیف کو بیکار رکھنے کے زیادہ مرتکب ہوتے ہیں۔ انھیں لوگوں نے حشو کی دو قسمیں گھڑ لیں ایک حشو قبیح۔ دوسرا حشو حسن جیسے گناہ کی کوئی شخص دو قسمیں ٹھہرائے ایک گناہ اچھا دوسرا گناہ برا۔ شعر میں حشو و زوائد کا ہونا بدترین عیوب ہی۔ شعر کی صفت یہ ہی کہ مضبوط اور مربوط ہو۔ ورنہ نام کو نہ ہو۔ ٹھکا ہوا ہو۔ ٹھوس ہو۔ اگر ایک لفظ اٹھا دیا جائے تو سلسلہ تار و پو و بکھر جائے۔ تصرف کرنے سے نکتہ چیں کو عاجز کر دے۔ اسی کا نام سحر حلال۔ سحر ممتنع ہی۔ اسی کا نام اعجاز ہی۔ یہ کمال حضرت نظامی گنجوی میں ہی۔ خاقانی میں ہی۔ مولانا عبدالقادر بیدل میں ہی۔ اور شعراء اُردو میں حضرت غالب دہلوی میں ہی۔ رحمۃ اللہ علیہ اجمعین اور بھاشا کے شعراء میں تلسی داس جی کا کلام بہت مضبوط ہی۔ حشو نام کو نہیں۔ اور شعراء عرب میں متنبی کا کلام بہت چُست ہی۔ اور کیوں نہ ہو۔ متنبی کے لغوی معنی ہی شعر میں نبوت کا دعویٰ کرنے والے کے ہیں۔ ہم سب کے کلام کا نمونہ مع حل و تنقید پیش کریں گے۔

مولانا نظامی گنجوی معراج رسول میں فرماتے ہیں۔

شبے کاسماں مجلس افروز کرد ۔ شب از روشنی دعوئے روز کرد

اس شعر میں لفظ شب دو جگہ آیا ہی مگر حشو نہیں۔ آسمان کو مجلس افروز کرنے یعنی انجمن انجم کو زینت دینے اور اپنی روشنی سے دن کا دعویٰ کرنے کی فاعل دونوں مصرعوں میں شب ہی ہی۔ بیشک فن بلاغت و بیان میں مضمر کی جگہ اظہار مظہر فعل فصاحت ہی یعنی مصرع اولیٰ میں لفظ شب ظاہر تھا تو مصرع دوم میں ضمیر لانا مناسب اور کافی تھا جو "کرد" میں ہی۔ مگر لفظ شب کو مکرر لانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ کیونکہ پہلی شب عام ہی اور دوسری خاص۔ بلاغت یہ ہی کہ شب تو ہمیشہ آسمان کی مجلس روشن کرتی ہی مگر معراج کی شب میں یہ تخصیص ہی۔ کہ اس نے اپنی روشنی سے دن بن جانے کا دعویٰ کیا۔ یہاں اعتراض پڑتا ہی کہ دن کو تو ستارے اور ثوابت چھپ جاتے ہیں پھر آسمان کی مجلس کا روشن کرنا کہاں رہا۔ جواب یہ ہی کہ شب نے ایسا دعویٰ کیا ہی نہ کہ حقیقتہً د[ن] دن بن گئی ہی۔ مراد انتہا درجہ کی روشنی ہی اور بس۔ اور اگر شب کو مفعول اور آسمان کو فاعل قرار دیا جائے تو مضمر و مظہر کا جھگڑ[ا] ہی نہیں رہتا۔ کیا معنی کہ مصرع اولیٰ میں شب مفعول ہی او[ر] مصرع ثانیہ میں فاعل۔ یعنی آسمان نے جس شب کو اپنا مجل[س]

بنایا اور اگر افروز کو مخفف افروزی مانا جاے اور شب کو محض ظرف نہ کہ فاعل، تو شب کا دوسرے مصرع میں مکرر لانا ضروری ہوجاتا ہی یعنی جس شب آسمان نے مجلس افروزی کی تو شب نے دن ہوجانے کا دعویٰ کیا۔ ورنہ مولانا نظامی یوں فرماسکتے تھے ؎

زر روشنگری دعویِ روز کرد

آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

زمعراج او در شبِ ترکِ تاز معترج گران فلک راطراز

معراج و تعریج میں تجنیس ہی۔ معراج آلہ عروج (چڑھنے کا زینہ) تعریج کپڑے کو بیل بوٹے سے بُننا۔ معترج گر اگرچہ مثلاً لفظاً ہی مگر قوام میں ٹھکا ہوا ہی۔ مراد ستارے ہیں جو آسمان پر اپنی گردش سے بوٹے بُن رہے ہیں۔ رسول صلعم کی معراج نے اُن کو زینت دے دی بہت بلند اور بلیغ مضمون ہی۔

خاقانی ایک مدحیہ قصیدے کی تشبیب میں ساقی کو مخاطب کرکے کہتا ہی ؎

برق توئی و بید من سوختۂ توام کنوں سوختہ بید خواہ اگر راوقِ امید پروری

حل اے ساقی تو برق ہی اور میں تیرا بید سوختہ ہوں یعنی تو نے مجھے بید کی لکڑی کی طرح جلاکر کوئلا کردیا ہی اور یہ قاعدہ ہی کہ بید کے کوئلے سے شراب صاف کرتے ہیں پس تو اگر عید کے لئے راوق (شراب مصفّیٰ) تیار کرنا چاہتا ہی تو مجھے کام میں لا ؎

بر عنب و دُم خورہ خیز رکاب بادہ دہ چوں دُمش از مطوقی جاں عنبش ز احمری

لغت عنب۔ پختہ انگور۔ خورہ مخفف خروس مراد صراحی ہی جو اکثر خروس کی شکل ہوتی ہی۔ مطوقی۔ خمدار ہونا۔ دُمش میں ضمیر شین خورہ کی جانب ہی اور عنبش میں بادہ کی جانب۔ رکاب بڑی طشتری جسے رکابی کہتے ہیں۔

حل اے ساقی انگور اور دُم خروس کے انداز پر اُٹھ اور شراب کی قاب دے جیسی خروس کی دُم جھکی ہوئی ہوتی ہی اور جیسا انگور سُرخ ہوتا ہی یعنی رندوں کو جھک جھک کر شراب دے۔ سُرخ انگور کی طرح تیرا حُسن بھی لعلگوں ہی لیکن قدر سنجیدہ ہی جیسے مجذ کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ایک لفظ بھی حشو نہیں ٹھوس کلام ہی۔ پھر خورہ (صراحی) اور عنب (شراب) کے انداز کی توضیح کرتا ہی ؎

رقص کناں نگر خورہ لعل عنب چو روے تو طوق کشاں سر دُمش چوں خطت از معنبری

حل صراحی رقص کررہی ہی۔ سُرخ شراب تیرے چہرے کے مانند ہی۔ صراحی کی دُم خمدار ہی جیسا تیرا خطِ سیاہ۔ "محفل میں اکثر حسین امرد لڑکے رقص کرتے ہیں اور وہی ساقی بنکر شراب پلاتے ہیں کیونکہ سبزۂ خط تو امردوں ہی کے چہرے پر ہوتا ہی نہ کہ رقاصہ عورتوں کے چہرے پر ؎

منتظری کہ از فلک خوانچۂ زر برآیدت خوانچہ کن پیالہ کش خوانچۂ زر چہ می بری

حل۔ اے ساقی تو شاید منتظر ہی کہ آسمان سے تیرے لئے خوانچۂ زر (آفتاب) نکلے اُس وقت تو رندوں کو صبوحی پلائے۔ خوانچہ بنا۔ پیالہ نکال۔ خوانچۂ زر کا کیا انتظار کرتا ہی یعنی طلوع آفتاب سے پہلے صبوحی دے۔ ذیل کے شعر میں تجنیس ملاحظہ ہو ؎

کردہ چرخ جو بجو دیدہ آزمودہ کردہ بجور جوز پشت ہم بجوال اُندری

لغت جوال۔ باگ ڈور یا رسی جو گھوڑے اور بیل وغیرہ کے لگی ہو جس سے وہ مطیع رہے۔ جوز پشت۔ زخمی۔ اب ملاحظہ ہو کہ اس شعر میں لفظ (جو) پانچ جگہ جُدا جُدا معنی میں آیا ہی۔

حل آسمان کا کیا ہوا تمام و کمال تو نے دیکھا اور آزمایا ہی، اُس نے ظلم سے تیرے پشت کو جوز (اخروٹ) کی طرح زخمی یا دوپارہ کردیا ہی۔ کیونکہ جوز کی پشت ایسی ہی ہوتی ہی۔ ہموار نہیں ہوتی۔ کھُردری ہوتی ہی اور دوپارہ۔ پھر بھی تو آسمان کی رسی میں

[...]جا ہوا - طرح طرح کی تکلیفیں سہہ رہا ہو اس سے بکل - مولنا عبدالقادر [...]ل فرماتے ہیں - ؎

[...]ست عالم بے بری طرب شکار عافیت — چو چنار بندِ کفِ تہی ہمہ تن بلہ بر کرا فریں

بھلا ہندوستان بلکہ خود ملک فارس میں کوئی ہمہ داں عالم [...]فاضل اس شعر کے صحیح معنی سمجھ سکتا ہو، ہرگز نہیں۔ اگر کسی کو دعویٰ ہو تو سامنے آئے اور بیدل کے دوسرے اشعار کے معنی بتائے۔

لغت کُبلہ چمڑے کا دستانہ جس کو ہاتھوں میں چڑھا کر شکاری لوگ جانور پکڑتے ہیں - تاکہ وہ چونچوں اور پنجوں سے ہاتھوں کو زخمی نہ کردیں -

حل - عالم بے بری (دُنیا) ایک چمن ہی یہاں طربِ حقیقی جو آسائش سے حاصل ہو شکار ہوتی ہی - اے مخاطب اگر تجھے شکار کی ہوس ہی تو چنار کی طرح اس چمن میں جا اور دستانہ جس کو تو ہاتھ میں پہنتا، اب اس کو کمر پہ پیدا کر - یعنی اُس کا پہننا فضول ہی - کیونکہ شکار تو رہا ہی نہیں اور یہ چمن بے بری کا عالم ہی کچھ حاصل نہ ہوگا - قاعدہ ہی کہ پنجۂ چنار بالکل خالی ہوتا ہی اُسے پھول پھل نہیں لگتے - چنار سے مراد کٹھل کا درخت ہی جو چنار ہی کی قسم سے ہی - اُس کا جڑ یا تنے میں دس دس اور بیس بیس سیر اور بسا اوقات من من بھر کے کٹھل لگتے ہیں مشکیں جیسی لٹکتی ہوئی ہم نے خود دیکھی ہیں پس کٹھل اُس کی کمر پر گویا بیلہ ہی - مطلب صرف اس قدر ہی کہ تو کیسی ہی کوشش کرے مگر دُنیا میں عافیت حقیقی (شانتی یا قوت مطمئنہ) نہیں مل سکتی یہ ذراسی بات حضرت بیدل نے اس تفنن سے ادا کی ہی کہ سمجھانے سے بھی ذہین و فطین نازک فہم ناظرین ہی سمجھیں گے معمولی فہم والوں کے لئے سمجھنا مشکل ہی، اب تو صاف اور سریع الفہم کلام کی تعریف ہی گویا شعراء متقدمین کی جگر کاویاں اور نزاکت آفرینیاں فضول ہیں - ایک شعر اور ملاحظہ ہو - ؎

سرو برگ راحت ایں چمن بخیال ما نکند وطن — چو غبار خفتہ گرفتگی سر بال و پر آفریں

حل - اس چمن (دنیا کی) راحت کا سامان ہمارے خیال میں بھی جاگزیں نہیں ہوتا - اگرچہ آسمان کو طاقت ہی کہ ہماری نیچرل ساخت اور جسمانی قطع وضع کو اس اسلوب سے پیدا کرے کہ ہمارا سر پروں کے نیچے ہو اور ہم بھیگے ہوئے غبار کی طرح آرام سے پڑے رہیں مگر ہم تو آسائش کے طالب ہی نہیں اور یہ قاعدہ ہی کہ جانور آرام یا بسیرا لیتے وقت سروں کو پروں کے نیچے دے لیتے ہیں سبحان اللہ - اب حضرت غالب مرحوم کا کلام لیجئے - آپ کا فارسی کلام بالکل صاف ہی، مگر اُردو میں حضرت بیدل کا تتبع کیا ہی - اور اشعار میں اکثر بیدل ہی کے رنگ کی جھلک ہی - فرماتے ہیں ؎

ہجومِ نالہ حسرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہی — خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہی

حل - نالے ہجوم کرکے آ رہے ہیں مگر ایک چیخ بھی پیش نہیں کر سکتے اُن کی حسرت عاجز ہی - اُدھر خموشی جب دیکھتی ہی کہ نالے کرنے کو بانسلیوں کے سوپں آگے چلے جاتے ہیں تو وہ بھی خس بدنداں (عاجز) ہی کہ میں کیونکر خاموش رہ سکوں گی - یعنی نالے اور خاموشی دونوں کشمکش میں ہیں - نہ چیختے بن پڑتی ہی نہ خاموش رہتے - ریشۂ نیستاں کے ساتھ خس بدنداں کیا خوب ہی ایک مطلع ملاحظہ ہو - ؎

شب جو وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا — رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

حل - شب وہ معشوق جو ناموسِ عشق کی خلوت کا مجلس افروز تھا (خلوت بھی اور مجلس یعنی جلوت بھی - ناظرین یہ نزاکت سمجھیں) تو شمع کا ہر رشتہ (وہ دھاگے جن سے شمع کی بتی بنتی ہی) لباسِ فانوس کے لئے کانٹا ہو رہا تھا یعنی باوصف اس کے کہ خلوتِ ناموس تھی کوئی غیر موجود نہ تھا پھر بھی فانوس کے لباس کے لئے ہر شمع کا رشتہ کانٹا بنا ہوا تھا - یعنی فانوس رشک کر رہا تھا کہ یہ شمع

(با وصف خلوت میں ہونے کے) عریاں کیوں ہی۔ میرا لباس پھٹ جائے تاکہ میں اُسے چھپا لوں۔ اللہ اکبر کتنی نزاکت ہی۔ حضرت غالب نے (رشتۂ مہر شمع) فرمایا ہی، حالانکہ فانوس ایک تھا اور شمع بھی ایک پس یقیناً یہ مراد ہی۔ ؎

شمع کا پیرہن رشتۂ علیکسۂ فانوس تھا

اب عرب کے نامی گرامی شاعر متنبی کا بلیغ کلام لیجئے اپنے ممدوح سیف الدولہ کی سخاوت کی مدح میں ایک قطعہ لکھتا ہی۔ ؎

یا ایہا المُهدے علیہ روحہ   اذلیس یاتیہ لہا استجداءُ
احمد عفاتک لاتجست لیفقدہم   فلترک مالم یاخذوا اعطاءُ

حل۔ اے وہ شخص (ممدوح) جس کی روح بھی ہدیہ دی گئی ہی یعنی جس نے اپنی جان بھی سائلین کو ہدیتہً دے دی ہی (ہبہ کر دی ہی) اس لئے کہ سوال کی طلب نہیں آتی یعنی تیری روح کے لئے کوئی سائل نہیں آتا ورنہ تو ضرور دے دیتا۔ تو اپنے سائلین کا شکریہ ادا کر کہ وہ زندہ رہیں اور تو اُن کے گم ہو جانے پر خدا کرے دردناک نہ ہو کیونکہ تیری روح اُن کے پاس ہی اور وہ زندہ رہیں گے تو تو بھی زندہ رہے گا۔ تیری جان جو اُن کی ملکیت ہو گئی ہی اُنھوں نے تیرے پاس چھوڑ رکھی ہی اور یہ قاعدہ ہی کہ جو شخص کوئی شی کسی کے پاس چھوڑ دے اور نہ لے وہ بمنزلہ عطا کے ہی۔ پس سائلین کا شکریہ ادا کر کہ وہ تیرے معطی اور منعم ہیں۔ صرف اتنی بات کہ تو مال، جان کے دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا کس خوبی سے ادا کیا ہی۔ اسی قصیدے میں لکھتا ہی۔ ؎

واذا اسطرت فلالانک مجدبٌ   تُسقی الخصیب و تمطر الداماءُ

لغت مجدب جدب سے ماخوذ ہی، قحط یا خشک سالی پیدا کرنے والا خصیب سبزہ زار والی زمین دآماء دریا۔

حل۔ تیرے ملک کو بارش کی ضرورت نہیں اور اگر تو کبھی بارش دیا جاتا ہی یعنی تیرے ملک میں مینہ برستا ہی تو اس لئے نہیں کہ تو خشک سالی پیدا کرتا ہی، آخر بارش جب ہوتی ہی سبزہ زار اور دریا دونوں ہی پر یکساں ہو جاتی ہی مگر دریا کو بارش کی کیا ضرورت ہی۔ ؎

واذا مُدحت فلا لتکسب رفعۃً   للشاکرین علے الالٰہ ثناءُ

حل اور جب تو مدح کیا جاتا ہی تو اس لئے نہیں کہ اُس سے تو بلندی حاصل کرے آخر شاکر لوگ رات دن خدا کی تعریف کرتے ہیں۔ حالانکہ خدا کو کسی کی تعریف کی پروا نہیں نہ اُس کو تعریف سے کوئی رفعت ملتی ہی، بلکہ شاکر کا کام ہی شکر کرنا ہی۔ کیا کیا پاکیزہ توجیہات ہیں۔ سبحان اللہ۔

بھاشا میں مہاراج تلسی داس جی کی کتاب رامائن عجیب و غریب نظم ہی جو بے بہا جواہرات سے مرصع ہی بالکل نیچرل اور سوشیل ہی، ایک شعر بھی ایسا نہیں جس سے اخلاقی نتیجہ نہ نکلتا ہو۔ پھر رنگ آمیزی ایسی دلکش اور شیریں ہی کہ غلو اور خلاف فطرت مبالغہ بالکل نہیں۔ الفاظ قلیل اور معانی کثیر۔ سچی روی اور سچا قافیہ۔ ٹھکا ہوا کلام حشو و زوائد سے پاک۔

جب شری رام چندر جی بالی کو مار کر اور سگریو کو راج دیکر پرورشن پہاڑ پر رونق افروز ہوئے تو آپ کے چرنوں کے پرتاب سے وہاں بہار آگئی۔ بارش ہونے لگی۔ تلسی داس جی اس کا نیچرل سین کس دلکش اسلوب سے حسب ذیل دکھاتے ہیں۔ ؎

سُندر بن کسومت ترو شوبھا   گنجت چنچریک مدھ لوبھا

حل۔ خوبصورت بن۔ خوشبو دینے والا۔ رونق دار۔ بھونرے شہد کے لالچ سے چار طرف گونج رہے ہیں۔ شوبھا اور لوبھا کتنے سچے قافئے ہیں۔

دیکھ منوہر شیل انوپا   رہے تہاں انج سہت سربھوپا

حل پرورشن پہاڑ کو عمدہ اور لاثانی دیکھکر رام چندر جی

سو بھائی رام لچھمن سمیت وہاں براجمان ہوئے۔

کندمول پھل پتر سہائے		بھئے جب تب سب پربھو آئے

حل۔ جب سے رام چندر جی براجے کندمول (وہ پھل جو زمین کے اندر اندر پیدا ہوتے ہیں) اور پھل اور پتے بافراط ہو گئے۔

مدھکر کھگ مرگ تن دھر دیوا		کریں سدھ منی پربھو کی سیوا

حل۔ تمام دیوتا رشی اور منی، بھونروں اور ہرنوں وغیرہ کے روپ میں آکر بھگوان کی سیوا کرنے لگے۔ دیوتاؤں نے اپنے شریر اس خوف سے بدلے کہ کہیں راون کو خبر نہ ہو جائے۔

منگل روپ بھئے بن تب تیں		کینہ نواس رماپت جب تیں

حل۔ جب سے رامچندر جی نے وہاں قیام کیا پہاڑ کا بن منگل کا داتا بن گیا۔

برکھا کال میگھ نبھ چھائے		گرجت لاگت پرم سہائے

حل۔ برسات کے دن آ گئے۔ بادل گرجتے ہوئے کیسے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ رامچندر جی اپنے بھائی لچھمن جی سے کہتا کہتے ہوئے فرماتے ہیں۔ دوہا

لچھمن دیکھو مورگن ناچت بارد پیکھ		گرہی برت رت ہرکھ جس بشن بھگت کنہ دیکھ

لچھمن دیکھو توموروں کے جھنڈ بادلوں کو دیکھ کر کیسے آنند ہو کر ناچتے ہیں جیسے کوئی گھرست جو بھگت کو پسند کرتا ہو رام بھگتوں (عارفوں) کو دیکھ کر خوش ہوتا ہو۔

گھن گھمنڈ نبھ گرجت گھورا		پریاہین ڈرپت من مورا

حل۔ بادل آسمان میں اُمنڈ اُمنڈ کر گرج رہے ہیں اور میرا جی پریا (جانکی جی) کی جدائی میں تڑپتا ہے۔ یہاں رامچندر جی نے اپنی عصمت کی دیوی بی بی کی محبت کا اظہار کیا ہے۔

دامن دمک رہی گھن ماہیں		کھل کی پریت یتھا تھرناہیں

حل۔ بجلی بادلوں میں چمک چمک کر رہ جاتی ہے جیسے دشمنوں کی محبت کا کچھ بھروسہ نہیں ہوتا۔

برکھیں جلد بھوم نیراے		یتھا نویں بدھ ودیا پائے

حل۔ بادل زمین کے گرد آ آ کر ایسے برستے ہیں (فروتنی کرتے ہیں) جیسے عاقل لوگ علم حاصل کرکے اور بھی منکسر المزاج ہو جاتے ہیں۔

چھدر ندی بھری چلی اُترائی		جس تھوڑے دھن کھل بورائی

حل۔ چھوٹی چھوٹی ندیاں بھر بھر اور آپے سے باہر ہو کر اُچھل اُچھل کر چل رہی ہیں جیسے کوئی بیوقوف ہیچا آدمی تھوڑا روپیہ پا کر اُچھلنے کودنے لگتا ہے۔ کیونکہ ندیوں کا پانی ادھر اُدھر سے آیا ہوا ہے ان کا اپنا ذاتی نہیں۔

دیکھئے کوئی تشبیہ ایسی نہیں جو سوشیل رزلٹ سے خالی ہو سچی شاعری اسے کہتے ہیں۔

احمد حسن شوکت

علامہ شبلی نعمانی

علامہ شبلی دور جدید کے بہترین وزندہ حکماء اسلام میں سے ہیں۔ اس پُرآشوب وقحط الرجال زمانہ میں اب یہی ایک ذات ہندوستان میں باقی رہ گئی ہے جو باقیات الصالحات اور سارے ہند کے لئے باعث افتخار ہے۔ خدا ان کو عمر صد سالہ بخشے اور ان کے فیوض علمی سے ہند کو روشن ومنور کرے، اور جن تجاویز عالیہ کی تکمیل میں وہ منہمک ہیں اُن کے پھلوں کو دیکھنا انھیں اپنی زندگی میں نصیب ہو! آمین!

سال گذشتہ میں جب شملہ پر میں ایک نہایت ہی تجربہ کار ووسیع المعلومات جرمن مستشرق کے ساتھ جو ہندوستان میں قریباً چالیس سال سے علمی کاروبار میں مشغول ہیں ملا، اور ہندوستان کے علما و مصنفین کا ذکر آیا تو صاحب موصوف نے فرمایا کہ

"علما و مصنفین ہند میں مجھے چند باتوں کی خاص کمی محسوس ہوئی ہے اوّل مادہ تحقیق و تدقیق دوّم جانچ پرتال۔ سوّم جدت۔ چہارم مضبوطی رائے واستدلال۔ علماء و مصنفین ہند کا تخیلہ تو بیشک زیادہ قوی ہے لیکن ان میں مبالغہ کی عادت ہے۔ ان کے تاریخی حکایات اور جنگی افسانے مبالغہ ومتضاد خیالوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بخلاف اسکے اہل مغرب کے دماغ منطقی استدلال اور درست الفاظ استعمال کرنے کی عادی ہیں۔ اہل مغرب کے محققانہ وعالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی دیسی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں۔ گو یہ ایک گونہ اسلامی رنگ لئے ہوتی ہیں"۔

واقعی یہ رائے نہایت منصفانہ و باوقعت ہے جن صاحبوں نے علامہ ممدوح کی بیش بہا تصانیف مثل تاریخ علم کلام، الفاروق، الغزالی، شعر العجم، موازنۂ انیس و دبیر و مجموعہ رسائل شبلی وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اُردو زبان میں یہ تصانیف بلحاظ عالمانہ ومحققانہ وفلسفیانہ استدلال و انداز کے کسی مستند یوروپی تصنیف سے کم نہیں ہیں۔ علامہ ممدوح کی تصانیف کی سب سے بڑی خصوصیت فلسفیانہ تحقیق و تدقیق مضبوطی رائے ومنطقیانہ استدلال ہے۔ ان میں ایک قسم کی اُرجنالٹی، یعنی جدت بھی ہے، اور طرز ادا میں دل آویزی و عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے۔ عالمانہ تحقیق و جانچ پرتال و جدت متقدمین ائمہ ومجتہدین کی تصانیف کے بعد اب بہت کم نظر آتی ہے۔ قریباً سات سو سال سے مسلمانوں میں سے جدت واختراع کا مادہ زائل ہو گیا ہے۔ اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک کورانہ تقلید کے کنوئیں کے مینڈک یا لکیر کے فقیر ہو رہے ہیں۔ کس قدر افسوس ہے کہ اصول ارتقاء عقل کے یہ لوگ منکر ہو رہے ہیں اور ذراسی بھی جدت وجودت کو بدعت وکفر سمجھتے ہیں۔ وہ تھوڑا سا زمانہ جس میں صرف قرآن اور عقل کا دور دورہ رہا اب تک اسلام میں طلائی دور سمجھا جاتا ہے۔ اسی آزادی کے دور میں ایسے ایسے علما و ائمہ ومجتہدین پیدا ہوئے جن کا اجتہاد آج بطور قطعی کے مانا جاتا ہے۔ حالانکہ آج بھی ویسے ہی اور شاید ان سے افضل علما ومجتہدین پیدا ہو سکتے ہیں بشرطیکہ قانون ارتقاء عقل کو مان لیا جائے اور اسپر عملدرآمد ہو۔ یورپ میں جہاں اس اصول کو مان لیا ہے، اور عقولِ انسانی کے نشوونما میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں، آج کل

کفٰی لھا بعضہم علی بعض کے مصداق علما و فضلا پیدا ہو رہے ہیں۔ اسلام کی سب سے بڑی پولیٹیکل مصیبت تو اس روز پیدا ہوئی جب کہ جمہوری حکومت کی جگہ شخصی حکومت نے غصب کر لی اور اسلام کے پولیٹیکل نظام کو بدل ڈالا۔ اس کے بعد جیوں جیوں بادشاہانِ اسلام قوی و خود مختار ہوتے گئے، انھوں نے اور بھی عقولِ انسانی کے ارتقا میں مزاحمتیں محض اپنی ذاتی اغراض کے لئے پیدا کرنی شروع کیں۔ علما کو بھی دولت و جاہ و حشم کی تزویر میں پھنسا کر اپنا طرفدار بنایا، اور علما نے عوام کو اپنی گرفت میں لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں حریت کا مادہ رفتہ رفتہ سلب ہو گیا۔ عقلی ضعف بھی آ گیا۔ قوت ارادی پست ہو گئی۔ تقلید کے بندھنوں میں جکڑ گئے۔ لکیر کے فقیر بن گئے۔ ظالم سے ظالم و فاسق سے فاسق بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ عوام کی نظر میں وہی بادشاہ و خلیفہ سب سے زیادہ مقبول ٹھہرا جو قوتِ فکر و حریت کا دبانے والا، اور شخصی و نوعی آزادی میں خلل انداز ہو۔ گو ظاہر میں مذہبی جامہ پہنے ہو۔ آج دنیائے اسلام تقلیدی و لفظی جھگڑوں میں ایسی جکڑی ہوئی ہے کہ نجات مشکل معلوم ہوتی ہے۔ جا بجا معدودے چند نفوسِ قدسی ایسے پیدا ہو چلے ہیں جو اس غلامی و ذلت اور اس کے اسباب کو محسوس کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو روحانی و عقلی نجات دلائیں جو پولیٹیکل آزادی کے ابتدائی زینے ہیں۔ علامہ مفتی عبدہ مصر میں اسی خیال کے تھے اور علامہ شبلی ہند میں ایک ایسا بڑا کام کر رہے ہیں جس کی اہمیت کا اندازہ مسلمانانِ ہند کو ۲۵ سال کے بعد معلوم ہوگا۔ کوئی شک نہیں کہ اگر علامہ شبلی اوائل اسلام کے زمانہ میں ہوتے تو آج وہ امام و مجتہدِ وقت مانے جاتے۔ کیونکہ ان میں اکثر ان خصوصیتوں کی جھلک پائی جاتی ہے جو اوائلِ اسلام کے ائمہ و مجتہدین میں پائی جاتی تھی۔ عالمانہ عبور۔ غور و خوض کی قوت۔ تحقیق و تدقیق و علمی جانچ پڑتال کی عادت۔ اپنی طبیعت سے کسی بات کا پیدا کرنا۔ پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں و خارستانوں سے نکال کر و سلجھا کر تقسیم و تحلیل کرنا اور پھر اُسے ایسے طور سے ترتیب دینا کہ وہ شے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے۔ یہ وہ خصوصیتیں ہیں جو علامہ ممدوح کو درجۂ امتیاز بخشتی ہیں۔ اسی کے ساتھ علامہ ممدوح میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم و جدید میں ایسا پیوند لگاتے ہیں کہ مطلق اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ معاملہ فہمی و دُور اندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے۔ ایسے علما تو آجکل بہت ملتے ہیں جن کی شان میں سورۂ جمعہ کی یہ آیت بالکل صادق آتی ہے کہ وہ گدھے ہیں جن پر کتابوں کا بوجھ لدا ہے۔ "چارپائے بر و کتابے چند"۔ یعنی علم کے ساتھ نہ عقل ہو نہ تحقیق و معاملہ فہمی و دُور اندیشی۔

علامۂ شبلی کی زندگی اس قابل ہے کہ دیگر علماء ہند اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کی تعلیم و تربیت بھی مثل دیگر علما کے اسی قدیم اصول و طرز پر ہوئی تھی جو ہندوستا[illegible] کے پُرانے عربی مدرسوں میں آج تک رائج ہے۔ لیکن آپ [illegible] اپنی محققانہ طبیعت و جودت سے برابر کام لیا اور لکیر کے فق[illegible] نہ بن بیٹھے کہ صرف قَالَ قَالَ کا درس دیتے اور اَقوال کے [illegible] پر فی الفور کفر و الحاد کے فتوے صادر فرماتے ھذا و ھا[illegible] و ھذا بدعتیٌ، پر اخوت اسلامی کا شیرازہ درہم برہم کر[illegible] علامۂ شبلی نے علوم اسلامی سے فراغت پا کے یونانی خیا[illegible] و جدید یوروپی علمی تحقیقات و انکشافات پر بھی نظر ڈالی ۔ ا[illegible] موازنہ کیا۔ آپ نے لفظی سطح سے مغز قرآن پر غور و خوض کر[illegible]

اصول ارتقاء عقل پر ایمان لائے۔ جوہر عقل کی فضیلت کو تسلیم کیا، اور اسی کے ساتھ اس کو ہنوز امن الخطا بھی نہیں سمجھا، کیونکہ اگر ایسا سمجھتے تو ایک طرف تو مقلد ہونا پڑتا اور دوسری طرف انانیت پیدا ہو جاتی۔ علامۂ ممدوح نے اس معاملہ میں وہی طریقۂ اعتدال اختیار کیا جو ائمہ سلف کا خاصہ تھا۔

علامۂ ممدوح کے اشغال علمی و بیش بہا تصانیف پر اگر سرسری ریویو بھی کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ ایک بڑا دفتر بن جائے۔ ہم اپنے ناظرین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ علامۂ ممدوح کی کل عالمانہ تصانیف و رسائل و مضامین و غزلیات کا مطالعہ کریں۔ ان کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت و عظمت و خوبیوں و ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ طلبا اگر انہیں پڑھیں تو اعلا درجہ کے ادیب بن جائیں۔ علما پڑھیں تو ان میں محققانہ مذاق پیدا ہو جائے۔ غیر اقوام پر ان کے مطالعہ سے اسلام کی حقیقی عظمت و خوبیاں منکشف ہوں۔ یہ کتابیں سہل پسندی۔ عام فہمی و دلآویزی و ارزانی میں بھی اپنی آپ نظیر ہیں۔

جن لوگوں کو علامۂ ممدوح سے نیاز حاصل ہے وہ ان کی اسلامی سادگی و خلوص سے نہایت متاثر ہوتے ہیں تبحر علمی پر۔ سادگی و اخلاص سونے پر سہاگا ہے۔ اور علم و سادگی و خلوص و اسلام کا دور و آپ کے کل خاندان کا شرف ہے۔ چنانچہ آپ کے بھائی مولوی حمید الدین صاحب عربک پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی میں بھی یہی اوصاف پائے جاتے ہیں، اور اسلام کا گہرا عشق اس پر مستزاد ہے۔

علامۂ شبلی کا مذاق مختلف پہلو رکھتا ہے۔ ایک طرف تو آپ کا مذاق سخت فلسفیانہ و محققانہ پہلو لئے ہوئے ہے اور واقعات تاریخی میں کسی قسم کی رنگ آمیزی آپ کو پسند نہیں۔ دوسری طرف آپ بے حد نیچر پرست واقع ہوئے ہیں۔ آپ کی فارسی غزلیات سے جذبات لطیف درد و عشق و حسن و جمال کا پتہ چلتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں جتنے انبیا و مشاہیر و حکما گذرے ہیں ان میں نیچر پرستی بے حد رہی ہے۔ کائنات کے حسن و خوبیوں میں انھیں سب سے زیادہ مزہ ملتا ہے۔ اس وقت ہم کو ان کی ایک غزل کے چند مصرعے اتفاق سے یاد آگئے جو نقل کئے جاتے ہیں۔

ہر جا کہ روے روشن تو جلوہ ساز بود　　ہر ذرہ را نظر بجمال تو باز بود
ہر جا حدیث غمزۂ ایام کردہ ایم　　روے سخن بآں نگہ فتنہ ساز بود
جانا! زبان و لب نشود ترجمان دل　　مارا امید بانگہ ہاے راز بود
ان شوخ را بصومعہ ہا چوں گذر فتاد　　یکبارہ عشق ہائے حقیقی مجاز بود
تا چرخ سفلہ صحبت آں شوخ در گرفت　　کو فتنہ دوست بود و ایں فتنہ ساز بود

غمگیں مباش گر سخن از مدعا رفت
شبلی ہنوز اوّل راز و نیاز بود

اشغال علمی و تصانیف کے ساتھ ساتھ علامۂ ممدوح نے مختلف قومی خدمات انجام دی ہیں۔ مثلاً آپ انجمن ترقی اردو کے اوّلین مربیوں میں سے ہیں۔ زبان اردو کو آپ نے بہت کچھ مالا مال کیا ہے۔ جب آپ حیدر آباد میں ناظم علوم و فنون تھے تو ایک نیا علمی دور حیدر آباد میں چمک اٹھا تھا۔ آپ ایک مشرقی یونیورسٹی کا نظام بھی بنا چکے تھے۔ صرف حضور نظام کی منظوری کی دیر تھی۔

اب علامۂ ممدوح ایک ایسے بڑے کام میں مشغول ہیں کہ اگر وہ مکمل ہوگیا تو سمجھ لینا چاہئے کہ مشرق میں ایک نیا دور

... طلوع ہوگا۔ اگر الندوہ فی الحقیقت کامیاب ہوگیا
ہندوستان کے شیعہ وسنّی وہابی وحنفی وغیرہ علماء حقیقت
اسلام کی عمارت بنانے میں متفق ہوگئے اور ہر ایک نے اپنی
ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بنائی تو ہندوستان ومشرق میں
مسلمان قوم کا ایک زندہ تاج محل بن جانا کچھ مشکل نہیں۔
دارالعلوم ندوہ ہی ایک ایسا انسٹی ٹیوشن مسلمانوں
کا ہے۔ جس پہ ٹھیٹھ اسلامی ہونے کا اطلاق ہوسکتا ہے۔
کیا عجب ہو کہ یہ ہند کا الأزہر بن جائے اور اس سے
ایک ایسی جماعت پیدا ہوجائے جو ایک طرف تو اندر
سے مسلمانوں کی کایا پلٹ کردے اور دوسری طرف ہندوستان
ومشرق میں یدخلون فی دین اللہ افواجا، کے جھنڈے
گاڑے! خدا علامۂ ممدوح کو کم از کم ۲۵ سال اور زندہ رکھے
اور چشم حاسداں سے بچائے!

جان ملکم

ہندوؤں کے مذہب پر ایک عام فلسفیانہ نظر

توحید پر اسی رسالہ میں جو مضمون اس سے پہلے شائع
ہوا ہے اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندو دراصل کسی نہ کسی
شکل میں وحدانیت کے قائل ہیں۔ اس پہ قدرتی طور پر
یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہندوؤں کے عقیدے میں
ایک ہی خدا سچ ہے اور ذات ہے تو سوائے اس کے کوئی
دوسری ذات نہیں ہے تو پھر یہ کیسے ہے کہ ہندوؤں کا مذہب
اس قدر بوقلموں اور رنگ برنگ نظر آرہا ہے۔ کوئی شاکت ہے کوئی
وشنو [illegible] اور کوئی شیو [illegible] اور کوئی کچھ اور۔ کوئی کھڑا
تلک لگاتا ہے اور کوئی آڑا اور کوئی اپنا سارا ماتھا رنگ لیتا
ہے۔ غرض جہاں دیکھو وہاں جدا رنگ نظر آتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر
مانیر ولیمس (Monier Williams) نے بھی اپنی ایک کتاب
میں اس مذہب کی نسبت حسب ذیل لکھا ہے:-
"ہندوؤں کا مذہب ایک ایسا مذہب ہے جس کی بنیاد ایک
اصلی اور سادہ مسئلہ وحدت الوجود پر قائم ہے مگر جس میں سے انواع
واقسام کے بے شمار توہمات اور عقائد کی شاخیں پھوٹیں ہیں۔ جس
طرح بڑ کے درخت کے ایک ہی تنے سے بے شمار شاخیں پھوٹتی
ہیں اور پھر ان شاخوں سے جٹائیں نکل کر زمین تک پہنچتی ہیں اور
ان جٹاؤں کے زمین میں جم جانے سے ایک بے شمار تعداد میں
نئے تنے پیدا ہوجاتے ہیں جن کی وجہ سے اصلی تنا خود اپنی شاخوں
کے گھنے جنگل میں ناپید ہوجاتا ہے، اسی طرح اس ہمہ اوست کے
مسئلہ نے ہندوؤں کے دلوں میں مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ لی ہے
اور اس سے بے شمار شاخیں نکلی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جو سیدھا
سادا اور اصلی مسئلہ تھا ان توہمات اور بیہودہ عقائد کے جنگل میں
غائب ہوجاتا ہے۔ اس مسئلہ وحدت الوجود کے مطابق وجود حقیقی
ایک ہے اور دوسرا کوئی نہیں۔ یہی وید کی صحیح تلقین ہے اور یہی صحیح علم
ہے جو ویدوں سے حاصل ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے عوام الناس
کے مذہب میں گو مسئلہ مذکور الصدر ہی نجات کا ایک سچا راستہ مانا
گیا ہے مگر اس میں علاوہ اُس کے دیگر اسفل طریقے بھی رکھے گئے

ہیں مثلاً ایک کرم مارگ ہو جس میں اعمال اور کفاروں وغیرہ کا پھل مانا گیا ہو اور دوسرا بھکتی مارگ جس میں شخصی خدا کی پرستش اور اس کے عشق کا پرچار ہو۔ اگرچہ اس مذہب کی بنیاد وید پر ہو مگر اس میں تمام مذاہب سے کچھ نہ کچھ لے لیا گیا ہو اور کچھ ایسے اشکال اس نے اپنے روبرو رکھے ہیں جو تمام اقسام کے خیال کے لوگوں کے لئے موزوں ہیں۔ وہ اول تا آخر ایک ایسا یعنی سب کچھ گوارا کرنے والا ہو یا یہ کہ سب باتوں کا تحمل ہو۔ سب کو اپنے میں شامل کرنے والا اور سب باتوں کو قبول کرنے والا ہو۔ اس کا ایک رُخ اگر روحانی ہو تو دوسرا مادی، اگر ایک قرینِ عقل ہو تو دوسرا بعید از عقل۔ ایک اگر پاک وخالص ہو تو دوسرا ناپاک وغلیظ۔ اس کی تشبیہ ہم ایک کثیر الاضلاع شکل سے دے سکتے ہیں جس کا ایک بازو اگر عملی طور پر کام کرنے والوں کے لئے ہو تو ایک سخت اخلاق پسند آدمیوں کے لئے ہو۔ ایک اور پُرجوش طبیعت کے لوگوں کے لئے اور ایک اور شہوانی طبائع کے آدمیوں کے لئے اور ایک اور فلسفائی خیال اور غور پسند طبیعت کے لوگوں کے لئے ہو۔ جن کو پابندیِ رسم پسند ہو ان کی اس میں کامل تشفی ہوتی ہو جو اعمال کے پھلوں کے منکر ہیں اور بھکتی یعنی عشقِ خدا کو اپنا اصل مقصود سمجھتے ہیں ان کو بھی ان کے احاطے سے باہر جانے کی ضرورت نہیں جن کی طبیعت شہوت پسند ہو وہ بھی اپنی خواہشات کو اس میں پورا کرسکتے ہیں اور جن کی طبیعت اس قسم کی واقع ہوئی ہو کہ ان کو "خدا کیا ہو؟ آدمی کیا ہو؟ روح اور مادہ میں کیا تعلق ہو؟" ایسی باتوں پر غور کرنا پسند ہو وہ بھی یہاں اپنی طبیعت کے موافق خیالات کی بلند پروازیوں میں مستغرق رہ سکتے ہیں۔ غرض کہ ہر قسم کی طبیعت کے لوگوں کے لئے اس میں کوئی نہ کوئی طریقہ موجود ہو اور اسی وجہ سے اس مذہب میں بے شمار تفرقے ہوگئے ہیں۔"

ایک اور جگہ پر وہی پروفیسر صاحب یہ لکھتے ہیں:۔

"قدیم ویدوں اور بودھوں کے مذہب اور اصلی باشندگان کی غیر آرین قوموں کے عقائد کے باہمی خلط ملط سے ہندوؤں کا وہ مذہب پیدا ہوا ہو جو حال میں رائج ہو۔ چونکہ ہندوؤں کے مذہب کا ایک بڑا اصول یونیورسل ٹالریشن (Universal toleration) ہو جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ سب باتوں کو گوارا کرنے والا ہو اور تعصب سے بالکل مبرا ہو اس لئے اُس نے کل اقسام کے عقائد کو اپنے میں داخل کرلیا ہو حتیٰ کہ ہندوستان کے جنگلی اور پہاڑی اقوام کے عقائد بھی اس میں شامل ہوگئے ہیں۔ اس نے سبھوں کے لئے دروازہ کھول دیا ہو اور سب اس میں داخل ہوسکتے ہیں۔ بشرطیکہ برہمنوں کی عظمت اور کھانے پینے وشادی بیاہ کے متعلق چند قواعد کی پابندی کی جائے۔"

پھر اور ایک جگہ پروفیسر مانیر ولیمس لکھتے ہیں:۔

"اور حق تو یہ ہو کہ ہندوؤں کے مذہب کا کوئی تذکرہ کامل نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ اس میں ہر مذہب اور ہر فلسفائی خیال کا ذکر نہ کیا جائے جو دنیا میں اب تک کبھی پھیلا ہو۔"

پروفیسر مانیر ولیمس نے جو تعریف ہندو مذہب کی کی ہو وہ ایک حد تک صحیح ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہند کے اصلی غیر آرین و نیز اُن بیرونی اقوام کے عقائد اس میں شریک ہوگئے ہیں جو زمانۂ متوسطا میں ملکِ ہند میں داخل ہوئے تھے اور یہی وجہ ہو کہ یہ مذہب اس قدر بوقلموں نظر آرہا ہو مگر یہاں یہ ضرور کہہ دینا چاہئے کہ یہ بوقلمونی محض اسی ایک وجہ سے نہیں ہو۔ قدیم رشی جنھوں نے اس مذہب کی بنا ڈالی تھی بخوبی سمجھتے تھے کہ انسان کے طبائع مختلف ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہو کہ کسی خاص عقیدہ

کو سب لوگ تسلیم کریں۔ طبائع کے اختلاف کے لحاظ سے طریقوں کا اختلاف عمداً جائز رکھا گیا ہے اور یہ تلقین کی گئی ہے کہ چاہے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے سالک اُس طریقہ پر چل کر منزل مقصود کو ضرور پہنچے گا دیر سے یا جلد تر البتہ کوئی طریقہ سیدھا ہے اور کوئی ٹیڑھا اُسی طرح جیسے کوئی سڑک سیدھی جاتی ہے اور کوئی چکر کھا کر مگر دونوں ایک ہی منزل کو پہنچاتی ہیں۔ طبائع انسانی تین اقسام کے دیکھے جاتے ہیں، ساتوک सात्विक راجیک राजसिक تامسک तामसिक ساتوک طبائع کے وہ صالح لوگ ہیں جو قطعاً تمام گندگیوں سے پاک ہوا و ہوس دُنیاوی سے آزاد، نیک خیال، نیک باطن، نیک رویہ، راجیک طبیعت کے آدمی تیز اور طرار کاموں کے کرنے میں مشاق ہوتے ہیں اور مغلوب الغضب اور مغلوب الشہوت، اور تامسک طبیعت کے وہ لوگ ہیں جو کامل جہالت اور کاہلی میں مبتلا رہ کر تاریکی پسند ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان تینوں خالص صفات کے آدمی بہت کم پائے جاتے ہیں۔ دُنیا میں زیادہ تر ان تینوں اقسام کے طبائع میں سے مخلوط طبائع کے آدمی ہوتے ہیں کسی میں ساتوکی جو راجیک و تامسک طبائع پر غالب ہوتی ہے کسی میں راجیک باقی دونوں پر اور کسی میں تامسک غالب رہتی ہے۔ پس ان مختلف طبائع کے لحاظ سے رشیوں نے مذہبی تفرقے رکھے ہیں، اور ہر ایک کے لئے راستے کھول دئے ہیں جن کو اختیار کرکے آدمی منزلِ مقصود کو پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً دو بڑے مارگ یعنی طریقے یہ ہیں (۱) پرورتی प्रवृत्ति مارگ۔ (۲) نورتی निवृत्ति مارگ۔ طریقہ اوّل میں تمام جائز دُنیوی لذائذ سے محظوظ ہونے کی اجازت ہے تاکہ اُن لذائذ سے سیر ہونے کے بعد حظ اُٹھانے والا شخص ان سے متنفر ہو کر جانب خُدا رجوع ہو جائے اور چونکہ ہندوؤں میں تناسخ کا ایک مسلم عقیدہ ہے اس لئے اگر اس جنم میں نہیں تو آیندہ کسی نہ کسی جنم میں وہ ضرور اس طرح لذائذ سے سیر ہونے کے بعد متنفر ہو کر جانب خُدا رجوع ہو جائے گا۔ طریقۂ دوم کو جو اختیار کرتا ہے وہ ان سب لذائذ سے دُور رہنا چاہتا ہے وہ سخت نفس کشی اور ریاضت کو اپنے اوپر گوارا کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے کو دریائے ہستی میں ملا دینا چاہتا ہے، یہ طریقہ شیوؤں शैव کا ہے جن میں جوگیوں کا ایک مشہور فرقہ ہے۔ چونکہ یہ لوگ عالم کی حقیقی ہستی کے قائل نہیں بلکہ ایک معنی میں یعنی حالت عرفاں میں وہ نابود ہی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ گویا وہ کشار क्षार یعنی راکھ ہے اس لئے یہ لوگ اپنے ماتھے پر بالعموم اور سارے بدن میں بالخصوص بھسم भस्म یعنی راکھ لپیٹتے ہیں۔ غرض کہ یہ دو بڑی تقسیم ہیں اور پھر اول الذکر تقسیم یعنی پرورتی مارگ کی اور بیشمار شاخیں پھوٹی ہیں، کیونکہ لذائذ سے محظوظ ہونے کا طریقہ گو وہ جائز ہی کیوں نہ ہو ایک طرح کا نہیں ہے۔ کوئی ان لذائذ کو تم مدعا سمجھ کر اُس نیچر کی جس سے ان کو یہ لذائذ حاصل ہوتے ہیں پرستش کرتے ہیں اور ایسے لوگ شاکت یعنی نیچر پرست کہلاتے ہیں اور کوئی ایسے ہیں جو لذائذ کو بھوگنا اپنا مدعا نہیں سمجھتے بلکہ وہ ان کو اس لئے بھوگتے ہیں کہ تا وہ ان سے سیر ہو کر اُن سے متنفر ہوں اور جانب خُدا رجوع ہوں۔ یہ لوگ ویشنو वैष्णव کہلاتے ہیں۔ مگر ویشنوؤں میں بھی دو طریقے ہیں ایک وہ جو اب بیان ہوا اور دوسرا وہ جس میں ترکِ لذائذ کی تلقین ہے۔ جن میں ترک لذائذ کی تلقین ہے وہ کہتے ہیں کہ لذائذ سے انسان کی کبھی سیری نہیں ہوتی جیسا گوسائیں تلسی داس۔

बुझै न काम अगिनि तुलसी कबहुं विषय भोग बहु घी ते

بجھے نہ کام اگنی تلسی کبہوں وشے بھوگ بہو گھی تین

یعنی یہ کہ خواہشات کی آگ حظائظ نفسانی کے گھی سے کبھی نہیں بجھتی۔ آگ پر جتنا گھی زیادہ ڈالا جائے گا وہ اتنا ہی زیادہ بھڑکے گی۔ اس طریقہ کو جس میں ترک لذائذ کی تلقین ہے بیراگ वैराग कہتے ہیں اور جس میں حصول لذائذ کی تلقین ہے اس کو انوراگ अनुराग یعنی پشٹی पुष्टि مارگ کہتے ہیں مگر عشق حقیقی دونوں کا اصل اصول ہے۔ البتہ طالب لذائذ مجازی سے حقیقی کو پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں فرقوں کے لوگ خصوص وہ لوگ جو طالب لذائذ ہیں خوشبودار چیزوں مثل صندل و گوپی چندن وغیرہ سے اپنی پیشانی کو رنگتے ہیں جس سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔

مثنوی معنوی میں یہ قصہ بیان ہوا ہے کہ کوئی چرواہا تھا جو بکریوں کا ایک بہت بڑا گلہ رکھتا تھا۔ ایک دن وہ جذبۂ عشق میں آکر خدا سے مخاطب ہو کر بہ آواز بلند یہ کہہ رہا تھا کہ اے میرے پیارے اگر میں تجھے پاؤں تو میں تیرا اسنگار کروں تجھے اچھے اچھے کپڑے پہناؤں اور اپنی بکریوں کا عمدہ سے عمدہ دودھ پلاؤں۔ یہ آواز کہیں حضرت موسیٰ کے کان میں پڑ گئی جو اُدھر سے گذر رہے تھے۔ حضرت موسیٰ خدا کے جلال کے قائل جس کا جلوہ وہ خود کوہ طور پر دیکھ چکے تھے فوراً اس چرواہے کے پاس آئے اور فرمایا کہ اے چرواہے تو کیا بے ادبی کرتا ہے، خدا کی شان میں ایسے کلمات زبان پر لاتا ہے۔ ایسے کلمات سے تو باز آ اور خبردار پھر ایسا نہ کہنا۔ وہ بیچارہ موسیٰ کے کہنے سے ڈر کر خاموش ہو گیا مگر اسی وقت موسیٰ کو یہ الہام ہوا کہ اے موسیٰ۔ ع

تو برائے وصل کردن آمدی   نے برائے فصل کردن آمدی

یہ قصہ ہندو بھگتوں کا ٹھیک فوٹو ہے۔ وشنوؤں میں جو پشٹی مارگ والے ہیں یعنی جو طالب لذائذ ہیں وہ کچھ اس کا انتظار نہیں کرتے کہ خدا اُن کے سامنے آئے بلکہ وہ اس کی ایک تصویر یا مورت کو اپنے سامنے رکھ کر دن میں کئی بار اُس کا سنگار کرتے ہیں، اچھے اچھے کپڑے و زیور پہناتے ہیں اور لذیذ کھانے اُس کے روبرو رکھتے ہیں اور اپنا تن من دھن سب اس پر قربان کرتے ہیں۔ وہ کوئی چیز اپنے لئے گوارا نہیں کرتے ہیں تاوقتیکہ وہ اُس کو بطور نذر اپنے محبوب حقیقی کے سامنے نہ رکھ دیں۔ اس کو کون نہیں جانتا کہ وہ مورت کچھ کھاتی نہیں، پہنتی نہیں، سونگھتی نہیں تاہم جذبۂ عشق ان کو ایسے حرکات کی طرف مائل کرتا ہے۔ جب عاشق کو اپنے معشوق حقیقی کے ساتھ پریم یعنی عشق کی زیادتی ہوتی ہے تو وہ جو جو باتیں اپنے لئے خوشگوار سمجھتا ہے اس کے لئے پہلے ضروری سمجھتا ہے۔ صرف یہی نہیں ہے بلکہ جو کچھ وہ کھاتا ہے اس کو وہ اپنے معشوق حقیقی کا جھوٹا سمجھ کر کھاتا ہے اور جو کچھ وہ پہنتا ہے اُس کی اُترن سمجھتا ہے۔ مگر یہ سب باتیں اسی وقت تک زیبا دیتی ہیں جب کہ عشق میں پوری پوری محویت ہو گئی ہے ورنہ یہ سب کھیل ہی ہیں۔ اور نہایت ذلیل حرکات میں داخل ہیں۔ ایسے لوگوں میں وہ لوگ جو اصل حقیقت کو پہچان گئے ہیں اس طرح کی پوجا کر کے بھی یہ بخوبی جانتے ہیں کہ جس کی وہ پوجا کر رہے ہیں اس کو ایسے چڑھاوے وغیرہ کی ضرورت نہیں وہ ان سب باتوں سے مبرا ہے جیسا کہ کسی سنسکرت شاعر نے چند اشلوکوں میں ظاہر کیا ہے کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

کون سی جگہ ہے جہاں وہ موجود نہیں پھر اس کا آواہن یعنی بلانا کیسا، جو سب کا آدھار یعنی سہارا ہے اس کو کیا آسن دیں، وہ جو بالکل پاک صاف ہے اُس کے پاؤں کیا دھوئیں، اور اس کو کیا ارگھ دیں، جس میں کوئی میل نہیں، اس کو اشنان کیا کرائیں، اور جو ایک عالم کو اپنے میں ڈھانپے ہوئے ہے اُس کو کپڑے کیا پہنائیں، جس کی کوئی حد یا انتہا نہیں، اُس کو جنیؤ کیا پہنائیں جو کسی سے چھوا نہیں جاسکتا اس کو گندھ یعنی خوشبو کیا سنگھائیں، وہ جو خود حسن مجسم ہے اُس کے لئے زیور کی کیا ضرورت ہے نیوید [illegible] یعنی کھانے وغیرہ اس کے سامنے رکھنے کی کیا ضرورت ہے جو ہمیشہ ترپت तृप्त یعنی سیر ہے۔ جو غیر محدود ہے اس کا طواف کیا معنی رکھتا ہے، اور جو ذات لاشریک ہے اس کی ڈنڈوت کیا ہو سکتی ہے، اس کی تعریف میں کیا مناجات کی جاسکتی ہے جس کی تعریف کرنے میں وید بھی عاری ہے۔ جو ہر جا حاضر و ناظر ہے اُس کی آرتی کیا کی جاسکتی ہے، غرض اس طرح خداوند حقیقی کی سب سے اعلیٰ پرستش برہم کے جاننے والوں کو کرنا چاہیئے۔"

ہندوؤں کے مذہب کی نسبت ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ متضاد باتوں سے بھرا ہوا ہے یعنی یہ کہ کہیں تو ایک چیز کی تعریف کی گئی ہے اور پھر دوسری جگہ اُسی چیز کی مذمت کی گئی ہے مگر واضح رہے کہ جو باتیں متضاد معلوم ہوتی ہیں وہ فی الحقیقت متضاد نہیں ہیں اس کے حل کی دو کنجیاں ہیں ایک یہ کہ ودھی विधि و نشیدھ निषेध یعنی اجازت و ممانعت ہے اور پرشنسا प्रशंसा و نندا निन्दा یعنی تعریف و مذمت دو علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں جن باتوں کی اجازت وید یا شاستر میں ہے وہ ہمیشہ جائز ہی سمجھی جاتی ہیں اور جن باتوں کی ممانعت ہے وہ ہمیشہ ممنوع ہی سمجھی جاتی ہیں یعنی جو اوامر ہیں وہ اوامر رہیں گے اور جو منہیات ہیں وہ منہیات سناکاری ممنوع ہے کبھی جائز نہیں ہو سکتی۔ پھر چند باتیں ایسی ہیں جن کی کہیں تعریف کی گئی ہے اور کہیں مذمت مثلاً شادی کرنا اور بچے پیدا کرنا ایک جائز فعل ہے اس کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اکثر جگہ اس کی تعریف کی گئی ہے اور زور دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شادی کرکے بیٹا پیدا نہ کرے گا تو وہ اور اس کے اجداد بہشت سے گر جائیں گے۔ دوسری جگہ جہاں معرفت کا ذکر ہے اور جہاں اس بات پر زور دیا دیا گیا ہے کہ تمام دنیاوی علائق سے کنارہ کشی کرنا چاہیئے، وہاں عورت کے ساتھ تعلق رکھنے کی مذمت بدرجۂ غایت کی گئی ہے، چاہے وہ جائز ہو یا ناجائز۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ شادی کرنا اور بچے پیدا کرنا ممنوع ہے، مگر اُس کے نزدیک جس کو معرفت مطلوب ہے یہ ایک مذموم بات ہے۔ جہاں معرفت کا ذکر ہے وہاں بُت پرستی ایک مذموم بات سمجھی جاتی ہے مگر جن کی روحانی حالت ابھی گھٹی ہوئی ہے اُن کے لیئے صرف اس کی اجازت ہی نہیں ہے بلکہ تقید ہے۔ دوسری کنجی ادھکار अधिकार اور اندھکار अनधिकार کی ہے یعنی یہ کہ قبل اس کے کہ کوئی تلقین کسی کو کی جائے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے اس تلقین کے لیئے استحقاق پیدا کیا ہے یا نہیں یا یہ کہو کہ وہ ظرف کیسا ہے جس میں فلاں علم جائے گا۔ ظرف کے لحاظ سے اپدیش کرنا چاہیئے، اگر اس کا لحاظ نہیں کیا گیا تو وہ اپدیش یعنی تلقین بیکار جاتی ہے اور اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا مُضر اثر پڑتا ہے۔ ظرف ہی کے لحاظ سے صفائی یا غیر صفائی خدا کے متعلق تلقین کرنے کی ہدایت شاستروں میں ہے ظرف ہی کے لحاظ سے برت یعنی روزہ رکھنے کی ہدایت ہے یعنی یہ کہ

کس کو برت بغیر کھانے یا پینے کے رکھنا چاہیئے اور کس کو پھل وغیرہ کھالینا چاہیئے۔

پروفیسر مانیر ولیمس کا یہ کہنا پورا پورا صحیح نہیں ہے کہ اصل اصول ہندو مذہب کا مسئلہ وحدت الوجود کی تلقین ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ جیسا سابق کے مضامین میں بتایا گیا ہے زمانۂ قدیم سے اس ملک میں مختلف عقائد رہے ہیں اور ان مختلف عقائد کی فلاسفی میں بھی فرق ہے۔ کوئی صفات کے قائل تھے اور کوئی ذات اور صفات دونوں کے اور کوئی صرف ذات کے اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ عقائد کیا ہیں۔

(۱) ایک وہ لوگ ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ ہمکو صرف صفات کا علم ہوتا ہے جس کو ذات کہتے ہیں۔ اس کا ہمکو کوئی علم نہیں ہے اور اس لئے اس کے وجود کو ماننا فضول ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمکو صرف تغیرات کا علم ہے کسی غیر متغیر شئے کا ہم کو علم نہیں اور اس لئے ہم اس کے وجود کے قائل نہیں ان لوگوں میں بودھ مذہب کے لوگ شریک ہیں چونکہ یہ لوگ صرف صفات کے قائل ہیں اس لئے وہ صرف ظاہری چیزوں کو سچا جانتے ہیں اور اس وجہ سے وہ نہ خدا کے قائل ہیں اور نہ روح کے۔ یہ لوگ قطعاً اہل ظاہر کہے جا سکتے ہیں صرف لفظ ہی کے قائل ہیں معنی کے نہیں۔

(۲) وہ لوگ ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ ہر چیز کی ذات بھی ہے اور اس کے صفات بھی ہیں یعنی یہ کہ وہ ہر چیز کی ذات اور صفات دونوں کے علحدہ علحدہ وجود کو تسلیم کرتے ہیں یہ ذات وصفات آپس میں ایسے ملے ہوئے ہیں کہ ایک دوسرے کے بغیر خیال نہیں ہو سکتا ذات کا خیال بغیر صفات کے نہیں ہو گا اور صفات کا خیال بغیر ذات کے نہیں ہو گا۔ یہ عقیدہ اُن لوگوں کا ہے جو روح کو الگ اور خدا کو الگ سمجھتے ہیں اور دونوں کو موصوف با صفات جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی چیز کا بغیر صفات کے رہنا ناممکن ہے چونکہ یہ لفظ اور معنی اور ذات او صفات دونوں کے قائل ہیں اس لئے یہ نیم اہل ظاہر اور نیم اہل باطن ہیں۔

(۳) وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ صرف ذات ہی سچی ہے اس کے اگر کوئی صفات ہیں تو وہ ظاہری ہیں فی الواقع ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ان کے نزدیک ذات اور صفات کوئی دو جدا جدا شئے نہیں ہیں۔ ہم کو ایک وقت میں ایک ہی چیز کا علم ہے اگر ہم کو ذات کا علم ہے تو صفات غائب ہو جاتے ہیں اور اگر صفات کو ہم دیکھتے ہیں تو ذات کا خیال جاتا رہتا ہے۔ یہ عقیدہ فرقۂ وحدت الوجود کا ہے ان لوگوں کے نزدیک صرف ایک ہی ذات ہے اور صورتیں بہت ہیں اور ایک ہی ذات صفات میں ظاہر ہو کر مختلف صورتیں دکھاتی ہے۔ یہ قطعاً اہل باطن ہیں اور معنی کے قائل ہیں لفظ کے قائل نہیں بقول شخصے لفظ بگزاری سوے معنی روی۔

غرض کہ ان تین مختلف عقائد پر سیکڑوں مذہبی فرقے ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے چلے آرہے ہیں جس وقت شری شنکر اچارج کا ظہور ہوا ایک طرف تو بودھوں کا زور تھا اور دوسری طرف جو ہندو باقی رہے تھے وہ بھی مختلف فرقوں میں منقسم تھے اور یہ بھی آپس میں جھگڑتے تھے کہ ہمارا معبود تمہارے معبود سے زیادہ مقتدر ہے گویا ہر ایک کے معبود ایک دوسرے سے علحدہ علحدہ ہیں۔ شری شنکر اچارج نے جو ہندوؤں میں سب سے بڑے فلاسفر مانے گئے ہیں مسئلہ وحدت الوجود کو سامنے رکھ کر ان مختلف فرقوں کو

اس کی غرض سے ہر کسی کو یہ ہدایت کی کہ لفظ یا صورت پرست مت بنو۔ اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔ لفظ کے پرے جو معنی ہیں یا صورت کے پرے جو ذات ہے، وہی ایک حقیقت ہے جس کا اصلی وجود ہے، وہی ایک حقیقت ان مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے جن کو تم مختلف ناموں سے پوج رہے ہو۔ پس تم سب مل جاؤ اور بے فائدہ لفظ یا صورت کے پیچھے مت جھگڑو۔ اگر تم کو پوجنے ہی کی خواہش ہے تو جس صورت میں چاہو اس کو پوجو لیکن اگر کوئی اور کسی دوسری صورت میں اس کو پوجتا ہے تو اس کو یہ سمجھ کر برا مت کہو کہ وہ بھی وہی ذات ہے جس کو تم اپنی قبول کی ہوئی خاص صورت میں پوج رہے ہو۔ غرض اس طرح پر انہوں نے اسمارت [illegible] مذہب کو قائم کیا جو اب تک چلا جاتا ہے اور یہی ایک مذہب ہے جو ویدوں کی اصل تلقین کے مطابق ہے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ آیا ہندوؤں کا مذہب ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہا ہے یا اس میں کچھ تغیرات بھی ہوئے ہیں۔ مخفی نہ رہے کہ ہندو مذہب کی دو اوستھا یعنی حالتیں ہیں ایک گیان اوستھا یعنی حالت عرفاں جس کو پرمارتھک اوستھا یعنی حقیقت بھی کہتے ہیں اور دوسری اگیان اوستھا یعنی حالت عدم عرفاں جس کو ویوہارک اوستھا یا تعینات بھی کہتے ہیں۔ گیان اوستھا کا اصل اصول توحید مطلق ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل نصف اشلوک سے ظاہر ہے

ब्रह्म सत्यं जगत्मिथ्या जीवो ब्रह्मैव नापरः

کہ یہ معنی ہیں کہ برہم [illegible] یعنی ذات مطلق ہی سچ اور عالم جھوٹا ہے اور جس کو جیو یعنی روح کہتے ہیں وہ درحقیقت برہم یعنی ذات مطلق ہی ہے۔ یہ ذات مطلق نرگن اور نراکار ہے یعنی صفات اور جسم کے خیالات سے وہ بالکل مبرا ہے۔ جس وقت گیان یا اعلیٰ درجہ کی بھگتی سے کسی کو یہ علم ہو کہ میں ذات مطلق ہوں، اس سے الگ نہیں ہوں تو اس وقت اس کو تمام قیود سے رہائی ہو کر مکتی یعنی نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی تلقین شرتیوں [illegible] میں کی گئی ہے جو اٹل ہیں اور جن میں کوئی تغیر واقع نہیں ہو سکتا۔

اب رہی اگیان اوستھا جس کو ویوہارک [illegible] اوستھا یعنی تعینات بھی کہتے ہیں۔ اس کے اصل اصول یہ ہیں۔

(۱) وحدانیت خدا یعنی معبودیت و عبودیت کے امتیاز کے ساتھ خدا الگ ہے اور روح الگ ہے، خدا ایک ہے اور روحیں بے شمار۔ وہ جو درحقیقت نرگن و نراکار ہے ایشور یعنی شخصی خدا ہو کر ظاہر ہوتا ہے جو سگن و ساکار ہے یعنی موصوف بہ صفات ہے اور جسم کے خیال سے بھی مبرا نہیں۔ یہی ایشور بہ لحاظ اپنے صفات کے تین روپوں میں ظاہر ہوتا ہے جن کو شیو، وشنو اور برہما کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

(۲) عقیدہ اوتار بخلاف دیگر مذاہب کے جن میں یہ مانا گیا ہے کہ جب ضرورت ہوتی ہے انسان کی ہدایت کے لئے انبیا وغیرہ خدا کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں یہ مانا گیا ہے کہ خود خدا ہی نیکوں کی حفاظت اور بدوں کے قلع و قمع کے لئے یا یوں کہو کہ جو جمال کے قائل ہیں ان کو اپنے جمال اور جو اس کا جلال دیکھنا چاہتے ہیں ان کو اپنے جلال کا درشن دینے کے لئے اور نیز انسان کی ہدایت کے لئے جامۂ انسانی میں ظاہر ہوتا ہے جس کو اوتار کے نام سے ملقب کیا گیا ہے۔

(۳) عقیدۂ تناسخ یعنی یہ کہ روح بہ نتیجۂ عذاب و ثواب مختلف قالبوں میں چکر کھاتی رہتی ہے۔

(۴) ویدک کرموں کا کرنا مثلاً سندھیا کرنا، جگ کرنا، شرادھ کرنا، اگنی ہوتر کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام باتوں کی تلقین وید اور شاستر دونوں میں کی گئی ہے اور یہی اٹل ہیں ان میں بھی کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔ البتہ یہ باعث بندھن یعنی قیودات مزور ہیں اور ان عقائد کے رکھنے یا ان کاموں کے کرنے سے مکتی نہیں مل سکتی۔

غرض یہ اصلِ اصول مذہب ہر دو اوستھاؤں کے ہیں اور ان پر کُل فرقے متفق ہیں سوائے اس کے کہ مکتی یعنی نجات کے متعلق باہم اختلاف ہے جس کا ذکر صراحت کے ساتھ سابق کے مضامین میں کیا گیا ہے۔ یہ وہ عقائد ہیں جن میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے، اب رہے فروعات مذہب جن کا ذکر اسمرتیوں اور پُرانوں میں ہوا ہے، ان میں ہر زمانہ میں تغیر ہوتا رہا ہے اور زمانہ کے لحاظ سے ہی اسمرتیاں بنی ہیں۔ ان فروعات میں یہ چند باتیں زیادہ تر قابل لحاظ ہیں۔

(۱) چونکہ ہر شخص کے طبائع جدا جدا ہیں اس لئے ہر شخص کو اپنی طبیعت کے لحاظ سے پرستش کے کسی ایک طریقہ کو اختیار کرنا چاہیئے اور ایشور کے مختلف روپوں میں سے اُس کے کسی ایک روپ کی پرستش یا عبادت کرنا چاہیئے یعنی یہ کہ پہلے یہ تصفیہ کرنا چاہیئے کہ ہمارا اشٹ इष्ट کیا ہونا چاہیئے۔

(۲) ایشور کو چھوڑ کر پرتیک اوپاسنا प्रतीक उपासना کہاں تک جائز سمجھی جاسکتی ہے۔

(۳) پرتما پوجن یعنی بُت پرستی کہاں تک جائز ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بہ لحاظ اختلاف طبائع جو ایک کا اشٹ ہے اور دوسرے کا اشٹ نہیں ہوسکتا کیونکہ خدا کی نسبت جس کسی نے اپنا کوئی خاص آئیڈیل Ideal قرار دیدیا ہے، ممکن ہے کہ وہ دوسرے کا نہ ہو۔ مثلاً جو شخص خدا کے جلال کا قائل ہے اس کا آئیڈیل ضرور اس کے آئیڈیل سے جدا ہوگا جو اس کے جمال کا قائل ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اسی پر اکتفا نہیں کی گئی کوئی اپنے آئیڈیل کو دوسرے کے آئیڈیل پر ترجیح دیتا ہے اور لڑنے جھگڑنے کے لئے مستعد ہوجاتا ہے۔ مثلاً کسی کے اشٹ دیو بھگوان وشنو विष्णु ہیں۔ وہ اس بات کو بھول کر کہ بھگوان وشنو اور بھگوان شیو शिव دونوں ایک ہی ذاتِ مطلق یا ایشور کے دو علٰحدہ علٰحدہ روپ یا مظہر ہیں اس شخص سے جھگڑتا ہے جس کے اشٹ دیو بھگوان شیو ہیں اور یہ کہتا ہے کہ میرے اشٹ دیو تمہارے اشٹ دیو سے بڑھ کر ہیں تمہارے اشٹ دیو یعنی شیو میرے اشٹ دیو یعنی بھگوان وشنو کے داس یعنی غلام بلکہ جیو یعنی روح ہی ہیں۔ البتہ ان کو بھگوان وشنو کی عبادت سے وہ مرتبہ ملا ہے جو ان کو حاصل ہے۔ اشٹ اشٹہ کے اس جھگڑے نے ہندوؤں کے مذہب میں وہ خرابیاں پیدا کردی ہیں جو آپ دیکھی جارہی ہیں۔ اور یہ محض اس لئے کہ بھگوان وشنو بھگوان شیو سے بڑے ہیں یا بھگوان شیو کو بھگوان وشنو پر ترجیح حاصل ہے۔ نئے نئے پوران بنادئے گئے ہیں اور قدیم پورانوں میں بھی تحریفات کی گئی ہیں جن کا تفصیل سے ذکر کرنا اس لئے مناسب نہیں سمجھا جاتا کہ ناحق کوئی بحث نہ چھڑ جائے۔ چونکہ برہما کے اوپاسک یعنی پوجنے والے کوئی نہیں ہیں، اس لئے بیچارا برہما باقی دونوں کا داس یا فرمانبردار ہی مانا گیا ہے۔

پُرانوں میں جو ایک کی بڑائی اور دوسرے کی مذمت جائز رکھی گئی ہے اس کے متعلق مصنف وچار ساگر کا یہ کہنا ہے چونکہ کُل پورانوں کے بنانے والے

[illegible] اس سے ان کا مقصد کسی ایک پوران میں وشنو اور [illegible] شو کی نندا کرنے سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وشنو یا شو [illegible] ترک کر دی جائے۔ اگر یہی مراد ہوتی تو وشنو وشیو دونوں کی [illegible] ترک ہو جاتی۔ ایک کی بڑائی اور دوسرے کی مذمت [illegible] کرنے سے ان کا اصل مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ جو کوئی اِشٹ इष्ट اختیار کیا جائے اس میں پوری پوری مصروفیت اور محویت ہو جائے ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو۔

شُدھ برہم [illegible] ہم اس سے پہلے یہ تعریف کر آئے ہیں کہ وہ نرگن و نراکار ہے یعنی نام و روپ اور جسم وغیرہ کے تمام خیالات سے بالکل پاک و صاف ہے اور جس کو جیو کہتے ہیں وہ فی الحقیقت برہم ہی ہے، اس سے الگ نہیں، لیکن جب جیو اودھیا میں جیو کو یہ پرتیت یعنی محسوس ہوا کہ میں برہم سے الگ ہوں تو پھر دو علیحدہ علیحدہ وجودوں کی ہستی کو ماننا پڑا۔ ایک ویشٹی व्यष्टि میں یعنی بحیثیت افراد جیوؤں کی ہستی جس کی کوئی تعداد مقرر نہیں کی جا سکتی اور دوسری سمشٹی समष्टि میں یعنی بحیثیت کل ایشور کی ہستی جو صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ بلحاظ طبائع تین گنوں کی ہستی مانی گئی ہے، ستوگن، رجوگن، تموگن جب ستوگن باقی دو گنوں پر غالب رہتا ہے تو اس کو شُدھ ستوگن کہتے ہیں اور جب یہی ستوگن باقی دونوں سے دبا ہوا رہتا ہے تو اس کو مَلِن ستوگن کہتے ہیں۔ یہ تینوں گن مایا[1] کے ہیں شُدھ मलिन ستوگن کے ساتھ مایا میں جو عکس شُدھ برہم یعنی چیتن चेतन کا ہے وہ عکس مع مایا اور اس کے ادھشٹھان अधिष्ठान چیتن کے ایشور نام سے موسوم ہوا اور مَلِن ستوگن کے ساتھ ویشٹی اگیان کے اس میں اُسی چیتن کا عکس مع اگیان اور اگیان کے ادھشٹھان چیتن کے جیو کہلایا۔ مخفی نہ رہے کہ سمشٹی समष्टि کے معنی کُل اور ویشٹی व्यष्टि کے معنی جزو یا افراد کے ہیں، سمشٹی میں جس کا نام مایا माया ہے ویشٹی میں اسی کا نام اگیان ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ مایا میں شُدھ ستوگن پردھان یعنی غالب رہتا ہے اور اگیان میں مَلِن ستوگن۔ مایا میں شُدھ ستوگن کے غالب رہنے کی وجہ سے ایشور سروگیہ सर्वज्ञ ہے یعنی عالم الغیب، کیونکہ شُدھ ستوگن کی خاصیت پرکاش یعنی نور کی ہے اور اسی لئے ایشور ہمیشہ مُکت ہے یعنی جینے اور مرنے سے پاک ہے۔ برخلاف اس کے اگیان میں مَلِن ستوگن کے پردھان رہنے سے جیو الپگیہ अल्पज्ञ ہے یعنی اس کا علم محدود ہے اور وہ جینے اور مرنے کے بھی تابع ہے شُدھ ستوگن کے ساتھ یہ مایا جس میں چیتن کا عکس پڑ کر اس چیتن चेतन کا نام ایشور ہوا اس ایشور کا کارن شریر ہے اور مَلِن ستوگن کے ساتھ اگیان جیو کا کارن شریر ہے۔ اور پانچ عناصر لطیفہ من، بدھی، چت، اہنکار، پانچ کرم اندریہ اور پانچ گیان اندریہ اور پانچ پران یہ سب مل کر جیو کا سوکشم सूक्ष्म یعنی جسم لطیف ہے اور کُل جیوں کے سوکشم شریر مل کر ایشور کا سوکشم شریر ہے اور کُل استھول स्थूल برہمانڈ یعنی تمام کائنات ایشور کا استھول شریر ہے۔ ایشور کے کارن شریر کے ابھمانی अभिमानी کا نام ایشور یعنی شِو ہے اور اس کے سوکشم شریر کے ابھمانی کا نام جس میں کارن شریر بھی انترگت ہے ہرنیہ گربھ हिरण्यगर्भ یعنی برہما اور اس کے استھول شریر کے ابھمانی کا نام جس میں کارن و سوکشم شریر دونوں انترگت ہیں وراٹ विराट یعنی وشنو ہے۔ یہ بموجب سدھانت مت کے ہے لیکن ویشنو لوگ اس ترتیب کو اُلٹا کر دیتے ہیں اور ان کے

[1] لفظ مایا اس تمام مضمون میں انگریزی لفظ فِنومِنا Phenomena کے معنی میں مستعمل ہوا ہے یا مایا ہو اگیان گیا ہے اس کے متعلق انشاء اللہ ایک بسیط مضمون کبھی لکھا جائے گا۔

نزدیک وشنو ایشور ہی جو کارن شریر کا ابھمانی ہی- غرض کہ ذات تو ایک ہی ہی لیکن ابھمان کے لحاظ سے روپ اور نام علحدہ علحدہ ہیں- پیدائش عالم کے وقت ایشور یعنی شیو سے ہی تمام شرشٹی نکلتی ہی اور پہلے سوکشم اور پھر استھول ہو کر ظاہر ہوتی ہی اور پرلے प्रलय کے زمانے میں استھول سے سوکشم ہو کر بالآخر اسی شیو یعنی ایشور میں لے लय یا فنا ہو جاتی ہی- غرض کہ ان تینوں شریروں کا ابھمانی ایک ہی ہی، البتہ بہ لحاظ اختلاف مدارج[۱] اور نہ کہ بہ لحاظ اختلاف نوعیت اسی ایک کے تین غلاف یعنی ابھمان ہیں لیکن اس پر بھی پہلا دوسرے کے انترگت ہی- اور پہلا اور دوسرا تیسرے کے انترگت ہی- شرشٹی کے ہو جانے کے بعد ان کارن و سوکشم و استھول شریروں یعنی تمام برہمانڈ یا عالم کا مالک وہی ایک وشنو نام سے موسوم ہوا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کل عالم کو تھامے ہوئے ہیں اور اسی سے سنسکرت میں انکا ایک نام استھتی स्थिति بھی ہی، جس کے معنی قیوم کے ہیں اور پرلے प्रलय کے وقت جب تمام شرشٹی شیو یعنی ایشور میں لے یعنی فنا ہو جاتی ہی، وہی ایک کارن شریر کا مالک ایشور یا شیو نام سے باقی رہتا ہی اب اُن لوگوں سے جو ہندوؤں کو تثلیث پرست کہتے ہیں ہمارا یہ سوال ہی کہ ہندو در حقیقت موحد ہیں یا تثلیث پرست-

اب دیکھنا چاہیئے کہ ہندوؤں کے مذہب میں جو خرابیاں اب پائی جا رہی ہیں اُن کے اسباب کیا ہیں- ان میں سے ایک بڑا سبب تو وہی اشٹ نشٹ کا جھگڑا ہی جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہی لیکن اس کے علاوہ دو اور بڑے اسباب ہیں جن کا ذکر مختصراً ذیل میں کیا جاتا ہی-

(۱) پرتیک اُپاسنا प्रतीक उपासना اور پرتیما پوجن کا زیادہ تر رواج ہونا- لفظ پرتیک کے معنی کسی کو کسی سے نزدیک پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں پرتیک اوپاسنا سے مراد ان اشخاص کی پرستش ہی جن کے فیضان برکت سے قرب خدا حاصل ہو سکتا ہی یعنی دیوتاؤں سادھو سنتوں اولیا وغیرہ کی پرستش- البتہ حالت ابتدائی میں اس قسم کی پرستش یا مورتی پوجا بُری نہیں ہی، لیکن اگر عمر بھر یہی رہی تو البتہ اس شخص کی حالت پر افسوس کرنا چاہیئے جو اس میں مصروف ہو- زمانۂ حال میں زیادہ تر اسی پرتیک اپاسنا اور مورتی پوجا کا رواج ہی اور اس سے روحانی حالت کو جیسی کچھ ترقی ہو سکتی ہی ظاہر ہی-

(۲) ہندوؤں کے مذہب کی خرابی کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہی کہ ایک طرف تو برہمنوں میں قناعت کی صفت باقی نہ رہی اور دوسری طرف اُن کے ججمانوں نے اُن کی طرف سے ہاتھ کھینچ لیا- زمانۂ قدیم میں برہمنوں کے لئے یہی شغل رکھا گیا تھا کہ وہ وید پڑھیں اور پڑھائیں، جگ کریں اور کرائیں اور علم و فضل کو ترقی دیں- ان کی پرورش ان کے ججمانوں یعنی چھتریوں اور ویشیوں سے متعلق تھی- اس زمانہ میں ان کو بھکشا کی کمی نہ تھی اور نہ اس کا لوبھ تھا کہ وہ بھکشا سے زیادہ جو اُن کی پرورش کے لئے ضروری ہو دھن دولت جمع کریں- اب ججمانوں کا یہ حال ہی کہ مفت بھکشا دینا تو جدا، اگر کوئی کرم بھی برہمنوں سے کرایا جاتا ہی تو اس کی پوری دکشنا بھی ان کو نہیں ملتی ہی مثلاً اگر کوئی ججمان سرادھ کرنا چاہتا ہی یا کوئی کتھا کہلانا چاہتا ہی تو سرادھ کرانے والے یا کتھا کہنے والے برہمن کو دکشنا صرف دو چار آنے دی جاتی ہی یا کتھا میں آٹھ آنہ یا روپیہ زیادہ سے زیادہ چڑھا دیا جاتا ہی جو اس کے عیال و

۱ - لفظ مدارج یہاں انگریزی لفظ Stages کے معنی میں مستعمل ہوا ہی-

اطفال کی پرورش کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہو کہ برہمن اپنے آبائی پیشے کو چھوڑ کر دوسرے دھندھوں کا آسرا لیتے ہیں جن کی وجہ سے علم و فضل اُن سے رُخصت ہو جاتا ہو یا یہ کہ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ججمان ان کی طرف سے ہاتھ کھینچ رہے ہیں تو وہ کمائی کی دوسری ترکیبیں اختیار کرتے ہیں، چنانچہ اُنھوں نے اپنے ججمانوں سے روپیہ اینٹھنے کے طرح طرح کے ایسے اختراعات کئے ہیں جن میں اُنھوں نے اُن ججمانوں کو پہلے سے بھی زیادہ جکڑ بند کر دیا۔ آج ججمان کے گرہ اچھے نہیں ہیں، یا اُس کے بچے کے لئے فلاں گرہ بھاری ہو اُس کا جاپ کرا دیا جائے نہیں تو موت کا خوف ہو۔ بیچارہ برہمن اس طرح کچھ تو لے ہی مرتا ہو جو اس کو دوسری حالت میں کبھی نہیں ملتا۔ کتھا میں شوڈس ماتر کاؤں اور نوگرہ کی اسی لئے پوجا کرائی جاتی ہو کہ اس طرح کچھ پیسے تو اور چڑھوا لئے جائیں گے۔ سرادھ میں ویدی پر چھ رِتوؤں کی پوجا جو بالکل غیر متعلق معلوم ہوتی ہو، صرف اسی لئے کرائی جاتی ہو کہ کم سے کم چھ پیسے تو اور چڑھوا لئے جائیں۔ تیرتھوں میں جہاں لوگوں کے اجتماع کا ایک بہت بڑا مقصد یہ ہو کہ علم و فضل کے متعلق خیالات کا باہمی تبادلہ ہو پنڈے لوگ بے طرح اپنے ججمانوں کو لوٹتے ہیں جس کی کیفیت اظہر من الشمس ہو۔ دوسری طرف ججمانوں کا یہ حال ہو کہ ناچ وغیرہ میں سیکڑوں روپیہ خرچ کر دیں گے لیکن کفایت کریں گے تو پروہت کی دکشنا میں اگر ججمان پہلے کی طرح برہمنوں کی پرورش کا خیال رکھتے اور برہمن بھی برہمن بنے رہتے تو شاید یہ نوبت پہنچتی۔ غرض برہمنوں اور ان کے ججمانوں دونوں کے قصور سے ہندو مذہب کی وہ خستہ و خراب حالت ہو رہی ہو جو ناگفتنی ہو اور جس کی اصلاح کی بظاہر کوئی امید نہیں ہو گیان بھکتی اور کرم کانڈ ان تینوں طریقوں میں کیسی اعلیٰ فلاسفی ہو اس کے متعلق میرے بسیط مضامین اسی رسالہ میں شائع ہو چکے ہیں اس لئے اور زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

پربھو لال

انگلستان سے ہم کیا سیکھ سکتے ہیں؟

پروفیسر میکس مولر نے اپنے ایک لکچر کے دوران میں کمال فصاحت و بلاغت کے ساتھ یہ بتایا تھا، کہ یورپ کی مسیحی اقوام، ہندوستان سے کیا کچھ سیکھ سکتی ہیں؟ مگر آج تک کسی نے یہ نہ بتایا کہ ضرورتِ زمانہ کو مدِّنظر رکھ کر، ہم ہندوستان والے انگلستان سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟

سنیئے! سب سے اوّل اور سب سے اعلیٰ درجہ کا سبق جو ہم اہلِ انگلستان سے سیکھ سکتے ہیں، وہ ایک ایسی خود غرضی ہو، جو سارے نیشن کے ساتھ مجموعی طور پر علاقہ رکھتی ہو۔ انگریز ہیں تو بہت ہی خود غرض، مگر ان کی یہ خود غرضی کسی شخصِ واحد کی ذات کے ساتھ تعلق نہیں رکھتی، بلکہ وہ قومی خود غرضی ہو۔ ہمارے خیال میں اس کا نام "مہذب خود غرضی" زیادہ موزوں ہو۔ اور یہ ہمیں صرف انگلستان ہی

کے مسیحی باشندگان سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی نے بھی آج تک دعویٰ نہیں کیا کہ انگریز خود غرض نہیں ہیں، وہ خود بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ برعکس اس کے، ہندوستان میں یہ بات کہیں نظر نہیں آتی یعنی وہ مجموعی صورت میں "خود غرض" نہیں ہیں۔ مانا کہ ان میں کوئی اکّا دُکّا منفردانہ صورت میں خود غرض ہو مگر مجموعی طور پر دیکھو گے، تو اہلِ ہند کے طریقِ معاش و معاد کی لغت میں اس کا کہیں نام نہ پاؤ گے۔ ان کو تو ابتدا ہی سے یہ سکھایا گیا ہے کہ "یہ دُنیا گذشتنی و گذاشتنی ہے، یہاں کے دھندوں میں اپنے آپ کو نہ پھنساؤ۔ جہاں تک ممکن ہو اُس عالم سے دل لگاؤ، جہاں ابدالآباد تک بے خوف و خطر رہنا ہوگا۔" دوسری طرف انگلستان والے اپنی ساری لیاقت سارا زور، ساری قوت، سارے خیال، اسی میں صرف کرتے ہیں، کہ جہاں تک ہو سکے اس دُنیا میں بیش۔ الت کی ترقی کریں۔ کیا ہی اچھی بات ہو، اگر برادرانِ ملک اہلِ انگلستان کی زندگیوں کا مطالعہ کریں۔ اگر مغرب کے تقدس مآب قسیسانِ اعظم کے رنگ میں ہمارے ہاں کی گہری اخلاقی فطرت رنگی جائے، تو ممکن ہے کہ ہم بھی اپنی حیثیت کو قائم رکھ سکیں

انگریزوں کی مجموعی یا قومی خود غرضی اور دنیا داری سے بالکل ملتی جلتی ان کی حبّ الوطنی ہے۔ قدیم سنسکرت زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو Patriotism کا ہم معنی قرار دیا جا سکے، یا کھینچ تان کر اس کے مفہوم کو اس کے قریب قریب کہا جا سکے، اور نہ ہی اب تک کوئی ایسی بڑی ضرورت محسوس ہوئی، جس کے دفعیہ کے لئے کوئی نیا لفظ تراشا جاتا۔ اس Patriotism (پیٹریٹ ازم) کے مفہوم کی کچھ کچھ جھلک یہاں کے دیہاتیوں میں ضرور پائی جاتی ہے، مگر وہ بھی عام طور پر نہیں۔ کیونکہ زمانۂ قدیم میں ہندوستانیوں کو کسی ایسی مشکل کا سامنا نہیں ہوا تھا جس کے مقابل میں انھیں خیال ہوتا کہ حبّ الوطنی بھی کوئی شے ہے۔ یہ اپنی ہی بساط کے مطابق بازی بدتے، اور اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے تھے۔ پروفیسر شلر Schiller نے کیا خوب کہا ہے۔

دُنیا کے جملہ امور کا دارومدار صرف بھوک اور محبت پر ہے

قدیم زمانہ میں اگر کہیں حبّ الوطنی کی ضرورت ہوئی ہوگی، تو صرف بھوک کے لئے اور بس۔ برعکس اس کے محبت کا یہ عالم تھا، کہ مہاتما بدھ کی تعلیم میں نہ صرف بنی نوع انسان تک ہی محبت کو محدود کیا گیا، بلکہ کھلے طور پر بتایا گیا کہ باغِ آفرینش کا کوئی گل بوٹا اس جوہر سے خالی نہیں۔ گلستانِ ہستی کے جن پھول پتے کو چاہو گے، وہی تمہارے دل کو لبھائے گا۔ چنانچہ ان کا یہ خیال ہمارے دانایانِ فرنگ کی رائے میں ان کی حبّ الوطنی یا روز افزوں ترقی کی راہ میں سدِّ سکندری سے کم نہیں۔ کیونکہ یہ بھی خود غرضی کی ایک قسم ہے، جس کا تعلق کسی فردِ واحد کی ذات سے نہیں بلکہ سارے نیشن کے ساتھ ہے۔ انھیں جب اپنے قومی مفاد کا خیال آتا ہے، تو وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس سے کسی کے گلے پر چھری تو نہیں پھرتی، کوئی مرے یا جئے، گر وہ اپنے قومی مفاد کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ انگریزی حبّ الوطنی کے اصول پر کلائیو، وارن، ہیسٹنگز، ڈلہوزی سب کے سب "محبانِ وطن" تھے، کیونکہ انہوں نے اپنے وطن و اہلِ وطن کو متموّل بنانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ چونکہ اب وہ نہ پہلے کی سی رسمیں ہیں، نہ وہ باتیں ہیں، اس لئے یہ سمجھو کہ اب وہ زمانہ آگیا ہے جس میں اہلِ ہند کو مغرب کی مسیحی اقوام سے حبّ الوطنی کا سبق سیکھنا چاہیے۔

[illegible] بلکہ دُنیا کی ہوا دیکھ کر اگر ہندوستانی اپنے دلوں میں اس محبت الوطنی کا خیال پیدا کریں، تو انھیں کافر، مرتد اور ملحد قرار دے کر، صرف برادری سے خارج کیا جائے بلکہ اُن کا خون مباح قرار دیا جائے اور انھیں کشتنی و گردن زدنی سمجھا جائے۔ اُس صورت میں کچھ بنے تو بنے، ورنہ کوئی اور صورت نظر نہیں آتی۔

ڈین رمزے Dean Ramsay کہتے ہیں:—

"محبت الوطنی کی بدولت آدمی کے دل میں اچھے اچھے خیال پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ یہ اُسے اپنے دیس کی بھلائی اور ترقی پر آمادہ کرتی ہی۔ واجب التکریم بزرگوں کے زانو بہ زانو بیٹھنے والوں کو چاہیئے، کہ اپنے میں اچھی اچھی خصلتیں پیدا کریں۔ یہی وہ بات ہی، جس سے آج کل کی دُنیا والوں میں ایک خاص جوش پیدا ہو سکتا ہی کیونکہ یہاں قدم قدم پر ہزاروں قسم کی گتھیاں ہیں جن کے سُلجھانے کے لئے بہت کچھ دل و دماغ چاہیئے..... محبت الوطنی، ایک ایسا اصول ہی جس کا فائدہ کسی شخص واحد کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا۔ خواہ لوگ طرح طرح کی باتیں سُنائیں، بُرا بھلا کہیں، نکّو بنائیں، "خود غرض قوم" نام رکھیں، غرض کچھ ہی ہو کسی سے ڈرنا نہ چاہیئے۔

الغرض ضرورت کے وقت ہندوستانیوں کو بھی اس قسم کی محبت الوطنی کے جوش کی ضرورت ہی، جس میں گویا عقل مفقود ہو۔ یہ ایک بڑا بھاری سبق ہی، جو ہم انگلستان سے سیکھ سکتے ہیں۔

ایک اور بات جو انگلستان کی بدولت ہمیں حاصل ہو سکتی ہی، وہ ہیرو ورشپ یا مشاہیر پرستی ہی۔ انگریزوں کی قوم اپنے ہاں کے اولوالعزم بہادروں کی عزت کرنے والی قوم ہی۔ وہ اپنے ہاں کے نبرد آزماؤں، بہادروں اور ناموروں کی اُن کی زندگی ہی میں اُن کی عزت کرتے ہیں، اور مرنے کے بعد ان کی یادگار قائم کرتے ہیں۔ اور ایک ہم ہیں، جو اس بات سے واقف ہی نہیں، کہ اپنے بزرگوں کی کیسی عزت کریں۔

مسٹر کارلائل Carlyle اپنی کتاب "ماضی و حال" میں کہتے ہیں:—

"ہیرو ورشپ کیا ہی؟ بہادروں کی سچی عظمت و عزت کا، اور نیز ان کے کارناموں کا خالصہ اعتراف۔ دُنیا کے ہر زمانہ میں بنی نوع انسان کی معاشرت ایک ایسی چیز ہی جس سے ذرا سی غور کے بعد انسان کی زندگی کے لئے بہت کچھ عمدہ سبق مل سکتے ہیں۔

دُنیا میں جس قدر بڑے آدمی ہو چکے ہیں، وہی قوم کے لیڈر کہلاتے ہیں، اُنکے اوضاع و اطوار اور نشست و برخاست کا لوگوں پر خاص اثر پڑتا ہی۔ یہی بزرگ اُس خاص خیال کے پیدا کرنے والے ہوتے ہیں، جن پر عوام الناس کے لئے چلنا لابدی ہی..... لہذا چاہے بڑے آدمیوں کی سوانح عمریاں کیسی ہی کیوں نہ ہوں، اُن سے کچھ نہ کچھ خاص سبق ضرور ملتا ہی"۔

دیکھیئے انگلستان کی طرف۔ اس ملک کے جن بزرگوں نے کوئی نہ کوئی کام کیا ہی، لوگ اُن کے حسنِ خدمات کے صلہ میں اُن کی یادگاریں اور مجسّمے قائم کرتے ہیں، یا ایک ہم ہیں جو اپنے بزرگوں کے کارناموں کا کچھ خیال نہیں کرتے!

انگلستان دُنیا میں سب سے زیادہ متموّل ملک ہی۔ اس کی مادی ترقی کا مدار، اس کی اپنی صنعت و حرفت ہی محدود نہیں بلکہ یہ کہ اس کا اسباب تجارت ممالک غیر میں

جا سکتا ہے۔ برعکس اس کے ہندوستان دنیا میں افلاس کے باعث شہرت ارباب ہے۔ اگرچہ یہاں معدنی اور نباتاتی اشیا کا ذخیرہ بکثرت ہے، مگر روپے کی کمی کچھ کرنے نہیں دیتی۔ ملک دولت مند ہو تو اہل ملک کو بھی کچھ فائدہ پہنچے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ فلاکت و غربت کا باعث کارخانہ داران انگلستان ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ بالکل سچ ہے۔ یہاں کی قدیم دستکاریوں کو جس طرح خاک میں ملانے کی کوشش کی گئی، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

علاوہ ازیں ہندوستان کے متمول کچھ ایسے عقل کے دھنی ہیں، کہ اپنا روپیہ کارخانوں میں لگانا نہیں چاہتے، مگر اس کی وجہ صاف ہے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مینچسٹر اور ڈنڈی کے محبان وطن ہندوستان کی سن اور روئی کی دستکاریوں کو بھی ضرور تباہ کریں گے، اور اپنے عندیوں میں اسی طرح کامیاب ہوں گے جیسا کہ اگلے زمانہ میں ہو چکے ہیں لارڈ لارنس فرماتے ہیں:۔

"اگر سرکار اہل ہند کے فائدہ کی کوئی بات کرتی ہے یا کرنا چاہتی ہے تو عجب مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک عام شور برپا ہوتا ہے، جس کی آواز پر انگلستان والے اور بھی زیادہ چلّاتے ہیں"

نپولین اعظم کی رائے میں انگریزی قوم ایک مہاجنی فرقہ ہے۔ ان سے یہ امید رکھنا کہ یہ ہندوستانیوں کو اپنے یہاں اور دیگر ضروریات مہیا کرنے کی توقع دلائیں گے، بالکل غلط ہے۔ وہ کس طرح آپ اپنا گلا کاٹ سکتے ہیں۔ ان مشنریوں اور انگلو انڈین اصحاب کو، جو ہندوستانیوں کی نسبت یہ کہا کرتے ہیں، کہ ان میں کوئی خاص جوہر نہیں ہے، کم ازکم یہ کوشش تو کرنی چاہیئے کہ غریب ہندوستانیوں کو اپنے ہاں کے کارخانوں اور دستکاریوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے۔ مگر ان سے ایسی امید رکھنا فضول ہے۔ تاہم ہمیں بیدل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر حب الوطنی کے کچھ معنی ہیں، تو ہمیں چاہیئے کہ اپنے ملک کی مصنوعات کی قدر کریں۔ یہی وہ گر ہے جس سے ہندوستان پھر ایک دفعہ تجارتی ملک ہو سکتا ہے۔

انگریزی قوم سے ہر شخص ویسا ہی دانائی کا سبق حاصل کر سکتا ہے، جیسا بنین کے مشہور ہیرو ورلڈلی وائز مین (ابن الوقت) سے۔ انگلستان والے غیر ملکی باشندوں کے ساتھ خواہ کیسے ہی مل جل کر رہیں اور ارتباط دکھائیں، مگر جب کبھی اپنے ہموطنوں کے ساتھ مقابلہ ہوتا ہے تو دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ آؤ! ہم بھی اُن سے یہی سبق حاصل کریں اور اپنے اہل ملک کے ساتھ مل کر قومی ترقی کے ساعی ہوں، اور ایک دوسرے کا گلا نہ کاٹیں۔

یہ وہ باتیں ہیں جو ہم اہل انگلستان سے سیکھ سکتے ہیں، اور آج کل انہیں کی ہم کو ضرورت ہے۔

انشاے اُردو - اس نام کی ایک دلچسپ کتاب منشی سید محمود علی صاحب نے اُن خطوط سے مرتب کی ہے جو مسٹر تہور ایڈیٹر رسالہ الحجاب کو ان کے دوست احباب نے کسی زمانہ میں لکھے تھے ان میں بعض ہندوستان کے قابل اہل الرائے اور مشہور شاعر ہیں یہ خطوط گھریلو طور پر لکھے گئے تھے جو اب بازار میں لائے گئے ہیں بعض بیگمات کے خط نہایت دلچسپ ہیں خطوط کیا ہیں اُردو علم ادب کی جان ہیں، ان میں جو دل کے سچے جذبات اور بے تکلف گفتگو۔ انتہائے سلاست کے ساتھ ہے وہ عمدہ سے عمدہ مضمون میں نہیں پیدا ہو سکتی۔ قیمت فی جلد ۸؍ ۔ دفتر رسالہ الحجاب موتیا پارک ۔ ریاست بھوپال سے مل سکتی ہے۔

بڑی بہن

(۱)

ایک دن موضع شیوگنج میں شام کے وقت کئی عورتیں ایک نیم کے نیچے باتیں کر رہی تھیں۔ تارا نے ایک ایسے خاوند کا ذکر کرتے ہوئے جس نے اپنی بیوی کو محض اس لئے ڈنڈوں سے مارا تھا کہ وہ بلا اُس کی اجازت کے گنگا نہانے چلی گئی تھی غصے کے ساتھ کہا "ایسے آدمی کے مُنہ میں آگ لگ جائے"!

یہ سُنکر عورتیں سناٹے میں آگئیں۔ کسی نے ہاتھ سینہ پر رکھ لیا۔ کسی نے دانتوں سے زبان دبائی۔ تارا کو یہ کہنا مناسب نہیں تھا۔ کندن نے تیوری بدل کر کہا "تارا بہن! تم زبان سنبھال کر بات نہیں کرتیں۔ اپنا شوہر تھا۔ مارہی بیٹھا تو کیا ہوا"۔

کندن جگ گوپال چودھری کی بیوی تھی۔ بابو جگ گوپال دُنیا کے اُن چند خوش قسمت آدمیوں میں تھے جنھیں بغیر ہاتھ پیر ہلائے دونوں وقت لقمۂ تر کھانے کو مل جاتا ہے۔ وہ سال بھر میں ایک بار لگان وصول کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلتے تھے۔ باقی سال بھر وہ اپنے دالان میں بیٹھے گپ شپ کیا کرتے۔ مگر یہ گاؤں اُن کی موروثی ملکیت نہیں تھی۔ موروثی جائداد تو بابو مدن گوپال مرحوم کے زمانہ ہی میں خورد بُرد ہو چکی تھی۔ جگ گوپال کے خُسر نے انھیں تکلیف میں دیکھکر یہ گاؤں گذارہ کے لئے دیدیا تھا۔ وہ اس کے علاوہ ہر مہینہ میں اپنے داماد کی امداد کرتا رہتا تھا۔ جگ گوپال کی خوب آرام سے کٹتی تھی۔ اور آیندہ کے لئے انھیں کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ بوڑھا سُسر لاولد تھا۔ اُس کے آنکھ مُوندتے ہی بیس ہزار سالانہ نفع کی جائداد ہاتھ لگے گی۔

ایسے خوش نصیب آدمی دُنیا میں کتنے ہوتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جگ گوپال اپنے سُسر کی مبارک موت کے خواستگار تھے۔ مگر سال میں دو تین بار وہ اس روزِ سعید کی آرزو میں ستیہ نارائن کا پاٹ ضرور کرواتے تھے۔

خیر! جگ گوپال کے دس سال بڑے آرام سے گذرے۔ تین بچے ہوئے۔ پیٹ نے گنبد نما صورت اختیار کی۔ چاندی کے بال جھڑنے لگے۔ خوش قسمتی کے آنے کا راستہ صاف ہونے لگا۔ مگر آنا کسے تھا۔ اور آئی کون! جو بات نہ ہونی چاہئے تھی وہ ہو گئی۔ اور اُس نے جگ گوپال کا مستقبل سیاہ کر دیا۔ ساٹھ برس کے سن میں بوڑھے خسر کے ایک بچہ پیدا ہو گیا۔ جگ گوپال نے سُنا اور سر پیٹ کر رہ گئے۔ کندن نے بوڑھے باپ کو خوب جی بھر کر کوسا۔ اور اس طفلِ نوزائیدہ کی لاش دیکھنے کی تمنا ظاہر کی۔ کہنے لگی بوڑھا ساٹھ برس کا ہوا مگر ابھی ہوس نہیں گئی۔ اب اُسے گلے سے باندھیں۔ سیاہ تند بیٹی تھی! خود غرضی! وائے خود غرضی!

اس بچے نے جگ گوپال کی بے فکریوں اور عیش پرستیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اپنی ننھی سی مٹھی سے اس نے جگ گوپال کی ساری امیدیں اور آرزوئیں۔ حوصلے اور ارمان مسل ڈالے۔ سسرال سے نوید آیا۔ مگر وہ شریک نہ ہو سکے۔ انھیں اب اپنی روزی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ آسام چلے گئے۔ اور ایک چائے کے کارخانہ میں ملازمت کر لی۔ زندگی میں پہلی بار اتنا دور دراز سفر کرنا پڑا۔ وہ اب تک کبھی تنہا نہیں رہے تھے۔ بیوی اور بچے اُن کی زندگی

کاپٹرو بن گئے تھے۔ کئی ماہ تک اُن کی طبیعت نہ جمی۔ مگر جوں جوں دن گذرتے گئے توں توں گھر کا خیال کمزور ہوتا گیا۔ سال بھر مشکل سے گذرا ہوگا کہ جگوپال کے دل میں ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ اور وہ یہ تھا کہ اب گھر کی حالت سدھارنی چاہئے۔ محبت کی جگہ ارادوں نے چھین لی۔ پہلے ہفتہ وار خطوط جاتے تھے۔ پھر پندرھویں دن جانے لگے۔ یہاں تک کہ دوسرا سال گذرتے گذرتے یہ نوبت ہوگئی کہ مہینے میں ایک خط لکھنے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔

مگر کندن کی کیفیت اس کے بالکل برعکس تھی۔ جگوپال سے اُسے وہی محبت تھی جو عام طور پر بیویوں کو ہوتی ہے۔ یعنی شوہر کی خدمت دل و جان سے کرتی تھی۔ وہ محبت جو دل کو بےچین کرتی ہے۔ جو آنکھوں کو رُلاتی اور جگر کو تڑپاتی ہے۔ وہ پُرجوش جذبہ جو دل کے کل احساسات پر حاوی ہو جاتا ہے کندن کو نہیں تھا۔ وہ کبھی اپنے شوہر سے الگ نہیں ہوئی تھی۔ اور اس لئے اُن احساسات سے، اُن حسرتوں سے جو کچھ فراق ہی میں اپنا زور دکھاتے ہیں وہ مانوس نہیں تھی۔ رشتۂ محبت میں گانٹھ تھی۔ مگر ڈھیلی۔ لیکن جُدائی کے اس جھٹکے نے اس گانٹھ کو مضبوط کر دیا۔ محبت کی آگ جو دبی ہوئی پڑی تھی جدائی کی ہوا پا کر بھڑک اُٹھی۔ کندن کے دل میں ایک نئی اور پرجوش محبت نے عود کیا۔ وہ اکثر خاموش اور اُداس رہنے لگی۔ تنہائی سے اُس کی طبیعت مانوس ہونے لگی۔ کبھی کبھی اکیلے میں رویا کرتی۔ خطوط زیادہ پُرشوق ہونے لگے۔ وہ سوچتی بلا سے مجھے موٹے کپڑے پہننے پڑیں گے۔ میں گاڑھا پہنوں گی۔ بلا سے مجھے تکلیف ہوگی۔ میں تکلیف سہوں گی۔ کندن اگرچہ کئی بچوں کی ماں تھی۔ مگر اس وقت اُس کے دل میں ایک نشۂ شباب کی متوالی نازنین کا جوش محبت اُمڈنے لگا۔ اس کو کتنی ہی ایسی باتیں یاد آتی تھیں جو اُس نے جگوپال کا دل دکھانے کے لئے کہی تھیں۔ کتنی بار وہ اُن سے روٹھی تھی کتنی بار اُن سے لڑی تھی۔ ان باتوں کو یاد کرکے وہ روتی تھی اس نے سچے معصومانہ جوش کے ساتھ اپنے دل میں عہد کیا کہ اب میں اُنھیں کچھ نہ کہوں گی۔ وہ جیسے رکھیں گے ویسے ہی رہوں گی!

(۲)

بڑھاپے کی اولاد بہت پیاری ہوتی ہے۔ اس نوزائیدہ بچہ نے جس کا نام نونی چندر رکھا گیا تھا اپنے بوڑھے ماں باپ کی قسمت جگا دی۔ اُن کی محبّت چاروں طرف سے سمٹ کر اُس پر جم گئی۔ وہ لڑکا نہیں تھا۔ اُن کی مدت العمر کی دعاؤں اور آرزوؤں نے انسانی شکل اختیار کر لی تھی۔

مگر بوڑھے ماں باپ کی تقدیر میں بچے کا سُکھ دیکھنا نہیں بدا تھا۔ تیسرے سال اُس کی ماں بیمار پڑی۔ اُسے معلوم ہوا کہ اب میں نہ بچوں گی۔ تب اُس نے کندن کو بلوایا۔ کندن جانے سے ضرور انکار کر دیتی۔ کیونکہ اُسے اب اپنے ماں باپ سے نفرت ہوگئی تھی۔ مگر اُن دنوں شیوگنج میں پلیگ پھیلا ہوا تھا۔ کندن کو انکار کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

کندن کی ماں اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور خوب روئی۔ باپ نے ہزاروں دعائیں دیں۔ مگر مکان کی مہریاں اور لونڈیاں اس مہمان کو دیکھ کر جل گئیں اور اس کی طرف طنز آمیز نگاہوں سے دیکھتیں۔ اکثر اُس سے بے ادبی کر بیٹھتیں۔ مہری کہتی اب کوئی کہاں تک پانی بھرے۔ دن بھر پانی ڈھوتے ڈھوتے کولھا رہ جاتا ہے۔ مہراجن کہتیں یہ لڑکے جانے کہاں کے

مرجھا سکے ہیں۔ چولھا جلا نہیں کہ سب آ کے گھیر لیتے ہیں۔ کندن یہ سب تکتی اور پی جاتی۔ اپنی ماں کی تکلیف دیکھ کر اس کا دل کچھ کچھ پگھل گیا تھا۔ آخر ایک روز بوڑھی عورت کی حالت بہت نازک ہوگئی۔ اُس نے نونی چندر کا ہاتھ پکڑ کر کندن کے ہاتھ میں دیا۔ اور روتی ہوئی دُنیا سے سدھار گئی۔

ماں کے مرتے ہی کندن کے مزاج میں ایک خوش آیند تبدیلی واقع ہوئی۔ نونی چندر سے جو اُسے نفرت تھی وہ جاتی رہی۔ اُس مرجھائے ہوئے یتیم بچّے کو دیکھ کر اُسے اُس پر ترس آتا۔ جب اُس کے اپنے لڑکے نونی کو مارتے۔ اور وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے آتا۔ اور "جی جی" کا آنچل پکڑ کر فریاد کرتا تو کندن کا کلیجہ مسوس اُٹھتا تھا وہ نونی کو بڑے جوش کے ساتھ گود میں اُٹھا لیتی۔ اور کلیجہ سے چمٹا کر پیار کرتی۔

کندن کے مزاج میں یہ تبدیلی کیوں واقع ہوئی۔ شائد اس لئے کہ بوڑھی ماں نے بچّے کو اس کے سپرد کیا تھا۔ یا ممکن ہو کسی کے خیال نے نفرت پر فتح پائی ہو۔ بہرحال کندن اب اپنے بھائی کو اپنے بچّے سے زیادہ چاہنے لگی۔ نونی کی فریادیں اب اکارتھ نہ جاتیں۔ اگر کبھی طفلانہ مناقشات میں نونی ہی جسارت کرتا تو بھی کندن اسے سزا نہ دیتی۔ نونی کو روتے دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا تھا۔ اور بچّہ بھی اُس سے کچھ ایسا ہلا کہ اپنی ماں کو بھول گیا۔

تین مہینے کے بعد کندن کا باپ بھی مرا۔ اُس نے اپنی وصیت میں جگ گوپال کو نونی کا سرپرست قرار دیا۔ اور گذارہ کے لئے اُسے ایک گانوں بھی دیا۔ کندن اب اُس گھر کی مالک ہوئی۔ اور نونی اُس کے دل کا۔

جگ گوپال خبر پاتے ہی آسام سے چلے آئے۔ اور زمینداری کا انتظام کرنے لگے۔

(۳)

جگ گوپال اب پہلے کا سا بے فکر۔ آزاد وضع آدمی نہ تھا۔ اب وہ شاطر۔ معاملہ فہم۔ دُنیادار بابو بن گیا تھا۔ اُسے روپیہ کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ اور ہر دم اسی دُھن میں رہتا۔ پردیس میں اُس نے خوب کمایا۔ اور خوب خرچ کیا۔ چائے کے باغوں میں ناجائز نفس پرستیوں کے بے شمار موقعے ہیں۔ ان سے اُس نے خوب دل کھول کر فائدہ اُٹھایا۔ خلاصہ یہ کہ اُس کے مزاج میں اب چھچھورا پن آگیا تھا۔ اور کندن جیسی سیدھی۔ بھولی عورت جس کی نگاہوں نے سامنے تاکنا نہیں سیکھا تھا اب اُس کے دل کو قابو میں نہ رکھ سکتی تھی۔ اُس نے ایک عرصۂ دراز کے بعد اپنے شوہر کو پھر پایا تھا۔ اور اُس کی دل جوئی و خاطرداری میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرم ہوگئی تھی۔ مگر جوں جوں وہ نزدیک آنے کی کوشش کرتی۔ توں توں جگ گوپال اُس سے دُور بھاگتا تھا۔

جگ گوپال نے پہلے ہی دن سے نونی چندر کے ساتھ منافرت کا برتاو کرنا شروع کیا۔ اُس کی طرف دیکھتا تو نفرت کے ساتھ۔ بات کرتا تو ترش لہجہ میں۔ کندن بھائی کی محبت میں شوہر کو اپنا شریک بنانا چاہتی۔ لیکن اگر وہ کبھی اُسے گود میں لے کر جگ گوپال کے پاس چلی جاتی تو وہ نفرت سے مُنہ پھیر لیتا۔ کچھ دنوں تک غریب کندن نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح جگ گوپال کے دل میں صفائی ہو جائے۔ مگر آخرکار اُسے معلوم ہو گیا کہ اُس نے نونی کا قصور اب تک نہیں معاف کیا۔ اور نہ اب اس کی توقع تھی۔ اور وہ قصور کیا تھا؟ پیدا ہونا!

پہلے جب کبھی نونی اور اُس کے بھانجوں میں جنگ ہوتی
تو کندن ہمیشہ اپنے یتیم بھائی کی طرف ہوا کرتی۔ اس لئے ان کو
نونی کے ساتھ سختی سے پیش آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مگر اب
عدالت کا رُخ پلٹ گیا تھا۔ نئے منصف نے آکر نیا قانون جاری
کیا تھا۔ جو فریاد کرتا تھا اُسی کی سزا ہوتی تھی۔ جب کبھی جگوپال
نونی کو مارتے اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے
آہستہ آہستہ کندن کے پاس آتا تو وہ اُسے گود میں اُٹھا
لیتی۔ اور مکان کے کسی گوشہ میں جاکر خوب روتی۔ اور جب تک
نونی اُسے چپ نہ کراتا رویا کرتی۔ جوں جوں جگوپال نونی
کے ساتھ زیادہ بے رحمی کرتے توں توں کندن کے دل
میں اُس کی محبت زیادہ ہوتی۔

جگوپال کو نونی کا رونا اور بولنا مثل بخار سا چڑھ آتا
تھا۔ اور جس وقت وہ نیند میں ہوتے اس وقت تو نونی کی
زبان کا کھلنا گویا شامت کا آنا تھا۔ جب وہ سوتے تو کندن
بھائی کو گود میں لے کر سب سے اونچی منڈیر پر پرے جاتی۔ اور
اُسے تھپک تھپک کر لوریاں سُناتی اور سُلاتی۔ اسی بنا پر کبھی
کبھی جگوپال کندن کو بھی سخت سُست کہہ بیٹھتا تھا۔ درگا پوجا
میں اُسنے اپنے لڑکوں کے لئے ریشمی کپڑے بنوائے۔ مگر نونی
کے لئے معمولی کپڑے بھی نہ بنوا سکا۔ کندن اپنے بیکس بھائی
پر یہ ظلم دیکھتی اور دل ہی دل میں پل کھا کر رہ جاتی۔ نونی اُس
سے اس قدر مل گیا تھا کہ وہ دونوں وجودوں میں اب کوئی فرق
نہ باقی رہا تھا۔ کندن کے دل میں اب جگوپال کی عزت روز
بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ وہ اُسے شتبہ نگاہوں سے دیکھتی۔ وہ
کبھی نونی کو اُس کے پاس تنہا نہ رہنے دیتی۔ اس قدر بدگمان ہوگئی
تھی! وہ اس معاملہ میں باوجود لی کوشش کے جگوپال
کے ساتھ وفاداری کا برتاؤ نہیں کرسکتی تھی۔

جگوپال بھی کندن کی جانب سے حد درجہ بدظن ہوگیا
تھا۔ پہلے وہ نونی کو اپنی خواب زندگی کا پریشان کرنے والا
سمجھتا تھا۔ اب کندن کو۔ کندن ہی اُس راستہ میں ایک کانٹا
تھی جو اُسے دولت و ثروت کی طرف لے جا رہا تھا۔ اُسے
اپنی بیوی سے اب مطلق ہمدردی نہ تھی۔ کندن کے دل میں بھی
ایک معما تھا جو اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

(۴)

بھیادوج کی تقریب آئی۔ کندن نے آج برت رکھا۔
آج کے لئے اُسنے پہلے ہی سے تیاریاں کر رکھیں تھیں۔ نونی
کے لئے اس نے گلابی رنگ کا ریشمی کوٹ۔ نیلے کنارے کی
دھوتی۔ سُنہرا ریشمی دوپٹہ منگا رکھا تھا۔ صبح اُس نے نونی
کو اپٹن سے ملا۔ نہلایا۔ کپڑے پہنائے۔ اور دستور کے
موافق اُس کے ماتھے پر دہی اور چاول کا ٹیکہ لگا دیا۔ نونی
خوش رنگ کپڑے پہنے گاؤں میں کھیلتا پھرتا تھا۔ صاف
تارا بھی کسی کام سے اس گاؤں میں آگئی تھی۔ یہاں طرح طرح
کے چرچے ہو رہے تھے۔ تارا نے سُنا اور غصہ میں بھری ہوئی
کندن کے پاس آکر بولی "بہن! یہ کیا سوانگ رچی ہو۔ دکھاوے
کے لئے تو نونی کا ایسا لاڈ پیار ہے۔ مگر گھر بھر اُس کی جان کا
گاہک ہو رہا ہے۔ سونے کے کٹور میں زہر ملا کر دے رہی ہو"
کندن نے غصہ سے کہا۔ "تارا۔ برس برس کے
دن ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو۔"

تارا نے جواب دیا۔ "میں کوئی بات اپنے من سے
بنا کر تھوڑے ہی کہتی ہوں۔ گاؤں میں جو کچھ سُنا ہے وہ تم
سے آکے کہہ دیا۔ جس کی بدولت تمہیں ساری دُنیا کا سکھ

مل سا ہو اُسی کے لیے اب کانٹے بوئے جا رہے ہیں۔ شیخوپورہ
میں میرے تمہارے بھانجے کھرد گوپال کا نام چڑھا دیا گیا ہے۔
بہت سے علاقوں میں ایسی ہی چالیں چلی جا رہی ہیں۔ مگر یاد رکھو
ایسی دولت کبھی ہضم نہیں ہوتی۔ ایشور سب دیکھتا ہے۔"

کندن رونے لگی۔ جب جگ گوپال گھر میں آئے تو اس
نے یہ ذکر چھیڑا۔ جگ گوپال بولے۔ "میں تو چاہتا تھا کہ یہ بات تمہارے
کان تک نہ پہنچے۔ مجھے خود بڑا دھوکہ ہوا۔ بات یوں ہو کر میں نے
شیخوپورہ کا انتظام کھردو کے سپرد کر دیا تھا۔ مگر کھردو نے
سرکاری لگان باقی ڈال دی۔ اور جب وہ گاؤں نیلام
پر چڑھا تو اُسے اپنے نام سے خرید لیا۔ مجھے بھی تو کل معلوم
ہوا ہے۔"

کندن۔ "تو تم عذر داری کیوں نہیں کرتے؟"

جگ گوپال۔ "عذر داری سے اب کوئی کام نہ چلے گا۔ علاوہ اسکے
اپنے بھانجے سے مقدمہ بازی کرنا بدنامی کی بات ہے۔
لوگ ہنسی اُڑائیں گے۔"

کندن کو اطمینان نہیں ہوا، وہ سمجھ گئی کہ یہ سب چالیں نونی
کے تباہ کرنے کے لئے چلی جا رہی ہیں اس کی عقل اب کچھ کام
نہ کرتی تھی۔ عورت ان معاملات کو کیا سمجھے۔ میں کیسے نونی
کو بچاؤں۔ کیا بیکسوں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ کیا دنیا میں کوئی
انصاف کرنے والا نہیں ہے۔ کوئی مجھے کلکٹر صاحب کے پاس
لے چلتا تو میں اُن سے سب حال کہہ سناتی۔ مجھے خود جانا
چاہئے۔ میں بڑے لاٹ تک فریاد لے جاؤں گی۔ مگر
نونی پر ظلم نہ ہونے دوں گی۔

۵

اس کے کچھ دنوں بعد نونی بیمار پڑا۔ برسات کے
دن تھے۔ چاروں طرف ملیریا پھیلا ہوا تھا۔ نونی بھی اُس کا
شکار ہوا۔ تین دن بخار نہ اُترا۔ اور نہ بچے نے آنکھیں کھولیں۔
گاؤں میں ایک بید جی تھے۔ وہ دونوں وقت آتے اور
دوا دیتے۔ مگر اُن کی دواؤں سے مطلق افاقہ نہ ہوا۔ چوتھے
دن کندن نے جگ گوپال سے کہا" جا کر شہر سے ساردا بابو
کو لے آتے تو اچھا ہوتا۔ نونی کا بخار اب تک نہیں اُترا۔

جگ گوپال نے لاپروائی سے کہا۔ ساردا بابو
جانے شہر میں ہیں یا نہیں۔ ابھی دو چار روز اور بید جی کی دوا
کھلاؤ"

کندن۔ "بید جی کی دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اور اُس
کی حالت خراب ہوتی جاتی ہے۔"

جگ گوپال۔ "ابھی کُل تین ہی دن تو بخار آیا ہے۔"

کندن۔ "تم ذرا چل کے اُسے دیکھو تو۔ کیا پیلا ہو گیا ہے۔"

جگ گوپال۔ "اچھا کل میں ڈاکٹر بابو کے پاس جاؤں گا۔"

جگ گوپال سویرے اُٹھے۔ اور دن بھر غائب رہنے
کے بعد شام کو خبر لائے کہ ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔
کہیں مفصل میں گئے ہیں۔ کندن کو شوہر کی باتوں پر یقین
نہ آیا۔ رات کو جب سب سو گئے تو اس نے نونی کو گود میں
لیا۔ گاؤں سے ملی ہوئی سارد ندی بہتی تھی۔ گھاٹ پر آکر
ایک کشتی کرایہ کی۔ اور بارہ بجے وہ ڈاکٹر صاحب کے مکان
پر پہنچی۔ ساردا بابو اس کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ دیکھتے ہی پہچان
گئے۔ کندن کو اس حالت میں دیکھ کر اُنھیں بہت رنج ہوا
صورت حال سمجھ گئے۔ کندن کے لئے دو کمرے خالی کرا
ایک مہری کا انتظام کیا۔ اور نونی کے معالجہ میں مصروف ہو
رات گذری۔ علی الصبح جگ گوپال جامہ سے باہر

غصہ سے کانپتے ہوئے پہنچے اور کندن سے کہا "خیریت چاہتی ہو تو اسی وقت میرے ساتھ گھر چلو۔"

کندن نے جواب دیا "تم اس وقت میرا گلا بھی کاٹ ڈالو تو میں نہ جاؤں گی۔"

جگ گوپال "اچھا تو اب میرے گھر مت آنا سمجھیں!"

کندن نے اب کی تن کر جواب دیا۔ "تمہارا گھر! وہ گھر تو میرے بھائی کا ہے۔"

جگ گوپال گھونسا تانکر رہ گیا۔ اسی وقت وہاں سے آکر رہنے کا مکان اور باغ اپنے بڑے لڑکے کے نام لکھوا لیا۔ اور دوسرے دن اس کی رجسٹری بھی ہوگئی۔

کندن ہفتہ بھر ڈاکٹر صاحب کے یہاں رہی۔ لونی کو صحت ہو چلی تھی۔ اس کا ارادہ ابھی اور ایک ہفتہ بھر رہنے کا تھا۔ مگر گھر اور باغ کے بیع ہونے کی خبر نے اسے وہاں نہ ٹھہرنے دیا۔ ڈیڑھ دو ہزار کی جائداد ہاتھ سے نکلی جاتی ہو! اپنے بیٹے کو کندن اس وقت غیر سمجھ رہی تھی۔ بھائی بیٹے سے بھی پیارا ہوگیا تھا۔

(۶)

کلکٹر صاحب موسم سرما کا دورہ کر رہے تھے شیخوپورہ میں قیام کیا۔ صبح کے وقت وہ اپنے خیمہ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ آس پاس کے مواضعات سے زمیندار اور رؤسا سلام کرنے کو حاضر ہوئے تھے۔ بابو جگ گوپال بھی سیاہ الپاکے کی چکن پہنے، سفید پگڑی باندھے سلام کو حاضر ہوئے۔ صاحب بہادر نے اُن کی غیر معمولی طور پر عزت کی۔ اور اُن کے لئے کرسی منگائی۔ جگ گوپال کو ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ ایسا خوش نصیب کون ہوگا۔ گیان پور کے چکرورتی اور شاہ گنج کے چودھری یہی ارمان لئے بیکنٹھ سدھار گئے۔

جگ گوپال نے چاروں طرف تفاخرانہ انداز سے دیکھا۔ گاؤں کے مُکھیے اور مزدور اُنکی یہ عزت دیکھکر سکتے میں آگئے۔ افسوس! سام گنج کے متر بابو یہاں نہیں ہیں۔ ورنہ دیکھتے کہ میری کیسی عزت ہے!

یکایک ایک عورت سر سے پیر تک چادر اوڑھے ایک پنج سالہ لڑکے کی انگلی پکڑے آئی اور کھڑی ہوگئی۔ صاحب نے پوچھا تم کون ہو۔ کندن بولی "حضور میں اسی گاؤں کی ایک دُکھیاری عورت ہوں۔ آپ کے پاس فریاد لیکر آئی ہوں۔"

صاحب "اچھا۔ اجلاس کے کمرے میں چلو۔ ہم ابھی آتا ہو۔"

کندن "نہیں حضور۔ میری عرض یہیں سُن لی جائے۔"

جگ گوپال کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا۔ کھسیائے ہوئے بندر کی طرح کندن کی طرف گھور رہا تھا۔ اگر صاحب کا خوف نہ ہوتا تو وہ ضرور اُس پر حملہ کر بیٹھتا۔

کندن کہنے لگی "حضور۔ یہ لڑکا میرا بھائی ہے میں بابو مادھوسودن کی لڑکی ہوں۔ جن کا دو سال ہوئے انتقال ہوگیا۔ یہ بابو صاحب جو آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں میرے شوہر ہیں۔ میرے باپ کا جب انتقال ہوا تو اُنھوں نے ان بابو صاحب کو اپنے نابالغ بچے کا ولی قرار دیا۔ اور اپنی زمینداری کا ہر ان کے گذارے کے لئے وصیت میں لکھ گئے۔ مگر ان بابو صاحب کی اب نیت بدلی ہوئی ہے۔ یہ میرے غریب بھائی کی ساری جائداد اپنے اور اپنے لڑکوں کے نام کرتے جاتے ہیں۔ کوئی ان کا

ہاتھ روکنے والا نہیں۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ ان کے قابو میں ہوں۔ کچھ بول نہیں سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حضور کے راج میں ایک یتیم پر قہر ٹوٹ جائے گا۔ اور اُس کی جائداد دوسروں کے تصرف میں آجائے گی۔ اسی لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں کہ یہ لڑکا آپ کو سونپ دوں۔ اب اس کے ساتھ انصاف کرنا آپ کا دھرم ہی۔ آپ جو مناسب سمجھیں کیا کریں۔"

یہ کہہ کر گندن خاموش ہوگئی۔ جگ گوپال نے غیظ و غضب سے بیچ میں کئی بار چھیڑنے کی جرأت کی۔ مگر صاحب کے تیور دیکھ کر خاموش ہوگئے۔ آخر صاحب نے اُن سے پوچھا "یہ سب سچ ہی؟"

جگ گوپال بولے "حضور میں حضور کیا عرض کروں۔ بابو مادھو سدن قرض چھوڑ گئے تھے۔ سو حضور کچھ زمین مکفول کرکے قرض ادا کیا گیا۔"

صاحب "اچھا آج کل کاغذات ہمارے سامنے پیش کرو"

جگ گوپال "بہت اچھا حضور۔"

صاحب نے تب گندن سے کہا "اچھا اب تم جاؤ۔ ہم اس معاملہ میں خوب کوشش کریں گے۔ تمہارے بھائی کی جائداد کوئی نہیں لے سکتا۔ تمہاری نیکی اور مستقل مزاجی سے ہم بہت خوش ہوا۔"

گندن نے جھک کر زمین چومی۔ اور نونی کو گود سے اُتار کر صاحب کے سامنے کھڑا کر دیا۔ نونی رونے لگا۔ مگر صاحب نے اُسے پچکارا۔ اور ایک ٹینس کا گیند دیکر اُسے بہلایا۔ جب گندن چلنے لگی تو صاحب نے پوچھا "اس لڑکے کو اپنے ساتھ لیتی جاؤ۔ کیا کوئی خوف ہی؟"

گندن۔ "حضور۔ اب میں اُسے آپ کے سپرد کر چکی ہوں میرے ساتھ وہ نہیں رہ سکتا۔"

صاحب "اور تم کہاں جاؤ گی۔"

گندن "میں اپنے شوہر کے ساتھ جاؤں گی۔"

گندن نے نونی کو گلے لگا کر پیار کیا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھرے رخصت ہوگئی۔

ایک ہفتہ میں علاقہ کورٹ آف وارڈس کے زیر تحت آگیا۔ اور نونی کو پڑھانے کے لئے ایک ماسٹر رکھدیا گیا۔ جگ گوپال آسام چلے گئے۔ مگر گندن کو پھر کسی نے نہ دیکھا۔ وہ جس دن صاحب کے یہاں سے لوٹی اُسی دن اُسے ہیضہ ہوگیا مگر گاؤں والے اب بھی اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اور صاف گو تالاب بھی کہتی ہی کہ گندن کو ہیضہ نہیں ہوا تھا۔

د۔ ر

دہلی سے ایک نیا باتصویر ماہوار رسالہ جاری ہوا ہی جس کا نام "تمدن" ہی۔ اس کے ایڈیٹر شیخ محمد اکرام اور مولوی محمد عبدالراشد صاحب الخیری ہیں شیخ محمد اکرام عرصہ تک تمدن کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں رہ چکے ہیں، اس لئے اُردو خواں پبلک اُن کے نام سے اچھی طرح آشنا ہی۔ رہے مولوی محمد عبدالراشد، سو وہ زبان اُردو کے مستند انشا پرداز ہیں، اور بیگماتی زبان و محاورات لکھنے میں خاص شہرت حاصل کرچکے ہیں اس سے اندازہ ہوسکتا ہی کہ ایسے دو قابل حضرات کی ایڈیٹری میں جو رسالہ شائع ہوگا، وہ کیسا ہوگا۔ "تمدن" کے مقاصد میں زبانِ اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوقِ نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پہنچانا ہی، پالیٹکس سے یہ بالکل الگ ہی۔ ابتک دو نمبر (اپریل و مئی) شائع ہوئے ہیں، اور دونوں اُن منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین سے مزین ہیں جو اس وقت ملک اور قوم کے واسطے مایۂ ناز ہیں۔ حجم ۴۸ صفحہ قیمت سالانہ مع محصول ۳ روپے۔ ہم نہایت تپاک کے ساتھ اپنے اس نئے معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور ہماری دلی دعا ہی کہ خدا اس کو اس کے مقاصد میں کامیاب کرے۔

شہیدِ وفا کی تُربت

اور رسم وداع دو پھول

سوادِ منظرِ شہرِ خموشاں کیا ہی دلکش ہے
ٹھہر جانا ذرا اک قبر پر جب تم اُدھر جانا

قلم فسانۂ طرازِ جذباتِ عشق و محبت شیریں ادا کالیوں نغز مہ پیرائی کر ایک آپ بیتی سنانے والا سوگوارِ غم شہید وفا یوں کہتا ہے:

۲۶۔ مارچ ۱۹۲۸ء ہفتہ کا روز بقول بعض احباب کے میری بازگشتِ وطن کا طرب افزا دن تھا، لیکن دلی تعلقات کے حسرتناک نتائج کا لحاظ کرتے ہوئے اُس شہرِ مینو سواد (حیدرآباد) سے کوچ کا دن تھا، جس کی آغوشِ بہار رو کامرانی میں مری محبت نصیب جانِ شیریں اور رشکِ نور جہاں .... نے بھولے بھالے شباب کے ۱۷ سال گذارے تھے، اور اب سلسلۂ حیات منقطع ہو جانے سے وہ پری جمال وہیں ایک پُر فضا مقام پر ایک شفاف اور جاری چشمہ کے کنارے خواب نوشینِ عدم کا لطف لیتے لیتے ہمیشہ کے لئے سو گئی تھی۔

تیاری سفر سے شبِ گذشتہ ہی کو فراغت حاصل کی جا چکی تھی، اور مخصوص آج کے لئے جو کام اٹھ رہا تھا، وہ دوستوں سے الوداعی ملاقات، اور رخصتی معانقہ تھا۔

قاعدہ ہے کہ جب کوئی غیر معمولی سفر یا حالت پیش آنے والی ہوتی ہے، تو خیالات میں پہلے ہی سے مدّ و جزر شروع ہو جاتا ہے، اور اسی حال میں کہیں آنکھ لگ گئی، تو عالمِ رؤیا کی نیرنگی اور بوقلمونی کا پھر کیا کہنا، الغرض اسی طبعی اصول نے یہاں بھی رات بھر عجیب عجیب گُل کھلائے، مناظرِ عبرت دکھا کر کبھی دل کو خدا ترسی کے پاک جذبہ سے متورکیا، اور کبھی چشمِ ملتجی پر پٹی باندھ کر ایسا لبریز جامِ عیش پلایا، کہ دل نے جوشِ مسرت و شادمانی کی لہریں لیں، کبھی میدانِ فنا کے گم گشتہ یاروں سے دو چار کیا، بالآخر صبح سویرے، منہ اندھیرے، رات بھر کے بھولے بھٹکے کو اُٹھا کر بٹھا دیا۔

خوابگاہ سے اُٹھ کر حجرے کی پر گیا، حمام کیا، اور وضو کر کے نمازِ صبح ادا کی، اب جھٹپٹا اور صبح کا سہانا وقت تھا، وقت کی دلچسپی نے دل میں گدگدا دیا، جھٹ کپڑے پہنے، اور باہر نکل آیا۔

"جاؤں تو کدھر؟"

یہ خیال آیا ہی تھا کہ جذبِ محبت نے (اُس غزالِ رعنا اور رشکِ زلیخا کے جذبِ محبت نے جو محبت کی سچی، اور بات کی پکی تھی، جس نے نہایت استقلال سے راہِ وفا میں اپنی جان دی تھی، پر دل کے بھید سے زبان تک کو آشنا نہ کیا تھا، اُس کی جذبِ محبت نے جو میرے حریمِ دل کی شمع کافوری تھی، اور جس نے دستِ قضا سے مرگِ شباب کا چھلکتا جام ابھی ابھی چڑھایا تھا) بازو تھاما، اور گورِ غریباں کی طرف لے چلا۔ نکلا تو اس طرح سے تھا، کہ اس سہانے وقت میں کسی سرسبز و شاداب مرغزار یا پھلے پھولے چمن کی ہوا کھاؤں گا جس سے فرحت حاصل ہوگی، اور عطر فرشِ بحری کے مشکبو

ہچکیوں سے شام جان سطح ہوگا، اور چاہ رہا ہوں کہ مرو
دِس خیال کی کامیابی پر اتنی بڑے کے لئے یقینی تھی، اگر وہ
ہیں استغراقی جذبہ محبت (وہ جذبہ جس میں ذوق و شوق
کی بیتابیاں اور گرمئ عشق اس روح آزاد اور نورِ مجسم کے ساتھ
اس کی حالت تلفید سے زیادہ بڑھ گئی تھی، وہ جذبہ جو اکثر
استغراقی حالتوں میں ایک زبردست قوت کے ساتھ مجھے
اپنی طرف کھینچتا تھا، وہ جذبہ جس کا افسوں مجھ پر میرے
اگلے اور ناقص خیال کے مطابق اس کی دُنیا میں رہنے
ہی تک چلا تھا، اور اس حور شمائل کے جنت سدھار جانے
کے بعد خود اس سے زندگی کا دردِ سر جانے اور خمار بادۂ عشق
اتر جانے کی طرح میرے سر سے بھی اس کا سودا نکل جانا چاہئے
مگر سوزِ محبت کی جلن دل سے نہ گئی تھی، بلکہ اور دونی ہو گئی
تھی) میری رہبری نہ کرتا، الغرض اُسی کشش نے مجھے
اُس بالینِ مزار تک پہنچایا، جس میں وہ ملکۂ حسن فنا کی
دار دسے بیہوشی پئے ہوئے خوابِ شیریں کے مزے لے رہی
تھی، بغرض فاتحہ اس ۲۴ روز کے عرصہ میں اس شہرِ خموشاں
اور گنجِ شہیداں میں بارہا آنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن آج
کا آنا وہ روز کا آنا نہ تھا، کسی بڑے سفر کے موقعہ پر پیارے
اور عزیز دوستوں سے آخری ملاقات کا سماں عموماً موثر اور رقت
خیز ہوا کرتا ہے لیکن اس وقت اس برزخ بسانے والے
دوست کی روحانی ملاقات کا سین جیسا کچھ پُر تاثیر تھا، اس
کے دکھانے کے لئے میری زبان میں یارائے بیاں ہے،
نہ قلم میں طاقتِ اظہار۔

دردِ دل کے ذوق چشیدہ ناظرین خود اندازہ کر سکتے
ہیں کہ زندگی وہ مرحلے جس نے ایک سچا غمخوار، اور دردمند

پایا ہو، اور صبر کا سِل سینے پر رکھکر اپنی یہ قسمت بھی تمام دل کے
سپرد کر دینے پر مجبور ہوا ہو اور صبح و شام محض اس قتیلِ تیغِ ادا
شہیدِ وفا کی تربت دیکھکر اپنے حسرت نصیب دل کی آرزوئے
دید اور شوقِ نظارہ پورا کرتا ہو، یا وہ چار اشک آنکھوں سے
بہا کر گرمئ شوق کم کرتا ہو، لیکن یہ سودائے سنگین میں کھویا
ہوا شخص اپنی اس طرفہ آرزو سے بھی محروم کیا جا رہا ہو، اور
وہ بلبلِ شیدا صیادِ ظلم حوادث ہونے سے پہلے اس پھول
کی آخری بو سونگھنے کے لئے چمن میں آ نکلے،

الغرض ان کیفیاتِ درد و غم کی برچھیاں کھایا ہوا
دل مرے سینے میں تھا، تربتِ جاناں پیشِ نظر تھی، اور
اور کچھ کم دو سال کی بامزہ صحبتوں کا نقشہ خزانۂ خیال میں
پردۂ کثافت ہٹا، چشمِ وجدان کھلی، مادّی زبان (زیادہ
مضغۂ گوشت جو منہ کے اندر زبان کے نام سے نامزد ہے)
بند ہوئی، لسان القلب میں اشراقی قوتِ گویائی آئی، پھر جن
لطیف اور پاکیزہ جذبات سے صدقِ صافی یا بیت السوز
معمور ہوا، اُن کی تعبیر الفاظ میں یہ ہوگی۔

"اے غبارِ راہِ فنا کے بھولے بھالے مسافر! اور اسنے
بسترِ خاکی پر آرام کرنے والے گُل پیرہن! تو بوئے گل کی
طرح چمن زارِ ہستی سے صحرائے عدم کو سدھاری، لیکن اپنے
دلدادۂ حُسن اور شیفتۂ جمال کو، جس کے دل کو تابِ مفارقت
ہرگز نہ تھی، بے بس کر کے چھوڑا۔ بھلا! اس مہجور کو جینے میں کیا
خاک لطف آئے گا، جس کا نہ کوئی غمخوار ہو نہ ہمدم،

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

ہائے! تیرا وہ رنگ تھا، جسے دیکھا نہ تھا، حسنِ صورت

میں تجھے اگر ملائک فریب کہا جائے۔ تو حُسنِ سیرت میں تو آپ اپنی نظیر تھی، تیرا مذاق اور رنگِ طبیعت بھی صورت کی طرح شگفتہ اور سیرت کی طرح پاکیزہ تھا، تیری خوبی صرف یہی نہ تھی، کہ دستِ قدرت نے چند نمائشی زیوراتِ آفرینش سے تجھے آراستہ کر دیا تھا، بلکہ تیری فطرت کو وہ جوہر بھی ودیعت کر رکھا تھا، جس سے تیری طبعِ نازک نے تحصیل و اکتساب کی خوبیوں سے مُعریٰ رہنا بھی گوارا نہ کیا، اور دستِ طلب نے معارف کے موتی بال بال پرو دیے۔

آہ! تو فنونِ لطیفہ کی شائق تھی، تیری زبان میں وہ شیرینی کہ جسے سُننے والے اعجاز کہیں اور بُلبُل چہکے۔ تیرے دستِ نگارش میں وہ رنگینی کہ قطرہ قطرہ سے فصاحت ٹپکے۔ تیری وہ گاہے ماہے تنہائی میں محبت اور فلسفۂ محبت پر شیوا بیانیاں جس سے حُسنِ تعلقات اور لگاوٹ کے پنہاں اسرار عیاں ہوں، بلبلِ شیدا بھی سُنے تو وجد میں آئے، تیری وہ شاعرانہ گونج، عاشقانہ دھن میں غزل سرائی، طوطیِ جناں بھی سُنے تو ہم آواز ہو جائے۔ اور ان سب خوبیوں سے بالاتر تیرا شیوۂ دردمندی۔

جس طرح تیری صورت میں جاں بخشی، تیری آواز میں سامعہ نوازی کی شان تھی، تیری سیرت میں دل نوازی، اور نگاہ میں کیمیا سازی کی ادائے خاص بھی تھی، تیرا غنچۂ خاطر نسیمِ بہار کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے سدا شگفتہ رہتا تھا، مہک ایسی کہ دلوں کے کنول دیکھ کر کھلیں، مگر ذرا کلمۂ درد کسی ہمنشیں کی زبان سے سُنا، اور پھول سے زیادہ نازک دل کی پنکھڑیاں پژمردہ ہونے لگیں، پھر اُس دردمند کو نہال کرنا بھی تیری شگفتہ مزاجی کا ایک دل پسند انداز تھا۔

آہ! یہ ساری خوبیاں ایک طرف، اور تیری نوبادۂ عنفوان سے بھرپور جوانی ایک طرف، اے وہ! کہ سینہ تیرا گنجینۂ آرزو، اور خزینۂ اسرارِ راز و نیاز تھا، اور اے تا یومِ القرار داغِ مفارقت دینے والے!! خاطرِ احباب پر میل نہ آنے دینا جب تیری نیک نہادی و پاکیزہ خوئی کا حصہ تھا، تو چشم زدن میں اتنا بڑا کوہِ الم توڑنا اُن پر تو نے کیسے گوارا کیا، ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا دردِ مفارقت تیرے لئے ہم سے زیادہ روح فرسا تھا، پھر تو نے ہمیں کیوں ایسا زخم کھلایا، جس کا مرہم اندمال اگر ہو سکتا ہے تو تیرے حُسنِ دل آرا کی دید، ہمارے دلِ بیتاب کو ایسا داغ کیوں دیا، جس کا ذریعۂ تسکیں اگر تھا، تو وہ تیرا نغمۂ جاں بخش۔

اے میرے نازشِ آرزو! کیا یہ میری آخری آرزو بھی کسی لطفِ دیرینہ کے ساتھ بر آئے گی۔

یا من ناصبور را ہمیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاکدامنی صبرِ من از خدا طلب

تیری مثل کی یاد سے زخمِ دل ہرا ہے، اور عمر بھر ہرا رہے گا، جب تک جیوں گا، تیری ہی یاد میں سر دھنوں گا۔

آہ! محبت کیش دل سے نہیں دیکھا جاتا، کل جہاں تیری شبستانِ عشرت ہزار اسبابِ مسرت سجائی جاتی تھی، جس کی حاشیہ نشینی کا فرض نو عروسانِ چمن ادا کرتے تھے۔ آج وہاں صفِ ماتم بچھی ہے، جو دل تیرے لطف و مروت کے فیضِ عمیم سے بہرہ یاب تھے، آج اُن کا حال زار ہے،

اے کاش عمرِ رفتہ! تو ہی اپنی رفتار معکوس کر دیتی، تاکہ اُس شوخ ادا کو جی بھر دیکھ لیتا، اور لے یہ جان پھر تیری نذر تھی، اور اے مرگ و زیست کا صدقہ جاریہ تقسیم کرنے والے!! تجھے میں اپنے لحظاتِ حیات دے کر کہتا ہوں،

کہ اُس گلِ رعنا کو ایک بار تازگیِ حیات دے کر جلا دے، ایک بار اس کی بو سونگھ کر پھر اُسی کے ساتھ فرشِ خاک پر سو جاؤں گا، مگر آہ! یہ سب مجذوبانہ بڑ ہے، یا از خود رفتگی کے عالم کی خام خیالیاں۔ جو گیا وہ پھر کہاں آتا، اور جو ہے وہ بھی جانے والا ہے "کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ"، چمن زارِ امکان کے یہ خوشنما منظر، تماشا گاہِ عالم کے نظر فریب سین، چاند، سورج، یہ بزمِ انجم، یہ چڑھتی دھوپ، یہ ڈھلتی چھاؤں، دُنیا کی دلچسپی سے بھری محفلیں، حُسن و جمال کی چھپکتی کونپلیں، لالۂ گلفام، عیش و عشرت کے لبریز جام، رونقِ حُسن، بہارِ چمن، یہ درسِ عرفانی، یہ غلغلۂ روحانی، حُسن و عشق کی گرمیاں، زہد و ورع کی جکڑبندیاں، الغرض نظمِ دُنیا کی یہ ساری دلچسپیاں آنی جانی چیزیں ہیں، اگر کسی چیز کو بقا ہے، تو وہ خیال فنا ہے، جو منزلِ عشق و محبت سے پرے ہے، مگر جادہ یہی ہے۔

صد رحمت اُن پاک روحوں پر، اور نیک انجام اور مبارک ہیں وہ اہلِ دُنیا، جنھوں نے اس سرودِ فنا کا نغمہ سمجھ کر اس کے دھوکے دم دم اس کی ہستی سے نیستی کا سبق لیا، اس وقفۂ زندگی کے بعد وہی لوگ اُس صحبتِ عیش میں پہنچیں گے۔ یا پہنچ گئے ہیں، جو کبھی برہم ہونے والی نہیں، اور جس میں دُنیا کی ظلمتیں کافور ہیں، اور نور کا اُجالا پھیلا ہے۔

پیاری نازنین! تیری پاکیزہ فطرت میں بھی یہ سچا خیال عین الیقین کے درجہ پر تھا، تیرا بطون صدق و صفا کا آئینہ، کیونکہ مرض الموت میں تیرے وہ جذبات ہر ہر موقع پر ظاہر ہوتے رہے، جو "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ" کا عقدہ حل کرتے تھے، اور حسنِ انجام یہ ہوا کہ تیرا سفینۂ وجود عرفانی موجوں کے مد میں پڑ کر قیامت تک کے لئے غائب ہو گیا، ہمارے خیال میں اس چاشنی سے تیرا وجدان ذوق آشنا تھا، مگر یہ تیری سچائی کا کمال تھا، کہ مقررہ وقت سے پہلے اُس سِرِّ خفی کے ظاہر ہونے میں سبکسری تھی، جسے تو نے ایک عالی ظرفی کی آن کے ساتھ دُرِّ ناسفتہ کی طرح خاطرِ گراں میں پنہاں رکھا۔ "ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔"

میں کامل وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ گلزارِ جناں میں تیری منزل اعلیٰ و ارفع ہوگی، جو محبت کا معدن، نورانیت کا سرچشمہ اور مسرتِ جاوداں کا مقام ہے، مگر ہائے!

رفتم زخود چو در دلم آمد خیالِ تو
تنہا نشستہ تو و خالی است جائے من

تیرا عاشقِ زار اپنے ہجراں نصیب دل کا قصۂ غم تجھے سنانے، اور تیرے بجائے تیری لحد سے اجازتِ سفر طلب کرنے آیا ہے۔

آہ! یہ بے مہری تجھے اس وقت ہرگز سزاوار نہیں، مگر تجھے خوابِ گراں سے کہاں فرصت، ہو تو چونکے، اچھا لے، یہ سورۂ اخلاص سے دم کئے ہوئے آخری پھول اس کا ہدیۂ شانِ محبت ہیں، (جو تعویذِ قبر پر چھڑکا دئے گئے)۔

اس کے بعد میں نے تربت کے سرہانے دو زانو بیٹھ کر اور تعویذِ قبر پر ہاتھ رکھ کر صدقِ دل سے فاتحہ خیر پڑھا۔

اس وقت کی کیفیت نہ پوچھئے، رقّت و تاثیر کا وہ عالم تھا، کہ مجھے خود اپنا ہوش نہ تھا، محویت نے اُس ماہ سیما کے ایوانِ نور تک پہنچا دیا تھا، جس میں وہ ایک ادائے تمکین و خودداری کے ساتھ مسندِ زرّیں کار پر حوروں کے جھرمٹ میں شاہانہ جوڑا پہنے جلوہ آرا تھی، تھوڑی ہی دیر میں نظروں ہی نظروں میں کچھ اس سے گفتگو رہی، پھر اُس نے ایک مطلّا و مذہب لوح اپنے دستِ نازک سے مجھے دی، جس پر یہ کلمہ بخطِ نور لکھا تھا۔

نصرمن اللہ وفتح قریب۔ اب گویا میں رخصت کر دیا گیا تھا، قبل اس کے کہ میری چشم حسرت بار اس برزخ کے وداعی سین کا نظارہ کر سکے میں جہاں کا تہاں معروف بفاتحہ تھا، البتہ تعویذ لحد پر اُس لوح کا گماں اب تک ہو رہا تھا، اور وہ طغریٰ آنکھوں میں جھکتا تھا۔

اب میں بخاطرِ ناخواستہ اُٹھا، ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ ٹپ ٹپ آنسو زمیں پر گر پڑے، فاتحہ ثانی پڑھ کر چلا، چلتے وقت فی امان اللہ کی باریک و دلاویز صدا میرے کان میں آئی، لوٹتے وقت خلاف امید میری طبیعت مسرور، دماغ معطر اور دل باغ باغ ہو رہا تھا اور یہ شاید اُس کی ایک لحظہ کی روحانی ملاقات کا اثر تھا جو اس غیرِ فانی اور پاک محبت کا معجزہ ہے جس کے سب کام تو بلا ارادہ رجوعِ قلب سے بنتے ہیں۔

ج۔ د۔ علی

اسیرِ مغفور

(بعض خود نوشت حالات)

حقیقت میں دیکھو تو دُنیا میں کیا نہیں ہے مگر سب کو فنا ہے۔ اجل سر پر کھڑی ہے، وقفہ کم ہے، اوّل بھی عدم ہے، آخر بھی عدم ہے۔ یہ بزمِ آراستہ کیا پسند آئے۔ ہمارا دل دُنیا سے برخاستہ ہے۔ زیادہ رہنے سے کیا؟ دُنیا دل لگانے کے قابل نہیں ہے۔ کیسے کیسے عزیز قریب اُٹھ کر گوشۂ قبر میں سو رہے جن سے دل بہلتا تھا وہ تابندہ کوکب خاک میں مل گئے۔ دورِ فلک میں جو لوگ مغتنم تھے وہ پردۂ خاک میں نہاں ہو گئے۔ جو زیست میں ہمدم و ہم پیالہ تھے انھیں کا ماتم کرنا پڑا۔ جن کے لئے پوشاکیں قطع کیں انھیں اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا۔ شب و روز جن کے ہاتھ میں ہاتھ رہتا تھا، ان کے تابوت کے ساتھ جانا پڑا۔ جو آٹھوں پہر پہلو میں رہتے تھے ان کو تختۂ غسل پر لٹایا۔ جو نزدیک ہر وقت ہم پنجہ رہتے تھے ان کو گور میں لٹایا۔ سرسبز چمن غارت پامالی ہوا بھرا ہوا گھر عزیزوں سے خالی ہو گیا۔ نہ وہ محفل ہے نہ وہ ساقی۔ زندگی کا مزا جاتا رہا۔ زمانے نے کیا کیا رنگ دکھائے اس سرائے میں کہیں ٹھکانا نہیں۔ جو آیا ہے اُسے ایک دن جانا ضرور ہے، نہ کوئی یار نہ غمگسار فقط مرگ کا انتظار ہے ضعیفی میں جوانی کا مزا کہاں ہم تو رہ گئے زندگی کا مزا جاتا رہا اب کچھ اپنا حال بیان کروں جو سُننے کے قابل ہے، قصبہ امیٹھی جو بہت آباد ہے وہی میرا وطن وہی میرا مولد ہے۔ چمن ہے لیکن خزاں دیدہ۔ رفیعانِ صاحبِ حشم رئیسانِ عالی ہمم سب اُٹھ گئے، جب نُو دس برس کا سن ہوا بخت رسا لکھنؤ میں لایا میرے جنت مقام باپ میر مدد علی تھے محبِ نبی و علی شیعہ پاک صاف اعتقاد عالی دقار ہوئے فارسی داں حضرت عبّاس علم بردار کی اولاد میں کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ مائل تخلص تھا۔ میں جب قبلہ گاہی کی خدمت میں حاضر ہوا شفقت سے پڑھانے لگے۔ فارسی میں روشن سواد ہو گیا اُستاد بن گیا۔ بہت سے طالب علم آنے لگے۔ آخر فکرِ روزی سے مکدر ہوا تو پہلے کتب خانے میں نوکر ہوا وہاں خوشنویسوں کا مجمع تھا۔ مجھ کو بھی یہ شوق پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ جب شاعروں سے ملاقات ہوئی شعر کہنے کا ڈھب ہو گیا۔ رنگین شاعری

…وں میں ادبی مضامین کی تلاش کرنے لگا، دیوان جمع کر کے دیکھے، …پہلوں کے رنگین کلام یاد کیے، بعض بعض موقع پر عربی زبان کی …محاورہ بندی… مگر اس کا بھی کچھ علاج کیجیے چچا میر سید علی نے …علم عقلی و نقلی میں بہت دقاق تھے، صرف و نحو میں منتخب روزگار تھے حکمت و منطق میں بے مثل، حدیث و قرآن پر فریفتہ آپ نے …اپنا دیوان نظم کر کے داد سخن دی تھی) میرے پڑھانے میں …کمال محنت کی چار برس تک ان کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی …زمانے سے کچھ ایسا انقلاب کیا کہ طبیعت میں اضطراب ہوا پڑھنے پڑھانے کی صحبت جاتی رہی روزی کی فکر نے پریشان کیا القصہ کچہری میں نوکری کی کچھ انشاگری جانتا تھا۔ عمر کے آٹھ برس اسی شغل میں بسر ہوئے۔

خدا کی شان رزاقی، وہاں ایک عالم مرزا کاظم علی تھے۔ ان کی خدمت میں مشرف رہا۔ حدیقہ حکیم ثنائی پڑھا علم حاصل کیا۔ وہ کامل تھے مجھ کو بھی کامل کر دیا۔ کبھی کبھی میر قائم علی سے پڑھ لیتا تھا۔ وہ ایک متقی عالم ہیں۔

ترک عادت تو بہت مشکل ہے۔ شاعری کا بھی کچھ کچھ خیال رہا جا بجا مشاعروں میں گیا شاعروں سے صحبتیں رہیں میں نے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں کیا کہ مجھ کو شاعری میں کمال ہے۔ مگر لوگ تو تعریف کرتے ہیں۔ یہ پرچے ہم کو بھی گذرتے ہیں تواریخ کی صبح و شام سیر کی، لغت کی کتابیں پیش نظر رہیں جب حضرت ثریا جاہ خاقان زماں محمد امجد علی شاہ زیب تخت و کلاہ ہوئے، بڑے نیک طینت معین شریعت فرشتہ خصال تھے، تو مدار المہام وزیر الممالک امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خاں بہادر ذو الفقار جنگ وزیر ہوئے۔ خدا نے ایسا بلند قدر بنایا کبھی ایک چیونٹی کو بھی نہ ستایا۔ صبح سے شام تک خدمت کے کام کرتے اور شام سے صبح تک عبادت میں مصروف رہتے۔

ہر گھڑی خاص و عام کی خبر تھی۔ رونق اسلام کی بڑھایا کیے۔ روز افزوں تائید خدا رہی لیکن خاکساری بدستور قائم رہی ان کے بزرگ بھی بہت صاحب ثروت قوم بنگش سے فرخ آباد کے رئیس تھے۔ جب یہ پہلے پہل لکھنؤ میں آئے تو محلہ تحسین گنج میں قیام کیا۔ مکانات خرید کیے۔ جب وزارت ملی تو ماہ نو سے ماہ کامل ہو گئے۔ خاندان کا خاندان ساتھ تھا۔ مرزا سکندر شکوہ کے مکانات اُن کے بیٹے عباس شکوہ سے مول لیے۔

از سر نو ان سب کی تعمیر کی، مکانوں کی تقدیر چمک گئی۔ "امین آباد" نام رکھا۔ اسی جگہ باغ نیدایں تھا۔ وہ بھی بادشاہ نے مرحمت فرمایا، اس کو خوب تیار کیا اور "امداد باغ" نام رکھا عجب عشرت آباد بن گیا، دو کانوں سے بازار شق القمر بن گیا۔ لوگ نواب کو دعا دیتے ہیں۔ وہاں رہنے والوں کو آرام ہے۔ طبیعت میں حق پرستی کا مذاق ہے۔ بجز رونق دین اور کچھ غرض نہیں۔ ایک مجتہد ملازم ہیں صبح و شام نمازیں ہوتی ہیں۔ ہمیشہ للہ تقسیم زر ہوتی ہے۔ مرزا حاجی کا باغ مول لیا ہے اس کے قریب درگاہ حضرت عباس علمبردار بنائی ہے، ہاں صبح و شام مجلسیں ہوتی ہیں، زیارت کو خاص و عام آتے ہیں۔

میں بھی ان کے بندوں میں ایک صاحب نیاز بندہ تھا۔ کچھ ایسا حق نہ تھا جس پر ناز کرتا، مجھ کو محض عنایت سے میر منشی کا محکمہ دیا۔ بہت مسرت سے تین برس کٹے کچھ حسب حال مقدرت حاصل ہوئی، جو عزیز قریب میرے ساتھ تھے ان کے بخت و نصیب موافق رہے۔ خدا کا شکر و سپاس ہے یہ بھی قیاس و وہم سے باہر تھا، یہاں نہ تو حسن صورت ہے نہ حسن خط

ہے- املا بھی غلط انشا بھی غلط - شکر کا دم دل کیوں نہ بھرے، خدا ہمارے محسن پر احسان کرے-

بعد ازاں گردش روزگار ہوئی زمانے کا تو کچھ اعتبار نہیں ہے آسمان و زمین دوسرے ہو گئے، فلک نے ہمیں خانہ نشین کر دیا- کیا کہوں جو دورِ زمانہ ہوئے تمام اقارب عدم کو روانہ ہوئے میری زوجہ نے بھی انتقال کیا، دل کو نہایت ملال ہوا، میرے سر پر اس قدر بلا پہ بلا پڑی کہ دنیا سے دل اٹھ گیا- زمانے کی سیر بہت کی الٰہی اب انجام بخیر ہو-

یں یہاں تک نام رہا اب علی کی محبت میں تمام ہوں سخن مختصر دنیا سے دل بہت برخاستہ تھا- کسی بزم آراستہ سے کچھ کام نہ تھا- ناگاہ ایک شاہی خواص آیا اور مجھے دیوان خاص میں لے گیا، وہاں حضرتِ سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ اختر صاحبِ سریر رونق افروز تھے، یہ بادشاہ رعایا کا بہت محبوب ہے- خدا کو اس کی خوشی منظور ہے- اور ایام میں ایسے بادشاہ کہاں، پایہ تخت بلند رہے چشم بد سے گزند نہ پہنچے-

مجھ جیسے ناچیز شخص سے خلق کیا- امتیازی درجے سے پاس بٹھایا- ایک ایسی کتاب عنایت فرمائی جو درحقیقت گل انتخاب تھی میں نے حسب حکم اسے نظم کیا- سن کے بہت خوش ہوئے- مجھے بھی ان کی خوشی سے مطلب تھا- فقط یہاں تک امیرِ مغفور کے خود نوشت حالات تھے-

---

امیر کے دادا کا نام سید محمد علی تھا ابن سید مولوی معین الدین ابن محمد صالح کروری- نانا ان کے لکھنؤ کے شیخ زادے تھے- تدبیر الدولہ مدبر الملک مظفر علی خاں بہادر بہادر جنگ دربار اختری سے خطاب ملا-

جس زمانے میں نواب محمد سعید خاں والیِ رام پور لکھنؤ میں مقیم تھے، امیر صاحبزادگان عالی شان کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے- پھر نواب یوسف علیخاں بہادر فردوس مکاں کے عہد میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے- پھر زمانہ سلیماں سریر آصف مشیر حاجی حرمین شریفین ہلال رکاب نواب محمد کلب علی خاں بہادر میں دربار سخن فہموں سے سجایا گیا اور قدر دانی کا بازار گرم ہوا- امیر بھی بیش بہا تنخواہ سے بلائے گئے-

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگردوں میں بعد آتش کے انھیں کا مرتبہ تھا- ہزارہا مستفید ہوئے- ایک دیوان فارسی گلشن تعشق اور چھ دیوان اردو میں ہیں- ریاض مصنف، گلستانِ سخن، دیوانِ امیر عاشقانہ دیوان ہیں- ایک دیوان غیر مطبوعہ ہے، ایک دیوانِ منقبت موسوم بہ گلدستۂ امامت ہے- ایک کلیات قصائد اردو، ایک مثنوی درۃ التاج ہے جو بادشاہ کی فرمائش سے نظم کی تھی، ایک مثنوی میں نواب امین الدولہ وزیر لکھنؤ کے زخمی ہونے کی کیفیت لکھی ہے- ایک مثنوی معارج الفضائل معجزات ائمہ میں ہے، ایک کتاب زر کامل عیار شرح معیار الاشعار اور بہت سے رسائل علم عروض و قوافی کے فارسی اور اردو میں ہیں- رسالہ بیانِ اضافت، رسالہ تشریح الحروف فارسی میں ہے- قوائد مظفریہ علم نحو عربی میں ہے- ان میں سے بعض کتب طبع ہو چکی ہیں-

مدت دراز تک مرثیہ وسلام کہا کئے مگر وہ دفتر غدر میں تلف ہو گیا-

۱۲۲۹ھ میں غازی الدین حیدر بادشاہ تخت نشین اودھ ہوا- اسی سال امیر پیدا ہوئے، واجد علی شاہ کے عہد میں علی نقی خاں وزیر کے ہاتھوں امین الدولہ کی دوستی میں امیر بھی کچھ دن اسیر رہے-

اسیر نے قدرتاً شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ بہت پُرگو تھے۔ ساٹھ ساٹھ ستّر ستّر شعر کی غزل کہا کرتے تھے۔ مصحفی اکثر کہا کرتے تھے، ایک روز یہ آخری شاگرد اُستادوں کی صفِ اول میں جگہ لے گا۔

اسیر جب واجد علی شاہ کے دربار میں رفقا کے معزز عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ خطاب حاصل کیا تنخواہ مقرر ہوئی تو ہمچشموں میں اعزاز بڑھ گیا۔ شاعری چمک گئی۔ بہت سے شاگرد ہوئے۔ اسیر کی غزل گوئی کا رنگ سب سے الگ تھا۔ بہت پُرگو تھے۔ مضامین عالی نظم کرتے تھے۔ اصلاح بہت جلد دیتے تھے۔ جب انتزاعِ سلطنت ہوا اور بادشاہ کلکتے تشریف لے گئے تو اسیر لکھنؤ کو نہ چھوڑ سکے یہاں ان کے قدردان بہت تھے، اکثر ذی وقار اُمرا شاگردوں نے ایک محلہ منشی گنج کے نام سے آباد کیا تھا، اس میں رہتے تھے۔ کشیدہ قامت، گورے کتابی رُو متوسط الجثہ تھے اکثر ٹخنوں تک کا کرتہ پہنتے تھے۔

رشک اور اسیر میں معاصرانہ چوٹیں چلا کرتی تھیں۔ باوجود کمال کے اسیر میں خودنمائی نہ تھی۔ شاعر کی طبیعت کی افتاد کا اندازہ ان کے کلام سے ہوسکتا ہے۔ ایک شعر میں اپنی عادت کو نظم کرتے ہیں۔

مثلِ ہلال بعد ہو کب طالبِ نظر　　وہ خودنما نہیں ہیں جو صاحب کمال ہیں

مزاج میں انکسار بہت تھا اور اسی کو پسند کرتے تھے۔ ایک موقع پر نظم میں اس کا اظہار بھی کیا ہے ؎

جو افتادہ ہیں ان کی ہر جگہ تعظیم ہوتی ہے
ہجومِ خلق ہو ہر چند جا سایہ خالی ہے

درحقیقت اسیر کے مزاج کی اُفتاد ایسی ہی واقع ہوئی تھی۔ اس میں کچھ تکلف نہ تھا، ہر کہ و مہ سے تواضع پیش آتے تھے۔ علم و فضل کا غرور نہ تھا۔ آخر یہ آفتاب شاعری ۱۲۹۱ھ میں غروب ہوگیا، ان کے انتقال کی ایک تاریخ خواجہ محمد یوسف صاحب یوسف نے کہی تھی جس کا مصرعہ تاریخی یہ ہے

ہاں مصحفی کی باقی تھی اک یہ نشانی

غرض وہ زمانہ شاعری کے لئے بہت اچھا تھا جس میں اسیر آتش، ناسخ وغیرہ اہلِ کمال پیدا ہوئے اور اپنے کمال کی قدر کے ساتھ دنیا سے اُٹھ گئے۔ اب نہ صاحب کمال ہیں نہ قدردانِ سخن۔ اہلِ کمال ہیں بھی تو ان کے جوہری کہاں ہیں۔ بہت سے ہیرے اب پتھروں کے ساتھ تل رہے ہیں۔

عشرت لکھنوی

تاجپوشی کے روز ہز اکسلنسی وائسرائے صاحب نے حسبِ ذیل تار حضور ملک معظم کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔

"نہایت ادب و اطاعت کے ساتھ میں یور میجسٹی اور ملکہ معظمہ کی خدمت میں اپنی اور گورنمنٹ ہند نیز باشندگان ہند کی جانب سے اس سعید اور قابل یادگار موقع پر نہایت عقیدت مندانہ مبارک باد کا اظہار کرتا ہوں۔"

اس کے جواب میں حضور ملک معظم کا یہ پیام آیا:—

"ملکہ معظمہ نے اور میں نے آپ کے پیغام کو، جو آپ نے گورنمنٹ و باشندگانِ ہندوستان کی طرف سے بذریعہ تار میری تاجپوشی کے متعلق مجھے بھیجا ہے نہایت مسرت سے وصول کیا۔ براہ مہربانی ان کو ہمارا سچا شکریہ پہنچا دیں اور یقین دلا دیں کہ ہم ان کے ان وفادارانہ خیالات کی قدر کرتے ہیں"

عالمِ خیال کا چوتھا رُخ

مائی ڈیر مسٹر شاکر — جو لطف مجھ میں اور آپ میں ہی، اُس کے اثر کو اپنے دل پر، اور حق کو اپنے دماغ پر تسلیم کر کے میں سرِ دست اپنی ایک نظم جس کا نام "عالمِ خیال کا چوتھا رُخ" ہی "ادیب" میں شائع ہونے کے لئے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔

یہ مسلسل چار نظمیں ہیں، جن کا

(۱) پہلا رُخ جنوری ۱۹۱۱ء کے "الناظر" (لکھنؤ) میں شائع ہوا، اس میں ایک عورت جس کا شوہر پردیس میں ہی شوہر کی یاد میں محو، اپنے خیال سے باتیں کر رہی ہی۔ اس پہلے رُخ پر مسٹر شبیر حسین، قدوائی، بیرسٹرایٹ لا کا ریویو اپریل ۱۹۱۱ء کے "الناظر" میں نکلا ہی۔

(۲) دوسرا رُخ مارچ ۱۹۱۱ء کے "الناظر" میں شائع ہوا، یہ ایک خط ہی، پردیس سے شوہر کی آمد آمد ہی، عورت انتظار کر رہی ہی، وہ نہ آسکا اور اُس کا خط اس عذر کے ساتھ آیا کہ ابھی نہیں آسکتا ہی، عورت نے بے چین ہو کے شوہر کو خط لکھا ہی۔ اس دوسرے رُخ پر مسٹر محمد سلیمان بیرسٹرایٹ لا کا ریویو جون ۱۹۱۱ء کے "الناظر" میں نکلا ہی۔

(۳) تیسرا رُخ مئی ۱۹۱۱ء کے "تمدن" (دہلی) میں شائع ہوا، اس میں شوہر نے عورت کو اُس کے خط کے جواب میں تسلیاں دی ہیں، اور وعدہ کیا ہی کہ میں آج کے بیسویں دن آؤں گا۔ اس تیسرے رُخ پر سید مقصود علی، آسیونی، وکیل کا ریویو جون ۱۹۱۱ء کے "تمدن" میں نکلا ہی۔

(۴) چوتھا رُخ یہ ہی، جس کو میں "ادیب" کے لئے بھیج رہا ہوں۔

احمد علی، شوق، قدوائی

شوہر نے خط میں لکھا تھا کہ میں بیسویں دن آؤں گا، آج بیسواں دن

ہی، عورت انتظار میں اپنے خیال سے باتیں کر رہی ہی

اک ہی بیسواں دن آج، آئینگے "وہ" فروری — کیا میں کھنچی ہوئی رہوں "ان" کی نظر سے دور ہی
یاس سے ہوں جلی ہوئی اُس کو میں پھونک کو بھاڑ ہیں — ہشاش ہوں وصل سے، اشک کی یاس ہی تیری آنکھیں

ان "کی" سامنے تو پھر ہو نہ سکے جگر سے صبر — پاکے "انھیں" کبھی نہ ہو تری ہوئی نظر سے سیر
آئیں گے یاد آئیں گے، دل مرا کاش بول جائے — تاش آگ بجھے تو اشک کی گرہ کو کھول دے

ایں جگر کو تھام لوں کیا ... — ... رُخ میں ادھر کو پھیر لوں
پول اُٹھا وہ میرا دل، کہتا ہی آ رہے ہیں "وہ" — میرے محبت سا ہیں تھکتے ہیں ... "وہ"

ان "کی" ... سے واہ ایک ... — دل سے کروں تو عذر میں، دل جو تھکے تو کیا کروں
دیکھ رہی ہوں آرسی، چہرے پہ رنگ آ گیا — دل نے کیا ... ، وہ کہاں سے آ گیا

... یہ فلک ستم کا ہی — آ رے دل میں اُو امید، وقت ترے کرم کا ہی
دل کو ملا کہاں سے رنگ، اس کو ملا امید سے — پائے گلا ... "من" کی ... سے

... میں ... ہوں ... — اس میں چھپی ہوئی ہوں میں سو وہ مرے پاس آ ہی جائے
کل مرے سر میں تھا جنون ... سا — کل مرے دل میں تھا ملال ... سا

... خیال کا ... ہوں ... — در شیشۂ دل میں ... بند کر کے میں
اپنے ... بار بار ... تبسم آج — ...

[illegible] بچھا گیا
آئیں گے "وہ" ضرور ہی، مجھ کو یقین آ گیا

[illegible] دشمن کے ہوا ہے محوِ خورش
اس کو بھی مل گئی خبر، پھرتا ہے کیا چکور گردش

[illegible] پر اب جو کہیں گے "پی کہاں"
اُن سے کہوں گی ہنس کے میں، بیٹھے ہیں یہ کہو "پیا"

مل تو گئے ہیں مگر، میری نظر جھکی رہے
بعد کو بات چیت ہو، پہلے زباں رکی رہے

پاس کے "انھیں" [illegible]، اس میں کہاں چھپا رہا
اس کو تو بول چال میں "ان" کی زباں سے ربط ہو

پھنسنے کو میں پھنسوں، مگر، بن بھی سکوں گی، یا نہیں
تننے کو میں تنوں، مگر تن بھی سکوں گی، یا نہیں

بن کے شگفتگی خوشی منہ سے جو کھل پڑے تو پھر
لطف کے ساتھ کر کے میل "ان" سے نظر لڑے تو پھر

پیشتر تو یہ ہے [illegible] ان کو سکھاؤں ڈھنگ میں
لیکن اداؤں کس طرح منہ سے خوشی کا رنگ میں

[illegible] پتلیاں، چین سے کب یہ رہ سکیں
شوق سے بے قرار ہوں، گر یہ پیا ہے کہہ سکیں

دل یہ کہے گا ہیل کر لب یہ کہیں گے، بول دے
حُسن کہے گا ہاتھ سے، تو مرے رخ کو کھول دے

آپ ہی ہم بڑھ چلیں گے پاؤں، آؤں گی ہٹ کے سامنے
لائیں گی شوخیاں مجھے، مگر نگہ [illegible] کے سامنے

[illegible] کشش کی بن پڑے، دل کو جبر کی تھام لوں
صبر کی دل میں ٹھان لوں، جبر سے دل پہ کام لوں

بن کے بلائیں "اُن" کے سر آج چڑھوں ضرور ہی
دل میں ہنسا کروں، مگر منہ سے لڑوں ضرور ہی

حیا میں گلے میں لگ چکی، اور گلوں میں لطف ہو
ہو گی مزے کی نوک جھونک، گرچہ دلوں میں لطف ہو

آنکھ مری جو اٹھ ہی جائے، جلد نظر کو پھیر لوں
صرف نظر ہی کو نہیں، بلکہ میں سر کو پھیر لوں

آئیں جو رخ کی سمت "وہ" ہاتھوں سے منہ چھپاؤں میں
جھانک کے انگلیوں سے ہاں، دیکھوں جو دیکھ پاؤں میں

دانت مرے دبائیں گے، تاکہ رہے زبان بند
کچھ "وہ" کہیں، تو انگلیاں اٹھ کے کریں گی کان بند

ایک پلک سے، دوسری بند رہے، ملی رہے
جیسے کلی انار کی، سوکھ کے، بے کھلی رہے

بیچ کے لب پہ دانت ہوں، اور نظر زمیں پہ ہو
ہاتھ مرے جگر پہ ہو اور شکن جبیں پہ ہو

میرے لبوں پہ گو ہنسی آنے کی چھیڑ چھاؤ میں
ہاتھ میں لے کے پنکھیا منہ کو کروں گی آڑ میں

لب دو ایں خدا کرے، میں جو انھیں بلاؤں بھی
"اُن" سے ملیں نہ چتونیں، میں جو انھیں ملاؤں بھی

سر کو جو میں اٹھاؤں بھی، تو نہ اٹھے جھکا رہے
دل کو جو میں بڑھاؤں بھی تو نہ بڑھے رکا رہے

کچھ جو "وہ" [illegible] تو یہ لوں [illegible]
لاکھ کاوشوں کے بعد [illegible] کے بعد

بول اٹھوں، تو جو چھپا "اُن" سے، دشمن زبان کی
"وہ" [illegible] کہیں زمین کی، تھیں کہوں آسمان کی

"وہ" ترے خدا کی چٹکیاں یاد دلائیں گے مجھے
چھیڑنے کو ہنسیں گے خود، اور ہنسائیں گے مجھے

کر کے بہانے چونچلے اپنی ہی رکھوں ٹیک میں
لاکھ منائیں کریں "اُن" کی نہ مانوں ایک میں

دل جو نہ مانے، تو "انھیں" ترچھی نظر سے دیکھ لوں
یا [illegible] بچا کے ادھر سے دیکھ لوں

مجھ سے "وہ" مانگیں پانیں، دوں گی مگر دباں میں
پھیر کے منہ بڑھاؤں گی ہاتھ سے خاصدان میں

میری وفا کے جال میں کیا "وہ" الجھ ہی جائیں گے
صاف ہیں دل کی حسرتیں، یہ "وہ" سمجھ ہی جائیں گے

"آئی لبوں پہ وہ ہنسی" یہ کہیں اور ہنسائیں تو
لاکھ دباؤں میں، مگر لب مرے کھل ہی جائیں تو

دل میں جو گدگدی سی ہو، رک نہ سکے کبھی ہنسی
باتیں ہی [illegible] کی ہیں، آنے لگی ابھی ہنسی

اُف ہ، مجھے اس کا سوچ کیا، دل میں تو رنج ہے نہیں
اپنی وفا کو [illegible]، دل مرا ایسی مجھے نہیں

دل میں بسے ہوئے ہیں "وہ"، ہیں جو خیال "انھیں" کا ہو
دل مرا ہو وہ آئینہ، جس میں جمال "انھیں" کا ہو

پھیلے ہیں روح بن کے "وہ" میرے تمام جسم میں
میری حیات ہیں "وہی" جان ہیں تمام جسم میں

او مرے دل کشش کچھ اور تاکہ "وہ" کھنچ کے آ ہی جائیں
پر انھیں جلد پا ہی جاؤں "وہ" مجھے جلد پا ہی جائیں

جگ کو ہو رہی تو دیر اور وہ مزے کی بات ہو
دل کو لبھانے لا مزے، حسن کی یہ بھی گھات ہو

اب تو یہ فکر ہے کہ آج کچھ تو سنگار چاہیے
ٹوٹ گیا ہے کل بلاق، سونے کا تار چاہیے

شوق کے پاس بھیج دوں، ایک ذرا سا تار کیا
دام دیں "وہ" تو دیں، تار کا ایسا بار کیا

ہاتھوں میں چوڑیاں ہیں کم، ٹوٹ کے گر گئیں کئی
آئیں گے لے کے ہیرے میاں، اُن سے منگاؤں گی نئی

مجھ کو بھی سادگی پسند، "اُن" کو بھی سادگی پسند
پہنوں جو [illegible] ہو گا "انھیں" بھی کچھ پسند

بیلیں ہوں، یا ہوں بوٹیاں، چھپتی ہیں کارچیاں
[illegible] رکھی ہیں جا بجا نئیاں

بیل کناری کی ابھی [illegible] منگا دو ابھی
لائی ہے [illegible] ایک بیل اس کو بھی [illegible]

بیل ٹکی ہو، گو، مگر کچھ بھی نہیں، [illegible] خراب
ایک تو [illegible]، دوسرے [illegible] خراب

کر کے منگاؤں بیل میں [illegible] خط میں [illegible] آہ
[illegible]

۱۔ [illegible] عورت نے پال رکھا ہے، جس کے متعلق اس نے شوہر کو خط میں لکھا ہے کہ ع بول اٹھا وہ میرا موا ہاتھ سے اب تو دل گیا الخ

۲۔ چکور کو شوہر پال گیا تھا، جس کے متعلق خط میں عورت نے لکھا ہے کہ ع پال گئے ہو تم چکور، ہوتی ہے اس سے شاد میں الخ

۳۔ [illegible] کا ذکر عورت اپنے خط میں لکھ چکی ہے کہ ع گھر میں پڑا تار کا اس پہ [illegible] آتے ہیں الخ

یوں نہ کہو گڑیا سے نہیں سمجھ دو وہ بناتی ہیں گناہ — چونک سے ابھی آئے وہ، جائے جو لیتے نان پو
ناحق گنوا دو لوں، اگر پھول ہوں خانہ باغ میں — اب کے برس تو موگرا گھر میں کھلانا یار نہیں
ہو ہی رہے گا یہ تو سب، مجھ کو خیال ایک ہے — سانس تیرے تو زبان چُپ، منہ مزور نیک ہے
اُس کی سی ابی کی گانٹھ دور کر، ابھی تو ہوگی شہر میں — دیکھ ہر سِرے میں اک گھڑی اس نے بچھا کے زہر میں
یعنی ہو دل میری چٹکیاں کرتی ہو دل کا غرق — آتی ہو کہ بعد اپنے ساتھ میرے لئے جنون وہ
جب وہ جلن سے لال ہو گال ہوں گرم دو توے — زرد تر ہر لمحہ اور داغ جیسے چھلے ہوئے جوے
دیکھ کے یہ چمک رنگ، وہ مسند روپیہ سے جلے — بیٹھ رہی کوئی جس طرح جیٹھ کی دھوپ سے جلے
آج مجھے بھی ہر گھڑی جانے کا کچھ بھی غم نہیں — اُس کو جو ہو کسی "پناہ" میں بھی کچھ اس کم نہیں
اے رو حضور ... بندی سنورتی ہی رہی — جن نے بڑا سنگار کچھ، حوصلہ کرتی ہی رہی

محمد علی، شوق، قدوائی

رباعیات شاکر

خوش رنگی پہ گل کی سر نہ دھن اے بلبل — گر داغ جگر کے میرے گن اے بلبل
سن سن کے چمن میں گل بھی سن ہو جائے — منقار قلم کے نغمے سن اے بلبل

شوخی سے حجاب ان کا عاری سمجھو — پردے کو حیا کی پردہ داری سمجھو
اغیار سے اٹھ کر جھکے میری طرف — اب لطف کو بھی ستم شعاری سمجھو

کس روز ہوا وہ دشمنِ جاں اپنا — نکلا شبِ وصل بھی ارماں اپنا
اس شوخ کا جیب سے دامنِ تار چھٹا — ہے اپنے ہی ہاتھ میں گریباں اپنا

ہے شوخی تمکین کہ سیماب میں موج — رخسار میں تابش ہے کہ مہتاب میں موج
وہ حسن سے اپنے آپ ہیں سکتے میں — آئینہ میں حیرت ہے کہ گرداب میں موج

دنیائے دنی سے کر کرانہ شاکر — یہ دام کا دم ہے کب ہو دانہ شاکر
گر صبحِ رواں کا تجھ کو لینا ہے سراغ — جاسوسِ نفس کو کر روانہ شاکر

عالمِ رؤیا

خواب کیا ہے؟ اک طلسمی بات ہے — پردۂ تصویرِ وہمیات ہے
خواب کیا ہے؟ رونقِ بزمِ وصال — زینت افزائے شبستانِ خیال
انبساطِ روحِ نفسانی ہے یہ — اک سرورِ سیرِ روحانی ہے یہ
ہے خیالاتِ پریشاں کا سماں — عقل حیراں ہو یہ پہنچا دے وہاں
اک نئی دنیا میں لے جاتا ہے یہ — سیرِ رنگا رنگ دکھلاتا ہے یہ
اس نے دکھلائے تماشے دمبدم — چین سے سوتے رہے بستر پہ ہم
جن سے ملنے کی تمنا تھی ہمیں — لا کے پہلو میں بٹھایا ہے انہیں
ہوں حواسِ ظاہری یا باطنی — سب نے کی اے خواب تیری پیروی
کان تھے مشتاق جس آواز کے — رازِ مخفی نغمہائے ساز کے
وہ شریلے نغمہائے دلگداز — جس میں نغمہ نے بھرا ہے سوز و ساز
تو نے سنوا کر اُسے تڑپا دیا — دل تک اُس کا خاص اثر پہنچا دیا
چشمِ حیراں کو کبھی بسمل کیا — اچھی صورت پر اُسے مائل کیا
تو نے توڑے ہیں طلسماتِ عجیب — تو نے دکھلائے ہیں اسرارِ غریب
سامنے ہیں کیسی کیسی صورتیں — کس غضب کی پیاری پیاری مورتیں
اس کا مبدا ہے دماغ انسان کا — ہے یہ عشرت خانہ اس مہمان کا
جو نہ دیکھے تھے تیرہ وہ دکھائے — عالمِ باطن کے راز اس نے بتائے
یہ بھی ہے قدرت کا اک سرِ خفی — منکشف کیا ہو حقیقت خواب کی

عزیز لکھنوی

قطعہ تاریخ

(جشن تاجپوشی حضور ملک معظم جارج پنجم دام ملکہ)

کیا مبارک دن ہے ساعت نیک ہے — ہو مبارک قیصرِ جم جاہ کو
از سرِ اقبال لکھو مہر سال — تاجپوشی ہو مبارک شاہ کو

۹ ۲ ۳ ۱ ۳

ایس۔ ایچ۔ مہر

تہنیت

(جشن تاجپوشی حضور جارج پنجم بادشاہِ انگلستان و قیصر ہندوستان دام اللہ سلطنتہ)

یہ کیا انداز ہی کیا عالم آرائی کا ساماں ہی کہ ویرانہ چمن ہی اور چمن گلزار رضواں ہی
زمین و چرخ دونوں مظہر عیش و مسرت ہیں ادھر گلہائے خنداں ہیں ادھر انجم درخشاں ہی
سمک سے تا سما چھایا ہوا ہی نور کا عالم زہے تنویر ہر ذرہ مثالِ مہر تاباں ہی
مشامِ روح کو ہی تازگی ایک ایک جھونکے سے جو اک قند موجِ بوے گل عنبر بداماں ہی
کھلی جاتی ہیں کلیاں دل کی آپ ہی آپ دیکھو تو ہواے سرد میں لیف انشاط انگیز پنہاں ہی
مبارک اہلِ گلشن تم کو یہ ایام عشرت کے کوئی سنبل سے کہدے جا کے کیوں ناحق پریشاں ہی
زراعت کا زمانہ آگیا فضل الٰہی سے دُرِ مقصود سے پُر ہر کس و ناکس کا داماں ہی
ہویدا ہیں در و دیوار سے آثار بہجت کے کہیں طوطی ترنم زا کہیں بلبل غزل خواں ہی

جوانِ چمن کی منعقد ہی انجمن دیکھو
خوشی میں آکے باہم ہو رہے ہیں حرف زن دیکھو

رچا ہی آج جشنِ تاجپوشی جارج پنجم کا نثارِ فرقِ اقدس ہی خزانہ ماہ و انجم کا
خوشی کا وقت ہی یہ شبھ لگن ہی نیک ساعت ہی ہوا ہی غلغلہ ہر شش جہت بانگِ ترنم کا
رُخِ پُر نور کے صدقے اُتر لیں دیکھنے والے ہی زیبِ تختِ شاہی جانشیں اڈورڈ ہفتم کا
لبِ اقدس کی ہر جنبش میں گویا پھول جھڑتے ہیں تعالی اللہ کیا کہنا ہی اس طرزِ تکلم کا
نگاہِ شاہ بھی اے مرحبا کیا روح پرور ہی مگر اس کے اشاروں میں اثر پوشیدہ ہی قم کا
سحابِ فیضِ شاہنشاہ سے سیراب ہی عالم دُرِ شہوار سے دامن بھرا ہی بحر و قلزم کا
قیامِ امن ہی کچھ اس طرح عہدِ ہمایوں میں عناصر میں بھی اب باقی نہیں امکاں تصادم کا
سبق آموزِ کسریٰ ہی عدالت شاہِ والا کی کسی پہ ہاتھ اُٹھا سکتا نہیں کوئی تظلم کا

رعایا سے محبت کا سدا اظہار ہوتا ہی
کہاں اولاد پر ماں باپ کا یوں پیار ہوتا ہی

مبارک تجھ کو لے ذی مرتبت یہ جشن شاہی ہو ترے قبضہ میں لے والا گہر مہ تا بہ ماہی ہو
رہے قائم ہزاروں سال ظلِ عاطفت تیرا جہاں میں روز افزوں تیری شانِ کجکلاہی ہو
صدہا رحمتِ حق خلق پر ہو تا ابد تجھ سے تری وابستہ دامن شہا عالم پناہی ہو
تری عظمت دوبالا ہو ترا اقبال روز افزوں قمر چاکر ترا خورشید لشکر کا سپاہی ہو
ضیا بخشِ جہاں تنویرِ مہر و ماہ ہی جب تک شہا تیری مسلم شش جہت میں بادشاہی ہو
ہوا خواہوں کو تیرے عیش حاصل ہو زمانہ کا نصیبِ دشمنِ بدبخت وہم غم و سیاہی ہو
ادھر جود و کرم کی تیرے ہو دنیا میں ارزانی ادھر تجھ پر نزولِ پیہم لطفِ الٰہی ہو
دعا یہ بر زباں پہ آگیا پھر مصرعِ اوّل مبارک تجھ کو اے ذی مرتبت یہ جشن شاہی ہو

رہے تو حکمراں دنیا پہ عیش و کامرانی سے
مسخّر ربع مسکوں ہو خدا کی مہربانی سے

محمد فاروق

اخلاقی غزل

حُسنِ اخلاق ہی کو کہتے ہیں جادو اے دوست دل کی تسخیر کا یہ سیکھ لے پہلو اے دوست
تو خمیدہ ہو اگر شکلِ کماں دُنیا میں کیوں کشیدہ ہو کوئی صورتِ ابرو اے دوست
دل ستائے گا غریبوں کا تو مٹ لے ہم سے چین پائے گا نہ تو بھی کسی پہلو اے دوست
حُسنِ ظاہر پہ شرف رکھتا ہی حُسنِ باطن پھول اچھا ہی وہی جس میں ہو خوشبو اے دوست
نیک دل ہو کے اگر حُسنِ لیاقت سے ملے دل سے ہو دوست ابھی دشمنِ بدخو اے دوست
کاہلی چھوڑ دے مائل ہو ریاضت کی طرف اس سے بہتر نہیں آرام کا پہلو اے دوست
ہند پر ہیں جو تعصب کی بلائیں نازل غم کے سامان نظر آتے ہیں ہر سو اے دوست
رکھ نہ ابنائے زمانہ سے خصومت کوئی دل میں تو ان کو سمجھ قوتِ بازو اے دوست
جائز اصلا نہیں توہین کسی مذہب کی دین اسلام ہو یا مذہب ہندو اے دوست
دیکھ پچھتائے گا اُترے گا جب اس مے کا خمار نشۂ عیش میں غافل ہی عبث تو اے دوست
آنکھ اگر ہی تو زمانے کی روش دیکھ کے چل کیوں گرا پڑتا ہی اندھوں کی طرح تو اے دوست

مشکلیں سب تیری ہو جائیں گی آساں محب
راہِ کوشش میں مناسب ہی تگاپو اے دوست

محب دریاآبادی

چشمِ جاناں

میں ترے عشق کا بیمار ہوں چشمِ جاناں　　ہمہ تن ساغرِ سرشار ہوں چشمِ جاناں
سخت مجبور ہوں لاچار ہوں چشمِ جاناں　　زیست سے تنگ ہوں بیزار ہوں چشمِ جاناں
شوقِ دیدار میں دُنیا سے گزر جاؤں گا
دیکھنا دیکھنا ایک روز میں مر جاؤں گا

دلِ وحشت زدہ کو ہو گیا سودا تیرا　　رات دن پیشِ نظر رہتا ہے نقشہ تیرا
صورتِ آئینہ ہے محوِ تماشا تیرا　　شوخیاں کرتا ہے کھنچ کھنچ کے سراپا تیرا
دیکھ کر تجھکو وہ کیا اور کسی کو دیکھے
کھُب گیا ہو جو نگاہوں میں اُسی کو دیکھے

راستے حسن پرستی کے دکھائے تو نے　　سرد مہری سے کنول دل کے بجھائے تو نے
خرمنِ صبر و خرد کتنے جلائے تو نے　　ہائے کیا سوتے ہوئے فتنے جگائے تو نے
تیری گردش میں زمانہ تہ و بالا ہی رہا
آہ حیران ترا چاہنے والا ہی رہا

معدنِ شرم و حیا مخزنِ عفت تو ہے　　سببِ عشق ہے تو وجہِ محبت تو ہے
باعثِ رنج و گرفتاری و آفت تو ہے　　موجبِ صد الم و درد و مصیبت تو ہے
حُسن نے کوٹ کے بھر دی ہے شرارت تجھ میں
کیوں نہ کہہ دوں کہ سمائی ہے قیامت تجھ میں

چمنِ دہر میں حالت ہے عجب نرگس کی　　شوقِ دیدار میں پتھرا گئیں آنکھیں اس کی
غیر حالت رہے کس طرح نہ اس بے بس کی　　تابِ نظارہ جو لائے یہ نظر ہو کس کی
دیکھنے کے لئے گو آنکھ خدا نے دی ہے
نور کی بجلی کسی نے بھی کہیں دیکھی ہے

آنکھ لگتی ہے کہاں تجھ سے جہاں آنکھ لگی　　تیری شوخی و شرارت تو ہے دیکھی بھالی
اس طرف دیکھ لے حُسن کی او متوالی　　بن گئے پُتلی مرے آنکھوں میں سمانے والی
ہائے کس کس پہ چلا دہر میں جادو تیرا
میرے مانند گرفتار ہو آہو تیرا

گوہرِ اشک تری نذر کیا چاہتا ہوں　　حاضرِ بارگہِ حسن ہوا چاہتا ہوں
کیا بتاؤں تجھے کیا حال ہے کیا چاہتا ہوں　　دے کے دل اک نگہِ مہر و وفا چاہتا ہوں
حکم ہو گر تو بٹھالوں تجھے سر آنکھوں پر
پورے ارماں ہوں جو پاؤں تجھے سر آنکھوں پر

خوش ہوں یہ خواہشِ دیدار گر اندھا کر دے　　تو مگر اک نگہِ لطف سے اتنا کر دے
چشمِ باطن جسے کہتے ہیں اُسے وا کر دے　　رازِ سب قدرتِ خالق کے ہویدا کر دے
نظر آئے در و دیوار سے جلوہ تیرا
دیکھ لوں ذات میں اپنی ہی سراپا تیرا

جامِ لبریزِ محبت کے پلا دے اے جاں　　گرمیِ آتشِ سیّال دکھا دے اے جاں
کلفتِ رنج و الم دل سے بھلا دے اے جاں　　مری سوئی ہوئی قسمت کو جگا دے اے جاں
سخت بیتاب ہوں سینہ سے لگا لے مجھ کو
اپنے آغوشِ محبت میں سُلا لے مجھ کو

اب نہ باقی رہی دل میں ہوسِ جامِ شراب　　مئے پر جوشِ محبت سے ہے سرشارِ شباب
کڑھیں لیتا ہے دل ہجر میں مانندِ کباب　　نگہِ لطف بفرما کہ شد ہنگامِ عتاب
تیرا جلوہ رہے دن رات مری آنکھوں میں
اور بسر ہو تری اوقات مری آنکھوں میں

محمد سیف الدین شباب

آج

اُٹھو! اُٹھو! دن گزر چلا ہے، پڑے ہو کن وسوسوں میں، جاگو!
حریف جوشن پہن چکے ہیں، نہیں مناسب کہ رن سے بھاگو!
جگہ جو ہے معرکے میں خالی، تمہارے ہی انتظار میں ہے
کرو دل و جان سے اُس کو پورا، وہ فرض جو کارزار میں ہے
ہیں شیخ چلی کے خواب، چھوڑو خیالِ آیندہ و گذشتہ
کہ "آج" ہے، اور کچھ نہیں ماہ و سال آیندہ و گذشتہ

اٹھو! اٹھو! یہ خیالِ آیندہ چھوڑ دو طاری ہے جو دلوں پہ
کہ جا کے گھمسان کی لڑائی میں ہم دکھائیں گے اپنے جوہر"
کریں گے یا جا کے ہم کسی دن ہوائی قلعہ کوئی مسخر
معاف میں مُنہ کی کھائے گا ہم سے لاکھ ہو کوئی دیو پیکر
سامنے آیندہ کارناموں میں ہوگی بے شبہ شانداری
ملے گی توقیر تم کو بیشک اگر ہو قسمت میں فضلِ باری
مگر نہ پاؤ گے بازوؤں میں تم اپنے طاقت جو "آج" جتنی
تمہاری میداں میں پھر نہ ہوگی کبھی ضرورت جو "آج" جتنی

اٹھو! اٹھو! جو رکاوٹیں ہیں، خیال میں بھی انھیں نہ لاؤ
جو روز و شب کل گزر چکے ہیں، تم اپنے دل سے انھیں بھلاؤ
ستم ہے زنجیرِ یادِ ایّام پائے مردانہ پر کڑی ہے
اسیر آج اس کے ہو گئے تم کہ جس کی بوسیدہ ہر کڑی ہے
ہو خواہ شاداں، ہو خواہ غمگیں، نکال دو پاؤں سے سلاسل
یہ زنگ خوردہ ہیں اور پرانی، تو توڑنا ان کا کیا ہے مشکل؟
نگاہ ڈالو نہ مڑ کے طومارِ کہنہ پر تم کبھی - مگر ہاں
سبق وہ پڑھ لو جو جنگِ "امروز" میں ہو جرأت فزائے مرداں

اٹھو! اٹھو! دن گزر چلا ہے یہ آتی دھیمی سی جو صدا ہے
صدا یہ دشمن کے کوچ کی ہے، تمہارے سر پہ جو آگیا ہے
کرو نہ ہتھیار تیز کرنے میں دیر ہرگز، کہ وقت کم ہے
وگرنہ پھر تم ہو، اور سر پہ تمہارے وہ وقتِ پُرالم ہے
کہ آنے والی لڑائی کے خواب سے ہو بیدار جس گھڑی تم
تو یہ سنو پھر کہ "ہو چکی وہ لڑائی" تب ہوش کیوں نہ ہوں گم

محروم

(ترجمہ از انگریزی)

دوست کو پیام

یہ عطا کیا ہے تم نے مجھے سوز و ساز کیسا
مرے دل میں بھر دیا ہے غمِ جاں گداز کیسا

یہ کشاکشِ تمنا یہ امید کامیابی
یہ تخیلاتِ باطل یہ نمودِ اضطرابی

یہ خلش یہ دردِ پنہاں یہ تڑپ یہ آہ و زاری
یہ ہجوم اندوہ کا یہ وفورِ بیقراری

کبھی بیمِ نامرادی کبھی اشتیاقِ عشرت
کبھی ذوقِ سازگاری کبھی خوفِ یاس و حسرت

کبھی موجِ شادمانی کبھی سوزِ دل سے گریاں
کبھی خود بخود فسردہ کبھی خود بخود پریشاں

کبھی شاکیِ زمانہ کبھی شکوہ سنجِ قسمت
کبھی واصفِ محبت کبھی نکتہ چینِ الفت

نہ ہو چین لمحہ بھر کو نہ سکون ایک دم کو
نہ قرار ہے خوشی کو نہ قیام ہے اَلم کو

تمہیں لطف کیا ملا ہے مری بیکلی سے آخر
تمہیں ہاتھ آ گیا کیا مری بیدلی سے آخر

مرے دل میں تھی تمنا، مرے دل کا مدعا تھا
مرے دل کی آرزو تھی، مرا دل یہ چاہتا تھا

تمہیں مجھ پہ رحم آتا، مجھے تم بھی پیار کرتے
مرے شیوۂ وفا کو کبھی تم اختیار کرتے

مرے دل کا درد سنتے، مرے چارہ ساز ہوتے
مری غمگساری کرتے، مرے دل نواز ہوتے

نہ میں اس طرح تڑپتا، نہ میں بیقرار ہوتا
نہ یہ اضطراب ہوتا، نہ یہ انتشار ہوتا

مری چشمِ خونچکاں سے نہ لہو ہی یوں ٹپکتا
نہ جگر میں آگ لگتی، نہ یہ شعلہ یوں بھڑکتا

مجھے کیوں جلا رہے ہو، مجھے کیوں ستا رہے ہو
مرے نقشِ زندگانی کو عبث مٹا رہے ہو

تمہیں منصفی سے کہہ دو، یہ ہے طرزِ ناز کیسا
میں نیاز مند ہوں گر تو پھر احتراز کیسا

مرے زخمِ دل کا کچھ تو کبھی التیام ہو جائے
مرے دردِ غم کا اب تو کہیں اختتام ہو جائے

ارشدؔ تھانوی

رباعی

خوش حال اگر پوچھو تو ہم میں کم ہیں
اک جانِ حزیں ہے، اور ہزاروں غم ہیں

ہیں لائقِ تعریف و ثنا اور ہی لوگ
ہر طور سے افسوس کے قابل ہم ہیں

سید غلام مصطفیٰ ذہینؔ

قطعۂ عبرت آمیز

جانبِ گورِ غریباں کل جو عبرت لے گئی ٹوٹی پھوٹی چند قبروں کے نظر آئے نشاں
دل بھر آیا ہائے ان کی بیکسی کو دیکھ کر ہو گئے آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں
مل کے اک اک قبر سے میں دیر تک رویا کیا فاتحہ پڑھ کر چڑھائی چادرِ اشکِ رواں
سایۂ اشجار میں سوتے تھے غافل بیکسے ابرِ رحمت کا کھنچا تھا ان کے سر پر سائباں
زندگی کے تھے یہ جھگڑے اب جو دیکھا دیگر ایک ہیں سب دوست دشمن مہرباں نامہرباں
دلربا تھے جن کے نقرے جن کی باتیں دلفریب ہو گئے کچھ ایسے چپ گویا نہیں منہ میں زباں
منہ سے ہنگامِ تکلم پھول جھڑتے تھے سدا ہو گئیں اب ختم وہ تقریر کی رنگینیاں
بن کے اک اک شعر میں شورِ قیامت تھا بپا چپ پڑے ہیں اک طرف وہ شاعرِ معجز بیاں
نظم میں بھی نثر میں بھی جن کو حاصل تھا کمال اک دو ورقہ طبع کا جن کی گلستاں بوستاں
کیا کہوں میں دے گئے داغِ جگر داغ و امیر وہ جلالِ باکمال اب ہائے دنیا میں کہاں
سرد اب کیونکر نہ ہو گرمیٔ بازارِ سخن کچھ شرر باقی ہیں لیکن برق آنکھوں سے نہاں
جس کی گویائی کا اک باغِ جہاں شیدا تھا یادگارِ ذوق یعنی وہ ظہیرِ نکتہ داں
تھا سرور افزا کلامِ پاک جن کا دو سرو جن کے ہر اک شعر میں اک گنجِ معنی تھا نہاں
قیدِ ہستی سے ہوا آزاد بھی آزاد اب موت کی تلخی سے چپ ہی ملے وہ شیریں بیاں
خیر سے گذرے جو دم اُس کو غنیمت جانئے حالی و شبلی سے ہے اب رونقِ ہندوستاں
ہیں بہت تھوڑے سے باقی ہند میں صاحب کمال قدرداں لازم ہے ان کی، لوگ پھر ایسے کہاں
کام جو کرنا ہے کر لو کیا بھروسہ زیست کا لے گئی ہے موت چن کر کیسے کیسے نوجواں
چلتے چلتے دے گئے اک داغ یہ سید علی ہے زمیں سے آسماں تک اک صدائے الاماں
رنگِ دنیا دیکھ کر آنکھیں ہماری کھل گئیں خوابِ غفلت سے ہوئے بیدار دیکھا یہ سماں
بھائی سے بھائی یہ کہتا ہے کدھر ہو بھائی تم باپ ہے بہرِ پسر اُف اک طرف نوحہ کناں
خوں فشاں ہے اک بہن اپنی بہن کے واسطے یاد کر کے اپنی بیٹی کو کہیں روتی ہے ماں
بے خبر سوتے ہیں یہ ان کو خبر کچھ بھی نہیں برق کیا ان پر گرائے گی جفائے آسماں
بوئے گلہائے چمن سے کیا معطر ہوں دماغ بے اثر ہیں اب نسیمِ صبح کی اٹکھیلیاں
کیا اٹھیں گے یہ بھلا مرغِ سحر کی بانگ سے کیا جگا لے گی انہیں آوازِ ناقوس و اذاں
عطر آگیں تھی کبھی جن کی شمیمِ جانفزا خاک میں آلودہ ہیں وہ گیسوئے عنبر فشاں
حادثاتِ دنیوی سے ان کو کیا خوف و خطر کیا بگاڑے گا اب انکا انقلابِ آسماں
خندۂ گل کی صدا سے بے خبر ہیں ان کے گوش خوش کرے کیا اپنے شیریں راگ سے آبِ رواں
لطف کیا ان کو میسر صحبتِ احباب کا ہو گئیں بے رنگ رنگا رنگ بزم آرائیاں
فرقتِ احباب میں آنسو رواں تھے دمبدم کہہ رہا تھا اپنے دل میں یہ کہاں اور میں کہاں
سر بزانوئے تفکر میں اسی حیرت میں تھا گوشِ عبرت میں مرے آواز آئی ناگہاں
دیکھ اے واصف ذرا انجام پر بھی کر نظر کون ہوتا ہے پسِ مردن رفیقِ بیکساں

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

واصف اکبرآبادی

رباعیات

واعظ کا مقولہ ہے کہ عقبیٰ مل جائے منعم کی تمنا ہے کہ دنیا مل جائے
دنیا عقبیٰ یہ دونوں چھوڑے ہم نے ہم تو یہی کہتے ہیں کہ مولیٰ مل جائے

کیا کوئی سنے غم کا فسانہ تیرا کہہ تو ہی کہاں تھا آشیانہ تیرا
ناداں سمجھ اپنے کو کہ دانا بلبل لایا ہے قفس میں آب و دانہ تیرا

سامانِ حیات رنج و غم میں دیکھا الفت کا مزہ ترے ستم میں دیکھا
جب تو نے دکھائی آنکھ دل لے کے مرا ایک جامِ سفال جامِ جم میں دیکھا

صوفی ہے ترے حال سے بندہ آگاہ تو باتیں عبادت کی نہ کر خواہ مخواہ
دل میں بخدا بتانِ کافر کی ہے یاد گو ورد زباں ہے تیری اللہ اللہ

عبدالحمید حمید (میرٹھی)

تازہ غزلیں

ہم فقیروں کا ٹھکانا بھی کہیں ہو جائے گا
جام ہمدم شیشۂ مے ہم نشیں ہو جائے گا

آکے مے خانہ میں جو عزلت گزیں ہو جائے گا
دور گردوں اس کو دور ساتگیں ہو جائے گا

دل کو روشن کر اگر ہو نیش زن زنبور غم
چاندنی راتوں میں پیدا انگبیں ہو جائے گا

بار عصیاں روز لے جایا کریں گے گر ملک
دبتے دبتے آسماں آخر زمیں ہو جائے گا

لے چلی تخت رواں سے خاک مرقد میں قضا
دیدۂ مور اب سلیماں کا نگیں ہو جائے گا

پہلے اپنی بات کا پیدا تو کر لے اعتبار
پھر اگر جھوٹ (بھی) کہہ دے گا یقیں ہو جائے گا

کچھ تو رہنے دے قیامت کے لئے بھی اے فلک
کیا عذاب حشر سب مجھ پر یہیں ہو جائے گا

خودنمائی اس قدر منہ پر یہ واعظ خیر ہے
ناز یہ کرنے سے کیا تو نازنیں ہو جائے گا

خامۂ و ذہن رسا کا روز افزوں ہو کمال
وہ تو صورت گر یہ معنی آفریں ہو جائے گا

آنکھ میں اک رس ہے لیکن شرط ہے طرز نگاہ
زہر ہو جائے گا یہ یا انگبیں ہو جائے گا

کچھ دنوں نوک مژہ کاوش اگر کرتی رہی
نام تیرا نقش دل میرا نگیں ہو جائے گا

بزم میں ہے تیرے پہنچائے گا ساغر چشم زخم
خط پیمانہ نگاہ نکتہ چیں ہو جائے گا

بحث رندوں سے نہ کر جا کے واعظ حضور
کیا رہے گی پھر اگر ملزم کہیں ہو جائے گا

علی حیدر طباطبائی لکھنوی

عدو ہے باغ میں وہ گلعذار راہ میں ہے
خزاں چمن میں ہے فصل بہار راہ میں ہے

خیال دوری احباب و یار راہ میں ہے
یہ ایک اور طبیعت پہ بار راہ میں ہے

جسے میں دیکھتا ہوں اشکبار راہ میں ہے
بتائے کون یہ کس کا مزار راہ میں ہے

بلائیں لیتا ہوں میں دور ہی سے توسن کی
سنا ہے جب سے کہ وہ شہسوار راہ میں ہے

عجب نہیں ہے وہ جائیں اٹھا کے دامن کو
بلند خاک سے میری غبار راہ میں ہے

حرم کا شوق بھی ہے بتکدہ کا قصد بھی ہے
مقام دور عجب انتشار راہ میں ہے

نہیں جو کھلتا ہے ساقی سے کاگ بوتل کا
سبب یہ ہے کہ کوئی بادہ خوار راہ میں ہے

اڑا اتنا خاک ہو جنگل میں کس لئے آتے ہیں
خبر نہیں تیرا ناقہ سوار راہ میں ہے

شہید عشق ہزاروں ہیں اس کے کوچہ میں
قدم قدم پہ بپا اک مزار راہ میں ہے

نکل گئے ہیں بہت دور قافلے والے
خبر نہیں کہ کوئی بے قرار راہ میں ہے

ہر ایک گام پہ آنکھوں سے ملے ہو نقش قدم
مسافروں کا بھلا کیا شمار راہ میں ہے

عدم کو منہ کو چھپائے جو لوگ جاتے ہیں
چڑھا دیا ہے کسی جا اتار راہ میں ہے

ہوس ہیں کا عشق تجسس اسی کا کرتے ہیں
بتوں کا ذکر ہمیں ناگوار راہ میں ہے

کشش تو جذبۂ دل آج اپنی دکھلا دے
لبوں پہ دم ہے مرا اور یار راہ میں ہے

کھلائے ٹھوکریں ماہر نفس امارہ
عدو کے ساتھ کا کیا اعتبار راہ میں ہے

ماہر کنتوری

تاکہ دیکھے حسن یکتائے رخ یار آئینہ
بن گیا اس آئینہ کا آئینہ دار آئینہ

دونوں آنکھیں آئینہ ہیں دونوں رخسار آئینہ
دیکھنا ان کا کرخ روشن ہے یا چار آئینہ

میں ادھر صورت سے حیراں وہ ادھر تصویر ہے
بیچ میں ساکت ہے کیوں نخل دیوار آئینہ

جب کہ بازار ازل میں تھی نمائش گاہ حسن
دیکھنے والوں سے پہلے تھا خریدار آئینہ

داغ غم سے ہو کے روشن دل مرا جلنے لگا
ماہ بن کر بن گیا مہر پر انوار آئینہ

صبح ہوتے دیکھتا ہے اس بت کافر کا منہ
حسن کی دیوی کا ہے شاید پرستار آئینہ

وہ مکدر ہم سے ہیں دل کی صفائی مٹ گئی
ہو گیا آخر غبار آنے سے بیکار آئینہ

کرکے ثابت رخ ادھر منہ پر دیا الٹا جواب
خوب محفل میں بنا ان کا طرفدار آئینہ

تم نے دیکھا ہی نہیں اپنا ابھی حسن و جمال
دل میں رکھ لو گے اگر دیکھو گے اک بار آئینہ

ایک کے دو دیکھ کر ثابت ہوا وہ کٹ گئے
کھل گئے جوہر نظر آیا جو تلوار آئینہ

شکل دیکھی اپنے جینے کی سرکتے ہی نقاب
ہے ترا رخ ہم کو آتے آئینہ رخسار آئینہ

میری جانب پشت کر لی ان کا چہرہ دیکھ کر
ہو گیا ان کی طرح صورت سے بیزار آئینہ

یوں پڑھاتی ہے سبق ندرت زباں کو طبع صاف
جیسے طوطی کو سکھائے طرز گفتار آئینہ

ندرت میرٹھی

ایڈیٹوریل

اس ماہ کا پرچہ تمدنِ ہند کے ایک باب سے شروع ہوتا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر لیبان مرحوم کی آخری علمی یادگار ہے۔ بعض اخبارات نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ شاید اب ترجمہ تمدنِ ہند کی اشاعت نہ ہوگی۔ مگر یہ خبر بالکل بے بنیاد ہے۔ کتاب کی چھپائی کا کام شروع ہے اور تھوڑا تھوڑا حصہ چھپتا ہے۔ ہمارے مکرم پادری جان ملکم صاحب کتاب کی نظر ثانی کر رہے ہیں، اور انھیں کی نگرانی میں کتاب چھپ رہی ہے۔ ہندوستان کے قدیم حالات پر جس قدر گہرا پردہ پڑا ہوا ہے اور جس قدر اس قدیم ترین ملک کی نسبت تاریخی لاعلمی چھائی ہوئی ہے اس لحاظ سے تمدنِ ہند کی اشاعت بے حد ضروری ہے۔ ہم پادری جان ملکم صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اس مفید عام اور لاثانی کتاب کا ایک باب ہمیں عنایت فرمایا اور وعدہ کیا ہے کہ آیندہ بھی خاص خاص ابواب ادیب کے لئے مرحمت فرمائیں گے۔

ہم نہایت خوش ہیں کہ ادیب کے جون نمبر کو عام طور پر پسند کیا گیا، اور اردو اخبارات کے علاوہ انگریزی اخبارات نے بھی اس کی تعریف کی بعض ایسے حضرات نے بھی ہماری محنت و کوشش کی داد دی ہے جو ادبی معاملات میں خاص بصیرت اور تجربہ رکھتے ہیں۔ یوں تو ہمیں بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں، مگر اس موقع پر ہم صرف دو خط ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

مولوی ناظر الدین حسن صاحب۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ڈی، بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ ایک ایسے معزز و جلیل القدر تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جو زمانۂ حال کی بہترین تعلیم و تربیت کا نمونہ ہیں، حال ہی میں آپ یورپ و بلادِ اسلامیہ کے سفر سے واپس آئے ہیں۔ آپ جون نمبر کے متعلق حسب ذیل تحریر فرماتے ہیں:۔

"۔۔۔ یہ رسالہ ظاہری حیثیت سے تو تمام اردو رسائل سے بہتر ہے اور اس کے مضامین بھی ایسے قابل حضرات کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ شاید کسی دوسرے اردو رسالے میں اس اعلیٰ پایہ کے مضامین مشکل سے نظر آئیں گے۔ تصاویر کی ترتیب و صفائی بھی بہت ہی قابل تعریف ہے۔۔۔۔۔"

مولانا سید علی حیدر صاحب طباطبائی نظم لکھنوی، عربک پروفیسر نظام کالج، حیدرآباد (دکن) ایک بلند پایہ عالم اور زبانِ اردو کے زبردست مصنف ہیں اور ادیب کی قلمی اعانت میں آپ نے ہمیشہ غیرمعمولی دلچسپی ظاہر فرمائی ہے۔ آپ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جون کا رسالہ آپ نے باوجود اس کم مہلت کے بڑی آب و تاب سے نکالا۔ سب مضامین دلچسپ اور نفیس ہیں۔ آپ کے حسنِ انتظام و صحتِ مذاق و خوبیِ انتخاب میں کوئی شک نہیں۔۔۔۔۔"

اسی طرح اور بہت سے حضرات نے ہماری محنت کی داد دی ہے، مگر ہم نے عمداً صرف انھیں دو لکھنوی احباب کے حوصلہ افزا کلمات نقل کئے ہیں جن سے ناظرین اندازہ فرما سکتے ہیں۔

ناظرین ادیب یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ہمارے محترم مولوی احمد علی صاحب شوق، قدوائی، لکھنوی نے ادیب کی مستقل قلمی اعانت کا وعدہ فرمایا ہے، چنانچہ اس نمبر میں عالمِ خیال کا چوتھا رُخ شائع کیا جاتا ہے۔ مولانا شوق نے اب تک عالمِ خیال کے تین رُخ لکھے ہیں، اور یہ چوتھا رُخ ان تینوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ مولانا موصوف کا دم اردو لٹریچر کے واسطے غنیمت ہے۔ جن لوگوں کو خدا نے سخن فہمی کا مادہ عطا کیا ہے وہی جان سکتے ہیں کہ آپ کی شاعری کس درجہ لطیف اور پاکیزہ ہے بلکہ بقول تمدن "وہ سدا بہار پھول ہیں جو ہمیشہ مہکتے رہتے ہیں" البتہ کج فہموں سے کوئی شکایت نہیں۔

یورپ میں مشرقی علوم وفنون وتمدن وآثار وغیرہ کی تحقیقات کے لئے یورپین ملکوں میں ایک خاص محکمہ قائم ہے کبھی کبھی اورینٹل کانفرنس کے اجلاس بھی وہاں ہوا کرتے ہیں۔ حال میں ہماری گورنمنٹ نے بھی ایک ایسی ہی کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت محسوس کی، جو ۱۲۔ اور ۱۳۔ ماہ حال کو شملہ میں منعقد ہوئی۔ گورنمنٹ ہند کے مشیر تعلیم مسٹر شارپ اس کے میر مجلس تھے۔ ۱۸ ماہران علوم کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، جس میں ۹ یورپین، ۵ ہندو اور ۴ مسلمان تھے۔

بحث وتنقیح کے لئے حسب ذیل مضامین تجویز کئے گئے تھے:۔

(۱) مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی ترقی۔

(۲) تاریخی آثار قدیمہ کی تحقیقات۔

(۳) مشرقی علوم کی امداد، اور مغربی علوم حاصل کرنے کے لئے وظائف دینے کی عملی تدبیروں کو وسیع پیمانہ پر کس طرح اختیار کرنا ممکن ہے؟

(۴) اہل ہند کو ایسی تعلیم دینا جس سے وہ محکمۂ آثار قدیمہ کے عہدے حاصل کرنے کے قابل ہوسکیں۔

(۵) ہندوستان میں مشرقی علوم کی قدر ومنزلت کیونکر زیادہ ہوسکتی ہے؟

(۶) مشرقی زبانوں کے طریقۂ امتحان جاری کرنے کے لئے کیا کیا تدبیریں اختیار کی جائیں؟

یہ تمام مباحث نتیجہ خیز اور سودمند ہیں، اور اگرچہ ان کے نتائج پر رائے زنی کرنا ہنوز قبل از وقت ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ ان تجاویز کے لئے اگر کوئی صورت بھی نکالی گئی، تو ملک کو بے انتہا فوائد حاصل ہوں گے! اخبارات میں جو مختصر کیفیت اس کانفرنس کی شائع ہوئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم مشرقی علوم کے کتب خانے قائم کرنے اور قلمی کتابوں کی فہرست تیار کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیا گیا، نیز یہ بھی قرار پایا ہے کہ گورنمنٹ ہند سے سفارش کی جائے کہ کلکتہ میں مشرقی علوم کی تعلیم کے لئے ایک درس گاہ قائم کی جائے۔

علمی حلقہ میں یہ خبر کمال مسرت وشادمانی سے پڑھی جائے گی کہ اردو کے مایۂ ناز ادیب شمس العلما مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی مدظلہم کو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ”شعر العجم“ کی تصنیف پر ڈیڑھ ہزار روپیہ انعام عطا ہوا ہے۔ اس قدر دانی کے لئے ہم پنجاب یونیورسٹی کا شکریہ ادا کرتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی مولانا ممدوح کو ان کی جگر کاوی اور دماغ سوزی کی واجبی داد ملنے پر دلی مبارک باد دیتے ہیں۔ ہمارے صوبہ میں صرف مولانا شبلی ہی کی ذات بابرکت ایسی ہے، جن کے سحاب قلم سے علی التواتر علمی بارش ہوتی رہتی ہے۔ ادیب کے اس نمبر میں ہم آپ کی تصویر بھی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں، اور ہماری دعا ہے کہ خدا آپ کو تادیر زندہ وسلامت رکھے۔

پنجاب گورنمنٹ کی علمی فیاضیاں مشہور ہیں۔ اردو زبان کی جس قدر سرپرستی پنجاب گورنمنٹ نے کی ہے اس قدر شاید ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ نے بھی نہیں کی۔ ابتدا میں البتہ ہماری گورنمنٹ نے بھی فیاضی کے ساتھ دیسی زبانوں کی ترقی پر روپیہ صرف کیا، مگر اب عرصہ سے یہ صیغہ بند ہے، اور مدتیں ہوگئیں کہ کسی مصنف کو کچھ نہیں دیا گیا، ادھر پنجاب گورنمنٹ ہے کہ برابر اردو مصنفین کو انعام دئے جا رہی ہے۔ حال میں مسٹر ظفر علی خان بی۔ اے کو ”معرکۂ مذہب وسائنس“ کے ترجمہ کے لئے پانچسو، اور خان بہادر مرزا سلطان احمد خاں صاحب کو ”اساس الاخلاق“ کی تصنیف پر تین سو روپیہ انعام دیا ہے۔ ہم ہر دو صاحبان کو مبارک باد دیتے ہیں۔ یقین ہے کہ ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ بھی اس طرف متوجہ ہوگی۔

یہ دیکھ کر نہایت خوشی حاصل ہوتی ہے کہ ہندو مستورات میں بھی بیداری کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ جن لوگوں نے الہ آباد کے زنانہ ہندی رسالہ ”استری درپن“

کو دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ رسالہ شادی شدہ مستورات اور کنواری لڑکیوں کی کیسی اعلیٰ خدمت کر رہا ہے۔ اس میں مضامین بھی زیادہ تر مستورات ہی لکھتی ہیں اور یہی اس کا مایۂ امتیاز ہے۔ جولائی سے "استری درپن" کا تیسرا سال شروع ہوتا ہے۔ گذشتہ دو برس میں اس نے نہایت اعلیٰ اور قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ چوتھی ششماہی جلد (جنوری تا جون ۱۹۱۱ء) چھ سو سولہ صفحات پر ختم ہوئی ہے، جس میں قیمتی مضامین نظم و نثر کا ایک نادر مجموعہ ہے۔ شریمتی رامیشوری نہرو صاحبہ (ایڈیٹر) قابل مبارکباد ہیں، کہ وہ اپنی ناظرات کی دعوت طبع کے لئے ایسا عمدہ سامان بہم پہنچا رہی ہیں۔

"استری درپن" کا جولائی نمبر ۲، صفحات پر ختم ہوا ہے جس میں چھوٹے بڑے چودہ مضامین درج ہیں، سری کرشن جی کی ایک نہایت عمدہ رنگین تصویر بھی اس میں موجود ہے۔ رسالہ کی خوبیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے عہ سالانہ قیمت بہت کم ہے۔

"استری درپن" کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں دہلی کے اردو رسالہ "عصمت" کی قابل قدر خدمات کو بھی نظرانداز نہ کرنا چاہئے، جو پاکیزہ خیالات، علمی اور ادبی مضامین، اور مفید معلومات کا مخزن ہے۔ ملک کے ممتاز اہل قلم کے مضامین کے علاوہ معزز خواتین کے طبعزاد مضامین اس میں بھی ہر ماہ شائع ہوتے ہیں، اور ہر پرچہ میں کسی مشہور مقام یا منظر کی تصویر بھی دی جاتی ہے۔ ہمارے مکرم جناب مولوی محمد عبدالراشد صاحب الخیری (ایڈیٹر رسالہ) کے مضامین ایک خاص جدت اور نرالی شان کے ہوتے ہیں۔ آپ کا طرز تحریر ایسا اچھوتا ہے کہ اس کی جس قدر داد دی جائے کم ہے (عصمت کی سالانہ قیمت مع محصول عہ ہے)۔

تصریح تصاویر

اس ماہ کی رنگین تصویر جاپانی مصوری کا نمونہ ہے۔ اس میں وہ منظر دکھایا گیا ہے جب کہ ایک ہجر کا مارا قیدی اور کالی داس کی تصنیف "میگھدوت" کا ہیرو، یکش، ابر کو قاصد محبت بنا کر اپنی معشوقہ کی طرف روانہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ کی دوسری تصویر آیندہ نمبر میں شائع ہوگی۔

دو ہزار برس قبل کی ایک ہندوستانی عورت۔ دو ہزار برس پیشتر ہندوستانی مستورات کیسی پوشاک پہنتی تھیں، اور کس قسم کے زیورات استعمال کرتی تھیں، یہ باتیں اس تصویر سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ یہ تصویر ایک مورت کی نقل ہے، جو بودھ گیا کی ایک قدیم عمارت میں پائی گئی تھی۔ علاوہ ازیں ہندوستانی فن سنگتراشی کا کمال بھی اس تصویر سے واضح ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں "اجنٹا کے غار" کی ایک تصویر بھی درج کی جاتی ہے۔

سوامی شنکر اچارج۔ سوامی شنکر اچارج سمجھتے تھے، کہ ہم ہمہ داں ہو چکے اب ہمیں تعلیم کی ضرورت نہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ ایک راستہ پر جا رہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ کوئی پاسی تاڑ کے پیڑ کو جھکا کر اس میں سے تاڑی نکال رہا ہے۔ شنکر اچارج بہت متعجب ہوئے، اور اس سے دریافت کیا کہ تم نے اتنے بڑے درخت کو کیونکر جھکا لیا؟ اس نے جواب دیا، علم کے زور سے۔ اتنا سنکر انھوں نے معلوم کیا کہ ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا باقی ہے اور ان کا ہمہ دانی کا غرور جاتا رہا۔ اسی واقعہ کو کلکتہ آرٹ اسکول کے ایک مدراسی طالب علم، مسٹر بھینک ٹپا نے اس تصویر میں دکھایا ہے۔ اس مصور کی یہ سب سے پہلی تصویر ہے۔

حبقوق نبی کا مزار۔ یہ نبی مسیح سے قریباً چھ سو برس پہلے گزرا ہے۔ اس کا مزار تولیکان میں واقع ہے، جو ہمدان سے ۱۸ میل کے فاصلہ پر ہے۔ تاریخ بائبل پر اس سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ تصویر کے لئے ہم پادری جان ملکم صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

"شاہزادہ جہانگیر و نورجہاں" والی تصویر میں جو منظر دکھایا گیا ہے وہ اس قدر عام ہے کہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

جسوداجی کی تصویر جس میں سری کرشن کا بچپن دکھایا گیا ہے، ایک بنگالی مصور کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔

حضرت امیر مرحوم کی تصویر کے لئے ہم مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی عنایت سے یہ تصویر ادیب میں شائع ہوتی ہے۔

اگست سنہ ۱۹۱۱ع

ادیب

جلد ۴ نمبر ۲

گہنے کا رواج

اِس انوکھے اور تکلیف دہ رواج کی ابتدا یون خیال میں آتی اور بزرگوں سے بھی اسی طرح سُنی جاتی ہے کہ اوّل اوّل حکما، حاذق نے صرف اس نظر سے کہ اشٹ دھات میں خون کے صاف کرنے اور اُسے خوب طاقت و مدد پہنچانے کے اجزا پائے جاتے ہیں۔ اور نیز بہت سے جلدی و خونی امراض کے حق میں معدنی اشیا کا جسم سے پیوستہ رکھنا ازحد مفید ہے۔ پس اُن نازک اندامون کی تندرستی کے واسطے جنھیں قدرت نے فطرتی نزاکت ہونے کے باعث سب سے زیادہ نحیف الخلقت ضعیف الاعضا، نازک مزاج، نازک دماغ، کمزور، ناتواں، کم خون، کم خوراک، رقیق القلب، لطیف الغذا، ریاضتِ جسمانی سے دم چرانے، سخت ورزش سے بچنے اور شرمانے والی جان پیدا کیا ہے۔ اِس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں ہے کہ اُنھیں زیور کی چاٹ پر لگایا جائے۔ چنانچہ غریبوں میں رانگ، کانسے، جست، پیتل، پھول، تانبے، بھرت وغیرہ کا رواج دیا۔ اور امیروں کے سونا چاندی سر چڑھایا۔ جب یہ رواج عام ہوگیا اور لوگ اسے خوبصورتی۔ اعلےٰ درجہ کی نمائش اور زیب و زینت تصور کرنے لگے۔ تو بعد میں رفتہ رفتہ جواہرات اور انکی تاثیرات مثل کواکب ذہن نشین کر کے مرصع ہونے کا ایجاد اور بڑھا دیا۔ جن اوسط درجہ کے لوگوں میں چاندی۔ سونا خریدنے کا پورا پورا مقدور نہ تھا اُنھیں پس اندازی کا مزا اڑانے کی غرض سے اسطرح سمجھایا کہ گہنا رجے کا سنگار۔ بھوکے کا آدھار ہے۔ اس آخیر مت نے وہ رواج پایا کہ بھوکا مرنا۔ قرضدار رہنا۔ جان کو آرام نہ دینا قبول مگر نہیں منظور تو گہنے کا نہ رکھنا۔ دن بدن ہزارون اقسام کے زیور نکلنے اور اختراع پر اختراع ہوتے چلے آئے یہانتک کہ جسم پر کوئی جگہ خالی نہ رہی جتنے بیرونی اور قابلِ نمائش اعضا تھے سب ہی بیری کے درخت کی طرح لد گئے جس کے سبب شائستہ

قوموں میں بھی خوشنمائی اور رعنائی اور بدصورتی تصوّر ہونے لگی۔ گو ہمیں یہاں رسم و رواج کے سبب اتنے برے نہیں کہ شکنی بھی کہ مصلحان قوم اس رسم کی اصلاح طلب خیال فرمائے موقع کے منتظر ہوں کیونکہ جو لوگ قانون قدرت کی پیروی کرتے یا جن کی توجہ اس بات کا رونا ہوتا۔ وہی ایسے امور کو نہایت حقارت اور کراہت کی نظر سے دیکھا کرتے ہیں۔ اور زمانہ بھی جتنا ترقی کرتا جاتا ہے وہ ایسے تکلفات کو بالائے طاق رکھتا اور خدا کی نظروں سے گراتا چلا جاتا ہے چنانچہ اس موجودہ وقت نے بھی اس بات کا ثبوت دیا کہ بہت سی چیزوں کے رواج اُٹھا دئیے۔ اور یہی بات تھی کہ ایسے ایسے ہونہار وقت پر ان زیوروں کے عیوب کی تصویر کھینچ کر ان کی اصلاح طلب قوم کو ان کے عیبوں سے آگاہ کر کے زیبائی بوجھکر کوستے پر دھکا دینا ہے۔ لہٰذا آج ہم چند سطریں اسی پر لکھکر قدرتی زینت اور مصنوعی سنگار کا فرق دکھاتے ہیں۔

ہمارے ہندوستان کی عورتیں گو انہیں کیسا ہی حُسن خداداد اور نہایت خوشنما تناسب اعضا میسر کیوں نہ ہو۔ مگر وہ جب تک ایڑی سے چوٹی تک گہنے پاتے میں گوندنی کی طرح لدی پھندی نہ رہیں۔ گویا حسن صورت سے محروم اور از حد مغموم ہیں۔ اتنی کسی کو خبر نہیں کہ ارے یہ گہنا نہیں بلکہ چاند سی صورت کو گہن لگاتا ہے۔ پہلے **جھومر** ہی کو دیکھو جو ماتھے پر جھوم جھوم کر سارا ماتھا چھپا لیتا اور زبردستی قدرت کو اصلاح دے کر تنگ پیشانی بدبختی کی نشانی بنا دیتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ الٰہی یہ جھومر ہے یا کوئی بچھو۔ جو کسی گناہ کی پاداش میں ہماری ہندوستانی بہنوں کی پیشانی پر لٹکا ہوا اس قول کی تصدیق کر رہا ہے کہ قیامت کے روز یہی گہنا سانپ بچھو ہو کر اسی انداز سے ایک ایک کے ماتھے پر پڑا جھومیگا۔ **سراسری** پر اگر سرسری نظر ڈالیں تو صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک کنکھجورا ہے جو کنپٹیوں سے لیکر مانگ تک لپٹا ہوا اللہ آمین کی جان کو کھا رہا ہے۔ ٹیکا آپ ہی ناک کا ٹیکا بنا ہوا کہہ رہا ہے کہ مجھ تک سب سے زیادہ ستارہ پیشانی بنا دینے کا ہنر ہے سبحان اللہ جس پیشانی پر یہ چھپا ہوا ہو وہ کیوں نہ خوبصورتی کو دوبالا کرے گی۔ کانوں کی کیفیت مت پوچھو۔ اوّل تو خود ہی چھیدڈالے گئے، سو کیا کہوں چھلڑ کا چھتا یا ٹوٹی ہوئی چھلنی کا چھرا بنے ہوئے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ کہیں مگر مچھ جھول رہا ہے کہیں **پتوں** کے بیلے جنگلے انسان کو درخت بنا رکھا ہے کہیں **بالیوں** اور **بالوں** نے بن داموں حلقہ بگوش بنا دیا ہے اگر دوپٹے میں کہیں بالی اولجھ گئی تو ایک دفعہ ہی روئی کے ساتھ بسمل بھر دی۔ اور جو کسی ناسمجھ بچّے کا ہاتھ پڑ گیا تو اس نے اس ناسمجھی اور کم سنی پر اونٹ کی نکیل پکڑ کر بٹھا دیا۔ دو خود ضعیف کے ہاتھوں بے بس ہو کر ایک ادنےٰ بچّے کے سامنے سر جھکا دیتی ہے۔ اگر پکّے کان ہوئے تو عمر بھر کو روگ لگ گیا۔ ادھر سیپ اُدھر یہ بوسے کہ ناک میں دم کر رہی ہے۔ واللہ کیا نزاکت اور خوشنمائی ہے کہ جس نے یہ کچھ ناک چیز جبو اگر ناچ نچا رکھا ہے۔ ناک کی **نتھ** جسے سُہاگ کی نشانی کہتے ہیں عجب مصیبتوں میں تیر دیتی ہے۔ اوّل تو منہ پر آگر خاصا چھینکا سا لٹک جاتا ہے۔ دوسرے بات کے چھونے کو اچھا جھولا بن جاتا ہے۔ اور جو مقدور بڑھا کر صرف **کیل** پر اکتفا کریں تو اونٹ کی نکیل کے سوا دوسری تشبیہ خیال میں نہیں آتی۔ **بلاق** خود زینت کا پھینپنا ہے۔ جو نجلی۔ بدتہذیبوں کی ناک میں لٹک رہا ہے گلے کا **طوق** غضب بدشگون گہنا ہے جسے اجنبی ملک کا آدمی سنتے ہی

چونکتا ہے کہ الٰہی اس بے گناہ پر خدا جانے کونسا سنگین جرم ثابت ہوا کہ جس کی سزا میں یہ طوق گلے کا ہار بنا۔

گلوبند آپ حیران ہے کہ جو پٹا کتوں کے گلے میں پڑنا چاہئے تھا وہ انسان کے گلوے مبارک میں کیوں پڑا؟ **چمپا کلی** ایک سنہری ناگن ہے جو کسی سپیرن کے گلے سے لپٹی ہوئی بل مار رہی ہے۔ **جگنی** ایک بڑا بھاری ٹکڑا ہے جو سینے پر چمٹا ہوا خون پی رہا ہے۔ **بازوبند** پہلے ہی مشکیں جکڑ لیتے ہیں **جوشن** خدا جانے کس لڑائی پر چڑھا کرے جائیں گے۔ **ہاتھوں کے کڑے** گویا دل کڑا کئے ہوئے ہتھکڑیاں ڈالنے آئے ہیں **چوہے دنتیاں** چوہوں کے سے دانت لگائے ہوئے ہات کاٹ کاٹ کر کھانے کو موجود ہیں۔ **چھلے انگوٹھیاں** وہ جوڑ بند ہیں جنھوں نے ٹوٹی ہوئی انگلیوں کے جوڑ جوڑ کو تھام رکھا ہے۔

جھانجن۔ پازیب۔ لچھے خاصی بیڑیاں نہیں نہیں۔ ٹھکاریاں ہیں۔ جو گھر کی چاردیواری سے جھنکار باہر نکالنے کے جرم میں پاؤں میں پڑی ہیں۔ **چٹکیاں۔ بچھوے** اوّل تو ان کا نام ہی خدا کے فضل سے کیسا عمدہ اور موزوں ہے کہ انسان کبھی اس بے رحمی کو پسند نہ کرے۔ جن کے پاؤں کی انگلیوں میں بچھو لپٹیں ان کے سایہ سے خدا بچائے۔ اب میں حیران ہوں کہ جن عورتوں کا سنگار اس خوبصورتی کے ساتھ ہو انھیں کیا کہوں اور کس نام سے تعبیر کروں۔ جہاں جہاں یہ زیور پہنا جاتا ہے اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو برابر اس کی رگ رگ سے کالے کالے دھبے پڑے ہوئے معلوم ہوں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جو سمجھدار ہوگی اس مضمون کو دیکھے گی وہ تو اپنے دل میں آپ قائل ہوگی اور جو ناسمجھ اس پر نظر ڈالے گی وہ ضرور ہمیں نکو بنائے گی۔ ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ جنھیں خدا تعالےٰ نے اوّل دن سے حسین پیدا کیا ہے وہ بن گہنے پاتے ہی لاکھ لاکھ بناؤ دیتی ہیں اور جو قدرت سے بدصورت پیدا ہوئی ہیں انھیں نہ گہنے سے چار چاند لگتے ہیں اور نہ زرق برق پوشاک سے۔ ہاں اگر سیرت میں وہ خوبصورتی سے بڑھی ہوئی ہیں تو ان کا یہ زیور ہزار حسن اور لاکھ گہنے سے زیادہ ہے۔ تم خود دیکھ سکتی ہو کہ جن کی ناک میں فقط نیم کا تنکا۔ کانوں میں ایک ایک بندا۔ ہاتھوں میں ہلکے ہلکے حباب۔ بدن میں سادی سادی پوشاک ہوتی ہے۔ وہ کیسی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور جو سونے چھونے میں لوٹی پڑتی ہیں وہ کیسی دیوالی کی سی گوجریاں معلوم ہوتی یا سیتلا کا سا بجا پا دکھائی دیتی ہیں۔ جب اس گہنے کی کمی میں یہ کچھ زیبایش اور موزونی ہے تو اسکے ترک میں کیا کچھ سادگی اور بے ساختہ پن کی پھبن ہوگی۔

ہم سے پوچھو تو گہنا پہنکر اصلی خداداد خوبصورتی اور قدرتی ساخت کو بھی بٹا لگانا ہے اس کے علاوہ اخباروں میں دیکھا ہوگا کہ بچوں اور اکثر عورتوں کی جانیں صرف اس زیور کی بدولت جاتی ہیں۔ پہننے کو ہم منع نہیں کرتے نت نت اور جم جم پہنو۔ آنکھوں سکھ۔ کلیجے ٹھنڈک۔ مگر وہاں تک کہ قدرتی بناوٹ کو اصلاح۔ اصلی خوبصورتی کو داغ جان کو عذاب نہ لگایا جائے۔ رپے کا سنگار۔ بھوکے کا آدھار ہم بھی جانتے ہیں اور ہمارے نزدیک بھی جمع کرنیکے واسطے یہ ایک عمدہ طریقہ تھا لیکن اُس صورت میں کہ بیچتے وقت یا گرو رکھنے کیوقت بہت سا خسارہ نہوا کرتا ایسی حالت میں اسکے بجائے ٹھوس کڑے بنا کر پہنے جایا کرتے یا کوئی آمدنی کی چیز خرید لیجایا کرتی تو بدرجہا بہتر تھا ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری ہندوستانی بہنیں اور علی الخصوص زیور کی شوقین عورتیں ہماری اس تقریر سے ناراض نہونگی ہمنے جو کچھ لکھا ہے صرف ہمدردی کے لحاظ سے لکھا ہے فقط

سید احمد دہلوی

فلسفۂ سیاست

فلسفۂ سیاست اصل میں علم تاریخ ہی کی شاخ کی قلم ہے، جو اس زمانہ موجودہ کے علمی انکشافات اور طریقہ استدلال کی بدولت اب ایک مستقل حیثیت کی شکل اختیار کر لی ہے ایسی حالت میں اب اسے علم تاریخ کا جزو سمجھنا مصطلحات زبان کو زیر بار کرنا ہے، مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ اور علم سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے، فلسفۂ سیاست کے بغیر علم تاریخ کی تحصیل ناقص اور بلا علم تاریخ جانے فلسفۂ سیاسی کا مطالعہ تحصیل لاحاصل ہے

اصطلاح عام میں تاریخ کا اصلی کام واقعات عالم کا ترتیب جمع کرنا ہے۔ اس زمانہ سے جبکہ انسان نے حیوانیت اور جہالت کی تاریکی سے نکلکر علم کے پُرفضا اور منور میدان میں قدم رکھا، علم تاریخ کی دلچسپیاں ہمیشہ بنی نوع انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہی ہیں۔ ملکوں کے انقلابات، سلطنتوں کے بننے بگڑنے کے واقعات، سلاطین، امرا اور شعرا کے حالات، انبیا اور علمار دین کے کمالات، درباروں کی شان وشوکت اور سازشیں، محبان وطن اور مصلحان قوم کی جانبازیاں، علمی انکشافات اور ایجادات، غرضیکہ انسانی جدوجہد کے سب کرشمے تاریخ کے صفحات پر منقوش و مرتسم ہیں۔ تاریخ گویا ایک سفرہ عام ہے جس پر ہر قسم اور ہر ذائقہ کی نعمتیں چنی ہوئی ہیں۔ اور جس سے ہر شخص اپنے مذاق اور استعداد کے موافق استفادہ کرتا ہے۔ لیکن سائنس نے ان دلچسپ واقعات کے ذخیرہ سے جو معجون مرکب تیار کی ہے، وہ مزہ میں پھیکی اور سیٹھی سہی لیکن نفع کے لحاظ سے کسی کھانے سے کم نہیں۔

مورخین نے دنیا کے جو اہم اور سبق آموز واقعات قلمبند کئے ہیں انکا مطالعہ انسان کے لئے نہایت ہی مفید ہے۔ انسانی معاملات میں ایک گونہ ترتیب اور باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ اور یکساں اسباب سے عموماً یکساں نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں، اور جو اسباب ایک واقعہ کے پیش خیمہ ہوتے ہیں انھیں اسباب کے دوبارہ جمع ہوجانے سے وہی واقعہ پھر ظاہر ہوسکتا ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ علم تاریخ تجربہ حاصل کرنے اور دنیاوی معاملات سمجھنے کا بہترین گر ہے۔ جب اسباب اور ان کے نتائج پر غور کرنے کا نام عقلمندی ٹھہرا تو لازم آیا کہ ہم ان واقعات کو جو ہماری نظر سے گذریں ضبط تحریر میں لائیں۔ اور ایک واقعہ کو دوسرے سے مقابلہ اور موازنہ کرنے کے بعد ایک عام اصول مستنبط و منضبط کریں۔ اور اسطرح واقعات ماضی وحال کی عینک سے دوربین کا کام لیں۔ اور آنیوالے دھندلے اور پوشیدہ واقعات کو معلوم کرلیں۔

چونکہ واقعات کے مجموعہ اور مخزن کا نام تاریخ ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ جملہ علوم کی عالیشان عمارتوں کا سنگ بنیاد ہے مثلاً علم ہیئت اور نجوم ان واقعات اور طبعی حادثات پر مبنی ہیں جو کسی خاص زمانہ میں کسی خاص موقع پر ظہور پذیر ہوئے۔ اور مورخین کے قلم سے صفحۂ تاریخ پر لکھے گئے۔ رفتہ رفتہ خاص قسم کے واقعات تاریخ سے علیحدہ ہو کر خاص علم کی شکل میں تبدیل ہوگئے۔ اس طرح مختلف واقعات مختلف زمانے میں تاریخ سے علیحدہ ہو کر نئے نئے ناموں سے پکارے جانے لگے۔

یہاں تک کہ اب علم تاریخ بھی ایک خاص قسم کے واقعات کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً غلہ کی گرانی اور مزدوری کی زیادتی دکی کے اسباب خود دراصل کسی تاریخی واقعہ کے تابع ہوتے ہیں مگر ہم اُن اسباب کو کسی تاریخ کی کتاب میں تلاش نہیں کرتے بلکہ اُس کے لیے سیاست مدن اور علم الاقتصاد کی کتابوں کی چھان بین کرتے ہیں۔ دمدار ستاروں کا نکلنا۔ اجرام فلکی کے عجیب و غریب تغیرات کا کسی خاص زمانہ میں دیکھا جانا۔ مورخین متقدمین نے بطور تعجب انگیز واقعات کے تحریر کیا ہے۔ کسی نے اُسے قہر خدا سے تعبیر کیا کسی نے قرب قیامت کے آثار میں سے سمجھا لیکن زمانہ موجودہ میں ایسے واقعات کو علم تاریخ کا جزو نہیں سمجھا جاتا بلکہ علم ہیئت اور کائنات الجو کے ماہرین ان تغیرات کی کیفیت شرح و بسط کے ساتھ اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں۔ اگر سائنس کی ترقی اور تیز رفتاری کی یہی کیفیت رہی تو رفتہ رفتہ علم تاریخ سے خاص خاص قسم کے واقعات علیحدہ ہوتے جائیں گے اور پھر اس خرمن میں بجز چند دانوں کے اور کچھ نہ رہے گا۔

کیا یہ دلچسپ علم جو ہر زمانے میں متمدن دنیا کے لئے مایہ فخر و ناز رہا ہے اور جس کا مطالعہ انسانی دماغ کے لئے بہترین تفریح سمجھا گیا ہے سائنس کے ہر لحظہ بڑھتے ہوئے سمندر میں غرقاب ہو جائے گا؟ بادی النظر میں تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زمانہ موجودہ کے مورخ جب کسی عجیب و غریب اقتصادی یا طبی واقعہ کا ذکر کرتے ہیں تو بہت مختصر طور پر کسی علم اقتصاد یا فن طب کی کتاب کے حوالے کو کافی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسے واقعات کی نسبت اُن کے خیالات خواہ کیسے ہی دلفریب اور دلکش پیرایہ میں کیوں نہ بیان کئے جائیں ہرگز ایک ماہر فن اقتصاد یا ماہر طب کی رائے کے برابر وقعت نہیں رکھ سکتے۔ وہ جانتے ہیں کہ پرلطف الفاظ اور دلفریب طرز تحریر کا جامہ جو پرانے مورخین کے بیان کردہ واقعات کو اس قدر دلکش اور دلفریب بناتا ہے، سائنس کے ہاتھوں تار تار کرکے پھینک دیا جائیگا پس مورخ ایسے علوم کے متعلق خامہ فرسائی کرنا ماہرین فن کا کام سمجھتے ہیں۔ اور اپنی توجہ صرف اُن واقعات تک محدود رکھتے ہیں جنکا تعلق زیادہ تر ملکی اور سیاسی معاملات سے ہے

تاریخ کے قدیم معنوں کے لحاظ سے نوچ کھسوٹ کے بعد جو کچھ سرمایہ بچا ہے وہ بھی رفتہ رفتہ سائنس کے ایک خاص شعبہ میں جا رہا ہے جس کا نام فلسفہ سیاست یا پولیٹکل سائنس ہے

اس جدید شعبہ کی ترقی اگرچہ انیسویں صدی کے اخیر میں ہوئی لیکن چودھویں صدی عیسوی میں جبکہ اسلامی سلطنت اور اسلامی تمدن کی روشنی ممالک مغربی میں باقی تھی اسکی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ یورپ اُس وقت ازمنہ متوسط کی گھٹا ٹوپ اندھیری میں ملفوف تھا کہ ابن خلدون ۱۳۳۲ء میں ٹیونس میں پیدا ہوا۔ اور ایک ایسے نئے فلسفہ اور نئی سائنس کی بنیاد ڈالی جو ارسطو کے شان و گمان میں بھی نہ تھی۔ ابن خلدون نے یہ دلیل پیش کی کہ موجودات کے علم کا نام فلسفہ ہے اور چونکہ موجودات کے علوم کا انحصار واقعات کی صحت اور عدم صحت پر ہے اور واقعات کی صحت و عدم صحت کا پتہ تاریخ سے چلتا ہے اس لئے تاریخ ہی ایسا علم ہے جس پر فلسفہ کا اطلاق صحیح معنوں میں کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ کو شاعرانہ لفاظی اور افسانہ نویسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا محض یہ کام ہے کہ واقعات جمع کئے جائیں اور واقعات سے صحیح نتایج اخذ کئے جائیں۔ تعصب اور طرفداری کو بالائے طاق رکھکر ہر واقعہ پر تنقید کا تیز نشتر استعمال کیا جاوے۔

فلسفۂ تاریخ کا اصل اصول یہ ہونا چاہئے کہ یکساں اسباب سے یکساں نتائج کا ظہور ہوتا ہے یعنی یہ کہ ایک ہی قسم کے واقعات کا نتیجہ ہمیشہ یکساں ہوتا ہے۔ مثلاً قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب کوئی قوم مردانہ شجاعت اور عدل و انصاف کو ہاتھ سے کھو بیٹھتی ہے اور عیش و عشرت کی طرف راغب ہو جاتی ہے تو دوسری قوم اور دوسرا تمدن اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ ریگستان عرب کے مٹھی بھر باشندے ایرانیوں کے وسیع ملک پر بآسانی قابض ہو گئے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ فاتحین میں شجاعت۔ پرہیزگاری اور عدل و انصاف کے جوہر موجود تھے اور مفتوح باشندگان میں یہ صفات مفقود تھیں۔ چند صدیوں کے بعد جب ہسپانیہ کے مسلمانوں نے عیش و عشرت میں پڑ کر اپنے آباؤ اجداد کی خصوصیات کو پس پشت ڈال دیا تو اصلی باشندگان ایبیریا نے جنکو صدیوں کی غلامی نے کمزور کر دیا تھا، طارق جیسے دلاور اور شجاع کی اور اس کے ساتھیوں کی اولاد کو دھکے دے کے اپنے ملک سے نکال باہر کیا۔ آجکل اگر ہم کسی قوم میں پست ہمتی۔ بداخلاقی سستی اور کاہلی کے آثار دیکھتے ہیں تو ہمیں اس نتیجہ پر پہنچنا دشوار نہیں ہے کہ یہ قوم عنقریب غارت و برباد ہونیوالی ہے

فطرت انسانی امتداد زمانہ کی وجہ سے تبدیل نہیں ہو جاتی اس لئے موجودہ حالات کے صحیح اندازہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ حالات ماضیہ پر غور و خوض کیا جائے اور جو کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اور جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس کے مقابلے اور موازنہ سے آیندہ کے واقعات کا صحیح اندازہ کیا جائے۔ ابن خلدون نے اس جدید فلسفۂ تاریخ کو اگلے زمانہ کے تاریخی حشو و زوائد سے پاک کیا اور صرف ملکی حکومت انسانی سوسائٹی کے بننے بگڑنے اور عروج و زوال کے واقعات یا معاشرتی اور اخلاقی ترقی اور تہذیب و تمدن کی اشاعت اور ان کے نتائج سے سروکار رکھا۔ ابن خلدون نے نہایت انکساری سے اپنی آخری تحریرات میں بیان کیا ہے کہ اس نے ایک عظیم الشان علم کی بنیاد ڈالی اور بجز خاص خاص اصول کی طرف اشارہ کرنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ ہے مگر اُسے قوی امید ہے کہ اس کے بعد دوسرے علماء اُسکی آغاز کردہ تحقیقات کو نہ صرف جاری رکھیں گے بلکہ اس میں نئی نئی شاخیں پیدا کر سکیں گے۔

بقول ڈاکٹر ڈابوار۔ ابن خلدون کی یہ قوی امید پوری ہوئی اور فلسفۂ تاریخ ترقی پاکر فلسفۂ سیاسی کی صورت میں ظاہر ہوا[1] لیکن افسوس ہے کہ ابن خلدون کے فلسفہ کو نشو و نما دینے اور موجودہ عروج کو پہنچانے والے مسلمان نہ تھے بلکہ یورپ کے عیسائی۔ اسلامی تہذیب و تمدن میں چودھویں صدی سے ایسا زوال آیا کہ مسلمانوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ فلسفہ سیاست جس کے اصول پر آج تمام دنیا کی سیاست کا دارومدار ہے۔ ایک مسلمان کے دماغ کا نتیجہ تھا!

انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے اس فطرتی خاصہ کے اقتضا سے انسان مل جل کر رہتا ہے۔ لیکن اُس کے مل جل کر رہنے سے متعدد نتائج پیدا ہوتے ہیں جن سے مختلف علوم کی بنیاد پڑتی ہے۔ مثلاً علم سیاست مدن، علم اللسان وغیرہ لیکن فلسفہ سیاست انسانی سوسائٹی کی صرف ایک شق سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان مثل دیگر جانداروں کے خاندان بنا کر رہتا ہے گو اُس میں خاندانی تعلقات کا سلسلہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے لیکن خاندان کے محدود دائرہ کے علاوہ ہم انسان کو ایک دوسرے سلسلہ اور زیادہ منضبط نظام کا محکوم

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فلسفۂ اسلام مصنفہ ڈاکٹر ڈابوار ۱۲

پاتے ہیں۔ دنیا کے خواہ کسی حصّے میں جاؤ اور کسی آدمی سے سوال کرو کہ علاوہ اپنے خاندانی تعلقات کے وہ کس نظام کا پابند ہے جس کے احکام اور قوانین کے سامنے سر جھکانا وہ بعض حالتوں میں خاندانی قواعد وضوابط سے زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔ اور جس کے ماتحت ہونے کی وجہ سے اُسے خاص حقوق حاصل ہوتے ہیں تو یہی جواب ملے گا کہ وہ کسی حکومت کا پابند اور حلقہ بگوش ہے۔ مثلاً یہی سوال کسی ہندوستان کے مسلمان سے کیا جاوے تو وہ یہی جواب دے گا کہ وہ "برٹش سبجکٹ ہے" ظاہر ہے کہ اس نظام کو اُس کے خاندانی نظام سے کوئی تعلق نہیں حالانکہ وہ اپنے خاندانی قواعد وضوابط کی پابندی کرنا اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے یہ نظام اُس کے مذہب سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتا حالانکہ جس مذہب کا وہ پابند ہے اُس کے قوانین وضوابط اور ارشادات کی تعمیل کو اپنا فرض اور سبب نجات جانتا ہے اور گو وہ عربی النسل ہو اور مذہباً اور رسماً اپنے عربی بھائیوں سے متحد ہو اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے بھی اُن سے زیادہ مختلف نہو۔ مگر باوجود ان مشابہتوں کے وہ بالکل مختلف حکومت کے قوانین کا ماتحت ہے اور اہلِ عرب دوسری کے۔

انسانی سوسائٹی کی تقسیم مختلف اصولوں پر کی جاتی ہے۔

علم الانسان کا ماہر کالے۔ گورے۔ زرد۔ اور بھورے حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔

علم الابدان کا عالم سر کی ہڈی کے ساخت کے لحاظ سے اور کوئی بالوں کی رنگت کے لحاظ سے۔

علم اللسان کا ماہر اختلافات زبان کے اعتبار سے۔

لیکن پولیٹیکل سائنس یا فلسفہ سیاست بنی نوع انسان کو بالکل جدا شکل میں تقسیم کرتا ہے۔ اسکی تقسیم کا معیار بالکل انوکھا ہے میں اگرچہ برہما یا سیلون یا گجرات کے باشندے کی زبان کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکوں گا مگر میں اپنے آپ کو اُس کے ساتھ ایک ہی حکومت کا ماتحت سمجھتا ہوں میرے اور اس کے حقوق ایک لحاظ سے یکساں ہیں۔ برخلاف اس کے گو میں اپنا کاروبار اُسی زبان میں کرتا ہوں جس میں کہ امریکہ کا ایک باشندہ لیکن بلحاظ حکومت وہ دوسری قسم کی حکومت کا حلقہ بگوش ہے اور میں دوسری قسم کی حکومت کا۔

بنی نوع انسان کی تقسیم بلحاظ حکومتوں کے نہایت اہمیت رکھتی ہے اولاً بوجہ اپنی عمومیت کے اور ثانیاً بہ سبب اپنے اثرات اور نتائج کے ہم خواہ کسی حصۂ ملک اور کسی سوسائٹی میں جائیں۔ انسانوں کو گروہ گروہ میں منقسم اور ساتھ ہی کسی خاص قوانین یا رسم ورواج کا پابند پائیں گے اور حکومت ہی ایسا لفظ ثابت ہوگا جو ہر قسم کی جماعت پر حاوی ہو سکتا ہے۔

چونکہ انسان کسی حکومت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو اُس کے قوانین اور مراسم کا پابند سمجھتا ہے اور اسکی سلامتی کے لئے اگر ضرورت ہو تو اپنی جان تک سے دریغ نہیں کرتا اور یقین رکھتا ہے کہ حکومت کی خدمت میں ہر طرح کی تکلیف اور سختی برداشت کرنا اُس کا فرض اولین ہے۔ اس لئے ان حکومتوں کی موجودگی کے باعث چند اہم اور دلچسپ واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں:۔

(۱) اُنکا آغاز۔ اُنکی بالیدگی اور ترقی اُن کی مختلف قسمیں اور تبدیلیاں۔

(۲) ایک جماعت کا دوسری جماعت پر اثر۔ آپس کی لڑائیاں اُن کے عہد نامے ملکوں کا الحاق واتحاد۔

(۳) وہ لامتناہی اثرات جو ان جماعتوں کے محکوم ہونے کی وجہ سے رعایا پر پڑتے ہیں۔ یعنی تہذیب وتمدن کی ترقی۔

ناظرین غور کریں کہ محض اس واقعہ کی بدولت کہ انسان کسی حکومت کا رعیت ہوتا ہے اس پر غور و فکر کرنے کے لئے کسقدر وسیع منظر سامنے آجاتا ہے۔

پولیٹیکل سائنس کا موضوع حکومت ہے۔ چونکہ حکومت قائم رکھنے کے لئے ہم ایک نظم و نسق کا رواج دیتے ہیں یا بالفاظ دیگر گورنمنٹ قائم کرتے ہیں اس لیے سیاست ملک کے تمام رموز اور ان پر غور و خوض کرنا فلسفہ سیاست کے دائرہ میں آجاتا ہے یعنی جس طرح پولیٹیکل اکانومی کا تعلق ملکی دولت سے یا علم الاجسام انسان کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے یا جبر و مقابلہ اعداد سے متعلق ہے یا مساحت فاصلہ اور اجسام سے تعلق رکھتی ہے اسی طرح فلسفہ سیاست حکومت یا انتظام سلطنت اور گورنمنٹ سے واسطہ رکھتا ہے۔

سیاست ملکی یا گورنمنٹ کی دو شاخیں ہیں۔ اوّل اندرونی ساخت اور وضع کہ کس طرح پر گورنمنٹ قائم ہوتی ہے اور کن ذرائع سے سیاست کی کل چلتی ہے۔ دوم بیرونی اثرات یعنی ایک حکومت دوسری حکومت پر کس طرح اور کس قسم کا اثر ڈالتی ہے اسکا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے پاس صحیح معلومات اور واقعات کا عظیم الشان ذخیرہ اور معتبر اور مستند تواریخ کی کتب کا مجموعہ ہو تاکہ مختلف قسم کے واقعات صیغہ وار جمع ہو سکیں مثلاً یہ کہ مختلف حکومتوں کے قائم ہونے اور ترقی کرنے میں کن کن واقعات نے مدد دی یا یہ کہ گرد و نواح کی حکومتوں کے تعلقات نے انکی ترقی اور تنزل میں کیا اثرات پیدا کئے۔ اس قسم کے معاملات میں ہم صحیح نتائج پر صرف اسی وقت پہنچ سکتے ہیں جبکہ ہمارے پاس مستند واقعات کا کافی سرمایہ ہو۔

علم سیاست مثل علم کیمیا کے نہیں ہے کہ ہم جب چاہیں کسی چیز کے اجزاء کا امتحان آلات اور مشاہدات کی مدد سے کرلیں مثلاً ہمیں ہوا میں آکسیجن بطور جزو کے ماننے میں پس و پیش ہو تو ہم فوراً چند آلات کی مدد سے آکسیجن اور نائٹروجن الگ الگ کرلیتے ہیں اور چند مشاہدات سے ایک حصہ میں آکسیجن کی خصوصیات پاتے ہیں اور ایک میں نائٹروجن کی مثلاً آکسیجن میں دہکتے ہوئی انگاری کا بھڑک اٹھنا اور نائٹروجن میں شمع کا گل ہوجانا۔ اس طرح ہم یقین کرلیتے ہیں کہ ہوا کا ایک جزو آکسیجن ہے جو بقاء حیات کے لیے ضروری ہے۔

لیکن کسی سیاسی نتیجہ کا امتحان ہم اس طریقے پر نہیں کرسکتے مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ انگلستان کی روز افزوں ترقی اور کامیابی کا راز پارلیمنٹ ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ انگلستان کی وضع کا پارلیمنٹ ہندوستان میں رائج کرنے سے بھی وہی نتیجہ پیدا ہوگا جو انگلستان میں پیدا ہوا کسی طرح قابل وثوق نہیں ہے۔ حکومت آفتاب و ماہتاب کی طرح کوئی مادی شے نہیں ہے کہ دوربین اور علم ریاضی کی مدد سے ہم اس کا مشاہدہ کرسکیں۔ حکومت اخلاقی اثرات سے محصور ہے جو کام کسی حکومت سے بہ حیثیت مجموعی ظہور پذیر ہوتا ہے وہ دراصل فرداً فرداً ہر باشندۂ حکومت کی جد و جہد اور محنت کا نتیجہ ہوتا ہے مثلاً انگلستان کے تہذیب و تمدن پر شیکسپیئر اور ملٹن کے علمی کارناموں کا بہت کچھ اثر پڑا۔ یا شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی پند و نصائح سے تمام مغربی اور جنوبی ایشیا اثر پذیر ہوا ہے اور اہل ایشیا کے اخلاق و عادات پر انہوں نے گہرا نقش چھوڑا ہے لیکن تاریخ میں ہم ان صاحبان کمال کے حالات بہت کم پاتے ہیں پس صحیح سیاسی نتائج پر پہنچنے کے لئے ہماری مشکلات کا حل محض تاریخی واقعات سے ہی حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام واقعات جو کسی حکومت اور قوم کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں ہمارے پیش نظر ہونا چاہئیں۔ اور جنھیں مورخین یہ سمجھ کر کہ یہ معاملات انکے مضمون سے دور ہیں پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اس تمہید کے بعد ہمارا یہ کام ہے کہ حکومت کے قائم ہونے اور وجود میں آنے اور ترقی کرنے کے اسباب کا تذکرہ کریں۔

ظفر عمر (علیگ)



آخری شاہ مغلیہ کی قلمکار کا نمونہ



خواجہ [illegible] کی دستکاری کا نمونہ

شیخ ابوالفیض فیضی فیاضی

مسلمان ناز اور فخر کر سکتے ہیں کہ اُنکے طبقہ میں فیضی سا جامع کمالات شخص گزرا۔ یک فنی تو بہت لوگ گذرے ہیں مگر جامع علوم و فنون صرف فیاضی تھا۔ چنانچہ واقعات ذیل سے معلوم ہوگا۔ مخزن اسرار نظامی کے جواب میں کتاب مرکز ادوار لکھی ہے۔ آغاز کتاب کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم گنج ازل راست طلسم قدیم
گنج ازل جیست کلام خدا مُہر ابد کرد بنام خدا
نقد دو کون است دریں مایہ درج چار کتاب است دریں آیہ درج

حروف بسم اللہ کے معنی بیان کرتے ہوئے الرحمن کے الف لام کی نسبت لکھتا ہے۔

در نگری وحدت و کثرت یکیست لام و الف در خط وحدت یکیست
لام بدل کردہ الف را مقام کردہ الف نیز بدل جای لام
چند بہر حرف شوی مختلف یک دلی آموز ز لام و الف

حمد میں لکھتا ہے۔

تختۂ ہستی کہ بشبک نگاشت نقش بدایع ہمہ یک یک نگاشت
روز برافروخت بہ اقبال صبح پائے خِرَد راست بہ خلخال صبح
دردہ دل شعل توفیق سوخت خانۂ تقلید ز تحقیق سوخت
صوفی و صافی مترنم ازو قول کلیم و متکلم ازو
نامیہ از ابر عطایش عجیم عاقلہ از نطفۂ در کش عقیم
عقل مقدس بہ تہش پا بگل فکر از و دست تحیر بدل
عقل کجا فکرت یزداں کجا بر در واجب رہ امکاں کجا
دانش ما جیست بہ علم علیم فکرت محدث چہ رسد در قدیم

ما سکہ را حوصلہ بر طاق ماند ناطقہ را سلسلہ بر ساق ماند

توحید میں لکھتا ہے۔

اے ہمہ در پردہ نہاں راز تو بے خبر انجام ز آغاز تو
قدس تو آنجا کہ زند گام را راہ نہ آغاز نہ انجام را
در تو ہم آغاز ہم انجام گم بر دو بخشہر قدمت نام گم

مناجات میں کہتا ہے۔

خاک عدم با تو عروسی نقاب آب قدم بے تو چو نقش بر آب
در جسد خاک نہی روح پاک طبلۂ عطار کنی جیب خاک
در سر صبح از تو نوائے صبوح در تن خاک از تو رواں آب روح
جوش دگر بخش بہ صہبائے من شور دگر ریز بہ سودائے من
خون مرا رونق گلزار دہ خاک مرا چشمۂ انوار دہ
نقد مرا گرمئے بازار بخش جنس مرا چشم خریدار بخش
چشمۂ دل کو وجگر ناصبور لوکہ دہد ساقی خورشید نور
کون و مکاں پر تو ذات تواند دیدہ و دل محو صفات تواند
آمدگی سود نہ آوردگی ذات تو ہم پردہ وہم پردگی

ترتیب کلام میں تمہیداً کچھ اشعار لکھکر گریز بمدح شاہ کرتا ہے بادشاہ کی تعریف بادشاہ بناکر ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے خیال میں خدا جانے کیا سمجھا اور کیا کچھ کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعرانہ حیثیت سے اپنے لیے لقب مداحی پسند نہیں کرتا۔ بلکہ جو کچھ مدح شاہ میں کہتا ہے اس کا نام "جوشِ ارادت" رکھنا چاہتا ہے اس خیال کی بنیاد تنوع خیالات اور ایجاد پسند طبیعت پر ہی نہیں بلکہ اس میں اہلکاری کے بہت سے اسرار مخفی ہیں۔

سایہ ... [illegible] جدا است　　سایہ نہ گویم کہ نور خدا است

نام گرامش ز شہان [illegible] سرش　　آمدہ [illegible] بالا [illegible]

از دو قی ناب سبق یافتہ　　تحفہ جنانش حق یافتہ

اسم گرامیش [illegible] است این　　اللہ اکبر [illegible] است این

صورت [illegible] آمیختہ　　کثرت و وحدت بہم آمیختہ

فرصت کونین [illegible]　　گنج دو عالم بہ ترازو [illegible]

بکر ازل را گہرش [illegible]　　مہر ابد را [illegible] نقش تو امان

سر چو بہ بالین [illegible] نہاد　　بر سر خود بار دو عالم نہاد

جلوہ دستے و [illegible] دان دور　　جرعہ جانے و فلاطون دور

خطاب

اے دو جہاں مقبل مسلم ترا　　دور شہنشاہی عالم ترا

ہست دو منشور جہانبانیت　　چوں سر تیغ و خط پیشانیت

در ازل از مدح تو بستند طرف　　دہ قلم [illegible] ورق و ہفت حرف

مدح تو بر فرق ازل خواندہ اند　　تحفہ تو بر دوش ابد ماندہ اند

بر صفت کونین دلیر آمدی　　دیر بمان دیر کہ دیر آمدی

اس کتاب میں مندرجہ ذیل عنوان ہیں

(۱) خلوت در انجمن (۲) ستایش نفس (۳) ستایش سخن (۴) نیرنگی نامہ (۵) چہرہ کشائی قلم (۶) بہار آفرینش (۷) صنعت پرتو ال (۸) فروغ خرد (۹) صنعت علم (۱۰) گونہ حسن (۱۱) جوش عشق (۱۲) ثنائے نظر (۱۳) نشاط بیداری (۱۴) طلوع صبح (۱۵) کوس سفر (۱۶) خزانِ فنا۔ (۱۷) ترانۂ واپسیں۔ خواجہ نظامی اور ملا جامی کی طرح ہر ایک بیان کے ساتھ حکایت نہیں لکھی صرف تین چار جگہ حکایات لکھی ہیں۔

پہلی کتاب جو اس طرز میں لکھی گئی یعنی جو واقعات صحیحہ یا مضامین نفیسہ پر مشتمل اور ان تمام عیوب سے پاک ہو۔ جو عموماً مشرقی لٹریچر میں پائے جاتے ہیں وہ خاقانی کی تحفۃ العراقین ہے۔ خواجہ نظامی کی ایجاد پسند طبیعت نے اس طرز میں تھوڑا سا تغیر دیکر ایک جدت پیدا کی اور مخزن اسرار لکھی یہ طرز ایسی مقبول ہوئی کہ تمام شعرا نے اسی زمین میں طبیعت کے جوہر دکھائے۔ امیر خسرو کی مطلع الانوار ملا جامی کی تحفۃ الاحرار تو داخل درس ہیں۔ عرفی شیرازی کی ناتمام مجمع الافکار اور زلالی کے کچھ مختلف اشعار بھی متداول ہیں فیضی نے اس کتاب میں شاعرانہ زور دکھانے کے علاوہ یہ مدنظر رکھا ہے کہ کلام محققانہ ہو اور اس سے شاعر کی وسعت معلومات بھی نمایاں ہو تعجب ہے کہ مرکز ادوار میں نعت رسول کا ایک شعر بھی نہیں ہرگز قیاس میں نہیں آتا کہ شیخ کے سامنے مخزن اسرار۔ مطلع انوار۔ تحفۂ احرار رکھی ہوں جن میں متعدد نعتیں ہوں شیخ ان کا جواب لکھنا چاہے۔ تفسیر قرآن لکھے۔ مسلمان کہلائے اور نعت رسول کا ایک شعر بھی نہو۔ حالاں کہ نل دمن میں بڑی بلاغت کے ساتھ نعت لکھی ہے۔ اور جا بجا معجزوں کا ذکر کر کے خشک فلسفیوں کے انکار پر استہزا کیا ہے۔ ملا عبد القادر بداؤنی نے بھی اپنی تاریخ میں اس کتاب پر کچھ اعتراض نہیں کیا ورنہ ملا جو اپنی تاریخ کے صفحہ کو فیضی کے کفر و الحاد کا فتوی بنانا چاہتا تھا کب در گذر کرنے والا تھا

اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاہزادہ سلیم جو بعد میں نور الدین جہانگیر کے نام سے تخت ہندوستان پر جلوہ آرا ہوا فیضی و ابو الفضل کا پولیٹکل تعلقات کی وجہ سے سخت دشمن تھا۔ جب بادشاہ ہوا تو اسے انکی شہرت و لیاقت کی داستانیں ناگوار طبع گزرنے لگیں۔ جہانگیر وہی راہ چلا جو طریق اس کے بعد عالمگیر نے دارا شکوہ کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ یعنی ابو الفضل اور فیضی کے منشیانہ و شاعرانہ خیالات کو میزان فقہ و شرع میں تولا اور کفر و الحاد کا فتوی لگا دیا۔ پس نعت کے

۱؎ یہ مضمون حدیث علمنی ربی فاحسن تادیبی سے لیا ہے اور بادشاہ کی ناخواندگی کو علم لدنی کا خلعت پہنایا ہے۔ ۱۲

ل اشعار غالباً نکال دیئے گئے اور باقی کتاب ثبوت ارتداد کے لئے چھوڑ دی گئی۔ بادشاہ یا معشوق کی علالت میں غزل لکھتا ہے۔

یارب بناز پرور نازک نہال ما را خورشید عافیت کن ابرو ہلال ما را
چون چشم خویش تا کے باشد بہ ناتوانی درجلوہ آر دیگر مشکیں غزال ما را
بر سطحہ مبارش بکشائے دیدۂ ما از آیت شفا کن فرخندہ فال ما را
اے عافیت کجائی زیں خانہ سر بہ کن صاف نشاط گرداں دُرد ملال ما را
آن ماہ را برآور از احتراق اشب ہیسند اے سعادت دیگر وبال ما را
در حلقۂ ملائک ذکر یست تازہ گوئی فیضی کمال صحت خواہد جلال ما را

غسل صحت بادشاہ کے بارے میں کہتا ہے۔

آں صحت ست عنصر شاہ یگانہ را پیداست اعتدال مزاج زمانہ را
درخواب راحت اندود بیمار نرگسش کوتہ کن اے طبیب فسون فسانہ را
گو شمع گوشہ گیر کہ از صبح عافیت افروخت آفتاب رخش صحن خانہ را
اے عیش اگر بپرفت زمن ورنہ کردے ایثار مقدمت گہر دانہ دانہ را
اے خوش بی کہ ماندی ازیں بزم گاہ در فرسودہ کن ز بوسۂ دوں آستانہ را

کہیں واقعات تاریخی کی بھی جھلکی دیتا ہے۔

فیضی بگردش قدح دم بدم کہ شاہ گجرات فتح کرد بہ بنگالہ میسرد

بعض غزلیں متروک بحور میں ہیں جنکے مضامین وغیرہ سے پایا جاتا ہے کہ حکیم ناصر خسرو علوی بلخی کا تتبع کرتا ہے۔

ساقی دوراں گذرز عربدہ سازی ساغر مے دہ بدور اکبر غازی
نے مے دانش ربا کہ محتسباں را ہمچو سپہر آورد بہ سفلہ نوازی
نے مے بدخو کہ وردہ مارغ رعونت یادہ تہور دہد بہ معرکہ تازی
نے مے آتش منش کہ در صف مستاں شہرہ بود گر میش بہ شیشہ گدازی
نے مے بیباک دل کہ بر خرد آرد ترک ہوس را بجوا دست درازی
زاں مے یکرنگ کز تصرف باطن توبہ دہد چرخ را ز شعبدہ بازی
زاں مے صافی کہ عاکفان صوامع خرقۂ دل را ازو کنند نمازی
زاں مے روشن نظر کہ باز نماید راہ حقیقت بہ عاشقان مجازی
زاں مے دریا گہر کہ پاک بشوید از دل عارف خیال نقش طرازی
فیضی اگرچہ درکشی زاں مے بے غش دور نباشد کہ بردہ گوئی بتازی

بہاریہ غزل

خاک چمن شد ز آب مشک تتاری آتش گل تیز کرد باد بہاری
ذرہ کافور بیخت شاخ شگوفہ سنبل مشکیں بسوخت عود قماری
بر سر ہر شاخ جلوہ گر شدہ گل ہا کردہ چو طفلاں باسپ چوب سواری
نہپے دوشیزگاں جملہ گلشن آب صفت خاک کرد آئینہ داری
دور نظر بازی است وحسن پرستی وقت گل افشانی ست بادہ گساری
غنچہ و نرگس رسیدہ اند فراہم کوش کہ دل را بدست دیدہ سپاری
جام مے لالہ گوں وطرۂ ساقی فیضی اگر عاقلی زکف نگذاری

فیضی کے قصائد بہت کم ملتے ہیں جسقدر دستیاب ہوتے ہیں وہ یا تو فخریہ ہیں یا مواعظ ونصائح سے پُر۔ قصاید بہت کم لکھے ہیں اور وہ بھی خصوصیت سے بادشاہ کی مدح میں۔

ایک فخریہ قصیدہ کا مطلع ہے۔

خواہم اصلاح نہ کتاب کنم نسخۂ کون انتخاب کنم

ایک ناصحانہ قصیدہ کا مطلع ہے۔

اگر بہ حضرت سلطاں رہ سخن داری مباد خامشیست بہ زخویشتن داری

قصائد کے کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ فیضی نے دربار میں داخل ہونے سے پیشتر جو قصائد امرائے دولت کی مدح میں لکھے تھے وہ بالآخر سب کے سب غارت ہوگئے چنانچہ فیضی خود کہتا ہے۔

فیضیم شاعر تونگر دل ہمت از خاک برکشیدۂ من
گشتہ در آستین ہمت گم طمع پیرہن دریدۂ من
ایں سواد سخن کہ مے نگری ہست خونابہ چکیدۂ من
افریبند دفتر ہا ست کہ ہست یعنی آن خاص آفریدۂ من

بردہ ہوش از نظارگیان — جلوۂ طبع شوخ دیدۂ من
بادۂ کو تپاہ ہے ز نگاہ خیال — خنش کلک سر بردۂ من
باشد آن خستہ ۔۔ پائے سخن — غزل و مثنوی گزیدۂ من
ہر چہ گفتم ۔۔ ۔۔ دل — عشق ۔۔ دار جریدۂ من
۔۔۔ شد نتائج دیوانہ — غزل ہا ۔۔ قصیدۂ من

۔۔۔

ایا مسافر اقطار نظم و نثر بہیں — کہ تا کجا بود امدادۂ مساعی ما
ہزار گونہ سخن از زبان ما ۔۔ — ہنوز تا بکجا کشد دواعی ما
بآفتاب نبود منتہی بوقت نظر — چو امتداد پذیرد خط شعاعی ما
بہر نگرہ اہل دید منتخب است — کہ تند رقم زدۂ کلک اختراعی ما
بگر ۔۔ ۔۔ نظم ہمگنان ۔۔ — قصیدہ و غزل و قطعہ و رباعی ما

سواطع الالہام ۔ قرآن مجید کی تفسیر عربی زبان اور بے نقط الفاظ میں ہے ۔ اس تفسیر سے فیضی کا کمال تبحر و دستگاہ ادب انشا بخوبی عیاں ہے ۔ حروف مہملہ کا اتنا التزام کیا ہے کہ نام بھی بدل ڈالے ۔ سروق پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جگہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ لکھا ہے جس میں کوئی منقوط حرف نہیں ۔ سورۂ اخلاص اس تفسیر کی تاریخ تصنیف ہے ۔ جاہل لوگوں نے اس تفسیر کی نسبت مشہور کر رکھا ہے کہ فیضی نے ایک قرآن بنایا تھا اور اکبر کو رسول الف ثانی قرار دیا تھا ۔

موارد الکلم ۔ علم اخلاق کی ایک کتاب ہے ۔ یہ بھی غیر منقوط حروف میں ہے ۔ روضۃ الادبا رمیں اس کتاب کی چند سطور نقل کی گئی ہیں ۔ فیضی نے خود بھی اس کتاب پر فخر کیا ہے ۔

طبع مشکل پسند من اکثر — مشکلات بدیع ملتزم ست
سلک ہائے بلاغت از کلکم — باسالیب خاص منتظم است
گر دلیلے بدیں سخن خواہی — در کتاب موارد الکلم ست

ان تصنیفات کے علاوہ اکبر نے ترجمہ کا محکمہ قائم کیا تو فیضی اُس کا مہتمم اور افسر اعلیٰ قرار دیا گیا ۔ راماین ۔ مہابھارت ۔ لیلاوتی ۔ جوگ بششٹ وغیرہ کے ترجمے سب فیضی کے قلم سے اصلاح پاکر نکلے ۔ مشہور ہے کہ فیضی بنارس پہنچا ۔ اور برہمن بچہ بنکر بنارس کے مشہور مہادیو ۔۔ ۔۔ پاٹشالہ میں داخل ہو گیا ۔ چونکہ حافظہ تیز ۔ ذہن صاف ۔ فہم درست ۔ طبع سلیم ۔ دل راغب اور علوم و کتب خصوصاً عربیت کی استعداد کامل تھی اس لئے تھوڑے سے عرصہ میں انتہائے تعلیم تک پہنچ گیا ۔ استاد بوجہ ذہانت اور اعلیٰ قابلیت کے باعث اس سے محبت کرتا تھا جب اس نے وطن کے لئے اپنے شفیق اُستاد سے اجازت اور رخصت چاہی تو اس نے ایک ہفتہ کے لئے اور ٹھہرالیا اور اپنے گھر میں مشورہ کرکے یہ ارادہ کیا کہ اپنی اکلوتی کنیاں سے فیضی کی شادی کردے جب فیضی سے کہا گیا اس نے صاف کہدیا کہ اس لڑکی کو ماں جائی بہن سمجھتا ہوں اور میں خود مسلمان ہوں ۔ استاد یہ سنکر پیکر حیرت بن گیا ۔ آہ بھر کر کہا کہ تو نے کل ہند دھرم ساتھ چل کیا ۔ مگر اب میرا حق استادی کیا ادا کرے گا ۔ فیضی نے عرض کیا آپ کیا فرماتے ہیں میں دل و جان سے آپ کی پدرانہ اور شفقت کا مرہون و ممنون ہوں ۔ اور میری استطاعت سے باہر ہے کہ آپ کے انعام و احسان کا حق ادا کر سکوں ۔ اُستاد نے کہا میں ایک خاص عہد لینا چاہتا ہوں تو سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کرے گا ؟ کہا ہاں ۔ کہا تو گایتری منتر کا ترجمہ نہ کرنا ۔ فیضی نے قبول کیا چنانچہ اس منتر کو بجنسہ لکھکر ترجمہ نکرنے کی یہی وجہ تحریر کردی ۔

بیان کیا گیا ہے کہ فیضی اور ابوالفضل نے دین کو دنیا پر نثار کیا ۔ اکبر نے جسقدر گرگٹ کی طرح رنگ بدلے وہ سب فیضی اور ابوالفضل کے اختراعات کا نتیجہ تھا ۔ اکبر ان کے ہاتھ میں پتلی کی طرح تھا ۔ اکبر کو آفتاب پرستی بھی انہوں نے ہی سکھائی ۔ کہتے ہیں کہ فیضی و ابوالفضل



کو ملحدانہ خیالات اپنے باپ شیخ مبارک سے ارث ملے تھے مگر کسی کے مذہب پر رائے دینا نہایت مشکل ہے اور مردہ شخص کو ملحد و مرتد بنانا بالکل بے سود ہے اس لیے یہ روایت قابل تسلیم نہیں۔ یہ سچ ہے کہ دونو بھائی نورتن میں داخل تھے اور بادشاہ کی جلوت وخلوت کے جلیس و ہمراز تھے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ اکبر کے مذہبی خیالات کی مہار انہی کے ہاتھ میں تھی محض غلط ہے اکبر کو تحقیقات مذاہب کا شوق تھا اور پولیٹکل وجوہ سے ہندؤں سے میل ملاپ ضروری سمجھتا تھا اور غالباً گورنمنٹ برطانیہ کی طرح وہ بھی سمجھا کہ ہندوستان جیسے کشت زار مذاہب میں اپنا طریق عمل گورنمنٹ کو لا مذہبی رکھنا چاہیئے۔ ان وجوہ کے ساتھ اکبر جاہل تھا اور ہر فرقہ کے منطقی وفلسفی دلائل کا سننا اور ایک کا دوسرے پر راجح و مرجوح سمجھنا اُس کے لیے مشکل تھا۔ اس لیے عمر بھر مذہب کو بھی شاہی رنگ رلیاں سمجھتا رہا۔ لیکن جب اکبر کے انجام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہر تاریخ میں لکھا ہوا ملتا ہے کہ مرنے سے تین روز پیشتر اُسنے قاضی اسلام کو بلایا اور اپنے گذشتہ اعمال وافعال واقوال سے توبہ کی عمر رفتہ پر اظہار ندامت کیا اور کلمۂ شہادت پڑھکر حاضرین کو اپنے تشہد کا گواہ بنایا۔ تو پھر کیوں یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ نورتن کے ان روشن اور قیمتی نگوں سے دراصل اپنے ضمیر کی راستی اور اپنی لازوال روح کو ظاہر پر نثار کر دیا تھا۔

یہ مان لینا آسان ہے کہ فیضی ہاں میں ہاں ملانے والوں میں ضرور تھا لیکن یہ یقین کرنا نہایت مشکل ہے کہ اس کے دلی معتقدات اسلام کے خلاف تھے۔ نلدمن میں جس بلاغت و فصاحت اور وسعت بیانی وزور کلامی سے اُسنے رسول کریم کی نعت لکھی ہے اور عام مسلمانوں بلکہ عجائز کی طرح معجزات کا اظہار کیا ہے اُس کے مقابلہ میں ایسی روایتیں محض فضول معلوم ہوتی ہیں۔ ہاں میں ہاں ملاتے رہنے کا ثبوت اُس کے اکثر اشعار سے ملیگا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

قسمت نگر کہ وہ خور ہر جو ہر عطاست ۔۔۔ آئینہ بار سکندر و با اکبر آفتاب
او میکند معائنۂ خود در آئینہ ۔۔۔ این میکند معائنۂ حق در آفتاب

نورے کہ زمہر عالم آرا پیداست ۔۔۔ از جبہہ شاہنشہ والا پیداست
اکبر کہ با آفتاب دارد نسبت ۔۔۔ این نکتہ ز بنیات اسما پیداست

ایسے اشعار کو میزان فقہ میں تولنا شاعرانہ مذاق سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اشعار میں یہ لوگ دلی معتقدات نہیں بلکہ صرف طبیعت کی شوخی اور فکر کی تیزی دکھایا کرتے ہیں۔

شیخ سعدی جیسے ثقہ اور محدث ایک جگہ لکھتے ہیں "بازن خویش ہم پہلو بودم خواجوے کرمانی آمد و در زد گفتم کیستی۔ گفت منم گفتم بازن خویش ہم سخنم نزنم بر آشفت کہ مردک چہ میگوئی گفتم آخر شاعر نیستم بہر تو قافیہ گزارم" اگر مذکورہ بالا اشعار یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ فیضی نے اکبر کو آفتاب پرستی سکھائی تو عرفی شیرازی کو کیا کہوگے جس کے قصائد میں آفتاب کی ردیف کا پورا قصیدہ موجود ہے اس قصیدے کے سوا دوسرا کوئی قصیدہ اسنے بادشاہ کی مدح میں لکھا ہی نہیں ۔ سینکڑوں لطائف سے فیضی کی ذہانت وطباعی ظاہر ہوتی ہے۔ اس جگہ صرف دو پر اقتصار کیا جاتا ہے

(۱) سلطنت ایران کا سفیر آیا بادشاہ کے سامنے مراسلہ پیش کیا۔ بادشاہ نے خود کھول لیا۔ سرنامہ نیچے۔ اور پایان اوپر۔ سفیر کے لبوں پر مسکراہٹ آنے لگی۔ فیضی جھٹ بول اٹھا "در حضرت ما سخن گوئید کہ پیغمبر ما نیز اُمّی بود"

(۲) شاہ عباس صفوی کے دربار میں طاہر وحید نے ایک رباعی پڑھی اسقدر مقبول ہوئی کہ فوراً مراسلہ تیار ہوا اور ایک سنہ

ہزار دو سالاں اکبر کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ مراسلہ کا دربار ویسے تزک و احتشام سے ہوا۔ رباعی پڑھی گئی

[illegible] ... بر سنان تیغ خونریز نازند
[illegible] ... عباس بذوالفقار حیدر نازد

عباس صفوی شیعہ تھا۔ یہ رباعی سنتے ہی اکبر نے گوشہ چشم سے فیضی کی جانب دیکھا۔ فیضی کھڑا ہو گیا اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی

دریا بگہر نبات با [illegible] نازد فردوس بسلسبیل کوثر نازد
عباس بذوالفقار حیدر نازد کونین بذات پاک اکبر نازد

سفیر عباس کو کھسیانا ہونا پڑا اور شعرائے ایران نے فیضی کی روانی طبیعت کا اقرار کیا۔ مگر انصاف یہ ہے کہ طاہر وحید کی رباعی کا جواب نہ بن سکا۔ عباس کو حیدر سے مناسبت ہے۔ کونین کو اکبر کی ذات سے کچھ مناسبت نہیں۔ اور تنقید کی نظر سے دیکھئے تو طاہر وحید کی رباعی کے چاروں مصرعے موجود ہیں۔ فیضی کی رباعی میں یہ بات نہیں۔ اور چوتھے مصرعہ میں اول تو لفظ پاک شتر دوم کونین تثنیہ اور نازد مفرد۔ پس نازند چاہیے۔ سوم تیسرا مصرعہ طاہر وحید ہی کا لوٹا دیا۔ غلطات تو طبقائے تو۔ چہارم طاہر وحید کی رباعی میں اکبر کی ہجو ملیح اور طنز ہے۔ یعنی اکبر کو مال و دولت پر گھمنڈ ہے۔ اور عباس کو ذوالفقار حیدر پر۔ فیضی کے چوتھے مصرع میں اگر اکبر سے مراد خدا ہے تو کونین کا خدا کی ذات پر ناز کرنا کوئی عجوبہ امر نہیں اور اگر مراد ممدوح یعنی اکبر ہے تو بالکل خلاف واقع غلو اور اغراق اور محض خوشامد ہے اگر چوتھا مصرعہ یوں ہوتا تب بھی ایک بات نکل آتی

ہر ذرہ بذات مہ اکبر نازد

بات یہ ہے کہ طاہر وحید نے وہ رباعی اطمینان سے سوچ سمجھ کر لکھی اور فیضی نے بے ساختہ فی البدیہہ۔ پس اگر کوئی بات رہ گئی تو اس سے کمال میں نقص لازم نہیں آتا۔ بعض دوسرے شعرا نے بھی طاہر وحید کے جواب میں رباعیاں لکھی ہیں مگر کسی کی رباعی نہ مربع نشین ترجیح ہوئی نقش بکسی۔

بادشاہ کے تقرب کو فیضی تو غالباً یاوری طالع۔ بلندی واقبال تصور کرتا ہوگا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ دربارا نہ زلیست سے اس کے علم وفضل نے بہت کم فائدہ دنیا کو دیا۔ عدیم الفرصت تو تھا ہی عمر نے بھی وفا نہ کی پچاس سال کی عمر میں شنبہ دہم صفر ۱۰۰۴ھ کو چند روز بیمار رہ کر انتقال کیا۔

اکبر بیماری کا حال سنکر عیادت کے لیے خود آیا۔ اور فیضی کا سر تکیہ سے اٹھاکر اپنے زانو پر رکھا لیا۔ اور فیضی کو پکارنا شروع کیا۔ نہایت محبت وقلق کے لہجے میں خیر باد کہا۔ فیضی آنکھیں کھولو دیکھو میں تمہارے پاس آیا ہوں حکیم علی گیلانی کو ساتھ لایا ہوں مگر فیضی پر سخت مدہوشی طاری تھی۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ مرنے سے چار روز پیشتر مجھکو کہا کہ بادشاہ سے چار یوم کی رخصت لیکر میرے پاس ہی بیٹھے رہو۔ میں نے رخصت لی چوتھے روز انتقال کیا اور پیشین گوئی صحیح نکلی۔ صاحب جامع التواریخ لکھتا ہے کہ شیخ فیضی کا سال مخبند وحکیم ہمام نے بہ ترتیب ایک ماہ کے اندر انتقال کیا۔

فیضی نے اپنی مثنوی نلدمن میں پہلا شعر حمد الٰہی میں یہ لکھا ہے

اے در تگ و پوے تو ز آغاز ۔ عنقاے نظر بلند پرواز

منقول ہے کہ دوسرا مصرع یوں تھا ع طاؤس نظر بلند پرواز
ایک مبصر ومدقق نے اعتراض کیا کہ طاؤس بلند پروازی کجا۔ پس بجاے طاؤس عنقا بایستے یعنی۔ "عنقاے نظر بلند پرواز
لیکن اس میں یہ نقص ہے کہ تگ وپوے عنقاکے پرواز کو مناسبت نہیں طاؤس البتہ اڑتا بھی ہے اور دوڑتا بھی ہے۔ پس پہلا مصرعہ یوں ہو۔

اے آنکہ در اوج تو ز آغاز عنقاے نظر بلند پرواز

اگرچہ تگ وپوے مراد تلاش وجستجو ہے مگر الفاظ کی مساعدت بھی ضروری ہے۔

احمد حسن شوکت

ازیادِ رفتہ سلطنت

بیجانگر

باب سوم

بیجانگر کے دو راجہ

۷۵۱ھ - ۸۰۲ھ == ۱۳۵۰ء - ۱۳۹۹ء

راجہ ہری ہر کا انتقال سلطنت کے لئے بھاکھا رائے - اور کامپا کی لڑائیاں - محمد شاہ بہمنی کی تخت نشینی - بھاکھا رائے اور کرشن دیو کا محمد شاہ سے اپنے علاقے مانگنا - کرشن دیو اور محمد شاہ کی لڑائی تلنگانہ پر محمد شاہ کی فوج کشی اور ناگ دیو پسر کرشن دیو کا قتل تلنگانہ پر محمد شاہ کی دوسری بار فوج کشی اور قلعہ گولکنڈہ کی فتح - سلطنت بہمنیہ پر بھاکھا رائے کا حملہ آور ہوکر شکست پانا - محمد شاہ بہمنی کی وفات اور مجاہد شاہ کی تخت نشینی - مجاہد شاہ کا سلطنت بیجانگر پر حملہ آور ہوکر بندر رامیشورم تک تاخت و تاراج کرنا - بھاکھا رائے کے انتقال پر ہری ہر دوم کا راجہ ہونا - سلطنت بہمنیہ کے اندرونی نزاعات - راجہ ہری ہر دوم کی لڑائی فیروز شاہ بہمنی سے -

۷۵۱ھ ۱۳۵۰ء میں راجہ ہری ہر کا انتقال ہوگیا تو اُس کے دو بھائی بھاکھا رائے اور کامپا نے سلطنت کا دعوی کیا - اور ۷۵۷ھ ۱۳۵۶ء تک قریباً چھ برس آپس میں لڑائی جھگڑے کرتے رہے - اس عرصہ میں دونوں بھائیوں کا آدھے آدھے ملک پر قبضہ رہا - کامپا کے مرنے پر اُس کے بیٹے سنگما نے بھی اپنے باپ کے مقبوضات قریباً ایک سال تک اپنے تصرف میں رکھّے - لیکن بھاکھا رائے نے بڑی ہی جد وجہد کرکے اُس کے علاقوں کو ۷۵۸ھ ۱۳۵۷ء میں چھین لیا - اس واقعہ کے بعد سلطنت اندرونی نزاعوں سے پاک وصاف ہوگئی - اور بھاکھا رائے تمام ملک کا بالاستقلال فرماں روا بن گیا -

گذشتہ چھ سال میں حسن بہمنی نے ورنگل اور بیجانگر کے بہت سے علاقے فتح کر لیئے تھے اور ان پر ابھی تک اسی کا قبضہ تھا - ۷۵۹ھ ۱۳۵۸ء میں محمد شاہ بہمنی اپنے باپ حسن بہمنی کا جانشین قرار پایا - تو اُس نے خیر و خیرات میں اسقدر روپیہ صرف کر دیا کہ خزانہ خالی ہوگیا اور اس حالت کو دیکھکر امرا میں ایک طرح کی بد دلی پیدا ہوگئی - جب یہ خبر مشہور ہوئی تو بھاکھا رائے اور ورنگل کے راجہ کرشن دیو نے اپنے مفتوحہ علاقے واپس مانگے - محمد شاہ نے ایلچیوں کو ڈیڑھ برس تک لیت ولعل میں رکھا - اس عرصہ میں جب خزانہ معمور ہوگیا اور ناراض امرا کی جگہ نئے امرا بھرتی ہوگئے تو ایک دن دربار منعقد کرکے اون ایلچیوں کو طلب کیا اور نہایت

قہر و غضب سے کہاکہ دو ڈھائی برس ہوچکے مگر اب تک رایان تلنگ و بیجانگر نے پیشکش نہیں بھیجے۔ انھیں چاہیئے کہ بہت جلد تلافی مافات کریں ورنہ اس کا نتیجہ بہت برا ہوگا۔ اس خبر کے پہنچتے ہی کرشن دیو نے اپنے بیٹے ناگ دیو کو بہت سی فوج دیکر قلعہ کولاس پر روانہ کردیا۔ اور بیجانگر کے راے نے اسکی مدد کے لیئے اپنے پاس سے بیس ہزار سوار دیئے۔ محمد شاہ نے مقابلہ کے لیئے بہادر خاں کو بھیجا۔ فریقین میں خوب معرکے ہوئے آخر میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ بہادر خاں ہندوں کا تعاقب کرتا ہوا ورنگل تک پہنچ گیا جس سے مجبور ہوکر کرشن دیو نے صلح کرلی اور ایک لاکھ ہون اور پچیس ہاتھی پیشکش میں دیئے۔ یہ واقعہ ۷۶۲ھ ۱۳۶۱ء کا ہے۔

اسی سال کے اخیر ایام میں محمد شاہ کے پاس ایک سوداگر نے آکر کہا کہ میں آپ کے لیے گھوڑے لارہا تھا مگر راستہ میں ویلم پیٹم کے حاکم ناگ دیو نے انھیں زبردستی چھین لیئے۔ اسپر محمد شاہ کو بے حد غصہ آیا اور اُسنے اُسیوقت لشکر کی تیاری کا حکم دیدیا۔ دس روز کے اندر اطراف و جوانب سے فوج آگئی اور گیارھویں روز چار ہزار سپاہیوں کو لےکر بادشاہ ویلم پیٹم کی جانب روانہ ہوا۔ ایک ہفتہ کی مسافت طے کرنے کے بعد لشکر جب شہر کے قریب ہوگیا تو بادشاہ نے تھوڑے سے آدمی سوداگروں کے بھیس میں شہر کیطرف بھیجے۔ یہ لوگ جب دروازے پر پہنچے تو دربانوں نے روکا اسپر اُنہوں نے بیان کیا کہ ہم سوداگر ہیں۔ راستہ میں راہزنوں نے لوٹ لیا ہے اس لیئے راجہ کے یہاں فریادی آئے ہیں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ فوج آگئی اور مصنوعی سوداگروں نے دربانوں کو قتل کردیا۔ اور حملہ آور بلاکسی روک ٹوک کے شہر مین داخل ہوگئے۔ ناگدیو کو جب محمد شاہ کے آنے کا حال معلوم ہوا تو پیچھے سے نکل بھاگا مگر راستہ میں مسلمانوں نے اُسے گرفتار کرلیا اور جب بادشاہ کے روبرو لایا گیا تو اُس نے نہایت گستاخی سے باتیں کیں اسپر محمد شاہ نے اسے مروا ڈالا شہر پر مسلمان قابض ہوگئے۔ بادشاہ چند روز تک مقیم رہکر واپس ہوا راستہ میں ہندوؤں نے کئی حملے کئے جس کی وجہ سے بہت سے مسلمان مارے گئے۔ اور چار ہزار آدمی سے گلبرگہ میں صرف ڈیڑھ ہزار واپس آئے۔

کرشن دیو کو جب اپنے بیٹے ناگ دیو کے مارے جانے کا حال معلوم ہوا تو اُسنے فیروز شاہ تغلق کو دکن کے تسخیر کرنے کی ترغیب دلائی اور خود بھی امداد دینے اور اطاعت کرنے کا وعدہ کیا۔ محمد شاہ نے یہ کیفیت سنکر اطراف و جوانب سے بہت بڑی فوج فراہم کی اور ۷۶۳ھ کے شروع ایام میں خان محمد۔ صفدر خاں۔ اعظم ہمایوں کو ہمراہ لیکر تلنگانہ پر حملہ آور ہوا۔ شروع میں راجہ نے مقابلہ کیا مگر جب اس کو متواتر کئی شکستیں ہوئیں تو اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ بادشاہ نے دو برس اس کا تعاقب کیا ۷۶۵ھ ۱۳۶۴ء میں راجہ نے مجبور ہوکر صلح کرلی۔ اور تین سو ہاتھی۔ دو لاکھ گھوڑے تیرہ لاکھ ہون تاوان جنگ میں دیے اور گول گنڈہ کا تمام علاقہ دیکر قلعہ گولکنڈہ کو سلطنت بہمنیہ اور تلنگانہ کی سرحد قرار دیا۔ اسکے بعد محمد شاہ گلبرگہ میں واپس چلا آیا اور اس فتح کی خوشی میں بادشاہ اور امرا نے کئی مہینے تک جشن منائے۔

راجہ ورنگل کے شکست پانے سے بیجانگر کے راے کو سخت تشویش ہوگئی۔ مگر جب اُسنے یہ دیکھا کہ محمد شاہ اور اُس کے بڑے بڑے امرا گلبرگہ میں عیش و عشرت میں مصروف ہیں تو فوراً تیس ہزار سوار اور نو لاکھ پیادوں کو لےکر سلطنت بہمنیہ

کر دیا - اور قلعہ ادھونی کو تاخت و تاراج کرتا ہوا مدگل میں آکر خیمہ زن ہوا اور وہاں کے آٹھ سو مسلمانوں کو جنہیں مرد عورت بوڑھے بچے سب ہی شامل تھے نہایت بے رحمی سے قتل کر ڈالا - اس فتنۂ عظیم سے صرف ایک آدمی زندہ بچا جس نے بہت سی تکلیفوں کے بعد گلبرگہ میں پہنچکر بادشاہ کو اس واقعہ کی اطلاع دی - محمد شاہ نے انتقام کا تہیہ کر کے دولت آباد سے لشکر طلب کیا - لیکن اُسکے آنے سے پہلے خود نو ہزار سوار لیکر روانہ ہو گیا - برسات کا موسم ہونے سے کرشنا خوب چڑھی ہوئی تھی مگر مسلمانوں نے اُسے تین روز میں عبور کر لیا کنارے پر راجہ سے مقابلہ ہوا جس میں تقریباً ستر ہزار ہندو مارے گئے - راجہ نے بھاگ کر قلعہ ادھونی میں پناہ لی - بادشاہ نے اسی جگہ برسات کے بقیہ ایام گذارے - اس عرصہ میں جب دولت آباد کا لشکر بھی آگیا تو بادشاہ نے قلعہ ادھونی پر حملہ کیا اور تھوڑے سے معرکہ کے بعد قلعہ ادھونی فتح ہو گیا - اسکے بعد بیجانگر کی جانب سفر کی تیاریاں ہونے لگیں - مسلمانوں نے جب دریائے دیدورتی کو عبور کر لیا تو راجہ کو بے حد پریشانی ہوئی اور اس نے اپنے بھتیجے بھوجمل رائے کو چالیس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیادے دے کر مقابلے کے لئے بھیجا - محمد شاہ نے اپنی فوج سے جسمیں پندرہ ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادے تھے دس ہزار سوار اور بیس ہزار پیادے دیکر خان محمد کو حملے کے لئے آگے روانہ کیا - ۱۴ ذی القعدہ ۷۶۷ھ کو سہ پہر تک خوب لڑائی ہوئی - قریب تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہو جائے مگر پیچھے سے محمد شاہ بھی بقیہ فوج لیکر آگیا جس سے مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے - خان محمد پانچسو سوار لیکر ہندوؤں کے لشکر میں گھس گیا اور ایسی ہلچل ڈال دی کہ ہندوؤں کے حواس باختہ ہو گئے - بھوجمل رائے زخمی ہو گیا اور راجہ کی فوج پسپا ہو کر بھاگ گئی -

اس واقعہ کے بعد تین مہینے تک متعدد لڑائیاں ہوئیں اور جب راجہ کو بار بار شکست ہوتی گئی تو اُس نے بیجانگر میں جا کر پناہ لی - مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا - لیکن راجہ کی نو لاکھ سپاہ نے شہر کے تمام راستے روک دیئے جس سے مسلمان اندر داخل نہ ہو سکے - جب اسیطرح ایک مہینہ گذر گیا تو بادشاہ نے ایک دن بیماری کا بہانہ کر کے محاصرہ اُٹھا لیا اور اسلامی فوج واپس گئی - ہندوؤں نے تعاقب کیا - کئی روز کے بعد جب دونوں فوجیں ایک میدان میں آگئیں تو رات کے وقت مسلمانوں نے ہندوؤں کو گھیر لیا - صبح کو اس کیفیت کے دیکھتے ہی ہندو گھبرا گئے اور ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ مسلمانوں نے مار دھاڑ شروع کر دی - تقریباً دس ہزار ہندو قتل ہوئے اور راجہ بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگ گیا - اس واقعہ سے ہندو راجہ کے مخالف ہو گئے اور اُسے کہا کہ جب سے تو حکمراں ہوا ہے قتل و خوں ریزی کا بازار گرم ہے اور اب تک ہزارہا ہندو قتل ہو گئے ہیں - مناسب ہے کہ تو آئندہ جنگ و جدل سے باز آکر اپنے بھائی کی طرح مسلمانوں کی اطاعت کر لے تاکہ ملک میں امن و چین ہو جائے - راجہ نے یہ سنتے ہی مجبور ہو کر محمد شاہ سے صلح کر لی - اور بہت سا زر و جواہر تاوان میں دیا -

اس کے بعد تقریباً نو برس بیجانگر میں امن و امان رہا - اس عرصہ میں نہ تو بیجانگر والوں نے چھیڑ چھاڑ کی اور نہ بہمنیوں کو جنگ کی ضرورت ہوئی - لیکن ۷۷۶ھ میں جب محمد شاہ کے بعد اُسکا بیٹا مجاہد شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے بکا راے کو لکھا کہ کرشنا اور تنگبھدرا دوآبہ پر ہمیشہ جھگڑا ہوتا ہے اس لئے سلطنت بہمنیہ کی سرحد دریائے تنگبھدرا قرار دی جائے اور قلعہ جات بنکاپور رائچور مدگل وغیرہ ہمیں دیئے جائیں مگر راجہ نے اس کے خلاف جواب دیا کہ مدگل و رائے

چونکہ پہلے ہمارے قبضہ میں تھے اس لئے وہ واپس دئے جائیں اور دریاے کرشنا سرحد مقرر کی جائے۔ اس کے سنتے ہی مجاہد شاہ نے بیدر بیرار۔ دولت آباد سے لشکر طلب کئے اور کل خزانہ شاہی کوٹ کر بیجانگر کی جانب روانہ ہوا جب دریاے تنگبھدرا عبور ہو گئی تو صفدر خاں کو قلعہ ادھونی کی تسخیر پر مقرر کیا۔ اس اثنا میں راجہ کی فوج بھی تنگبھدرا تک آگئی تھی اس کے مقابلہ کے لیے بہادر خاں اور اعظم ہمایوں بھیجے گئے۔ مگر بیجانگر والے بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے واپس ہو گئے۔ اور تنگبھدرا کے جنوبی جنگلوں میں جا کر پناہ لی۔ بیجانگر بہت سے پیچ در پیچ پہاڑی سلسلوں میں واقع ہونے کی وجہ سے ایک نہایت محفوظ مقام ہو گیا تھا اس لیے بادشاہ نے اس کا محاصرہ بے سود خیال کر کے راجہ کا تعاقب کیا اور چھ مہینے تک اُسے کوہ و صحرا میں مارتا پھرا۔ پھر اُس نے باقی فوج بیجانگر کے پاس چھوڑ دی اور صرف پانچ ہزار سوار لیکر انتہائے جنوب میں سمندر تک چلا گیا۔ اور وہاں رامیشورم میں ملک کافور کے سپاہیوں نے جو مسجد بنوائی تھی اور آجکل شکستہ ہو گئی تھی اوسکی مرمت کرائی اور راستہ میں مدورا۔ تانجور۔ کانچی ورم وغیرہ میں تاخت و تاراج کرتا ہوا بیجانگر کو واپس آیا۔

اس کے بعد مسلمانوں نے بیجانگر پر حملے شروع کیے۔ مجاہد شاہ نے ایک تنگ راستہ پر قبضہ کر کے اس کی حفاظت کے لیے چھ ہزار سوار اور بہت سے پیادے تعینات کر دئے اور خود شہر کے اندر گھس کے لڑتا بھڑتا راجہ کے محل سرا تک پہونچ گیا اس وقت ہندوؤں نے مدافعت کے لئے جان توڑ کوششیں شروع کیں اور مسلمانوں نے بھی مردانگی سے مقابلہ کیا۔

بادشاہ کھڑا ہوا جنگ کا ملاحظہ کر رہا تھا کہ دفعتہً اسکی نظر راجہ کے معبد پر پڑ گئی اور جب اسکی نسبت یہ سنا کہ اسمیں لاانتہا دولت محفوظ ہے تو قبضہ کرنے کے لئے بڑھا۔ ایک ہندو نے بادشاہ کو پہچان کر حملہ کرنے کے لئے آگے آیا۔ مگر محمود خاں افغان نے اُسے روک دیا اور دونوں میں مار دھاڑ شروع ہوئی قریب تھا کہ محمود مارا جائے مگر بادشاہ خود اسکی امداد کے لئے دوڑا۔ ہندو نے بادشاہ پر ہاتھ چلایا مگر سر پر خود ہونے کی وجہ سے وار خالی گیا اسکے بعد بادشاہ نے ایک تلوار ایسی ماری کہ مخالف کے دو ٹکڑے ہو گئے اسی اثنا میں راجہ کا بھائی آٹھ ہزار سوار اور چھ لاکھ پیادے لے کر شہر کے باہر آگیا۔ جب یہ حال بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے یہ اندیشہ کر کے کہ اگر مسلمان شہر میں گھر گئے تو بے آب و دانہ مرنا پڑے گا فوراً واپسی شروع کر دی اور ستّر ہزار قیدی اور بے انتہا دولت لے کر باہر نکل آیا اور اس کے بعد قلعہ ادھونی کا محاصرہ کیا اور قریباً نو مہینہ معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں مگر کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلا۔ سیف الدین غوری[۵] نے ان بے فائدہ لڑائیوں کی کیفیت سنی اور بادشاہ کے پاس چلا آیا اور راجہ سے صلح کی باتیں کر کے جنگ موقوف کرا دی۔

واپسی کے وقت دریائے تنگبھدرا سے اُتر کر مجاہد شاہ نے تمام فوج روانہ کر دی اور اپنے چند مصاحبین کو لیکر دریا کے کنارے مچھلی کے شکار میں مشغول ہوا۔ اور اسیطرح کئی ہفتہ گذر گئے۔ داؤد خاں اور مسعود خاں نے جنھیں بادشاہ سے خصومت تھی اس تنہائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور رات کیوقت موقع پا کر اُسے قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ ۱۷ ذی الحجہ ۷۷۹ھ (۱۳۷۸ء) کا ہے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد بھاکھا راے کا بھی انتقال ہو گیا اور اسکی جگہ اُسکا نواسہ ہری ہر راجہ بنایا گیا۔

[۵] ملک سیف الدین غوری مجاہد شاہ کا نانا اور سلطنت بہمنیہ کا وزیر اعظم تھا۔

ہری ہر کو جو سلطنت میراث میں ملی وہ شمال میں کرشنا سے لیکر جنوب میں بندر رامیشورم تک پھیلی ہوئی تھی ملیبار اور سنگلدیپ کے بڑے بڑے راجہ بھی اس کے باج گذار تھے۔ نو لاکھ سے زیادہ فوج خاص سلطنت کی ملازم تھی اور اس فوج کا شمار اسکے علاوہ تھا جو اطراف و جوانب کے راجہ جنگ کے وقت بطور امداد و اعانت کے بھیجا کرتے تھے۔

راجہ ہری ہر نے انیس سال تک مسلمانوں سے مصالحت رکھی ۷۹۹ھ میں جب محمود شاہ بہمنی کا انتقال ہو گیا تو آٹھ مہینے کے اندر اندر اس کے دو بیٹے غیاث الدین اور شمس الدین تخت نشین ہو کر معزول ہوئے۔ اس عرصہ میں سلطنت بہمنیہ میں عام طور پر بدانتظامی ہو گئی۔ جس سے فائدہ اٹھا کر بیجانگر والوں نے دوآبہ کے علاقہ جات مدگل و رائے چور پر قبضہ کر لیا۔ ۸۰۰ھ میں جب فیروز شاہ بادشاہ ہوا تو اُس نے سب سے پہلے انتظام سلطنت کی طرف توجہ کی اور ملک میں جو خرابیاں برپا ہو گئیں تھیں اونکے دفع کرنے میں مصروف ہوا۔ ہری ہر نے ان معاملات میں مشکلات پیدا کرنا چاہا اور کول اور گونڈا اقوام کے راجاؤں کو اغوا کر کے دیگر بہمنیہ سرحد پر شورش برپا کرا دی اور خود بھی ۸۰۱ھ کے اوائل ایام میں بیس ہزار سوار اور نو لاکھ پیادے لیکر سلطنت بہمنی پر حملہ آور ہوا۔ فیروز شاہ دولت آباد اور برار کے لشکر کو نرسنگھ والی گونڈوانہ کے مقابلہ پر روانہ کیا اور خود بارہ ہزار سوار لیکر سب سے پہلے کول کے راجہ کی خبر لی اور آٹھ ہزار کولیوں کو مار کر جب انکی طرف سے بے کھٹکے ہو گیا تو راجہ ہری ہر کیطرف متوجہ ہوا۔ اسلامی فوج نے آکر کرشنا کے کنارے ڈیرے ڈالے۔ برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے ندی خوب لبالب تھی اور سوائے اِسکے راجہ نے گھاٹوں کا بھی بندوبست کرا دیا تھا جس سے مسلمانوں کو ندی کا عبور کرنا مشکل ہو گیا۔ فیروز شاہ نے ارکین سلطنت سے مشورہ لیکر قاضی سراج کو بارہ آدمیوں کے ہمراہ ہندوؤں کی طرف روانہ کر دیا۔ قاضی نے ایک طوائف سے میل ملاپ کر کے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اسے اور اُس کے ایک ہمراہی کو اپنے مسخروں میں شامل کر کے راجہ کی محفل نشاط میں لے جائے رات کے وقت قاضی اور اس کا ساتھی دونوں ملکر اندر چلے گئے اور ننگی تلواریں لیکر مسخروں کی طرح ناچنے اور تماشا کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ایک نے موقع پاکر راجہ کے بیٹے کو قتل کر ڈالا۔ گیارہ آدمی جو باہر کھڑے ہوئے تھے عین وقت پر اندر گھس آئے۔ اور ڈیرے کے تمام آدمیوں کو مار کر ادھر اُدھر چھپ گئے۔ اس واقعہ سے ہندوؤں میں ہلڑ پڑ گئی۔ کسی نے کہا راجہ مارا گیا۔ کسی نے کہا اُسکا بیٹا قتل ہو گیا بعض لوگ یہ شور کرنے لگے کہ فیروز شاہ کا لشکر آگیا۔ الغرض ان اقسام اقسام کی افواہوں سے ہندو بدحواس ہو گئے۔ اس شور و غل کے سنتے ہی دو سو سپاہیوں نے دریا کو عبور کر کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا۔ پھر صبح ہونے سے پہلے فیروز شاہ بھی اپنی فوج لیکر اوتر آیا۔ ہندو پریشان ہو کر بھاگنے لگے۔ بادشاہ اُن کا تعاقب کرتا ہوا بیجانگر چلا گیا۔ اس تاخت و تاراج میں چار لاکھ ہندو گرفتار ہوئے اور بہت سا علاقہ پامال ہو گیا۔ راجہ اور اُس کے امیروں نے جب ملک کو تباہ ہوتے دیکھا تو صلح کے لئے ایلچی روانہ کئے۔ میر فضل اللہ انجو وکیل شاہی سے بہت کچھ گفتگو ہوئی اور آخر میں یہ طے پایا کہ راجہ دس لاکھ ہون بادشاہ کو اور ایک لاکھ ہون میر فضل اللہ کو دے تو جنگ موقوف کیجائے گی اور قیدی رہا کر دئے جائیں گے۔ اسپر راجہ نے چھ لاکھ ہون اور رعایا نے پانچ لاکھ ہون ادا کئے اور دوآبہ کا علاقہ بھی واپس اس تاریخ سے تنگبھدرا کا شمالی کنارہ سلطنت بہمنیہ کی سرحد قرار پایا۔

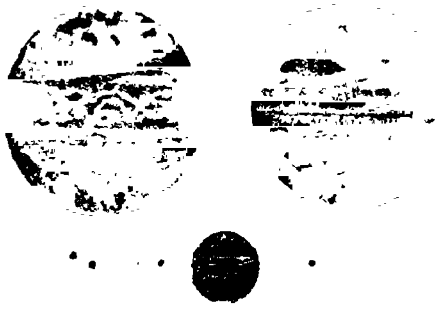
حکیم سید شمس اللہ قادری

عالم و مافی العالم

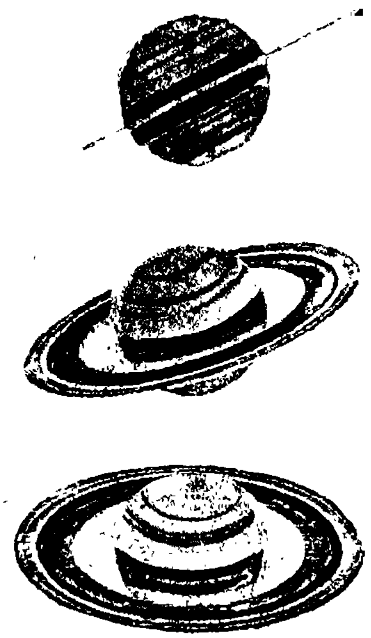
۳

یورے نس (Uranus)

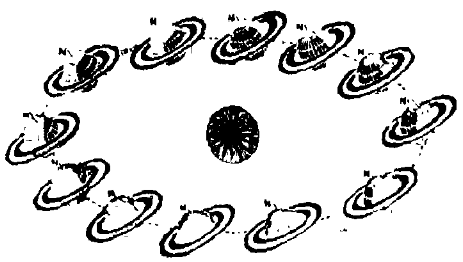
چھوٹے اور نزدیکی سیاروں کا تذکرہ ختم کرکے اب ہم دور افتادہ اور بڑے سیاروں کی طرف رجوع ہوتے ہیں "ہفت سیارگان" قدیم ایام سے مشہور چلے آتے ہیں پچھلے ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں انکے ساتھ دو اور سیارے شامل ہوئے اور پانسو کے قریب "سیارگان خرد" نظام شمسی کے حلقہ میں داخل کئے گئے ہیں۔ ۱۷۸۱ء میں ہرشل نے یورے نس کی اصلیت کو معلوم کیا۔ گو اس کا وجود بحیثیت ستارہ عرصہ سے معلوم تھا۔ انگلستان کے نامور فلکی فلامسٹیڈ نے تین مرتبہ۔ بریڈلے نے ایک دفعہ۔ مائر نے ایک دفعہ۔ اور فرانس کے ایک عالم ہیئت نے اسے گیارہ دفعہ دیکھا اور ستاروں کے ذیل میں شمار کیا تھا۔ کچھ عرصہ سے عالمان فلکیات حیران تھے کہ سنیچر اور برہسپت کی حرکتوں کی باقاعدگی اور صحت میں رخنہ واقع ہوتا ہے۔ اس کا اصلی سبب کیا ہے۔ بعض نے خیال کیا کہ ضرور کوئی اور سیارہ ہوگا جسکی کشش انکی گردشوں میں خلل انداز ہوتی ہے۔ آخرکار یہ گمان درست ثابت ہوا۔ ہرشل نے اپنی کوشش اور مشاہدہ سے اسکی تصدیق کر دی۔ یورے نس (Uranus) سورج سے ایک ارب اسی کروڑ میل پر واقع ہے اور اس کا قطر بتیس ہزار میل ہے اور اسکی سالانہ گردش چوراسی برس میں تمام ہوتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اسکا سال ہمارے سالوں کے حساب سے ۸۴ برس کے برابر ہوتا ہے۔ اسکی حرکت محوری ۸۵ روز میں پوری ہوتی ہے یعنی وہاں کا دن ہمارے ہاں کے پچاس دن کے مساوی ہے جب سے یہ سیارہ دریافت ہوا ہے سورج کے گرد صرف ایک چکر لگایا ہے دوسرا ہنوز ادھورا ہے۔ اسکی گردش کا دائرہ دس ہزار ملین۔۔۔ یعنی دس ارب میل ہے ہمارے کرۂ ارض سے حجم میں چونسٹھ گنا بڑا ہے۔ سر ولیم ہرشل کی رائے میں یورے نس کے گرد چھ چاند گردش کرتے ہیں۔ مگر عالموں کا تازہ ترین خیال یہ ہے کہ اس کے کل چار چاند ہیں۔ جو کرۂ ارض برہسپت اور سنیچر کے چاندوں کے برعکس مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ یہ چار چاند ایریل۔ ام بریل۔ ٹٹانیا۔ ابرون) ایک لاکھ بیس ہزار میلوں سے لیکر پونے چار لاکھ میلوں تک علی الترتیب یورے نس کے ارد گرد گھومتے ہیں دوسری عجیب بات یہ ہے کہ سب اسی دائرہ میں گردش کرتے ہیں۔ جسمیں خود انکا مرجع حرکت کرتا ہے جتنی حرارت سورج سے خارج ہوکر ہماری زمین پر آتی ہے اس کا صرف ۱/۳۶۸ حصہ یورے نس تک جاتا ہے۔ اگر اسکی اپنی کشش کا عمل معطل ہوجائے تو یہ سیارہ پندرہ برس میں سورج کی سطح پر ہولناک دھماکے کے ساتھ جا گرے گا۔ دوربینوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس میں وہی مادے پائے جاتے ہیں جو برہسپت میں موجود ہیں۔ اس واسطے موسمی تبدلات بھی ویسے ہی ہوں گے۔ حرارت و برودت کے درجہ میں بھی موافقت پائی جاتی ہے۔ ہوا زیادہ کثیف ہے سرخی مائل سیاہ دھاریاں دکھائی دیتی ہیں



مشتری
(جیسا دوربین میں نظر آتا ہے)



زحل اور اس کے حلقے



حلقہ ہائے زحل کی مختلف صورتیں

انجمن پریس اعظم گڑھ

...نکہ یہ سیارہ بہت دور افتادہ ہے اس واسطے اسکے متعلق بہت
...ے امور ہنوز تحقیق طلب ہیں جن کا زمانہ آئندہ کا سائنس انکشاف
...رے گا۔

نپ چون (Neptune)

نپ چون جو اپنی دریافت کے وقت سے لیکر آج تک نظام شمسی کا چوکیدار کہلاتا ہے، نہایت ہی دور افتادہ سیارہ ہے اور ایک اعتبار سے سب سے کم عمر۔ کیونکہ ۱۸۴۶ء میں معلوم ہوکر اراکین نظام شمسی کے گروہ میں شامل ہوا تھا۔ اس سیارہ کی دریافت ریاضی فلکیات کی نہایت شاندار اور معرکۃ الآرا کامیابی ہے۔ محققان فلکیات نے اپنے دوربینی مشاہدوں میں برسوں تک دیکھا کہ یورے نس کی رفتار کبھی بہت تیز اور کبھی سست ہوتی ہے۔ بہت غور و فکر اور دیکھ بھال کے بعد اُسے کسی دور افتادہ سیارہ کی کشش سے منسوب کیا گیا مگر رخنہ انداز سیارہ کچھ عرصہ تک معلوم نہیں ہوا۔ کیمبرج کے سینٹ جانس کالج کے ایک نوعمر گریجویٹ جس کا نام جان کوچ ایڈمز تھا، اور ریاضیات میں معتدبہ دستگاہ کے لئے خاص شہرت رکھتا تھا، اس مسئلہ کی طرف رجوع ہوا۔ اُسنے اسکے تمام پہلوؤں کو سوچا۔ سیاروں کی رفتاروں اور گردشوں کے زمانوں پر نظر عمیق ڈالی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ یورے نس سے اُس طرف ضرور کوئی بڑا سیارہ ہے جسکی کشش اُسکی حرکت محوری کو متاثر کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ اپنے تخمینہ جات کو حوالہ قلم کرکے اکتوبر ۱۸۴۵ء میں انگلستان کے شاہی منجم کے پاس بھیجدیا۔ مگر کسی نے اس سیارہ کو دریافت کرنے کی پروا نہ کی۔ اُسی سال فرانس کا نامور عالم جین لیوئیے بھی اسطرف رجوع ہوا اور اپنے خیالات دو مضامین میں فرنچ اکیڈمی کے حوالہ کئے۔ تیسرا مضمون اُسنے ۱۸۴۶ء میں لکھا۔ جس میں اس سیارہ کی ضخامت وغیرہ کا بھی اندازہ کیا۔ یہ مضامین برلن رصدگاہ کے مہتمم ڈاکٹر گال کے پاس بھیجکر درخواست کی کہ وہ اس سیارہ کو یورے نس سے آگے معلوم کریں۔ چنانچہ ۲۳ ستمبر ۱۸۴۶ء کو اُس نے ایک چھوٹا سا تارہ دیکھا۔ ادھر انگلستان کا شاہی منجم بھی اسکی تلاش میں تھا۔ وہ نقشے اور اندازے کر ہی رہا تھا کہ برلن سے نپ چون کی دریافت کی حیرت ناک خبر مشتہر ہوئی۔ لالینڈ نے ۸ اور ۱۰ مئی ۱۷۹۵ء میں نپ چون کو مشاہدہ کیا۔ مگر اُسے ستاروں کے ذیل میں داخل کیا تھا۔

نپ چون کا قطر (۳۴۸۰۰) میل اور سورج سے دو ارب اناسی کروڑ بیس لاکھ میل پر واقع ہے۔ یہ نودریافت سیارہ اپنی گردش سالانہ ۱۶۵ سالوں میں طے کرتا ہے گویا اس کے ہاں کا سال ہمارے ۱۶۵ برسوں کے برابر ہے۔ اسکی ضخامت زمین سے سترہ گنا زائد اور کثافت صرف اسکا ۱/۵ ہے۔ اور وہ اس سے پچاسی گنا بڑا ہے۔ اس کے ساتھ صرف ایک چاند ہے جو اسکی دریافت کے ایک ماہ بعد ہی معلوم ہوا تھا۔ وہ یورے نس کے چاندوں کی طرح مغرب سے مشرق کو گھومتا ہے اور اپنی گردش پانچ دن اور ۲۱ گھنٹے میں ختم کرتا ہے۔ اس کا فاصلہ نپ چون سے دو لاکھ ۲۳ ہزار میل ہے۔ جتنی حرارت اور روشنی ہمارے ہاں آتی ہے اس کا [illegible] حصہ نپ چون کی سطح پر پہنچتا ہے۔ اور وہ سات سو چاندوں کی روشنی کے برابر ہے۔ اگر نپ چون کی سطح سے سورج کو دیکھا جائے تو وہ بجلی کے بڑے لیمپ کی طرح دکھائی دیگا۔ شاید پوچھا جائے کہ نپ چون پر نظام شمسی کی حد ختم ہو جاتی ہے؟ اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

له ماخوذ از "نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا" جلد نمبر ۱۶ صفحہ ۳۶۲

دو ڈھائی سال ہوئے امریکہ کے علم فلکیات نے اس سے
بھی آگے ایک نیا سیارہ دریافت کیا ہے جو اپنی کشش کا
اثر نیپچون کی نقل و حرکت پر ڈال رہا ہے اب چوکیداری
کی گڑبڑی اس نو دریافت سیارہ کے ہاتھ آگئی ہے۔ معلوم
نہیں کہ آنے والے زمانہ میں عالموں کی علمی کوششوں سے
اور کیا کچھ دریافت ہوگا۔ روز بروز سائنس کی ترقی کی دوش
بدوش فلکی انکشافات میں بھی اضافہ کثیر ہوگا۔

سنیچر (زحل)

سنیچر (Saturn) پرانے سیاروں میں باعتبار حجم دوسرا
اور بلحاظ بُعد چھٹا ہے۔ یہ سیارہ سب سے زیادہ عجیب ہے
اس کے ارگرد مسلسل درخشاں حلقے اور دائرے دکھائی
دیتے ہیں اور اس کے ساتھ آٹھ چاند گردش کرتے ہیں اسکا
قطر ۷۴ ہزار میل اور سورج سے اٹھاسی کروڑ بہتر لاکھ میل پر
واقع ہے اس کا سال ہمارے تیس سال کے برابر ہوتا ہے۔
اسکی حرکت محوری دس گھنٹہ چودہ منٹ میں تمام ہوتی ہے۔
یہ کرہ زمین سے سات سو ساٹھ گنا بڑا ہے۔ اسکی کثافت
زمین کا صرف آٹھواں حصہ ہے۔ جتنی حرارت اور روشنی
ہمارے ہاں آتی ہے سنیچر کے حصہ میں اس کا صرف ۱/۹۰ حصہ
جاتا ہے۔ مگر وہ ہمارے تین ہزار چاندوں کی برابر ہے اور
جانداروں کی حیات کا وسیلہ بن سکتی ہے۔

اگر سنیچر کے سر پر سنیچر سوار ہو جائے اور اسکی کشش
بالکل زائل ہو جائے تو یہ پانچ سال دو ماہ میں سطح آفتاب
پر آرہے گا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد جلکر کوئلہ ہو جائے گا۔ اسکے
ہاں کے موسم بہت بے قاعدہ اور لمبے لمبے ہوتے ہیں قطبین میں
برسوں تک جاڑا اور تاریکی رہتی ہے۔

سنیچر کے عجائبات طبعی میں اس کے ارد گرد کے ہالے
یا چھلے ہیں۔ جن کا شمار کم از کم تین ہے بیرونی حلقہ کا قطر کوئی
دو لاکھ۔ دوسرے کا ڈیڑھ لاکھ اور تیسرے کا ایک لاکھ
انیس ہزار میل ہے۔ علما کہتے ہیں کہ یہ دائرے یا چھلے دوربین
میں نہایت ہی شاندار اور خوب صورت معلوم ہوتے ہیں
اور شان یزدانی کی تحسین و آفرین زبان سے نکلتی ہے۔ یہ چھوٹے
چھوٹے سیاروں کے حلقے ہیں جو کشش اتصال سے ایک دوسرے
سے مربوط اور منسلک رہتے ہیں۔ گلیلیو نے ۱۶۱۲ء میں یہ
حلقے پہلے پہل دیکھے تھے۔ مگر بیان نکر سکا کہ کیا ہیں۔ اسکے
کچھ چاند تو اسکے بہت قریب ہیں اور آدھے کے قریب کچھ
فاصلہ پر ہیں۔ نزدیک ترین چاند ایک لاکھ بائیس ہزار میل
پر اور بعید ترین بائیس لاکھ ستانوے ہزار میل پر واقع ہے۔
انکی گردش فلکی مدت بھی مختلف ہے۔ سب سے پہلے ۱۶۵۵ء
میں ایک عالم نے اس کا ایک بڑا چاند دیکھا تھا بعد میں رفتہ
رفتہ اور چاند بھی دریافت ہو گئے۱؎۔

برہسپت (مشتری)

پرانے خیالات دیوس پتر

برہسپت (Jupiter) جو زمانہ حال میں سیارگان
فلکی میں شامل ہوا ہے قدیم زمانہ میں دیوپتر
قوموں کے تمام دیوتاؤں کا گرو گھنٹال سمجھا
جاتا تھا۔ سنسکرت میں اس کا نام دیوس پتر۔ یونانی زیوس
پیٹر (Zeus Pater) اور لاطینی میں جوپی ٹر (Jupiter)
جس کے لغوی معنی ہرسہ زبانوں میں "آسمانی باپ" ہیں۔
پروفیسر میکس مولر مرحوم نے فلسفۃ اللسان کے مطالعہ میں

۱؎ ماخوذ از "گیلری آف نیچر" صفحہ ۹۸-۹۹

دیوس پتر" اور زیوس پتر۔ میں حیرت انگیز مشابہت پائی
اور ان زبانوں کا ایک ہی ماخذ تسلیم کرنے کو تیار ہوئے تھے۔
برہسپت یونانیوں اور رومیوں وغیرہ کے ہاں تمام دیوتاؤں
کا باپ اور بارش۔ آندھی اور بجلی کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔
رعد اور کٹرک اس کے خاص مصاحب قرار پائے تھے۔

سیارہ مشتری | برہسپت ارکین شمسی میں سب سے بڑا ہے۔
اتنا بڑا ہے کہ باقی تمام سیارے ملکر بھی اس کے مساوی
وزن نہیں ہو سکتے۔ یعنی انکی مجموعی ضخامت سے سہ چند
زائد ہے۔ اس کا فاصلہ سورج سے اڑتالیس کروڑ میل ہے
اور زمین سے انتالیس کروڑ میلوں پر چلتا ہے۔ اس کا قطر
ساڑھے چھیاسی اور اٹھاسی ہزار میل کے درمیان ہے سورج کے گرد
گیارہ سال میں ایک چکر ختم کرتا ہے۔ اور اس کے ہاں کا سال
۴۳۳۳ دن کا ہوتا ہے۔ کرہ ارض سے ۱۲۷۹ گنا بڑا ہے مگر
وزن میں صرف ۳۳۱ گنا بڑا ہے کیونکہ اسکی کثافت اضافی
صرف ¼ ہے۔ اپنے محور پر نو گھنٹے پچپن منٹ میں گھومتا ہے۔
برہسپت کی گردش کے دائرہ کا گھیر تین[1] ارب میل ہے
اور انتیس[2] ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے چلتا ہے جو کرہ ارض
کی رفتار کے نصف سے بھی کم ہے۔ اگر اسکی کشش طبعی کا عمل
معطل ہو جائے تو دو سال بتیس دن میں ہولناک دھماکے
کے ساتھ قرص آفتاب پر جا گرے اور وہاں ایک بڑے
زلزلہ کیساتھ عظیم الشان شگاف ہو جائے۔

شکر سے اترکر برہسپت سب سے زیادہ درخشاں ہے۔ مگر
چونکہ اسکی نسبت کرہ ارض سے بہت ہی دور ہے اسوجہ سے
اسکی درخشانی صرف ستارہ سیریس (Sirius) سے
گھٹ کر ہے۔ ورنہ یہ تمام اجرام فلکی میں سب سے زیادہ روشن
کرہ ہے۔ پچھلے سال انہی دنوں یہ سیارہ مع دیگر سیارگان کے
کرہ ارض کی زیارت کو آیا تھا اور شام کے وقت پونے آٹھ
بجے کے قریب مشرق سے دمکتا ہوا نکلتا تھا۔ جتنی حرارت اور
روشنی ہمارے ہاں آتی ہے اس کا صرف ¹⁄₂₇ حصہ مشتری
کے حصہ میں جاتا ہے۔ ہماری زمین چوبیس گھنٹے میں صرف
ایک دفعہ اپنے محور پر گھومتی ہے۔ مگر اتنی دیر میں برہسپت دو
دفعہ گھوم جاتا ہے اس سیارہ کی سطح پر ایسے موسمی تبدلات وقوع
میں نہیں آتے جیسے ہمارے ہاں ہیں۔ خط استوا کے علاقہ میں
سدا گرما اور قطبوں میں سدا سرما رہتا ہے۔ کیونکہ اسکا محور بالکل
سیدھا ہے۔ لیکن چونکہ بڑی تیزی سے گھومتا ہے اسواسطے
نہ تو سردی سخت ہوتی ہے اور نہ گرمی۔

صورت طبعی | دوربین کے ذریعے سے جب برہسپت دیکھا جاتا
ہے تو اس کے خط استوا کے ہم سطح منطقے۔ اور ٹیکے نظر آتے
ہیں۔ ۱۶۳۳ء[2] میں نیپلز میں ساپی اور بارتوی نے پہلے پہل یہ ٹیکے
مشاہدہ کئے تھے۔ کبھی کبھی انکا شمار آٹھ ہو جاتا ہے۔ کبھی ایک ہی
منطقہ نظر آتا ہے مگر تین ٹیکے عموماً دکھائی دیا کرتے ہیں۔ کوئی
معین اور کوئی غیر معین صورت میں نظر آتا ہے۔ بعض چند ہی
گھنٹوں میں ناپید ہو جاتے ہیں اور بعض مہینوں تک رہتے ہیں۔
سیاہ ٹیکوں کے خطہ میں گاہے گاہے ایک داغ بھی دکھائی
دیا کرتا ہے جو کبھی نظر آتا ہے اور پھر مٹ جاتا ہے۔ مگر منطقوں کے
خطوں میں اور بھی سیاہ داغ نظر آیا کرتے ہیں عالموں کا یہ گمان
ہے کہ برہسپت کی سطح پر عظیم طبعی انقلاب واقع ہوتے رہتے
ہیں جنکی ماہیت ہنوز دریافت نہیں ہوئی ہے اور جنکی وجہ سے

---

[1] ماخوذ از "نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا" جلد ۱۱ صفحہ ۳۳۴ اور "گیلری آف نیچر" صفحہ ۹۳۔۹۴۔۹۵۔ [2] ماخوذ از گیلری آف نیچر، صفحہ ۹۴

یہ چمکیلے اور داغ نمایاں ہوتے ہیں۔ سفید ٹکیوں کی بابت خیال ہے کہ وہ بادلوں کی قطاریں ہیں۔ جو اس کے کرہ ہوا میں معلق رہتے ہیں۔ جو سورج کی روشنی میں نہایت درخشاں معلوم ہوتے ہیں۔ جو زمین تک روشنی نہیں پہنچنے دیتے اور اس لئے تاریک نظر آتے ہیں۔ اس کی رفتار کی تیزی کے سبب سے بادل خط استوا کے خطوں میں متوازی قطاروں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف قیاس ہے۔ اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ یہ کرہ ہوا کے محیط ہیں۔

مشتری کے قمر | برجیس کے پانچ چاند ہیں۔ گلیلیو نے اپنی دوربین سے ۱۶۱۰ء میں انھیں دیکھا تھا۔ پہلا چاند اپنے مرکز سے دو لاکھ باسٹھ ہزار میل ہے۔ اور سب سے دور کا گیارہ لاکھ نہتر ہزار میل کے فاصلہ پر واقع ہے جو بارہ گھنٹے سے لیکر ۱۶ دن تک علی الترتیب گردش کرتے ہیں۔ چاند نمبر سوم کا قطر ۳۰۰۰ میل ہے اور باقی دو اور تین ہزار میل کے درمیان ہیں۔ گہن تو واقع ہوتا ہے مگر وہ گھٹتے بڑھتے نہیں جیسے ہمارے چاند میں دیکھا جاتا ہے۔ اور حالات ہنوز دریافت طلب ہیں۔ جو فلکی انکشافات کے ساتھ ساتھ ظاہر ہونگے۔

(باقی آئندہ)

جے۔ آر۔ را

جشن تاجپوشی

حضور ملک معظم ہز مجسٹی جارج پنجم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کا جشن تاجپوشی جس کی وجہ سے عروس البلاد لندن جون کے آخری ہفتہ میں گوناگوں دلچسپیوں کا مجموعہ بنا ہوا تھا۔ زمانہ حال کے ان اہم واقعات میں سے ہے جو اپنے معاشرتی و تمدنی نتایج کے لحاظ سے تاریخ عالم میں نمایاں درجہ حاصل کرنے کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں اور اسکی مسرت آمیز یادگار صفحہ دنیا پر مدت مدید تک موجودہ و آئندہ نسلوں کی دلبستگی کا ذریعہ ثابت ہوتی رہے گی۔

سلطنت برطانیہ کے ساتھ چشم بد دور آج جو ملکی و تجارتی خصوصیات وابستہ ہیں وہ باخبر اشخاص سے پوشیدہ نہیں۔ جو حکومت روئے زمین کے پانچویں اور بنی نوع آدم کے چوتھائی حصہ کی مالک ہو جس سلطنت میں کبھی آفتاب غروب نہ ہوتا ہو اور جسکی انصاف پسندی اور معدلت شعاری نے جا[...] کروڑ نفوس انسانی کے قلوب مسخر کر رکھے ہوں اس کے جاہ و جلال اور عظمت و اقتدار کا اندازہ ناممکنات سے ہے۔ [...] تھا کہ ایسے ذی مرتبت فرمانروا کا جشن تاجپوشی اسی تز[ک] و اہتمام سے منایا جائے جو اس کے شایان شان ہو۔ [...] جشن جس اعلے پیمانے پر ادا کی گئی ہیں اور ان کے اہتما[م و] انصرام میں جو گراں قدر اخراجات برداشت کئے گئے [...] کیفیت سنکر دل سے بزم کیانی و جشن جمشیدی کے نقشے [...] ہیں اور انگریزی سلطنت کی صولت و عظمت کا نقش [...] ہو جاتا ہے۔

جون کی ۲۲ تاریخ اس مبارک رسم کے لئے مقرر تھی کئی مہینوں کی کوشش اور لاکھوں کے صرف سے د[...]



اعلیٰ حضرت شہنشاہ جارج پنجم دام ملکہ و ملکہ معظمہ میری دام اقبالہا

تک جشن کی تیاریاں ہوا کیں۔ اسکے مبسوط حالات کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہوگی لیکن مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس موقع پر لندن کی آرایش و زیبایش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا تھا۔ شاہی مہمانوں کی آمد اور عام نظارگیوں کی کثرت سے لندن کی آبادی میں غیر متوقع اضافہ ہوگیا تھا اور جیسے جیسے تاریخ قریب آتی جاتی تھی ویسے ویسے شہر کی امنگوں کے ساتھ آدمیوں کا ہجوم بھی روز افزوں تھا۔

عام گزرگاہیں، شاہی محلات، سرکاری اماکن، اور پرائیوٹ مکانات اور دکانیں غرض ہر چیز دل آویزی میں بجائے خود نمونہ بہشت بنی ہوئی تھی۔ ایک طرف گورنمنٹ نے موقع کی اہمیت کا خیال کرکے اہتمام جشن میں پوری پوری ہمت دکھائی تھی۔ اور دوسری جانب رعایا نے اپنے ہردلعزیز بادشاہ کے نام پر ہزاروں اور لاکھوں خرچ کرکے اپنی فرماں پذیری اور وفاداری کے حوصلے نکالے تھے اور تاریخ مقررہ سے پہلے ہی پہلے لندن میں وہ چہل پہل پیدا ہوگئی تھی جس کا اندازہ کچھ وہی خوش نصیب کرسکتے ہیں جنھیں بذات خود شرکت جشن کی عزت ملی تھی۔

جشن کا پروگرام پہلے سے مرتب ہوگیا تھا۔ اور جملہ کارروائی اُسی کے مطابق عمل میں لائی گئی۔ ۲۱ر جون کو شاہی محل میں غیر ملک کے سفیروں کی دعوت کی گئی۔ اس میں ہندوستان کے بعض والیان ریاست کے ماسوا اکثر سلطنتوں کے ولیعہد اور شاہی خاندان کے اراکین بھی مدعو تھے۔ مہمانوں کو حضور ڈیوک آف کناٹ کی میزبانی کا شرف حاصل تھا۔ اُسی دن انگریزی نوآبادیوں کے وزراء اور قائم مقاموں کو ملک معظم کے حضور میں باریابی کا فخر عطا ہوا۔ اسی تاریخ میں شب کو نہایت وسیع پیمانے پر شہر میں روشنی کی گئی اور رات بھر لوگ سڑکوں پر گشت لگاتے اور تماشہ دیکھتے رہے۔ خلقت کا بے حد ہجوم تھا۔ راستوں پر کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ یہ رات گذرنے پر وہ صبح نمودار ہونے والی تھی، جس کے دل خوش کن انتظار نے لوگوں کی آنکھوں سے نیند اڑا رکھی تھی۔ تماشائیوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی اور انکی منتظرانہ حالت اسوقت تک قائم رہی جسوقت تک کہ لندن ٹاور سے توپوں کی آواز نے نعرہ مبارکباد کی طرح اٹھکر یہ نہ بتا دیا کہ جشن کی ساعت سعید آپہنچی۔ جلوس کے راستہ پر صبح ہی سے پولیس و فوج کا انتظام ہوگیا تھا۔ گذرگاہ کے دونوں جانب خلقت کا ہجوم تھا۔ ۵۴ ہزار فوج لارڈ کچنر کی نگرانی میں مصروف انتظام تھی۔ اور اس کے علاوہ کثیر تعداد میں پولیس تھی۔ انکی متحدہ کوشش سے کسی قسم کا فساد نہیں پیدا ہونے پایا۔ تماشائیوں نے اپنی اپنی جگہ سویرے ہی سے سنبھال لی تھی۔ مطلع ابرآلود تھا، اور جلوس کی روانگی کے وقت ترشح بھی ہو رہا تھا۔

بموجب قرارداد بکنگھم پیلیس سے جلوس روانہ ہوا پہلے غیر ملکوں کے شاہزادے اور سفیر تھے۔ پھر انگلستان کے شاہی خاندان کے نوجوان اراکین۔ آخری گاڑی میں حضور پرنس آف ویلز۔ شاہزادی میری۔ اور شاہزادہ البرٹ تھے۔ انکو دیکھکر چاروں طرف سے لوگوں نے نعرہائے مسرت بلند کئے۔ اس حصہ کے گذرنے کے بعد کچھ وقفے سے توپیں دغنا شروع ہوئیں جس سے معلوم ہوا کہ شاہی جلوس اب محل سے روانہ ہوتا ہے۔ اُسوقت تماشائیوں کے ذوق و شوق کی عجیب کیفیت تھی جسکا اظہار زبان قلم سے ناممکن ہے۔ حضور ملک معظم کی سواری کا دلفریب نظارہ کرنے کے لئے آفتاب عالمتا

بھی جو اب تک ابر میں چھپا ہوا تھا۔ اب نکل آیا تھا۔ اور اہل جلوس کی مطلا وردیوں اور صاف شفاف ہتھیاروں کی چمک دمک نے اسکی سنہری کرنوں کے ساتھ ملکر عجیب لطف پیدا کردیا تھا

سب سے آگے شاہی گارڈ کا بینڈ بج رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک گاڑی میں شاہی خاندان انگلستان کے محترم اراکین تھے۔ اور ان کے پیچھے حضور ملک معظم کے بحری وبری فوجی مصاحبین جنکی زرق برق پوشاکیں نظارگیوں کی آنکھیں خیرہ کررہی تھیں۔ ان سب کے بعد بگھی کی خاص گاڑی تھی جسمیں خود بدولت اور ملکہ معظمہ رونق افروز تھیں۔ بگھی میں آٹھ سبزہ گھوڑے لگے تھے۔ اس بگھی سے بعض تاریخی دلچسپیاں وابستہ ہیں۔ یہ شاہ جارج سوم کی جشن تاجپوشی کے لئے ۱۷۶۱ء میں تیار کی گئی تھی۔ اسکا وزن چار ٹن سے کسی قدر زیادہ ہے۔ اور اسکی تیاری پر ایک لاکھ پندرہ ہزار روپئے کی لاگت آئی تھی۔ کل کاری اور پچی کاری کا کام اسپر اس درجہ پختہ کیا گیا ہے کہ آج بھی وہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔

بادشاہ و ملکہ کی سواری کے گذرتے وقت ہرطرف سے شور مبارک باد بلند تھا کہ توپوں اور گھنٹوں کی آواز بھی ماند پڑ گئی تھی۔ رعایا کے اظہار شادمانی پر بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ دونوں زیر لب مسکراہٹ سے اپنی دلی خوشی کا اظہار فرماتے جارہے تھے۔ اور بار بار سر اقدس کی حرکت سے اس کے جوش و خروش اور خلوص کا گویا شکریہ ادا فرماتے تھے شاہی بگھی کے پیچھے لارڈ کچنر اور لارڈ رابرٹس گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کے عقب میں ہندوستان اور نوآبادیوں کی فوجیں تھیں۔ اول الذکر کی موجودگی سے جلوس میں اور بھی لطف پیدا ہوگیا تھا۔ ہر شخص کی توجہ انھیں کے جانب تھی اور تماشائیوں نے عام طور پر ان کے لئے نہایت گرمجوشی سے چیرز دئیے اور نعرے بلند کئے۔ جلوس کے آخری حصے پر شاہی گارڈ کی ایک پلٹن تھی۔ جسوقت جلوس لندن کے مشہور و معروف گرجے ویسٹ منسٹر ایبے کے قریب پہنچا تو آفتاب پھر چھپ گیا تھا لیکن بارش نہیں ہوئی۔

ایبے پر اسوقت عجیب جوبن برس رہا تھا۔ اسکی آرائش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا تھا۔ ہر طرف رنگ برنگ کے پھولوں سے زینت دی گئی تھی۔ اور جگہ جگہ عالیشان خوشوضع محرابیں بنائی گئی تھیں۔ جا بجا سفید ستونوں کی خوبصورت قطار تھیں جن کے اوپر ایک سرے سے دوسرے تک جھنڈیاں لہرارہی تھیں۔ ستونوں میں پھولوں کے ہار لپیٹے گئے تھے اور ان کے اوپر برٹش نوآبادیوں اور دیگر مقبوضات شاہی کے نشانات نصب تھے۔ آرائش میں اگرچہ سادگی کا زیادہ خیال رکھا گیا تھا۔ لیکن اس سادگی میں بھی ہزاروں طرح کی دل آویزیاں پیدا تھیں۔

ایبے کے داخلہ کے وقت ۵ ½ بجے صبح سے تھا۔ اور ۹ بجے تک تمام نشستگاہیں معمور ہوگئیں تھیں۔ سات ہزار معززین ایبے کے اندر وقت موعودہ پر موجود تھے۔ اور اس تعداد کو ممتاز سرکاری حکام ممبران پارلیمنٹ اور مذہبی رہنماؤں کے علاوہ ہر علم و فن کے قایم مقاموں پر مشتمل سمجھنا چاہئے۔

شاہی جلوس کے پہنچنے پر سابقہ ترتیب کے مطابق پہلے سفراء وغیرہ اور پھر حضور ولیعہد بہادر اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ داخل ہوئے۔ حضور ممدوح کے دست مبارک میں ایک چھوٹا سا

تاج بھی تھا۔ آپ ایک نمایاں جگہ پر تشریف فرما ہوئے۔

حضور ملک معظم اور ملکہ میری کی تشریف آوری کے وقت تمام حاضرین تعظیماً سروقد کھڑے ہو گئے۔ پیشوایانِ مذہب کے گذرنے کے بعد حضور ملکہ معظمہ داخل ہوئیں۔ دو بشپ صاحبان اور اکثر خواتین آپ کے ہمراہ تھیں۔ پھر لوازمات تاجپوشی لائے گئے۔ آخر میں اعلیٰ حضرت ملک معظم تشریف لائے آپ کے دونوں جانب بشپ صاحبان تھے۔ ممتاز افسران فوج جلو میں تھے۔ آپ کو دیکھ کر حاضرین نے نعرۂ سلامتی بلند کیا۔ کہ

"خدا بادشاہ و ملکہ کی عمر دراز کرے"

بادشاہ سلامت کا تخت قربان گاہ کے سامنے رکھا گیا تھا۔ اس کے داہنے طرف کیمونین سروس[1] کا سامان ایک لانبی میز پر رکھا تھا چبوترے پر نیلے رنگ کا قالین بچھا تھا جس پر دو نفیس کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہز مجسٹی اور ملکہ معظمہ نے پہلے اپنے تخت کے قریب پہنچ کر اور سر جھکا کر خاموشی کے ساتھ کچھ دعا پڑھی اور پھر کرسیوں پر متمکن ہوئے۔ اس کے بعد آرچ بشپ آف کنٹربری نے حضور ملک معظم کا تعارف حاضرین سے کرایا اور بیان کیا کہ

"آپ بلا ریب و شک اس سلطنت کے حکمراں ہیں"

حاضرین نے جواب میں "خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے" کا شور بلند کیا۔ آرچ بشپ آف یارک نے دعا پڑھی۔ حضور ملک معظم نے حلف لیا اور جسم مبارک پر تیل[2] کی مالش کی گئی۔ آرچ بشپ آف کنٹربری نے فرق اقدس پر تاج رکھا۔ اس پر حاضرین نے نہایت جوش و خروش سے مسرت کا اظہار کیا۔ بگل بجے۔ توپیں دغیں اور خوشی کے گھنٹوں نے اپنی بلند آواز سے آسمان کو سر پر اٹھا لیا۔

انگلستان میں ہر تاجپوشی کے موقع پر نیا تاج تیار کیا جاتا ہے۔ ہز مجسٹی جارج ششم کے تاج میں آپ کے نامور والد ماجد کے تاج کی بہ نسبت ۹۰ نیلم، ۵۲ ہیرے۔ اور ۹۰ دیگر جواہرات زیادہ ہیں۔ ہندوستان کے مشہور عالم ہیرے کوہِ نور کو اب علیا حضرت ملکہ معظمہ کے تاج میں جگہ دی گئی ہے۔

تاجپوشی کے بعد ہز مجسٹی تخت پر جلوہ بخش ہوئے۔ حاضرین نے اظہار وفاداری کے طور پر سر تسلیم خم کئے اور کلیسا، رعایائے انگلستان اور خاندان شاہی کی جانب سے اقرار اطاعت و فرماں برداری عمل میں آیا۔ اس کے بعد ملکہ معظمہ کی تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی۔ آپ کنٹربری اور یارک کے لاٹ پادری صاحبان کے ہمراہ قربان گاہ کے روبرو تشریف لائیں اور آپ کو تاج پہنایا گیا۔ تخت شاہی کے سامنے سے گذرتے ہوئے آپ نے بھی اظہار وفاداری کی غرض سے سر مبارک خم کیا۔ اس کے بعد ہیر مجسٹیز کو ایک دوسرے چھوٹے سے گرجے میں لے جا کر خلعت شاہی سے مزیّن کیا گیا۔ اور واپسی پر حاضرین نے آوازۂ مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

ان تمام مراسم کے ادا ہونے پر واپسی شروع ہوئی اور شاہی جلوس اسی تزک و احتشام سے دوسرے راستے سے ہوتا ہوا واپس آیا۔

۱۲ جون کی شب کو آتشبازی اور روشنی کا اہتمام قابل دید تھا۔ دوسرے روز جلوس شاہی ایک دوسری گذرگاہ سے

---

[1] یہ ایک مسیحی مذہبی رسم ہے۔ اردو میں اس کو "عشاء ربانی" کہتے ہیں۔ [2] انگلستان کی یہ ایک قدیمی رسم ہے کہ تخت نشینی کے وقت بادشاہ کے جسم پر تیل ملا جاتا ہے۔

سمجھا گیا تاکہ وہ لوگ جو پہلے دن شاہنشاہ کے دیدار سے محروم رہ گئے ہوں آج بہرہ اندوز ہوسکیں۔ گو آج کسیقدر ترشح ہو رہا تھا لیکن حضور ملک معظم نے گاڑی کھلی رکھی تاکہ رعایا کو خدایگان والاشان کی زیارت بسہولت ہو سکے۔

جشن کے موقع کو عجیب شاندار بنانے کے لیئے جہاں بیشمار ذخیرے اور سامان مہیا کئے گئے تھے وہاں دو ایک باتیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ گھوڑوں کی ایک نمائش المپیا میں منعقد ہوئی تھی۔ اور ۲۴ جون کو جنگی بیڑہ جہازات کا ملاحظہ کیا گیا۔ اس قسم کا دلفریب نظارہ دنیا کی نظر سے آج تک نہیں گذرا۔ تقریباً چار سو جنگی جہازات جمع کئے گئے تھے۔ حضور ملک معظم نے ملکہ معظمہ کے ہمراہ شاہی جہاز میں جلوہ افروز ہو کر جہازات کے گرد چکر لگایا۔ اور ملاحوں نے نعرہ ہائے مسرت سے خیر مقدم کیا۔ رات کو ان جہازات پر برقی روشنی کی گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سمندر میں گویا آگ لگی ہوئی ہے۔

۳۰ جون کو کرسٹل پیلیس میں مدارس کے ایک لاکھ بچوں کی دعوت اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل عجیب چیز تھی جس کی تحریک ملک معظم نے فرمائی تھی۔

اس اجمال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس خوش اسلوبی و شان و شوکت سے رسم تاجپوشی ادا کی گئی ہے۔ حضور ایڈورڈ ہفتم آنجہانی کے عہد میں بھی اسی موقع پر نہایت دھوم دھام ہوئی تھی لیکن آپ کے عالی منزلت جانشین کی تاجپوشی جس پیمانے پر کی گئی ہے اس کا قیاس صرف اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ اب کی مرتبہ تمام اخراجات کا تخمینہ ۵۴ لاکھ روپیہ نقد کیا گیا ہے۔ بحالیکہ گذشتہ مرتبہ ساڑھے تین لاکھ کے قریب صرف ہوا تھا۔ ذیل میں بعض اخراجات کی جداگانہ تفصیل شمار و اعداد کے ذریعے دی جاتی ہے۔ امید ہے کہ ناظرین دلچسپی سے دیکھیں گے۔

عام اخراجات۔	۵۰۰۰۰ پونڈ
اخراجات متعلق فوج۔	۸۰۰۰۰ پونڈ
اخراجات افواج بحری۔	۲۰۰۰۰ پونڈ
ہندوستانی مہمان اور ہندوستانی فوج	۳۷۰۰۰ پونڈ
اخراجات متعلق تعمیرات۔	۳۳۰۰۰ پونڈ
بیرونی سفرا کی مہمانداری	۹۰۰۰ پونڈ
روشنی	۲۰۰۰۰۰ پونڈ

سید محمد فاروق شاہپوری

مسٹر میتھیو برون کیمرن

اگر آپ کو کبھی لکھنؤ کے کیننگ کالج میں آنے کا اتفاق ہو تو منجملہ اور انگریزی پروفیسروں کے ایک صاحب پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ پڑی ہوگی جو بہت تنکیل - دراز قد اور لاغر اندام ہیں - جنکے چہرے سے متانت و سنجیدگی ٹپکتی ہے آنکھیں شرافت اور ہمدردی کا اظہار کرتی ہیں جس کے ساتھ اپنے طلبا سے پیش آتے ہیں - آپ ان کو بہت کم کسی سے گفتگو کرتے پائیں گے بلکہ ہمیشہ یا تو کتابوں کی صحبت ہوگی یا اپنا تعلیمی فرض ادا کر رہے ہوں گے اور اگر گفتگو کرتے بھی ہونگے تو کسی علمی معاملے پر - ممکن ہے کہ کسی اور پروفیسر کو کلاس میں جانے میں دیر ہوجاے لیکن آپ کی یہ کیفیت ہے کہ آدھا گھنٹہ بجا اور گھڑی کی سوئی کی طرح آپ اپنے ٹھکانے پر موجود ہیں - کیا مجال کہ اپنے وقت مقررہ میں سے ایک منٹ بھی چھوڑ دیں - آپکا مقولہ ہے کہ "وقت سے پورا فائدہ، جو اٹھا سکتا ہے حاصل کرلو" یہی صاحب ہیں جنکی تصویر ہدیۂ ناظرین ہے -

پیدائش و عالم طفولیت

اسکاٹ لینڈ جو کہ جزیرۂ برطانیہ کے شمال میں واقع ہے مردم خیز خطّہ ہے - انگریزی علم ادب کے بعض بیغمبر جنھوں نے انگریزی علم ادب کو یورپ کا علم ادب بنا دیا - اُسی کی خاک سے اٹھے تھے - گو اسکاٹ لینڈ رقبہ میں برطانیہ کا بہت بڑا حصہ نہیں ہے - لیکن برطانیہ کی ترقی میں اُسنے بہت سے کارنمایاں کئے ہیں - اسکاٹ لینڈ کا سب سے بڑا شہر گلاسگو ہے - گو وہ دار السلطنت نہیں ہے - یہ دنیا کے بڑے صنعتی مرکزوں میں ہے اور یہاں ایک یونیورسٹی بھی ہے - اسی شہر میں ۱۸۶۶ء میں جبکہ للارڈ ڈربی تیسری مرتبہ کرسیِ وزارت پر متمکن ہوے تھے اور انکا مشہور پارلی منٹری رفارم ایکٹ پاس ہوا تھا مسٹر کیمرن نے پہلے مرتبہ اس دنیا کی روشنی میں آنکھیں کھولیں تھیں - لیکن آپ کا سن بہت ہی کم تھا جبکہ خاندان پیزلی جو مغربی حصّہ اسکاٹ لینڈ میں ایک مشہور صنعتی مقام ہے منتقل ہوگیا اور یہیں آپ کا زمانۂ طفولیت اپنے پدر بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں بسر ہوا -

تعلیم

پڑھنے لکھنے کا آپکو شروع ہی سے بہت شوق رہا - اور ہمیشہ اپنے ہم سبقوں سے افضل رہے - انسان میں کوئی بھی صلاحیت ایسی نہیں ہوتی جسکے اُبھرنے کے سامان خداوند تعالیٰ مہیّا نہ کردے - چونکہ مسٹر کیمرن میں علمی دنیا میں خاص شہرت حاصل کرنے کی صلاحیت موجود تھی - آپ کو ہمیشہ برطانیہ کے مشہور مشہور عالموں کے زیر تعلیم رہنے کے موقع ملتے گئے آپکی تعلیم بھی اپنے مولد یعنی گلاسگو یونیورسٹی میں ہوئی - یہاں آپنے اعلیٰ قابلیت سے ایک وظیفہ سائٹھ پونڈ سالانہ کا چار سال کے واسطے حاصل کیا - یعنی وظیفہ میں آپ چار سال تک پچھتر روپیہ ماہوار پاتے رہے - منطق و فلسفۂ اخلاق میں آپ اڈورڈ کا مرڈ

کے جو بعد کو ماسٹر آف بیلیل مقرر ہوئے شاگرد رہے اور امتحان میں انعام حاصل کیا۔ علم طبعیات لارڈ کالون مرحوم سے پڑھنے کا شرف آپ کو حاصل ہوا۔ اور اس میں بھی ایسی مہارت حاصل کی کہ انعام کے مستحق قرار دیئے گئے۔ آپ کے زمانہ طالب علمی میں گلاسگو میں اور بھی مشہور و متبحر عالم پروفیسری پر مامور تھے مثلاً انگریزی علم ادب کے استاد پروفیسر نکل اور پروفیسر جب جو بعد میں سر کے ممتاز خطاب سے سرفراز کئے گئے تھے۔ اور کیمبرج کے ریجیس پروفیسر زبان یونانی مقرر ہوئے تھے۔ اور پارلیمنٹ میں یونیورسٹی کے نائب منتخب ہو کر داخل ہوئے تھے۔ یہ دونوں بہت بڑے ادیب تاحال خیال کئے جاتے ہیں۔ اور انکی کتابیں بڑی مستند مانی جاتی ہیں۔ گلاسگو یونیورسٹی سے آپنے ۱۸۸۹ء میں ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اور کلاسکس یعنی لاطینی و یونانی علم ادب میں ڈسٹنکشن پایا۔

اس کے بعد فری چرچ ٹریننگ کالج گلاسگو میں معلمی کا کورس مشہور و معروف ڈاکٹر مارسین سے پڑھا۔ اور امتحان میں اول آئے۔ باوجود اس قدر انعامات وغیرہ حاصل کر لینے کے آپ کو اب بھی پڑھنے سے سیری نہوئی اور واقعی بات بھی یہ ہے کہ علم مثل ایک روشن ستارہ کے ہے جو افق پر نظر آتا ہے اور طالب علم اُس جہازراں سے مشابہت رکھتا ہے جو اُس ستارہ کے رُخ اس امید پر جا رہا ہے کہ اس تک پہنچ جائے۔ لیکن جسقدر یہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ستارہ بھی پیچھے ہٹتا نظر آتا ہے۔ سچا طالب علم وہی ہے جو اس تلاش میں ثابت قدمی کے ساتھ مصروف رہے اور ہمت نہ ہارے۔ چنانچہ آپ نے لنڈن یونیورسٹی کی سائینس کی ڈگری حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ اور اس کے واسطے گلاسگو اور لندن میں سخت محنت کرتے رہے۔ انصاف پسند خدا کی حکومت میں محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ مسٹر کیمرن کی محنت شاقہ ۱۸۹۱ء میں بار آور ہوئی اور آپ نے لندن یونیورسٹی کی بی ایس سی کی ڈگری فرسٹ ڈویزن میں پاس کی کیوں ہو۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اپنی تعلیم کے متعلق جو حالات درج ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ کس اعلیٰ پایہ کے طالب علم آپ رہے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اچھا اُستاد وہی ہے جو تعلیم کتابی سے نہیں۔ بلکہ تعلیم نظری سے سیکھا ہے۔

مسٹر کیمرن کی بھی کیفیت ہے بمثل معمولی پروفیسروں کے انکو علم کی تعریف میں بے معنی راگ گانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ آپکی زندگی ایک زندہ مثال ہے جو ظاہر کر رہی ہے کہ کس شوق سے طلباء کو اپنی کتابوں کی خدمت کرنا چاہیے

ہندوستان آنا

صانع کل جو بڑا دانا و بینا ہے ہر ایک چیز کسی نہ کسی غرض کے لئے بناتا ہے۔ ادنیٰ سے کیڑے سے لیکر بڑے بڑے بادشاہوں کے سپرد کوئی نہ کوئی خدمت اس شاہنشاہ کی ضرور ہی ہوتی ہے۔ اور اُس خدمت کا پورے طور پر ادا کرنا گویا انکی زیست کی علت غائی ہے۔ ہمارے مسٹر کیمرن کے سپرد ہندوستان میں شعل علم کا روشن کرنا تھا۔ انکی تمام گذشتہ زندگی اسی ایک غرض کے پورا کرنے کے واسطے انکو تیار کر رہی تھی۔ اب چونکہ وہ فارغ التعلیم ہو چکے تھے ضرورت اس بات کی تھی کہ تعلیم دینے میں کچھ تجربہ بھی حاصل کر لیں۔ قبل اس کے کہ وہ اپنے کام پر مامور ہوں۔ کیونکہ سپاہی کو بیشتر ڈرل وغیرہ سے تیار کر لیتے ہیں تب میدان میں بھیجتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر کیمرن کے سپرد مختلف اقسام کے سکنڈری اسکولوں

...ام ہوا اور یہیں اُنھوں نے خوب تجربہ حاصل کیا۔ بعد میں گرنیاک اکاڈمی
...آپ کا تقرر ہوا۔ یہ وہ اکاڈمی تھی جہاں سے کیننگ کالج کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر
...ل بے ہوائٹ مرحوم ہندوستان تشریف لائے تھے اور یہی اتفاق آپکو بھی ہوا کہ گذشتہ ۱۸۹۵ء
...ں گرنیاک اکاڈمی سے کیننگ کالج کے پروفیسر مقرر ہوکر ہندوستان تشریف لائے
...ہ کام شروع کیا جسکے واسطے قدرت خاموشی کیسا آپکو تیار کر رہی تھی۔

کیننگ کالج کی پروفیسری

سولہ سال سے آپ کیننگ کالج میں انگریزی علم ادب و
فلسفہ کی پروفیسری کر رہے ہیں۔ طلبا کو اس امر کا ازحد شوق
...ہتا ہے کہ آپ کی شاگردی میں آئیں۔ پیشتر آپ ایف اے
کو بھی پڑھاتے تھے لیکن اب صرف بی اے اور ایم اے
کے کلاس آپ کے سپرد ہوتے ہیں۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ علم ادب کی پڑھائی یہاں
...جواب ہوتی ہے۔ دیگر کالجوں کے طلبا کو اسکی ازحد فکر رہتی
ہے کہ کیمرن صاحب کے لکھائے ہوئے نوٹ کسی طرح دستیاب
ہوں۔ کالج میں گویا آپ ایک مقناطیس ہیں کہ دور دراز مقامات
سے طلبا کو اپنی کشش سے لے آتے ہیں۔ ابھی پار سال کا
ذکر ہے کہ جودھپور سے ایک صاحب محض کیمرن صاحب سے ایم اے
کا کورس پڑھنے آئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ آپکا طرز تعلیم
بہت ہی سائنٹفک ہے۔ میں نے اپنی عمر کے اُنیس سال طالبعلمی
میں صرف کئے اور متعدد ماسٹروں اور پروفیسروں سے جو ہر طرح
لایق تھے پڑھا۔ لیکن آپ کا ایسا پڑھانے والا دوسرا کوئی نہ ملا
میرے اکثر احباب کی جنھوں نے آپ سے پڑھا ہے یہی رائے
ہے۔ میں ذاتی تجربہ سے کہہ سکتا ہوں کہ جو طالب علم آپ کی
ہدایتوں پر عمل کرے اور آپ کے لکھائے نوٹ بغور پڑھے وہ
امتحان میں ضرور اچھی طرح پاس ہوگا۔ یہ تو آپ کی تعلیم کا ایک ادنی
فائدہ ہے۔ خاص نتیجہ آپ کی تعلیم کا تو یہ ہے کہ جس مصنف کی
بعض کتابیں بھی آپ نے پڑھا دیں۔ اس میں طالب علم کو
خاصی دستگاہ حاصل ہوگئی۔

آپ کو اپنے طلبا سے خصوصاً اُنسے جنکو پڑھنے کا شوق
ہو خاص الفت ہے اور ہر طرح سے انکی مدد کے واسطے تیار رہتے
ہیں۔ لیکن چونکہ آپ میں ظاہرداری مطلق نہیں ہے۔ شروع
شروع میں طلبا کا خیال یہ ہوتا ہے کہ آپ کو ہمسے تعلقات بڑھانا
منظور نہیں۔ حالانکہ یہ خیال جیسا کہ میں اور میرے اکثر دوست
ذاتی تجربہ سے کہہ سکتے بالکل باطل ہے۔ اپنے طلبا کی عزت
کا آپکو ازحد خیال رہتا ہے۔ کبھی کلاس میں کسی سے کچھ نہیں
کہتے۔ تنہائی میں چاہے سمجھا دیں۔ غلطیاں وغیرہ اس طرح
بتاتے ہیں کہ درجہ کے لڑکوں کو سوائے اُسکے جس نے غلطی کی ہو
نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کسکی غلطی ہے۔

کالج میں آپ ازحد ہر دلعزیز ہیں اور ہر ایک لڑکا چاہے
وہ کسی درجہ کا کیوں نہو آپکی وقعت اور محبت سے ہمیشہ اپنا دل
گرم رکھتا ہے اور جب تک کالج میں رہتا ہے یہی خواہش رکھتا
ہے کہ آپکی شاگردی کا فخر ہو۔

لڑکے کیا پرنسپل بھی آپ سے ازحد خوش ہیں۔ ایک
روز وہ کہتے تھے کہ میں اس امداد کا جو کہ کیمرن صاحب سے
مجھکو ملا کرتی ہے شکریہ نہیں ادا کر سکتا۔ ممبران کمیٹی تو گویا آپکو
کالج کا مایہ ناز خیال کرتے ہیں۔ علاوہ پروفیسری کے فرائض
کے آپ نے کیننگ کالج اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کو اپنے آنے
پر زندہ کیا۔ اور اُس وقت سے ہر سال اس کے صدر انجمن منتخب
ہوتے آئے۔ آپ کا انتخاب ہر سال بڑے جوش و خروش سے
ہوتا ہے۔ اور ہر ایک سکریٹری اپنی سالانہ رپورٹ میں آپ کی مدد

کا شکریہ پُرجوش الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ میں نے ایسوسی ایشن کی گزشتہ رپورٹیں تلاش کیں لیکن سوائے دو ایک کے اور کوئی بھی دستیاب نہ ہوئی۔ ایک میں آپ کے بارہ میں یہ درج ہے۔

"انجمن کی کامیابی کا دارومدار زیادہ تر ہمارے پروفیسر و پریزیڈنٹ مسٹر کیمرن پر ہے۔ کالج میں اس قسم کی کام کرنیوالوں کو بہت الفت سے نگاہ میں رکھتے ہیں۔ انجمن کے تمام کاروبار کے آپ روح رواں ہیں۔ آپ کا مہربانی سے پیش آنا اور ہنسانا ہوتا ہے اور آپ کا شفقت پدرانہ سے ہماری دماغی و اخلاقی ترقی کا پیش نظر رکھنا یہ اسباب ہیں جنھوں نے آپکو ہماری عزت و محبت کا خاص مرکز بنادیا ہے۔ ہم آپکی محبت مثل پدر کے کرتے ہیں۔ اور عزت مثل گرو کے"

دوسری رپورٹ میں سکریٹری یوں لکھتا ہے۔

"ہماری انجمن کی ترقی کا خاص سبب ہمارے محترم پریزیڈنٹ ہیں جن سے ہمکو بہت الفت ہے۔ مربی انجمن یعنی پرنسپل صاحب نے اپنی رپورٹ میں خوب لکھا ہے کہ اس قابلیت محنت و جوش کے واسطے جو اپنے طلبا کی تربیت کے جزو اعظم ہیں۔ صرف کی ہے میرے شکریہ و طلبا کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ انکی ہدایت سے مباحثہ عمدہ و مفید مضامین پر ہوتا ہے اور قوت بیانیہ ہمیشہ اچھی طرف لگائی جاتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ ہی انجمن کے بانی ہیں۔ اور اس کی پیدایش سے اس وقت تک اس نے آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ آپ اس انجمن کی جان ہیں۔ آپ اپنے قیمتی وقت کا بڑا حصہ اس میں صرف کرتے ہیں۔ اور ہماری علمی اور اخلاقی ترقی پر پدرانہ توجہ رکھتے ہیں۔ بعض الفاظ میں ہم کسی طرح آپ کا شکریہ نہیں ادا کر سکتے۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کا طریقہ بس یہی ہے کہ ہم انجمن سے خوب فائدہ حاصل کریں۔ اسمیں کم از کم آپ سے نصف دلچسپی تو لیں اور یہ محسوس کریں کہ یہ انجمن ہماری ہے۔ آپکی مثال ہمکو ہمیشہ اپنے نظروں کے سامنے رکھنا چاہئے۔ ہمارے واسطے آپ معیار شرافت ہیں۔ معیار طالب علم اور معیار استاد ہیں۔ آپ کے واسطے اگر لفظ گرو استعمال کیا جاوے بیجا نہوگا۔ میں آپ کو اپنی طرف سے اور اپنے ہم مکتبوں کی طرف سے یقین دلاتا ہوں کہ آپ نے ہمارے دلوں کو مسخر کر لیا ہے"

یہ تو دو رپورٹوں کے اقتباس ہیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اپنے زمانے کی اور رپورٹوں میں بھی ایسے ہی الفاظ سنے تھے لیکن انکا یہاں نقل کرنا زیادہ جگہ لے گا لہذا انھیں دو پر اکتفا کی جاتی ہے۔

آپکے چند قابل طلبا

اس سلسلہ میں اگر آپ کے بعض قابل طلبا کے نام دیئے جائیں جو زندگی کے میدان کارزار میں خوب فتحیاب ہوئے بے جا نہ ہوگا۔ پنڈت مہیش بل ڈکشت ایم اے جو ہمیشہ فرسٹ ڈویژن میں ہی امتحانات پاس کرتے ہی نہیں چلے آئے بلکہ اوّل آتے رہے آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ اب یہ صاحب غالباً ڈپٹی کلکٹر ہیں۔

بابو موہن لال ایم اے جو گذشتہ سال تک میور سنٹرل کالج میں پروفیسر تھے۔ اور اب ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ اور بابو سنیدرو ناتھ رائے ایم اے پروفیسر میرٹھ کالج۔ و ابھے چرن مکرجی ایم اے پروفیسر انگریزی میور کالج بھی آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ کے میڈیکل کالج کے جو کہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء سے کھلیگا اناٹومی (تشریح البدن) کے پروفیسر سید المظفر خان ایم بی سی (لنڈن) کو بھی آپ ہی کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔

الٰہ آباد یونیورسٹی سے آپ کا تعلق

آپ کو کالج میں آئے چار سال بھی نہیں ہوئے تھے
۱۹۰۹ء میں آپ الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔
باوجود عدیم الفرصتی کے آپ نے یونیورسٹی کے کام میں بہت
دلچسپی لی۔ آپ کی تجاویز پر یونیورسٹی کے نصاب میں کئی قابل
قدر اصلاحیں ہوئیں۔ ان میں سے بعض کا اعتراف وائس
چانسلر جے۔ رُوس نے اپنے کانوکیشن ایڈریس میں ۱۹۰۹ء میں
کیا تھا۔ اور آپ کی تعریف کی تھی۔ یہ بہت بڑی عزت ہے کہ
وائس چانسلر کسی فیلو کے خدمات کی تعریف عوام کے روبرو
کانوکیشن میں کرے اور شاذ ہی کسی کو حاصل ہوتی ہے سکنڈری
اسکولوں کے ماسٹروں کی تربیت میں آپکو خاص دلچسپی ہے
اور یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ الٰہ آباد میں ہر گریجویٹ
ٹریننگ کالج قائم ہوا ہے اور یہ بھی تعلیم کے حق میں آپ کی
ایسی عنایت ہے جس کا شکریہ ہم کسی طرح ادا نہیں کر سکتے
علاوہ اس کے کہ ہمارے نوجوانوں کے واسطے عمدہ ذریعہ
معاش نکل آیا۔ اس کالج سے ایک بہت بڑی کمی یہ دور
ہوئی کہ اسکولوں کو لایق طرز تعلیم سے واقف ماسٹر ملنے لگے۔ تاوقتیکہ
ماسٹر جدید طرز تعلیم سے بخوبی واقف نہو وہ لڑکوں کو اچھی
طرح پڑھا نہیں سکتا۔ اس کی تعلیم سے لڑکے آدمی نہیں
بنتے بلکہ طوطے بنتے ہیں۔ پس تعلیم کے حق میں یہ نعمت غیر
مترقبہ ہے۔ کہ ٹریننگ کالج قایم ہوگیا ہے۔ یونیورسٹی کے واسطے
آپ اپنا بڑا قیمتی وقت صرف کرتے ہیں۔ اور بڑی دلسوزی
سے کام کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونیورسٹی نے
آپکو جو عہدہ حسب ذیل عطا کئے ہیں:۔
کنوینر آف دی بورڈ آف سٹڈیز۔ اور بورڈ آف
اگزامنرز ان انگلش لٹریچر ممبر آف دی بورڈ آف سٹڈیز
اور بورڈ آف اگزامنرز ان فلاسفی کنوینر آف دی بورڈ
آف سٹڈیز اور ممبر آف دی بورڈ آف اگزامنرز ان ٹیچنگ
اس فہرست سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کس قدر دماغی
محنت صرف یونیورسٹی کے واسطے کرتے ہیں۔

متفرقات

اس قدر محنت شاقہ سے بھی آپ کی سیری نہیں ہوتی
جیسے زمانۂ طالب علمی میں آپکو تحصیل علم سے از حد شوق تھا
اور وہ شوق اب تک قایم ہے۔ ویسی ہی اب آپ کو اس کا
بے حد خیال ہے کہ اپنی غیر معمولی قابلیت سے انسان کو
جہاں تک ممکن ہو فائدہ پہنچائیں۔ لیکن آپ کا دائرۂ شوق
علم ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ لکھنؤ کا بڑا کتب خانہ جو کہ اب
گورنمنٹ پبلک لائبریری میں شامل ہوگیا ہے اور جو چھتر منزل
کے مغربی گوشہ میں واقع تھا۔ یعنی اسٹیشن لائبریری اس کے
آپ پانچ سال تک سکریٹری رہے۔ جب سے سرکار نے اسکول
لیونگ سرٹیفکیٹ اگزامنیشن قائم کیا ہے آپکو اُس کے سنٹرل
اگزامننگ بورڈ کا ایک ممبر مقرر کیا ہے۔
لکھنؤ میں اب سرکار کی طرف سے بڑا کتب خانہ قایم
ہو رہا ہے وہ اس مکان میں ہے جہاں شاہانِ اودھ
کا تخت رہتا تھا۔ یہ پبلک لائبریری امید ہے کہ آئندہ ماہ
جولائی میں کھولی جاوے گی۔ کیونکہ اُسوقت تک فرنیچر تیار
ہو جاوے گا۔ اس لائبریری کے سکریٹری آپ مقرر
ہوئے ہیں۔ اس کتب خانہ کا سکریٹری ہونا محض عزت ہی
نہیں ہے بلکہ اُسکے کام میں سخت محنت کرنا ہوتی ہے جن
صاحبوں کو اس فن میں کچھ بھی دخل ہے وہ جانتے ہونگے

کہ نئے کتب خانہ میں کتابوں کو کس طرح نمائش کیا جاوے اور ان کی ترتیب دیا کس قدر وقت طلب کام ہے۔ در حقیقت وہ فارغ ہو کر ہی کرا سکتے ہیں خصوصاً جبکہ وہ کتب خانہ اس قدر بڑے پیمانہ پر موجود ہو کہ لکھنؤ کا سرکاری کتب خانہ ہوگا۔

ناظرین! ان مختصر سوانح حیات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسٹر سیتھیو بران کیمرن جنکی ذات پر ان کے طلبا کو فخر ہے کس پایہ کے آدمی ہیں۔ آپکو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کس قدر محنت فیض رسانی کی غرض سے وہ کرتے ہیں لیکن ابھی آپکو یہ نہیں بتایا گیا کہ انکے پڑھنے سیکھنے کے شوق کا اب کیا حال ہے۔ جناب مسٹر کیمرن با کتاب ایسے ہی ہیں جیسے ماہی بے آب۔ اس وقت تک آپکی یہ کیفیت ہے کہ کیا لٹریچر کیا فلسفہ اور کیا سائنس ان پر کوئی بھی جدید کتاب شائع ہوئی اور آپ نے اس کو اپنا جزو دماغ کر لیا۔ قبل اس کے کہ وہ کتاب ہندوستان میں دستیاب ہو سکے آپکے کتب خانہ میں نظر آتی ہے۔ ہم لوگوں کو علوم ذیل انسے سیکھنے کا موقع ملا ہے اور انہیں انکو خاصی دستگاہ حاصل ہے بلکہ وہ اب تک ان کے بارہ میں خود نئی چیزوں کی دریافت میں کوشاں ہیں۔ انگریزی علم ادب۔ فلسفہ۔ باٹنی۔ زوالوجی۔ فزکس۔ اور فزیالوجی۔ گو آپ اردو کے عالم نہیں ہیں پھر بھی کبھی کبھی ایسے سوال کر بیٹھتے تھے کہ ہم بگلیں جھانکتے تھے

ناظرین! یہ مختصر احوال ایک محترم بزرگ کے جو آپ کے ملک کی خدمت بدل و جان کر رہا ہے اور بہت سے ہندوستانیوں سے زیادہ کر رہا ہے آپ کے نذر ہیں اور امید ہے کہ آپ میں جو حضرات طالبعلم ہیں یا ماسٹر یا پروفیسر ہیں وہ اس روشن مثال سے فیضیاب ہونگے۔ دیگر حضرات بھی اس کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

یہ مضمون اس دعا پر ختم کیا جاتا ہے جسمیں مجھے امید ہے نہ صرف مسٹر کیمرن کے طلبا میرے ہمزبان ہوں گے۔ بلکہ ناظرین "ادیب" بھی شریک ہوں گے کیونکہ وہ دل سے ان خدمات کے شکرگذار ہیں جو مسٹر کیمرن ہندوستان کے واسطے ادا کر رہے ہیں

قطعہ

سال و فال و مال و حال و اصل و نسل و تخت و بخت
باد ت اندر ہر دو گیتی برقرار و بر دوام
سال خرم فال نیکو مال وافر حال خوش
اصل ثابت نسل باقی تخت عالی بخت رام
آمین ثم آمین

پنڈت برجناتھ شرغہ

برٹش حکومت کی برکتیں

امن و امان

آج ہے امن و اماں کا دور دورہ ہر طرف
شیر بکری سے الگ ہٹا ہے، کانٹا پھول سے

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان پر ہندو حکمراں تھے۔ ان کے دورِ حکومت میں جو ابتری ملک میں پھیلی ہوئی تھی وہ اظہر من الشمس ہے جب ان کے ظلم و ستم حد سے گذر گئے، اور خدا نے انھیں اس قابل نہ سمجھا کہ اُن کے ہاتھوں ملک اور اہلِ ملک کی فلاح و بہبود ہو، بلکہ اُن کے دورِ حکومت سے ہندوستان کو زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا۔ تو خدا نے اُنکی سرکوبی کے لیئے محمود غزنوی اور محمد غوری ایسے غیر ملکی بادشاہوں کو بھیجا۔ یہانتک کہ ایک وقت چنگیز خان جہاں سوز اور تیمور لنگ کی بھی باری آئی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان کی باگ ڈور ایک غیر ملکی قوم کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ساڑھے سات سو برس تک ہندوستان انھیں کے قبضۂ اختیار میں رہا۔ اور جب انکو بھی خدا نے اس قابل نہ پایا کہ اُن سے ملک و اہلِ ملک کی وہ خدمت سرانجام پائے جو اسکی مرضی کے عین مطابق تھی، تو نادر شاہ اور احمد شاہ کو بھیجکر ان کی قوت کو توڑا، اور انکے ہاتھ سے یہ ملک چھین لیا۔ یہ وہ الٰہی انتظام ہے جسمیں کبھی سرِمو فرق نہیں ہوتا۔ اب اسی مشیّتِ ایزدی نے اس قوم کا ہاتھ ہمارے سر پر رکھا جسکو اُسنے اسکے اہل سمجھا اور جنکے سایۂ عاطفت میں ہم ملک کو اسقدر سرسبز دیکھتے ہیں کہ اسکی نظیر کسی اور زمانے میں نظر نہیں آتی۔ مہابھارت کی عظیم الشّان لڑائی کے بعد، جبکہ ملک کی مجموعی قوت بالکل درہم و برہم ہو چکی تھی، شاید ہی ہندوستان کو کبھی یہ امن و امان نصیب ہوا ہو، جو اس دَور میں ہے۔ اس سے بیشتر یہ حال تھا کہ کبھی تو رانی۔ اور کبھی ایرانی، کبھی یونانی اور کبھی ترکستانی ہمیشہ ہندوستان پر حملہ آور ہوتے رہے اور ملکی خانہ جنگیاں اسپر مستزاد تھیں۔ شمالی ہند والے جنوبی ہند والوں (وندھیاچل سے دکن تک) کو آدمیوں ہی میں شمار نہ کرتے تھے اور خود آریہ ورت (شمالی حصّۂ ملک) والوں کو اپنے یہاں کے غریب ہموطنوں کو اسقدر رذیل و خوار سمجھ رکھا تھا کہ اُن کو ہمیشہ کے لیئے شودر قرار دیدیا اور انھیں اسقدر دبایا کہ اُنسے گویا آدمیت ہی مفقود ہو گئی ہے۔ آج تک جہاں کہیں انگریزی حکومت کا کم اثر پہنچا ہے یہی حال ہے کہ کوئی شودر کسی اعلیٰ ذات والے شخص کے سامنے بیٹھ نہیں سکتا، کھڑا نہیں ہو سکتا، چھوا تک نہیں لگا سکتا، حتیٰ کہ اُس سے دو سَو گز کے فاصلہ پر رہنا اسکے لئے قطعی حکم ہے۔ اللہ رے ظلم! یہ اُسی پُرانے ظلم کی ایک ادنیٰ مثال ہے، جو اب بھی دکن اور اس کے قرب و جوار میں پائی جاتی ہے گذشتہ صدی کے مرہٹہ حملے اور برگی ہنگامے جن سے ملک تحس نحس ہو چکا تھا، ابھی بالکل تازہ ہیں۔ بیچاری مستورات اور معصومین پر جو ناروا اور قابلِ ملامت ظلم و تشدّد ہوتے رہے، وہی ظلم و تشدّد جن کی شہادت آج تک "مرہٹہ ڈچ" سے مل رہی ہے جو کلکتہ کے قریب واقع ہے۔ ڈچ اور پرتگیزوں کی بحری ڈاکہ زنیاں، اور سواحل دریا کے باشندوں کو لوٹنا، ایسے واقعات ہیں، جنکا سلسلہ ہمیشہ اس ملک کی گذشتہ تاریخ

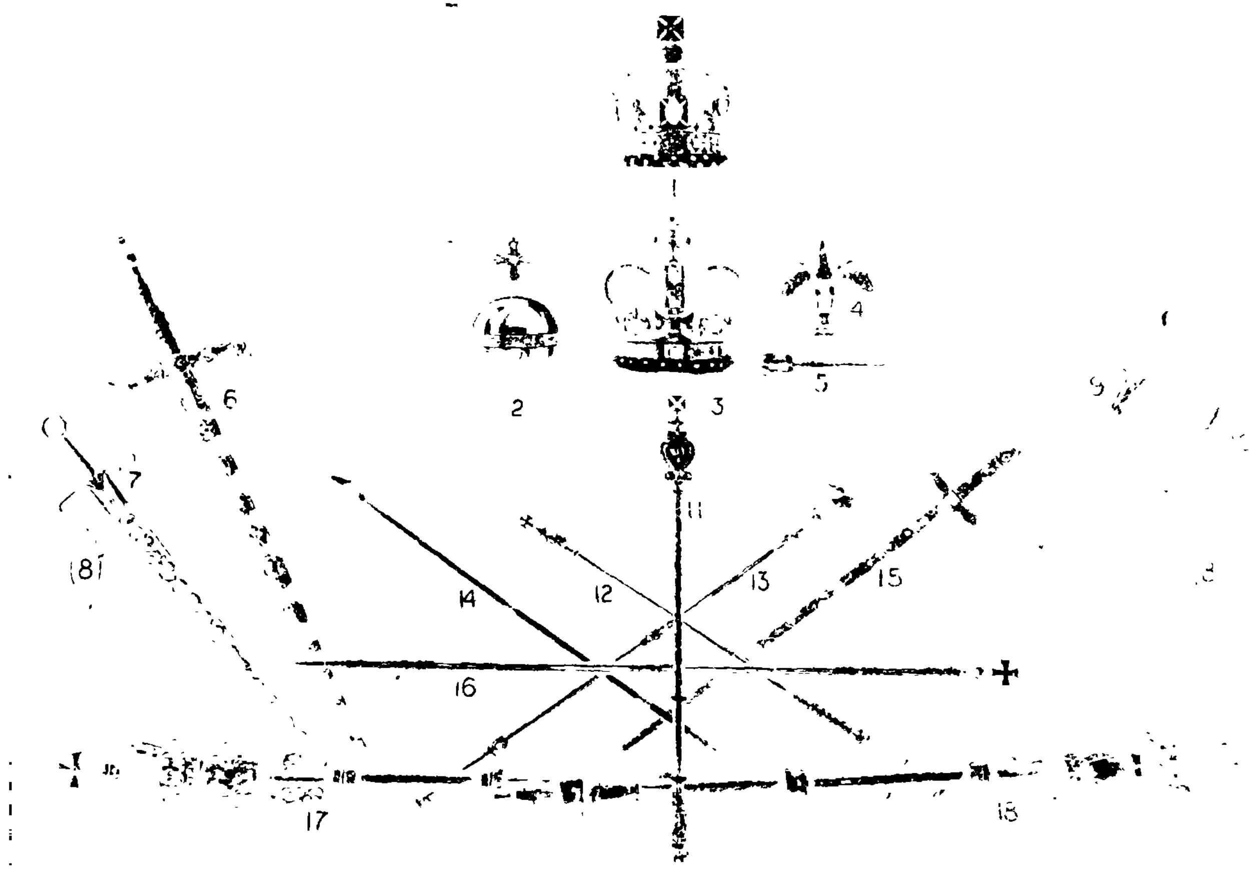
دنیا بھر میں جاری رہا ہے۔ برعکس اس کے جسوقت سے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہوا ہے، اس وقت سے جو امن و امان ملک میں جاری ہے اور جو آسائشیں ملک و اہل ملک کو حاصل ہیں، ان کو نظر انداز کرنا کفران نعمت ہے، نیز اس خالق حقیقی کی حکمت کا انکار کرنا ہے جس کے انتظام سے ہندوستان کو یہ امن و امان نصیب ہوا

شمس العلماء مولانا نذیر احمد نے جو نادر خیالات "انگریزوں کی عہد کی سلطنت" کے باب میں ظاہر کئے ہیں کوئی جاہل سے جاہل اور کوڑھ مغز شخص بھی ان کی صداقت سے انکار نہیں کرسکتا۔ اور جس شخص کو اپنے ملک اور اپنے ملک کا کچھ بھی پاس ہے وہ ضرور مولانا موصوف کے خیالات کی تائید کرے گا۔ ملاحظہ فرمائیے آپ تحریر کرتے ہیں

"انگریزی سلطنت کی بدولت ہندوستان میں آج وہ رونق پھیل رہی ہے کہ رات اور دن میں کچھ تمیز نہیں رہی راستے ایسے امان میں کہ جہاں پہلے قافلوں کا گزر نہ ہوتا تھا، اب وہاں جس کا جی چاہے آنکھ بند کرکے سونا اچھالتا چلا جائے۔ تجارت اسقدر آسان ہو گئی کہ دو دن میں ہزاروں من مال مشرق سے مغرب میں، اور جنوب سے شمال میں پہنچتا ہے شہروں کا پہلے نام ہی نام سنتے تھے اب وہاں جانا ایسی بات ہے جیسے بازار میں سیر کرنے اگر ہزاروں کوس کسی کو کچھ خبر بھیجنی ہو۔ یا وہاں سے کسی کو خبر منگانی ہو تو منہ سے بات نکالنے کی دیر ہے۔ جو خبر بھیجو، اسکی رسید لو، جو بات پوچھو اُس کا جواب لو، پیشے والے اپنے کاموں کی قدر آپ جانتے تھے، صبح سے شام تک جان کھپاتے تھے۔ اب ہر شخص کو اسکی محنت کا پھل خاطر خواہ ملتا ہے۔ یہ غلطی ہمیشہ سے چلی آتی تھی کہ نکمے آدمی سدا عیش و عشرت سے بسر کرتے تھے، اور کام کے آدمی ذلیل و خوار پھرتے تھے، یہ اس سلطنت کا صدقہ ہے کہ جتنے حقدار تھے، وہ اپنے حق کو پہنچ گئے کھیتی کا مدار پہلے ہر جگہ بارش یا کنوؤں کے پانی پر تھا۔ اب جمنا اور گنگا چار دل کھونٹ میں دوڑی پھرتی ہیں۔ جہاں جہاں نہر گئی ہے وہاں ہمیشہ سماں رہتا ہے۔ اسکے سوا پہلے بادشاہوں اور امیروں کے سوا غریبوں کی بیماری کا علاج جیسا چاہئے ویسا نہ ہوتا تھا کہیں طبیب کو ڈھونڈتا پھرتا تھا کہیں دوائیں مول لینی پڑتی تھیں۔ اب شہر شہر اور قصبے قصبے اور گانوں گانوں سرکاری ڈاکٹر علاج کرتے پھرتے ہیں۔ نہ کچھ ڈاکٹروں کو دینا پڑتا ہے نہ دوا مول لینی پڑتی ہے۔ جس کا جی چاہے علاج کرائے جو دوا چاہے لے جائے۔ پہلے اول تو کتاب ملتی ہی نہ تھی، اور اگر ملتی بھی تھی تو بہت بھاری قیمت کو ملتی تھی اور جو لکھواتے تو ایک ایک کتاب برسوں میں تمام ہوتی تھی اب چھاپہ کی بدولت کتاب اور ترکاری ایک بھاؤ بکتی ہے۔ جو سواریاں پہلے بادشاہوں کو میسر نہ تھیں وہ آج ادنیٰ ادنیٰ آدمی کے پاس موجود ہیں۔ جو کپڑا پہلے امیروں کو نصیب نہ ہوتا تھا، وہ پنہاریوں کے بچے پہنے پھرتے ہیں۔ پہلے جب کوئی تمام عالم کی سیر کرتا، تب جا کر اُسکو ساری دنیا کی حقیقت معلوم ہوتی تھی، اب ہر ایک ملک کا نقشہ نہایت صحیح کھنچا ہوا کاغذ کے مول بکتا پھرتا ہے جسکا جی چاہے گھر بیٹھے ساری دنیا کے پہاڑ اور جنگل، دریا اور جزیرے، اور آبادی اور ویرانی کی سیر کرلے پہلے اولاد کو پڑھانا لکھانا اسقدر مشکل تھا کہ اس سے زیادہ اور کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اب سرکاری تعلیم نے اس مہم کو ایسا آسان کر دیا کہ جاہل رہنا مشکل ہے اور پڑھنا لکھنا آسان ہے۔

پہلے شہروں کی صفائی ایک ایسی چیز تھی کہ کبھی اسکا تصور بھی دل میں نہ آتا تھا۔ اب ایک ایک گلی اور ایک ایک کوچہ اور سڑک اور بازار ایسے صاف رہتے ہیں کہ پہلے شاید امیروں کے رہنے کے مکان بھی اتنے صاف نہ رہتے ہوں گے۔ پہلے غریب امیر سے اور رعیت حاکم سے ایسی دبی تھی جیسے غلام اپنے آقا سے دبتا ہے۔ اب ہر شخص کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے ایک جرم قانونی کے سوا اور جو کچھ جس کے جی میں آئے سو کرے، کوئی کسی کا مزاحم نہیں۔ ایک حاکم کے فیصلہ سے ناراض ہو دوسرے کے یہاں جا کر نالش کرے۔ وہاں بھی خاطر خواہ حکم نہ ہو تیسرے سے کہے۔ چوتھے سے کہے یہانتک کے بادشاہ کے دربار میں جا کر فریاد کرے۔ جو مذہب جسکا جی چاہے اختیار کرے۔ سرکاری قانون کی جو بات ناگوار معلوم ہو اُس پر اعتراض کرے۔ غرض اسی طرح کی اور سیکڑوں باتیں ہیں۔"

ایڈیٹر



سامان تاج پوشی
THE ROYAL REGALIA.

غمِ فرقت

یکشن کی زبانی

عدوئے راحت و تسکین ہیں بلائے فراق   کوئی غریب نہو آہ! مبتلائے فراق
یہ جانِ ناتواں اور اُسپہ صدمہ ہائے فراق   ز بس ہے روح گسل درد جانگزائے فراق

قرارِ جانِ حزیں کو نہ تاب ہے دیکھو
عجب طرح کا الٰہی عذاب ہے دیکھو

گھٹائیں چھا رہی ہیں کالی کالی بھادوں کی   چمک کے برق گراتی ہے قلب پر بجلی
شبِ فراق کی سختی پھر اُسپہ تنہائی   کسے سناؤں کہانی کہ کس طرح گذری

نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم
حدیثِ دل بکہ گویم عجب غمے دارم

نفس کی آمد و شد بن گئی دمِ خنجر   کہ پارہ پارہ کلیجہ ہے چاک چاک جگر
دلِ فگار ہے پہلو میں بسمل مضطر   غمِ فراق سے ہے سخت زندگی دوبھر

کہاں ہے آنکھ میں جوشِ سرشک رونے کو
اُمڈ رہا ہے یہ طوفانِ غم ڈبونے کو

یہاں تلک تپِ ہجراں نے کر دیا ہے نزار   ہوا ہے تکیہ سے سر کا اُٹھانا بھی دشوار
وداع ہو چکے صبر و شکیب و تاب و قرار   اُٹھائیگا سرِ شوریدہ منتِ دیوار

عیاں ہے صدمۂ فرقت نے جیسی حالت کی
خدا ہی جانتا ہے کیفیت طبیعت کی

خبر کسے ہے کہ ہے کون وقفِ غمِ ناشاد   گذر رہی ہے کسی ناتواں پہ کیا بیداد
سُنے ہیں تو نے تو اے ابر نالہ و فریاد   تو ہی سنائیو ہجراں نصیب کی روداد

برس کے حال دکھا دینا دیدۂ تر کا
تبا نا برقِ تپاں حال قلبِ مضطر کا

کبھی نہ روزِ قیامت سے کم ہوئی ہجر کی رات   ہزار رنج و قلق اور مصائب و آفات
غمِ فراق میں جاں دینی تھی نہ مشکل بات   مگر ہے حسرتِ دیدار صرف وجہِ حیات

اسی امید یہ جانِ نزار باقی ہے
یہی خیال یہی انتظار باقی ہے

رہیں رنج و محن ہے ستم کشِ فرقت   سہیگی کیسے خدا جانے ہجر کی شدت
غمِ فراق نے کی رفتہ رفتہ یہ صورت   کہاں ہے ضعف سے اظہارِ حال کی طاقت

جُدا کسی سے کسی کا کوئی حبیب نہو
یہ درد وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہو

شررؔ (سہارنپوری)

عظمتِ ہند

رونقِ انجمنِ عالمِ امکاں ہم تھے   وصف تھے جنمیں فرشتوں کے وہ انساں ہم تھے
شمع تھے راہِ ہدایت کی زمانہ کے لیئے   روشنیٔ نگہِ گبر و مسلماں ہم تھے
مرکزِ علم تھے ہم دائرۂ عالم میں   شمع افروزِ رہِ منزلِ عرفاں ہم تھے
دین و دنیا کے مسائل کے تھے ہم عقدہ کشا   بابِ تحقیق تھے ہم قبلۂ ایماں ہم تھے
خطۂ ہند میں تھا خطۂ یوناں کا اثر   علم ارسطو کا تھا حکمت میں بھی لقماں ہم تھے
طبعِ روشن سے تھے ہم فیض رسانِ عالم   صورتِ ذرہ تھے سب مہرِ درخشاں ہم تھے
بزمِ عالم میں یہ صورت تھی صفائے دل سے   مثلِ پروانہ تھے سب شمعِ شبستاں ہم تھے
گلشنِ دہر میں ہمسا نہ تھا آزاد کوئی   پابہ گل سب تھے مگر سروِ خراماں ہم تھے
غنچۂ خاطرِ عالم تھا شگفتہ ہم سے   مایۂ نازِ بہارِ چمنستاں ہم تھے
ہوسِ تاجِ شہی ہمتِ عالی کو نہ تھی   دیکھتے کب طرفِ قیصر و خاقاں ہم تھے
نکتہ آموزِ قدیم و ادب آموزِ جدید   طفلِ مکتب تھے سب اُستادِ دبستاں ہم تھے
شرک سے کفر سے مذہب کو بچانا تھا فرض   یہی دولت تھی فقط جسکے نگہباں ہم تھے
نہ تو محتاج کسی کے تھے نہ ہم دستِ نگر   اپنے خالق کے فقط بندۂ احساں ہم تھے
رحم و ہمدردی و دلجوئی سرشت اپنی تھی   چارہ سازِ غم و اندوہِ غریباں ہم تھے

باغ و بستانِ [illegible] بالِ دامن   [illegible] صفت بال ہم تھے
بلبلِ زار تھے قمریِ ناشاد تھے ہم   [illegible] ہم تھے
[illegible]   [illegible] گل و سنبل [illegible] ہم تھے
[illegible] کشت میں   [illegible] پریشاں ہم تھے
[illegible]   [illegible] ہم تھے
گو [illegible] حقیقت [illegible] تلاش   [illegible] جویاں ہم تھے
رہتے تھے جن [illegible]   [illegible] ہم تھے
[illegible]   [illegible] کے کہ جولاں ہم تھے
کیا کہیں [illegible] انجمنِ عالم میں   حلقۂ بزم میں مثلِ مہِ تاباں ہم تھے
[illegible]   [illegible] ہم تھے
ہم مقدم تھے [illegible]   [illegible] نہ تھا [illegible] ہم تھے
طمع [illegible] دھبہ کبھی [illegible]   [illegible] ہم تھے
مرہمِ زخمِ غریباں تھا سدا اپنا سلوک   دوست بیکس کے تھے ہمدردِ یتیماں ہم تھے
جب سلطان تھا نہ سحباں تھا نہ حافظ نہ ظہیر   نکتہ پرواز و سخن سنج و سخنداں ہم تھے
نام لکھا تھا [illegible] اپنا   علم و اخلاق کے مضمون کا عنواں ہم تھے
اپنے خالق کے حبیب [illegible]   معرفت کیش تھے ہم ہادیِ ایماں ہم تھے
ہفت اقلیم میں ہر سکہ پہ نقش اپنا تھا   کوئی فرمان ہو مہرِ سرِ فرماں ہم تھے
مست ایسا کوئی [illegible] عالم [illegible] تھا   آبرو وہ جرعہ کش بادۂ عرفاں ہم تھے
سب کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں اب ہم صورتِ خار   یاد ایام کہ جب نازِ گلستاں ہم تھے
اب تو شبنم کی طرح رہتے ہیں گریاں ہر دم   اسی گلزار میں اک دن گلِ خنداں ہم تھے
پابہ زنجیر ہیں جس طرح علائق سے اب   اس طرح سے نہ کبھی قیدیِ زنداں ہم تھے
آنکھ ہر ایک سے اب رہتی ہے نیچی اپنی   شرم سے یوں نہ کبھی سربگریباں ہم تھے

اب علاج اپنے مرض کا ہو تو اک بات بھی ہو
اس سے حاصل کہ کبھی عیسیِ دوراں ہم تھے

بشن نراین در

نغمۂ روح

روح [illegible] ہوں تاف قدرت کی پری   گنبدِ گردوں سے بالا تھی مری جلوہ گری
[illegible] امکاں میرا مکاں   میں ہوں اب در چار دیوارِ مکانِ عنصری
[illegible] عرش سے پرواز تھی   اب قفس ہے جسم کا اور ہیں بے بال و پری
آج ہوں [illegible] رشتہ [illegible]   ورنہ تھی آزاد ہر قیدِ تعلق سے بری
[illegible] ہوئی اک میرے دم کی روشنی   ورنہ ہے یہ قالبِ خاکی اندھیری کوٹھری
رہ [illegible] ظلمت [illegible] میں ہوں [illegible]   مجھ سے کم ہے چادرِ مہتاب کی ضو گستری
وہ [illegible] نایاب [illegible] ہوں کیا مجال   جانچ لے کوئی مبصر یا پرکھ لے جوہری
میری [illegible] آب و تاب [illegible] فروغ   قطرۂ ناچیز کو ہے زعمِ والا گوہری
اک جھلک نے میری مشتِ خاک کو چمکا دیا   ذرۂ بیقدر نے خورشید سے کی ہمسری
[illegible] میں [illegible] جادو بھرا   کس فسونگر نے سکھایا اسکو سحرِ سامری
کالبد میں آب [illegible] مسخر کر لیا   کوئی جادوگر اتارے جیسے شیشے میں پری
صوت [illegible] سامع کو ہو جاتا ہے وجد   لحن دلکش پر مرے مطرب کو شوریدہ سری
[illegible] ہر دل میں مجھ سے سوز و گداز   ہو ترانوں سے مرے ہر آنکھ میں بیداری
مجھ سے عقدہ کھلتے ہیں [illegible]   سیکھتے ہیں مجھ سے اسرافیل بھی خنیاگری
ہے مرے دم کا دمامہ [illegible] میں   مجھ سے زندہ صنعتِ صناع کی صورتگری
میں نہوں تو ساز و سامانِ جہاں سب ہیچ ہیں   دولت و جاہ و حشم تیغ و علم چترِ زری
ہفت کشور [illegible] تابع فرماں مرے   میں نہوں تو پھر کہاں کی تاجداری افسری
سب کی [illegible] میری بدولت تھا زمانے میں عروج   صولتِ اسکندری شان و شکوہِ قیصری
اب کہاں وہ جشنِ جمشیدی و بزمِ خسروی   اب کہاں تختِ ہمایونی و تاجِ اکبری
عالمِ بالا میں جب دن بول بالا تھا مرا   کب وجودِ عنصری تھا زیرِ چرخِ چنبری
تھی یہ تعمیرِ خراب آباد ہستی بے نشاں   بے ستوں قایم نہ تھا یہ گنبدِ نیلوفری
امرِ ربی کا معما ہے مرا رازِ خفی   رمزِ خالق کی ہیں مجھ میں حکمتیں لاکھوں بھری
میرا عقدہ حل نہ کر سکتے اگر ہوتے بھی آج   حافظ و سعدی و جامی و نظامی انوری
کہدیا میں نے یہ نغمۂ روح کے سنکر شفیق   آنچہ وصفِ خود سرائی از ہمہ بالاتری

شفیق عمادپوری

مسلکِ گوتم

کوئی تلاش میں اللہ کے پریشاں ہے   کسی کو بہر تسلی اصولِ ایماں ہے
کوئی حقیقتِ آواگون کا خواہاں ہے   کسی کے دل میں قیامت کا خوف پنہاں ہے

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے

الجھتے رہتے نہ یہ روح کے معانی میں   قیام خواب سمجھتے سرائے فانی میں
ادائے فرض سے ڈرتے نہ زندگانی میں   پھنسے نہ رہتے کبھی دردِ جاودانی میں

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے

نہ ذبح کرتے یہ بیچارے بے زبانوں کو   فنا نہ کرتے کبھی بھولی بھالی جانوں کو
چڑھا کے بھینٹ نہ خوش کرتے قہرمانوں کو   نہ مرگِ نزل سے بھر دیتے آسمانوں کو

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے

جو کہ سے بھنگ کے پی پی کے مست ہوتے ہیں   افیم کھا کے قوی جنکے پست ہوتے ہیں
شراب پی کے جو محوِ الست ہوتے ہیں   بتوں کے نام پہ جو مے پرست ہوتے ہیں

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے

جو بندے بہرِ عصا غیر باز بنتے ہیں   درِ ستم کو زمانے میں باز رکھتے ہیں
وہ جنکے حکم سے جنگی جہاز بنتے ہیں   مددِ تیغ کی مسند طراز بنتے ہیں

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے

عدو کو حسنِ مروت کا یہ صلا دیتے   جہاں سے جنگ و جدل کا نشاں اڑا دیتے
جو دل کو غازۂ الفت سے یہ جلا دیتے   تو اسے آئنے کو جامِ جم بنا دیتے

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے۔

سنا شمیم کلام اس طبیبِ انساں کا   علاج جسنے کیا درد و یاسِ حرماں کا
وہی چراغ ہے اس دہر کے شبستاں کا   بتایا جسنے طریقہ حصولِ نرواں کا

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے

شمیم

گلِ نیلوفر

نور کا تڑکا ہے، اور خورشید ہے جلوہ فشاں   قابلِ نظارہ ہے کیفیتِ سیلانِ آب
دشت میں چشمہ اگر ہے دلفریبی سے رواں   پھول نیلوفر کا بھی ہے زینتِ دامانِ آب

گل بداماں ہے مگر کوئی عروسِ شرمگیں   دستِ قدرت نے ہی کھینچا یا کوئی نقشِ فسوں
لب پہ ہے موجِ تبسم کی ادائے دلنشیں   ہلکی ہلکی روئے زیبا پر نقابِ نیلگوں

پڑ رہا ہے آسماں کا عکس سطحِ آب پر   محوِ نظارہ ہے یہ پھر کس دلآویزی کیساتھ
شرم سے پانی کی چادر میں چھپا لیتا ہے سر   بہتی ہے ہلکی سی کشتی جب کوئی تیزی کیساتھ

اے بہارِ جوئبار اے نازشِ آبِ رواں   تیری رعنائی کا عالم ہے عجب وقتِ سحر
تو ہے خلاقِ دو عالم کی محبت کا نشاں   اُن کی نظروں میں جو عشق کوش ہیں اہلِ نظر

زندگی کے ظلمت افزا، پُرخطر گلشنوں میں جب   ہم بھلا دیتے ہیں دل سے تجھکو اے پروردگار
زرد پڑ جاتا ہے چہرہ خشک ہو جاتے ہیں لب   مسکرا کر ہم کو اک اک گل میں تو کرتا ہے پیار

اے گل ترا ہے طلسمِ جلوۂ موہوم تو   ہے خزاں سر پہ کھڑی تیری دو روزہ ہے بہار
اس چمن میں آہ ابتک بھی ہوں اسیرِ رنگ و بو   ہستیٔ فانی بھی ہے میری بہت ناپائیدار

جلوۂ حسنِ ازل ہر گل میں ہر نغمے میں ہے   پردۂ ہستی حجابِ چشمِ حیراں ہے مگر
پر توِ شانِ جلالی دیکھ آئینے میں ہے   شوقِ خود بینی ہے لیکن مانعِ ذوقِ نظر

اے طلسمِ عشوۂ نیرنگِ ہستی! ٹوٹ جا!   ہے سرِ شوریدہ کو سودا بہارِ خلد کا

کو [illegible] جا با آئینہ صورت بیچی اُنوشہ [illegible] [illegible] مشتاق تماشا سبزہ زارِ خلد کا

ایسا [illegible] زنداں میں ہوں پابندِ الام [illegible] قیدِ تن کی کشاکش سے بہت بیزار ہوں
شورشِ انداز اک مرقعِ [illegible] [illegible] [illegible] تیرا [illegible] برقِ تجلی [illegible] طالبِ دیدار ہوں

تماکر

شمع و پروانہ

آہ شب کو ایک محفل میں ہوا میرا گذر — دیکھی جلتے شمع میں نے اور پروانوں کے پر
ہو رہی ہے چھیڑ چھاڑ آپس میں جلا کر عجب — [illegible] شیدا ابنا تا [illegible] وہ اسکو دیکھکر
اور دعویٰ ہے یہ اُسکا پاس کوئی آئے کیوں — حُسن کی گرمی سے میرے قلب جلتے ہیں اگر
میں نہوں جس بزم میں اس بزم میں اندھیر ہو — میرے دم کی روشنی رہتی ہے ہر دم رات بھر
مفت میں بدنام کر رکھا ہے لوگوں نے مجھے — مجھکو خالق نے دیا شعلہ زبانی کا اثر
میں یہاں رکھتی ہوں گو پر یہ زباں ہر خلق میں — محفلِ عشرت میں رکھیں یا جلائیں قبر پر
تو اگر شیدا نہیں تو آیا کیوں میری طرف — دے جوابِ صاف اسکا عذر جانسوزی کر
بولا وہ ہر ایک اچھی شے پہ کرتا ہے نگاہ — آئینہ ہو اسمیں یا خورشید ہو یا ہو قمر
تیری محفل میں مرا آنا ہے یہ بھی اتفاق — لیکن اس سے عشق کب ثابت ہے کچھ تو دھیان کر
سنکے باتیں دونوں کی سناٹا ہے اک بزم میں — چل رہی ہیں گویا چھریاں پہلوئے انصاف پر
اہلِ محفل سنتے ہیں دیتے نہیں کچھ بھی جواب — صاحبِ دل سے رہا جاتا ہے کب یہ دیکھکر
کہدیا دونوں کے مُنہ پر میں نے بھی بیساختہ — کون ان جھگڑے بکھیڑوں میں پڑے المختصر
اپنی اپنی جا پہ باتیں ظاہرہ تو ٹھیک ہیں — دونوں سچے ہیں کوئی جھوٹا نہیں لیکن مگر

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا میشود
گر نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا میشود

ماہ عظیم آبادی

نوحۂ سرور

اے اجل [illegible] چراغِ زندگی گل کر دیا — کس کی میت پر جوانا مرگ کا غُل کر دیا
خون کسکی حسرتوں کا بے تامل کر دیا — ختم کسکی زیست کا دورِ تسلسل کر دیا

کس گلِ شاداب کو تونے ملایا خاک میں
پھونک کر اُف کر دیا کس کو خس و خاشاک میں

چاک کسکا پردۂ دامانِ ہستی کر دیا — کسکا وقفِ نیستی سامانِ ہستی کر دیا
اُف یہ کسکو خانماں ویرانِ ہستی کر دیا — تونے رخصت کونسا مہمانِ ہستی کر دیا

شور برپا ہے یہ کس کی مرگِ حسرتناک کا
اے اجل کسکو کیا پیوند تونے خاک کا

یہ ستم تونے بلائے ناگہانی کیا کیا — کسکے ارمانوں پہ پھیرا تونے پانی کیا کیا
کسکی ہستی تونے کردی آہ فانی کیا کیا — خاک میں کسکی ملا دی زندگانی کیا کیا

صاعقہ بنکر جلا دی کسکی کشتِ آرزو
کسکی قسمت سے مٹا دی سرنوشتِ آرزو

تیرے ہاتھوں کون وقفِ پائمالی ہوگیا — کسکا بنکر نقش تصویرِ خیالی ہوگیا
کسکا پیمانۂ عشرت سے خالی ہوگیا — کون مٹکر نذرِ صد آشفتہ حالی ہوگیا

حسرتیں نالاں ہیں کسکے خانۂ ویراں میں آہ
تفرقہ ڈالا یہ تونے کسکے جسم و جاں میں آہ

یہ دیا ہے تونے داغِ تازہ کسکی موت کا — کھینچتے ہیں اقربا خمیازہ کسکی موت کا
درد و غم ہے سبکو بے اندازہ کسکی موت کا — گر بجتا ہے خلق میں آوازہ کسکی موت کا

کسکی میت پر ہجومِ حسرت و ارمان ہے
الوداعِ آخری کا کسکی یہ سامان ہے

کسکو بارِ زندگانی سے سبکدوشی ہوئی — خاک ہوکر خاک سے کسکو ہم آغوشی ہوئی
جان دے کر کسکو حاصل خود فراموشی ہوئی — لب بلب کسکے دہن سے مُہرِ خاموشی ہوئی

ہوگئی وقفِ خزاں کسکی بہارِ زندگی

نقشِ باطل ہو گئے کیسکے نگارِ زندگی

کیا تو نے اے اجل! چھلکا دیا جامِ حیات
کسکو تو نے کر دیا صد حیف ناکامِ حیات
دلکش صبحِ قیامت کسکی ہے شامِ حیات
تیرے ہاتھوں ہو گیا کسکا سرانجامِ حیات

خرمنِ ہستی یہ کسکا پھونک کر راکھ کر دیا
اک زمانیکو جو سرگرم تاسف کر دیا

وا حسرت اے اجل کمبخت تیرے منہ میں خاک
اُف تری سفاکیاں ۔ تو نے کیا اسکو ہلاک
جسکی دل آویز نظموں کی تھی اک عالم میں دھاک
روح فرسا سانحہ ہے اسکا مرگِ دردناک

جسکے نغمونکی صدا آتی تھی کل تک کان میں
اب نہیں اسکا پتا بھی عالمِ امکان میں

آہ اے دارالسرور باغِ جنت کے مکیں
اے سرورِ خوش بیاں ۔ اے تاجِ شہرت کے نگیں
تیرے غم سے ہیں دلِ اہلِ قلم اندوہ گیں
یہ وہ صدمہ ہے تلافی جسکی ہو سکتی نہیں

قابلِ صد رنج و حسرت ہے تری بے وقت موت
دے گئی داغِ جدائی سبکو تیری سخت موت

رونقِ بزمِ سخن تھی تیرے دم سے سربسر
گل نئے پھولا کئے تیرے قلم سے سربسر
یہ نمایاں ہے تری طرزِ رقم سے سربسر
پھول تو چنتا تھا گلزارِ ارم سے سربسر

تھی سرودا فزا ازبس تیری نے نابِ سخن
کھل گیا تھا تیری نظموں سے نیا بابِ سخن

صنف میں تیرا اندازِ تخیل تھا نیا
ہر روش میں تیرے لفظونکا تسلسل تھا نیا
نیچرل نظموں میں تیرا رنگ بالکل تھا نیا
تیری محفل میں جو چھلکا ساغرِ مل تھا نیا

یہ ٹپکتا ہے ترے ہر شعرِ تر سے بالیقیں
تو نے سینچا ہے اسے خونِ جگر سے بالیقیں

آئینہ ہر شعر ہے روشن خیالی کا تری
مصرعہ مصرعہ ہے مرقع خوشمقالی کا تری
شوخیِ مضموں نتیجہ طبعِ عالی کا تری
چستیِ بندش ہے نمونہ باکمالی کا تری

گو کہ تھی تیری طبیعت فطرتاً مشکل پسند
ہوتی تھیں لیکن تری پُر درد نظمیں دلپسند

آہ اے شیوا بیاں سرمایۂ نازِ سخن
غرقِ حیرت کس لئے ہے اے سرافرازِ سخن
کیوں نہیں اب چھیڑتا تو پردۂ سازِ سخن
دم بخود کس فکر میں ہے نغمہ پردازِ سخن

تیرے نغموں کے لئے سب گوش برآواز ہیں
تو اٹھاتا کیوں نہیں جو پردہ ہائے راز ہیں

اسقدر بھی کیا سرورِ بادۂ سر جوش ہے
اپنی ہستی کا بھی محوِ خواب تجھکو ہوش ہے
کیوں فسردہ تیرے دل کی آتشِ خس پوش ہے
آہ اے شعلہ زباں تو کس لئے خاموش ہے

تیرے ہونٹوں پر ہے یہ مُہرِ خموشی کس لئے
راز ہے کوئی وگرنہ پردہ پوشی کس لئے

خالی از علت نہیں ہے تیرا اندازِ سکوت
تجھپہ شاید کھل گیا ہے عقدۂ رازِ سکوت
دل ہی دلمیں چھیڑتا ہے پردۂ سازِ سکوت
نقدِ جاں دیکر ہوا ہے تو ہم آوازِ سکوت

اب نہ آئیں گی تری دلکش صدائیں کان میں
نام پر باقی رہے گا عالمِ امکان میں

گو فلک نے کر دیا ہے تجھکو پیوندِ زمیں
کب مٹا سکتا ہے لیکن تیرے نقشِ دلنشیں
سب کہیں گے تیری نظموں پر صدائے آفریں
ہے سخن ہی سے بقائے نام و شہرت بالیقیں

نقشِ باطل ہو نہیں سکتا کبھی نامِ سرور
ہند میں جب تک رہیگی گردشِ جامِ سرور

برق دہلوی

حبِّ وطن

جسِ خاک سے بنے ہیں اُسی خاک میں ملیں
گل ہوں تو اپنے باغ کی خاشاک میں ملیں
بوئے وفا نہ ہوئے صفا کا ہو جن میں رنگ
جلد اے خدا! وہ پھول کہیں خاک میں ملیں
دلکو خبر ہو دل کی تو ہو دل سے دلکو راہ
خط سب کو حبِّ قوم کے اس ڈاک میں ملیں
آنکھوں سے چن کے دل میں رکھوں پھول اسطرح
کانٹے وطن کے جو خس و خاشاک میں ملیں

خاکِ وطن ہی لیگی فلک گود میں ہمیں
کچھ غم نہیں جو پیکِ اجل تاک میں ملیں۔

لال چند فلک

انجامِ گل

وہ دھوپ آگئی وہ تیرا رنگ لے اُڑی | وہ ہر طرف سے شعاعوں نے تجھکو آگھیرا
وہ دلفریب ترا حسن چھپایا زرا (| ...گی کی طرف قدرتاً بے تو مائل
وہ جھک گئی کمر شاخ آگری پ... | وہ چھڑیاں ترے رخ پر یوں پڑی خشکی
جو شاخ نخل تمنا رہتی کبر ونخوت سے | وہ خشک ہوکے جھکاے ہے سر ندامت سے
نہ تازگی تری باقی نہ حسن صورت ہی | نہ رنگ شوخ رہا ہے نہ تیز نکہت ہی
مزہ شباب کا لُوٹا دھوپ نے آکر | کھڑا رہا شجر گل بھی بے بس اور مضطر
ہوئی نمود فنا کے یہ جو شادخاور کی | اُداس ہوگیا رنگت اُڑی گل تر کی
کچھ اُس کو رحم نہ آیا تری نزاکت پر | نہ کھایا اُس نے ترس حسن پر نہ رنگت پر
کہاں ہے بلبل حسرت نصیب شیدائی | نہیں تیری یک جو بھیر نصرت زدگی چھائی
نہیں نہیں وہ اسی رنج میں تو ہے بیتاب | کہ اب نصیب نہو گا اُسے گل نایاب
گھمنڈ تھا تجھے کس درجہ حسن فانی پر | ادھر تو تو یہ اُدھر رنگ نوجوانی پر
یہ دو گھڑی کی جوانی تری تھی اے نادان | مگر تجھے نہ رہا انقلاب کا کچھ دھیان
دماغ اب تری خوشبو سے ہوگئے محروم | دلوں کو جس سے تھی فرحت وہ رنگ ہے معدوم
رہا بھی شاخ میں تو مُردہ گل تو ہے بیکار | کہ اس سے رونق بُستاں نہیں بنی نہار

جو وصل یار سے محویؔ یہ بے نصیب رہے
تو کس امید پہ گلشن میں عندلیب رہے

محویؔ لکھنوی

جانِ جہاں

تجھ سے اے جانِ جہاں سب کو ملی روح حیات | تجھ سے انوار میں روشن ہے ساری کائنات
تیری وسعت سے ہے یاں یہ وسعت پہنائے دہر | تیری رفعت سے ہے یاں یہ اوج سقف کائنات
تیرے جلوے سے منور مسجد و بیت حرم | تیرے رنگوں سے مصور کرنے فرش سومنات
ماہ طرح تماشا یعنی اک تیرا وجود | حاصل جان تمنا یعنی تیری ایک ذات
گلستانِ صد نزاکت اے تری ہر ایک مژ | بوستانِ صد لطافت اے تری ہر ایک بات
تیرے نور لطف میں ہنگامہ زار رہتا ہے دن | تیرے ظلِ عاطفت میں یاں سکوں کی ہے رات
تجھ سے ظاہر ہے اگر ہے بھی کسی شی کا ظہور | تجھ سے ثابت ہے اگر ہے بھی کسی شی کو ثبات
تجھ سے ہے ہاں تجھ سے ہی اے شرح راز زندگی | عرصہ عالم میں ہر کچھ بھی اگر طور حیات

تجھ سے اے جانِ دو عالم تجھ سے اے جانِ ولی
بس وہی ہے اک تمنا۔ بس وہی ہے ایک بات

ولی الحق

ادیب

بلنّد الحمد شگفتہ ہوئے غنچے دل کے | جھومتی آئی نسیم طرب آثار ادیب
اہل دل ایک ہی جلوے پہ فدا ہوتے ہیں | دل لُبھا لیتے ہیں مضمون گہربار ادیب
واہ کیا حسن دل افروز ہے کیا طرز لطیف | اک نظر دیکھ کے سب بنتے ہیں سرشار ادیب
دلربا کیسی تصاویر ہیں اللہ اللہ | نقد دل دے کے زمانہ ہے خریدار ادیب
کونسی آنکھ ہے جو اسکی جھلک پر نہیں غش | کونسا دل ہے نہیں ہے جو طلبگار ادیب
ہند کے اہل قلم جان سے ہیں اسکے رفیق | ملک کے اہل زباں دل سے ہیں انصار ادیب
اس پہ ہے حضرت شوکت کی نگاہ الطاف | کیوں نہ پھر بام فلک پر ہے معیار ادیب
حضرت شوق رہیں خلق میں سرسبز مدام | فیض سے جن کے شگفتہ ہوا گلزار ادیب
حضرت نظم ہوئے جب سے معین و ہمدرد | رشک مہر منور ہوئے آثار ادیب
اے خداوند جہاں حضرت شاکر ہیں شاد | جن کے آنے سے بڑھی رونق بازار ادیب

چشم حسّاد سے کچھ خوف نہیں اسکو شہیر
جب کہ افضال الٰہی ہیں مددگار ادیب

شہیر فتحپوری

تازہ غزلیں

بقیہ اشعار غزل مندرجہ ادیب مئی ۱۹۱۱ء

دود درونِ سوختہ جبکہ چرخِ بریں نہ ہو — آسودہ کدورتِ کلفت زمیں نہ ہو
سجدہ بہر نیاز سے لغزت گزیں نہ ہو — گر سنگِ آستاں ترا پیدا بر جبیں نہ ہو
ہے کیفِ مے سے نرگسِ ساقی جھکی ہوئی — نازآفریں ہے جو۔ وہ نیاز آفریں نہ ہو
بیژن ہے چاہ میں تو ہے رستم کو اسکی چاہ — غفلت فراسیاب کے زیرِ کمیں نہ ہو
جو سرفرو نہو، وہ کبھی ہو نہ سُرخ رو — ہو موج نشیں نہو تو سیہ رو نگیں نہ ہو
خالِ رُخِ صنم کو سویدائے دل سمجھ — عرفاں کا نقطہ چیں ہو، مگر نکتہ چیں نہ ہو
دنیا کی سرزمیں میں ہی دامِ بلا نہاں — دانا اگر ہے طائرِ دل دانہ چیں نہ ہو
گو خاک ہوگئے ہیں یہ سہمے ہوئے ہیں ہم — زیرِ زمیں بھی خوف ہے چرخِ کمیں نہ ہو
کیا تند خوئیوں سے دلِ ناتواں کو باک — خاشاک، قہرِ شعلہ سے چیں بر جبیں نہ ہو
تحت الثریٰ بھی رُتبہ پستی میں کم نہیں — نازاں تو اپنی اوج پہ چرخِ بریں نہ ہو
خود گوشہ تیرے دل کا ہی جب خرمنِ غنا — تو بہرِ توشہ پیشِ خساں خوشہ چیں نہ ہو

تھک کر گرا صدف میں تو کم ظرف تھا گہر
دریا میں اوجِ موج کبھی تہ نشیں نہ ہو

شوکت (میرٹھی)

دیکھوں آزاد گرفتار بنا ہو کیونکر — دل مرا زلف کے پھندوں سے رہا ہو کیونکر
چارہ گر دردِ محبت کی دوا ہو کیونکر — دل بیمار کو بے یار شفا ہو کیونکر
سنگدل وہ ہیں یہ شیشے سے سوا نازک ہے — ٹوٹنے میں دلِ مضطر کے صدا ہو کیونکر
چٹکیاں دل میں لیا کرتی ہے الفت اُسکی — آستیں دیدۂ گریاں سے جُدا ہو کیونکر
جسقدر اُنکو مناتا ہوں بگڑ جاتے ہیں — اپنی ناکامیِ قسمت کا گلہ ہو کیونکر
شبِ فرقت دلِ بیتاب کو لطف آتا ہے — تیری تصویر نگاہوں سے جدا ہو کیونکر
چاہنے والوں سے وہ آنکھ ملاتے ہی نہیں — کارگر بزم میں شمشیرِ ادا ہو کیونکر
لب پہ ہر مرتبہ آتی ہے شکایت اُسکی — ہجر کی شب مری مقبول دعا ہو کیونکر
آپ آتے ہی نہیں اسکی عیادت کیلئے — دور آئی عاشق کی قضا ہو کیونکر
یار پہلو میں ہے گلشن پہ گھٹا چھائی ہے — ہاتھ اب گردنِ مینا سے جدا ہو کیونکر
سنگدل درد کی باتیں کبھی سنتا ہی نہیں — کسطرح حال کہوں ذکرِ جفا ہو کیونکر
چار ہو آنکھ کہوں حال بن آئے کچھ کام — دور اُن نرگسی آنکھوں سے حیا ہو کیونکر
دن میں سو بار کیا کرتے ہو جھوٹے وعدے — مُنہ سے جو کہتے ہو تم اسکو نبا ہو کیونکر
سر اٹھانے نہیں دیتے مجھے عصیاں یارب — دامنِ شرم مرے رخ سے جدا ہو کیونکر

آگئی حشر کے دن اُسکی محبت **ماہر**
شکوۂ ظلم و جفا پیشِ خدا ہو کیونکر

ماہر (کنتوری)

عید کا دن ہے وہ اب جانبِ خنجر دیکھیں — ذبحِ عاشق کو کریں صبر کا جوہر دیکھیں
زلف سرکا کے جمالِ رُخِ انور دیکھیں — کب یہ دن ہمکو دکھاتا ہی مقدر دیکھیں
گو ترے جلوہ سے ہی خانۂ عالم معمور — خود نظر اپنی جو حاجب ہو تو کیونکر دیکھیں
بے طرح زیست نے روکا ہی لحد کا رستہ — کب مرے قبضہ میں آتا ہی مرا گھر دیکھیں
رکھ کے زانو پہ وہ کیا دیکھتے ہیں شان اپنی — اوجِ آئینۂ و اقبالِ سکندر دیکھیں
خاک اُڑانے پہ جو ہنستے تھے ترے کوچے میں — زانوئے حور پہ تربت میں مرا سر دیکھیں
غیر کو بھی تو انہیں آنکھوں سے دیکھا ہمنے — وائے ہم پہ تجھے اِن آنکھوں سے کیونکر دیکھیں
جو یہ کہتے ہیں کہ معراج نہ تھی جسمانی — خاک میری ترے کوچہ میں ہوا پر دیکھیں
فصلِ گل آئے کہ ہم تشنہ لبان مشتاق — دستِ ساقی پہ چھلکتے ہوئے ساغر دیکھیں
خوں سے دامن کو بچانیکی جنھیں کوشش تھی — بھیڑ آکر وہ مزارِ شہدا پر دیکھیں

فی الحقیقت ہو وہی عید کا دن اے **آباد**
جسدن اس روح کو ہم جامہ سے باہر دیکھیں

آباد عظیم آبادی

خون کے دریا نکلے اور ابلتے جائیں گے | دل کے ناسوروں سے جو قطرے نکلتے جائیں گے
حشر کے دن سامنا ہوگا حسینوں سے ضرور | خون اپنے دل کا ہم چہرے پہ ملتے جائیں گے
چھیڑ دے اے فصلِ غم دل کو اب تو جو ہو سو ہو | جیسے سنبھالا جائیگا جب تک سنبھلتے جائیں گے
اپنے مرکز پر ٹھہر جائیں گے ... جنوں | گرد میں کے ساتھ ہم ذرات چلتے جائیں گے
دل نہ چھیڑو دلِ جلے کا ان اسبابِ نشاط | ہم یونہی اپنے تصور سے بہلتے جائیں گے
گرد اڑتی ہی سمجھ جو رفتہ رفتہ رستہ ہے | تیرے جاتے وقت وہ چہرے پہ ملتے جائیں گے
اور ہو جائیگا ان قبروں کا منظر دیدنی | وہ اگر گورِ غریباں پر ٹہلتے جائیں گے
آئیں گے ... کشتگانِ غم ہر تو آموز میں | رفتہ رفتہ میری صحبت میں بہلتے جائیں گے
ہم تو ... رہن گیا غیروں کو ہر نقشِ قدم | چلنے والے اب کہاں تک راہ چلتے جائیں گے
زلف کھولی میری بالیں پر کسی نے کہہ کے یہ | آج کے بیمارِ شامِ غم سنبھلتے جائیں گے
جی میں آتا ہے کہ اپنے دل پہ خنجر مار لیں | اب کہاں تک ہاتھ اپنے سینہ پہ ملتے جائیں گے
جائیے بیمارِ غم کے عکدہ میں کیا ہے اب | سر جھکائے آپ یوں کب تک ٹہلتے جائیں گے
خامۂ قدرت نے دل کا نام یہ کیا لکھا | ہر جگہ اس لفظ کے معنی بدلتے جائیں گے

دل کے شعلوں میں شفق پھولے گی جلوؤں کی عزیز
صبح ہوتی جائیگی جتنا کہ جلتے جائیں گے

عزیز لکھنوی

جب کسی کو غم زدہ میں دیکھتا ہوں اے حسن
جی بھر آتا ہے کچھ اپنا ساز و ساماں دیکھکر

حسن امام

کم نہ تھی صحرا سے کچھ بھی خانہ ویرانی مری | میں نکل آیا کہاں ہائے وائے نادانی مری
کیوں نہ ناواں میں کسی کو رہبرِ ملکِ عدم | اے خضر یہ سرزمیں ہے جانی پہچانی مری
جان و دل پر جتنے صدمے ہیں اسی کے دم سے ہیں | زندگی ہے فی الحقیقت دشمنِ جانی مری
ابتدائے عشق گیسو میں نہ تھیں یہ الجھنیں | بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی آخر پریشانی مری
دشتِ ہستی میں دواں ہوں آبلہ پا کچھ نہیں | کب ہوئی محتاجِ لیلےٰ قیس سامانی مری
اور تو واقف نہیں کوئی دیارِ عشق میں | ہے جنوں شیدا مرا وحشت ہے دیوانی مری
باغِ دنیا میں یونہی رو ہنس کے کاٹوں چار دن | شبنم و گل کی طرح ہے زندگی فانی مری
کرکے ترکِ آرزو بیٹھا ہوں کیسا مطمئن | ہو گئی آساں ہر اک مشکل بآسانی مری
ہاں خدا لگتی ذرا کہدے تو اے حسنِ صنم | عاشقی اوروں کی اچھی یا کہ حیرانی مری؟
لختِ دل کھانے کو ہے خونِ جگر پینے کو ہے | میزبانِ دہر نے کی خوب مہمانی مری

نغمہ زن صحرا میں ہے جس طرح کوئی عندلیب
یوں ہے اے محروم سرحد میں غزل خوانی مری

محروم

اسقدر گھبرا گیا دل زلفِ جاناں دیکھکر | جسطرح اٹھے کوئی خواب پریشاں دیکھکر
کیا خبر تھی اسقدر دشوار یاں بڑھ جائیگی | عشق کر بیٹھے تھے ہم اک کام آساں دیکھکر
کس قدر بھولے ہوئے ہو عیش میں عشقی کو تم | آنکھ کھولو جانبِ گورِ غریباں دیکھکر
اے تغافل کیش اتنا جورِ جرمِ عشق پر | رحم کر ہم بیکسوں کا تنگ زنداں دیکھکر
دل کو تار دل کا نکلنا سنتے تھے اے مہ جبیں | اب یقیں کامل ہوا ماتھے پہ افشاں دیکھکر
تشنگیٔ عشق سے خشک ہو چکے تھے لب مرے | منہ میں پانی آگیا چاہِ زنخداں دیکھکر
محویت ایسی ہوئی بت بن گئے حیراں رہے | رونقِ آبادیٔ شہرِ خموشاں دیکھکر
یوسفِ مصری بہت نازاں تھے اپنے حسن پر | منہ میں پانی آگیا تیرا زنخداں دیکھکر

(منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی مرحوم)

دل میں خلشِ غمِ نہاں ہے | جو آہ ہے لب پہ خونچکاں ہے
سوکھی ہوئی پتلیاں ہیں آنکھیں | وہ سیلِ سرشک اب کہاں ہے
دم توڑ رہی ہے نامرادی | برسوں سے غریب نیمجاں ہے
دل آنکھوں سے بہ گیا ابل کر | اے دردِ فراق اب کہاں ہے
رہنے کو نہیں کہیں ٹھکانا | اب مجھ کو زمیں بھی آسماں ہے
نخچے سے جگر کی خیر یارب! | بسمل ہے غریب نیمجاں ہے
دل ہی کبھی آبلہ کبھی اشک | ہر رنگ میں اب یہ خونفشاں ہے
بولے مجھے دیکھکر سرِ راہ | کیا تو ہی سرورِ خستہ جاں ہے

ایڈیٹوریل

مرزا غالب اُردو لٹریچر کو جس قدر ترقی غالبؔ مرحوم کی بدولت ہوئی ہے، وہ شاید کسی اور بزرگ سے نہ ہوئی ہوگی زمانۂ حال میں جو سلاست نویسی اور خیال بندی کا رنگ انشا پردازی کا خاص جزو معلوم ہوتا ہے، یہ فیضان غالبؔ کے سوا کسی اور سے ممکن ہی نہیں۔ مرزا نوشہ کا جو احسان اُردو زبان پر ہے، اُس کو نہ صرف دلّی کا اسکول آف لٹریچر تسلیم کرتا ہے، بلکہ لکھنؤ۔ اور لکھنؤ کا بھی خاص "شیش محل"۔ وہی غالبؔ جس نے بلند پروازی اور علو خیالی کے ساتھ روزمرّہ اور محاورہ بندی میں ایسا نام پایا کہ سند الوقت رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب آشوبؔ، شمس العلما حالیؔ، مرزا مجروحؔ، مرزا آفتہؔ وغیرہ نے خاقانیٔ ہند اُستاد شاہ حضرت ذوقؔ کی شاگردی کے بجائے اُسی کے آگے زانوئے ادب تہ کرنا مایۂ ناز سمجھا۔ ہائے! اسی غالبؔ کا مزار اب ایسی کس مپرسی کی حالت میں ہے کہ اُسے دیکھکر غیر ملک کے رہنے والوں کو حسرت ہوتی ہے، چنانچہ پاؤنیر کے ایک نامہ نگار، ڈاکٹر مارٹن، نے اپنے ایک مراسلہ میں لکھا تھا۔

"ابکے جو میرا دلّی جانا ہوا تو شاہ نظام الدین اولیاء کے احاطہ کے باہر ایک خادم نے مجھے ایک قبر دکھلائی، پھر اُس کے پاس لے جا کے کہنے لگا کہ یہ غالبؔ کی قبر ہے۔ (آہ! وہی غالبؔ جس کا یہ شعر ہے ؎ غالب نام آورم نام و نشانم مپرس ہم اسد اللّٰہ ام ہم اسد اللّٰہیم) ٹوٹی ہوئی قبر جسکے سرہانے سنگِ مرمر پر کتبہ اور اسکی بھی وہ حالت کہ عیاذاً باللّٰہ یہی معلوم دیتا تھا کہ دو ایک برساتوں کے بعد یہ بھی قبر کے ساتھ مِل کے تہِ خاک ہو رہے گا؛ اور اسکے ساتھ زبان اُردو کا ایک سربلند علَم سرنگوں ہو کر مٹی میں ایسا ملیگا کہ اسکا نشان تک نظر نہ آئیگا تو کیا مجھے اس امر کا حق ہے کہ کلامِ غالبؔ کے دلدادگان پر افسوس نہ کروں؟ مورّخ، مصنّف، شاعر، جس قوم میں ہوں وہ اس قوم کے بیش بہا جواہر ہوتے ہیں۔ یہ مال ضائع نہیں کرتے بلکہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں، انکی قبریں نہیں بلکہ بیش قیمت خزانوں کے دفینے ہیں ان تبرکات کی کچھ قیمت نہیں، یہ انمول رتن ہیں۔ ان مقدس تربتوں کو برباد ہونے دینا گناہ ہے، اور گناہ کے ساتھ وہ تقصیر جو آنیوالی نسلیں کبھی بھی معاف نہ کریں گی۔ میری خواہش ہے کہ یہ تربت برباد نہ ہونے پائے، میری یہ تمنا ہے کہ یہ مرقد باقی رہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ یہ ڈھیر قائم رہے اس لیے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو ایک ایک روپیہ کا عام چندہ ہو، اور پھر دو تین ہزار میں ایک مضبوط چھوٹی سی عمارت بنا کر مرنے والے کا زندہ نشان قائم کیا جائے"۔

مندرجہ بالا سطور کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک یورپین ڈاکٹر کے الفاظ ہیں، جو ٹیس کھائے ہوئے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔ وہ غالبؔ کو قوم کا بیش قیمت مال بتاتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ اس قبر کو برباد ہونے دینا ایسا گناہ اور تقصیر ہے کہ آنے والی نسلیں اسکو معاف نہ کریں گی۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ آئندہ نسلیں اس مقدس تربت کو ترکہ میں پانے والی ہیں۔ اس ترکہ میں اصراف کرنے کا موجودہ نسلوں کو کوئی حق نہیں۔ یہ امانت ہے، اور امانت بھی ایسی جو ایک نسل سے دوسری نسل کو پہنچنی چاہیئے۔ آنیوالی نسلیں جب غالبؔ مرحوم کے مزار کی جستجو کریں گی، اور اس کا پتہ یا نشان پانے کے لیے اس قسم کی تکلیف کا سامنا ہوگا جو آجکل کے ماہرانِ علمِ آثار الصنادید کو تابوت سکینہ کے دریافت کرنے میں ہوئی، تو کیا کہیں گی؟ یاد رکھو، کہ یہ جُرم نہ معافی کے قابل ہوگا، نہ ضمانت کے لائق۔ آہ! مرنے والے نے اپنی زندگی ہی میں کہدیا تھا ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

وہ دن تو ابھی دور ہے کہ ہمارے ہندوستان میں کوئی **غالب کلب** یا **غالب ہال** قائم کیا جائے، مگر کیا ہم اس درجہ پست ہمت اور ایسی

نوابان علم غفلت میں مبتلا رہے ہیں کہ غالب ایسے زندہ جاوید شاعر کی مٹی مٹائی قبر کو برباد ہوتے دیکھیں اور اس کے رہے سہے نشان کو بھی قائم رکھنے میں دریغ کریں۔ افسوس ہے

کیا کسی منہ سے ہو عرب کی شکایت غالب

تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

غالب مرحوم کا زیادہ تر حق واقفیت اہل نکات نوابان لوہارو،

شمس العلما حالی، بابو مانک چند صاحب مصنف آئینہ سکندری، اور لالہ سری رام صاحب ایم اے وغیرہ بزرگان دہلی پر ہے۔ اگر وہ خاموش ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں **ادیب** کے اجرا کا سب سے بڑا مقصد ملک میں لٹریری مذاق پیدا کرنا ہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہماری کوشش سے غالب کی قبر بربادی سے بچ جائے تو یہ ہماری سب سے اعلیٰ خدمت ہوگی۔ لہذا ہم اس مہینے سے **غالب میموریل فنڈ** (چندہ یادگار غالب) کھولتے ہیں۔ اور شیدایان کلام غالب سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ بھی اس مفید تحریک میں حصہ لیں، اور اپنے احباب کو بھی اس طرف رجوع کریں۔ جو کچھ بھی ارسال ہوگا شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ ہاں! یہ بتا دینا بھی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ "غالب میموریل فنڈ" میں جو روپیہ فراہم ہوگا، اس کا بے جا استعمال نہ کیا جائے گا۔ کامریڈ کے قابل ایڈیٹر مسٹر محمد علی بی اے، تخمینہ اخراجات تیار کر رہے ہیں، اور انہوں نے بھی اپنے اخبار میں فنڈ کھولا ہے۔ کافی روپیہ فراہم ہونے پر ایک مستقل یادگاری روضہ تعمیر کیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ روپیہ کی فراہمی تک جناب مولوی حسن نظامی صاحب بلاد اسلامیہ کی سیاحت سے واپس آجائیں، اور روضۂ غالب کی تعمیر انہیں کی نگرانی میں ہو۔

اخیر میں اتنا ضرور کہے دیتے ہیں کہ جب یہ روضہ تیار ہو جائے گا تو موجودہ زمانے کے دلدادگان کلام غالب کے سر سے بڑا بھاری بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کیونکہ غالب مرحوم کے حل طلب اشعار کو حضرت استادی مولانا شوکت مدظلہم اور مولانا علی حیدر صاحب نظم طباطبائی لکھنوی نے اپنے "مشتمل کلیات غالب" میں صاف کر دیا ہے، جس سے اردو لٹریچر پر بڑا بھاری احسان ہوا ہے۔ تیسری بات جس سے زمانہ حال میں یادگار غالب قائم رہ سکتی ہے، وہ دیوان غالب کے نہایت ہی خوش خط اور اعلیٰ قسم کے کاغذ پر چھپنے سے پوری ہوگی۔ ممکن ہو تو **ادیب** ہی اس کمی کو پورا کرے گا۔ اور جس طرح زمانہ حال میں شکسپیر، ملٹن، اور دیگر صدر نشینان انجمن علم ادب انگریزی کی تصانیف عمدہ پیرایہ میں انگلستان سے نکلتی ہیں، یا مولوی محمد رحمت اللہ صاحب رعد کے ہاں سے "دیوان حافظ" اور "مسدس حالی" وغیرہ شائع ہوئے ہیں۔ اسی طرح عمدہ پیرایہ میں کلیات غالب مع تصویر و صحیح سوانح عمری مصنف بھی شائع کی جائے۔

سکھ کنیا مہا ودیالہ، شہر فیروزپور

یہ ایک غلط خیال ہے کہ اس زمانہ میں سچے فدائیان قوم، یا ایثار نفس کرنے والے، دوسروں کے راحت و آرام کے لیے اپنے جان و مال سے دریغ نہ کرنے والے، قوم اور قوم کے بچوں کے لیے تن، من، دھن سے ہر وقت خدمت کرنے والے پائے نہیں جاتے۔ ان لوگوں کو ہم علی رؤس الاشہاد ڈنکے کی چوٹ اعلان دیتے ہیں۔

کمی کس بات کی ہے اس خدائی کارخانے میں

اگر نہیں تو آئیں، اور شہر فیروزپور کے اس آشرم کو دیکھیں جو پانچ نومبر ۱۸۹۲ء کو خالصہ نیشن کی پیاری بیٹیوں کے سدھارنے کے لیے بھائی تخت سنگھ جی نے قائم کی، اور اسمیں انکی پیاری بیوی بی بی ہرنام کنور نے خاص حصہ لیا۔ چنانچہ اس آشرم کی تاریخ سے پایا جاتا ہے کہ

"جب ایک ایسی لڑکی آشرم میں آئی جسکی والدہ اسے ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دیکر دھرم کے امتحان کے لیے چھوڑ گئی، تو بھائی تخت سنگھ جی اسے گود میں اٹھا کر بی بی ہرنام کور کے پاس لے گئے اور کہا "جہاں اور بچے ہیں وہاں یہ بھی سہی زندگی ہوئی تو پرماتما کی دیا سے پل رہے گی نہیں تو خیر" چنانچہ اس زندہ جاوید لیڈی نے اس نووارد کو سینے سے لگایا، اور وہی چھاتیاں جن سے دودھ پانے کے لیے اسکا اپنا بچہ ترستا تھا، اس کے لیے وقف کر دیں"

ان باہمت اور مستقل مزاج میاں بیوی کی کوششوں سے آشرم میں ترقی ہونے لگی، اور پھر ان کا کام دیکھکر چند اور بھی فدائیان قوم ان کے کام میں حصہ لینے کے لیے مستعد ہوگئے۔ انہیں میں ایک بھائی دیر سنگھ جی بھی ہیں۔ حال میں اس آشرم کی طرف سے ایک انگریزی کتاب شائع ہوئی ہے جو ہمارے پاس بھی آئی ہے۔ یہ اُن سب آراء کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً یہاں کے معائنہ کرنے والوں نے آشرم کی نسبت قلم کی تھیں اُنہیں میں منجملہ اور بجناب لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر پنجاب کی بھی رائے ہے جنھوں نے مارچ ۱۹۰۹ء کو اپنی لیڈی صاحبہ کے ساتھ اس کا معائنہ کیا تھا۔

پچھلے دنوں اس آشرم کی نسبت یہ سوال پیدا ہوا تھا، کہ اس کا اور سب انتظام تو ہر طرح قابل تعریف ہے، مگر بورڈنگ کافی نہیں۔ اسپر دریافت کیا گیا کہ کسقدر رقم کے صرف سے عمارت مکمل ہو سکتی ہے، تو پچاس ہزار روپیہ کا تخمینہ ہوا۔ یہ سنکر بھائی تخت سنگھ جی پہلے تو کسی قدر گھبرائے۔ مگر پھر خود بخود کہنے لگے "ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا"، اس لیے اُنہوں نے سچے دل سے گرو گرنتھ صاحب سے وعدہ کیا کہ "جبتک یہ رقم پوری نہ ہولے گی، وطن سے دُور اور چمن سے دُور، شکستہ پری اور خستہ حالی سے ننگے پاؤں جابجا چکر لگاتا پھروں گا۔ جہاں کہیں سے جو کچھ ملیگا، غنیمت سمجھوں گا۔ اور جو میری زندگی میں میری مراد پوری نہ ہوئی تو جیتے جی نہ فیروزپور اور نہ اُس کے آشرم کا مُنہ دیکھوں گا۔ جسطرح راجپوتوں میں اکثر اس قسم کی باتیں سُننے میں آتی ہیں، کہ وہ کسی بات کے پورا ہونے تک اپنے حلف کے مطابق بائیں ہاتھ سے کھاتے یا حجامت نہ بنواتے تھے، اُسی طرح میں بھی یہ رقم پوری نہ ہونے تک جوتا نہ پہنوں گا"۔ ہمارے خیال میں سکھ بہادروں کے سامنے پچاس ہزار کوئی بڑی بھاری رقم نہیں۔ اُنہوں نے خالصہ کالج کے لیے ایک برس میں اسقدر چندہ جمع کر لیا تھا، کہ محمڈن یونیورسٹی والوں کو دس سال تک نصیب ہوگا۔ امید ہے کہ خالصہ بہادر اس آشرم کی مدد کے لیے بھی اُسی قسم کی دریا دلی دکھائیں گے، جو کالج کے موقعہ پر دکھا چکے ہیں۔ کیا سکھ کانفرنس کے اصولوں میں "استری تِکشا" کی مدد کا کوئی اصول نہیں؟ کیا سنگھ سبھاؤں میں مستورات کی تعلیم اور خبر گیری اغراضِ خاص میں داخل نہیں؟ جب یہ سب کچھ ہے تو کیا وجہ ہے کہ غریب تخت سنگھ کو زیادہ دن جلا وطنی میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے؟ اگر یہ رقم اُس کے ہاتھ آجائے، تو اسمیں شبہ نہیں کہ وہ قیمتی وقت جو روپیہ فراہم کرنے میں صرف ہوگا، وہ قوم اور قوم کے بچوں کی دیگر ضروریات کے رفع کرنے میں صرف ہوگا۔

صحیفۂ زرّیں ہندوستان کے علم ادب کی ہر قسم کی کتابوں کی اشاعت میں جسقدر کوشش اور محنت و جانفشانی کے ساتھ، بلا کسی قسم کی قومی یا مذہبی جانبداری کے، مطبع اودھ اخبار نے کام لیا ہے، اُسی کا حصہ ہے۔ اس کے لائق اور ہونہار مالک کا بدولت نے نہ صرف فارسی، عربی، ہندی، بھاشا، سنسکرت، اور اُردو حروف ہی میں کتابیں شائع کی ہیں، بلکہ وقتاً فوقتاً ضروریاتِ زمانہ کو محسوس کرکے ہر قسم کی کمی پوری کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ منشی نولکشور صاحب بجہانی ایک تو خود زمانہ کے رنگ کو پہچانتے تھے، دوسرے اُنکے کارکن اور کارپرداز بھی نورٌ علیٰ نور تھے۔ منشی ہادی علی رشک۔ لالہ کالکا پرشاد توحد۔ زرّیں رقم، جواہر رقم۔ منشی امیر اللہ تسلیم، بابو تربھون ناتھ ہجر۔ مولانا بحر العلوم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، اور خدا جانے کتنے اور درجنوں اہلِ قلم جمع کر رکھے تھے، جو اپنے وقت کے بادشاہ کہلاتے تھے۔ ان کی جدت پسندی اور بلند پروازی کے باعث مطبع اودھ اخبار کی مطبوعات کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہوتی رہی۔ چنانچہ اسی زمانہ شناس مطبع نے جہاں اور چیزیں آج سے آٹھ دس برس اُدھر شائع کی تھیں شہنشاہ خلد آرام گاہ اڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی پر ایک خاص کتاب "صحیفۂ زرّیں" بھی نکالی۔ اس صحیفہ میں سرکاری کتاب "دربار قیصری" کے تتبع پر وہ جملہ مضامین درج کیے گئے جنھیں دہلی کے دربار تاجپوشی کے ساتھ خاص تعلق تھا۔ مختصر تاریخ جلسہ کے بعد رئیسان نامدار اور والیانِ ریاست ہائے ماتحت سرکار انگلشیہ وغیرہ کے حالات معہ تصاویر اس خوش اسلوبی کے ساتھ چھاپے کہ اُس وقت کی زندہ تاریخ ہیں۔ اگرچہ انہیں دنوں میں ایک دوسری کتاب لاہور سے "یادگار دربار" کے نام سے مولوی فیروزالدین صاحب نے بھی بڑی کاوش کے بعد نکالی تھی مگر "صحیفۂ زرّیں" کا حجم اُس سے کہیں بڑا تھا۔ یہ کہنا کہ قدردانوں نے اس کتاب کی پوری قدر نہیں کی، غلط ہے۔ کیونکہ پچھلے تجربہ سے اور بھی جرأت حاصل کرنے کے بعد لالہ منوہر لال صاحب بی اے مینیجر مطبع نے اس کے متعلق جو مختصر سی رپورٹ لکھی ہے، نہایت ہی طمانیت بخش ہے۔ "صحیفۂ زرّیں" کی زبان اُردو تھی، یعنی وہ زبان جو ہندوستان کے بیشتر حصص میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ احاطۂ مدراس کے لفٹننٹ گورنر صاحب کے پرائیویٹ سکرٹری نے اسکی رسید دیتے وقت یہ لکھا تھا، کہ:-

"حضور لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر اس کتاب کو دیکھکر نہایت ہی محظوظ ہوئے مگر اسکا افسوس بھی ہوا کہ یہ ایک ایسی زبان میں ہے جسکو وہ خوب نہیں سمجھ سکتے۔ ورنہ اس سے وہ بہت زیادہ لطف اٹھاتے۔ بہرحال وہ کتاب کی عمدہ جلد، صورت اور اسکی ظاہری آرائش کے لیے مالک مہتمم، ایڈیٹر وغیرہ صاحبان کی محنت خاص کا اعتراف کرتے ہیں"

اور کوئی ہوتا تو شاید اس رائے سے کمزور ہمت ہو جاتا مگر ان واجب الاحترام مطبع نے اس ناکامی کو بھی لین کی طرح کامیابی کا زینہ خیال کیا چنانچہ اس بات کو اسی دل میں رکھا۔ اب جو تاجپوشی کا یہ دوسرا موقع زمانہ نے دکھایا اور دہلی میں شہنشاہی دربار منعقد ہونے کا وقت آیا۔ تو اس وقت وہ بات بھی سامنے آگئی۔ اب کے پہلے سے کہیں زیادہ اہتمام کے ساتھ اسی قسم کی ایک دوسری کتاب شائع ہوگی۔ مضامین بھی اسی رنگ کے ہونگے۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ اسکی زبان انگریزی ہوگی۔ منیجر صاحب نے اسکا نام THE GOLDEN BOOK کے بجائے ایک فارسی جامع اور انگریزی طرز کا نام تجویز کیا یعنی WHO'S WHO یہ نام عموماً ان کتابوں کے ہوتے ہیں، جو ہر سال مشاہیر و برگزیدہ نمایان روزگار کے حالات میں لکھی جاتی ہیں۔ انمیں کسی خاص قوم یا جماعت کی تخصیص نہیں ہوتی۔ نہ یہ تذکرۃ اولیاء کی مانند ایک خاص فرقہ اولیائے کرام کیساتھ علاقہ رکھتی ہے۔ نہ رسیان مدا کے حالات سے مختص ہوتی ہے۔ ان کتابوں میں ہر قسم کے ہنرور، پیشہ ور، مشہور اہل سیف و قلم، صناع، کاریگر وغیرہ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں "صحیفۂ زریں" کا یہ انگریزی ایڈیشن اس مبارک عہد جارج پنجم کے آغاز حکومت کی نہایت ہی عمدہ یادگار ہوگی۔

سنٹرل ہندو کالج گرلز سکول بنارس جس ملک کی بہبودی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، اسمیں تعلیم نسواں کا خاص خیال ہوتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ بنارس ایسے مقدس شہر میں بھی ایک لڑکیوں کا اسکول قائم ہے، جسکی رپورٹ بابت سال گذشتہ اسوقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ سال زیر رپورٹ (یکم اکتوبر ۱۹۱۰ء لغایت اخیر ستمبر ۱۹۱۱ء) میں اس مدرسہ میں بہ تفصیل ذیل ۱۶۸ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں۔

برہمن ۹۷	کھتری ۴۴	}	میزان کل ۱۶۸
اگروال ۲۳	دیگر اقوام ۴	}	

بمقابلہ سال گذشتہ طالبات کی تعداد میں ۸ کا اضافہ رہا، اور ۱۴۱ حاضری روزانہ رہی۔ اس اسکول میں یہ خاص انتظام کیا گیا ہے کہ قبل اس کے کہ بچوں کو یہاں کی رہائش کے قابل بنایا جائے۔ انھیں ایک سال تک ابتدائی حصہ میں رکھا جاتا ہے بعد ازاں وہ جماعت بندی کے ساتھ سال بہ سال ترقی کرتے ہیں چونکہ اجماعتوں کی دو مختلف زبانوں میں تعلیم ہوتی ہے، اس لئے وقت کا ایک خاص حصہ صرف ہوتا ہے۔ تین ہندی سکھانیوالی، چار بنگالی پڑھانیوالی، اور چھ مدرسۃ المعلمین کے لیے تیار ہوتی ہیں۔ دونوں یورپین لیڈیاں اعلیٰ جماعتوں کو حساب، انگریزی، نقاشی اور کشیدہ کاری سکھاتی ہیں۔ آنریری اسسٹنٹ سکرٹری کا کام مسز مسیحی دارا صاحب کی اہلیہ محترمہ نے اپنے ذمہ لیا ہے، جو علاوہ کار معوضہ کے لڑکیوں کی خاص معاونت فرماتی ہیں لڑکیوں میں تین بیوگان بھی ہیں جنکی اس قسم کی تعلیم ہو رہی ہے کہ بعد میں دنیٰ درجہ کی استانیوں کا کام انجام دے سکیں آج کل مدرسۃ المعلمین کے معلموں کی بڑی ضرورت ہے۔ بہت سی نیک نہاد اور خدا کی پاک مخلوق نے اپنی خدمات پرنسپل صاحبہ کے زیر اہتمام کر رکھی ہیں۔ ایک موہن صاحب بلا تنخواہ مذہبی اور ہندو سنسکرت کی تعلیم دیتے ہیں۔ سب لڑکیوں کو اُن کی مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ بڑی لڑکیوں کو حساب خانہ داری، جغرافیہ، تاریخ ڈرائنگ، نقاشی، مٹی کے کھلونے وغیرہ بنانا، سوزن کاری، قطع و برید اور کشیدہ کاری بھی سکھائی جاتی ہے۔ چونکہ اب لوگ انگریزی تعلیم کے زیادہ خواہاں ہیں، اس لئے بڑی لڑکیوں کو اس سے بھی محروم نہیں رکھا جاتا۔ جو لڑکیاں انٹرنس کی تیاری کر رہی ہیں، انھیں مس پامر صاحبہ الجبرا اور اقلیدس سکھاتی ہیں مس آرنیڈیل کی عنایت سے لڑکیاں پھول پتیاں اس خوش اسلوبی سے بناتی ہیں کہ اصل و نقل میں فرق معلوم نہیں ہوتا۔ لڑکیاں اپنی کرتیاں خود بھی طرح بنالیتی ہیں۔ جو رومال لیڈی منٹو صاحبہ کو اس مدرسہ کے معاینہ کے وقت پیش کیا گیا تھا وہ انھیں لڑکیوں کا بنایا ہوا تھا۔ اب ہندو کالج گرلز اسکول کیطرف سے مدد کیلئے عام طور پر چندہ کی درخواست کی گئی ہے۔ چونکہ یہ ایک نیک کام ہے اس لیے پبلک سے امید قوی ہے کہ اسکی معاونت میں کوتاہی نکریگی۔

ستمبر ۱۹۱۱ء

ادیب

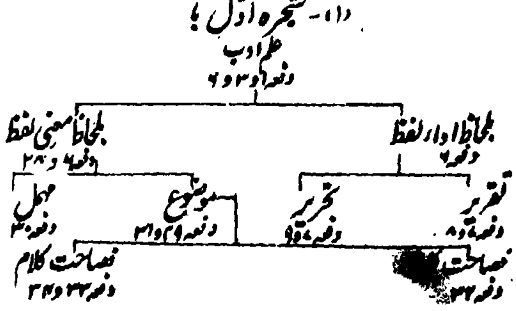
جلد ۴ نمبر ۳

تقسیمِ علمِ ادب

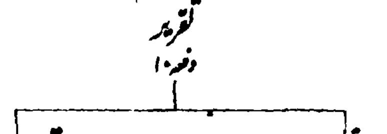
۱ تعریف علم ادب — ادب وہ علم ہے جس میں بلحاظ ادا الفاظ اور اُسکے معنے کے بحث کی جاتی ہو، اس کی تقسیم، دفعات وتشریحات ذیل سے واضح ہوتی ہے:-

۲ اشجار علم ادب — چونکہ علم ادب وسیع علم ہے، اس کے ذیلی علوم اور اس ہی طرح اسکی کیفیت تقسیم، واختصار اقسام میں طلبا علم کو دقت رہا کرتی تھی، لہٰذا اشجار ذیل بغرض سہولت تیسیر قایم کیئے گئے

(۱) - شجرہ اوّل ؛



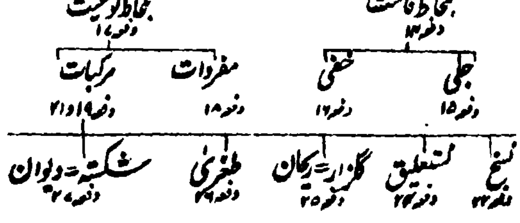
(۲)۔ شجرۂ دوم



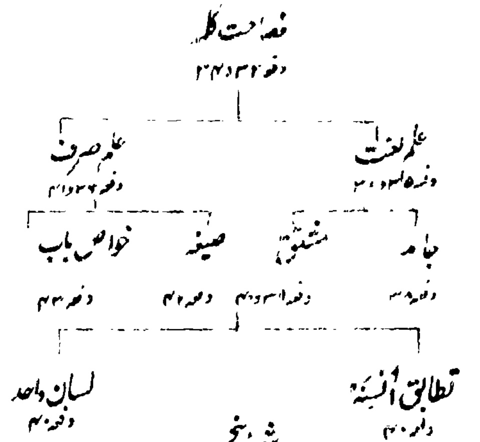
(۳)۔ شجرۂ سوم

تحریر

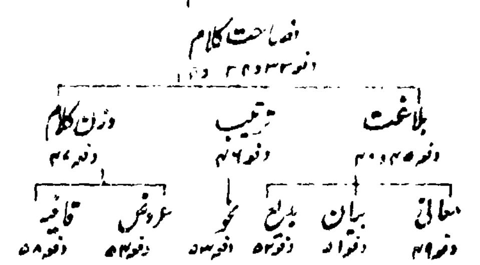
دفعہ ۷ و ۹ و ۱۳



(۴) شجرۂ چہارم



(۵) شجرۂ پنجم



۳۔ اختلاف علما | جار اللہ زمخشری، جن کا زمانہ حیات ۴۶۷ھ تا ۵۳۸ھ مطابق ۱۰۷۴ء تا ۱۱۴۳ء ہے، اور ابو یعقوب یوسف ابی بکر سکاکی معروف بہ سراج الدین خوارزمی، جن کا زمانہ حیات ۵۵۵ھ تا ۶۲۶ھ مطابق ۱۱۶۰ء تا ۱۲۲۹ء ہے، اور علاوہ ان کے دیگر علما نے اپنی تصانیف میں علم ادب کے مختلف اقسام بیان کئے ہیں، کسی نے اس میں کے بعض علوم کے لئے مستقل موضوع اور غایۃ قرار دے کر نصاب علوم ادبیہ بارہ تک پہنچایا ہے، اور کسی نے اُن سے جداگانہ بحث کی ہے، تاہم اُن کا قرار دادہ نصاب قابل غور ہے، اور تقسیم مذکور الصدر میں حسب ذیل دس علوم ادب مناسب معلوم ہوتے ہیں:-

(۱) تجوید (۲) وقف (۳) تحریر (۴) لغت (۵) صرف۔ (۶) تطابق السنہ۔ (۷) بلاغت (۸) نحو۔ (۹) عروض (۱۰) قافیہ۔

۴۔ تقسیم مجوزہ | اشجار مندرجہ دفعہ ۲ سے واضح ہے کہ وہ علم ادب کی تمام شاخوں پر حاوی ہیں۔

۵۔ تعریفات اقسام | جس طرح علما کا اسکی تقسیم معرض اختلاف بن گئی تھی اس ہی طرح اُس کی تعریفات اقسام میں بھی جا بجا اُن کا اختلاف پایا جاتا تھا، لہذا بشمول بیان کیفیت تقسیم، ذیل کے دفعات تعریف میں وہ ہی اختلاف حسب ذیل رفع کیا گیا، جب کسی اصطلاح سے بحث کی جائے تو مصنف کے معنوں پر لحاظ رکھنا چاہئے، عام مسئلہ ہے کہ "لَا مُشَارَکَۃَ فِی الْاِصْطِلَاحِ"، جب کوئی اصطلاح ایک معنے میں استعمال کی جائے، اور اس ہی اصطلاح کو دوسرا مصنف مختلف معانی میں استعمال کرے، تو انکو مختلف اصطلاحات سمجھنا چاہئے، ورنہ قیاسات میں حد اوسط کے تکرار نہ ہونے سے مغالطہ کا اندیشہ ہے۔

۶۔ ابتدائی تقسیم | چونکہ علم ادب میں الفاظ و معانی دونوں سے بحث کی جاتی ہے، اس لئے اسکی تقسیم اوّلاً بلحاظ ادائے لفظ اور ثانیاً بلحاظ معنی لفظ کی گئی۔

۷۔ ادائے لفظ | تقسیم بلحاظ ادائے لفظ کے حسب ذیل دو اقسام ہیں:

(۱) تقریر۔ (۲) تحریر۔

۸۔ تعریف تقریر | تقریر اُس کو کہتے ہیں جس میں بلحاظ ادائے الفاظ کی کیفیت و نوعیت اور ترتیب سے بحث کی جاتی ہو، مثلاً ؎

سَأَلْتُ الْعِلْمَ مَنْ اَحْیَاکَ حَقًّا
فَقَالَ الْعِلْمُ شَمْسُ الدِّیْنِ یَحْیٰی

یعنی میں نے علم سے پوچھا کہ تیری حیات کی ٹھیک پرورش کس نے کی ہے؟ تو علم نے کہا کہ میرے سچے زندہ رکھنے والے شمس الدین یحیٰی ہیں۔ مولوی شمس الدین یحیٰی صاحب فیض آباد کے قریب جو کے رہنے والے تھے، اور ملک اودھ اس ہی اجودھیا ـ

کے نام سے مشہور ہے، جو زمانۂ قدیم میں اودھ کا دارالسلطنت تھا، اور اسی وجہ سے وہ شمس الدین یحییٰ اودھی سے مشہورِ آفاق ہیں، بڑے محدث تھے، علم و فضل اُنکا مسلم الثبوت ہے، سلطان غیاث الدین تغلق کے عہدِ حکومت میں گذرے ہیں، حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور بڑے معتقدین میں سے تھے، شاگرد رشید جناب مولانا ظہیر الدین بھکری رحمۃ اللہ علیہ کے تھے، شیخ نصیر چراغ دہلوی نے آپ کی مدح میں شعر مذکور الصدر کہا ہے۔

۹۔ تعریف تحریر | تحریر اُس کو کہتے ہیں جس میں الفاظ کے قلمبند ہونے سے بحث کی جاتی ہو، دیکھو مثال دفعہ ۸ بلحاظ کتابت۔

۱۰۔ تقسیم تقریر | تقریر کے حسب ذیل دو اقسام ہیں:-

(۱) تجوید۔ (۲) وقف۔

۱۱۔ تعریف تجوید | تجوید اُس کو کہتے ہیں جس میں ترتیل و حقوق حروف بغیر تکلف و افراط و تفریط کے اپنے اپنے مخارج میں نہایت لطافت اور کمال خوبی کے ساتھ ادا کئے جاتے ہوں مثلاً حروف حلقی، وسطی، شفتی کو بکمالِ امتیازِ مخارج بلا استعلاء و استفلاء و بلا تصنع بقانون مقتضائے طبائعِ حروف ادا کرنا۔

۱۲۔ تعریف وقف | وقف کے لغوی معنی رُکنے اور ٹھہرنے کے ہیں، اور باصطلاح قرّاء، نطق کو کسی لفظ کے حرفِ اخیر پر قطع کرنے کو کہتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وقف میں ہمیشہ لفظ کا حرف اخیر ساکن ہوتا ہے، تفصیل دیکھو رسالہ اوقاف عبارت میں، مثلاً قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں دال مرفوع ہے، اور بحالت وقف ساکن ہو گئی۔

۱۳۔ تقسیم تحریر | تحریر کے حسب ذیل دو اقسام ہیں:-

(۱) بلحاظ قامت (۲) بلحاظ نوعیت

۱۴۔ تشریح قامت | تحریر بلحاظ قامت کے یہ معنی ہیں کہ کاتب الحروف کے طرز تحریر سے حروف کی ہیئت کذائی اور مقدار معلوم ہو، اور اس لحاظ سے اُس کے حسب ذیل دو اقسام ہیں:-

(۱) جلی۔ (۲) خفی۔

۱۵۔ تعریف جلی | جلی لغت میں ظاہر اور روشن اور واضح کو کہتے ہیں لیکن حقیقت میں کسی چیز کا جلی اور خفی ہونا امورِ اضافیہ میں سے ہے، ایک چیز بہ نسبت دوسرے کے جلی اور بہ نسبت تیسرے کے خفی ہوتی ہے، اس بناء پر کسی خاص اندازہ کا مقتضی نہیں لیکن کاتبین اپنی اصطلاح میں روز مرّہ کے معمولی تحریراتِ دفاتر و مراسلات کی مقدارِ تحریر سے بڑھکر کو جلی کہتے ہیں مثلاً مضمون ہذا کے دفعات خط جلی میں اور اُن کا خلاصہ خط خفی میں ہے۔

۱۶ تعریف خفی | خفی لغت میں معنی پوشیدہ ہے، لیکن اصطلاح کاتبین میں خط خفی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی صحیح البصر کی بصارت سے مخفی ہو، بلکہ مراد اُس سے وہ کتابت ہے جو مقابل جلی ہے، جس کا ذکر دفعہ مذکور الصدر میں ہوا ہے۔

۱۷ نوعیت تحریر | تحریر بلحاظ نوعیت کے یہ معنی ہیں کہ بہ نظر اپنی ذاتی قابلیتِ انقسام کے، تحریر کتنے اقسام کی گنجائش رکھتی ہے، بربناء اس لحاظ کے وہ حسب ذیل دو اقسام پر منقسم ہو سکتی ہے:-

(۱) مفردات (۲) مرکبات

۱۸ تعریف مفردات | تحریر مفردات اس کو کہتے ہیں جو حروف تہجی اپنے اصلی اختراع کے موافق ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ کتابت میں آجائیں، مثلاً صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ نصیحت والے قرآن کی قسم، دیکھو سورۂ ص نمبر ۳۸ نمبر آیۃ ۱/۲۳، یہاں ص مفرد اور باقی الفاظ مرکب لکھے جاتے ہیں۔

۱۹ تعریف مرکبات | تحریر مرکبات اس کو کہتے ہیں جو حروف تہجی ایک دوسرے سے بمقتضائے مقام ملاکر لکھے جائیں مثلاً دیکھو

مثال دفعہ ۱۸۔

۲۰۔ عدم مرکبات | الفاظ بذریعہ مرکبات کے بغرض کفایت وقت لکھے جاتے ہیں، مبتدیوں کے واسطے مفردات لکھکر اعراب دینا باعث سہولت ہوتا ہے، لیکن فی زمانا یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا، مثلاً آیہ مذکور الصدر اگر بحروف مفردات تحریر کریں تو حسب ذیل قلمبند ہوگی، اور مبتدیوں کو اس کی تہجی اور قرأت میں سہولت ہوگی۔

نَ سَ ذَ ال کَ ذُ انِ ذِ ی الْ ذ بِّ کُ دِ ۂ

توضیح۔ جب لام کے تحت میں نقطہ ہو، تو اس سے مقصود صفر ہے، یعنی لام ساکت ہے، مثلاً حروف قمری میں الف لام جیسے لام قرأت میں آتا ہے، حروف شمسی میں، وہ ساکت رہتا ہے، دیکھو بحث الف لام۔

۲۱۔ تقسیم مرکبات | تحریر مرکبات کے حسب ذیل پانچ ۵ اقسام ہیں۔
(۱) نسخ (۲) نستعلیق (۳) گلزار رَیحان (۴) طغرا (۵) شکستہ۔ دیوان

۲۲۔ تعریف نسخ | کلام عرب میں نسخ بمعنی تحریر ہے، اور نسخہ بھی اس ہی سے مشتق ہے، اور نُسَخ اسکی جمع ہے۔ مثلاً یہ قول خداوندی "کِتَابُنَا یَنْطِقُ عَلَیْکُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ" یہ ہماری کتاب ہے، تمہارے مقابلہ میں حق بول رہی ہے، تم جو کرتے ہو، ہم انکو لکھواتے جاتے ہیں، دیکھو سورہ جاثیہ نمبر ۴۵ نمبر آیۃ ۲۸/۵۰۴ خط نسخ کی شباہت حسب ذیل ہے۔

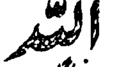
بـ۱۔ ا ب ج د د۔
بـ۲۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

۲۳۔ ایجاد نسخ | خط نستعلیق عموماً فارس میں مستعمل ہوتا تھا عرب نے عبارت عربی کو ممیز کرنے کے واسطے خط نسخ میں لکھنا شروع کیا، تاکہ تحریر فارسی اور عربی میں محض بربنائے مشابہت اشتباہ نہ ہو سکے۔

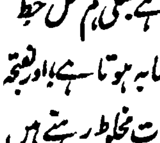
۲۴۔ تعریف نستعلیق | نستعلیق، الفاظ، نسخ و تعلیق سے مرکب ہے، نسخ بمعنی لکھنے، اور تعلیق بمعنی لٹکانے کے ہے، مراد اس سے سنبھال کر لکھنا ہے، خطِ نسخ میں اسقدر نوک اور پلک نہیں ہوتی ہیں جس قدر خطِ نستعلیق میں ہوتی ہیں۔ اور اس ہی وجہ سے نستعلیق لکھنے میں بہ نسبت خطِ نسخ کے زیادہ دیر لگتی ہے، خطِ نستعلیق کی شباہت حسب ذیل ہے:۔

بـ۱۔ ا ب ج د ر۔
بـ۲۔ خدایا جہاں پادشاہی تراست ز ما خدمت آید خدائی تراست

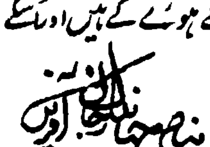
۲۵۔ خط گلزار | خط خواہ نسخ ہو یا نستعلیق، جب اس میں بیل بوٹے بھر دیئے جائیں، تو اس کو خطِ گلزار کہتے ہیں، گلزار بمعنی پھولوں کی جگہ کے ہے، یہ لفظ فارسی، عربی میں لفظ ریحان بمعنی بالنگو کے ہے۔ اور جس خط میں پھول اور بوٹے درج کئے جائیں اسکو خط ریحان کہتے ہیں۔


خط گلزار

۲۶۔ خط طغرا | طغرا بالضمہ طا ایک پرند کا نام ہے جسکی ہم شکل خط طغرا لکھا جاتا ہے، اور یہ عموماً پروں کے مشابہ ہوتا ہے، اور بعض طار بمعنی مخلوط ہے، چونکہ اس خط میں بھی حروف کلمات مخلوط رہتے ہیں اس ہی وجہ سے اسکو طغرا کہتے ہیں، یہ ایک پیچیدہ خط ہے، جسکو سلاطین اکثر اپنے فرامین میں استعمال کرتے ہیں، سلطان روم اور امیر کابل اپنے فرامین اور سکک میں ابتک استعمال کرتے ہیں۔


خط طغرا

۲۷۔ خط شکستہ | خط شکستہ اکثر دفاتر میں مستعمل ہے، اور محررین اسکو بوجہ تعجیل کام میں لائے ہیں، شکستہ بمعنی ٹوٹے ہوئے کے ہیں اور اسکے حروف اسطرح ٹوٹے ہوتے ہیں کہ بلا مہارت کامل کے اُن کا پڑھنا دشوار ہوتا ہے۔


خط شکستہ

۲۸۔ تقسیم بلحاظ معنی لفظ | چونکہ بعض الفاظ واضع کی

طرف سے معانی کے لیئے موضوع ہوتے ہیں، اور بعض بلا وضع واضع، اور بلا معنی ہوا کرتے ہیں، اس لیئے لفظ کے بلحاظ معنی حسب ذیل دو اقسام قرار دیئے گئے۔ (۱) موضوع۔ (۲) مہمل

۲۹۔ تعریف لفظ موضوع | لفظ موضوع اس کو کہتے ہیں جو کسی خاص معنی کے لئے وضع کیا گیا ہو۔ مثلاً رَبٌّ۔ باعتبار وضع لغوی بمعنی پروردگار مستعمل ہے۔

۳۰۔ تعریف مہمل | لفظ مہمل اس کو کہتے ہیں جو واضع سے کسی معنی کے لئے موضوع نہ ہو۔ مثلاً روٹی ووٹی، یہاں ووٹی تابع مہمل لفظ روٹی کا ہے، ورنہ لفظ ووٹی کے بنفسہٖ کچھ معنی نہیں ہیں، اس قسم کے توابع مہمل اکثر زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔

۳۱۔ تقسیم لفظ موضوع | لفظ موضوع کلمہ اور کلام دونوں پر حاوی ہے، بنظر استعمال فصاحت بھی دونوں میں پائی جاتی ہے، لہٰذا اسکی تقسیم حسب ذیل دو اقسام پر کی گئی ہے۔

(۱) فصاحت کلمہ۔ (۲) فصاحت کلام۔

۳۲۔ تعریف فصاحت کلمہ | فصاحت کلمہ اس کو کہتے ہیں جس میں تنافر حروف اور غرابت و مخالفت قیاس لغوی نہو، مثلاً اللہ۔

۳۳۔ تعریف فصاحت کلام | فصاحت کلام اس کو کہتے ہیں جسمیں تنافر کلمات اور ضعف تالیف اور تعقید نہو مثلاً اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا۔ بیشک یہ لوگ بھی داؤ چل رہے ہیں، اور ہم بھی داؤ چل رہے ہیں۔ دیکھو سورۂ طارق نمبر ۸۶ نمبر آیۃ ۱۵ و ۱۶

۳۴۔ تقسیم فصاحت کلمہ | فصاحت کلمہ حسب ذیل دو علوم کو متناول ہے۔ (۱) علم لغت (۲) علم صرف۔

۳۵۔ تعریف علم لغت | علم لغت اس کو کہتے ہیں جس میں لفظ کے جوہر اور مادہ سے بحث کی جاتی ہو۔ مثلاً دیکھو دفعہ ۲۹

۳۶۔ تعریف علم صرف | علم صرف اس کو کہتے ہیں جس میں ہیئت لفظ سے بحث کی جاتی ہو، مثلاً يَضْرِبُ فعل معروف میں 'ی' مفتوح اور 'ض' ساکن، اور 'رِ' مکسور اور 'بُ' مضموم ہونا چاہیئے۔

۳۷۔ تقسیم لغت | بلحاظ تجویز عقلی لغت میں حسب ذیل دو اقسام کی گنجائش ہے۔ (۱) جامد (۲) مشتق۔

۳۸۔ تعریف جامد | جامد اس لفظ موضوع کو کہتے ہیں جو نہ کسی لفظ سے مشتق ہو، اور نہ اُس سے کوئی لفظ مشتق ہو مثلاً رَجُلٌ = مرد۔

۳۹۔ تعریف مشتق | مشتق اس لفظ موضوع کو کہتے ہیں جس سے مختلف صیغے بن سکتے ہوں۔ مثلاً قول بمعنی کہنے کے ہے، اور قائل اور مقولہ اسی سے مشتق ہیں۔

۴۰۔ تقسیم مشتق | مشتق کا دیئے دائرہ قائل اور مقولہ کو اپنا مرکز قرار دے کر لسان واحد کیا بلکہ تطابق اَلسنہ پر جا کر محیط ہو جاتا ہے :۔ تماثیل

پ۔ یَاهُوْ اولیاء اللہ کے نزدیک اسماء اللہ میں سے ہے، عبرانی میں بھی یہ اللہ کا نام ہے، اور وہ اس وجہ سے کہ یہود میں اللہ کا نام لینا خلاف ادب خیال کیا جاتا تھا، بجائے اُس کے 'یَاهُوْ' استعمال کیا کرتے تھے، توریت میں اُس کو جَهُوْدَا۔ یَاهُوْ سے تعبیر کیا ہے، 'جَ' کا 'ی' سے تبادلہ علم تطابق اَلسنہ سے واضح ہوتا ہے، مثلاً اجودھیا = ایودھیا، جوگ = یوگ، 'ی' حرفِ علت ہے، جب اسکو واضح کرنا ہوتا ہے، تو 'ج' سے بدل دیتے ہیں، اللہ کو منادی کرنے میں بوجہ کثرت استعمال یَاهُوْ عبرانی میں نام الٰہی ہو گیا ہے، انگریزی میں جہوداً (Jehovah) کہتے ہیں۔

پ۔ 'مَا' یا 'اُمّا' کو فارسی میں 'مادر' اور انگریزی میں 'مدر' اور 'ماما' کہتے ہیں، اور سنسکرت میں 'ماتا'، اور عربی میں 'اُمّ' کہتے ہیں۔ یہ تمام الفاظ، ایرانی اور شامی زبانوں کے

مادہ واحدسے ہیں کیونکہ مواد بعد ولادت شفیتین سے اپنی والدہ کو ماں ماں پکار سکتا ہے۔ لہٰذا اصطلاحات مذکورالصدر السنۂ مختلفہ میں قریب المخرج ہیں۔ اور یہ مسئلہ علم تطابق السنۂ ت السانی میں ہوتا ہے۔

۴۱۔ تقسیم صرف | علم صرف میں حسب ذیل دو امور سے بحث کی جاتی ہے (۱) صیغہ (۲) خواص باب۔

۴۲۔ تعریف صیغہ | صیغہ اس ہیئت کو کہتے ہیں جو ترکیب حروف اور حرکات سے حاصل ہو۔ مثلاً فتح اور تفتیح۔ فتح بمعنی کھولنے اور کشادہ کرنے کے ہیں۔

۴۳۔ تعریف خواص | اصطلاحات کے خاص ابواب میں جانے سے معنی مخصوص پیدا ہوتے ہیں۔ کون صیغہ کس باب میں جاتا ہے۔ جاکر کیا معنی پیدا کرے گا۔ یہ ہر زبان کے محاورہ پر منحصر ہے۔ مثلاً مفلس کے لفظی معنے متمول اور پیسہ رکھنے والے کے ہیں۔ لیکن باب افعال کا خاصہ بعض صیغوں میں سلب شے کا ہے۔ اس وجہ سے مفلس وہ شخص ہے جسکے پاس پیسے نہ رہے ہوں۔

۴۴۔ تقسیم فصاحت کلام | حصر عقلی سے فصاحت کلام حسب ذیل تین اقسام میں منحصر ہے۔ (۱) بلاغت (۲) ترتیب (۳) وزن کلام۔

۴۵۔ تعریف بلاغت | بلاغت کے لغوی معنی پہنچنے کے ہیں۔ اور اصطلاح میں اُس علم کو کہتے ہیں جس میں کلام کے مقتضائے حال سے تطبیق اور اس کے وضوح دخفار و تحسین پائی جاتی ہو۔ دیکھو شعر مندرجہ دفعہ ۸۔

۴۶۔ تعریف ترتیب | ترتیب کلام سے علم نحو میں بحث کی جاتی ہے اور اسکی تفصیل دفعہ ۳۵ میں درج ہے۔

۴۷۔ تعریف وزن کلام | وزن کلام اس کو کہتے ہیں جس میں کلام کے موزوں ہونے سے بحث کی جاتی ہو۔ اسکی تفصیل علم عروض اور قافیہ کی بحث میں بدفعات ۵۴ تا ۸۵ درج ہے۔

۴۸۔ تقسیم بلاغت | بلاغت کے حسب ذیل تین اقسام ہیں۔ (۱) معانی (۲) بیان۔ (۳) بدیع۔

۴۹۔ تعریف معانی | علم معانی اُسکو کہتے ہیں جسمیں لفظ مقتضائے حال سے مطابق کیا جاتا ہو۔ مثلاً حسب ذیل التفاتات ثلثہ جو علما علم معانی وعلم بیان وعلم بدیع کے ہاں منجملہ علوم بلاغت کے انواع بلیغ سمجھے جاتے ہیں۔

ت۔ التفات غیبت سے خطاب کی طرف مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ .... اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۔ ہر طرح کی تعریف اللہ کو ہے .... ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ دیکھو سورۂ فاتحہ نمبر ۱ نمبر آیہ ۱ و ۵۔

ت۔ التفات خطاب سے غیبت کی طرف مثلاً هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ الخ ۔ اللہ وہ ہی ذات ہے، جو تم کو خشکی اور تری میں لئے پھرتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو، اور وہ سواران کشتی کو باد موافق کے ذریعہ سے لیکر چلتی ہیں۔ اور وہ اُس سے خوش ہوتے ہیں۔ یکایک کشتی کو ایک ہوا کا جھونکا آلگتا ہے الخ۔ دیکھو سورۂ یونس نمبر ۱۰ نمبر آیہ $\frac{22}{1389}$ ۔

ت۔ التفات غیبت سے تکلم کی طرف مثلاً وَاللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط کَذٰلِکَ النُّشُوْرُ ۔ اور اللہ وہی ذات ہے، جو ہوائیں چلاتا ہے۔ پھر ہوائیں بادل کو ابھارتی ہیں۔ پھر ہم بادل کو مُردہ شہر کی طرف ہانک دیتے ہیں۔ پھر ہم اُس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرے پیچھے زندہ کر دیتے ہیں۔ اس ہی طرح مُردوں کا اُٹھنا بھی ہوگا۔ دیکھ

سورۂ فاطر نمبر ۳۵ نمبر آیة $\frac{۱}{۳۳، ۳۲، ۳۳}$ -

۵۰- تطبیق مثال | مثال اوّل میں مقتضائے حال، سلسلہ قائم رکھنا چاہیے تھا؛ یعنے جیسا کہ ابتدائے فاتحہ بلا خطاب ہے اُس ہی طرح بیان مابعد بلا خطاب ہونا تھا - جائز تھا کہ بجائے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ، اِیَّاہُ نَعۡبُدُ اور بجائے اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ، اِیَّاہُ نَسۡتَعِیۡنُ - ہوتا؛ لیکن بلحاظ قواعدِ بلاغت جن فوائد کا یہ خلافِ مقتضائے حال فقرہ، مخزن تھا، سچ تو یہ ہے کہ اِیَّاہُ نَعۡبُدُ ان سے یک لخت بے بہرہ تھا؛ دیکھو کتب علم معانی؛ علم معانی کا یہی فرض ہے کہ بجز بے پایان کتاب سماوی کے اس قسم دُرِ ناسفتہ فوائد سے ہمارے روحانی افلاس کو دور کرے؛ علیٰ ہذا القیاس دیکھو مثال ثانی و ثالث المتفاتات آخر الذکر۔

۵۱- علم بیان | علم بیان اس کو کہتے ہیں جسمیں کلام کے وضوح وخفا معنی میں مختلف تعبیرات سے بحث کی جاتی ہو؛ یہی اعتبارات ہیں جن کی وجہ سے کلام میں بلاغت کا حسن ذاتی پیدا ہوجاتا ہے؛ مثلاً یہ قول خدا، وَیُطَافُ عَلَیۡهِمۡ بِاٰنِیَةٍ مِّنۡ فِضَّةٍ وَّاَکۡوَابٍ کَانَتۡ قَوَارِیۡرَا۠ قَوَارِیۡرَا۠ مِنۡ فِضَّةٍ قَدَّرُوۡهَا تَقۡدِیۡرًا - اور بہشتیوں پر چاندی کے باسنوں اور شیشے کے آبخوروں کا دور چل رہا ہوگا؛ مگر شیشے ایسے ہوں گے جیسے چاندی کے؛ دیکھو سورۂ دہر نمبر ۷۶ نمبر آیة $\frac{۱۵}{۵۹۱۵}$ و $\frac{۱۶}{۵۹۱۱}$؛ واضح رہے کہ شیشہ کو چاندی کا کہنا محض مقصود اسکی صفائی اور قیمتی ہونا ہے۔

۵۲ تعریف بدیع | بدیع کے لغوی معنی نادر اور عجیب کے ہیں۔ اور اصطلاح میں اس علم کو کہتے ہیں جسمیں کلام کی تزئین اور تحسین اور اُس کے معنی واحد میں صُوَرِ متقابلہ کے جمع ہونے سے بحث کی جاتی ہو۔

تمثیلاً ست- ت - صِبۡغَةَ اللّٰهِ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً وَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ = ہم خدا کے رنگ میں ہیں؛ اور اس سے رنگ میں کون اچھا ہوسکتا ہے؛ اور ہم اُس ہی کی عبادت کرتے ہیں؛ دیکھو سورۂ بقر نمبر ۲ نمبر آیة $\frac{۱۳۸}{۱۴۵}$؛ ب- ۹

بدی را بدی سہل باشد جزا　　اگر مردی اَحۡسِنۡ اِلٰی مَنۡ اَسَاءَ

دیکھو بوستان مصنفۂ شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ان امثلہ میں وہ الفاظ مذکور ہیں، جو اُن کے غیر کے واسطے موضوع ہیں؛ مثلاً رنگ خدا کا نہیں، مگر اپنے واسطے مستعمل کیا ہے؛ یا مثلاً برائی کے انتقام کو بدی سے تعبیر کیا ہے؛ ان دونوں امثلہ میں مشاکلہ محضہ مستعمل ہے -

۵۳- تعریف نحو | علم نحو اُس کو کہتے ہیں جس میں الفاظ کلام کے باہمی تعلقات سے بحث کی جاتی ہے؛ زبان عربی میں چونکہ آخر کلمہ کے اعراب کی بحث بھی ضرور ہوتی ہے وہ اکثر تعلقات الفاظ پر منحصر ہوتی ہے، لہذا اس کا ذکر بھی اس ہی علم میں کیا جاتا ہے؛ مثلاً تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَهَبٍ - ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے؛ یعنی ہلاک ہوگیا؛ دیکھو سورہ ابولہب نمبر ۱۱۱ نمبر آیة $\frac{۱}{۶۲۲۰}$، تَبَّتۡ فعل ہے، اور یَدَا، اصل میں یَدَانِ تھا؛ لیکن بوجہ مضاف ہونے کے نون اعرابی ساقط ہوگیا؛ ابولہب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا، لیکن مشرف باسلام نہیں ہوا - اور وہ اور اُس کی بیوی رسول خدا کو اذیت پہنچاتے تھے؛ اُن کے واسطے یہ سورۃ بطور بددعا کے ہے؛ ابولہب کنیت ہے، نام اُس کا عبدالعزیٰ ہے؛ حالت رفع میں ابولہب اور حالت جرّی میں ابی لہب کہتے ہیں؛ ابی لہب مضاف مضاف الیہ ملکے کنیت مضاف الیہ ہے، یدا، کا، اور یدا، ابی لہب، مضاف مضاف الیہ ملکر فاعل ہے، فعل تبت، کا؛ فعل ساتھ فاعل کے ملکر جملہ فعلیہ ہے اور یہ جملہ فعلیہ دعائیہ ہے؛

اس سے واضح ہے کہ یہ جملہ انشائیہ ہے نہ خبریہ ۔ اس قسم کے مباحث سب علم نحو سے متعلق ہیں ۔

۵۴ ۔ تعریف عروض | علم عروض اسکو کہتے ہیں جس میں الفاظ کے وزن سے بحث کی جاتی ہے ۔ مثلاً یہ قول خدا عروض کے بحر وافر میں ہے ۔

وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ

خدا انکو رسوا کرے ۔ اور تم کو ان پر غلبہ دے ۔ اور مومنین کے سینوں کو تشفی دے ۔ دیکھو سورہ توبہ نمبر ۹ نمبر آیۃ $\frac{14}{148}$ ۔

۵۵ ۔ بحر آیۃ | آیۃ کریمہ مذکورۃ الصدر کی بحر حسب ذیل ہے ۔

(۱) ۔ مَفَاعِيْلُنْ مَفَاعِلَتُنْ فَعُوْلُنْ
مَفَاعِيْلُنْ مَفَاعِيْلُنْ فَعُوْلُنْ

۵۶ ۔ تقطیع آیۃ | تقطیع آیۃ کریمہ مندرجہ دفعہ ۵۴ حسب ذیل ہے ۔

وَيُخْزِ هِمْ	وَيَنْصُرْ كُمْ	عَلَيْهِمْ
مَفَاعِيْلُنْ	مَفَاعِلَتُنْ	فَعُوْلُنْ
وَيَشْفِ صُدُوْ	رَقَوْمٍ مُّوْ	مِنِيْنَ
مَفَاعِيْلُنْ	مَفَاعِيْلُنْ	فَعُوْلُنْ

۵۷ ۔ ہدایت | جائز نہیں ہے کہ آیۃ کریمہ دفعہ ۵۴ بطور راگ کے پڑھی جائے بعض آیات قرآن مجید موزوں ہیں ۔ لیکن اُن کی تلاوت خوش الحانی سے کرنا جائز ہے ۔ بطور شعر اُنکو نہ پڑھنا چاہئے ، جب کلام موزوں ہو تو اس کو اصطلاح میں نظم کہتے ہیں ۔ اور جب غیر موزوں ہو تو اُس کو نثر کہتے ہیں ۔

۵۸ ۔ تعریف قافیہ | قافیہ وہ علم ہے ، جس میں آخر کلام کے موزوں ہونے سے بحث کیجاتی ہو مثلاً ؎

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ كَمَا
أُمِرْتَ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ
وَلِنْ فِي الْكَلَامِ لِكُلِّ الْأَنَامِ
فَمُسْتَحْسَنٌ مِنْ ذَوِي الْجَاهِ لِيْنَ

معافی کا شیوہ اختیار کر ، اور حسب الامر اچھے کام کی نسبت فرمائش کرتا رہ ۔ اور جُہال سے اعراض کر ۔ اور بات چیت میں سب سے نرمی سے پیش آ ۔ کیونکہ صاحب مرتبہ کو نرمی پسندیدہ ہے ۔

محمد نظام الدین حسن

قران السعدین ۔ اس کتاب کے مصنف حیدر آباد دکن کے ایک مشہور ہندو ، راجہ راجیشور راؤ صاحب اصغر ہیں ۔ راجہ صاحب موصوف ایک علمدوست شخص اور زبان اُردو کے زبردست حامیوں میں سے ہیں ، اور متعدد علمی کتابوں کے مصنف و مؤلف بھی ہیں ۔ ہر ایک زبان میں عموماً اور اُردو میں خصوصاً اشیاء و اسماء کی تذکیر و تانیث کا مسئلہ نہایت مشکل ہے ۔ ایک ایسے وسیع اور مخلوط النسان برّاعظم میں جیسا کہ ہندوستان ہے ، تذکیر و تانیث کے متعلق ذوق ہونا ، اور غلطیوں کا پھیلنا قدرتی بات ہے ۔ راجہ صاحب ممدوح نے اس کتاب کی تصنیف و تالیف میں زبان اُردو کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور کچھ شک نہیں کہ مستند و مسلّم الثبوت ادیبوں اور شاعروں کے کلام سے نظائر و امثال تلاش کرنے ، اور اس کتاب کو ترتیب دینے میں ، راجہ صاحب نے بہت کچھ محنت و عرق ریزی سے کام لیا ہے ۔ آپ اس کتاب کی تدوین کے لئے خاص طور پر پبلک کے شکریہ کے مستحق ہیں ۔ کتاب کی مجموعی ضخامت ۴۴ صفحات ہے اور قیمت عسہ بنا لقین قابل مصنف سے حیدر آباد (دکن) کے پتہ پر طلب فرمائیں ۔





تمدّن

معاشرت، سیاست اور مذہب

بجملہ کائنات میں سب سے اہم وہ شے ہے جو تمام موجودات میں مشترک ہے، اور وہ کسی کے نزدیک وجود مطلق یا روح ہے، کسی کا خیال جو ہر و قوت کا طرفدار ہے، اور کوئی مادّہ کا نام لیتا ہے۔ بہرصورت یہ امر مسلم ہے کہ ایک خاص چیز دنیا کی ہر چیز میں نہاں ہے۔ لیکن مخلوقات کے اقسام اگر علیحدہ علیحدہ کر دیے جائیں، تو ہر نوع میں کئی چیزیں مشترک ملیں گی۔ مثلاً انسان میں علاوہ اُس خاص شے کے کئی چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جو سب انسانوں میں موجود ہیں منجملہ اُن کے تمام بنی آدم کے اجزاء ترکیبی وہی ہیں جو ایک انسان کے مگران اجزاء کی کمی و بیشی کیوجہ سے یہ متحد الحقیقت ذات اسقدر مختلف الاوصاف ہوگئی ہے کہ آدم اوّل سے اسوقت تک جتنے افراد گزرے ہیں انہیں سے کوئی دو فرد بھی ایسے نہیں ملتے جو آپس میں ہر طرح یکساں ہوں۔

اس اختلاف کا سبب، اجزاء ترکیبی کی کمی بیشی اور اس اتحاد کا باعث، اجزاء ترکیبی کا وجود ذاتی، پیش نظر رکھ کے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس اتحاد حقیقی و ذاتی اور اس اختلاف فطری و صفاتی کے درمیان کیسے تعلقات ہیں، اور دونوں سے فرداً فرداً کیا کیا منافع ہیں۔

اگر انسان متحد الحقیقت نہوتا تو اُسکا وجود یا اس میں روح یا مادّہ یا قوت ایجابی و سلبی یا زندگی یا جان نہ ہوتی، کیونکہ جس شے نے انسان کو متحد رکھا ہے وہ تمام اشیاء میں اہم ہے۔ (اگرچہ وہ شے جو نوع انسان میں متحد ہے دوسری چیزوں میں بھی ہو، مگر اسوقت ہم کو سوائے انسان کے اور کسی سے بحث نہیں۔)

اس لحاظ سے مادۂ اتحاد انسان میں مقدم قوی تر اور علت وجود ہے۔

اس کے مقابل میں انسان کی صفت اختلاقی اگر نہوتی تو کم از کم انسان انسانیت سے خارج ہوتا۔ تمام موجودات یعنی موالید ثلاثہ میں نوع انسان کو جو خاص امتیاز حاصل ہے اس کا دار و مدار اسی اختلاف صفاتی پر ہے ورنہ باعتبار ذات سب متحد ہیں خواہ نباتات ہوں یا جمادات۔

کم و بیش اختلاف کا سامان ہر ذرّہ میں موجود ہے مگر اختلافات کی کثرت و عظمت جس شدت سے انسان میں ہے وہ کسی نوع میں نہیں۔ اگر انسان کے ہر فرد کو ایک خاص امتیاز نہوتا تو بہت سے نقصانات ہوتے جو ضرورت ایک شخص کو ہوتی وہ سب کو ہوتی اور جب وہ ضرورت قالبضانہ ہوتی تو سب متصادم ہو جاتے۔ صفات انسانی تو در کنار ذات انسان کا وجود نہ رہتا۔ اگر صورت ہی میں اختلاف نہوتا تو کوئی تعیّن یا کاروبار آپس میں نہو سکتا جیسا کہ حیوانات مطلق میں ہے۔

یہ دونوں اتحاد اور اختلاف فطری ہیں۔ گو اوّل الذکر مقدّم اور قوی ہو مگر جب یہ دونوں اپنی ظرف سے کچھ آگے بڑھتے ہیں تو طرح طرح کے نقصانات کا احتمال ہوتا ہے۔

ان دونوں کی ترقی، تنزلی بھی انھیں دونوں کی مختلف نسبتوں سے واقع ہوتی ہے۔ اختلافات صفاتی کی وجہ سے ہر انسان کا سب لوگوں سے یکساں تعلق نہیں ہے، ہر شخص پر ہر ایک کا وہ اثر نہیں جو دوسرے کا اور دوسرے پر نہیں۔ اس لئے بعض کا اتحاد بعض کے ساتھ ترقی کرکے اسدرجہ پر ہوجاتا ہے کہ اُسکا نام محبّت یا عشق رکھنا پڑا، اور جب وہ اوسط درجہ میں ہوتا ہے تو ہمدردی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، مگر جب یہ اثر اسکے برعکس ہوتا ہے تو اول نفرت پھر عداوت ہوجاتی ہے۔

اس اتحاد و اختلاف کے جزر و مد نے اتنی تعداد اور اس قدر مقدار کے نامتناہی سلسلہ پیدا کردئے ہیں کہ ہر انسان بجائے خود ایک دنیا ہے اور دنیا بھی وہ جو دوسرے عوالم سے متعلق اور ہم معاملہ۔

اِن اختلافات کے اقسام اور ان کے نام تو قلمبند کرنا محال ہے مگر اختلافات کے مخزن اور معدن یہ ہیں۔

طبایع، کیفیات، حالات امزجہ، خیالات، مقاصد، ضروریات، واقعات، رفتار، گفتار، اشکال، تاثیرات، ان سب امور میں سے ہر ایک امر اختلافات کا ایک وسیع اور گنجان جنگل ہے۔ جبتک یہ اختلافات فطرت کے دائرہ میں رہیں اسوقت تک کوئی ذاتی یا صفاتی نقصان متصور نہیں، مگر جب اپنے فطری حدود سے تصنعات کی طرف بڑھیں اور ترقی پذیر ہوں تو وہی نقصانات پیدا ہوں گے جو اتحاد ذاتی اور اختلاف صفاتی کی عدم موجودگی میں ہو سکتے ہیں۔ ان نقصانات کی اصلاح اور انسداد کے لئے وہی شے کافی ہوسکتی تھی جو مثل اختلاف صفاتی کے فطری ہو، بلکہ اُس سے مقدم اور قوی تر تاکہ اُسپر غالب آسکے۔

حکمت صناعی نے اِس اختلافی فطرت کا مدّمقابل اتحادی حقیقت کو پہلے ہی سے تجویز کرلیا تھا اور درحقیقت یہ تجویز بڑی حکیمانہ تھی کہ اتحاد حقیقی ذاتی کو اختلاف صفاتی پر مقدم رکھا اور قوت بھی اُسی میں زیادہ رکھی اور یہ تقدیم و ترجیح ایسی ہی ہے جیسی ذات کو صفت پر۔

جب دنیا کی کمسنی تھی اسوقت تو ان اختلافات نے پاؤں نہیں پھیلائے، مگر جب آدمیوں کے ساتھ ساتھ ضروریات بھی بڑھتے گئے تو ہر خطہ کے روشن خیال لوگوں کو یہ فکر ہوئی کہ ہم اپنے آپ کو مع اپنے سامان کے (جو اسوقت نہایت ہی ضروری اور قلیل تھے) محفوظ رکھیں، اور یہ اپنی حفاظت اُسیوقت ممکن تھی جب علاوہ اور انتظامات کے اپنے ہموطنوں کی بھی حفاظت کا خیال رکھا جاتا، کیونکہ کوئی بندوبست ایسا کافی نہیں ہوسکتا تھا کہ اگر اس کے ہموطن اُسے برباد کردینا چاہیں جب بھی وہ محفوظ رہے۔ لامحالہ یہ اصول قرار دینا پڑا کہ "دوسروں کو نقصان نہ پہنچاؤ، تا خود بھی نقصان نہ اٹھاؤ گے"۔ اس فطری اور ذہنی عہدنامہ کے ساتھ ہی ساتھ حفاظت کے انتظامات بھی اپنی اپنی حیثیت کے موافق کئے گئے۔ اور امتداد زمانہ نے اونکو ترقی دیکر مکمل کرنا شروع کیا۔ پہلے قناتوں پر قناعت کرتے تھے اب مٹی یا پتھر کی چاردیواری بننے لگی، پہلے سایہ دار درختوں پر اکتفا تھی اب چھت پٹنے لگی، پہلے کوئی قیامگاہ معیّن نہ تھا، آج سلسلۂ کوہ میں ہیں تو کل کف دست میدان میں۔ اب اپنے رہنے اور اپنے سامان زندگی رکھنے کے لئے ایک محفوظ احاطہ ہوگیا، اسی کا نام **تمدن** رکھا گیا۔

دنیا کی مجموعی حالت پر ایک سرسری مگر جامع نگاہ ڈالنے سے یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ جہاں انسان کی ضرورتیں روز بروز بڑھتی گئیں وہاں اسکو اپنی ضرورتوں میں انہماک بھی بڑھتا گیا، اور

اس انہماک و ترقی ضروریات نے یہ سب چیزیں ایجاد
رادیں، جو آج دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ پہلے انسان برہنہ رہتا
تھا۔ پھر پتوں کا لباس۔ پھر کپڑے کا۔ اب اتنی وضعیں اور پارچے
ہو گئے کہ اگر ہر شخص ایک نیا کپڑا پہنے تو اقسام پارچہ و لباس ضرور
کافی ہوں گے۔

اوائل میں خود رو پھلوں اور کونپلوں پر گزر تھی یا شکار
کے کچے پکے گوشت سے پیٹ بھر لیا جاتا تھا۔ اب کھانوں کی
اتنی قسمیں ہو گئیں کہ شمار نہیں۔ ابتدا میں صرف چھ ضرورتیں
تھیں مگر جب انکی تعداد بڑھنے لگی تو اوسیطرح جس طرح تمدن میں
دوسروں کا تعلق لازمی تھا ان معاملات میں بھی ابنائے جنس
سے کام پڑا۔ اوّل اوّل ایک خاندان کے لوگ آپس میں مل جل کر
رہنے لگے۔ سب کا باورچیخانہ اور خوابگاہ ایک ہی احاطہ میں،
پھر اہل ہمسایہ سے تعلقات پیدا ہوئے۔ بعد اس کے سوسائٹیاں
قایم ہونے لگیں، اور آپس میں ایک دوسرے کی شرکت و اعانت
سے عیش و عشرت کرنے لگے۔ اس برتاؤ کا نام **معاشرت** رکھا
گیا۔ یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اتحاد و اختلاف اور ان دونوں کی فطری
نسبتوں اور حقیقی ضرورتوں نے تمدن و معاشرت کی بنیاد ڈالی اسلئے
تمدن و معاشرت بھی فطری ہوئے اور قانون قدرت و اصول
فطرت میں تمدن و معاشرت کا وہ مرتبہ ہے جو انسان میں
اخلاط یا عناصر کا۔ اگر معاشرت کسی قوم سے اُٹھا لیجائے تو وہ
انسانیت کے دائرہ سے باہر ہو جائے، اور اگر تمدن رفع
ہو جائے تو بربادی اور فنا ہر وقت اسکی تاک میں رہے۔ ہر ایک
شے کی ضد ایک ہوتی ہے، تمدن اسقدر وسیع اور اہم شے
ہے کہ اسکی ضد میں چند در چند الفاظ کا ایک پورا جملہ آسکتا ہے۔ یعنی
تمدن کی ضد میں وحشیانہ آزادی اور خانہ بدوشی کے مجموعے کو پیش
کر سکتے ہیں۔ علم الانسان میں اصل اصول تمدن ہے اور انسان کو
زندہ و کامیاب رکھنے کے لئے علاوہ تمدن کے اور کوئی باہمی تعلق
نہیں۔ معاشرت اسی تمدنی ترقی کے دوسرے زینے کا نام ہے

جب تمدن کی یہ شان ہے اور اصول فطرت قانون قدرت
اور انسانی زندگی کی جان ہے اور اس قدر صاحب حسب و نسب
ہے کہ اُس کے والدین اتحاد ذاتی اور اختلاف صفاتی ہیں تو لازم
ہوا کہ اُس کے برقرار رکھنے کے لئے وہ قوت پیدا کی جائے جسکا
مقابلہ کوئی فرد کیا کوئی گروہ نہ کر سکے، اور اگر کسی وقت میں کوئی
کر سکے تو وہ تمدن ہی ہو۔

اس قوت کا احساس عام طور پر تمام اہل تمدن کو نہیں
ہوا بلکہ ان روشن خیال اہل تمدن کو جو قوم یا ملک کے لیڈر
کہلاتے ہیں اور گو ایسے لیڈر ہر زمانے میں ہوئے بلکہ اب تک
ہیں، مگر قانون قدرت نے جن ضرورتوں سے انکو پیدا کیا تھا انکو
اتنا عرصہ دراز گزرا کہ اب خود معمولی لیڈر بھی اپنی علت آفرینش
کو بھول گئے، اور اسیوجہ سے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوتے۔
اس وقت وہ ضرورتیں نمایاں طور پر تقاضا کر رہی تھیں، اسوجہ
سے ان لیڈروں نے بآسانی یہ تجویز کر لیا کہ تمام اہل تمدن
میں سے ایک یا چند اشخاص ایسے منتخب کئے جائیں جنکو اختلاف
صفاتی نے خاص قوتیں عنایت کی ہوں اور ان قوتوں کے زور پر
مخالفین تمدن پھر اس دائرہ انسانیت میں لائے جائیں اور تمدن
کی بنیاد مضبوط ہو جائے۔ یہ طاقت جو اصول تمدن کو بزور قائم رکھے
حکومت کے نام سے اور اس کی انتظامی طاقت سیاست کے لفظ
سے مشہور ہوئی۔ سیاست کے تفصیلی قواعد مدوّن ہو کر قانون بنے
اور جسطرح حکومت کے بانی روشن دماغ اہل تمدن تھے اُسیطرح
قانون حکومت جنکی مجموعی شرکت و اعانت سے نافذ کیا گیا وہ بھی

اہلِ تمدن ہی کے زور و قوت افراد تھے ان سب کا نام فوج ہو گیا۔

اگرچہ تمدن سے فوج تک کا سلسلہ ایک ہی زمانے یا ایک ہی ملک میں مسلسل اور مرتب نہیں ہوا بلکہ جیسے مصریوں نے حکومت کی بنا کسی زمانہ میں ڈالی اور پھر کسی اور وقت روم و یونان میں قانون مدوّن ہوا مگر تمام دنیا کی ان متفقہ کوششوں اور مختلف ممالک مختلف زمانوں کے لیڈروں کی علو ہمتی اور روشن خیالی نے باوجود کامیابی پورا کام نہیں کیا اور اختلاف صفات کا غالب مقابل نہیں قائم کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو تمام تمدنی ضرورتیں نکلتیں اور تمدن میں ایک دوامی پختگی کا مادہ پیدا ہو جاتا۔

قبل اس کے کہ ہم ان مسائل پر روشنی ڈالیں ہمکو اوّل تمدن کے انقلابات ترقی و تنزلِ اور اس کے اصول و فروع پر ایک تاریخی مگر اجمالی نظر ڈالنا ضرور ہے۔

یورپ کا معمولی تمدن اگرچہ پہلے سے تھا مگر گیارھویں صدی عیسوی سے ترقی پذیر ہوا۔ کیونکہ جنگ صلیبی جو کہ ۱۰۹۶ء سے ۱۲۷۲ء تک رہی، اسکی جنگی تقریب نے استفادہ، معاملت اور معاشرت وغیرہ کے اس قدر سلسلے قائم کر دئے کہ ہزاروں جدید امور تمدن و اصول معاشرت اہلِ یورپ نے اہلِ عرب سے لئے، یہاں تک کہ جسقدر اقسام ترقی تمدن و معاشرت کے ممکن ہیں ان سب پر یورپ کو اہلِ عرب کے ذریعہ سے دسترس ہوئی۔ ان سب کی تفصیل کے لئے ایک کتاب ضخیم چاہئے مگر ثبوت کے واسطے مسیحی مورخوں کا حوالہ کافی ہے۔ رابرٹ، ریمانڈ وازیل، برنارڈ۔ ژاک دی ابن کاتبین شاہزادی قسطنطنیہ، ولیم صوری، وغیرہ نے باتفاق ایسا ہی لکھا ہے۔ آخر الذکر نے جو کچھ رائے ان اہلِ یورپ کی بابت دی ہے قریب قریب اکثر مورخوں نے ایسا ہی لکھا ہے۔ اس لئے سب مورخوں کا بیان ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں، ولیم کے رائے کا آخری فقرہ یہ ہے کہ:-

"ان کی بدفعلیاں اس درجہ خلاف فطرت انسانی ہیں کہ اگر کوئی مورخ انکی تصویر کھینچنا چاہے تو اس بار عظیم کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

اور ڈاکٹر گستاولی بان کا یہ بیان شہادت کے لئے کافی ہے کہ

"ان صلیبی لڑائیوں سے عام یورپ کی تمدنی حالت درست ہو گئی اور تمدنی فائدہ عربوں سے صرف یورپ کو نہیں بلکہ تمام دنیا کو پہنچا۔"

اب یہ ضرورت نہ رہی کہ تمدن میں سب سے آخری نمبر جس کا ہے اس کے لئے ثبوت بہم پہنچائیں مگر قدیم کسکو ہے اسکا پتہ بتانے میں تاریخ اسقدر طویل العمر نہیں۔

ہیرودوطس یونانی سیاح و مورخ جو کہ حضرت عیسٰی سے ۴۸۰ برس پہلے گزرا ہے وہ اپنے قدیم زمانہ کے حالات میں ملک یمن کو تمدنی ترقی کے اُس درجہ پر بتاتا ہے جس کے آگے کوئی اور مرتبہ نہیں اسکی تصدیق مسعودی اور اراتسطین کی شہادت سے بھی ہوتی ہے اور شہر صور کی تعمیر حضرت عیسٰی سے ۱۲ سو برس پہلے ہوئی، جہاں افریقہ اور ہندوستان کی چیزیں آتی تھیں۔ (جو تمدن و معاشرت کی پیدائش کے کئی ہزار برس کے بعد ضرورت سے زیادہ ہونے کے باعث ایجاد ہوئی ہونگی) مثل عطر و خوشبو و مسالے اور سفوف طلا وغیرہ اور حضرت عیسٰی سے ۱۷۵۰ برس پہلے مصر میں ایک بادشاہ سلاطین رائیہ کا حکومت کرتا تھا جو کہ اپنے خاندان کا سترھواں بادشاہ تھا۔

جب تمدن کی کمسنی ہو گی تو کئی ہزار برس کے بعد وہ ایسا تجربہ کار پیر فرتوت ہوا ہو گا کہ شہروں کی بنا پڑے، تمام دنیا کی تجارتی منڈی قرار دیجائے، معاشرت کی تمام ضرورتیں پوری ہونے کے بعد غیر ضروری اشیا (المضاعف) ہوں، اور اسکے استحکام

کے لئے حکومت کی بنا پڑے اور پھر شاہانہ سلسلہ خاندانی چلے یہانتک حضرت عیسٰی سے ساڑھے سترہ سو برس پہلے مصر میں سترھواں بادشاہ تھا۔ ان سب واقعات سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ تاریخ سے تمدن ابتدا کا پتہ لگانا محال ہے۔ گر مذہبی تاریخوں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یمن مصر اور ہندوستان کو تمدن میں تمام ممالک پر سبقت ہے اور از روے قیاس روم و چین کو بھی جگہ دے سکتے ہیں اگر توریت اور وید کے ماننے والے جو دعوی تمدنی اوّلیت کا کریں تو ہم کسی دستاویز سے انکو نہیں جھٹلا سکتے۔

تمام مذہبی اور غیر مذہبی تاریخوں سے عقل و قیاس جو نتیجہ نکالتا ہے وہ یہ ہے کہ طوفان نوح سے پہلے چھوٹے پیمانے پر اور بعد کو بڑے پیمانے پر ہر مرتبہ تمدن نے ترقی کی اور ہر مرتبہ زوال آیا یہ سلسلہ برابر جاری رہا خصوصاً روم، یونان، چین ہندوستان، یمن اور مصر و ایران میں۔ مگر روس انگلستان امریکہ، افریقہ اور فرانس وغیرہ پر وہی ایک مرتبہ ستارہ تمدن نے روشنی ڈالی بلکہ ان میں سے بعض کو تمدنی ترقی کا اعلی درجہ پہلے ہی مرتبہ نصیب ہوا ہے۔ اور یہ گیارھویں ہی صدی عیسوی سے جسکی ضروری تفصیل ہم اوپر کر چکے ہیں، یورپ کی خوش نصیبی نے اسکو اسی زمانہ سے ترقی دینا شروع کی جب سے عربوں کا تمدن زوال آمادہ ہونے لگا اور اب تک نہ انکا عروج نہ انکا زوال کسی مرکز پر ٹھہرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بہرصورت دنیا کے مہذب ممالک میں خدا جانے کتنی مرتبہ تمدن کے باغ میں بہار اور خزاں آئی غالباً اتنی ہی مرتبہ جتنی دفعہ کوئی باغبان پیدا ہوا اور مرگیا جب کسی شہر کا تمدن کمال زوال پر پہنچا تو قدرت نے انہی اصول پر جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں ایک شخص ایسا مبعوث کیا کہ اس نے سنبھالا اور قبل اس کے کہ اختلاف صفاتی کی افراط تفریط نوع انسان کو اُس ملک سے بالکل برباد کردے جہاں اسنے تمدنی اصول بالکل تقویم پارینہ سمجھ لئے ہیں پھر انہی اصول کی تجدید کی اور ترقی شروع ہوئی یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

اب ہمکو صرف یہ دیکھنا ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا تو نہیں ہے جسپر ترقی تہذیب تمدن و معاشرت کا زمانے میں بھی نہ حکومت کے قانون کا زور چلا ہو، نہ معاشرت کی دلچسپی کا جادو۔

امریکہ اور چین کے اصلی باشندے، ہندوستان کے کنجڑا اور عرب و شام و مصر کے بدو تمدنی قیدوں سے ہمیشہ آزاد رہے ان مختلف اقوام کے دماغ میں عموماً اور بدوٗوں کے ذہن میں خصوصاً آزادی کا ایک ایسا مستقل خیال تھا کہ تمدنی پابندیوں کو قید سخت سمجھتے تھے۔ مرصع مطلا مکان انکے نزدیک جڑاؤ پنجرہ تھا اہل تمدن انکے خیال میں غلام ہیں اور ان کی طرز معاشرت کو وہ نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر انھیں دولت عظیم دیکر گھر میں رہنے پر مجبور کیا جائے تو وہ زر و جواہر کو اپنی آزادی کی سب سے بڑی نعمت پر قربان کردیں اور اُسی سلسلہ کوہ یا میدان دشت میں چلے جائیں جہاں اُنکی وہ جائداد جس کو کوئی چُرا نہ سکے یعنی آفتاب کی شعاعیں اور ریت کے ذرّے ہمیشہ کے لئے انھیں کافی ہیں۔ میوہ کے درخت لگانے اور زراعت کرنے کی ترغیب سے وہ ہمیشہ بُرا مانتے رہے۔

پانچہزار برس تک کوئی ان کی آزادی میں فرق نہ لا سکا۔ ممالک عرب پر یونانی رومی مصری عجمی قوموں نے باری باری حکومت کی مگر نہ کبھی اُنھوں نے خراج دیا نہ کوئی اور اثر حکومت کا لیا اور نہ انمیں وہ تبدیلی ہوئی جو حکومت کے بدلنے سے رعایا میں بھی واقع ہوتی ہے۔ عرب کا جو سلسلہ کوہ اُنکا تفریح گاہ تھا

اُس کے دامن میں تین ایسے سرسبز شاداب پائیں باغ سیکڑوں مرتبہ پرُبہار اور خزاں رسیدہ ہوئے مگر انھوں نے تو کیا اُنکے مویشیوں نے بھی اُدھر رُخ نہ لیا انکو متمدن بنانے کے لئے معاشرت کا سبز باغ اور حکومت کی زبردست طاقت کافی نہ تھی انکی تہذیب قلبی فصاحت لسانی، آزاد خیالی پر نہ کوئی اضافہ ہو سکا اور نہ کمی۔

ان بدوؤں کو کم سے کم اتنا تمدن دینے کے لئے کہ وہ فنا ہوجانے سے بچ جائیں علاوہ معاشرت وحکومت کے کسی بے انتہا با اثر قوت کی ضرورت تھی۔ وہ قوت اِدھر انکو انکی استعداد کے موافق اپنا پابند کرتی اور اُدھر بادشاہوں اور مقننوں کو بھی کسی ایسی ہی طاقت کی ضرورت تھی کہ وہ انکی حکومت پر غالب آسکے اور خود ان پر حکومت کرسکے علاوہ ان دو باتوں کے جو لوگ معاشرت کی لذت کو ہیچ سمجھتے ہیں اُن کے دلوں پر ہرگز کوئی قانون حکومت نہیں اثر کرسکتا؛ کیونکہ وہ بادشاہوں کو نفیہ سے بدتر سمجھتے ہیں، اور اہلِ دولت کی کوئی ہستی اُن کے ذہن میں نہیں۔ بہرحال ضرور ایک ایسی قوت کی حاجت تھی جس کے قبضۂ قدرت میں بادشاہ و وزیر بھی اُسیطرح ہوں جسطرح خدمتگار اور ایک بہادر بدمزاج بھی اس حکومت کا ایسا ہی محکوم ہو جیسا ضعیف بیمار بڈھا۔ ایسی قوت جس چیز میں ہے اسی کو مذہب کہتے ہیں یہی مذہب وہ شے ہے جو تمام مذکورۂ بالا ضرورتوں کو پورا کرسکتی ہے اور یہی ایک ایسی طاقت ہے کہ انسان کے اختلاف صفاتی کی بے اعتدالیوں کو رفع کرنے کے لئے اتحاد ذاتی وحقیقی کو اس کے سامنے لاکے کھڑا کرسکتی ہے۔ اور جسقدر مذہبی اصول میں انحطاط ہوگا اُسیقدر تمدنی امور میں۔

تمدن ومعاشرت کے لحاظ سے جس طرح عرب کی سرزمین بمقابلہ ہندوستان وغیرہ کم مایہ ہے اسیطرح اہلِ عرب کے خصائص شجاعت اور جنگ پرستی وغیرہ بھی مخالف تمدن ہیں اور تمام دنیا کے آزادوں میں سب سے زیادہ سخت عرب ہی کے آزاد بدوہیں۔ ان سب وجوہ سے اکثر مذہبی پیشوا یعنی انبیا اسی سرزمین پر مبعوث ہوئے مصر شام اور عرب سے زیادہ دنیا کے کسی مقام پر نبیوں کی بعثت نہیں ہوئی اور روح مذہب کے سب سے بڑے دو خاکی قالب بھی انہی ممالک میں تعمیر ہوئے ایک بیت اللہ دوسرے بیت المقدس۔

جتنی مرتبہ ان ممالک کا تمدن کمالِ زوال پر پہنچا اتنی ہی مرتبہ ایک نبی نے آکے پھر سنبھالا سب سے زیادہ اور سب کے آخر میں پیغمبر اسلامؐ تشریف لائے کیونکہ اسوقت حضرت موسیٰ کا زندہ کیا ہوا تمدن اسقدر مردہ ہوچکا تھا کہ شہری اور غیر شہری باشندوں کے اختلاف صفاتی حد فطرت سے بڑھ گئے تھے عنقریب وہ خاندانی لڑائیاں جو پشتہا پشت تک بلکہ اُس زمانہ تک جبکہ ایک متنفس بھی زندہ رہے چلنے والی تھیں۔ طائف الملوکی نے حکومت کی قدیم مجموعی اور زبردست قوت کو توڑکر اتنا کمزور کردیا تھا کہ وہ بالجبر اصول تمدنی کے برقرار رکھنے کا زور نہ رکھتی تھی۔ مذہب جو سب سے زیادہ قوت باطنی کا مجموعہ ہے اسقدر متغیر اور مسخ ہوگیا تھا کہ بیت اللہ میں ۳۶۰ بت جمع کردئے گئے تھے گویا ایک ہی ملک میں ہر گروہ کا مذہبی مرکز جُدا تھا، اس سے زیادہ ضروری وقت پیغمبر آخرالزماں کے ظہور کا کوئی نہ تھا اور نہ اس ملک کے سوا کسی اور جگہ ایسی شدید ضرورت تھی۔

ناطق لکھنوی

تزکیۂ اخلاق

علم اخلاق دنیا کے ہر ایک مہذب ملک میں پایا جاتا ہے، صرف فرق یہ ہے کہ ماہرین علوم مغربی نے اس فن کو علم فقہ اور مذہب سے علیحدہ کرکے ایک نیا فن قرار دیدیا ہے، برخلاف اس کے علمائے مشرق اسے مذہب اور علم باطن کا جزو ضروری سمجھتے ہیں۔ راقم الحروف کا روئے سخن ان لوگوں سے ہے جو وجود خدا، ہستی روح، اور عالم بالا کے معتقد ہیں ضمناً اسقدر لکھدینا شاید بے ربط نہو کہ ماہرین فلسفۂ اخلاق جو وجود خدا، اور روح کے قائل نہیں ہیں، اور جنھوں نے اپنے فلسفہ کی بنیاد تجربہ اور دیگر اصول پر قایم کی ہے، تزکیۂ اخلاق کی ضرورت اور اہمیت کے متعلق ہمارے ہم آہنگ ہیں، انسانی زندگی کا مآل کار کچھ ہی ہو، بنی نوع انسان کی دنیوی ترقی اور اطمینان کے لئے با اخلاق ہونا ایک لازمی امر ہے۔

ہمارے معاشرتی تعلقات بھی بغیر پابندی اخلاق دشوار ہوجاتے ہیں۔ جہاں تک انسان کی دنیوی فلاح و بہبودی کا تعلق ہے، اسکے لئے علم اخلاق کی پیروی کو مغربی علمائے علم اخلاق ضروری سمجھتے ہیں۔ دین یا عقبیٰ کے وجود اور فرائض سے چونکہ انکو ابھی تک دلچسپی، یا یوں کہئے کہ کافی علم نہیں اس لئے انھوں نے اخلاقی احکام اور ضروریات کو محض دنیا تک محدود رکھا ہے۔ بہرکیف ہمارا منشاء یہ ہے کہ خواہ کسی ملک یا کسی گروہ کا علم اخلاق کیوں نہ ہو، ان میں سے ہر ایک تزکیۂ اخلاق کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے جبکہ دنیا کی بہبودی اور نظام معاشرت کا دارومدار تزکیۂ اخلاق پر ہے، تو روحانی زندگی میں کامیابی کے لئے، ظاہر ہے کہ کس حد تک اُسکی پابندی ضروری اور لازمی ہونی چاہیئے۔

عام طور پر بوجہ لاعلمی یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ علم باطن کی تحصیل محض مرشد کامل کی نظر کیمیا اثر اور فیض روحانی پر منحصر ہے، نہ کہ اپنے مساعی جمیلہ پر۔ ایک حد تک یہ صحیح ہے کہ مرشد کامل کی اعانت بغیر روحانی زندگی کی دشوار گذار راہ آسانی سے طے نہیں ہوتی، مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مرشد کامل صرف اسیوقت سالک پر توجہ کرتا ہے جب کہ اسے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ سے مزین پاتا ہے جب تک ضبط، ریاضت، اور تزکیۂ نفس کے ذریعہ سالک اپنی مستعدی اور شوق دلی کا ثبوت نہیں دیتا، مرشد اگر واقعی میں کامل ہو ہرگز اُسکی جانب متوجہ نہیں ہوتا۔

اس قدر ضروری تمہید کے بعد اس امر کو بخوبی ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ تزکیۂ نفس و اخلاق، روحانی زندگی کا پہلا مقدمہ ہے۔ بغیر اس کے تحصیل علم باطن کا خیال محض ہوس ہے۔

عالم معرفت میں حضرت موسیٰ سے بھی زیادہ عالی ظرف درکار ہے، بقول عرفی ؎

عشق اگر مرد لیست مردے تاب دیدار آورد
ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد و بیمار آورد

جبکہ اخلاق درست نہو، اور نہ نفس پاکیزہ، اسپر رموز و حقایق باطن کا انکشاف بجائے مفید ہونے کے نہایت مہلک اور خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ ایک نااہل شخص کے ہاتھ میں

بندوق یا طپنچہ اگر دیدیا جائے تو بجائے کار آمد ہونے کے اس کے لئے مضرت کا باعث ہوتا ہے جس شخص میں اقادر بھی ذاتی استعداد نہو کہ بذریعہ کوشش بلیغ اپنے ظاہر و باطن عادات اور اخلاق کو درست کر سکے، وہ روحانی زندگی کے مراحل کیسے طے کر سکتا ہے؟ - مرشد کا فرض صرف ہدایت ہے - عمل طالب کا کام ہے - فرض کرو کہ ایک شخص جو نان شبینہ کو محتاج ہو، تمہارے پاس بامید اعانت آکر سائل ہو، تو تم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہو کہ اسکی کچھ کفالت کر دیا جو کچھ ماحضر موجود ہو اُس کے سامنے رکھدو، باقی رہا اس غذا کا کھانا، دانتوں کا چلانا، ہضم کرنا، یہ سب اس شخص گرسنہ کا کام ہے - فرض کرو! کہ مرشد علم معرفت کے کل رموز ایک دم سے تمہیں بتادے، تو کیا تم بغیر ذاتی سعی و محنت عارف ہو سکتے ہو؟ ہرگز نہیں ؎

آن کس است اہل بشارت کہ اشارت داند
نکتہا ہست بسے محرم اسرار کجا ست

تزکیۂ اخلاق کی کوشش یوں تو ہر عاقبت اندیش کو بدل و جان کرنی چاہئے، مگر طالب حق کے لئے اس سے کسی طرح مفر نہیں - خدا کے حضور میں باریابی کا یہ پہلا زینہ ہے -

مسلمانوں میں عرصہ سے یہ رائج ہے کہ جب سالک کسی بزرگ کی خدمت میں بغرض تعلیم روحانی حاضر ہوتا ہے تو اُسے اپنے گناہوں سے تائب ہوکر پیر کے ہاتھ پر بیعت لینی پڑتی ہے، توبہ و استغفار کے بعد مرشد کے سامنے خدا سے وعدہ کرتا ہے کہ ممنوعات شرعیہ سے پرہیز کرونگا، اور اوامر و نواہی کا بطریق احسن پابند رہونگا، مگر ان میں سے کتنے مردمیدان ہیں جو اس عظیم الشان وعدہ کو، (وہ بھی کس کے حضور میں خدائے برتر اور مرشد کامل کے) ایفا کرتے ہوں -

لفظِ توبہ کا اصلی مفہوم اہلِ باطن کے نزدیک کچھ اور ہی ہے - لوگ یہ سمجھتے ہیں ؎

رات بھر پی پیا کی صبح کو توبہ کرلی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

گویا کہ توبہ بچوں کا کھیل ہے یا طفلانہ دوستی ہے جب چاہا توڑ دیا اور جب چاہا دوست بن گئے -

یاد رکھنا چاہئے توبہ وہی صحیح ہے جو ایک بار کرنے کے بعد تا زیست قایم رکھی جائے - انسان کو چاہئے کہ توبہ کرنے میں جلدی نہ کرے - پہلے اپنے خیال اور عادات کی جانچ کرے - دیکھے کہ مجھ میں اس قدر کافی اخلاقی حرارت اور قوت ارادی ہے کہ اگر میں ایکبار توبہ کروں تو ہمیشہ اس کا پابند رہ سکوں گا یا نہیں - توبہ قطعی ارادہ کا نام ہے - جسوقت طالب عزم بالجزم کرلیتا ہے کہ میں راہ خدا پر استقلال اور صبر کیساتھ بلاخوف و خطر چلونگا اور مکروہات دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جاؤنگا، اسوقت اسکو توبہ کرنی چاہیئے - توبہ وہی مقبول ہوتی ہے یا یوں کہئے کہ وہی توبہ کار آمد ہوتی ہے جس کے بعد انسان دوبارہ افعال مذموم اور اعمال قبیحہ کا مرتکب نہیں ہوتا - اسیواسطے مرزا سودا کہہ گئے ہیں کہ شیخ کو چاہئے کہ سالک کو تعلیم فنا سے پہلے دنیا کے تعلقات سے متنفر کر دے ؎

خانہ پرور دِ چمن ہیں آخرے صیاد ہم
اتنی رخصت دے کہ ہولیں گل سے ٹک آزاد ہم

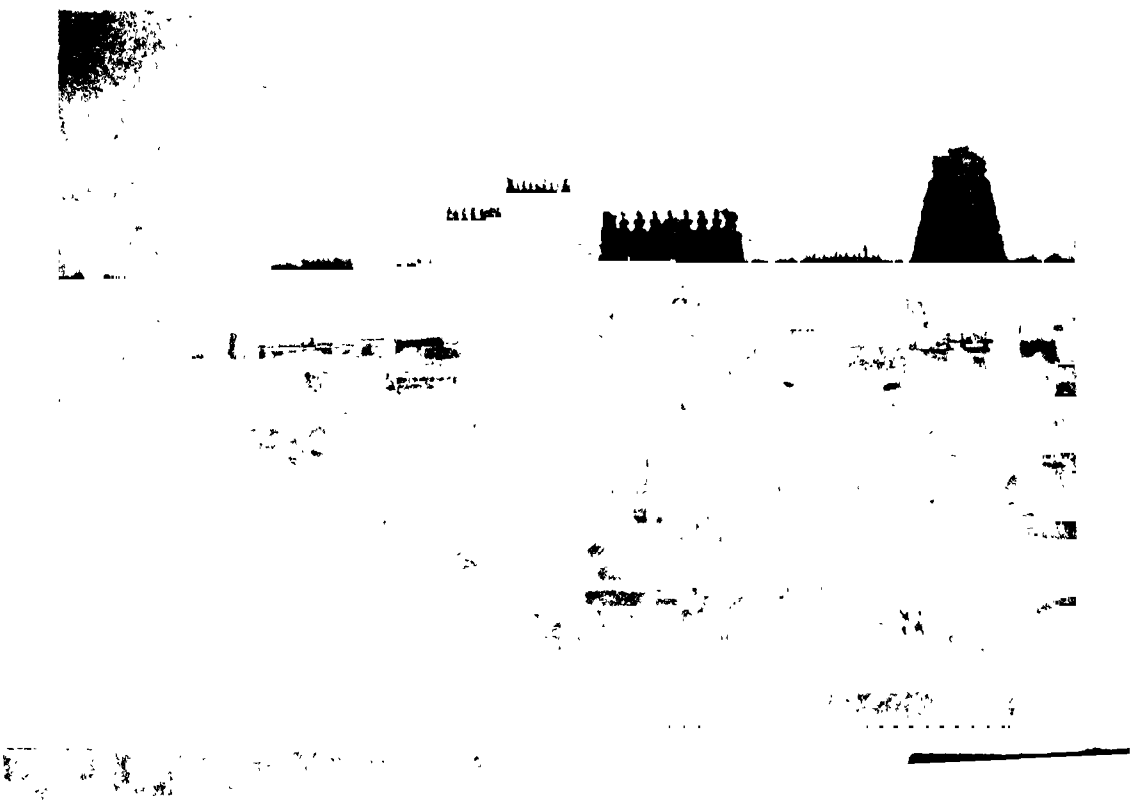
کیونکہ جسقدر دنیا کی محبّت بڑھتی جاتی ہے اُسی قدر مشکلات زیادہ ہوتی جاتی ہیں - ؎

اس کشمکشِ دام کے کیا کام تھا مجھے
اے الفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

اکثر نیک نیت اور حوصلہ مند سالک جب خدا کی راہ پر چلنے کا قصد کرتے ہیں اور تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس میں سرگرم



عام نظارہ قلعہ و مندر سری رنگ ناتھ



ہوتے ہیں تو اپنے گناہوں کے بار گراں کو خیال کرکے متاسف اور خدا سے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں۔ بوجہ غلطی یہ سمجھتے ہیں کہ اخلاق کی درستی محض خدا کی توفیق و برکت پر منحصر ہے۔ جب تک خدا امداد نہ کرے گا تزکیۂ اخلاق ممکن نہیں۔ یہ خیال درست نہیں۔ علمائے علم النفس کے قدیم وجدید ہر دو گروہ کی یہ قطعی رائے ہے کہ خیال و تصور میں حیرت انگیز قوت ہے۔ انسان جس قسم کا خیال یا تصور بار بار دل میں کرتا اور لاتا ہے اسی قسم کے خیال و تصور بجنسہٖ خود بخود کچھ روز کی مزاولت کے بعد دماغ میں پیدا ہونے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی خیالات افعال کی صورت میں ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ اور انسان سے بلا اختیار سرزد ہوتے ہیں۔ اس اصول کی بنا پر ہمیں چاہئے کہ بجائے گذشتہ بے عنوانیوں اور گناہوں پر بار بار سوچنے اور افسوس کرنے کے نیک افعال اور راست خیال کو اپنے دل میں جگہ دیں۔ اور انھیں کا بار بار تصور بھی کریں۔ اس طریقہ سے راست گفتاری اور راست کرداری ہمارے جزو دماغ ہو جائے گی اور ہم بجز نیک افعال کسی مذموم فعل کے کبھی مرتکب نہ ہوں گے۔

"چھاندویوگیہ اپنشد" میں لکھا ہے کہ انسان خیال کا مخلوق ہے۔ جیسے خیالات اس کے دل میں جاگزیں ہوتے ہیں ویسے ہی آخر میں وہ خود بن جاتا ہے۔ اسی لئے دنیا کے ہر ایک بانی مذہب نے درستی خیال کی نہایت شد و مد سے تاکید کی ہے کیونکہ یہ مسلم الثبوت مسئلہ ہے کہ اخلاق پسندیدہ کے لئے پاکیزہ خیالات نہایت ضروری ہیں۔ انسان سے جو فعل سرزد ہوتا ہے پہلے وہ عالم خیال میں نشوونما پاتا ہے، بعدہٗ فعل پسندیدہ یا نازیبا کی شکل میں اگر عالم ظاہر میں نمودار ہوتا ہے! یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ سے اہل ہند میں زناربندی کی رسم چلی آتی ہے، ایک زنار میں تین دھاگے ہوتے ہیں، ان کا منشا یہ ہے کہ جب اس زنار پر نظر پڑے، خیال و قول و فعل کی درستی اور ضبط کا تصور دل میں قائم رہے اس لئے کہ انھیں تین زبردست انسانی قوی کے قابو میں کرنے کا نام تزکیۂ اخلاق ہے جس شخص نے اس "تثلیث" اخلاقی کو زیر کرلیا، اس کے لئے سارے اخلاق کو درست بنانے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی۔ انسانی گناہ انھیں تین قوتوں کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتے ہیں۔ پارسیوں میں بھی ایک سفید فیتہ کمر کے چاروں طرف تین بار باندھتے ہیں۔ اس کا مقصد بھی سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ انھیں قوی انسانی کی اصلاح کا خیال ہر وقت دل میں قائم رہے۔

عادت ایک زبردست قوت ہے۔ اگر انسان نے شروع سے نیک افعال کی عادت ڈال لی تو اسے اخلاق کی اصلاح میں چنداں دقت نہیں ہوتی۔ جس طرح عادت انسان کو حیرت انگیز مدد دیتی ہے اسی طرح نقصان بھی پہنچاتی ہے۔ عادت کو سنسکرت میں سُبھاو کہتے ہیں اور سُبھاؤ کو دور کرنا سخت دشوار کام ہے۔ اگر ارادہ پختہ ہو تو آہستہ آہستہ اس پر غالب آسکتا ہے۔ البتہ بعضے اولو العزم ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جہاں انکو اپنی عادت کی غلطی معلوم ہوگئی فوراً چھوڑ دیتے ہیں اور اس کا نام نہیں لیتے۔ "بھگوت گیتا میں ایک اشلوک ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ایشور نہ کرم کو اور نہ کرم کے کرنے کو اور نہ کرم کے پھل کو پیدا کرتا ہے۔ یہ کل امور سبھاؤ سے پیدا ہوا کرتے ہیں اس لئے انسان کو اپنے سبھاؤ کی درستی میں بہت کوشش کرنی چاہئے" ایک شاعر کہتا ہے ؎

ہم کرتے ہیں عادت کی غلامانہ اطاعت
اصلاح پذیر اس لئے عادت نہیں ہوتی

ہمیں چاہیے کہ ہم دماغ کو اپنا غلام بنا لیں ہم ان کے مالک بنیں نہ کہ وہ ہمارے۔ یہ صرف عادت کی درستی پر موقوف ہے۔ جب تک ہم دماغ کے بُرے عادات کی غلامانہ پیروی کرتے رہیں گے ان سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں باطنی کشمکش کا ہنگامہ شروع ہوتا ہے سالک و غلام میں عرصہ تک جنگ رہتی ہے آخر غلام کو شکست فاش ہوتی ہے اور مالک کے سر فتح کا سہرا بندھتا ہے۔

ایک بار جب سالک نے قطعی طور سے یہ سمجھ لیا کہ فلاں فعل بد ہے اور اس کا ترک لازمی، تو اُسے مردانہ وار نہایت صبر و استقلال سے کام لیکر اس فعل بد کے دور کرنے کی سعی کرنا چاہیے۔ چونکہ عادت ایک مدت مدید کی مہارت اور پیروی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس لیے اگر بعض اوقات انسان سے دوبارہ وہی فعل سرزد ہو جائے تو بے دل اور مایوس نہ ہونا چاہیے ع۔ بہ مطلب میرسد جوینده کام آہستہ آہستہ۔

درستی اخلاق کا عملی طریقہ یہ ہے کہ مقابل و متضاد عادات کو از سر نو اپنے میں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، کیونکہ علل و اسباب کا سلسلہ ہر دو عالم یعنی باطن و ظاہر میں یکساں جاری ہے۔ فرض کرو کہ تم میں بدگوئی کی عادت ہو تو تمہیں چاہیے کہ بدگوئی کا خیال نہ کرو! بلکہ خوش کلامی کی عادت ڈالو! کچھ روز کے بعد جب یہ عادت پختہ ہو جائے گی تو بدگوئی خود بخود زائل ہو جائے گی۔

نفرت کو محبت سے، بدی کو نیکی سے، دروغ گوئی کو راست گوئی سے، غیظ و غضب کو تامل اندیشی اور ضبط سے دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیے، اگر کسی کمرہ میں تاریکی ہے تو مزید تاریکی کا اضافہ کرنے سے تاریکی ہرگز دور نہ ہوگی، بلکہ روشنی پیدا کرنے سے تاریکی فنا ہو جائے گی۔ دوسرا طریقہ تزکیۂ اخلاق صحبت صالح یا ست سنگ ہے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کند　　صحبتِ طالح ترا طالح کند

نیک یا بد صحبت نہایت اثر پذیر ہوتی ہے۔ یا خدا کی صحبت میں خدا یاد آتا ہے۔ ؎

بسا ہے کون ترے دل میں گلبدن کے ذوق　　کہ بو گلاب کی آتی ترے پسینہ سے

"آنند"

پولیسمین ۔ اس کتاب کے مؤلف مسٹر ظفر عمر صاحب بی اے۔ (علیگ) ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس بدایوں ہیں۔ اصلاح پولیس ملک کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے، جو کل ملک کے دل میں اس وقت شعلہ زن ہے۔ یہ اصلاح بہت کچھ اہل پولیس کی انفرادی تعلیم و تربیت اور اخلاق پر موقوف ہے۔ مسٹر ظفر عمر نے اس رسالہ میں اہالیان پولیس کے حقیقی فرائض، آداب، اخلاق، برتاؤ کو ایسے سنجیدہ اور دل آویز پیرایہ میں دکھایا ہے کہ اگر اہالیان پولیس ان پر عامل ہوں تو ہندوستان کی پولیس "فرشتۂ رحمت" بن جائے۔ جس دل سے یہ خیالات نکلے ہیں، کوئی شک نہیں، کہ وہ پولیس کا ایک بہترین اور فدا از سر ثابت ہے۔ یہ رسالہ اس قابل ہے کہ ہر پولیسمین اس کو اپنی جیب میں رکھے اور روزانہ اس کا ورد کرے۔ شروع کتاب میں حضور ملک معظم جارج پنجم کی ایک نہایت شاندار و تاجدار تصویر بھی ہے۔ ضخامت ۱۴۲ صفحات، جیبی تقطیع۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔

عالم ومافی العالم

سیّارگان صغیر[1]

سیارگان کلاں کے ذکر بالانفراد کے بعد اب چھوٹے چھوٹے سیاروں کا ذکر کرنا مناسب ہے، جو نظام شمسی کا جزو قرار پائے ہیں انیسویں صدی کے آغاز سے پیشتر ان کا وجود کسی کو معلوم نہ تھا؛ ۱۸۰۱ء میں پیاسی نے پلرمو (سسلی) میں ایک چھوٹا سا سیارہ دریافت کیا۔ اس سے اور عالموں کے دل میں بھی یہ ہوس پیدا ہوئی کہ ہم بھی اس قسم کے سیارے معلوم کرکے نام پیدا کریں۔ چنانچہ اولبرس نے ۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۷ء میں دو دریافت کئے۔ اور ۱۸۰۴ء میں ہارڈنگ نے ایک اور دریافت کیا۔ اس کے بعد عالموں نے یہ خیال کیا، کہ شاید آسمان اُن کے وجود سے خالی ہوگیا ہے، مگر ۱۸۴۵ء میں ہنکے جرمن محقق کی کوشش سے ایک اور معلوم ہوا۔ جس سے یہ امید بندھی، کہ چھوٹے سیاروں کے شمار میں کوئی خسارہ نہیں واقع ہوا ہے۔ اس کے بعد سے ہر سال دس بیس نئے سیار دریافت ہوتے رہے ہیں۔ اس مبارک کام میں فلکی فوٹوگرافی نے بہت بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ اور دوربین سے وہ کام نہیں نکلتا۔ جو فوٹوگرافی سے ہو رہا ہے۔ آسمان پر چاہے کتنا ننھا تارہ اور چاہے کتنے فاصلہ پر ہو۔ اور دوربین کی زد سے بچ جائے۔ مگر فوٹوگرافی کی مار سے وہ کبھی نہیں بچ سکتا۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء سے آج تک پانچ سو سے زاید سیارے معلوم ہو چکے ہیں۔ یہ سب کے سب منگل اور برہسپت کے درمیانی خطّہ میں گردش کرتے ہیں، مگر بہت چھوٹے ہیں۔ ان میں کے سب سے بڑے سیارے سیریز کا قطر ۴۸۵ میل ہے۔ باقی اس سے کہیں چھوٹے ہیں۔ انکی حرکت محوری بہت بے ٹھکانہ ہے۔ اروس (Eros) جو ان سب میں بہت مشہور ہے۔ اگست ۱۸۹۸ء میں دریافت ہوا تھا۔ یہ گردش کرتا ہوا زمین کے بہت نزدیک آجاتا ہے، اور کوئی سیارہ اتنا نزدیک نہیں آتا ہے۔ حال کے مشاہدوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسکی درخشانی تغیر پذیر ہے۔ عالموں کا یہ خیال ہے کہ یہ دوہرا سیارہ ہے۔ اور یہ دونوں ایک ساتھ پانچ چھ گھنٹوں میں گردش کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اُن چار سیاروں[2] کا بھی تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے، جو ۱۸۰۱ء ۱۸۰۲ء ۱۸۰۴ء اور ۱۸۰۷ء میں علی الترتیب دریافت ہوئے تھے۔ اور ان کے نام یونانی دیوتاؤں کے نام پر رکھے گئے ہیں، یعنی سیریز (Ceres) پالس (Pallas) جُونو (Juno) اور وسٹہ (Vesta) ہیں۔ وسٹہ سورج سے ساڑھے بائیس کروڑ۔ جونو چھبیس کروڑ چالیس لاکھ میل۔ سیریز اور پالس چھبیس کروڑ چالیس لاکھ میلوں کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ وسٹہ۔ پالس۔ آئرس اور فلورا سیارگان خرد میں سب سے بڑے اور سب سے زیادہ درخشاں ہیں۔ سب سے چھوٹے کا قطر صرف پچاس میل ہے۔ اور سب سے بڑے کا پانچ سو میل کے قریب ہے۔ فلورا سورج کے قریب ترین اور ہائی جیا (Hygiea) اور ہیمس

[1] ماخوذ از "نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا" جلد نمبر ۲، صفحہ ۱۹۱　[2] "گیلری آف نیچر" صفحہ ۹۰

(Themis) بعید ترین ہیں۔ آنے والے زمانہ کے عالموں کی کوششوں سے کیا ظہور میں آئے گا۔ کوئی پیشین گوئی کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ مگر یہ قرین قیاس ہے کہ ایسے ایسے عجائبات خلا کا انکشاف ہوگا جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ انسان حیران ہوں گے۔

نظام شمسی کے تذکرہ میں ان اجرام فلکی کا ذکر نا تمام ہوچکا۔ جو قابل بیان ہیں۔ یعنی سیارے اور ان کے چاند۔ اور سیارگان خرد و دمدار تارے "آوارہ گردان سماوی" میں شامل ہیں کبھی کہیں کبھی کہیں۔ یہ کسی قاعدہ آسمانی کے تابع نہیں رہتے، اس واسطے انکا بیان قلم انداز کیا جاتا ہے۔

شہاب ثاقب یعنی ٹوٹنے والے تارے | شہاب ثاقب بھی ہمارے مطلب سے بہت متعلق نہیں۔ اور نہ بہت ضروری ہیں۔ ان سے ہر کوئی آشنا ہے۔ رات کو تارے ٹوٹتے کس نے نہیں دیکھے ہیں؟ یہ چھوٹے چھوٹے اجرام ہوتے ہیں۔ اور شتربے مہار کی طرح خلا میں گھومتے پھرتے ہیں جب اپنے راستے سے بھٹک جاتے ہیں، تو ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں جس سے رات کے وقت شعلے اور شرارے نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تارے زمین پر بھی آپڑتے ہیں۔ جو بڑے بھاری سیاہ پتھروں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ دس بارہ برس ہوئے جنوبی افریقہ میں (کیپ کالونی) ایک جگہ ایک بڑا وزنی شہاب ثاقب گرا۔ جو زمین کے اندر دھس گیا۔ اور پچاس فٹ گہرا گڑھا بنا دیا۔ اس میں لوہا۔ کاربنہ۔ گندھک۔ سلیکہ۔ مگنشیا۔ چونا (لائم) الومینا۔ پوٹاس۔ سوڈا۔ اکسائڈ آف منگنیز۔ تانبہ۔ کاربن وغیرہ چیزیں پائی گئی تھیں۔

اسپکٹرو اسکوپ سے یہ معلوم ہوگیا ہے۔ کہ یہ اشیاء تقریباً تمام اجرام فلکی میں پائی جاتی ہیں۔ اور بہت سے سیارے انہی شہاب ثاقبوں کے مجموعے سے بنتے ہیں، جدید عالموں کا ایک گروہ تسلیم کرتا ہے۔

اجرام فلکی کس طرح بنے؟

ارکین نظام شمسی، ساکنین خلائے آفتابی کے تذکرہ کے بعد اب اس مسئلہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ جو اس حصہ مضمون کا عنوان ہے۔ اور یہ ایک سوال ہے جسے ہر تجسس پسند دل پوچھیگا۔ یہ سورج۔ چاند۔ تارے۔ سیارے۔ وغیرہ ساکنین خلا کس طرح وجود پذیر ہوئے اور ان کا ہیولا یعنی مادۂ عالم کیا ہے! اس مضمون میں اسکا جواب بہم پہنچایا جائے گا۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ متقدمین کا تکوین کے بارہ میں کیا خیال تھا کیونکہ انکے خیالات اور تعصبات ایک بڑی حد تک متاخرین کو ورثہ میں ملے ہیں۔ اور انسے ہر کوئی واقف ہے۔ مگر یہاں پر علوم جدید سے جو جواب ملتا ہے، وہ نقل کیا جائے گا، اور اسے اہل نظر اور شائقین پرانے خیالات سے مقابلہ کرکے تفاوت اور تخالف باہمی معلوم کرسکتے ہیں۔

(۱) نظریہ سحاب | سب سے بڑا خیال اجرام خلائی کے بارے میں نظریۂ سحاب یعنی نیوبلر ہائی پاتھے سِس (Nebular Hypothesis) ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ نیوبلہ یعنی دخانی سفید درخشان مادہ سے جو آسمان میں ہر جگہ موجود ہے۔ دنیا اور عالم بالا کروروں برسوں کے بتدریج ارتقا سے وجود میں آئے۔ دسمبر یا بھادوں کے مہینوں میں جب مطلع بالکل صاف ہوتا ہے اور آسمان میں تارے اسی طرح چمکتے اور بہار دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے کسی ہال کی چھت میں فانوس بلوریں لٹکتے معلوم ہوتے ہیں۔ کہکشاں میں اور دیگر حصص خلا میں بہت سفید انبارسے نظر آتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ

ا؎ منقول از "موزز اینڈ جیالوجی" مصنفہ ڈاکٹر سیموئل کنس صفحہ ۵۵۔

ہیے فضلہ۔ دار جیلنگ یا کسی اور برفانی مقام میں موسم سرما کی صبح کو زمین
برف پڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ سفید سا مادہ۔ نیوبلہ، یا دخان یا
اب سماوی کہلاتا ہے۔ اسی سے بقول ارباب سائنس۔ دنیائیں
ی ہیں۔

اسکاٹ لینڈ کے مشہور فلکی جیمز فرگیوسن نے ایک خط میں کسی
دوست کو لکھتے ہوئے بائبل کے بیان آفرینش کی تصدیق کی کہ خدا
نے عالم بالا کو اسی طرح بنایا جیسے بائبل میں لکھا ہے۔ یعنی اُسنے نیوبلہ
یعنی ہیولیٰ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد
جرمنی کے مشہور فلاسفر کانٹ نے ۱۷۵۵ء میں یہ خیال ظاہر کیا۔
کہ آسمان میں درخشاں گیس اور غیر معین سحاب ہے، جو عالم کا مادہ
ہے۔ اور جس سے تبدریج یہ عالم وجود پذیر ہوے۔ مگر سر ولیم ہرشل
اور فرنچ عالم لاپ لیس نے بہت مشاہدہ اور تحقیق کے بعد اس
خیال کو نظریہ کی صورت میں ظاہر کیا۔ لاپ لیس نے ریاضی اصول
سے یہ دیکھا کہ نظام شمسی کے جملہ ارکین آفتاب عالم تاب کے گرد
مغرب سے مشرق کی طرف چکر لگاتے ہیں۔ اور ہر سیارہ اور ماہتاب
بجائے خویش اُسی رُخ پر گھومتا ہے۔ دوسری بات اُسے یہ نظر
آئی کہ تمام سیارے سورج کے گرد اور سب چاند اپنے مرجع
اصلی کے اردگرد اُسی دائرہ میں گردش کرتے ہیں جس میں کرۂ ارض
سورج کے آس پاس طواف کرتی ہے۔ اس کا کیا باعث ہے؟
کہ یہ سب ایک ہی رُخ پر گھومتے ہیں۔ اس کی وجہ اس نے یہ
قرار دی کہ شروع میں نظام شمسی کے جملہ ارکین درخشاں گیس
یا بخارات سحاب کی صورت میں تھے۔ (مگر اس نے خود کسی نیوبلہ
کو کبھی نہیں دیکھا تھا) اُس نے خیال کیا کہ انقباض (Contraction)
اور انجماد (Condensation) سے رفتہ رفتہ حلقے بنتے چلے گئے۔

سورج بھی اسی طرح بنا تھا۔ اور اب وہ سکڑتا چلا جاتا ہے۔ سر ولیم
ہرشل نے کچھ عرصہ تک آسمانوں کا مشاہدہ کیا۔ نیوبلوں[1] کے گردہوں
کی دیکھ بھال کی اور جو ستارے یا سیارے عالم ارتقا کے ابتدائی
مرحلوں میں تھے، انکی حالتوں کو بھی دیکھا۔ اور یہ رائے دی، کہ تمام
عالم سحاب سے بنے۔ اس مسئلہ کی رو سے یہ مانا جاتا ہے، کہ
شروع میں آسمان کے سب حصّوں میں نہایت گرم سحاب[2] یا گیس
کے تودے تھے کشش ثقل سے انکے اندر گردش پیدا ہو گئی۔
جو لاکھوں کروروں برسوں تک رہی آخر کار گھومتے رہنے سے
حرارت خارج ہوتی گئی، اور ذخیرہ میں انقباض پیدا ہوا۔ بڑے
ڈھیر سے ٹکڑے ٹوٹ کر علیحدہ ہوتے رہے جو حلقوں میں بجائے
خویش گھومتے رہے۔ آخرش بے شمار زمانوں کے گذرنے کے
بعد انہوں نے ٹھوس اجسام کی صورت اختیار کر لی۔ اور اس طرح
سیارے، چاند اور نظام ہائے شمسی وجود میں آئے۔

نظریہ سحاب کا دم چھلّا اس نظریہ میں پروفیسر جارج ہوارڈ ڈارون
(کیمبرج) نے ۱۸۸۵ء میں یہ اضافہ کیا ہے، کہ زمین اور چاند کروڑوں
برس پیشتر ایک دوسرے سے جدا نہ تھے۔ جیسے اب ہیں۔ اُس
دور افتادہ زمانہ میں ہمارے کرۂ ارض گیس کے ڈھیر کی صورت
میں اپنے محور پر تین اور پانچ گھنٹوں کے درمیان میں گھوم رہی تھی
اس گردش اور کشش آفتاب سے اس میں شق واقع ہوا۔ چھوٹا
ٹکڑا چاند بن گیا اور بڑا زمین کا کرہ بنا۔ یہ خیال مسئلہ سحاب کا دم چھلّا
اور ضمیمہ[3] سمجھا جاتا ہے۔

نظریہ سحاب کی تائید و تصدیق حال کی تحقیق سے جو اسپکٹروسکوپ سے
ہوئی۔ یہ مسئلہ بخوبی ثابت ہو گیا ہے۔ کہ عالم سحاب یا درخشاں گیس
سے وجود میں آئے ہیں۔

---

[1] از "اوینس آف ماڈرن اسٹرانامی" مصنفہ ہکٹر میکفرسن مطبوعہ لندن جنوری ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۲۶-۲۲۰ - [3] از "نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا" جلد نمبر ۵ صفحہ ۵۶۳-
[2] از "اوینس آف ماڈرن اسٹرانامی" (فلکیات کی سرگزشت) صفحہ ۲۲۸-

سپس آرہ نے سورج ستاروں اور نیو بلہ کے اجزائے ترکیبیہ کی حقیقت ظاہر کر دی ہے۔ وہ گیس سے بنے ہیں۔ اس سے زمین کی ابتدائی تاریخ اور مختلف حالتوں کا پتہ لگتا ہے۔ آسمان کے اجرام کی اصل کا نوٹو بھی اس آلہ نے پیش کر دیا ہے۔ ان میں سے بعض ہنوز عالم طفولیت میں، بعض شباب میں، بعض مہمان چند روزہ، اور بعض مُردوں کے ذیل میں داخل ہو گئے ہیں۔ برہسپت گو زمین سے کئی سو گنا بڑا ہے مگر ارتقا کی پہلی منزل میں ہے۔ اس کا مطلع زمین سے زیادہ مکدر اور بادل سے بھرا ہوا ہے۔ اس سے بادل تو پیدا ہوتے ہیں مگر وہ سورج کی گرمی سے نہیں۔ بلکہ اس کی اندرونی بے حد گرمی کے سبب سے اٹھتے ہیں۔ جب تک یہ بادل دور نہوں برہسپت زمین کی حالت کو نہیں پہنچ سکتا۔ سنیچر۔ یورینس۔ اور نیپچون بھی ہنوز ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں الجھے پڑے ہیں۔ حرارت وہاں اس قدر ہے کہ روئیدگی اور جانداروں کی ہستی ناممکن ہے۔ صرف شکر زمین کے ہم رتبہ ہے، جو اپنے حجم طبعی میں بھی اس کے لگ بھگ ہے۔ منگل اپنے ارتقا میں زمین سے چند قدم آگے ہے۔ اپنی چھوٹائی کے سبب ارتقا کی تمام منزلوں سے گذر گیا۔ بڑھاپے کے ہاتھوں میں گرفتار ہے۔ اس کے سمندر خشک۔ دریا برباد۔ اور اُنکی جگہ دلدلی نباتات ہے۔ ہوا لطیف اور ہلکی ہے۔ وہ زمانہ دور نہیں، کہ منگل مُردوں کے گروہ میں شامل ہو جائے گا۔ ایسے کئی مُردے اجرام آسمان میں موجود ہیں۔ ہمارا چاند۔ سیاری زندگی کا آخری مرحلہ پیش کرتا ہے۔ یہ سرد اور خشک مادہ کا ڈھیر ہے۔ وہاں ہوا کا نام و نشان نہیں، سمندر اور جھیلیں سب خشک ہو گئی ہیں۔ پہاڑوں کی ننگی چوٹیاں روئیدگی سے معرّا ہیں۔ یہی حال منگل کا ہونے والا ہے۔ اور چند کروڑ سال کے بعد یا اس سے پیشتر ہماری دنیا کا بھی یہی حشر ہوگا۔[۱۵۱]

میٹیورِٹک تھیوری یہ دوسرا تکوین عالم کے بارہ میں میٹیورِٹک تھیوری[۱۵۲] (Meteoritic Hypothesis) یعنی مسئلہ شہاب ثاقب ہے۔ اس کے موجد سر نارمن لاکیئر مشہور عالم فلکیات ہیں۔ یہ حال ہی کا ہے۔ اس کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ تمام سیارے اور ستارے ان شہاب ثاقبوں کی ترکیب سے بنے ہیں، جن سے عالم بالا مملو ہے۔ عالموں کا ایک گروہ اس نظریہ کا قائل ہے۔ سیموئل لینگ نے اپنی مشہور کتاب "مسائل مستقبل" (پربلیمز آف فیوچر) میں ایک فصل اس امر کی بحث کے لئے مخصوص کی ہے، کہ عالم بالا میں کیا ہے؟ اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ شہاب ثاقب بیشمار ہیں جن سے خلا کا ہر گوشہ بھرا ہوا ہے۔ سر نارمن لاکیئر کی نظریہ کے سب عالم حامی نہیں ہیں۔ صرف ایک چھوٹا گروہ مانتا ہے۔ برعکس اس کے نیوبلر تھیوری یعنی نظریۂ سحاب کو قبولیت عامّہ کا فخر حاصل ہو گیا ہے۔

(باقی آئندہ)

جے۔ آر۔ رائے

---

[۱۵۱] ... صفحہ ۲۲۳ - ۲۲۵ -

[۱۵۲] از نواز نیشنل انسائیکلوپیڈیا" جلد ۵ صفحہ ۴۵۷ -

فرانس کے اخبارات

فرانس بھی شائستگی اور تہذیب میں کسی سلطنت سے کم نہیں اور اخباروں کی قدر دانی اور رتبہ سنجی میں تو اس کا پایہ بہت ہی بڑھا ہوا ہے۔ ناظرین سنیں گے تو متحیر ہو جائیں گے۔ پیرس (دار السلطنت فرانس) کے اخباروں کی عظمت اللہ اکبر۔ روزانہ اخبار" لا پٹی جنرل" ہی کو لیجئے جس کی اپنی عالیشان تعمیر دار الاخبار میں ۸۰۰ ملازم کام کرتے ہیں۔ ایک لاکھ پچاس ہزار ماہوار کا تو صرف کاغذ ہی خرچ ہوتا ہے۔ اس کی روزانہ اشاعت ۱۰ لاکھ ہے اور مختلف مقامات پر اس کی ۲۰ ہزار ایجنسیاں کھلی ہوئی ہیں۔ ناظرین اسی سے رفعت و شان کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ دوسرا روزانہ اخبار" طان" ہے جس کے دفتر میں ۹۰۰ آدمی کام کرتے ہیں۔ صرف تاربرقیاں حاصل کرنے کو ۲ لاکھ روپیہ سالانہ صرف ہوتا ہے اور جس کے ایڈیٹر ایک سو سے زیادہ ہیں۔ کسی کی تنخواہ چار ہزار روپیہ ماہوار سے کم نہیں۔ یہ وہ اخبارات ہیں جن کے ہاتھ میں پبلک اور گورنمنٹ دونوں کی باگ ہے، چاہیں جوش کو ابھار دیں، چاہیں ٹھنڈا کر دیں۔ چاہیں جنگ کرا دیں، چاہیں صلح۔ جنکی اشاعت کے لئے سپیشل ٹرینیں جاتی ہیں۔ سینکڑوں مضمون نگار مذکورہ بالا اڈیٹروں کے علاوہ ہیں۔ جو گھر بیٹھے لاکھوں روپیہ پاتے ہیں۔ امیر کبیر بنے ہوئے ہیں۔ اور سب سے مستغنی۔ فی مضمون پانچہزار روپیہ تک اجرت پاتے ہیں۔ سب کے سب علما، و فضلا اور فلاسفر ہیں۔ معلومات کی یہ وسعت کہ ان کا سینہ جام جہاں نما ہے۔ جو نامہ نگار سر بکف ہو کر اور جنگوں کے معرکوں میں جا کر وقائع نگاری کرتے ہیں لاکھوں روپیہ سے اپنی پاکٹیں بھرتے ہیں۔ جنگ اُن کے حق میں گویا پیداوار کی فصل ہوتی ہے۔ اُن کے مقابلہ میں اب ہندوستان کے مرحوم اخبارات پر نظر ڈالئے گا تو یہ معلوم ہوگا کہ اصلی افسانوں کے مقابلہ میں اُن کی بھونڈی نقلیں یا مٹی کی تصویریں ہیں۔ یورپ میں کسی جدید اخبار یا رسالے کے نوٹس پر جب تک ۴۰ یا ۵۰ ہزار درخواستیں نہیں آ جاتیں شائع نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں پرانے پُرانے اخباروں کی دس پندرہ ہزار اشاعت گویا معراج ہے اور سینکڑوں اخبارات تو ایسے ہیں جن کے مالک خود ہی ایڈیٹر خود ہی منیجر، خود ہی پرنٹر، خود ہی کمپازیٹر، خود ہی سنگ ساز اور ضرورت آ پڑے تو لنگوٹا کسکر خود ہی پریس کی کل کھینچنے پر بھی چُست۔ آپ کا ج مہا کا ج ؎

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِل کوزہ - خود رندِ سبو کش
خود بر سرِ آں کوزہ خریدار برآمد - بشکست و رواں شد

یہ تحریر مبالغہ نہیں بلکہ واقعی اور چشم دید ہے۔ اور ہم حوالہ دے سکتے ہیں، لیکن اس میں نہ غریب پریس کی اہانت ہے نہ اس کا کچھ قصور۔ بلکہ سارا قصور ملک کی ناتربیت یافتگی کا ہے جس ملک میں فیصدی بمشکل پانچ لکھے پڑھے خود سرکاری رپورٹ سے ثابت ہوں وہاں اخباروں کی کیا قدر۔ یہ پانچ فیصدی وہ طلبہ ہیں جو حال میں تعلیم پا رہے ہیں۔ دس پندرہ سال پیشتر کا ذکر نہیں جب کہ تعلیم کو وہ نمونہ تھا جو آج کل ہے۔ یعنی جہالت اور بھی زیادہ تھی۔ اس کے برعکس ولایت میں فیصدی ۹۵ لکھے پڑھے اور پانچ ناخواندہ۔ خود ہم سے میرٹھ کے سابق ڈسٹرکٹ جج مسٹر مارکم صاحب بہادر نے ہندوستانی پریس کی بابت یہ الفاظ فرمائے

تھے کہ "جب کسی کو انداز سے شکست ہوتی ہے تو اخبار یا پریس جاری کر دیا جاتا ہے"۔

غور و انصاف سے دیکھئے تو ہندوستان میں اب تک ایک بھی ایڈیٹر اور انشاپرداز پیدا نہیں ہوا۔ اکثر اخباروں اور رسالوں کا لٹریچر دیکھکر ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی۔ ہنسی تو اُن کی کم مائگی اور بے دوری پر اور اپنے عیب کو ہنر سمجھنے پر اور غصہ ملک کی ناقدردانی اور بے حسی پر۔ یورپ میں اخبارات روحانی غذا ہیں۔ کان کھودنے والے اور گاڑیوں کے کوچبان تک اخبار خریدتے ہیں۔ جیلوں کے قیدی تک غل مچاتے ہیں کہ ہم اخبار نہ دیکھیں گے تو مر جائیں گے۔ ہمارے کھانے پینے میں جتنی چاہو کھینچ کرو مگر اخبار دیکھنے کی آزادی نہ چھینو۔ اللہ اللہ اخباروں کی یہ قدر!

ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت کا مقابلہ اہل یورپ کی تعلیم و تربیت سے کیا جائے تو اخباروں کی موجودہ حالت نسبتہً ترقی پر نظر آئے گی۔ یورپ کی چند صدی قبل کی تعلیمی حالت ہندوستان سے بھی بدتر تھی۔ اگر ہندوستان میں زیر سایہ برٹش تعلیم و تربیت ترقی کے زینے پر اسی طرح پہنچتی رہی تو نہ صرف چند صدی بلکہ ایک ہی صدی میں کچھ کی کچھ ہو جائے گی۔ دیسی پریس ابھی طفلانہ حالت میں ہے۔ وہ خبروں میں، تاروں میں، مضامین میں انگریزی اخباروں اور جرنلوں کا کاسہ لیس ہے اور اس کو فخر سمجھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُس کے پاس سرمایہ نہیں۔ اور سرمایہ اس وقت ہو کہ پبلک حوصلہ بڑھائے، اور قدردانی کرے۔ نہ ابھی تک اعلیٰ درجے کے انشاپرداز پیدا ہوئے۔ اور ترقی اُسی فن کو ہوتی ہے جس میں معاش کو ترقی ہو۔ جو مالکان اخبار نسبتہً وسعت رکھتے ہیں، وہ انشاپردازی اور لٹریچر کی ترقی میں رقم کیا معنی کوڑی بھی خرچ کرنا نہیں چاہتے۔ وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اخبار کو اپنا ذاتی مال بنا رکھا ہے نہ کہ پبلک کا مال۔ اخبار اُن کے اپنے خیالات سے پُر ہوتا ہے نہ کہ پبلک خیالات سے۔ اور ہندوستانیوں کے طبائع مختلف ہیں۔ پس اخباروں میں پبلک خیالات کی اشاعت کی ضرورت ہے۔ ترقی نہ کرنے کی ایک قوی وجہ یہ بھی ہے

اس معاملہ میں ہم اپنے پیارے ہونہار "ادیب" کو مستثنیٰ فرما دیتے ہیں کہ اس میں کیسے کیسے جادو نگار اور انشاپرداز جمع ہیں اور کیسے کیسے سوشیل اور نیچرل مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں کہ اول سے آخر تک پڑھ جائیے مگر طبیعت سیر نہیں ہوتی اور "العطش العطش" اور "ہل من مزید" کی صدا لگاتی ہے۔ پھر چھاپا، کاغذ خوب اہل کمال اور عمائد و رؤسا کی دلکش تصاویر الغرض دلچسپیوں کے کل سامان موجود۔ باایں ہمہ حجم ۶۰ صفحات۔ پیٹ بھر کر ہر قسم کے لکھ مضامین۔ اس سے مالک کی نیک نیتی اور اُسکی پبلک فیاضی کا اچھی طرح پتہ لگ سکتا ہے۔ پھر "ادیب" جو دلہن کی طرح آراستہ ہو کر نکلتا ہے تو وہ مالک کے ارمانوں کی شہادت دے رہا ہے کہ پبلک اپنی فیاضی اور قدردانی کا جس قدر ہاتھ بڑھائے گی میں اس کی نوکی شائستگی کرکے اُسی قدر اس کا حسن و جمال بڑھاؤں گا۔ اس سے بڑھکر مالک کے خلوص کا اور کیا ثبوت ہوگا۔

اگرچہ ہمکو یقینی طور پر معلوم ہو کہ ادیب میں ابھی تک آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں آئی مگر مالک کی ہمت کے دم خم وہی ہیں یہ کیا طاقت ہو کہ اولوالعزمی کا جھنڈا اُٹھائے نہ آئی ہو بلکہ اپنی تنے کے عمدہ بنانے پر اُس کے دل کی اوج موج بڑھتی ہی چلی جا اُنکا عمل انجیل مقدس کے اس مقولے پر ہے کہ "آسمان بھی انھیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد کرتے ہیں"۔ اور لارڈ بیکنسفیلڈ آنجہانی کا یہ قول اسکو یاد ہو کہ "استقلال کامیابی کی عمدہ دلیل ہے"۔ ادیب انشاءاللہ ضرور کامیاب ہوگا۔ اب تمام ناظرین ادیب ہر کہ حتی الوسع دو دو نئے خریدار اپنے ادیب کے لئے پیدا کرکے سلف ہیلپ کا دکھائیں اور مالک کی ہمت بڑھائیں۔

شوکت میرٹ



سری کرشن کا بچپن

خوفِ رُسوائی

(۱)

ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ میں ایک نازک اندام نفیس پوش عورت میز کے سامنے رخساروں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے - وہ کسی گہرے خیال میں غرق ہے۔ مگر ظاہرا اس خیال میں غور کی محویت نہیں ہے - بلکہ بے چینی اور انتشار - اضطراب اور گھبراہٹ کے آثار اُس کے حسین چہرے پر نمودار ہیں -

سرلا - بابو دھرن چودھری کی بیوی تھی - دھرن کلکتہ کے ایک ہونہار بیرسٹر تھے - خلیق اور غریب نواز فیشنبل سوسائٹی سے محترز رہنے والے - نہ بال سے رغبت - نہ گھوڑ دوڑ کے شیدا - وہ تھیٹر وال اور پولیٹکل جلسوں میں بہت کم شریک ہوتے - ان کی اوقات کا بیشتر حصہ اپنے مقدمات کی تحقیق و تدقیق میں صرف ہوتا تھا - ان کے دوستوں کا حلقہ نہایت محدود تھا - جہاں تکلف اور ظاہرداری کے بدلے خلوص اور دوستی کے مراسم برتے جاتے تھے - دھرن کو فیشن سے انتہا درجہ کی نفرت تھی باوجود اس کے کہ کلکتہ کا ہر ایک گوشہ پولیٹکل خبروں سے گونج رہا تھا - مگر دھرن کو اُنسے صرف اتنی ہمدردی تھی کہ اخبار وں میں اُن کا تذکرہ دیکھ لیا کرتا - پولیٹکس سے اُسے مناسبت نہ تھی وہ اپنے دوستوں میں ایک سیدھا سلیم الطبع - صلح پسند - میانہ رو - خوش باش آدمی مشہور تھا - اس کے برعکس سرلا نیشنسٹ عقائد کی عورت تھی - اُس نے اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم پائی تھی اور ہندوستان کے پولیٹکل اور اقتصادی معاملات سے اُسے بہت زیادہ دلچسپی تھی - ایک بار وہ اپنے کالج کی لیڈی پرنسپل سے صرف اس بنا پر جھگڑ پڑی کہ لیڈی صاحبہ نے بر سبیل تذکرہ ہندوستانی عورات کے متعلق زبان سے کچھ اہانت آمیز کلمات نکالے تھے - آزادیٔ نسواں کے متعلق بھی اس کے خیالات بہت وسیع تھے - باوجود ان اسباب کے وہ ہندوستانی محبت اور جذبات کی عورت تھی - وضع کی پابند شوہر کی ادب اور محبت کرنے والی -

سرلا سوچتی تھی "کیا یہ ممکن ہے؟" - "انھیں ان معاملات سے مطلق دلچسپی نہ تھی - یہ سب کسی بدخواہ کی شرارت ہے - کسی سیہ باطن شخص نے یہ دروغ اختراع کیا ہے - ایسا ہرگز ممکن نہیں" !

(۲)

حقیقت یہ تھی کہ آج پولیس سپرنٹنڈنٹ نے کئی کانسٹبلوں کے ساتھ دھرن بابو کے مکان کی تلاشی لی تھی - منگل کے روز چار بجے شام کو ہیریسن روڈ کے کنارے ایک نوجوان بنگالی نے ایک انگریز افسر پر بم گولہ چلایا تھا - اس ہولناک حادثہ نے سارے شہر میں کھلبلی ڈالدی تھی - خانہ تلاشیوں کی گرم بازاری تھی - اور سب سے اچنبھے کی بات یہ تھی کہ دھرن بابو پر اس قتل کی اعانت کرنے کا جرم لگایا گیا تھا جو شخص سنتا اُسے حیرت ہوتی - دھرن بابو ! نہیں - وہ ہرگز ایسے معاملوں میں شریک نہیں ہو سکتے ! - وہ ایسے سیدھے سادے - سلامت پسند - اپنے کام میں شب و روز محو رہنے والے آدمی تھے کہ کسی کو اُن کے متعلق ایسی متوحش خبر سنکر اعتبار نہیں آتا تھا اور دھرن بابو پر یہ شبہ محض ایک مخبر کے بیان کی بدولت عائد ہوا تھا - مخبر نے صاف صاف کہا تھا کہ منگل کو چار بجے دھرن بابو ہیریسن روڈ پر موجود تھے - اور اُنہوں نے قاتل کو اپنے ہاتھ سے

بم گولہ دیا تھا۔ اسی بیان کی بدولت آج دھرن بابو کی خانہ تلاشی ہوئی۔ صندوق، الماریاں، کاغذات، خطوط ایک بھی تفتیش کنندہ افسر کی متجسّس نگاہوں سے نہ بچا۔ اور باوجودیکہ کوئی ثبوت ایسا نہ ملا جس سے دھرن بابو پر اعانت جرم کے شبہ کی تائید ہو سکے تاہم سپرنٹنڈنٹ نے انھیں زیرِ حراست لے لیا۔ سرلا انھیں پریشان کرنے والے واقعات کے اثر سے اس وقت بے چین ہے۔

وہ خیال کرتی تھی "ضرور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے غلطی ہوئی اُس نے دھوکا کھایا۔ منگل کو چار بجے دھرن عدالت میں ہوں گے، عدالت سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ ان کے موکل اور احباب اسکی تصدیق کر سکتے ہیں۔ مگر دھرن نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے روبرو اپنی بریت کا ثبوت کیوں نہ دے دیا۔ ممکن ہے اس وقت گھبراہٹ میں انھیں خیال نہ رہا ہو۔ اب ضرور انھوں نے صفائی کر لی ہوگی اور غالباً آتے بھی ہوں گے۔"

ان خیالات سے سرلا کا دل ذرا ہلکا ہوا۔ اسی اثناء میں ایک موٹر کار دروازہ پر آکر رُکی۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ وہ مسرت سے بیتاب ہوکر زینہ سے نیچے اُتری۔ موٹر گھر ہی کا تھا۔ مگر اس میں دھرن بابو کے بجائے جوتندرو بیٹھے ہوئے تھے۔ جو دھرن کے دلی دوستوں میں تھے۔

سرلا نے پوچھا "دھرن کہاں ہیں۔ دیکھا پولیس والوں نے کیسی حماقت کی ہے۔ تم جانتے ہو منگل کے دن شام کے وقت وہ ہائی کورٹ میں تھے۔ کیوں صفائی ہوگئی نہ۔ کب تک آئیں گے؟ تم اُن سے ملے تھے ؟"

جوتندرو کے چہرہ نے سرلا کے خیال کی تائید نہیں کی۔ وہ فکرمند اور دردناک نگاہوں سے سرلا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سرلا نے گھبرا کر کہا "جوتن! تم اس قدر پریشان کیوں ہو صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔؟"

جوتن نے کچھ سوچ کر جواب دیا "شاید دھرن آج شب کو نہ آسکیں۔ ممکن ہے کچھ توقف ہو۔ جونہی ان کی صفائی ہوگئی۔ غالباً ان کا تم سے ملنا ضروری ہے۔ میں خیال کرتا ہوں...." یہ کہتے کہتے جوتن بابو رک گئے۔ سرلا تاڑ گئی کہ یہ کوئی منحوس خبر لائے ہیں۔ گھبرا کر بولی "جوتن! مجھ سے اس وقت پہیلیاں مت بجھواؤ۔ جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہو۔ مجھ میں اب برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ کیا دھرن ابھی رہا نہ ہو سکیں گے۔ کیا انھوں نے اپنے بریت کے ثبوت میں یہ نہیں کہا کہ وہ منگل کو چار بجے عدالت میں تھے۔ میرے خیال میں یہ تو بہت کافی ثبوت تھا۔"

جوتندرو نے لمبی سانس لیکر کہا "وہ منگل کے دن سہ پہر کو وہ عدالت میں نہیں تھے۔"

سرلا "کیا! عدالت میں نہیں تھے۔ آخر تب کہاں تھے؟"

جوتندرو "یہی تو وہ بتاتے نہیں۔"

سرلا "کیوں آخر وجہ؟ کیا آپ ہی اپنے دشمن بنے ہیں؟"

جوتندرو "وہ مطلق کچھ نہیں ظاہر کرتے۔ عدالت میں ان کے دو بجے تک رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں گئے۔ مگر کہاں گئے اور دو بجے سے چھ بجے تک کہاں رہے۔ اس کا وہ کچھ بھی پتہ نہیں دیتے۔"

سرلا نے عالم وحشت میں سر کو ہاتھوں سے تھام کر کہا "میری عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ دھرن کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ اس سازش میں شریک ہوں۔ اگر وہ خود اپنی زبان سے کہیں تب بھی مجھے اعتبار نہیں آسکتا۔ مگر وہ صاف صاف حقیقت حال کیوں نہیں کہتے۔ کیا تم لوگوں نے انھیں سمجھایا نہیں؟"

جوتندرو "سمجھایا کیوں نہیں۔ گھنٹوں بیٹھے سر مغزنی کرتے

رہے۔ مگر جب کچھ ان کے خیال میں آئے۔ اور وہ ایسے کم فہم نہیں ہیں کہ ہم کو ان کے سمجھانے کی ضرورت ہو۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ یہ ایسے نازک موقع پر اُن کا کچھ صاف صاف نہ کہنا کیسے خطرناک نتائج پیدا کرے گا۔ مگر اس وقت وہ کسی کی نہیں سنتے۔ کہتے ہیں بلا سے میں چند سالوں کے لئے جلاوطن ہو جاؤں گا۔ جلاوطنی اور قید جھیلنے کے لئے آمادہ ہیں مگر منگل کو کہاں تھے۔ یہ نہیں بتاتے۔ اس لئے میں تمہارے پاس آیا ہوں کہ شاید کچھ تمہیں معلوم ہو۔ کچھ معلوم ہے؟ وہ زیادہ تر کہاں آتے جاتے ہیں؟"

سرلا نے سر ہلا کر جواب دیا "میں نے انھیں کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ میں تو اب تک اسی خیال سے خوش تھی کہ منگل کو چار بجے وہ ضرور کچہری میں رہے ہوں گے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ آخر وہ کیوں خاموش ہیں۔ کیا سمجھے ہوئے ہیں، ذرا مجھے اُن کے پاس لے چلو۔ شاید وہ مجھ سے کچھ اپنے دل کی بات کہیں۔ ضرور کہیں گے۔ میں انھیں سمجھاؤں گی مجھے یقین ہے کہ میں ان کی زبان سے حقیقت حال سن لوں گی۔ وہ میری درخواست کو رد نہیں کر سکتے۔ بس مجھے اُن کے پاس لے چلو۔"

سرلا کا گلا بھر آیا۔ جوتن دلاسہ و تسکین دہ لہجہ میں بولے "میرا بھی یہی خیال ہے کہ شاید تم سے وہ کچھ بتلائیں۔ اسی لئے میں تمہارے پاس آیا تھا۔ مگر اب رات زیادہ آگئی ہے۔ اور اس وقت اُن سے ملاقات کرنے کی کوشش فضول ہے۔ مجسٹریٹ کی اجازت ملنی مشکل ہوگی۔ میں کل تمہیں وہاں لے چلوں گا۔ ایشور نے چاہا تو سب اچھا ہی ہوگا۔ ہائیں! یہ کیا۔ دل کو ڈھارس دو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

سرلا کی آنکھوں میں اشک اُمڈے ہوئے تھے۔ مگر اُس نے ضبط کیا۔ اور جوتن سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی "جوتن۔ تمہاری ان عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میری زبان میں الفاظ نہیں ہیں۔ مگر میں انھیں فراموش نہیں کر سکتی۔"

سرلا کی آواز پھر رک گئی۔ وہ کیسی خوش خوش زینے سے اتری تھی۔ دھرن کی واپسی کی امید نے اُس کے چہرہ کو روشن کر دیا تھا۔ مگر اب اس پر حسرت و یاس کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ جوتن بابو آہستہ آہستہ فکرمند کمرہ سے باہر چلے گئے۔ وہ سوچتے جاتے تھے "غریب! ابھی اُسے کیا خبر کہ کیا بیتنے والی ہے۔ کاش وہ ظالم اپنی زبان سے کچھ کہہ دیتا۔ مگر تب بھی۔ عجیب گومگو کا معاملہ ہے۔"

(۲۲)

دس بج گئے تھے۔ سرلا نے کچھ نہیں کھایا۔ نوالے منہ سے باہر نکلے آتے تھے۔ وہ پلنگ پر گئی۔ مگر نیند نہ آتی تھی۔ میز کے سامنے اخبار لے کر بیٹھی۔ مگر اخبار ہاتھ میں تھا اور آنکھیں کھڑکی کی طرف۔ تب وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت دھرن کے پاس چلوں۔ چلکر مجسٹریٹ سے کہوں کہ مجھے اُن سے ملاقات کرنے دو۔ کیا وہ انکار کرے گا؟

ہائے۔ دھرن اس وقت کیا کرتے ہوں گے۔ کاش میں ان[کے] پہلو میں ہوتی۔ کیا وہ مجھ سے بھی اپنے دل کا حال چھپائیں گے۔ ک[یا] اس وقت انھیں میرا خیال ہوگا۔ کبھی کبھی اس کا دل جھنجھلا اُٹھتا اور وہ اپنے شوہر کو بے رحم خیال کرتی۔ کیا انھیں خبر نہیں کہ میں ک[تنی] بے چین ہوں۔ اتنے دنوں تک ساتھ رہنے پر بھی انھیں میرے دل ک[ا] اور میری محبت کا اندازہ نہ ہوا۔ وہ کیوں خاموش ہیں۔ وہ کیوں

ٹہلتے ٹہلتے اُس کی نگاہ دھریندر کی میز پر پڑی۔ خطوط کاغذات۔ اخبارات اوراق پریشان کی طرح بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ سرلا اضطراری طور پر بیٹھ گئی۔ اور انھیں سمیٹنے لگی اس کی نگاہ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی جو میز کے نیچے گرا

اس نے چاہا کہ اسے اٹھا کر دوسرے خطوط کے ساتھ رکھ دے۔ مگر اس پرزے پر چند ایسے الفاظ نظر آئے جو خود بخود اسکی آنکھوں میں چبھ گئے۔ یہ وہ الفاظ تھے جن کے پردہ میں اس کی پریشانیوں کا راز پوشیدہ تھا۔ "منگل کے دن ۹ بجے" سرلا چونک پڑی۔ اُس نے پرزے کو اٹھا لیا۔ منگل کے دن ۹ بجے ہی کا تو یہ واقعہ ہے۔ اُس نے ان الفاظ کو پھر غور سے دیکھا۔ کیا اس پرزہ کو ان واقعات سے کوئی تعلق ہے۔ کیوں میں نہ اُسے پڑھوں۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ انداز تحریر سے بھی وہ مانوس معلوم ہوتی تھی۔ مگر خط کو پڑھوں؟ سرلا باوجودیکہ شوہر کو دل وجان سے چاہتی تھی۔ لیکن انگریزی تعلیم کے اثر نے اُس کے دل میں یہ خیال قایم کر دیا تھا کہ مجھے اپنے شوہر کے پوشیدہ خطوط پڑھنے کا کوئی مجاز نہیں ہے کیا میں اس خط کو پڑھ لوں تو وہ مجھسے ناراض ہوں گے۔ یقیناً اس سے ان معاملات پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑے گی اس میں کوئی ایسی بات ہرگز نہیں ہوسکتی جو دھرن مجھسے چھپانا چاہتے ہوں۔ بالفرض اس میں کوئی مخفی بات ہی ہو۔ تاہم میں اس وقت اسے پڑھنے کی مستحق ہوں۔ تہذیب جدید کی یہ قیدیں ایسے نازک موقعوں پر عمل میں نہیں آسکتیں۔ کیا مجھے اُن کے رازدار بننے کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ میں ثابت کردوں گی کہ میرے دل میں بھی باتیں اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہیں جس طرح اُن کے دل میں۔

اس نے خط کھول کر دیکھا۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ سرلا ایک ہی نگاہ میں اُسے پڑھ گئی۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا گویا میرے بدن میں جان نہیں ہے۔ وہ پتھر کی مورت کی طرح بے حس و حرکت ہوگئی۔ اس کی انگلیوں کے بیچ میں کاغذ کا وہ پرزہ ہوا کے جھونکوں سے ہل رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں دیوار کی طرف گڑی ہوئی تھیں۔ اُس کا چہرہ خاک کی طرح زرد ہوگیا تھا۔ عضو مفلوج کی طرح اس کے دل ودماغ اس وقت بیکار ہوگئے تھے خط کا مضمون بھی خیال میں نہیں آتا تھا۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ یکایک اس کی نگاہوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ اور ساری کیفیت نظروں کے سامنے صورت پذیر ہوگئی۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور کرسی پر گر پڑی آہ اس خموشی کے یہ معنی ہیں! اسی لئے زبان پر مہر لگی ہوئی ہے" خیر۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ سرلا سوچنے لگی۔

بیشک یہ خط دھرن کو اس الزام سے بری کردے گا۔ جو اُن پر عائد ہے۔ کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔ میں اسے مجسٹریٹ کے سامنے رکھدوں گی۔ ذرا سی تحقیقات میں سارے واقعات کھل پڑیں گے۔ اور دھرن فوراً رہا ہوجائیں گے۔ لیکن اسکے بعد پھر کیسے نبھیگی! کیا اس کے بعد بھی ہم ایک دوسرے کی محبت کرسکیں گے۔!"

اسے پھر خیال آیا۔ کیا یہ مناسب ہے کہ میں اس راز کو اس طرح طشت ازبام کردوں جن کے مخفی رکھنے کے لئے دھرن یہ سب کچھ جھیلنے کو تیار رہے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ میں خموشی اختیار کروں۔ اور انھیں اس الزام کا خمیازہ اٹھانے دوں جس سے وہ بالکل پاک ہیں انھیں بچانا میرا فرض ہے۔ آخر اُس کے دل نے فیصلہ کرلیا۔ وہ کھڑکی کی طرف گئی۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر اپنے کمرہ میں آکر ایک چادر اوڑھ کر باہر نکل پڑی۔ نوکر چاکر سب سوگئے تھے۔ گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی نے اُسے باہر جاتے نہیں دیکھا۔

سرلا قدم بڑھاتے ہوئے تھوڑی دیر میں ایک خوبصورت مکان کے سامنے آکر رکی کمرہ میں لیمپ جل رہا تھا۔ اور ایک عورت میز پر بیٹھی ہوئی کچھ لکھتی دکھائی دیتی تھی۔ سرلا کو دیکھتے ہی اُس عورت گھبرا کر

پوچھا "سرلا! تم یہاں کہاں؟ اتنی رات گئے۔ کیا معاملہ ہے۔ کیا دھرن بیمار تو نہیں ہیں؟"

سرلا نے میز کے سامنے آکر کہا "کیا تم نے نہیں سُنا کہ دھرن پر حادثۂ بم میں شریک ہونے کا جرم عائد ہوا ہے۔ مخبر کا بیان ہے کہ جس وقت قاتل کے ہاتھ میں بم دیا گیا اُس وقت دھرن وہاں موجود تھے۔ یہ منگل کے چار بجے دن کا واقعہ ہے دھرن کا بیان ہے کہ مجھے ان سانحات کا مطلق علم نہیں۔ اور نہ اُس وقت میں وہاں تھا۔ لیکن یہ وہ نہیں بتاتے کہ اُس وقت تھے کہاں۔ میں تم سے پوچھتی ہوں منگل کے دن چار بجے شام کو وہ کہاں تھے"

وہ عورت چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی "منگل کو ۴ بجے!۔ اُس دن تو وہ..." کچھ کہتے کہتے رک گئی اور بہت مدھم لہجہ میں بولی "وہ کیوں وہ کچھ بتاتے نہیں کیا۔ سوا کچہری کے اور کہاں ہوں گے"

سرلا نے جواب دیا "نہیں اُس دن عدالت میں نہیں تھے" گر ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ "اُگل پڑی" اور اس معاملہ میں وہ اس لئے خاموش ہیں کہ شاید اظہار حال کسی کے نام نیک پر دھبہ لگا دے اب میرے سامنے ایسی بھولی نہ بنو۔ میں سب جان گئی ہوں۔ ہاں مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا ہے یہ دیکھو" یہ کہکر اس نے وہی خط میز پر پھینک دیا

اس عورت نے لپک کر خط اُٹھا لیا۔ اور اس پر ڈالتی ہوئی نگاہ ڈالکر کسی قدر بیباکانہ لہجہ میں بولی "مجھے کسی کا خوف نہیں ہے۔ بیشک دھرن کو مجھ سے محبت ہے۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہیں۔ تب سرلا نے تحکمانہ انداز سے کہا "تو تمہیں بچا کیوں نہیں لیتیں۔ اس خط کو مجسٹریٹ کے پاس بھیجدو۔ اور دھرن فوراً چھوٹ جائیں گے" یہ کہکر وہ لوٹ پڑی۔ اور اپنے خانۂ محزوں میں چلی آئی۔

تڑکا ہوگیا تھا۔ اور سرلا کی آنکھیں ابھی نہیں جھپکی تھیں۔ اسے اب دھرن کی رہائی کی فکر نہ تھی اس فکر سے اب وہ آزاد ہوگئی تھی۔ مگر جن فکروں نے اس وقت اسے گھیرا تھا وہ اس سے بھی زیادہ جانکاہ تھیں۔

"تھوڑی دیر میں وہ یہاں آتے ہوں گے۔ مجھ سے ملاقات ہوگی کیا میں ان سے مل سکوں گی؟ اب میں کس دعوے پر۔ کس بھروسے پر اُن سے ملوں گی۔ جب یہ میں جانتی ہوں کہ انھیں مجھ سے نہ کبھی محبت تھی اور نہ ہے۔ تو میں کونسا منہ لیکر ان کے سامنے جاؤں گی جب تک میں الفت کا خواب دیکھ رہی تھی۔ مجھے اُن پر اعتبار تھا۔ مگر اب! آہ اب میرے لئے زندگی میں کیا امید ہے میرا دل۔ میری جان میری آرزوئیں۔ میری زندگی کی خوشیاں سب ان کی ذات سے وابستہ تھیں۔ محبت سے عورت کا سہاگ قائم ہے میرا سہاگ اب کہاں!"

سرلا کی آنکھیں کھڑکی کے باہر سبزہ زار کی طرف لگی ہوئی تھیں گویا وہ مستقبل کے وسیع میدان میں قدم بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ اُس کے دماغ میں اب احساس کا مادّہ نہ رہا تھا۔ بھوک اور پیاس۔ نیند اور تکان۔ یہ ضرورتیں اسے بالکل محسوس نہ ہوتی تھیں۔ سست رفتار دن چڑھتا جاتا تھا اور سرلا وہیں کھڑکی کے سامنے انہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دھرن کی اب تک کچھ خبر نہ تھی۔ مگر سرلا کو اس کی زیادہ تشویش نہ تھی۔ وہ اپنے شوہر کو ہمیشہ ایک حلیم اور متین شخص سمجھتی رہی۔ اُس نے بارہا اُن سے اُن کی بے نمکی اور بے اعتنائی کی شکایت کی تھی۔ مگر اس خیال سے اس کے دل کو تسکین ہوگئی تھی کہ ان کی طبیعت ایسی متین واقع ہوئی ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ طبعاً اظہار جذبات سے محترز رہتے ہیں وہ اس کی طرف سے ہمیشہ بے تعلق سے رہتے تھے۔ کچھ پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں جاتی ہے۔ کیسے رہتی ہے۔ کن چیزوں کا شوق ہے ایسا شاذ ہی کبھی اتفاق ہوا تھا کہ وہ درگا پوجا کے دن سرلا کے لئے کوئی تحفہ لائے ہوں۔ سرلا سمجھتی تھی کہ مقدمات کی مصروفیت

ان بے اعتنائیوں کا باعث ہے۔ اسے یقین تھا کہ گو ظاہر نہ سہی۔ مگر دل سے وہ میری محبت کرتے ہیں۔ مگر اب ان سرد مہریوں کا راز سمجھ میں آگیا۔ وہ اب دوسری عورت کے دام محبت میں گرفتار ہیں۔ جب محبت کا رشتہ نہ رہا تو تمدنی رشتہ کس کام کا۔ مگر باوجود ان سرد مہریوں کے وہ شوہر کی محبت میں مخمور تھی۔ اُس نے انھیں اپنے دل میں جگہ دیدی تھی۔ اور اب کسی طرح مٹا نہیں سکتی تھی۔ خواہ وہ محبت اُس کے لئے سوہان روح ہی کیوں نہ ہو۔ بےشک یہ خیالات حسد اور جلن کے سبب سے پیدا ہوئے تھے۔ مگر حسد کی تیزی اور جلن کا ہی محبت کی کسوٹی ہے۔

بہت دیر تک سوچنے کے بعد سرلا اس نتیجہ پر پہنچی "میں اب ان کا دامن چھوڑ دوں گی۔ اس کے سوا میرے لئے اب اور کوئی تدبیر نہیں ہے میں نے اب تک نادانستہ انھیں قید جبر میں رکھا تو اب میں انھیں چھوڑ دوں گی۔ اُن کا گلا چھوٹ جائے گا۔ اُنکی زندگی آرام سے گذرے گی۔ ایشور کرے وہ ہمیشہ خوش رہیں۔ سرسبز ہوں۔ انھیں خوش دیکھکر میں بھی خوش ہو لیا کروں گی"!

انھیں خیالات میں دس بج گئے۔ سرلا اب تک وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ یکایک ایک گاڑی کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دھرن بیٹھے ہوئے تھے۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا مگر وہ بے جان لاش کی طرح بیٹھی رہی۔ زینہ پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور ذرا دیر میں دھرن کمرہ میں داخل ہوئے۔ سرلا اب بھی کچھ نہ بولی۔ اُسے الفاظ ہی نہ ملے دھرن نے اُس کے پاس آکر آغوش محبت میں لینا چاہا۔ اور بولے "کیوں سرلا تم میری خاطر بہت پریشان تھیں"؟ سرلا نے منہ پھیر لیا اور ہٹ گئی۔ دھرن نے کچھ خیال نہ کیا۔ کہنے لگے "پولیس والوں نے کیسی حماقت کی۔ خیر جو کچھ ہوا۔ وہ ہوا۔ کسی طرح خانہ عافیت میں تو پہنچے۔ رات بھر مصیبت میں مبتلا رہا"۔

سرلا خاموش اُن کے چہرہ کی طرف تاکتی رہی۔ کیسی مکر کی باتیں ہیں۔ دھرن کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہی بے تکلفی وہی آزادی۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ سرلا زیادہ متحمل نہ ہو سکی۔ ترش لہجہ میں بولی "تم یہاں کیوں آئے؟" دھرن نے تعجب آمیز لہجہ میں کہا "سرلا یہ کیسی باتیں کرتی ہو۔ اپنے گھر کے سوا اور کہاں جاتا۔ تم میرے آنے سے خوش نہیں معلوم ہوتیں۔ کیوں کیا بات ہوئی؟"

سرلا "ابھی اُس سے ملاقات کی یا نہیں۔؟"

دھرن "کس سے؟ تمہارا مطلب میں نہیں سمجھا"

سرلا "دھرن۔ اب یہ تجاہل مت جتاؤ۔ اب حیلہ سازیوں کا موقع نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم میں صفائی کے ساتھ گفتگو ہو جائے۔ مجھپر تمہاری ساری باتیں روشن ہو گئیں ہیں۔ ایک خط میری نظر سے گذر چکا ہے جو مجھے میز کے نیچے گرا ہوا ملا۔ یہ خط میں نے تمہاری معشوقہ کو دکھایا۔ اور غالباً اُس نے اسے مجسٹریٹ کے یہاں پیش کر دیا اس لئے اب مجھ سے دخل فصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری خوشی میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔ میں تمھیں شوق سے لطف زندگی اٹھانے کے لئے آزادی دیتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ باتیں مجھے اور پہلے کیوں نہ معلوم ہو گئیں ورنہ تمھیں اتنے عرصہ تک قید بے جا میں نہ رہنا پڑتا"۔

دھرن بغلیں جھانکنے لگا۔ آخر راز طشت از بام ہو گیا۔ میں نے کیا حماقت کی کہ خط کو چاک نہ کر دیا۔ اس نے وہ خط مجسٹریٹ کے یہاں دیکھا تھا۔ اور حافظہ پر بار بار زور ڈالتا تھا کہ کیونکر یہ وہاں پہنچا۔ مگر یاد نے کچھ کام نہ دیا تھا۔ اب حقیقت معلوم ہوئی۔ اور وہ اپنے اوپر جھنجلایا۔ مگر سرلا کی خوشامد کرنے لگا "میری جان! میں سخت نادم ہوں۔ واقعی مجھے سخت ندامت ہے۔ مگر کیا تم میری اس خطا کو

معاف نہیں کر سکتیں۔ اگر کسی کے کان میں اس کی ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو میری خیر نہیں۔ ابھی تک یہ بھید چھپا ہوا ہے مجسٹریٹ بڑا دانا شخص ہے۔ اُس نے خط کو دیکھکر مجھے تو رہا کر دیا۔ مگر اُسے عدالت میں پیش نہیں کیا۔ ابھی تک یہ راز سربستہ ہے مگر تم خوب جانتی ہو کہ لوگوں کو ایسی باتوں کی کیونکر تلاش رہتی ہے۔ پبلک کو دوسروں کی رسوائی و بدنامی میں مزہ آتا ہے۔ میری خاطر سے تم اس تذکرے کو زبان پر نہ لاؤ۔ غلطیاں انسان سے ہوتی ہی ہیں۔ اگر تم اسی میں خوش ہو تو حلفیہ کہتا ہوں کہ اب کبھی اُس کے دروازہ پر نہ جاؤں گا۔"

سرلا "کیوں تم اُس پر عاشق نہیں ہو؟ - اس کی آبرو کے خوف سے تم قید اور جلا وطنی جھیلنے پر آمادہ تھے۔ اور اب تم کہتے ہو میں اُس کے دروازے پر نجاؤں گا۔ کیا اتنی جلد دل سے نقشِ محبت مٹ گیا۔ ان فریب کی باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ تم شوق سے خوشیاں مناؤ۔ میں ذرا بھی مخل نہوں گی۔ حسد کا کانٹا کسی کے پہلو میں کھٹکنا نہیں چاہتی۔"

دھرن کرسی پر بیٹھ گئے اور غمناک لہجہ میں بولے "سرلا! ایسی باتیں بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہیں۔ جب تم دیکھتی ہو کہ میں حد درجہ نادم اور پشیمان ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اب اس سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔ تو تمہیں ایسی باتیں کرکے میرا دل نہیں دکھانا چاہئے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ ان باتوں کو پوشیدہ رکھنے کے لئے میں کس حد تک نقصانات اٹھانے کے لئے تیار تھا۔ اگرچہ میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا مگر مجھے جلا وطن ہونا گوارا تھا بجائے اس کے کہ منقل کے دن اپنے حرکات کا پتہ دوں۔ اب تک طرح طرح کی افواہیں اڑتی ہونگی۔ یقین مانو اس رسوائی کے مقابلہ میں میں جلا وطن ہونا بہتر سمجھتا ہوں۔"

سرلا "اگر راہِ محبت میں قدم رکھا ہی تو رسوائی کا کیا خوف! اگر تمہاری محبت سچی ہے تو تمہیں سوسائٹی کا اس قدر خوف نہ کرنا چاہئے۔"

دھرن "کیسی باتیں کرتی ہو سرلا! سوسائٹی کا خوف خدا کے خوف سے بھی زیادہ ہے۔ اگر تم نے یہ روش اختیار کی تو میری عزت خاک میں ملا دوگی۔ اور میرا مستقبل سیاہ ہو جائے گا میں سوسائٹی کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں گا۔ سرلا۔ تم اس وقت غصہ میں ہو مگر جب تمہاری طبیعت ٹھنڈی ہوگی۔ غصہ فرو ہو جائیگا اور تم اس مسئلہ پر غور کروگی تو یقیناً میری خطا معاف کر دوگی۔ ایسی بہت کم عورتیں ہوں گی جنھیں اپنی زندگی میں ایسی گتھیاں نہ سلجھانی پڑتی ہوں۔ میں مبالغہ نہیں کرتا ہوں۔ سوسائٹی میں ایسی باتیں آئے دن ہوا کرتی ہیں۔ مگر پردہ کے اندر۔ میں دوسری کا شیدا سہی۔ کیا تمھیں بھی میری محبت نہیں۔ اسی محبت کے صدقے تم ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں پختہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب پھر ایسا موقعہ کبھی نہ آئے گا۔" یہ کہکر دھرن باہر چلے گئے۔ اور سرلا وہیں خاموش بیٹھی سوچتی رہی "سوسائٹی کا شیرازہ ایسے کچے دھاگے سے بندھا ہوا ہے"!

و۔ ر

مولوی سیّد احمد صاحب دہلوی

مولوی سید احمد صاحب اپنی بہترین تالیف "فرہنگ آصفیہ" کی وجہ سے علمی دنیا میں بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ ایک نہایت بسیط، ضخیم، جامع، اور مستند اردو لغت ہے۔ آپ سے پیشتر کسی اہل زبان نے اس اہم کام کی طرف برائے نام بھی توجہ نہیں کی جس کے سبب اردو زبان ایک نامکمل اور ادھوری زبان خیال کی جاتی تھی۔ آپ نے چونکہ تقریباً اپنی تمام عمر اسی کی تحقیق میں صرف کر دی، اور اردو دنیا پر ایک غیر معمولی احسان فرمایا، اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ آپ کا مختصر علمی تذکرہ "ادیب" میں شائع کرکے بادہ نوشان بزم اردو کو ذوق روحانی حاصل کرنے کا موقع دیں:۔

مولانا موصوف نویں محرم ۱۲۶۲ھ مطابق ۸ جنوری ۱۸۴۶ء کو بمقام دہلی کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے اور شاہ صابر بخش کے باغ واقع فیض بازار میں ہوش سنبھالا۔ آپ مولوی حافظ سیّد عبد الرحمٰن صاحب مرحوم خلف مولوی سید خواجہ علی صاحب مغفور کے بیٹے ہیں۔ آپ کے جدّی بزرگوار سادات و علمائے بخارا سے حسنی و حسینی سیّد اور حضرت غوث پاک رح کی اولاد امجاد سے ہیں۔ ننیہالی بزرگوار حضرت موّت واقع یمن۔ (ملک عرب) سے اولاد و احفاد جناب امام جعفر صادق ع قبیلہ بالفقیہہ کی نیک یادگار ہیں، جنھیں ہمایوں بادشاہ کی وفات پر اس کی چاہیتی ملکہ (نواب حمیدہ بانو عرف حاجی بیگم والدہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ہند!) کمال ارادت و عقیدت سے باجازت سلطان روم حج سے واپس ہوتے وقت ۹۶۹ھ ہجری میں تیمناً اپنے پیارے خاوند کی فاتحہ خوانی کے واسطے ہمراہ لے کر آئی تھی۔ اور ان بزرگوں کے نام سے ایک بستی موسوم "عرب سرائے" ہمایوں بادشاہ کی قبر کے پاس آباد کر دی۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس قبر پر ایک عالیشان مقبرہ بنوا دیا۔ آپ کے ماموں حاجی مولوی سیّد عبد اللہ بالفقیہ صاحب رئیس شملہ و دہلی ایک بڑے مہمان نواز، امیر، پارسا و عابد مشہور امصار و دیار ہنوز زندہ و سلامت ہیں۔ عبادت الٰہی سے کام ہے۔ ہر وقت اصلاح حال و تزکیۂ باطن میں مصروف رہتے ہیں۔ حاجی صاحب کے پاس وہ قابل زیارت شجرہ اب تک موجود ہے، جو ان کے بزرگوار عرب سے لیکر آئے تھے۔

مولوی سیّد احمد صاحب نے درسی کتابیں بڑے بڑے اساتذہ سے گھر پر اور سررشتۂ تعلیم کی کتابیں مختلف سرکاری مدارس اور نارمل اسکول دہلی میں پڑھیں۔ تصنیف و تالیف کا شوق بچپن سے رہا۔ بالخصوص اُردو زبان کی تدوین پر جان و دل سے مائل و فریفتہ رہے۔ زبان اُردو کے شعرائے ماضی و حال کا کلام مدوّن دیکھا۔ شہزادگان دہلی و نیز نامی گرامی علما، فضلا، حکما اور شعرا کی صحبتوں میں بھی بیٹھے۔

ایام طالب علمی میں ایک فارسی منظوم طفلی نامہ اور ایک انشائے تقویت الصبیان۔ بقید تلازمہ اُردو میں تصنیف کی چنانچہ یہ انشا اسی زمانہ (۱۸۶۹ء) میں دہلی سے شائع ہوئی۔ پھر ۱۸۶۹ء میں ایک رسالہ کنز الفوائد (یعنی مناظرۂ تقدیر و تدبیر) تصنیف کرکے گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر گورنمنٹ کی طرف سے دو سو روپیہ کا انعام مرحمت ہوا۔ اور اول مرتبہ

سرکاری خرچ سے یہ کتاب چھپکر مشتہر ہوئی اور مصنف کو بھی بہت سی جلدیں عطا کی گئیں۔

آپ کو اپنے زمانۂ تعلیم سے یہ دھن لگی ہوئی تھی، کہ کوئی اردو کی مکمل مصطلحات یا کامل لغات جمع کی جائے۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء میں خدا پر بھروسہ کرکے یہ کام شروع کردیا۔ کنز الفوائد کے انعام نے اس کام کے حق میں آب حیات کا کام دیا۔ مصنف کی ہمت بڑھادی۔ اور اس رقم سے بہت سا ضروری سامان خرید کیا جس کے سبب سے آپ کی تصنیف و تالیف کا شوق اور بھی دوبالا ہوگیا۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء میں ایک اور کتاب موسوم بہ وقائع درانیہ اردو میں تالیف فرمائی۔ گورنمنٹ نے اس کتاب پر بھی ازراہ قدردانی ڈیڑھ سو روپیہ بطور انعام مرحمت فرمایا۔ اس سے اور بھی سہولت حاصل ہوگئی۔ اور موجودہ مشکلات دور ہوگئیں اور تدوین کا کام اس جوش کے ساتھ شروع کیا گیا کہ آپ کا ایک جوان بھائی محنت شاقہ کی وجہ سے مرض سل میں مبتلا ہوکر لقمۂ موت ہوگیا۔ افسوس!

چونکہ خداوند مطلق کو اُن کے ہاتھوں سے یہ کام لینا منظور تھا اس لئے مولوی صاحب اس صدمۂ عظیم پر بھی اپنے عزم صادق سے باز نہ آئے۔ اور اس طرح جان توڑ کر منہمک ہوگئے کہ چھ برس کے عرصہ میں لغات اردو کا بہت سا حصہ مسودات کی صورت میں تیار کرکے ابتدائی مسودات کی صفائی شروع کردی۔

ہمت اگر سلسلہ جنباں شود مور تواند کہ سلیماں شود

اسی زمانہ میں ڈاکٹر ایس۔ ڈبلو۔ فیلن صاحب انسپکٹر مدارس صوبۂ بہار ایک ہندوستانی انگلش ڈکشنری لکھ رہے تھے۔ اور انکو دہلی کے ایک ایسے اسکولر (ماہر زبان) کی ضرورت تھی جو اُن کی ڈکشنری کی تدوین میں مدد دے۔ چونکہ مولوی صاحب موصوف کی لغت کا تذکرہ گاہے گاہے اخبارات میں چھپتا رہتا تھا اس لئے ڈاکٹر فیلن صاحب نے پتہ لگاکر خود دہلی کا قصد کیا۔ اور وہاں پہنچکر انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے منشی فقیر چند کو۔ اور اُردو میں تیار کرنے کے واسطے مولوی سید احمد صاحب کو منتخب فرمایا۔ ڈاکٹر فیلن صاحب ارمغان دہلی کے تیار شدہ اجزا اور مسودوں کو دیکھکر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ہمارے ساتھ چلنے سے تم کو ہم سے اور ہم کو تم سے بہت کچھ مدد ملے گی۔ مولوی صاحب نے دو عذر پیش کئے۔ اوّل یہ کہ میرے لغات کے کام میں ہرج ہوگا۔ میں اس کا عاشق ہوں۔ اُس کے ہرج سے میری روح کو صدمہ پہنچیگا۔ دوم یہ کہ میں نے نارمل اسکول میں سرکاری وظیفہ پر تعلیم پائی ہے فی الحال نائب مدرس ہوں۔ حسب قاعدہ تین سال تک دوسری ملازمت نہیں کرسکتا۔ فیلن صاحب نے جواب میں فرمایا کہ آپ کے لغات کے کام میں ہرج نہوگا۔ آپ شوق سے اپنا کام جاری رکھ سکیں گے رہا دوسرا عذر، میں انسپکٹر صاحب مدارس حلقہ انبالہ اور صاحب ضلع بہادر دہلی سے اجازت دلوادوں گا۔ میں دانا پور پہنچکر دو چٹھیاں ہر دو صاحبان موصوف کے پاس بھیجوں گا۔ وہ بطیب خاطر آنے کی اجازت دے دیں گے۔ بالاخر مولوی صاحب دانا پور تشریف لے گئے، اور فیلن صاحب کے پاس مقیم ہوکر مصروف کار ہوے۔

فیلن صاحب ان کے استقلال اور محنت پسندی سے بہت خوش تھے۔ علاوہ تنخواہ کے اور بھی سلوک کرتے تھے۔ بعض اوقات منشی صاحب موصوف کے مکان پر آکر ان کی مصروفیت دیکھتے اور تعریف کرتے جس کا اشارہ انہوں نے اپنی کئی چٹھیوں میں کیا ہے۔

پورے سات سال میں فیلن صاحب کی ڈکشنری ختم کرکے ۱۸۸۰ء میں حسب طلب مہاراجہ الور اُن کا سفرنامہ لکھنے

کے لئے چلے گئے۔ چھ مہینے میں سفرنامہ تیار کر کے تنخواہ کے علاوہ معقول انعام لے کر گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب کی نائب مترجمی پر لاہور چلے آئے۔ یہ سفرنامہ دلچسپ اور قابل دید ہے۔

جن لوگوں نے ۱۸۶۵ء کے اخبارات "انجمن پنجاب" "کوہ نور لاہور" "اودھ پنچ" "اکمل الاخبار" وغیرہ ملاحظہ کئے ہوں گے وہ بتا سکتے ہیں کہ اس انداز کا سفرنامہ آج تک کسی رئیس نے نہیں لکھا جس قدر سفرنامہ تیار ہوتا جاتا تھا۔ مولوی سید احمد صاحب اُسکی ایک ایک نقل اخبارات میں دیتے جاتے تھے۔

ہنوز فیلن صاحب کی ڈکشنری زیر تالیف تھی کہ اس عرصہ میں مولوی صاحب نے چند اور کتب تصنیف فرمائیں۔ مثلاً ہادیُ النساء ٹھیٹ بیگماتی زبان میں نہایت دلچسپ اور شوق انگیز تحریر کی، جس پر فیلن صاحب نے صرف زوردار ریویو ہی نہیں لکھا۔ بلکہ گورنمنٹ بنگال میں سفارش کر کے بہت سی کتابیں فروخت کرا دیں۔ انشای ہادی النسا ۱۸۷۴ء سے اب تک اور لیبی تعلیم ۱۸۷۴ء سے تا حال متعدد مرتبہ چھپ چکی ہیں۔

۱۸۷۰ء کے اخیر سے ۱۸۷۲ء تک آپ نے اُردو زباندانی کے سلسلہ کا ایک نمونہ اخبار انجمن پنجاب میں چھاپنا شروع کیا تھا۔ یہ نمونہ ان کی مفصلہ ذیل کتب کا تھا جن میں سے ارمغان دہلی کے سوا باقی کتابوں کے چھاپنے کی ابتک نوبت نہیں آئی۔ اور آتی بھی کیونکر! فرہنگ آصفیہ کے اخراجات، وقت کی قلت، اور دیگر مصائب نے ان کی بلند حوصلہ طبیعت کے پر پرواز توڑ دئیے تھے اگر زمانہ نے فرصت دی تو شائد یہ آرزوئیں بھی پوری ہو کر رہیں! تکمیل الکلام یعنی خاص پیشہ وروں کے اصطلاحات۔ تحقیق الکلام یعنی اُردو زبان کے نکات جن کی جھلک رسالہ "علم اللسان" مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور میں دیکھ لیجئے۔! رس کھان۔ یعنی ٹھیٹ ہندی زبان کے دوہوں، گیتوں، پہیلیوں، مکرنیوں، بھجنوں وغیرہ کا عمدہ مجموعہ ہے۔ ریت بکھان یعنی اہل ہنود کے اعلے خاندانوں کی رسمیں۔ ناری کتھا۔ یعنی ہندو عورتوں کی روزمرہ دلچسپ بول چال بطور مکالمہ۔ قواعد اردو۔ لغات النسار۔

۱۸۸۱ء میں آپ نے ارمغان دہلی کے نام اپنی ڈکشنری کا پہلا حصہ جس میں حرف الف ممدودہ کے الفاظ ڈیڑھ سو صفحوں میں کلاں تقطیع پر درج ہوئے تھے چھاپ کر شائع کیا۔ اس حصہ کو دیکھکر جان لینا چاہئے کہ مولف فرہنگ آصفیہ کی آرزو یہ تھی کہ ساری کتاب اسی طرز پر حسب مسودۂ اولین چھاپی اور مشتہر کی جائے۔ مگر زر کثیر کہاں سے لاتے۔ جو اس پر بھی لگاتے، اور اپنی ضروریات زندگی کو بھی پورا کرتے۔ ناچار افسردہ خاطر ہو کر بیٹھ رہے اور موجودہ صورت پر ہی اکتفا کی۔ اب ارمغان کے اس حصہ کو بھی فرہنگ میں شامل کر دیا، تاکہ یہ نمونہ آئندہ فرہنگ نگاروں کے لئے مشعل راہ ہدایت ہو۔

اسی اثنا میں آپ نے اور کئی چھوٹی موٹی کتابیں مفید خلایق لکھیں۔ جن میں سے کچھ تو چھپ گئیں اور اکثر مسودات کی صورت میں پڑی رہ گئیں۔ مطبوعہ کتب کے نام یہ ہیں:۔

تحریر النسا یعنی ہادی النسا کا دوسرا حصہ، لڑکیوں کا قاعدہ، لڑکیوں کی پہلی کتاب، بی راحت زمانی کا قصہ، جس سے وقت کی قدر مقصود ہے۔ اخلاق النسا، بچوں کا رکھ رکھاؤ۔ یہ سب کتابیں تعلیم نسوان کے متعلق اُنہی کی زبان میں لکھی گئیں ہیں۔ علم اللسان، جس میں ہر ایک زبان کی ابتدائی، وسطی اور آخری حالت بطور لکچر بیان کی ہے۔ رسوم دہلی جس میں پیدائش سے بیاہ، شادی اور مرنے تک کی رسمیں نہایت دلچسپ عبارت میں بیان کی ہیں۔

غیر مطبوعہ کتب میں سے بعض کے نام اوپر آگئے ہیں، اور بعض کے یہ ہیں۔ جو اُن کے بعد لکھی گئیں۔ سیر شملہ، مع تاریخ شملہ جو سر وقار الامرا بہادر وزیر دکن کی تشریف آوری کے موقع پر بمقام شملہ اُن کی یادگار میں پیش کی (یہ کتاب انڈین پریس الہ آباد سے عنقریب باجازت مصنف شائع ہونے والی ہے۔) اُردو ضرب الامثال۔ روزمرہ دہلی۔ رسوم اعلیٰ ہنود ان دہلی حالات فرقہائے مختلفہ مع رسوم۔

جب مولوی سید احمد صاحب ڈاکٹر فیلن صاحب کی ڈکشنری سے فارغ ہوکر آلور۔ اور آلور سے لاہور نائب مترجمی کے عہدہ پر آئے تو خیال کیا کہ اتنی بڑی لغات کا چھاپنا میری احاطۂ قدرت سے باہر ہے۔ نیز ایسی مطول کتاب کی خریداری اہلِ ہند کی مقدرت سے بعید ہے۔ لہذا اصل کتاب کا خلاصہ کرنا اور ۱۸۸۲ء سے طور رسالہ نکالنا شروع کیا۔ اس موقع پر حسب ضرورت و مصلحتِ وقت نظائر، نوٹ، وجہ تسمیہ، اور مادّہ وغیرہ کا پورا التزام نہیں رکھا بلکہ معانی بعیدہ سے بھی احتراز فرمایا۔ لیکن بااین ہمہ وہ خلاصہ بھی ایسا طویل و ضخیم ہوا کہ اس کے چھپوانے کا عقدۂ مشکل پھر بھی حل نہو سکا۔

بالآخر سین مہملہ تک چالیس نمبر نکال کر آئندہ رحمت خداوندی کے امیدوار ہوکر بیٹھ رہے۔ لیکن تصنیف و تالیف کا مشغلہ ترک نہ فرمایا۔ وہ اپنے اشغال و افکار میں مصروف تھے کہ اونکی دعا کا تیر نشانہ پر پہنچ گیا۔ اُن کی امید کا پودا سرسبز ہونے کو آیا۔ یعنی ۱۸۸۸ء میں سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام نظام کی مبارک صورت میں ایک فرشتۂ غیبی ملک دکن سے شملہ میں بارانِ رحمت بنکر نزول فرما ہوا۔ یہ اُس زمانہ میں شملہ ہائی اسکول کے ہیڈ مولوی تھے۔ صرف ایک عرضی کے وسیلے سے اُن کے حضور تک پہنچ گئے۔

پورا مسودہ پیش کیا۔ مطبوعہ رسالے اور دیگر کتب نفیسہ تحفۃً اُن کے سامنے رکھے اور حضور نظام کے نام نامی پر ڈیڈیکیٹ کرنے کی اجازت لی۔ الغرض کُل مسودہ مع رسالجات شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی کے سپرد ہوا کہ اس پر رپورٹ کریں۔ سید صاحب نے قابل تحسین رپورٹ کی، جس کی نقل جلد چہارم میں موجود ہے۔ اس پر سرِدست پانچسو روپیہ کا انعام اور چار سو جلدوں کی خریداری منظور ہوئی۔ اور ختم کتاب پر معقول انعام کا وعدہ کیا گیا۔ پس اسی وقت سے اس کتاب لاجواب کے طبع ہونے کی بنیاد پڑ گئی۔ اور نام اُس کا "فرہنگ آصفیہ" رکھا گیا۔

غرض جس لغات کی ابتدا ۱۸۶۸ء میں کی گئی تھی وہ ۱۸۹۲ء میں ختم ہوئی۔ اور ۱۹۰۱ء میں بہمہ وجوہ تکمیل کو پہنچکر حضور نظام والا مقام کی نظر تلطف سے یائے تحتانی تک شائع ہوگئی ؎

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

اس عرصہ میں آپ کئی مرتبہ حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۹۰ء میں، دوسری بار ۱۸۹۳ء میں، تیسری دفعہ ۱۸۹۵ء میں، چوتھی بار ۱۹۰۱ء میں۔ پہلے سفر میں سر آسمان جاہ بہادر کے عروج کا، دوسرے میں نزول کا زمانہ دیکھا۔ تیسرے سفر میں نواب سر اقبال الدولہ بہادر کا دور دورہ نظر آیا۔ چوتھے سفر میں سر مہاراجہ کشن پرشاد کا موجودہ عہد نظر افروز ہوا۔ اور ہر ایک سفر میں کچھ نہ کچھ کام بنتا رہا۔ لیکن افسوس کہ حضور نظام کی حضوری کا شرف حاصل نہ کر سکے جس کی آپ کو کمال آرزو تھی۔ چنانچہ اسی شوق میں آپ نے ایک مضمون موسوم بہ "پیکر خیال" اپنے عرض حال میں لکھا جو قابل دید ہے۔ اور جلد چہارم کے اخیر میں درج ہوا ہے۔

جس وقت یہ فرہنگ ختم ہوگئی، تو حسب وعدہ پانچہزار روپیہ

کا انعام مرحمت ہوا۔ اور بعد میں پچاس روپیہ ماہوار کا وظیفہ بھی مقرر ہوگیا۔

فرہنگ آصفیہ میں ساٹھ ہزار کے قریب لغات، محاورات، مصطلحات، ضرب الامثال وغیرہ موجود ہیں۔ گورنمنٹ پنجاب نے بھی ازراہ قدردانی ۱۹۰۱ء میں پانچسو روپیہ کا انعام اور ہزار روپئے کی خریداری سے مصنف کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

علیا حضرت قیصرۂ ہند جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ بادشاہ انگلستان اور لارڈ کرزن وائسرائے ہند کی طرف سے بھی تعویت کا اعزاز بخشا گیا رئیس رامپور اور رئیس ٹونک نے بھی خریداری سے دل بڑھایا۔ ۱۹۰۶ء میں جس وقت شہزادہ پرنس آف ویلز دہلی میں تشریف لائے، تو سر ڈبلیو لارنس صاحب بہادر چیف آف دی اسٹاف کے وسیلہ سے ایک پُرتکلف نظم "خیر مقدم" اور رسالہ رسوم مسلمانان پیش کیا جس کی قبولیت سے حضور پرنس آف ویلز بہادر بالقابہ نے مفتخر فرمایا۔ چنانچہ یہ "خیر مقدم" اخبار پایونیر، ومورننگ پوسٹ وغیرہ میں بھی مع خبر اعزاز قبولیت شائع ہوگیا تھا۔

مولانا موصوف کا مفصل حال فرہنگ آصفیہ کے سر دیباچوں، اس کے ہر حصہ کے دیباچوں، اور جلد چہارم کے خاتمہ سے بھی معلوم ہوسکتا ہے۔ اور یا اُن کی خودنوشت سوانح عمری سے جو کسی موقع پر شائع کی جائے گی۔

الغرض، مولوی سید احمد صاحب نے زبان اُردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے اور ابھی تک اسی میں منہمک ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا آپ کو تادیر زندہ وسلامت رکھے۔

شہیر (فتحپوری)

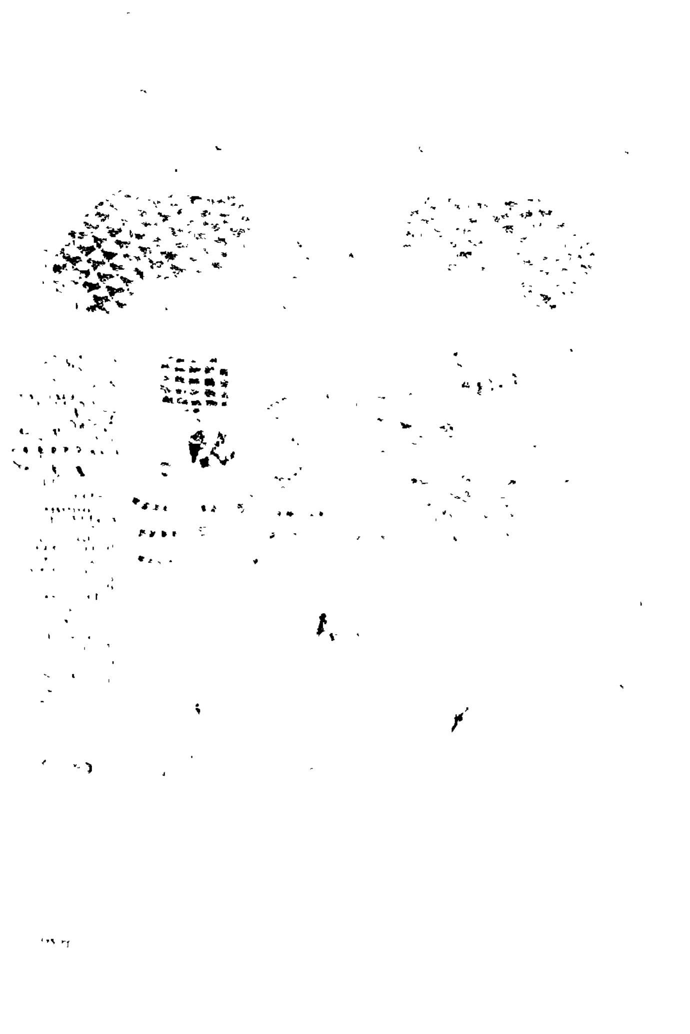
مندر سری رنگ جی واقع ترچناپلی

اس مندر کا، جس کے اندر قصبۂ سری رنگم کا بڑا حصہ ہے، طول شمال سے جنوب تک ۲۹۰۰ فٹ، اور عرض مشرق سے مغرب تک ۲۵۰۰ فٹ ہے۔ گویا یہ ۲۴۴ بیگھے آراضی پر پھیلا ہوا ہے اتنا بڑا مندر کسی مقام پر نہیں ہے۔ سری رنگم کا خاص مندر سات فصیلوں کے اندر ہے۔ جابجا چاروں طرف چھوٹے بڑے اٹھارہ گوپر بنے ہوئے ہیں۔ جن میں دو بہت بڑے ہیں۔ اور باقی سب چھوٹے۔ ان کے بیچ میں بہت سے دروازے بھی ہیں۔

باہر کے چاروں طرف کی فصیلوں کے درمیانی حصہ میں ایک ہی طرح کا ایک ایک بڑا دروازہ ہے جو گوپر کی طرح معلوم ہوتا ہے اگر ان دروازوں پر گوپر بنائے جاتے تو اُن کی اونچائی قریب ۳۰۰ فٹ کے ہوجاتی۔ ان میں سے ترچناپلی کی طرف کا جنوبی دروازہ اُنچائی میں ۴۳ فٹ اور لمبائی میں (دہنے بائیں) ۱۴۰ فٹ اور عرض میں ۱۰۰ فٹ ہے۔ دروازہ میں بڑے بڑے پتھر کھڑے کئے ہوئے ہیں جن میں سے بعض ۴۰ فٹ سے بھی زیادہ اونچے ہیں۔ جنوبی دروازہ سے جاتری لوگ اندر کے ساتویں کوٹ میں داخل ہوتے ہیں۔ جہاں ایک ہسپتال ہے اور ہر روز بازار بھی لگا کرتا ہے۔ اس کوٹ کے درمیان چاروں طرف پختہ سڑک بنی ہوئی ہے جس کے بازوؤں میں معمولی لوگوں کی بستی ہے جنوبی



...نگ ناتھ

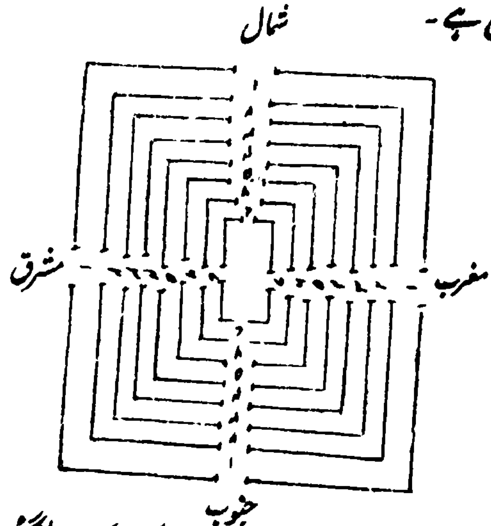


اندرونی حصہ مندر سری رنگ ناتھ

انڈین پریس الہ آباد

دروازہ سے چار پانچ سو گز پر کاویری ندی کی جنوبی شاخ کی ایک چھوٹی سی شاخ واقع ہے جس میں جاتری لوگ اشنان و دان کیا کرتے ہیں۔ کاویری کی شمالی شاخ، جس کو کولرون کہتے ہیں مندر کے شمالی دروازہ سے آدھے میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر ہے۔

چھٹویں کوٹ میں تین طرف چھوٹے چھوٹے، اور جنوب کی طرف ۷ درجہ والا ایک بڑا گوپر ہے۔ کوٹ کے اندر چاروں طرف سڑک کے بازوؤں میں برہمنوں اور پنڈوں کی آبادی اور دوکانات ہیں۔ چاروں بازوؤں کی دیوار تخمیناً ۲۰ فٹ اونچی ہے۔



پانچویں کوٹ میں چاروں طرف ایک ایک چھوٹا گوپر، اور کوٹ کے اندر چاروں طرف سڑک کے بازوؤں میں برہمنوں اور پانڈوں کے مکانات ہیں۔

چوتھے کوٹ کے جنوب اور شمال میں ایک ایک چھوٹا گوپر اور مشرق کی طرف ۱۵۲ فٹ اونچا ایک بڑا گوپر ہے اس کے اوپر کا حصّہ ناتمام ہے، اگر کامل ہوتا تو وہ ۲۰۰ فٹ سے زیادہ اونچا ہو جاتا۔ اس کے نیچے کا دروازہ ۴۴ فٹ اونچا ہے۔ اس کوٹ میں کئی ایک بڑے بڑے منڈپ بنے ہوئے ہیں جن میں سے

ہزار ستون کا منڈپ تخمیناً ۴۵۰ فٹ لمبا اور ۱۳۰ فٹ چوڑا ہے اس منڈپ میں ۶۰ صف ہیں اور ہر ایک صف میں ۱۶ ستون ہیں اور ہر ایک ستون ۱۸ فٹ اونچا ہے۔ اس کوٹ کے مشرق والے بڑے گوپر کے غرب میں بھی ایک منڈپ ہے جس میں سنگ تراشی کا کام بہت اعلیٰ درجہ کا کیا ہوا ہے۔ گھوڑوں اور سواروں کی پوری پوری شکلیں بنی ہوئی ہیں تیسرے کوٹ میں جنوب و شمال کی طرف ایک ایک گوپر اور مغرب کی طرف ایک کھڑکی ہے۔ جنوبی گوپر کے سامنے جانب شمال گرڑ منڈپ میں گرڑ کی ایک بہت بڑی رنگین بنی مورتی ہے۔ اس کے شمال میں ایک چبوترہ کے پاس سونے کا ملمع کیا ہوا گرڑ ستمب ہے۔

کوٹ کے گوشہ پر "چندر پشکرنی" نامی ایک مدوّر خوبصورت تالاب ہے جس میں جاتری لوگ اشنان اور مارجن کرتے ہیں اس کے پاس مہالکشمی کا بڑا مندر، رامچندر کی مورتی، اور ویکنٹھ ناتھ بھگوان کا قدیم استھان ہے۔ وہاں کئی ایک دیوتا اور رشیوں کی بھی مورتیں ہیں۔ دوسرا کوٹ ۱۹۰ فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے جس کے غرب میں ایک دروازہ اور جنوبی حصّہ میں دالان اور منڈپ ہیں۔

پہلے کوٹ کا دروازہ جنوب میں ہے۔ کوٹ کے شمالی حصّہ میں سری رنگ جی کا نج مندر ہے، جس کے نیچے کا حصّہ مدوّر اور اوپر کا سکھر طلائی ملمع کا ہے۔ مندر کے پیچھے کی چھت میں دیوتاؤں کی مورتیں کندہ ہیں۔ سری رنگ جی کے نج مندر کے پیچھے ایک کوپ (باولی) اور ایک مندر ہے جس کے پیچھے پیتل کا ایک ستمب زمین میں نصب ہے۔ وہاں سے سری رنگ جی کے نج مندر کا سکھر دکھائی دیتا ہے سکھر پر ایک سونے کا کلس ہے۔ تھوڑی دور آگے ایک اونچے دالان میں بھی ایسا ہی ایک ستمب نصب ہے، جہاں سے

واسدیوجی کی وہ برہنہ صورت نظر آتی ہے، جو مندر کے بیکھر پر ہے۔ مندر کا پوجاری ایک روپیہ لے کر جاتری کی طرف سے سرینگ جی کی پوجا اور کافور کی آرتی کر دیتا ہے۔ جو جاتری روپیہ نہیں دیتا وہ اوقات مقررہ پر درشن کر کے چلا جاتا ہے۔ مندر میں درشن کرنے والوں کا ایک ہجوم رہتا ہے۔ خاص مندر ایک چھوٹی سی کوٹھری کی طرح ہے۔ سرینگ جی کے خزانے میں سونا۔ چاندی۔ پنا۔ ہیرا۔ اور لعل وغیرہ سے جڑے ہوئے لاکھوں روپیہ کے جواہرات اور ظروف ہیں۔ جو انہی کے متعلق ہیں۔

سرینگ جی کا موجودہ مندر سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ کل مندر ایک ہی وقت میں نہیں بنا۔ بلکہ بتدریج، موقع بموقع اس کی توسیع ہوتی گئی یہاں ہر سال ایکادشی کا بڑا میلہ ہوا کرتا ہے۔ اس موقع پر ایک بڑا پنڈال بنایا جاتا ہے اور اس میں قسم قسم کی تصاویر (جو دیوتاؤں، دیویوں، حاکموں، سپاہیوں اور قیدیوں وغیرہ کی ہوتی ہیں) کھینچی جاتی ہیں۔ اس پنڈال کی تیاری میں تخمیناً چار ہزار روپیہ صرف ہوتا ہے۔

سرینگ جی کا ذکر مندرجہ ذیل پرانوں میں موجود ہے۔ بخیال طوالت وہ واقعات یہاں نہیں لکھے گئے۔

(۱) سریمد بھاگوت۔ سکندہ ۱۰ ادھیائے ۷۹
(۲) متس پران۔ 〃 - ۲۲
(۳) پدم پران۔ پاتال کھنڈ۔ اترارده 〃 - اوّل
(۴) والمیک راماین۔ اتر کانڈ۔ ۱۲۱ - دان سرگ
(۵) سرینگ مہاتم ادھیائے۔ ۱-۲-۳-۴-۵-۶-۸-

ہ۔م۔ر

نوجوان بیوہ کی شب تنہائی

"وہ نہیں آیا! نہیں آیا اور نہیں آسکتا، ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا کے جھونکو! جاؤ، جاؤ، مجھے نہ چھیڑو۔ میرے سینہ کی آگ کو نہ بھڑکاؤ۔ تم بیشک روح کو تازہ کرنے والی چیز ہو۔ تم بلاشبہ قلب کو عجیب فرحت بخشتے ہو مگر یاد رکھو کہ تم خود کوئی چیز نہیں ہو۔ مطمئن دماغ، اور بادہ وصل سے سیراب دل کے لئے تم اس وقت بہترین نعمت ہو لیکن اس دل، آہ، اس کمبخت بیچین و بے قرار دل کے لئے جو فرقت کی آگ سے جل رہا ہے، تم زہر آلود نشتر ہو، تم اس کے زخموں کے لئے نمک ہو، ہاں! تم خونخوار اژدہے ہو، جاؤ! جاؤ!! تم جلتی ہوئی آگ پر تیل چھڑکتے ہو تم کسی کی یاد کو ساتھ لاتے ہو اور ہر بار ایک نیا نشتر لگاتے ہو۔ جاؤ! جاؤ!! مجھے نہ ستاؤ۔ مجھے نہ رلاؤ"

"کیا تم میری زلفوں کو پریشان کرنے، میرے گیسوؤں کو درہم برہم کرنے آئے ہو؟ یہ ٹھیک ہے چلو! خوب زور سے چلو!! اپنا کام کرو، بیشک انھیں پریشان کردو! انھیں درہم برہم کردو!! اور تھوڑی سی خاک لاکر ان پر ڈالدو!!! یہ مجھے چھیڑتے ہیں۔ مجھ سے دل لگی کرتے ہیں"

"پیارے ماہتاب! کیا تو بھی اب رخصت ہوتا ہے؟ کیا تو بھی مجھ سے منہ چھپانے لگا؟ ہاں اس وجہ سے کہ میں تجھ میں اور اُس منور چہرہ میں کچھ مشابہت پاکر تجکو شوق سے رہی تھی، اور دل بہلا رہی تھی، خیر، بسم اللہ جائیے! آپ بھی جائیے!! آپ بھی

ہ چھپا بیٹھے !!! میں دل میں اٹھنے والے درد کی چمک سے دل
بلاؤ نگی، میں آج ان حسرتوں اور تمناؤں سے لڑنے کا شغلہ
ناؤں گی، آج ان سب کا گلا گھونٹونگی، سب کا خون کردوں گی،
ور سینہ کے اندر، نہیں خاص دل میں دفن کروں گی۔ جلاؤں گی؟
پرواہ نہیں، پھونکدینگی؟ بہت خوب پھر آہوں کے ساتھ دھواں
بنکر نکلیں گی؟ مناسب ہے۔ خون بنکر اشکوں کے ساتھ بہینگی؟ بہتر
ہے مگر نہیں! ہرگز نہیں!! انھیں میرے سینہ کے اندر قید ہونا
ڑے گا۔ بیشک ان کو دل کے اندر گھٹنا ہوگا۔ میں حکم دیتی ہوں
آگ لگائیں، جلائیں!! پھونک دیں!!! مگر باہر نہ نکلنے پائیں۔

"اچھا! یہ ستاروں کی چمک کیوں کم ہوتی جاتی ہے؟ کیا
یہ بھی رخصت ہو رہے ہیں؟ رخصت! آہ، یہ کوئی لفظ ہے
یا زہر سے بجھا ہوا نشتر؟ اور خونخوار خنجر؟ او ظالم! چبھ اور چبھ، بیٹھ
اور بیٹھ، چیر اور چیر، اچھی طرح ٹکڑے کر۔ کاش یہ دل نہ بنتا، اسکا
وجود ازل سے نہ ہوتا"

"آہا! کیا دنیا میں کوئی اور بھی مجھسا مصیبت زدہ حسرت
نصیب، اور درد دل کا مریض ہے؟ سنوں کیا کہتا ہے؟ "پی کہاں"
"پی کہاں" آ، اے میرے ہم داستان آ۔ مگر تو تو اپنے پی کو ڈھونڈتا
ہے، بلاتا ہے، ہاں تو تجھکو "پی" کے مل جانے کی امید ہے۔
خوش نصیب، بڑا خوش نصیب۔ تو میرے پاس کیوں آئے گا۔ تو
ایک خوشگوار، نہایت ہی دلچسپ امید سے دل بہلاتا ہے۔ آہ!
میرے پاس وہ آئے جس پر یاس کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو، جس سے
دائمی ناامیدی نے یہ دلچسپ مشغلہ بھی نہایت بے رحمی، اُف،
سخت بے دردی کیساتھ چھین لیا ہو جس کی زندگی موت سے
لاکھ درجہ بدتر ہو۔ تکلیف دہ ہو۔ زندگی! نفرت، نفرت، نہایت
ہی بُری چیز، سخت تکلیف دہ زمانہ۔ مگر میرے لئے۔ اس خوش
قسمت پپیہے کے لئے نہیں۔ اُسکی زندگی تو قابل رشک ہے۔ "انتظار"
"امید" "شوق" "تلاش" کس قدر پیارے لفظ ہیں، کس قدر
دلچسپ اور خوش آیند مشغلے ہیں۔ "او "پی" کے تلاش کرنے والے!
جا، جا، یہاں نہ بول، اس اجڑے ہوئے، ہمیشہ کے لئے اجڑے
ہوئے امید اور شوق کی باتیں یاد دلاکر، زندہ درگور حسرت نصیب
اور مایوس دلوں کو نہ دکھا۔ جا! کسی چمنستان میں، ہرے بھرے
گلزار میں جا، اور وہاں اپنے پی کو تلاش کر۔

پی کا خیال، پی کا شوق، پی کی حسرت دید رحم! او آسمان رحم!!
دل پھٹا، دماغ چلا، سینہ شق ہوا، اور جگر کباب ہوا۔ ترحم! او میری
قوت حافظہ ترحم!! مجھے چھوڑ دے، مجھے دیوانہ بننے دے، مجھے پاگل
ہونے دے، مجھے گریبان چاک کرنے دے ورنہ میری جان لے۔

متقی امروہوی

نظام المشائخ دہلی اُردو زبان کا یہ ماہوار پرچہ مولوی محمد آلواحدی صاحب کی ایڈیٹری میں دہلی سے نہایت آب وتاب کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ صوفیہ مشائخ کی دینی ودنیوی اغراض کی حمایت اس کا مقصد خاص ہے۔ ہندوستان میں بہت سے اُردو رسائل شائع ہوتے ہیں۔ مگر صرف "نظام المشائخ" ہی ایک ایسا پرچہ ہے، جو اس بات کا دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ اپنے احاطۂ مقاصد سے باہر قدم نہیں نکالتا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب، جو آجکل بلاد اسلامیہ کی سیاحت کو تشریف لے گئے ہیں، اس کے اعلیٰ مدیر ہیں۔ ان کے سفر کے حالات بھی اسی میں سلسلہ وار شائع ہو رہے ہیں، جو بجائے خود نہایت دلچسپ ہیں۔ اس کے قلمی معاونین کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، جسمیں کئی مسلم الثبوت اہل قلم واساتذہ شامل ہیں۔ ہم "نظام المشائخ" کی اس ترقی وکامیابی پر اپنے مکرم دوست کو مبارکباد دیتے ہیں۔ حجم ۲۰ صفحات ماہوار، قیمت سالانہ ؟ فی پرچہ ؟ ملنے کا پتہ فیض بازار دہلی۔

"سائنس اینڈ ریلجن"

یعنی

"علمِ طبعیات اور مذہب"

مائی ڈیر تمنا! آپ کے لطف سے میں نہایت خوشی اور دلچسپی کے ساتھ محجوب ہو رہا ہوں اس لطف پر وہ لطف اور بڑھ گیا جو آپ کی توجہ سے "ادیب" میں پیدا ہو گیا ہے۔ آج میں ایک ٹکڑا اپنی طویل نظم "سائنس اینڈ ریلجن" کا "ادیب" کے واسطے بھیجتا ہوں، یہ نظم پانچسو اشعار سے زیادہ کی ہے۔ اس کے بعد اور نہیں بھیجوں گا۔

نہیں ترجیح ممکن بے مُرجّح[1] علم کہتا ہے

عدم پر کیوں ہوئی ترجیح ہستی کو سبب کیا ہے

کسی ذی عقل سے یہ فعلِ[2] ترجیحی ہوا صادر

ہے ناداں مادہ وہ فعل عقلی پر نہیں قادر

کہا دہری نے، بن[3] جاتی ہے خود ہر شے ضرورت پر

مگر نوعیں ہیں بے حد اور نہیں سب ایک صورت پر

نظامِ عالمِ ہستی کو ہے درکار حکمت بھی

خرد، تدبیر، ارادہ، اختیار، اور علم و حکمت بھی

مسلّم ہے کہ ظرفِ مادہ ہے عقل سے خالی

تو کیونکر اُس نے حکمت اور صنعت کی بنا ڈالی

ہوا بے عقل عالم کس طرح وقت اور ضرورت کا

بنا موجد وہ کیونکر ہر نئی ترکیبِ صورت کا

نہیں[4] ہوتا علاقہ علّت و معلول کا زائل

تو معلول اپنی علت سے ہوا کیوں بُعد پر مائل

کروڑوں[5] سال بچھڑا کس طرح معلول علت سے

بلا علت کو یہ فہم توقف کس جبلّت سے

ہوا[6] ہے سائنس خود قائل کہ استعداد حادث ہے

تو اجزائے بسیطہ میں قدیم ایجاد حادث ہے

قدم[7] علت کو ہو، معلولِ علت ہو مگر حادث

وہ ہے اک جزوِ علت، کُل بھی حادث، جزو اگر حادث

نہ تھی ذرات[8] میں کیوں قوتِ ایجاد پہلے سے

وہ خود تھے تو نہ تھی کیوں اُن میں استعداد پہلے سے

رہی جنبش[9] تو کیوں رکھا معطّل کاروبار آخر

کیا کس فہم سے نوعوں کا برسوں انتظار آخر

تو کیا کہتی رہی امید اُن کی آج، کل، پرسوں،

کبھی وقت آئے گا، یوں بھی رہے وہ منتظر برسوں

عبث[10] اور بے نتیجہ مادہ برسوں رہا کیوں کر

کیا کس شے نے پھر آمادہ اُس کو قابلیت پر

سمجھ[11] کیوں آئی وقت اور حاجتِ ایجاد کی اُس میں

تو کیا عقل آ گئی ترکیبِ استعداد کی اُس میں

جو دہری[12] مادے کے باخرد ہونے کا قائل ہو

تو ہر ہر جزو کے ادراک کا اثبات مشکل ہو

---

[1] یہ منطق کا مسلّم مسئلہ ہے کہ ترجیح بلا مرجح ممکن نہیں۔ [2] بحث یہ ہے کہ عالم عدم سے وجود میں آ گیا تو وجود کو عدم پر ترجیح کس ذی عقل نے دی [illegible] سائنس خود بے عقل تسلیم کرتا ہے [illegible] ترجیح کا فعل عقلی صادر نہیں ہو سکتا۔ [3] یہ قول [illegible] نہیں ہے، مادہ سے ہر شے اپنی ضرورت کے وقت خود بخود بن جاتی ہے درست نہیں [illegible] تمام مختلف صورتوں کی ہیں [illegible] حکمت نہیں بن سکتیں۔ [4] سائنس کا مسئلہ ہے کہ علت سے معلول کا علاقہ زائل نہیں ہوتا [illegible] [5] [illegible] کروڑوں سال [illegible] معلول [illegible] علت سے بچھڑا [illegible] [6] [illegible] سائنس [illegible] استعداد مادہ کو حادث کہتا ہے [illegible] اس صورت میں اجزائے بسیطہ کو قدیم [illegible] ایجاد کو حادث کہنا چاہیے [illegible] اجزائے بسیطہ [illegible] [7] [illegible] علت قدیم اور معلول [illegible] [illegible] [8] [illegible] [9] سائنس [illegible] حرکت [illegible] [10] [illegible] [11] [illegible] [12] [illegible]

وہ بھو خود کور بھی، بے عقل بھی، بے دست و پا بھی ہو
تعجب ہے مصوّر بھی، مقنّن بھی خدا بھی ہے

کرے ترتیب عالم اور خود ہو بے خبر اُس سے
وہ خود خلقت سے نادان خلقِ عالم ہو مگر اُس سے

جو ٹھہرے[۱] مادہ حادث تو بے شک بات بن جائے
ثبوتِ بعد استعداد میں دقت نہ پیش آئے

جو زیرِ بحث علمی، مسئلہ قوت[۲] کا آتا ہے
تو کیا کیا سینس زورِ انتقال اس میں دکھاتا ہے

جُدا ہر قوتِ طبعی کو پہلے اس نے مانا تھا
الگ عالم میں اُس نے فعل ہر قوت کا جانا تھا

ہے اب قائل کہ در اصل ایک ہی سب کی حقیقت[۳] ہے
تغیرِ ہیئتوں کا منتقل ہونے کی صورت ہے

وہ کل قائل تھا جس کا، آج اس حالت سے منکر ہے
اسی فہم اور اسی قوت پہ وہ قدرت سے منکر ہے

وجودِ کائنات اک شکل پر ان میں سے جانو تم
طریقِ نشو[۴] مانو، یا طریقِ خلق[۵] مانو تم۔

جو مانو نشو کو، تو مادّے سے ابتدا سمجھو
اُسی سے اُس کے اجزائے بسیطہ کی بنا سمجھو

عناصر اُنشو میں پھر آئے، ان اجزا کی قوت سے
معادن ہو گئے موجود پھر ایجادِ فطرت سے

نباتات اور حیوانات رنگِ نشو پھر لائے
جہانِ نشو میں اجسام موجودات یوں آئے

ہوئیں فرعیں جُدا اصلوں سے اور پھیلیں زمانے میں
بڑھیں پھر ہر طرف نوعیں جہاں کے کارخانے میں

جمارنگِ توالد پھر تو حیوانوں میں کثرت سے
صفاتِ اصل پھر پانے لگیں نوعیں وراثت[۶] سے

تباین[۷] نے بدل دیں جب صفات اونکی اصول انکی
تو نوعیں مختلف آنے لگیں پیشِ نظر اُن کی

بقا میں[۸] پھر پڑا جھگڑا کہ رکھئے زندگی باقی
مٹی شکلِ ضعیف آخر، رہی شکلِ قوی باقی

ہوا پھر انتخاب[۹] اُن میں سے اک مدت گذرنے پر
رہا انسان، سب نوعوں سے اعلیٰ منتخب ہو کر

تباین[۱۰] ہو، مگر وہ حد سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا
عرض سے وہ تجاوز کر کے جوہر ہو نہیں سکتا

صُور[۱۱] کا مادّے کے ساتھ دہری نے قدم مانا
تو کیا مابعد کی شکلوں میں اُن کو منقسم جانا

۱ے اگر مادہ حادث مان لیا جائے تو بعد استعداد کی بحث میں دقت نہ پیش آئے یعنی وہ حکیم مطلق کی حکمت کا نتیجہ قرار پا جائے۔ ۲ے قوتِ طبعی ۳ے سینس نے پہلے روشنی، پانی، ہوا، حرارت، قوت کہربائی وغیرہ سب قوتوں کو علیحدہ علیحدہ تسلیم کیا تھا لیکن اب تحقیقاتِ جدیدہ سے اس بات کا قائل ہوا ہے کہ سب قوتوں کی اصلیت ایک ہی ہے، انتقال سے مختلف شکلیں ظہور میں آتی ہیں، مثلاً حرکت قوت کہربائی کی جانب، قوت کہربائی حرارت کی جانب، حرارت روشنی کی جانب منتقل ہو جا[illegible] مدعی ہوا تھا اس مسئلہ ۴ے ارتقا نشو یعنی مادہ کی قوتِ طبعی سے خود ہی وجود میں آنا ۵ے ارتقا خلق یعنی خالق مطلق کی قدرت اور حکمت سے پیدا ہونا ۶ے قانون وراثت سینس کہتا ہے [illegible] کا مطلب ہے کہ ہر نوع اپنی اصل کی [illegible] کچھ نہ کچھ ضرور [illegible] مطلب ہے کہ جب نشو کے طریقے سے وجود [illegible] بہت پہنچی تب توالد کی کثرت ہوئی [illegible] صفات اصل پانے لگیں ۷ے تباین سینس کی [illegible] ہر نوع اپنی اصل سے کسی نہ کسی صفت میں ضرور متغایر ہوتی ہے، مطلب یہ کہ [illegible] صفات [illegible] اصل سے بدل دیا تب انواع کی حالتیں مختلف نظر آنے لگیں ۸ے تنازع للبقا ہے، سینس کے [illegible] یعنی تمام موجودات میں [illegible] قوی نوع ضعیف کو مٹا دیتی ہے [illegible] ۹ے انتخاب طبعی سینس کے قوانین میں داخل ہے یعنی فطرت مختلف انواع میں سے قابل کو منتخب کرتی ہے مطلب یہ ہے کہ انسان موجودات میں منتخب ہو کر اعلیٰ قرار پایا ۱۰ے بعض علمائے سینس اس جانب بھی گئے کہ تباین سے نوع اپنی اصل سے [illegible] بدل سکتی ہے کہ وہ عرض سے جوہر ہو جائے۔ جوہر وہ ہے جو قائم بالذات ہو جیسا جسم، اور عرض بخلاف اس کے قائم بالغیر ہے جیسا رنگ [illegible] مطلب یہ کہ اصل نوع جوہر ہے اور فرع عرض، یہ محال ہے کہ عرض [illegible] جوہر ہو جائے اس امر پر [illegible] ایک نوع کبھی نوع جداگانہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں، اپنی ہی اصل کی نوع میں فرع ہو سکتی ہے، البتہ تباین سے کچھ تغیر شکل میں ممکن ہے ۱۱ے دہری کا قول ہے کہ تمام صورتیں جو ہمیشہ عالم ظہور میں آتی رہیں گی مادہ کے ساتھ ہی[illegible] تو کیا وہ صورتیں مابعد کی شکلوں میں جن کو حادث کہنا چاہئے، تقسیم ہو گئی تھیں؟

اگر شئے[۱] ہے تو ہر صورت قدم کی شکل باقی ہے
قدم کے ساتھ تکرارِ قدم پھر لازم آتی ہے
قدم[۲] ذاتی ہو یا بالغیر، مانا ہے محال اُس کا
نہیں ممکن کسی منطق سے عالم میں زوال اُسکا
جو پچھلی[۳] صورتوں سے صورتیں پہلی ہوئیں زائل
تو کیوں پھر فہم دونوں کی حداثت کا نہ ہو قائل
وہ[۴] باقی ہیں تو ٹھہرا لغو فعلِ مادّہ بے شک
عبث رکھا انھیں برسوں تک اور رکھے گا برسوں تک
قدم مانا صُور کا تو ہوا دہری کو یہ حاصل
کہ نابود تو مشکل، کہ موجود تو مشکل
یقیں[۵] دورِ حقیقی کا ہو، ایسا ہے کہیں ممکن
مقدّم ہو وجود اپنے سبب پر، یہ نہیں ممکن
خدا سے مادّہ، اور مادّے سے ہو خدا پیدا
تو حیرت ہو کہ پہلے کون ان میں سے ہوا پیدا
کہیں دورِ[۶] معیّت ہو تو کچھ حجّت نہیں ہم کو
وہ ممکن، اور اُس سے سابقہ رہتا ہے عالم کو

تسلسل[۷] کس طرح تسلیم کر لینے کے قابل ہے
کہ وہ برہانِ سلمی[۸] اور تطبیقی[۹] سے باطل ہے
غلط[۱۰] رازِ حیات آیا ہے علم و فہمِ دہری میں
کہ ہے وہ جلوۂ فعلِ عناصر وہمِ دہری میں
وہ اک وصفِ وجودی ہے نہیں حاوی ہے علم اُس پر
وہ نفسِ ذات سے زائد، مگر ہے ذات کے اندر
عقیدہ ہے یہ دہری کا کہ ہے ہر شے ہمیشہ سے
نہ اوّل ہے، نہ آخر، یوں ہی عالم ہے ہمیشہ سے
زمانہ ابتدا کی حد نہ رکھے، یہ سمجھ کیا ہے
کسی کے دل میں کیا ایسا تصور آ بھی سکتا ہے؟
یقیناً[۱۱] آ نہیں سکتا، تو اب کہئے محال اُس کو
ہے ناقص عقل اُس کی جو کرے ممکن خیال اُس کو
غلط ہے سائنس پر یہ شک کہ ہے خالق سے برگشتہ
وہ ہے اک علم، دیوانہ نہیں ہے جو ہو سر گشتہ
وہ دہریت ہے جو چاروں طرف آوارہ پھرتی ہے
غلط راہوں میں اکثر ٹھوکریں کھا کھا کے گرتی ہے

---

۱ اگر یہ شے یعنی مادّہ قدیم صور مابعد میں تقسیم ہو رہی ہیں تو قدم کے ساتھ قدم کی تکرار لازم آتی ہے، اور یہ محال ہے ۲ قدم کی دو صورتیں ہیں، ایک قدم ذاتی یعنی اُس شے کی اصلیت جس کی ذات خود اسکے ظہور کی مقتضی ہو جیسے شمس، دوسری قدم بالغیر یعنی اُس شے کی اولیت جس کا ظہور دوسرے کی ذات سے متعلق ہو جس طرح شمس کا نور۔ فلسفہ کی کسی دلیل سے دونوں کا زوال پذیر ہونا ثابت نہیں ۳ مطلب یہ ہے کہ اگر صور قدیم صور مابعد میں تقسیم ہوئیں، تو صور قدیم باقی نہ رہیں، زائل ہو گئیں، اور زوال حادث ہونے کی دلیل ہے۔ ایسی حالت میں صور قدیم اور صور مابعد دونوں کا حادث ہونا کیوں نہ تسلیم کیا جائے ۴ اگر دہری یہ کہے کہ صور قدیم اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں تو یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ مادّہ نے مدتوں انہیں عبث یعنی بیکار رکھا، اور یہ فعل لغو ہے جو قانون فطرت کی رو سے جائز نہیں ۵ دورِ حقیقی یعنی دو چیزوں کے وجود کا ایک دوسرے پر منحصر ہونا۔ اسکی اتنی شکل ہی پیدا ہو سکتی ہے، موجود شے کا وجود اپنے سبب یعنی اُس شے کے وجود سے سبقت پا جائے جس نے اُسے موجود کیا ہے، مثلاً خدا سے مادّے کا اور مادّے سے خدا کا وجود، یہ عقلاً محال ہے ۶ دورِ معیّت، یعنی ایک علت کے دو ایسے معلول جن میں سے بعض کا وجود بعض پر منحصر ہو مثلاً ابر سے سایہ اور سایہ سے ظلمت، ابر علت ہے جس کے سایہ اور ابر دونوں معلول ہیں ۷ تسلسل، یعنی ایک غیر مختتم سلسلہ جو ازلی و ابدی کی غیر محدود جانب کی طرف چلا جائے، اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ خدا کا وجود کسی دوسری شے پر مبنی ہو، اور اس شے کا وجود کسی اور شے پر۔ ایسے غیر متناہی سلسلے سے خدا کی ذات قدیم نہیں رہتی بلکہ حادث قرار پاتی ہے۔ اور یہ محال ہے ۸ برہان سلمی منطقی برہان ہے، مثلاً مثلث کی دو ساقوں کو غیر متناہی فرض کرکے دونوں کے بیچ میں جو مسافت واقع ہو اُس میں خطوط اَرے کھینچ دئے جائیں۔ پھر جتنا طول ساقین کو دیا جائے گا، اتنی ہی مسافت پیدا ہوگی اور اس میں خطوط بڑھیں گے مگر سب خطوط دو حدوں میں گھرے رہیں گے ۹ برہان تطبیقی، مثلاً دو سلسلے دو امور کے قائم کئے جائیں۔ ایک قبل کا اور دوسرا بعد کا، پھر اس دلیل سے کہ حد ناقص حد زائد کے برابر نہیں ہوتا دونوں سلسلوں میں سے ایک ایک عدد کو ساقط کرتے جائیں یہاں تک کہ ایک سلسلہ ختم ہو جائے اور دوسرا باقی رہے، یہ براہین اس قدر دقیق اور وسیع ہیں کہ اس مختصر نوٹ میں نہیں سما سکتے۔ ۱۰ حیات کا اصل راز دکھلا تو دہری نے کہا کہ وہ مادّے کے اجزائے صغار کا اور عناصر ممتزجہ کی باہمی تاثیر کا ایک ظہور ہے ۱۱ یہ منطق کا ایک مسلّم مسئلہ ہے کہ جس امر کا تصوّر دل میں آ ہی نہ سکے، وہ محال ہے ۱۲ مطلب یہ ہے کہ زمانہ جو موجود ہوا اور گذرتا ہے اُس کی ابتدا کی کوئی حد نہ ہو اور تسلسل کے ساتھ اُس کی ہمیشگی غیر محدود مانی جائے، ایسا تصوّر ہو ہی نہیں سکتا لہٰذا محال کو ممکن کہنا مقتضائے عقل نہیں ہے۔

کبھی ظن اِس طرف مائل کبھی وہم اُس طرف راہی
عبث فکر اِس طرف مائل، غلط فہم اُس طرف راہی
نتیجہ فکر کا ہے فلسفہ، قطعی وہ کیونکر ہو
تغیّر اس میں اکثر ہو، تبدّل اس میں اکثر ہو
جو مذہب فلسفہ ہی پر ہو، تو مشکل یہ پیش آئے
کہ بدلے فلسفہ تو رنگ مذہب بھی بدل جائے
تغیّر جس کا شیوہ اور تبدّل مدعا ٹھہرا
وہ مذہب تنگ ٹھہرا پیرہن ٹھہرا ہوا ٹھہرا

احمد علی شوق قدوائی

رُباعیاتِ رشید

(از سید محمد مصطفی مرزا عرف پیارے صاحب رشید لکھنوی)

بالوں کی سیاہی، آہ! سیہات گئی　　کہتے ہیں جوانی جسے وہ رات گئی
پیری نے زبان کی فصاحت کھو دی　　لو صبح ہوئی، رات گئی، بات گئی

مدت سے جدائی کا الم باقی ہے　　اک عمر سے یہ نشانِ غم باقی ہے
یوں جھک کے جوانی سے ملاقات ہوئی　　جب سے ابتک کمر میں خم باقی ہے

سو رنج میں روز کم سے کم کھاتا ہوں　　جو کوئی نہ کھا سکے وہ غم کھاتا ہوں
پیری کی طرف دیکھ کے آتی ہے شرم　　جب اپنی جوانی کی قسم کھاتا ہوں

کیوں کنج لحد کے متصل جاؤں گا　　کہنے کے لئے مطلب دل جاؤں گا
پیری سے نہیں گا منکسر اور رشید　　جھکتے جھکتے زمیں سے مل جاؤں گا

پیری سے رہا نہ کوئی یارا ہم کو　　قوت کا قوا کے تھا سہارا ہم کو
تنہا موت آ کے کیا بنا لیتی رشید　　پیری نے شریک ہو کے مارا ہم کو

مذاقِ عشق

تشبیب قصیدہ

خداوندا بحسن یوسف و عشق زلیخائی　　نہ آئے دامن عصمت پہ میرے داغ رسوائی
بحق نرگس مست بتاں یا بتا آنکھیں دے　　کہ جو ہوں انتظار وعدۂ فردا میں پتھرائی
مطیع حکم کر یوں قوت ادراک کو میری　　سمجھ میں کچھ نہ آئے پھر کسی کی بات سمجھائی
دماغ ایسا عطا کر اپنے سودائے محبت میں　　جسے ہو نخچہ مغزان جنوں سے تازہ بینائی
وہ دل دے ہو جبیں پر جس کی نقش قشقہ وحشت　　فضائے ملک وحدت میں کرے سجدہ جبیں سائی
وہ دل دے اے خدا جو کشتۂ طرز تغافل ہو　　وہ دل دے جو کہ ہو جا نداوہ ناز خود آرائی
وہ دل دے جو کہ ہو سرتا قدم اک آبلہ یارب　　تپک میں جسکی شوخی حسن کی دیتی ہو دکھلائی
گل زخم محبت سرزمین دل سے یوں نکلیں　　کرے خود حسن ازل ہر شوق سے جن کا تماشائی
وہ ناخن دے کریں خون جگر سے جو حنا بندی　　رہیں داغ جنوں کی سینہ کاوی پر جو شیدائی
ترے وادی وحدت میں ہو مجھ سا دیوانہ　　ترے صحرائے قدرت میں نہ ہو مجھ سا سودائی
نہاں کر میری آب و گل میں اپنے جذب الفت کو　　مخمر حق سے کر میرے اشکال ہیولائی
مجھے اُس بحر عشق سرمدی کا ایک قطرہ دے　　کہ جس نے انبیا کے چشمہ دل میں جگہ پائی
بوقت ذبح اسمعیل جسنے دلدہی کی تھی　　خلیل اللہ کو دیدے کے تعلیم شکیبائی
بیاض دیدہ یعقوب جسکی صبح عشرت ہے　　سواد مجلس یوسف ہو جسکی شام تنہائی
چراغ حسن سے پایا تھا کاجل جسنے زنداں میں　　کہ چشم پیر کنعاں میں لگائے کحل بینائی
وہ عشق ایسا ہو جس سے امتحاں گاہ مصیبت میں　　لیا ایوب دل نے مدتوں درس شکیبائی
یہی ہے باعث بیداری بخت مہ کنعاں　　یہی ہو حاصل تعبیر رویائے زلیخائی
اسی نے میکدے میں حسن کی ساقی گری کی ہو　　اسی نے بزمگاہ ناز میں کی بادہ پیمائی
یہی دامان عرو حسن میں ہمراز وحدت تھا　　یہی بیت الحزن میں تھا انیس شام تنہائی
ید بیضا کا تمغہ وادی ایمن میں لوا کر　　اسی نے حضرت موسیٰ کی کی تھی عزت افزائی
سرالبتان وحدت میں اسیکا دور دورہ تھا　　اسی گلشن میں خوشبو سے گل باغ الست آئی
اسی کی خصلتیں کچھ کم نہیں ہیں خرق عادت سے　　اسی کے دم قدم کیسا تھ اعجاز مسیحائی

جلایوں بے ستوں کیا تیشۂ فرہاد سے کاٹا — اسی نے بازوؤں میں کوہکن کے دی توانائی
اسی کی ہر رگ دل تھی زمام ناقۂ لیلیٰ — یہی تو نجد میں تھا رہ نورد دشت رسوائی
اٹھیں دود سیاہ آہ کی جب آسماں پیما — تو اس نے کعبۂ لیلیٰ میں اذاں ناقوس کی دلوائی
یہی وہ خضر ہے پیر طریقت بن کے مجنوں کو — زمانے میں بیاباں در بیاباں خاک چھنوائی
اسی نے دیکھ کر جوش خروش حضرت موسیٰ — کمی دیدار میں دارو دئے بیہوشی تھی ہوائی
یہی کرتا رہا پروانگی شمع حقیقت کی — یہی حسن ازل کا بدو فطرت میں تھا شیدائی
یہی تھا واقف اسرار آداب عبودیت — اسی نے آستان حسن پر کی ناصیہ سائی
اسی کے آئینہ خانہ میں ہر سو ایک جلوہ ہے — اسی سے حسن خود بیں کو ہوا دعوائے یکتائی
یہی ہے مقتل جاں دادگان خنجر ابرو — یہی ہے مشہد دلخستگان تیغ رعنائی
یہی ہے مسکن آوارگان دشت ناکامی — یہی ہے مدفن افتادگان کوئے رسوائی
یہی تھا حکمراں ملک حقیقی و مجازی میں — اسی نے عمر بھر دونوں جہانوں کی پذیرائی
اسی وادی کے ہر ذرہ میں وسعت ہے بیاباں کی — اسی دجلہ کے ہر قطرہ میں جزر و مد دریائی
بنا کر اس نے دار الضرب لیں داغ کے سکے — ہر اک پہلو پہ اُس کے حسن کی تصویر کھچوائی
خیال حسن میں اک ذرہ اس نے خاک ڈالی تھی — انھیں ذروں سے پروانوں نے خلعت ہمسری پائی
یہی ہے موجد علم حدیث شمع و پروانہ — یہی ہے واضع قانون صبر و ناشکیبائی
ہر اک ناسور اسکا دوربین جلوۂ جاناں — ہر اک زخم اسکا اک گلدستۂ باغ تماشائی
یہی ہے راکب اسپ سریع السیر بیتابی — یہی ہے تازیانہ بردار شوق جادہ فرسائی
نبرد اہل دل میں یہ کماں بردوش رہتا ہے — اسی کے ناوک دلدوز میں ہے زور گیرائی

یہی ہے گوہر نایاب اُس بحر حقیقت کا
طلسم لفظ کن سے جسنے کی ہے قدرت آرائی

عزیز لکھنوی

رباعی

آئی رمضاں کے بعد وہ عید سعید — ہر قفل دہن کے واسطے جو ہے کلید
مل مل کے گلے منا رہے ہیں خوشیاں — احباب کو یا رب ہو مبارک یہ عید

محوی لکھنوی

جلوۂ جاناں

دیکھ برزخ میں ذرا جلوۂ طاؤس حرم — ہے یہی جلوہ جو ہے رشک صد باغ ارم
کیف نظارگی حسن کی دل میں ہے عجب — شوق ہے مجھکو تو آ دیکھ تماشا کوئی دم
ان میں جو آ کے ملا وہ بھی ہوا دریا دل — آشنا قلزم عرفاں کے ہیں کیسے حاتم
پھر یہ دیدار کہاں اسکو سمجھ جلوۂ برق — دیکھ دم بھر میں ہوئی جاتی ہے صحبت برہم
طرفہ نیرنگ ہے یہ رنگ تماشائے جمال — شوق کو رام کر اپنا کہ یہ ہے آہوئے رم
ہو جو کم کیف تو پھر ذوق تماشا کیا ہو — جذبۂ شوق ہو تو کیف کا کیوں نشہ ہو کم
حال کی قدر نہیں وقت نہیں قابو میں — ہوش در دم کو سمجھ دم ہے یہ دم بھر میں عدم
نقش موہوم مٹا واہمہ خلاق نہ بن — کوچۂ وہم کی ہے راہ بہت خم در خم
ہے ادھر سرو سرافراز سراسر مائل — خاکسار اُسکو پسند آئے ترے سر کی قسم
سینے بریاں ہوئے جن کے وہ ہے انکا دمساز — ہے وہ محو جگر خستۂ و چشم پر نم
ناظر جلوہ ہیں وہ جو ہیں ازل سے ہی سعید — جن کا ہے طالع فرخندہ نہیں بخت دژم
روبرو کیوں نہ ہو وہ آئینۂ غیب و شہود — چشم باطن جو ہو وا ہوش تک ہوں گوش اصم
پاس انفاس کے جادے سے چلا آ سالک — سن تو یہ بانگ جرس گونجتی ہے کیا پیہم
جوگ کے سادھوؤں کا آ کے مہابن دیکھو — تم کو آئے گا نظر جلوۂ طاؤس حرم
شام سندر ہے اسی بن کی گپھا میں پنہاں — نے نوازی میں ہے سرمست وہ جان عالم
کنز مخفی ہے وہ استار خفا میں روپوش — چشم دل کے لئے مشہود ہے سر اعظم
خلوت دل میں یہی ایک ہے دمساز رفیق — جان و دل سے یہ ہوا مونس جان و ہمدم
جذبہ سکر میں مجذوب تماشا ہے نظر — دیکھ لے سالک مجذوب نگاہ محرم
کیوں نہ ہو جلوۂ مستور تجلی پیکر — مظہر فیض ہوں جب خود کشش کاف کرم
ساقی محو تغافل تجھے کچھ ہوش نہیں — خود نما جلوہ ہے خود جلوہ نمائے عالم
یہ دم چند جو صحبت ہے غنیمت گن اسے — دیکھ لے شوق سے تو بھی رخ زیبائے صنم
بے ہمہ با ہمہ ہو تو بھی خود آرا بن کر — وسوسہ ہو نہ کوئی خطرہ نہ غرہ نہ بھرم

نودشناسی کی خدائی میں جدائی ہو کہاں　　رنگ تسکیں میں ہو تمکین مسرت ہو نہ غم

وصل ہو یاں جو ہوا پردہ پڑا ابر زخ کا
طلب و طالب و مطلوب ہوئے ضم باہم

ساقی دہلوی

شمع

اے شمع کسقدر ہی سوز و گداز تجھ میں　　عشاق کے دلوں کا ہی بند راز تجھ میں

فرقت کی آگ اونکے دلمیں ہے جل رہی ہیں　　تیرے بھی تن بدن سے شعلے نکل رہے ہیں

غمگیں ہیں اور انکا مطلوب جا نگزا ہے　　تو رو رہی ہی تیرا اسلوب جانگزا ہے

وہ کاٹتے ہیں راتیں اپنی جو تارے گن کر　　تو کاٹتی ہے راتیں اپنے ترارے گنکر

اک شمع رو کی لو سے دل انکا جل رہا ہے　　جسم اپنی لو سے تیرا جلکر پگھل رہا ہے

انکی نگاہ میں گر اک روے آتشی ہے　　تیری نگاہ میں خود آتش بھری ہوئی ہے

کاکل کے عشق سے ہو نازل بلا جو ان پر　　تو بھی گھری ہوئی ہی اپنے دھوئیں کے اندر

زخمی اگر دل انکا ہی ابروؤں کے خم سے　　کھاتی ہو زخم تو بھی گلگیر کے ستم سے

بہتا ہی خون انکا آنکھوں سے ہو کے پانی　　تیرا بدن پگھل کر دکھلاتا ہے روانی

تجھ پر بھی رات بھاری انپر بھی رات بھاری　　تو اور گریۂ غم وہ اور آہ و زاری

لیکن ہو ان میں تجھ میں اے شمع فرق اتنا　　دلسوز ان کے احباب اور تو گھڑی ہے تنہا

تنہا ہی تو سحر تک تنہا ہی تو رہے گی　　ہے کون جس سے دلکا کچھ حال تو کہے گی

کچھ منھ زبان پائی لیکن نہیں وہ گویا　　گویا ہو تو سنے کون افسانہ درد و غم کا

آہیں تری ہیں ظالم گو دل ہلانے والی　　لیکن نہیں زباں تک ہرگز وہ آنے والی

پروانے جو ہو کر سب خون بہ گئی تو　　یا داغ بن گئی تو اور جلکے رہ گئی تو

تیری لگی بجھائے کس کو پڑی ہے ایسی　　آئے کسی کے آئے ہمت کہاں کسی کی

جب ہم خوشی کے دن ہیں احباب ہیں ساتھی　　جب آپڑی مصیبت پھر آہ! کب ہیں ساتھی

لیکن ترے پتنگے ہیں شمع! تجھپہ شیدا　　شاید دکھے دل انکا ہو ان کو درد تیرا

دیکھینگے تجھکو مصروف آہ و فغاں میں وہ جب　　دو دیں گے جھٹ تو دانہ تیری مدد کو وہ سب

آئیں گے بھی پتنگے تو کیا مدد کریں گے　　دیکھینگے تجھکو جلتا تو خود بھی جل مریں گے

آکر بٹائیں گے کب غم میں وہ ہاتھ تیرا　　اس سوز و ساز میں کیا دینگے وہ ساتھ تیرا

گو دیں گے وہ پروں سے ٹھنڈی ہوائیں تجھکو　　اس سوز اس جلن میں تخفیف تاکہ کچھ ہو

لیکن تری جلن کو کیا کم وہ کر سکیں گے　　ہاں خود جلیں گے خود کو بیدم وہ کر سکینگے

جل جائیں گے جو خود ہی تو غم کرینگے کسکا　　وہ خود ہی خاک ہونگے ماتم کرینگے کسکا

روشن وفا کو اپنی کر جائیں گے وہ جلکر　　لیکن یہ انکا جلنا ہی تیرے حق میں بدتر

خود وہ جلیں گے لیکن نکلے گا نام تیرا　　مشہور ہی جلانا او شمع کام تیرا

الزام جسقدر ہیں سب تیرے سر رہینگے　　عشاق کش کہیں گے پروانہ کش کہینگے

قصے ترے بنائیں دنیا میں لوگ کیا کیا　　چرچے زباں پہ لائیں دنیا میں لوگ کیا کیا

ظالم بھی تو بنے گی بے مہر و پر دغا بھی　　مشہور سب میں ہو گی تو شمع بیوفا بھی

قاتل تجھے کہیں گے سارے خدا کے بندے　　منصف نہ ہونگے ہرگز جو رو جفا کے بندے

بے رحم تجھ پہ واجب اے شمع زار ہی تو　　پروانوں کے الم میں ہاں سوگوار ہی تو

دل سے ترے نہوگا یہ سوز یہ الم کم　　ہوگی نہ یہ جلن کم ہوگا نہ داغ غم کم

جلتا ہی تہر دن کو او رشب کو تو اکیلی
ننھے سے جی کا تیرے اللہ ہی ہے بیلی

خورشید علی مہر دہلوی

رباعیات

معشوق کو بے قرار ہوتے دیکھا　　بے رحم کو اشکبار ہوتے دیکھا
یہ تجربہ حاصل ہوا اس الفت میں　　ہر چیز کو یادگار ہوتے دیکھا

اے نرگس مست یار میری توبہ　　اے میکدۂ خمار میری توبہ
بے مانگے بہت پلائی تونے ابن بس　　اے لذت بادہ خوار میری توبہ

صبر دہلوی

بعد مدت کے فلک لایا دیار یار میں

کیا یہی ہے وہ مقام انجمن زیر و عطر بار　　جسکی صبح و شام پر قربان ہوتی تھی بہار
کیا یہی ہے وہ مقام دلربا و دلفریب　　جس کا تھا ہر ایک ذرہ مایۂ صبر و شکیب
کیا یہی ہے وہ مقام عمز دا راحت فزا　　سبزی رنگین جسکی تھی مرقع عیش کا
ہاں یہی وہ خاک ہے جس سے ہستی تھی خوشی　　جس کا دن تھا نور آگیں عنبر آگیں رات تھی
ہاں یہی وہ خاک ہے سرمایۂ تسکین دل　　حسن پرور تھی سرور آور تھی جسکی آب گل
ہاں یہی وہ خاک ہے جس خاک پر تھا دلگداز　　چشم گر نمناک تھی تو یہ بھی رہتا تھا گداز
یارب ایسی گلزمیں کو کھا گئی کسکی نظر　　اب ہی سبزے کی وہ شادابی نہ وہ لطف سحر
اے فلک اے جور پرور ظلم کی کچھ انتہا　　ہائے کیسے باغ کو برباد تونے کر دیا
کیا سنوں بلبل کو اس کا آشیاں ملتا نہیں　　گل کو کیا پاؤں کہ تنکے کا نشاں ملتا نہیں
اے گل سیراب تیری عطر افشانی کہاں　　عندلیب زار تیری مرثیہ خوانی کہاں
وے گلستان تمناؤں تو تیرے برگ و بار　　سرزمین صدق و خلت کے تھے زیبا یادگار
پھول تیرے سب کے سب تھے آرزو و دید کی　　جسکی رنگینی تھی سرخی آتشیں رخسار کی
لیکن ان پھولوں میں تھا اک پھول ناز کی خوشنما　　جسکی بوئے خلق سے عالم تھا کل مہکا ہوا
تھا اجالا میرے گھر کا دل کی راحت اس سے تھی　　اسکو مجھسے عشق تھا اور مجھکو الفت اس سے تھی
عصمت و عفت کی دیوی کوہ تمکین و حیا　　چارہ ساز اہل حاجت ما داوج التعنا
دلربائی میں تبسم رشک موج سلسبیل　　جانفزائی میں تکلم دار وے طبع علیل
تھا منور اس رخ روشن سے کاشانہ مرا　　بادۂ عشرت سے تھا لبریز پیمانہ مرا
تھا سفر یا تھا حضر اسکی جدائی شاق تھی　　فرقت اسکی آفت جان دل مشتاق تھی
خوف تھا جس بات کا آخر کو پیش آئی وہی　　گردش تقدیر اپنے سامنے لائی وہی
آہ خاک ناکوہ نے میرا وہ در بے بہا　　چھین کر مجھسے خدا جانے کہاں پر کھو دیا
کیا کہوں کس سے کھوئی ڈھونڈھوں کہاں پاؤں کہاں　　کچھ نشاں ملتا نہیں حیران ہوں جاؤں کہاں
اس کے مرجانے سے جینے کا مزا جاتا رہا　　بلکہ تھا جو زندگی کا مدعا جاتا رہا

اے اجل اے ہادم لذات برباد ی نشاں　　تو بتا مجھکو کہ وہ ہے شاہد رعنا کہاں
حال پر ہم دردمندوں کے نظر ہے یا نہیں　　اسکو میرے روز ہجراں کی خبر ہے یا نہیں
اسکو میرے روز ہجراں کی خبر ہی یا نہیں　　آہ آتشبار میں یارب اثر ہی یا نہیں
آہ آتشبار میں یارب اثر ہے یا نہیں　　نالۂ بیدار پھر وہ فتنہ گر ہے یا نہیں
کون بتلائے کہ وہ فرخندہ صورت کیا ہوئی　　دل ہے کیوں ویران وہ الفت کی مورت کیا ہوئی
عیش کے دن کیا ہوئے عشرت کی باتیں کیا ہوئیں　　برہمی وہ کیا ہوئی چاہت کی باتیں کیا ہوئیں
اے محل تر کیا محبت کا یہی تھا اقتضا　　چھوڑ کر تنہا مجھے آباد ویرانہ کیا
کیا خطا مجھسے ہوئی آزردگی کا کیا سبب؟　　یاد وہ صحبت روز و شب کی پایۂ غفلت عجب
تیری دوری دیکھیے کیا کیا دکھائے گی مجھے　　ہر گھڑی کی یاد دیوانہ بنائے گی مجھے
ہجر میں جز آہ و زاری جی بہلتا ہی نہیں　　گریۂ پیہم پہ اپنا زور چلتا ہی نہیں
نالۂ ناشاد لب سے دور ہو سکتا نہیں　　زندگی جب تک ہے دل مجبور ہو سکتا نہیں

موت آجائے تو ثاقب رنج فرقت دور ہو
اسکی صورت دیکھکر جان حزیں مسرور ہو

العبد الحزین ثاقب (مدرفیدباری)

انتظار دوست

نہیں تاب صبر باقی، الہی انتظار کب تک؟　　کوئی حد بھی ہے کروں میں ترا اعتبار کب تک؟
ترے آج کل کے وعدے نہ وفا ہوئے نہ ہونگے　　یونہی دلکو دے تسلّی کوئی بیقرار کب تک؟
نہ مہینے دو مہینے، کیا انتظار برسوں　　دل مضطرب پہ آخر ہے اختیار کب تک؟
ذرا تو بھی سوچ دل میں کہیں تو کوئی ٹھکانا　　ترے لطف کا رہوں اب میں امیدوار کب تک؟
میں بغیر تیرے اب تک ہاں زندہ ہوں تعجب　　نہ ہو زندگی یہ اپنی مجھے ناگوار کب تک؟

بلبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد؟

محمد یحییٰ تنہا بی۔ اے

سچّی بیوی

نہائی کی مونس ہے تُو — سازِ محبت کی ہے نے تُو
م عنایت کی ہے مے تُو — حق میں ہے اک پاکیزہ شے تُو
رونق بزمِ الفت تُو ہے — لطف فزائے صحبت تُو ہو
ے وجود سے گھر ہے جنّت — بن تیرے جنت قعرِ مذلت
ری لطافت تیری نزاکت — اک عالم پر چھائے ہی حیرت
سچّی خلقت حق کی پری ہو — پر تجھے اس سے بےخبری ہو
بات تری ہے شہد سے شیریں — کام ترا ہے گل سے بھی رنگیں
حُسن ہے تیرا عزّت و تمکیں لو — شرم تری ہے خود تیری تزئیں
تو ہی محبت کا ہے پُتلا — تو ہی مرُوّت کا ہے پُتلا
گھر باہر کی عزّت تجھ سے — سارے گھرانے کی حشمت تجھ سے
ماں اور باپ کی غیرت تجھ سے — نام و نمود کی شہرت تجھ سے
تجھ بن، انساں کب ہے انساں — تُو جو نہ ہو تو گھر ہے ویراں
باہر جب ہوں مرد اکیلے — ہوں بیچارے غربت جھیلے
کوئی نہیں آرام جو دے لے — بھائیں نہ دل کو باغ اور میلے
تیرا تصوّر پر ہو خوش کن — دل پر تیرا اثر ہو خوش کن
ہے اولاد کی اپنی دائی — پال اور پوس کے راہ پہ لائی
اچھی پڑھائی اُس کو بتائی — اچھی لکھائی اُسکو سکھائی
کھیل کود میں گرُ بتلائے — جیسے کوئی مرشد گر جتلائے
تو نے جنے دارا و سکندر — تو نے بنائے کرشن، مہیشر
تیرے نمونے پیر و پیمبر — تیرے کرشمے گھر گھر، در در
تیرے ہی باعث کون و مکاں ہو — تو جو نہیں تو ہیچ جہاں ہے
جب جنّت میں آدم آئے — تنہائی سے بہت گھبرائے
رو رو کے ایسے آنسو بہائے — آنکھوں سے بہکر گود تک آئے
حق نے کیا دنیا کو پیدا — آدم کو، حوّا کو پیدا
پس ہوئی بیوی موجبِ راحت — وہ دو عالم میں باعثِ فرحت
گھر میں سرور، بادۂ عشرت — اور سفر میں حسنِ مسرّت
رازوں کی رکھوالی تو ہے — گلشنِ دل کی لالی تو ہے
شرم و حیا کی زندہ پری ہے — غیرت کوٹ کے تجھ میں بھری ہو
کھیتی گھر کی تجھی سے ہری ہے — تیری ہی چاندی سب سے کھری ہے
تیرا وجود مسرت افزا — تری نمود محبّت افزا
تو ہے اندھیرے گھر کا اجالا — تیرا ہی سب سے بول ہے بالا
تو ہی شرافت کی ہے مالا — سب سے بہتر، سب سے بالا
عفّت و عصمت تیرا زیور — ہے یہی سب سے اچھا زیور
ایسی تھی عصمت تجھ کو پیاری — زندہ جل کے مری بےچاری
جان کی بازی دیکے نہ ہاری — عصمت قرباں، عفت واری
عشق کا شوہر کے دم بھر کے — زندہ ہوگئی گو یا مر کے
گرچہ وہ دن ہے آنکھوں سے اوجھل — تیرا ہی ہے لیکن کس بل
صبر کی شاخ کا جنتی ہو تو پھل — کاٹتی آنکھوں میں ہے پل پل
ستی کے ست کی جان یہی ہو — عشق کی سچّی شان یہی ہو
تجھ سا سچّا دوست کہاں ہے — تیرا ہی طالب سارا جہاں ہے
ہمسایوں کی راحتِ جاں ہو — فقر فقیری شانِ شہاں ہے
تیرا ابر کرم ہے چھایا — جنگل جنگل، دریا دریا
شانِ امارت میں بھی جلی ہے — نازمیں، نعمت میں، تو پلی ہے
باغِ کرم کی ہنستی کلی ہے — بات تری مصری کی ڈلی ہے
تیرے ہی حسن سے ہر سو چمکا — چپّا چپّا، ذرّہ ذرّا
پر ہیں بہت سے تجھکو بھولے — اپنی آن اور بان پہ پھولے
خود ہیں جھلا تے عیش کے جھولے — اور تیرے دل کو دے کے طولے

بیخبری کی نیند میں سوتے   دین میں دنیا کے لئے کھوتے
بے شک انھیں کی بدولت پہنچا   دل پر تیرے صدمہ گہرا!
پر اس کا بھی کچھ نہیں شکوا!   واہ رے ہمت! بل بے بوتا!
صبر کی سِل چھاتی پر رکھی   عیش ابد کی نعمت چکھی
شرم و حیا کی سچی دیوی   صبر و رضا کی سچی دیوی
جود و سخا کی سچی دیوی   لطف و عطا کی سچی دیوی
کشتی دنیا چلتی ہے تجھسے   آس کی کھیتی پھلتی ہے تجھسے
محرمِ خلوت تجھ پر صدقے!   مونسِ جلوت تجھ پر صدقے!
منبعِ رحمت تجھ پر صدقے!   مصدرِ عشرت تجھ پر صدقے!
کانِ مروّت! تجھ پر قرباں!!   جانِ محبت! تجھ پر قرباں!!

نصیر (حسین آبادی)

نوحۂ وفات

سر سرندر بکرم پرکاش بہادر والیٔ سرموراہن

گھٹا چھائی ہے کالی ہر طرف ناہن میں ماتم کی
گری ہیں خرمن تاب و تواں پر بجلیاں غم کی
وفورِ غم سے حالت ہے دگرگوں چشمِ پُرنم کی
نہیں ہے صبر کی طاقت کسی میں رنج پیہم کی
رواں ہے سیل اشک خوں ہر اک کی چشم گریاں سے
نکلتی ہے صدائے نالہ ہر قلبِ پُر ارماں سے
قلم رد تا ہے لکھنے سے، ہے موتِ ناگہاں کِس کی
ہوا کا غضا سیہ، آئی اجل یہ ناگہاں کِس کی
گئی گلگشت باغِ خلد کو پاکیزہ جاں کس کی
مٹی ہے خاک میں جلدی مبارک عز و شاں کِس کی
جسے سرتو میں دیکھو نشانہ تیرِ غم کا ہے
تڑپنے میں ہر انساں آئینہ نخچیرِ غم کا ہے
عدم میں لے گیا ہیہات! مرگِ ناگہاں کس کو
رہے اس صدمۂ جانکاہ پر ضبطِ فغاں کسکو
بھلا ایسی مصیبت پر رہے تاب و تواں کسکو
ابھی تو نوجواں تھا لے گیا تو آسماں کسکو
اُٹھا واحسرتا! دنیا سے جو مشہور راجا تھا
بہت ہی نیک سیرت نیک دل دانا تھا یکتا تھا
خبر کیا تھی کہ سوئے خلد راہی شادماں ہوگا
خبر کیا تھی کہ استسقا سے عاجز جانِ جاں ہوگا
وہ عازم جو تھی جولانی کو سوئے آں جہاں ہوگا
روانہ دارِ فانی سے بملکِ جاوداں ہوگا
ہیں اب سر پیٹتے غم میں شکیب و حسرت و ارماں
رعایا کی نہ کیونکر زندگانی ہو بلائے جاں
عقیل و عادل و نصفت مزاج و بندہ پرور تھا
وہ علم و فن کا شایق قدر دانِ ہر ہنرور تھا
خلیق و خوش سیر تھا نیک عادت نیک محضر تھا
ذکی فہم و فراست میں سخن سنج و سخنور تھا
الم ہو نالہ و آہ و بکا جتنا ہو تھوڑا ہے
ہر اک دلپر ملالِ جاں گزا جتنا ہو تھوڑا ہے
خبر تھی کسکو ہوں گے راہیٔ ملکِ بقا جلدی
نہ ہوگی اس مرض سے اب انھیں حاصل شفا جلدی
چمن میں آکے رخصت ہوگی یوں بادِ صبا جلدی
اٹھالیگا وہ سایہ فرقِ ناہن سے خدا جلدی
مگر تسکیں ہے اب ناظر ہوا خواہانِ دولت کو
کہ اس کے جانشیں سے شان ہوگی شانِ دولت کو

چندو لال ناظر



آنریبل راجہ سر سراندر بکرم پرکاش صاحب بہادر والئی ریاست سرمور ناہن(مرحوم)

انڈین پریس الہ آباد

جی نہ بھایا مرا اندوہِ فنا نے بہم　　سر اٹھایا جو حبابِ لبِ دریا کی طرح
ہجرِ ساقی میں سرِ بادہ کشاں ناکام　　ایک چکر میں ہے پیمانۂ صہبا کی طرح

میری ہستی میں بھی اک نکتۂ معدوم ہے توفیقؔ
میرے ہونے نے کیا گم مجھے عنقا کی طرح

توفیق مہدوی

تازہ غزلیں

...نام کی ہے، کام کی بہا نہیں　　کہ دستِ شوق کسی کے گلے کا ہار نہیں
...ج وصل میں اس طرح چوسے جاتے ہیں　　انھیں لبوں سے سُنی ہے ہزار بار نہیں
...ن ماہ جبیں سیرگاہ سمجھے ہیں　　یہ داغ داغ - جگر کوئی لالہ زار نہیں
...م کی طرح نہیں میکدے میں بیٹھے ہی　　سوا ہمارے یہاں کوئی ہوشیار نہیں
...س نے ناقۂ لیلیٰ کو نجد میں گھیرا　　بگولے دشت کے ہیں قیس کا غبار نہیں
...ہے گی یاد انھیں بھی مجھے بھی وصل کی رات　　کہ اُن سا شوخ نہیں، مجھ سا بیقرار نہیں
...اب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا　　مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں
...ر بھی ہوتی ہے چلتے ہیں اے اجل ہم بھی　　اب اُنکے آنے کا ہم کو بھی انتظار نہیں
...دیت اس دلِ مردہ کو کیوں ہے پہلو میں　　عذابِ گور نہیں، گور کا فشار نہیں
مجھے یہ ڈر ہے نہ ہو اور طولِ محشر کو　　مرے گناہوں کا مالک کوئی شمار نہیں
...ہی چراغِ لحد تھے یہی تھے قبر کے پھول　　اب اُن کے نقشِ قدم بھی سرِ مزار نہیں

حنا لگا کے پہنتے ہیں گل رخوں میں ریاضؔ
کچھ ان کی رنگینی مبارک کا اعتبار نہیں

ریاض خیرآبادی

خدا توفیق دے قاتل کہیں تیغِ دو سر باندھے　　کہ سر دینے پہ ہم تیار ہیں کب سے کمر باندھے
کھلا کب بابِ خلوت پائے درباں پر گرے برسوں　　عدو کے سامنے بھی ہاتھ اپنے جبیں پر باندھے
یونہی سنوار رہے سارا زمانہ روزِ محشر تک　　جو وہ بکھرے ہوئے گیسو نہ ہنگامِ سحر باندھے
بہارِ زخم سے ہے یادگاری اس کے خنجر کی　　تڑپ کر توڑ دوں ٹانکے اگر زخمِ جگر باندھے
سنا ہے وادیِ ایمن کا جب ماجرا میں نے　　کھڑا رہتا ہوں پہروں ہاتھ زیرِ سرِ شجر باندھے
حسینانِ چمن کے حسن پر سب محوِ حیرت ہیں　　مجھی کو دیکھتے ہیں ٹکٹکی اہلِ نظر باندھے
اور سب دور ہی خلوت میں اسکی پاؤں پھیلائے　　کھڑے رہتے ہیں عاشق ہاتھ لب پہ ضبط سے باندھے
نہ ہو نیرنگیِ باغِ جہاں سے ایک دم غافل　　بسانِ لالہ رہ سر پہ یہاں رختِ سفر باندھے

زمیں پر گر پڑے آبادؔ خوشۂ عقدِ پرویں کا
قیامت ہو ابھی طُرّہ جو وہ دستار پر باندھے

آباد عظیم آبادی

میری ہستی ہے مرے جوشِ تمنا کی طرح　　میں عدم ہو کے بھی موجود ہوں عنقا کی طرح
بس کہ اے جوشِ ہوس ہائے کدورت بس کر　　مل گئے خاک میں ہم نقشِ کفِ پا کی طرح
جھک گیا شعلۂ بیتاب ہوس سے دل بھی　　جگر سوختہ داغِ تمنا کی طرح
دیکھ اے گرمیِ رفتار کہ دل بھی میرا　　ٹوٹ جائے نہ کہیں آبلۂ پا کی طرح
لذتِ جوشِ تپشہائے تمنا مت پوچھ　　داغ ہے دل ہمہ تن داغِ تمنا کی طرح
ہوں وہ لاشے کہ ازل ہی میں مرا دل بگڑ　　مٹ گیا نقطۂ موہوم تمنا کی طرح
روک رکھا ہے مری گردشِ قسمت نے مجھے　　قید ہوں نقطۂ پرکار تمنا کی طرح

کوئی بھی ہم کو با وفا نہ ملا　　یوں تو ملنے کو اک زمانہ ملا
اُن سے ملکر بھی کچھ مزا نہ ملا　　وہ ملے دل مگر ذرا نہ ملا
راہِ الفت میں وہ بھی گم ہوتے　　خضر کو کوئی رہنما نہ ملا
تو نے دل لے کے آنکھ پھیری ہے　　اب نظر مجھ سے بے وفا نہ ملا
ایک سے دے کے دل اٹھاتے ہیں　　وہ بھی کمبخت کام کا نہ ملا
تھک گیا شیخ کر کے طوفِ حرم　　کسی جانب مگر خدا نہ ملا
بے خودی میں انھیں تو کیا پاتے　　ہم کو اپنا ہی خود پتا نہ ملا

اُن سے میری نبھی نبھی نہ نبھی دل ہی تو ہے ملا ملا نہ ملا
جب سے سیدھا ہوا ہے دل بگڑ آج تک بھی وہ کج ادا نہ ملا
مٹ گئے رہروانِ راہِ طلب گر ان کا ہی نقشِ پا نہ ملا
دل دیا یادِ چشمِ یار ملی کعبہ بیچا شرابخانہ ملا
پی چکے سب مگر مجھے ساقی کوئی قطرہ بچا کچھا نہ ملا
بن گیا درد دل مرا ہمدرد جب کوئی درد آشنا نہ ملا
اڑ گیا طائرِ حنا بن کر اُن کی مٹھی میں دل مرا نہ ملا

آتے ہی ہاتھ سے چلدئے وہ حمید
آرزو پا کے مدعا نہ ملا

حمید میرٹھی

جہاں نے ڈھونڈنے والے کو کیا نہیں ملتا مگر ہمیں دلِ بے مدعا نہیں ملتا
کہاں ہیں وقتِ مصیبت قرار و صبر و شکیب رفیق کوئی مزاج آشنا نہیں ملتا
بنا رہے ہیں وہ دل میں ہمارے گھر اپنا کہ اس سے بڑھ کے مکان دوسرا نہیں ملتا
غرورِ زندگی مستعار بے جا ہے کسی کو مرہمِ زخمِ قضا نہیں ملتا
فراغِ صحبتِ احباب یاروعہدِ شباب کہاں گئے کہ کسی کا پتا نہیں ملتا
بشر کو عاقبتِ کار کا خیال رہے بغیر نیک عمل کے خدا نہیں ملتا
ہجومِ غم سے مرے دل میں کیا خوشی آئے یہ بھیڑ ہے کہ کہیں راستا نہیں ملتا
تمام کوچۂ جاناں کی خاک چھان آئے کہیں غریب دلِ مبتلا نہیں ملتا

ہوا ہے سرد زمانے سے دل یہ اے عشرت
خوشی میں غم میں کسی میں مزا نہیں ملتا۔

عشرت لکھنوی

گذرے ہوئے ملال فراہم نہ کیجئے اچھے بھلے مزاج کو برہم نہ کیجئے
پھر کاہشِ ہوس سے تبہ ہو گی زندگی دشمن پہ رحم کیجئے اب دم نہ کیجئے
لفت کو گزر فروغ نہ دیجے نہ دیجئے جو رہ گئی ہے اس کو تو اب کم نہ کیجیے
روشن ہیں مجھ پہ حسن کی سب کار سازیاں اپنے ستم کو لطف سے مدغم نہ کیجیے

مصروف منع گریہ رہے آستین غیر
بسمل کا اس طریق سے ماتم نہ کیجئے

ریاض الحسن بسمل

رہی فراق میں بھی شکل روبرو تیری شبیہ کھینچی تصور نے ہو بہو تیری
معاف رکھ! جو ہے گلہائے تر سے پیار مجھے کہ ان میں رنگ ترا کچھ ہے کچھ ہے بو تیری
نسیمِ صبح کا جھونکا نفس نفس تیرا! رہے گی سوختہ جانوں کو آرزو تیری
یہ فخر کم نہیں ہم قابلِ خطاب تو ہیں عزیز اور کے القاب ہیں "تو" تیری
دہانِ غنچہ ترسے، زبانِ سوسن سے چمن چمن میں سنی ہے گفتگو تیری
دل و جگر پھکے جاتے ہیں سوزِ ہجراں سے لگن عذاب ہوئی مجھکو شمع رو تیری

کہاں کہاں ترے محروم کو بقول سرور
"کشاں کشاں لئے پھرتی ہے جستجو تیری"

محروم

میری آنکھوں میں ہے عکسِ رُخِ زیبا اُنکا میری نظروں سے ٹپکتا ہے تماشا اُنکا
ہائے یہ دیدۂ مشتاق ہے کسکا، میرا ہائے وہ وعدۂ دیدار ہے کسکا، اُنکا
دلِ آزارِ طلب کو ہو نوید حرماں بنگیا راحتِ جاں دردِ تمنّا اُنکا
کاش ملجائیں دو عالم مجھے آنکھیں بنکر دیکھ لوں ایک نظر میں بھی تماشا اُنکا
مفت بربادیِ ناموسِ وفا ہوتی ہے یا مرا ہو کے رہے یا دلِ شیدا اُنکا
شمع و پروانہ کہو یا گل و بلبل سمجھو نام روشن ہے زمانہ میں ہمارا اُنکا
اسطرف پاسِ وفا اور انھیں پاسِ اعدا ہوگیا رنج اسی بات پہ میرا اُنکا

مجھکو بیدل ابھی مرجانیکی فرصت کب تھی
دیکھنا تھا اسی پہلو سے کلیجا اُنکا

بیدل جھنجھانوی

ایڈیٹوریل

آل انڈیا اُردو کانفرنس

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جب دنیا بھر کے تفکرات سے آزادی ہوتی ہے، تو ماہران علم اللسان مل جل کے اُن چند وسائل و تجاویز پر غور کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں جو ماضی کے تجربہ سے مستقبل کے لئے مفید ثابت ہوں۔ ایسے موقع پر ان گنتی کے سند الوقت حضرات کی مجوزہ باتیں آئندہ کے لئے خضر طریقت کا کام دیتی ہیں۔ اس قسم کی کانفرنسیں مصر کے عروج کے وقت سب سے پہلے ان بادشاہوں کے زمانہ میں شروع ہوئیں، جنکا خاندان "راعی" کہلاتا ہے۔ اہل روما نے بھی اپنے یہاں، جولیس سیزر، اور قیصر آگسٹس کے دور میں کچھ علمی مجالس قائم کر کے خاص اجلاس کئے۔ یونانیوں کے "مشائین" میں تو اس قسم کی مجلسیں عام تھیں۔ یورپ میں، پندرہویں صدی کے آغاز شباب میں، قریباً ہر ایک ملک نے اپنی زبان اور لٹریچر کے متعلق چھان بین کر کے جس قسم کے قواعد تجویز کئے ہیں، وہی اس زبان کے لئے اصولِ صرف و نحو کے علاوہ انشا پردازی کی جان ٹھہرے ہیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس دور انگلشیہ میں ریل و تار کے ذریعہ دور دور کے شہروں کا باہمی فاصلہ اسقدر قریب ہو گیا ہے کہ یہاں کے تجارتی تعلقات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور تبادلۂ خیالات نے ثابت کر کے دکھا دیا ہے کہ اُردو کے بولنے والے ہندوستان تو ہندوستان، اس کے پرے افغانستان، ادھر عربستان، اور لنکا تک جہاں چلے جائیں، بغیر اس کے کہ انھیں اپنے اظہار خیالات کے لئے ٹامس کک اینڈ سن کے کسی ترجمان سے مدد لینی پڑے، اپنے آپ ہی سب کچھ کر سکتے ہیں، ہندوستان میں ۱۴۴ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان سب میں کیا بلحاظ طرز تحریر، اور کیا بلحاظ اظہار خیالات اُردو ہی کو وہ فخر حاصل ہے، جو کسی اور زبان کو نہیں ہو سکتا۔ جب ہمارے یہاں کے چند بزرگوں کو اُردو کی مزید ترقی کا خیال پیدا ہوا، تو آل انڈیا اُردو کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی، تاکہ اُردو کو خاص ملکی زبان تصور کر کے ایک مجتمعی کوشش سے آئندہ کے لئے کچھ ایسے اصول بنائے جائیں جن کی رُو سے ہر حصہ ملک کے لئے ریل کی ایسی سیدھی سڑکیں قائم ہو جائیں۔

خوشی کا مقام ہے کہ آل انڈیا اُردو کانفرنس کی ضرورت محسوس کر کے بہی خواہان ملک نے سالانہ جلسے تجویز کئے چنانچہ پچھلے برس اس کا پہلا اجلاس ہوا۔ اُسوقت دلّی، لکھنؤ، آگرہ کے بجائے بدایوں کو جلسہ کے لئے انتخاب کیا گیا تھا، اور مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے اس کے پریسیڈنٹ چُنے گئے تھے۔ آپنے جو تقریر فرمائی تھی، وہ ایسی اعلیٰ تھی کہ اُس سے ہندو لوگ خوش تھے اور مسلمان لوگ محظوظ۔ اس کانفرنس میں جو تجاویز پیش ہوئی تھیں، وہ عموعی طور پر ترقی زبان کے لئے نہایت ہی موزوں تھیں۔ اور ملک نے انھیں پسند کیا۔ گو اُس وقت بعض اہل الرائے نے اتنا ضرور کہا کہ جس شہر کو جلسہ گاہ کے لئے انتخاب کیا گیا ہے [illegible] نہیں، مگر بعد میں جواب مل گیا کہ ہندوستان کی کسی زبان کے متعلق جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک بسہولت سمجھی جاتی ہو، ہندوستان کے کسی شہر کو انتخاب کرنا برابر ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ بدایوں کو محروم الارث قرار دیا جائے حالانکہ بدایوں ایک زمانہ میں ایسا نام پا چکا ہے کہ اُس کے مورخ، مصنف، مؤلف، شاعر، ناظم، ناثر، "منتخب التواریخ" تھے۔

عام خیال تھا کہ بدایونی جلسہ کے بعد دوسرے سالانہ جلسے کے واسطے کوئی اور بڑا شہر انتخاب ہوگا، جلسہ پہلے سے کہیں وسیع پیمانہ پر کیا جائے گا، جو فروگذاشتیں، عدیم الفرصتی کی وجہ سے پہلے ہو چکی تھیں ان کی خاص اصلاح ہو گی۔ مگر اہل الرائے کی امیدوں کے خلاف بدایوں کے بعد دوسرے سال کے لئے مولوی رفیع الدین صاحب نے اپنے پرگنیس والے شہر "پونہ" کو تجویز کیا اور بجائے اس کے کہ اس علمی جلسہ کی صدارت کے لئے

راجہ سرکشن پرشاد صاحب، مدار المہام حیدرآباد دکن، شمس العلما مولانا امداد امام صاحب اثر

شمس العلما مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی	شمس العلما مولانا عبد الحکیم صاحب
شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب حالی	ابو ادریس مولانا احمد حسن صاحب شوکت
شمس العلما مولانا نذیر احمد صاحب	خان بہادر مرزا سلطان احمد خان صاحب
شمس العلما مولانا محمد یوسف صاحب	آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر — شمس العلما مولوی عبداللہ صاحب
مسٹر ایم ایس رلیا رام صاحب قابل بی اے ایل ایل بی — مولوی عبداللہ العمادی صاحب ایڈیٹر وکیل امرتسر
نواب سعید الدین خان صاحب طالب (دہلوی) — مولوی سید محمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ

میں سے کوئی صاحب انتخاب کئے جاتے، آنریبل خان بہادر میاں محمد شفیع صاحب ممبر لیجسلیٹو کونسل پنجاب کو نامزد کیا گیا۔ اسمیں کچھ شک نہیں کہ میاں صاحب اپنی قانون دانی اور قانون فہمی کے باعث اس وقت "زندہ دلان پنجاب" کے سربرآوردہ حضرات میں سے ہیں، اور لاہور کے خطۂ یونان موضع باغبان پورہ میں آنریبل خان بہادر میاں محمد شاہدین صاحب جج چیف کورٹ پنجاب کے دوسرے درجہ پر ہیں۔ مگر آپکا انتخاب اس وقت نہایت ہی موزوں ہوتا، اگر یہ کوئی قانونی جلسہ ہوتا، لیکن ایک ایسے جلسہ کے لئے جسمیں محض علمی ہی باتیں ہوں۔ ایسا انتخاب قابل حرف گیری ہے، کیونکہ اس سے پہلے میاں صاحب نے لٹریری دنیا میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کیا جس سے انکا شمار زبان اردو کے ہوا خواہوں میں ہو سکتا۔

بہرحال جلسہ کو رفیع الشان بنانے کے لئے مولوی رفیع الدین احمد صاحب نے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔ اسپیشل ٹرین دوڑائی گئی۔ اور پونہ و بمبئی کے احاطہ کے قریباً ہر ایک شہر کے قائم مقام استقبال کو آئے۔ ۲۱ جولائی کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ طمطراقی جلوس نکلا۔ اور دوسرے دن اسلامیہ اسکول میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جسمیں آنریبل میاں محمد شفیع صاحب خان بہادر نے اپنی پریسیڈنشیل تقریر فرمائی۔

آپ کی تقریر اگرچہ بیش بہا معلومات کا خزانہ تھی مگر اسمیں بعض ایسے چبھتے ہوئے فقرے پائے جاتے ہیں جن سے بحث کا ایک نیا میدان کھل گیا ہے۔ چنانچہ آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما لکھتے ہیں:-

"یہ کانفرنس محض علمی ہے، اور مجھکو یہ خیال بھی نہ تھا کہ اپنے دوسرے اجلاس میں یہ کانفرنس دو عظیم قوموں کے درمیان برہمی کا باعث بنائی جائے گی، یا یہ کہ اس کے ذریعہ پولیٹکل اظہار ہوگا، اور دل کے بخارات نکالے جائیں گے"

حکیم برہم بھی اپنے اخبار "مشرق" میں تحریر فرماتے ہیں:-

"ہم آنریبل میاں محمد شفیع صاحب کی دل آزار باتوں سے اتفاق نہیں۔ انھوں نے گول الفاظ میں ہندوؤں پر الزام لگایا ہے کہ وہ سوراجیہ کی ترقی کے لئے ہندی کی ترقی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایک قیاسی قیاس ہے، کسی مسلمان کا یہ قیاس نہ ہونا چاہئے۔ ..... سوراجیہ کے غلط معنی ملک میں پھیلائے گئے ہیں حالانکہ انسان کے دل و دماغ میں سوراجیہ کا مسکن ہے...... میاں محمد شفیع صاحب کا یہ اعتراض بے موقع تھا۔ علاوہ انکو بحیثیت ایک صدر انجمن کے اس بات کو نہ کہنا چاہئے تھا۔ اس واسطے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان ہے۔ اگر ہندو اردو سے نفرت کرنے لگے ہیں تو انکو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہئے نہ یہ کہ ان کو بہ خیال دیگر اردو سے نفرت بڑھانے کی کوشش کی جائے۔"

ان کے علاوہ اور بہت سے اہل الرائے کو کچھ موافق کچھ مخالف خیالات کے اظہار کے لئے اس تقریر نے بے بس ہو کر مجبور کیا۔ کسی نے لگانے کی، اور کسی نے بجھانے کی کوشش کی۔ انصاف پسند طبائع صرف یہی چاہتے ہیں کہ زبان کی ترقی کے لئے پولیٹکل مذاق کا نام نہ ہونا چاہئے کیونکہ اہل قلم کو اہل سیف سے کیا کام؟

آل انڈیا اردو کانفرنس میں جو ریزولیوشن پیش ہو کر پاس ہوئے "مسلم" نے اُن کو حسب ذیل لکھا ہے:-

۱۔ صوبہ بمبئی کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے، اور اس کانفرنس کی رائے میں گورنمنٹ کا وہ خیال کہ اردو محض آرائشی زبان ہے، اور دنیوی کاروبار میں مفید نہیں، محض غلطی پر مبنی ہے۔ لہذا یہ کانفرنس مؤدبانہ عرض کرتی ہے کہ مسلمانوں کے لئے دینی اور دنیاوی معاملات میں اردو کی بیحد ضرورت ہے، اور بجز اردو کے انکی تعلیم ناممکن ہے۔

۲۔ صوبہ بمبئی میں اردو مدارس کی تعلیم ہرگز درست نہیں ہو سکتی، اور نہ کافی تعداد اردو مدرسین کی دستیاب ہو سکتی ہے تاوقتیکہ اس صوبہ میں ایک اردو ٹریننگ کالج نہ قائم کیا جائے۔

۳۔ اس صوبہ کے ہر ڈویژن میں ایک مسلمان ڈپٹی انسپکٹر خاص اردو مدارس کے لئے مقرر کیا جائے، جیسا کہ جنوبی ڈویژنوں میں گورنمنٹ نے مقرر کیا ہے اور ان افسروں کو پورے عملی اختیارات عطا فرمائے جائیں۔ اور نیز اُن کے نائبوں کی سالانہ رپورٹیں اردو مدارس کے بارے میں براہ راست سب انسپکٹروں کو بھیجی جائیں۔

۴۔ حسب سفارش ایجوکیشنل کمیشن اس صوبہ میں اینگلو ورنیکلر مدارس زیادہ کھولے جائیں۔ اور پونہ کیمپ کا اینگلو اردو اسکول جہاں فی الحال پانچویں جماعت تک

...گریزی پڑھائی ہوتی ہے، ہائی اسکول کر دیا جائے۔

۵۔ اوّل درجہ کے اُردو اسکولوں میں، مدرسۂ ناسک کی طرح، تیسری جماعت ...ے انگریزی پڑھائی جائے۔

۶۔ مڈل اور ہائی اسکولوں میں، اُردو کورس نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان طلبا کو بیحد نقصان پہنچتا ہے، لہذا مڈل اور ہائی اسکولوں میں، اُردو کورس پڑھائے جائیں۔ اور اُردو مدرّس مقرر کئے جائیں۔

۷۔ جن سرکاری ہائی اسکولوں میں فیس پڑھائی جائے، وہاں مسلمان طلبا کے ساتھ حسب سفارش ایجوکیشنل کمیشن، رعایت کی جائے۔

۸۔ مسلمانوں کی تعلیم میں جو نقصان عظیم اس صوبہ کے اندر ہو رہا ہے، اسکی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ایجوکیشنل کمیشن نے جو سفارشیں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں کی ہیں اُن کی پوری تعمیل نہیں ہوتی۔

۹۔ اُردو کی ترقی کے واسطے اُردو زبان میں انواع و اقسام کے علوم و فنون کی کتابیں بکثرت تصنیف و تالیف ہوں، اور دیگر زبانوں سے ترجمہ کی جائیں۔

۱۰۔ صوبہ بمبئی کی دیسی زبانوں کی درسی کتابوں میں بزرگان و سلاطین اسلام کے متعلق توہین آمیز الفاظ اور بے بنیاد روایات موجود ہیں جن سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔ یہ کانفرنس درخواست کرتی ہے کہ ایسے مضامین کتابوں سے نکال دئے جائیں اور ٹیکسٹ بک کمیٹی میں مسلمانوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ نیز ہر ایک دیسی زبان کی ٹیکسٹ بک کمیٹی میں مسلمانوں کے قائمقام ہوں۔

۱۱۔ مردم شماری میں مسلمانوں کی زبان، اردو کے کم دکھانے کی وجہ سے زبان کی خانہ پُری میں غلط اعداد بتائے گئے ہیں۔ لہذا یہ کانفرنس اظہار افسوس کرتی ہے اور گورنمنٹ کی توجہ بغرض تحقیقات اس پر مبذول کرتی ہے۔

۱۲۔ اس صوبہ کے چند اُردو نصاب کی ترمیم کے لئے اور نیز ان تعلیمی سوالات پر جو آجکل گورنمنٹ بمبئی کے زیر تجویز ہیں اپنی رائے ظاہر کرنے کی غرض سے یہ کانفرنس چند لائق اصحاب کی ایک کمیٹی مقرر کرتی ہے۔

ان جملہ ریزولیوشنوں پر ایک نگاہ دوربین سے دیکھنے والے فوراً معلوم کرلیں گے کہ

(۱) پہلا رزولیوشن کسی قدر خلاف واقعات ہے، کیونکہ مسلمانان بمبئی کی زبان مجموعی طور پر اُردو نہیں ہوسکتی۔ وہاں عموماً گجراتی زبان کا استعمال ہے۔

(۲) رزولیوشن نمبر ۲ و نمبر ۳ و نمبر ۴ و نمبر ۵ و نمبر ۷ و نمبر ۱۱ زیادہ تر اس قسم کے ہیں جنھیں آل انڈیا اُردو کانفرنس کے ساتھ کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ یہ تجاویز اگر "مسلم لیگ" میں پیش ہوتیں تو زیادہ موزوں تھیں۔

(۳) رزولیوشن نمبر ۶ لغایت نمبر ۸ اور نمبر ۱۲ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کیلئے رہنا چاہیے تھے۔

(۴) رزولیوشن نمبر ۹ سے ہمیں کلی اتفاق ہے ہمارے خیال میں اتنا حصہ اور بھی ہونا چاہئے تھا کہ جن لوکل گورنمنٹوں نے زندہ مصنّفین کی چند خاص تصانیف کے لئے قدر افزائی کی ہے، اُن کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یہ استدعا کی جائے:۔

ا۔ ایک مستند، سستی، عمدہ، اُردو کی لغت بنائی جائے۔

ب۔ اصطلاحات علمی کے لئے مناسب ہم معنی الفاظ تجویز کئے جائیں، جن سے اُن کا مفہوم واضح ہو۔

آل انڈیا اُردو کانفرنس کے ریزولیوشنوں میں مندرجہ ذیل ریزولیوشنوں کی بھی ضرورت تھی:۔

۱۔ اشہری، برق، سرور، تسلیم، ظہیر، ڈاکٹر بلگرامی، مولانا ذکاءاللہ اور دیگر بزرگوں کی وفات پر اظہار تاسف، جنکی بدولت اُردو لٹریچر نے خاص ترقی حاصل کی۔

۲۔ لالہ سری رام صاحب ایم اے کی اُن خدمات کا اعتراف جو انھوں نے "خمخانۂ جاوید" ایسا تذکرہ لکھنے سے اُردو لٹریچر کی بھاری کمی کو پورا کیا ہے۔

۳۔ انشا پردازی کے لحاظ سے اس وقت کس قسم کی اردو کا رواج ہے کم از کم ہر ایک کے قواعد و اصول مرتب کئے جائیں۔

۴۔ آئے دن نئے نئے علمی، ادبی، اخلاقی رسالے جاری ہوتے ہیں، جو ملکی لٹریچر کی مزید ترقی کا باعث ہیں۔ جس رسالہ کو اس کے حسن خدمات کے لحاظ سے زیادہ ممتاز سمجھا جائے، اسکی خاص عزّت افزائی کیجائے جس طرح کہ یورپ کی لٹریری

سوسائٹیاں اپنے ہاں کے میگزینوں کو اعزازی تمغات عطا فرما کر ان کی خدمات کا اعتراف کرتی ہیں۔ نیز ایسے رسائل کے اڈیٹروں کو بھی خاص اعزاز سے ممتاز کیا جائے، اور اُن کے لٹریچر و مفید سمجھ کر گورنمنٹ سے سفارش کی جائے کہ ان کی چند کاپیاں مدارس کے لئے خریدی جائیں۔

۵۔ کم لیضاعت مترجم بعض وقت اچھی کتابوں کو ترجمہ کے لئے انتخاب کرتے ہیں۔ اور اسیطرح اپنی کم بضاعتی کی وجہ سے بہت غلط ترجمہ چھاپتے ہیں لہذا لٹریچر کے خاص مذاق کو مدِنظر رکھ کے ایسے اصول مرتب کئے جائیں جن سے تجاوز کرنے والے کی کتاب اشاعت پذیر نہ ہو۔

۶۔ دربار تاجپوشی کے موقع پر جو مشاعرہ "تاجِ سخن" کے نام سے زیر اہتمام نواب احمد سعید خاں صاحب طالب دہلی میں ہونے والا ہے، اس کو بھی اس کانفرنس کی ایک شاخ قرار دیکر جس قسم کے تمغے تجویز کئے جائیں، اس کانفرنس کی وساطت سے تقسیم ہوں۔

اس قدر اظہار خیالات کے بعد ہم ایک اور بات ظاہر کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ جب آل انڈیا اُردو کانفرنس والے کانفرنس کو کوئی مذہبی کانفرنس نہیں سمجھتے، تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسکی صدارت کے لئے یکے بعد دیگرے ہر مذہب کے لٹریری اصحاب انتخاب کئے جایا کریں۔ اور اس لحاظ سے آئندہ سال کے جلسے کے لیۓ ہم آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کا نام پیش کرتے ہیں، جن کے انتخاب سے ساری غلطیوں کا دفیعہ ہوجائے گا۔

جنت آرامگاہ آصف

ملک میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ پڑھی گئی ہو کہ ۲۹ راگست کی دوپہر کو سلطان دکن نظام الملک میر محبوب علی خان بہادر المتخلص بہ آصف کی روح پر فتوح اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف پرواز کرگئی۔ آپ کی ناگہانی وفات سے سیاسی اور ملکی معاملات کو جو ناقابل برداشت احساس ہوا ہے اس کو تو مدبرانِ ملک ہی خوب جان سکتے ہیں۔ مگر آہ! دنیاے شاعری کو جو ناگزیر نقصان پہنچا ہے، وہ ہمارے احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ یہ ایک ایسا دل خراش اور جگر کاہ حادثہ ہے جسکی تلافی مادرگیتی سے ممکن نہیں۔ اعلیٰ پایہ کے شاعر ہونے کے علاوہ آپ بڑے زبردست علمی سرپرست تھے۔ آپ کے مبارک عہد میں جسقدر ترقّی زبان اُردو کو حیدرآباد میں ہوئی ہے اس کی کوئی اور نظیر نہیں مل سکتی۔ رعایا پروری آپ کا خاص شیوہ تھا۔ ایسے ہمدرد اور صاحب دل حکمراں شاذونادر ہی ہوتے ہیں، جو کہہ سکیں کہ

آصف کو جان، مال سے اپنے نہیں دریغ
گر کام آئے میری رعایا کے واسطے

غرض ایسے رعایا پرور فرمانروا کی جدائی کا جسقدر غم کیا جاے، کم ہے۔

آئندہ نمبر میں ہم آپ کے بالتصویر حالات ہدیۂ ناظرین کریں گے آپ کی وفات کے متعلق جو نظمیں اور قطعات تاریخ دفتر ادیب میں آئے ہیں وہ بھی اُسی پرچے میں شائع ہوں گے۔

شکریہ

ہم اپنے اُن قدردانوں کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں، جنھوں نے ہماری ناچیز خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم پر اُن اہل اخبارات کا بھی شکریہ واجب ہی، جنھوں نے اپنے اپنے صحائف میں ادیب اور ادیب کے لٹریچر کی تعریف کی ہے۔

خریداران ادیب سے اپیل

اب تک یہ شکایت کی جاتی تھی کہ ادیب کے قلمی معاونین میں زیادہ تر وہی اصحاب ہیں جو اُردو کے دیگر رسائل میں بھی لکھتے ہیں۔ معاونین ادیب ملاحظہ فرماوینگے کہ اب اس شکایت کی مطلق جگہ نہیں رہی۔ ہر پرچہ میں آپ کو دوچار ایسے حضرات کے نام نامی نظر آئیں گے، جنھوں نے اب تک ادیب کے سوا کسی اور رسالہ کے لئے قلم نہیں اٹھایا۔ اسی نمبر کو دیکھئے۔ اس میں کئی نئے نام ہیں۔ ابتدائی مضمون کے مصنف ہمارے ملک کے ایک نہایت معزز و ممتاز اہل قلم ہیں۔

ینہ نمبر میں ہم آپ کی تصویر بھی ہدیہ ناظرین کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں) باب "آئندہ" کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس نمبر میں آپ کے مضامین کی اول قسط درج کی جاتی ہے۔ آئندہ بھی آپ کے محققانہ مضامین ادیب میں شائع ہوتے رہیں گے۔ حضرت ریاض کا نام محتاج تعریف نہیں۔ آپ اپنے زمانہ کے نہایت بلند پایہ شاعر ہیں۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس نے آپ کا نام نہ سنا ہو۔ عرصہ سے آپ خاموش تھے خوشی کی بات ہے کہ نیاز مند ایڈیٹر کی زبانی درخواست کو آپ نے اپنے حسن اخلاق سے قبول فرمایا اور مسلسل طور پر اپنا کلام عنایت فرمانے کا وعدہ کیا ہے جس کا سلسلہ اس نمبر سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی نئے نام آپ کو نظر آئیں گے

معاونین ادیب اس سے تو ہرگز انکار نہیں کر سکتے، کہ ہم ادیب کو اسم بامسمیٰ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو کچھ ہم کر سکتے ہیں، اس میں کوتاہی نہ ہوگی۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ معاونین ادیب بھی اس علمی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ مولانا شوکت مدظلہ نے اپنے مضمون دفرانس کے اخبارات ہیں دو دو خریدار پیدا کرنے کی اپیل کی ہے۔ اگر ناظرین اپنے ادیب کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ اس کے سرپرستوں کا دائرہ وسیع کیا جائے، تو ہمیں امید رکھنا چاہئے کہ وہ جلد ہمیں شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔ اُن کی سہولت کے لئے اس نمبر کے ساتھ مطبوعہ کارڈ ارسال کیا جاتا ہے تاکہ وہ اُنکی خانہ پری کرا کے بھیج سکیں۔ ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں آپ اپنا فرض ادا کیجئے!

مزار غالب

ہم نہایت خوش ہیں کہ "مزار غالب" کے عنوان سے جو نوٹ گذشتہ نمبر میں درج کیا گیا تھا، اور یادگار غالب کے قائم کرنے کے باب میں جو اپیل کی گئی تھی، اس کا اچھا اثر ہوا ہے ہم نہایت شکریہ کے ساتھ ذیل میں اُس رقم کی رسید دیتے ہیں، جو اس وقت تک اس سلسلہ میں وصول ہوئی ہے۔ معاونین ادیب سے درخواست ہے کہ وہ اس طرف خاص توجہ مبذول فرمائیں۔ اور اس علمی تحریک میں نہ صرف خود عملی حصہ لیں، بلکہ اپنے احباب کو بھی اس طرف متوجہ کریں۔

انڈین پریس، الہ آباد	عنہ ۵
مولانا ابوالفضل صاحب بی اے	عنہ ۵
پادری جان ملکم صاحب	عہ
مولوی اعلان صفی صاحب (شہیر منشی عالم)	عہ
منشی عبداللہ خان صاحب	عہ
منشی کندن لال صاحب (شرر سہارنپوری) قسط اول	عہ
ایک ہندو	عہ
منشی لاڈلی پرشاد صاحب	عہ
منشی گیا پرشاد صاحب	عہ
منشی اشتیاق حسن صاحب	عہ
منشی سمیع اللہ صاحب	عکا
ایک پردہ نشین خاتون	عہ
مولوی حبیب احسن صاحب بہلی	عہ
نیاز مند ایڈیٹر ادیب	عنہ ۵
میزان	عـہ ۵

تصریح تصاویر

اس ماہ کی رنگین تصویر ایک مشہور بنگالی مصور، بابو شمر نیدر ناتھ گپتا، کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کے واقعات کا تعلق مہابھارت سے ہے۔ جب پانڈو اپنا تمام مال و اسباب قمار بازی میں ہار گئے تو اُس وقت یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اگر تم پانچوں بارہ برس کا بن باس اور ایک سال اگیات باس (اس طرح رہنا کہ کوئی شخص پہچان نہ سکے) کر آؤ تو پھر سلطنت کے حقدار ہو سکو گے۔ اس تصویر میں ارجن کو دکھایا گیا ہے جسنے اپنے اگیات باس کے لئے زنانہ صورت اختیار

کہ کمہ برہن نلا نام رکھ لیا تھا۔ اگیات باس کی میعاد پوری ہو چکی تو ارجن اب مہاآش کے لڑکے اتر کو ساتھ لیکر کوروں سے لڑنے کو جا رہا ہے۔ اتر لڑائی سے ڈرتا ہے۔ اگر ارجن در برہن نلا، اس کو سمجھا رہا ہے کہ "چھتری کو لڑائی سے ہرگز نہیں ڈرنا چاہئے"۔

سلطان عبدالحمید خاں اور پرنس بسمارک (۱۸۴۲ء لغایت ۱۹۰۹ء) کی تصویریں انگریزی مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ بادی النظر میں یہ عام تصویریں ہیں، لیکن ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے تو واضح ہوگا کہ دونوں تصویریں بجائے خود مرقع ہیں۔ ممالک یورپ میں ایسی تصویروں کی بہت قدر کی جاتی ہے۔

اس پرچہ میں ایک اور تصویر شائع کی جاتی ہے جسمیں سری کرشن کا بچپن دکھایا گیا ہے۔ یہ بھی اسی مصور کی کھینچی ہوئی ہے جسکی ایک تصویر جولائی نمبر میں "جسودا جی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ہندوستانی فن تصویر کا یہ ایک نادر نمونہ ہے۔

مرحوم مہاراجہ ناہن کی تصویر کے لئے ہم بابو چیندو لال صاحب رما ناظر کا شکریہ ادا کرتے ہیں، تصویر کے ساتھ آپ نے مہاراجہ صاحب کے مختصر حالات بھی ارسال فرمائے ہیں جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

ریاست سرمور ناہن انبالہ کے جانب شمال و مشرق بفاصلہ [illegible] میل واقع ہے۔ ریاست کے حکمراں جناب آنریبل سر سریندر بکرم پرکاش بہادر۔ ایک عالی دماغ، وسیع الخیال، بیدار مغز، سنجیدہ، خلیق، عالی حوصلہ، دلیر، عادل، وجیہہ، خوش خصال، نیک طینت سادہ مزاج رئیس تھے۔ آپ نومبر ۱۸۶۶ء کو کتم عدم سے عالم شہود میں جلوہ آرا ہوئے تھے۔ بچپن ہی سے خداداد ذہن اور دماغ اور اقبال ساتھ لائے تھے۔ اپنے والد مہاراجہ سر شمشیر پرکاش صاحب بہادر جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کے زیر نظر ہر تربیت و تعلیم پائی، علم تمدن و ریاست میں، جیسا کہ ایک رئیس کے لئے زیبا ہے دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ آپ نے اکتوبر ۱۸۹۸ء میں مسند نشین ہو کر زمام حکومت ہاتھ میں لی۔ مسند نشین ہوتے ہی بڑے استقلال سے ریاست کے کاروبار کو انصرام دینا شروع کیا۔ دسمبر ۱۹۰۲ء میں آپ ممبر کونسل بنائے گئے اور جنوری ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ کی طرف سے کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کا خطاب عنایت ہوا۔ ۱۱ سال تک بڑی دانائی اور فراست متانت سے ریاست کے کاموں کو بنفس نفیس انجام دیا۔ عدل و انصاف میں یکتا اور معقول پسندی کے شیدا تھے۔ آپنے ریاست کو ہر طرح رونق دی۔ پلیگ کے انسداد کے لئے آپ نے سالانہ کثیر خرچ سے ایک محکمہ "پلیگ ڈپارٹمنٹ" قایم کیا۔ آپنے ناہن میں پانی کی قلت کو محسوس فرماکر واٹر ورکس کا کام اعلیٰ پیمانہ پر جاری فرمایا جسکے لئے تین لاکھ روپیہ کے قریب منظوری ایک مشہور [illegible] کمپنی کو دی گئی۔ آپنے اپنے اہلکاروں کے لئے بصرف کثیر ایک بلڈنگ عطا فرمائی جس میں اپنے نام نامی پر "سریندر کلب" قائم فرمایا۔ حسب معمول آپ بماہ چیت دہرہ دون تشریف لے گئے تھے راستہ میں معمولی شکایت سلسل بول پیدا ہوگئی۔ دہرہ دون جاکر استسقا کا مرض ہوگیا۔ دل، جگر، پھیپھڑہ پر خراب اثر پڑا اور آپ ۴ جولائی ۱۹۱۱ء کی شب کو ۱/۲ ۱۲ بجے اپنی رعایا کو داغ مفارقت دے گئے۔ اثنائے بیماری میں ولیعہد صاحب بہادر امر سنگھ جی کو جو بڑے سنجیدہ اور فہمیدہ ہیں، کل نظم و نسق ریاست سپرد فرمایا۔ جنھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے زمام حکومت ریاست ہاتھ میں لی۔ اور اب کل ریاست کا انتظام نہایت حوصلہ اور بیدار مغزی سے اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر چلکر انجام دے رہے ہیں۔

آل انڈیا اردو کانفرنس کے مجمع کی تصویر محض اس لحاظ سے شائع کی جاتی ہے کہ اس کا نام "مجمع اردو کانفرنس" ہے مگر سخت افسوس کے ساتھ یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اسکو "اردو" سے کوئی تعلق نہیں۔ اس مجمع میں مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کے سوا کوئی اور حضرت ہمیں ایسے نظر نہیں آئے جنھوں نے اردو لٹریچر کی کچھ خدمت کی ہو۔ علاوہ بریں جو کارروائی کانفرنس میں ہوئی اس کے لحاظ سے بھی یہ کانفرنس "اردو کانفرنس" نہ تھی۔ برعکس نہند نام زنگی کافور والی مشہور مثل غالباً ایسے ہی مواقع پر استعمال ہوتی ہوگی!

مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کی تصویر اس مع الی تشکر گزاری کیساتھ شائع کیجاتی ہے جو آپ کی قلمی اعانت سے ادیب پر فرض ہے۔ آپ کی شیوا بیانیاں عالم شہرت رکھتی ہیں اور ناظرین ادیب ہمیشہ آپکے کلام سے محظوظ ہوتے رہے ہیں۔

ادب اردو کا باتصویر ماہوار رسالہ

ادیب

جلد سوئم

جنوری لغایت جون ۱۹۱۱ء

جس میں

پچاس نامور اہل قلم کے ایک سو مضامین۔ تین سو چار صفحات

میں درج ہیں اور

ستاون رنگین و سادہ تصاویر شامل ہیں

مرتبہ

نوبت رائے نظر لکھنوی

پیارے لال شاکر میرٹھی

مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد

قیمت فی جلد دو روپیہ

فہرست مضامین

فہرست تصاویر

جنوری سنہ ۱۹۱۱ء

فروری سنہ ۱۹۱۱ء

مارچ سنہ ۱۹۱۱ء

اپریل سنہ ۱۹۱۱ء

مئی سنہ ۱۹۱۱ء

جون سنہ ۱۹۱۱ء



دمینتی اور ہنس

[illegible]

DAMAYANTI AND HANSA [illegible] Nath Tagore

انڈین پریس الٰہ آباد

اکتوبر ۱۹۱۱ء

ادیب

جلد ۴ نمبر ۴

اقوامِ ہند کی اصل اور اُن کی تقسیم[۱]

۱۔ قوم کیونکر پیدا ہوتی ہے، اور اس میں تغیرات کیونکر ہوتے ہیں۔

قوم و ملت

قبل اس کے کہ ہندوستان کی اقوام کا بیان کیا جائے، ہم اس امر کی تصریح کرنا چاہتے ہیں کہ قوم کیا چیز ہے؛ یہ کیونکر پیدا ہوتی ہے، اور اس میں تغیرات کیونکر وقوع میں آتے ہیں اور وہ کون سے خصائص ہیں جن کی بنا پر اقوام کی تقسیم ہوسکتی ہے۔ اس سے پہلے ہم نے اپنی دوسری تصانیف میں اس مضمون پر تفصیلی بحث کی ہے اور دکھایا ہے کہ علمی تحقیقات کی رو سے عام خیالات کیا ہیں، اور خود ہماری ذاتی تحقیقات اس مسئلہ میں کیا ہیں۔ پس اس مقام پر اُس پرانی تحقیقات کا ایک خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ بنی نوع انسان کے مختلف گروہ جو تمام صفحۂ عالم پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کی چند تقسیمیں کی گئی ہیں۔ جن کو نام اقوام کا دیا گیا ہے۔ یہ قوم کا لفظ گویا انسان کے لئے وہی معنی رکھتا ہے جو لفظ "جنس" حیوان کے لئے۔ نوع انسان کی مختلف اقوام اُسی طرح ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں اور اُن کے خصائص ویسے ہی صاف اور بیّن ہیں۔ جیسے اجناس حیوانی کی۔ ان کے خصائص میں ایک اصولی امر یہ ہے کہ یہ بذریعہ وراثت کے ابًا عن جدٍ پہنچتی ہے، لفظ "قوم" کا مفہوم جنس کا تو ہے لیکن یہ لفظ "ملت" سے بالکل علیحدہ ہے یعنی قوم و ملت مترادف الفاظ نہیں ہیں۔ ملت کا اطلاق اقوام مختلفہ کے اُن گروہوں پر ہوتا ہے جو خاص وجوہات سے خواہ وہ وجوہات سیاسی ہوں یا جغرافی کسی ایک حکومت کے تحت میں آجاتے ہیں، مثلاً ہندو، فرانسیسی، نسوی۔ ان الفاظ سے مراد ایسی اقوام کے گروہ ہیں جو بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ایک ہی ملک میں رہتی ہیں، اور اسی وجہ سے اُنکے اغراض بھی متحد ہیں۔

خصائص موروثی و خصائص اکتسابی

اجناس حیوانی کی طرح اقوام انسانی میں بھی دو قسم کے خصائص ہیں جن کا اثر اور جن کی عظمت نمایاں ہے۔ ان میں سے اوّلاً وہ خصائص ہیں جو وراثت کے ذریعہ

[۱] یہ مضمون "تمدنِ ہند" سے لیا گیا ہے جو زیر طبع ہے اس کے اشاعت کے لئے ہم پادری جان ملکم صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

آبا و اجداد سے پہنچی ہیں اور پیدا ہونے کے ساتھ ہی اشخاص میں فطرتاً موجود ہو جاتی ہیں۔ ثانیاً وہ خصائص جو کسی مخصوص فرد قوم میں مرزبوم، تعلیم و تربیت اور دوسرے اسباب سے پیدا ہو جاتی ہیں گویا یہ وہ کمزوری ہے جسے قوم زمانۂ دراز سے اپنے سر پر لئے آتی ہے۔ ہر فرد قوم پیدائش کے وقت انھیں اپنے ساتھ لاتا ہے۔ دوسرے خصائص ہر فرد قوم کے ایام زندگی میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بمقابل موروثی خصائص کے نہایت ہی کمزور ہیں۔ اور ہرگز خصائص موروثی کا جو صدیوں میں پیدا ہوئی ہیں مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ اکتسابی خصائص بہ مرور زمان اور اثر مرزبوم کسی قوم میں زمانۂ دراز تک رہ جاتی ہیں تو پھر بتدریج اس قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر کے بڑے بڑے تغیرات پیدا کر دیتی ہیں۔

اتصال قومی ان تصانیف میں جن کا ذکر اوپر ہوا ہم نے دکھایا ہے کہ وہ مختلف اقوام جنھیں اسباب خارجی نے کسی ایک ملت میں شامل کر دیا ہے آگے چل کر کسی روز ایک قوم بن جائیں گی، اور جو چیز انھیں ایک قوم بنائے گی وہ یہ ہے کہ اثر مرزبوم، ازدواج باہمی، اور وراثت، یہ تینوں مل کر مدت ہائے دراز میں ایسی جسمانی، اخلاقی، اور دماغی خصائص پیدا کر دیں گی جو ہر فرد قوم میں عام ہو جائے گی

اتصال قومی کے شرائط مصنف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اتصال قومی کے لئے دو شرطیں لازمی ہیں اولاً جو تغیرات پیدا ہوں وہ بتدریج وراثت کے ذریعہ سے پیدا ہوئے ہوں، اور ثانیاً ان مختلف اقوام میں جو کسی ایک ملت کے اجزا ہیں حد سے زیادہ نامساوات نہ ہو۔ شرط ثانی بھی نہایت ضروری ہے۔ مثلاً اگر کسی سفید رنگ قوم کا چھوٹا سا گروہ حبشیوں کے بڑے گروہ میں شامل کیا جائے تو وہ چند روز میں مفقود ہو جائے گا، بہت سی اقوام فاتح کا جنھوں نے کثیر التعداد اقوام کو فتح کیا انجام یہی ہوا یعنی قوم مفتوح میں مل گئیں جیسے عرب مصر میں۔ اس زمانہ کے مصری جو زبان مذہب اور نظامات کے لحاظ سے بالکل عرب ہیں، فی الواقع انھیں اقوام کی اولاد ہیں جو فراعنہ کے وقت میں اس ملک میں تھیں، اور اس کا ثبوت اُن مورتوں سے ہوتا ہے، جو مندروں اور قدیم سلاطین مصر کی قبروں پر کندہ ہیں۔

اثر مرزبوم مرزبوم کا اثر جو کسی زمانہ میں بہت بڑا سبب اقوام کے تغیر کا سمجھا جاتا تھا، فی الواقع نہایت خفیف اور کمزور سبب ہے۔ اس کا اثر اُسی وقت ہوتا ہے جب کوئی قوم کسی مرزبوم میں ہزارہا صدی رہی ہو جس سے اتنا طویل زمانہ مراد ہے جو تاریخ انسانی کے شروع ہونے سے ماقبل تک پہنچ جاتا ہے۔ فی زماننا منجملہ اُن اسباب کے جو خصائص موروثی میں تغیر پیدا کرتے ہیں مرزبوم کا اثر بہت خفیف سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً قوم یہود نے جو تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ اپنی موروثی خصائص کو نہایت مضبوطی سے قائم رکھا ہے۔ خصائص موروثی اس درجہ مضبوط اور مستحکم ہیں کہ اگر کوئی قوم ایسے مرزبوم میں جا بسے، جہاں بلا اپنی حالت بدلے ہوئے اور اپنے میں تغیرات عظیم پیدا کئے ہوئے، قائم نہ رہ سکتی ہو تو وہ مر مٹے گی لیکن بدلے گی نہیں۔ مرزبوم کا عادی ہو جانا محض خیالی امر ہے۔ مثلاً باوجود اس باقاعدہ زندگی کے جو انگریز ہندوستان میں بسر کرتے ہیں، اور جس میں اصول صحت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے وہ ہرگز اس ملک کی آب و ہوا کے عادی نہیں ہو سکتے۔ اور اگر وہ اپنے بچوں کو تربیت کے لئے یورپ نہ بھیجیں تو اس براعظم کے اندر تیسری ہی پشت میں ایک یوروپی بھی باقی نہ رہ جائے۔ مرزبوم کا اثر خفیف تو ہے مگر موجود ضرور ہے۔ گو یہ اثر محسوس

ی وقت ہوتا ہے جب وراثت اس کی پوری اعانت کرے،
لاً اگر اقوام مختلفہ میں جو ایک ہی ملت کے اجزا رہیں اتصال
یدا کرنے کی دوسری شرط جس کا ذکر اوپر کیا گیا موجود ہو، یعنی انمیں
یادہ نامساوات نہ ہو تو اس صورت میں موروثی خصائص قدیم
کا وزن خصائص جدید کے وزن سے مساوی ہو جاتا ہے" اور
اس وقت مرز بوم اپنا بیّن اثر دکھانے لگتی ہے۔ پس ہم اُسی
پہلے نتیجہ پر آگئے، یعنی نئی اقوام ازدواج باہمی اور میل جول سے
پیدا ہوتی ہیں، نہ صرف اثر مرز بوم سے۔

اس نئی قوم کا درجہ

لیکن یہاں ایک نیا مسئلہ ہمارے سامنے آجاتا ہے،
جس کے حل ہونے پر بڑے بڑے عملی نتائج کا دار و مدار ہے، یعنی
تمدن انسانی میں اس نئی قوم کا درجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اگر یہ نئی قوم
اقوام ممزوجہ کے بہترین قوم سے بہتر یا اُس کے مساوی بھی ہو، تو
یہ کہیں گے کہ یہ نتیجہ عمدہ ہوا۔ اور اگر بالفرض اس کا عکس ہوا اور
نئی قوم درجہ میں گھٹ گئی تو نتیجہ بُرا ہوا۔ اقلاً قوم ممزوجہ میں سے
وہ قوم جو امتزاج سے پہلے اعلیٰ درجہ رکھتی تھی گھاٹے میں رہے گی
ہم نے اپنی مذکورۃ الصدر تصنیفات میں اس اصولی مسئلہ پر تفصیلی
بحث کی ہے، اور یہاں صرف نتائج کا لکھ دینا کافی ہوگا۔ جس مقام
پر ہم نے ان نتائج کو بیان کیا ہے جو عالم کے مختلف حصّوں میں اس
قسم کے امتزاج اور میل سے پیدا ہوئے ہیں وہاں یہ بتا دیا گیا
ہے کہ میل جول کا نتیجہ مخصوص حالات کے لحاظ سے یا تو بہت ہی مفید
ہوا ہے یا سخت مُضر۔ میل جول مفید اُسی وقت ہوتا ہے جب کہ اُن
اجزا مختلفہ میں جن کے ملنے سے ایک نئی قوم پیدا ہوتی ہے تبائن
نہ ہو بلکہ مماثلت ہو۔ مثلاً قوم انگریز کے مختلف اجزا یعنی قدیم برٹن،
ڈین، انگلو سیکسن، اسکاٹ، اور نارمن، فرنچ، آئرش وغیرہ میں
مماثلت موجود تھی، اور اس وجہ سے ان کے میل کے نتیجہ سے ایک
اعلیٰ درجہ کی قوم تیار ہوگئی۔ برخلاف اس کے اگر مختلف اجزا میں
زیادہ تبائن ہو اور اتصال کی صلاحیت کم ہے تو نتیجہ یقینی مضر ہوتا
ہے مثلاً اقوام سفید رنگ اور اقوام سیاہ فام کا میل۔ یا ہندو اور
یوروپی کا میل۔ ہنود اور یورپیوں کے میل کے متعلق اس تصنیف
کے اس حصہ میں پھر رجوع کیا جائے گا جس میں ذات کا بیان
ہے اور دکھایا جائے گا کہ فی الواقع اس میل جول سے کس قدر
بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ہم دکھائیں گے کہ ہند کے قدیم فاتحین
یعنی قوم آریا ان بُرے نتائج سے بخوبی واقف تھے، اور اُن کا یہی
علم غالباً ذات کی تقسیم اور اس کے متعلق کل انتظامات کے قرار دینے
کا باعث ہوا۔ اس قسم کے امتزاج اور میل کے سیاسی اور اخلاقی نتائج
پر بھی جو مختلف صورتوں میں واقع ہوئے ہیں۔ بحث کی گئی ہے اور
دکھایا گیا ہے کہ اقوام کے تنزل اور حکومتوں کی ترقی اور انحطاط کے اسباب
میں یہ بہت باوقعت سبب ہیں۔ ہم نے یہ بھی دکھایا ہے کہ جس وقت
دو قومیں ایسی ہوں کہ ان میں سے ایک دوسرے کی محکوم ہو تو
میل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ جب ان اقوام میں زیادہ
فرق ہو تو ایک قوم دوسرے کی حکومت کو بآسانی قبول کر لیتی ہے
مثلاً مسلمانوں کی حکومت ہند میں جہاں تقریباً پانچ کروڑ ہندوؤں
نے اسلام قبول کر لیا۔ برخلاف اس کے جب فاتح و مفتوح میں فرق
زیادہ ہے تو محکوم قوم اس آسانی سے غلامی قبول نہیں کرتی یہ حال
ہند میں انگریزی حکومت کا ہے۔ باوجود ڈیڑھ سو سال کے تسلط کے
انگریزوں نے اس ملک کے باشندوں کو اپنی زبان اور اپنا مذہب
سکھانے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ حالانکہ اتصال قومی کے پیدا
کرنے میں یہ دو بہت بڑے جز ہیں۔

اس مقام پر ہم ان عام اصول کا، جو اقوام عالم پر صادق
آتے ہیں، اور جن کا ذکر ہم اپنی ایک دوسری تصنیف میں بتفصیل کر

کر چکے ہیں، اسنادہ نہیں کریں گے۔ اقوام جدید کے پیدا ہونے کے مسئلہ کو چھوڑ کر اب ایک نظر ان خصائص پر ڈالیں گے جن کے ذریعہ سے اقوام انسانی کی تقسیم اور تفریق ہو سکتی ہے۔

تقسیم اقوام کے اصول خصائص جسمانی و اخلاقی و دماغی کی بحث تقسیم اقوام میں

تقسیم اقوام کے اصول | بہ نظر سرسری تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقوام کی تقسیم میں سب سے با وقعت خصائص وہ ہیں جن کو خصائص جسمانی کہنا چاہئے مثلاً جلد اور بالوں کا رنگ یا کھوپڑی کی ساخت وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ یہ وہ خصائص ہیں جو سب سے پہلے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ لیکن تھوڑے سے غور کے بعد معلوم ہو گا کہ فی الواقع ایسا نہیں ہے اور ان خصائص کے ذریعہ سے صرف سطحی تقسیم ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر صرف جلد اور بالوں کے رنگ کی بنا پر اقوام کی تقسیم کی جائے تو کل اقوام عالم چار یا پانچ سے زیادہ قسموں میں تقسیم ہو سکیں اگر اس کے ساتھ کھوپڑی کی ساخت بھی شامل کر لی جائے تو ان چار یا پانچ قسموں سے ہر ایک کی دو یا تین قسمیں بن سکیں گی لیکن اس سے آگے بڑھنا محال ہو گا۔ اگر ہم اقوام سفید رنگ کی تقسیم عریض الراس یا طویل الراس میں کریں اور پھر ان میں نہایت سفید اور کم سفید کی تفریق کریں تو اس تقسیم سے ہمیں فائدہ نہ ہو گا کیونکہ اس تقسیم میں ایسی مختلف الاصل اقوام شامل ہو جائیں گی جیسے فرانسیسی انگریزی۔ رومی۔ اور المانی وغیرہ۔ پس معلوم ہوا کہ صرف جسمانی خصائص کی بنا پر اقوام انسانی کی تقسیم نہیں کی جا سکتی اور ایک ملت میں مختلف اقوام کے مجتمع ہونے کے بارہ میں جو کچھ ہم اوپر کہہ چکے ہیں اس سے معلوم ہو گا کہ زبان و مذہب و تقاسیم سیاسی بھی بنائے تقسیم نہیں قرار دی جا سکتیں

خصائص اخلاقی و دماغی | پس بنائے تقسیم نہ تو خصائص جسمانی ہیں اور نہ زبان و مذہب و تقاسیم سیاسی لیکن خصائص اخلاقی و دماغی البتہ بنائے تقسیم قرار دی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ یہ پرتو ہیں ہر قوم کے خاص قوائے دماغی کے جو مادہ دماغی کی ساخت پر موقوف ہیں اور ان کا فرق اس درجہ باریک ہے کہ ہمارے آلات سے پیمائش نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہمیں خواہ مخواہ اس کی ضرورت ہے کہ مادہ دماغی کے اس فرق کو ہم معلوم ہی کر لیں۔ ہمارے لئے اسی قدر کافی ہے کہ اس فرق کی وجہ سے جو دماغی اور اخلاقی صلاحیتیں کسی قوم میں پیدا ہو جاتی ہیں اُن سے ہم مطلع ہوں۔ یہی خصائص اخلاقی و دماغی ہر قوم کی ترقی تدریجی کا دار و مدار ہے۔ اور یہی خصائص اس قوم کا حصہ تاریخ عالم میں مقرر اور معین کرتی ہیں اسی وجہ سے ان خصائص کی بہت بڑی وقعت ہے اور جو شخص کسی قوم کی اصلی حالت کو دریافت کرنا چاہے اسے لازم ہے کہ ان خصائص کا مطالعہ کرے نہ کہ خصائص جسمانی کا۔ ایک بہادر راجپوت اور بزدل بنگالی کے درمیان میں فرق کرنے کے لئے نہ تو کھوپڑی کی ساخت کام آ سکتی ہے اور نہ کھوپڑی کا زاویہ بلکہ ہمیں صرف انکی خصائص روحانی اور وجدانیات کے ذریعہ سے اس اختلاف عظیم کا پتہ لگے گا جو ان دونوں میں واقع ہوا ہے۔ مثلاً ہم انگریزوں اور ہندوؤں کی ہزار کھوپڑیوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کریں لیکن اس مقابلہ سے ہمیں ہرگز یہ نہ معلوم ہو سکے گا کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن سے تیس۳۰ کروڑ ہند وکئی ہزار انگریزوں کے تابع حکومت ہیں۔ یہ راز ہم پر جب ہی کھلیگا جب ہم ان دونوں اقوام کی اخلاقی اور دماغی حالتوں کا مقابلہ کریں۔ اس مقابلہ سے صاف ظاہر ہو جائے گا کہ ایک میں کس اعلیٰ درجہ کا استقلال اور قوت عملی ہے اور دوسرے میں کس درجہ کا ضعف اور کمزوری ہے کسی قوم کی دماغی اور اخلاقی صلاحیتیں اس قوم کا ارث ہیں جسے ہم نے کسی مقام پر مردوں کی آواز سے تعبیر کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ خصائص اُن کے کردار و رفتار میں بہت بڑا دخل رکھتی ہیں۔ یہی خصائص قوم کے نظامات کو



نوجوان ترک

انڈین پریس الہ آباد

ار دیتی ہیں۔ نظامات انھیں نہیں پیدا کرتے۔ اس میں شک نہیں افراد کے اندر ان خصائص میں تھوڑا بہت فرق واقع ہوتا ہے بلحاظ شکل وصورت میں فرق ہے لیکن قوم کے کثیر التعداد افراد میں ان میں سے بہت سی خصائص اسی طرح مستحکم ہوتی ہیں جیسے حیوانات کے اجناس میں خصائص جسمانی۔

قوم ایک جاندار ہے ہمارے زمانہ کے علم تشریح و علم حیات نے ہمیں بتایا ہے کہ اشیائے جاندار کے جسم لاکھوں ذرّوں سے بنے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک بطور خود زندہ ہے اور اپنی تجدید کرتا ہے، اور اسی وجہ سے ہر ایک ذرّہ کی زندگی کی مدّت اُس عضو بدن سے کم ہے جس کا وہ ایک جزو ہے۔ اسی طرح قوم کو بھی ایک جاندار سمجھنا چاہیئے، جو ہزارہا منفرد اجزا سے بنا ہوا ہے جس میں تجدید ہوتی جاتی ہے۔ ہر فرد قوم کی ایک ذاتی زندگی ہے جو مثل ذرّہ کے زندگی تھوڑی ہوتی ہے۔ لیکن قوم بہ حیثیت مجموعی ایک علیحدہ زندگی رکھتی ہے اور اس میں وہ مجموعی خصائص ہوتی ہیں جن پر تاریخ کے مطالعہ کے وقت ہمیں نظر رکھنی چاہیئے جب کسی زمانہ میں مختلف اقوام عالم کے علم النفس کا باہمی مقابلہ کیا جائے گا اور اس سے ایک نیا علم استخراج ہوگا تو اس علم کے محقق کا کام یہ ہوگا کہ اُن خصائص میں سے جو ہر ایک قوم میں مخصوص ہیں ایسے خصائص کو اخذ کرے جو تمام اقوام عالم میں مشترک ہوں اس خیالی قوم کے افراد نئی خصائص کے ذریعہ سے کسی قدر ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے جائیں گے لیکن پھر وہ ایک معین اور لازمی قانون قدرت کے مطابق ایک دوسرے سے قریب بھی ہوتے جائیں گے۔ انسان صرف اپنے والدین کا فرزند ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی اپنی قوم کا وارث بھی ہے

خصائص ملتی ظاہر ہے کہ وہ خصائص جو کسی ملت کے مختلف افراد میں بطور عام پائی جاتی ہیں تعداد میں اُسی قدر زیادہ ہوں گی جس قدر اس ملت کے اجزا میں مماثلت ہو اور اگر ان اجزا میں تباین ہو یا انفصال کم ہو تو اس وقت بے شک عام خصائص کی تعداد کم ہو جائے گی اگر ہم حیوانات کی تقسیم سے مقابلہ کریں تو یہ کہا جائے گا کہ کسی ملت کے وہ گروہ جن میں مماثلت ہو بجائے کسی جنس حیوانی کے اقسام کے ہیں یعنی ان میں باہمی فرق اس قدر نہیں ہے کہ انہیں سے ہر ایک کو ایک علیحدہ جنس قرار دیا جائے۔ برخلاف اس کے جو گروہ غیر مماثل ہوں گے حیثیت علیحدہ علیحدہ اجناس کی ہوگی۔ وہ تمام خصائص جو کسی ملت کے افراد میں زیادہ تر پائی جائیں۔ انھیں اس ملت کے خصائص سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً اگر ایک ہزار فرانسیسی اور ایک ہزار انگریز لئے جائیں تو انکے افراد میں بہت کچھ فرق محسوس ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان ہزار ہزار آدمیوں میں بعض خصائص ایسی عام ہوں گی جن سے ہم ایک خیالی فرانسیسی اور خیالی انگریز اپنے ذہن میں بنا سکتے ہیں جس سے فرانسیسی اور انگریز کی تعریف ہو سکے گی۔ اسی طرح علم حیوانات کے ماہرین نے مثلاً گھوڑے یا کتے کی تعریف کی ہے جب اس تعریف کو گھوڑوں اور کتوں سے تطبیق دیں تو اس میں بہت سے افراد شامل ہو جائیں گے اور شاید تھوڑے سے ایسے بھی ملیں گے جن میں خفیف سا فرق ہوگا، اور ان پر یہ مجموعی تعریف پوری طرح صادق نہیں آئیگی۔

اقوام ہند کی تقسیم اصول تقسیم کو قرار دینے کے بعد اب ہم ان اصول کو اقوام ہند کی تقسیم میں استعمال کر سکیں گے۔ ان اقوام کے بیان میں ہم پہلے ہر ایک کا مقام جغرافی بتائیں گے اس کے بعد ہم ہر ایک قوم کا علیحدہ علیحدہ بیان لکھیں گے اور پھر ایک خاص فصل میں اُن کی اُن عام خصائص کا ذکر کریں گے جو امتزاج باہمی اتحاد مرزبوم و نظامات و اعتقادات کی وجہ سے ان مختلف اقوام میں پیدا ہوئی ہیں

(باقی آئندہ) **سیّد علی بلگرامی**

سیف وقلم

خوشتر آں باشد کہ سر اہل ملک
گفتہ آید در بیاں سیف وقلم

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ زمانہ کی رفتار ہمیشہ یکساں نہیں رہی ہے اگر ہم دنیا کی تاریخ کے متفرق اوراق پر غائیت اور امعان سے نظر ڈالیں گے تو ہمیں پتہ لگ جائے گا کہ شروع ہی سے یہ زمانہ کبھی بھی ایک رفتار پر نہیں چلی ہے بلکہ کبھی کسی رفتار پر اور کبھی کسی پر۔

گہے چنیں گاہے چناں

اگر کبھی تیز چال ہے تو کبھی سست چال سے بھی۔ اگر کبھی فلک سپید ہے منزلیں طے کرتی ہے تو کبھی صرف ایک ہی منزل پر رہ گئی ہے۔

گاہ آدمی گاہ ... سرد ... شد
... یہ ... نمیدار ... قرار

اگر گزشتہ صدی کے مردے قبروں سے نکلکر اس صدی کا نظارہ کریں تو وہ موجودہ کیفیات اور حالات کا تماشا کرکے حیرت زدہ ہو جائیں گے۔ ؎

میری گردش کو دیکھکر پرکار
چال بھی اپنی بھول جاتی ہے

قدرت سے یہ کون پوچھے کہ اس قدر تغیرات اور تبدلات کیوں رکھے۔ اس بوقلمونی سے فائدہ ہی کیا۔ یہ روش اور یہ چال قدامت اور استقلال کے خلاف ہے۔ یکرنگی میں جو لطف ہے وہ دورنگی میں کہاں۔ یہ معماً ایسا نہیں کہ قدرت پر اس کا حل چھوڑ دیا جائے لطف ہی اس میں تھا کہ ہر ایک قسم کے تغیرات اور تبدلات کی ہستی بھی وجود پذیر ہی

جب انسان بذاتہٖ خود بھی ایک رنگ میں نہیں رہتا تو پھر دیگر مواد اور خود اس کے افعال اور تصرفات کیوں ایک ہی نقش قدم لیں۔ یہ تغیر اور تبدل بھی ایک ضروری مرحلہ ہے۔ یہ کسی شخص اور کسی قوم کا اجارہ نہیں کہ ایک ہی با اقبال حالت میں ہمیشہ رہے۔ یا کوئی قوم ہمیشہ ادبار اور فلاکت ہی میں دبی رہے۔ کبھی کوئی قوم ادبار میں ہوتی ہے اور کبھی باقبال۔ کبھی مہذب اور کبھی غیر مہذب۔ کبھی حوادث مار مار کر سیدھا کرتے ہیں اور کبھی راہ پر لاکر اقبال اور احترام کا وارث بھی بناتے ہیں ؎

نفس سیدھا ہو نہ سکتا عیش میں کثتی اگر
آئے دن کی سختیاں تادیب ہو اُستاد کی

حکمت اور دانائی کیا ہی ؟ یہ کہ زمانہ کی رفتار سمجھ میں آجائے۔ جدھر زمانہ انگلی اٹھائے آپ بھی اودھر ہو جائیں جدھر وہ جائے آپ بھی وہی راہ لیں۔ بے وقوفی اور جہالت یہ ہی کہ زمانہ کا مقابلہ کریں مُنہ کی کھائیں اور تباہ ہو کر رہ جائیں۔ اور ایسے گڑھے میں گریں کہ خبر سے بنا شد ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔

دنیا کی شروع شروع میں وہ چال نہ تھی جو اس کے مابعد حصوں میں رفتہ رفتہ ہوتی گئی۔ زمانہ بھی گرگٹ کی طرح کبھی کوئی رنگ بدلتا ہے اور کبھی کوئی۔

ایک زمانہ سیف یا شمشیر کا یا یوں کہئے کہ زور یا کسی حد تک
بر یا جہالت کا تھا۔ یہ زمانہ مدتوں زوروں پر رہا۔ اس کے حصے
یں وہ شوکت وہ اقبال، وہ دبدبہ آیا کہ جس کی نظیر وہ آپ ہی
تھا اس وقت میں سب فتوحات اور سب تعلیات اسی کو زیبا
تھیں اور اُسی کا موروثی حصہ کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہ تھا۔
چھوٹے سے لیکر بڑے تک اُسی کے نام لیوا اور اُسی کے حوالی موالی تھے

ہمیں بود فخر و مباہات دنیا

زمانہ سیف و شمشیر نے اپنے عہد حکومت میں مختلف روپ
اور مختلف سوانگ بدلے۔ کبھی دیو کی صورت میں نکلا اور کبھی جن
کے روپ میں کبھی پری بن کر آیا اور کبھی چڑیل کے قالب میں جلوہ
افروز ہوا۔ کبھی آسمان سے نازل ہوا اور کبھی زمین سے سر نکالا۔ کبھی
قومی رنگ میں للکارا اور کبھی مذہبی لے میں پکارا۔ کبھی دیوانہ وار
آیا اور کبھی فرزانہ بن کر۔ کبھی سیدھا چلا اور کبھی اُلٹا۔ کبھی چمکا
اور کبھی دمکا۔ کبھی جلا اور کبھی جلایا۔ کبھی ہنسا اور کبھی رویا۔ کبھی
ہنسایا اور کبھی رلایا۔

مختلف رنگوں میں آئے مہرباں
وضع اپنی کا بھی کیا کچھ پاس ہر

نہ کوئی پرساں تھا اور نہ کوئی نگراں جس رنگ میں چاہا آئے
جس لے میں چاہا بولے اور الاپے۔ کبھی کمان میں حلول ہوئے
اور کبھی تیر و تفنگ میں۔ کبھی توپ میں اور کبھی خنجر و سیف میں۔ جہاں
گئے جدا ہی بستی بسائی۔ اور جہاں بیٹھے اپنی ہی دھونی رمائی۔

اس دور میں ساری ترقیوں ساری کامیابیوں کا مدار
سیف و خنجر ہی پر تھا۔ خوبی تھی تو یہ تھی۔ کمال تھا تو یہ تھا۔ خواب
میں بھی اسی کی یاد تھی اور بیداری میں بھی یہی خونخوار مشغلہ۔
کب خواب میں خنجر کی رگڑ یاد نہ آئی کب روح سوے کوچہ جلاد نہ آئی

بادشاہوں کی بادشاہت امیروں کی امارت رئیسوں کی ریاست
فوجوں کی شجاعت اہل کاروں کی لیاقت کا سرمایہ ہی گویا سیف
و خنجر تھے۔ جہاں دیکھو تیر و کمان کا تذکرہ، سیف و شمشیر کی کہانی۔
کوئی مرتا ہے تو کوئی مارتا ہے، اِدھر تلواروں پر زمردی حاشیہ
چڑھتا ہے، تو اُدھر خون میں قبضہ شمشیر رنگا جاتا ہے ایک طرف
نشہ نصرت سے جان ڈالتی ہے اور دوسری جانب جان لیتی
ہے۔ ایک کے حق میں فتح و کامیابی کا فتویٰ دیا جاتا ہے تو دوسرے
کے دامن پر خون کا دھبہ لگایا جاتا ہے۔ جب سیف و شمشیر کا زور
و شور تھا تو اس وقت نہ تو امن و امان کی کچھ قدر و منزلت تھی اور نہ
آزادی کی کوئی قیمت۔ بزدل سا بزدل بھی خنجر و تیغ سے مسلح ہو کر نکلتا تھا

موج ہوائے ہاتھوں میں کرچیں لیے ہوئیں غنچوں کی قلیں لیں پرائے چڑھے ہوئے

تاریخیں دیکھو تو انھیں خونخواریوں سے بھری ہیں۔ داستانیں
پڑھو تو اسی کشت و خون سے لبریز شاعری کا سارا دفتر انھیں
خوں ریزیوں کی نذر ہوتا تھا اور مجموعہ نثر انھیں خون خرابیوں
کا طومار لاتحصیٰ۔

یہ حالت کب تک باقی رہتی۔ بدلی اور آخر بدلی۔ قلم نے
علَم علم کے زور پر اپنے آپ کو سنبھالا اور سیف و شمشیر کے مقابلہ
پر میدان تدبیر اور عرصہ تفکر میں کھڑا ہو گیا اگرچہ شروع شروع میں
نوک خنجر کا مقابلہ نہ کر سکا۔ دبکا۔ جھجکا۔ پینترے بدلے۔ قدم اُکھڑ اُکھڑ
گئے۔ کئی دفعہ خوف زدہ ہو کر حوصلہ ہارا۔ لیکن رفتہ رفتہ مضبوط
ہو گیا اور ہاتھ سے گیا ہوا میدان مار لیا۔ اگرچہ زخمی اور لہولہان
بھی ہو گیا مگر مقابلہ سے اخیر تک جی نہ چُرایا۔
جگر پھٹ گیا اور اندر سے کھوکھلا بھی ہو گیا۔ لیکن ثابت قدمی
آخر مرتے مرتے کچھ نہ کچھ نباہی گئی گو سوائے پر کاہ کے اور کوئی
ہستی نہ تھی مگر آخر بازی لے ہی گیا۔

یہ مقابلہ ارکبھی کلک زنگیں بن کر آیا اور کبھی جوش میں جوشن بے مثال۔ یہ حال تھا کہ شمشیر وسیف نے ہار مانی اور تابع فرمان قلم ہو کر چلے۔ تادیر کی۔ نادم ہوئی۔ سر جھکایا۔ اور پشیمانی سے خون رودی۔ زمانہ نے ثابت کر دیا کہ وہ کبھی ایک ہی چال پر نہیں رہا اور کبھی ایک ہی جانب نہیں جھکا۔

زمانا نہیں ایک حالت پہ رہتا بدلتا ہے گردش کے مانند رنگت
کبھی سیف وشمشیر کی جنبہ داری کبھی کلک رنگیں کی کرنا حمایت
کبھی ہمنشیں بن کے اقبال آیا کبھی ساتھ لایا ہے ادبار وشامت
کبھی کرتے ہیں لوگ تعریف اسکی کبھی کھولتے ہیں زبان شکایت

سیف وشمشیر نے اپنے زمانہ میں ہزاروں گھر برباد کئے اور لاکھوں جانیں لیں۔ آخر سیفِ قلم نے جوشِ غیرت میں آکر وہ سبق دیا کہ مدتوں سے اپنی جان کو رو رہی ہے۔ نہ وہ طاقت، نہ وہ قدرت، نہ وہ بُرش نہ وہ کاٹ جب تک زبان قلم سے کوئی لفظ نہ نکلے تب تک کیا مجال کہ اب سیف وشمشیر نیام سے نکلے۔ ہر طرف قلم کا ہی لوہا مانا جاتا ہے اور قلم ہی کی شہرت ہے۔ اب دنیا میں کونسی قوم فاتح اور ناصر ہے جس کے ہاتھ میں خنجر قلم اور شمشیرِ کلک ہے۔ جو سیفِ قلم کا قبضہ اپنے قابو میں رکھے گا وہی خاندان عظمت پائے گا۔ جس کے گھر میں سیفِ قلم کا لائسنس ہو گا وہی کنبہ عزت دار ہے۔

اب قلم کا راج ہے اور قلم کا اقبال، قلم کی حکومت اور قلم کی سلطنت۔ پہلے قلم اور پیچھے تلوار۔ جب قلم حکم دیتا ہے تو تلوار نیام سے ادب کے ساتھ نکلتی ہے۔ جب قلم صفحۂ قرطاس پر حرکت کرتا ہے تو شمشیر میدان قتال وجدال میں منھ کھولتی ہے۔ سپاہی قلم کے تابع ہے اور کمان افسر قلم کا مطیع۔ شمشیر دنیا میں خون بہاتی ہے اور قلم آبِ صلاحیت سے خون کے دھبے دھوتا ہے۔

بُرش کب تیغِ ابرو کی ملی تیغ مہ لقو کو کہاں شمشیر لوہے کی کہاں شمشیر ...

سیف وشمشیر کی بُرش اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر یہ سب کچھ اب قلم کے تابع ہو چکا ہے اس زمانہ میں شمشیر و خنجر اُسی وقت کام دیتا ہے جب قلم قابو میں ہو سیف وخنجر لڑائی سے فتح کرتا ہے لیکن قلم آشتی اور محبت سے اپنی فتوحات کا ثبوت دیتا ہے

کیا حقیقت خنجر وشمشیر کی باقی رہی نوکِ کلکِ فکر سے عقدہ کشائی ہو گئی

اب قوموں کی لڑائی اور جنگ وفساد کے دن باقی نہیں ہے جو قومیں شومئی طالع سے اب تک زورِ قلم سے آگاہ نہیں رہی تھیں وہ فنِ قلم سے بہرہ ور ہو کر فتوحات تمدنی اور سوشیل سے متمتع ہوں۔ اقتصادی جنگوں میں زور آزمائی کریں اور جوہرِ سیفِ قلم دکھائیں، تہذیبی لڑائیوں میں سامانِ قلم سے کام لیں، تمام بُرائیوں، تمام دشمنیوں، تمام ہوسوں تمام بدخواہیوں کا نوکِ قلم سے سینہ چھید کر حسد وبغض کا خون بہائیں قومی اصلاحات کے واسطے ایسی قلمی جنگ کریں کہ دنیا عش عش کر اُٹھے

اب گزشتہ زمانہ کی طرح شمشیرِ قلم سے قومی زندگیوں کا خون نہ کریں میدان خلوص میں جم کر زورِ قلم سے اعدائے بغض وکینہ کا خاتمہ کر دیں۔ گورنمنٹ انگریزی نے اپنی ذاتی فیاضی سے قلمی خزانے کھول دئے ہیں۔ علوم وفنون کا ذخیرہ نسبتاً سستا کر دیا ہے۔ زورِ قلم سے اُسے حاصل کر ذاتی کدورتوں اور قومی رنجشوں سے روگرداں ہو کر اشہبِ قلم کے ذریعہ سے اُس منزل پر پہنچ جاؤ جہاں پہنچنے کی زمانہ تاکید کر رہا ہے تمام منتشر اور پریشان اجزا ایک ہی رُخ ہو کر علمِ قلم کے نیچے اغراض مشترکہ کے تہیّہ میں لگ جائیں اور اپنے اور اپنی گورنمنٹ کے لئے ایک برکت ثابت ہوں۔ قلم کی جے۔ قلم کا بول بالا۔

بہت لڑ چکے اور بہت مر چکے اب تو کوئی دن قلم کی بدولت صلح وآشتی سے گزارو

جاہ سے بات کرو پیار سے دیکھو اللہ
ہائے اتنی بھی نہیں تم میں مروت باقی

سلطان احمد



گنگا اور شانتنو

عالم ومافی العالم

(۵)

کیا سیارے آباد ہیں؟

یہ مسئلہ بڑا دلچسپ، مگر ساتھ ہی بڑا دقت خیز ہے، وجہ یہ ہے کہ محض استدلال تمثیلی اور تشابہ سے کام لینا پڑتا ہے اور خیالی گھوڑے دوڑانے پڑتے ہیں۔ یوں کہنا بجا ہوگا کہ مسئلہ ہذا یقینیات کے طبقہ سے نہیں بلکہ ظنیات سے متعلق ہے۔ اس مضمون کے پہلے نمبر کے خاتمہ میں سورج میں انسانی آبادی کے امکان سے بحث کی گئی تھی اور علمائے فلکیات کے خیالات کا اقتباس دیا گیا تھا۔ اس جگہ صرف ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ انکے آرا کا اعادہ نامناسب ہے۔ فیوگی اے نے اپنی کتاب[۱] میں یہ لکھا ہے کہ جب انسان اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔ تو کسی اور سیارہ پر جاکر پیدا ہوجاتا ہے پھر وہاں سے آگے جاکر کسی اور دنیا میں جنم لیتا ہے۔ اس طرح چند مرتبہ مختلف سیاروں میں پیدا ہونے اور مرنے سے اسکی روح کثیف اجزا سے پاک ہوکر اس قابل ہوجاتی ہے کہ وہ سورج کے خطۂ نور میں داخل ہو۔ وہ نری پاکیزگی اور خالص عقل رہ جاتی ہے پھر سورج کے ایک خاص حصہ میں مستقل سکونت اختیار کرلیتی ہے

سائنس کی شہادت مگر سیاروں کی آبادی[۲] کے بارہ میں سائنس کیا شہادت دیتا ہے۔ اس پر تھوڑی دیر غور کرنا چاہئے۔ سب سے ضروری اور قابل غور امر یہ ہے کہ اس دنیا میں حیوانی زلیست کے قیام کے واسطے کونسی باتیں ضروری ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں سے مختلف حالات میں ذی روح و ذی عقل ہستیوں کا ہونا محال نہیں ہوسکتا۔ اسی دنیا میں بعض جاندار ایک نرالی حالت میں زندہ پائے جاتے ہیں گو تاریکی میں زندہ رہنا امر محال ہے مگر کنٹکی (امریکہ) کے غاروں کے اندر ایک قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جو کبھی کسی قسم کی روشنی دیکھتی ہی نہیں ہیں۔ بعض گہرے سمندروں کے نیچے مچھلیاں پائی جاتی ہیں جن کے اوپر دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ پڑتا ہے اور وہ ہوا کی بھی محتاج نہیں ہیں۔ حالانکہ اور جاندار اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ قطبوں کی بے انتہا سردی اور ابلتے پانی کے چشموں کے اندر بھی جاندار پائے گئے ہیں۔ مگر پانی کے بغیر جاندار کا رہنا امر محال ہے

چاند کی حالت سب سے پہلے چاند کی حالت پر غور کرنا چاہئے۔ آیا وہاں جاندار اور نباتات ہے یا نہیں۔ بڑی دوربینوں سے وہ بخوبی نظر آتا ہے۔ وہاں ہوا نہیں ہے خشک بنجر میدان اور ننگے پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ روئیدگی نام کو بھی نہیں ہے اور وہاں کسی جاندار کے وجود کے علامات نہیں پائے جاتے۔

سیارگان کلاں کی حالت بھی ناموافق ہے۔ اب ذرا سیاروں کے طبعی حالات دیکھنا چاہئے آیا وہاں جاندار ہیں یا نہیں۔ نپ چون۔ یورے نس۔ شنیچر۔ برہسپت۔ سیارگان خورد۔ منگل زمین کی گردش کے دائرہ سے باہر۔ اور بدھ۔ وشکر اس کے حلقہ گردش کے اندر ہیں۔ نپ چون اور یورے نس بہت دور افتادہ ہیں۔ اس واسطے دوربین سے سوائے کرۂ ہوا کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا

[۱] "ڈے آفٹر ڈیتھ"۔ [۲] گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک پروفیسر نے ایک لیکچر اس مسئلہ پر لاہور دکھوسہ لیکل میں ماہ فروری ۱۹۱۵ء میں دیا تھا جس سے راقم نے چند امور کا استنباط کرکے یہاں لئے گئے ہیں۔ جے۔ آر۔ رانا

سیاروں کا ان خود مشاہدہ کے نا قابل ہیں۔ برہسپت اور سنیچر سیاروں میں سب سے بڑے ہیں۔ ان میں ہوا بخارات سب مگر دیگر حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حرارت کے سبب سے سُرخ ہیں اور جاندار و نباتات ان کے اوپر وجود پذیر نہیں ہوسکتے۔ بُدھ بہت چھوٹا اور سورج کے بہت نزدیک ہے۔ دوربین وہاں بھی بیکار ہے۔

شکل کی اعتبار سے کرۂ ارض کے مشابہ ہے مگر یہ کہنا دشوار ہے آیا وہاں جاندار ہیں یا نہیں ہیں

مریخ میں آبادی کے آثار | اب باقی مریخ ہے۔ گذشتہ تیس چالیس سال میں اس کے متعلق بہت تحقیق ہوئی ہے۔ جنگل کے بیان میں بعض امور بیان ہو چکے ہیں جن کی بنا پر وہاں انسانی ہستیوں کا وجود مانا گیا ہے۔ دوربین کے ذریعہ سے اسکی سطح پر خطوط دکھائی دیتے ہیں۔ اٹلی کے نامور فلکی شیاپریلی مرحوم نے انکی بابت یہ گمان ظاہر کیا تھا کہ وہ نہریں ہیں۔ لوئل اور پکرنگ۔ امریکن عالم کے مشاہدوں سے انکی تصدیق ہوگئی ہے۔ ان میں سے کئی متوازی خطوط میں کھودی گئی ہیں۔ مگر ان کا جد فیما بین ۵۰ اور چار سو میلوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ بعض نہریں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں جیسے جال کی رسیاں۔ ایک نہر ساڑھے چونتیس سو میل لمبی ہے۔ یعنی لاہور سے قاہرہ تک لمبی ہے پھر کہیں انہیں نہروں کے اتصال یا مقام انقطاع پر "نخلستان" سے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر

آبادی کی علامات | بعض خطے ایک موسم میں زرد۔ اور دوسرے میں خشک اور میدان دکھائی دیتے ہیں۔ جسے فصلوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اگر وہاں نباتات ہے تو جاندار کیوں نہیں۔ اگر جاندار ہیں تو انسان کے ہونے میں کیا بُرائی ہے یہ علامات انسانوں کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ مریخ میں پانی گھٹتا چلا جاتا ہے۔ قطبوں میں برف پڑتی ہے۔ جھیلیں اور سمندر بھی خشک ہوگئے ہیں۔ اہل مریخ بہت دانا اور عقلمند ہیں انہوں نے سیکڑوں میل لمبی نہریں کھود لی ہیں۔ جب برف پگھلتی ہے تو اس کے پانی کو نہروں میں کھینچ لیا جاتا ہے اور اس سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے۔ اور دیگر کام بھی اس سے چلتے ہیں مگر اہل مریخ کی شکل وصورت کیسی ہے اس کے بارہ میں اندازہ کرنا دشوار ہے۔ سر آلیور لاج ان کے منہ انگریزی حرف وی V کی طرح قرار دیتے ہیں۔ اور انہیں بڑے دیو قد اور شہزور سمجھتے ہیں کیونکہ انکی کشش ثقل کرۂ ارض کا ایک تہائی حصہ ہے ویلز نے اپنی کتاب[1] میں بھی اہل مریخ کی یہی شکل بتائی ہے بعض انہیں بن مانسوں کی اور بعض ریچھوں کی شکل کے بتلاتے ہیں انسان کو یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ میں ہی تمام عالم میں اکیلا اشرف المخلوقات ہوں۔ اسکی ہمسری اور رقابت کے لئے مریخ اپنی آبادی پیش کرتا ہے۔ اگر وہ اس دنیا پر حملہ آور ہوں تو یہاں کے لوگوں کا ستیاناس کردیں۔ مگر وہ ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکیں گے وہ آب وہوا کی عدم موافقت سے دم گھٹ کر مرجائیں گے۔

مسئلہ تخم ذی جان

مسئلہ پن سپرمیا بہت عجیب وغریب ہے اسکے رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ ایسے ننھے ننھے تخم اڑتے پھرتے ہیں۔ جہاں موقع ملتا ہے اور تمام حالات انکی نمو کے موافق ہوتے ہیں۔ وہ تھوڑے عرصہ کے بعد وجود پکڑ لیتے ہیں۔ اس مسئلہ کے حامی سیاروں میں

[1] "وار آف دی ورلڈس" (دنیاؤں کی جنگ آرائی۔) مریخ سے چند آدمی دھات کے کھوکھلے لمبے گولوں کے اندر بند ہوکر آئے اور انگلستان پر حملہ کیا ان چند آدمیوں کا مقابلہ نہ ہوسکا کیونکہ انکے پاس ایک ایسا آلہ تھا جس سے وہ چند منٹ میں میلوں تک آگ لگا دیتے تھے۔ آخرکار آب وہوا کی ناموافقت کے سبب مرگئے۔ ج۔ آر۔ آر

باتات وحیوانات کا امکان سمجھتے ہیں۔ بشرطیکہ وہاں کے طبعی
حالات نباتی وحیوانی زیست کی نشوونما کے موافق ہوں۔ یہ بہت پرانا
نظریہ ہے۔ حیات خود روکی توجیہ بھی اسی سے کی جاتی ہے۔ جس کا
مطلب یہ ہے کہ جاندار آپ سے آپ پیدا ہوئے ہیں۔ سوا ور
جس کی رو سے ڈاروِن کے مسئلہ انتخاب طبعی۔ تغیر انواع اور ارتقا
سے انکار کیا جاتا ہے۔ اسکی بنا ایک لاطینی علمی ضرب المثل پر
ہے کہ تمام جاندار جانداروں ہی سے پیدا ہوتے ہیں[۱]۔ فرانس
کے ایک عالم۔ سالس گیون منتلی وال نے ۱۹۲۱ء میں اپنی
ایک کتاب میں اس قسم کا خیال ظاہر کیا تھا۔ کہ چاند سے حیات بخش
تخم زمین پر آکر گرے تھے جس سے نباتی وحیوانی زندگی کا آغاز ہوا
تھا۔ جرمنی کے ڈاکٹر ایچ۔ ای۔ اکٹر نے موسیو منتلی مریان کی کتاب سے
جسمیں آباد سیاروں کا ذکر تھا۔ یہ خیال اخذ کیا اور اسے ڈاروِن
کے مسئلہ کے ساتھ شامل کر دیا۔ کہ کسی آباد دنیا سے جاندار تخم اڑ کر
اس دنیا میں آئے تھے جس سے پودوں اور جانوروں کی ابتدا ہوئی۔

شہاب ثاقبوں میں ذی جان تخم

ڈاکٹر موصوف کا یہ بھی خیال ہے کہ شہاب ثاقبوں
میں کاربن (کوئلہ) پایا گیا ہے (جو خلا میں گھومتے
رہتے ہیں) اور اس کے اندر جاندار تخم ہوتے ہیں۔ دوسرا عجیب
خیال انکا یہ ہے کہ ہماری کرۂ ہوا میں جو ننھے ننھے جانور اڑتے
پھرتے ہیں، وہ شہاب ثاقبوں کے ملے ساتھ اڑتے ہوئے عالم
بالا کے دیگر حصوں میں پہنچتے ہیں، اور وہاں جب آب و ہوا
اپنے موافق پاتے ہیں تو وجود پذیر ہو جاتے ہیں۔
ڈاکٹر موصوف کہتے ہیں کہ "خلائے غیر محدود میں ایسی دنیائیں ہیں جو کچھ عالم
شباب میں کچھ ادھیڑ حالتیں اور کچھ اپنی حیات کا زمانہ معینہ ختم کر چکی ہیں۔
ادھیڑ دنیاؤں میں جانداروں کے موافق حالات ہیں ہم عالم کے اندر جانداروں کا وجود
قدیم مانتے ہیں۔ وہ وہاں موجود ہے اور اس سے نئے جاندار
پیدا ہوتے رہتے ہیں[۲]۔ ان خیالات کی جرمنی کے نامی عالم نباتات
فرڈیننڈ کون نے ۱۸۷۲ء میں تائید کی۔ مگر سر ولیم ٹامسن (لارڈ
کیلون) مرحوم نے اپنے پریسیڈنشل ایڈریس میں ۱۸۷۱ء
میں برٹش اسوسی ایشن کے سامنے دیا گیا تھا رکٹر کے خیالات کی
حمایت و تائید کی تھی۔

نہایت ہی ننھے جراثیم کا وجود

ایسے ننھے ننھے جراثیم پائے گئے ہیں جو خوردبین
جنکے انکشاف میں قاصر ہے۔ جیسے زرد بخار مویشی کے منہ اور پاؤں
کی بیماری کے جرم ہوتے ہیں۔ بعض کا سائز (۰.۰۰۰۲) ملیومیٹر ہوتا ہے
یہ ہوا میں اڑتے رہتے ہیں۔ سورج کی شعاعوں کے زور سے
وہ خلا میں دور تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور جاندار پیدا کرنے کے موجب
ہوتے ہیں۔ اگر زمین سے ایسا ننھا جرم اٹھکر اوپر جائے تو وہ مشتری
کا دائرہ گردش ۲۱ روز میں۔ بہ نسبت کا اسی روز میں۔ نپ چون کا
چودہ ماہ میں طے کر کے جائیگا اور ہمارے نظام شمسی کا قریب ترین ہمسایہ
نظام شمسی الفہ سنتاوری کا ہے وہاں یہ جرم نو ہزار سال میں پہنچیگا یہ حساب شمسی
کی رفتار کی شرح کے مطابق لگایا جاتا ہے جرم کا وزن مخصوص پانی کے برابر تسلیم کیا گیا ہے۔

جرم کی زندگی کے قیام کی میعاد

اب دوسرا سوال اس کے ساتھ یہ پیدا ہوگا
کہ یہ جاندار تخم یا جرم کتنی مدت تک قائم رہ سکتا ہے۔ خلا میں کہیں
سخت حرارت ہے اور کہیں سخت سردی جس سے عمل حیات زائل
ہو جاتا ہے۔ مصر کی کسی ممی میں سے گیہوں کے چند دانے نکلے تھے
جو کئی ہزار برس تک پڑے رہنے کے بعد بھی اگنے کے قابل پائے
گئے۔ فرنچ عالم بادون کہتا ہے کہ رومی قبر میں اٹھارہ سو سال
کے بعد جرم پائے گئے تھے جو نشوونما کی قوت سے معرا نہ تھے
مارشل وارڈ اور روکس کے تجربات سے جراثیم کی مدت قیام

---

[۱] ماخوذ از "ورلڈس ان میکنگ" وارتقائے عالمین صفحہ ۲۱۷ مطبوعہ لندن ۱۹۰۸ء [۲] ماخوذ از "ورلڈس ان میکنگ" صفحہ ۲۱۸-۲۱۹

[۳] ماخوذ "ورلڈس ان میکنگ" صفحہ ۲۲۰-۲۲۲-۲۲۳-

ثابت ہوئی ہے یہی ان کے پیدا کردہ جراثیم بہت دیر تک زندہ رہنے کے قابل تھے۔ تمام شرائط ان کے ساتھ یہ پائی گئی کہ ہوا نہ لگے۔ خلا میں ہو کہاں۔

اس قسم کے خیالات ہیں عالموں کے جانداروں کی تولید وتقسیم کے بارہ میں۔ مگر زندگی کا مادہ کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ سائنس نے اس کا ہنوز کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا ہے۔ بعض ارتقا کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ پروٹوپلازم "زندگی کا تخم" اور "آرگینک سل" وغیرہ سے رفتہ رفتہ نباتات اور حیوانات وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہ ایک سربستہ راز ہے جسے انسان کبھی افشا نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کی شان یزدانی سے پیدا ہوتا ہے۔

عالم کی بربادی

(کون وفساد کا تسلسل)

عالم بالا کے ان مختصر مگر دلچسپ حالات کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی بربادی کے بارہ میں بھی کچھ بیان کیا جائے۔ عالم کس طرح وجود میں آیا۔ اسکا مجمل ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔ مگر یہاں اسکی تباہی کا ذکر ہوگا۔ چونکہ ہم نظام شمسی سے بہت واقف ہیں اس واسطے اسی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس کا مرجع آفتاب ہے۔ حرارت وروشنی دو چیزیں جانداروں کے لئے لازم ہیں۔ اس وجہ سے سورج منبع حیات ہے۔ جب سورج کی گرمی اور روشنی ختم ہو جائیگی تو اس کے متعلقین بھی ختم ہو جائیں گے گو ان کا طبعی مادی وجود قائم رہ سکتا ہے

آفتاب کی تباہی اخراج حرارت سے | سورج کی حرارت دن بدن گھٹتی جاتی ہے۔ مگر کروروں سالوں کے بعد زمین کی موجودہ صورت اختیار کرے گا۔ اس وقت جتنی حرارت وروشنی کرۂ ارض پر آتی ہے اس سے ۲۲۰۰۰ ملین یعنی بائیس ارب ساٹھ کرور گنا زیادہ حرارت خارج ہوتی ہے۔ اگر سورج کی موٹائی اس کے نصف قطر کا ¼ حصہ ہو تو ساڑھے چوہتر ہزار ملین یعنی ساڑھے چوہتر ارب سالوں کے بعد اس سے زیادہ حرارت خارج نہ ہوگی جتنی اب سالانہ ہوتی ہے یعنی شرح اخراج اتنی مدت کثیر کے بعد بھی وہی رہے گی۔ مگر اس عرصہ میں اس کا ایک حصہ سرد ہو جائے گا اس واسطے ساٹھ ارب سال زمانہ قرار دینا چاہئے۔ لیکن پانی کو جمانے والی خشکی ڈیڑھ لاکھ ملین Billion سالوں کے بعد پیدا ہوگی اور یہ میعاد بے قیاس ہے اسے عداد میں ظاہر کرنا دشوار ہے مگر کسی شخص کو یہ کیفیت دیکھنا نصیب نہ ہوگی جب سطح آفتاب سرد ہو کر اس پر ایک قسم کا چھلکا چڑھ آئے گا تو وہ گیسوں کے نکلنے سے پھٹ جائے گا اور اندر سے کھولتا ہوا لاوا نکلے گا۔ وہ بھی کچھ عرصہ بعد جم جائے گا اور شگاف مٹ جائیں گے۔ اندرونی گیسیں گاہے بگاہے آتش فشانوں کے راستے نکلا کریں گی۔ خشکی کی ترقی کے ساتھ ساتھ بخارات اور کاربانک ایسڈ گیس نکلے گی پھر پانی منجمد ہو جائے گا اور سطح آفتاب پر سمندر بن جائیں گے۔ جیسے ہمارے ہاں ہیں۔ پھر سمندر بھی جم جائیں گے۔ سورج کو شہاب ثاقبوں کے گرنے سے اور خلا کی طرف سے کچھ گرمی ملے گی۔ مگر ٹمپریچر دن بدن گرتا جائیگا۔ کاربانک ایسڈ گیس جمنے لگے گی۔ اور کرۂ ہوائے شمسی میں برف کی طرح نمودار ہوگی۔ پھر ۲۰۰ ڈگری سنٹی گریڈ پر کرۂ ہوا کی گیسیں منجمد ہونگی نائٹروجن کا نیا سمندر پیدا ہو جائے گا۔ صرف ہیلیم اور ہیڈروجن باقی رہ جائیں گے۔ اخیر میں سورج چاند کی طرح ایک عظیم کالا کرہ نظر آئے گا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس حالت کو پہنچنے سے پہلے ہی یہ کسی اور ستارہ سے ٹکرا جائے۔ اور اس کا خاتمہ ہو جائے[1]

[1] ماخوذ از "ورلڈس ان میکنگ" صفحہ ۱۴۸-۱۴۹-۱۵۱-

ا یہ گمان ہے کہ آفتاب مع متعلقین نکشتر ویگا (Vega) کی طرف ۱۲ میل فی سکنڈ کے حساب سے بڑھ رہا ہے۔ راستہ میں کسی نامعلوم تارہ یا نظام شمسی سے تصادم ہونا ناممکنات سے نہیں ہے۔

بنتا اور بگڑنا بگڑنا اور بننا سلسلہ لا متناہی ہے

سورجوں اور سیاروں کے تصادم باہمی سے وہ مادہ پیدا ہوتا ہے جس سے عالم بنتے ہیں اور اسے کاسمک ڈسٹ (خاک سماوی) یا نیوبلہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ایک طرف سیارے بنتے ہیں اور دوسری طرف بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ قانونِ حرکت اور قانونِ قوت اپنے ابدی کام میں مصروف ہیں۔ ایک بناتا ہے اور دوسرا بگاڑتا ہے۔ مادہ سے بقائے حیات اور انتقال صورت بدلنا منسوب کیا جاتا ہے۔ جرمنی کیا بلکہ تمام مہذب دنیا کے نہایت مشہور سائنسدان پروفیسر ارنسٹ ہیکل آف جینا یونیورسٹی جرمنی (مگر اب علیحدہ ہو گئے ہیں) نے جرمان ازم یعنی وحدت الوجود (مگر وہ صرف مادۂ عالم کو مانتے ہیں) کے نہایت پرجوش پجاری ہیں۔ کون و فساد کے سلسلہ کے بارہ میں حسب ذیل اصول منضبط کئے ہیں[1]

(۱) خلا کی وسعت غیر محدود اور غیر معین ہے اسکا ایک انچ بھی خالی نہیں ہے۔ ہر جگہ ہیولی ہے۔

(۲) اسیطرح دنیا کا قیام بھی بے حد و حساب ہے۔ اسکی نہ کبھی ابتدا ہوئی اور نہ کبھی انتہا ہوگی۔ یہ قدیم ہے۔

(۳) ہیولی ہر جگہ ہے۔ اسکی نقل و حرکت مسلسل جاری ہے اور اس میں کوئی رخنہ واقع نہیں ہوتا ہے۔ اسے کامل سکون لاحق نہیں ہوتا ہے۔ مادہ اور انقلاب انگیز قوت کے عمل کا تسلسل جاری ہے۔

(۴) ہیولائے خلا کی یہ عالمگیر نقل و حرکت ایک گرداب قدیم کی صورت میں جاری ہے۔ اور کبھی کبھی عمل ارتقا میں نمایاں ہو جاتی ہے۔

(۵) اس ارتقا کا پہلا عمل یہ ہوتا ہے کہ ایتھر محسوس اور ٹھوس صورت پکڑتی ہے۔

(۶) مادہ بتدریج حجم و ضخامت میں بڑھتا رہتا ہے۔ اس کے ڈھیر بنتے چلے جاتے ہیں۔ حرکت اور کشش دو زبردست اسباب ہیں جو انھیں نئے نئے کرے بنانے میں مصروف رکھتے ہیں۔

(۷) خلا کے ایک حصہ میں ایتھر میں ارتقا پیدا ہو کر نئے نئے کرے وجود میں آتے ہیں۔ دوسری طرف عمل فساد جاری ہے۔ کرے ایک دوسرے سے ٹکرا کر برباد ہوتے جاتے ہیں۔ اور نیا نیوبلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

(۸) انکے تصادم باہمی سے جو حرارت پیدا ہوتی ہے وہ قوت بن جاتی ہے۔ جو اس بربادی کے ڈھیر یعنی نیوبلہ کے اندر گرداب پیدا کر کے نئے نئے کرے بناتی ہے اور یہ دائمی کھیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ کرۂ ارض کروڑہا سال ہوئے اسی طرح بنی تھی چند کروڑ سالوں کے بعد جب اسکا محور بگڑ جائے گا تو سورج میں گر کر بھسم ہو جائے گی۔ عالم کے اندر عمل ارتقا اسیطرح جاری چلا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا اور انتہا ہولی ہے۔

یہ تازہ ترین خیال ہے علما کے ایک گروہ کا۔ اسپر اضافہ کرنا مشکل ہے۔ نہ اسکی تردید کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اہل نظر اپنے واسطے خود نتیجہ اخذ کر لیں گے۔

تمام شد

جے۔ آر۔ رائے

---

[1] منقول از ’’ریڈل آف دی یونیورس‘‘ صفحہ ۸۶ دوسرا کالم۔

مالک الدولہ صولت

(۲)

مالک الدولہ کی تین غزلوں کے کچھ شعر میں لکھ چکا ہوں جن میں سے ایک کو اہل عروض بحر ہزج میں شمار کرتے ہیں اور دوسری کو متقارب مثمن زدہ رکنی کہتے ہیں۔ اور تیسری مضارع میں ہے کچھ شعر اور ان کے دیوان میں سے انتخاب کرکے لکھتا ہوں۔ گو بمقتضائے محبت مجھے انکا سارا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بہ نظر اختصار بہت سی غزلوں کو چھوڑ دیا۔ دیوان کی یہ حیثیت ہے کہ حاشیہ پر بھی اکثر غزلیں ہیں۔ اور بوسیدہ ہونے کے سبب سے ہر مصرع کا ایک آدھ لفظ شروع کا یا آخر کا تلف ہو گیا ہے کہ پڑھا نہیں جاتا۔ وہ غزلیں سب بیکار ہو گئیں۔ میرے اس انتخاب پر نکتہ چینی کی نظر نہ کرنا چاہیے۔ کہ صولت مرحوم میرے احباب اخلاص مندیں سے ہیں۔ ان کی ہر ادا مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر بھی میں نے آداب تذکرہ نگاری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ تحسین کے ساتھ تنقید سے بھی کام لیا ہے۔ اس کے ضمن میں اکثر نکات فن کی بحثیں اور شعرائے معاصرین کے مشاعرہ و مطارحہ کا حال جو کچھ مجھے یاد آجائے گا لکھوں گا۔ ان مرحوم کا طرز سخن کوئی جدت کا پہلو لئے ہوئے نہیں ہے۔ لیکن سارا کلام مطبوع و مانوس ہے۔ لکھنؤ کا خاص رنگ اور لکھنؤ کی خاص زبان ہے۔ یہاں کے لوگ ہمیشہ صائب و حافظ کا تتبع کرتے رہے اور فارسی کے خلط کو بارشاد شیخ ناسخ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اسی زمانہ میں دہلی میں مرزا بیدل و مرزا جلال اسیر کا رنگ پھیلا اور اردو میں فارسی ترکیبوں کے خلط نے ایسا مزہ دیا کہ طرز سخن کچھ سے کچھ ہو گیا۔ گو بیدل کی ترکیبیں اہل زبان کی نظر میں اعتبار سے ساقط ہیں۔ لیکن مرزا داغ مرحوم کے سوا اکثر شعرائے دہلی نے اس سے احتیاط نہیں کی۔ مرزا غالب مرحوم کی نازک خیالی شعر و سخن کی جان ہے۔ اردوئے معلٰی کی تحریریں ان کے افصح الفصحا ہونے کی سندیں ہیں لیکن طرز بیدل میں ریختہ لکھنے کا انجام یہ ہوا کہ ایک ضخیم دیوان میں سے چند جزو انتخاب کئے گئے اور اس میں بھی زبان کے لحاظ سے اکثر شعر آدھا تیتر آدھا بٹیر ہیں۔ نہ انھیں فارسی کہہ سکتے ہیں نہ اردو۔ عنایت فرما شمس العلما مولوی حالی صاحب کے اس قول کی میں بھی تائید کرتا ہوں کہ "بیدل کا شعر سمجھ میں نہ آنے پر بھی اچھا معلوم ہوتا ہے" اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ لفظ و ترکیب میں فقط ایک سحر ہے معنی کو اوسکی دلاویزی میں چنداں دخل نہیں اور یہ ایک ایسا عقدہ دشوار ہے جس کے حل کرنے کی طرف شعرا کو ضرور توجہ کرنا چاہیے۔ اور شعر کے راز سربستہ کو کھولنا چاہیے۔ چند اشعار صولت کے جو میں لکھنا چاہتا ہوں یہ ہیں ؎

واقف تری خلوت سے بشر ہو نہیں سکتا — میں کیا ہوں فرشتہ کا گزر ہو نہیں سکتا
موسٰی کو تصوّر ہی فقط دل میں ہے کافی — وہ پردہ نشیں پیش نظر ہو نہیں سکتا
اے دست جنوں شاق ہے طول شب ہجراں — کیا چاک گریبان سحر ہو نہیں سکتا
فرماتے ہیں آسان نہیں جی سے گذرنا — مر جانے کو سب کہتے ہیں پر ہو نہیں سکتا
میں کہتا ہوں نالے مرے لے آئیں گے تمکو — وہ کہتے ہیں ایسا تو اثر ہو نہیں سکتا
اٹھیں گی نہ غیروں سے مری طرح جفائیں — یہ حوصلہ یہ دل یہ جگر ہو نہیں سکتا
صولت رہ الفت میں رکھا قدم اب تک — کرنے کو بہت حوصلہ پر ہو نہیں سکتا

گریبان سحر کا ہاتھ سے چاک ہونا یا چاک ہونے کی تمنا کرنا

کچھ معنی نہیں رکھتا۔ مگر لفظ جنوں نے معنی پیدا کر دئے کہ جو مبتلائے جنون ہوتا ہے اُس کو ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔

تیر کا استعمال تمگر کے معنی پر اب چھوٹ گیا۔ آخر میں مرزا داغ مرحوم نے بھی اسے ترک کیا اور کہا کہ واقع میں اچھّا نہیں معلوم ہوتا۔

جگر والے شعر کے اگر یہ معنی لئے جائیں کہ ایک معشوق بازاری سے خطاب ہے جس کے بہت سے عاشق ہیں تو نہایت رکیک و قبیح ہے۔ اگر یہ سمجھئے کہ ایک عزیز کسی دوسرے عزیز سے شکایت کر رہا ہے جسے بیگانوں پر زیادہ بھروسا ہے یا ایک رفیق قدیم کسی امیر کی نا قدر شناسی کا شکوہ کر رہا ہے جسے نئے ملازموں کی طرف زیادہ تر توجہ ہے تو یہی شعر نہایت حسین ہے،

ان آنکھوں سے بچشم غور ہم نے اس جہاں دیکھا — ترا جلوہ نظر آیا جدھر گذرے جہاں دیکھا
نہ پایا طور سینا دل کو جھنجھنے تیرے جلوہ سے — جوان آنکھوں نے دیکھا چشم موسیٰ نے کہاں دیکھا
دم جاں کندنی حسرت ہی لیں شہید وں کی — نہ پھر کر اس نظر قاتل نے سوئے کشتگاں دیکھا
بُرا ہو خواب راحت کا کھلی جب آنکھ غفلت سے — نہ پھر ہم نے نشان نقش پائے کارواں دیکھا
مرا نشانہ ہلاکر لوگ تربت میں، یہ کہتے ہیں — تہ اے سونے والے آخری اپنا مکاں دیکھا

آنکھوں سے بچشم غور دیکھنا جھگڑے سے خالی نہیں ہے مگر بنگاہ غور دیکھنا مقصود ہے اور اس قسم کی مجازات شعرا کے کلام میں ہوتے ہیں۔ مجازاً نگاہ کے معنی میں چشم کو لے سکتے ہیں۔

نقش پا نشان یا و نشان نقش پا سب طرح سے درست ہے۔

شعر کی کرامات کو دیکھئے کہ جو شخص مر گیا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ میرا شانہ ہلا کر الخ۔ لیکن بے ہوشی مرگ میں یہ امتیاز نہیں باقی رہا کہ ایک شخص شانہ ہلا رہا ہے یا بہت سے لوگ ہیں

مکان فارسی میں گھر کے معنی پر نہیں آیا۔ ان معنی پر مکان لفظ ہندی ہے اور ہندی ہونے کی وجہ سے اس میں اعلان نون کا ترک کرنا کچھ اچھّا نہیں معلوم ہوتا۔ جیسے پرستان میں نون غنہ کا استعمال غلط سمجھا جاتا ہے۔ ویسا ہی اُس میں بھی بُرا معلوم ہوتا ہے لیکن ان باتوں کو کوئی سمجھتا نہیں۔ اور شاعر کے لئے بہت کچھ توسع بھی ہے ؎

مجھکو سودے نے دکھایا ہے بیاباں کیسا — کوئی وحشی نظر آتا نہیں انساں کیسا
ہوئی عمر بسر اپنی غم ہجراں میں — چین کیسے ہیں کئے عیش کا ساماں کیسا
چاہ بابل کا فسانہ تو ہے مشہور جہاں — دل فرشتوں کا پھنسا عشق میں انساں کیسا
عشق بازی سے تجھے منع کیا تھا صولت — پہلے مطلق نہ سنا اب ہے پشیماں کیسا

ان اشعار میں "کیسا" کا محل استعمال دیکھئے "کوئی وحشی نظر آتا نہیں انساں کیسا" یعنی انسان تو بڑی چیز ہے۔ اور "دل فرشتوں کا پھنسا عشق میں انساں کیسا" یعنی انسان تو ادنیٰ چیز ہے۔

حافظ کہتا ہے من آں نیم کہ ازیں عشقبازی آیم باز۔ غزل گو کا کلام مبہم اور کثیر المعنی ہوتا ہے خصوصیات اور تخصیصات سے اُسے بحث نہیں۔ شعر بقول کلی اگر ہے تو غزل ہی ہے اور اسی سبب سے غزل کا مطلب سمجھنے کے لئے نظر دقیق چاہئے۔ جو لوگ فہم متوسط رکھتے ہیں وہ غزل کے ظاہری معنی سمجھ لیتے ہیں۔ باطنی اشارے اسکے گو سمجھ میں نہ آئیں مگر اپنا کام کر جاتے ہیں۔ اور یہ کلیہ ہے کہ غزل کا جو شعر اچھا معلوم ہوتا ہے اُس کے معنی بہت دور ہوتے ہیں یہاں عشق بازی کا لفظ اختیار کر لیا ہے اور مراد اُس سے ہر قسم کے جذبات ہیں جنکے اتباع سے پشیمانی حاصل ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ عشق بازی جیسی ذلیل چیز ہے تمام جذبات ایسے ہی رکیک و ذلیل ہیں۔

جب کہ میں بزم سیہ مستاں سے ساغر لیچلا — شور تھا ظلمات* سے پانی سکندر لے چلا
آنکھ دکھلانے ہیں وہ مست خرام نازکو — رہ گیا تھا ہوش کچھ باقی وہ ساغر لے چلا
سبحہ میں زنار کو زاہد نے پوشیدہ کیا — آستیں میں رکھ کے بت کعبہ کے اندر لے چلا
کاندھا دینے والے جبکو راہ میں تھک تھک گئے — بار عصیاں کا خدا جانے وہ کیونکر لے چلا

---

* ظلمات کو بسکون لام باندھنا فارسی گویوں کی تقلید سے جائز ہو گیا ہے۔

میں یہ سمجھا تھا کہ میخانہ ... دامے قسمت آسمان دیر ہی اور لے چلا

یہ غزل جس مشاعرہ کی ہے مرزا داغ بھی اس میں شریک تھے اور بڑا مجمع تھا حافظ اعلیٰ نجف رامپوری بانی مشاعرہ تھے - اور شیخ عبد الرزاق شاد دہلوی شاگرد حکیم محمد سجاد دہلوی کے مکان پر بزم مشاعرہ منعقد ہوئی تھی - دونوں صاحبوں نے اہتمام میں بہت سرگرمی کی تھی شہر میں جا بجا اشتہار لگا دیے تھے شعرا کے مکان پر جا جا کے وعدے لے لئے تھے - اس سبب سے کہنے والوں کے علاوہ تماشائیوں کا زیادہ تر ہجوم تھا - آخر شب میں کہیں مٹیا برج کے شعرا کی نوبت آئی - مالک الدولہ نے غزل پڑھی - پھر شیخ امداد علی یاور جو برق کے شاگردوں میں خوش فکر شاعر تھے انھوں نے غیر طرح پہلا شعر پڑھنا شروع کئے تھے - کہ مرزا داغ نے کہا "حضرت طرح میں کچھ کہا ہو تو پڑھئے" انھوں نے کہا طرح میں تو میں نے کچھ نہیں کہا اور یہ کہکر غزل جیب میں رکھ لی - ان کے بعد میرے پڑھنے کی باری تھی - اور میرے بعد مرزا داغ پڑھنے والے تھے - میں نے عذر کیا کہ نماز کا وقت قریب ہے غزل کیا پڑھوں لوگوں نے کہا کہ ابھی عرصہ ہے آپ پڑھئے تو سہی - خیر میں نے غزل پڑھ دی یہ سوء اتفاق دیکھئے کہ اس کے بعد مشاعرہ میں کوئی نہ ٹھہرا اصل حقیقت یہ تھی کہ تمام رات کی خستگی اور بے خوابی پھر نماز جماعت کے فوت ہو جانے کا اندیشہ - اکثر تماشائیوں میں دہلی کے اہل حرفہ و کارخانہ دار تھے جو کوٹھو ٹولہ میں بسے ہوئے تھے یہ وجہ تھی برہمی مشاعرہ کی مگر مرزا داغ مرحوم کو بدگمانی اہل مٹیا برج کی طرف سے پیدا ہوئی کہ انھوں نے صحبت کو درہم و برہم کر دیا - اور میرے اشتیاق میں جو لوگ جمع ہوئے تھے وہ مجھے نہ سن سکے - اس مشاعرہ کے دس برس بعد کا ذکر ہے کہ حیدرآباد میں مرزا داغ کے شاگردوں میں سے ایک صاحب نے مشاعرہ کیا جن کا نام مجھے یاد نہیں - مگر طرح تھی صیاد کا اور جلاد کا - اور ایک بجے دن سے مشاعرہ شروع ہو گیا تھا - میں نے دیکھا کہ مرزا داغ تو بیچ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور غزل خوانی کبھی دہنی طرف ہونے لگتی ہے اور کبھی بائیں جانب اس صف میں ایک نے غزل ختم کی اور اس صف میں دوسرے نے پڑھنا شروع کر دیا - اس بے ترتیبی میں شام ہو گئی کہ مرزا داغ نے کہا آخر میرے پڑھنے کی بھی باری آئے گی یا نہیں - یہ سن کر جن جن لوگوں نے اپنی اپنی غزلیں نکالی تھیں جیبوں میں رکھ لیں مرزا داغ صاحب نے غزل پڑھی اور مقطع پڑھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے کہ اب نماز کا وقت ہے بس ہو چکا مشاعرہ - حیدرآباد کے ایک اور مشاعرہ کا برہم ہو جانا مجھے یاد آیا - مرحوم میر باقر حسن ضیا لکھنوی بانی مشاعرہ تھے - طرح کچھ نہ تھی سر آسمان جاہ بہادر مرحوم کی وزارت کا زمانہ تھا شمس العلما مولوی حالی صاحب کے سننے کے لئے یہ صحبت منعقد ہوئی تھی مگر یہاں کے سب چیدہ شاعروں کو میر باقر حسن نے بہت اہتمام سے بلایا تھا - سامعین میں ایسے ایسے لوگ تھے جو بہت کم شعر و سخن کی صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں - نواب عماد الملک بہادر نواب وقار الملک - مولوی مشتاق حسین صاحب - مولوی عزیز مرزا صاحب میر باقر حسن نے حیدرآباد کے لنگر کا حال نظم کیا تھا وہ پڑھا - مولوی حالی صاحب نے ہندوستان کی پھوٹ پر اور کالے گورے کے مقابلہ پر دو ایک نظمیں پڑھیں - ان کے بعد مرزا داغ مرحوم نے دو غزلیں پڑھیں پھر میری باری آئی دو غزلیں میں نے بھی پڑھیں اس کے بعد مشاعرہ برہم ہو گیا مولوی مشتاق حسین صاحب کے اٹھتے ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے اکثر لوگوں نے صاحب مشاعرہ سے شکوہ کیا - انھوں نے کہا میں تو سننے کو موجود ہوں مگر سامعین پر میرا کیا بس ہے سب لوگ کیلئے خاطر



نمونهٔ خوش خطی

اٹھے جن میں گرامی و عرشی دربار شاہی کے فارسی گو خوش فکر شاعروں میں تھے۔

گرم اسطرح شب ہجر میں پہلو ہوتا   داغ ہوتا مرے دلپر نہ اگر تو ہوتا
آہ کرنے پہ تو محفل سے نکالا اُسنے   قہر ہوتا جو مری آنکھ میں آنسو ہوتا
جھونی مہندی مرے یوسف کی جو ہاتھ آجاتی   کیا زلیخا کے لئے وسمہ ابرو ہوتا
ہوتا زاہد نہ کبھی ضد سے مرا ہم مشرب   میں مسلمان جو ہوتا تو وہ ہندو ہوتا

یہ مصرع کس قدر شوخ ہے "میں مسلمان جو ہوتا تو وہ ہندو ہوتا" گویا اب یہ ہندو ہیں اور اس ضد سے وہ مسلمان ہے۔ اگر یہ مسلمان ہوجاتے تو وہ ہندو ہوجاتا۔ ہندو ہوجانا بھی لطف سے خالی نہیں۔ نیا مضمون ہے جسے شاعر نے تراشا اور آریہ سماج نے پھیلایا۔

قدیم شاعری پہ ایک یہ اعتراض ہے کہ زاہد و واعظ و شیخ سے مقدس فرقہ پر یہ لوگ زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ اصل امر یہ ہے کہ رندی بنما و پارسائی می کن۔ ان لوگوں کو جو ریاکار و طالب دنیا نہ سمجھے وہ شاعر نہیں۔ دلا لا کنز حکما الکل مرزا صائب جن کا شمار مقدس شعرا میں ہے کہتے ہیں ؎

زکر سحر شماراں خدا نگہدارد   کہ صد سرست بیک حلقۂ کمند ایں جا
کمس را بے تردد عنکبوت آرد بدام خود   ید طولی است در تحصیل روزی گوشہ گیراں

حافظ کہتے ہیں اور یہ تو شاعر رند مشرب ہیں ؎

در میخانہ بستند خدایا مپسند   که در خانهٔ تزویر و ریا بگشایند
گرچہ بر واعظ شہر ایں سخن آساں نشود   تا ریا ورزد و سالوس مسلماں نشود
مبوس جز لب معشوق و جام می حافظ   کہ دست زہد فروشاں خطاست بوسیدن
رنگ تزویر پیش ما نبود   شیر سرخیم و افعی سیہ ایم

جرأت کا مجھے ایک شعر یاد ہے ؎

شیخ جی کیوں نہ بنے ہو تم فانوس   بھلا دامن کا یہ بھی گھیر ہے کچھ

ہر زبان کی شاعری میں تقلید قدما شرط ہے۔

نہ کیوں ہم خفتہ بختوں کی دعا میں ہو اثر اُلٹا   شاہی خواب کا ہوتا ہی مضمون بیشتر اُلٹا
ازل سے مرتبہ پایا ہے اعلی راستباز وں نے   نہیں ممکن شرف مجلس میں نیچے ہاتھ پر اُلٹا
ہملا ظاہر و باطن ہیں یکساں جسطرح دیکھو   نہیں آئینہ کی صورت ادھر سیدھا ادھر اُلٹا

اس مصرع پر "شاہی خواب کا ہوتا ہی مضمون بیشتر اُلٹا" مرحوم نے جو مصرع لگایا ہے وہ نکتہ شناسان فن سے داد طلب ہے۔ یہ مصرع ان کے مبلغ شعر کی معیار ہے۔ اور ان کے کامل عیار ہونے کی دلیل ہے۔ اچھا شعر تو اتفاق سے کبھی نکل آتا ہے جس کے لئے کوئی قاعدہ ہی نہیں بن سکتا۔ لیکن مصرع لگانے میں جسے اتنی مہارت ہو ضرور وہ کچھ پیدا کرہی لیتا ہے۔ تذکرہ خزانہ عامرہ میں ذکر ہے کہ نورالعین واقف نے ایک مصرع کہا ع

اے چراغت بکف از رنگ حنا زدو بیا۔ کئی مہینے تک اسیر مصرع نہ لگا یعنی جلد چراغ لے کر دوڑ اس مضمون کا ربط دوسرے مضمون سے اسکی سمجھ میں نہ آیا مدت کے بعد یہ بات خیال میں آئی کہ شبستان غم میں دل گم ہوگیا ہے اس کے ڈھونڈھنے کے لئے چراغ کی ضرورت ہے۔ دیکھئے غزل کہنے میں کیا کد و کوشش یہ لوگ کرتے تھے۔

ہجر میں آنسو بہاتا ہی رہا تو   زخم دل پانی چراتا ہی رہا تو
دے گیا پیک اجل پیغام موت   نامہ بر خط لے کے آتا ہی رہا تو
جان دے دی ہم نے اُسکے بے کہے   وہ ستمگر آزماتا ہی رہا تو

بہانے اور چرانے میں ایطا نہیں ہے۔ اس سبب سے کہ چرانے کا الف جزو کلمہ ہوگیا ہے اور بہانے کا الف زاید ہے۔ اگر دونوں جگہ الف زاید تعدیہ کا ہوتا تو ایطا تھا جیسے ستانا بجانا، ہٹانا مٹانا بجانا اُٹھانا ہنسانا۔ گرانا۔ بجھانا۔ اڑانا۔ بچھانا۔ گھلانا۔ بسانا۔ چکھانا۔ گھٹانا بڑھانا پڑھانا۔ ترانا۔ پھرانا۔ کھپانا۔ تپانا۔ چرانا۔ پھنسانا۔ گلانا

مٹ تا ۔ بکنا ۔ جما تا ۔ جھکتا ۔ ٹپکنا ۔ سڑنا ۔ چبانا ۔ چبا ۔ چڑھانا ۔ اترانا ۔ بننا ۔ اگانا ۔ ملانا ۔ بڑا ۔ چباتا ۔ جلانا ۔ ہوبانا وغیرہ کہ ان سب لفظوں میں الف ثابت ہے اور جزوِ کلمہ نہیں ہوا ہے ۔ یعنی الف نکال دو تو کلمہ بامعنی باقی رہتا ہے ۔ پڑھانا ۔ چرانا ۔ بچھانا ۔ رلانا ۔ کھلانا ۔ ہلانا ۔ منہانا ۔ دکھانا ۔ سکھانا ۔ سکھانا ۔ ر جھانا ۔ بجھانا ۔ چڑھانا ۔ سلانا ۔ جگانا ۔ ہنسانا ۔ ڈھانا وغیرہ کہ ان لفظوں میں بھی وہی الف ہے مگر جزوِ کلمہ ہو گیا ہے ۔ میں نے یہاں بہت سے الفاظ جتنے اس وقت یاد آئے اس لئے لکھ دئے کہ ان قافیوں میں کوئی ایطا سے بچنا چاہے تو اُسے آسانی ہو ۔ ورنہ اصل امر یہ ہے کہ ان قافیوں میں بہت کم لوگ ایطا سے پرہیز کرتے ہیں گویا کہ جائز سمجھ لیا ہے ۔ مندرجہ بالا تینوں شعروں میں ردیف کیا مزہ دے رہی ہے غزل کے سوا اور کسی صنفِ شعر میں یہ مزہ نہیں آتا ۔

بزم پُر نور رکھے آٹھ پہر جامِ شراب ۔۔۔ دن کو خورشید ہے شب کو قمر جامِ شراب
ساقیا سیر ہوں میں اب تو نہ بھر جامِ شراب ۔۔۔ کیوں چھلکتا ہوا آتا ہے ادھر جامِ شراب
مسجدم گردشِ پیمانہ غنیمت سمجھو ۔۔۔ آخری دور ہی کرتا ہے سفر جامِ شراب
موجِ مَے جھومتے ہوئے یاد دلاتی ہے مجھے ۔۔۔ پھول کھلتا ہی نظر آتا ہے جامِ شراب
غیر کو دیتے ہیں ساغر وہ مری ضد سے فقط ۔۔۔ آج ہے تشنہ لب خونِ جگر جامِ شراب

قدیم شاعری کا ایک مضمون معرکہ آرائے شعرا جامِ شراب ہے ۔ ابتدا اس کی عربی سے ہوئی ۔ فارسی گویوں میں پھر اسکا دور شروع ہوا ۔ سکندرنامہ کی کوئی داستان ذکرِ شراب سے اور حافظ کی کوئی غزل خالی نہیں ۔ اُردو گویوں میں یہاں تک ذکرِ شراب نے ترقی کی کہ اب مرثیوں میں بیس بیس بند فقط ساقی نامہ کے ہوتے ہیں ۔ کسی نے شراب سے شرابِ معرفت مراد لی ہے ۔ اور کسی نے شرابِ محبت ۔ مگر اصل امر یہ ہے کہ رندانہ مضامین شعر کا وہ میدان ہے جو چھوٹ نہیں سکتا ۔

جو نہادہ بدوش و قدح گرفتہ بدستم ۔۔۔ فدائے چشم تو ساقی بہوش باش کہ مستم

آتش کہتے ہیں ؎

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو ۔۔۔ آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

غرض یہ مضمون بھی موردِ اعتراض ہے ۔ کہ جو لوگ شراب کو ام الخبائث اور نجس العین سمجھتے ہوں وہ کیا سمجھ کے اُسی شراب کی مدح سرائی کرتے ہیں ۔ اور عرفاں و تولا کا استعارہ شراب سے کرتے ہیں ۔ وہ نور ۔ یہ نار ۔ وہ خیر ۔ یہ شر ۔ وہ مقدّس ۔ یہ نجس ۔ یہ اعتراض آجکل کا نہیں ہے بلکہ قدیم سے چلا آتا ہے ۔ لیکن یہ اعتراض اسی بنا پر ہے کہ حقیقتِ شعر کو سمجھتے نہیں ۔ ہر زبان میں شعر کے جو میدان بندھے ہوئے ہیں شاعر انھیں چھوڑ نہیں سکتا ۔ یورپ کے لوگ دو ہزار برس سے تقریباً بت پرستی کو ترک کر چکے ہیں ۔ مگر آج تک جو شاعر ہوتا ہے وہ ضرور پہلے بتوں کو پکارتا ہے کہ اُن کے یہاں معرکۂ شعر کا میدان یہی ہے زہیر بن ابی سلمیٰ نے ہرم بن سنان و حارث بن عوف کی مدح میں جو قصیدہ کہا ہے اُسکی تشبیب میں ام اوفیٰ کے کھنڈر اور اسکی محمل و ناقہ و سفر کا رونا دس پندرہ شعر تک چلا گیا ہے ۔ اہلِ مدرسہ سے کوئی پوچھے کہ مدح کو اس تشبیب سے کیا علاقہ ہے ۔ کیا یہ شخص دیوانہ تو نہیں ہو گیا ہے ابھی ایک کھنڈر سے باتیں کر رہا تھا ابھی ساداتِ عرب کی مدح اور عبس و ذبیان کی صلح کا تذکرہ کرنے لگا ۔

نہیں معلوم کہ وہ کون گھڑی تھی یارب ۔۔۔ نکلے جس روز سے دیکھی نہ وطن کی صورت
رونا آیا مجھے غنچوں کی ہنسی پر صولت ۔۔۔ پھر گئی سامنے اُس غنچہ دہن کی صورت

وطن کا رونا حسبِ حال اور واقعہ کے مطابق ہے ۔ یہ لوگ لکھنؤ سے نکلکر پھر کبھی نہ گئے ۔ اسی امید میں رہے کہ بادشاہ کے ساتھ ہی لکھنؤ جائیں گے ۔ لیکن بہت ایسے ہیں کہ کبھی وطن سے نہیں نکلے ۔ اور شعر میں اپنی آوارہ وطنی کا ذکر اور وادیِ غربت کی

معیبتیں باندھا کرتے ہیں۔ جو لوگ شعر کو سمجھتے ہی نہیں وہ ان باتوں پر ہنستے ہوں گے۔ لیکن جو لوگ وطن کے معنی اور وادیٔ غربت کے استعارہ سے ناواقف نہیں ہیں اور اُن مُصیبتوں سے آگاہ ہیں جن کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے ان کو اسی شعر پر وجد ہوتا ہے اسیطرح غنچہ دہن کے لفظ کو بھی اگر آپ بنظر تعمیم دیکھیں تو شعر کے معنی کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ غنچہ دہن ہونا معشوق ہی کے لئے خاص نہیں ہے۔ کیا فرزند عزیز دوست میں نہیں یہ وصف ہوا کرتا۔

کیجئے خونِ تمنا آرزوے دل سمیت — توڑئے دستِ طلب بھی کاسۂ سائل سمیت
ہوگا فریادی خدا سے سر تنِ بسمل سمیت — حشر میں تلوار بھی کھنچ آئے گی قاتل سمیت
یاس و حسرت کہتی ہے قبر بیاباں مرگ پر — یہ مسافر کارواں گم کردہ ہے منزل سمیت
کون اب دلسوز باقی ہے بجز داغِ جگر — شمع بھی ٹھنڈی ہوئی پروانۂ محفل سمیت

دونوں مطلعوں کی برجستگی اور دونوں شعروں کا درد قدر شناسان سخن کے دل سے پوچھئے۔ مجھے یہ چاروں شعر ان کی بندش و ترکیب ان کی برجستگی و جدّت ان کا طرز بیان ان کا رنگ دل سے پسند ہے۔ بس غزل میں یہ شان ہونا چاہئے۔ اگر ایسے ہی مضامین دل آویز ہر زمین میں نکل آیا کریں تو کیا پوچھنا۔

یہ غصہ یہ جفا یہ ستم مہرباں عبث — ہر بات سے رقیب کے یہ گریباں عبث

اس مطلع میں ہے یا ہیں کا حذف کر دینا ایک لطف رکھتا ہے

نرگسی چشم میں سرمہ کی ہے تحریر عبث — تم نے بیمار کو پہنائی ہے زنجیر عبث
کیا کروں گا میں یہ اترا ہوا نقشہ لے کر — آپ جب پاس رہیں گے تو ہے تصویر عبث
حق کے ہم آگے بھی وہ بت حق پہ تھا میں حق پر — اسکی تقریر بجا ہے مری تقریر عبث

اس مطلع پر مجھے ایک شعر یاد آیا جو عرصہ ہوا لکھنؤ میں سنا تھا جب سے مجھے یاد ہے ۔

کفِ نرگس سے آنکھیں بند کی ہیں شرم آئی ہے — عصائے نرگس بیمار اب آنکھ کی کلائی ہے

مطلع بھی خوب کہا اور دونوں شعر بھی خوبی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اُترے ہوئے نقشہ میں ایہام ہے۔ آزاد مرحوم کی تقریر سے متوہم ہوتا ہے کہ ایہام گوئی ختم ہوگئی یہ رنگ متقدمین کے لئے مخصوص تھا لیکن اصل امر یہ ہے کہ اس صنعت کو اُردو کے کسی شاعر نے آج تک تو نہیں ترک کیا سب کے کلام میں یہ بھری ہوئی ہے

قفس میں گھٹ کے، تنا ہے دم نکلنے کی — چمن سے چھٹ کے یہ باقی ہے آرزو صیّاد
بقا و صبر کا باقی رہے گا افسانہ — ہمیشہ زندہ رہیں گے نہ ہم نہ تو صیّاد

دیکھئے مصرعوں کے درمیان جو سجع پیدا ہو جاتا ہے کیا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ قافیہ مزہ کی چیز ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ عیب بھی ہے کہ قافیہ کی پابندی جن جن زبانوں میں ہے اس کے سبب سے صدہا مضامین عالی کا اور محاورات برجستہ کا خون کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ شعر کہتے ہیں اُنکے دل سے پوچھئے کہ زمین و قافیہ کے لحاظ سے کیسے کیسے مضامین سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں قافئے بکثرت دستیاب ہیں۔ انگریزی کی طرح یہاں قافیہ کی تنگی نہیں۔ اس پر بھی جو بے تکلفی نظم بے قافیہ میں ہوتی ہے وہ پابندی قافیہ میں ناممکن ہے انگریزی میں نظم بے قافیہ کے لئے ایک ہی وزن مخصوص ہے۔ ہر وزن میں ایسی نظم نہیں کہی جاتی اُردو میں کوئی وزن ابھی تک ایسا نہیں مشخص ہوا جس میں اس نظم کا نمونہ پیش کیا جائے۔ ہماری زبان میں تو جتنے اوزان ہیں ان کی بنا قافیہ پر رکھی گئی ہے۔ اسی غزل کے دوسرے شعر میں یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ جس مصرع میں یا فقرہ میں کوئی ایسا لفظ ہو کہ اس کے نکال ڈالنے سے بھی معنی وہی باقی رہیں ایسے لفظ کے نکال ڈالنے سے کس قدر برجستگی اس کلام میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی شعر کے دوسرے مصرع میں سے پہلے

لفظ زندہ کو حذف کرکے اسکی برجستگی پر غور کیجئے اور پھر لفظ ہمیشہ کو بھی حذف کرکے دیکھئے کہ اور زیادہ خوبی پیدا ہوجاتی ہے۔ فقط مصرع پورا کرنے کے لئے ایسے الفاظ کے بڑھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میری صلاح یہ ہے کہ ایسے الفاظ کے بڑھانے سے بہتر یہ ہے کہ مضمون اور بڑھا دیں اور اس ترکیب سے مصرع کو پورا کریں۔ مثلاً [illegible] یہ یاد رکھو کہ رہیں گے ہم [illegible] اور مضمون کے بڑھانے سے کلام کثیر المعنی ہوجاتا ہے۔ اور الفاظ زائد سے گویا معنی میں اور کمی پیدا ہوتی ہے

ترے محفل میں رو دے کیسا [illegible] مزاج — مدتوں صحبت رہی اب تک نہ پہچانا مزاج

بول چال اور روز مرہ کا بعینہ نظم ہوجانا عجب لطف رکھتا ہے۔

شمع آئے جو ترے سامنے روشن ہوکر — جھلملا جائے چراغ تہِ دامن ہوکر
ہم محبت کی نگاہوں کے تو قابل نہ رہے — دیکھ اور قہر ہی کی آنکھ سے دشمن ہوکر
گل ہوئے سیکڑوں پروانوں کی ہستی کے چراغ — شمع اندھیر مچا کر گئی روشن ہوکر
تیغ ابرو کی جو لکھی ہے صفت خامہ نے — کبھی سر ہوکے جھکا اور کبھی گردن ہوکر

مطلع کا مضمون زبان سے ماخوذ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے حسن کے سامنے شمع شرماتی ہے۔ قہر ہی کی آنکھ میں ہی کی ی گرتی ہے اگر قہر کی ہی آنکھ باندھتے تو یہ ثقل دفع ہوجاتا۔ کی میں سے ی کا گرجانا ایسا ثقیل نہیں ہے۔ مگر لکھنؤ کی خاص زبان یہ ہے کہ ہی کو کی پر مقدم رکھیں گے۔ مالک الدولہ کے قلم سے قہر کی ہی آنکھ نکلنا محال تھا۔ سیکڑوں پروانوں میں دو جمعوں کا جمع ہوجانا تنافر سے خالی نہیں۔ اس پر دونوں لفظوں میں سے واو بھی گر گیا ہے کسی شاعر کا کلام ان باتوں سے خالی نہیں دیکھا لیکن اسما و افعال میں سے حروف علت بہ تخصیص وہ حروف جو معروف ہیں نہ گریں تو بندش میں صفائی پیدا ہوجاتی ہے

آیا ہے دل اپنا جو کسی رشک پری پر — شک ہے پر طاؤس کا داغ جگری پر
جلوہ نظر آئے دم آخر جو تمہارا — پھر طور کا عالم ہو چراغ سحری پر
جس دل میں نہو درد وہ کیا درد کو سمجھے — بے جا نہیں ہنستے ہو مری نوحہ گری پر

داغ جگر میں پری کے نقش و نگار حسن کا جلوہ نظر آرہا ہے اس سبب وہ پر طاؤس بن گیا ہے۔ یہ مطلع تو بہت اچھا ہے لیکن اس قسم کے مضمون اکثر بے معنی ہوجاتے ہیں۔ مثلاً آنکھوں کے عشق میں بیمار ہوا تو طبیب نے روغن بادام نسخہ میں لکھا اور اگر مر گیا تو قبر سے نرگس بجائے سبزہ پیدا ہوئی اور اگر سبزہ اُگ آیا تو ہرن آکر اسے چر گئے اور اگر ان سب آفتوں سے بچے تو خواب میں بہار نرگستان و حلقۂ غزالاں ضرور دکھائی دے گا۔ ایسے تخیلوں سے احتراز چاہئے دوسرے شعر میں جلوہ سے تجلی الٰہی اور چراغ سحری سے اپنا نفس واپسیں مراد ہے۔ یعنی تمہارے جلوہ سے اس چراغ سحری میں تجلی طور کی روشنی پیدا ہوجائے گی۔

سودا بڑھا ہے قید کی تدبیر دیکھکر — پھر زلف یاد آگئی زنجیر دیکھکر
غارت یہ نوجوانوں کے باندھے ہے تو کمر — اُنکا شباب اے فلک پیر دیکھکر
محشر میں چھپ سکے گا نہ قاتل شہید سے — پہچان لیں گے کشتہ شمشیر دیکھکر
زاہد ہوا کرامتِ ساقی کا معتقد — شیشہ میں آفتاب کو تسخیر دیکھکر

باندھے ہے تو کمر یعنی باندھے ہوئے ہے۔ محاورہ میں ہوئے کو اکثر ترک کردیتے ہیں۔ جناب نفیس مرحوم نے حضرت امیر کی مدح میں کہا تھا کہ ع غزوۂ ذات سلاسل کی بھی کڑیاں جھیلے۔ اس کا چرچا حیدرآباد میں بہت ہوا کہ میر صاحب نے یہ کیا پڑھا۔ کڑیاں جھیلیں کہنا چاہئے تھا۔ یہ ذکر اس ہیچمدان تک بھی پہنچا۔ اور لوگ مستفسر ہوئے۔ میں نے سمجھا دیا کہ ہوئے یہاں سے محذوف ہے اور یہ حذف فصحا کے محاورہ میں ہے۔ اس شعر میں اُن کی ضمیر نوجوانوں کی طرف پھرتی ہے۔

کم کیجئے نہ ظلم و ستم اور چند روز
سنتے ہیں ہم بھی رنج و الم اور چند روز

اکثر خلافِ عہد کیا ہے حضور نے
پھر دیکھتے ہیں قول و قسم اور چند روز

تھا دل میں قصد ہم بھی چلے جائیں ساتھ ہی
رکتے جو رہروانِ عدم اور چند روز

ہم جان دیں گے چھوڑ کے سر شل کو کوہکن
مجنوں کے ہیں قدم بہ قدم اور چند روز

مطلع میں اپنی زیست سے مایوس ہونے کو بکنایہ ظاہر کیا ہے۔ اور کنایہ صنائع شعریہ میں بہت لطیف صنعت ہے۔ یہ مطلع اور اس کے بعد والا شعر جفاکاری و بدعہدی کی شکایت میں ہے۔ کچھ یہ ضرور نہیں کہ یہ خطاب معشوق ہی سے ہو۔

(باقی آئندہ)

علی حیدر طبا طبائی

تذکرہ

اعلیحضرت نظام الملک آصف جاہ
نواب میر محبوب علی خاں غفران مآب

۲۹ر اگست ۱۹۱۱ء سہ شنبہ کو دن کے ایک بجے رؤسائے ہند کے سرتاج، حیدرآباد کے محبوب خلائق ہردلعزیز فرمانروا، حضور سر میر محبوب علی خاں بہادر مظفر الممالک نظام الدولہ نظام الملک فتح جنگ آصف جاہ سادس کے رہگرائے عالم جاودانی ہونے کی روح فرسا خبر قصر فلک نما سے جب مشتہر ہوئی تو کون ایسا شخص تھا جسکو اس کے سننے سے سکتہ سا نہ ہوگیا۔ لوگ اس جانکاہ خبر کے سننے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ جب دوشنبہ کی رات کو حسب معمول اہل حیدرآباد اپنے روزانہ کاروبار کی تکان کے بعد خواب استراحت کا لطف حاصل کر رہے تھے تو اُن کو اسکی مطلق خبر نہ تھی کہ وہ عزیز جان جو اِن کی ذرا ذرا سی بے آرامی اور خفیف خفیف سی بے اطمینانی سے بے انتہا متاثر و بے چین ہوجاتی ہے اور جو شفقت محبت اور درد سے معمور ہے موت کے سنگدل فرشتہ کے ساتھ مقابلہ کر رہی ہے۔ اور جب اپنے محبوب بادشاہ کی مختصر دو روزہ علالت کی خبر سے بے خبر رعایا سہ شنبہ کی صبح کو تازہ دم ہو کر بیدار ہوئی ہے تو اسکو خواب میں بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ آج نصف النہار کو ہمارا سرتاج ہمارا والی، ہم پر ہمارے ماں باپ سے زیادہ شفیق۔ ہمارے رنج و غم میں شریک۔ رحم و کرم کا فرشتہ فیاضی و سیر چشمی کا نمونہ رعایا؟

معدلت گستر، غریب پرور اور خدا ترس بادشاہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو جائے گا۔ دن کے نو دس بجے البتہ یہ خبر کسی قدر مشہور ہونے لگی کہ حضور اقدس و اعلیٰ کی طبیعت دو ایک روز سے ناساز ہے اتوار کی شام تک تو مزاج مبارک بالکل اچھا تھا۔ یہاں تک کہ آپ مہام سلطنت کے انجام دینے میں مصروف تھے۔ لیکن کام ہی کی حالت میں دفعتہ بخار آیا اور آپ پر بے ہوشی طاری ہوگئی حالت اس وقت چنداں خطرناک نہ تھی۔ لیکن دوشنبہ کی شام سے بیہوشی زیادہ ہونے لگی اور دس دس پندرہ پندرہ منٹ کے وقفہ سے بیہوشی کے دورے پڑنے لگے اور تشنج کے آثار شروع ہو گئے۔ آدھی رات کو مرض کے اشتداد کی خبر سنکر صاحب رزیڈنٹ حیدرآباد مع رزیڈنسی ڈاکٹر کے قصر فلک نما پر حاضر ہوئے اور کئی گھنٹہ وہاں حاضر رہے۔ رزیڈنسی سرجن نے حالت تشویشناک پائی۔ شاہی اطبا اپنے اس آقائے ولی نعمت کے علاج کی فکر میں جس کی مسیحا نفسی کا ایک زمانہ قائل ہے اپنی جانیں لڑا رہے تھے مگر افسوس! صد ہزار افسوس!! مشیت ایزدی کچھ اور ہی تھی ان ہی کوششوں میں دن کے بارہ اور ایک کے درمیان وہ رحم و کرم سے معمور فیاض اور دردمند دل جو اپنی عزیز از جان رعایا کے ایک ایک فرد کی ادنیٰ ترین مصیبت پر بھی بیقرار ہو جاتا تھا ہمیشہ کے لئے اپنی حرکت کو بند کر کے خاموش ہو گیا۔ یہ تمام باتیں ایسی دفعتہ ہوئیں کہ علالت کا حال معلوم ہونے کے پہلے وفات حسرت آیات کی خبر مشہور ہوئی اکثر لوگوں کو باور نہ آتا تھا کہ کارکنان قضا و قدر نے ایسے عزیز خلایق۔ خیر مجسم۔ رحم دل۔ فدائے رعیت بادشاہ کو جو نہ صرف ان کے جان و مال ہی کا مالک تھا بلکہ جن کے دل بھی اسی کے قبضۂ اقتدار میں تھے۔ اتنے بے وقت ان سے چھین لینا گوارا کیا ہو گا۔ مگر فوراً ہی تمام کاروبار کے بند ہو جانے اور سارے شہر پر ایک عام سکوت غم کے طاری ہو جانے نے جس کی تائید آسمان بھی اپنی ماتمی گھٹاؤں سے کر رہا تھا یہ ثابت کر دیا واقعی شاہ دکن نے اپنی ڈیڑھ کروڑ رعایا کو تڑپتا اور اپنے بے شمار وابستگان و بہی خواہان کو انتہا درجہ کے رنج و غم میں مبتلا چھوڑ کر عالم جاودانی کی راہ لی۔ تین بجے کے قریب نواب شہاب جنگ افتخار الملک بہادر نے چارمینار کے پاس قدیم دستور کے مطابق حضور نواب میر محبوب علی خان بہادر کے انتقال پر ملال اور شہزادہ ولی عہد نواب میر عثمان علی خاں بہادر کی تخت نشینی کا اعلان کیا جس سے بیم و رجا کی کیفیت بھی باقی نہ رہی۔ لوگ ایوان شاہی کی طرف دوڑنے لگے۔ قصر فلک نما پر خلقت کے ازدحام کی کوئی انتہا نہ تھی لوگوں کے ہجوم سے راستہ ملنا دشوار ہو گیا تھا ہر شخص زار و قطار رو رہا تھا۔ کوئی آنکھ نہ تھی جس سے آنسوؤں کا دریا نہ بہ رہا ہو۔ ہر عمر، ہر درجہ، ہر طبقہ اور ہر رتبہ کا انسان اشک حسرت بہا رہا تھا اور ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ کوئی ان ترقیوں اور برکتوں کو یاد کر رہا تھا جو حضور اقدس کے عہد حکومت میں حیدرآباد کو نصیب ہوئیں اور کوئی ان خوبیوں اور نیکیوں کو یاد کر کے جو حضور ممدوح کی ذات میں خصوصیت کے ساتھ موجود تھیں اور جن کے سبب سے وہ اپنی ریاست ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی دور دور بہت ہر دلعزیز تھے۔ اور ان سے دلی محبت کی جاتی تھی آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ رات کے ایک بجے کے قریب مکہ مسجد کے صحن میں سلاطین آصفیہ کے مقبروں میں اپنے محترم دادا نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع غفران منزل کے پہلو میں بصد ہزار حسرت و یاس کروڑہا مخلوق کے اس امید گاہ اور پشت و پناہ کو سپرد خاک کیا گیا۔ ہائے وہ پیارا جسم جس کے ایک ایک رونگٹے پر حیدرآباد کی لاکھوں جانیں قربان تھیں زمانہ کی چشم زخم سے

پینتالیس سال تک محفوظ رہنے کے بعد آخر کار اب ایوان شاہی کی آسایشوں کو چھوڑکر مکہ مسجد کے صحن میں ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن ہے۔ آہ!

اے آفتابِ من کہ شدی غائب از نظر آیا شبِ فراق ترا کے بود سحر

اے بادشاہ عالم و اے قبلۂ جہان بکشائے چشم رحمت و بر حال من نگر

عالم چنین ز غصہ و ما دم بود بدست سوزم چو شمع در غم و دود دم بود بسر

اس قیامت خیز اور عالم آشوب حادثہ نے حلقہ بگوشان دولت آصفیہ کی کثیر تعداد میں ہی نہیں بلکہ حیدرآباد کے باہر بھی ہل چل ڈالدی۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اظہار رنج کے مختلف رسوم ادا کئے جا رہے ہیں۔ میسور۔ اور پٹیالہ وغیرہ دیسی ریاستیں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے عالی منزلت ہردلعزیز فرماں روا کی وفات پر ماتم کرنے میں حیدرآباد کی شریک ہیں۔ برہما اور انگلستان تک نے اشکِ حسرت بہانے میں حیدرآباد کا ساتھ دیا۔ اِس سانحہ جانگداز کی سوگواری میں اگر حیدرآباد نے تمام دفاتر سات روز اور ساری دوکانیں تین دن بند اور کاروبار موقوف رکھنے سے اپنا فرض ادا کیا تو شملہ پر وٹیشل لاج کے جلسۂ رقص کو ملتوی اور گورنمنٹ انگریزی کے تمام دفاتر ایک روز کے بند کرنے سے حضور ویسراے نے یہ ثابت کیا کہ مرحوم اپنے دائرۂ حکومت کے باہر بھی کس درجہ ہردلعزیز تھے اب تک برابر ہندوستان کے ہر حصّہ سے ماتم کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ہر رنگ۔ ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ اس رنج میں شریک ہیں۔ اور ہر شخص اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ والیسراے ہند کے قول کے مطابق اعلیٰ حضرت حضور میر محبوب علیخاں کی بے وقت وفات کے سانحہ سے حیدرآباد ہی کا نقصان نہیں ہوا بلکہ خود سلطنت عظمےٰ ہند کو صدمۂ عظیم برداشت کرنا پڑا۔ اسکی وجہ سوا اسکے اور کیا ہو سکتی ہے کہ حضور خلد آشیاں صرف حیدرآباد ہی پر حکومت نہیں فرماتے تھے اور اہل حیدرآباد کے دلوں پر ہی حکمراں نہ تھے بلکہ سارے ہندوستان کے باشندے حضور کے ساتھ عقیدت مندانہ تعلق رکھنا اپنے لئے موجب فخر اور باعثِ ناز سمجھتے تھے۔ اعلیٰ حضرت غفران مکاں کے ذاتی جوہر اور حمیدہ اوصاف بیشک اس بات کے مقتضی تھے کہ یگانہ و بیگانہ ہر شخص کا دل نورِ عقیدت سے معمور رہے۔

اعلیحضرت نواب میر محبوب علی خاں بہادر ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ م ۱۸ اگست ۱۸۶۶ء کی شب کو کتم عدم سے عالم وجود میں آئے۔ ابھی ڈھائی سال کا سن بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نواب میر تہنیت علی خاں بہادر افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی ناگہانی موت سے تاریخ ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ م ۲۶ فروری ۱۸۶۹ء آپ کو یتیمی کا داغ اور سلطنت کا چھتر ملا۔ آپ خاندان آصفیہ کے نویں فرمانروا تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی سے ہوتا ہوا خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیق تک پہنچتا ہے۔ آپ کے جد امجد خواجہ عابد خان نے جو سمرقند میں اپنے علمی تبحر اور تقدس کی بدولت بہت مشہور تھے ترک وطن کرکے ہندوستان کا قصد فرمایا۔ اس وقت شاہجہاں سریر آرائے سلطنت تھا۔ شاہجہاں نے خواجہ عابد خاں کی بہت قدر کی اور اُن کو بڑی آوبھگت کے ساتھ اپنے دربار میں جگہ دی۔ شاہجہاں کے بعد جب اورنگ زیب عالمگیر نے تخت شاہی پر قدم رکھا تو خواجہ عابد خاں کی اور بھی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ محکمہ صدارت کی صدر نشینی پنج ہزاری منصب اور چین قلیچ خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ۱۰۹۸ھ میں اورنگ زیب کے ہمراہ رکاب قلعہ گول کنڈہ پر حملہ کرتے

ہوئے گولے سے زخمی ہوکر انتقال کیا۔ اور نواح گولکنڈہ میں مدفون کئے گئے۔ اس طرح اس سرزمین میں پیوند خاک ہوکر خواجہ عابد خاں نے اپنی اولاد کے لئے سلطنت کا حق قائم کیا۔ ان کے فرزند شہاب الدین خاں بھی اپنے باپ کی طرح شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی عنایات سے مورد رہے۔ "غازی الدین خاں فیروز جنگ" اور "فرزند ارجمند بے ریو رنگ" کے معزز خطابوں اور ہفت ہزاری منصب و سات ہزار سوار سے مفتخر تھے۔ مالوہ وغیرہ کی صوبہ داری بھی کی ۱۱۲۲ھ میں انتقال کیا۔ اور دہلی میں اجمیری دروازہ کے قریب دفن ہوئے۔ نواب میر قمر الدین خاں فتح جنگ نظام الملک آصف جاہ اعظم آپ ہی کے فرزند ارجمند تھے اور خاندان آصفیہ کے بانی۔ اس سلسلہ میں حیدرآباد کے پہلے فرماں روا اور اولین نظام دکن ہوئے ہیں۔ نواب میر قمر الدین خاں آصف جاہ کی والدہ ماجدہ شاہجہاں کے نامی گرامی وزیر اعظم عمدۃ الملک سعد اللہ خاں کی دختر نیک اختر تھیں۔ نواب میر قمر الدین خاں سلطنت مغلیہ کی مختلف خدمات جلیلہ پر سرفراز تھے۔ دکن۔ مالوہ۔ اکبرآباد اور گجرات کی صوبہ داری کی خدمتیں یکے بعد دیگرے اور بعض اوقات اکھٹی انجام دیں۔ کئی سال تک شہنشاہ دہلی کے وزیر اعظم بھی رہے جب کوئی سخت مہم پیش ہوتی یا کوئی اہم معاملہ ہوتا تو شہنشاہ دہلی نواب آصف جاہ نظام الملک کو خواہ وہ دہلی سے اس وقت کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں۔ ضرور طلب کر لیتے۔ سارے ہندوستان میں نواب آصفجاہ کی شجاعت۔ دانشمندی اور فراست کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی انکا نظیر نہ تھا۔ نادر شاہ نے جو وقت اپنی فوج کی ایک خفیف سی بے عزتی سے آگ بگولا ہوکر دہلی میں قتل عام کا حکم دیا ہے اور اہل ہند کی نرم و نازک جانیں افغانی اور ایرانی دیو قامتوں کے فولادی ہاتھوں سے عجب بے دردی کے ساتھ تلوار کے گھاٹ اتاری جانے لگی ہیں تو یہی نظام الملک آصفجاہ تھے جو زلازل ہند کے سامنے یہ کہتے ہوئے جا کھڑے ہوئے تھے۔

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

اور نادر شاہ جیسے صاحب جلال و جبروت بادشاہ سے اسکے انتہا درجہ کے غیظ و غضب اور قہر کے عالم میں "بریش سفیدت بخشیدم" کا جاں بخش خلعت حاصل کیا تھا۔

جب سلطنت مغلیہ زوال و انحطاط کے اخیر زینہ پر پہنچ گئی اور شیرازہ سلطنت بکھرنے لگا تو نظام الملک آصف جاہ نے جو اول ہی سے تمام جزو کل کے مالک تھے شہنشاہ دہلی سے برائے نام تعلق رکھنے کی بھی ضرورت نہ دیکھی اور دکن کے خود مختار فرماں روا ہوگئے۔ آصف جاہ نظام الملک اول کے بعد مملکت آصفیہ کے حسب ذیل فرماں روا ہوئے :-

۱۔ نواب میر احمد خاں ناصر جنگ شہید — حکومت از ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۰ء
۲۔ نواب ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ — ۱۷۵۰ء تا ۱۷۵۱ء
۳۔ نواب سید محمد خاں صلابت جنگ آصف الدولہ — ۱۷۵۱ء تا ۱۷۶۱ء
۴۔ نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی — ۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۳ء
۵۔ نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ آصفجاہ ثالث — ۱۸۰۳ء تا ۱۸۲۹ء
۶۔ نواب میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصفجاہ رابع — ۱۸۲۹ء تا ۱۸۵۷ء
۷۔ نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصفجاہ خامس — ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء
۸۔ نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک آصفجاہ سادس — ۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء

اسطرح نواب میر محبوب علی خاں مرحوم اس سلسلہ کے نویں حکمراں تھے۔ ڈھائی سال کی نہایت کمسنی میں آپ مسند نشین ہوئے

مسند نشینی کے مراسم ادا کرنے کی غرض سے آپ کو ناناکی گود میں محلسرا سے لانا پڑا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر تک آپکی جانب سے سر سالار جنگ اعظم اور نواب شمس الامرا امیر کبیر امور سلطنت انجام دیتے رہے۔ اس عرصہ میں آپ کا وقت زیادہ تر تعلیم اور شہسواری۔ نشانہ بازی۔ شمشیر زنی وغیرہ فنون کی مشق میں بسر ہوتا تھا۔ آپ نے ان فنون میں اتنی مہارت پیدا کی کہ آپ ہندوستان بھر میں اوّل درجہ کے شہسوار اور نشانہ باز شمار کئے جاتے تھے۔ اسی زمانہ میں آپ نے اپنی ریاست کے اکثر حصوں کا دورہ فرمایا اور کلکتہ۔ دہلی وغیرہ کی بھی سیر کی ۱۸۷۷ء کے دربار قیصری میں جبکہ آپ کی گیارہ برس کی عمر تھی آپ شریک تھے۔ سر سالار جنگ اعظم کی آرزو تھی کہ تکمیل تعلیم کی غرض سے آپ کو یورپ کی سیر کرائیں۔ اس کا انتظام بھی اس عالی پایہ شخص نے کر دیا تھا۔ لیکن بعض وجوہ سے اس ارادہ کو ملتوی کرنا پڑا۔ اور اس کے چند ہی روز بعد ۸ رفروری ۱۸۸۳ء کو سر سالار جنگ اعظم کا انتقال ہوگیا جس کے باعث یہ ارادہ کبھی پورا نہ ہوسکا۔ جب آپ اٹھارہ برس کے ہوئے تو ۵ رفروری ۱۸۸۴ء کو ویسرائے ہند لارڈ رپن نے حیدرآباد پہنچکر سرکار عظمت مدار کی جانب سے ریاست کے پورے اقتدارات و اختیارات حضور خلد آشیاں کے سپرد کئے۔ لارڈ رپن نے اس خوشگوار فریضہ کو ادا کرتے ہوئے ایک بہت معنی خیز اور نصیحت آمیز دلچسپ تقریر کی تھی جس کے بعض فقروں کا اعادہ اس موقع پر بے محل نہ ہوگا۔ دوران تقریر میں خوش تدبیر پیرانہ سال والیسرائے نے کہا :-

حضور والا کے ذمہ ایک اہم ترین عظیم الشان خدمت ہے۔ آپ تقریباً ایک کرور انسانوں کے حاکم ہیں۔ انکی فلاح و بہبودی اب آپ ہی کی ذات سے وابستہ ہے۔ اور انکی بھلائی برائی آج سے آپ کی عقل و فراست، آپ کی محنت و جفاکشی اور آپ کی خطایئ دنیوی سے نفرت پر منحصر ہے۔ میں آپ سے نہایت تاکید کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ آپ ظاہری شان و شوکت اور طمطراق کے بے معنی غرور کو مت پسند کیجئے۔ مال و دولت پر جو ہر طرف سے آپ کو گھیرے ہوئے ہوں گے گھمنڈ نہ فرمائیے۔ اور خوشامد چاپلوسی تعریف و توصیف کی جسکا چاروں طرف آپکو جلوہ نظر آئے گا پروا نہ کیجئے۔ آپ کا ملک نہایت وسیع۔ آپ کی آمدنی بہت زیادہ۔ اور آپ کی رعایا کثیر التعداد ہے۔ لیکن انمیں سے کسی ایک چیز پر بھی آپ کو ناز کرنا زیبا نہیں۔ آپ ہنوز نوجوان ہیں اس لئے آپ پر اُن تمام خواہشات اور ترغیب و تحریص کے اسباب کا چاروں طرف سے حملہ آور ہونا ضروری ہے جو شباب کا اقتضا ہیں۔ لیکن آپ کبھی انکو غالب ہونے کی نوبت نہ آنے دیجئے۔ آپ کے اغراض اعلیٰ۔ مقاصد بلند اور ذمہ داریاں عظیم الشان ہیں۔ اگر آپ ہندوستان کے رئیسوں میں نام کرنا چاہیں تو یہ بات آجکل محض آپ کی حکومت کے مبنی بر انصاف اور آپکی رعایا کے آسودہ حال ہونے سے حاصل ہوسکتی ہے۔ رعایا کی وفاداری اور عقیدت مندی آپ کے خاندان اور آپ کی ذات کے ساتھ مسلم اور قابل تعریف ہے۔ اب یہ آپکا کام ہے کہ آپ اسکو برقرار رکھیں۔ اور جیسا جیسا زمانہ گزرتا جائے اس میں اور ترقی پیدا کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ جو چیز کسی بادشاہ کے لئے سب سے زیادہ قابل قدر اور مایۂ ناز ہو سکتی ہے یعنی رعایا کی بلا تصنع خالص دلی محبّت وہ آپکو بدرجۂ اتم حاصل ہوجائے۔ خداوند تعالےٰ نے رعیت اس لئے آپ کے تفویض نہیں فرمائی ہے کہ آپ اُسکو اپنے حظوظ کا آلہ یا فخر و ناز کا ذریعہ بنائیں۔ بلکہ اُن لوگوں کی حفاظت

ونگرانی اس لئے آپ کے سپرد ہوئی ہے کہ آپ اُن پچاس [illegible] حکمراں ہوں۔ اور ان کی ہدایت و رہنمائی کریں جس سے خدا کی عظمت و شان نمایاں ہو۔ اور انکو بہبودی و فلاح نصیب ہو۔ ان ہی کی فلاح و بہبودی سے آپکو اطمینان و خوشی حاصل ہوگی۔ اور ان ہی کی خوشنودی رضامندی و خوشحالی سے آپ کو سلامتی و امن و امان کا لطف ملے گا۔

آپ کے اغراض و مقاصد ہمیشہ بہت بلند اور اعلیٰ ہونے چاہئیں۔ خلاف شان لہو و لعب سے محترز رہئے۔ اور اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کو ہمیشہ پیش نظر رکھئے۔ ہمیشہ آپ کی دلی تمنا اور کوشش ہونی چاہیے کہ جب آپ اپنے آباو اجداد سے متصل ہو جائیں تو لوگ آپ کی نسبت یہی کہیں کہ:۔

"انکی حکومت رعایا کے حق میں رحمت تھی اور انہوں نے اپنی رعایا کو بہترین حالت میں نہایت آسودہ حال چھوڑا"

.... خدا آپ پر مہربان اور آپ کا مددگار و معاون رہے۔ آپ کے عہد کو سرسبز۔ آپ کی حکومت کو کامیاب اور آپ کی فرمانروائی کو انصاف پرور اور معزز و ممتاز فرمائے۔

آج کے دن کی تمام امیدیں اور خوشیاں بار آور ہوں اور آپکی مرہون منت رعایا کی آئندہ نسلیں آپ کے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے دن کو ریاست کی تاریخ میں ایک بہت روشن۔ مبارک۔ نامی گرامی بافروغ زمانہ کا آغاز سمجھیں"

لارڈ رپن کی یہ مشفقانہ نصیحتیں اور امیدیں رائیگاں نہیں گئیں بلکہ حضور خلد مکاں نے ان کے ایک ایک لفظ کو ہمیشہ اپنا نصب العین رکھا۔ اختیارات حاصل ہونے کے بعد سے داعی اجل کو لبیک کہنے تک حضور مرحوم نے اپنی زندگی بالکل اسی نمونہ پر بسر کی جس کی لارڈ رپن نے تمنا کی تھی۔ حیدرآباد کو آپ کے ظل عاطفت میں بیالیس سال چھ مہینے بسر کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ اس زمانہ میں ریاست کو انواع و اقسام کی ترقیاں ہوئیں۔ کوئی صیغہ ترقی کے اثر سے خالی نہ رہا۔ اس مبارک عہد میں حیدرآباد کو جو ترقی نصیب ہوئی۔ اس کی نظیر ملک کی پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان تمام ترقیوں اور برکتوں کا ٹھیک اندازہ اسطرح ہوسکتا ہے کہ حیدرآباد کی پچھلی تاریخ کو بیالیس سال کے متعدد و مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ہر بیالیس سال کی میعاد میں ملک کو کیا کیا ترقیاں نصیب ہوئی ہیں۔ پھر تو بہ آسانی معلوم ہو جائیگا کہ حضور خلد مکاں کا عہد حکومت ملک کے لئے ہر طرح موجب برکت رہا ہے۔ اُس وقت اس مبارک عہد کی اصلی عظمت سمجھ میں آئے گی۔ اور معلوم ہوگا کہ یہ امن و اماں جو ہمیں آج نصیب ہے ہمارے بزرگوں کو خواب میں بھی میسر نہ تھا۔ ریاست کے مختلف صیغوں اور شعبوں کی درستی اور باقاعدہ حالت جو آج پائی جاتی ہے۔ پہلے اسکا پتہ تک نہ تھا عامۂ خلائق کے فائدہ کے لئے یہ محکمے پولیس صفائی تعلیمات۔ طبابت وغیرہ کے کہاں تھے۔ اخبار رسائل۔ مطابع۔ ریل۔ تار۔ ڈاک وغیرہ کو کون جانتا تھا غرض خلق اللہ کی آسائش اور ملک کی ترقی کے اس وقت جو جو سامان نظر آتے ہیں وہ سب اسی مبارک عہد کی یادگار ہیں۔ ریاست کی انتظامی حالت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ مالگزاری۔ فنانس۔ عدالت وغیرہ کے تمام انتظامات بالکل جدید اصول کے مطابق ہوتے ہیں۔ مدارالمہام یا وزیراعظم تمام کاروبار ریاست کے اعلےٰ ترین افسر ہیں۔ مدارالمہام کے چار معین المہام ہیں جن کے سپرد مختلف صیغہ جات ہیں۔ ہر صیغہ اور ہر علاقہ کی نگرانی کے لئے الگ الگ معتمد (سکریٹری) مقرر ہیں۔ فنانس۔ مالگزاری۔ عدالت و کوتوالی و امور عامۂ۔



دربار نورتن اکبری

تعمیرات اور فوج یہ پانچوں صیغے پانچ معتمدین (سکریٹریوں) کے تفویض ہیں۔ ہر معتمد کے ماتحت متعدد ناظم (ڈائرکٹر) اور مددگار وغیرہ ہوتے ہیں۔ جن کی وساطت سے اس صیغہ کا کام چلتا ہے معتمدین اپنے اپنے کاغذات اپنے معین المہاموں کے پاس پیش کرتے ہیں۔ جن کی تجویزیں پھر مدار المہام کے پاس پیش ہوتی ہیں۔ اور اس کے بعد وہ تمام کاغذات مدار المہام کی شرح کے ساتھ اخیر فیصلہ کی غرض سے خود حضور نظام کے ملاحظہ میں گذرانے جاتے ہیں۔ حضور خلد مکاں نے سنہ ۱۹۰۹ء میں چند قوانین مرتب فرما دیئے تھے جن کی رو سے معتمد معین المہام اور مدار المہام کے اقتدارات مقرر ہوگئے ہیں۔ ان احکام کو "قانونچہ مبارک" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اور ان ہی کے مطابق ریاست کا کاروبار انجام پاتا ہے۔ ایک مجلس وضع قوانین (لیجسلیٹو کونسل) بھی حضور فردوس آشیاں نے سنہ ۱۸۹۳ء سے قایم فرما دی ہے جس میں چند اراکین رعایا کے مختلف طبقوں کی جانب سے بھی منتخب ہوتے ہیں۔ ایک کبنٹ کونسل بھی قایم ہے جس کے اراکین دولت آصفیہ کے صرف موروثی امرائے عظام ہی ہوتے ہیں غرض موجودہ ترقیات کے لحاظ سے جسقدر انتظامی اصلاحیں ممکن ہوسکتی تھیں۔ ان میں سے کوئی بات حضور خلد مکاں نے اپنی ریاست کے لئے باقی نہ چھوڑی۔

ممالک محروسہ سرکار نظام کی جملہ آمدنی تقریباً سات کرور سے زیادہ ہی ہے۔ اگر جاگیروں وغیرہ کی آمدنی کو الگ رکھا جائے تو صرف ریاست کی خالص آمدنی جو اس سال کے موازنہ میں شریک تھی۔ ۔ ۱۰۱۵۴۵۷۸۴ ہے۔ یہ آمدنی بہت زیادہ ہے بمقابل اس وقت کی آمدنی کے جبکہ حضور غفراں مکاں نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی اس موقعہ پر یہ معلوم کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ریاست کی جانب سے بعض عام ابواب پر کیا خرچ کیا جاتا ہے۔ لہذا ہم اس سال کے موازنہ کی بعض رقمیں یہاں درج کرتے ہیں:۔

تعلیمات - دس لاکھ اکہتر ہزار سات سو روپیہ - طبابت - آٹھ لاکھ تینتیس ہزار روپیہ - مذہبی اور خیراتی وظائف و معمول چھ لاکھ تراسی ہزار چار سو روپیہ - عدالت - چودہ لاکھ چھہتر ہزار ایک سو - وظائف حسن خدمت - چودہ لاکھ روپیہ - رعایتی ونیز تین لاکھ دو ہزار تین سو ایک روپیہ - رعایتی ماہوار ین منصبین وغیرہ جملہ پینتالیس لاکھ چھیاسٹھ ہزار تین سو۔

ان تمام اصلاحوں اور اس ساری خوش نظمی کا سہرا حضور خلد مکاں ہی کے سر ہے۔ کیونکہ ایک ایسے ملک میں جو ایشیائی اور شخصی حکومت کی باقیات الصالحات ہو جو کچھ ہوتا ہے محض اس کے تاجدار کی بدولت ہوتا ہے۔ اسی لئے اس عہد کی ساری ترقیوں کا ظہور حضور مرحوم ہی کی عنایت خسروانہ سے ہوا۔ اور ان ترقیوں نے اہل حیدرآباد کو اپنے محبوب بادشاہ کا والہ و شیدا بنا دیا۔ مگر یہ سب تو ریاست کے اندرونی انتظامات تھے جن کا اثر زیادہ تر ان ۱۲۳۷۵۴۹۹ نفوس تک محدود ہے جو ریاست کے ۸۲۶۹۸ مربع میل رقبہ میں حضور نظام کے ظل عاطفت کے نیچے بستے ہیں۔ اور جنکی قسمتیں اپنے فرمانروا کے ہاتھ میں ہیں اسلئے محض ان اصلاحوں اور انتظاموں کی بدولت ایسی عام ہردلعزیزی نہیں حاصل ہوسکتی جو حضور میر محبوب علی خاں مرحوم کو تھی کہ حیدرآباد کے باہر والے بھی آپ کی ایک ایک ادا کے دل سے گرویدہ تھے ہندوستان کی سب سے زبردست ریاست کا حکمراں ہونا بھی عامہ خلایق کی اتنی غیر معمولی گرویدگی کا کوئی سبب نہیں ہوسکتا

بالمختصر یہ کہ اعلیحضرت خلد مکاں اپنی وجاہت و شوکت اور اپنے علو مرتبہ کے باعث اس درجہ ہر دلعزیز نہ تھے بلکہ وہ محض انکی ذاتی خوبیاں اور خداداد بھی جوہر تھے جن پر اپنے اور غیر سب جان دیتے تھے۔ نواب میر محبوب علی خاں بہادر کی فطرت میں خوش اخلاقی انکسار۔ حلم۔ مروت۔ سادگی۔ نیک نفسی۔ بے تعصبی۔ فیاضی اور رحمدلی کے جوہر خلاق عالم نے کوٹ کوٹ کے بھرے تھے۔

وہ جس طرح ایک بڑی ریاست کے حکمران تھے اسی طرح ان تمام انسانی خوبیوں کے بھی مالک تھے۔ آسایش کے بے اندازہ سامان مہیا ہونے کے باوجود آپ کو ہمیشہ درویشانہ طرز پر زندگی بسر کرنے کا شوق تھا۔ مشہور ہے کہ آپ بہت کم شاہی خوابگاہ کے نرم و نازک بستر پر آرام فرماتے تھے۔ بلکہ اکثر اوقات تو آپ نفس کشی اور ریاضت کے طور پر سخت اور کھردری کمل بچھا کر بغیر تکیہ کے استراحت فرماتے تھے۔ دھوپ اور بارش کی صعوبتوں کو بھی آپ بکشادہ پیشانی برداشت فرمانے کو اپنی کسر شان نہ سمجھتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ آپ عین دھوپ میں باہر نکل آئے۔ اور کسی کام میں مصروف ہوگئے صبح سے شام ہوگئی۔ مصاحبین مارے دھوپ کی شدت کے بیتاب ہیں۔ مگر وہ جوان مرد عالی ہمت بالکل ان تمام اثرات سے بے پروا اپنے کام میں مشغول ہے۔ کبھی آپ کسی سے باتیں کرتے یا کچھ لکھتے یا کسی اور کام میں کھڑے ہو جاتے تو چوبیس چوبیس گھنٹے ایک پہلو پر گذار دیتے ساتھیوں کا برا حال ہو جاتا مگر آپ پر تکان یا کوفت کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں معلوم ہوتا۔ آپ کی طبیعت میں اس قدر پاس و لحاظ تھا کہ ان موقعوں پر ان مصاحبوں کو جو اس مشقت کے برداشت کرنے کے ناقابل ہوتے بیٹھ جانے کا حکم دیدیا کرتے تھے۔ چنانچہ فصیح الملک داغ مرحوم کو جو آپ کی استادی کے فخر سے ممتاز تھے بوجہ ان کی کبرسنی کے آپنے عام حکم دے رکھا تھا کہ وہ بلا تکلف ان مواقع پر بیٹھ جایا کریں۔ نمایش نام کو نہ تھی۔ سادگی اتنی کہ لباس وغیرہ تک میں تکلف پسند نہ کرتے تھے۔ دہلی دربار کے عظیم الشان موقع پر جب سارے والیان ملک بے حساب زیورات اور بھڑکیلے لباس میں دبے جا رہے تھے۔ حضور خلد مکان حسب عادت وہی سادہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ چنانچہ مسٹر اسٹیفن وھیلر نے اپنی کتاب "تاریخ دربار تاجپوشی" میں خاص طور پر اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ:۔

"نظام ایک باوقار سیاہ رنگ کا لباس زیب تن کئے ہوئے تھے"

آپ کو شان و شوکت سے جس درجہ نفرت تھی اور آپ کی طبیعت میں جو سادگی تھی اس کا کسی قدر اندازہ آپ کے فرمان مشتہرہ ۲۷ صفر المظفر ۱۳۲۰ھ کے حسب ذیل فقرہ سے ہوتا ہے:

آخر میں میں چاہتا ہوں کہ میری محبوب رعایا کا ہر طبقہ امراء و جاگیردار سپاہ اور دوسری عام رعایا جن کو میں اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں بخوبی سمجھ لیں اور ہمیشہ کے لئے سمجھ لیں کہ سابق میں گو کچھ ہی رسم و رواج رہا ہو۔ اور دوسرے فرمانرواؤں نے اپنے اختیار سے اپنے واسطے گو کیسے ہی حقوق قرار دے لئے ہوں لیکن میں اپنی ذات خاص کے واسطے اس سے زیادہ کوئی حق قایم کرنا نہیں چاہتا جس کو خدا نے اور اس کے رسول نے میرے واسطے مقرر کر دیا ہے اور میں خدا کی درگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھکو میرے اس ارادہ پر آخر وقت تک ثابت قدم رکھے۔

درویشوں اور باخدا لوگوں سے آپ کو بے انتہا عقیدت اور ارادت تھی۔ اور ان سے حصول فیض کا بہت شوق تھا۔ ہمیشہ فقرا کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کا بہت ادب کرتے۔ توسیع ملک یا طلب جاہ کی خواہش آپ کو صاحبدلی در

پاس نہیں لے جاتی تھی بلکہ محض دعائے مغفرت اور نیک کاموں کی توفیق کی آرزو میں آپ ان لوگوں کے پاس جایا کرتے۔ حضور خلد مکاں ہمیشہ اس بات کے بھی عادی تھے کہ راتوں کو بھیس بدلکر نکل جایا کرتے اور انتظامی حالت کو ملاحظہ فرمانے کے سوا غربا کی مختلف طریقوں سے مدد کرتے آپ کو اپنی رعیت کے ساتھ بےانتہا محبت تھی۔ مختلف اوقات مختلف طریقوں سے آپ کی رعایا پروری اور رحمدلی کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ ابھی تین سال قبل رود موسیٰ کی قیامت خیز طغیانی میں حیدرآباد کی حسرتناک تباہی کے موقع پر آپنے جس ہمدردی اور مسیحا نفسی کا اظہار کیا وہ ہمیشہ یادرہے گی۔ آپ نے رعایا کی تباہی و تاراجی کے غم میں دو دن تک ایک دانہ زبان پر نہ رکھا۔ حزن و ملال اور بےچینی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ دمبدم طغیانی کی کیفیت دریافت فرماتے اور بار بار سیلاب کے مصائب کو جہاں تک ہو سکے گھٹانے اور آفت زدوں کی فوری مدد کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ اپنے خاص مصاحبین کو اسی غرض سے روانہ فرمایا۔ مصیبت زدہ بےخانمانوں کے لئے اپنے خاص شاہی محل کھلوا دئے۔ اور حکم دیا کہ جس کا جی چاہے بلا کھٹکے ایسں ٹھہرے۔ بیچارے تباہ حال آفت زدوں کو فاقہ کشی کی موت سے بچانے کے لئے شہر کے مختلف حصوں میں فی الفور ہندو مسلمانوں کے واسطے جداگانہ کھانا پکا کر تقسیم کرنے کا حکم صادر کیا۔ اور صرف اسی پر اکتفا نہ کیا کہ ایوان شاہی میں تشریف رکھکر ضروری احکام صادر فرما دیتے۔ بلکہ باوجود سڑکوں کے خراب و از کار رفتہ اور راستوں کے ناقابل گزر ہونے کے کہیں گھوڑے پر چڑھکر اور کہیں پاپیادہ مقامات متاثرہ کا بنفس نفیس معائنہ فرمایا۔ کہیں شہر کی تاراجی اور اپنی عزیز رعایا کی تباہی دیکھکر اشکبار ہو ہو گئے۔ اور کہیں نہایت دلسوزی سے شفقت آمیز جاں بخش الفاظ میں مصیبت زدوں کی تسلی و تشفی فرمائی۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جو ہر دل پر احسان مندی اور شکر و امتنان کے حروف میں منقوش ہیں۔ انکا گہرا اور دیرپا نقش ہمیشہ جولوح عالم سے محفوظ رہے گا۔ بلکہ جیسا جیسا زمانہ گذرتا جاے گا اسی قدر نمایاں ہوتا رہے گا۔ آپ کا قول تھا۔ ؎

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ

گر کام آے خلق کی راحت کے واسطے

اور یہی آپ کا فعل تھا۔ آپ کے رحم و کرم کا یہ حال تو مشہور ہے کہ جب آپ کسی پر اس کی کسی حرکت سے ناراض ہو کر اپنے پاس سے الگ بھی کر دیتے تھے تو اسکی تنخواہ وغیرہ برابر اس کے نام جاری رہتی۔ فیاضی کا یہ عالم کہ ہزاروں آدمی اپنے گھر بیٹھے تنخواہیں اور منصب پا رہے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں کے باشندوں میں حضور خلد مکاں کے نمکخوار اور وابستہ موجود نہوں۔ دہلی کی جامع مسجد ہو یا اجمیر کی درگاہ یا علی گڈھ کا مدرستہ العلوم یا بغداد و عرب کے معابد و زیارت گاہ سب کے لئے ریاست سے بڑی بڑی تنخواہیں مقرر ہیں۔ یہ مرحوم ہی کی توجہات خسروانہ کا ادنےٰ کرشمہ ہے کہ اس وقت مولانا حالی اور علامہ شبلی وغیرہ جیسے فاضلانِ عصر اپنا سارا وقت بےفکری کے ساتھ ملک کی خدمت میں بسر کر رہے ہیں۔ حضور غفران مکاں کی صلح کل طبیعت اور بےتعصبی بھی اس میں شک نہیں کہ عدیم المثال تھی ہندوستان کے والیانِ ملک ہی نہیں بلکہ سارے جہان کے فرمانرواوں میں اس بےتعصبی کی نظیر نہیں ملتی۔ تعصب کا ہیبت ناک دیو جس بری طرح دنیا کی بڑی بڑی ترقی یافتہ سلطنتوں تک پر

مسلمہ ہے۔ اس کو سب جانتے ہیں۔ بڑے بڑے مدعیان مذہب و شائستگی بھی اس مرض متعدی سے خالی نہیں ہوتے مگر حضور میر محبوب علی خاں مرحوم اپنی رعایا کے کل فرقوں سے یکساں سلوک کرتے تھے آپ نے کبھی عبد اللہ اور رام داس میں کوئی فرق نہ کیا۔ ہندو مسلمان پارسی عیسائی وغیرہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ ویسا ہی تھا جیسا کہ خود اس مذہب کے فرمانروا کا ہو سکتا ہے۔ ریاست کے تمام عہدے بلا تخصیص ہر قوم کے لئے یکساں کھلے رکھے۔ آپ نے کبھی کوئی امتیاز خون یا رنگت یا مذہب کا روا نہ رکھا۔ مسلمانوں کے مساجد و معابد کی طرح ہندوؤں کے مندر عیسائیوں کے کلیسا اور پارسیوں کی دیولوں کے لئے بھی بڑے بڑے وظایف و روزینے مقرر کئے۔ ہندوؤں کے اکثر مندروں کے واسطے تو بڑی بڑی جاگیریں اور نوبت نقارے تک مقرر ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ حیدرآباد کے ہندو مسلمان بفضل خدا بلا کسی کانگرس یا کانفرنس کی کوششوں کے خود بخود باہم شیر و شکر ہیں ہندوستان کی موجودہ سیاسی بے چینی کے متعلق لارڈ منٹو کو مرحوم نے جو جواب لکھا تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے حضور کی بے نظیر خداداد بے تعصبی کی تشریح ہوتی ہے۔ حضور خلد مکاں کی اسی قابل تعریف اعلیٰ صفت کو فخر ہند شمس العلما مولانا حالی نے نہایت جامع الفاظ میں نہایت عمدگی کے ساتھ بیان فرمایا ہے:۔

رہا مذہب ہر اک ملت سے ہی یکساں سلوک اس کا کوئی گر پوچھے اس سے جہاں کی پاسبانی کا
تعصب اجنبیت اختلاف مذہب و ملت نہیں کوئی مزاحم اس کی دریا کی روانی کا
رعیت شاد ملک آباد اور آزاد ہر ملت ادا حق کر دیا شاہ دکن نے حکمرانی کا

حضور جنت آشیاں کے انتہا درجہ کی بے تعصبی کی یہ عدیم النظیر مثال قابل ذکر ہے کہ جب آپ ۱۸۸۴ء میں با اختیار ہوئے اور اقتدارات فرماں روائی حاصل ہونے کی تقریب میں جشن ہونے لگے تو بعض اہل ہنود نے آپ کے پاس یہ معروضہ پیش کیا کہ جسطرح مسند نشینی اور جشن وغیرہ کے مراسم اسلامی طریقوں سے بجا لائے گئے اسیطرح ان کی تمنائے دلی ہے کہ اپنے آقائے ولی نعمت بادشاہ عالی مرتبت کی تاجپوشی اور با اختیار ہونے کے مراسم ٹھیٹ ہندو طریقوں سے بھی ادا کئے جائیں۔ گو اکثر لوگ اس کے سخت خلاف تھے۔ لیکن حضور نواب میر محبوب علی خاں جنت آشیاں نے اس مخالفت کی مطلق پرواہ نہ کی۔ اور بڑی ہی بے تعصبی اور وسیع مشربی کے ساتھ اس بات کی اجازت دی کہ ہندو لوگ اپنے عقاید اور اپنے طریقوں کے مطابق ابھیشیک کے مراسم ادا کر کے اپنی آرزو پوری کریں۔ چنانچہ تمام رسوم برابر ادا کئے گئے اور حیدرآباد کی آبادی کا بہت بڑا حصہ اپنے جواں سال بادشاہ کی اس دل دہی اور خاطر داری کا دیوانہ ہو گیا۔ ہائے یہ چیزیں ہیں جن پر اپنے پرائے سب فدا تھے اور یہی باتیں ہیں جن کو یاد کرنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ یہی تھے وہ صفات حمیدہ جن کی جادو بھری تاثیر نے کروروں انسانوں کو حضور غفران مکاں کا والہ و شیدا اور حلقہ بگوش بنا دیا تھا۔ اور یہی تھیں وہ طبعی خصوصیات جن کے اعجاز نے ہر کس و ناکس کے دل پر قبضہ کر لیا تھا۔ لارڈ رپن نے تو صرف یہ توقع ظاہر کی تھی کہ حضور مرحوم اسطرح زندگی بسر کریں جو ان کے بعد احسانمندی کے ساتھ یاد کی جائے۔ اگر مرنے کے بعد انسان کو دنیا سے کوئی تعلق ہوتا ہے تو لارڈ رپن مرحوم دیکھتے ہوں گے کہ اسوقت حیدرآباد کی ڈیڑھ کروڑ رعایا کا کیا حال ہے۔ حضور میر محبوب علی خاں کی مرقد پر ہر روز صبح کے پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک خلایق کا کیسا ہجوم رہتا ہے۔ ہندو مسلمان

پارسی۔عیسائی۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ محبوب خلایق فرمانروا کے مقدس مزار کی زیارت کے لئے کس دلی شوق اور ارادت سے جاتے ہیں۔ دور دور کے اضلاع سے بیچارے غریب لسان اور مزدور پیشہ تک سفر کی صعوبتیں اور غربت کی زحمتیں برداشت کرکے محض اپنے محبوب بادشاہ کی قبر پر پھول چڑھانے کے لئے آتے ہیں۔ ہر وقت مزار پر ہزاروں آدمیوں کا مجمع رہتا ہے۔ لحد پر پھولوں کا قدِ آدم سے زیادہ انبار لگ جاتا ہے اس سے زیادہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی کیا ہوگی۔ یہ وہ خداداد نعمت ہے جو بمشکل کسی کو نصیب ہو سکتی ہے۔

اے تیر غمت را دلِ عشاق نشانہ
خلقے بتو مشغول تو غایب ز میانہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا سرائے فانی ہے۔ یہاں جو شخص آتا ہے اس کے لئے جانا بھی ضرور ہے اسی اٹل قانون کے مطابق حضور نواب میر محبوب علی خاں ہمیں داغ مفارقت دے گئے اور اب وہ انسانی کمالات کا سرچشمہ اور ملکوتی صفات کا مجموعہ ہم میں باقی نہیں رہا لیکن اسکی نیکیاں اور اسکے کارنامے ہمارے پاس موجود ہیں اور دنیا میں یہی چیز ہے جس کو بقا ہے۔ اس سے بڑی خدمت مرحوم کی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہم ان خوبیوں سے سبق حاصل کریں اور انپر کاربند ہوں۔ فقط

سیّد خورشید علی

بچے کی تندرستی یہ چھوٹی تقطیع کا رسالہ ایک مصری ڈاکٹر، عبدالعزیز نظمی کی عربی تصنیف "صحۃ المولود" کا ترجمہ ہے، جسکو منشی محمد حلیم صاحب انصاری نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ ایک نہایت ضروری اور مفید کتاب ہے۔ ہندوستان میں، مستورات کی جہالت کی وجہ سے، ہر سال ہزاروں معصوموں کی جانیں محض غفلت و بے احتیاطی سے تلف ہو جاتی ہیں، اور اگر بچے تندرست بھی رہتے ہیں تو کمزور و نحیف، قومی و اقتصادی پہلو سے کسی نسل کا ناقص ہونا بڑی مصیبت ہے۔ پس ہر ایک ماں باپ کا فرض ہے کہ اس کتاب کو اپنے گھر میں رکھے۔ اور جو قواعد پرورش اسمیں لکھے ہیں۔ ان پر اپنے ملک و مقام کی آب و ہوا کے لحاظ سے عملدرآمد کرے۔ نسل کی عمدگی و خوبی پر انفرادی و قومی زندگی کا انحصار ہے۔ قدیم یونانیوں میں تو نسل کی مضبوطی و خوبصورتی کا اسقدر خیال تھا کہ کمزور و ناقص بچے تلف کر دئے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ قدیم یونانیوں کے دل و دماغ ظاہری حسن و جمال اور جدت و اخلاق کے لحاظ سے آج تک بہترین نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ اس کتاب کی قیمت ۱۰؍ ہے، جو اس کے فائدہ کے لحاظ سے کچھ نہیں ملنے کا پتہ:۔

منشی محمد حلیم انصاری۔گوشہ چھتر منزل کوچہ پیسہ اخبار۔لاہور۔

صرف ایک پیسہ

کا کارڈ لکھکر اگر آپ بچاس صفحہ کا ایک نہایت دلچسپ، اچھوتا، اور دل کو بے قرار کرنے والا ناول پڑھنا چاہتے ہیں تو جنرل منیجر فسانہ ایجنسی لاہور کو پتا پتہ ارسال کر دیں۔ وہ زبردست اخلاقی ناول جسے بچے اور مستورات بھی بلاتکلف مطالعہ کر سکتی ہیں آپکی خدمت میں مفت ارسال ہوگا۔ اسکے ساتھ ہی آپکو ایک جدید لٹریری اسکیم کا حال بھی معلوم ہوگا جو لاہور کے چند معزز اور لٹریری آدمیوں کے اہتمام میں معقول سرمایہ سے قائم ہوئی ہے۔ یہ رعایت صرف ۱۵ ار نومبر ۱۹۱۱ء تک ہے۔

دمینتی اور ہنس

مرحبا خوبیٔ حسنا کی ... رت آفریں ۔ ہے فسون تاثیر دمینتی کا حسن دلنشیں
وہ حیا پرور نگاہیں وہ ادائے سرنگیں ۔ عصمت و عفت کی دیوی ہے مقدس نازنیں

جس کا نقش پا زیارت گاہ اہل دید ہے
جسکی خاک پا کا ذرہ ہمسر خورشید ہے

شوخیوں کی مضطربی ماہ سیما میں نہیں ۔ خود نمائی کی ادا طرز دلآرا میں نہیں
سرکشی سرو گلستاں قد رعنا میں نہیں ۔ حشر آرائی خرام ناز یما میں نہیں

ہے حسینوں کا مگر حسن دمن سرتاج حسن
قدرتی حاصل ہے رشک ماہ کو معراج حسن

یہ حسیں کاشانۂ نل کی تھی شمع دلفروز ۔ رکھتی تھی پروانہ سال سینہ میں الفت کا سوز
عالم نسواں میں تھی مانند مہر نیمروز ۔ ہے فروغ بزم الفت ذکر خیر اسکا ہنوز

دلگداز اہل دل اسکا بیان عشق ہے
اک طلسم رنج و راحت داستان عشق ہے

اس ستی کا ہی ہمارے ملک میں ذکر عزت کیساتھ ۔ فخر ہے بھارت کو اس خاتون کی عظمت کیساتھ
نامور گذری پتی ورتا ؤں میں حرمت کیساتھ ۔ الفت نل میں اُٹھائیں سختیاں شدت کیساتھ

اس قدر ثابت قدم تھی مرحلات عشق میں
نام روشن آج تک ہی کشش جذبات عشق میں

سامنے اک ہنس ہے مرغوب طبع نازنیں ۔ جسکی ہیں حرکات شیریں دلپسند مہ جبیں
طائر نازک ادا ہی محو ناز دلنشیں ۔ یعنی یہ زیبا طراز خامۂ جاں آفریں

اُڑ رہا ہے بال و پر کھولے ادائے ناز سے
دلستانی کر رہا ہے شوخیٔ پرواز سے

شرر سہارنپوری

مصوری و شاعری

سخن مرقع ارژنگ فکر ہے بہزاد ۔ مصوری کو کہوں شاعری کا اک خاکا
اگر ہے صورت و معنی کا فرق دو تو نہیں ۔ اس اعتبار سے پایہ سخن کا ہی اونچا
نہ مو قلم کی نہ پرکار کی یہاں حاجت ۔ دکھایا جاتا ہی لفظوں میں کھینچکر نقشا
وہاں تو صفحۂ عارض کی نیمرخ تشبیہ ۔ یہاں اُتارتے ہیں ہر ادا کا اک چربا
یہ بات اور ہے ایسے بھی ہم میں ہیں نقاش ۔ کہ جنکے نقشے علیحدہ ہیں خط و خال جدا
یہ کہد و اُن سے جو ہیں محو رنگ آمیزی ۔ کہ شوخیوں میں رہے سادگی کا رنگ بھرا
صفائے بندش مضموں نے وہ آئینہ ۔ جمال شاہد معنی ہو صاف جلوہ نما
بجا نہیں کہیں بیجا رعایت لفظی ۔ محل پر اپنے جو بیساختہ ہو کیا کہنا
مصوری میں جسے نقش سادہ کاری کہیں ۔ کوئی نگینہ انگوٹھی پہ جسطرح ہو جڑا
بری ہو ہر غل و غش سے زبان ٹکسالی ۔ کہ جوہری تو پرکھ لیتے ہیں کھرا کھوٹا
درست شعر ہو نکہ سکھ سے حسب موقع الفاظ ۔ محاوروں میں تصرف ہی صرفۂ بے جا
وہ شرمناک نہوں شعر بے حجابانہ ۔ کہ عیب کھولدے گہرا مجاز کا پردا
کھچے نہ یار کے جوبن کی اسطرح تصویر ۔ کہ بھاگے دامن عصمت میں منہ چھپا کر حیا
بنائے طائر عنقا کو کیوں کوئی پربند ۔ پھنسا کے جال میں انکھا کے کسلئے جا
کوئی لکیر کا ایسا فقیر کیوں بن جائے ۔ کہ جس سے چھوٹے نہ تقلید کا ذرا دامن
نئے جو ہیں وہ چلیں ایسی کیوں انوکھی چال ۔ کہ ڈھونڈنا پڑے چلنے کو اک نیا رستہ
اب ارغنوں ہو پرانا کہ ہو نیا ارگن ۔ مگر نہ لے سے ہو باہر کسی کا راگ نیا

وہی ہو تال۔ وہی سم۔ وہی سر اور الاپ
شفق پرانا ترانہ ہو یا نیا نغما

شفق عمادپوری

عندلیب

جسطرح تو فراق میں ہے عندلیبِ زار — اور عشقِ گل کا تیرے ہے ہر دم گلے کا ہار
آوارہ گردیوں سے ہے جسطرح تجھکو کام — بے لطف جب سے کٹ رہا ہے موسمِ بہار
ہے تیرے دم سے باغ میں ساری چہل پہل — فکرِ خزاں میں نغموں سے ہے گاہ انتشار
اسکے سوا تجھے نہیں بھاتی ہے کوئی شے — گر گل نہو تو خار ہے یہ سارا لالہ زار
ہی ڈھونڈتا ہے جسکو نہیں جب وہ رنگ و بو — کس کام کے چمن میں جو گل کھلتے ہوں ہزار
بے خبر یہ ہے کہ تجھے کچھ خبر نہیں — آیا بھی اور چلا بھی گیا موسمِ بہار
جسطرح دخلِ غیر نہیں چاہتی ہے تو — جسطرح تیرے دل میں کھٹکتی ہے نوکِ خار
کسکو سنائے کس سے کہے حالِ زار دل — جسطرح تیرا کوئی نہیں اپنا غمگسار
پوچھا کسی نے حال تو خاموش رہگئی — نکلا بھی کچھ زباں سے تو بس نکرِ کردگار
سنتے ہیں دونوں غنچہ و گل تیری گو صدا — دیتے نہیں جواب پکارے جو تو ہزار
معشوق سے ہوئی ہیں صدا بیوفائیاں — بے اختیار جیسے کہ تو گل پہ ہے نثار
مجھ دل جلے کا تجھ سے زیادہ ہے حالِ زار — کرتا ہوں انتظارِ قضا میں بھی دلفگار
اک بیوفا پہ یونہیں مرا آگیا ہے دل — اک گلعذار کے لئے میں بھی ہوں بیقرار
اچھا تو ہے جو ساتھ ہے میرا اور ترا — تو مجھسے پوچھ اور میں سنوں تیرا حالِ زار

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو "ہائے گل" پکار میں چلاؤں "ہائے دل"

ماہ عظیم آبادی

دُنیا

کس سے کہیں پُر درد ہے افسانہ ہمارا — دشمن ہی رہا یہ دلِ دیوانہ ہمارا
اکدن نہ ہوا سبزۂ بیگانہ ہمارا — کچھ کام نہ آیا کبھی یارانہ ہمارا

دنیا نہیں صد حیف یہ عبرت کی ہے تصویر
دلکش ہے مگر صانعِ قدرت کی ہے تصویر

ہر شام و سحر کیا کہیں کیا کیا نظر آیا — نیرنگیٔ قدرت کا تماشا نظر آیا
ہر ذرّہ میں اُس مہر کا جلوا نظر آیا — ہر نقش میں نقاش کا نقشا نظر آیا

پھولوں میں وہی شان ہے کانٹوں میں ہے آن
عاشق ہے تو ہر رنگ کو ہر رنگ میں پہچان

القصّہ نہیں چیز کوئی حسن سے خالی — نرگس ہے کہ ہے مَے کی یہ چھوٹی سی پیالی
مست آنکھ کے ڈورے ہیں کہ لالہ کی ہے لالی — ہیں پھول چنبیلی کے کہ یہ سلکِ لآلی

پھولوں کی یہ ڈالی ہے کہ جنت کی ہے نعمت
تصویر نہالی ہے کہ سبزہ کی یہ صورت

یہ قند کا شربت ہے کہ ہے نہر کا پانی — کلیاں ہیں کہ معشوق کی یہ غنچہ دہانی
یہ سرو ہے یا قامتِ نوخیزِ جوانی — پتّے ہیں درختوں پہ کہ پوشاک سہانی

یہ چاندنی کا پھول ہے یا چاند سی صورت
چھپا ہے کہ اک شوخ کی یہ چمپئی رنگت

جلوہ شفقِ شام کا وہ صبح سہانی — وہ راگ پرندوں کے وہ پانی کی روانی
پنہاں ہے ہر اک شکل میں اک حسنِ معانی — ہر شے سے ہے غرض خالقِ بیچوں کی نشانی

ہے عکس اُسی نور کا مراۃِ صُوَر میں
کانٹوں میں وہی نوک جو نس ہے گلِ تر میں

ہے غنچۂ سربستہ کہ خلوت کدۂ راز — ہے یہ گلِ بشگفتہ کہ عشرت کدۂ ناز
ہے نغمۂ بلبل کہ کسی ساز کی آواز — پریوں کا یہ اڑنا کہ پرندوں کی ہے پرواز

ہیں خوب مہ و مہر و زمین نجم و فلک بھی
پر سب میں نظر آتی ہے اک تیری جھلک بھی

ہیں اک الف اللہ کا پتّوں کی لکیریں — راجع ہیں اُسی سمت دونوں کی بھی ضمیریں
گاتی ہیں وہی راگ قلم کی بھی صریریں — ہیں اُسکی نشانی کی یہ ادنیٰ سی نظیریں

گہری جو نظر ہو تو یہ تہ تک کی خبر لائے
ماہی تو ہے کیا چیز یہ مہ تک کی خبر لائے

قدرت کے مرقع میں عجب رنگ بھرے ہیں — ہر شے ہے طلسمات وہ نیرنگ بھرے ہیں

ہیں حل کہیں اور کہیں رنگ گئے ہیں　　کچھ آئینے ہیں صاف تو کچھ زنگ لگے ہیں
دنیا میں غرض دیکھو نیکی بھی بدی بھی
سامانِ مرگ لیکن ہے حیاتِ ابدی بھی
سمجھتے ہیں فنا ہو گا یہ ہر ذرۂ خاک　　بجھ جائے گا اک پھونک میں یہ شعلۂ ادراک
کہتے ہیں نجوم اور طبیعات کے ادراک　　مٹ جائیں گے اک روز یہ مہر و مہ و افلاک
نور ان میں رہے گا نہ یہ تاری نہ یہ خاکی
باقی جو رہے گی تو بس اک ذات خدا کی
جو زندہ ہے اک دن اسے موت ہے آنی　　یہ یاد رہے خوب کہ یہ جان ہے جانی
جو چیز ہے اس دہر میں بیشک وہ ہے فانی　　دنیا کے یہ قصے ہیں کہ پریوں کی کہانی
اک خواب ہے جو شہرۂ آفاق ہوا ہے
کچھ بھی نہیں یہ واہمہ خلاق ہوا ہے
دنیا کے بکھیڑوں میں تو مصروف ہیں ہر دم　　بھولے ہیں اسے یاد ہیں بس جسکی ہے مقدم
ہاں جلد کریں کام کہ فرصت ہے بہت کم　　غفلت کدۂ دہر میں غافل نہ رہیں ہم
آتی تو رہے موت کی اے مشفقِ من یاد
پوشاک بھی بدلیں تو ہمیں آئے کفن یاد
دنیا میں ہیں یہ رنج و خوشی دیکھو توام　　ہنسنے کے لئے عید ہے رونے کو محرّم
ہونٹوں پہ تبسّم ہے کہیں چشم ہے پرنم　　شادی ہے کسی گھر میں کسی گھر میں ہے ماتم
سہرے میں تھے جو پھول وہ چڑھتے ہیں لحد پر
تھا بیاہ اور اب فاتحہ پڑھتے ہیں لحد پر
اک رنگ پہ رہتا نہیں یہ رنگِ زمانہ　　کہتے ہیں جو کچھ آج وہ کل ہوگا فسانہ
اک روز مسافر کی طرح ہونگے روانہ　　یہ پھول رہیں گے نہ یہ گلشن نہ ترانہ
دن عیش کے یکساں کبھی رہتے نہیں دیکھے
آنکھوں سے سدا اشک بھی بہتے نہیں دیکھے
مرتے ہوئے کیواسطے مرتا نہیں کوئی　　پیمانہ جو خالی ہو تو بھرتا نہیں کوئی
وعدہ بھی وفا کرنے کا کرتا نہیں کوئی　　گڑنے کے لئے ساتھ اترتا نہیں کوئی

مٹی میں ملاتے ہی نکل آتے ہیں باہر
ہو جاتے ہیں رخصت لحدِ تنگ میں رکھکر
سچ ہے کہ بُرے وقت کا ہوتا نہیں کوئی　　سینے میں پڑیں داغ تو دھوتا نہیں کوئی
آنکھوں سے بہیں اشک تو روتا نہیں کوئی　　مرجائے مگر جان تو کھوتا نہیں کوئی
عاصی کو بھروسہ ہے فقط رحمتِ رب کا
پوچھیگا وہی پوچھنے والا ہے جو سب کا
ظاہر میں عروسِ شبِ اول ہے یہ مانا　　دنیا سے کسی حال میں پر دل نہ لگانا
اس ظالم و مکار کے کہنے میں نہ آنا　　بچتے ہیں سدا دام سے اسکے جو ہیں دانا
دکھلا کے جھلک اپنی لُبھا لیتی ہے دل کو
پھندے میں ہر اک طرح پھنسا لیتی ہے دل کو
یہ پھول ہے وہ جسمیں نہاں خار ہیں لاکھوں　　عشرت کی جگہ ہے، مگر آزار ہیں لاکھوں
یہ گنج ہے وہ جسمیں بھرے مار ہیں لاکھوں　　کچھ بھی نہیں پر اسکے طلبگار ہیں لاکھوں
ناگن یہ ڈسے جسکو وہ پانی بھی نہ مانگے
جاتے ہوئے دنیا سے نشانی بھی نہ مانگے
وہ شہد ہے زہرابِ فنا جسمیں بھرا ہے　　وہ دن نہ رہے جسمیں مسافر وہ مرا ہے
وہ اسکی ہوا ہے کہ سدا زخم ہرا ہے　　سنبھلا نہ وہ پھر جسکا قدم اسمیں ڈھرا ہے
گمراہ نہ ہوتے تو ہم اس راہ نہ چلتے
آبادیٔ دنیا سے ذرا بچ کے نکلتے

واصف اکبرآبادی

اسپ

اے سمندِ بادپا، آئینۂ صدق و صفا　　اے مجسّم راستبازی نکتہ آموزِ وفا
تیرا یہ رنگِ فا گلگوں رہے گا یادگار　　محوِ نیرنگی ہے جب تک ابلقِ لیل و نہار
حبذا تیری رفاقت اے رفیقِ راہِ رزم　　مرحبا تیری چمک اے برق جولانگاہِ رزم
کھیت رہجانا لڑائی میں ترا انجام ہے　　کام آنا جنگ میں دنیا میں تیرا کام ہے

اپنے مالک کے لئے اپنے کو دیتا ہے مٹا　　کلکِ قدرت نے بنایا ہی تجھے نقشِ وفا
شوق سے راہِ وفا میں تو کٹا دیتا ہی سر　　زخم کھا کھا کے جگر پر رہتا ہی سینہ سپر
جان دیدیتا ہے راکب کی رضا کیواسطے　　تو نہیں مرتا ہے اپنی واہ وا کیواسطے
تیرا سر ہی پایہی ہدفِ ضربتِ توپ و تفنگ　　تیرا سینہ ہی کہ ہے آماجگاہِ تیرِ جنگ
مرتی جاتی میں اصالت کی ترے توصیف ہے　　کھیت رہنے ہی میں تیرے کھیت کی تعریف ہے
بھاگتا ہی کب لڑائی سے تو ہمت ہار کے　　سرخرو دیکھا ہے تجھکو کھیت میں تلوار کے

خوش خرامی دیدنی ہی جب تو چلتا ہی قدم　　چوم لیتی ہے تری رفتار خود تیرے قدم
چلکے سرپٹ جب تو ہوجاتا ہی نظروں سے ہوا　　گرد کو بھی تیرے کب پاتی ہی پھر بادِ صبا
تیری چالیں پویہ۔ رہوار۔ اور دوگام اَیر　　ترکی۔ تازی۔ عراقی عربی تیرے نام ہیں
ابلق و مشکی۔ سمند و نقرہ۔ کمیت و سرنگ　　سبزہ و سرغہ۔ یہ ہی مشہور ہیں تیرے رنگ
تجھکو سکھلاتے ہیں بچپن ہی میں آدابِ حرب　　پالتے ہیں مثل لڑکوں کے تجھے اہلِ عرب
راستی ہے تیری یکساں مفلس و خوشحال سے　　پائی ہے ہر دلعزیزی تو نے سیدھی چال سے
دم کے دم میں قطع کر دیتا ہی تو راہِ سفر　　باگ اٹھی اور اڑ کے پہنچا منزلِ مقصود پر
جیت کر بازی بڑھا دیتا ہی تو مالک کی شان　　پولو اور گھوڑ دوڑ میں رکھتا ہی اسکی آن بان

چلتی ہیں تیرے ہی دم سے سب فٹن اور بگھیاں
نام روشن کر رہی ہیں تیرا "گھوڑے گاڑیاں"

حفیظ

مُرجھائی ہوئی کلیاں

ایک دن میرا دلِ زار جو گھبرایا بہت　　جسکے بہلانیکو گھر سے میں چمن میں پہنچا
میں بیاں کرتا ہوں دیکھا ہوا سب حالِ چمن　　لیکن اے اہلِ وطن چاہیے گوشِ شنوا
پودے پودے میں تھی ہر کیفیتِ شانِ نمود　　سبزے سبزے میں تھی ہر حالتِ نشوونما کیا کیا
آبیاری کا عجب دور یہ دیکھا میں نے　　خود بخود دوڑی ہوئی آتی تھی موجِ دریا
پھول کھلتے تھے مہکتی تھیں چٹک کر کلیاں　　تھا دل آویز بڑا انکا تبسم، خندا
پھل تھے گدرائے ہوئے نخل تھے سب پھلے پھلے　　نکلی تھی پھوٹ کے کونپل میں بھی کونپل کیا کیا
تھا کسی ننھے حسیں کی طرح بوٹا ہر اک　　چھوٹے سے نازنیں کیطرح سے ہر گلبن تھا
نونہالانِ چمن دیکھے ہرے اور بھرے　　بار آور تھے جوانانِ چمن بھی کیا کیا
اپنی جوشش سے غضب جھومتے تھے سب اشجار　　اپنی اٹھکیلیوں سے مست تھی گلشن کی ہوا
مالنیں پھرتی تھیں ہر سو یہاں اترائی ہوئی　　باغباں تھا وہاں ہر ایک ہی ترچھا بانکا
بلبلوں کا تھا چہکنا بصد انداز و روش　　سیکڑوں طرح سے پھولوں کا تھا کھلنا ہنسنا
اتنے میں پیشِ نظر ہو گیا منظر یہ مرے　　کتنے عشاق تھے۔ تھا کتنے حسینوں کا پرا
دستِ رنگیں پہ کچھ اور تھی کسی کے مہندی　　دہن و رخ پہ گل و غنچہ کسی کے تھے فدا
چشمِ عشاق میں کیا کیا نہ نظر بازی تھی　　اور کیا کیا نہ حسینوں میں تھی ہر شوخ ادا
سرو پر پھبتی یہ کہتے تھے کہ ہی کاہِ چمن　　جبکہ ہر سروِ رواں کو جو ٹہلتے دیکھا

ناگہاں اتنے میں پُر درد صدا یہ آئی
سانحہ کوئی نہ دیکھا تو یہاں کیوں آیا

سن کے یہ میں نے کسی گوشے میں ڈالی جو نظر　　سانحہ میں نے حقیقت میں بلا کا دیکھا
تھیں اسی گوشہ میں "مرجھائی ہوئی کچھ کلیاں"　　ہائے کیا کہئے جو کچھ ان کا برا عالم تھا
میں نے ان کلیوں سے پوچھا کہ بتا دو مجھکو　　کسلئے جسم تمہارا ہی یہ مرجھایا ہوا
تم میں فرحت ہے نہ نکہت ہے یہ کیا باعث ہی　　دل ہی ٹھنڈا ہے تمہارا نہ کلیجا ٹھنڈا
بولیں مرجھائی ہوئی وہ ہی سی کلیاں مجھسے　　نہ چمن اپنا ہی۔ ہے ہے نہ یہ گلشن اپنا
دیکھی تونے جو مہکتی ہوئی کلیاں ہونگی　　ہاں انہی کلیوں میں پھولوں کے ہی کھلنے کا مزا
انہی کلیوں میں ہی ہر حسنِ طلب کا عالم　　انہی پھولوں میں ہے واللہ تقاضا کیا کیا
وہی کلیاں ہیں دلہن پھول ہیں دولھا انکے　　نظر آتا ہے چمن ہمکو انہی دونوں کا
بہرِ شادابی ہے گلشن یہ انہی کا یکسر　　بہر سیرابی ہی ایک ایک ہی تختہ انکا

اور ہم سب جو یہ "مرجھائی ہوئی ہیں کلیاں"
نہ دلہن ہم ہیں نہ ہے کوئی ہمارا دولھا

صاف لفظوں میں بتا دیں تجھے اس باغ میں ہم　　ہم ہیں کیا۔ ایک مرقع ہیں ہمی اشکوں کا
نہ ہنسی اپنی ہماری ہے نہ ہی کوئی خوشی　　نہ تبسم ہی رہا ہے نہ خندہ ہی رہا

نہ تو بو باس ہے اپنی نہ بہار اپنی ہے   اور پھولونکا نہیں ہم میں وہ بھی تو بیتا
کہ جھکیں دو تو جگر تھام کے یہ میں نے کہا   کتنا جانکاہ ہے صد حیف تمہارا دکھڑا
ہائے صد حیف تمہارے وہ ادا ٹوٹ گیا   ہائے کیا کیا نہیں ہے منہ کو کلیجا آتا

تم کو اے اہلِ وطن چاہیے ہر وقت یہ پاس
ان کا زیبا نہیں مرجھایا ہوا یوں رہنا

انکی آہیں نہ سلگا دیں کہیں سب پھولونکو   نہ ہو جائے تلفنا کہیں سب کلیوں کا
انکو چھاتی سے لگاؤ انھیں تم پیار کرو   ہے دل و دیدہ میں انکا ابھی بٹھانا اچھا
انکی سرسبزی کا باعث ہو تمہاری الفت   انکی شادابی کا موجب ہو تمہارا رونا
جسقدر جا ہو ابھی اپنے کئے کا صدقہ دو   تازگی کے ابھی قابل ہے وہ انکا ڈھانچا

ورنہ بریاں انہیں کلیوں کی دعائے بد سے
غنچہ و گل ہی نہیں سوکھے گا پتا پتا

بریاں جہان آبادی

سانچی*

کس قدر دلچسپ ہے یہ سبزہ زارِ کوہسار   تازگی بخشِ دل و جاں ہے بہارِ کوہسار
کیا سہانی سبزی ہے کیا سوادِ پُر فضا   کیا مزے کی سیر ہے منظر ہے کتنا خوشنما
دستِ قدرت کی نمایاں ہر طرف گلکاریاں   حسنِ فطرت کی عیاں ہر سمت جلوہ زاریاں
تو ہے اے "سانچی" کے جنگل غیرتِ باغِ عدن   دامنِ صحرا میں نظارے کو ہے لطفِ چمن
دلکشی کے اور بھی ساماں مہیا ہیں یہاں   یعنی آثارِ قدیمہ یادگارِ رفتگاں
دستبردِ عہد سے جو ہو گئے بالکل کھنڈر   کچھ برائے نام باقی رہ گئے دیوار و در
آج بھی اُن پر برستا ہے مگر جاہ و جلال   اب بھی ظاہر ہو رہا ہے اگلے لوگونکا کمال
ان عمارات شکستہ میں بہت کچھ ہیں نہاں   بودھ مذہب کی ترقی کے زمانہ کے نشاں
یہ فرازِ کوہ پر گنبد جو قائم ہیں ہنوز   دیکھنے آتے ہیں جنکو دور سے سیاح روز
دو مکاں ہیں چار دیواری کی صورت انکی ہے   بیچ میں ہیں ان کے گنبد جنکو کہتے ہیں بھٹے
جو تصاریفِ زمانہ سے شکستہ حال ہیں   مختلف ہیں۔ انکی نسبت جسقدر اقوال ہیں
لوگ کہتے ہیں بڑا گنبد عبادتخانہ تھا   اور چھوٹا اک مقدس شخص کا کاشانہ تھا
بعض کی تحقیق سے ثابت ہوا یہ مقبرے   اصلیت سچ پوچھئے تو انکی تاریکی میں ہے
چند کتبے بھی ہیں پتھر جو پڑھے جاتے نہیں   اگلے لوگوں کے نوشتے فہم میں آتے نہیں
سنتے ہیں پہلے یہاں اک شہر آباد تھا   فارغ البالی سے جسمیں ہر بشر دل شاد تھا
اب نشاں تک بھی نہیں باقی کوئی اس شہر کا   کھینچ رہا ہے ایک نقشہ انقلابِ دہر کا

یوں نہیں مٹ جائینگے سارے نقشِ ہستی ایک دن   اور ویراں ہو گی کل دنیا کی بستی ایک دن
خاک میں ملجائیں گی یہ چلتی پھرتی مورتیں   اور فنا ہو جائینگی اچھی بری کل صورتیں
پھر نہ بدلے گی کسی کو گردشِ لیل و نہار   رنگ لائیگا نہ پھر کچھ انقلابِ روزگار
شکوہ جورِ فلک ہو گا نہ قسمت کا گلہ   ٹوٹ جائیگا یہ گوناگونیوں کا سلسلہ
پھر نہ آئے گی گلستاں میں بہارِ جانفزا   اور نہ ہونگے شاہدانِ گل کبھی جلوہ نما
یہ نسیمِ صبح کی ہونگی نہ عنبر بیزیاں   اور نہ مرغانِ خوش الحاں کی ترانہ ریزیاں
پھر نہ ہو گا میکدوں میں بادہ نوشونکا ہجوم   مدرسوں میں بھی نہ ہو گا درس و تدریسِ علوم
منعقد ہو گی نہ یہ احباب کی بزمِ طرب   قہقہے یاروں کے ہونگے اور نہ کچھ شور و شغب
شعر گو ہونگے نہ انکی محفلِ شعر و سخن   کوئی سوسائٹی ہو گی اور نہ کوئی انجمن
پھر کمال اپنا دکھائینگے نہ اربابِ نشاط   سب کے سب معدوم ہو جائینگے اسبابِ نشاط

الغرض مٹ جائیگا ہر چیز کا نام و نشاں
ہر طرف چھا جائیگا اک عالمِ ہو کا سماں

ارشد تھانوی

تصحیح۔ گذشتہ نمبر میں جو نظم بعنوان "سائنس اینڈ رلجن" شائع ہوئی ہے اُس کے چوتھے شعر میں ایک غلطی ہو گئی ہے صحیح شعر یوں ہے ؎

نظامِ عالمِ ہستی کو ہے درکار حکمت بھی
خرد، تدبیر، ارادہ، اختیار اور علم و قدرت بھی

---

* ریاست بھوپال کے شمال مشرقی گوشے کے ایک پُر فضا مقام کا نام "سانچی" ہے جسکو آثار قدیمہ کی تاریخی اہمیت نے بہت زیادہ مشہور کر دیا ہے۔



سانچی کا ایک نظارہ

انڈین پریس الہ آباد

نسیم برشگال

اے ہوائے روح پرور اے نسیم برشگال — تیرے سرد و نرم جھونکے کیا طراوت ریز ہیں
رقص صحن گلستاں ہے تری خوش خوش چال — تیری مست اندازیاں کتنی مسرت خیز ہیں

تو ہوائے گلشن فردوس ہے کیا اے نسیم — یہ ترا دامن ہے یا ہے جلوہ زار بوئے گل
چادر صبح عروسی، عکس لرزان شمیم — موج نکہت ہے تو یا رقصان غبار کوئے گل

رونق باراں ہے تیرا حسن تاخیر خرام — زینت گلہائے ہستی ترا انداز ہے
اے سبک رفتار اے جادو تصویر خرام — تو پری ہے یا کوئی نقش طلسم ناز ہے

ہلکے ہلکے تیرے جھونکے بھینی بھینی اُس کی بو — اور ٹھنڈے ٹھنڈے تختے چھوٹی چھوٹی کیاریاں
کوئی فتنہ ہے ہوا ہے یا فقط دھوکا ہے تو — ہیں فریب دست گلچیں تیری گل آرائیاں

آہ! لیکن ہے یہ شوخی صرف دم بھر کے لئے — گرم کردے گی تجھے ظالم شعاع آفتاب
شاق ہوگی یہ جدائی جان مضطر کے لئے — پھر وہی افسردگی ہے تا وداع آفتاب

اے نسیم باغ، اے سرگشتۂ آب و ہوا۔ — مایۂ آوارگی، سرمایۂ رنگ بہار
آہ! میرا اور تیرا ساتھ ہے کچھ دیر کا — تو بہار باز رس ہیں سایۂ رنگ بہار

میں بھی ہوں تیری طرح ہمسایۂ پیری نسیم — آمد و شد پر نفس کی ہے مدار زندگی
ہے دل حسرت زدہ پامال صد امید و بیم — آہ! تاکے سرخوشی کیف بہار زندگی

میں بھی فانی، تو بھی فانی، فرق اتنا ہے مگر — گلشن ہستی میں ہے تجھکو امید بازگشت
آہ! آسکتا نہیں میں مثل نکہت لوٹ کر — اور تجھے ہوگی میسر روز عید بازگشت

تازگی تجھکو ملیگی صورت صبح چمن — اور مجھکو گوشۂ پر یاس و آلام لحد
تو قیامت تک رہیگی زینت صبح چمن — اور میں آفت کش تاریکیٔ شام لحد

سیماب اکبرآبادی

موسم برشگال

پانی کھلا ہے اسدم برس کر — دیکھیں تو چل کر جنگل کا منظر
آتا نظر ہے قدرت کا جلوہ — چاروں طرف ہے سبزہ ہی سبزہ
کیسی ادا سے بہتے ہیں جھرنے — پانی کی موجیں نکلی ہیں پھرنے
ہٹ ہٹ کے آنا کٹ کٹ کے جانا — دے دے کے چھینٹے گل کو ہنسانا
پانی میں کیسی دولت بہادی — قدرت نے سیروں چاندی گلادی
گرنا چٹانوں سے کیسے اچھل کر — گودی میں سبزہ کی جانا مچل کر
جانا تو یوں۔ کوئی سن گن نہ پائے — سبزہ کی چادر سے منہ کو چھپائے

اونچے پہاڑوں سے اٹھا وہ بادل — چوڑے فلک پر چھایا وہ بادل
جھونکے ہوا کے اٹھنے لگے ہیں — پتوں میں جا کر طائر چھپے ہیں
کیسی چمکتی ہیں بوندیں ڈھلک کے — موتی برستے ہیں سطح فلک سے
سبزہ پہ پانی کے قطرے پڑے ہیں — صحرا کے دامن میں موتی ٹکے ہیں
کیسے چٹیلے میدان دُھلے ہیں — پانی کے ہاتھوں اجلے بنے ہیں

پانی کے تھمنے سے پھیلا اجالا — سورج نے پردہ سے منہ کو نکالا
اٹھکر چلے ہیں پانی کے مارے — نالوں کو پھاندا پہنچے کنارے
کب تک نہ بھیگے خود کو سنبھالے
سر پر کھڑے ہیں بھادوں کے جھالے"

قیصر (بھوپال)

نوحۂ انتقال والاجاہ نواب میر محبوب علیخاں

۱۳۲۹ھ

شدتِ غم سے زیر ہے ستانِ نظام　　سر پٹکتے ہیں نو دمانِ نظام

رنج و غم کی گھٹائیں چھائی ہیں　　برق ہیں قلبِ شاعرانِ نظام

اب تھمیگی نہ چشم تر کی جھڑی　　پتلیاں بھی ہیں نوحہ خوانِ نظام

آج سونا پڑا ہے ملکِ سخن　　بند کیا ہوگئی زبانِ نظام

اب کہاں شہرۂ سخن سنجی　　اب کہاں لذتِ بیانِ نظام

وہ کہاں آبروئے باغِ سخن　　گلفشاں اب کہاں زبانِ نظام

تھی وہ شاہدِ فصاحت پر بھی　　غازۂ حسن تھا بیانِ نظام

ہے جہاں پر چھائی اک اداسی سی　　جانِ عالم تھی آہ جانِ نظام

کیسے کیسے نکلتے تھے مضموں　　موتیوں سے تھا پُر دہانِ نظام

ہم سے جور و ستم نے ہائے چھین لیا　　موجِ کوثر بنی زبانِ نظام

آہ بستی اجڑ گئی دل کی　　حسرتیں اب ہیں نوحہ خوانِ نظام

حوض و فوارہ پر اداسی ہے　　چشم پُر آب ہے مکانِ نظام

رنگ رخ طائرِ پریدہ ہے　　غم سے فق روئے میہمانِ نظام

کوئی پوچھے تو دیکھے شاعر کے　　جوہرِ خنجرِ زبانِ نظام

تھام دل کر سلام فکر سال　　ہے یہی کار خادمانِ نظام

کہدے سوچ اسقدر تجھے کیوں ہو　　صاف ظاہر ہے عزّ و شانِ نظام

تھا وہ محبوبِ حق خدا سے ملا　　یا جناں میں ہوا مکانِ نظام

۱۳۲۹ھ　　۱۳۲۹ھ

قطعۂ دعائیہ

مہرِ عالم ہو سایۂ عثماں　　کہ ہیں یہ شمعِ دودمانِ نظام

تا ابد حکمراں دکن میں رہیں　　ہو عیاں جلوۂ زمانِ نظام

ان کے جود و کرم کے ہاتھ ہے　　سرپرستیٔ خادمانِ نظام

معین الدین سلام

نوحۂ وفات نظام

کیا غضب ہے اے اجل دنیا میں کوئی ذی حیات　　تیرے دستِ ظلم سے زندہ نہ رہنے پائے ہائے

چشم بد دور اپنے حق میں تیرے آگے جو کہے　　دیدہ و دانستہ اسکو بھی نظر کھا جائے ہائے

کیسے کیسے خاندانوں کو کیا تو نے تباہ　　کیسے کیسے گھر بنے تو نے اجاڑے ہائے ہائے

نامیوں کے کھوج تک باقی نہ رکھے نام کو　　صفحۂ ہستی سے وہ نام و نشاں مٹوائے ہائے

بے گنہ ناداں جواں سب پہ پھری تیغِ جفا　　یہ ستم یہ ظلم تیرا کس سے دیکھا جائے ہائے

تھا جو گلدستہ میں اے بادِ فنا چوٹی کا پھول　　کیا غضب ہے کیا ستم ہے وہ ہی گل مرجھائے ہائے

جسکے لکھے تھے قصیدے شاعرانِ ذی شعور　　اُن سے نوحے مرثئے اب اسکے تو لکھوائے ہائے

جسے آنکھوں میں رکھیں آہ وہ ہر دلعزیز　　کارواں سے مثل یوسف یوں بچھڑ کر جائے ہائے

شادیانے جسکے بجتے اسکی نوبت ہی یہ آج　　پیچھے میت آگے ماتم اس کا ہو تل جائے ہائے

بین بجے نغموں کی بجائے بین کا ہی شور و غل　　دھوم سے اسکا جنازا یوں اجل اٹھوائے ہائے

جھاڑتے تھے روز و شب جو اسکی پاپوشوں کی گرد　　اسکی میت پر انہیں سے مٹی اب ڈلوائے ہائے

فرشِ دیبا کی بھی جسکو سلوٹیں تھیں ناگوار　　اُس تنِ نازک کو تو یوں خاک میں ملوائے ہائے

ہاتھ جو بہرِ سلام اٹھتے تھے جسکے روبرو　　آج اُسکی فاتحہ کو ہاتھ وہ اٹھوائے ہائے

چھا گئی ہے کیا غم و اندوہ کی دل پر گھٹا　　ہے سیہ پوش اسکے ماتم میں بھی کعبہ ہائے ہائے

قیصری دربار میں جو شوق سے آنے کو تھا　　اے اجل اسکو ہی تو ملکِ عدم پہنچائے ہائے

حشر تک ماتم رہیگا اس غمِ جانکاہ کا　　شاہِ آصف جاہ جیسا شخص یوں مر جائے ہائے

حضرتِ شاہِ نصیر و حضرتِ داغ و امیر　　تجھ میں اے خاکِ دکن یہ سب کے سب سمائے ہائے

رہ گئے تھے ایک انکے قدرداں شاہِ دکن　　وہ بھی پہلو میں انہیں کے سوئے جا کر ہائے ہائے

مر گئے شاہِ دکن کیا مٹ گئی قدرِ سخن　　مٹ گئی قدرِ سخن۔ کیا لاکھ کوئی لائے ہائے

اب اُنسا قدرداں کوئی نہ اُنسا باکمال　　کہنے سننے والے دونوں ہی سدھارے ہائے ہائے

ہو چکی بس نوحہ خوانی اے دلِ اندوہگیں　　کب تلک اس پر درد قصّہ کو کوئی دہرائے ہائے

یادِ مرحوم اے دلِ مضطر ہے نشتر سے سوا　　دکھتا پھوڑا کس لئے دانستہ یہ چھیڑا جائے ہائے

مانگئے دے حق تعالیٰ سے دعائے مغفرت　　تابکے یہ وائے ویلا تابکے یہ ہائے ہائے

دے نظامِ جہاں سکو اقبالِ و دولت کو دعا — جز دعائے خیر لب پر اب نہ ہرگز آنے ملے
دوستوں پر تو ہو نازل حق تعالیٰ کا کرم — دشمنانِ شاہ والاجاہ پر بجلی ٹوٹنے
جز شکیبائی کوئی چارہ نہیں بدل مجبور — سنکے دل بولا۔ خلیق۔ اب صبر کیونکر آنے ملے
زخم بھرتے ہی بھر لگا تازہ گھاؤ — ایک چٹکی بھر نمک کو کس لئے ترسانے ملے
یعنی کہدے مصرعۂ تاریخ بھی باقی جو ہو — بس یہاں اتنی ہلا دینے سے کیوں ٹلنے ملے

دل سے سنکر مصرعۂ غم یہ کہا میں نے خلیق
زندہ دل شاہِ دکن محبوب علیخاں جانے ملے
۲۹ ہجری قدسی ۱۳

خلیق دہلوی

اللہ کے آگے سر کو خم کرتا تھا — دشواریوں کی راہ عدم کرتا تھا
کافی ہے سمجھنے کے لئے وہ آصف — ساری دنیا پہ جو کرم کرتا تھا

محبوب نہو پاس تو چاہیں کس کو — سامع ہی نہیں سنائیں آہیں کس کو
اوجھل جب ہو گیا ہمیشہ کے لئے — پھر ڈھونڈھتی پھرتی ہیں نگاہیں کس کو

صبر دہلوی

یادِ محبوب

رُباعیات

رخصت اسوقت ہر اک کے اوسان کی تھی — سُدھ بُدھ نہ کسیکو بھی مگر جان کی تھی
محبوب علی خاں جو گئے جنت میں — منگل کا روز چوتھی رمضان کی تھی

محبوب علی خاں شہ فردوس مقام — جسکے باعث ہوا ترقی کو قیام
کل تک تو فلک نما پہ تھا جلوہ فگن — مکہ مسجد ہے آج جائے آرام

جو بات ہوئی اسکی بہت خوب ہوئی — ہر آن طبیعتوں کو مرغوب ہوئی
بے چین نگاہوں کی تسلّی کے لئے — محبوب کی قبر بھی تو محبوب ہوئی

اتنا مطلب ہوا کہ مطلوب بنا — عالم کے لئے یوسفِ یعقوب بنا
اس سے بڑھکر قبولیت کیا ہوگی — اللہ کے محبوب[1] کا محبوب بنا

قطعاتِ تاریخِ وفاتِ حسرت آیات

اعلیٰ حضرت حضور نظام الملک نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ جنت آرام گاہ

از سید حسن رضا صاحب ماہر کنتوری

رشکِ حاتم، فخرِ شاہانِ جہاں، ہمدردِ خلق — جس کے در سے لوگ پھرتے تھے ہمیشہ بامراد
آ گیا تھا وقت، فالج کا بہانہ ہو گیا — صبرِ اُن کے غم میں دے تو سب کو اے ربِ عباد
نورِ رُخ سے قبر بھی دم بھر میں روشن ہو گئی — غم میں سارا ملک ہے اور روحِ حضرت شاد
سالِ رحلت ہاتفِ غیبی نے یہ ماہر کہا — قربِ احمد اور محبوبِ علی پاک اعتقاد
۲۹ ۱۳ ھ

از حکیم غلام قادر صاحب آفر انصاری

چوں نظام الملک خامس والئی ملکِ دکن — میر محبوب علی خاں آصفِ غفراں مآب
شد ز دنیا در سہ شنبہ رابعِ ماہِ صیام — ملک را از سوزِ مرگش سینہ و دل شد کباب
گفت تاریخِ وفاتِ حسرت آیاتش افر — ہائے شد ز آفاق آصفجاہ در عینِ شباب
۲۹ ۱۳ ھ

دیگر

چون از جہاں رحیلِ نظامِ دکن نمود — صد بابِ رنج بر دلِ اسلامیاں کشود
تاریخِ پر ملالِ وفاتش افر نوشت — سہ شنبہ چہارمِ شہرِ صیام بود
۲۹ ۱۳ ھ

---

[1] مولانا مولوی محمد عمر صاحب قادری مشہور واعظ نے اپنے خواب کو اسطرح بیان فرمایا کہ میں حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر حاضر ہوں اور اعلیٰحضرت نواب میر محبوب علی خاں بہادر غفراں منزل بھی حاضر ہیں۔ حضرت موصوف نے اعلیٰ حضرت مرحوم کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ میں اللہ کا محبوب ہوں اور تو میرا محبوب ہے۔ واقعی غفراں منزل کا عقیدہ اسی قابل تھا ایسا معائنہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

از منشی نسیم الدین صاحب اثر بلند شہری

ہوئے جب میر محبوب علی خاں   شہ ملک دکن جنت کے جویا
ہوا یہ فرط حسرت اشک کا حال   کہ اک دریائے خوں آنکھوں نے رویا
سروش فکر یہ بولا کہ سب سے   نظام الملک آصف جاہ گویا
۱۳ ۲۹

دیگر

وفات حضرت شاہ دکن نے   کیا یک لخت اک عالم کو حیراں
ہوئی اے اشک مجھکو فکر تاریخ   نہ ممکن ہے ایسے غم کا درماں
ندا آئی کہ پہنچے خلد میں وہ   نظام الملک محبوب علی خاں

از منشی فضل ستار صاحب لاؔ ابالی امروہوی

رفتی ز بزم رفعت چون مہر جهانتاب   والئی ملک دکن خسرو ذی شان آصف
دکن بود ز افزونی جاہ و اقبال   رشک جمجاہی جمشید و سلیمان آصف
قدردان ہمہ ارباب فن و اہل کمال   نکتہ سنج و سخن آرا و ثناخوان آصف
شکل یوسف بجہاں بود عزیز دلہا   کرم بود اگر حاتم دوران آصف
زینت گور کنون است کہ وشنیدہ ام   زیب اورنگ شہی بود بہ ایوان آصف
لا ابالی سن رحلت بطراز ہجری   ہائے ایوان شہ محبوب علی خان آصف

از پنڈت سکھدیو پرشاد صاحب مہر ڈپٹی انسپکٹر مدارس بھرت پور

قضا حیف کی شاہ ملک دکن نے   ہے ماتم کدہ پر محن حیدرآباد
کدھر رم گیا بلبل باغ معنی   کہ تھا جس کے دم سے چمن حیدرآباد
یہ ذرہ نوازی اسی مہر کی تھی   کہ تھا مخزن لعل فن حیدرآباد
سر آہ سے مہر لکھ سال رحلت   غم مرگ شاہ دکن حیدرآباد

از منشی نادر علی خاں نادرؔ کاکوروی لکھنوی

شد عہد محبوب علی خاں چو ختم   بشد دور عثمان علیخاں شروع
سر مطلع آسمان دکن   رقم کرد نادر غروب و طلوع
۲۹ ۱۳

قطعات تاریخ جلوس

علیحضرت قدر قدرت مظفر الممالک نظام الدولہ نظام الملک آصفجاہ نواب میر عثمان علیخاں
فتح جنگ بہادر نظام دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

از مولوی سید عبد الغفور صاحب ضرغام جعفری

مہر مضمون سے نمودار ہے ماہ تاریخ   دیکھ لیں سب شعرائے مشاہیر زمن
خوب ممدوح جمیل اور مبارک ہے ماہ   اور واصف بھی ہے مشہور یہ ضرغام دکن
قدر تاریخ کا اس وجہ سے ہوتا ہے خیال   شاہی تاریخ میں زیبا ہے شہنشاہی سن
جلوہ افروز حضوری ہے مہ مہ کمال   میر عثمان علی خاں کا جلوس احسن

از سید حسن رضا صاحب ماہر کنتوری

ہوئے زیب مسند جو عثمان علی   زمیں سے فلک تک تھی اک واہ واہ
زمیں اسطرح سب تھے گھیرے ہوئے   ستاروں میں ہوتا ہے جسطرح ماہ
کہا ہاتف غیب نے سال یہ   نظام دہم عاقل عہد شاہ
۱۳۲۹ ف

از منشی فضل ستار صاحب لاؔ ابالی امروہوی

اگرچہ صرف ستم شد پامال خزاں   بہار باز رسیدہ بہ گلستان دکن
گلے ربود ازیں باغ چو گلچین قضا   قدر بکرد عیاں نو گل خندان دکن
بدند دوش ز دست تو اجل وقت بکا   چہ محو نغمہ کنوں زمزمہ سنجان دکن
بدوش بود گو تاریک زد و وہم دل   کنوں ز شمع طرب روز شبستان دکن
کسوف مہر اگرچہ لمعہ مہر شدہ   فروغ مہر بشد درمیان دکن
درخش جشن تجلی غمام غم جاں   منور است چہ بام و در ایوان دکن
فزوں بگشت ز محبوب بیں فضا خجل   فزوں ز عثمان علیخاں ترقی شان دکن
فسردہ شام الم صبح طرب شاد بداں   منم قدیم غلام در خاقان دکن
بہ لا ابالی گفتا چہ سن جشن مسیح   "جلوس شاہی عثمان علیخان دکن"

تازہ غزلیں

شمس العلماء مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی

جانِ من بوسہ شمردن نہ ز آئیں باشد   زاں کہ رسم است کہ ایں کار بہ تخمیں باشد
ورقِ بختِ من امروز شکنہا دارد   ایں ہماں است کہ در جبہ تو چیں باشد
ناکجا میں چنِ حسن گذشت از نظرم   کہ ہنوزم ورقِ دیدہ نگاریں باشد
وعدۂ قتل بمن کرد، وزکم حوصلگی   باورم نیست کہ ایں ہم پئے تسکیں باشد
خود تو دانی کہ مرا روئے سخن باکہ بود؟   گر حدیث از گل و از لالہ و نسریں باشد
ناہا بر توفنِ شرعِ مسلّم داریم   کارِ عشق ار بگذاری کہ بہ آئیں باشد
بزم ہر چند کہ برہم شد و چیدند بساط   ہم چناں مستیم از بادۂ دوشیں باشد
نکتۂ شرع کہ از دل بہ زباں می آید   وائے اگر دستخوشِ زاہدِ بے دیں باشد
غیحِ ما تو بہ زعمے کردہ تحسیں طلب است   ویں نہ کارے است کہ شائستہ تحسیں باشد

می گذشتی و بہ انگشت نشاں می دادند
"آں کہ دین و دلِ شبلی بربود" ایں باشد

ڈاکٹر ٹی۔ ریل صاحب لطیف

نگاہِ چشمِ شوقم لمعۂ نورِ جمالِ تو   سویدائے دلم آئینۂ عکسِ جمالِ تو
ز دیدارت عیاں گردید حسنِ بیمثالِ تو   ز گفتارت شدہ معلوم اسرارِ کمالِ تو
سرِ شوریدہ غافل نیست از ذوقِ خیالِ تو   نگاہِ چشمِ حیراں دائما محوِ جمالِ تو
الٰہی وسعتِ ارض و سما ہم تنگ شد لیکن   بچشم و دل عیاں شد جلوۂ نورِ جمالِ تو
بوقتِ امتحانم درجۂ عشقم فزوں گشتہ   چہ از عجز و نیاز من چہ از حسن و جمالِ تو
دلم آزار می داند سرم بے ہوش می ماند   چہ از دردِ فراقِ تو چہ از لطفِ وصالِ تو
نہاں داری چرا از چشمِ عاشق روئے انور را   من از روزِ ازل دانستہ ام حسن و جمالِ تو
نہ رنجوریم از بیتابئ دردِ فراقِ تو   خوشا بگذشت عمرِ ما بہ امیدِ وصالِ تو
لطیف ناتواں آہ و بکا سوئے نمی دارد   کہ یارِ بے نیازت آگہی دارد ز حالِ تو

سیّد ریاض احمد صاحب ریاضؔ

وہ تیرے سایۂ دیوار سے اب دور رہتا ہے   لئے دیوانہ تیرا زیرِ نخلِ طور رہتا ہے
برابر جلوۂ بیہم سے ہر سو نور رہتا ہے   ہمارے دم سے روشن لب چراغِ طور رہتا ہے
نہیں منظور کوئی مجھکو شریکِ دورِ تنہائی   یہ آفت ہے مرا سایہ بھی مجھسے دور رہتا ہے
نیا فتنہ ضرور اٹھتا ہے جب کوئی وہاں جائے   ہمیشہ انکی محفل کا یہی دستور رہتا ہے
مرا دل ناز پرور تھا کیسا۔ کیا ہوا اُسکو   بہت غمگیں بہت محزوں بہت رنجور رہتا ہے
یہ آئینہ سکھاتا ہے اُسے کیا آگے خود بینی   وہ کافر یوں نہیں اپنے حسن پر مغرور رہتا ہے
نہ اُس کافر کے گیسو میں نہ مجھ بیکس کے پہلو میں   خدا جانے کہاں میرا دلِ مہجور رہتا ہے
سنی ہے بیستوں پر بارہا آواز تیشے کی   یہاں کوئی نہ کوئی کام پر مزدور رہتا ہے
زمانے میں بہت اللہ کے بندے ہیں ایسے بھی   کہ جن کے پاؤں پر تاجِ سرِ فغفور رہتا ہے
ادب سے واعظ کی صحبت میں ہم وہ شئے نہیں پیتے   ہمارے جام میں افشردۂ انگور رہتا ہے
ریاضؔ احباب گور کھپور اکثر یاد آتے ہیں   زباں پر میری اکثر ذکرِ گورکھپور رہتا ہے

دیگر

لباسِ نور میں فانوسِ شمعِ طور رہتا ہے   تہِ داماں برقِ انکا رخِ پُرنور رہتا ہے
خدایا شمع سے بڑھکر ہے دو دِ شمع کا جوبن   وہ بنکر حور تو یہ بن کے زلفِ حور رہتا ہے
اتو بجلی کا ہی صیّاد کیا تیری نگاہوں میں   کہ ہر مرغِ چمن پرواز سے مجبور رہتا ہے
خمار آلودہ آنکھوں پر ہزاروں میکدے صدقے   وہ کافر بے پئے بھی رات دن مخمور رہتا ہے
کشیدہ بھی ہو ناوک تو بھی رہتی ہے جگہ دل میں   کہ زخم اچھا بھی ہو جاتا ہے تو ناسور رہتا ہے
شبِ فرقت نے دھڑکا کھو دیا ہے روزِ محشر کا   سپیدۂ صبح کا گھر سے مرے کافور رہتا ہے
حسینوں کے حنا آلودہ ہاتھ اسے کہیں اچھے   کہ موقع پاکے بھی دستِ ادب معذور رہتا ہے
سپاسِ لطف بن جاتا ہے شکوہ بے نیازی کا   کہ میرے دل میں رہتا ہے جو مجھسے دور رہتا ہے
ترے صدقے ترے ہاتھوں سے اتنی پی ہے اے ساقی   کہ اب تو بے پئے منہ پر ہمارے نور رہتا ہے
ہزاروں مستِ مے دیکھے حسیں دیکھے جواں دیکھے   کوئی آنکھ کی طرح نشہ میں اتنا چور رہتا ہے
قیامت تک پھلے پھولے قلم ساقی کے ہاتھوں کی   ہماری قبر پر اب سایۂ انگور رہتا ہے
فرشتے پر سے مس کرتے ہیں شاید اے ریاضؔ اسکو   کہ ایں ریشِ مبارک پر بہت ہی نور رہتا ہے۔۔

ایڈیٹوریل

حضور نظام

اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر نظام دکن، ۲۹ رجمادی الثانی ۱۳۰۳ھ سہ شنبہ کو رات کے ۹ بجے، حیدر آباد کے مشہور شاہی محل حویلی قدیم میں پیدا ہوئے سنہ ہجری کے حساب سے اس وقت آپ کا سن چھبیس برس کا ہے۔ آپ انیس بھائی بہن تھے۔ جنمیں صرف تین بھائی اور تین بہنیں اسوقت موجود ہیں۔ آپ ان سب میں بڑے ہیں حضور نظام خلد آشیاں کو آپ کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال تھا چنانچہ نہایت اعلیٰ پیمانہ پر آپ کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی تعلیم کے لئے نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی، مولوی انوار اللہ خاں، سلطان العلما ثنا والملک مولوی سید علی، مسٹر ایجرٹن، مسٹر میتن اور مسٹر برنٹ وغیرہ علماء و فضلا مقرر تھے۔ اور نظام مرحوم خود بہ نفس نفیس آپ کی تعلیم کی نگرانی فرماتے تھے۔ آپ کی تعلیم کا سلسلہ ابتک برابر جاری تھا۔ آپ قدیم و جدید تعلیم کا بہترین نمونہ ہیں مسائل ملکی میں ہوشیار، اصول حکمرانی میں آزمودہ کار، معاملات ریاست سے واقف، اور رموز سلطنت سے آگاہ بنانے کی غرض سے یہ انتظام کیا گیا تھا کہ جمیع دفاتر کے کاغذات متعلقہ عہدہ داروں کے ذریعے آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے تھے۔ فوجی تعلیم بھی آپ کو نہایت اعلیٰ درجہ کی دلائی گئی ہے حضور نظام مرحوم کو آپ کی تربیت کا اسدرجہ خیال تھا کہ ۱۳۱۷ھ کی یکم صفر کو تیرہ سال کی عمر میں آپ کو محلات شاہی سے بالکل علیحدہ کر کے محلسرا سے بہت دور، نظام کالج کے پاس، کنگ کوٹھی میں منتقل فرما دیا تھا جہاں آپ اسوقت تک قیام فرما ہیں۔ اپنے والد محترم کے ساتھ کلکتہ اور دہلی وغیرہ کی سیاحت بھی کی ہے اور قلمرو آصفیہ کے اکثر حصوں کو بھی آپ کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف و ممتاز ہونے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔ آپ کی بیدار مغزی، اصول کی پابندی، اور دانشمندی کی دھوم ہے۔ اور آپکی لیاقت و قابلیت بہت امید افزا ہے۔ نظام مرحوم میں رحم و عفو و فیاضی کا مادہ بتدریج بہت بڑھ گیا تھا لیکن جدید نظام میں کل اوصاف سنہ کا پہلو برابر پایا جاتا ہے۔

۹ رصفر المظفر ۱۳۲۴ھ کو خاندان شاہی کے معزز رکن نواب جہانگیر جنگ بہادر کی صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوا جن کے بطن سے اسوقت آپ کے دو شہزادے نواب میر حمایت علی خان اور نواب میر شجاعت علی خاں، پانچ اور چار برس کے ہیں ۱۴ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ سہ شنبہ کو اپنے نامور باپ کی وفات حسرت آیات کے باعث آپ نے زمام حکومت ہاتھ میں لی اور اسوقت آپ اپنی آبائی اور موروثی سلطنت کے حکمراں ہیں آپ کی مسند نشینی کی تہنیت میں بے شمار تاریخیں کہی گئیں اور کہی جا رہی ہیں جنمیں مولوی محمد اختر صاحب کا قرآن شریف کی ایک آیۃ سے نکالا ہوا مادۂ تاریخ

انّا مکنّا لہٗ فی الارض

اور حضرت جلیل کا مصرعۂ تاریخ

میر عثمان علی خاں ہوئے سلطان دکن

اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ کی تاریخ

مبارک ہو سرکار مسند نشینی

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اب سب کی آنکھیں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے اس جواں سال اور جدید فرمانروا کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اسبات کا تو یقین ہے کہ وہ تمام توقعات جو آپ کی ذات ستودہ صفات سے وابستہ ہیں ضرور پوری ہو کر رہیں گی خصوصاً آپکے وہ الفاظ جن میں آپ نے مسند شاہی پر قدم رکھتے ہوئے صاحب رزیڈنٹ اور نیز حضور والیسرائے کی مبارکباد کا شکریہ ادا فرمایا ہے۔ اس یقین میں اور بھی جان ڈالتے ہیں:۔

"آپ نے بڑی مہربانی کی جو مع اپنے اسٹاف کے مجھکو میری مسند نشینی کی مبارکباد دینے کی غرض سے آئے جس منصب پر میں متمکن ہوا ہوں وہ بڑی ذمہ داری کا منصب ہے اور مجھے معلوم ہے جیسا کہ میں نے کل کہا ہے۔ کہ جب تک میں اپنے جلیل القدر مرحوم والد کے نقش قدم پر چلنے کی پوری پوری کوشش نہ کرونگا اسوقت تک اس کے

فرائض پورے طور پر ہرگز انجام نہ دے سکوں گا اور نہ اس کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکوں گا۔ لہذا میرے والد بزرگوار کی مثال معاملاتِ ملکی کی انجام دہی میں رہبری کرنے کے لئے مینارِ روشنی کی طرح میری نظر کے سامنے رہے گی۔ آپ نے وائسرائے ہند کی طرف سے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ میرے ہر دلعزیز والد نے میرے خاندان کے تعلق ہز امپیریل مجسٹی کی گورنمنٹ کے "مخلص حلیف" ہونے کی دیرینہ روایات کو کس خوبی کے ساتھ برقرار رکھا۔ میں آپ کو اور آپ کی وساطت سے جناب وائسرائے کو اس امر کا یقین دلاتا ہوں کہ میری کوشش بھی ہمیشہ ان روایات کو مستحکم کرنے کی جانب مبذول رہے گی جسکے یہ معنی ہیں کہ ایک طرف تو میں اپنے ملک اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہوں گا اور دوسری طرف مملکت ہند کی عام فلاح و بہبود کی ترقی میں ساعی رہوں گا جسکا میری ریاست ایک جزو لاینفک ہے ...."

ہمیں پورا یقین ہے کہ جدید نوجوان نظام سلطنتِ حیدرآباد کے دیرینہ بیش قدر روایات کو ضرور قائم رکھیں گے مثلاً اس پرآشوب زمانہ میں حیدرآباد ہی وہ ملک ہے جہاں ہندو اور مسلمان مثل بھائی کے رہتے ہیں۔ اور نظام مرحوم دونوں کو مثل اپنی آنکھوں کے سمجھتے تھے۔ محکمہ اموراتِ مذہبی کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے منادر کو مسلمانوں کی مساجد سے قریباً پچیس ہزار روپیہ زیادہ ملتا ہے۔ اسیطرح حیدرآباد ہی وہ ملک ہے جہاں ہمیشہ سے ایسے لایق باکمال اور باہنر لوگوں کی قدر افزائی ہوتی رہی۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے عہدوں پر لایق دیسی مامور ہوتے آئے ہیں۔

+ + + + + + + + + +

نظام مرحوم رعایا کی خوشحالی و فارغ البالی کی شب روز نگرانی رکھتے تھے چنانچہ آپ نے ٹیکس کی زیادتی کو ہمیشہ روکا حیدرآباد میں ٹیکس کا معیار بمقابلہ ہندوستان کی تمام دوسری دیسی ریاستوں کے بہت ہلکا ہے اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ وہاں کی رعایا بہت آسودہ ہے۔

تمام وابستگان و بہی خواہانِ دولتِ آصفیہ کی یہ دلی تمنا ہے کہ آپ اپنے نامور، اولوالعزم اور محترم باپ کے قابلِ فخر جانشین ثابت ہوں۔ اور آپکا عہد دکن اور کل ہندوستان کے حق میں امید اور توقع سے بڑھکر روشن اور بابرکت ہو، اور یہ "عثمانیہ دور" امورِ خیر، علم و فضل کی اشاعت و معاونت میں "محبوبیہ دور" سے بڑھ چڑھ کر رہے۔ آمین۔

(اس نمبر میں ہم آپ کی ولیعہدی کے زمانہ کی تصویر ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ کسی آئندہ اشاعت میں تازہ تصویر پیش کریں گے۔)

رباعیات عمر خیام کا ایک بیش بہا ایڈیشن

اسمیں کچھ شبہ نہیں کہ پانچویں صدی ہجری میں ایرانِ قدح نوش کی بزم کا نقشہ کچھ ایسا جم گیا تھا کہ مولانا روم، سعدی، حافظ کے کلام میں اسکی چاشنی خاص طور پر نظر آتی ہے۔ شعرا نے بھی بادۂ شیراز اور میخانۂ حجاز کی ترنم نوازیاں اس خوش اسلوبی سے کیں کہ خداشناس اور خدارس بھی بھول گئے۔ زمانہ کا مذاق دیکھ کر اہل الرائے کو بھی اسی شراب و کباب کی محفل کے ملازمات کا استعمال کرنا آیت اور حدیث سے بھی جائز ثابت ہوتا تھا حافظ کے بعد جس شخص نے بے ثباتی عالم کی سادہ، شوخ، اور دلکش تصویر جام و شراب کے پیرایہ میں دکھائی ہے وہ عمر خیام ہے۔ اسکی رباعیاں عرفانی خیالات اور رازِ آفرینش کا لب لباب ہیں جسطرح ان سے ایک ویدانتی فلسفی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسیطرح ایک دھرمی ہندو اور سچا مسیحی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے کوئی رباعی ایسی نہیں جو معرفت اور گیان کا مخزن نہو۔ عمر خیام تھا تو ایک ایرانی، اور اس کی قدر بھی کسی کے ملک کی ایک خاص جماعت میں ہوا کی۔ مگر جب سے فٹز جیرلڈ نے اسکی چند رباعیات انگریزی میں ترجمہ کرکے پبلک کے سامنے پیش کی ہیں، اسوقت سے زمانہ جو پہلے ایک جان سے اسکا طلبگار تھا۔ اب ہزار جان سے عاشقِ زار ہے فٹز جیرلڈ کے علاوہ اور بھی چند بزرگوں نے عمر خیام کی کچھ رباعیاں انگریزی میں ترجمہ کی ہیں۔ مگر جو قبولیت فٹز جیرلڈ کے ترجمہ کو حاصل ہوئی۔ وہ کسی اور ترجمہ کو نہیں ہوئی۔ ایک ایڈیشن کے بعد دوسرا

ایڈیشن نئے رنگ میں نکلا، اور ہاتھوں ہاتھ اُٹھ گیا۔ یہی نہیں بلکہ عمر خیام کے کلام اور خیال کے شیدائیوں نے جداگانہ کلب اور ہال تجویز کئے، جہاں کئے سال [illegible] کی رباعیات پر لیکچر ہوتے ہیں۔

کتابوں میں نفسِ مضمون کے مطابق تصاویر شامل کرنا خاص اہلِ ہند کا ایجاد ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک بزرگ نے ویدک طب کے متعلق ایک رسالہ میں چند تصاویر بھی کھینچیں۔ راجہ بکرماجیت کے بزرگوں میں سے کسی نے رامائن اور مہابھارت کے متعلق تصویریں بنوائیں۔ اگرچہ اُس زمانہ میں تصویر بنانے یا بنوانے والے نے کسی خاص جدت سے کام نہیں لیا۔ مگر اب بعض تصویروں سے اُس وقت کے طرزِ معاشرت پر ایک خاص روشنی پڑتی ہے۔ ہندوستان قدیم سے ہی مصوری اور نقاشی کے لئے مشہور تھا۔ ماہرانِ آثار الصنادید کے خیال میں جسقدر پرانے زمانے کی سنگتراشی کے نمونے یا موقلم کی مدد سے بنائی ہوئی مورتیں ہندوستان میں مل سکتی ہیں، کہیں اور نہیں مل سکتیں چنانچہ وہ پنج تنتر جو ہندوستان سے ایران پہنچکر کلیلہ و دمنہ کے لباس میں ظاہر ہوئی تھی باتصویر تھی۔ محمود غزنوی نے سومنات کے مندر سے رامائن کا ایک نسخہ حاصل کیا تھا جسکا کوئی صفحہ تصویر سے خالی نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ امیر تیمور کے کتب خانہ میں شاہنامہ کی بھی ایک جلد باتصویر تھی، اور کسی زندہ دل نے امیر علی شیر کے حکم سے نظامی کے سکندر نامہ کے چند ایک سین فنِ تصویر کے ذریعہ اس خوش اسلوبی سے دکھائے تھے کہ دیکھنے والے ایک نظر میں داستان کا سارا مضمون سمجھ لیتے تھے۔ بیتال پچیسی کی تصویریں بادا ہکرن جی نے سب سے پہلے بنا کے ادبی خیالات پیدا کر دئے تھے۔ بنگال کے ایک عالی خیال مصور نے کالیداس کے میگھ دوت شکنتلا اور دیگر ناٹکوں کے مختلف سین ایسے وقت میں تصویر کے ذریعہ دکھائے تھے جبکہ کسی کو اس امر کا شان و گمان بھی نہ تھا، کہ اس سے کتاب کی زینت دوبالا ہوتی ہے۔ اہلِ یورپ نے اس سے ایک گونہ اور بھی جدت کا کام لیا ہے، یعنی کتابِ مقدس کے مختلف سین مختلف پہلوؤں سے دکھائے ہیں۔ انکے خیال میں اس سے بچے بغیر اُستاد کی مدد کے بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی بات کو مدِنظر رکھکر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے ولایت سے آتے ہی یہ بھی ایک خیال ظاہر کیا تھا کہ مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے کے لئے قرآن شریف کے بعض قصص کے متعلق رنگین، سادہ، روغنی تصویریں بنا کے بے انتہا تعداد میں اگر تقسیم کی جائیں تو نہایت ہی مفید ہوگا۔ مطبع نولکشور کا خاص ایڈیشن "گلستان باتصویر" بھی نہایت پرلطف اور دیکھنے کی چیز ہے۔

جسطرح یورپ کے بامذاق آجکل مصوری کے فن لطیف میں نام پیدا کر رہے ہیں۔ اسیطرح کسی زمانہ میں ہندوستان کے مصور مشہور تھے۔ اس وقت بھی ہمارے ہاں کی پرانی تصویروں کی اس قدر عزت ہے کہ ایک تصویر پانچ سے پانچ ہزار تک بکتی ہے۔ کسی مصور کی وہ تصویر جو راجہ جے چند والئی قنوج کی بیٹی کے سوئمبر کی تھی، اور جسمیں فتح چند کی فتح دکھائی گئی ہے۔ دس ہزار کو اٹھی تھی۔ الغرض ہندوستان فنِ تصویر میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ لیکن کچھ برس پیشتر وہ بات جاتی رہی تھی، جو پہلے حاصل تھی۔ مگر راجہ راوی ورما نے از سر نو اسمیں جان ڈالی اور کافی نام پیدا کیا۔ ادھر بنگال کے چند ایک بزرگوں نے بھی اپنی نقشکاری کے خوب خوب جوہر دکھائے مثلاً بابو نند لال بوس نے "ساوتری اور فرشتۂ موت" کی تصویر شرقی خیالات کے مطابق پیش کی کہ لندن والوں نے اسکی خاص قدر کی۔ بابو سمرندر ناتھ ٹیگور کی "ستی" والی تصویر نے امید سے بڑھکر عزت حاصل کی۔ بابو ابنیندرو ناتھ ٹیگور کی "چراغاں" والی تصویر ایک قیامت کا نمونہ ہے۔ غرض ان دنوں پھر ہندوستانی فنِ تصویر نے اس قدر ترقی حاصل کر لی ہے کہ یورپ کے نقادانِ فن کو داد دیتے ہی بن پڑتی ہے۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ تصویروں سے کتاب کی خوبصورتی و خوبی دوبالا ہو جاتی ہے چنانچہ اس خیال کو مدِنظر رکھکر لندن کے رسالہ **The Studio** کے کارپردازان نے جب رباعیات عمر خیام کا انگریزی کا ایک ایڈیشن نکالنے کا خیال ظاہر کیا تو بے شمار ترجموں کے مقابلہ میں فٹز جیرلڈ کے ترجمہ کو ترجیح دی گئی۔ اور پھر انتخاب پر انتخاب یہ کہ مصنف کی وہ رباعیاں ایسی لیں جو قریباً مذاق عام کی دلچسپی کا سامان ہیں۔ چھپائی میں بھی

خاص جدّت سے کام لیا گیا ہے، یعنی

ہر ایک رباعی پر سلسلہ وار نمبر شمار ہے۔

رباعی کے چاروں مصرعے چار چار سطور میں ہیں۔

کاغذ اعلیٰ قسم کا بہت دبیز۔ اور چھپائی نہایت صاف۔

اور ان سب سے بڑھکر مشرقی تہذیب، وضعداری، اور اصلیت کو ایک نئے رنگ میں ظاہر کرنے کے لئے کلکتہ کے مشہور و معروف مصوّر، بابو ابنیندرو ناتھ ٹیگور کے ہاتھ کی ایک درجن دلکش تصویریں دی گئی ہیں جو علیحدہ علیحدہ بارہ کارڈوں پر چھاپی ہیں۔ ان کو دیکھکر بے اختیار باچھیں کھل جاتی ہیں۔ ہر ایک تصویر اپنے کارڈ کے کاغذی چوکھٹے میں نگینہ کے مانند جڑی ہے لیکن مزید احتیاط کی غرض سے اس پر ایک باریک کاغذ لگایا گیا ہے جس پر سُرخ رنگ میں وہ رباعی بھی چھاپ دی گئی ہے، جسکا مضمون اس تصویر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ یہ مجموعۂ رباعیات اور ایک درجن دستی قلمکاری کا نمونہ تصویریں، مشرقی طرز کی مقوّہ کی جلد میں ہے۔ ہر ایک چیز نورٌ علیٰ نور اور اعلیٰ کاریگری کا نمونہ ہے۔

بابو ابنیندر و ناتھ ٹیگور کا درجہ بحیثیت فن تصویر کے ماہر ہونے کے کیا ہے، یہ امر ہمارے احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ اس نمبر میں ہم آپکی ایک مشہور تصویر "دمینتی اور ہنس" ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ اس سے آپ کی مصوّری کا رنگ اور جدت طرازی واضح ہوسکتی ہے۔ حاجتِ مشّاطہ نیست روئے دلارام را۔

رباعیات عمر خیام کے اس نادر انگریزی ایڈیشن کی قیمت صرف ۵۰؎ ہے۔ جو محنت اور لاگت کو دیکھتے ہوئے کچھ چیز نہیں۔ جو صاحبان منگانا چاہیں پتہ ذیل پر درخواست بھیجیں:۔

The Studio Office,

44, Leicester Square,

LONDON, W. C.

برقابی یا وائر وائرلیس ٹیلیگرافی

یورپ کی تاریخ سولزیشن پڑھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی کے ایجادات واختراعات نے کس قدر ترقی کی، اور ایجاد کنندوں کے حوصلہ افزائی، ہمت اور استقلال کو بام ترقی تک پہنچانے کے لئے فرمانروایانِ وقت نے کہاں تک ہاتھ بٹایا۔ مسٹر نوکس (ڈائرکٹر محکمہ تعلیم ممالک مغربی و شمالی) کی کتاب "ہیروز آف دی سائنس" کے مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ بہت سے موجدوں نے محض سرکاری اعانت کے باعث کیا سے کیا کرکے دکھادیا۔ انہیں ایجادات کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے پہلے کھمبوں یا ستونوں کی مدد سے سلسلۂ تار کو قائم کیا۔ وہ کس درجہ کامیاب ہوا کہ اگلے زمانہ والے باوجود اچھے فہم و فراست کے اسکو انجام دینے میں کامیاب نہ ہوے تھے اس ایجاد کی روزافزوں ترقی دیکھ کے سویڈن کے مسٹر جے۔ بی۔ آرمسٹرانگ اور مسٹر اے۔ آرلنگ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور جب ان کی متحدہ کوشش نے کامیابی کا سہرا پہنا تو اس ایجاد کا نام دونوں کے نام پر "آرمورل" رکھا گیا۔ مگر بعد کی دوراندیش نگاہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ "آرمل سسٹم دورانِ جنگ میں از حد مفید سہی، مگر دور کے فاصلہ میں اس سے کام نہیں چل سکتا"۔ اس خیال کو صوبجات متحدہ کے محکمۂ تار کے سپرنٹنڈنٹ بہادر، پروفیسر مورس، نے عملی صورت میں لانے کے لئے جس طریق کو استعمال کیا ہے وہ مخفی نہیں۔ چنانچہ جہاں، بحر، بحیرہ، ندی نالہ دریا آتے تھے وہاں تک تو کسی قسم کی تکلیف نہ تھی اور جہاں کچھ بھی نہ تھا وہاں کنوؤں سے کام لیا جاتا تھا۔ یہ اتنا بڑا کام تھا کہ اگر سرکاری اعانت ساتھ نہ ہوتی تو سارا کھیل بگڑ جاتا۔ مسٹر مورس کے بعد پروفیسر ٹامسن نے خیال ظاہر کیا کہ "اگر کافی سرمایہ ہو تو لندن اور کیپ کالونی کو تار کے سلسلے سے ملحق کرسکتے ہیں"۔ چنانچہ حکام نے اسکی سرپرستی کی اور وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد دو اور اشخاص نے اپنی دماغی محنتوں کا نتیجہ عملی صورت میں دکھلانے کا اعلان کیا یعنی پروفیسر ٹرو بریج نے چلتے جہاز اور اسٹیمر میں، اور مسٹر ایڈیسن اور گل لی لینڈ نے چلتی ریل گاڑی میں تار دینے کا اعلان کیا۔ ابھی ان دونوں کے خیالات عمل میں نہ آئے تھے کہ سر ولیم پریس نے اپنے نائب کیساتھ ایک نیا طریقہ ایجاد کرکے دنیا کو اور بھی

مشتہر کردیا، اور نئے طریق تو ایجاد کی مثال دکھانے کے لئے پہلے ۲۰ لفظ کا عام تار دیا اور بعد ازاں ایک اخبار کے کارسپانڈنٹ کی حیثیت سے سو لفظ کی ایک خبر بھیجی۔

لوگ کہنے لگ گئے کہ مرد لیم کی ایجاد بے نظیر ہے۔ کون جانتا تھا کہ ۱۸۹۶ء میں جو بات مارکونی نے کہا ہے وہ ابھی ہل چل ڈالیگی، اور قومی ادارہ تجارتی ترقی کی جان ٹھہرے گی۔ مارکونی جس کا نام آج کل دنیا کے پردہ پر شہرت عام کا تمغہ حاصل کرچکا ہے، جب بون یونیورسٹی میں پروفیسر ہرٹز کی "نوٹ بک ۱۸۹۰ء" دیکھ چکا تو اس نے سخت کوشش وکنش سے ۱۸۹۵ء میں کامیابی حاصل کی اور مئی ۱۸۹۶ء میں انگلستان پہنچکر اپنے خیالات کی عام طور پر اشاعت کی وہ اپنی کوششوں میں اسقدر کامیاب ہوا کہ دو ماہ بعد اس نے اپنے اس طریقہ پیغام رسانی کو رجسٹرڈ کرانے کی درخواست دیدی۔ رجسٹری ہونے سے پہلے امتحان لازمی تھا چنانچہ قرار پایا کہ صدر ڈاکخانہ اور دریائے ٹیمز کی چوکی کو ملا کے کام کیا جائے۔ بات پوری تھی کسوٹی پر کھری نکلی۔ ادھر کی کامیابی دیکھکر صیغہ جنگ نے بھی امتحان کا قصد کیا۔ پہلے تو صرف سو گز کی بات تھی مگر اب کے میدان سالسبری کو انتخاب کیا گیا۔ اس نے پہلے سے بھی زیادہ رنگ دکھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کی زبان پر "مارکونی سسٹم" چڑھ گیا۔ سوداگروں نے ایک لاکھ پونڈ کے سرمایہ سے کمپنی کھڑی کی اور بعد میں اس سرمایہ کو سہ چند کردیا۔ کام شروع کرنے کے لئے آبنائے انگلستان کا وہ حصہ تجویز کیا گیا جسکے ایک طرف ڈوور (واقعہ انگلستان) اور دوسری طرف ون گرو (واقعہ فرانس) ہے۔ جب اس تیس میل کے فاصلہ میں کامیابی ہوئی تو صیغہ بحریات نے بھی اس کا اجرا منظور کیا۔ بعد ازاں مارچ ۱۹۰۱ء میں عام تجارت کو ترقی دینے کے لئے خاص کارروائی کی گئی۔ الغرض مارکونی کی ہمت بڑھانے میں جسقدر گورنمنٹ انگریزی اور انگریزی رعایا نے کام لیا وہ امید سے بڑھکر تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ امریکہ اور یورپ کے موجدوں کو ہمیشہ سرکار کی طرف سے مدد ملتی رہی ہے۔ اور جب کسی موجد کو تخت نے اپنے سایۂ اقبال میں لے لیا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ ساعی ہوا۔ اسوقت ہندوستان میں مسٹر حبیب الرحمان خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ محکمۂ تار نے اپنی سعی بلیغ سے ایک نیا طریقہ پیغام رسانی ایجاد کیا ہے، جسکی ضرورت، فوائد، اور تجربات کے متعلق آپ نے ایک رسالہ انگریزی اور ایک اردو میں شائع کیا ہے اس رسالہ میں اگرچہ لفظی تصویر ان تجربات کی ہے جن کو مدنظر رکھکر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ناگپور میں آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد کی تجویز اور مسٹر ظہور احمد بیرسٹر کی تائید سے ایک رزولیوشن پاس ہوا جسمیں موجد کو ایجاد کی مبارکباد کے بعد اسکی آئندہ کامیابی کی ہزار جان سے خواہش کی گئی ہے۔ ہم بھی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ کانفرنس کے اس رزولیوشن سے جو کچھ بھی قوم یا ملک کی طرف سے اُن کی عزت ہونی چاہئے تھی ہوچکی۔ گویا ابتدائی مرحلہ طے ہوگیا۔ مگر اس قسم کی علمی اختراعات کی جبتک گورنمنٹ سرپرستی نہ کرے ہمہ سرسبزی معلوم۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اگر مارکونی کی طرح مسٹر حبیب الرحمن خاں کو سرکار دولتمدار سے

ا۔ تجربات کے سامان بہم پہنچائے جائیں۔

ب۔ تجربات کو وسیع تر پیمانہ پر سرانجام دینے کی آزادی ہو۔

ج۔ ہر طرح کی مناسب مدد کا وعدہ ہو۔

د۔ پیٹنٹ کرنے کرانے کی سہولت ہو۔

تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ "رحمانی سسٹم" ضرور ترقی کرے گا۔ بلکہ اس سے دوسرے موجدوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اب کے برس جو حضور ملک معظم ہندوستان تشریف لاتے ہیں کیا ہی عمدہ بات ہو، کہ جہاں اس موقع پر دوسری ہندوستانی چیزوں کو دکھایا جائے وہاں اس "رحمانی سسٹم" کا بھی ملاحظہ کرایا جائے۔

مسٹر حبیب الرحمن خاں کے سسٹم میں بہت کچھ سہولتیں اور آسانیاں نمایاں ہیں جسکا فائدہ ایک ہی نظر میں وہ لوگ بخوبی سمجھ سکتے ہیں جنکو ٹیلیگراف کی ماہیت پر کماحقہ تصرف ہے۔ اگر سرکار نے موجدوں کو اپنے ظل حمایت میں لے لیا تو دیکھ لیگی کہ امریکہ والے جس ایڈیشن پر نازاں ہیں اس سے کئی درجہ بڑھ چڑھ کر اس بھارت ورش میں موجود ہیں۔ جو اس وقت اگرچہ بے سروسامانی یا اپنی غفلت کے باعث "نیم وحشی" کہلاتے ہیں، مگر کسی وقت آسمان ایجاد

داختراع پر چانداور سوسے بھی زیادہ چمکیں گے۔ کمی ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ سرکاری مدد نہیں۔ یہ ہو جائے تو پرپرزے نکل آئیں گے اور پھر پیدا ذکرنے میں کوئی بات نہ رہے گی۔ جس طرح انگلستان کے نئے نئے اختراعات کرنے والے اپنے ایجاد کردہ اسکیم کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سامنے مختصر سے پمفلٹ میں شائع کرتے ہیں، اسیطرح مسٹر حبیب الرحمان خاں نے اپنی اسکیم مفصل طور پر ایک رسالہ میں لکھی ہے اور اُردو داں حضرات کی مزید واقفیت کے لئے اسکا ترجمہ بھی اپنی نگرانی میں شائع کیا ہے۔ شائقین کو چاہئے کہ ان رسائل کو بغور ملاحظہ فرمائیں اور پھر اس امر کی داد دیں کہ ایک ہندستانی دماغ نے کیا کچھ کرکے دکھایا ہے۔ اور ابھی اس سے کیا کیا امیدیں ہو سکتی ہیں۔

چندہ یادگارِ غالب

افسوس ہے کہ معاونین ادیب نے ابھی تک اسطرف کامل توجہ نہیں فرمائی اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس علمی تحریک میں نہ صرف خود عملی حصہ لیا جائے بلکہ اپنے احباب کو بھی اس طرف متوجہ کیا جائے۔

اس ماہ میں مندرجہ ذیل رقم اس سلسلہ میں وصول ہوئی ہے:۔

ڈاکٹر ٹی۔ ریل صاحب لطیف، اجمیر	صہ/
بابو امراؤ سنگھ صاحب توسط ڈاکٹر ریل صاحب	صہ/
خان بہادر ڈاکٹر محمد حفیظ اللہ صاحب طالب ″	عہ/
ڈاکٹر یوسف نارائن صاحب ″	عہ/
ڈاکٹر مہابیر پرشاد صاحب ″	عہ/
ڈاکٹر محمد ظفریاب خاں صاحب ″	عہ/
ڈاکٹر کشوری لال صاحب ″	عہ
ڈاکٹر گنگا رام صاحب ″	عہ
پنڈت لشن نراین صاحب طرب ″	عہ/
مسٹر جے لال شاہ۔ وکیل ہائیکورٹ نینی تال	عا/
	[illegible]
مشتہرہ سابق	[illegible]
میزان	[illegible]

تصریح تصاویر

دمینتی اور ہنس (رنگین) اور ساوتری و فرشتۂ موت کا ذکر ہم "رباعیات عمر خیام" کے انگریزی ایڈیشن کے ریویو میں کرچکے ہیں۔ سالگزشتہ میں دیگر مصوروں کی بھی انہی مضمون کی تصویریں ادیب میں شائع ہو چکی ہیں جنکے ساتھ مفصل نوٹ بھی درج تھے لہذا اعادہ کی ضرورت نہیں۔

گنگا اور شانتنو کی تصویر ایک بنگالی مصور مسٹر بی پی بنرجی کے کمالِ مصوری کا نمونہ ہے۔ ذکر ہے کہ ایک دفعہ مہاراجہ شانتنو ساحل گنگا پر ہوا خوری کے لئے گئے۔ گنگا جی اُسوقت ایک حسین عورت کی شکل میں پھر رہی تھیں شانتنو دیکھتے ہی فریفتہ ہو گئے۔ اس تصویر میں یہی منظر دکھایا گیا ہے۔

نورتن اکبری کی دھوم تمام عالم میں مچی ہوئی ہے۔ اس نمبر میں اس دربار کی تصویر بھی شائع کی جاتی ہے جو ایک قدیم مرقع کی نقل ہے بخوبی ہر شخص کی شناخت ہو سکتی ہے (۱) حکیم ہمام (۲) راجہ ٹوڈرمل (۳) راجہ مان سنگھ (۴) راجہ بیربل (۵) ملا دوپیازہ (۶) ابوالفیض فیضی فیاضی (۷) شیخ ابوالفضل (۸) مرزا تانسین (۹) نواب خانخاناں۔

اس نمبر میں "نوجوان ترک" کی نئی پود کی ایک تصویر شائع کیجاتی ہے۔ گہوارہ ہی سے اُن کو حریت، اخوت، مساوات اور عدالت کے اصول کی تعلیم ہوتی ہے اس اصول کی حفاظت اس زمانہ میں بغیر سربکف اور شمشیر بدست رہنے کے ناممکن ہے۔ یورپ نے اس سپاہی بچے کے تیور تاڑ لئے۔ خدا چشم بد سے بچائے اور ایشیا کی اس بہادر قوم کو اپنے نیک ارادوں میں کامیاب کرے۔

نمونہ خوشخطی زمانہ قدیم کے کسی خوشنویس کی تحریر کا نمونہ ہے جسمیں اس نے ہر قسم کا طرز تحریر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ افسوس کہ کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

توسیع اشاعت

ذیل کے علم دوست اصحاب کا دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنہوں نے اس ماہ میں ادیب کی توسیع اشاعت میں دلچسپی لی اور اپنے احباب کو اسکی خریداری پر مائل کیا:-

(۱) پادری جان ملکم صاحب (۲) سید محمد صابر علی شاہ صاحب تحصیلدار (۳) منشی عبد اللہ خاں صاحب سب انسپکٹر پولیس۔ (۴) ابو محمد سید حسن امام صاحب وارثی۔ (۵) مرزا محمد ہادی صاحب عزیز (۶) پنڈت بنواری لال صاحب سیاح ہند۔ (۷) پنڈت جواہر ناتھ صاحب کول ساقی (۸) حکیم سید ولی الدین صاحب۔ (۹) بابو شو بہارام صاحب کلرک ڈاکخانہ (۱۰) بابو موتی سرن صاحب پلیڈر (۱۱) بابو رام کشن صاحب امپورٹ ایجنٹ (۱۲) مولوی ریاست حسین صاحب (۱۳) مولانا احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی۔ (۱۴) بابو جگل کشور صاحب ضبط۔ (۱۵) ڈاکٹر ٹی ریل صاحب لطیف (۱۶) حاجی عنایت اللہ صاحب نقل نویس (۱۷) مسٹر وی۔ پی ورما (۱۸) منشی نثار علی خاں صاحب اوورسیر (۱۹) منشی محمد عین العزیز خاں صاحب (۲۰) مولوی خواجہ امیر الدین صاحب منصف (۲۱) نواب سید ابو القاسم خاں صاحب (۲۲) بابو کاشی پرشاد صاحب تحصیلدار (۲۳) مولوی تدبیر الدین صاحب (۲۴) بابو چند ولال صاحب اوورسیر ملٹری ورکس (۲۵) مولوی محمد تمیز الدین صاحب ٹیلیگراف انسپکٹر (۲۶) بابو چند ولال صاحب ورما ناظر (۲۷) سید ابو الخیر محمد شمس الرحمن صاحب (۲۸) منشی امیر علی صاحب صیغہ دار (۲۹) حافظ فیاض احمد صاحب پانی پتی۔

(قیمت سالانہ للعہ) **ادیب** (فی پرچہ ۵ر)

کے قواعد

یہ باتصویر ماہوار رسالہ جو اردو علم ادب کی ترقی کا نمونہ ہی ہر انگریزی مہینہ کی آخری تاریخوں میں شائع ہوتا ہی۔ ملک کے نامور اہل قلم مسلم الثبوت اساتذہ اور بہترین انشا پردازاسے وقیع، دلچسپ اور مفید بنانے میں سرگرم ہیں۔ مضامین کی نوعیت ایسی ہی جو ہر طبقہ کے لئے دلچسپ ہو۔ کوشش کی گئی ہی کہ اسکے مضامین زیادہ تر ہوں خواہ نظم یا تعلیم یافتہ مستورات کے لئے بھی اسیقدر دلچسپ مفید اور خوشگوار ثابت ہوں جس قدر تعلیم یافتہ اصحاب یا اہل نظر اصحاب کے لیے۔

اسکی ضخامت ۸۰ صفحات یا اس سے زیادہ ہوتی ہے اور صفحہ میں دو کالم ہونے کی وجہ سے اسمیں معمولی تقطیع کے ایکسو صفحات کے قریب گنجایش رکھی گئی ہے۔ اسکے علاوہ ہر ماہ التزاماً کم از کم سے ایک رنگین اور سات عکسی تصاویر دیجاتی ہیں جنمیں مشہور مصوروں کی صناعیوں کے نمونے، مشاہیر حضرات کے فوٹو، تاریخی عمارات کے نقشے اور دیگر دلچسپ امور کے مرقعے ہوتے ہیں بعض تصاویر کے متعلق مشہور شاعروں کی نظمیں بھی حاصل کیجاتی ہیں جو تصویر کی دلکشی کو دو بالا کر دیتی ہیں قدر دانوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسکے حجم اور تصاویر کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہیگا۔

تصاویر کے علاوہ اسکی لکھائی چھپائی میں بھی اعلی درجہ کا اہتمام کیا جاتا ہی اور قیمتی کاغذ پر نہایت صفائی کے ساتھ تصاویر چھاپکر اسمیں اضافہ کی جاتی ہیں۔ جو اسکی مقررہ ضخامت سے علیحدہ ہوتی ہیں۔ بہر نوع قدر دانان علم ادب کے لئے ایسا پرچہ مہیا کیا گیا ہے جو کمی قیمت کے ساتھ انگریزی میگزینوں سے مشابہ ہے۔

اسکی سالانہ قیمت چار روپیہ مع محصول ہی۔ اس قیمت میں ان خصوصیات کیساتھ کوئی پرچہ نہیں نکلسکتا۔ بلکہ اس ارزانی کے ساتھ اسقدر تصاویر بھی جنکی سالانہ تعداد کم از کم یک صد ہوتی ہی کہیں دستیاب نہیں ہوسکتیں۔ بنظر بریں معزز ناظرین رسالہ سے استدعا ہے کہ اگر یہ خدمات قابل قبول ہوں تو علاوہ ذاتی قدر دانی کے اسکی توسیع اشاعت میں بھی حتی الامکان امداد فرمائیں۔

خریداری کے لیے پیشگی قیمت آنا ضروری ہی۔ نمونہ مفت نہیں بھیجا جائیگا بلکہ چھ آنہ وصول ہونے یا ویلیو پے ایبل کی اجازت آنے پر ارسال ہوگا۔ نام اور پتہ صاف و خوشخط لکھا جائے تاکہ پرچہ پہنچنے میں دقت نہو۔ اگر ایک دو ماہ کے لئے پتہ تبدیل کرانا ہو تو مقامی ڈاکخانہ سے انتظام کر لینا چاہئے۔ اور اگر ہمیشہ یا زیادہ عرصہ کے لئے ضرورت ہو تو منیجر ادیب کو اطلاع دینا چاہیے۔

اس رسالہ میں مذہبی مباحث اور موجودہ پالیٹکس پر کوئی مضمون نہ چھاپا جائیگا۔ نا تمام مضامین بھی نہ لئے جائیں گے۔ جس مضمون کے ساتھ تصویر کی ضرورت ہو اسکا مضمون نگار حضرات خود بندوبست فرمائیں۔ اگر مضمون اور تصویر ساتھ نہ آئیگی تو مضمون شائع نہوگا۔ خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہوسکے گی۔ تمام خط و کتابت اس پتہ سے ہونا چاہئے۔ منیجر "ادیب" انڈین پریس الہ آباد

نومبر ۱۹۱۱ء

ادیب

جلد ۴ — نمبر ۵

فلسفۂ سیاست (۲)

حکومتوں کی مشترک خصوصیات

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ بنی نوع انسان مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے گروہ بنا کر رہتے ہیں یا بالفاظ دیگر حکومتوں میں منقسم ہیں لیکن کیا سب حکومتیں ایک ہی قسم کی ہیں؟ اور کیا آدمیوں کے ہر مجموعہ کو ہم حکومت کہہ سکتے ہیں؟ یورپ کے بعض علما حکومت کا اطلاق صرف اُنھیں حکومتوں کے لئے جائز اور مناسب سمجھتے ہیں جو یورپ میں اس وقت پائی جاتی ہیں یا یوروپی وضع کی اُن حکومتوں کے لئے جو دیگر حصص دنیا میں مثلاً امریکہ میں پائی جاتی ہیں۔ اُن کے نزدیک ایشیا کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو مثل یورپ کی حکومتوں کے متمدّن اور ترقی یافتہ نہیں ہیں حکومت کے پرمعنی اور موقر لفظ سے تعبیر کئے جانے کے لائق نہیں سمجھی جاتیں۔ یہ انسانی خاصہ ہے کہ جب وہ کسی بات پر غور کرتا ہے تو مقابلہ کے لئے ہمیشہ ایسی چیز اختیار کرتا ہے جو خود اُس کے گرد وپیش ہو۔ قدما کا بھی یہی حال تھا۔ ارسطو نے حکومت کا صحیح اور بہترین نمونہ شہری حکومت کو قرار دیا ہے۔ اُسکے زمانہ میں یونان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ہر شہر گویا کہ بطور خود ایک حکومت اور سلطنت کا درجہ رکھتا تھا۔ ایتھنس کو اسپارٹا سے وہی تعلق تھا جو آج جرمنی کو انگلستان سے ہے۔ ہر ایک شہر کی مجلس شوریٰ جدا تھی۔ فوجی انتظام علیحدہ، حکام بالکل مختلف، ایک شہر کی رعایا اپنے آپ کو دوسرے شہر کی رعایا سے علیحدہ اور اُن کے اغراض و مقاصد جُدا سمجھتی تھی۔ اور جسطرح آج بڑی بڑی سلطنتوں میں مقابلہ اور رقابت کی گرم بازاری ہے اُس زمانہ میں شہروں کے درمیان یہی کیفیت تھی۔ اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کا خیال ہر شہری حکومت کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھا۔ پس ارسطو نے شہری حکومت کو معیار مقرر کرکے ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کیا اور اسی لحاظ سے اُنکی تقسیم کی۔ ارسطو کا یہ بھی

خیال تھا کہ اعلیٰ ترین حکومت کو بہت بڑا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ کسی جمہوری حکومت میں صرف اسی قدر آدمی ہونے چاہئیں کہ مجلس شوریٰ میں سب کے سب ایک وقت میں جمع ہوسکیں تاکہ براہ راست تبادلۂ خیالات اور مباحثہ ہوسکے۔ لیکن یہ طریقہ استدلال صحیح نہیں ہے جب کوئی ماہر نباتات، عالم نباتات کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتا ہے تو وہ مجاز نہیں ہے کہ صرف خوشنما پودوں اور پھولوں کے درختوں ہی کو اپنی توجہ کا محتاج بنائے۔ برخلاف اس کے اُسے لازم ہے کہ جنگلی اور زہریلی گھاس تک جو نباتات کی تعریف میں آتی ہو تقسیم کرتے وقت پیش نظر رکھے۔

اس میں شک نہیں کہ یورپ اور امریکہ کی متمدن حکومتیں کے سامنے ایشیائی ریاستیں کیا بلحاظ قوت وعظمت کے اور کیا بلحاظ علمی تمدنی، و معاشرتی ترقی کے ایسا ہی درجہ رکھتی ہیں جیسا ذرہ سورج کے سامنے، لیکن پھر بھی ان سب میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جو متمدن یورپ کی بڑی سے بڑی حکومت میں۔ یہ صحیح ہے کہ مشترک خصوصیات نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہیں تاہم جس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ سب آدمی ایک جنس ہیں حالانکہ دنیا میں کوئی دو آدمی ایک قسم کے نہیں ہوتے۔ اسیطرح یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ ایک متمدن اور غیر ترقی یافتہ حکومت ایک ہی جنس میں داخل ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ جسطرح انسان باوجود ایک جنس ہونے کے جسمانی ساخت، آنکھ ناک کان۔ اعضاء کی قوت اور اخلاقی حالتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اسیطرح حکومتیں بھی باوجود خصوصیات مشترک رکھنے کے، اپنے قوانین، معیار ترقی، تہذیب و تمدن اقتصادی، علمی، اور اخلاقی ترقی، فوجی قوت وغیرہ کے لحاظ سے آپس میں فرق رکھتی ہیں۔

اگر ہم تاریخ کی سفحہ گردانی کریں اور مختلف حکومتوں کے حالات پر غور کریں تو ہماری نظر معاً ایسی خصوصیات پر جا پڑتی ہے جو تمام حکومتوں میں بلا استثناء مشترک پائی جاتی ہیں۔ بعض خصوصیات مثلاً رعایا کی اخلاقی مدارج ترقی وغیرہ پوشیدہ بھی رہ جاتی ہیں لیکن کسیقدر غور و تعمق کے بعد یہ مشکل بھی آسان ہوجاتی ہے۔ اور ہم مختلف نتائج پر غور کرکے اسباب کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ مجملاً حکومتوں کی مشترک خصوصیات حسب ذیل قرار دی جاسکتی ہیں:۔

(۱) جماعت | ظاہر ہے کہ سب سے بڑی ضرورت حکومت کے لئے افراد قوم کی ہے۔ ہر حکومت آدمیوں کی کسی جماعت پر مشتمل ہوتی ہے۔ جماعت کی تعداد کی البتہ کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ مختلف حکومتوں میں مختلف ہوتی ہے۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ لیکن جبتک کوئی جماعت خاندان کے محدود دائرہ میں رہتی ہے اُس پر حکومت کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ خاندانی رشتہ ٹوٹ کر فرقہ بندی اور قوم پرستی کی صورت پیدا ہوگئی ہو۔ ایک چھوٹا سا خاندان یا فرقہ مثل حضرت یعقوب کے خاندان کے جو یہودیوں کے مورث اعلیٰ ہیں کسی بڑی حکومت کا سنگ بنیاد ہوسکتا۔ لیکن اصل حکومت کا اطلاق اُسیوقت ہوسکے گا جب انسان رشتہ اور ناتہ کے تار پود سے بالکل آزاد ہوجائیں اور چھوٹے چھوٹے مختلف جرگوں اور فرقوں کی ایک برادری اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہوجائے بغیر کسی انسانی جماعت کے جو ایک خاص درجۂ ترقی و تہذیب پر پہنچکر نیشن یا قوم کہلاتا ہے کسی حکومت یا سلطنت کا وجود نہیں ہوسکتا۔

حکومت کی جماعت کی کوئی خاص تعداد معیّن نہیں ہے۔ ارسطو کا بیان ہے کہ " نہ تو حکومت میں صرف دس آدمی ہوسکتے ہیں اور

نہ ایک لاکھ" موسیو راسو مشہور فرانسیسی عالم کی متعینہ تعداد دس ہزار آدمیوں کی آج کل کسی طرح کافی نہیں ہوسکتی۔ از منہ متوسطہ میں اس قسم کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا قیام اطمینان و استحکام کے ساتھ ممکن تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ کا تقاضہ ہے کہ بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ فی زماننا ملکی فرائض کا دائرہ اسقدر وسیع ہوگیا ہے کہ اُن کی انجام دہی کے لئے بہت زیادہ بلکہ بے اندازہ قومی قوت و طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور کچھ اس وجہ سے کہ بڑی حکومتوں کی زبردست قوت چھوٹی حکومتوں کے لئے نہایت خطرہ و بے اطمینانی کا باعث ہوگئی ہے۔ چنانچہ اسوقت متمدن دنیا کی کوئی قوم تنہا رہنا خطرہ سے خالی نہیں سمجھتی دو دو بلکہ تین تین اقوام از روے معاہدہ ایک دوسرے کی امداد پر مجبور ہیں۔ روس و فرانس جرمنی کی بڑھتی ہوئی قوت سے مشوش ہو کر آپس میں متحد ہوگئے۔ جرمنی نے اسٹریا سے رشتہ اتحاد قائم کیا ہے۔ ٹرکی چھوٹی حکومت ہونے کی وجہ سے بڑی سلطنتوں کے طمع اور بغض و عداوت کا شکار بن رہا ہے۔ ابھی دو برس کی بات ہے کہ اسٹریا نے ٹرکی کے دو زرخیز صوبے ہڑپ کر لئے اور کمزور ٹرکی انگشت نارضامندی تک نہ اٹھا سکا۔ اب اٹلی جو جرمنی اور اسٹریا کے ساتھ متحد ہے سلطنت عثمانیہ کے صوبہ طرابلس کو ہضم کئے لیتا ہے۔

۲۔ معین حصہ ملک | کوئی حکومت محض جماعت انسانی سے حکومت نہیں کہلا سکتی۔ جب تک کہ کسی معین حصہ ملک پر اُسکا قبضہ مستقل طور پر نہ ہو۔ قوم اور ملک کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خانہ بدوش قومیں جو گروہ بنا کر دیس دیس پھرتی ہیں اگرچہ کسی سردار یا سرغنہ کی ماتحتی میں ہوتی ہیں اور بہ لحاظ رسم و رواج اور زبان آپسمیں متحد ہوتی ہیں۔ لیکن اُنکے نظام پر حکومت کا اطلاق نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ کسی حصہ زمین پر قابض نہ ہوں۔ یہودی اگرچہ باعتبار قوم اور زبان متحد تھے اور حضرت موسیٰ کے زیر نگیں ان میں ایک حد تک پولٹیکل خیالات سرایت کرگئے تھے لیکن جب تک یشوع نے فلسطین پر قبضہ نہ کیا اُن کی حکومت قائم نہ ہوئی۔ آج یہودی کثیر تعداد میں اقطاع عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اُنکے پاس دولت ہے، وجاہت ہے، اُنکا مذہبی اور قومی شعار بدستور قائم ہے لیکن بوجہ اس کے کہ اُنکے قبضہ میں زمین و ملک نہیں ہے اُنکی کوئی علیحدہ حکومت نہیں ہے حالانکہ ماننٹنگرو یا سرویا جنھیں دولتمند یہودی کھڑے کھڑے خرید سکتے ہیں۔ حکومت کہلانے کا امتیاز رکھتی ہیں۔

۳۔ عصبیت | جماعت اور قبضہ ملک کے علاوہ حکومت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جملہ افراد قوم آپسمیں متحد اور متفق ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ انتظامی آسانیوں یا پولٹیکل خیالات کے لحاظ سے باشندگان ملک ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں۔ مثلاً امریکہ چھوٹی چھوٹی بکثرت ریاستوں کا مجموعہ ہے۔ اندرونی نظم و نسق کے لحاظ سے یہ ریاستیں بالکل آزاد ہیں۔ یا انگلستان کی لبرل اور کنسرویٹیو پارٹیاں پولٹیکل خیالات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ لیکن یہ علیحدگی اندرونی نظم و نسق تک محدود ہے۔ بیرونی تعلقات کے لحاظ سے انگلستان ایک ہی حکومت متصور ہوتی ہے۔ پس جب تک کہ ملک کے مختلف حصے اور پارٹیاں بیرونی تعلقات کے لئے ایک قوت نہ بن جائیں کوئی قوم حکومت نہیں رکھ سکتی۔

۴۔ تفریق مابین حاکم و محکوم | ہر حکومت میں خواہ کسی قسم کی ہو حاکم و محکوم میں فرق پایا جاتا ہے۔ یہ فرق مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کا وجود حکومت کے بقا اور قیام کے لئے لازمی ہے۔ جمہوری حکومتوں میں مثلاً فرانس و امریکہ میں

پریسیڈنٹ اور مجلس شوریٰ کو حاکم اور عام رعایا کو محکوم سمجھا جاتا ہے کیونکہ جو احکام و قوانین پریسیڈنٹ یا مجالس کی منظوری سے جاری ہوتے ہیں انکی تعمیل ہر فرد بشر کو کرنا پڑتی ہے اسیطرح یونان کی جمہوری حکومت کے زمانہ میں ایتھنس کے باشندے مجموعۃً حکمران تھے۔ لیکن فرداً فرداً ہر باشندہ محکوم سمجھا جاتا تھا۔ جب کسی ملک میں یہ نوبت پہنچ جاتی ہے کہ ہر شخص اپنی ذات کو اپنے افعال کا مختار سمجھنے لگے اور حاکم و محکوم کا فرق اُٹھ جاتا ہے تو وہاں بدامنی اور غدر کی حالت ہوجاتی ہے۔ لیکن بہت جلد اس حالت کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور کوئی نہ کوئی قوت ایسی کھڑی ہوجاتی ہے جو حاکم کا درجہ اختیار کرتی ہے۔ خواہ یہ قوت خارجی ہو یعنی غیر قوم یا بیرونی یعنی خود اہل ملک میں سے کوئی بادشاہ بن بیٹھے یا کوئی حکمراں جماعت پیدا ہوجائے جس سے حاکم و محکوم کا فرق پھر قائم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ نظام سلطنت کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ تمام افرادِ ملک کسی حاکم اور کسی قانون کی پابندی کریں۔

ظفر عمر علیگ

ہکسلے کے خیالات

پروفیسر ٹامس ہنری ہکسلے انگلستان کا ایک نہایت مشہور سائنس داں اور چارلس ڈارون کا شاگرد رشید تھا۔ اصل یہ ہے کہ اس کے خیالات کی حمایت اور اُنکی اشاعت جتنی ہکسلے کی تحقیق لیکچروں اور کتابوں سے ہوئی تھی، شاید ہی کسی کی کوششوں سے ہوئی ہوگی۔ وہ ایک بڑا تیز فہم۔ ظریف طبع اور باریک بین محقق تھا۔ اگناشی سزم (Agnosticism) یعنی لاادریت کا موجد تھا۔ بلکہ اس لفظ کو پہلے پہل اسی نے استعمال کیا تھا اور پھر اسے اسقدر اشاعت نصیب ہوئی کہ یہ ایک علمی اصطلاح مقرر پاگیا۔ راقم کا ارادہ ہے کہ اس کے بیش قیمت خیالات کا انتخاب رسالہ ہذا کے معاونین کی نذر کیا جائے جس سے اُنکی دلچسپی میں اضافہ معقول ہونے کی امید لگانا فضول نہوگا۔

معرکۃ الآرا مسائل کے سُلجھاؤ کے لوازم

جو لوگ اُن عظیم مسائل کے سمجھنے یا حل کرنے کے خواہاں ہیں، جو چارلس ڈارون صاحب نے پہلے پہل ہمارے پیش نظر کئے۔ اُنکے لئے یہ لازم ہے کہ وہ اُن حقائق اور واقعات پر عبور حاصل کریں جو صاحب موصوف نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں بیان کئے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ وہ اُس طریقۂ تحقیق سے کام لیں جس کا انہوں نے اپنی زندگی کے دوران میں ایسا شاندار نمونہ قائم کیا تھا۔ ڈارون صاحب میں کون کون سی خوبیاں تھیں۔ وہ بڑے تیز فہم تھے۔ وہ حقائق کے علم کی تلاش میں رات دن غلطاں پیچاں رہتے تھے اور اُن کے کھوج میں کبھی تکان یا آلسی محسوس نہ کرتے تھے جب ایک امر کی صداقت آشکارا ہوجاتی تھی تو وہ اپنے پہلے خیال کو ترک کردیتے تھے۔ جب تک یہ خواص آپ کے اندر موجود نہونگے آپ کسی اصول اور مسلہ کو انتہا تک نہیں پہنچا سکتے۔ اور جس صورت میں ڈارون صاحب ممدوح نے ان مسائل کو پیش کیا ہے آیا وہ آخری ہے اور تمام حیص بیص اور تحقیق و تدقیق کے بعد بھی



مرحوم و مغفور مہاراجہ سر نریندر نارائن بھوپ بہادر، جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ سی۔ بی۔ والئی کوچ بہار

انڈین پریس الہ آباد

قائم رہے گی۔ سردست کوئی آدمی اسکی بابت کوئی خاص راے صحت کے ساتھ نہیں دے سکتا۔ مگر ایک امر بیّن ہے اور وہ یہ ہے کہ اُن کے طریقۂ تحقیق۔ اور عجیب وغریب استقلال عشق صداقت۔ علم معیّن کے حصول کے لئے سب خیالات ومقاصد قربان کرنے کی خواہش کی تقلید سے اُن سچّائیوں کے قریب تر پہنچ سکتے ہیں جن کے حصول اور تشریح اور اشاعت کے لئے اُنہوں نے اپنی جان لڑا دی[1] تھی۔

انیسویں صدی کی خصوصیت

میں خیال کرتا ہوں۔ انیسویں صدی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ علم کا اشتیاق بہت جلد پھیل گیا ہے۔ اور اسکا انجام یہ ہوا ہے کہ تمام مسائل کی چھان بین اور تحقیق وتدقیق میں جن سے عقل انسانی کو دو چار ہونا پڑتا ہے علمی طریقۂ تحقیق سے کام لیا جانے لگا ہے اور اس کے ساتھ ہی موروثی اور قومی عقائد اور خیالات جو جدید طریقۂ تحقیق کی تاب نہیں لا سکتے فرسودہ اور لغو ٹھہر کر متروک اور نسیان سپرد[2] ہوگئے ہیں۔

علم المعاشرت کا مفہوم اصلی

علم المعاشرت بھی ایک علم ہے اگر جائز و ناجائز استعمال سے یہ لفظ اسقدر ذلیل نہو گیا ہوتا تو اسے سیاسیات (Politics) کہنا بجا ہوتا۔ انسان خاص قسم کی ہستیاں ہیں وہ خاص خاص حالتوں میں ویسی ہی حرکتیں کرتے ہیں جیسے بے سہارے پتھر لڑھکتے اور بکھر جاتے ہیں۔ ان کی فطرت جن قوانین کے تابع کام کرتی ہے وہ ایسے ہی لازوال اور بے بدل ہیں جیسے قانون کشش۔

پولیٹکل اکانومی کے ماہروں اور محققوں نے محقق طبعیات کی طرح سیدھا راستہ پکڑ لیا ہے۔ یعنی وہ انسان کی حرکت کی علت اولیٰ کے نتائج کا کھوج کرنے کے درپے رہتے ہیں اسکی بنا پر اجتماع زر کی خواہش بے روک اور سرکش معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ یا اور لوگ یہ امر بھول جائیں کہ اور زبردست اسباب بھی اس خواہش کے پورا کرنے میں مانع آ سکتے ہیں۔ تو یہ جدید طریقۂ تحقیق کا قصور نہیں ہے بلکہ انکی اپنی کوتاہ بینی اور بیوقوفی اسکی ذمہ دار ہے۔

ہائیڈرو اسٹیٹکس (Hydrostatics) یعنی علم مائعات اس وجہ سے "چھوٹا علم" نہیں ٹھہر سکتا کہ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف نہیں بہتا ہے۔ مثلاً آدھی بوتل میں پانی بھر کے اُسے اوندھا کردو اگر ڈاٹ ہوگا تو وہ کبھی نہیں گرے گا۔

جو کچھ پولیٹکل اکانومی والے کر رہے ہیں ویسے ہی اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک گروہ اہل تحقیق کا اخلاق کی طرف بھی رجوع ہو۔ سب سے پہلے اس مسئلہ کو سلجھاوے کہ خاص اغراض کے بے روک ٹوک اظہار کے وقت کیا ہوگا۔ اور "فرض" یا "واجب" کا مسئلہ بعدازاں حل ہو جائے گا۔ کیونکہ جو کچھ کرنا واجب ہے عوام کی ایک کثیر تعداد اسیطرح کرے گی گویا کہ بعض منفی اور مثبت یعنی مفید ومضر خوشیاں طرز عمل کی علت غائی بنجاتی ہیں ہم علم یوبیوٹکس (Eubiotics) سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہم کو صاف صاف بتائے کہ اگر تمام انسانوں کی طرز عمل فلاح یا نفع ذاتی (جیسا عامیانہ معنی میں سمجھا جاتا ہے) کی غرض سے تحریک پاے تو اس کا کیا انجام ہوگا۔ یوٹیلیٹیرین[3] (Utilitarian) فرقہ کے عالموں نے ایک ایسے علم کی بنیاد ڈالدی یعنی فلاح کی خواہش اجتماع زر کی خواہش سے کسی طرح

---

[1] "لائف اینڈ لیٹرس" جلد سوم صفحہ ۳۵۶ [2] ایضاً صفحہ ۳۲۲ [3] پر مارتھ یا فلاح عامۂ خلائق کا اخلاقی اصول یعنی اس عقیدہ کے حامی کہتے ہیں کہ بنی آدم کی خدمت گزاری انسان کی زندگی کا مقصد اولیٰ ہونا چاہئے۔

بہتر نہیں ہے۔ لیکن اگر اس عجیب دنیا اور اس زندگی کا مقصد اسی کا حصول ہو تو اسے آزمانا چاہیے اور اس کے لئے کوشش کرنا واجب ہے۔[1]

لشکر آرائی کی ترقی کا سبب

یورپین سلطنتیں دن بدن لشکر اور فوجی سامان بڑھاتی چلی جاتی ہیں اس سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں ان کے بارے میں مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے۔ میری رائے میں ایکی وسیع اصلی تمدنی قوتوں کا اظہار ہے جن کا عمل اور ظہور سلطنتوں کی قرارداد باہمی سے خاطر خواہ اثر نہیں حاصل کر سکتا میں خیال کرتا ہوں لشکر آرائی کی ترقی کو "جنگ طلبی اور جنگجوئی کے میلان" وزرا فردوں سے منسوب کرنا غلطی ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ بین الاقوام تجارت و صنعت کے سبب سے فوجیں بڑھانا پڑتی ہیں تو قدرے درست اور راستی کے قریب ہوگا۔ اس میں اہل فرانس کی انتقام خواہی۔ اور اہل جرمنی و اہل اٹلی کی قومی اتحاد و قوت کے اظہار کی مبنی برحق خواہش بھی شامل کرنا چاہیے روسیوں کے سر پر یہ بھوت سوار ہے کہ سلیو (Slav) نسل کے جہاز مغربی سمندروں میں بے روک ٹوک چلتے رہیں۔ اور تقدس مآب حضرت پوپ اپنا دینی اور دنیاوی رسوخ و اقتدار بحال کرنے کی فکر میں سرگرداں ہیں۔ اور "مریض یورپ" (ترکی) اس وجہ سے زندہ ہے کہ اس کے معالج یہ سمجھ رہے ہیں کہ کہیں دوسرا ڈاکٹر اسکی جائداد کا وارث نہ بن جائے۔ یہ اسباب ہیں یورپ کی قوموں کے ہر سال جنگ آزمائی کی تیاری کرنے کے جب میں ان فتنہ خیز اور شر انگیز اسباب پر غور کرتا ہوں جو فی زمانہ یورپ کے تمدن کے شیرازہ کو درہم برہم کرنے میں لگے رہتے ہیں تو مجھے صاف صاف سوجھتا ہے کہ سلطنتوں کے فوجی اخراجات کے تعین کی تجویز بالکل لچر اور بے سود ہے۔ کیونکہ اس سے جمہور کے دلوں میں یہ گمان پیدا ہو سکتا ہے کہ حکومتوں کی خواہش پر یورپ کا امن اور جنگ منحصر ہے۔[2]

تحقیق سائنس میں کامیاب ہونے کی شرط

سائنس کا جو شعبہ چاہو تحقیق کے واسطے منتخب کرو۔ مگر اس میں کامیاب ہونے کے لئے تین چیزوں کی اشد ضرورت ہے یعنی غیر معمولی تربیت۔ محنت پسندی اور اشتیاق تجسس۔ اگر شوق ہے تو دن بھر کے کاروبار کے بعد تمہیں کافی مہلت مل سکتی ہے جسے تم سائنس کی تحقیق میں صرف کر سکتے ہو۔ اگر اس جوش دماغی کی کوتاہی ہے تو تمہارے لئے بہتر ہے کہ لین دین اور خرید و فروخت میں لگے رہو۔ تم قوم اور ملک کی اس حالت ہی میں عمدہ خدمت انجام دے سکتے ہو جب تم اپنی قابلیت اور اپنی میلان طبیعت کے مطابق جوش اور سرگرمی سے کوئی علم حاصل کرنے کے درپے ہو جاتے ہو۔[3]

قدیم و جدید طریقہ تعلیم

قرون وسطیٰ اور زمانۂ حال کی تعلیم اعلیٰ میں جو یہ تفاوت معلوم ہوتا ہے کہ اوّل الذکر کی نگاہ ماضی کی طرف رہتی اور کتابوں سے علم سکھایا جاتا تھا آج کل اس کے برعکس ہے یعنی آگے کا خیال رہتا ہے اور موجودات کا علم بتایا جاتا ہے ازمنہ وسطیٰ کے اہل الرائے کا یہ خیال تھا کہ جتنا علم ہے وہ قدما ہی کی تصانیف میں بھرا پڑا ہے۔ یعنی دینی کتب بڑے بڑے یونانی حکما اور ابتدائی صدیوں کے مسیحی علما کی کتابوں ہی تک محدود سمجھا جاتا تھا۔ البتہ اتنی خصوصیت ان کے طریقۂ تعلیم میں ضرور تھی کہ اہل سلف کی کتابوں سے واقعات اور معلومات اخذ کرکے اُن پر استدلال کرتے اور انوکھے ڈھنگ سے استخراج نتائج کیا جاتا تھا۔

مگر طریقۂ جدید یہ ہے کہ زندگی کے حقائق کی تصدیق علمی طریق تحقیق سے کیجاتی ہے اور اسیطرح علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اسکے سوا اور کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ دوسرے اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ تحقیق طلب واقعات حقائق معتد قرار

[1] جلد سوم صفحہ ۲۳۰، [2] جلد سوم صفحہ ۳۲۲ [3] ایضاً صفحہ ۲۴۵۔

علوم سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور اُستاد کا فرض ہو کہ وہ اپنے طلبا میں نئے طور پر تحقیق کر کے نئی بات پیدا کرنے کا مادّہ پیدا کرے۔ اس اعتبار سے یونیورسٹی کا کام اور رتبہ اُن علوم گاہوں سے بالکل جُدا اور علیحدہ ہے جن میں ٹیکنکل تعلیم مثلاً الہیات قانون اور طبّیات دی جاتی ہے اور یونیورسٹی کا مقصود اولیٰ یہ نہیں ہے کہ اُستادوں کے کام کی خوبی کا موازنہ کرے۔ یا یہ قرار دے کہ کون کون سے طلبا پادری اور ڈاکٹر اور وکیل بننے کے قابل ہیں۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ سائنس یا فنون کے شائقین کی تعلیم کا ایسے اُستادوں کے ذریعہ سے بندوبست کرے جو یہ سکھائیں کہ موجودات میں کیا معلوم ہو چکا ہے اور انہیں نامعلوم باتوں کے دریافت کرنے کا ڈھنگ بتایا جائے۔

قادر علی الاطلاق کا مسئلہ اگر قادر علی الاطلاق کا یہ مفہوم لیا جائے کہ کائنات کا ادنیٰ ترین گوشہ بھی اتفاق کے تابع نہیں ہے۔ یا اگر اس کے یہ معنی ہوں کہ عمل عالم یعنی قانون قدرت عقل کی تحریک سے معرا نہیں ہے۔ یا اگر اس کا یہ مطلب ہو کہ ابتدائے آفرینش سے عالم کے اندر قاعدہ کی مسلسل حکومت قائم چلی جاتی ہے تو میری رائے میں یہ مسئلہ نہ صرف قبول کرنے ہی کے قابل ہے بلکہ میرے نزدیک صداقتوں کی سرتاج سچائی ہے جیسے ہر شہری کے واسطے تمام قوانین مروّجہ سے واقف ہونا اہل انصاف اور اہل عمل کی شکل و صورت کی واقفیت سے زیادہ ضروری ہے اسیطرح واجب الوجود کا مسئلہ جیسا میں نے بیان کیا ہے تھیالوجی (الہیات قیاسی) کے تمام مسائل سے کہیں بڑھکر ضروری ہے علاوہ بریں اگر قادر علی الاطلاق کے مسئلہ سے یہ مراد لی جائے کہ نہایت ہی دور افتادہ زمانہ یعنی ابتدائے زمان میں ایک وجود ذی عقل نے عمل عالم یا سنسار گتی (Cosmic Process) کو تحریک دی تھی یعنی جس میں ہماری ایسی عقل اور دوربینی تھی اور اُس کے ساتھ ہی یہ بھی مانا جائے کہ اسے نہ صرف ہماری ننھی سی دنیا ہی کے ہر واقعہ کا علم ہے بلکہ عالم بالا کی بیشمار دنیاؤں کے ذرا ذرا حالات سے اُن کے وجود میں آنے سے سنکھوں سال پیشتر واقف تھا تو سائنس جہانتک مجھے معلوم ہے اس مسئلہ کے برخلاف کچھ بھی کہنے کو تیار نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ مسئلۂ ارتقا کو شخصیت دی گئی ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو۔ لیکن جو واقعات معلوم ہو چکے ہیں انکی بنا پر میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ نہ تو قادر علی الاطلاق کو تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ اُس سے انکار ہو سکتا ہے۔

جے۔ آر۔ رلے

میگھ ناد کا یگیہ ۔ اس ماہ کی رنگین تصویر جو انڈین پریس کے ایک مصوّر کی صنّاعی کا نمونہ ہی بالمیکی راماین سے تعلّق رکھتی ہی۔ میگھ ناد آتش پرست شخص تھا۔ ذکر ہے کہ فتح کی خواہش سے وہ رات کے وقت یگیہ کرنے لگا تاکہ اُس کا دیوتا اُس سے خوش ہو جاے وہ یگیہ کر ہی رہا تھا کہ بھبیشن کو یہ راز معلوم ہو گیا۔ بھبیشن واقف تھا کہ اگر یگیہ بغیر شر و فساد کے پورا ہو گیا تو میگھ ناد کسی کے مارے نہ مر سکے گا۔ لہذا لکشمن جی کو ہمراہ لیکر وہاں پہنچا۔ بھبیشن خود تو دروازے پر کھڑا رہا اور لکشمن جی اندر میگھ ناد کے پاس پہنچے۔ میگھ ناد نے دریافت کیا تم کون ہو؟ کیا تم میرے اگنی دیوتا ہو؟ لکشمن جی نے جواب دیا نہیں۔ میں تیرے حق میں ملک الموت ہوں، اور تیری روح قبض کرنے آیا ہوں۔ میگھ ناد نے غضب میں آکر ایک گدا پھینک مارا جس کے لگتے ہی لکشمن جی بیہوش ہو کر گر پڑے۔ اس کے بعد وہ بھبیشن کی طرف مخاطب ہوا اور بہت سخت سست کہا۔ جب لکشمن جی کے ہوش و حواس درست ہوئے تو انہوں نے میگھ ناد کو مار ڈالا۔ یہ اس تصویر کی مختصر کیفیت ہی۔

لازوال خوشی

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ہر شخص اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ مجھے سچی خوشی حاصل ہو لیکن ہنسی کی بات یہ ہے کہ خوشی اُن لوگوں سے دور بھاگتی ہے جو اس کے دل و جان سے طالب ہیں۔ غریب سمجھتا ہے کہ خوشی دولت مند ہونے میں ہے دولتمند کا گمان ہے کہ خوشی خطابوں کے حاصل کرنے میں ہے۔ خوشی نہ یہ ہے اور نہ وہ۔ اگر یہ کلیہ قاعدہ ہو کہ خوش وہی ہوگا جو دولتمند ہو۔ تو لازمی امر یہی ہے کہ ہر دولت مند خوش نظر آئے لیکن ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر بہتیرے دولتمند ہمیشہ رنجیدہ نظر آتے ہیں اگر بیرونی اشیا کے حاصل ہونے میں خوشی ہوتی اور بیرونی اشیا سے محروم رہنا رنج و کلفت کا باعث ہوتا تو ہمیشہ غریب مسکین لوگ مصیبت زدہ دکھائی دیتے اور امیر خوشی و بہجت سے بھرپور نظر آتے لیکن عام طور پر معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ نہایت ہی مغموم آفت کے مارے بعض وہی لوگ ہیں جو چاروں طرف سے دولت ثروت اور عیش و عشرت کے سامانوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ اور بعض خوشی سے منور چہرے وہی نظر آتے ہیں جنکو ضروریات زندگی بھی نصیب نہیں۔ بعض امیروں نے ہمسے کہا ہے کہ دولت مند ہو کر خود غرضانہ سُکھ بھوگتے بھوگتے وہ دُکھی ہوگئے ہیں زندگی اُن کے لئے مزے کی نہیں رہی ہے اور اب وہ ایسے خوش نہیں ہیں جیسے وہ غریبی کی حالت میں تھے۔

تو پھر خوشی مسرت اور انبساط کیا ہے؟ یہ کیونکر حاصل ہو سکتی ہے؟ کیا خوشی محض خیال ہی خیال ہے؟ کیا خوشی دنیا میں کوئی چیز نہیں؟ کیا دُنیا میں تکلیفیں اور مصیبتیں ہی ہیں؟

اس باب میں دانا لوگوں کا کیا خیال ہے؟ اُس کے ذکر کرنے سے اس جگہ کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ بتانا یہ ہے کہ عام لوگ مسرت و شادمانی کا معیار کس کو قرار دیتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ مسرت اُسکو نصیب ہوتی ہے جس کی خواہش پوری ہو جائے۔ دلی مراد بر آئے۔ یہ گمان ہے جسکا بیج نادانی کی زمین میں بویا گیا ہے اور خود غرضی کے پانی سے شاداب کیا گیا ہے۔ پھل کیا ہوگا؟ مصیبت!! تم خواہش کے خانماں کو تباہ کردو خود غرضی کی بودی عمارت کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکو۔ دولت اپنے آرام کے لئے اکٹھی نہ کرو بلکہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے کماؤ۔ اس لئے نہیں کہ خود کھاؤ بلکہ اس لئے کہ اوروں کو کھلاؤ پھر دیکھو کہ تم خوش ہو یا رنجیدہ۔ پھر غور کرو کہ دراصل تمہیں خوشی نصیب ہوئی ہے یا نہیں۔ بعض لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خود غرضی مصیبت کا باعث ہے لیکن وہ یہ نہیں مانتے کہ اُن کی اپنی خود غرضی مصیبت کا باعث ہے بلکہ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دوسروں کی خود غرضی ہمارے لئے آفت کا سبب ہوئی ہے۔ اگر تم یہ مانو کہ تمہاری ہی خود غرضی تمہارے لئے تباہی کا سبب ہوئی ہے تو تم حقیقی خوشی کے دروازے کے قریب پہنچ جاؤ گے لیکن جب تک تمہارے دماغ میں یہ سمائی ہوئی ہے اور تمہارے دل میں یہ بسی ہوئی ہے کہ دوسروں کی خود غرضی نے تمہاری خوشی کو پامال کیا ہے اس وقت تک تم کبھی خوشی کا منہ نہیں دیکھ سکتے بلکہ روز بروز تمہاری مصیبتوں کے بادل گھرے ہوتے جائیں گے۔

خوشی دل کی شانتی میں ہے۔ آنند من کے ستھر (قائم) رکھنے میں ہے۔ جو شخص خواہشوں کا شکار ہے وہ ہرگز خوش نہیں رہ سکتا۔



مہارانی کوچ دہار (دختر مہاتما کیشب چندر سین)

اُس کا سدا یہی حال رہتا ہے کہ جب اُسکی ایک خواہش پوری ہوجاتی ہے تو وہ دوسری خواہش کی تکمیل کی فکر میں ہوتا ہے جب دوسری بھی پوری ہوجاتی ہے تو تیسری کی فکر میں ہوتا ہے اسیطرح خواہشوں کا تانتا ختم نہیں ہونے پاتا اور بیچارے خواہشات کے مغلوب شخص کی پریشانی روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ وہ باولے کتے کی طرح مختلف خواہشوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔ رستے میں جو کوئی حائل ہوتا ہے وہ اس کو مار گراتا ہے۔ خواہ وہ دوست ہو یا رفیق۔ زن ہو یا فرزند۔ بھائی ہو یا بھتیجا۔ جو کوئی بھی اسکی خودغرضانہ خواہش کے پورا ہونے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے وہ اُسکو ہی دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیتا ہے۔ خواہش ایک بے تھاہ سمندر ہے جسکی گہرائی کو کوئی نہ جانچ سکا۔ خواہش وہ بھوت ہے کہ ایک دفعہ جس کے سر چڑھا۔ بس چڑھا۔ پھر کبھی اترنے کا نام نہیں لیتا۔ خواہش نرک (دوزخ) ہے جس میں انواع واقسام کی تکالیف کا ہجوم ہے۔ خواہش کو چھوڑ دو اور سورگ (بہشت) کو حاصل کرو۔ اصلی خوشی کا حظ اٹھاؤ۔

نرک (دوزخ) بھی تمہارے دل ہی میں ہے۔ اور سورگ (بہشت) بھی تمہارے دل ہی میں۔ اگر خودی اور خودغرضی کا خیال دل میں سمایا ہوا ہے تو سمجھو کہ تم نرک میں ڈوب گئے۔ خودی کو چھوڑ دو۔ خودغرضی سے کنارہ کش ہو۔ اپنے اوپر وہ حالت طاری کرو جسمیں انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ جب تک تمہیں اپنے ذاتی مفاد مدنظر ہیں۔ اُس وقت تک خوشی پر نہیں مار سکتی۔ بلکہ اسطرح تم اپنے لئے بدنصیبی کے بیج بوتے جاؤ گے۔ اگر تم اپنے آپ کو دوسروں کی خدمت میں غرق کر دوگے تو تمہیں اصلی خوشی نصیب ہوگی اور مسرت اور انبساط کا پھل چکھو گے۔ خوشی محبت کرنے میں ہے محبوب بننے میں نہیں۔ خوشی خیرات دینے میں ہے، خیرات لینے میں نہیں۔ خوشی پنکھے کے نیچے ٹھنڈی ہوا میں سونے میں نہیں ہے بلکہ ایک خانماں خراب یتیم بیچارے کی گریہ وزاری سنکر مدد دینے اور سہلانے کرنے میں ہے۔ خوشی مصیبت زدوں کی خاطر پسینہ بہانے میں ہے، آرام سے سونے میں نہیں۔

خودی میں پھنسے ہوئے ہو تو سمجھ لو کہ رنج کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہو۔ خودی کو چھوڑ دو، اور شانتی کو آغوش میں لو۔ اطمینان قلب اُسوقت ہی حاصل ہو سکتا ہے جبکہ تمہاری خواہشیں تمہارے بس میں ہیں۔ خودغرضانہ خواہش نہ صرف خوشی کو ہی برباد کرتی ہے بلکہ خوشی کے تمام ذرائع کو بھی تباہ کر دیتی ہے دیکھو جو لوگ زبان کے ذائقے میں پھنسے ہوئے ہیں وہ نت نئے لذیذ کھانوں کی فکر کرتے ہیں۔ تاکہ لذیذ کھانوں کے لالچ میں بھوک خوب لگے۔ لیکن اصل میں نتیجہ برعکس ہوتا ہے۔ لذیذ کھانا کھانے والوں کی بھوک مرجاتی ہے۔ انجام کار لذیذ سے لذیذ کھانا بھی اُنکو اچھا نہیں لگتا۔ وہ اکثر روز مرہ ہی بیمار رہتے ہیں، اور بدہضمی کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ اچھا۔ اب ان لوگوں کو دیکھو جو اپنی بھوک پر قابو رکھتے ہیں اور کبھی لذیذ کھانوں کا خیال تک دل میں پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اُن کو نہایت ادنیٰ درجہ کے کھانوں میں بھی خوشی محسوس ہوتی ہے کبھی تم نے اپنے نوکر کو جو کی روٹی شوق سے کھاتے ہوئے دیکھا ہے؟ اگر دیکھا ہے تو ضرور تم میرے قول کی تصدیق کرو گے۔ سچ تو یہ ہے کہ جسکو اپنی جان کے بچانے کی فکر ہر وقت دامنگیر رہتی ہے وہ جان سے جاتا ہے، اور جس کو اپنی جان کا خوف نہیں وہ عمر دراز تک زندہ صحیح وسالم رہتا ہے۔

لازوال خوشی اُسکو نصیب ہوتی ہے جو خوشی کی خودغرضانہ خواہش کا پیچھا نہیں کرتا۔ بلکہ اُس کو چھوڑ بیٹھتا ہے جس چیز کو ایک دن ہاتھ سے جانا ہے اُس کو تم ہی پہلے سے کیوں نہ چھوڑ بیٹھو۔

جس عزیز چیز کے بے وقت چھن جانے سے تمکو رنج ہوگا اسکو اگر تم خود ہی دے دو تو خوشی ہوگی۔ اپنی عزیز چیزیں مستحقین کو دو یا خود نقصان اٹھاؤ اور دوسروں کو فائدہ پہنچاؤ۔ نتیجہ کیا ہوگا۔ یہی کہ تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ تم امر ہو جاؤ گے۔ تمہارا نام جہان میں ابدالآباد تک باقی رہے گا۔ تمہیں لازوال خوشی نصیب ہوگی۔

کیا تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ اصلی خوشی نیکی کرنے میں ہے یا اپنے ساتھ نیکی کرانے میں؟ نہیں سوچا ہو تو اب سوچو اور سوچو ہی نہیں بلکہ نیکی کرکے دیکھو۔ اب خود اپنے دل میں اندازہ لگاؤ کہ تم کو نیکی کرکے خوشی حاصل ہوئی ہے یا اپنے ساتھ نیکی کرا کے خوشی ہوتی ہے؟ جواب یہی دینا پڑے گا کہ خوشی نیکی کرنے میں ہی ہے۔ خوشی روپیہ لینے سے نہیں ہوتی بلکہ محتاجوں غریبوں مسکینوں کو روپیہ دینے سے ہوتی ہے۔ خوشی خدمت کرانے میں نہیں ہے بلکہ خدمت کرنے میں ہے۔ خوشی قربانی کرانے میں نہیں ہے بلکہ خود اپنی قربانی کرنے میں ہے۔

تم خام خیالی سے لازوال خوشی اُن چیزوں میں ڈھونڈتے ہو جو خود لازوال نہیں۔ جو جلدی تباہ ہو جانے والی ہیں۔ جو بہت جلدی ہی خراب ہو جاتی ہیں۔ ان خراب ہو جانے والی جلد مر جانے والی اشیا پر مفتوں نہ ہو بلکہ شیدا بنو تو ایسی چیز کے جو لازوال ہو۔ پس زوال یافتہ چیزوں کا دھیان چھوڑ دو اور "لازوال" سے ناتہ جوڑو جیسے جیسے تم اپنی خودی کو کچلتے جاؤ گے اور پاکبازی ایثار نفسی اور عوام الناس کے ساتھ محبت کا جذبہ بڑھاتے جاؤ گے ویسے ہی ویسے تم وہ خوشی حاصل کرتے چلے جاؤ گے جو لازوال ہے۔ اور جو کبھی تمسے جدا نہیں ہو سکتی۔

جس شخص کا دل دوسروں کی محبت میں ایسا غرق ہے کہ اپنے آپے کو بھول گیا ہے اور اپنے فوائد کو خیرباد کہہ چکا ہے۔ وہ مبارک شخص لازوال خوشی کا ہی بھاگی نہیں ہوتا بلکہ اسکو ایشوریہ گیان (معرفت الٰہی) بھی ہو جاتا ہے۔ اپنی گذری ہوئی عمر کے واقعات پر ذرا لمحہ بھر غور کرو۔ تم دیکھو گے کہ تمہیں انتہا درجہ کی خوشی اُسوقت ہی ہوئی ہے جبکہ تم کسی کے ساتھ مہربانی سے بولے ہو یا تمنے کسی دکھی شخص کو دیکھکر ترس کھا کر اُسکو دکھ سے نجات دی ہو۔

اگر تم اپنی غیر مستقل خودی کو چھوڑ دو جو تمسے ہر وقت یہی کہتی رہتی ہے کہ جا بیجا طور پر اپنے فائدے کے متلاشی رہو تو تم فرشتوں کی قطار میں جا کھڑے ہو گے۔

اگر سورگ (بہشت) میں داخل ہونے کے خواہشمند ہو تو ہماری بات سنو اور سنو ہی نہیں بلکہ اس پر عمل بھی کرو۔ تم سب سے پہلے دوسروں کی نسبت اپنے خیالات کو درست کرو۔ پھر اگر کسی سے بولو تو بڑی مہربانی سے بولو۔ اور کام کرو تو ہمیشہ بھلائی کا کرو۔ اسطرح تم ایک دن بہشت میں داخل ہو سکتے ہو۔ بہشت کسی اور جگہ نہیں ہے بلکہ اسی جگہ ہے۔ یہ اُس شخص کی جاگیر ہے جو عادتاً خود فراموش ہے۔ یہ اُسکو ہی نصیب ہوتا ہے جسکا دل بغض کینے عداوت وغیرہ کی آلائش سے پاک ہے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ دینے سے خوشی ہوتی ہے لینے سے نہیں لیکن یہ خیال رہے کہ اگر کوئی چیز دیکر تم اس بات پر آزردہ ہو کہ لینے والا تمہارا مشکور نہیں ہوا یا اُس نے تم سے چاپلوسی کی باتیں نہیں کیں یا تمہارا نام اخبار میں لکھوا کر چار دانگ عالم میں مشہور نہیں کیا۔ تو سمجھ لو کہ تم نے جو کچھ دیا تھا اُسکی تہ میں خود پسندی تھی، محبت نہیں! تمنے اسلئے دیا تھا کہ معاوضے میں کچھ لو۔ یہ دینا نہیں کہلاتا۔ بلکہ دوسرے سے چھیننا کہلاتا ہے!!!

یہ آخری الفاظ یاد رکھو اور دل پر نقش کر لو کہ تم اوروں کی خیرخواہی میں اپنے آپکو مٹا دو جو کچھ کرو کرتے ہوئے انانیت کا خیال نہ آنے دو۔ لازوال اور اصلی خوشی کا پوشیدہ راز یہی ہے۔ ہمیشہ محتاط رہو اور خودی کا دخل دلمیں نہ ہونے دو۔ ایثار نفسی اپنا اصول بناؤ۔ پس تم اعلیٰ درجہ کی خوشی کی چوٹی پر پہنچ جاؤ گے۔ وہ خوشی ایسی ہوگی جسپر غم و اندوہ کا بادل نہیں چھا سکتا۔ اور تم ایسی خوشی میں رہ کر "لازوال آتما" بن سکتے ہو۔

ڈپٹی لال نگم

شاہنامہ فردوسی طوسی

مشہور بات ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے حکیم فردوسی سے شاہنامہ مرتّب کرایا اور بوجوہات چند اُسکو دل شکستہ کردیا- ان امور کی تفصیل یہاں بیان کرنا فضول ہے- ہمکو صرف شاہ نامہ کی تاریخ لکھنی ہے-

سلطان محمود کے انتقال کے بعد غزنی میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اُٹھی اور ایسی حالت میں کیسے ممکن تھا کہ فردوسی کی جاں کاہی اور سلطان کے شوق کا نتیجہ شاہ نامہ سلامت رہ جاتا- چنانچہ اسی بنا پر علامہ لطف علی خاں آذر نے اپنے آتشکدۂ آذر میں لکھدیا-

"حالا نمی تواں گفت کہ دریں کتاب شعرے از فردوسی باقی ماندہ بازانچہ ماندہ بمقابل اشعار فصیح بلغار و افکار بلیغ فصحا در ہر باب شعر خوب و سخن مرغوب دارد" علامہ ممدوح کی اس تحریر سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اُس کے وقت میں شاہ نامہ کے اشعار ایسے خلط مبحث ہوگئے تھے کہ اصل کو نقل سے جدا کرنا مشکل ہوگیا تھا-

ایک وقت میں اہل ایران کو تدوین شاہنامہ کی جانب خیال ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سی جلدیں مرتّب ہوگئیں- مگر کسی میں کچھ کم تھا اور کسی میں زیادہ- اب ہم بتلانا چاہتے ہیں کہ شاہنامہ کی کامل ترتیب کا سہرا کس کے سر رہا اور موجودہ شاہنامہ کی تدوین کیسے ہوئی-

بعہد شاہ عالم دہلی میں کوشش کی گئی تھی کہ جس قدر نسخے موجود ہیں سب کو جمع کرکے ایک عمدہ اور صحیح نسخہ مرتّب کردیا جائے مگر عبد القادر خاں روہیلہ کی شورش اور چند اسباب سے یہ امر معرضِ التوا میں رہا- قسّام ازل نے اسکا شرف سلطان نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کی قسمت میں لکھا تھا- اُس نے خود ہی ارادہ کیا اور وہ ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا- ذیل میں اُن تمام نسخوں کی تفصیل درج ہے جو شاہ اودھ نے فراہم کرکے ایک نسخہ (موجودہ شاہنامہ) مرتّب کیا-

پہلا نسخہ مولانا عبد الرحیم بن مولانا عبد اللہ القریشی کا لکھا ہوا ۱۲۰۱ھ کا دستیاب ہوا- یہ ایرانی خط میں تحریر تھا اور اس میں ۵۱۲۴۴ اشعار تھے- نہایت صحیح- عمدہ اور مطلّا تھا-

دوسرا نسخہ- ایرانی خط میں نہایت عمدہ اور صحیح لکھا ہوا محمد حافظ رہتکی کے قلم کا- اس میں اشعار کی تعداد ۴۷۵۲۰ تھی اور سال رقم ۸۲۰ ہجری تھا-

تیسرا نسخہ نجد میں بخط نسخ لکھا گیا تھا- یہ بھی صحیح اور خوش خط تھا اشعار کی تعداد ۵۰۵۰۰ تھی اور سال رقم ۸۳۸ ہجری-

چوتھا نسخہ خطِ نستعلیق نسخ نما میں ایران کا لکھا ہوا تھا- صحت کے اعتبار سے غیر درست اور کل اشعار ۵۶۶۵۰ تھے- سال رقم ۸۴۸ ہجری-

یہ چاروں نسخے آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے سلطان نصیر الدین حیدر کو ارسال کئے تھے-

ایک نسخہ سید التفات حسین خاں صاحب کا جمع کیا ہوا دستیاب ہوا- اس کا کاتب حاجی علی شیرازی المخاطب بہ کاتب مسجل تھا- یہ سب سے زیادہ صحیح اور مستند تھا- خط لاجواب اور نہایت عمدہ مینا کاری ہر صفحہ پر تھی- شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی مہر تھی- اور اشعار تعداد میں ۵۲۱۳۳ و سال رقم ۱۰۹۹ھ تھا-

ایک نسخہ مسٹر ریکس نے نذر کیا تھا۔ یہ بھی ایرانی خط میں تحریر تھا اور اسکا کاتب عبدالصمد بن علی محمد الحسینی ایک مشہور ایرانی تھا۔ ہر طرح صحیح اور قابل اعتبار تھا۔ اشعار کی تعداد ۴۶۹۸۲ اور سال رقم ۸۸۵ھ۔

دو نسخے منتظم الدولہ نے بھیجے تھے۔ ایک ان میں سے نہایت صحیح اور خوشخط نستعلیق میں لکھا ہوا۔ اور دوسرا متوسط درجہ کا تھا۔ پہلے میں ۵۵۰۹۲ اور دوسرے میں غالباً ۵۵۰۰۰ اشعار تھے۔

ایک نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ سے آیا۔ اس کا خط نہایت عمدہ اور طلائی کام تھا۔ نظام بن محمد شیرازی کاتب اور سنہ رقم ۸۹۹ھ تھا۔ ۵۱۱۳۳ اشعار تھے۔

ایک نسخہ مدلین صاحب نے بھیجا تھا۔ اس کا کاتب ابن حسن نور الدین اصفہانی تھا۔ کتابت و صحت میں متوسط۔ اس میں ۵۲۹۱۱ اشعار تھے۔ اور ۸۸۱ھ میں لکھا گیا تھا۔

ایک نسخہ راپسن صاحب نے بھیجا تھا۔ اس کا کاتب عبدالکریم بن عبدالنبی جونپوری تھا۔ کتابت و صحت دونوں عمدہ تھیں۔ سال رقم ۱۰۲۰ھ تھا۔

ایک نسخہ لیمر صاحب کے پاس سے آیا تھا مگر اس میں ایک لاکھ اشعار شروع کے گشتاسپ نامہ اسدی کے اور دوسری داستانیں فردوسی کی تھیں۔ خط بہت اچھا اور طلاکاری خوب تھی۔ سال رقم ۹۹۹ھ ہجری تھا۔

ایک نسخہ ایرانی خط میں لکھا ہوا نہایت معتبر و خوشخط جس میں ۵۳۰۰۰ اشعار تھے اور سال رقم ۷۴۹ھ تھا۔

ایک نسخہ محمد خان قزوینی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہایت ہی خوشخط اور مطلا کار۔ یہ ایسا نفیس و پاکیزہ تھا کہ اُسکو تمام جمع شدہ شاہناموں کی عروس کہا جا سکتا ہے اس میں ۵۴۰۲۰ اشعار تھے۔

ایک نسخہ ایرانی خط میں نہایت خوشنما لکھا ہوا جسمیں ۸۷۹۱۱ اشعار تھے۔ گویا بہت زیادہ تھے۔ سات ہزار بیتیں بغداد شریف کی تعریف میں بھی تھیں۔ سال رقم ۱۰۸۱ھ۔

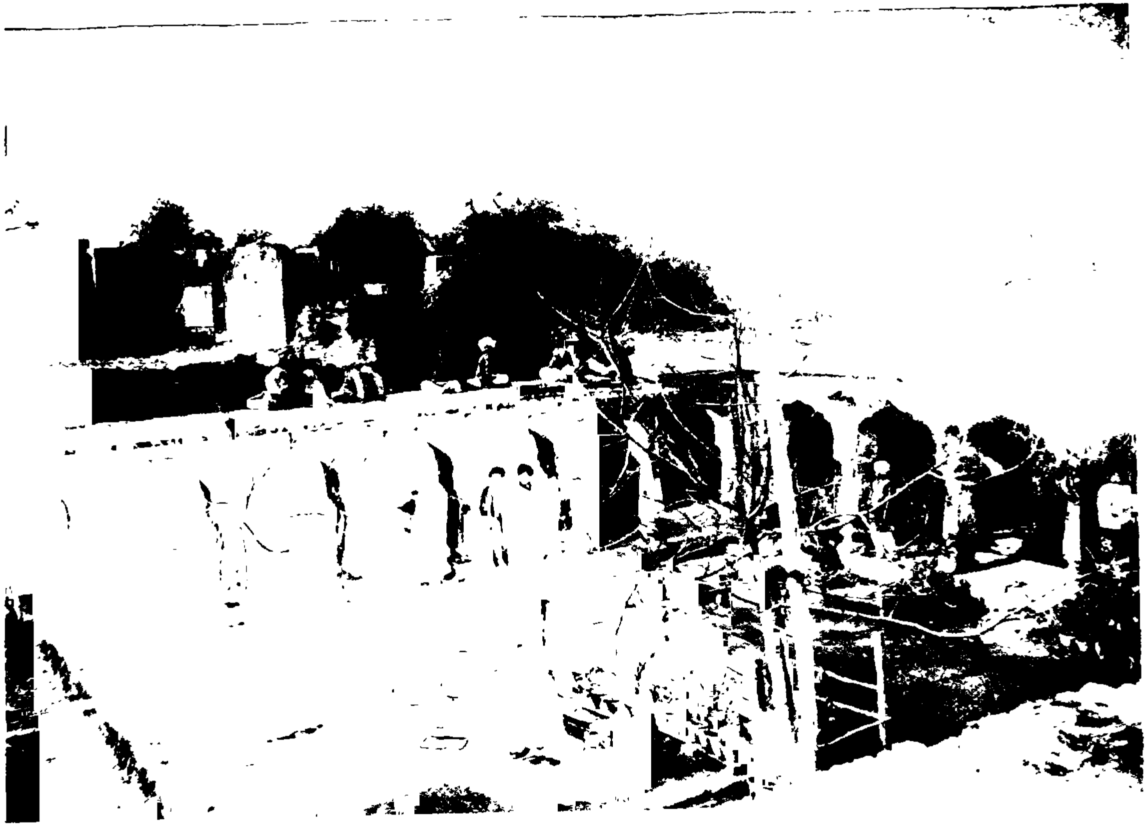
ایک نسخہ میں ابتدائے حکمرانی کیکاؤس سے لیکر لہراسپ تک کا حال لکھا ہوا تھا۔ مگر صحت قابل اعتماد تھی۔ ۱۰۰۰ہجری سال رقم تھا۔

ایک نسخہ میرزا علی اصفہانی نے بھیجا تھا جس میں ابتدا سے بیجن کا گودرز کے پاس کیخسرو کا خط لیکر آنے تک صحیح واقعات مندرج تھے۔

ایک نسخہ آنریبل مسٹر طول نے بھیجا تھا۔ اس میں سوسن رامشگر کے قصہ سے لیکر آخر تک واقعات ہیں۔ جب ان تمام نسخوں کو دیکھا گیا تو بڑا فرق نظر آیا۔ لیکن نہایت محنت و دقت سے سب شاہناموں کو سامنے رکھکر اُس زمانے کے علما نے ایک اصح نسخہ مرتب کیا۔ اور اسطرح سے سیکڑوں برس کا اختلاف دور ہو گیا۔

ایران پر سب سے بڑا حق ترتیب شاہنامہ کا تھا کیونکہ وہیں اسکی نشو و نما ہوئی لیکن قدرت نے یہ فخر ہندوستان کی قسمت میں لکھدیا تھا۔ اسی صحیح نسخہ سے غالباً منشی نول کشور نے شاہنامہ طبع کیا اور اسی کی نقل آقا سمیع شیرازی ایران لے گئے جن کے محررہ نسخہ سے ۱۹۰۶ء میں ایک عالم ایرانی آموزندہ شیر مرد فارسی ایرانی نے بمبئی میں بذریعہ فوٹو لیتھو شاہنامہ چھاپا۔ اسکی تقطیع ۲۱×۱۷/۱ اور قیمت عـہ تھی۔

بعہد سلطان عالم واجد علی شاہ مرزا رجب علی بیگ صاحب سرور لکھنوی نے سرور سلطانی کے نام سے شاہنامہ کو اردو نثر کا مقفیٰ و مسجّع لباس پہنایا۔ انگریزی، ہسپانوی، اور فرنچ زبانوں کے ترجمے کا مجھے بھی علم ہے۔ ممکن ہے کہ اور یورپین زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے ہوں۔



جھولنا محل - گورداسپور پنجاب

انڈین پریس الہ آباد

اہل علم جانتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش نظم فارسی سے آج تک شاہنامہ کے برابر کوئی کتاب زبردست نہیں لکھی گئی۔ اہل یورپ کی سرمایۂ ناز کتاب ہومر کی آلیڈ۔ اور اہل ہند کی مہابھارت ہے۔ اسیطرح اہل ایران شاہنامہ فردوسی کو افتخار کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ فارسی زبان کے مستند اُستادوں نے فردوسی کو کامل الفن تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ حکیم انوری کیسے مہذّب و مودّب الفاظ میں لکھتا ہے ؎

آفریں بر روان فردوسی　　آن ہمایوں نہاد فرخندہ
او کہ اُستاد بود ما شاگرد　　او خداوند بود ما بندہ

انوری وہ شخص ہے کہ جمہور نے اُسکو پیغمبر سخن مان لیا ہے۔ اس کے علاوہ اُستاد الاساتذہ حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد　　کہ رحمت بران تربت پاک باد

خدائے سخن مولانا نظامی یوں ارشاد فرماتے ہیں ؎

سخن گوے پیشینہ دانائے طوس　　کہ آراست روئے سخن چوں عروس

یہ سب بزرگ فن شاعری کے مسلّم الثبوت اُستاد تھے اس لئے انکی رائے بہت زیادہ وزن دار ہے۔ آج کل انگریزی تعلیم کے پیچھے ہندوستانی ایسے پریشان ہو رہے ہیں کہ علوم نفیسہ فارسی عربی و سنسکرت کی جانب کوئی توجہ نہیں۔ افسوس کہ اہل مغرب ان علوم کو شوق کے ساتھ پڑھیں اور ہم لوگوں کی یہ حالت ہو۔

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم　　ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

محمد شفیع الدین خان

عالم خیال کے چوتھے رُخ کا ایک نظارہ

"عالم خیال" کے نام سے سلسل چار نظمیں منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی کی تصنیف کی ہوئی مختلف رسالوں میں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں، جن کو ایک ہی زنجیر کی چار کڑیاں کہنا زیبا ہے۔ یہ لاجواب نظمیں اگر کسی ایک ہی رسالے کے حصّے میں پڑی ہوتیں، تو طالبان سخن کو جستجو کی دشواری نہ پیش آتی جن کی نگاہیں ایک نظم کو دیکھکر بے تابانہ سب نظموں کی جویا ہوتی ہیں۔

مجھے بے انتہا فرحت اس امر سے ہوئی کہ "چوتھا رُخ" ان نظموں کا الہ آباد کے رسالہ "ادیب" میں نکلا ہے۔ وہ میری رائے میں اس وقت بہ اعتبار اُن تمام خوبیوں کے جو ایک رسالے میں مجتمع ہونی چاہئیں، ہندوستان کے اُردو رسالوں میں بلند ترین پایہ رکھتا ہے درحقیقت چاروں نظموں کا استحقاق رسالہ "ادیب" ہی کو تھا جسکی تصویر نے جو "عالم خیال" کے نام سے شائع ہوئی تھی، سحربیان سخن سنج کے خیال کو ان نظموں پر آمادہ کیا تھا۔ معلوم نہیں کہ کیا اتفاقات ایسے پیش آئے گئے جن کے سبب سے موتیوں کی لڑی ٹوٹ گئی اور موتی بکھر گئے۔

حصّہ اوّل پر مسٹر رشید حسین قدوائی بیرسٹرایٹ لا نے، حصّہ دوم پر مسٹر محمد سلیمان بیرسٹرایٹ لا نے، اور حصّہ سوم پر سیّد مقصود علی صاحب (ردیونی) وکیل نے ریویو تحریر فرمایا ہے۔ ہر ریویو اپنے حصّہ نظم کی شاعرانہ خوبیوں اور اس کے لطیف جذبات کا معقول شارح ہے، اور اشعار کے ربط باہمی کو آشکارا کرکے ہر طرز بیان کی ضرورت کو عالم خیال سے عالم ظہور میں لا رہا ہے۔

دو قابل بیرسٹروں کے نظارے معمولی نہیں ہیں۔ اُن کی وسیع نگاہیں انگریزی کے مذاقِ فطری اور جذباتِ انسانی کو اپنے ماحول اور دماغوں میں مجتمع کئے ہوئے ہیں، اور ان کے فلسفیانہ خیالات کی جولانیاں فلسفۂ اخلاق و معاشرت کے مراحل کو طے کر چکی ہیں، جن کا میدان بہ نسبت اُردو و فارسی کے انگریزی علم ادب کی قلمرو میں وسیع تر ہے۔ لہٰذا نظموں کی ان خوبیوں پر جو فیصلے ان دونوں کے ہیں، وہ ناطق ہیں۔

ہر دو قابل بیرسٹر تحریر فرماتے ہیں کہ ایسے جذبات کی مسلسل نظمیں انگریزی میں بھی نہیں ہیں۔

ہر دو ریویو نگار تسلیم فرماتے ہیں کہ اُردو میں اس قسم کی دلفریب نظموں کے موجد حضرت شوق قدوائی ہی ہوئے ہیں، جنھوں نے فصیح زبان، لطیف بیان، فطری جذبات، اخلاقی خیالات اور ایشیائی طرزِ معاشرت کی دلکش اداؤں کے ساتھ عفت مآب عورتوں کے جذباتِ دلی کو اسطرح دکھا دیا ہے کہ گویا زندہ صورتیں پیشِ نگاہ ہیں۔ آج یہ کمالِ سخن سرائی حضرت شوق قدوائی ہی کی ذات پر منحصر ہے، اور بس۔

اب مجھے اِن ہر دو امور پر بجز اس کے اور کچھ رقم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں قابل ریویو نگاروں سے لفظ بہ لفظ متفق ہوں۔

جذباتِ انسانی اور فطری ہیجانِ طبعی پر فلسفیانہ اور سخن سنجانہ بحث فاضل بیرسٹروں نے ایسی قابلیت اور ماہیت کے ساتھ کی ہے نیز مذاقِ سخن اور اُس کے نکات کو اُنھوں نے اور پھر حضرت وکیل نے اس قدر خوبی اور پُرتجربہ دلائل کے ساتھ دکھایا ہے کہ اس صنف پر بھی گنجایش تحریر زیادہ نہیں باقی رہی، البتہ صرف ایک امر زمانۂ حال کی سخن سرائی پر غور طلب ہے۔ وہ یہ کہ قدیم طرزِ سخن اور جدید طرزِ سخن دونوں کی صورتیں اس وقت بگڑی ہوئی کیوں ہیں؟

میری رائے میں مطابع کی زیادتی۔ اور رسالوں کی کثرت سے ذرائع اشاعت میں آسانی ہوئی تو ناواقفانِ فنِ سخن سرا بن گئے۔ رسالوں کے ایڈیٹروں میں یا تو سخن سنج اور سخن فہم کم ہیں، یا صفحے بھرنے کو اگر ہے تو یہی سامان ہے۔ کریں کیا؟ لیکن پُر از اغلاط اور اصولِ علم و فن سے متجاوز نظموں کے شائع کرنے سے بجائے بہبودِ اُردو کے خرابی کے اسباب مہیّا کئے جاتے ہیں۔

اگر کبھی حشر شدنی ہے اور ہر شے یارائے سخن پائے گی تو زبانِ اُردو اور فنِ شعر کے خونِ ناحق کا محاسبہ انہیں حضرات سے ہوگا جو اغلاط اور بے اصولی سے ان کے گلوں پر جہل کی چھریاں بے رحمانہ پھیر رہے ہیں۔

خیر۔ وہ ہزار مخرّب ہوں، فن اُنکے زائل کرنے سے زائل نہیں ہو سکتا۔ سرزمینِ فن و سخن پر جنابِ شوق قدوائی کے سے یکتائے فن و سخن موجود ہیں۔ (خدا عمر میں بہت برکت دے) جن کی سحر بیانی نے "حسن" اور "عالمِ خیال" نیز اور بہت سی فطری مذاق کی بے مثل اور لاجواب نظموں سے سخن پرست دماغوں اور نگاہوں کو منوّر کر دیا ہے۔

اب میں اِن مباحث سے اپنے رخ کو اصل نظم یعنی "عالمِ خیال کے چوتھے رُخ" کی جانب پھیرتا ہوں جسکی لطافتوں اور خوبیِ بیان کی نزاکت نے میرے دماغ اور دلکو گرویدہ کر لیا ہے۔

{ شوہر نے خط میں لکھا تھا کہ میں آج کے بیسویں دن آونگا آج بیسواں دن ہے
{ عورت انتظار میں اپنے خیالات کے ساتھ باتیں کر رہی ہے۔

خط کو ہے بیسواں دن آج - آئینگے وہ ضرور ہی کیا میں کھنچی ہوئی رہوں "اُن" کی نظر سے دو

لفظ "ضرور" "پر" "ہی" کا زور دیکے عورت نے اپنے یقین کو شوہر کے آج آنے پر مستحکم کر لیا۔ اب مصرعۂ ثانی کی بنیاد "عالمِ خیال" کے دوسرے رُخ پر ہے۔ وہ عورت کا حسرت ناک خط ہے جس میں وہ بہت سے شکوے اور طنز آمیز گلے شوہر کو تحریر کر چکی ہے۔ اسوقت سوچتی ہے

کہ کیا میں اُن شکووں کی بنا پر شوہر سے کچھ اظہار کشش کروں اور رد و بدل ہو۔

اس خیال کے ساتھ ہی جوشِ محبت نے جو باعصمت عورت کا خاصّہ ہے۔ اس کے دل کو تمنا کی جانب پھیر دیا اور وہ اپنے خیال سے یوں اظہارِ مجبوری کرنے لگی۔

"۔۔ دن ہائے کی صدا سُنے۔ تو پھر ہو نہ سکے جگر سے صبر پلکے "اُنھیں" کبھی نہ ہو ترسی ہوئی نظر سے ہم

باعفت عورت جو مصائب ہجراں میں سالہا سال مبتلا رہتی ہو۔ یہ شعر اُس کے جوشِ تمنا کی سچّی حالت کا نقشہ کھینچ رہا ہے "ترسی ہوئی" کے الفاظ نے اور بھی تمنا کو قوت دی ہے۔ یہ جناب شوقؔ قدوائی ہی کے کمالِ سخن اور اُنھیں کی لطیف زبان کی سحر البیانی کا حق ہے۔

عورت نے پھر اپنے دل سے ایک ایسا سوال کیا ہے اور پھر خود ہی ایسا جواب دیا ہے کہ دونوں کا لطف میرے دل کو جنبش میں لا رہا ہے یعنی دل وجد کر رہا ہے۔ پہلا شعر سوال ہے اور دوسرا شعر جواب

کیا میں جگر کو تھام لوں۔ کیا میں نظر کو پھیر لوں؟ کیا "وہ" اُدھر سے آئیں۔ تو رُخ میں اِدھر کو پھیر لوں
اُن کی کشش میں آ کے رُخ پھر نہ سکے تو کیا کروں دل سے کروں تو زور میں۔ دل جو جھکے تو کیا کروں

واہ! جناب شوق!! سبحان اللہ!!! شعر کیا فرمائے ہیں، منہ سے موتی اُگلے ہیں۔ میری عمر کا زمانہ بھی اشعار کو دیکھتے ہی گذرا ہے۔ لیکن ایسے فصیح اور دلکش اور با ادا اشعار جن میں فطری اداؤں کے ساتھ جذبات کوٹ کوٹ کے بھر دئے گئے ہوں، سوا اِن نظموں کے نہ آج تک دیکھے نہ سُنے۔

شعر اول اپنے مصرعۂ اولے سے کن فصیح اور سلیس الفاظ میں ارادۂ ضبط اور اس کی صورت کا اظہار کر رہا ہے۔ اور مصرعِ ثانی اُدھر اور اِدھر کے الفاظ سے آنے اور رُخ پھیرنے کی کیا دلاویز ادائیں دکھا رہا ہے

دوسرے شعر کی رفعت نے عرشِ معلےٰ سے ٹکر کی ٹھہرا دی۔ مصرعِ اولیں جس کشش سے رُخ کے نہ پھر سکنے کا اظہار کر رہا ہے، اس کا لطف اصحاب معنی فہم کے قلوب اثر پذیر سے پوچھا جائے۔ مصرعِ ثانی نے اور بھی قیامت کر دی۔ فرقت زدہ کا دل جو ناتواں ہو رہا ہے اُس کا زور کر کے تھک جانا۔ یہ ایسا حسنِ بیان ہے کہ اِس سے بہتر اِس موقع کے لئے اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اِس تھکنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رُخ کھنچے کھنچے سامنے ہو ہی جائیگا۔

کیا سوا جناب شوقؔ قدوائی کے اور کسی نے بھی اُردو کی شاعری میں ایسے سچے جذبات دکھائے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ ایسا کمال سخن آفرینی ہے جس نے فصاحت سے زبان اُردو کو اور لطافت سے اندازِ بیان کو آج ہندوستان میں خلعت یکتائی پہنا دیا ہے۔

اب بہ مقتضائے فطرت عورت کو وہم نے گھیرا کہ مبادا آج شوہر نہ آئے تو کیا کہتی ہے۔

"۔۔ اگر نہ آئے "وہ" ہائے یہ تنک ستم کا ہے آمرے دل میں او اُمید، وقت ترے کرم کا ہے
تنک سے پڑی ہیں سوچ میں ڈرتی ہوں پاس آ نہ جائے اُس سے جڑھی ہوئی ہو نہیں، دم سے پاس آ نہ جائے
آتے ہی یاس کا خیال۔ کانپ اُٹھی ہوں ڈر کے میں در نہیں دل میں۔ ورنہ آج بیٹھتی بند کر کے میں
یاس ہوں جلی ہوئی۔ اُسکو میں جھونکوں بھاڑ میں ہٹ مرے دل سے او تنک آج۔ یاس تیرے بڑے میں

شعر اوّل کے مصرعِ اولیٰ میں "ہائے" نے حسرت انگیز خیال میں جان ڈال دی ہے مصرعِ ثانی میں "اُمید" پکاری گئی ہے۔ یہی ایک چیز ہے جس سے ایسی حالت میں قلب حزیں تسکین پا سکتا ہے۔ امید کو کرم کا وقت بتایا گیا ہے۔ "وقت" کا لفظ جو یہاں "ضرورت" کے معنی دے رہا ہے۔ اُس نے عجیب لطف پیدا کیا ہے۔ شعر دوم میں یاس سے خوف کا اظہار ہے جس کے خیال نے شعر سوم میں وہ لطافت پیدا کی ہے جو باعتبار حالت اور باعتبار سخن سنجی جس قدر مصرعِ اولیٰ سے صورت حال ہے۔ اُسیقدر مصرعِ ثانی سے بلند پایہ ہے۔ یہ بیان کہ دل میں دروازہ نہیں ہے ورنہ آج میں بند کر کے بیٹھتی تاکہ یاس نہ آ سکے۔ کتنا رفیع مضمون اور کیسا دلفریب ہے۔ شعر چہارم میں جو لطف "جلی ہوئی" اور "جھونکوں بھاڑ میں" ان دونوں محاوروں سے پیدا ہوا ہے، جن

عورت کی بے تکلفانہ بول چال پیشِ نگاہ ہے۔ اس لطف کی داد دل ہی سے لی جا سکتی ہے۔ اسی شعر کے مصرعِ ثانی میں شک یہ کہکر مٹایا جاتا ہے کہ یاس رہی تو پری آنکھیں سے ہے۔ مضمون اور قافیہ دونوں کمالِ مضمون آفرینی کے قطعی دلائل ہیں۔ معمولی شاعر کا خیال نہ اتنی بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ نہ اس کی زبان بندشِ مضمون کے واسطے ایسے فصیح اور سلیس الفاظ پا سکتی ہے۔ یہ قدرت کلام، قوتِ بیان اور لطفِ زبان جناب شوق قدوائی ہی کے مفتوحہ اور مقبوضہ ممالک ہیں جن میں انھیں کا سکۂ سخن چل رہا ہے۔ اور بس۔

اس کے بعد عورت نے اپنے دل سے سوال کیا ہے۔ اُس کا دل بول اُٹھا کہ آرہے ہیں۔ اور بہت سا بھین میرے واسطے تحفہ لیے آ رہے ہیں۔ یہ معنی آفرینی کے لحاظ سے کیسا نیا۔ اور واقعے کے اعتبار سے کس قدر دلچسپ تحفہ ہے۔ غالباً جناب شوق قدوائی ہی نے صلاح دی ہوگی کہ ایسا تحفہ لے جاؤ جس کو دل قبول کرنے اس لئے کہ سوا ان کے ایسا نکتہ یاب دماغ فی زمانا اور کسی سخن گو کا نہیں ہے۔ جو ایسے تحفۂ لاجواب تک اپنے خیال کو پہنچا سکے۔

عورت کا دل بول کے آنے کی خبر دے چکا تو وہ اپنے یقین کا استحکام کیسے کیسے مسرت خیز خیالات سے کرتی ہے، اور کیا کیا فرحت انگیز شگون لیتی ہے:-

دیکھ رہی ہوں آرسی۔ چہرے پہ رنگ آگیا　　دل نے کیا ہی سرخ رُو۔ ورنہ کہاں سے پا گیا
دلکو ملا کہاں سے رنگ۔ اِس کو ملا امید سے　　پائیگا یہ کچھ اور بھی۔ آج ہی اُنکی دید سے
کل مرے سر میں تھا جنوں۔ آج ہی کچھ غرور سا　　کل مرے دل میں تھا ملال۔ آج ہی کچھ سرور سا
اپنے لبوں پہ بار بار پاتی ہوں میں تبسم آج　　خوش ہوئے مرے لبو۔ کہتے ہو ادیکھو تم آج
گھر کی زمین جاگ اُٹھی صحن پہ نور چھا گیا　　آئینگے وہ ضرور ہی۔ مجھکو یقین آگیا

آرسی میں چہرے کے رنگ کو دیکھ کے کہتی ہے کہ یہ اُمید سے مِلا ہے۔ رنگِ امید کو شعرا نے الفاظ میں تو دیکھا ہوگا، مگر جناب شوق، قدوائی نے اُسے چہرے پر نمایاں کر دیا۔ گویا یہ رنگ حضرت ہی کے سخن لاجواب کے واسطے وضع کیا گیا تھا۔

شعر دوم میں لفظ غرور جو لطیف اور بلند معنی دے رہا ہے اسکی داد یا اُسے تو سے زیادہ ہے۔ اور اُسی کے برابر کا قافیہ سرور ہے جسکا سرور دلِ سخن فہم سے پوچھا جائے۔ عورت کی فطرت کا یہ خاصہ کہ شوہر پر اُسکو گھمنڈ ہوتا ہے، اس فصیح اور لطیف شعر نے ظاہر کر دیا۔

شعر چہارم میں لبوں پر بار بار تبسم کا آنا بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی مسرتِ دلی کی فطری روش ہے۔ اسی شعر کے مصرع ثانی میں لبوں کی جانب مخاطب ہو کے یہ کہنا کہ "کہتے ہو! دیکھو تم آج" کس قیامت کا ٹکڑا ہے۔ اس کو جواہر کا ٹکڑا نہیں بلکہ دل کا ٹکڑا کہنا چاہئے۔ اور اسکا مزا بھی وہی دل پا سکتا ہے جس کو چاشنی مہر و وفا کے ساتھ چاشنی سخن بھی نصیب ہوئی ہو۔ صرف انھیں چھ الفاظ کی شرح لکھنے کا قصد کیا جائے تو دماغ کشمکش و پیچ میں پڑ جائے کہ کہاں تک اظہار مطالب کروں۔ یہ جناب شوق قدوائی ہی کا سخن گسترانہ دماغ ہے جسکو ناپیدا کنار بحر موّاج کہنا چاہئے۔

عورت نے شوہر کے آنے کا یقین دلکی شہادت اور شگونوں سے بہر نوع کر ہی لیا۔ اب وہ اُن نازوں کی جانب اپنے خیالات کو منتقل کرتی ہے جن کو وہ کام میں لانا چاہتی ہے۔ فی الحقیقت قدرت نے عورت کے دل و دماغ کی ترکیب ہی میں نازوں کو داخل کر دیا ہے اور یہی ادائیں ہیں جو حرکات کرشمہ پرداز سے حسن کو قوتِ جاذبہ دیکے مردوں کے دلوں پر مقناطیسی کشش کا اثر ڈالتی ہیں۔ کیسی ہی حسین عورت کیوں نہ ہو، اگر اُسکی ادائیں دلفریب نہیں ہیں تو قوت جاذبہ نگاہوں سے گذر کر دلوں پر کم اثر انداز ہو سکتی ہے حضرت حافظ شیراز علیہ الرحمہ نے کیا خوب فرمایا ہے ع بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد
حسن کا مسئلۂ فلسفیانہ ایسا وسیع ہے جس کی تحریر کا یہ موقع نہیں



دیوار چین

انڈین پریس الہ آباد

جسکو شوق ہو، وہ جناب شوق قدوائی کی مثنوی "حسن" کو دیکھے۔ جس میں حسن کا وسیع فلسفہ ایسی رنگینی سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا گلہائے رنگا رنگ چمن زار اوراق پر کھلے ہوئے ہیں۔ اور اُس مثنوی کے فلسفہ کی تشریح حضرت برق بی۔ اے (آں جہانی) نے دیباچہ میں نہایت معقول کی ہے جس سے بلیغ مسائل کا فصیح بیانات سے انکشاف ہو گیا۔ ورنہ بہت لوگ مثنوی کو دیکھ کے فہمِ نکات سے محروم رہتے۔

بہرحال عورت نے قصد کر لیا کہ وہ دلفریب اداؤں کا جال شوہر پر ڈالے گی۔ اب وہ کہتی ہے :۔

دل تو خفا نہیں مگر۔ میری نظر جھکی رہے — بعد کو بات چیت ہو۔ پہلے زباں کی شرط

اُس کی محبت، وفا، اور سرشت نیک نے اُس سے یہ کہلا دیا کہ وہ دل سے خفا نہیں ہے۔ اگر وہ اس امر کو ظاہر نہ کر دیتی تو ضرور اس کا برتاؤ قابلِ حرف قرار پاتا۔ اس لئے کہ شوہر اپنے خط میں (جو سلسلۂ عالمِ خیال کا تیسرا رُخ ہے) عورت پر یہ ظاہر کر چکا ہے کہ وہ بہ مجبوری ایک مدّت دراز تک پردیس میں رہا۔ نہ کہ بہ انداز بے وفائی۔ اور اُسی خط میں وہ چند در چند شکلوں سے عورت کے ساتھ محبّت اور اُسکی دل خوش کن یاد کا اظہار کر کے اُسکو تشفّیاں دے چکا۔ اور یہ وعدہ تحریر کر چکا ہے کہ آج کے دسویں دن وہاں پہنچیگا۔

اداہائے دل فریب کا اظہار بہت سے اشعار میں کیا گیا ہے۔ نیز نظم خود بھی بڑی ہے۔ اور ہر شعر اس کا ایک کرشمۂ ہوش رُبا ہے۔ لہذا اب میں جا بجا سے اس کے چند چند اشعار تحریر کروں گا تاکہ ریویو بہت طویل نہ ہو جائے جس کو جناب سحر البیاں کی پوری سحر بیانی کا نظارہ مدِ نظر ہو، وہ اس چوتھے رُخ کو الہ آباد کے بلند نام رسالۂ "ادیب" میں دیکھے۔ اور ہر چہار نظموں کی یکجائی کتاب کے واسطے حضرت شاکر میرٹھی "ایڈیٹر ادیب" سے درخواست کرے۔

اب عورت اداہائے ناز آفریں پر خیالات کو یوں دوڑا رہی ہے۔

بننے کو میں بنوں مگر بن بھی سکونگی یا نہیں — تننے کو میں تنوں۔ مگر تن بھی سکونگی یا نہیں

یہ الفاظ نکلے ہیں یا جناب شوق قدوائی کے قلم سے آبِ حیات کے قطرے ٹپکے ہیں۔ جو ہمیشہ اُردو کے ادب کو زندہ رکھیں گے۔

عورت اپنے جوشِ محبّت اور ولولۂ تمنّا کا اندازہ کر کے خود کہتی ہے کہ اظہارِ کشش کا تصنّع اُس سے بن بھی پڑے گا یا نہیں۔ یہ پس وپیش اُس فطری خیال پر مبنی ہے جو اوہام کی کشمکش سے پیدا ہوتا ہے۔

اب وہ مسرّتِ قلب سے کششِ مصنوعی کے مغلوب ہو جانے کا وسوسہ یوں ظاہر کرتی ہے۔

بن کے شگفتگی خوشی رخ سے جو کھل پڑے تو پھر — لطف کے ساتھ کر کے میل اُن سے نظر لڑے تو پھر

ہونٹھ تو میرے بس کے ہیں انکو سکھاؤں جنگ میں — لیکن اڑاؤں کسطرح رخ سے خوشی کا رنگ میں

دل یہ کہیگا میل کر۔ لب یہ کہیں گی۔ بول نہ — حسن کہیگا ہاتھ سے۔ تو مِرے رُخ کو کھول دے

شعرِ اولیں میں شگفتگی کا چہرے سے کھل پڑنا کیا لطف پیدا کر رہا ہے یہ بالیقین فطری مسرّت ہے۔

شعرِ ثانی میں ہونٹھوں کو تعلیمِ جنگ۔ مگر رُخ سے رنگِ خوشی کے نہ اڑا سکنے پر مجبوری۔ یہ ایسی شاعرانہ لطافتیں اور نازک خیالانہ مضمون آفرینیاں ہیں جو جناب شوق قدوائی ہی کے دماغِ سحر آفریں اور زبانِ سحر البیاں کے واسطے اس زمانہ میں مخصوص ہیں۔

اب یہ شعر ملاحظہ ہو جو فصاحت، نزاکت، اور ادائے فطرت کا ایک گنجینہ ہے۔

بن کے بلائیں انکے سر آج پڑوں ضرور ہی — دل میں ہنسا کروں مگر مُنہ سے لڑوں ضرور ہی

"بن کے بلا" یہ ٹکڑا قلبِ ادا شناس کو جو مزہ دے سکتا ہے اُسکی حد نہیں بیان کی جا سکتی، زبان کیا ہے معدنِ جواہر ہے۔ مصرعۂ ثانی ہو بہو تصویرِ فطرت ہے۔ اس کے بعد وہ کہتی ہے ؎

کچھ جو دہ ہیں۔ تو۔ یوں نہ لوں۔ لوں تو نہیں نہیں کے بعد — لاکھ رُکاوٹوں کے بعد۔ لاکھ چناں چنیں کے بعد

میں کہہ چکا ہوں کہ زبان معدنِ جواہر ہے، یہ چناں چنیں

کا قافیہ اُسی معدنِ جواہر کا ایک لعل بے بہا ہے۔ فصاحت اور ثروت زبان کا خزانہ جتنا قدرت کے پاس تھا گویا وہ سب اس عہد میں جناب شوق قدوائی ہی کی زبانِ سحر البیان کو عطا فرما دیا گیا ہے۔

بہت سے پُرلطف اور اداہائے دلفریب کے اشعار اس موقع پر ہیں لیکن خیالِ طوالت مانعِ تحریر ہے۔

اب عورت اس خیال پر مائل ہوئی کہ یہ تو جو کچھ ہوگا ہوگا! آج مجھے کچھ سنگار تو ضرور کرنا چاہئے۔ کیسا طبعی خیال ہے، جو عورت کی سرشت میں گویا ودیعت ہے۔ سنگار کے واسطے طرزِ شوہر لینا اور اشیائے مناسب کے فراہم کرنے کا انتظام وہ اپنے تصوّرات سے کرنے لگی۔ اسی درمیان میں اُس کو ایک خیال نے گھیر لیا، جس کا اظہار وہ یوں کرتی ہے۔

ہو ہی رہے گا یہ تو سب، مجھکو خیال ایک ہے　　ساس "چیبا" زبان چیپ" نند فزوں نیک ہے

ساس کے ناقص برتاد پر بے ساختہ اُسکی زبان کچھ کہنے کو تھی۔ مگر بہ پاسِ ادب اُس نے "چیپ وزبان چیپ" کہکر روک دیا۔ فطری بے ساختگی کو لحاظِ ادب سے کیا لطیف شکل اور کن عمدہ الفاظ سے روکا ہے کہ سبحان اللہ نند سے وہ بہت جلی ہوئی ہے۔ اُس سے اظہارِ کدورت "ضرور نیک ہے" ان طنزیہ الفاظ سے کیا گیا ہے۔

یہاں نند کی نسبت جو خیالات اُسنے ظاہر کئے ہیں، اُن کے دو لاجواب شعر میں ذیل میں رقم کرتا ہوں ؎

اسکی سی بس کی گانٹھ اور کوئی نہ ہوگی شہر میں　　رکھی ہے مُنہ میں اک چھُری اُنسے بجھا زہر میں
جب وہ جلن سے لال ہو گال ہوں گم دو توے　　خود تو ہے لسن اور دانت جیسے چھلے ہوے جوے

شعرِ اولین کا محاورۂ زبان اور اُس کے مصرعِ ثانی کی نفاستِ بیان اور لطافتِ معنوی ملاحظہ ہو۔

شعرِ دوم میں دونوں گالوں کی نسبت یہ ذہن انگیز مثال کہ جلکے گرم ہوں تو دو توے ہو جائیں۔ قابلِ داد ہے۔ اور اسی شعر کا مصرعِ ثانی اپنی دونوں تشبیہات سے لاثانی اور لاجواب ہے یعنی وہ (نند) خود لسن ہے اور اُس کے دانت چھلے ہوئے جوے ہیں۔ کیا ہجو ہے کہ اس سے بہتر ہجو اور نہیں ہو سکتی۔ تشبیہات بھی کتنی جدید ہیں۔ چھلے ہوئے لسن کے الفاظ نے جوؤں کی ہیئت کذائی دکھا دی۔ دانتوں کے واسطے یہ تشبیہ جدید کس قدر موزوں ہے۔ قدرتِ بیان، قدرتِ زبان، قدرتِ معنی آفرینی یہ جملہ اصنافِ سخن سنجی جناب شوق قدوائی ہی کی اختیاری چیزیں ہیں۔ تشبیہات کیا عموماً مضامین تو آج انھیں کے دماغِ بلند اور خیالاتِ ارجمند کے حصّہ میں ہیں۔

ذیل میں عورت نند کے حسد کا ماحصل ظاہر کرتی ہے۔ کہتی ہے ؎

دیکھ کے یہ چمک دمک وہ مرے روپ سے جلے　　ریت میں کولی جس طرح جیٹھ کی دھوپ سے جلے

کیا لطافت اور کیا فصاحت ہے۔ کہ ان دونوں خوبیوں کے لئے یہ نظم سرمایۂ نازش ہے۔ چمک دمک کو دیکھ کے جلنا۔ اے سبحان اللہ مصرعِ ثانی تمثیلِ جدید اور لطفِ بیان کی رفعت پر پہنچ کے عرشِ معلےٰ سے باتیں کرنے لگا۔ ریت میں جس کی حدت مشہور ہے اس میں جیٹھ (ماہ ہندی) کی دھوپ سے جلنا۔ اللہ رے کلام فصاحت نظام۔ یہ قدرتِ کلام اور قوتِ زبان ہے جو بیان کو اوجِ سما پر لئے جاتی ہے معمولی شاعر کا خیال بھی ریت اور جیٹھ کے الفاظِ لاجواب تک رسا نہیں ہو سکتا

اس کے بعد سب سے آخری شعر ہے جو قلبِ اثر پذیر کے لئے ایک عجیب اور لطیف حیرت انگیز حالت پیش کرتا ہے۔ عورت اپنے منصوبوں ہی میں تھی کہ شوہر آ گیا تو وہ کس حسرت انگیز نفیس پیرائے میں کہتی ہے ؎

اے وہ جھنور آ گئے بندی سنورتی ہی رہی　　من نہ پڑا سنگار کچھ۔ حوصلہ کرتی ہی رہی

بندی کا لفظ کیا محاورے کا لطف دے رہا ہے۔ شعر استعجاب، تحیر اور حسرت کی ایسی دلکش تصویر ہے کہ دل بے ساختہ اُسکی تاثیر کو قبول کرتا ہے میں نے جس قدر داد دی ہے۔ یہ ایسی بلند پایہ اور لطیف نظم کو دیکھتے بہت کم ہے۔ جس قدر اُسکی لطافتیں اور کششیں جو فطری جذبات

بھری ہوئی ہیں، دل کو مسخر کرتی ہیں، اُسقدر داد دل ہی دے سکتا ہے زبانِ خامہ مجبور ہے۔ حضرت حکیم برہم نے بہت صحیح بات تحریر فرمائی کہ جناب شوق قدوائی کے سخن کی داد روح القدس سے ملتی ہے یعنی انسان کے قلم اور زبان سے اس یکہ تازِ میدانِ سخن اور سخن گستر سحر البیان کے اصنافِ سخن کی داد پوری نہیں ہوسکتی۔

میں ریویو کو ختم کرچکا۔ آخر میں خدا سے یہ دعا ضرور مانگوں گا کہ وہ جناب شوق قدوائی کو عمر دراز دے اور جسقدر لطف ہم مشتاقانِ سخن کو ان کی لاجواب نظموں سے حاصل ہو رہا ہے اُسیقدر لطفِ حیات اُن کو حاصل رہے۔ آج ملکِ ہند میں ایک یہی تو ہیں جنکی سخن سنجیوں کے گلہائے رنگارنگ سے سرزمین سخن گلزارِ شاداب بنی ہوئی ہے۔ اور جن کی باآب وتاب اور لاجواب نظموں کے سلسلے سے عقدِ مروارید کی دولتِ بے بہا خزینۂ اردو کو حاصل ہو رہی ہے۔

سیّد شبیر حسن

انقلابِ زمانہ

زمانہ کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کے اجزا کا مجموعہ پایا جائے یا اُس کے گزشتہ اجزا کا کوئی وجود قرار دیا جاسکے۔ یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جس کے اجزا نہ موجود ہیں نہ معدوم، یعنی زمانہ کا وجود کوئی مستقل اور مخصوص شے نہیں ہے۔ زمانہ کا وہ حصّہ جسے ہم اسکی رفتار کے لحاظ سے موجود قرار دیتے ہیں، وہ دراصل ایک غیر مستقل اور بہت جلد معدوم ہوجانے والا ہے۔ ہم اسی زمانہ کو زمانۂ موجودہ کہتے ہیں، جو ہماری آنکھوں کے سامنے اپنا دورہ پورا کرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسا معدوم ہوجاتا ہے کہ پھر اُس کے اجزا سے کوئی نشان نہیں ملتا۔ اگر ہم رفتارِ زمانہ پر غور کریں تو ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ زمانہ بالذات کوئی مستقل شے نہیں ہے، یا زمانۂ حال اُسی غیر مستقل رفتار کا نام رکھا گیا ہے جو اپنے عدم استقلال کیوجہ سے بہت جلد معدوم ہوجاتا ہے جسطرح گھڑی کا پہیّہ گھومتا اور چکّر کھاتا ہے، اور ایک چکّر ختم ہونے پر وہ معدوم ہوجاتا ہے، اور پھر دوسرا چکّر شروع ہوتا ہے اور وہ بھی پہلے چکّر کے نقشِ قدم پر چلکر معدوم ہوجاتا ہے، اُسی طرح زمانہ کی حالت کو خیال کرو۔

زمانۂ موجودہ اُس رفتار کا نام ہے جو نہایت سریع الا[illegible]ہے۔ اس حرکت اور تعلق کا نام خواہ خیالی حرکت اور تعلق رکھو، خواہ طبعی۔ جب زمانہ کا رنگ بدلتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی انسان کے حالات اور خیالات بھی بدل جاتے ہیں۔ یہ انقلاب صرف اسی جہت سے ہے کہ زمانہ اور انسانی خیالات اور حالات میں ایک تعلق اور نسبت ہے گویا انسانی خیالات اس نسبت اور تعلّق کے باعث زمانہ کے محکوم اور تابع ہوتے ہیں جب زمانہ میں انقلاب آتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی انسانی خیالات میں بھی تبدیلی واقع ہوجاتی ہے، لیکن یہ خیالی انقلاب بوجہ اتم زمانہ کے ساتھ منقلب نہیں ہوتا، کیونکہ زمانہ بعد انقلاب کوئی وجود اور شکل قائم نہیں کرتا ہے۔ نہ وہ مخصوص موجود رہتا ہے، اور نہ اس امر کا امتیاز کیا جاسکتا ہے کہ اس کے اجزا کسقدر تھے؛ مگر انسانی خیالات اور حالات قائم رہتے ہیں، اور اُن کا وزن و مقدار، خواہ وہ کسی دور دراز زمانہ میں ظہور پذیر ہوئے ہوں، بسہولت

دعہ گی معلوم ہو سکتا ہے۔ ہم جو کسی گذشتہ اور معدوم زمانہ کے حالات و خیالات کو دریافت کرتے ہیں، تو صرف اسی وجہ سے کہ وہ بذاتہٖ قائم تھے، اور اُن کی صورتیں ابھی تک معدوم نہ ہوئی تھیں۔ اگر خیالات و حالات بھی زمانہ کی طرح معدوم اور لاشے ہو جاتے، تو دنیا سے علم تاریخ ایسا شریف فن جاتا رہتا، اور کچھ بھی معلوم نہ ہوتا کہ ازمنۂ گزشتہ کے لوگوں کے کیا حالات و خیالات تھے، اور اُن کی طرزِ معاشرت کیا تھی، یا اُن کی سیاست و تمدّن کے کیا کیا طریقے اور ڈھنگ تھے۔ یہ صرف حالات کی قائمی ہی کا طفیل ہے کہ آج ہم پرانے سے پرانے زمانہ کے لوگوں کی ذرا ذرا سی حقیقت و حالت سے واقف ہیں۔ انسانی خیالات و حالات صرف ایک ہی طریق سے کامل طور پر قائم اور برقرار رہ سکتے ہیں، اور وہ طریق "تحریر" ہے۔

جب زمانہ چکر کھاتا ہے تو اس چکر اور انقلاب سے لوگوں میں متعدد اور مختلف تاثیرات پیدا ہوتی ہیں؛ وراُن تاثیرات کے اثر سے زمانہ گزشتہ کی بہ نسبت وہ زمانہ جو اب چل رہا ہے، ہر بات میں جزوی طور پر مخصوص ہو جاتا ہے۔ زمانہ کی تاثیرات مراتب انسانی کے لحاظ سے اثر کرتی ہیں۔ اور یہ مراتب بالعموم تین قسام پر منقسم ہیں، یعنی

ا۔ اعلیٰ۔

ب۔ ادنیٰ۔

ج۔ اوسط

اعلیٰ سے وہ اشخاص مراد ہیں جن کے دل میل و کدورت سے مبرّا و منزّہ ہیں؛ اوسط وہ جن کے دل میں نہ زیادہ صفائی اور نہ زیادہ میل؛ اور ادنیٰ وہ لوگ ہیں جن کے دل بالکل میلے اور مکدّر ہوں۔

جب زمانہ پلٹا کھاتا ہے، تو یہ انقلاب اعلیٰ آدمیوں کے مصفّا دلوں میں عکس قبول کر لیتا ہے۔ اعلیٰ لوگوں کے قلوب کی مثال آئینہ سے دیجا سکتی ہے۔ مصفّا آئینہ کے سامنے جب کوئی شے آتی ہے، تو فوراً اُسکا عکس پڑجاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ اعلیٰ آدمیوں کے دل ایک صاف و شفاف چشمہ کی مانند ہیں جب پانی کے اوپر سے کوئی تیز پرواز جانور اڑتا ہوا چلا جاتا ہے، تو پانی میں اُسکا عکس فوراً ہی اتر آتا ہے۔ اسی طرح تیز رفتار زمانہ کی تاثیرات کا عکس دلوں پر جم جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آئینہ اور پانی پر ایک میعادی اور محسوس عکس بنتا ہے، اور صاف دلوں میں دوامی اور معقول۔

اور جن لوگوں کے دل کچھ کچھ مکدّر ہیں، ان میں اتنی جلدی اور صفائی سے زمانہ کے انقلابات کا عکس نہیں پڑتا، اور نہ وہ لوگ اسکی تاثیرات سے کسی خاص حد تک متاثر ہوتے ہیں۔ اُن کے دل ایک گدلے تالاب کی مانند ہیں، اُس کے اوپر سے خواہ کتنے ہی جانور اڑتے چلے جائیں، وہ انکا عکس قبول نہ کرے گا۔ اس عدم انعکاس کا باعث صرف تکدّرِ قلوب ہے، اور جن کے دل بالکل مکدّر اور میلے ہوتے ہیں، اُن پر زمانہ کی تاثیرات و انقلابات کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ جسطرح کیچڑ کے اُوپر کسی جانور کو پکڑ کر بٹھایا جائے، تو ایک کثیف شے ہونے کے باعث اس پر مطلق عکس نہ پڑے گا۔

ہندوستان کے حصے کا زمانہ کب کا الٹ پلٹ ہوگیا۔ اگلی تحقیقاتیں، پُرانی ریاضتیں اور مجاہدات، پُرانے طرز و طریق بالکل بدل گئے۔ ان کی جگہ پر زمانہ نے اور بھرتی کی۔ نئے نئے علوم و فنون، نئی نئی تحقیقاتیں، نئی نئی تدابیر و تجاویز ظاہر ہوگئیں۔ اس انقلاب سے وہ لوگ جن کے دل بالکل مصفّا اور لطیف تھے، بیحد متاثر ہوئے وہ رفتارِ زمانہ کو پہچان کر اُس کے نقشِ قدم پر چلنے لگے۔ مگر وہ لوگ جن کے دل بہت صاف نہیں تھے، اس انقلاب اور الٹ پھیر کو دیکھ دیکھ کر تذبذب میں پڑ گئے، اور وہ اشخاص جن کے دل بالکل مکدّر تھے، اس انقلاب کو دیکھکر ایسے متحیّر ہوئے کہ خود بھی پلٹا کھا گئے۔



بیگم کا روضہ (مٹھی گنج - الہ آباد)

" نہ اُدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے"

مندرجۂ بالا تحریر سے یہ تو واضح ہوگیا کہ انقلابِ زمانہ سے ہندوستانیوں کے دل بھی پیٹا کھا گئے، خواہ ان منقلبین کی تعداد کم ہی ہو۔ اب یہ سوال عاید ہوتا ہے کہ یہ انقلابات اور بیٹے اہلِ ہند کے حق میں مفید ہیں کہ مُضر؟ جہاں تک اس معاملہ پر غور کیا جائے، اور منقلبین کے حالات وخیالات کو دیکھا جائے، اور نیز انقلاب کے نتائج وتاثیرات کو وزن کیا جائے، ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنا ہی ہماری ترقی وبہبودی کا موجب ہے۔ زمانہ نے جن باتوں اور جن رسموں کو اپنی تیز رفتاری کے باعث پیچھے چھوڑ دیا ہے، ہمکو بھی مناسب ہے کہ ہم انھیں چھوڑ کر زمانہ کے نقشِ قدم پر آگے کی طرف بڑھیں۔ اہلِ یورپ کی ترقی اور روز افزوں رونق کا باعث یہی ہے کہ وہ اپنی چال ڈھال کو زمانہ کی رفتار کے مطابق رکھتے ہیں۔ جدھر زمانہ کا قدم پڑتا دیکھتے ہیں، اُدھر ہی ڈھل جاتے ہیں جس طرف زمانہ جاتا ہے، خود بھی اُس کے پیچھے ہو لیتے ہیں جس طرح زمانہ چکر کھاتا اور اپنا دورہ کرتا ہے، وہ بھی اُس کے ساتھ ساتھ گھومتے ہیں۔

اگر اہلِ یورپ ہماری طرح اپنی آبائی رسوم پر اڑے رہتے، اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ موافقت ومرافقت نہ کرتے تو آج ایسی ترقی کا مُنہ نہ دیکھتے۔ وہی پتھروں کے کھنڈ، چمڑے کا لباس، اور بالوں کی ٹوپیاں موجود ہوتیں۔ کچھ شک نہیں کہ ہمارے ملک کے لوگوں نے کچھ تو اپنی ناداری کی وجہ سے اور زیادہ تر ناجائز آبائی تقلید سے اپنی بہتری وبہبودی کو اپنے ہی ہاتھوں معدوم اور زائل کر دیا، اور روز بروز کرتے جاتے ہیں۔ ہم صریحاً دیکھتے ہیں کہ فلاں رسم جو محض ایک ڈھکوسلا ہے، ہماری ترقی اور بہبودی میں مانع ہے۔ مگر اتنا حوصلہ اور مجال نہیں کہ ہم اُسکو ترک کر جائیں۔ اُسی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں، اور فخریہ کہتے ہیں کہ "جب ہمارے بزرگ اور باپ دادے اس کو کرتے چلے آئے ہیں، تو ہم کیوں نہ کریں؟"

بعض لوگوں کا یہ معتقد ہے کہ آبائی رسوم کو ترک کرنے سے ہماری بدنامی ہوتی اور برادری میں ناک کٹتی ہے۔ یہ عقل کے دشمن اور گانٹھ کے پورے یہ خیال نہیں کرتے کہ ہمارے بزرگوں اور اسلاف کے خیالات اپنی اور اُس زمانہ کی تحقیقات کے بموجب تھے۔ اُنکا زمانہ گزر گیا اور وہ خود بھی مٹی میں ملکر خاک ہوگئے۔ اس زمانہ کے داناؤں اور محققین نے اُن کے بعض خیالات کو ردی اور پوچ ثابت کر دیا ہے، اور ان رسوم وخیالات کی غلطیاں دکھا دی ہیں۔ تو کیا مناسب ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کے خیالات کو، باوجودیکہ اُن کے بعض جزو اور حصے غلط ثابت ہوگئے ہیں، اور اُن کی بعض مذموم رسمیں قوم کے حق میں زہرِ ہلاہل کا درجہ رکھتی ہیں، محض اس خیال سے کہ وہ ہمارے بزرگوں کے افعال وخیالات ہیں، اُن کو جاری رکھیں، اور ان کو ترک کرنا موجبِ ذلت اور ناک کٹائی سمجھیں؟ جب اُن کے اغلاط واسقام ظاہر ہوگئے ہیں تو کیا ضرور ہے کہ اب اُن کو مانا جائے۔ ہمارے بزرگوں اور باپ دادوں کا فعل اور حکم کوئی خدائی اور نبوی حکم نہیں ہے کہ ہم اُس پر عملدرآمد کرنے پر مجبور کئے گئے ہوں۔ ہمارے بزرگوں کے تمام خیالات وعادت اپنے زمانہ کے مطابق تھے۔ اُن پر چلنے کے لئے اُنہیں کا زمانہ مخصوص تھا۔ اگر ہم اپنے بزرگوں کے خیالات اور اُن کے بزرگوں کے خیالات کا باہم مقابلہ وموازنہ کریں، تو معلوم ہوگا کہ ہمارے بڑوں نے اپنے زمانہ کی رفتار کو دیکھکر اپنے بزرگوں کے بہت سے خیالات کو ترک کر دیا اور اُن کی جگہ پر نئے خیالات اور رسوم پیدا کئے۔ پس اسیطرح ہمکو مناسب ہے کہ ہم بھی انقلابِ زمانہ کو دیکھکر اپنے بزرگوں کی بعض رسوم کو جو اب غلط، ردی، اور موجبِ نقصان ثابت ہوئی ہیں، ترک کر دیں،

دوران کی جگہ اس زمانہ کے مطابق پیدا کریں، تاکہ ہم بھی زمانہ کی تیز رفتاری کا ساتھ دے سکیں۔ جو شخص علمِ تاریخ سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ ہر ایک زمانہ کے لوگ دوسرے زمانہ کے لوگوں سے طرز و طریق میں ہمیشہ علیحدہ اور جدا رہے ہیں۔ پہلے زمانہ کے خیالات اور رسمیں دوسرے زمانہ میں برابر قابلِ ترک نمایاں کی جاتی رہی ہیں۔

برادران! اب وہ زمانہ نہیں ہا کہ ہم لکیر کے فقیر بنے رہیں زمانہ پلٹا کھا چکا۔ ہمارے حالات بدل گئے۔ ہمارے بزرگ مٹی میں مل گئے۔ مگر کس قدر افسوس کی جا ہے کہ ہمارے خیالات نے پلٹا نہ کھایا۔ یہ ہماری غلطی ہے۔ اُس زمانہ کے ساتھ اسکی ساری باتیں بھی جاتی رہی ہیں۔ جب کسی نئی حکومت کا دور ہوتا ہے تو پرانے آئین و قوانین یک لخت بدل جاتے ہیں۔ آج کل انگریزوں کے عہد میں اگر کوئی شخص آئین اکبری کی تلاش کرے، تو محض حماقت ہے۔ پرانا زمانہ بدل گیا اب نیا دور جاری ہے۔ اُس زمانہ کے آئین و قوانین اس زمانہ میں کام نہیں دے سکتے۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اِس زمانہ کے مطابق چلیں۔

لیکن اِس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارے ملکی بھائی سب رسموں کو ترک کر دیں، یا اپنے بزرگوں کے تمام خیالات و تحقیقات کو ردّی اور غلط سمجھیں۔ البتّہ ہم اِس بات پر زور دیتے ہیں کہ اُن رسوم و خیالات کو، جن کی غلطی ثابت ہو چکی ہے اور جو قومی ترقی اور ملکی فلاح کی مانع ہیں، ترک کر دینا چاہئے جس طرح ہمارے بزرگوں اور بڑوں نے اپنے بزرگوں کی بہت سی رسوم کو رفتارِ زمانہ کے متضاد اور قومی ترقی و ذاتی بہبودی کے مخالف سمجھ کر ترک کر دیا اور بجائے اُن کے اُن رسوم و خیالات کو جگہ دی، جو زمانہ کی حالت کے بموجب اور ملک و قوم کے حق میں مفید تھے، ہم کو بھی ضرور ہے کہ ہم بھی اِس زمانہ کی رفتار کو دیکھکر عمل کریں جس سے ملک و قوم کا بھلا ہو!

تعلیمِ نسواں

اِن دنوں تمام شائستہ ممالک میں تعلیمِ نسواں کا بہت زیادہ چرچا ہے۔ عام طور پر تعلیمِ نسواں کو مفید مانا جاتا ہے مگر ہمارے ہندوستان میں اس مفید تحریک کی بھی مخالفت کی جاتی ہے۔ اور اس مخالفت کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب مستورات لکھ پڑھ جاتی ہیں تو وہ

۱۔ مغرور ہو جاتی ہیں
۲۔ اپنی مرضی پر چلنے لگتی ہیں
۳۔ شوہر سے بیباک ہو جاتی ہیں
۴۔ خانگی امور کی طرف بے توجہی کرتی ہیں۔

لیکن یہ اتہامات بالکل بے بنیاد ہیں۔

جس اعلیٰ صفت کو غرور و تکبّر کہا جاتا ہے حقیقت میں وہ "بلند خیالی" ہے۔ علم سے ہرگز غرور پیدا نہیں ہوتا، بلکہ جو ہوتا ہی وہ بھی جاتا رہتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان ایک گہرے دریا کے مثال مطمئن اور بھاری بھر کم ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی تعلیم یافتہ شخص مغرور

ہو تو اس کا موجب تعلیم نہیں ہو سکتی۔ البتہ تھوڑا علم اس کو مغرور بنا دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ تھوڑے علم کو ہمیشہ مضر بتایا جاتا ہے۔ اگر لڑکیاں مغرور ہو جاتی ہیں، تو لڑکے اُن سے کہیں زیادہ مغرور ہو جاتے ہیں۔ روح دونوں میں یکساں ہے۔ طوطے کی طرح رٹ لینے کا نام علم نہیں ہے، اور اگر اسی پر کوئی مغرور ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اُس نے تعلیم کا بہترین حصہ ابھی دیکھا ہی نہیں۔ پس یہ الزام دینا کہ تعلیم سے مستورات میں غرور پیدا ہو جاتا ہے، سراسر بہتان اور یک طرفہ ڈگری ہے۔ پھر یہ الزام اُس صورت میں کچھ وقیع بھی ہو سکتا اگر مردوں میں یہی بات نہ پائی جاتی۔ اگر مستورات علم حاصل کر کے مغرور ہو جاتی ہیں، تو مردوں کے غرور کا کیا سبب ہے؟

دوسرا نقص یہ بتایا جاتا ہے کہ مستورات لکھ پڑھ کر اپنی مرضی پر چلنے لگتی ہیں۔ مگر اصل میں یہ نقص نہیں ہے۔ علم کا لابدی نتیجہ یہ ہے کہ انسان میں اپنی نیکی و بدی، عزت و رسوائی وغیرہ میں امتیاز و شناخت کرنے کا مادہ پیدا ہو کوئی وجہ نہیں کہ جو مستورات جہالت کی وجہ سے اپنے شوہروں اور دیگر لواحقین کی صلاح و مشورہ کی محتاج رہتی تھیں، اب روشن ضمیر (تعلیم یافتہ) ہو کر بھی اُنہیں کی دست نگر رہیں۔ اگر وہ اپنے فیصلہ اور جانچ کے مطابق کسی کام کو کرتی ہیں، تو اس پر مردوں کو بگڑنا اور غصہ ہونا نہ چاہیے، کہ ہماری صلاح نہیں لی، ہمیں کچھ سمجھتی نہیں۔ اس غصہ کے احساس کا الزام بیچاری عورتوں کے سر تھوپنا سراسر ظلم ہے۔ ہاں یہ اچھی بات ہے کہ اپنے بڑوں سے صلاح لی جائے، مگر اپنے آپ کو بالکل اُن پر چھوڑ دینا، کہ کوئی کام بھی اپنی مرضی سے نہ کر سکیں، نادرست ہے۔ اگر کوئی ایسا وقت آ پڑے کہ شوہر نہ ہو، اور گھر کا کوئی دوسرا آدمی بھی نہ ہو اور کام بہت ضروری ہے، تو کس سے صلاح لی جائے۔ کیا عورت اپنے ہی فیصلہ پر عمل نہ کریگی؟ اگر ایسا نہ ہو تو عورت کو "کٹھ پتلی" سمجھنا چاہیے کہ جس رخ پر تار کو حرکت دی اُدھر ہی وہ ہو گئی۔

"شوہر کو حقیر جاننا اور بے باک ہو جانا" یہ تیسرا الزام ہے۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ کسی تعلیم یافتہ اور شریف عورت کی یہ تعریف ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جاہل اور ناخواندہ عورتیں ایسا کرتی ہیں، تو اس کا سبب اُن کے شوہروں کی بدسلوکی ہوتی ہے۔ اگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جاہل عورتوں کی بہ نسبت تعلیم یافتہ عورتیں اپنے شوہروں سے زیادہ محبت رکھتی ہیں۔ اب رہا بے باک ہونا، تو اس کا جواب ہے کہ خوف و ہراس اُس کام میں ہوتا ہے جس کی بابت یہ علم ہو کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ جب تعلیم حاصل کرنے کے بعد عورت نے اپنے بُرے بھلے کی تمیز سیکھ لی، تو وہ ہر ایک درست کام کو نڈر ہو کر کرتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر اُس خاندان کا کوئی ممبر غلط راہ پر جاتا ہو تو وہ اس کو بھی خبردار کر دیتی ہے۔ اگر اسی کو مرد کہتے ہوں کہ بڑی بیباک اور نڈر ہے، ہمارے تابع میں نہیں رہتی، ہمیں نصیحتیں کرتی ہے، تو میں نہیں سمجھ سکتی کہ یہ کس حد تک درست ہے۔

سب سے زیادہ یہ کہا جاتا ہے کہ عورت لکھنے پڑھنے یا لٹریری کام کرنے کے لئے پیدا نہیں کی گئی بلکہ اُس کا یہ فرض ہے کہ اپنے شوہر کی خدمت کرے اور بال بچوں کو سنبھالے۔ جو لوگ ذرا گھر سے خوش ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں پڑھ لکھ کر کچھ دفتر کا کام نہیں کریں گی، اور نہ ہمیں اُنکی کمائی کھانی منظور ہے، پھر ہم انھیں کیوں پڑھائیں۔ غریب کہتے ہیں کہ ہاں علم اچھی چیز ہے، لیکن اگر ہم اپنی لڑکیوں کو پڑھائیں، تو گھر کا کام کس طرح چلے گا۔ اور اگر گھر کی بڈھی عورتوں سے کہا جائے کہ اپنی ناتی پوتی کو تعلیم دلاؤ، تو اُنکی منطق نرالی ہوتی ہے۔ وہ فوراً یہی جواب دیتی ہیں کہ تعلیم پاکر

لہ "فرائض مستورات" کے باب میں کسی آئندہ نمبر میں اپنے خیالات ظاہر کروں گی۔ یہاں گنجائش نہیں۔

لڑکیاں بے شرم ہو جاتی ہیں، آنکھوں پہ ٹھیکرا رکھ لیتی ہیں، چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں کرتیں وغیرہ۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اگر کسی لڑکی میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں تو اس کا الزام علم پر نہیں لگ سکتا۔ علم سے تو بھلے بُرے کی پہچان ہو جاتی ہے، لیکن اگر کوئی علم کی صلاح پر نہ چلے تو اس میں علم کا کیا قصور؟

خورد و نوش کے لئے بھی تعلیم کی بہت ضرورت ہے۔ تعلیم یافتہ عورت ہمیشہ وہی چیزیں پکائے گی اور اپنے بچّوں کو کھلائے گی جو موسم کے لحاظ سے مضرِ صحت نہوں۔ وہ کپڑے میں بھی اسی قسم کا لحاظ رکھے گی۔ بیماری کے دنوں میں ایسی واقفیت بے حد مفید ہوتی ہے۔ اگر تمام لڑکیاں اور عورتیں اس قسم کی واقفیت بہم پہنچالیں، تو میں یقین کرتی ہوں، کہ بہت سی دُکھ بیماریاں دنیا سے جاتی رہیں گی۔ ایسا ہونا کچھ ناممکن نہیں ہے۔ علم میں بڑی بھاری طاقت ہے۔ اگر تمہاری لڑکیاں زیورِ علم سے آراستہ ہیں تو تم خود دیکھ لوگے کہ اُن کا گھر بہشت کا نمونہ ہوتا ہے کہ نہیں۔

اس بات کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں، کہ بچے زیادہ تر اپنی ماؤں کی نقل کرتے ہیں۔ جو قوم اعلیٰ درجہ حاصل کرنا چاہتی ہے، مناسب ہے کہ اُس قوم کی عورتیں تعلیم یافتہ ہوں۔ جو باتیں بڑی محنتوں اور دقتوں کے بعد بھی اسکولوں میں حاصل نہیں ہو سکتیں، اُنھیں کو بچے کھیل کھیل میں اپنی ماؤں سے سیکھ لیتے ہیں۔ اگر ماں تعلیم یافتہ ہے تو اپنے بچّوں کو بھی بہت سی علمی باتیں باتوں ہی باتوں میں سکھا سکتی ہے۔ مثلاً کہانی کے پیرایہ میں بہت سی تاریخی اور مذہبی باتیں بچّوں کو سکھائی جا سکتی ہیں، جو ہمیشہ کے لئے اُن کے دلوں پر نقش ہو جائیں گی۔ مگر جاہل مائیں ہمیشہ اپنے بچّوں کو فضول اور بیہودہ کہانیاں[۱] سناتی ہیں، جن سے کوئی خاص مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ البتّہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ بُرائی کا بیج اُن کے دلوں میں بو دیا جاتا ہے۔ افسوس!

یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ مستورات یونیورسٹی کی ڈگریاں حاصل کریں۔ یہ حیثیت پر منحصر ہے۔ مگر ہاں، اتنی تعلیم ضرور ہونی

۱۔ ایک امریکن ڈاکٹر چارلس رُزنے (جو مدراس میں ویدانت اور یوگ کی تعلیم پا رہے ہیں) ایک ہندوستانی کے ساتھ گفتگو کی جسکا آخری حصّہ "انڈین ریویو" میں شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا تھا کہ "ہندوستانیوں کی بابت میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں، کہ مجھے ہر ایک ہندوستانی کے مُنہ پر بزدلی اور ڈرپوکی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اپنی بیویوں کے سامنے تو وہ شیر کی طرح گرجتے ہیں، لیکن جب دفتر میں جاتے ہیں تو بے زبان بھیڑ بن جاتے ہیں۔ وہ اسقدر ڈرتے ہیں جسکی کوئی حد نہیں۔ انہیں خوف رہتا ہے کہ کہیں ہماری نوکری نہ جاتی رہے۔ برعکس اسکے امریکہ میں یہ حالت نہیں ہے۔ کوئی امریکن جب اپنے مالک یا پریزیڈنٹ روزولٹ اور لفٹننٹ کے ساتھ ملاقات کرتا ہے تو مردِ بن کر اُن کے ساتھ دست پنجہ کرتا ہے۔ اسکی گفتگو میں کسی قسم کی بزدلی نہیں پائی جاتی۔ لیکن ہندوستان میں لوگ اپنے آقا کے سامنے ڈر اور خوف کے مارے تھر تھر کانپتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بزدلی اُن کی بے علم اور جاہل مائیں بچپن کے زمانہ میں انکے دلوں میں بھر دیتی ہیں۔ بدروحوں، جنّات، اور بھوتوں کی ڈرانے والی کہانیاں اُن کو سناتی ہیں۔ اس کا جلد دفعیہ کرنا چاہئے۔ ہندوستانی مستورات کو اعلیٰ تعلیم کی بہت سخت ضرورت ہے، تاکہ انکی زندگی کے کسی پہلو میں جہالت کا نام و نشان نہ رہے اور بجائے اس کے کہ وہ اپنے بچّوں کو ڈرانے اور خوف دلانیوالی کہانیاں سنائیں اُن کے دلوں میں دلیری اور بہادری کا بیج بوئیں اور اپنے ملک کے بہادر لوگوں، اور بڑے بڑے نامی گرامی بادشاہوں، اور شہیدوں اور سنت لوگوں کی کہانیاں سُنائیں۔ اس مقصد کے حاصل ہونے کے لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ پہلے وہ خود اُن سے واقف ہوں۔ پس اہلِ ہند کو مناسب ہے کہ وہ تعلیم نسواں میں عملی حصّہ لیں اور اپنی مستورات کو زیورِ علم سے آراستہ کریں۔ اور کوشش کریں کہ خوف اور ڈرنے کی بزدلانہ عادت اُنکے بچّوں میں پیدا نہ ہونے پائے۔"



مہنت نارائن ناتھہ جی

چاہئے کہ وہ اپنے بھلے بُرے کو سمجھ سکیں، اپنے بچّوں کو عمدہ تعلیم و تربیت دے سکیں، اپنی مذہبی کتاب کو عمدگی کے ساتھ سمجھ کر پڑھ سکیں اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو خط وغیرہ لکھ سکیں اور گھر کا حساب کتاب رکھ سکیں۔ اگر اس سے زیادہ تعلیم ممکن ہو تو اسکو حاصل کرنا چاہئے، ورنہ عام جہالت کے مقابلہ میں اتنا ہی غنیمت ہے۔

پُرانے زمانہ میں مستورات بھی مردوں کے ساتھ کام کرتی تھیں، یعنی علم پر اُنکو کافی عبور تھا۔ بعض عورتیں تو ایسی ہوگزری ہیں کہ اب اُن کے حالات پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً سیتا جی نے جو جوابات رام چندر جی کو دئے تھے، اُن میں صاف صاف منطق کی جھلک پائی جاتی ہے۔ نورجہاں، اور زیب النسا، گزشتہ زمانہ کی مشہور بیگمات ہیں، جو علمی معاملات میں کسی طرح مردوں سے کم نہ تھیں۔ احمدنگر کی مشہور شاہزادی چاند بی بی کو بھی کافی شہرت حاصل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر زمانہ میں تعلیم یافتہ مستورات موجود تھیں۔ جب سے پٹھانوں نے حملے شروع کئے اُس وقت سے تعلیم نسواں کے باب میں غفلت ہونے لگی ہے۔ ورنہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان میں شروع سے ایسی جہالت رہی ہو۔

آج کل اس بات کی سخت ضرورت ہے اور یہ مناسب بھی ہے کہ مستورات کو تعلیم دی جائے تاکہ وہ

۱۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں کسی کی محتاج نہوں۔
۲۔ خانگی امور و معاملات کو درستی کے ساتھ انجام دے سکیں۔
۳۔ ہر ایک کام کو قاعدہ کے ساتھ کرنے سے اپنی اور اپنے بچّوں کی صحت کو بحال رکھ سکیں۔
۴۔ وقت بے وقت اپنے بچّوں کا علاج معالجہ کر سکیں اور ذرا ذراسی بات میں ڈاکٹر کی محتاج نہوں۔
۵۔ اپنی قوّت ارادی کو قابو میں رکھ سکیں۔

غصّہ کرنا، ذرا ذراسی بات میں بگڑنا اور لڑنا، بدمزاج ہونا، یہ سب بُرائیاں جہالت کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ جاہل عورتوں کی لڑائیاں آپ نے بھی دیکھی ہوں گی کہ کس طرح وہ عام شاہراہ پر کھڑی ہوکر گالیاں بکتی ہیں۔ تعلیم یافتہ عورتوں کے درمیان میں بھی جھگڑا ہوتا ہے۔ مگر آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ کوئی تعلیم یافتہ عورت راستے میں کھڑی ہوکر گالی بکتا تو درکنار، کوئی نا ملائم لفظ اپنے زبان سے نکالتی ہو۔ علم سے اُس نے جان لیا ہے کہ ایسا کرنا بُرا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہماری قوم ایک اعلیٰ اور مہذّب بنے تو سب سے پہلے اپنی لڑکیوں کو تعلیم دو۔ کیونکہ قوم تبھی اچھی ہوسکتی ہے جبکہ قوم کی مائیں تعلیم یافتہ ہوں گی۔ فقط

آر۔ ظہور الدین

جھولنا محل گورداسپور۔ گرونانک کے زمانہ میں پنجاب میں کئی نامی بزرگ ہوگزرے ہیں۔ انہیں کے خاندان کے نام پر گورداسپور کا نام پڑا ہے۔ مشہور ہے کہ یہاں کی گدّی پر بیٹھنے والوں نے اپنے اپنے زمانہ میں طرح طرح کی کرامات دکھائی ہیں۔ اورنگزیب بادشاہ کے عہد حکومت میں مہنت ناراین ناتھ یہاں کی گدّی پر براجمان تھے ذات کے یہ سارسوت برہمن تھے۔ ان کے والد مہنت دیپ چند نے ایک عالیشان محل بنوانا شروع کیا تھا۔ اسوقت انکی عمر کوئی نو دس برس کی ہوگی۔ روایت ہے کہ کھیلتے کھیلتے یہ محل کے پاس چلے گئے۔ انھیں دیکھکر معماروں نے کہا "بابا جی! ہم ایسا مضبوط محل بنارہے ہیں کہ اگر ہاتھی بھی اسکی دیوار پر ٹکّر مارے تو یہ ہرگز نہ ہلے" اتنا سُنکر مہنت نارایَن ناتھ نے اپنا پیر دیوار پر رکھکر ہلایا تو دیوار بھی ہلنے لگی۔ دیوار کو ہلتے ہوئے دیکھکر آپنے سادگی اور بھولے پن سے کہا کہ "دیکھو دیوار تو ہل رہی ہے!" یہ دیکھکر سب لوگ متعجب ہوئے۔ معماروں کو حکم ہوا کہ اب دیواروں پر چھت نہ ڈالی جائے۔ اُسوقت سے اب تک یہ دیوار برابر ہلانے سے ہلتی ہے۔ دور دور سے لوگ اسکو دیکھنے آتے ہیں۔ اسی دیوار کا نام "جھولنا محل" ہے۔ تصویر میں جس دیوار پر چند آدمی اور نیچے بیٹھے ہوئے ہیں، یہی جھولنا محل کی دیوار ہے۔ اس دیوار میں ۹ دروازے ہیں، اور وہ ستونوں پر یہ کھڑی ہے۔

ایشیائی شعراء کا کمال (۲)

اگر ہمارے زمانہ کے شاعران عموماً گزشتہ کاملان فن و خدایان سخن کے کلام پر انصافاً نظر کریں گے اور غوامض و دقائق نزاکت و بلاغت سمجھیں گے حالانکہ سب کوئی سمجھنے والا بھی نہیں، تو اپنی شاعری کی بساط اور دعوئ ہمہ دانی پر افسوس کریں گے، اور بعد درجہ نادم ہوں گے ؎

طرز کلام غیر کجا و ایں روش کجا نسناس را کسے نہ شمارد ز نوع ناس

رجال سخن و مردان فن کا جیسا قحط موجودہ زمانہ میں ہے کبھی نہ ہوا ہوگا۔ پھر طرّہ یہ ہے کہ ایک ایک شاعر کوس لمن الملک الیوم بجا رہا ہے۔ اگر آج نہ صرف شعرائے عرب و فارس بلکہ بعض شعرائے اردو غالب و مومن کا کوئی نازک شعر مشتہر کیا جائے تو ہندوستان میں ایک بھی اس کا سمجھنے اور سمجھانے والا نہ نکلے گا۔ حال کو حجت نہیں لیجئے۔ بیدل ؎

بکدام فرحت ازیں چمن ہوس از فضولی اثر کشد
شب خوں بعمرِ خضر زنم کہ نفس شراب سحر کشد
نہ گزشت گردنہ آسماں سر راہ ہرزہ خرامیم
نگرم تاملِ نقشِ پا مژہ بہ پیشِ نظر کشد
نہ شد آں کہ از دم گرم کس بہ تسلّی کشدم ہوس
بہ تپم در آئینہ چوں نفس کہ ز جوہرم تہ پر کشد

حضرت بیدل دوسری غزل میں ذہن کے شق کرنے والے اشعار فرماتے ہیں ؎

بنمود ہستی بے اثر چہ نقاب شق کنم از حیا
تو مگر بمن نظرے کنی کہ دمے عرق کنم از حیا
چہ کنم ز شوخئ طبع دوں قدحے نہ زد غم تم بخجل
کہ بہ بوسم آن لب لعل گوں سحرے شفق کنم از حیا

سبحان اللہ کیسی مشکل زمین اور کیسے بلند و نازک مضامین ہیں۔ ہمارے شعرا بلکہ علماء و فضلاء اگر ان کے سمجھنے کا ارادہ کریں گے تو ہیبت سے شبکۂ دماغ میں تشنج پیدا ہو جائے گا۔ ہم تو نکات بیدل حل کر چکے بلکہ اسی رنگ میں اپنی طبیعت کا نیرنگ بھی دکھا چکے، قصائد خاقانی کے مقابلہ میں قصائد لکھ چکے۔ غالب کے طرز پر ریختہ لکھ چکے۔ کبھی ناظرین ادیب کی نظر سے گزریں گے۔ حضرت غالب مرحوم کے کلام میں بھی کہیں کہیں بیدل کی ہوا ہے۔ پس کلام غالب وہ شخص حل کر سکتا ہے جو کلام بیدل حل کر سکے۔ مگر مجدد کے سوائے کوئی مرد میداں نہیں۔ ہاں پرائے مال پر "یا حسین" کہنے والے شعراء پیدا ہو رہے ہیں۔ اور لیجئے ؎

بحصولِ مقصدِ عافیت نہ دلیل جو نہ عصا طلب
تو ز اشک آں ہمہ پس فہ قدمے ز آبلہ پا طلب
کفِ پائے حجلہ نشینِ ما بخیال کرد کمینِ ما ؛
پئے آرزوئے جبینِ ما بچراغ رنگ حنا طلب
طلب تو بس بود آں قدر کہ ز معنی ببری اثر
بخودت اگر نہ رسد نظر بخیال ہیچ و صدا طلب
مپسند اے فلک آں قدر خللِ طبیعتِ و حشیم
کہ چو موجم آبلہ پائے غم نمِ انفعالِ گہر کشد
بسجودِ درگہش اے عرق تو زبے نمی منما تری
کہ مبادسعیِ جبینِ من بفشارِ دامنِ تر کشد

ناظم شروانی سیمرغ قافِ معانی یعنی خاقانی شاہ اخستان کے مدحیہ قصیدۂ تہنیتِ عید میں کہتا ہے ؎

روزہ پا اندر رکابِ پیشانِ استقبالِ عید — دستہا را از رکابِ می عناں انگیختہ
برجہاں ایں نقرہ گیراں عید کردہ پیش از انکہ — صبح عیدی نقرہ خنگی زیر راں انگیختہ
عاریت بردہ ز کامِ روزہ داراں بوئے مشک — در لبِ مہ کردہ از خمِ عبیراں انگیختہ
در وداعِ روزہ گلگوں می کشیدہ تا ز خاک — جرعہ چوں اشکِ وداعِ دلستاں انگیختہ
شاہدانِ آب دنداں آمدہ بر روئے آب — فتنہ را از خوابِ خوش دنداں کناں انگیختہ
آہوئے شیر افگنِ ما کاہ سیمین بر دست — وز لبِ کاوش لعابِ لعل ساں انگیختہ
خوردہ می خنداں بکاسِ کہربا قرطاسِ سیم — خور طلسمِ لوریاکِ زعفراں انگیختہ*
لعبتانِ چشمہا حیراں کہ با بختِ نرد — چشمہا از لعبتانِ استخواں انگیختہ
رقعہ ہمچوں قطب از شش جا رد و دیرِ بین — از سہ سوے روین نقشِ فرقداں انگیختہ
دف ہلال بیدر شکلِ در شکارستانِ او — از حملِ زجدی و ثورش کارواں انگیختہ
راندہ چوں دامانِ شب چوں غب رہ بر جنبِ چرخ — جادو آسا یک فوارہ از کتاں انگیختہ
بر سرِ دریائے نیلیں تیغ کانِ رونیاس — تا جزیرہ رونیاسِ دلبراں انگیختہ

یہ قصیدہ کورس ایم - اے و منشی فاضل پنجاب یونیورسٹی میں داخل ہے۔ تمام قصائد خاقانی جو بی - اے کورس و منشی عالم میں داخل ہیں اور تمام قصائد جو بی اے کورس الہ آباد میں داخل ہیں، ہم نے حل کر دئیے۔ ایک ماسٹر اور ایک پروفیسر صاحب اُٹھے اور ہمارے حل کردہ قصائد جو کورس بی اے الہ آباد میں ہیں اپنے نام سے داخل کر دئیے۔ لیکن انوری اور عرفی کے قصائد کو کیا کریں گے۔ جن کی غلط در غلط شرح کی ہے اور سررشتہ تعلیم کو گمراہ کیا ہے۔ طالب علموں اور معلموں کے گلے پر چھری چلائی ہے۔ ایک اور پروفیسر نے ہمارے حل کردہ قصائد خاقانی کورس منشی عالم کو ہتھیا لیا۔ افسوس ہے کہ ان بے مایہ "شرح کرنیوالوں" کو یہ خبر نہیں کہ کیا ایسا امر اہم چھپ سکتا ہے؟ اگر عدالت دیوانی و فوجداری میں دعوے دائر ہوا اور اُن سے کہا جائے کہ اگر یہ قصائد تمہارے حل کئے ہوئے ہیں تو خاقانی کے کسی دوسرے قصیدے کا ایک ہی شعر حل کر کے دکھاؤ، تو معلوم نہیں کیا جواب دینگے۔ اچھا اگر مندرجۂ بالا اشعار خاقانی کوئی صاحب حل کر کے ہمارے حبیب ادیبؔ میں چھپوا دیں تو ہم اپنے دعوے سے دست بردار ہوں گے۔ اب ہم اُردو اشعار پیش کرتے ہیں مگر اُن کے سمجھنے کا بھی وہی رنگ ہو گا۔ جو خاقانی اور بیدلؔ کے اشعار سمجھنے کا۔ کیونکہ جو آب از سر گزشت چہ یک نیزہ چہ یک مشت۔ نازک کلام کے سمجھنے کا کسی سر میں دماغ ہی نہیں۔ ورنہ مجددؔ کے بھیجنے کی خدائے تعالےٰ کو کیا ضرورت تھی۔

حضرت غالبؔ مرحوم کا کلام دقیق اور سنگلاخ بتایا جاتا ہے مگر حضرت حکیم مومن خاں صاحب مومنؔ مرحوم کا کلام تمام شعرائے اُردو کے کلام سے نازک تر ہے۔ مومنؔ کا کوئی ذکر ہی نہیں کرتا کیونکہ اُن کا اکثر کلام سمجھ میں نہیں آتا۔ خوبی یہ ہے کہ کوئی اجنبی لفظ نہیں۔ نہ ترکیب پیچیدہ۔ نہ تتابع اضافات۔ تاہم عسیر الفہم اور دقیق۔ مسدس میں فرماتے ہیں ؎

بچا دل آبلہ پائی کو کیونکر خارِ ماہی سے
گرا ہم عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں دل کا

نعت کی تشبیب میں بطور تعلّی فرماتے ہیں ؎

مرہم ہو چارہ گرِ قبضِ تا بدستِ لئیم — کیا ہو میں نے جو تجویز وزنِ مغز فلوس
گواہ عصمتِ مریم ہو کثرتِ اولاد — عقیمہ مجھ سے سنے گر بیانِ تشکلِ عروس
تہِ دشت بزمِ طرب کثرتِ نتائج ہے — نہ کیوں ہو شکل حماری کو نازِ شکلِ عروس
حکیم وہ ہوں کہ جانتے ہیں حواس اگر — کرے معارضہ سر دفترِ عقول و نفوس
جو ہوں معالجِ مبطوں تو قابضِ ارواح — کرے دعاے رواجِ طریقِ جالینوس

غزلوں کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

حیرتِ حسن نے دیوانہ کیا گر اس کو دیکھنا خانۂ آئینہ بھی ویراں ہوگا
نسبتِ عشق سے ہوں نقش میں کیا لیلیٰ ہے یہ رونا کہ دہن گور کا خنداں ہوگا
چارہ گر زیرکی اپنی دوکرے کام سے پردہ شوخ جو بیہوش گریباں ہوگا

آتش پیری نو دیکھی لوئی مجھکو مری شرم نے رسوا کیا
پانی میں ... آپ مرے خون کا دعویٰ کیا
جور کا شکوہ نہ کر ظالم ہے ناز اعدا نے افشا کیا
دعوئ تکلیف سے جلاد نے روزِ جزا قتل مجھے اپنا کیا

یہ اشعار ہمارے نزدیک تو بالکل صاف و شگفتہ ہیں مگر کوئی انہیں حل کرکے دکھائے۔ خاقانی اور بیدل کا کلام تو کجا جو حضرات حل قصائد خاقانی اور حل کلیاتِ غالب کے مدعی ہیں وہ تو ضرور اس پر ... کیونکہ جب انھوں نے خود قصائد خاقانی حل کئے ہیں تو مندرجۂ بالا اشعار بھی خاقانی ہی کے ہیں کیوں حل نہ کریں۔ اور جب کلیاتِ غالب خود حل کیا ہے جو مومن کے کلام سے سخت ترین ہے تو مومن کا کلام کیوں حل نہ کریں۔

ہم آیندہ غالب کے بعض اشعار بھی جو اب تک حل نہیں ہوے اور ہم نے اسی دن کے لئے ان کو حل نہ کیا تھا پیش کرینگے ساری حقیقت کھل جائے گی۔

انسان کو وہ کام کرنا چاہئے جو اس کے قابو اور بساط کے موافق ہو۔ ورنہ رسوائی اور تکلیف سامنے دھری ہے ہمارے وطنی ماسٹر اور پروفیسر صاحب بخوبی آگاہ ہوجائیں۔ تصنیف و تالیف ایک جائداد ہے اس پر قابض ہوجانا یا غصب کرنا آسان نہیں آجکل برٹش عملداری ہے۔

احمد حسن شوکت

مولوی نظام الدین حسن، بی۔ اے، بی ایل

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہونے کے بعد اسلامی تمدن اور قابل مسلمان افراد میں جو ضعف اور کمی ہوگئی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ غدر کے پر آشوب زمانہ کے بعد مسلمانوں کے سوکھے مگر پر قوت تنے اور چیدہ خاندانوں میں جا بجا جو چند افراد عالیہ کا ظہور رہوا ہے وہ مغتنمات سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی قوم مغلوب ہوکر غیروں کے قبضے میں آجاتی ہے تو بہت جلد اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ مغلوب و مفتوح قوموں کی طبیعت پر کسل غالب آجاتا ہے ان کا جوش و ولولہ سرد پڑجاتا ہے۔ فاتحانہ حیثیت سے گرکر مفتوحانہ حیثیت میں اضمحلال روبہ ترقی ہوتا ہے اور آخر کار وہ قوم گھٹنے اور مٹنے لگتی ہے پس ایک ایسے زمانہ میں اگر کسی مضمحل قوم میں کچھ قابل افراد پیدا ہوں تو وہ نہایت ہی عزت کے لائق ہوتے ہیں۔ مولوی نظام الدین حسن زمانۂ حال کے مسلمانانِ ہند میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اودھ کی مردم خیز خاک سے آپ کا بھی تعلق ہے۔ خاندانی وجاہت اور ذاتی لیاقت دونوں باتوں کے لحاظ سے آپ واجب العزت ہیں۔ آپ کے والد ماجد مولوی محمد حسن صاحب عرصہ تک سرکار انگلشیہ میں جج کے عہدہ پر ممتاز رہے اور وظیفہ لینے کے بعد حیدرآباد دکن کی عدالت العالیہ کی ججی پر سرفراز ہوئے۔ مولوی نظام الدین حسن صاحب ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپکی ابتدائی تعلیم تو پرانی مکتبی طریقہ پر ہوئی لیکن چونکہ آپ کے والد ماجد

اُس زمانہ کے عالمگیر تعصبات سے پاک تھے اس لئے انہوں نے مولوی صاحب ممدوح کو مکتبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم دلانا شروع کی اور مولوی صاحب قریباً تمام امتحانات میں اوّل یا کم از کم دوم درجہ حاصل کرتے اور انعامات لیتے رہے۔ میور سنٹرل کالج الہ آباد سے آپ نے ایف۔ اے کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔ اور کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری ۱۸۷۸ء میں حاصل کی۔ شروع ہی سے آپ کو کچھ وراثت سے اور کچھ ذاتی شوق سے قانون اور ریاضی کی طرف میلان تھا۔ چنانچہ آپ نے الہ آباد ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان ۱۸۸۱ء میں پاس کیا۔ اور ۱۸۸۲ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ ایل کا درجہ حاصل کیا اور لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ لیکن گورنمنٹ آف انڈیا نے اسی اثنار میں آپکو صوبہ برار میں اسسٹنٹ کمشنری کا ممتاز عہدہ عطا فرمایا۔ اور ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۲ء تک آپ صوبہ برار میں اسسٹنٹ کمشنری وججی وغیرہ کے مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے سخت محنت وجفاکشی بچپن ہی سے آپکی طبیعت ثانی بن چکی تھی اسپر اعلیٰ درجہ کی دیانتداری اور فرائض میں انہماک ایسی خصوصیتیں تھیں جن سے اعلیٰ حکام انگریز اور گورنمنٹ آف انڈیا دونوں کی نظر میں آپکی نہایت عزت و وقعت قائم ہوگئی۔ چنانچہ محکمہ خارجہ گورنمنٹ آف انڈیا نے حیدرآباد دکن کی عدالت العالیہ کی ججی پر جس کے لئے اسوقت ایک سخت دیانت دار جج کی ضرورت تھی آپ کی سفارش کی اور مولوی صاحب ممدوح ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۲ء تک یعنی تقریباً ۱۰ سال حیدرآباد کی ججی پر قائم رہے۔ اپنی دیانت داری اور انصاف کا سکہ آپ نے حیدرآباد میں ایسا بٹھایا کہ دوست دشمن سب آپ کی انصاف پژوہی وریاضیانہ تحقیق و تدقیق کے قائل ہوگئے۔ اور قانونی تبحر کے باعث آپ محکمہ وضع قانون ممالک محروسہ حیدرآباد دکن کے ممبر منتخب کئے گئے۔ چونکہ عوام الناس سنٹیمنٹ پسند ہوتے ہیں اور محض خشک حکیمانہ وفلسفیانہ تحقیق وتدقیق بمقابلہ نمائش وظاہرداری دنیاسازی ورعایت کے اُن کو چنداں مرغوب نہیں ہوتی بالخصوص دیسی ریاستوں میں جہاں درباداریوں اور سازشوں کے جال ہمیشہ پھیلے رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً انقلابات کے بھونچال آتے رہتے ہیں اور جو شخص اِن درباداریوں اور سازشوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں وہ کبھی ہردلعزیز نہیں بنتے۔ اس لئے ۱۹۰۲ء میں مولوی صاحب ممدوح حیدرآباد سے اپنے سابق عہدہ ڈپٹی کمشنری پر برار واپس چلے آئے اور ضلع یوت مل کی ڈپٹی کمشنری پر متعین کئے گئے ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے بہ سبب آپ کی اعلیٰ دیانت داری جفاکشی اور سخت پابندی قانون وضابطہ کے آپ کو ریاست بھوپال کی وزارت مال پر بسفارش روانہ کیا جہاں آپ دو سال تک رہے اور ریاست کے تمام محکموں میں سخت دیانت داری اور فرائض کی انجام دہی پر آپ کا سارا زور رہا۔

بالآخر آپ نے قریباً ۲۸ سال کی مسلسل خدمات و مشقت ومشغولیت کے بعد ۱۹۰۶ء میں وظیفہ لے لیا۔ اور اپنے وطن کے قریب لکھنؤ میں اقامت اختیار کی۔ مولوی صاحب ممدوح کی زندگی و ذاتی خصائص سے زمانۂ حال کے مسلمان نوجوان چند نہایت ہی اہم اور مفید سبق حاصل کرسکتے ہیں۔

(۱) اوّل خصوصیت آپ کی چستی وجفاکشی ہے۔ ایام طالبعلمی وایام ملازمت میں آپ سخت محنت وجفاکشی کے پابند رہے اور ان آخری ایام میں بھی جبکہ آپ اپنی زندگی کی دوڑ کے اختتام پر قریب آرہے ہیں اپنے فرائض ذاتی و قومی وملکی

ومشاغل علمی میں منہمک رہتے ہیں جسمانی طور پر گو آپ بہت قوی نہیں ہیں لیکن سستی و کاہلی سے آپ ہمیشہ مقابلہ وضد کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت اہل یورپ کا تو عام خاصہ ہے مگر اہل ہند اور بالخصوص مسلمانوں میں اس کی کمی پائی جاتی ہے ذرا سی بھی فارغ البالی و خوشحالی ہم کو محنت شاقہ و ریاضت و فرائض کی انجام دہی سے روکتی ہے مفتوح و مغلوب قوموں کا سب سے بڑا مرض کسل و اضمحلال ہوتا ہے۔ اسی لئے نبی عربؐ اکثر یہ دعا مانگتے تھے کہ اعوذ باللہ من الکسل والہرم یعنی قومی ترقی کا راز چستی اور مسلسل کام کرنے میں ہے دنیا میں جتنے مشاہیر یا نامور شخص ہوتے ہیں اُن کی زندگی نہایت ہی محنت و مشقت و مصروفیت کی رہی ہے۔ زمانہ حال ہی کے بزرگوں کو لو۔ مثلاً نواب وقار الملک جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ محنت و مشقت کی گویا کل ہیں شمس العلما ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم۔ مولوی چراغ علی مرحوم۔ جنرل عظیم الدین خاں مرحوم وغیرہ۔ یہ لوگ اس قدر محنتی تھے کہ معمولی آدمی کو حیرت و استعجاب ہوتا تھا۔ اور انکی کامیابی و ترقی کا راز اسی میں تھا۔

(۲) مولوی نظام الدین حسن صاحب کی دوسری بڑی خصوصیت سخت دیانت داری و بے لوثی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اس زمانہ کے افراد عالیہ میں بھی خال خال پائی جاتی ہے صاحب اختیار و سخت آزمائش کے عہدوں و کاموں پر رہتے ہوئے سخت دیانت دار رہنا اس زمانہ میں تو قریب قریب فوق العادت بات ہے۔ ایام سلف کے مسلمان البتہ اس میں بڑے ممتاز رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو سخت دیانت دار ہوگا وہ مسرف ہو ہی نہیں سکتا۔ ذرہ ذرہ اور قطرہ قطرہ کے لئے وہ اپنے کو خدا کا امانت دار و ذمہ دار سمجھتا ہے۔ مولوی صاحب ممدوح اس معاملہ میں غالباً ہندوستان بھر میں ایک عجیب الخلقت فرد ہیں۔ آپ نے اپنی تمام زندگی کے حرکات و واقعات، آمدنی و مصارف کی ایسی یادداشتیں رکھی ہیں جن سے جزئیات تک کا پتہ چل جاتا ہے۔ باقاعدہ طور پر کئی درجن حساب و کتاب کے رجسٹر سالہا سال سے آپ کے یہاں رکھے جاتے ہیں جس میں ہر خطہ و گفتہ نہایت صحیح اندراج ہوتے ہیں اور جن کی صحت علم ریاضی کی سی صحت تک پہونچتی ہے چونکہ یہ ایک نادر بات ہے اس لئے مولوی صاحب ممدوح کے اس طریقہ کو اکثر لوگ بنظر استعجاب دیکھتے ہیں۔ مولوی صاحب ممدوح کا دماغ حد درجہ ریاضی واقع ہوا ہے اور اس کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ آپ ہر بات کو انتہا ریاضی و منطقی صحت کے ساتھ جانچنا و دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ انتہا ریاضی و منطقی صحت پسند دماغ نہایت ہی اعلیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسے یکطرفہ رُخ سے اُنھیں نتائج پر پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے جو اُس بڑے ریاضی داں کا ہوا جو ایک برات کے ساتھ تھا۔ رستہ میں ایک ندی ملی۔ ریاضی داں نے جا بجا سے اُس ندی کے عمق و وسعت کو ناپ کے ایک اوسط نکالدیا اور حکم دیا کہ سب لوگ ندی کو عبور کر سکتے ہیں۔ مگر مولوی صاحب ممدوح یکرخے شخص نہیں ہیں۔ شدت کے ساتھ ریاضی و منطقی ہونے کے علاوہ آپ کامن سینس میں بھی اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں۔ علی گڈھ کالج کے آپ ٹرسٹی بھی ہیں اور کالج کے حساب و کتاب کے آڈیٹر بھی ہیں۔ آپ کی رائیں نہایت بے رو رعایت و بے لوث ہوتی ہیں۔

(۳) تیسری خصوصیت ممدوح کی اسلامی سادگی و اتقا ہے۔ آپ ضلع کے ڈپٹی کمشنر رہے جج رہے لیکن جمعہ کی نماز میں ہمیشہ مثل ایک معمولی مسلمان کے شریک ہوئے۔ امیر غریب سب سے

آپ کا یکساں برتاؤ ہے۔ ساری عمر نماز و اوقات کی پابندی آپ نے نہایت شدت سے رکھی ہے۔

(۴) اولاد۔ ممدوح صاحب اولاد ہیں۔ اپنے بڑے صاحبزادہ ناظر الدین حسن صاحب کی تعلیم و تربیت کا فرض آپ نے جس خوبی سے انجام دیا وہ نہایت تعریف کے لائق ہے ۱۹ سال کی عمر میں صاحبزادہ موصوف نے نہ صرف علی گڈھ یونیورسٹی کا بی اے پاس کیا بلکہ کیمبرج یونیورسٹی کے ماسٹر آف آرٹ اور ایل ایل ڈی کی ممتاز ڈگریوں کو نہایت عزت کے ساتھ حاصل کیا اور بیرسٹر ایٹ لا بھی ہو گئے اور اب لکھنؤ میں پریکٹس کرتے ہیں۔ اور نہایت ہوشیار و خلیق ہیں۔ مسلمان جو کسی زمانہ میں علم کے ساتھ سپاہیانہ خصائل میں بھی ممتاز تھے یہ خصوصیت بھی ناظر الدین حسن صاحب نے قائم رکھی۔ آپ علی گڈھ کالج کے رائڈنگ رسالے کے کپتان تھے۔

(۵) مولوی نظام الدین حسن نے باوجود ملازمت کے مشاغل و خاندانی فرائض کے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا چنانچہ آپ نے حسب ذیل مختلف چھوٹے چھوٹے جامع رسالے تصنیف کئے ہیں جو نہایت مفید ہیں صحت و اختصار ان رسالوں کی بڑی خصوصیت ہے۔ یہ رسالے طوالت زوائد مبالغہ و تکرار سے مبرا ہیں۔

۱۔ رسالہ اوقاف العبارت
۲۔ صفات باری تعالیٰ
۳۔ طلوع و غروب معلوم کرنے کا طریقہ (انگریزی)
۴۔ الرموز
۵۔ بحث الف لام
۶۔ کعبہ کی سمت معلوم کرنے کا طریقہ (انگریزی)
۷۔ فہرست قرآن مجید
۸۔ صحیفۂ حرمت ربوٰ (وغیرہ)

ان رسالوں میں رسالہ اوقاف العبارت ایک نئی تحقیق ہے جس میں مصنف ممدوح نے ثابت کیا ہے کہ موجودہ یوروپی زبانوں میں جو اوقافی نشانات ہیں ان کی ابتدا عربی میں ہوئی تھی اور اہل یورپ نے اُن کو عرب سے لیا ہے۔ اسیطرح قرآن کی فہرست بھی بہت مفید ہے۔

خدا تعالیٰ ممدوح کو بہت دنوں تک صحت کے ساتھ زندہ رکھے اور مسلمانان ہند ان کے نمونہ سے سبق حاصل کریں۔

جان ملکم

دیوار چین — یہ وہی دیوار ہے جس کی چار دانگ عالم میں شہرت ہے۔ دو ہزار برس ہوئے کہ خاندان چین کے پانچویں حکمراں نے تاتاریوں کے حملہ کو روکنے کے لئے اسے تعمیر کرایا تھا۔ اسوقت سے اب تک یہ جُوں کی تُوں موجود ہے۔ اس دیوار کی لمبائی ۱۴۰۰ میل ہے اور چوڑائی قریباً ۲۰ فٹ اور اونچائی ۱۸ سے ۳۰ فٹ تک ہے۔ اس کی چوڑائی پر تین گاڑیاں برابر برابر چل سکتی ہیں۔ "ہفت عجائبات عالم" میں اس دیوار کا بھی شمار ہے۔

شاہ عبدالجلیل کا روضہ اور بیگم کا روضہ — بادشاہی زمانہ کی الہ آباد میں دو مشہور عمارتیں ہیں ان کے علاوہ اور بھی چند عمارتیں ایسی ہیں جو اپنی تاریخی اہمیت کے باعث بہت مشہور ہیں۔ کسی آیندہ اشاعت میں ہم الہ آباد کی قدیم عمارات کے متعلق ایک آرٹیکل درج ادیب کریں گے۔

شعرم را بمدرسہ کہ برد

کسی مدرسہ کے ملا یا طالب علم نے مولانا نظامی گنجوی مرحوم کے شعر پر بے سمجھی یا بے شعوری سے اعتراض کیا تو مولانا نے بخندہ روئی فرمایا کہ ہائے مدرسہ میں میرا شعر کون لے گیا۔ یعنی کسی نے نافہمی سے شعر کی مٹی خراب کی۔ ایسا ہی کسی صاحب نے مجدد السنہ مشرقیہ سیدنا مولانا شوکت مدظلہ کی تنقید پر جو حضرت ابو الفیض فیضی کے کلام پر بطور سرسری کی تھی کدورت کا غبار رسالہ الناظر میں نکالا گویا برق مشعل تجدید کو پھونکوں سے بجھانا چاہا۔ واضح ہو کہ تنقید صرف فرمان اقلیم سخن کا کام ہے جو جامع علوم و فنون ہو نہ کہ ان لوگوں کا جنکی دلیل اور رہبر سبیل صرف دقیانوسی تقلید ہے۔ اور اسی تقلید نے ہمارے ملک کے حوصلے پست کر دئے ہیں مولانا روم فرماتے ہیں ؎

آن محقق ہرچہ میگوید حق است — آن مقلد ہرچہ میگوید دق است
مشک آلود است اما مشک نے — مشک چہ بود او سوائے پشک نے

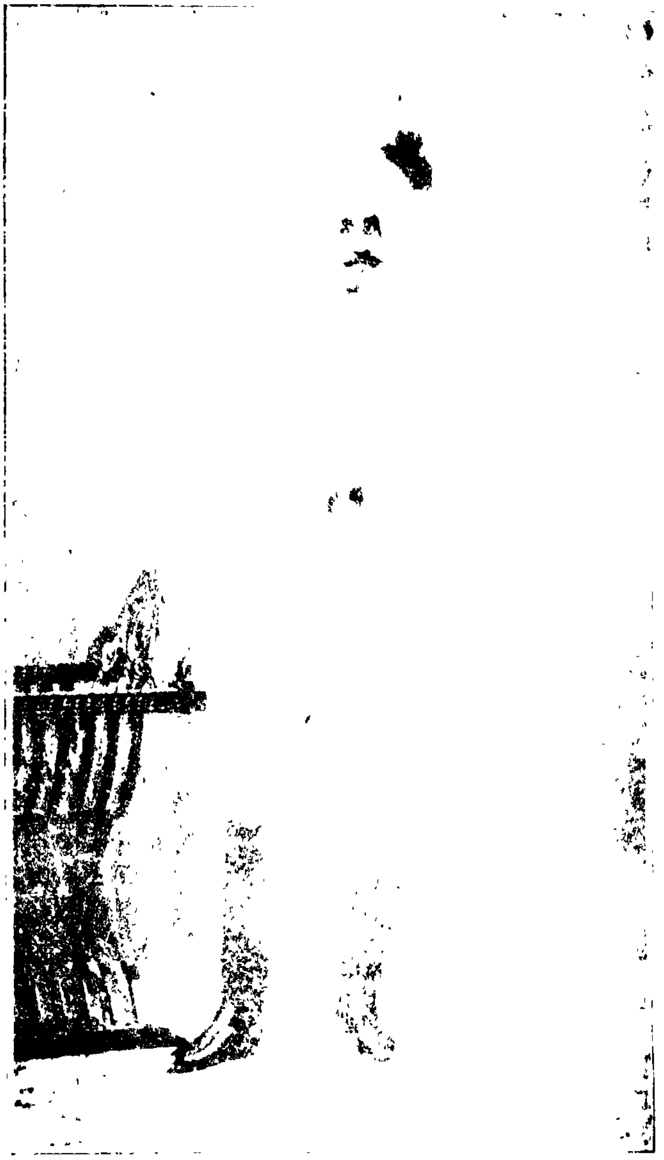
یعنی محقق جو کچھ کہتا ہے وہ ٹھیک ہے اور مقلد جو کچھ کہتا ہے وہ محض بیہودہ سمع خراشی ہے۔ تقلید بظاہر مشک آلود ہے۔ مگر درحقیقت چوہے کی مینگنی ہے۔

حضرت مجدد نے طاہر وحید کی رباعی کو نہ صرف فیضی کی رباعی بلکہ کل شعرا کی جوابی رباعیوں پر بجا طور سے ترجیح دی تھی کیونکہ اول تو سب نے طاہر وحید ہی کی ادھوری تقلید کی ہے اور ظاہر ہے کہ قافیہ پیمائی اور مضمون پر مضمون لکھنا نہایت خفیف اور آسان بلکہ نوآموزوں کا کام ہے۔ ایجاد مشکل ہے مگر مقلد یہ رمز نہیں سمجھ سکتا اس کا سرمایہ تو بکر و خالد کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ اب میں طاہر وحید کی رباعی کی بلاغت کا سمجھانا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ ناظرین دھوکے میں نہ پڑیں۔ طاہر وحید ؎

زنگی بعراوائی لشکر نازد — رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزاین پر از زر نازد — عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

مصرعہ اولیٰ کو یوں بتایا جاتا ہے ؎ زنگی بسپاہ و خیل و لشکر نازد

اس مصرعہ نے تو غریب طاہر وحید کی رباعی کی بلاغت کا خون کر دیا آپ لکھتے ہیں کہ "ایک مصرعہ میں تو سپاہ و خیل و لشکر ہے اور دوسرے مصرعہ میں مقابلہ پر سنان و تیغ و خنجر ہے" مگر یہ خبر نہیں کہ سپاہ و خیل و لشکر تو زنگی کا ہے اور سنان و تیغ و خنجر رومی کا۔ تقابل کہاں رہا۔ پھر مصرعہ اولیٰ میں سپاہ خیل لشکر گویا تین جدا جدا چیزیں ہیں لشکر اور شے ہے اور سپاہ دوسری چڑیا ہے۔ اور خیل کو تو سپاہ و لشکر سے گویا کچھ واسطہ ہی نہیں اور سپاہ و لشکر میں گھوڑے تو ہوتے ہی نہیں اور دوسرے مصرع میں جو سنان و تیغ و خنجر ہے تو لشکر سپاہ ان ہتھیاروں سے بالکل الگ تھلگ اور نابلد ہوتی ہے واہ کیا خوب تقابل ہے۔ کیا حیوان ناطق انسان کی ضد ہے اور کیا حیوان و انسان میں تقابل تضاد ہے جیسا شیعہ سنّی میں اور مقلّد و غیر مقلد میں۔ بلکہ مومن و کافر میں۔ سبحان تیری قدرت فراوانی لشکر اور سنان و تیغ و خنجر میں بڑا ہی تقابل ہے یعنی ممکن ہے کہ زنگیوں کا لشکر (مانگی بھیڑ بھاڑ) ہو مگر جری نہ ہو نہ اسکی سنان و تیغ و خنجر کارگر ہو۔ پس زنگیوں کو گھٹایا ہے اور پہلا شعر صاف طور پر اکبر کے گھٹانے کی تمہید ہے مگر اس بلاغت کے سمجھنے کو بازار سے کوئی جنس فہم نہیں خرید سکتا۔ دوسرا شعر کتنا بلیغ ہے اور کیسی چبھی



مہاراجہ راجندر نارائن بھوپ بہادر والئی ریاست کوچ بہار

انڈین پریس الہ آباد

ہوئی تعریض ہے اور عباس کے ساتھ ذوالفقار حیدر کتنا موزوں اور متناسب ہے۔ طاہر وحید کا مطلب یہ ہی کہ خزانے اور کوٹھی کٹھلے تو کروڑپتی اور ارب پتی سیٹھ ساہوکاروں اور سوداگروں کے پاس بھی ہوتے ہیں مگر تیغ نہ ہو تو وہ کس کام کے ہیں کوئی قاروں کا چچا سیٹھ ساہوکار کشور کشا اور نہ فاتح نہیں ہوسکتا۔ افسوس ہے کہ حشو کو کلام کا نقص نہیں سمجھا جاتا بلکہ اُس پر فخر کیا جاتا ہے۔ حشو تو بدترین عیوب میں سے ہے۔ کلام وہ ہے جو ٹھکا ہوا ہو۔ در زنا مرکو نہ ہو۔ تصرف دخل نہ پاسکے۔ اور شعراء کاملین فارس و عرب کا کلام ایسا ہی ہے بلکہ بھاشا کے کویشروں (شاعروں) کا بھی یہی اسلوب ہی۔ دوہہ

قافیہ بندی سے بہتر ہے کہ چھپّر باندھے

اب طاہر وحید کی رُباعی کے مقابلہ میں فیضی کی رباعی ملاحظہ ہو ؂

دریا بگہر فلک بہ اختر نازد　　فردوس بسلسبیل و کوثر نازد
عباس بہ ذوالفقارِ حیدر نازد　　کونین بذات پاک اکبر نازد

تیسرا مصرعہ تو طاہر وحید ہی کا دوہرا دیا جو فیضی جیسے علاّمہ کی شان سے بہت بعید ہے۔ کیا لفظ عبّاس دوسری طرز سے نہ بندھ سکتا تھا۔ صاف علامت عجز نمایاں ہے۔ پھر طاہر وحید کی رباعی تو بالکل مسلسل اور مربوط ہے اور فیضی کی رباعی کی بندش منقطع اور متلون ہے گویا کئی رنگ کا ایک نیرنگ ہی۔ دریا اور گوہر کو فلک و اختر سے لگاؤ نہیں اور ان دونوں کو سلسبیل کوثر سے ربط نہیں۔ چوتھا مصرعہ نہایت سبک ہے جس میں لفظ پاک خوگیر کی بھرتی ہے۔ کونین تثنیہ کو فیضی رباعی لکھتے وقت مفرد سمجھا پس نازد مفرد کے ساتھ ملادیا۔ آپ کہتے ہیں یہ جائز ہے تو بہ تو بہ شعراء فارس کے کلام سے قیامت تک بھی ایسی لغو سند نہیں مل سکتی۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ زید و عمرو مے آید یا عمرین مے آید۔ کیا اُردو زبان میں کوئی بول سکتا ہے کہ ہم دونوں آتا ہے۔ ہاں صاحب لوگ ایسا بولنے سکتا ہے کہ "ول! ہم ..... کل بولا تھا کہ اس ما پھک (اسکے موافق یا اس طرح) بیرا اور کھانساماں (خانساماں) اپنا اپنا ڈیوٹی پورا کرے" ایک اَن پڑھ کے سامنے بھی جمع یا تثنیہ کو مفرد بولئے گا تو وہ حیرت سے مُنہ تکنے لگے گا۔

حضرت مجدد تحریر فرماچکے ہیں کہ فیضی نے اکبری دربار ..... جوابی رُباعی فی البدیہہ لکھی ہے۔ اگر کوئی بات رہ جائے تو اِس سے فیضی کے جوہر کمال پر حرف نہیں آسکتا وہ اِس ..... تھے فرشتہ یا معصوم نہ تھے۔ ممکن ہمیشہ ممکن ہے۔ جو کام ایک انسان کرتا ہے دوسرا بھی کرسکتا ہے حضر..... فیضی کے مصرعہ کو یوں بدلا تھا ؂

ہر ذرہ بذات مہرِ اکبر نازد

مہر اور اکبر دونوں ذومعنی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں "..... نہیں بولتے" اوّل تو اکبر مضاف الیہ ہے نکہ صفت ..... بھی ہو تو ایک مقلد البتہ اس کو ناجائز بتاسکتا ہے۔ ..... نیّر اکبر۔ مہر اکبر میں کیا فرق ہے۔ واضع نے الفاظ وضع کیے ..... نہ کہ تراکیب۔ یہ انسان کا کام ہے۔ اگر نئی ترکیبیں ..... وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہیں تو ہر زبان کی ترقی ..... میں نہ ہک جائیں اُردو ہی کو دیکھئے کہ انگریزی زبان کی بدولت اُس میں کس قدر نئی ترکیبیں نئے محاورات پیدا ہورہے ہیں جن سے اُردو زبان کو ترقی ہورہی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ "ماہ انور یا مہر خاور مشہور ہے نکہ مہر اکبر اور کیا کوئی مہر اصغر بھی ہے" میں کہتا ہوں کیا کوئی ماہِ اظلم یا ماہ تاریک یا مہر باختر یا مہر مغرب بھی ہے یا مہر شمال اور

مہرجنوب بھی کسی نے دیکھا ہے۔

اب ملاحظہ کے اصلاحی شعر کو لیجئے ؎ عنقائے نظر بلند پرواز۔ آپ نظر کے معنی نگاہ یا آنکھ کے سمجھے ہیں۔ یعنی آنکھ عنقا ہے اور بلند پروازی کر رہی ہے۔ یعنی معدوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا اندھی ہے اور ازل سے تقلید کی بوسی گھن لگی لاٹھی لیکر ٹٹولتی آئی ہے۔ بھلا اندھا کیا تاک دیو کرے گا اور اُٹھنے کے لئے کہاں سے سرخاب کا نہیں چمگادڑ کا پر لائے گا اور وہ بھی دن دہاڑے جب نظر کے معنی آنکھ یا نگاہ کے ہیں تو یوں چاہیے ؎

اے از پئے دید تو آغاز عنقائے نظر بلند پرواز

اب سمجھئے یہاں نظر کے معنی علم نظر (عقلیات و فلسفے) کے ہیں یعنی خدائے تعالےٰ کی ماہیت کا ادراک عقل کا کام نہیں اور اس کی سعی بیکار ہے چنانچہ اگلے شعر میں اس کی توضیح ہے ؎

فکر تو میل خیال بگداخت اوجِ تو زمرغ بال بگداخت

اگر آپ واقعی فیضی کا کلام سمجھ سکتے ہیں تو مندرجہ ذیل شعر کا مطلب بتائے جو حمد ہی میں ہے ؎

وانگاہ مجرّد از وسائط ترکیب فزود بر بسائط

پھر آگے معراج میں شعر ذیل کا مطلب بھی بتائے ؎

کان ذوجسدین چون قلم چند دندر دو سرے چنیں علم چند

جو شخص بساط سے بڑھ کر قدم رکھتا ہے ندامت و پشیمانی اٹھاتا ہے جسطرح شعرا فارس و عرب کے کلام کا سمجھنا آسان نہیں اُسیطرح تنقید کا سمجھنا بھی آسان نہیں۔ یہ کام علماء اور فضلاء اور پروفیسروں کا ہے۔ اُن میں سے بھی شاذ و نادر کا۔ اگر آپ فیضی کا کلام سمجھ سکتے ہیں تو اُس کے ایک قصیدے کا شعر ذیل سمجھئے حالانکہ یہ شعر کچھ مشکل نہیں ؎

بدلو جاہ طبیعت کہ خاک برسر آں کند کنگرہ طارم بریں مکشائے

نحوی ترکیب بتائے اور یہ بھی کہ مصرعہ اولیٰ میں خاک برسر آں چسپاں ہے یا نہیں کیا کوئی اور لفظ چاہیئے اور کیا موزوں ہوگا۔ اب حضرت مجید حماسہ اور متنبی وغیرہ شعراء عرب کے کلام یا بھاشا کے شعرا کی نظم پر تنقید کریں گے تو کیا آپ اُس کو بھی سمجھیں گے۔

اعجاز میرٹھی

مہاراجہ کوچ بہار۔ مہاراجہ سر نرپیدر نارائن بھوپ بہادر جی سی۔ آئی۔ ای، سی۔ بی، حضور ملک معظم کے جشنِ تاجپوشی کی تقریب پر انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ ناسازیٔ طبع کی شکایت تو پہلے ہی سے تھی، مگر جشنِ تاجپوشی کے بعد مرض نے ایسا زور جمایا کہ جانبر نہو سکے۔ اپنے والد ماجد کی وفات کے وقت آپکی عمر صرف ۲ سال کی تھی ابتدائی تعلیم آپنے بنارس میں پائی اور بعدازاں پٹنہ کالج اور پھر کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج میں داخل ہوئے۔ آپکے لڑکپن کے زمانہ میں آپکی ریاست نے سرکار انگلشیہ کو جنگ بھوٹان میں بہت مدد دی تھی جس کے صلہ میں ریاست کو دو توپیں انعام دی گئیں۔ ۱۸۷۸ء میں جبکہ آپکی عمر ۱۶ برس کی تھی آپ تکمیل تعلیم کے لئے دو انگریز افسروں کی نگرانی میں ولایت تشریف لیگئے وہاں سے واپس ہونے پر آپکو اختیارات عطا کئے گئے۔ اس کے بعد آپنے بابو کیشپ چندر سین کی دختر نیک اختر کے ساتھ شادی کی ۱۸۷۷ء کے دہلی دربار کے موقعہ پر آپ کو ایک تمغہ اور ایک تلوار انعام ملی نیز سرکار نے آپ کو جی سی۔ آئی۔ ای کا اعلیٰ خطاب بھی عطا فرمایا۔ تیراہ کی مہم میں آپ نے سرکار کی طرف سے آفریدیوں کا خوب خوب مقابلہ کیا اور دادِ شجاعت دی۔ رعایا کا آپ کو بہت خیال رہتا تھا۔ سوشل ریفارم (تمدنی اصلاح) میں بھی آپ حصہ لیتے تھے۔ علم دوست بھی تھے۔ اپنے دارالریاست میں آپ نے ایک کالج قائم کیا جس سے رعایا کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع حاصل ہو۔ شکار کا آپ کو بہت شوق تھا، یہاں تک کہ اس موضوع پر آپ نے ایک عمدہ کتاب تصنیف کی ہے کئی مرتبہ آپ (مع مہارانی صاحبہ) انگلستان تشریف لے گئے۔ برٹش فوج کے آپ آنریری میجر تھے۔ آپ کی وفات پر حضور ملک معظم جارج پنجم نے بھی بذریعہ تار اظہار افسوس کیا۔ آپ کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ بڑے صاحبزادے جانشین ہوئے ہیں جنکی تصویر ہدیۂ ناظرین ہے۔

فراق

کوکلا تجھسے طبیعت جو بہل جاتی ہے — تو جو آتی تو مرے دلمیں یہ لہر آتی ہے

اپنا دکھ تجھکو سناؤں میں بہن تو جو سنے — صبح سے آج طبیعت مری گھبرائی ہے

پیا پردیس گئے جب سے کچھ ایسے چپ ہیں — نہ تو خط آتا ہے کوئی نہ خبر آتی ہے

نہیں معلوم کہ کیا اُن پہ گذرتی ہوگی — اُنکا دھیان آتا ہے تب جان پہ بن آتی ہے

ساس سے کچھ نہیں کہہ سکتی نہ کچھ دیور سے — مجھے تو نند سے بھی پوچھتے شرم آتی ہے

پوچھوں کس سے میں بہن اُسکا تو یہ حال ہے اب — سیدھی سی بات جو کرتی ہوں بگڑ جاتی ہے

مجھکو دیوانہ بنا رکھا ہے سب نے گھر میں — میں جو روتی ہوں تو لوگوں کو ہنسی آتی ہے

تیری ماں بھی یہ مری ساس سے کل کہتی تھی — کونسا غم ہے بہو کو جو گھلی جاتی ہے

مُنھ لپیٹے ہوئے ہر وقت پڑی رہتی ہے — سُست رہتی ہے نہ ہنستی ہے نہ کچھ کھاتی ہے

ساس بولیں کہ بناوٹ لی ہیں ساری باتیں — میکے جانے کے لئے سوانگ یہ پھیلاتی ہے

یہ سُن سُنکے کُڑھا کرتی ہوں دن رات بہن — کیا کروں موت بھی تو مجھکو نہیں آتی ہے

اپنا دکھڑا میں کہوں تجھسے کہاں تک پیاری — تو جو آتی ہے طبیعت یہ بہل جاتی ہے

تو یہ کہتی ہے کہ اب آتے ہیں پیا — جیتی رہ میری بہن کیا مجھے بہلاتی ہے

تو ذرا کہہ تو کہ اک تار جوابی بھیجیں — مجھکو تو ساس سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے

پھر مری بات پہ کیا جانے وہ کیا کہہ بیٹھیں — طعنہ بازی سے طبیعت مری گھبراتی ہے

ساس نندوں کی محبت کو تو میں دیکھ چکی — آگے کیا دیکھئے قسمت مری دکھلاتی ہے

دھک سے رہجاتی ہوں سنتی ہوں جو پردیس کا نام — اک اُداسی سی مرے چہرہ پہ چھا جاتی ہے

دل بھر آتا ہے مرا غیر کا دُکھ سننے سے — رنج کی بات نہیں مجھسے سہی جاتی ہے

آنکھ لگتے ہی بُرے خواب نظر آتے ہیں — بند کانوں میں بھی رونے کی صدا آتی ہے

ایسی کمزور طبیعت ہوگئی ہے ان روزوں — ہر طرف رنج ہی کی شکل نظر آتی ہے

کوکلا میرے حواسوں کا تو یہ عالم ہے — کل کی بات آج جو پوچھو نہیں یاد آتی ہے

اپنے سایہ سے بھی ڈرتی ہوں اکیلے میں بہن — گھر کی بھی شکل بھیانک سی نظر آتی ہے

بیکسی پر جو مری اُس کو ترس آتا ہے — کبھی دو چار گھڑی ساس بھی سمجھاتی ہے

میرا دیور بھی تسلّی کبھی کرتا ہے مری — نند بھی میری دلاسا مجھے دے جاتی ہے

کیا کہوں میری طبیعت بھی ہے ایسی کمبخت — کچھ جتن کیجئے پر یہ نہیں کل پاتی ہے

دن تو رو رو کے کسی طرح سے کٹ جاتا ہے — چھاتی پھٹتی ہے مری رات جہاں آتی ہے

شام سے صبح تلک تارے گنا کرتی ہوں — بیٹھے چین آتا نہ لیٹے مجھے نیند آتی ہے

تھرتھرا جاتی ہوں گھبرا کے میں چونک اُٹھتی ہوں — منہ سے چادر بھی جو سوتے میں سرک جاتی ہے

دھیان رہتا ہے پیا کا مجھے دن رات بہن — تیری پیاری تو اسی غم میں گھلی جاتی ہے

نہیں معلوم کہاں ہونگے وہ کیسے ہونگے — سوچ اُنھیں کا ہے انھیں کی مجھے یاد آتی ہے

یاد پردیس میں مجھکو بھی وہ کرتے ہونگے — کچھ سبب ہے جو طبیعت مری گھبراتی ہے

اُنکے آنے تلک اب آس کسے جینے کی — تھوڑی سی عمر ہے سو غم میں کٹی جاتی ہے

میرے گھر والے تو نادان سمجھتے ہیں مجھے — میری تسکین کو تو بھی مجھے پھسلاتی ہے

تو تو کہتی ہے چلو باغ میں جھولا جھولیں — رُت ہے ساون کی وہ گھنگھور گھٹا آتی ہے

صدقے جاؤں میں ترے پیار محبت کے بہن — تُو تو سب طرح سے دل کو مرے بہلاتی ہے

پر مرا حال جو کچھ ہے وہ کہوں کیا تجھسے — مجھے دنیا کی کوئی بات نہیں بھاتی ہے

ضعف غم سے یہ ہوا حال کہ اب نبض مری — چھوٹ جاتی ہے تو گھڑیوں نہیں پھر آتی ہے

دل تڑپ جاتا ہے پھٹ جاتی ہے چھاتی میری — روتی ہوں شعر کسی کا جو یہ تو گاتی ہے

"وہ شکل امید تو کب ہم کو نظر آتی ہے"

"صورتِ یاس بھی بن بن کے بگڑ جاتی ہے"

بشن نراین در

تاریخ وفاتِ تسلیم مرحوم لکھنوی

صد حیف گیا جہاں سے وہ قافیہ سنج — تھا ذہن رسا سے جو معانی کا گنج

محوی یہ کہو سالِ وفاتِ مرحوم — مرگ تسلیم کا جگر دوز ہے رنج

۱۴ ۲۹

محوی لکھنوی

رُباعیات

ہوتی ہے نزاکت ہی سے تمکیں پیدا　　معشوق کی سادگی سے تزئیں پیدا
ہے عشق بتاں میں صورت حق زاہد　　فرہاد کی سنگ سے شیریں پیدا ۔

امید بقائے عیش نادانی ہے　　اے خضر تمہاری عمر بھی فانی ہے
شہرت سے کبھی نہ خوش ہوں مردان غنا　　خود نقش نگیں کا چین پیشانی ہے

ٹیکا کر عزم سے ہر سے پیر کا باندھ　　لیکن نہ تصور تو کبھی غیر کا باندھ
ہر شے میں ہے موجود فقط ایک وجود　　احرام تو کعبہ کا کبھی دیر کا باندھ

کیا چاہئے مجھ بے سر و ساماں کے لئے　　بیہوں تڑپتا ہے دل ارماں کے لئے
وحشی کو ہو کیوں نہ ننگ عُریانی سے　　ہاتھ اس کا ترستا ہے گریباں کے لئے

غواص کو یاں ہے جستجو کی مشکل　　گوہر کو بھی واں ہے آبرو کی مشکل
ممکن نہیں ہرزہ گو سے پاس انفاس　　ہے گل کو حفاظت اپنی بو کی مشکل

کیا دفتر شوق دوست تک پہنچاؤں　　اے بخت رسا تجھے کہاں سے لاؤں
ناغر ہوں میں کیا غرض کبوتر سے مجھے　　خود بیٹھ کے خط کے دوش پر اڑ جاؤں

چکھا وہ مزہ حسن کی شیرینی سے　　بیزار ہوئے وہ نخوت آئینی سے
کیا منہ ہے کہ دیں جواب آئینہ کو　　خود ناک میں دم ہے انکا خود بینی سے

پھل تلخ ملے ہمیشہ بد بینی کے　　کھٹے ہوئے اس سے دانت شیرینی کے
بیماں شکنی بتوں کی ہے دل شکست　　ہیں بال گواہ مو بمو چینی کے

جینے کی خوشی کے بدلے غم اور نہو　　پیری کا شباب میں الم اور نہو
ہو جا کے عدم میں پشت ہلکی پھلکی　　اب بارسے زندگی کے خم اور نہو

شوکت میرٹھی

سرکشی و احتضار

اک نجس قطرہ سے کی حق نے ہماری خلقت　　سرکشی اُسپہ کریں ہم یہ خدا کی قدرت
نام لیتے ہوئے جس چیز کا شرم آتی ہو　　دیکھئے بدلی ہے کس طرح سے اُسنے رنگت
کیوں نہ ہو صنعت صانع پہ تحیر سب کو　　ایک کی دوسرے سے کچھ نہیں ملتی صورت
ایک مٹی سے بنے سب ہیں مگر دیکھئے فرق　　مختلف رنگ جدا پائے ہیں سب نے قامت
کوئی ایسا ہے حسینوں میں نہیں جسکا مثل　　گندمی رنگ کسی کا کوئی کالی صورت
حسن پر ناز زمانے میں اگر اُسکو ہے　　اسکو دعوٰی کہ ملاحت کی ملی ہے دولت
کیوں نہ ڈالیں ہمیں حیرت میں اثر اُسکے　　طالب حُسن کوئی اور کسی کو نفرت
کوئی کہتا ہے کہ ہے عشق حسینوں کا جنوں　　کوئی کہتا ہے گئی عقل ہے اُسکی حضرت
کوئی ممتاز زمانے میں ہے مردود کوئی　　خاکساری ہے کسی میں تو کسی میں نخوت
کوئی ایسا ہے کہ گھر راہ خدا میں دیدے　　کوئی کہتا ہے نہو صرف ہماری دولت
کوئی ایسا ہے کہ دس بیس ہیں اُسکے مہماں　　کوئی ایسا ہے عزیزوں سے ہے اسکو نفرت
ایک گھر میں ہیں اگر دس تو مزاجوں میں ہے فرق　　ہے کوئی نرم کسی میں ہے نہایت شدت
کوئی ایسا ہے کہ روتے ہوئے بچوں کو ہنسائے　　کوئی ایسا ہے کہ جاتی نہیں اُسکی نخوت
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ کیوں ہے نمود　　حال کھلتا نہیں پائی ہے کہاں کی عزت
کیوں ہوئے جاتے ہیں یہ جامہ سے باہر اتنا　　مال دنیا جو ملا اُس سے بڑھی کیا شوکت
طالب نام اگر ہیں تو کریں کسب ہنر　　کوئی عالم میں نہیں علم سے بہتر دولت
دیکھو اکثر یہ کتابوں میں لکھا ہے وہ سنو　　نو سبق اُس سے جہاں میں ہے اگر کچھ عزت
ایک زردار کا اب ہوتا ہے دُنیا سے سفر　　قابل رحم ہے ہر طرح سے اُس کی حالت
کبھی اولاد سے کہتا ہے کہ دو میری کمک　　کبھی احباب سے کہتا ہے نبھاؤ الفت
اشک بھر آتے ہیں دل تھام کے رہ جاتا ہے کبھی　　کبھی کہتا ہے کہ کام آئی نہ اپنی دولت

کیوں فراہم کیا اور وں کے لٹانے کے لئے   عملِ خیر سے کیوں دلکو تھی میرے نفرت
لب پہ یہ ذکر تھا اکبار جو آنکھیں جھپکیں   دیکھتا کیا ہے نرالی ہے یہاں کی صحبت
کوئی کہتا ہے ذرا دیکھ تو تو میری طرف   کسقدر قابلِ افسوس ہے تیری محنت
رات کو رات نہ تو دن کو کبھی دن سمجھا   تیرے دلمیں تھی عجب طرح کی میری الفت
تیری اولاد کرے گی تجھے درزات تلف   کام کچھ تو نے نہ مجھسے لیا دیکھی ذلت
کچھ بتا چھوڑ چلا ہے مجھے غافل کسپر   کون پہنچاسے گا اب تجھکو لحد میں راحت
سُنکے یہ آنکھوں میں بیکس کے بھر آئے آنسو   کف افسوس ملے دیکھ کے سب کی صورت
ناگہاں سامنے اک شکل مجسّم آئی   اور گویا ہوئی ہنسکر کہ قریں ہے رحلت
اب بھی کچھ قدر مری دلمیں ترے ہے کہ نہیں   ننگ وہ کیا ہے جن سے تھی ہمیشہ الفت
ساتھ ہر وقت رہا کرتے تھے سایہ کی طرح   ہوگئی آج انہیں لوگوں کو تجھسے نفرت
قبر تک بھی تو نہیں ساتھ یہ دینے والے   اور کیا کام بھلا آئے گی ان کی ہمت
ہم ترے ساتھ ہیں تا پرسشِ محشر غافل   کام بن جائیں گے سب نیک اگر ہے نیت
لب پہ دم آگیا کیا دیر ہے توبہ کر لے   تیرے عصیاں سے سوا ہے کہیں حق کی رحمت

طول ہوتا ہے یہ ہے نظم کا ماہر کی مآل
عملِ خیر کروگے تو ملے گی جنّت

ماہر کنتوری

فسانۂ دشینت و شکنتلا

باب اوّل - ولادت شکنتلا

یا ہادیِ گمراہ و تبہ کار مدد   یا رحم نمائے بندۂ زار مدد
یا چارۂ دردِ دلِ ناچار مدد   یا حامیٔ مطلق و مددگار مدد

اے عشق اتری خودی نے کیا کیا نہ کیا   اب کیا رہا خود خدا سے بیگانہ کیا
حاصل یہ کہ سحر تو نے حسبِ اطوار   اچھا کیا یا بُرا - اچھا نہ کیا

کہتا ہے جو داستانِ دلکش   یوں خامہ سے ہے بیانِ دلکش
قصّہ ہے کہ جوئے گوتمی پر   تھا ایک فقیر نیک محضر
لیبو امتر اُس کا نام نامی   تھا حسنِ عمل میں وہ گرامی
از بسکہ اسیرِ معرفت تھا   گویا تصویرِ معرفت تھا
وحدت کی چمک عیاں تھی اُس پر   قدرت کی جھلک عیاں تھی اُس پر
صحرا میں عجب سماں بندھا تھا   جو گل تھا خوشی سے ہنس رہا تھا
لاتی تھی صبا ہوائے جنّت   تھی پیشِ نظر فضائے جنّت
اک صفحۂ راز برگِ تر تھا   اک صوفیِ مست ہر شجر تھا
موجوں کی وہ آب میں روانی   کہتی تھی فسانۂ نہانی
پانی میں حباب کی وہ مستی   کرتی تھی عیاں فریبِ ہستی
اٹھا تھا جو پردۂ حقیقت   ہر شے میں تھا جلوۂ حقیقت
اک سمت وہ عابدِ خرد مند   تھا محوِ عبادتِ خداوند
بوئے گلِ خاص پیرہن میں   راحت تھی ہری کی اُسکے تن میں
تھا یادِ خدا میں وہ جو مخمور   تھا رشک سے دل ملک کا معمور
اک اک نے حسد سے اُسکو تاڑا   یوں کھیل بنا ہوا بگاڑا
بلوا وہیں حورِ مینکا کو   ظاہر کیا لب نے مدّعا کو
درویش کی بندگی بگڑ جائے   عرفاں کے چمن پر اوس پڑ جائے
بولی وہ کہ سہل بات پائی   یہ کہکے چلی زمیں پر آئی
جب پہنچی وہ مہرشی کے بن میں   پھول اک نیا کھلا چمن میں
بن ٹھن کے وہ سج سجا کے پہنچی   اور نزدِ فقیر جا کے پہنچی
بے پردہ تھا نورِ حسنِ دلکش   ظاہر تھا غرورِ حسنِ دلکش
مستیِ خرام کا یہ تھا حال   فتنہ تھا قدم قدم پہ پامال
آئی وہ لگاتی سوز کی آگ   گاتی ہوئی حسن و عشق کا راگ
خاموش طیورِ خوش نوا تھے   مدہوشِ صدائے نغمہ زا تھے
کرتی تھی الاپ سے وہ بسمل   لوٹا جاتا تھا رقص پر دل

مجرا میں غرض جو گونج اُٹھی تان   چھوٹا عابد کا گیان سے دھیان
دیکھا تو تھی اک نگارِ خوش رو   بس دل میں سمائی عشق کی بو
آنکھوں نے دیئے وہ جامِ سرشار   زاہد کے ہوئے حواس بیکار
جوبن میں بھرا ہوا تھا جادو   چتون میں بھرا ہوا تھا جادو
دیوانہ بنا دیا ہر ادا نے   زائل کئے ہوش مینکا نے
انداز پہ دل ہوا تھا قرباں   آواز پہ دل ہوا تھا قرباں
تھا پہلے تو بندۂ خدا وہ   اب بندۂ صنم کا بن گیا وہ
جس دل میں فروغِ لامکاں تھا   اک جلوۂ باطل اب یہاں تھا
دل گھر تھا خدا کا اب ہوا دیر   پیدا ہوا روشنی میں اندھیر
ہرچند تھا فکرِ راہِ رم میں   ششدر رہا مگر قدم قدم میں
بیچینیں حسرتیں نکل کر   ارمان پھرے مچل مچل کر
ہمت ہوئی دل میں التجا کی   جرأت ہوئی عرضِ مدعا کی
ظاہر ہوئی حالتِ نہانی   اُس رنگِ پریدہ کی زبانی
تھا دام پری کا مدعا پرستش   درویش سے ہو گئی ہم آغوش
وہ پاک خیال سر سے نکلے   ارمان اِدھر اُدھر سے نکلے
دونوں ہوئے حظِ وصل میں چور   مہ نے لیا آفتاب سے نور
میعادِ حمل غرض گزر کر   نکلا وہ جسد، وہ نورِ انور
یعنی اک دخت دلبری سے   جادو سی عیاں ہوئی پری سے
آنچل پہ اُٹھایا مینکا نے   دامن پہ رکھی کلی صبا نے
شرمائی ہوئی ادا سے آئی   نزدیکِ رشی حیا سے آئی
بولی کہ اے نکتہ دانِ الفت   لے نذر یہ ارمغانِ الفت
اس نور کی جا نظر میں رکھنا   اس نقشِ وفا کو بر میں رکھنا
اب مجھکو وطن کی ہو اجازت   جانے کی عطا ہو جلد رخصت
دیکھی جو وہ دختِ ماہ پارہ   عابد کو ہوا غمِ نظارہ
اُس غنچہ کو دیکھ وہ ہوا زرد   یاد آیا سبب تو ہو گیا زرد

غفلت سے جو چشم ہو گئی وا   حیلہ کا گرا نظر سے پردا
آنکھوں سے اڑا خمارِ غفلت   جانا کہ بگڑ گئی عبادت
منھ پھیر حجاب کر گیا وہ   بس خوفِ خدا سے ڈر گیا وہ
ہو کر وہ غریقِ بحرِ افسوس   بولا، صد حیف، بختِ معکوس!
اے نفس! کیا یہ تو نے کیا ہائے   کیسی ہوئی تجھ سے یہ خطا ہائے
تقویٰ کا مٹا نشاں، صد افسوس   محنت ہوئی رائیگاں، صد افسوس!
یہ کہکے وہ زار زار رویا   اُف! سوز سے شمع وار رویا
دیکھی جو پری نے کج ادائی   کچھ فتح پہ اپنے مسکرائی +
چھوڑا وہیں اُس بتِ حسیں کو   ویرانے کے دیا زمیں کو +
آہستہ وہاں سے خود اُٹھ آئی   جنت کو چلی، ہوئی ہوائی
بسوامتر اُس جگہ تھا مدہوش   تھیں مادر و دخت، سب فراموش
دنیا کی نہ اُس کو تھی خبر کچھ   غم تھا اپنا ہی، تھا اگر کچھ
چھوڑا اُس دشت کی زمیں کو   دیوانہ سا چل دیا کہیں کو
درویش کنو تھا اک نکوکار   ناگاہ وہاں ہوا نمودار
دیکھا یہی۔ خاک میں سے تنویر   آئینہ میں حسن کی تھی تصویر
اک ہنس تھا سر پہ سایہ افگن   شعلہ سا نہاں تھا، زیرِ دامن
خوبی کی تھی اک نرالی صورت   پیاری تھی وہ بھولی بھالی صورت
تھا بسکہ رحیم پیرِ دانا   واجب اُسے چھوڑنا نہ جانا
معصوم پہ اُس کو رحم آیا   آنکھوں میں لیا، گلے لگایا
گھر لایا، غرض، اُسے وہ خوش کام   رکھا اس کا شکنتلا نام

رہتی تھی سہیلیوں میں، بن میں
بڑھنے لگی، شاخِ گل چمن میں

اقبال ورما سحر

بیکار رہنے والو!

تم کیوں ہوے ہو پیدا بیکار رہنے والو؟
کیا فرض ہے تمہارا بیکار رہنے والو؟

دیکھو ذرا اُٹھا کے تقدیر کا نوشتہ
کرنا ہے تمکو کیا کیا بیکار رہنے والو

ہے دلفریب کتنی آرائشِ مناظر
دیکھو ذرا تماشا بیکار رہنے والو

کرنا ہے تمکو جو کچھ انجام اُس کو دیدو
ہے چند روزہ دنیا بیکار رہنے والو

کب تک یہ زور نکبت کبتک خوابِ غفلت
دنیا ہے عبرت افزا بیکار رہنے والو

مہلک مرض تمہارا ہے کاہلی و سستی
کرلو علاج اپنا بیکار رہنے والو

یورپ کے رہنے والے کیا کر چکے ہیں ابتک
تمنے بھی کچھ کمایا بیکار رہنے والو

کیا کر رہی ہے دنیا کیا ہو رہے ہیں ساماں
کچھ بھی نہ تمنے دیکھا بیکار رہنے والو

بالیں پرست رہنا اچھا نہیں تمہارا
کرنا تھا کچھ مداوا بیکار رہنے والو

منسوخ کر رہے ہو قانونِ نظمِ قدرت
تمکو دئے ہیں اعضا بیکار رہنے والو

اعضا تمہارے اکدن ہو جائینگے معطّل
سوچو نتیجہ اپنا بیکار رہنے والو

اس گردشِ فلک نے کیا کیا نہ روپ بدلے
دیکھا نہ تم نے اصلا بیکار رہنے والو

تمکو دئے گئے ہیں بیکار و بے سبب کیا؟
یہ دیدہ ہاے بینا بیکار رہنے والو

دیکھو مصنّفاتِ نام آورانِ گیتی
کیا کر رہی ہے دنیا بیکار رہنے والو

اپنے دماغ و دل کی گر روشنی دکھاتے
ہوتے نہ تم بھی یکتا بیکار رہنے والو

کس کس لباس میں ہے صورت نما ترقی
دیکھو جہاں کا نقشا بیکار رہنے والو

کیوں کر رہے ہو شکوہ تقدیر کا تم اپنی
الزام ہے یہ بیجا بیکار رہنے والو

جا کر کرو ریاضت کالج میں مدرسہ میں
ہو بے نظیر رہنا بیکار رہنے والو

علمی مناظروں میں عقلی نمایشوں میں
کیا کیا نہ تمکو ڈھونڈھا بیکار رہنے والو

ہمّت کے نیشتر سے غیرت کی رگ کو چھیڑو
ہے جوشِ خلطِ سودا بیکار رہنے والو

اسلاف نے تمہارے کی کیسی جانفشانی
ہے کچھ خیال اس کا بیکار رہنے والو

جو نقش ہیں بٹھانا اسوقت وہ بٹھا دو
اب ہوگے پھر نہ پیدا بیکار رہنے والو

صحبت سے دوستونکی فرصت ملے جو دم بھر
نظمِ عزیز پڑھنا بیکار رہنے والو

عزیز لکھنوی

چاندنی

غنچۂ دل کو کھلا جاتی ہے آکر چاندنی
ہے برنگِ موسمِ گل روح پرور چاندنی

ہیں زمین و آسماں روشن و فورِ نور سے
شکلِ روے یار ہے کیا نور گستر چاندنی

آسماں پر ہے ستاروں سے فروغِ نورِ ماہ
چار سو سطحِ زمیں پر جلوہ گستر چاندنی

گلشنِ دنیا میں یہ رنگیں بہاریں تجھ سے ہیں
نور کی مورت ہے تو سے ماہ پیکر چاندنی

واہ وا کیا عجز ہے کیا خاکساری تجھ میں ہے
بچھگئی سطحِ زمیں پر فرش بنکر چاندنی

مرقدوں پر رکھتی ہے لطف و عنایت کی نظر
ڈالتی ہے قبر پر رحمت کی چادر چاندنی

سچ تو یہ ہے کیا لکھے کوئی تری مدح و ثنا
آئی ہے تو نور کے سانچے میں ڈھلکر چاندنی

آشکارا ہے جہانیں صنعتِ پروردگار
روزِ روشن ہے نمایاں قدرتِ پروردگار

صورتِ رخسار روشن پُر ضیا ہے چاندنی
باغِ عالم میں بہارِ جانفزا ہے چاندنی

کھینچ لیتی ہے دلوں کو مہ جبینوں کی طرح
واہ کیا دلکش ہے کیسی دلربا ہے چاندنی

اے قمر تیری ضیائے حسن ہے کیا دلفریب
پیاری پیاری روح افزا دلکشا ہے چاندنی

ہر روش پر کیوں نہ اترائی پھرے بادِ صبا
شام ہی سے باغمیں رونق فزا ہے چاندنی

ہے نمونہ قدرتِ صانع کا ہر سو آشکار
مظہرِ انوارِ حق شانِ خدا ہے چاندنی

غنچۂ خاطر کھلے جاتے ہیں کلیوں کی طرح
کسقدر ہے دلکشا کیا پُر فزا ہے چاندنی

باغ میں جوشِ طرب سے بلبلیں ہیں نغمہ زن
ہو مبارک اَوج کیا عشرت فزا ہے چاندنی

آشکارا ہے جہاں میں صنعتِ پروردگار
روزِ روشن ہے نمایاں قدرتِ پروردگار

اوج گیاوی

تصحیح ۔ گذشتہ نمبر میں جو فارسی غزل جناب ڈاکٹر ڈی ریل صاحب لطیف کی شائع ہوئی تھی، اُس کے مطلع کے اوّل مصرعہ میں قافیہ غلط ہوگیا ہے جسکا ہمیں افسوس ہے۔ صحیح مطلع یوں ہے:-

نگاہِ چشمِ شوقم لمعۂ نورِ جلالِ تو
سویدائے دلم آئینۂ عکسِ جمالِ تو

جلوۂ قدرت

ہر شے میں نور تیرا جلوہ دکھا رہا ہے — قدرت کا تیری طوطی نغمہ سنا رہا ہے
[illegible] تیرا یا رب نہیں جہاں میں — نیرنگیاں ہیں تیری دنیا کے گلستاں میں
[illegible] نظر کا بس جا ممکن ہرگز نہیں ہے — صنعتگری کا تیری راز نہاں یہی ہے
[illegible] یہ شگوفے یہ شاخ [illegible] رعنا — کیسے عدم سے تو نے ان کو کیا ہے پیدا
تیرے کرم سے قائم ہے یہ حیات عالم — زیر نگیں ہے تیرے سب کائنات عالم
گلشن میں ہر شجر پر قمری کی ہے یہ کو کو — عظمت کا تیری جلوہ آتا نظر ہے ہر سو
سو سو تجلیاں ہیں اک اک ادا میں تیری — اہل خرد ہیں حیراں مدح و ثنا میں تیری
گلشن میں [illegible] قدرت گل میں تری لگا ہے — ہر مرغ خوشنوا کے لب پر تری ثنا ہے

ہر رفعت و بلندی ہے تیرے آگے پستی
کیا حمد تیری لکھے کیا ضبط کی ہے ہستی

جگل کشور ضبط

قطعہ تاریخ وفات حضرت ظہیر دہلوی

اے اہل جہاں چساں بباید — وارستگی از غم جہاں یافت
[illegible] کنیم امید عشرت — لیکن ز فلک نہ تواں یافت
[illegible] ز قضائے جور پیشہ — شد فوت و حیات جاوداں یافت
چوں مرگ ظہیر مشتہر شد — محوی کہ ملالتے بجاں یافت

خوش مادۂ ز سال فوتش
بگزشت ظہیر از جہاں یافت
۱۹ ۱۱

محوی لکھنوی

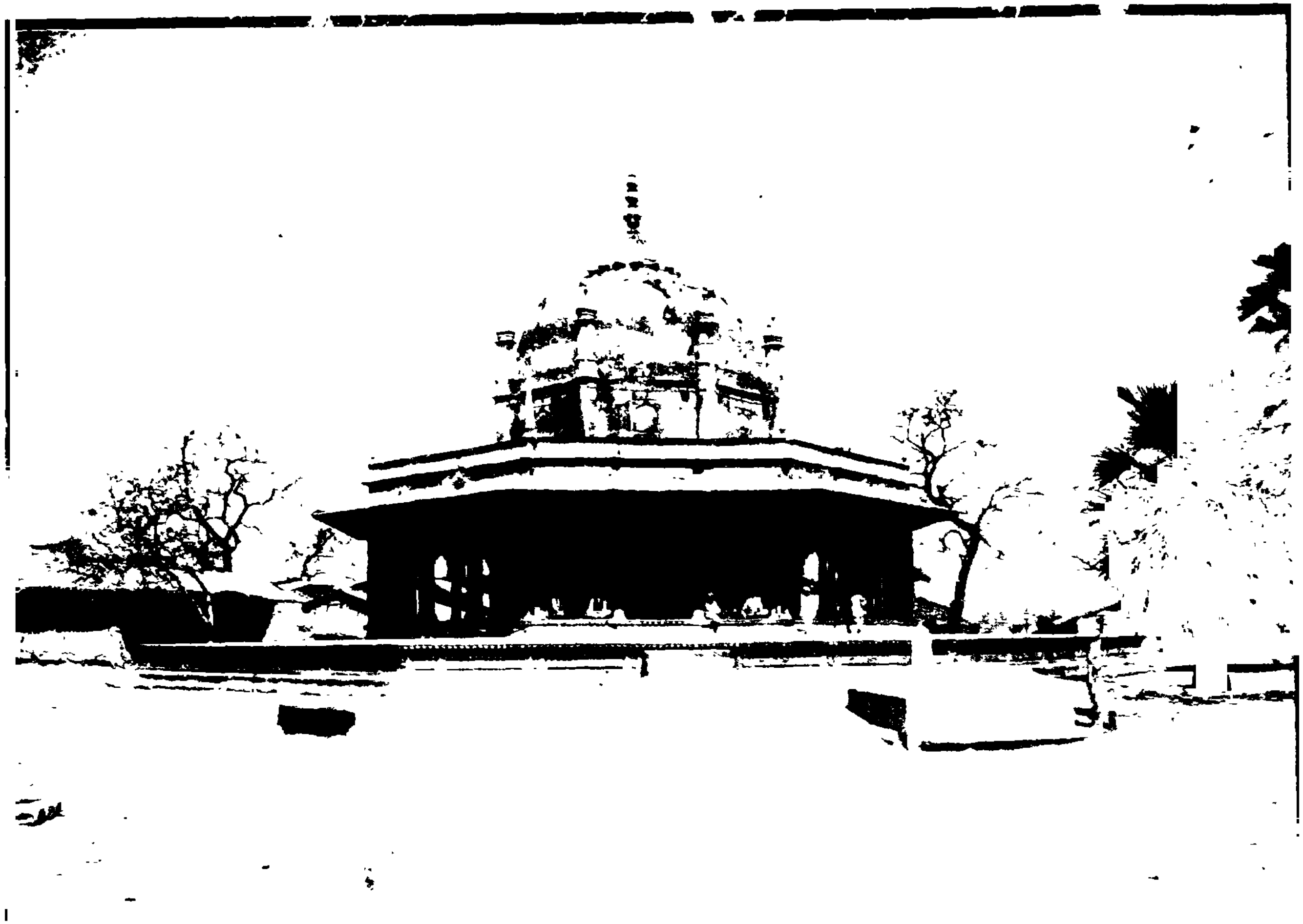
تازہ غزلیں

ابو الاعجاز حضرت عرشی

ہر ذرّے ذرّے میں پرتو تری خدائی کا — ہر اک پہ سایہ ہے دامانِ کبریائی کا
ہمیں غرور سے وہ حکم جبہ سائی کا — خدا کی شان تم اور ادعا خدائی کا
جنوں نے شوق دلایا برہنہ پائی کا — ترے فراق میں کاسہ لیا گدائی کا
دل شکستہ میں طاقت نہیں ہے ملنے کی — اٹھائے کون یہ صدمہ تری جدائی کا
میں مر گیا تو لحد پر وہ شمع رو بولا — چراغ ہو گیا گل آج آشنائی کا
فقیر عشق ہیں ہم بادشاہ ہیں دل کے — کہ رشک ساغر جم کاسہ ہے گدائی کا
کہاں کا باغ خلیل اور کہاں کا جلوۂ طور — یہ ایک شوشا تھا حضرت کی کبریائی کا
چلیں گے کوچۂ جاناں میں سر کے بل عشاق — کہ مدتوں سے تہیہ ہے جبہ سائی کا
نہ راہ عشق میں دو گام چل سکے ہمراہ — اسی پہ خضر کو دعویٰ تھا رہنمائی کا
[illegible] یا خاک کا میری کلال نے ساغر — پس فنا بھی نہ دھبا مٹا گدائی کا
بنائی خلد بریں خاک تو نے اے شداد — ملا نہ حکم جو در تک بھی رسائی کا
چراغ کعبۂ دل ہے خیال حسن نبی — کہ نور پردہ میں ہے ذات کبریائی کا
وہی وہی ہے جدھر دیکھئے اٹھا کے نگاہ — بہشت آئینہ خانہ ہے خود نمائی کا
نئی روش سے بہار آئی باغ عالم میں — جنوں کے ہاتھ میں دامن ہے پارسائی کا
پہنچنے پائے نہ ہم کوئے یار تک عرشی — گلہ ہے اپنے مقدر کی نارسائی کا

از خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی

انکی نگاہ ناز سے کیوں طور جل گیا — موسیٰ کا ارتباط رقابت سے کھل گیا
وہ آپ ہوں فراق میں یا انکی یاد ہو — کوئی نہ کوئی دلکو مرے آکے مل گیا
سچ تو یہ ہے رقیب نے ڈالا یہ تفرقہ — اقرار وصل کرکے وہ مجھسے بدل گیا
دل میرا مجکو پھیر نہ دینا تھا توڑ کے — یہ چال وہ حسین شرارت سے چل گیا
موسیٰ سے کیوں حجاب کیا کوہ طور نے — کیا اور کوئی دیکھنے والا نکل گیا
الفت جتا کے یار کو مغرور کر دیا — اتو مزاج اور بھی انکا بدل گیا
عشرت کٹھن ہے منزل الفت کا راستہ — دو ہی قدم میں پاؤں ہمارا پھسل گیا



روضة شاه عبد الجليل - الهآباد

دسمبر ۱۹۱۱ء

ادیب

جلد ۴ — نمبر ۶

اقوامِ ہند کی اصل اور اُن کی تقسیم (۲)

(۳) ہند کی اقوام کیونکر بنی ہیں اور انکی اصلی تقسیمیں کیا ہیں؟

ہند کی اقوام اور اُن کی مدنی حالت کا اختلاف

تھوڑا ہی زمانہ گزرا ہے کہ ہند ایک ایسا ملک خیال کیا جاتا تھا جس میں یک ہی قسم کی قوم رہتی ہے اور ان کا مذہب اور تمدن اور نعت و حرفت ایک ہی سا ہے اور مدت ہائے دراز سے بلا کسی یر کے چلا آتا ہے۔ لیکن یہ غلط راے اسوقت قائم نہیں رہ سکتی۔۔۔ ۔۔۔۔اس ملک میں انسان میں بہ لحاظ اپنی مختلف اقسام مختلف یالات مختلف رسوم و عادات اور مختلف مدارج تمدن کے اُسی در فرق ہے جس قدر اس مرز بوم میں جہاں وہ رہتا ہے۔ اگر م نے یہ کہا ہے کہ ہند بوجہ اپنی متضاد اور مختلف آب و ہوا کے ام عالم کا ملخص ہے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کے باشندوں یں بھی یہ تضاد اور تفریق کچھ کم نہیں اور بہ حیثیت مجموعی یہاں اریخی بنی نوع انسانی کا ہر ایک طبقہ موجود ہے۔ نوع انسانی کی قسمیں یہاں اشد درجہ مختلف ہیں۔ ایک طرف تو سیاہ فام وحشیوں کی اقوام ہیں اور دوسری طرف ایسی اقوام ہیں جن کی جلد مثل یورپیوں کے صاف اور سفید ہے۔ یہاں دنیا کے مدارج ترقی کے کل درجے موجود ہیں یعنی ممالک متوسطہ کے پہاڑی حصوں کی وحشیانہ زندگی سے لیکر گنگا کنارے کے شہروں کی پُرلطف معاشرت اور پھر یوروپی زندگانی کے اُن اعلیٰ وسائل تک جن کو اس ملک کے اخیر فاتحین یہاں لائے ہیں۔

اقوام ہند چار اقوام سے مرکب ہیں۔ لفظ ہندو

وہ پچیس کروڑ مخلوق جس کو ہم یورپ میں بطور عام ہندو کہتے ہیں کئی بڑی بڑی اقوام سے مرکب ہیں حبشی زرد رنگ قوم تورانی اور آریہ لیکن ان چار اصلی اجزا کے مختلف تناسب میں ملنے کی وجہ سے اور نیز اُن اثروں کی وجہ سے جو اختلاف مرز بوم سے پیدا ہوئے ہیں ہند میں ایک بہت بڑا گروہ ذیلی اقوام کا پیدا ہوگیا ہے جو تعداد میں یورپ

کی اقوام سے زیادہ ہیں۔ لفظ ہندو قومیت کے لحاظ سے کچھ معنی نہیں رکھتا ہندو ہیں اس سے مراد صرف وہ شخص ہے جو نہ مسلمان ہو نہ عیسائی نہ یہودی اور نہ پارسی اور جو ان چار ذاتوں میں سے جن کو فی الواقع ہندو مذہب نے بھی جائز رکھا کسی ایک ذات میں شامل ہو - یہ ذاتیں ابتدا میں چار ہی تھیں یعنی برہمن چھتری ویش اور شودر لیکن اب ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

یہ ذاتیں اقوام کی تقسیم سے مطابقت تو نہیں رکھتیں لیکن جیسا ہم آگے چلکر دکھائیں گے ہمیں ذات قائم ہونے کے اصول کی خبر دیتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہو گا کہ برہمن عموماً آریہ ہے اور چھتری راجپوت اور ویش تورانی اور شودر تورانیوں اور اصلی باشندگان ملک کے میں سے بنا ہے۔

ہند کے قدیم باشندے

ہند کے قدیم باشندے سیاہ فام تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم الایام سے ان کی دو قسمیں تھیں ایک حبشی وش جن کے بال اونی اور چہرے چپٹے تھے یہ مشرق اور وسط میں رہتے تھے اور دوسرے آسٹریلیا کے حبشیوں کے قسم میں سے تھے۔ قد آور اور زیادہ ہوشمند اور ان کے بال لمبے تھے یہ جنوب اور مشرق میں بود و باش رکھتے تھے۔ ان میں سے پہلی قوم اس وقت تک گونڈ وانہ کے پہاڑوں میں موجود ہے اور دوسری نیلگری کی وادیوں میں۔ یہ قدیم اور وحشی اقوام جو کبھی ابتدائی تعلیم کے درجے تک بھی نہیں پہنچیں۔ تاریخی زمانہ کے پہلے سے ہند کے ساحلی جنگلوں میں رہا کرتی تھیں اور جیوں جیوں ملک میں تمدن ترقی کرتا گیا یہ بتدریج مفقود ہوتی گئیں۔

ملک ہند میں داخل ہونے کے مشکلات

جیسا ہم اوپر دکھا چکے ہیں ہند وہ ملک ہے جس میں داخل ہونا نہایت مشکل ہے۔ ایک طرف تو ہمالیہ کے پہاڑ اور دوسری طرف سمندر نے اسے تمام دنیا سے علیحدہ کر لیا ہے۔ خلیج بنگالہ کی طرف اس کے سواحل کو موجوں کے تھپیڑوں نے غیر ممکن العبور بنا رکھا تھا اور بحر عمان اور بحر عرب کی جانب مانسون کی شدت افریقہ سے آنے والی کشتیوں کو مار کر ہٹا دیا کرتی تھی۔ اگر وہ کنارے تک پہنچ بھی گئیں تو مغربی گھاٹ اُن کے لئے ایک سدّ حائل تھے اور اُن کی آڑ میں یہاں کے باشندے بخوبی ان اجنبی اشخاص کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ ان وجوہات سے اُس قدیم زمانہ میں کسی اجنبی قوم کو اس ملک میں سمندر کی راہ سے آنے کا خیال تک نہیں گزرا اور اقوام فاتحین جو اس ملک میں آئیں وہ ہمالیہ کے راستے سے آئیں۔ یہ بڑی قہقہہ دیوار ملک کو دور تک محفوظ کئے ہوئے ہے لیکن اس کے دونوں کناروں پر دو منفذ ہیں۔ مشرق کی طرف برہمہ پتر کی گھاٹی اور مغرب کی طرف دریائے کابل کی گھاٹی ان دونوں نے اس دیوار میں راستہ پیدا کیا ہے اور انھیں راستوں سے ایشیائی فاتحین کی فوجیں یکے بعد دیگرے اس زرخیز ملک میں داخل ہوئی ہیں۔ ان اقوام میں سے زیادہ قوی اور کثیر التعداد قوم مغربی راستے سے داخل ہوئی کیونکہ دونوں راستوں میں سے یہی راستہ زیادہ آسان تھا۔ مشرقی راستہ یعنی برہمہ پتر کی گھاٹی ایک ایسا خطہ تھا جہاں جنگل کی گنجانی اور پانی کی توفیر انسان کو ہر قدم پر روکتی تھی۔ انگریزوں نے ان دونوں راستوں کو دو نام دئے ہیں جو بالکل صحیح تو نہیں لیکن یہ ہندوستان کے جغرافیہ سے کسی قدر مطابقت رکھتے ہیں مغربی راہ کا نام باب آریہ رکھا گیا ہے اور مشرقی راہ کا باب تورانی۔

باب تورانی

باب تورانی یعنی برہمہ پتر کی گھاٹی وہ راہ ہے جس سے فی الواقع اقوام تورانی اس ملک میں نہیں آئی ہیں لیکن اگر اس لفظ کو خاص معنی میں نہ استعمال کیا جاوے تو کہہ سکیں گے کہ یہ نام غلط نہیں ہے لفظ تورانی سے دراصل وہ قوم مراد ہیں جو ترکستا

کے باشندہ ہیں۔ لیکن بطور عام اس لفظ کا اطلاق اُن زرد فام اقوام پر بھی ہوتا ہے جو تورانیوں سے مشابہ ہیں۔ باب تورانی سے ہند میں آنے والی یہی اقوام زرد فام تھیں جن کے چہرے چپٹے اور آنکھیں ترچھی تھیں۔ یہ تاریخی زمانے سے پہلے یہاں آئیں اور یہ ملک کے پہلے اجنبی تھے۔ اصلی تورانی سیدھے بالوں والے جن کے منہ پر ڈاڑھیاں تھیں اور جن کی آنکھیں سیدھی تھیں اس زمانے سے بہت بعد ہند میں آئے اور درحقیقت ان کا بڑا گروہ باب آریہ سے اس ملک میں داخل ہوا۔ اصلی تورانیوں کے ذکر سے پہلے ہم اس امر کی تحقیق کریں گے کہ زرد فام اقوام جو ہند میں آئیں اُن کا کیا حشر ہوا اور وہ کونسی نشانیاں اس ملک میں چھوڑ گئیں یہ اقوام زرد فام برہمپتر کی وادی سے گزرنے کے بعد مشرق کی طرف روانہ ہوئیں۔ یہاں انھیں اس پہاڑی خطّے نے روکا جو اب گونڈوانہ کہلاتا ہے۔ اصلی باشندگان سیاہ فام نے جو بالکل مقابلہ نہ کر سکتے تھے یہاں آکر پناہ لی اور اس خطّے کی دشوار گزار زمین اور یہاں کی قاتل آب و ہوا نے اجنبیوں کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ اب یہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے ایک ان میں سے گنگا کے کنارے کنارے مغرب کی طرف چلا اور دوسرے نے خلیج بنگالہ کے کنارے کنارے جنوب کی راہ لی۔

پروٹوڈراویڈی اقوام | ان ایشیائی فاتحین اور اصلی سیاہ فام باشندگان ہند سے جو اقوام پیدا ہوئیں اُن کا نام پروٹوڈراویڈی (یعنی قدیم قوم ڈراویڈ) رکھا گیا ہے اور چونکہ ان میں اصلی باشندوں کا میل زیادہ تھا یہ بھومی جنم یعنی اصلی باشندے سمجھے جاتے ہیں۔ نئے فاتحین کے ریلوں نے ان بھومی جنم اقوام کو روز بروز جنوب کی طرف بھگایا اور نئے فاتحین و مفتوحین کے میل سے وہ قدیم قوم بنی جس کو ڈراویڈ یا ٹامل کہتے ہیں۔ پس گویا قوم ٹامل نتیجہ ہے پروٹوڈراویڈیوں اور زرد فام اقوام کے میل کا۔ اگر اقوام زرد فام کے اثر کو جو ہند کی اقوام پر پڑا بغور دیکھا جائے تو یہ اثر زیادہ تر برہمپتر کی گھاٹی میں نظر آتا ہے جہاں فاتحین کی نئی نسلیں یکے بعد دیگرے زمانہ دراز تک آتی رہیں۔ مثلاً آسام کے باشندے جن کی تعداد تقریباً بیس لاکھ ہے خالص زرد فام نسل کے ہیں۔ لیکن بنگال میں بھی جہاں کے باشندے نہایت مخلوط ہیں زرد فام دھاوے کا اثر اس وقت تک موجود ہے۔ کیونکہ یہاں وہ اقوام دور تک پھیل گئی تھیں۔ جیوں جیوں ہم جنوب کی طرف خلیج بنگالہ کے کنارے کنارے چلیں ان زرد فام اقوام کا اثر کم ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً سنتالوں میں یہ اثر بمقابل ان اقوام کے جو گونڈوانہ میں رہتی ہیں بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے گونڈوانہ کی اقوام کھونڈ مالیر اور گونڈ اس وقت تک اصلی باشندگان ہند سے زیادہ مشابہ ہیں اور شاید انھیں میں وہ قدیم حبشی وحشی قوم جس کا اوپر ذکر ہوا اس وقت موجود ہے۔

ٹامل اور تلنگے | غرض اس وقت جنوبی ہند میں گوداوری سے لیکر کیپ کامرن تک مختلف ڈراویڈی اقوام جن میں متعدد تقسیمیں ہیں بود و باش رکھتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ مشہور تقسیمیں ٹامل اور تلنگے ہیں۔ یہ کُل زرد فام اقوام اور حبشیوں کے میل سے بنی ہیں لیکن انہیں اور اجزا بھی شامل ہو گئے ہیں جن میں سے ایک جزو تورانی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اقوام تورانی کے مغرب کی طرف سے آنے کا ذکر کریں ہمیں یہ کہہ دینا ضرور ہے کہ ہمالیہ کی بلند سطحوں اور وادیوں کے باشندے باستثنا باشندگان کشمیر کے تبت الاصل ہیں اور مشرقی چین کے باشندوں سے بہت مشابہ ہیں لیکن تبتی اقوام یہاں بطور فاتحین کے نہیں آئیں کیونکہ جغرافی حیثیت سے اور نیز بلحاظ نسل و مذہب و رسوم و عادات کے ان کا زیادہ تر تعلق

ان کے نظامات ہر جگہ غالب ہیں۔ بمبئی سے آگے گھاٹ کے دونوں دامنوں پر ایک جنگجو قوم ہے جس نے تاریخ میں بڑا حصہ لیا ہے۔ یہ تورانی الاصل مرہٹے ہیں اور ان کی تعداد کئی لاکھ ہے۔ جیوں جیوں ہم وسط ہند کی طرف اور جنوب کی طرف اترتے جاتے ہیں آریائی تمدن اور تورانی نقشے کم ہوتے جاتے ہیں اور مخلوق ڈراویڈی ہوتی جاتی ہے۔ ان اجزا کے مختلف امتزاج سے کئی قومیں پیدا ہوئی ہیں اوّلاً بھیل جنہیں راجپوتوں نے بھگاکر پہاڑی حصوں میں پہنچا دیا۔ یہ پروٹو ڈراویڈی ہیں اور ان میں تورانی اثر بہت کم آیا ہے بلکہ بعض ان میں سے گویا اصل باشندگان ہند کی اولاد ہیں یہ وندھیاچل کے مغربی حصے میں رہتے ہیں اور ان کی تعداد تقریباً بیس لاکھ ہے دوسری قوم مہیر ہے جو جاٹوں سے زیادہ ملتے ہوئے ہیں اور اراول کے شمال میں رہتے ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً چھ لاکھ ہے تیسری قوم مینا ہے جو ریاست جے پور میں بود و باش رکھتے ہیں اور ان کی تعداد تقریباً تین لاکھ ہے۔ اخیر میں راموسی اور دھانک ہیں جو مغربی گھاٹ کے دامن میں بستے ہیں۔ یہ زیادہ تر ڈراویڈی معلوم ہوتے ہیں جیساکہ ان کی تاریک جلدوں چپٹی ناکوں اور ابھرے ہوئے رخساروں سے معلوم ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی فتوحات | مسیحی گیارھویں صدی میں مسلمانوں کی فتوحات شروع ہوئیں یہ فاتحین بھی نہایت مختلف الاصل تھے ان میں عرب ایرانی، افغانی اور مغل ملے جلے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے ہند کی اقوام کو جو پہلے ہی سے مخلوط تھیں اور بھی زیادہ مخلوط بنادیا۔ ان کی حکومت اور ان کے تمدن نے سندھ و گنگا کے مجراؤں میں بہت کچھ اثر پیدا کیا لیکن جنوب میں انکے میل سے کوئی علحدہ قوم پوری طرح قائم نہیں ہوئی۔

(ماخوذ از مسودۂ تمدن ہند) **سیّد علی بلگرامی** (مرحوم)

دربار تاجپوشی

ایں بارگاہ کیست کہ گویند بے ہراس
کاے اوج سطح چرخ حضیض ترا مماس

جس طرح موسم بہار کی جلوہ آرائی، ہنگامہ پیرائی، اعجوبہ نمائی، صفاگستری، ضیا پروری سے بیشتر ہواؤں کا رخ بدل جاتا ہے سماں پلٹ جاتا ہے۔ زمانہ کے صحیفہ کا ورق الٹ جاتا ہے۔ رات کا سنسان سناٹا گھٹ جاتا ہے۔ دن عاشق کا ارمان ہوکر بڑھ جاتا ہے۔ خزاں کے زرد منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ نیچر کے ہونہار پودوں میں کونپلے پھوٹنے لگتی ہیں۔ جو درخت ٹنڈ منڈ نظر آتے تھے انکے سوکھے ٹھنڈ بیلوں اور پتوں سے لدکر جھنڈ کے جھنڈ ہونے لگتے ہیں، نئے نئے سرخ سرخ پتے، روز روشن میں شمعوں کے قمقموں کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ سبز سبز پتے شاخوں کا عصا ہاتھ میں لئے خضر کی صورت نظر آتے ہیں بلبلیں پھولوں کی پتلی پتلی نازک اور لچکدار ٹہنیوں پر پھول پھول کر بیٹھی ہوئی پیک صبا سے خسرو گل کی سواری کا مژدہ سنکر خوشی سے پھولی نہیں سماتیں۔ تہنیت کے زمزمے سناتی ہیں۔ خیر مقدم کے نغمے گاتی اور چہچہاتی ہیں۔ درختوں کی فوج در فوج قطاروں کو قوت نامیہ کا جنرل عجیب اوج موج سے بڑھاتا ہے۔ سرو اپنے کو کھینچکر اور تن کر فیروزمندی اور بخت بلندی کا لہلہاتا جھنڈا دکھاتا ہے۔ سبزۂ نودمیدہ شوق پا بوسی بہار میں بچھا جاتا ہے۔ نرگس بعینہ ہمہ تن چشم انتظار بننے کو اور سوسن ادب سے دانتوں میں زبان دبائے اپنی ارمان بھری داستان

کہنے کو ہوتی ہے۔ بیدل ؎

دل ذرۂ تپ جستجو سر مہر گرمئے آرزو　　چہ ہوس کہ تحفہ نے کشد بنگاہ آئینہ مائلش

یعنی ہر ذرہ جستجوے معشوق کی سرگرمی میں تپ بنا ہوا ہے اور آفتاب ہمہ تن گرمئے آرزو سے ہوسیں اپنا اپنا تحفہ پیش کر رہی ہیں مگر حسن آرا دلبر اپنے بناؤ سنگار کے لئے آئینہ کی جانب مائل ہے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا

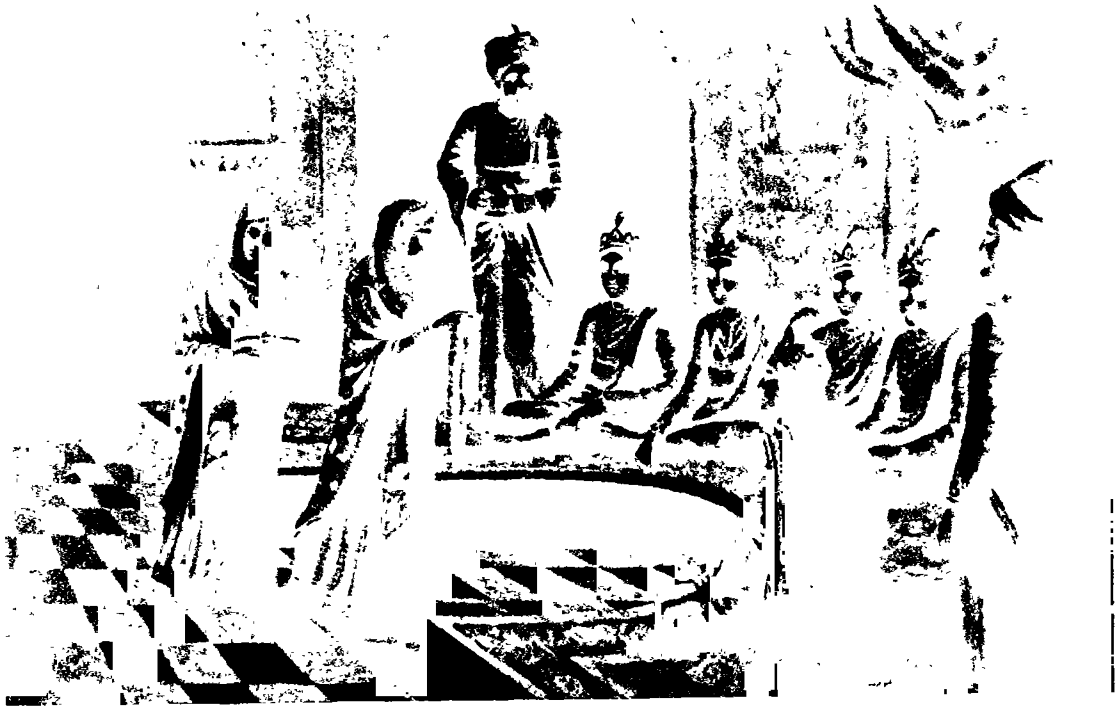
اسیطرح اس بھارت ورش کی بھومی ایک سال قبل اپنے شری شکتیمان مہاراج دھراج چکرورتی راج دھان ظل اللہ سنسار اوتار کے نزول اجلال کے انتظار میں سمندر کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوے ہے کہ شہنشاہی جہاز دلنواز قیصری پھریرا اڑاتا اور ابرنیساں کیطرح خوشی کی لہریں دکھاتا بندرگاہ بمبئی کو معدن لعل اجلال و صدف گوہر اقبال بنائے۔ تمام ہندوستان میں ویسی ہی جنبش ہے جیسے نسیم بہار کی سرسراہٹ سے نخل و شجر میں پیدا ہو جاتی ہے اور جیسی باد موافق کے مسرت بھرے جھونکے سے بحر کی تمام سطح پر لہر دوڑ جاتی ہے۔ مختلف مذاہب کی سوسائٹیاں جو ملک اور قوم اور برطانیہ کی بہتری اور فلاح و صلاح کی رات دن خواہاں ہیں سوتے جاگتے اپنی اپنی رفارم کی تکمیل کے ہرے بھرے باغ دیکھ رہی ہیں کہ اب خاطر خواہ نتائج اور ثمرے حاصل ہونگے۔ پولٹیکل رفارمر خورسند، سوشیل لیڈر آنند ہیں کہ انکی اسکیمیں جو نیک نیتی اور خیر طلبی کے سونے کے اوراق پر پیش ہوں گی کامیابی کا مبارک چہرہ دیکھیں گی اور اس کو سونے میں سہاگا پائنگی۔ خادمان ملک و قوم امیدوار ہیں کہ انکی جانی اور مالی خدمتیں مقبول ہو کر شہنشاہی دربار سے عطیہ (تمغہ اور خطاب وغیرہ) دلوائیں گی۔ ہر قسم کے اہل کمال حسرت بھرا دل پہلو میں لئے بیٹھے ہیں کہ اب ہمارے جوہر کمال کا ستارہ چمکے گا اور ہمارا گرد آلود گوہر شفاف و آبدار ہو کر کامگاری کی سلک میں منسلک ہوگا اور گردن شاہد مقصود کی حمائل بنے گا۔

شہنشاہ کی رونق افروزی کی خبر بشاشت اثر کا چراغ تمام برٹش انڈیا میں گھر گھر روشن ہے ہندوستان کی سرزمین آسمان بنی ہوئی ہے اور خیر مقدم کے جو چراغ روشن ہیں وہ ستارے ہیں جو اپنی تابناکی سے سیہ بخت بد بینوں کی آنکھیں خیرہ کر رہے ہیں۔ گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے۔ جب ابھی سے مسرت و شادمانی کا یہ سماں ہے تو ہز میجسٹی کی جلوہ افروزی پر تو گویا ہندوستان کو چار چاند لگ جائیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ترستی آنکھوں نے کم و بیش دو سو برس کے عرصہ میں اپنے نامدار تاجدار داتار سایۂ کردگار کا جمال جہاں آرا نہیں دیکھا۔ وہ تاجدار جس کی پُر جلال سلطنت کی افق سے آفتاب و ماہتاب ڈوبکر نکلتے ہیں۔ وہ تاجدار جس کے جہازوں نے سمندر کو مشرق و مغرب میں کھونڈ ڈالا ہے۔ جس کے لشکروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے دنیا کے اونچے اونچے سر بفلک پہاڑوں کو روند ڈالا ہے۔ جس کا سکہ باد وزاں کی طرح ممالک دنیا میں چل رہا ہے جسکی عالمگیر صنعت و تجارت نے یورپ۔ ایشیا۔ افریقہ کو مالا مال کر دیا ہے۔ جسنے اپنے خداداد نعمتوں کے بار احسان کا جوا انسانی نسلوں کے دوش پر رکھدیا ہے۔ جسکی ریلوں کے سلسلہ نے صعوبتوں اور دشوار گزاریوں کے لمبے لمبے دانتوں والے فیلان مست کا مُہرہ توڑ دیا ہے۔ جس کے انجنوں کی چنگھاڑوں نے افلاس و نکبت کے سیاہ دیوؤں کا منہ کالا کرکے عدم کے مازندران میں جلا وطن کر دیا ہے۔ جس کے انجنونکے دھواندھار بادلوں نے عالمگیر خلا کے سر پر گھٹا ٹوپ رکھدیا ہے جو صنعت و حرفت کی دولت کا دنیا پر مینہ برسا رہا ہے۔ وہ تاجدار جس کی

ایک ہاں بڑے بڑے متکبر زباندرازوں کی نہیں کی زبان تالو سے کھینچ لیتی ہے۔ وہ تاجدار جس کے عہد ایجاد عہد میں خبروں کے تاروں نے لگاتار اُن نیچرل غیب دانی کی برقی رو بجلی کی سرعت سے کہیں بڑھکر انسانوں میں دوڑا دی ہے بلکہ برقی تاروں کو معطل کر دیا ہے۔ وہ تاجدار جس کے عہد میں فلک سیر غباروں نے فضائے بسیط اور جوّ محیط میں دوازدہ بروج کی جگہ لے لی ہے۔ اور جس کے ایجاد کے دریا نے بروج فلکیہ کو حباب بنادیا ہے۔ دوازدہ بروج تو فلک ہی پر اپنی اپنی جگہ متمکن ہیں مگر غباروں کے بروج زمین سے آسمان پر آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو ایجادات کسی زمانہ میں اُن نیچرل (خرق فطرت و نقض قانون قدرت) سمجھے جاتے تھے اب نیچرل (فطری اور قدرتی بلکہ عادتی) ہو گئے ہیں۔ وہ تاجدار جس نے علوم و فنون کے دریا بہاکے پیاسوں کو سیراب کر دیا۔ وحشیوں کو انسان بنادیا۔ وہ شہنشاہ جس کے اکثر ماتحت رؤسا خود مختار بعض سلطنتوں اور حکومتوں کے فرمانرواؤں سے اور جن کی ریاستوں کا رقبہ بعض سلطنتوں کے رقبہ سے کسیطرح کم نہیں۔ رعایا ہند کو حسرت آمیز تعجب ہو کہ ایسے شہنشاہ جم جاہ سکندر پایگاہ کا سایہ ہما پایہ صرف لندن تک محدود رہے اور ہندوستان محروم۔ ہز میجسٹی اپنے مقبوضات انگلینڈ میں تو جب چاہیں دورہ فرماکر جمال جہاں پیرا سے رعایا کے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور عطا فرمائیں مگر غریب ہندوستان اپنے رقیب انگلینڈ کے مقابلہ میں ہر طرح حرماں نصیب رہے۔ پس ہندوستان کو اپنے شہنشاہ عالی جاہ سے کالے کوسوں سمندر پار رہنے کا جسقدر قلق ہے وہ اُسکی صورت حال سے ظاہر ہے۔ مگر اب ہندوستان اپنی طالع مندی ارجمندی پر جسقدر فخر و ناز کرے بجا ہے کہ ہز میجسٹی جارج پنجم نے اُس کا اضطراب محسوس فرماکر دو سو برس کی مفارقت کی تلافی مافات فرمائی اور جس طرح خاص تخت گاہ (لندن) میں دربار تاجپوشی منعقد فرمایا اسیطرح ہندوستان میں ایک عظیم الشان دربار کے انعقاد کا ارادہ ظاہر فرماکر ہندوستان کے آنسو پوچھے۔ ہندوستان اپنے شہنشاہ کی مفارقت میں اس لئے مضطرب ہے کہ اُس کا نیچر محض اطاعت گزاری ہے وہ اطاعت ہی کے لئے عدم سے وجود میں آیا ہے۔ ہندوستان کے جزیرہ کا ذرہ ذرہ اطاعت کے خمیر میں گوندھا ہوا ہے۔ اطاعت گویا سرزمین ہند کے حق میں آفتاب ہے اور ظاہر ہے کہ ذرّے کا وجود بغیر آفتاب کے معدوم ہے۔ اطاعت ہندوستان کی جان ہے اگر جان نہیں تو جسم بھی نہیں روے زمین کے مورخین نے ہند کے اطاعت کے جوہر کی جسقدر تعریف کی ہے اب اُس سے زیادہ تعریف ممکن نہیں ہندوستان ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کی بھومی ہے مورخوں نے اسے جنت کا لقب دیا ہے اور یورپین مورخوں نے یہ لکھا ہو کہ ہندوستان ہی وہ ملک ہے جہاں سونے چاندی کے درخت لہلہا رہے ہیں اور ایک باوقار مورّخ نے ہندوستان کی تعریف میں یہ عبارت لکھی ہے:۔

> ہند مملکتیست وسیع و عریض۔ ہوایش را در مزاج شکستہ
> دلاں تاثیر مومیائی۔ شجرش عود۔ و حجرش مرمر۔ و دیہہ
> و قرایش طیرۂ فضائے ملک بربر۔

قدرت کے تمام عطیے اس بھومی پر ختم ہو گئے ہیں۔ اگر ایک مقام پر کوسوں پانی نہیں ملتا لوگ بوند بوند کو ترس رہے ہیں تو تھوڑی دور جاکر دوسرے مقام پر سرد اور شیریں پانی کے دریا جاری ہیں۔ کہیں دو دریا بڑے تپاک سے باہم گلے مل رہے ہیں۔ بمبئی میں اگر کوئی آگبوٹ پر سوار ہو کر شب کو



دمینتی سوئمبر

انڈین پریس الہ آباد

مدر کی سیر کرے تو دو دو میل تک سمندر میں چراغ ہی چراغ
ائیں گے سمندر کی لہریں جب پشتے سے ٹکراتی اور پھر سو سو
پیچھے ہٹ جاتی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں ہاتھی
ماڑ رہے ہیں۔ علیٰ ہذا قدرت کی عجیب و غریب نیرنگیاں
بھومی کے ہر مقام پر موجود ہیں اور مختلف قومیں بعض
لیوں کی پرستش کرتی ہیں۔ اطاعت اور پرستش چونکہ اس
ی کا سُبھاؤ ہے لہٰذا ۳۳ کروڑ دیوتاؤں ہی تک محدود
ں بلکہ ہمیشہ نئے نئے دیوتا یہ بھومی جنتی رہتی ہے اور اس
ی میں سب دیوتاؤں سے بڑا دیوتا راجہ اور بادشاہ ہے۔ اس
ی میں جو لوگ براجمان ہیں وہ فطرت کی یہ فلاسفی تمام
ار کے مہاتما دوانوں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں کہ ایک منش
یسا ہی شریر رکھتا ہے جیسا ہم تم سب مگر کروڑوں آدمیوں
روں جو اس کے نازک ہاتھ کی انگلیوں اور پنجے میں
ہیں دم کے دم میں مروڑ سکتا ہے پس ضرور اس میں
ن ان نیچرل شکتی (خلاف فطرت طاقت) موجود ہے اگر وہ
ہے تو نازک انگلیوں کی لکیروں کے شکنجے میں کروڑوں
انوں (شنکروں) کو کھینچ سکتا ہے۔ اور چاہے تو انہیں
ں انگلیوں سے سونے چاندی اور جواہرات کا مینہ
ا سکتا ہے اس کا اشارۂ ابرو تیغ بنکر کروڑوں
یوں کا سر یکقلم قلم کر سکتا ہے۔ اس کے ترحم کی نگاہ
یک چھینٹا خشم و غضب کے عالمگیر دریائے آتش کو سرد
کر سکتا ہے۔ بھلا شخص واحد میں یہ طاقت کہاں سے آگئی۔
یہ فوق العادت طاقت اُسی نے دی ہے جس کے سامنے
دریا ایک قطرہ اور جس کے حضور صحرا ایک ذرّہ ہے اور
جس کے جلال و جبروت کے آگے کوہ ایک پرِ کاہ ہے
راجا اور بادشاہ کی تمام قوتیں اسی ازلی ابدی قوت کا
پرتو اور عکس ہیں۔ مبارک ہیں وہ شہنشاہ و فرماں روا جو
اس نرنکار پرماتما کے دوار کو بار بار سیس نواتے اور اُسی
کے مندر میں ہر دم ماتھا ٹیکتے اور اپنے کو ناچیز و ہیچ سمجھتے
ہیں اور اس کے عزّ و جلال و کمال لایزال صنعت قدرت
کی تہ تک پہنچنے کا حتے الامکان ارادہ رکھتے ہیں۔ بیدل؎

یکمالِ خالقِ انس و جاں نہ زمیں رسید نہ آسماں
چو صدف کسے چہ دہد نشاں ز حقیقتِ گہرِ آفریں

چونکہ دو سو سال قبل اس بھومی پر ہزاروں برس ہماری نہ
حکومت رہی لہٰذا وہ اطاعت کی عادی بن گئی۔ اب
برٹش گورنمنٹ نے وہ آہنی جُوا اس کے کاندھے سے
اٹھا لیا اور اس کو آزاد کر دیا۔ پس برٹش خاندان کے چشم
و چراغ بلکہ اس کان کے گوہر شب چراغ ملک معظم جارج پنجم
بالقابہ سے ہندوستان کو اپنی آزاد و مرفہ الحالی کی ترقی کی
کچھ امیدیں ہوں اور دربار تاجپوشی جو کچھ برکتیں اس پر نازل
کرے کم ہے۔

ندرت میرٹھی

فتحمند زندگی - یہ مسٹر جیمس ایلن کی ایک مشہور تصنیف ہے جس کو لالہ رگھوبر دیال صاحب، بیرسٹر ایٹ لا، میرٹھ نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ نوجوانوں کے لئے نہایت مفید ہے۔ اسمیں ایسے اخلاقی اوصاف اپنے میں پیدا کرنے کے گُر بتائے گئے ہیں جن سے انسان واقعی انسان بن سکتا ہے۔ دنیا میں فاتح وہی ہے جسکو اپنی زندگی پر پورا قبضہ و اختیار ہو۔ طلباء کو یہ رسالہ ضرور پڑھنا چاہئے۔ قیمت ۴ر

مالک الدولہ صولت (۳)

پڑگئے ہیں یوں دلِ مضطر میں داغ   جس طرح ہوں لالۂ احمر میں داغ
خوف ہے مجھکو دلِ پرسوز سے   پڑنجائیں دامنِ محشر میں داغ

مطلع کی بندش اچھی ہے زوائد سے پاک ہے مگر تشبیہ مبتذل ہے اور کسی قسم کی تازگی بھی نہیں ہے۔ دامنِ محشر میں داغ پڑجانے کی تخیل اچھی معلوم ہوتی ہے۔

ہے خدائی اس بتِ بے دین و ایماں کی طرف
کون بندہ حق کہے گا اب مسلماں کی طرف
رفتہ رفتہ دستِ وحشت کی رسائی دیکھئے
آستیں کا چاک جا پہنچا گریباں کی طرف
لوگ کہتے ہیں ضرور اک دن قیامت آئے گی
کاش آنکلو تمہیں گورِ غریباں کی طرف
ہم تو کہتے ہیں کسی سے واسطہ ہم کو نہیں
آپ تو کہئے اٹھاکر ہاتھ قرآں کی طرف
دن ہمارے قتل کا قاتل بتاتا ہی نہیں
ابروؤں کا ہے اشارہ عید قرباں کی طرف
سنتے ہیں صولت گرفتارِ بلائے زلف ہے
کیا وہی جکڑا ہوا جاتا تھا زنداں کی طرف

اس زمین میں بھی حسن تغزل بھلا معلوم ہوتا ہے قرآن کے قافیہ میں یہ غنیمت ہے کہ محض بدگمانی ظاہر ہوتی ہے ورنہ معشوق کے مبتذل ہوجانے میں کوئی بات باقی نہ رہی تھی ؎

نہیں داغِ دل ہیں مٹانے کے قابل   یہ گلشن ہو اُن کے دکھانے کے قابل
جدائی میں ہم منہ لپیٹے پڑے ہیں   نہ آنے کے قابل نہ جانے کے قابل
جو رمز و کنایہ لکھا خط میں اُسنے   وہ باتیں نہیں ہیں بتانے کے قابل
کہا بے وفا دل لگی ہیں، تو بولے   کوئی ڈھونڈھ لو دل لگانے کے قابل
محبت کا گیسو کی پابند ہوں میں   نہیں بیڑیاں یہ بڑھانے کے قابل

بحر متقارب فعولن چار بار۔ اس وزن میں اکثر ناموزون الطبع ناواقف عروض یہ غلطی کرجاتے ہیں کہ مصرعہ کو فعول یا فعل پر تمام کردیتے ہیں حال آنکہ فارسی و اردو کے شعرا میں کسی نے ایسا نہیں کیا مثلاً محبّت کا گیسو کی پابند ہوں۔ اسی پر مصرعہ تمام کردیا جاتا تو رکن آخر سالم نہیں رہتا اور وزن میں خلل پڑتا ؎

ہو از لفوں پر اُسکی مبتلا دل   کئے کی اپنے پائیگا سزا دل
وہ بیٹھے ہیں مرے پہلو بہ پہلو   جگر کی جا جگر ہے دل کی جا دل

اس مصرعہ میں حالت اطمینان کی صورت کھینچی ہے حال آنکہ اطمینان ایک معنوی و باطنی شے ہے اُس کے لئے صورت کجا بالتزام یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ فراق میں جگر و دل ٹھکانے نہیں رہتے۔ شاعر کا کام مصوّری ہے اور یہ سچ ہے کہ کوئی تصویر غیر مہذب بھی ہوتی ہے مگر وہ بھی تصویر ہی ہوتی ہے بلکہ تصویر سے بڑھکر۔ اس لئے کہ معانی کی تصویر کھینچنا شاعر ہی کا کام ہے مصوّر میں یہ ہنر کہاں ؎

جن کے ستم اُٹھاکر برباد ہوگئے ہم   نازاں ہیں اب وہ اسیر جلاد ہوگئے ہم
مطلب نہیں کسی سے ہی کام عاشقی ہے   افکارِ دنیوی سے آزاد ہوگئے ہم
شیریں سے منہ نہ موڑا کہسار کو نہ چھوڑا   سر پتھروں سے پھوڑا فرہاد ہوگئے ہم

کیا مطلع کہا ہے۔ اور شعروں میں بھی کیا اچھا تغزل ہے لیکن اُردو کی شاعری اور زبان کی اصلاح کرنے والے یہ کہا کرتے ہیں کہ آخر فرہاد و مجنوں کا ذکر کب تک کئے جائنگے یہ مضمون کیا کبھی پُرانا نہو گا۔ اسی طرح اگر بہزاد و شداد کے قافئے کئے تو وہ بھی پُرانے ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں کو مرے ہوئے نہیں معلوم کے ہزار برس گزر گئے۔ پھر اسی قیاس پر صیّاد و جلاّد گو کسی خاص شخص کا نام نہیں ہے مگر ان کی شکایت کرتے کرتے بھی زمانہ ہو گیا۔ کہاں تک کوئی سن سکتا ہے۔ یہ اعتراض بظاہر بہت قوی معلوم ہوتا ہے۔ مگر جواب اس کا یہ ہے کہ ان قافیوں کے ساتھ "ہو گئے ہم" بھی تو لگا ہوا ہے۔ دوسرے جو قافئے معرکہ انظار شعرا رہا کئے ہیں اس سے تجاوز کرنا غزل میں نامناسب بلکہ غریب و رکیک معلوم ہوتا ہے۔ نساخ مرحوم گیسو و آہو کے قافیوں میں راسو ضرور کہا کرتے تھے اور اس پر انھیں ناز تھا کہ میں نے نیا قافیہ نکالا۔ مگر غرابت سے خالی نہیں۔ غزل میں یہ عیب بے شک ہی کہ اسکا فرہ ایسا پڑجاتا ہے کہ شاعر دوسرے اصنافِ سخن سے اکثر بیگانہ رہتا ہے فارسی و اُردو کی شاعری میں غزل و قصیدہ اکثر ہے۔ وبعض شعرا مثنوی و مرثیہ بھی کہتے ہیں۔ غیر زبانوں کی شاعری میں زیادہ تر کسی موضوع پر شعر کہتے ہیں یا کسی منظر کا سماں دکھاتے ہیں یا مثنوی کہتے ہیں اور فسانہ گوئی کرتے ہیں۔ غزل ان کے کلام میں نہیں ہے۔ ہمارے قصیدوں کی تشبیب و تمہید اکثر کسی منظر لطیف یا کسی موضوع اخلاقی پر شامل ہوتی ہے مگر مقصود قصیدہ کا کسی امیر کی مدح ہوتی ہے۔ اس سبب سے تشبیب کا مضمون بھی مبتذل ہو جاتا ہے۔ فسانہ گوئی شریعتِ اسلام میں ناجائز قرار پائی ہے۔ اس سبب سے شعرائے اہل اسلام نے اس سے احتیاط کی ہے۔

جانتے زیست کو ہو نقش بر آب بیٹھتے خیمۂ حباب میں ہم
اس کے آنے کی سنتے ہیں جو خبر فرق پاتے ہیں اضطراب میں ہم

اس زمین میں بھی دونوں شعر خوب ہیں اور خیمۂ حباب والا شعر تو تعریف سے مستغنی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ انسان خیمۂ حباب میں کیونکر سما سکتا ہے تو میں یہی کہونگا کہ وہ شعر کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہستی جس دریا کا نقش بر آب ہے اس کا حباب کچھ اور ہے۔

نظر آتا ہے مجھکو جان کا خطرہ اقامت میں مثالِ نبض میں سرگرم ہوں قطعِ مسافت میں
جدائی میں تری میں سوکھکر کانٹا ہوا اے گل عجب کیا ہوں جو دامن گیر صحرائے قیامت میں
گزارا یہ عالمِ خوف و رجا میں کیوں نہ تردامن یقیں برقِ غضب کا بھی ہو دلکو ابر رحمت میں

مطلع میں وہ مضمون عالی ہے جسے فکرِ شاعر کا کارنامہ کہنا چاہئے۔ ایسے شعر بہت کم دست یاب ہوتے ہیں۔ کانٹے کا دامنگیر ہونا بھی لطف سے خالی نہیں۔

غمِ ہجراں سے آرام نہیں، مجھے اصلا تاب کلام نہیں
اس قصہ کا انجام نہیں، یہ فسانہ وہ ہی کہ تمام نہیں
تری یاد میں جب سے فقیر ہوا، ترے عشق میں جب سے کہ جوگ لیا
رہا دشت میں منہ پہ بھبوت ملا، مجھے دیر و حرم سے کام نہیں
ہیں نزع کے طور نکلتا ہی دم، او لٹی سانسیں لیتے ہیں ہم
ہٹ جاؤ ہمارے سر کی قسم، اسوقت تمہارا کام نہیں
سرِ قبر وہ آئے جو بال کھلے، پڑھا فاتحہ روکے یہ کہنے لگے
او ٹھو۔ بیٹھے ہیں کب سے ہم آئے ہوئے، سونے کا تو یہ ہنگام نہیں

یہ فسانہ وہ ہی کہ تمام نہیں، اس میں چاروں فعلن متحرک العین اور الٹی سانسیں لیتے ہیں ہم، اس میں چاروں فعلن مسکن ہیں اس سبب سے کہ فعلن میں تین متحرک پیاپے جمع ہو گئے ہیں

اور یہ کلیہ عروض فارسی کا ہے کہ جس بحر میں تین متحرک جس جگہ پے در پے آجائیں وہاں دوسرے کو ساکن کر سکتے ہیں لیکن اردو کے شعرا اس وزن کے سوا اور کسی بحر میں ایسا تصرف کم کرتے ہیں۔

مردم نہیں ہیں شیشہ چشم بتِ بے حجاب میں — پریوں کو اس نے بند کیا ہے حباب میں
اک برق آہ سے ترے جل جاتا دیکھنا — کیوں آسماں چھپا ہے گلیم سحاب میں
ہوتا ہے پختہ کار سن اس میں شک نہیں — کیفیتیں زیادہ ہیں کہنہ شراب میں
پہنچے وہاں غبار جو اس خاکسار کا — دو دن جلا ہو آئینہ آفتاب میں
پیشِ نگاہ رہتے تھے صولت جو رات دن — وہ صورتیں نظر نہیں آتی ہیں خواب میں

زنجاجی سرپوش کو بھی حباب کہتے ہیں جس کے نیچے گلدستے وغیرہ رکھتے ہیں۔ یہاں یہی معنی مقصود ہیں مطلب یہ کہ پریوں کو شیشہ میں اتارا ہے۔ آسمان کا گلیم سحاب میں چھپنا کیا اچھی تخیل ہے۔ اپنی خاک سے آئینۂ آفتاب کی جلا ہونا بہت ہی تعلّی کا مضمون ہے۔ لیکن شاعر کے منہ سے تعلّی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور خاکسار کا لفظ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ مرتبہ خاکساری سے حاصل ہوا ہے۔

نہیں اگرچہ خمارِ شراب آنکھوں میں — غنودگی ہے مگر بے حساب آنکھوں میں
کبھی وہ دیکھتا ہے لطف سے غضب سے کبھی — جہاں کی طرح سے ہے انقلاب آنکھوں میں
تمہارے ہجر میں مہماں ہوں کوئی دم کا — کیا ہے روح نے اب پا تراب آنکھوں میں

مطلع میں یہ بات نہ بتائی کہ یہ کس کی آنکھوں کا ذکر ہے اور اس سے کلام کا حسن زیادہ ہو گیا۔

یہ رنگ پر ہے بہار گلچیں، کہ گل سے نازک ہیں خار گلچیں
غضب ہے گل کا نکھار گلچیں، یہ لطف ہے یادگار گلچیں
کسی کا ہوتا نہ خوف حاشا، چمن بھی اپنا تھا گل بھی اپنا
زمانہ آرام سے گزرتا ہمارا ہوتا جو یار گلچیں
نہ کیوں ہو سیرِ چمن سے نفرت، یہ رنگ دیکھا ہے ہم نے صولت
کھلے جو دو پھول بعد مدت، تو آ کے ٹوٹے ہزار گلچیں

لکھنؤ کی شاعری میں گل و بلبل و صیاد و گلچیں کا ذکر بہت ہے۔ ایسے اشعار کو استعارہ پر محمول کرنا چاہئے۔ اگر کہنے والے نے اس نکتہ کو سمجھ کر نہیں کہا ہے۔ اس کے نہ سمجھنے سے شعر کو ضرر نہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ہم نے تقلید قدما میں اسی قسم کے مضامین باندھے جیسے ان کے کلام میں دیکھے اور اہل مذاق نے جب داد دی تو تنبہ ہوا کہ اس شعر کی یہ خوبیاں ہمارے خیال میں نہ تھیں۔

آج چھلّا وہ نشانی کا عطا کرتے ہیں — اور دیوانہ کو انگشت نما کرتے ہیں
آپ عاشق ہمیں سمجھیں کہ نہ سمجھیں اپنا — ہم اسی طرح مگر جان فدا کرتے ہیں
جھوٹی قسمیں نہیں کھاتے ہیں نہیں کچھ وسواس — اب تو قرآن پہ قرآن اٹھا کرتے ہیں
دل لگی ان کی ہے اغیار سے لڑوا دینا — آپ الگ رہتے ہیں اور انکو بُرا کرتے ہیں
اعتماد آپ کو جن جن کی رقابت پر ہے — گوشت ناخن سے وہی لوگ جدا کرتے ہیں
پوچھتا کیا ہے مزاج اپنے مریضوں کا مسیح — شکر ہے شکر ہے جیتے ہیں دعا کرتے ہیں
تم سے مطلب ہے ہمیں اور کسی سے کیا کام — جلنے والے تو اسی طرح جلا کرتے ہیں

اس غزل کے مطلع میں تو ایک عاشقانہ معاملہ ہے۔ باقی جتنے شعر ہیں وہ دیکھنے ہی میں عاشقانہ معلوم ہوتے ہیں ورنہ یہ معاملات اہل دنیا میں ہوا ہی کرتے ہیں۔ عاشق و معشوق کی کچھ خصوصیت نہیں ہے۔ شاعر کے کلام کو عام کر کے دیکھو تو معلوم ہو کہ وہ دنیا کے کن کن معاملات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

بت پرستوں کو کہا کرتا ہے واعظ سخت سست — ہم طرح دیتے ہیں اس مردِ خدا سے کیا کہیں
آہ کرنے پہ ہوئے برہم تو ہم خاموش ہیں — آپ تو بیکار لڑتے ہیں ہوا سے کیا کہیں
پوچھنا رونے کا باعث ہچکیاں تھمنے تو دو — دم سماتا ہی نہیں فرطِ بکا سے کیا کہیں

مصلحت جو قتل عاشق میں تھی خود ظاہر کریں   مجھسے کیوں پوچھا میں کیا جانوں خدا سے کہئیے

بت پرستوں کو برا کہنا اس سبب سے برا معلوم ہوتا ہے کہ خود بھی بت پرست ہیں بت پرستی سے مراد محویت ہے جو عالم اجسام کو دیکھکر طاری ہوئی ہے۔ شاعر اُسے مظاہر قدرت سمجھتا ہے اور صوفی سد راہِ معرفت خیال کرتا ہے۔ بکا کا قافیہ غرابت سے خالی نہیں۔ میرے خیال میں یہ لفظ زبان شاعر کا نہیں خصوصاً شاعر غزل گو۔

چال سے آفت بپا کر آئے ہو   فتنۂ محشر جگا کر آئے ہو
شکل تم جس کو دکھا کر آئے ہو   اُس کو دیوانہ بنا کر آئے ہو
جذبِ دل پھر کھینچ لایا ہے ادھر   کیسے اُلٹے پاؤں جا کر آئے ہو
وہ ہی امیدِ اسیری میں ہلاک   جس کو صدقے میں رہا کر آئے ہو
شکوے مجھسے دردِ دل کہتے ہیں وہ   ہائے کیا فقرہ بنا کر آئے ہو
میں نے جا کر جب کہا مرتا ہوں میں   بولے سچ مچ زہر کھا کر آئے ہو
آہ نے صولت کی دکھلایا اثر   یار کیسے تلملا کر آئے ہو

صولت نے یہ غزل جس رنگ میں کہی ہے یہ رنگ لکھنؤ میں اُچھلا اور موجد اس کے جرأت ہوئے۔ پھر ناسخ و آتش کا رنگ اس پر غالب آ گیا۔ آخر میں فصیح الملک مرزا داغ مرحوم نے اس رنگ کو اپنے حصّہ کا کر لیا۔ حال آنکہ وہ کہتے تھے کہ میں نے ابتدا میں شیخ ناسخ کا تتبع کیا پھر حکیم مومن خاں صاحب کا طرز اختیار کیا۔ پھر میں اپنے رنگ پر آ گیا۔ مگر اصل امر یہ ہے کہ یہ رنگ جرأت کا ہے اور خاصہ اس رنگ کا یہ ہے کہ اکثر کلام سست اور بے مزہ رہتا ہے۔ جرأت کا ضخیم دیوان چھپ چکا ہے اور لوگوں کی نظر سے گزر چکا ہے چند اشعار بیشک بہت شوخ ہیں ان میں بھی معاملات عاشقانہ اکثر تعلق ناجائز کا پہلو لئے ہوئے ہیں ؎

رنگ اب چھوڑ دیا گھر سے نکلکر آنا   یا وہ راتوں کو سدا بھیس بدلکر آنا
جرأت اُسکی کہوں کیا تجھسے طرحداری میں   جانا جب اٹھ کے تب اک روپ بدلکر آنا
گالیاں دینے لگے نام مرا لے لے تم   کچھ مری چاہ کے کھل جاتے ہی کھل کھیلے تم
پوچھے ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری   تو منہ کو پھیر کے کہتا ہے اف پناہ تری
کہا جو میں نے کہ ہو دل جلو تکی آہ اک سخت   تو بول اٹھا کہ تجھی پر پڑیگی آہ تری
میرے جو اشارہ سے رکھا پھیر کسی نے   سو باتیں سنائیں مجھے منہ پھیر کسی نے
دیکھوں تو یوں وہ کہکے لگے منہ کو ڈھانپنے   کمبخت پھر لگا مجھے نظروں میں بھانپنے

غزل میں کسی حسین کی تصویر دکھانا یا اسکی کسی ادا کا ذکر کرنا اس ہیچ مداں کی رائے میں خلاف تہذیب نہیں ہے اور مہذب قوموں کے شعرا کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اسی وادی کے سالک ہیں البتہ معاملات عاشقانہ جن سے تعلق ناجائز سمجھا جائے شعر میں ہوں تو اخلاق پر بُرا اثر ڈالتے ہیں۔ اسی وجہ سے محقق طوسی، امراؤ القیس و ابو نواس کا دیوان دیکھنے کو منع کرتے ہیں اور اڈیسن نے سیفو شاعرہ یونان کا کلام تلف ہو جانے کو غنیمت سمجھا ہے۔

ناسخ و آتش نے کھلے کھلے جذبات کے نظم کرنے سے کراہتیہ کی لیکن پھر بھی استعارہ کے پردہ میں اس طرح کے مضامین اُنکے کلام میں موجود ہیں۔ کوئی اس بات کو سمجھا نہیں کہ ایسے مضامین مطلقاً ترک کرنا چاہئے۔ شیخ ناسخ نے اس مصرعہ میں۔ ؏ رکھوں میں ساق ساقیِ گلفام دوش پر۔ کنایہ و تجنیس کی آڑ پکڑی ہے مگر بات تو وہی ہے جو کہنے کی نہ تھی۔ داغ نے یہ مضامین اس برجستگی سے نظم کئے کہ لوگ حیران رہ گئے تعجب یہ ہے کہ جلال مغفور و امیر مرحوم کے کلام پر بھی اس کا اثر پڑ گیا۔ تقریباً پچیس برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ تیسرا دیوان جلال کا چھپا ایک نسخہ اسکا حیدرآباد میں مجھے بھیجا اور یہ لکھا کہ یہ دیوان میں نے اہل دہلی

کے رنگ میں کہا ہے۔ میں نے اس عطیہ کے شکریہ میں یہ کلمہ بھی لکھا کہ ہمیں تو آپ کا پہلا ہی رنگ زیادہ تر پسند ہے۔ مختصر یہ کہ وہ مجھسے خفا ہو گئے۔ مگر مالک الدولہ اور بادشاہی دربار کے شعرائے سبعہ سیارہ ایسے کورہ دہ میں رہے جہاں سے کسی شاعر کا کلام باہر نکلا نہ کسی کا شہرہ وہاں تک پہنچا۔ داغ مرحوم کا پہلا دیوان کب کا چھپ چکا تھا اور وہ خود بھی مٹیا برج وکلکتہ کے مشاعروں میں شریک ہو چکے تھے۔ لیکن انکی شہرت کا زمانہ مالک الدولہ نے کہاں دیکھا مٹیا برج کا خاتمہ ہو جانے کے بعد حیدرآباد میں جب میں پہنچا ہوں تو مرزا داغ صاحب وہاں آچلے تھے اور سیف الحق ادیب مرحوم کے مہمان تھے اور امیدوار میں تھے ایک غزل انہوں نے اپنی سنائی کہ یہ تازہ فکر ہے

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے اجل رہ گئی تو کہاں آتے آتے

ساری غزل مرصع اور نہایت برجستہ تھی مگر اس شہرت عام کو دیکھئے کہ وہاں سے میں اُٹھا تو راہ میں وہی غزل گائی جا رہی تھی۔ ہمارے زمانہ میں یہ شاعر بڑا مقبول و اقبال مند گزرا غزلیں ان کی گانے کے مناسب ہوتی تھیں اور اسی سبب سے شہرت بھی ان کی سی کسی غزل گو کو نصیب نہ ہوئی۔ مگر حیدرآباد بلکہ تمام ہندوستان میں تہذیب جدید نے اتنی جلد ترقی کی کہ ان مرحوم کی زندگی ہی میں اُنکا رنگ پھیکا پڑ گیا اور لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ چوما چاٹی کے مضمون کہنا جانتے ہیں۔ اتنے بڑے دربار میں کوئی شاندار قصیدہ نہ پیش کر سکے اسی اثنا میں مجھے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ اب کے دفعہ وہاں کئی خوش فکر شاعروں کو دیکھکر نہایت مسرت ہوئی یعنی جناب منشی نوبت رائے صاحب نظر و حضرت محشر اور حضرت فصاحت۔ محرم کے دن تھے برادر معظم نواب سید فدا حسین خانصاحب طباطبائی سے ملنے کو میں حسین آباد گیا وہ مجلس میں جانے کو گھر سے نکل چکے تھے۔ بی حیدر کے یہاں سالانہ مجلس تھی مجھے اپنے ساتھ لئے ہوئے مجلس میں چلے گئے۔ وہاں بھی اکثر ایسے احباب سے ملاقات ہوئی جو شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے۔ مجلس شروع ہونے میں عرصہ تھا۔ مرزا داغ کا ذکر ہونے لگا ایک صاحب نے کہا داغ اپنے طرز میں متفرد ہیں فصاحت نے کہا اب تو کل کے چھوکرے اُسی طرز میں غزل کہہ لیتے ہیں۔ میں نے کہا اُس شخص کے کمال کی بڑی دلیل یہ ہے کہ یہاں کے مشاہیر شعرا پر اُس کے کلام کا ایسا اثر پڑا کہ رنگ سخن بدل گیا۔ ایک اور بزرگ بیٹھے تھے انہوں نے کہا غرض اُس سے یہ تھی کہ دیکھو ہم ایسا بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں نے کہا الفضل للمتقدم۔

حیدرآباد میں جب میں آیا تو مرزا داغ مرحوم پوچھنے لگے کہ لکھنؤ میں ہمارا بھی ذکر کسی سے آیا تھا۔ میں نے حیدر کی مجلس میں جو گفتگو ہوئی تھی یہ سمجھکر بیان کی کہ وہ خوش ہوں گے۔ مگر اُنھیں ملال ہوا۔ کہنے لگے جی ہاں ہمارا طرز سخن چھوکروں ہی کے کہنے کا ہے۔ میں یہ ذکر کرکے پشیمان ہوا۔ گویا وہ اُسے میری رائے سمجھے۔ حالانکہ میری رائے اُنکی نسبت میں وہی تھی جو میں نے بیان کی اور اُن کے کلام کا بڑا قدرداں میں تھا۔ اور وہ بھی میری ہرزہ سرائی کو جس غور سے سنتے تھے کسی اور کے کلام پر ایسی گہری نظر نہیں ڈالتے تھے۔ یہ کل کی بات ہے جیسے آج میں کہانی کی طرح بیان کر رہا ہوں۔ ایک دفعہ کہنے لگے یہ جو طرح ہوئی ہے رفتار کسی کی اور تکرار کسی کی اس میں کچھ شعر کہے ہوں تو پڑھئے۔ میں تو مشاعرے میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے جو شعر یاد آتے گئے میں پڑھنے لگا ایک شعر یہ تھا ۔

واعظ ہو کہ زاہد ہو یہ ہے فصل بہاری   ہم رند اٹھائیں گے نہ زنہار کسی کی

قافیہ اس کا میری زبان سے پورا نہ نکلا تھا کہ انہوں نے ایسا مزا لے کے ردیف کو پڑھا جیسے کوئی سم پر بے چین ہو جاتا ہے۔ اور مجھ سے کہا سچ کہئے گا یہ داغ کا رنگ ہے کہ نہیں۔ میں نے کہا آپ کا فیض صحبت کہاں تک نہ پہنچے گا۔ مگر اس شعر کے رنگ کو بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

عبرت مجھے ہوتی ہے پلٹنے پہ صبا کے   اک بات اٹھاتا نہیں کہسار کسی کی

کہنے لگے یہ اور ہی چیز ہے۔ پھر ایک شعر میں نے اور پڑھا ؎

یوں مر کہ نہ یاروں کو ہو بھاری ترا مرنا   یوں جی کہ طبیعت پہ نہ ہو بار کسی کی

کہا اس کا کیا پوچھنا۔ مرزا داغ کے چھوٹے بھائی شاغل مرحوم ذوق کے شاگرد اور بڑے خوش فکر شاعر تھے وہ بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے اُن سے میں نے کہا کچھ اپنا کلام سنائیے۔ مرزا داغ نے کہا ان کو شوق ہی نہیں آپ کی طرح سے برسوں میں ایک آدھ غزل کہہ لیتے ہیں غرض شاغل نے بہت اچھی ایک غزل پڑھی زمین یہ تھی کہ ہو جائے گا اور رہ جائے گا ان کا ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ؎

تم شبِ وصل میں افسانہ کہو میں سمجھا   کہ یہ برسوں کا جاگا ہوا سو جائیگا

وہ زمانہ جب کہ حجاب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
یہی چہرہ زیرِ نقاب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہمیں جاں نثار تمہارے تھے، کہ ہمیشہ جس سے اشارے تھے
کبھی عاشق اپنا خطاب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جو اُٹھائے لطف وصال میں، نہیں آتے وہم و خیال میں
وہ گزشتہ عیش بھی خواب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
یہ ملال آج ہے بوسہ پر، بھلا پہلے کی بھی ہے کچھ خبر
نہ حساب تھا نہ کتاب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حکیم مومن خاں صاحب کی نکالی ہوئی زمین ہے۔ ع

وہ جو ہم سے تم سے قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ یہ غزل لکھنؤ میں بہت مشہور رہی ہے اور مٹیا برج میں بھی ارباب نشاط کے زباں زد تھی۔ مومن نے "تھا" کو قافیہ قرار دیا اور مالک الدولہ نے تھا کو بھی ردیف کر دیا اور حجاب و نقاب قافیہ قرار دیا اب یہ زمین زیادہ خوبصورت ہو گئی۔ اس غزل کے آخر شعر میں دیکھئے کہ محاورہ قیاس پر کس قدر غالب ہے۔ ایسی مثال اس مسئلہ کے سمجھنے کے لئے بہت کم ملے گی۔ کتاب مونث ہے مگر محاورہ نے اپنی زبردستی سے اُسے مذکر بنا لیا۔ بھلا کے الف کا گرنا بُرا معلوم ہوتا ہے ؎

وہ حسین غیرت لیلیٰ نظر آتا ہے مجھے   تھا جو مجنوں کو وہ سودا نظر آتا ہے مجھے
اسکے ابروئے تصور میں رواں ہیں آنسو   تیغ کی باڑھ پہ دریا نظر آتا ہے مجھے
ہمسری کی تھی جو کل تجھ سے مہ کامل نے   آج چہرہ بھی کچھ اترا نظر آتا ہے مجھے
کس طرح شکر کا سجدہ نہ بجالاؤں میں   یار کا نقش کفِ پا نظر آتا ہے مجھے
تیری باتیں ہیں قیامت کی غضب کے فقرے   آج بھی وعدۂ فردا نظر آتا ہے مجھے
ہائے کچھ کم نہ ہوئی قلب و جگر کی دھڑکن   رقص بسمل کا تماشا نظر آتا ہے مجھے
تم نے کیا پھیر لیں آنکھیں کہ جہاں مجھ سے پھرا   کوئی اپنا نہ پرایا نظر آتا ہے مجھے

چاند کا ایک رات میں چہرہ اتر جانا کیا اچھی تخیل ہے۔ شاعر کے سوا کسی کو ایسی باتیں نہیں سوجھتیں۔ میں نے درخشاں کا جو تذکرہ رسالہ ادیب میں شائع کیا تھا اس میں یہ نکتہ طالبانِ فن کے لئے قابل لحاظ لکھا تھا کہ بوسہ ابرو میں نہایت تصنع معلوم ہوتا ہے۔ بوسہ لینے کے جو مقامات ہیں ان میں ابرو نہیں داخل تصور ابرو میں بھی ویسا ہی تصنع ہے۔ لیکن تیغ کی باڑھ پر دریا کا ہونا کیونکر بنتا۔ اس قسم کا توسعہ اساتذۂ فارس کے کلام سے ماخوذ ہے۔ حافظ کہتے ہیں ؎

در نماز م خم ابروئے تو در یاد آمد   حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

مگر تتبع کسی کے کلام میں ہو اچھا نہیں۔

اے دل تجھکو خیال کیا ہے   گھلا گیا کیوں ملال کیا ہے
دانستہ وہ بھولتے ہیں پوچھتے ہیں   مطلب کیا ہے سوال کیا ہے
ماشاء اللہ ابھی سے ہوشوخ   کیا عمر ہے سن وسال کیا ہے
سنتے نہیں ہم سوائے قلقل   اے شیخ یہ قیل وقال کیا ہے
لاکھوں ہیں بناؤ سادگی میں   آرائشِ خط وخال کیا ہے
دیکھو دیکھو نہ حشر ہو جائے   سنبھلو سنبھلو یہ چال کیا ہے
محفل میں کسے وہ ڈھونڈتے ہیں   اُٹھ اُٹھ کے یہ دیکھ بھال کیا ہے
مسلا ہے کسی کا غنچۂ دل   مٹھی میں یہ لال لال کیا ہے
دو چار منٹوں کا ہوں جو بے حکم   کیا نہ ہو مرا مجال کیا ہے

یہ وزن رباعی کا مجزو ہے۔ رکن آخر کے کم کردینے سے ... یہ سمجھو" اے دل تجھکو خیال کیا ہے بتلا" یہ رباعی کے اوزان میں سے ایک وزن ہے۔ اس میں سے بتا نکال ڈالا اور رباعی حاصل ہوا۔ اس وزن میں تین متحرک ایک ... ہو جاتے ہیں۔ یعنی مفعول مفاعلن مفاعیل میں مفعول کا ... کا میم اور ف متحرک ہیں۔ اردو کہنے والے بھی ... متحرک ثانی کا قاعدہ جاری کرتے ہیں اور مفعولن ... مفاعیل کے وزن پر جس مصرع کو چاہتے ہیں کہتے ہیں مگر رباعی کی طرح بعض لوگ اس میں بھی دھوکا کھاتے ہیں۔ دو حرف زیادہ کہہ جایا کرتے ہیں جس سے مفعولن مستفعلن مفاعیل ایک غلط وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وزن میں شعر کہنے والوں کو میں اس عام الورود دھوکے سے متنبہ کردینا مناسب سمجھا۔ داغ کی ایک رباعی میں میں نے یہی غلطی پائی۔ وہ مصرع مجھے اسوقت یاد نہیں مگر وزن اس کا یہ تھا مفعولن مستفعلن مفاعیل فعل۔

خیر گزری آپ کا آنا غنیمت ہو گیا   تھم گئے نالے قیامت ہو گئی یا رگئی
پھینک کر تیرِ نظر دو چار وہ راہی ہوا   زخم دل میں رہ گئے زخموں میں پیکا رگئی
کھائے غوطہ پھر نہ اُبھرا میں غریقِ بحرِ عشق   ہاتھ ساحل سے بڑھا کر موجِ دریا رہ گئی
اپنے بیگانوں سے اے شوکت چھٹے ہم بعد مرگ   سب ہوئے رخصت لحد میں لاش تنہا رہ گئی

موج کا غریق کے نکالنے کو ہاتھ بڑھانا تازہ خیال ہے لفظ لحد بسکون ح ہے۔ لیکن فارسی والے بتحریک باندھا کرتے ہیں اور اردو کہنے والے اُن کے متبع ہیں۔ غرض دونوں طرح نظم میں لانا صحیح ہے۔ رہ گئی اور رہ گیا کی ردیف مجھے اکثر مزہ دیتی ہے حافظ کی اس غزل میں حسن ردیف قابل لحاظ ہے۔

ہر کہ شد محرمِ دل در حرمِ یار بماند   آنکہ ایں کار ندانست در انکار بماند
داشتم دلقے و صد عیب مرا می پوشید   خرقہ رہنِ مے و مطرب شد و زنار بماند
گشت بیمار کہ چوں چشمِ تو گردد نرگس   شیوۂ آں نہ شدش حاصل و بیمار بماند
از صدائے سخنِ عشق ندیدم خوش تر   یادگارے کہ دریں گنبدِ دوار بماند
صوفیاں واستدند از گرو مے ہمہ رخت   دلقِ ما بود کہ در خانۂ خمار بماند
بر جمالِ تو چناں صورتِ چیں حیراں شد   کہ حدیثش ہمہ جا بر در و دیوار بماند
بتماشاگہ زلفش دلِ حافظ روزے   شد کہ باز آید و جاوید گرفتار بماند

فراغ قلبِ مجنوں ہے خیالِ روئے روشن بھی
دگر نہ ہے مقام ہو جو ہو وادیٔ ایمن بھی ہو
یہ بے دردی کے معنے ہیں ستمگر ہو تو ہو تم سا
نہ پوچھا زندگی میں بھی نہ آئے بعد مردن بھی
خدا کو بھول جائیں سب جو شکل اپنی دکھادو تم
کریں سجدہ مسلماں بھی پڑھیں کلمہ برہمن بھی
تم اپنی تیغ کی خوں ریزیاں عشاق سے پوچھو
عجب طوفاں بپا کرتی ہے موجِ آبِ آہن بھی
دلِ پُر داغ کافی ہے قفس میں دل بہلنے کو



لیلیٰ و مجنوں

انڈین پریس الہ آباد

یہیں سیرِ گلستاں ہے یہیں لطفِ نشیمن بھی
کوئی دیکھے بوقتِ گریہ از خود رفتگی میری
عجب کیا ہے بہالے جائے موجِ چینِ دامن بھی

مطلع کی بندش اداے مطلب سے قاصر ہے۔ یعنی مجہول
افراغِ قلب خیال روے روشن سے بھی ہے۔ ورنہ قلب
ن کا وادی ایمن بھی ہوتا تو مقام ہو تھا۔ مردن اور کردن
و گفتن وغیرہ سیکڑوں مصدر ہیں جنمیں نون مصدری ہے
سکو دامن اور آہن کے قافیوں میں لے آنا شائگاں کہلاتا
ہے۔ ایطا و شائگاں میں اکثر اہل فن فرق نہیں کرتے ہیں جیدال
ن راے یہ ہے کہ اگر یہی قافیے مطلع میں آجائیں تو ایطا ہے
ور اشعار میں ہوں تو شائگاں ہیں۔ اُردو میں دریا اور صحرا
کے ساتھ دیکھا اور سمجھا اور بولا وغیرہ جس میں الف ماضی
لگا ہوا ہے نظم کیا جاے تو قافیہ شائگاں اُن لفظوں کو کہیں گے
ور اگر مطلع میں دیکھا اور بولا مثلاً کہا جائے گا تو ایطا ہوگا۔ کلمہ
بسکون لام متصل ہوگیا ہے اور اردو میں تو بتحریک لام بُرا معلوم ہوتا ہے

طبیعت میں نہ شوخی تھی نہ گرمی تھی ذرا پہلے
تمہارے ہاتھ پر چڑھتا نہ تھا رنگِ حنا پہلے
کروں کیا دل کی بے تابی کو نالے کس طرح روکوں
برستے ہو عبث مجھ پہ سنو تو ماجرا پہلے
ابھی کچھ دن اُدھر الھڑ پنے سے چال چلتے تھے
اُتر پڑتا تھا شانہ سے دوپٹہ بارہا پہلے
ابھی کیونکر جگر کے داغ کی حالت دکھاؤں میں
تمہارے سامنے سے ہو تو آئینہ جدا پہلے

مجھے یاد ہے مشاعرہ میں اس مطلع نے بڑا رنگ دیا تھا۔ وقیہ اور آنچل سنّی اور کاجل گھونگٹ اور افشاں چوٹی اور ... لکھنؤ کے خصوصیات میں سے ہے اس واسطے کہ امرد پرستی کے عیب سے غزل کو پاک کریں۔

(باقی آیندہ) علی حیدر طباطبائی

دربار دہلی

نو سو برس دہلی دار السلطنت رہا یہ تو یقینی ہے اور اس کے علاوہ ظنی ہے کیونکہ ہندوستان کے واقعات قدیمہ کے زینوں پر چڑھنے میں فن تاریخ پس پا ہے تواریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ ۹ مرتبہ دہلی تاخت و تاراج ہوا اور اتنی ہی مرتبہ پھر آباد ہوا مگر یہ آبادی کبھی کبھی ادھر اُدھر ہٹ گئی چنانچہ جس مقام پر اب نافِ شہر ہے وہ قدیم دہلی کی آبادی سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ جہاں تک غور کیا جاتا ہے دہلی کو تمام ہندوستان میں دار السلطنت ہونے کا فخر اسی بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی شاہان ہند کو غنیم کا خوف ہوا ہے شمال و مغرب کے گوشہ سے اور اس کا راستہ پنجاب سے ہے اور پنجاب کا پھاٹک دہلی ہے۔ لہذا بادشاہ کا دہلی میں قیام رکھنا اسیطرح مناسب ہوا جس طرح جنگی موقع پر قلب لشکر میں بادشاہ محفوظ اور محافظ رہتا ہے اور اگر بالکل پنجاب میں یعنی سرحد کے قریب پایۂ تخت ہوتا تو یہ بھی نامناسب ہوتا کیونکہ تمام ہندوستان سے باعتبار قرب و بعد دار السلطنت کو قریب قریب مساوات ہونی چاہیے اور پنجاب میں اگر پایۂ تخت ہوتا تو پورب سے

بہت فاصلہ ہوجاتا یا اگر یورپ کی طرف ہوتا تو پنجاب سے
بہت فاصلہ ہوجاتا اور یہ پولٹیکل اصول سے بُرا تھا ان وجوہ
سے اکثر بادشاہوں نے اس کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔
گا چونکہ گورنمنٹ انگریزی کو بھی ضرورتیں کلکتہ میں واقع ہوئیں جو
کہ یورپ کے بحری راستوں کا دہانہ ہے اور اسی وجہ سے
اگر کوئی خوف بحری ہو سکتا ہے تو وہ زیادہ تر کلکتہ کے بندرگاہ
پر اس لئے گویا پایۂ تخت کلکتہ قرار دیا گیا حالانکہ بادی النظر میں
بڑی مہموں کا خوف اُسی جانب ہے جسطرف سے ہمیشہ رہا
یعنی افغانستان۔ مگر کابل کی مہم سر ہوجانے کے بعد گورنمنٹ
کو ایسا اطمینان کامل ہوگیا کہ سوائے معمولی باغی قبائل کے
اور کسی شاہی فوج نے اُدھر رُخ نہ کیا۔ یہ گورنمنٹ کی پولٹیکل
قابلیت کا نتیجہ تھا کہ اُس کا انتظام جس پیشین گوئی کی بنا پر ہوا
تھا وہ آج تک صحیح رہا۔ پولیٹکل معلومات میں اس سے یہ فائدہ
اُس شخص کو پہنچ سکتا ہے جو یہ نتیجہ نکالے کہ ہر ایک یورپین
سلطنت کو بہ نسبت بری طاقت کے بحری قوت کی زیادہ ضرورت
ہے اور یہ پولیٹکل مسئلہ دو چار برس سے نہیں طے ہوا ہے بلکہ
حضرت عیسیٰ سے تقریباً ساڑھے چار سو برس پیشتر تھیمسٹوکلس اعظم
یونانی پہلا شخص تھا جس نے یہ تجویز کی تھی کہ لہراسپ شاہ فارس
کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ اسی حالت میں ہو سکتا ہے جبکہ جنگی
جہاز تیار کئے جائیں اُس کی رائے سے عام اختلاف ہوا اور
آخر تک رہا مگر آخرکار بڑی مشکل سے وہ کامیاب ہوا اور اسکی
رائے کے موافق تقریباً ڈیڑھ سو جہاز کا بیڑہ تیار ہوا۔ افلاطون
کا مقولہ ہے کہ تھیمسٹوکلس پر یہ الزام یونانیوں نے لگایا کہ اس نے
فوجی سپاہی اور بہادروں کی تیغ و سپر چھین کے ان کے ہاتھوں
میں تھاپیاں پکڑا دیں اور بڑے بڑے سورماؤں کو ملاح
بنا دیا۔ اس بحری جنگ میں پہلا سپہ سالار یورپ پانڈس ایک
والی ریاست تھا فتح ہونے کے بعد تمام یونان کو معلوم ہوگیا تھیمسٹوکلیز
کی رائے بہت صائب تھی گو اس سے پہلے جہازوں کا وجود
تھا مگر یورپ میں جنگی جہاز کوئی نہ تھا اور نہ اس ساز و سامان
سے۔ غرضکہ یہ ایک قدیمی طے شدہ مسئلہ ہے کہ جو ممالک سمندر
کے قریب بھی واقع ہیں خواہ وہ جزیرے نہوں اُنہیں بحری
قوت کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے اثر نے دہلی کو ایک
نامعلوم وقت تک کے لئے اس عزت سے محروم کردیا تھا
کہ وہ دارالسلطنت ہوا اور نہ اب امید* ہے مگر ۵۴ برس کے
بعد اُس کو اعلیحضرت جارج پنجم قیصر ہندوستان و انگلستان کے مراحم خسروانہ
سے وہ پھر ایک مرتبہ اپنی گذشتہ رونق کی تجلی دکھادیگا۔ یوں تو
ہر واقعہ مجموعی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے مگر اس اہمیت کیساتھ
ہندوستان میں کبھی ایسا عالیشان دربار نہوا ہوگا جسمیں
مدبران انگلستان کی تشریف آوری سے دربار آراستہ ہوا ہو
اب ہمکو یہ دیکھنا ہے کہ یہ قدیمی تقریب تخت نشینی لندن میں
جن اصول پر ہوئی ہے آیا دہلی میں بھی اُنہی اصول پر ہوگی یا
نہیں اور یہ کہ ہونی چاہئیے یا نہ۔

انگلستان کا قدیمی رواج اس موقع پر جو کچھ ہے سیاست
و مدن پر اُس کی بنا ہے اور اعلیٰ حضرت کی تخت نشینی میں بھی
وہی سب رسوم ہوئے جو ہمیشہ سے ہوتے چلے آئے ہیں صرف
یہ ایک فرق تھا کہ وزیر اعظم اس سے پہلے کبھی ان خاص
موقعوں پر شریک نہ ہوئے تھے ابکی مرتبہ یہ اضافہ کیا گیا باقی
تمام رسوم حسب دستور ادا ہوئے ان سب کی اصلیت یا یوں
کہا جائے کہ اس تقریب کا خاص رکن یہ تھا کہ بادشاہ و
رعایا نے آپس میں ایک دوسرے سے اقرار و عہد کیا کہ باہم

* خوشی کی بات ہے کہ اہل ہند کی یہ پرانی آرزو پوری ہوگئی۔

خیر خواہی و ہمدردی کی نسبت برقرار رکھیں گے۔ اس موقع پر اعلیٰحضرت نے حلف کے رو سے جو اقرار کیا کہ میں انگلینڈ و آئرلینڈ دریاستہائے متحدہ اور جملہ ممالک متعلقہ کا یکساں خیال رکھونگا۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہندوستان بھی ضمناً آگیا تو یہ قرض شاہنشاہ کے اوپر سے اسیوقت اتر گیا اب ہا رعایا کا معاہدہ تو وہ یورپین رعایا کی طرف سے ہوچکا ہندوستانی رعایا سے کہلوانا باقی ہے جو کہ بغیر کہلوائے کہنے کو تیار ہے مگر صرف اقرار سے کچھ نہیں ہوتا ہے جب تک عملی طور پر ہر ایک اقرار پورا نہیں کیا جاتا اسوقت تک کوئی عہد مضبوط نہیں سمجھا جاتا اور اس کے عملی ثبوت کی ابتداد رباری کے وقت سے شروع ہوجاتی ہے۔ چنانچہ لندن کی تخت نشینی کے موقع پر جس خلوص اور جوش کے ساتھ سات ہزار اہل دربار نے خوشی منائی اس کو اعلیٰ حضرت نے بخوبی محسوس کیا۔ چنانچہ ایک تحریر کے ذریعہ سے سکرٹری کی معرفت اہلِ دربار کا شکریہ ادا کیا گیا اسی طرح دہلی دربار میں ہندوستانی رؤسا کے خیالات کا بھی اندازہ حضور پر نور کو عین وقت پر ضرور بالضرور ہوگا اور اگر کم سے کم اتنی ہی مسرت ان لوگوں سے بھی ظاہر ہوئی تو اہل ہند غیر قوم ہونے کی وجہ سے زیادہ شکریہ کے مستحق ہوں گے۔ جذبات دلی بغیر ظاہر ہوئے نہیں رہتے خصوصاً بادشاہوں اور مدبّروں کے روبرو جھوٹی خوشی اور مصنوعی ہنسی سچے رونے سے بدتر ہے غالباً دربار میں تو کوئی ایسا شخص نہو گا جو اس موقع پر دل سے خوش نہو خواہ وہ زبان سے کہے یا نہ کہے تو رعایا کی طرف سے بھی اہل الرّائے مطمئن ہیں بس یہی ضروری رکن اس تقریب کے ہیں کہ بادشاہ رعایا پر مہربان ہوا اور رعایا بادشاہ کی مطیع و ہمدرد ہو۔ ورنہ جو لوگ اس دربار کو صرف تماشا یا نمایش سمجھتے ہیں وہ حشرات الارض ہیں اُنکی خوشی ناخوشی کوئی چیز نہیں عام طور پر یہ بھی ایک رسم ہے کہ ہر ایک مسرّت خیز دربار میں رعایا بادشاہ کو نذر دیتی ہے اور بادشاہ رعایا کو خلعت و انعام۔ ہم کو امیّد ہے کہ اب تک ہندوستان پر برٹش گورنمنٹ کی جس قدر مہربانیاں ہوتی رہی ہیں اس مرتبہ اس خاص تقریب میں جس سے زیادہ کوئی طرب انگیز تقریب نہیں ان پر اضافہ ہوگا اور رعایا اس المضاعف انعام کو ہمیشہ یاد رکھے گی اور اعلیٰحضرت و ملکہ معظمہ کے حق میں دعائے خیر کرتی رہے گی

ناطق لکھنوی

رسوم دہلی متعلقہ مسلمانان۔ یہ کتاب منشی سید احمد صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ کی تصنیف ہو۔ اس میں آپ نے قریباً ۲۰ رسوم کا بیان کیا ہے، جو دہلی کے علاوہ تمام مسلمانانِ ہند میں کم و بیش مروّج ہیں، بلکہ جزوِ معاشرت بن گئی ہیں۔ ''رسوم دہلی'' کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہندو مذہب اور رسم و رواج بتدریج مسلمانوں میں کسقدر سرایت کر گئے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھکر یہ کہنا بے جا نہوگا کہ گو عقائد کے لحاظ سے مسلمانانِ ہند مسلمان ہوں، مگر رسم و رواج اور معاشرت کے لحاظ سے وہ بہت کچھ ہندوؤں سے مشابہت و مشارکت رکھتے ہیں اور اس مشابہت و مشارکت پر بھی ہندو اور مسلمانوں کا ایک دوسرے سے اجنبی رہنا عجیب و غریب فنامنا (مظاہرہ) ہے بہرکیف یہ کتاب دلچسپی سے خالی نہیں۔ قیمت ۱۲ ار

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی

اس میں شک نہیں کہ اردو علم ادب لکھنؤ میں دہلی سے آیا اور اس بدیہی امر سے انکار کرنا سخت احسان فراموشی ہے یا یہ کہئے کہ دہلی کا ٹکسال لکھنؤ میں اُٹھ آیا اس لئے کہ دہلی جن لوگوں سے عبارت تھی وہ سب شہزادے اور شاعر اپنی پختہ کلامی اور کہنہ مشقی کے زمانے میں دہلی کو سلام کر کے لکھنؤ چلے آئے اور اسی سرزمین میں دفن ہوئے۔ لکھنؤ کے دربار میں ان کی توقیر اور عزّت حد سے سوا ہوئی ملک الشعرا میر تقی میر لکھنؤ میں معہ اہل وعیال کے چلے آئے اور زندگی بھر مفتی گنج میں رہے اور اب بھی وہیں سو رہے ہیں۔ ملک الشعرا مرزا رفیع السودا لکھنؤ منیا بازار میں آکر بسے اور میر باقر سوداگر کے امام باڑے میں دفن ہوئے انشاء اللہ خاں انشا لکھنؤ میں آئے اور فراشخانے میں رہے اور حسین گنج میں آئینہ بی بی کے باغ میں دفن ہوئے میر حسن، میر خلیق، میر جرأت، صاحبقران، میر تقی، ہوس، میر سوز، طالب علیخاں عیشی، سب کہاں رہے، کہاں دفن ہوئے، وطن کو چھوڑ کر غربت میں وہ آرام پایا کہ مرکے بھی لکھنؤ سے نہ نکلے۔ اس قدردانی کا یہ صلہ ملا کہ لکھنؤ نقش ثانی بن گیا اور اب تک اس کا وقار زبان اُردو کی تحقیق میں اتنا ہی ہے جتنا شاہی میں تھا۔

جب دہلی کے لوگ مرچکے تو خدا نے لکھنؤ کی سرزمین میں بھی ایسے لوگ پیدا کئے جن کی شہرت اور زباں دانی کے نقارے تمام ہندوستان میں بج گئے۔ ناسخ اور آتش کا زمانہ لکھنؤ میں اُردو علم ادب کی تاریخ کا زمانہ ہے اس لحاظ سے آتش کے واقعات اور اُن کی اُردو کی مستقل خدمت کا احسان تمام ہندوستان پر ہے۔ اُردو علم ادب کے ایسے محسن کا ذکر ہر طرح ملک کے لئے مفید ہے۔

خواجہ حیدر علی نام، آتش تخلص تھا آبا و اجداد قدیم باشندے دہلی کے تھے شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں انکے والد خواجہ علی بخش درویش سالک (جو خواجہ زادوں کے خاندان سے تھے) دہلی سے فیض آباد میں آئے اور محلہ مغل پورہ میں قیام کیا پیری مریدی کا سلسلہ شروع کیا اسی پر اوقات بسر ہونے لگی۔ اس زمانہ میں دہلی اجڑ رہی تھی عالمگیر ثانی کا بھی انتقال ہو چکا تھا اب سوائے اودھ کے اور کوئی مقام نہ تھا جہاں آسائش سے بسر ہو سکے تھوڑے زمانے کے بعد بکسر کی لڑائی میں شجاع الدولہ بہادر کو شکست ہوئی جسکا رنج بہت کچھ ہوا اس لحاظ سے کوئی شکست بکسر کا نام بھی نہ لیتا تھا اس اثنا میں فوج مغلیہ سے بادشاہ بدظن ہو چکے تھے آتے ہی تمام فوج کو برطرف کر دیا مغل لوگ فیض آباد سے شاہجہاں پور چلے گئے اس سبب سے مغل پورہ بہت ویران ہو گیا۔ ہر چند مغلوں نے خواجہ علی بخش سے چلنے پر اصرار کیا لیکن خواجہ صاحب کی یہاں اچھی طرح بسر ہو رہی تھی اس سے کہیں نہ جا سکے۔ اس اثنا میں جناب عالی (نواب شجاع الدولہ بہادر) نے اپنے فرزند نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی نواب خانخاناں کی پوتی سے کی جسمیں چوبیس لاکھ روپیہ صرف کیا یہ واقعہ ۱۱۸۳ء کا ہے ابھی یہ چہل پہل ہو رہی تھی کہ خواجہ علی بخش کے گھر میں خواجہ حیدر علی آتش پیدا ہوئے۔ باپ کی طرح گورے چٹّے اور خوبصورت۔ ابھی لڑکا اچھی طرح جوان نہ ہونے پایا تھا اور تعلیم بھی نامکمّل تھی کہ باپ نے انتقال کیا مزاج میں آوارہ گردی تھی



عطائے دیوانی

(شاہ عالم کے دربار سے لارڈ کلایو کو فرمان دیوانی عطا ہوتا ہے)

Block kindly lent by THE BHARATI, Calcutta.

اور سر پر کوئی مربی موجود نہ تھا فوج کے لڑکوں کی صحبت میں آتش بانکے اور شورہ پشت ہوگئے اس زمانے میں بانکپن اور بہادری کی بہت قدر تھی آتش کو بہادری دکھانے کے بہت سے مواقع ملے مغل بچّوں کی صحبت میں تیغ زنی بہت اچھی آگئی تھی آدمی تھے جیوٹ کے بات بات پر تلوار کھینچ لیتے تھے کمسنی سے تلوتے مشہور ہوگئے سیکڑوں تلواریں کھائیں ہزاروں ٹانکے لگے اس جوہر کے قدرداں فیض آباد میں ایک نواب میر محمد تقی تھے جو آتش کو نوکر رکھکر اپنے ساتھ لکھنؤ میں لے آئے انھیں کے ساتھ ناسخ بھی فیض آباد سے لکھنؤ آئے۔

اسوقت میں ناسخ اور آتش کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ ہم بھی لکھنؤ میں شاعری کے زمرے میں آئیں گے اور ایک مشہور استاد کے نام سے مشہور ہوں گے سردی کے زمانے میں شب کو نواب صاحب کے ٹپنی پردے اوڑھ لیتے تھے اور دن کو تنزیب کا انگرکھا پہنے ہوئے اکڑتے پھرتے تھے۔

آتش گورے شکیل وجیہ چھریرا بدن اور رندانہ وضع کے آدمی تھے آدھا سر منڈا ہوا اور آدھے سر پر پٹے (اسوقت اچھے بانکوں کی یہی وضع تھی اور ان کو اک پٹے جوان کہتے تھے) کھانڈا باندھتے تھے بھنگیرن کی دکان پر چرس کا دم لگا رہے ہیں کسی نے ان کو دیکھکر کھنکارا یا سامنے سے مونچھ اونچی کرتا ہوا نکلا بس غضب آگیا تلوار کھینچ لی اور کہا آؤ ہمارے تمہارے دو دو ہاتھ ہو جائیں

لکھنؤ میں آکر رفتہ رفتہ آتش کی صحبت بدل گئی انکو کتب بینی کا شوق ہوا اور دن رات علمی چرچے رہنے لگے اسی زمانے میں ان کو مذاق سخن پیدا ہوا اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد ہوئے ناسخ بھی انکے شاگرد ہوئے تھوڑے ہی زمانے کی مشق میں روزمرّہ محاورے اور صفائی کلام میں استاد سے سبقت لے گئے اس مدت میں نواب میر تقی کا انتقال ہوگیا آتش کے شاگردوں کی جمعیت بڑھنے لگی اور کلام کی شہرت ہونے لگی۔

نوازگنج کے قریب چوپٹیوں سے آگے ماہولال کی چڑھائی مشہور ہے وہاں سے اتار کو ایک چھوٹا سا باغچہ اور ایک کچّا مکان تھا وہ آتش نے خرید لیا اور اسی میں رہنے لگے مکان لینے کے بعد آتش نے اپنا نکاح کسی شریف خاندان میں کرلیا تھوڑے زمانے کے بعد ایک صاحبزادے پیدا ہوے جنکا نام آپنے محمد علی رکھا ان کی بیوی بہت نیک عورت تھی انکی وارستہ مزاجی اور سگی گرہستی نے ملکر گھر سنبھال لیا عقد سے پہلے تو آتش کو ہزار روپیہ ماہوار ملتا جب بھی مہینے میں دو ایک فاقے ضرور ہوجاتے تھے لیکن نکاح کے بعد بی بی کے پس انداز کرنے سے میاں کے فاقے بچ جاتے تھے۔

مولوی صادق علی کہتے تھے آتش کو میں نے دیکھا ہے گیروا تہ بند باندھتے تھے ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا جس میں ایک چھلہ سونے کا رہتا تھا دوسرے تیسرے فاقہ کی حالت میں چھلہ رہن رکھکر فاقہ شکنی کرتے تھے۔

سچّے کام کا سلیم شاہی جوتہ ایک اشرفی کی قیمت کا پہنتے تھے۔ بے طمع اور بے غرض تھے کبھی شاگرد سے اپنی حاجت کا اظہار نہ کرتے تھے اور اکثر اپنی دولت دعوت اور ضیافت میں لٹا دیا کرتے تھے کچھ تنخواہ اودھ کے بادشاہ کی طرف سے ملا کرتی تھی وہ چار دن میں خرچ کر ڈالتے تھے۔

منشی امیر اللہ تسلیم مرحوم شاگرد نسیم دہلوی کہتے تھے ہم نے جسوقت آتش کو دیکھا کوئی ستّر برس کے قریب ہونگے ایک بالشت سے زیادہ ڈاڑھی تھی مہندی کا خضاب کرتے تھے معالی خاں کی سرا میں رہتے تھے ایک لنگوٹ باندھے ٹوٹے ہوئے کھٹولے پر جو

زمیں دوز تھا تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے رہتے تھے بیچ میں حقہ سامنے رکھا رہتا تھا جو کوئی امیر غریب آتا سب کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقہ پیش ہوتا۔

وارث علی خاں ان کے رفیق بھنگ گھوٹ کر پلایا کرتے تھے مزاج میں توکل تھا جو کچھ آتا اس کو اسی روز خرچ کر ڈالتے تھے۔ دوسرے روز کے لئے کچھ نہ رکھتے تھے جس روز فاقہ ہوتا دروازہ بند کرکے گھر میں بیٹھ رہتے۔ ایک روز رسالہ دار فقیر محمد خاں گویا کو معلوم ہوا کہ آتش آجکل بہت تکلیف میں ہیں کچھ روپیہ لیکر گھر پر آئے دروازہ بند تھا آواز دی اندر سے آواز آئی کون ہے یہ بولے فقیر۔

آتش نے کہا فقیر کا میرے یہاں کام نہیں آج خدا مہمان ہے (فاقہ ہے) دوسرے روز پھر آئے مشکل سے دروازہ کھلوایا ایک لڑکا بہت کمسن تھا کوٹھے پر کنکوا اوڑا رہا تھا سامنے بلایا اور اُسکا کنکوا جرخی ڈور دیکھکر کہا یہ کنکوا تو اچھا نہیں سب سے گُتی لیتا ہوگا ڈور بھی اچھی نہیں ٹوٹتی ہے۔ دو ہزار کی دو تھیلیاں سامنے رکھوا دیں کہ تو بھی اس کا ڈور کنکوا منگوانا۔

آتش اس بات کی تہ کو پہنچ گئے کہ خاں صاحب مجھکو زیر بار احسان کرنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے خانصاحب آپ کو چاہئے تھا اس کو تادیب دیتے کہ ایسے اشغال سے باز رہتا نہ کہ آپ خود ڈور کنکوے سے مدد دیں یہ کہکر پانچ روپیے نکالکر لڑکے کو دئے اور کہا خانصاحب کو جھک کر سلام کرو اس کی چیز کھانا باقی روپئے خانصاحب کے واپس کر دئے۔ گھی میں تلی ہوئی مرچیں بہت کھایا کرتے تھے۔

مولوی فصیح اللہ صاحب وفا کا بیان ہے کہ اس زمانے میں جو مشاعرے ہوتے تھے انمیں ایک قافیہ لازمی قرار دیدیا جاتا تھا۔ طرح مقرر ہوئی "اپنے بیمار سے بھاگو نہ مسیحا ہو کر" اس میں میلا کا قافیہ لازمی قرار دیا گیا۔ جو قافیہ لازمی ہوتا تھا اس پر سب شاعر زور دیکر کہتے تھے۔ نواب سید محمد خاں رند نے اس میں غزل کہی۔ اصلاح کے واسطے لائے اور کہنے لگے اُستاد مشروطہ قافیہ تو میں نے اپنے حصے کا لکھا ہے۔ پھر بہت ناز سے پڑھا ؎

اگرئی کا ہے گماں ٹنک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

تمام غزل پر اصلاح دی اور کہا ذرا ٹھہرو سید آتا ہوگا (صبا سے مراد ہے) اس کا قافیہ بھی سنتے جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد میر وزیر علی صبا آئے۔ آتش نے پوچھا غزل مشاعرے کی لائے ہو۔ عرض کیا جی ہاں۔ کہا پڑھو۔ صبا نے کہا نواب صاحب بیٹھے ہیں ان کے سامنے میں بھلا غزل پڑھ سکتا ہوں۔ کہنے لگے کیوں کیا نواب صاحب چور ہیں۔ اچھا ایک قافیہ "میلا ہو کر" پڑھ دو۔ صبا نے کہا ؎

باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گل کا نہ اُترا کبھی میلا ہو کر

کہنے لگے دیکھئے نواب صاحب شعر اس طرح کہتے ہیں۔

شیخ فضل احمد کیف کہتے ہیں ایک مرتبہ طرح ہوئی زوال نہیں انتقال نہیں۔ انمیں بول چال کی قید تھی ہمیں بھی طرح کا مصرعہ آیا غزل کہی۔ خواجہ صاحب کو قید کا قافیہ جب سنایا تو کہنے لگے اب کی بار غزل تمھیں پڑھنا تم نے قافیہ خوب کہا ہے میں تو نہ پڑھوں گا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

کسی نے باغ میں ایسا شگوفہ چھوڑا ہے
کہ آج تک گل و بلبل میں بول چال نہیں

نواب معتمد الدولہ بہادر ناسخ کے شاگرد تھے ان کے مشاعرے بہت دھوم دھامی ہوا کرتے تھے اکثر آتش کو بھی بلواتے تھے۔ یہ اسی بانکپن سے اکڑتے ہوئے جاتے تھے۔ تلوار میان سے

دو انگل باہر رہتی تھی۔ لوگ کہتے تھے خدا خیر کرے۔ ایسا نہو مشاعرے میں خون کی ندیاں بہ جائیں۔

دونوں مشہور شاعر اور دونوں کے شاگرد بے شمار۔ ایک مرتبہ جو مشاعرہ کیا تمام شہر میں مصرع طرح تقسیم کر دیا لیکن آتش کو ایک روز پیشتر مصرع طرح بھیجا آپ نے فرمایا شاید معتمد الدولہ بہادر کو ہمارا امتحان منظور ہے جو طرح عین وقت پہنچی خیر وہاں تو ہم آتے یا نہ آتے مگر اب جانا ضروری ہے۔ غزل کہی تلوار کمر سے لگائی نکے دار ٹوپی دی شاگردوں کے جم غفیر سے مشاعرے میں داخل ہوے دیکھا تو معتمد الدولہ نے نیا مکان جو تعمیر کرایا ہے اسمیں مشاعرہ کیا ہے آپنے مکان کو دیکھکر فی البدیہہ یہ مطلع کہا جب آکر سامنے آیا تو پڑھا

یہ کس رشک مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

مطلع تھا موقع کا دشمن کے منہ سے بھی واہ نکل گئی معتمد الدولہ نے اسیوقت خلعت دیا اور بہت عزت کی۔

آتش کے شاگردوں مین ایک نواب اصغر علی خاں صاحب اصغر بہت خوشگو شاعر تھے مگر وارستہ مزاج غزل پڑھنے کے بعد پھینک دیتے تھے اکثر لوگوں میں ان کے شعر آتش کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں انکا ایک یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

اگر بخشے زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

جب میر تقی میر نے انتقال کیا تو سعادت علی خاں کا زمانہ تھا آتش کا سن اسوقت اکتالیس برس کا تھا بہت رنج کیا اسلئے کہ میر صاحب انکی بہت قدر دانی کرتے تھے آتش اور ناسخ کی شاعری میں جتنا فرق تھا اتنا ہی مزاج میں بھی تفاوت تھا۔ آتش رند اور متوکل آدمی تھے اس وجہ سے وہ ہر ایک امیر غریب کو برابر سمجھتے تھے اور دنیاوی ساز و سامان کی چنداں طمع نہ تھی۔ ناسخ مرفہ حال تھے اور لوگوں کی انکے مرتبے کے موافق عزت اور آبرو کرتے تھے امرا کی آو بھگت سوا تھی اسلئے اکثر رئیس انکے شاگرد ہوتے تھے ناسخ کے شاگرد جو غریب ہوتے تھے ان کو سفارش کرکے کہیں نوکر رکھوا دیتے تھے اور حد سے زیادہ دنیا سازی کرتے تھے۔ لوگوں کا رجوع انکی طرف زیادہ ہونے لگا اور رفتہ رفتہ نواب معتمد الدولہ بہادر انکے شاگرد ہوئے تو ملک میں انکا اعزاز اور وقار زیادہ ہو گیا۔ آتش نے یہ رنگ دیکھا تو اپنی فقیری کی آڑ لے لی ایک لنگا بٹ بھنگ کا سونٹا اور چاروں ابرو کا صفایا گھر سے نکلنا کم کر دیا اگر امرا کپڑے پہننے لگے مگر وہ فقیری بھی بادشاہت سے بہتر تھی آرام سے اپنے گھر میں فکر سخن میں موتی پرو رہے ہیں کسی نے آواز دی، دل چاہا تو دروازہ کھلوا دیا نہیں تو صاف جواب دیا اسوقت آرام میں ہیں

خواجہ محمد علی جب تعلیم سے فراغت حاصل کر چکے تو عین شباب میں شعر کہنے لگے جوش تخلص رکھا گیا مچھلی کے بچے کو کون پیرنا سکھاتا ہے چند روز میں اچھے مشاق ہو گئے آخر وقت میں آتش کی بینائی جاتی رہی تھی میر دوست علی خلیل ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ خالد جنگ کے بیٹے سجے دیال جو آتش کے شاگرد تھے مصر ہوئے کہ آپ جوش کی شادی کر دیجئے آتش نے عذر کیا کہ فقیر کی کیفیت تمکو معلوم ہے شادی حوصلے کے موافق ہونا چاہیئے لائق شاگرد نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا آپ اپنے کفو میں نسبت ٹھہرالیں شادی کا سامان بندہ مہیا ہو جائے گا آتش کی غیرت نے اس کو بھی قبول نہ کیا آخر بار بار کے تقاضوں سے تنگ آکر جوش کی نسبت ٹھہرانا پڑی شادی کے دھوم دھامی جلسے کے لئے دلارام کی بارہ دری لے لی گئی۔ تمام دوست احباب شاگرد عزیز مدعو ہوئے بہت معقول انتظام تھا سارا خرچ جے دیال نے نہایت حوصلے سے کیا جب محمد علی نوشہ

بنکر آتش کے سامنے آئے تو آپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے شاگردوں نے عرض کیا اُستاد یہ وقت خوشی کا ہے خدا نے آپ کو بیٹے کا سہرا دکھایا خدا کا شکر بھیجئے بدشگونی نہ کیجئے ان کی اولاد سے خدا آپکی نسل قائم رکھے۔ کہنے لگے میں اس بات پر روتا ہوں کہ محمد علی کی والدہ جو خوش ہونے والی تھی وہ زندہ نہیں ہے جو اپنے بیٹے کو دولھا بنے ہوئے دیکھے میں آنکھوں سے اندھا ہوں صورت دیکھ نہیں سکتا یہ کون سا خوشی کا مقام ہے خیر تم لوگوں کو خدا مبارک کرے۔

شیخ ناسخ کے مرنے کی خبر سنی تو چیخ مار کر رونے لگے لوگوں نے کہا وہ تو آپ کے حریف تھے ہمیشہ سے دشمنی چلی آتی تھی آپکو خوش ہونا چاہیے کہ ایک دشمن کم ہو گیا۔ کہنے لگے میاں کیا کہتے ہو ہم اور وہ فیض آباد میں مدتوں ایک رئیس کے نوکر رہے مدت تک ہم پیالہ ہم نوالہ رہے ہمیشہ دوستی کا برتاؤ رہا شاعرانہ نوک جھوک کی اور بات ہے اور آشنا پرانا تو دشمن نہیں ملتا۔

نواب محمد علی خاں قمر عرف نواب چندا میاں نے خواجہ آتش کو دیکھا ہے اس زمانے میں خواجہ صاحب نابینا ہو چکے تھے مکان میں ایک چھپر پڑا تھا ایک کھاٹ بچھا تھا اس پر بیٹھے رہتے تھے نرکل کی چٹائیاں سامنے بچھی رہتی تھیں۔

غازی الدین حیدر بادشاہ نے ایک مرتبہ اپنے وزیر معتمد الدولہ سے پوچھا ہمارے شہر میں کوئی نامی شاعر بھی ہے عرض کیا شاعر تو بہت سے ہیں لیکن ان میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش بہت مشہور ہیں ارشاد ہوا اچھا ہماری کوٹھی میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے معتمد الدولہ نے اس مشاعرے کی خبر ناسخ کو کر دی اور انہیں کی تجویز سے تاریخ اور مصرعہ طرح مقرر ہو گیا اور آتش کو ایک روز پیشتر چوبدار کے ہاتھ رقعہ طلب آیا۔

بہت پیچ و تاب کھا کر کہا معتمد الدولہ نے اچھا سلوک کیا اب یہ شہر ہمارے رہنے کے قابل نہیں رہا یہ کہکر گھر میں کہلا بھیجا کچھ ٹکروں کی روٹی پکا دو ہم کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ چھوڑ دیں گے دوسرے روز علی الصباح گھر سے پیادہ پا نکل کھڑے ہوئے۔ سنہری برج میں مرزا محمد تقی مرزا حیدر صاحب بیٹھے ہوئے سیر دیکھ رہے تھے آتش کو دیکھکر کہا اُستاد آج گھر سے کیوں نکلے آدمی بھیجکر بلوایا آتش نے کہا ہمارا اسلام کہدینا اور کہا ہم سفر کو جا رہے ہیں مرزا محمد تقی یہ سُنکر خود بوچے پر سوار ہو کر آتش کے پاس پہنچے راہ میں روک کر سب حال دریافت کیا اور کہا اُستاد آپکو اسکی کیا پڑی ہے آپ نہیں جانتے کہ میرے پاس پانچسو بانکا پچاس پچاس روپیہ ماہوار کا ملازم ہے یہ کس کام آئیگا آپ دیکھ لیجئیگا اگر معتمد الدولہ نے ہٹ دھرمی کی تو بارہ دری میں لہو کی ندیاں بہ جائیں گی مرزا صاحب تیس ہزار روپیہ ماہوار کے وثیقہ دار تھے ان کے سمجھانے سے آتش وہیں بیٹھ رہے اور شام تک غزل کہا کئے۔

اتنی دیر میں مرزا صاحب نے آتش کی طرف سے ایک درخواست لکھی حضور میں ایک فقیر گوشہ نشین ہوں اگر حضور نے یاد فرمایا ہے تو اتنی اجازت چاہتا ہوں کہ سب سے پیشتر غزل پڑھوں اور دوسری گزارش یہ ہے کہ گزگزی خاص مرحمت ہو یہ عرضداشت محل کے اندر پیش ہوئی اور اس عنوان سے پیش ہوئی کہ بادشاہ نے دستخط فرما دئے حالاں کہ شاہی دربار میں سوائے بادشاہ کے ولیعہد تک کو اجازت نہ تھی۔ شام تک اس مشاعرے کی شہرت تمام شہر میں ہو گئی آتش کے تمام شاگرد نواب غضنفر الدولہ نواب مہدی علیخاں نواب نصرت یار خاں نواب سید محمد خاں رند خلیل وغیرہ مرزا صاحب کے دولت کدہ پر جمع ہو گئے شاہی مشاعرہ کی طرح "فسانہ کیا نشانہ کیا"

تھی شام کو جب یہ خبر آچکی کہ ناسخ مع اپنے شاگردوں کے مشاعرے میں پہنچ چکے تو آتش نے بھی ٹوٹی تلوار (کھانڈا) کمر سے لگائی ایک تہمد آدھی باندھی آدھی اوڑھی ننگے سر ننگے پاؤں گھر سے نکلے پیچھے پیچھے آدمی چھتر لگائے ہوے اس کے بعد تمام رؤسا امرا شاگرد وغیرہ اس کے بعد پانچسو بانکا تلوار کمر سے لگائے کٹنے مرنے پر تلے ہوئے۔ اس بات کے تمام لوگ قائل ہیں کہ مشاعرے میں آتش کے سامنے کبھی ناسخ کا رنگ نہیں جما انکا پڑھنے کا انداز شعر کا رکھ رکھاؤ ادا کرنے کے تیور کسی کو نصیب نہ تھے۔

آتش شاہی دولت کدہ میں داخل ہوئے تو دیکھا صدر بارہ دری کے اندر شہ نشین پر کرسی بچھائے ہوئے غازی الدین حیدر فردکش ہیں ادھر اُدھر ارکین سلطنت مختصر باادب کھڑے ہیں آگے چلمن پڑی ہوئی ہے بارہ دری کی بغل میں داہنی طرف ناسخ مع اپنے شاگردوں کے بیٹھے ہیں بائیں طرف آتش کے واسطے جگہ ہے بیچ کے در میں کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے مرزا محمد تقی صاحب آتش کو لئے ہوئے بیچ کے درجے میں چلے گئے چوبدار نے عرض کیا حضور یہاں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے آپنے ہنس کر دیا وہ خاموش ہو رہا آتش نے پہلے بادشاہ کو فراشی سلام کیا اور سامنے بیٹھ گئے اور پھر دست بستہ عرض کیا حضور ایفائے وعدہ ہو۔

بادشاہ نے اشارہ کیا ایک خواص خاص گڑگڑی لیکر حاضر ہوا۔ پھر عرض کیا اجازت ہے غزل شروع کروں فرمایا "ہوں" آتش گڑگڑی لے کر مشاعرے کے پیتر سے سے بیٹھے اور اسی ٹھاٹھ سے اپنی غزل پڑھنے لگے جس سے تمام سامعین وجد میں آگئے اور بادشاہ کے دل پر ایک خاص اثر ہوا۔ سننے والے کہتے ہیں آج تک ایسی زوردار غزل خواجہ صاحب نے نہیں پڑھی۔ بعض شعروں میں ناسخ پر کھلی کھلی جھونک تھی جنکو بادشاہ سنکر مسکرائے ؎

کہتی ہے تجکو خلق خدا غائبانہ کیا ن تو سہی جہانمیں ہے تیرا فسانہ کیا
ہمسے خلاف ہوکے کریگا زمانہ کیا جہل و علم ہے پاس اپنے نہ ملک و جاہ
رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا ہوتا ہے سنکے زرد جو نامرد مدعی

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

آتش کے سب شاگرد بائیں طرف بیٹھے تھے استاد کی تعریف کر رہے تھے ناسخ کے شاگردوں پر اس ادائے خاص کا بہت اثر ہوا اور دل کھولکر لوگوں نے تعریف کی شاہی حکم سے دوہرا خلعت مرحمت ہوا مگر اس شاعر درویش سیرت نے عرض کیا میری عزت وہی کافی ہے جو حضور نے خاص گڑگڑی مرحمت فرماکردی ہے۔ یہ خلعت ناسخ کو مرحمت ہو میں اپنا صلہ پاچکا اور اسی تیور سے سلام کرکے خوشی خوشی گھر واپس آئے۔

تحسین گنج میں میاں تحسین علی خاں خواجہ سرا کے یہاں مشاعرہ ہوا چلن بگڑا کفن بگڑا اس میں بھی پالا آتش کے ہاتھ رہا اور ناسخ کی غزل کمزور ہوئی۔

ولی عہدی کے زمانے میں حضرت محمد واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ آتش کے شاگرد ہوئے سو روپیہ ماہوار دیتے رہے غزل اصلاح کو بھیجدیا کرتے تھے آتش نابینا تھے غزل سنکر شاگرد سے اصلاح لکھوا دیا کرتے تھے ایک شعر پر بادشاہ کو کچھ شک ہوا رفقا سے بیان کیا سب نے کہا خداوند آپ کا شعر بے مثل ہے آتش نابینا ہیں شاگرد جو چاہتا ہے شعر کاٹ دیتے ہیں۔ یہ خبر آتش کو معلوم ہوئی دوبارہ غزل آئی اسپر لکھدیا ماشا اللہ

خوب غزل کہی ہے اُس سہ ماہی میں جتنی غزلیں آئیں سب پر یہی لکھ دیا۔

جب سہ ماہی تنخواہ آئی تو واپس کردی اور کہا میں حرام کی تنخواہ نہیں لیتا جب غزل بناتا تھا تنخواہ لے لیتا تھا اب اصلاح نہیں ہوتی تنخواہ کس بات کی لوں۔ بادشاہ نے علی نقی خاں وزیر کو بھیجا آتش نے یہی جواب دیا علی نقی خاں نے شاگردوں سے ناراضی کا سبب دریافت کرکے بادشاہ سے بیان کیا بادشاہ خود معذرت کے لئے آتش کے مکان پر آئے۔

منشی تہور صاحب کہتے ہیں جب ہمنے دیکھا ہے تو آتش کی بینائی جاتی رہی تھی گورے دبلے پتلے تھے سر پر بال لمبے لمبے تھے جوڑا باندھتے تھے مونچھیں بڑی بڑی ڈاڑھی منڈی ہوئی ایک تہمد آدھی باندھے ہوئے آدھی اوڑھے ہوئے مکان میں بیٹھے رہتے تھے۔ چہرے سے بانکپن ٹپکتا تھا ایسا متوکل آدمی آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ خواجہ محمد بشیر کہتے ہیں ہم بہت کم سن تھے صفر کا مہینا تھا ۱۲۶۳ء تھا۔ آتش کی بیماری کی خبر مشہور ہوئی خواجہ رکن الدین کے ساتھ ہم بھی آتش کی عیادت کو گئے اس زمانے میں واجد علی شاہ کا عہدِ سلطنت تھا اور اسی سال سریرآرائے سلطنت ہوئے تھے۔

آتش کا مکان ماہولال کی چڑھائی پر تھا جہاں اب چھتے والی بھٹی ہے کچا مکان تھا اس میں ایک چھپر پڑا ہوا۔ تقریباً بیاسی برس کا ایک آدمی چاروں ابرو کا صفایا رنگ کھلتا ہوا چارپائی پر لیٹا تھا دریافت کرنے سے معلوم ہوا یہی آتش ہیں کچھ منہ سے کہنا چاہتے تھے آواز نہ نکل سکی شاگرد لوگ نرکل کی چٹیاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر تک کھڑے رہے پھر چلے آئے اسکے آٹھ روز کے بعد سُنا آتش کا انتقال ہوگیا اور اپنے مکان میں دفن کئے گئے۔

معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ ۱۲۵۴ھ میں ناسخ کا انتقال ہوا اور ناسخ کے نو برس کے بعد ۱۲۶۳ھ میں آتش نے اس جہان فانی سے کوچ کیا کسی شاعر نے "چراغ جہاں" تاریخ وفات نکالی تھی۔ (باقی پھر)

عشرت لکھنوی

محاکمۂ مرکزِ اُردو۔ اس مختصر رسالے کے مصنف منشی سید احمد صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ ہیں۔ آپ کا نام ہی اس کی خوبی اور سند کے لئے کافی ضمانت ہے۔ اس رسالہ میں مصنف موصوف نے دہلی کو اردو زبان کا وطن اور ٹکسال ثابت کرکے حب الوطنی کا خوب حق نباہا ہے۔ اور مختلف فصحا و شعرا کے کلام سے یہ ثابت کیا ہے کہ فصاحت و بلاغت کی جان سادگی، عام پسندی، اور دل آویزی میں ہے اور یہ خصوصیتیں دہلی کی زبان میں ہمیشہ سے رہی ہیں۔ لکھنو کی زبان میں تصنع و تکلفات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور لاہور کی زوردار زمین میں گو اُردو کے پودے نے نہایت زور کا نشو و نما پایا ہے، مگر اس میں ہنوز کسی قدر قلم تراشی کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیچر کی سادگی و خاموشی پر جو دلربائی و فصاحت ہے، انسانی تصنع اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ برج بھاشا کے مقبول عام ہونے کا راز اسی نیچرل سادگی میں ہے۔ ہم بھی زبانِ دہلی کے شیدائی ہیں اور وہیں کے اسٹینڈرڈ (معیار) کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جسطرح یوسفِ کنعانی کا عروج کنعان سے نکلکر مصر میں ہوا، اسیطرح اُردو کی قدر و قیمت و ترقی لکھنو، حیدرآباد اور لاہور میں پہنچ کر ہوئی۔ اہل زبان اس رسالہ کے مطالعہ سے خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ قیمت ۸ر



सिस्टर निवेदिता । SISTER NIVEDITA سسٹر نویدتا

Indian Press, Allahabad.

سسٹر نویدیتا

کسی پیدائشی ہندوستانی کی ایثار نفسی، وطن پرستی، خدمت ملک اس قدر قابلِ تحسین و آفریں نہیں، جتنی ایک غیر ہندوستانی شخص کی، جو مادرِ ہند کی خدمت کے لئے اپنے اصلی وطن عزیز و اقارب دوست و احباب، راحت و آسائش کو ترک کر کے غیر ملک کو اپنا وطن بنائے۔ ایسے بے نفس اور خدا ترس شخص کی تعریف جس قدر کی جائے کم ہے۔

سسٹر نویدیتا انہیں چند برگزیدہ نفوس میں ہیں جنھوں نے اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہکر ہندوستان میں بود و باش اختیار کی اور جس کی خدمت میں دل و جان سے مصروف رہیں۔

ناظرینِ ادیب کو معلوم ہوگا کہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو سسٹر نویدیتا بمقام دارجیلنگ جاں بحق ہوئیں۔ ان کی وفاتِ حسرت آیات سے ہندوستان کی سوشل، تعلیمی، اور مذہبی ترقی کو صدمۂ عظیم پہنچا۔ سسٹر کی زندگی کے کارنامے اور خدمات اس قدر زیادہ ہیں کہ ایک مختصر سے مضمون میں وہ سب قلمبند نہیں کئے جا سکتے۔ ہم چند واقعات اور حالات کے اظہار پر اکتفا کرتے ہیں۔

شکاگو کی عالمگیر مذہبی کانفرنس اور سفرِ امریکہ سے فارغ ہو کر جب سوامی ویویکانند صاحب لندن تشریف لے گئے تو اہلِ مشرق، خصوصاً ہندوستان، کے حالِ زار کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کی پبلک سے خدمت ہند کی اپیل کی۔ مس مارگریٹ۔ ای نوبل (سسٹر نویدیتا) نے بڑی خوشی سے اپنی بیش قیمت خدمات سوامی جی کے نذر کیں، اور اُن کے ہمراہ ہندوستان آئیں۔

سوامی ویویکانند جی ہند و فلسفہ کے ماہر اور عارفِ کامل تھے آپ کی خداداد سحر بیانی اور پرمعنی تقریر کا ایسا معجز نما اثر ہوا کہ مس نوبل صاحبہ نے آپ کے حلقہ بگوش ہو کر شرفِ شاگردی حاصل کیا۔ اس زمانہ سے ہندو مذہب اور ہند و قوم کی محبّت اُن کے دل میں اس درجہ بڑھی کہ اپنا طرز معاشرت، بلکہ نام بھی، تبدیل کر دیا۔ سسٹر کی مرتاضانہ زندگی کو دیکھکر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سچی ہندو نہیں۔ وہ ہندوؤں کی سوشیل، پولٹیکل، اور مذہبی اصلاح کی حمایت بذریعہ تحریر و تقریر آخر وقت تک کرتی رہیں۔ آج سے تیرہ برس قبل آپ مسز جے۔ سی۔ بوس صاحبہ سے ملیں اور ہندی بہنوں کی تعلیمی ضرورت کو محسوس کر کے اُن کی خدمت کا مستحکم ارادہ ظاہر کیا۔ مسز بوس کا بیان ہے کہ "میں نے حقیقی کامیابی سے ناامیدی ظاہر کی، اور ہندوؤں کی راسخ الاعتقادی، جاہلانہ ذاتی تفریق اور تنگ خیالی کی بنا پر یہ عرض کیا کہ آپ کو غیر ملکی ہونے کی وجہ سے ناقابل برداشت دقتوں، ہر ایک قدم پر ناامیدی اور جہالت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ اپنے اس ارادہ سے باز رہیں۔ مگر اس ثابت قدم انسان نے میری ایک نہ سُنی اور اپنے عزم بالجزم پر قائم رہیں۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے مجھے ایک چھوٹے سے مکان میں جو بوسی پارہ لین میں واقع ہے مدعو کیا۔ میں ان کی کارگزاریوں کو دیکھ کر حیرت میں رہ گئی"۔

جس محلّہ میں سسٹر نے مکان کرایہ پر لیا تھا، اس میں کٹر ہندو آباد تھے۔ ابتدا میں ان کو کوئی خدمتگار بھی نہیں ملا۔ وہ اکثر محض نوالکھات پر گزارا کرتی تھیں، یا کبھی کبھی خود کچھ پکا لیا کرتی تھیں۔ اس مکان میں انہوں نے ایک کنڈر گارٹن اسکول جاری کیا تھا،

جس میں نہ صرف نوعمر بچوں بلکہ سن رسیدہ ماؤں کو بھی شفقت اور اور مادرانہ محبت سے تعلیم و تربیت دیا کرتی تھیں۔ ان کی دینداری، انکساری، اور بے نفسی کو دیکھکر وہ ہندو مستورات جو پہلے ملنے جلنے سے ہچکچاتی تھیں یا اپنے بچوں کو مدرسہ میں بھیجنے سے پرہیز کرتی تھیں اب بلا تامل آنے جانے لگیں۔ اس مدرسے سے ہندو بچوں اور مستورات کو جس قدر فائدہ پہنچا وہ محتاج بیان نہیں ہر ایک تعلیم یافتہ بنگالی مسٹر کی بے نظیر خدمات کا معترف ہے۔

فیض رسانی کا دائرہ صرف اس درسگاہ تک محدود نہ تھا، بلکہ وہ صفائی اور حفظان صحت کی تعلیم و ترغیب محلہ والوں کو برابر دیا کرتی تھیں اکثر ایسا دیکھا گیا کہ انہوں نے ناپاک زمین اور گندی نالیوں کو خود اپنے ہاتھ سے صاف کیا اور محلے والوں کو صفائی کا عملی نمونہ دکھایا۔ پہلے پہل جب کلکتہ میں طاعون پھیلا تو سارا شہر بدحواس اور خائف ہو کر گرد و نواح میں بھاگنے لگا۔ نفسی نفسی کی صدا ہر طرف بلند تھی۔ ایسی حالت میں مفلسوں اور محتاجوں کی خبرگیری کون کرتا۔ مگر آفریں ہے مسٹر کی ذات قدسی صفات پر کہ صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ نہایت سرگرمی اور مادرانہ توجہ سے غربا کی تیمارداری کی اور اپنی جان عزیز کو جوکھم میں ڈالا۔ ایک غریب لڑکا طاعون میں مبتلا ہوا۔ اس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ مسٹر نے اس کے علاج میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ آخر میں اس بچے نے ان کی گود میں جان دی۔

خدا ترسی اور رحمدلی کا یہ حال تھا کہ خود تکلیف اٹھاتیں مگر دوسروں کی مدد ضرور کرتیں۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ انکا ملازم پڑا سردی کھا رہا تھا۔ آپ نے اپنا گرم لبادہ اس کو اڑھا دیا اور خود رات بھر سردی کھایا کیں۔

جس زمانہ میں مشرقی بنگال قحط و طغیانی کا شکار رہا، مسٹر نویدیتا اس خبر بد کو سنتے ہی باریسال جا پہنچیں، اور قحط زدہ کسانوں کی حتی الوسع امداد کی۔ ان ان تھک خدمات کا یہ اثر ہوا کہ ان کی تندرستی خراب ہوگئی۔ آپ کے احباب اور نیز ڈاکٹروں نے بہ اصرار تمام صلاح دی کہ اس تنگ و غیر محفوظ مکان کو ترک کر دیں اور کسی دوسرے مکان میں فروکش ہوں، مگر بچوں کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا آپ نے گوارا نہ کیا۔

علمی قابلیت، سچی دینداری، اور عالمانہ تقریر و تحریر کا یہ حال تھا کہ یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے سر برآوردہ اہل الرائے مسٹر نویدیتا کی خداداد لیاقت کے مداح ہیں۔ علاوہ متعدد رسالوں اور مضامین کے آپ نے متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں سے "وب آف انڈین لائف" نہایت مقبول اور مشہور ہے۔ آخری زمانہ حیات میں آپ نے دو اور کتابیں لکھنی شروع کی تھیں، اور انہیں میں مشغول تھیں کہ پیغام اجل آپہنچا اور یہ دونوں کتابیں ناتمام رہ گئیں۔

یوں تو ہندوستان کی ہر شے اور ہر فن انکو ازبس عزیز تھا مگر فن تعمیر اور دستکاری سے خاص دلچسپی تھی۔ مسٹر کا خیال تھا کہ ہندوستان کو یورپ کی کورانہ تقلید نہ کرنا چاہئے بلکہ وطنی صنعت و حرفت کو ترقی دینے اور ہندوستان کی حیرت انگیز دستکاریوں کو قائم رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

مسٹر نویدیتا کی محبت صرف اہل ہنود تک محدود نہ تھی بلکہ وہ سچی وطن پرست تھیں اس لئے بلا خیال فرقہ و ملت ہر گروہ کے ساتھ انکو ہمدردی تھی، مسلمانوں کے قدیم کارناموں سے از حد دلچسپی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ خدا بخش اورینٹل لائبریری بانکی پور دیکھنے گئیں۔ کسی کتاب یا کتبہ پر شاہجہاں کا اصلی دستخط تھا۔ محافظ کتب خانہ کی اجازت لے کر آپ نے نہایت ادب اور تعظیم سے

اس دستخط کو بوسہ دیا اور دیر تک دم بخود کھڑی رہیں۔ راقم الحروف کو بخوبی یاد ہے کہ جس زمانہ میں آپ لکھنؤ میں لکچر دے رہی تھیں تو شہر کی شاہی عمارتوں اور اسلامی بادشاہوں کے کارناموں کی تعریف میں ازبس رطب اللسان تھیں۔ انکا خیال تھا کہ ہندو مسلمانوں میں موجودہ اختلافات محض انگریزی داں اصحاب کے باعث ہے۔ غیر انگریزی داں ہندو مسلمان اب تک دوستانہ و برادرانہ مراسم رکھتے ہیں۔

آپ سودیشی تحریک کی پرجوش حامی تھیں۔ اُن کی رائے میں اس تحریک کی ترقی میں ہندوستان کی مالی بہبودی کا اصلی راز وابستہ ہے۔ حب الوطنی اور یکجہتی کی تعلیم وہ برابر دیتی رہیں۔ مغربی ممالک میں ہندوستان کے پیچیدہ معاشرتی و سیاسی مسائل کے متعلق مسنر نویدیتا کی رائے نہایت مستند مانی جاتی ہے۔ حق یہ ہے کہ ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ وجہ یہ کہ مسنر نویدیتا اپنے خلوص اور ہمدردی کی وجہ سے تقریباً سارے ہندوستان میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں، خصوصاً بنگال میں جہاں وہ زیادہ تر قیام پذیر رہیں۔ معزز اور متوسط الحال اہلِ ہنود کے گھروں میں اُنکی رسائی تھی۔ ہندوؤں کی ظاہری اور خانگی دونوں زندگیوں سے وہ بخوبی واقف تھیں۔ قریباً تمام ہندوستان کا سفر کر چکی تھیں۔ ہر ایک تاریخی مقام کے حالات سے واقف و آگاہ تھیں۔ ہندوستان کو اپنا وطن اور ہندوستانیوں کو اہلِ وطن سمجھتی تھیں۔ ایسی حالت میں اُن سے زیادہ کس مغربی شخص کو حق حاصل تھا کہ ہندوستان کے معاملات اور ہندوستان کے معاشرتی، مذہبی، اور سیاسی امور پر رائے زنی کر سکے۔

ہندوستانیوں کو ایک متحدہ قوم بنانے کا خیال اُن کے دل میں عرصہ سے جاگزیں تھا، اور اس موضوع پر بارہا تقریریں کی تھیں۔ مسنر کی رائے میں ایک نہ ایک دن ہندوستان کے منتشر اجزا و مختلف ادیان وملل بلاخیال ذات و مذہب "ایک قوم" مثل جاپان یا انگلستان ضرور بنیں گے۔

دنیا میں ایسے پاکباز، بے نفس، اور خالص وطن پرست بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ ہم لوگ مسنر نویدیتا کے بارِ احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ وہ ہماری سچی محسن اور خیر اندیش تھیں۔ خدا مغفرت کرے۔ آمین۔

"آنند"

رسید کتب۔ (۱) امثال مصنفہ خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب وزیر مال ریاست بہاولپور ۔عہ (۲) بھیشم پتامہ کا مکمل جیون چرتر مصنفہ ٹھاکر سکھرام داس چوہان راجپوت پرنٹنگ ورکس لاہور ۔۹ر (۳) آئینہ شوق (دیوان) از منشی جگن ناتھ پرشاد صاحب شوق۔ محلہ پیپل مہادیو، چھتہ صوفی جی۔ دہلی ۔عہ (۴) دیوان غالب مترجم از سید فضل الحسن صاحب حسرت بی اے دفتر اردوے معلی علیگڈھ۔ ۔عہ (۵) تحقیقِ سخن مولفہ مولوی سید حسن مرتضےٰ صاحب شفق عماد پوری، رفیع گنج ضلع گیا۔ ۸/۱۲۔ قواعد سول سرس ٹنڈن برادرس، تاجران کتب علی گڈھ۔ ۹ر (۷) دھرم تتو، سوندریہ پربھا، آتم سدھار، پاروتی پرینیہ ناٹک، پتنی دھرم سنگرہ، کویرتن مالا، از دفتر اخبار بھارت مترنمبر ۹ بابو مکتارام اسٹریٹ کلکتہ (یہ سب کتابیں ہندی زبان میں ہیں، جو خریداران بھارت متر کو برائے نام قیمت پر دی جاتی ہیں) (۱۳) بڑی جنتری ۱۹۱۲ء مرتبہ منشی محمد رحمت اللہ صاحب رعد نامی پریس کانپور۔ قیمت ۔عہ (۱۴) اقوال بدھ (ترجمہ "دھم پد") مترجمہ پنڈت مانک راو وٹھل راو صاحب، انڈین پریس الہ آباد ۔ ۱۲ر (۱۵) ہندو قوم مرہی ہی! (مصنفہ ڈاکٹر یو۔ این۔ مکرجی صاحب) مطبوعہ پبلک بھنڈار سوہا بازار لاہور۔ ۲ر (۱۶) علی جنتری ۱۹۱۲ء مرتبہ سید محمد عبد اللہ علم سوداگر، رام نرائن بازار کانپور۔ ۲

جاپان میں تعلیم نسواں

("جاپان میگزین" سے "ادیب" کے لئے ترجمہ کیا گیا)

جاپانی بچّے تین سال کی عمر میں کنڈرگارٹن اسکول میں داخل ہو سکتا ہے لیکن اس طرز کے اسکول چونکہ اس ملک میں بہت کم ہیں اس لئے اکثر بچّے چھ سال کی عمر میں پرائمری اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں جس کے بعد عرصہ چھ سال تک انھیں اسکول کی حاضری پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس قاعدہ سے صرف لولے لنگڑے اور کمزور بچّے مستثنیٰ ہیں۔ اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو یکساں تعلیم دی جاتی ہے۔ گو اکثر سہولیت کی غرض سے ان کی جماعتوں کو الگ الگ بھی کر دیا جاتا ہے۔ جو لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہتی ہوں وہ بارہ سال کی عمر میں تعلیم کے اُس کورس کو شروع کرتی ہیں جو جاپان میں عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور کسی اعلےٰ درجہ کے پرائمری اسکول، سپلیمنٹری (ایزادی) اسکول یا لڑکیوں کے ہائی اسکول میں داخل ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان میں اکثر جو نہایت غریب اور ادنےٰ طبقہ کی ہیں وہ مزید تعلیم کے فوائد سے محروم رہ کر کارخانوں، چھاپہ خانوں وغیرہ میں محنت مزدوری کرنے لگ جاتی ہیں۔ یا گھر میں رہ کر مختلف طریقوں پر اپنے والدین کو مدد دیتی ہیں۔ مثلاً چھوٹے بچّوں کی نگہداشت وغیرہ جنھیں وہ ایک کپڑے سے اپنی پیٹھ کے ساتھ باندھکر ہر وقت پھرتی نظر آتی ہیں۔

بڑے درجے کے پرائمری اسکولوں میں تعلیمی کورس عرصہ دو سال میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ ان اسکولوں میں مضامین وہی ہیں لیکن کسیقدر زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ہوتے ہیں مثلاً اخلاقی تعلیم، نوشت وخواند، مقامی جغرافیہ تاریخ، نقاشی، موسیقی، جمناسٹک، سلائی، دستکاری وغیرہ۔ بہت سی لڑکیاں اتنی تعلیم حاصل کر کے کام میں لگ جاتی ہیں۔ لیکن بعض لڑکیوں کے ہائی اسکول، زنانہ کاریگروں کے مدرسہ، یا زنانہ نارمل اسکول میں پڑھنے کے لئے داخل ہو جاتی ہیں۔

ایزادی اسکول تین قسم کے ہوتے ہیں۔ زرعی، حرفتی اور تجارتی۔ ان میں سے ہر ایک میں عرصہ تعلیم یکساں یعنی تقریباً دو سال ہے۔ ان اسکولوں سے نکلتے ہی لڑکیاں اُن خاص کاموں میں مصروف ہو جاتی ہیں جن کی انھیں تربیت دی گئی ہو۔

خاص ملک جاپان میں لڑکیوں کے ہائی اسکولوں کی تعداد ۱۶۰ ہے۔ ان کا تعلیمی کورس عرصہ چار یا پانچ سال کا مقرر ہے اور مضامین ذیل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اخلاق، انتظام خانہ داری، کھانا پکانا، کپڑے دھونا، سلائی، تیمارداری اور بچوں کی نگہداشت، غیر ملکی زبانیں (جن کے انتخاب کا اختیار طالب علم کو ہوتا ہے) جبر و مقابلہ، اقلیدس، علم نباتات، علم حیوانات، علم موجودات، نیچرل فلاسفی، علم کیمیا، نقاشی، موسیقی، خاص خاص مراسم کے موقعہ پر چائے دینا اور پھول سجانا وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے اسکول چونکہ زیادہ تر بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں واقع ہیں اس لئے دیہات سے آئی ہوئی لڑکیوں کی رہائش کے لئے علیحدہ مکانات بنے ہوئے ہیں۔ ایسے اسکولوں کی طالب علم لڑکیاں زیادہ تر

اوسط سے بڑا درجہ رکھنے والے لوگوں کی ہوا کرتی ہیں اور اچھے مالدار گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ رواجاً ان کی شادی کا انتظام ان کے گریجویٹ ہونے پر فوراً ہی کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح پر وہ جتنی بھی تربیت حاصل کرتی ہیں وہ ساری عملی طور پر انتظام خانہ داری کے کام آتی ہے۔ لیکن بعض لڑکیاں زنانہ نارمل اسکولوں یا زنانہ یونیورسٹیوں میں داخل ہو جاتی ہیں جہاں اُنہیں استانیوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ان کا تعلیمی کورس ۴ ۱/۲ سال کا ہوتا ہے۔ ٹوکیو میں جو بڑے درجہ کا نارمل اسکول ہے اس میں لٹریچر، سائنس، اور آرٹ، ان تینوں میں سے کسی ایک کی تعلیم حاصل ہو سکتی ہے۔ لٹریری یا علمی کورس کے مضامین حسب ذیل ہیں۔ علم اخلاق، علم درس، جاپانی زبان، السنہ چینی، انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، موسیقی، اور جمناسٹک۔ سائنٹیفک کورس مضامین ذیل پر مشتمل ہوتا ہے:۔ علم اخلاق، علم درس، انگریزی، ریاضی، علم طبعیات، علم کیمیا، نیچرل ہسٹری، موسیقی، اور جمناسٹک۔ آرٹ کے کورس کی ذیل میں یہ مضامین آتے ہیں:۔ علم اخلاق، علم درس، انگریزی، علم طبعیات، علم کیمیا، انتظام خانہ داری، خانگی تعلیم، کپڑوں کی سلائی، دستکاری، نقاشی، نمونہ سازی، موسیقی، اور جمناسٹک۔

زنانہ یونیورسٹی کے آٹھ مختلف شعبے ہیں اور ہائی یا نارمل اسکولوں کے مضامین کے علاوہ یہاں مندرجہ ذیل مضامین کی بھی تعلیم ہوتی ہے:۔ علم موجودات، نیچرل فلاسفی کی تاریخ، فنون لطیفہ کی تاریخ، علم اللسان، آئین ملکی، اور ضابطہ دیوانی۔

امرا کے اسکول کی طرز پر ایک اسکول امیرزادیوں کے لئے قائم ہے۔ لیکن اس میں عزت دار و صاحب اقتدار عوام کی بیٹیاں بھی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کے عملی طور پر چار مختلف صیغے ہیں کیونکہ Common (معمولی) اور Academic (اعلیٰ تعلیمی) کورس دونوں جداگانہ طور پر دو دو چھوٹی اور بڑی جماعتوں پر مشتمل ہیں اور انہیں پورا کرنے کے لئے عرصہ چھ سال کا مقرر ہے۔ تعلیمی مضامین اس جگہ بھی قریب قریب وہی ہیں جو زنانہ ہائی اسکولوں میں بطور نصاب مقرر ہیں۔

یہ سب انسٹی ٹیوشن، باستثنائے یونیورسٹی، گورنمنٹ کے زیر اقتدار ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے مشن اسکول قائم ہیں جن میں اکثر کو گورنمنٹ جائز تسلیم کرتی ہے اور جو معمولی طریقوں پر چل رہے ہیں۔ چند ایک پرائیویٹ انسٹی ٹیوشن ان کے سوا اور ہیں جن میں سے ایک کسی جاپانی عورت مس ٹسوڈا کا قائم کردہ اب تک چل رہا ہے۔ مخفی نہ رہے کہ یہ عورت ان سات لڑکیوں میں سے ایک ہے جنہیں گورنمنٹ نے ممالک متحدہ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے بھیجا تھا۔

جاپان میں عورتوں کی تعلیم کا بنیادی اصول اُنہیں نیک بیبیاں اور مائیں بنانا ہے اور یہی انکا فرض آسمانی خیال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ کنبہ کے خیال کو قومی اور سب سے اعلیٰ تصور کرتے اور شخصیت کو اہمیت سے بالکل بعید رکھتے ہیں بچپن ہی سے لڑکیوں کو اطاعت گزاری کا عادی کیا جاتا ہے اور یہ بات اُن کے ذہن نشین کر دی جاتی ہے کہ اپنے بھائیوں اور کنبہ کے دوسرے مردوں کے مقابلہ میں وہ دوسرے درجہ کی اہمیت رکھتی ہیں۔ تمدنی حالات لڑکی کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ اس کے دوستانہ تعلقات صرف اُسی کی جنس تک محدود ہوں اور وہ بہت جلد سیکھ لیتی ہے کہ اپنے والدین کے انتظام کے بموجب اسے بلاشکایت اپنی زندگی کو اپنے شوہر کی

مرضی کے مطابق بسر کرنا چاہیے شوہر کو لڑکیاں مشرقی دستور کے مطابق شادی کے دن سے پہلے بہت کم دیکھتی ہیں۔ سوئے مدبرانہ حلقہ کے لوگوں کے شاذ و نادر ہی عورت اپنے شوہر کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھتی یا مہمانوں کی دعوت میں شریک ہوتی ہے۔ اور اگر ہوتی بھی ہے تو محض اس لئے کہ ان کی ضروریات کا خیال رکھے۔ اس کا کام بالکل کنبہ کے حلقہ تک محدود ہوتا ہے اور اس کا فرض محض اُن کی جسمانی ضروریات رفع کرنا خیال کیا جاتا ہے عام طور پر اسے صرف امور ذیل میں مہارت ہوتی ہے:- کوٹو کھیلنا (جو عملی طور پر سکھایا جاتا ہے اور اس میں موسیقی سیکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ موسیقی کا طریق تحریر حال ہی میں مروّج ہوا ہے) پھولوں کو آراستہ کرنا، اور نقاشی یا تصویر کشی گو باوجود اس کے زنانہ طلبہ کو آرٹ اسکولوں میں داخل نہیں کیا جاتا۔

زبیدہ خاتون

چُپ کی داد

"Silence is the safest course for any man to adopt"

--(La Rochefoucauld)

(۱)

۲۵ر دسمبر ۱۹۰۲ء کی رات کو میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کی ڈاک میں سوار ہو کر ۱۹۰۳ء کے دربار تاجپوشی میں شریک ہونے کی غرض سے دہلی روانہ ہوا میں جس درجۂ اوّل کے ڈبہ میں بیٹھا تھا اس میں ایک یورپین جنٹلمین اور اس کی بیوی بھی سوار تھے۔ یہ دونوں میانہ قد کے تھے اسباب ان کے ساتھ بے شمار تھا اور پیچھے کی اکثر نشستیں ان کے ٹرنکوں۔ دستی بیگوں۔ ٹفن کی ٹوکریوں۔ بستروں اور کیش بکسوں سے رُکی ہوئی تھیں۔ لیکن اتنے اسباب کی موجودگی چنداں حیرت میں ڈالنے والی نہ تھی کیونکہ ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا وہ اپنی سکونت منتقل کر رہے ہیں اور غالباً کالکا کی طرف کسی جگہ اقامت گزیں ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اتنے بڑے اسباب کے ڈھیر کو دیکھکر میری طبیعت سخت پریشان تھی کیونکہ رات کا سفر تھا اور کمرے میں لیٹنے کے لئے کہیں گنجائش نظر نہ آتی تھی۔ ان دونوں کے پاس ایک چیز ایسی بھی موجود تھی جسے دیکھ کر میں سخت حیران تھا باوجود پنجاب کے کڑکڑاتے جاڑے کے ان کے ساتھ پانی سے بھری ہوئی ایک مٹی کی صراحی تھی جسکا منہ ایک بڑے سے کاگ کے ذریعہ بند کر رکھا تھا۔ یہ صراحی ایک شخص کی موت کا باعث ثابت ہوتی لیکن قدرت نے مجھے اُسے بچانے کا ذریعہ بنایا۔ اسی واقعہ کی یاد گزشتہ دربار دہلی نے میرے دل میں تازہ کردی ہے اور میرا ارادہ اس جگہ ان واقعات کو جو اس گاڑی کے اندر اس رات وقوع میں آئے بیان کرنے کا ہے۔

(۲)

اس روز میں جب لاہور سٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوا تو کمرہ

خالی تھا لیکن مجھے وہاں بیٹھے ابھی پانچ منٹ نہ گذرے تھے کہ دونوں میاں بیوی داخل ہوئے۔ اُن کے ہمراہ قلیوں کی ایک پوری پلٹن تھی جنھوں نے اسباب اُٹھا یا تھا۔ صاحب اپنی شکل وشباہت سے چنداں ملنسار یا حلیم الطبع معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کی بھنویں اور موچھیں گھنی اور بھاری تھیں اور تیوری پر بل پڑے ہوئے تھے۔ میں نے رکتے رکتے کہا "یہ اسباب گارڈ کے کمرہ میں رکھوا دیا جاتا تو بہتر تھا۔ اس سے گاڑی رک جائے گی تو مسافروں کے بیٹھنے کی جگہ باقی نہ رہے گی"۔ اس نے میری بات کا بالکل جواب نہ دیا بلکہ اور بھی تیزی سے قلیوں کو اسباب جلد جلد رکھنے کا حکم دینے لگا۔ میں نے اس سے مزید تکرار کرنا فضول سمجھا اور اپنا گلیڈسٹون بیگ لیکر چپ چاپ ایک بالائی نشست پر جا بیٹھا۔

گھنٹی بج چکی۔ گارڈ نے سیٹی دے دی اور اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ نے سبز بتی دکھادی۔ ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ اس وقت تک قلی اسباب لادنے اور رکھنے کے کام میں مصروف تھے۔ ان میں سے چند ایک کو تو آخر چلتی گاڑی سے اُترنا پڑا۔ جب گاڑی اسٹیشن پلیٹ فارم سے نکل گئی لیڈی نے تنگ سفید رضائی ایک نشست پر بچھادی اور صاحب اس پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد وہ اسباب کو ٹھیک ٹھاک کرنے لگ گئی لیکن مجھے اس بات سے سخت حیرت تھی کہ اس کے شوہر نے اس کام میں اسے بالکل مدد نہ دی۔ ایک ٹرنک اس قدر بھاری تھا کہ باوجود اسکی کوشش کے اپنی جگہ سے نہ ہل سکا لیکن چونکہ وہ راستہ میں پڑا تھا اسے سرکانا بھی ضروری تھا۔ ایک بار اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا لیکن اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے صرف اتنا کہا "آہ! میں کتنا کمزور ہو گیا ہوں" اس پر میں نے اندازہ کیا کہ یقیناً وہ بیمار ہے اور یہ شاید تبدیل آب ہوا کی غرض سے کہیں جا رہا ہے۔

لیڈی کے گلابی لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ دوبارہ پوری کوشش سے بکس کو ہلانے لگی۔ اب مجھے نہ رہا گیا۔ میں نے دیکھا کہ گاڑی لاہور چھاونی مشرقی کے اسٹیشن سے نکل چکی ہے اور اب امرتسر سے پہلے کہیں نہ ٹھہرے گی جہاں اُسے قریباً ایک گھنٹے میں پہنچنا تھا۔ آخر کار میں اپنی نشست سے نیچے اُترا اور معذرت کرتے ہوئے بھاری ٹرنک کو کھینچ کر ایک طرف کر دیا۔

لیڈی نے کہا "او تھینکس" اور میری طرف ایک ایسی نگاہ سے دیکھا جو سراسر ممنونیت سے پُر تھی۔ صاحب کی تیوری پر پہلے تو بل پڑ گئے لیکن پھر معاً اس نے بھی میرا شکریہ ادا کیا۔ اس اثنا میں میرے اندر اس لیڈی کی مدد کرنے کا شوق اور بھی تیز ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے چند منٹ [illegible] درخواست کی اور خود چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر دائیں بائیں رکھنے لگا۔ بلکہ اس کے لئے بیچ والی نشست پر ایک رضائی بھی بچھا دی۔ اس کے بعد اس خیال سے کہ اگر تیسری بیچ خالی رہ گئی تو کوئی مسافر اس پر آ بیٹھے گا میں نے چند ایک ٹرنک اس پر چن دئے۔

اس اثنا میں میرے دونوں ہمراہی میری حرکات کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے رہے جب میں اس کام کو ختم کر چکا تو صاحب نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ لیڈی نے زبان سے کوئی لفظ نہ نکالا! البتہ اسکی مسکراہٹ سے ممنونیت کا اظہار ہوتا تھا۔

(۳)

اس اثنا میں گاڑی امرتسر کے اسٹیشن پر جا پہنچی اور چند منٹ ٹھہر کر پھر آگے کو روانہ ہوئی۔ اس وقت لیڈی نے جس کا

نام میں صاحب کی گفتگو سے معلوم کر چکا تھا کہ اَمیلیا ہے، مجھے مخاطب کر کے پوچھا" بابو تم کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا" میڈم میں دہلی جا رہا ہوں" صاحب بیچ میں بول اٹھے" دہلی کو؟ تب تو انبالہ تک ہمارا تمہارا ساتھ ہوگا!"

اَمیلیا کہنے لگی" اس میں کم از کم ہمیں یہ فائدہ ہے کہ اس طویل سفر میں جی بہلا رہے گا۔ بابو تم کو شاید معلوم نہیں کہ مسٹر ایکٹن بیمار ہیں۔ مرض ذیابیطس نے اس بیچارے کو اس حالت تک پہنچا دیا ہے۔"

میں نے پوچھا" کیا آپ کو مرض ذیابیطس ہے؟ بھلا آپ کب سے بیمار ہیں؟"

مسٹر ایکٹن نے جواب دیا" بابو تین سال سے میں اس موذی مرض میں مبتلا ہوں اب اس نے مجھے لب قبر تک پہنچا دیا ہے۔ میری جسمانی حالت نہایت شکستہ ہے اور نقاہت اس درجہ تک پہنچ چکی ہے کہ میں بمشکل دس قدم چل سکتا ہوں۔"

جب وہ گفتگو ختم کر چکا تو میں نے اسے ایک ویراج کا پتہ دیا جسکی نسبت مجھے معلوم تھا کہ بہت سے ایسے مریض اس کے زیر علاج شفا پا چکے ہیں۔ ہرچند کہ ایک دیسی کی دوا تھی تاہم اس نے وعدہ کیا کہ میں اس کی آزمائش ضرور کروں گا۔ کیونکہ واقعہ میں بیماری رنگ اور رتبہ کی تمام باہمی تمیز اٹھا دیتی ہے۔

اس کے تھوڑے وقفہ بعد مسٹر ایکٹن کی آنکھ لگ گئی۔ مسز ایکٹن نے معذرت کرتے ہوئے شٹر بند کر دئیے۔ تاکہ اسکا شوہر سرد ہوا کے جھونکوں سے محفوظ رہے اس اثنا میں میں اپنی بالائی نشست سے اسکی حرکات کو تعریف اور ہمدردی کی نظر سے دیکھتا رہا۔ فی الحقیقت اس کی شکل و صورت اور چال ڈھال بہت کچھ قابل تعریف تھا۔ اس کی تمام حرکات ایک خاص انداز لئے ہوتی تھیں۔ اس کے اعضا کی موزونیت بےعیب تھی قد میں نہ بہت لمبی اور نہ پستہ قامت تھی۔ جسم نہ زیادہ موٹا اور نہ بالکل پتلا تھا۔ آواز شیریں چہرے پر اداسی کی جھلک اور آنکھیں کسی قدر سیاہ تھیں۔ اگر آپ ان تمام تفصیلات کو اپنی ذہنی آنکھ کے روبرو رکھ لیں تو یقیناً اَمیلیا ایکٹن کی تصویر کو اپنے سامنے دیکھ سکیں گے۔

شٹر بند کر کے اور لیمپ پر سبز غلاف چڑھا کر وہ نشست پر بیٹھ گئی اور ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے مختلف امور پر گفتگو کرتے رہے آخر کار میں نے معلوم کیا کہ وہ اب باتیں کرتی کرتی تھک گئی ہے اور سونے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس وقت گاڑی جالندھر چھاونی کے اسٹیشن سے آگے نکل چکی تھی میں نے اسکی یہ حالت دیکھکر معذرت کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ خواہ میں خود نہ سوؤں لیکن اسے سونے کی ترغیب پیدا ہو جائے۔ ڈاک گاڑی اس وقت آباد لیکن سنسان گاؤں اور سرسبز گیہوں کے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔ ہلکے ہلکے ہچکولے لگنے سے رفتہ رفتہ میری بھی آنکھ لگ گئی۔

(۴)

یاد نہیں میں اس حالت میں کب تک سویا کیا۔ بہر نوع جب میں بیدار ہوا اور آنکھیں کھولکر گاڑی میں نگاہ دوڑائی تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مسز ایکٹن جاگ رہی اور ادھر اُدھر پھرتی تھی، اس نے سوائے اپنے سخت کالر کے اور کوئی کپڑا نہ اُتارا تھا۔ اور اب ہاتھ میں کوئی چیز لئے بیٹھی تھی۔ ڈھکے ہوئے لیمپ کی مدھم سی روشنی میں میں پہلے تو معلوم نہ کر سکا کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے۔

لیکن اس بات سے چونکہ مجھے حیرت تھی کہ وہ اس وقت تک کیوں جاگتی ہے اور اس کے علاوہ اس کی خاموشی کو دیکھکر میرے دل میں اس بات کا اندیشہ خود بخود پیدا ہو چکا تھا کہ کوئی برا واقعہ پیش آنے والا ہے اسلئے میں نے بالکل کسی قسم کی حرکت نہ کی اور چپ چاپ نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میری حالت اسوقت ایسی تھی کہ اسے بالکل میری بیداری کا علم نہ ہو سکتا تھا۔

یکایک کسی کاگ کے اڑنے کی آواز سے مجھے خیال گذرا کہ وہ چیز جو اس کے ہاتھ میں تھی بلاشبہ کسی چیز کی شیشی ہوگی آپ میری حیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں جب اس نے بھوت کی طرح چپ چاپ اٹھکر وہ شیشی اس مٹی کی صراحی میں الٹ دی اس کی اسوقت میری طرف پشت تھی اس لئے میں نے اچھی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ جو کچھ مجھے نظر آ رہا ہے وہ خواب تو نہیں؟ لیکن نہیں یہ سب واقعہ میں ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ اتنا معلوم کرکے میں نے پھر وہی حالت اختیار کر لی۔ مسز ایکٹن نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو خراٹے مار مار کر سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس وقت کاغذ کی طرح سپید تھا جسے دیکھکر میرے دل میں اشتباہ پیدا ہو گیا۔ معاً وہ غسل خانہ میں داخل ہو گئی۔ میں حیران تھا کہ اس شیشی میں کیا ہوگا۔ میرے ضمیر نے آواز دی "یہ دوا نہیں زہر ہے"

کیا یہ ممکن تھا کہ میں ایک قاتلہ کی معیت میں سفر کر رہا ہوں؟ کیا ان خوشنما خط وخال کے نیچے خوفناک شیطانی سیرت پوشیدہ تھی؟ یہ خیالات یکے بعد دیگرے بڑی تیزی کے ساتھ میرے دماغ میں سے گذرے اور اس سے کم عرصہ میں جتنا ان واقعات کی تحریر میں صرف ہوتا ہے میں نے اس بارہ میں اپنے دل کے اندر ایک خاص ارادہ کر لیا۔ میں چپ چاپ بغیر آہٹ کئے بالائی نشست پر سے اترا اور بڑی آہستگی سے ایک شٹر کھولکر صراحی کو باہر پھینک دیا۔ گاڑی اس وقت بڑی تیزی کے ساتھ فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ صراحی کے نیچے گرنے سے بالکل کسی قسم کی آواز پیدا نہ ہوئی۔ اور چونکہ [illegible] مسافر کھڑکیاں بند کئے بیٹھے تھے اس لئے میری دانست میں کسی نے اس صراحی کو گرتے دیکھا بھی نہیں۔ میں ابھی شٹر [illegible] بارہ اوپر اٹھانے ہی کو تھا کہ غسل خانہ کا دستہ گھومنے کی آواز آئی۔ میں [illegible] حالت میں چھوڑ ایک بندر کی پھرتی کے ساتھ اپنی نشست پر جا لیٹا اور وہی پہلے کی طرح خواب کی صورت اختیار کر لی۔ اتنے میں آہٹ سے معلوم ہوا کہ مسز ایکٹن بھی غسل خانہ سے نکلکر گاڑی میں آ گئی ہے۔ اس وقت میرا دل بڑے زور [illegible] دھک دھک کر رہا تھا۔ لیکن میں نے بڑے ضبط سے کام لیا اور ذرا سی جنبش بھی ظاہر نہ ہونے دی۔

(۵)

کھلی کھڑکی میں سے ہوا بڑی تیزی کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھی مسز ایکٹن کو جب سرد ہوا کا جھونکا لگا تو قدرتی طور پر وہ حیران سی ہو کر رہ گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ معاً اسکی نظر اس جگہ پر پڑی جہاں صراحی رکھی ہوئی تھی اور جب اس نے اس جگہ کو خالی پایا تو حیرت استعجاب اور اضطراب یکے بعد دیگرے اس کے برف کے ایسے سفید چہرے پر نمودار ہونے لگے۔ میں یہ تمام حالت اپنی کسی قدر کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا صراحی کو غائب پاکر اس نے ایک ہلکی سی چیخ ماری اور بستر پر گر پڑی میرا خیال ہے کہ اسوقت یقیناً اسے غش آ گیا ہوگا۔ پہلے تو میرا ارادہ ہوا کہ اٹھ کر دیکھوں لیکن پھر اس خیال سے جرات

نہ ہوئی کہ میرے اُٹھنے سے معاملہ اور بھی بگڑ جائیگا اور ممکن ہے وہ اپنے جرم کو پردہ پوشی کرنے کے لئے چلتی گاڑی سے کود جائے میں نے بڑی کوشش سے اپنے جسم اور زبان کو قابو میں رکھا اسوقت مجھے انگریزی کی وہ مثل یاد آئی کہ "گفتگو چاندی مگر خاموشی سونا ہے"! میں نے بیدار رہنے کی کوشش کی لیکن تفکرات کے چکّر نے گاڑی کے ہچکولوں کی مدد سے آخر مجھے سُلا ہی دیا جب میں بیدار ہوا تو گاڑی راجپورہ سے نکل چکی تھی اور انبالہ اب قریب ہی تھا - رات کی تاریکی صبح کاذب کی روشنی میں مبدل ہو چکی تھی - میں نے دیکھا کہ مسٹر اور مسز ایکٹن بیٹھے بڑے مزے سے باتیں کر رہے تھے - ان میں سے کسی کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار تک نظر نہ آتے تھے - مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ رات کا واقعہ یقیناً کوئی خواب تھا - لیکن اتنے میں مجھے بیدار پاکر مسٹر ایکٹن نے اپنی صراحی کے گم ہوجانے کا ذکر کیا گو وہ اس بات پر خوش تھا کہ اس کی گھڑی زنجیر اور کیش بکس جسمیں بہت سے نوٹ تھے محفوظ رہے مسز ایکٹن نے بھی اس بارہ میں اپنی حیرت کا اظہار کیا تاہم اس کا انداز بیان کسی قدر افسوس ناک تھا - جو خوش قسمتی سے اس کے شوہر نے معلوم نہ کیا - بہر نوع وہ نہ تو میری طرف دیکھتی اور نہ میری آنکھ سے آنکھ ملانے کی جرأت کر سکتی تھی - اس اثنا میں انبالہ چھاؤنی کا اسٹیشن آگیا اور دونوں میاں بیوی مجھسے بڑی گرمجوشی کے ساتھ جدا ہوئے -

(۶)

اس کے قریباً دو سال بعد ایک روز اتفاق سے مسز ایکٹن مجھے لاہور میں اپر مال پر لارڈ لارنس کی تصویر کے پاس سیر کو جاتی ہوئی مل گئی - اس نے بہنوں کی طرح مجھ سے آزادانہ طور پر گفتگو کی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اسے ایک ایسے جرم سے بچایا تھا جس کا خیال تک کرنا بمنزلہ گناہ تھا - اس نے مجھ پر ان تمام تکالیف اور مصائب کا اظہار کیا جو اس کے شوہر کی دائمی بیماری کی وجہ سے اسے پیش آتے رہے تھے اور جن سے مجبور ہو کر اس نے خود اپنا اور اپنے شوہر کا خاتمہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا - اس نے کہا کہ میں اب خوش ہوں اور میری خوشی کا واحد موجب صرف آپ ہیں کیونکہ جس کبیراج کا پتہ آپ نے بتایا تھا اس کے زیر علاج مسٹر ایکٹن کی حالت اب روبصلاح ہوتی جارہی ہے"

اس کے بعد میرا اکثر ان کی کوٹھی واقع ایبٹ روڈ میں آنا جانا رہا - لیکن اب عرصہ ایک سال سے مسٹر ایکٹن ریٹائر ہو کر ولایت چلے گئے ہیں - اُس دربار کے بعد ایک اور دربار حال میں دہلی میں ہو چکا ہے - اس لئے میں نے ان واقعات کا انکشاف نامناسب یا غیر موزوں نہ جانکر انہیں قلمبند کر دیا ہے -

تیرتھ رام

سری رام چندر جی

ہندوستان جنت نشان کی خوبیوں میں سری رامچندر جی مہاراج کا وجود مبارک بھی اس قابل گزر چکا ہے جن کے عملی ایثار کا مختصر سا ذکر ہمارے نوجوان ہندی بھائیوں کے لئے مفید اور نفع رساں ہوسکتا ہے اس لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ذیل میں کچھ عرض کرکے ہندی بھائیوں کو اُس پر توجہ کرنے کے لئے تحریک کی جائے۔

گو یہ سچ ہے کہ جن لوگوں کی زندگی اُن کے عملی نمونوں کے باعث قابلِ قدر ہوتی ہے اُس پر مفصّل اور شرح و بسط سے لکھنے ہی میں مزا آتا ہے کیونکہ ان کی زندگی کے مختلف واقعات بجائے خود نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں چند صفحوں پر مضمون کا سمانا امرِ محال ہے اور ضرورت اس کی ہے کہ صرف ان امور کا ایک گلدستہ بنا کر پیش کیا جائے جس سے جہاں ہر قوم و مذہب کے اصحاب کے دماغ معطر ہوسکیں، وہاں ہندوستان کی خوبی کا حال بھی اظہر من الشمس ہوسکے۔

آج رام چندر جی کو گزرے ایک مدت مدید اور عرصہ بعید ہوچکا ہے لیکن جس عملی نمونے نے ان کا نام اس وقت تک زندوں کی فہرست میں جلی حروف میں دکھلایا ہے وہ انکی سچّی وفاداری، حقیقی فرمانبرداری، ایثار، اور خودداری کے جوہر ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی اُنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد اور غرض سمجھنے میں نہایت ہوشیاری، دلیری، اور مستعدی سے کام لیا تھا اور یوں اپنے آپ کو ممتاز انسانوں کے زمرہ میں شامل کرنے کے لئے بدرجہ اولیٰ کوشش کرکے کامیابی اور بامرادی کا سارٹیفکیٹ حاصل کرلیا تھا۔

اگر ہمکو ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنے کی خ[illegible] سے بہت سے دنیا میں ممتاز انسان بننے کے خواہشمند [illegible] یقیناً ہیں تو مثل رام چندر جی کے [illegible] اغی کا ذریعہ عملی طور پر یقین کرکے فرمانبرداری، ایثار، خودداری، استقلال کا مجسّم نمونہ بننا چاہئے۔

سری رام چندر جی کو جب بن باس کا حکم ہوا تھا حقیقتاً وہ اس قدر سخت تھا جس کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوجانا نہایت مشکل تھا کیونکہ شادی خانہ آبادی [illegible] کا خصوصاً راج تلک کے موقعہ پر قدرتاً ایسا تھا [illegible] مستقل مزاج اور کڑے دل والے کا گھبرا جانا بھی [illegible] وقت اگر رنج و غم کی سیاہ اور گھ[illegible] یک لخت آجائیں تو انسان یقیناً حواس باختہ ہوسکتا ہے مگر رامچندر جی نے خوشی کے وقت میں غم اور غم کی کالی گھٹاؤں سے ذرا بھی لغزش نہیں کھائی۔ بلکہ اس مصیبت کے پہاڑ کو نہایت استقلال اور خوشی سے اپنے دوشوں پر اٹھانے کے لئے تیار ہوگئے جس سے اس امر کا ثبوت ہم پہنچتا ہے کہ دراصل رامچندر جی بڑے صاحبِ حوصلہ تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک فقیر اور سادھو [illegible] کو ایک جنگل میں منگل منانا آسان اور سہل ہے مگر ایک نازو نعم میں پرورش پانے والے کے لئے اور وہ بھی ایک دو بلکہ [illegible] چودہ برس کے لئے بہت ہی دشوار اور مشکل ہے۔ لیکن مہاراج رام چندر کی زرّیں لائف یہ سمجھاتی ہے کہ وہ اس قسم کے بلند ہمّت تھے کہ اُنکے

نزدیک چودہ سال کی مدت بالکل معمولی مدت تھی۔

اگر رام چندر جی کی لائف کو دنیوی وجاہت کے لحاظ سے دوسرے شہزادوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو صرف رام چندر جی کا وجود ان سب میں ممتاز ثابت ہوتا ہے کیونکہ اول الذکر [illegible] انسانی اغراض اور اپنی بھلائی کے وسائل زیر نظر رکھنے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر برخلاف اس کے موخرالذکر نے انسانیت کا [illegible] تھا کہ دوسرے کی بھلائی کی خاطر اپنی جان [illegible] آجائے تو عیش وعشرت پر لات مارنی پڑے [illegible] فکر کی بات نہیں۔

کہنے کو تو رانی کیکئی سری رام چندر جی کی سوتیلی والدہ تھیں۔ اس لئے یہ ممکن تھا کہ رام چندر جی کے دل میں انکے ارشاد کی وقعت نہ ہو [illegible] ارشاد کی تعمیل میں عیش وعشرت پر لات مارنے پر طیار نہ ہوتے خصوصاً اس حالت میں جبکہ تمام رعیت آپ کی طرفدار تھی۔ مگر سری رام چندر جی کے عملی دیثار نے ثابت کر دیا کہ کیکئی کی عزت اور عظمت ان کے دل میں مہارانی کوشلیا سے کم نہ تھی اور وہ اپنے سوتیلے بھائی بھرت کو بھی اسی طرح ہی دل سے عزیز رکھتے تھے۔ جیسے اپنی جان شیریں کو چنانچہ جب ماتا کیکئی کا یہ ارشاد سنا کہ وہ چودہ برس بنوں میں رہیں اور میرا لڑکا بھرت راج پاٹ سنبھالے تو آپ نے نہایت خوشی سے اس ارشاد کو منظور کرکے اجودھیا نواسیوں کو آگاہی دیتے ہوئے صاف الفاظ میں اپنے دلی خیالات یا یقین کا یوں اعلان کر دیا کہ " میں اور بھرت دو نہیں ہیں اپنی سعادتمندی اس امر میں یقین کرتا ہوں کہ ماتا کا حکم بجالاؤں اور بھرت راج کریں۔ اے لوگو! خوش ہو کہ تمکو ایک نیک، عادل، رعایا نواز، اور روشن خیال راجہ ملتا ہے "

اجودھیا نواسیوں کے دلوں میں چونکہ آپکی محبت نے گھر کیا تھا اس لئے اُن کو آپ کی جدائی شاق گزری اور انہوں نے ہر ایک طرح سے آپ کو سمجھانا اور روکنا چاہا لیکن آپ نے والدین کے ارشاد کی تعمیل کو اسقدر ضروری یقین کیا ہوا تھا کہ صاف الفاظ میں ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یوں سمجھا یا کہ " والدین کے قدموں میں جنت ہے۔ وہ فرزند کیسا خوش نصیب ہے جس کو والدین کی فرمانبرداری اور اطاعت کا موقعہ نصیب ہو اور وہ اس میں کامیاب ہو۔ وہ پسر نہایت ہی بدنصیب ہے جو اس نعمت سے محروم ہے۔ چودہ برس کا زمانہ کٹ جانا مشکل نہیں، خواب کی طرح سے گزر جائے گا۔ مگر عدول حکمی کا داغ ایسا خطرناک ہے جس کا دُھلنا امر محال ہے "

آخر رام چندر نے بڑی بہادری اور دلیری سے عیش و عشرت سے مفارقت کے پیالہ کو پیا اور جنگل کی راہ لی۔ پھر وہاں سے چودہ برس کامل نہ صرف اجودھیا میں بلکہ کسی دوسری بستی میں بھی داخل ہونے سے احتراز کرکے استقلال اور اعلیٰ درجہ کی فرمانبرداری کا وہ قابل قدر نمونہ دکھایا کہ آج دنیا میں ہر طرف سے " سری رام چندر جی کی جَے " کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ فرمانبرداری اور اطاعت کا جُوا گردن پر رکھنے سے انسان کو ایک طاقت اور قوت عطا ہوتی ہے جس سے بڑھکر اس کا کوئی یار و غمگسار نہیں ہوتا۔

کہنے کو تو رام چندر جی کی مفارقت میں آپکی رعایا میں کوئی فرد و بشر نہ تھا جو آٹھ آٹھ آنسو نہ رویا ہو لیکن کیا سوائے لچھمن جی اور مہارانی سیتا کے حقیقی طور پر کسی نے آپ کا ساتھ دیا؟ ہرگز نہیں۔ اور کیونکر کوئی ساتھ دیتا جبکہ سری لچھمن اور جنابہ سیتا جیسے

دل وگردے والے مفقود تھے۔

پیارے ناظرین! ہم نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے اُس سے ہماری غرض یہ نہیں کہ آپ کے آگے ایک پرانا قصہ پیش کر کے آپکے عزیز اور قیمتی وقت کا خون کریں بلکہ محض اس لئے کہ آپ کو اور خود ہمکو ذیل کے نتائج اخذ کر کے خاص سبق حاصل کرنے کا موقعہ نصیب ہو۔

(۱) ہماری زندگی کا مقصد اعلیٰ جہاں یہ ہے کہ ہم اپنے دل ودماغ کو علم کی روشنی سے منور کریں وہاں یہ بھی ہمارے فرائض میں سے ہے کہ علم کو خاص کام لینے کا ذریعہ بنا دیں۔

(۲) جسطرح ہمارے دل میں اپنی بھلائی اور بہبودی کے لئے ان تھک کوشش کرنے کا جوش ہو اسیطرح دوسرے کی فلاح کے لئے بھی تن من دھن سے کوشش کرنا اپنے فرائض میں سے یقین کیا جائے۔

(۳) دوسرے کی فلاح وبہبودی کے لئے اگر اپنی عیش وعشرت کی سیجوں سے جدا ہونا پڑے تو ہم وحزن سینہ [illegible] کا [illegible] نہ بن سکیں بلکہ دوسرے کی بھلائی کے لئے ہر ایک قسم کی مصیبت کو عین راحت سرور اور سچا ذوق یقین کیا جائے۔

(۴) سوتیلے بھائی بہن ایسے ہی عزیز یقین [illegible] حقیقی یقین کئے جاتے ہیں اور سوتیلی والدہ کی عزت [illegible] وقر کا سکہ ایساہی دل میں بٹھانا [illegible] اپنی حقیقی والدہ کا کیونکہ والدہ سے تعلق کی وجہ سے وہ [illegible] ہے کہ اسکی اطاعت اور فرمانبرداری سے انکار نہ کیا [illegible] اور اطاعت کا تلک نافرمانی کے زریں تاج سے بدرجہا بہتر ہے۔

یہ وہ چار سبق ہیں جو سری رام چندر جی کی زریں [illegible] ملتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ جوان [illegible] کے لئے تیار [illegible]

[illegible] حسین

جاڑا

من تصنیف جناب سید محمد مرتضیٰ صاحب بیان ویزدانی مرحوم (میرٹھی)

دھوم مچاتی سردی آئی — دانت بجاتی سردی آئی
دُھنیوں کے بھاگوں جاڑا آیا — تانت بجی اور راگ بھی پایا
ڈھک گیا مُنہ اور چھپ گئے ہاتھ — جاءالبرد مع الجبات
دانت کی ڈونڈی گھر کا اکھاڑا — روئی کے بیچ نے سب کو پچھاڑا
کھیت کیا رکھے پڑ گئے لالے — پالے کے سب پڑ گئے پالے
گھر گھر بانٹی دولت اس نے — سب کو دیا ہے خلعت اس نے
کسی کا شالی مول میں بھاری — کسی کی کملی تول میں بھاری
جیت گیا گر بالا پالے — کھیت رہے تمباکو والے
غل بل کرتے پھرتے ہیں کُل — کابلیوں کا ٹوٹا ہے بل

میوہ تولنے والے آئے — پشتو بولنے والے آئے
نکلے چینے جھاڑی سے — اُترے ریچھ پہاڑی سے
جوؤں میں کپڑے نور بھرے ہیں — رُوڑ میں کیا انگور بھرے ہیں
ٹنگ سے بیٹھی ہے اک اک جوں — کابل جائے گی جوں کی توں
پیسہ دہ اینک میوہ بدشم — کابلیم انگور فروشم
ہوگیا سب کا کلیجا ٹھنڈا — کھوپڑی ٹھنڈی بھیجا ٹھنڈا

× × × × × × ×

دھنیوں کے بھی ہوش ہیں گم — دھننے لگے سر روئی کے بدلے
کان پہ دھرا تھا اب ہے دھن — کان کے بدلے ہاتھ میں [illegible]

روئی کے بادل آگئے سر پر — باندھ کے دل [illegible]
رعد بنے لڑکے دانت [illegible] — دل بادل میں کڑک [illegible]
آگ سے بچ بچ [illegible] — [illegible] آگ جو سب کو
گود میں لی چھاتی سے لگالی — آجکل آگ ہے ننھی بالی
شب کو انگیٹھی [illegible] — [illegible]
اک اک عضو ہوا ہے ٹھنڈا — چار [illegible] دھند
ٹھرے ہوئے [illegible] کے
گرم فقط [illegible] کے

خیر مقدم

دامرِ کیہاں تو ئی خسروِ ذیشاں تو ئی ہم جہانِ مردمی ہم جانِ ہر انساں توئی
در جہان از فیضِ عدلِ تو کسے محروم نیست دوستاں راجاں توئی ہر دشمناں سوہاں توئی
[illegible] بے مثال ہم سلیمانی بعہدِ خویش ہم سلماں توئی
تو زمانہ [illegible] م تو قیصرِ انگلینڈ و ہر انڈیا سلطاں توئی
[illegible] زیں سبب چشم و چراغِ سطوتِ شاہاں توئی
[illegible] معنوں تو اہمیت ایں زمینِ ماست چرخ و نیرِ تاباں توئی
[illegible] چمن او حسن تو غازۂ رخِ بہارِ گلشنِ امکاں توئی
جائے تو در دل چرا نبود کہ بہر دوستاں مدعا و آرزو و حسرت و ارماں توئی
بر بر [illegible] تو مسخر کرد ہفت اقلیم را اے شہِ ذی جاہِ ما اسکندرِ دوراں توئی
[illegible] پیشِ تو باید سلامی رستمِ میداں توئی
[illegible] عیسیٰ میکند دردِ قلبِ خستگاں را دارو و درماں توئی
[illegible] بود مغفر از برائے راحت او سایۂ یزداں توئی
ستہ د [illegible] انقلابِ روزگار
چوں مددگارِ حمیدِ بے سرو ساماں توئی

حمید میرٹھی

[illegible] دربار

[illegible] کے بعد [illegible] یہ موقع ہے کہ ممالک یورپ کے جلیل القدر تاجدار نے سات [illegible] ہند پر قدم رکھا ہے یعنی حضور پرنور ملک معظم حضرت جارج پنجم شاہنشاہ ہندوستان اور شاہنشاہ [illegible] ام [illegible] عظم و اجلالم کے قدوم میمنت لزوم سے خاک ہندوستان [illegible] حسرت خیز موقع پر وفاشعار رعایائے ہند کو جسقدر خوشی و مسرت ہو کم ہے یہی وجہ ہے کہ آج کل ہندوستان کا زمین و آسمان [illegible] کی مدح سرائیوں اور مختلف زبانوں کی نغمہ پیرائیوں سے گونج رہا ہے ۔ چنانچہ مشہور [illegible] شاعر مسٹر جے ۔ این مکری نے انگریزی نظم میں دہلی کو مخاطب کرکے جس عنوان سے اظہار مسرت کیا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہوگا ۔ یہ نظم بطور خلاصہ اسکا ہے کہ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف کلکتہ میں شائع ہوئی ہے جسکا ترجمہ نذر ناظرین ہے ۔

اے پرانی دلّی ۔ اے آثارِ دیرینہ شکوہ اے جوانوں بادشاہوں خاندانوں کی یادگار
تو کبھی گہوارہ تھا مذہب کا اور تہذیب کا اب شباب اور شان و شوکت کا ہے تو ہی مزار

پانڈوؤں نے تجکو جب دیکھا نگاہِ شوق سے پڑگئی آنکھوں میں اُن کی بس چکا چوند دیکھکر
خوب گایا ہے مہابھارت نے ہر بار تیرا باندھکر صنعت کا سہرا تیرے اور قدرت کا [illegible]

تیرے چپہ چپہ پر انبار ہیں اور رنگ و تاج حوصلوں کے ولولوں کے جوش کے جذبات کے
لوگ لیتے اور تجھے کھوتے رہے ہیں بارہا چال سے تدبیر سے تلوار سے اور [illegible] سے

تو عماراتِ نفیسہ کا ہے دار السلطنت سات تعمیرات ہیں دنیا کی ہے تیرا شمار
آج بھی وہ خوبیاں ہیں تجھ میں جنکو دیکھکر وجد کر اُٹھتے ہیں تیرے دوست دشمن ایکبار

اے مبارک بعد مدت ہنستی ہے قسمت تری آرہا ہے یعنی شاہنشاہ ہندوستان کا
کالے کوسوں دور سے ساتوں سمندر پار سے چھوڑکر دیکھ جزیرہ اپنا انگلستان کا

ہاں مبارک عظمتِ دیرینہ کے سنگِ نشان ڈالدے گا اپنے ہاتھوں سے ترا اب تھمبلہ
ایک چادر تیری بوسیدہ شکستہ قبر پر یادگاروں میں تری اور ایک تازہ یادگار

ہو رہی ہے دیکھ وہ صبح تجلّی کی نمود اُٹھ رہا ہے پردہ بزمِ عظمت و اقبال کا
فرش سے تا عرش آرائش ہے آتا ہے نظر پھر زمانہ راجہ آشوک کے اجلال کا
